شہاب نامہ

قدرت اللہ شہاب

۱۹۹۸ء

• اقبال جرم

ebooks.i360.pk

قدرت اللہ شہاب

۹ جون ۱۹۳۸ء سے میں نے باقاعدہ ایک ڈائری رکھنے کی طرح ڈالی۔ یہ روایتی روزنامچہ کی صورت میں نہ تھی بلکہ میں نے اپنے ایک خود ساختہ شارٹ ہینڈ (مختصر نویسی) میں ہر اس واقعہ یا احوال کو نوٹ کرنا شروع کر دیا جو میرے نزدیک کسی خاص اثر یا اہمیت کے حامل تھے۔ رفتہ رفتہ یہ میری عادت ثانیہ بن گئی۔

ایک روز میں نے اپنے ان کاغذات کا پلندہ ابن انشاء کو دکھایا' تو وہ بہت ہنسا۔ میری مختصر نویسی میں درج کی ہوئی کوئی بات تو اس کے پلے نہ پڑی لیکن یہ ضرور پوچھا کہ ۹ جون کی تاریخ سے یہ ڈائری شروع کرنے میں کیا راز ہے۔ اس وقت تو میں نے اسے کچھ نہ بتایا۔ البتہ جو صاحب اس کتاب کا آخری باب "چھوٹا منہ بڑی بات" پڑھنے کا بوجھ برداشت کر لیں گے' ان پر اس تاریخ کی حقیقت از خود منکشف ہو جائے گی۔

کچھ عرصہ بعد ابن انشاء ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر علاج کی غرض سے لندن چلا گیا۔ اس کی وفات سے دو ڈھائی ماہ قبل میں اسے ملنے لندن گیا۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ ایک روز اچانک ابن انشاء نے کسی قدر مزاحیہ انداز میں اپنی زندگی کا جائزہ لینا شروع کر دیا اور پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا کہ اگر کسی ترکیب سے اسے دوبارہ دنیاوی زندگی مل جائے تو اسے وہ کس طرح گزارنا چاہے گا۔ اس کی تشنہ تکمیل تمناؤں' آرزوؤں اور امنگوں کی تفصیل اتنی طویل تھی کہ اسے سناتے آدھی رات بیت گئی۔ اس کے

بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر تمہیں دوبارہ زندگی نصیب ہو تو اسے کس طرح بسر کرنا چاہو گے؟

میں نے مختصراً جواب دیا کہ بہت سی کج فہمیوں، کمزوریوں، خطا کاریوں اور غفلتوں کی اصلاح کر کے میں دوسری زندگی بھی مجموعی طور پر ویسے ہی گزارنا چاہوں گا جیسے کہ موجودہ زندگی گزار رہا ہوں۔

یہ سن کر ابن انشاء چوکنا ہو گیا اور کاغذ پنسل ہاتھ میں لے کر سکول ماسٹر کی طرح حکم دیا۔ "وجوہات بیان کرو، تفصیل سے۔"

میں خود احتسابی کی کدال سے اپنا اندر اور باہر کرید کرید کر بولتا رہا اور ابن انشاء ایس ایچ او کی طرح ایف آئی آر کے طور پر میرا بیان لکھتا رہا۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی فہرست یہ تھی۔

دین کے بارے میں میں کبھی شک و شبہ یا تذبذب میں گرفتار نہیں ہوا۔ دین کے متعلق میرا علم محدود اور عمل محدود تر ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنی بے نیازی سے مجھے اسلام کی بعض جھلکیوں کی نعمت سے محروم نہیں رکھا۔

ایک دور افتادہ، پس ماندہ اور سادہ ماحول سے نکل کر میں نے اپنے زمانے کی سب سے بڑی سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں حصہ لیا اور اللہ نے مجھے کامیابی عطا فرمائی۔

سروس کے دوران میں نے کبھی اپنی پوسٹنگ یا ٹرانسفر کے لیے کسی قسم کی کوشش، سفارش یا خوشامد سے کام نہیں لیا۔ اس کے باوجود مجھے اچھے سے اچھا عہدہ نصیب ہوتا رہا۔

ملازمت کے دوران میں نے دانستہ طور پر کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اپنی جائز تنخواہ کے علاوہ میں نے کبھی کسی حکومت سے مالی یا زرعی اراضی یا پلاٹ وغیرہ کی شکل میں کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ایک بار سربراہ مملکت نے مجھے آٹھ مربع زمین کا انعام دینے کی پیشکش کی۔ جب میں نے اسے قبول نہ کیا تو انہوں نے کسی قدر ناراضگی سے اس کی وجہ

پوچھی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ انسان کو انجام کار دو ڈھائی گز زمین کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ہر کس و ناکس کو کہیں نہ کہیں مل ہی جاتی ہے۔

ملازمت کے دوران میں نے اپنا کام ایمانداری اور بے خوفی سے کیا۔ اس کی پاداش میں چار بار استعفیٰ دینے کی نوبت آئی۔ چوتھی بار بعد از خرابی بسیار منظور تو ہو گیا لیکن میری پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ غالباً سزا کے طور پر تین برس تک رکے رہے۔ مجھے یہ تسلی ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب جیسی عظیم ہستی کے ساتھ میری بس یہی ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں کو اپنی اپنی پنشن کے حصول میں یکساں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تین برس خاصی تنگدستی کا زمانہ تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ کسی انسان کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

میں خود کسی کا دشمن نہیں ہوں اور نہ ہی کسی اور کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔ پہلی بات تو یقینی ہے' دوسری تخمینی۔ دوسروں کے دل کا احوال تو فقط اللہ ہی جانتا ہے۔

انسانوں کے درمیان باہمی تعلقات میں وقتاً فوقتاً رنجشیں' کدورتیں' نفرتیں اور تنازعے پیدا ہونا ایک فطری امر ہے' میں ان کمزوریوں سے ہرگز مبرا نہیں۔ لیکن میں نے رنجشوں' کدورتوں اور تنازعوں کو ہمیشہ عارضی اور دوستیوں اور محبتوں کو ہمیشہ دائمی سمجھا ہے۔

میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ کسی کی پیٹھ پیچھے وہی بات کہی جائے جو اس کے منہ پر دہرائی جا سکے۔ اس اصول کو پوری طرح نبھا تو نہیں سکا' لیکن کسی حد تک اس پر عمل کرنے کی توفیق نصیب ہوتی رہی ہے۔

میں نے اپنے خلاف تنقید یا الزام تراشی کا برداشت کرنا سیکھا ہے اور اس کے جواب میں تضحیک یا تردید کرنے سے گریز کیا ہے۔ البتہ بجا یا بے جا تعریف سن کر دل خوش ہو جایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کمزوری پر قابو پانے کی کوشش جاری رکھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب بندہ کے لیے مدح و ذم دونوں یکساں ہیں۔

میں کبھی Frustrate (مایوس) یا بور نہیں ہوا۔

تنہائی کے احساس نے مجھے نہیں ستایا۔ میں اکیلے میں زیادہ خوش رہتا ہوں۔
خوش قسمتی سے مجھے ایسے دوستوں کی رفاقت نصیب ہوئی' جن کا اپنا اپنا رنگ اور اپنی اپنی شخصیت ہے۔ مثلاً ابن انشاء' ممتاز مفتی' بانو قدسیہ' اشفاق احمد' واصف علی واصف صاحب' جمیل الدین عالی' ریاض انور' ایثار راعی' مسعود کھدر پوش' ابن الحسن برنی' اعجاز بٹالوی' ایوب بخش اعوان وغیرہ۔ یہ سب اپنے اپنے میدان کے منفرد شہسوار ہیں۔ باہمی محبت' خلوص' احترام اور اعتماد کے علاوہ ہمارے درمیان اور کوئی خاص قدر مشترک یا مقصدیت نہیں۔ اس کے باوجود ہر زمانے میں ہمارے تعلقات میں نہ کوی کجی آئی ہے اور نہ کوئی کمی پیدا ہوئی ہے۔
خاص طور پر ممتاز مفتی انتہائی ذکی الحس' ضدی' بے باک اور شدت اور حدت پسند تخلیق کار ہیں۔ کسی وجہ سے میری کوئی حرکت انہیں پسند آ گی اور انہوں نے بیٹھے بٹھائے ایسی عقیدت کا روگ پال لیا کہ میرے چہرے پر مشک کافور سے مہکتی ہوئی حنائی داڑھی چسپاں کر کے' میرے سر پر دستار فضیلت باندھی اور سبز پوشوں کا پر اسرار جامہ پہنا کر اپنی سدا بہار تحریروں کے دوش پر مجھے ایسی مسند پر لا بٹھایا' جس کا میں اہل تھا نہ خواہش مند۔ اس عمل سے ان کو تو کوئی فائدہ نہ پہنچا البتہ میرے لیے وہ ایک طرح کے مرشد کا کام دے گئے۔ ان کی وجہ سے میں صراط مستقیم پر ثابت رہنے پر اور بھی زیادہ مستعد ہو گیا تا کہ ممتاز مفتی کی عقیدت کے آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے۔ بظاہر میرا نفس تو بہت پھولا' لیکن اندر ہی اندر عرق ندامت میں غوطے کھاتا رہا۔ کیونکہ من آنم کہ من دانم
میں نے دنیا بھر کے درجنوں سربراہان مملکت' وزرائے اعظم اور بادشاہوں کو کئی کئی مرتبہ کافی قریب سے دیکھا ہے لیکن میں کسی سے مرعوب نہیں ہوا اور نہ ہی کسی میں مجھے اس عظمت کا نشان نظر آیا جو جھنگ شہر میں شہید روڈ کے فٹ پاتھ پر پھٹے پرانے جوتے گانٹھنے والے موچی میں دکھائی دیا تھا۔

اس طرح کی زندگی کے علاوہ مجھے اور کیا چاہیے؟ اب تو بس یہی جی چاہتا ہے۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی

اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

ابن انشاء نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ فہرست میرے حوالے کی' اور وصیت کی کہ اپنی ڈائری کی خفیہ نویسی کو بے نقاب کرو اور دلجمعی سے ایک کتاب لکھو۔ میں تو اسے پڑھنے کے لیے زندہ نہ رہوں گا لیکن میری روح خوش ہو گی۔
حامی تو میں نے بھر لی' لیکن جب قلم اٹھایا تو ایک شدید الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ مجھے احساس تھا کہ میں نے زندگی بھر کوئی ایسا تیر نہیں مارا جس پر شیخیا ں بگھار کر

اور اپنے منہ میاں مٹھو بن کر ادب کے میدان میں ایک برخود غلط تمیں مار خاں بننے کی کوشش کروں ------- کیا لکھوں؟ -------- کیسے لکھوں؟ -------- اور کیوں لکھوں؟ -------- اسی شش و پنج میں کئی برس گزر گئے۔ رفتہ رفتہ میرے دماغ کی تاریک سرنگ میں روشنی کے کچھ آثار نمودار ہونا شروع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ جن واقعات' مشاہدات اور تجربات نے مجھے متاثر کیا ہے ان کی روئیداد بے کم و کاست بیان کر دوں۔
اس کے علاوہ یہ امر بھی مد نظر رہا کہ بعض غلط فہمیوں اور مفروضوں کی بنا پر میرے ماتھے پر کچھ کلنک کے ٹیکے لگ چکے ہیں' جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔
مثلاً میرے محترم اور مہربان بزرگ ابوالاثر حفیظ جالندھری نے کسی شاعرانہ موڈ میں یہ کہہ دیا۔

جب کہیں انقلاب ہوتا ہے
قدرت اللہ شہاب ہوتا ہے

اس شعر کا بہت چرچا ہوا اور یہ تاثر دیا گیا کہ وطن عزیز میں "انقلاب" کی آڑ میں جتنی غیر جمہوری کارروائیاں ہوتی رہی ہیں' ان سب میں میرا کچھ نہ کچھ ہاتھ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو جب گورنر جنرل غلام محمد نے سب سے پہلے اسمبلیاں توڑ کر آمریت کا ڈول ڈالا' اس وقت میں پنجاب کی صوبائی حکومت کے ماتحت لاہور میں ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے طور پر متعین تھا۔ اس واقعہ کے سات آٹھ روز بعد مجھے اچانک گورنر جنرل کا سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔ اس کی وجہ مجھے اب تک معلوم نہیں۔ اس وقت تک ملک غلام محمد سے میری نہ کوئی ذاتی شناسائی تھی نہ کوئی رابطہ تھا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جب اسکندر مرزا اور کمانڈر انچیف ایوب خان کا مارشل لاء نافذ ہوا۔ اس وقت ۲۰ ستمبر سے میں جناح ہسپتال کراچی میں عارضہ قلب کے علاج کے لیے داخل تھا۔ اکتوبر کے شروع میں ہسپتال سے گھر آ گیا۔ ڈاکٹروں کا حکم تھا کہ مزید دو ہفتے دفتر نہ جاؤں اور گھر پر ہی مکمل آرام کروں۔ مارشل لاء لگنے کی خبر مجھے پہلی بار کرنل مجید ملک نے رات کے بارہ بجے گھر پر ٹیلیفون کر کے سنائی۔ وہ ان دنوں مرکز میں پرنسپل انفارمیشن آفیسر تھے۔ دوسرے مارشل لاء کی سازش جنرل محمد یحیٰی اور ان کے ایک مخصوص ٹولے تک محدود تھی۔ پورے دس روز میں اسلام آباد کے مرکزی سیکرٹریٹ میں بے کار بیٹھا مکھیاں مارتا رہا۔ چند دنوں بعد اس دھاندلی پر ہلکا سا احتجاج کر کے میں بیوی بچے سمیت بیرون ملک چلا گیا اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ تیسرے مارشل لاء کے وقت میں اسلام آباد میں گوشہ نشینی کی زندگی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اقتدار میں آنے کے پینتیس روز بعد مجھے اچانک جنرل محمد ضیاء الحق کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم ملا۔ رمضان شریف کے دن تھے۔ تراویح کے بعد رات کے تقریباً بارہ بجے میں آرمی ہاؤس پہنچا۔ اس وقت جنرل صاحب اپنے ڈرائنگ روم میں مولانا ظفر الحق انصاری کے ساتھ مصروف

گفتگو تھے۔ اس سے فارغ ہو کر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ جنرل صاحب بڑی شفقت سے پیش آئے اور فرمایا۔ "ملک کے اس نازک مرحلے میں ہمیں تجربہ کار کارکنوں کی ضرورت ہے۔ میری خواہش ہے کہ کل سے تم وزارت تعلیم کا کام سنبھال لو۔"

یہ سن کر میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے عرض کیا۔ "جناب! اب مجھ میں کام کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ کچھ تو ضعیف العمری کا تقاضا ہے' کچھ ریٹائرڈ زندگی نے آرام پسندی کی عادت بڑھا دی ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ عرصہ کے لیے لندن جا کر اپنے دوست ابن انشاء کی عیادت کرنا چاہتا ہوں۔"

جنرل صاحب مسکراتے رہے اور فرمایا۔ "کوئی بات نہیں' ضرور جاؤ۔ وزارت تعلیم کے سیکرٹری ڈاکٹر محمد اجمل چند روز میں یونیسکو کی کسی تعلیمی کانفرنس کے لیے جنیوا جا رہے ہیں' میں تمہیں ان کے ساتھ ایک ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے بھیج رہا ہوں۔ وہاں سے لندن بھی ہو آنا۔ واپسی پر پھر بات ہو گی۔"

میں نے اس وقفہ کو غنیمت سمجھا اور ڈاکٹر اجمل کے ساتھ پہلے جنیوا اور پھر لندن چلا گیا۔ ہم کچھ روز ابن انشاء کے ہاں ٹھہر کر واپس اسلام آباد آ گئے۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ میری ٹال مٹول پہچان کر اب وزارت تعلیم میں کام کرنے کی بات آئی گئی ہو گی۔ لیکن میرے کئی عزیزوں اور دوستوں نے جو فوج میں ملازم تھے' مطلع کیا کہ جی ایچ کیو کے افسروں کی ایک میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے میرا نام لے کر بتایا کہ انہوں نے شعبہ تعلیم کے لیے مجھے منتخب کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ کویت سے میرے ایک دیرینہ دوست کا مبارکباد کا خط آیا کہ مشرق وسطیٰ کے دورے پر کسی مقام پر پاکستانیوں کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے جنرل صاحب نے پھر یہی بات دہرائی۔ مجھے تشویش تو ضرور لاحق ہوئی لیکن میں خاموشی سے کان لپیٹ کر اسلام آباد میں بیٹھا رہا۔ اس دوران چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کو اپنی مرضی کے دوسرے نورتن مل گئے تھے۔ میں ان کا تہہ دل سے

شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہ تو اس موضوع پر پھر کوئی بات چھیڑی اور نہ ہی کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار کیا۔ اگر خدا نخواستہ میں لالچ میں آ کر یہ پیشکش قبول کر لیتا

تو مجھے یقین ہے کہ نوے روز کے مارشل لاء کو ساڑھے آٹھ سال (یا گیارہ سال) تک طول دینے کا سہرا بھی اسی خاکسار کے سر باندھا جاتا۔

صدر ایوب کے زمانے میں جب انہوں نے جگہ جگہ عام جلسوں میں سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا تو میرے دوست سید محمد جعفری نے اپنے مخصوص اور منفرد رنگ میں یہ پھبتی اڑائی۔

یہ سوال و جواب کیا کہنا
صدر عالی جناب کیا کہنا
کیا سکھایا ہے کیا پڑھایا ہے
قدرت اللہ شہاب کیا کہنا

سید محمد جعفری بڑے بلند پایہ اور ہر دلعزیز شاعر تھے۔ ان کے نام کی وجہ سے یہ اشعار بہت سے حلقوں میں زبان زد خاص و عام ہو گئے۔ اس شہرت نے یہ ظلم ڈھایا کہ ہر کوئی سمجھنے لگا کہ صدر ایوب میرے اشارے پر ناچتے ہیں اور ان کا ہر فیصلہ میرے مشوروں کا مرہون منت ہے۔

چنانچہ رائٹرز گلڈ قائم ہوا تو کچھ نے یہی سمجھا کہ میں نے ترپ چال چل کر ادیبوں اور دانشوروں کے تمام انڈے صدر ایوب کی جھولی میں ڈال دیئے ہیں۔ سرکاری درباری حلقوں کو ضد تھی کہ صدر ایوب کے اعتماد کا فائدہ اٹھا کر یہ ادارہ "سرخوں" کی کمین گاہ کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ جب "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" اور "لیل و نہار" پر حکومت نے زبردستی اپنا قبضہ جمایا' اسے بھی میرے ذہن رسا کا نتیجہ قرار دیا گیا۔ ۱۹۶۳ء کے بدنام زمانہ پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی ننس کا نفاذ بھی میرے ہی کھاتے

میں ڈالا گیا۔ علی ہذا القیاس------

مجھے توقع تھی کہ صحافی برادری جو بڑے بڑے "سکوپ" لے اڑنے میں مہارت رکھتی ہے' ان میں کوئی صاحب دل میرے سر تھوپے ہوئے الزامات کی تحقیق اور تفتیش کرنے کی زحمت بھی اٹھائے گا۔ یہ امید نقش بر آب ثابت ہوئی۔ الٹا بھیڑ چال کی صورت میں بہت سے حضرات بلا چوں و چراں یہی الزامات دہراتے رہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ کتاب لکھنے کا ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا۔ اس کا مقصد اپنی بری اور معصومیت کا ڈھول پیٹ کر نمبر بڑھانا نہیں۔ فقط حقائق کے ریکارڈ کو صاف کرنا مقصود ہے۔

اس کتاب میں واقعات سب صحیح ہیں' لیکن اسلوب بیان میرا ہے۔ جہاں کہیں میں نے کوئی نتائج اخذ کئے ہیں یا کوئی رائے دی ہے ان کا ذمہ دار بھی میں ہی ہوں۔ ان سے بعض کو اتفاق ہو سکتا ہے بعض کو اختلاف۔ دونوں صورتیں میرے لیے برابر ہیں۔ اپنی کج فہمیوں یا خام خیالیوں کی اصلاح کرنے میں میری انا کوئی رکاوٹ نہ بنے گی بلکہ خوشدلی سے اظہار تشکر میں میرا ہاتھ بٹائے گی۔

کچھ صاحبان کو گلہ ہے کہ جو واقعات چٹخارے لے لے کر میں اب سنا رہا ہوں' اس وقت کیوں خاموش رہا جب یہ سب کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ میں ایک مثالی بیورو کریٹ تو نہیں لیکن قدرے اچھا بیورو کریٹ ضرور رہا ہوں۔ اچھا بیورو کریٹ بننے کے لیے چند اصولی شرائط لازمی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کسی معاملے میں اس کا مشورہ طلب کیا جائے تو اس پر اپنی بے لاگ رائے کا بے خوفی سے اظہار کرے۔ اگر اس کی رائے کے مطابق فیصلہ ہو گیا تو فبہا ------- بصورت دیگر اگر اس کی رائے یا مرضی کے خلاف فیصلہ ہوا تو ایک اچھے بیوروکریٹ کے سامنے صرف دو ہی راستے ہوتے ہیں کہ ایک یہ کہ فیصلہ اس کی خواہش کے مطابق ہو یا مخالف' اس کا فرض ہے کہ وہ سر تسلیم خم کر کے اس پر دیانتداری سے عملدرآمد کرے۔ بصورت دیگر استعفیٰ دینے پر ہمت چست کرے اور ملازمت چھوڑ کر جو جی چاہے کہے سنے۔ اپنی سروس کے دوران میں ان دونوں راستوں پر چلا ہوں۔ پہلے پر زیادہ' دوسرے پر کم۔ میرے کمزور ضمیر نے مجھے فقط چار

بار استعفیٰ پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ چوتھی بار جب میرا استعفیٰ منظور ہوا' اس وقت میری ملازمت کے سات آٹھ برس باقی تھے۔ میں اسے اپنا کمال تو نہیں سمجھتا جس پر اتراتا پھروں' لیکن مطمئن ضرور ہوں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ہر سرکاری ملازم کو حق حاصل ہے کہ وطن کے دفاع اور سالمیت کے State Secrets (امور ریاست کے راز) فاش کئے بغیر وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو آزادی کے ساتھ بیان کرے۔ میں نے اسی موقف کو اپنا کر یہ کتاب لکھی ہے۔ دنیا بھر میں بھی یہی چلن رائج ہے۔

اس میں کئی اہم واقعات تشنہ اظہار رہ گئے ہیں۔ مثلاً بنگلہ دیش کے قیام کا پس منظر' عوامل اور عواقب یا ذوالفقار علی بھٹو کے پانچ سالہ دور حکومت اور جنرل محمد ضیاء الحق کے ساڑھے آٹھ برس کا مارشل لاء ------- یہ موضوعات اتنے اہم اور دور رس ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر پوری پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ان ادوار میں میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ کسی حکومت یا حکمران کے بارے میں اندرون خانہ کی باتیں معلوم کر سکیں۔ اگرچہ میں نے "حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ" پڑھی ہوئی ہے' لیکن کسی وجہ سے حکومت نے آج تک اسے ایک انتہائی خفیہ راز کے طور پر چھپا رکھا ہے۔ اس رپورٹ کی روشنی میں کوئی بات لکھنا ایک سول سرونٹ کے ضابطہ کردار کے منافی ہو گا۔ میں نے زندگی بھر کبھی اس ضابطہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے ان موضوعات پر قلم اٹھانے سے گریز کیا ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ کسی وقت کوئی اہل دل ان ادوار کے احوالات کو قلمبند کرنے کا حق ضرور ادا کرے گا۔

اس کتاب کا مقصد کسی فرد کی جان بوجھ کر کردار کشی' بت شکنی یا بت تراشی کرنا نہیں ہے۔ جو لوگ تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں' ان کی ذات انفرادی نہیں رہتی' بلکہ اپنی طرز کا ایک ادارہ بن جاتی ہے۔ تاریخ کی سرچ لائٹ نہایت تیز اور بے رحم ہوتی ہے۔ اس کی شعاعوں کی روشنی میں ہر شخص اور ادارے کے حقیقی خد و خال سامنے آ جاتے

ہیں۔ ان خد و خال کی لطافت یا کثافت کا ذمہ دار مصنف ہے' نہ اس کی تصنیف۔ یہ تو محض ان افراد کے ذاتی' صفاتی' ظاہری یا باطنی کردار کا عکس ہے جو اپنے اپنے زمانے میں زندگی کے اسٹیج پر اچھا یا برا پارٹ ادا کرنے کے بعد زندہ ہیں یا مر چکے ہیں۔ دونوں صورتوں میں میں کسی معذرت کا طلبگار نہیں۔ میں نے حقائق کو انتہائی احتیاط سے ممکنہ حد تک اسی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے' جس رنگ میں وہ مجھے نظر آئے ہیں۔ ہر طرح کی احتیاط کے باوجود انسان خطا کا پتلا ہے اور اس کی بصارت اور بصیرت دونوں دھندلا سکتے ہیں۔ اس لیے میں حتمی طور پر اپنی پارسائی یا معصومیت کا دعویٰ کرنے سے بھی معذور ہوں اور اللہ تعالیٰ کی شان توابی' ستاری' غفاری اور بے نیازی کا سہارا لے کر ان تمام جرائم کا اقرار کرتا ہوں' جن کا مجھے علم ہے اور جن کا مجھے علم نہیں۔

محترمہ ادا جعفری نے اسلام آباد میں ایک گھریلو قسم کی ادبی تنظیم "سلسلہ" کے نام سے قائم کر رکھی تھی۔ انہوں نے مجھ پر ایسا دباؤ ڈالا کہ مجھے اس تنظیم کے ماہانہ اجلاس میں "شہاب نامہ" کا ایک باب سنانا پڑتا تھا۔ جب وہ کراچی چلی گئیں' تو محترمہ نثار عزیز بٹ نے بھی یہی سلسلہ جاری رکھا۔ اس کتاب کے ابتدائی چند باب انہی محفلوں کے لیے لکھے گئے۔ اس سے میرا ست رفتار قلم کسی قدر تیزی سے رواں ہو گیا۔ "سلسلہ" بند ہونے کے بعد جواں سال ادیبوں کی ایک ایسی ہی تنظیم "رابطہ" نے بھی میری اسی طرح مدد کی۔

حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد نے مجھے اپنی چند نشستوں میں اس کتاب کے کچھ باب سنانے کی دعوت دی۔ ان نشستوں میں پرانی اور نئی نسل کے ہونہار ادیبوں کی تنقید اور تعریف اور بحث مباحثہ نے میری رہنمائی کی اور اس طرح مجھے اپنی تحریر میں بہت سی اصلاحیں کرنے کا موقع نصیب ہوا۔

نیپا (NIPA) کراچی اور پشاور میں بھی مجھے کچھ باب سنانے کا موقع ملا۔ ان اداروں میں تربیت پانے والے سینئر سرکاری افسران کا رد عمل میرے بہت کام آیا۔

سیارہ ڈائجسٹ' معاصر' دستاویز' نیا دور اور تخلیقی ادب جیسے رسالوں میں میرے کچھ باب شائع ہوئے۔ انہیں پڑھ کر بہت سے قارئین نے اپنے خطوں سے میری بڑی ہمت بڑھائی۔

ان میں کچھ خطوط ایسے قد آور ادیبوں کی جانب سے بھی تھے جن کی قدر افزائی میرے لیے باعث افتخار ہے۔

اس کتاب کا پورا مسودہ ممتاز مفتی' بانو قدسیہ اور اشفاق احمد نے حرف بہ حرف پڑھ کر اپنی مثبت تجاویز سے قدم قدم پر رہنمائی فرمائی ہے۔

ان سب اداروں' رسائل اور احباب کا لفظی شکریہ ادا کر کے میں ایک فرسودہ رسم دہرانا نہیں چاہتا۔ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں ان سب کا کس قدر ممنون احسان ہوں۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو خوش اور خوشحال رکھے۔

○○○

کہنے لگے۔ "پلیگ کا چوہا' پلیگ کا چوہا' گھر جا کر جلدی نہادو' ورنہ گلٹی نکل آئے گی۔"

ان لوگوں نے بھی پلیگ کی جملہ علامات پر حسب توفیق روشنی ڈالی اور میرے علم میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔

ان دنوں جموں شہر میں ہر روز دس دس پندرہ پندرہ لوگ طاؤن سے مرتے تھے۔ گلی کوچوں میں چاروں طرف خوف ہی خوف چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ گاہک دکانوں کا کن انکھیوں سے جائزہ لیتے تھے کہ کہیں بوریوں اور ڈبوں اور کنستروں کے آس پاس چوہے تو نہیں گھوم رہے۔ دکاندار گاہکوں کو شک و شبہ سے گھورتے تھے کہ ان کے ہاں پلیگ کا کیس تو نہیں ہوا۔ لوگوں نے ایک دوسرے کے گھر آنا جانا اور ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ سڑک پر راہگیر ایک دوسرے سے دامن بچا بچا کر چلتے تھے۔ شہر کا ہر مکان دوسروں سے کٹ کٹا کر الگ تھلگ ایک قلعہ سا بنا ہوا تھا۔ جس میں پھٹی پھٹی سہمی سہمی آنکھوں والے محصور لوگ چپ چاپ اپنی اپنی گلٹی کا انتظار کر رہے تھے۔ میونسپل کمیٹی والے در و دیوار سونگھ سونگھ کر پلیگ کے مریضوں کا سراغ لگاتے تھے۔ جہاں ان کا چھاپہ کامیاب رہتا تھا' وہاں وہ علی بابا چالیس چور کی مرجینا کی طرح دروازے پر سفید چونے کا نشان لگا دیتے تھے۔ تھوڑی بہت رشوت دے کر یہ نشان اپنے مکان سے مٹوایا اور اغیار کے دروازوں پر لگوایا بھی جا سکتا تھا۔ پلیگ کے عذاب میں مبتلا ہو کر مریض تو اکثر موت کی سزا پاتا تھا' باقی گھر والے مفرور مجرموں کی طرح منہ چھپائے پھرتے تھے۔ ایک دوسرے کو ہاتھ ملانے کا رواج بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ لوگ دور ہی دور سے سلام دعا کر کے رسم مروت پوری کر لیتے تھے۔

یکے بعد دیگرے دو طاؤن زدہ چوہوں کو ہاتھ لگانے کے باوجود جب میرے تن بدن میں کوئی گلٹی نمودار نہ ہوئی تو میرا دل شیر ہو گیا۔ اپنے ارد گرد سہمے ہوئے' ہراساں چہرے دیکھ کر ہنسی آنے لگی۔ اور ان کی بے بسی سے شہ پا کر رفتہ رفتہ میرے دل میں خوف کی جگہ نئے نئے منصوبے سر اٹھانے لگے۔

• جموں میں پلیگ

گرمیوں کا موسم تھا اور جموں شہر میں طاؤن کی وبا بڑی شدت سے پھوٹی ہوئی تھی۔ اکبر اسلامیہ ہائی سکول میں چوتھی جماعت کے کلاس روم کی صفائی کا کام میرے ذمہ تھا۔

ایک روز چھٹی کے بعد جب میں اکیلا کمرے کی صفائی کر رہا تھا' تو ایک ڈیسک کے نیچے ایک چوہا مرا پڑا ملا۔ میں نے اسے دم سے پکڑ کر اٹھایا' باہر لا کر اسے زور سے ہوا میں گھمایا اور سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر لال دین زور سے پھنکارا' اور اپنی لنگڑی ٹانگ گھسیٹتا ہوا دور کھڑا ہو کر زور زور سے چلانے لگا۔

لال دین ہمارے سکول کا واحد چپڑاسی تھا۔ وہ گھنٹی بھی بجاتا تھا' لڑکوں کو پانی بھی پلاتا تھا اور چھابڑی لگا کر بسکٹ اور باسی پکوڑیاں بھی بیچا کرتا تھا۔

"ارے بد بخت!" لال دین چلا رہا تھا۔ "یہ تو پلیگ کا چوہا تھا۔ اسے ہاتھ کیوں لگایا؟ اب خود بھی مرو گے' ہمیں بھی مارو گے۔"

اپنی لاٹھی پر ٹیک لگا کر کھڑے ہی کھڑے لال دین نے پلیگ کے مرض پر ایک مفصل تقریر کر ڈالی۔ پہلے تیز بخار چڑھے گا۔ پھر طاؤن کی گلٹی نمودار ہو گی۔ رفتہ رفتہ وہ مکئی کے بھٹے جتنی بڑی نمودار ہو گی۔ جسم سوج کر کپا ہو جائے گا۔ ناک' کان اور منہ سے خون ٹپکے گا۔ گلٹی سے پیپ بہے گی اور چار پانچ دن میں اللہ خیر سلا ...... ہو جائے گی۔

چند روز بعد میں ریذیڈنسی روڈ پر گھوم رہا تھا کہ اچانک ایک چوہا تیز تیز بھاگتا ہوا سڑک پر آیا۔ کچھ دیر رک کر وہ شرابیوں کی طرح جھوم جھام کر لڑکھڑایا۔ دو چار بار زمین پر لوٹ لگائی اور پھر دھپ سے اوندھے منہ لیٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اسے پاؤں سے ہلایا تو وہ مر چکا تھا۔ بے خیالی میں میں نے اسے دم سے پکڑا اور اٹھا کر سڑک کے کنارے ڈال دیا۔ چند راہگیر جو دور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے' پکار پکار کر

رگھو ناتھ بازار میں حکیم گوراندتہ مل کی دکان تھی۔ ایک روز حکیم صاحب اپنی کرسی پر اکیلے بیٹھے اپنی ناک پر بار بار بیٹھنے والی مکھیاں اڑا رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور گھبراہٹ کے لہجے میں بولا۔ "حکیم صاحب! پلیگ کی دوا چاہیے۔ بہت جلد"

پلیگ کا نام سن کر حکیم صاحب چونکے اور ڈانٹ کر کہنے لگے۔ "چھاتی پر کیوں چڑھے آتے ہو؟ دور کھڑے ہو کر بات کرو۔ کس کو پلیگ ہے؟"

میں نے روئی کا گالہ ٹنکچر آیوڈین میں تر کر کے ایک میلی سی پٹی کے ساتھ اپنی بغل میں باندھا ہوا تھا۔ میں کھسک کر حکیم صاحب کے اور بھی قریب ہو گیا اور آستین میں سے بازو نکال کر اپنی بغل معائنہ کے لیے ان کے منہ کے قریب لانے لگا' تو ان کی آنکھیں خوف سے ابل کر باہر کی طرف لڑھک آئیں۔

حکیم صاحب بوکھلا کر اتنے زور سے اٹھے' کہ کرسی کھٹاک سے الٹ کر پیچھے کی طرف گر گئی۔ دکان کے اندر دور کھڑے ہو کر وہ چیخنے لگے۔ "یہ دکان ہے دکان' چھوت کی بیماریوں کا ہسپتال نہیں۔ فوراً باہر نکلو اور ہسپتال جا کر حاضر ہو جاؤ۔ ورنہ بلاتا ہوں ابھی پولیس والوں کو۔"

حکیم صاحب کی میز پر گلقند کا مرتبان پڑا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ڈھکنا اٹھایا اور شیرے میں لت پت گلقند کی ایک مٹھی بھر کر دکان سے باہر چلا آیا۔

حکیم گوندراتہ کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ دکان کی کوئی چیز ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ ایک بار روغن بادام کی کھلے منہ والی بوتل میں مردہ چھپکلی نظر آئی۔ حکیم صاحب نے چمٹے سے پکڑ کر اسے نکال' اور کچھ دیر تک اسے بوتل کے منہ پر الٹا لٹکائے رکھا تا کہ چھپکلی سے ٹپکتے ہوئے بادام روغن کے زیادہ سے زیادہ قطرے بوتل میں واپس گر جائیں۔

حکیم صاحب پر اس کامیاب بلیک میل نے میری ہمت بڑھائی اور حوصلہ بلند کر دیا۔ لوگوں

کی باتیں سن کر دیواروں پر لگے ہوئے محکمہ حفظان صحت کے ہدایت نامے پڑھ پڑھا کر اور پھر خود اپنی روشنی طبع کو خوفناک حد تک بروئے کار لا کر میں نے پلیگ کی علامات' کوائف اور نتائج پر خاصی طویل اور ہولناک قسم کی تقریر ازبر کر رکھی تھی۔ اسے اکا دکا لوگوں پر آزمایا تو نتیجہ خاطر خواہ پایا۔ اچھے اچھے صحت مند اور وضع دار قسم کے بزرگ پلیگ کے ذکر اذکار پر کسی نہ کسی منزل پر پھسل جاتے تھے' اور دفعۃً ان کے متین و فطین چہروں پر توہمات کے کالے کالے کوے بڑے زور و شور سے کائیں کائیں کرنے لگتے تھے۔ موقعوں پر مجھے کامیابی و کامرانی کا وہ نشہ سرشار کر جاتا تھا' جو قوالوں کی پارٹی اس وقت محسوس کرتی ہے جب ان کے کسی بول پر کوئی بے اختیار اٹھ کر حال کھیلنے لگ پڑے۔

سکول میں مولوی عبدالحنان ہمارے اردو اور دینیات کے جواں سال استاد تھے۔ بڑے خوش مزاج' بذلہ سنج اور مہربان۔ گورا رنگ' تیکھا ناک نقشہ' سنہری فرنچ کٹ داڑھی' نرم نرم مترنم آواز' دیدہ زیب خوش قطع لباس۔ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ سبق پڑھاتے پڑھاتے وہ وقتاً فوقتاً اچانک خاموش ہو جاتے تھے اور آنکھیں بند کر کے جھوم جھوم کر فرمایا کرتے تھے۔ "سبحان اللہ' سبحان اللہ -------- زندگی بھی عجیب نعمت ہے۔"

ایک روز مولوی عبدالحنان کلاس میں آئے تو بجھے بجھے سے تھے۔ وہ دونوں ٹانگیں میز پر پسار کر کرسی میں نیم دراز ہو گئے اور آنکھیں میچ کر اداسی سے کہا۔ آج طبیعت بحال نہیں۔ سبق نہ ہو گا۔"

باقی لڑکے تو ہنسی خوشی کھیل کود میں مصروف ہو گئے اور میں اپنے چہرے پر فکرمندی کی قلعی کر کے بڑی سنجیدگی سے مولوی صاحب کے قدموں میں آ بیٹھا۔ ان کے نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ کان تمتمائے ہوئے تھے اور چہرے بشرے پر ہراس و وسواس کی چمگادڑیں الٹی لٹکی ہوئی تھیں۔ کیس امید افزا تھا۔ اس لیے دو تین بار میں نے کوشش کی کہ انہیں شہر میں طاؤن کی کچھ تازہ خبریں سناؤں۔ لیکن

ہر بار انہوں نے مجھے سختی سے جھڑک کر خاموش کر دیا۔ یہ حربہ کارگر نہ ہوتے دیکھ کر میں نے لال دین چپڑاسی سے شکایت شروع کر دی' کہ وہ سکول کی صفائی کا خاطر خواہ دھیان نہیں رکھتا۔

"خواہ مخواہ لال دین کی چغلی کیوں کھاتے ہو؟" مولوی صاحب نے درشتی سے کہا۔ "کیا کیا ہے اس بیچارے نے؟"

"دیکھئے نا' مولوی صاحب" میں نے گلہ کیا۔ "ہمارے اس کلاس روم میں بھی پلیگ کا چوہا مرا پڑا تھا۔"

تیر نشانے بیٹھا اور مولوی صاحب زور کا جھٹکا دے کر کرسی سے یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے طاؤن زدہ چوہا ابھی تک وہیں پڑا ہو۔ انہوں نے کئی بار استغفراللہ پڑھا اور غصے میں بھرے ہوئے غالباً لال دین کی تلاش میں کمرے سے نکل گئے۔

اس کے بعد وہ دو روز سکول نہ آئے۔ تیسرے روز میں ان کی حالت کا سراغ لگانے ان کے گھر گیا۔ مولوی صاحب چادر لپیٹے چارپائی پر ادھ موئے سے پڑے تھے۔ اور ایک پتلی سی نئی نویلی دلہن ایک طرف بیٹھی انہیں پنکھا کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی کا رنگ رچا ہوا تھا۔ پنکھے کی ڈنڈی بھی سرخ تھی۔ جب وہ ہاتھ ہلاتی تھی تو ایسے لگتا تھا کہ مولوی صاحب کی سنہری داڑھی پر خون کی پھوار پڑنے لگے گی۔

مولوی صاحب مجھے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ صادقہ بیگم نے اپنے ہاتھ سے دیسی شکر کے شربت میں ستو گھول کر مجھے پینے کو دیئے۔ پھر اس نے ایک ٹوکری اور کچھ پیسے میرے حوالے کئے کہ بازار سے آلو' مٹر' دھنیا اور گوشت خرید لاؤں۔ سودا سلف خریدنے کا مجھے تجربہ نہ تھا۔ لیکن میں نے بڑی محنت سے خریداری کی اور واپس آ کر ہر چیز کا بھاؤ' اس کی اصلی قیمت سے کافی کم بتایا۔ پیسوں کا فرق میں نے اپنی پاکٹ منی ملا کر پورا کر دیا۔ صادقہ بیگم خوش ہوئی اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ "واہ کاکا' تم تو بڑے ہوشیار نکلے۔ بڑی اچھی خریداری کرتے ہو۔ مولوی صاحب کو دیکھنے آ جایا کرو اور مجھے سودا بھی لا دیا کرو۔"

صادقہ بیگم کے حکم کی یہ شان نزول مجھے بڑی اچھی لگی۔ اب میں سکول جانے کی بجائے ہر روز سیدھا مولوی صاحب کے ہاں پہنچتا۔ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر پاکٹ منی کے علاوہ گھر سے کچھ فالتو پیسے حاصل کرتا اور بڑی محنت سے صادقہ بیگم کے سودا سلف میں سبسڈی لگاتا۔

مولوی صاحب سے رسمی مزاج پرسی کرنے کے بعد میں صادقہ بیگم کے پاس باورچی خانہ میں جا بیٹھتا' کبھی مٹر کی پھلیاں چھیلتا' کبھی پیاز کاٹتا' کبھی مصالحہ پیستا اور جو کام بھی وہ شروع کرتی میں بھاگ بھاگ کر اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا۔

ایک روز جب میں ان کے ہاں پہنچا تو صادقہ بیگم نہا دھو کر نئے کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔ کالے ریشم کا برقعہ پاس رکھا تھا۔ مولوی صاحب منہ سر لپیٹے خاموش پڑے تھے۔ میں نے حال پوچھا تو انہوں نے چادر کے اندر ہی سے کراہ کر کہا۔ "اللہ' اللہ' حال اچھا نہیں۔"

"گلٹی نکل آئی؟" میں نے پر امید شوق سے پوچھا۔

"تیرے منہ میں خاک" صادقہ بیگم غصے سے پھنکاری۔ "گلٹی کی بیماری تھوڑا ہے' ایسے ہی ذرا سا بخار ہے۔"

اس کی آنکھوں میں جو نیلی نیلی مخمل سی بچھی تھی' اس پر آنسو پھیل گئے -------- جس طرح شبنم کے قطرے چوٹ کھا کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور اپنے مہندی رنگے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگی۔ اس نے اخروٹ کی چھال سے دانت صاف کئے ہوئے تھے اور اس کے پتلے پتلے ہونٹ سرخی سے گلنار ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے پر سونے اور چاندی کے ورق ہی ورق بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے وہ ابھی بیسن اور دہی اور دودھ سے نہا کر بیٹھی ہو۔ دعا کے بعد اس نے مولوی صاحب پر دم کیا۔ کالے ریشم کا برقع یوں اوڑھا جیسے گڑیا کو فراک پہنایا جاتا ہے' اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ "کاکا' میرے ساتھ چلو گے؟"

میں خوشی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے مجھے کوہ قاف پر چلنے کی دعوت مل رہی ہو۔

"روشن شاہ ولی کے مزار پر نیاز چڑھانے جانا ہے۔" صادقہ بیگم نے کہا۔ "تم بھی میرے

ساتھ چلو۔"

روشن شاہ ولی کا نام میں نے سن رکھا تھا۔ دور ہی دور سے ان کے مزار کی زیارت بھی کر چکا تھا۔ سنگ مرمر کے بلند چبوترے پر ایک بڑی سی قبر تھی جس پر سبز غلاف چڑھا رہتا تھا۔ رات کو سرہانے کئی چراغ جلتے تھے۔ مسلمان تو اندر جا کر فاتحہ درود پڑھتے تھے یا نذر نیاز چڑھاتے تھے لیکن کئی ہندو ڈوگرے بھی شیشے کی طرح چمکتی ہوئی چار دیواری پر ہاتھ پھیر کر عقیدت مندی سے مزار کو سلام کیا کرتے تھے۔ میں نے بڑی پھرتی سے صادقہ بیگم کو یقین دلایا کہ میں روشن شاہ ولی کے مزار کا راستہ بخوبی جانتا ہوں اور اسے بڑی آسانی سے وہاں لے جاؤں گا۔

چینی کی ایک طشتری میں نیاز کا زردہ تیار تھا۔ صادقہ بیگم نے اسے جالی کے رومال سے ڈھانپ کر میرے حوالے کیا۔ میں نے اظہار عقیدت کے طور پر اپنے منہ کو زیادہ سے زیادہ سکیڑ کر گول کیا اور زور سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر طشتری کو احتراماً دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ مزار پر چڑھانے کے لیے کورے لٹھے کی ایک چادر تہہ کر کے صادقہ بیگم نے اپنے پاس رکھ لی۔ مولوی صاحب کے محلے سے نکل کر ہم نے مزار کے لیے سالم تانگہ کرایہ پر لیا۔ میری کوشش تو یہی تھی کہ میں پچھلی سیٹ پر عین صادقہ بیگم کے ساتھ بیٹھوں لیکن بیلنس رکھنے کے لیے تانگہ والے نے مجھے آگے بیٹھنے کا حکم دیا۔ پہلے تو میں بڑا آزردہ ہوا لیکن جب پکی سڑک آئی تو مزا آنے لگا۔ دھوپ کی تمازت سے سڑک پر بچھی ہوئی کول تار پگھل پگھل کر رضائی کی طرح نرم ہو گئی تھی۔ اس پر سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی تھپ تھپاہٹ' ربڑ کے ٹائر پہیوں کی لرزاں لرزاں تھرتھراہٹ اور پچھلی سیٹ پر ہوا میں اڑتے ہوئے کالے ریشمی برقع کی سرسراہٹ میرے کانوں میں ہارمونیم اور طبلہ اور ستار بجانے لگی۔ میرا دل اندر ہی اندر گیت گانے

لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے میں تانگے سے چھلانگ لگا کر تخت سلیمان پر جا بیٹھا جسے جن اور پریاں ہر وقت اپنے کندھوں پر اٹھائے اڑتے رہتے تھے۔ باہر سڑک پر چلتی پھرتی ساری مخلوق مجھے بڑی اداس، بے حد حقیر، بڑی مفلس اور لا انتہا محرومیوں کی ماری ہوئی نظر آنے لگی۔ اپنی خوش بختی اور خوش وقتی کی ترنگ میں سرشار ہو کر میں نے بے اختیار جالی کا رومال ایک طرف سرکایا اور زور دے کر بڑے بڑے نوالے مزے لے لے کر کھانے لگا۔ یہ دیکھ کر تانگے والا زور سے غرایا اور چلا چلا کر صادقہ بیگم سے کہنے لگا۔

"بی بی جی! یہ دیکھو، تمہارا لونڈا نیاز جوٹھی کر رہا ہے۔ اب تمہاری منت خاک پوری ہو گی!"

صادقہ بیگم نے برقع اٹھا کر بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پھر شبنم کے موتی بن بن کر لوٹنے لگے۔ میں گم کردہ راہ کتے کی طرح گردن ڈال کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

جب ہم روشن شاہ ولی پہنچے تو صادقہ بیگم مایوسی سے مزار کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

"کاکا، یہ تو نے کیا کیا؟" وہ بولی۔ "نیاز جوٹھی کر دی۔ اب ہم مزار شریف پر کیا چڑھائیں گے؟"

اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے، جیسے شمع سے موم کے گرم گرم قطرے تیز تیز قطار در قطار ٹپکتے ہیں۔ میں نے بھی اپنا سر اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا اور زار زار رونے لگا۔ ہمیں روتا دیکھ کر مزار کا ایک ملنگ اٹھ کر آیا اور گرجدار آواز میں بولا۔ "بالکوں کی خیر -------- پیر دستگیر سب مرادیں پوری کرے، بی بی لاؤ تمہارا نذرانہ حضور میں پیش کر دوں۔"

موقع غنیمت جان کر میں نے زردے کی پلیٹ اس کے حوالے کر دی۔ صادقہ بیگم نے لٹھے کی چادر پیش کی۔ ملنگ نے چادر کھول کر اسے اپنے بازوؤں سے ناپا اور مایوسانہ انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "بہت چھوٹی چادر ہے۔ بی بی دیکھتی نہیں ہو بڑی سرکار کا

مزار بھی کتنا بڑا ہے؟"

صادقہ بیگم بے بسی سے سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ ملنگ کو شاید ترس آ گیا۔ اس نے کہا۔ "اچھا بی بی' سوا روپیہ ساتھ چڑھا دو۔ اللہ بادشاہ قبول کرے گا۔"

صادقہ بیگم نے اپنی ریزگاری گنی۔ دو ڈھائی آنے میں نے ڈالے اور بڑی مشکل سے سوا روپیہ پورا کر کے ملنگ کے حوالے کیا۔

واپسی پر ہمارے پاس تانگے کا کرایہ نہ تھا۔ میری جیب میں فقط ڈیڑھ آنہ باقی تھا۔ رگھوناتھ بازار کے نکڑ پر پان والے کی دکان آئی تو میں بھاگ کر دو پیسے کے دو میٹھے پان پڑیا میں بندھوا لایا۔ سبزی منڈی میں بیروں کے ٹوکرے ہی ٹوکرے پڑے تھے۔ میں نے دو پیسے کے ڈھیر سارے بیر تلوا کر اپنی ٹوپی میں ڈلوا لیے۔ اب ہم بیر بھی کھاتے جاتے تھے اور مزے مزے کی باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ میں جان بوجھ کر لمبے لمبے راستے اختیار کرتا تھا تا کہ ہمارا سفر طویل تر ہوتا جائے۔ ایک کوچے میں ملائی کی برف والی لکڑی کی صندوقچی بغل میں دبائے ہانک لگاتا پھر رہا تھا۔ میں نے لپک کر دو پیسے کی برف پیپل کے پتے پر رکھوائی اور بھاگ کر صادقہ بیگم کو دے دی۔ اس نے برقع کے اندر ہی اندر جلدی جلدی برف کھا لی۔ پتہ میں نے چاٹ لیا۔ جب ہم منڈی میں مہاراجہ کے پرانے محلات کے نزدیک آئے' تو میری جیب خالی تھی۔ ورنہ صادقہ بیگم کے لیے ایک آدھ راج محل خریدنے کا خیال بھی ضرور آتا۔ مولوی صاحب کا محلّہ سامنے آیا تو دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ اللہ کرے ہمارے پہنچنے تک مولوی صاحب مر گئے ہوں۔ اور میں صادقہ بیگم کے ساتھ اسی طرح گلی گلی' کوچہ کوچہ پان چباتا' بیر کھاتا' برف اڑاتا گھومتا پھرتا رہوں۔ لیکن افسوس کہ مولوی صاحب زندہ سلامت تھے اور بدستور چارپائی پر سر منہ لپیٹے اپنی گلٹی کا انتظار کر رہے تھے۔

اس رات مجھے پوری طرح نیند نہ آئی۔ ذرا سی آنکھ لگتی تو رنگ برنگ خوابوں کے اڑن کھٹولے مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ پٹخ دیتے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو میں نے

جلدی جلدی اپنا بستہ سنبھالا اور بھاگتا دوڑتا سیدھا مولوی صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ خود تو موجود نہ تھے لیکن ان کی چارپائی پر صادقہ بیگم ململ کا دوپٹہ اوڑھے گہری نیند سو رہی

تھی۔ میں باورچی خانے میں گیا تو مولوی صاحب وہاں بھی نہ تھے۔ دوسرا کمرہ دیکھا' وہ بھی خالی تھا۔ میرے دل میں امید کا ایک چھوٹا سا سانپ خوشی سے لہرایا کہ شاید مولوی صاحب مر گئے ہوں اور راتوں رات انہیں دفن بھی کر دیا ہو۔ لیکن پھر اچانک پچھلی کوٹھڑی سے ان کی آواز آئی جیسے کوئی قبر کے اندر سے بول رہا ہو۔ "بیٹا' بات سننا۔"

میں بے صبری سے کوٹھڑی کی طرف لپکا اور بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "مولوی صاحب گلٹی نکل آئی؟"

"بک بک نہ کرو۔" مولوی صاحب نے مجھے جھڑکا۔ وہ اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں سب سے الگ تھلگ زمین پر اپنا بستر بچھائے بیٹھے تھے اور چائے میں باقر خانی بھگو بھگو کر ناشتہ کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے کوٹھڑی سے باہر ہی باہر رہنے کی تلقین کی اور بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ "صادقہ بیگم کو تیز بخار ہے۔ رات سے دائیں بغل میں طاؤن کی گلٹی بھی نمودار ہو گئی ہے۔ اس کے ماں باپ کو خبر پہنچا دی ہے۔ وہ بھی آتے ہی ہوں گے۔ بیٹا! اس وقت تک تم بی بی کے پاس بیٹھو' اور اس کی خبر گیری کرو۔" مولوی صاحب نے میری طرف کچھ پیسے پھینک کر کہا۔ "بازار سے برف لے آؤ۔" بی بی کے سر پر رکھو اور شربت بنا کر پلاؤ۔ گلاس باہر گلی کے نلکے پر دھونا' اور اس پلنگ کے پاس الگ رکھ دینا۔ باورچی خانے میں دوسرے برتنوں کے ساتھ نہ ملا دینا۔"

برف لا کر میں نے ایک ڈلی توڑی اور صابن کی طرح اسے صادقہ بیگم کے ماتھے پر ملنے لگا۔ برف کا ٹکڑا گرم گرم توے پر رکھی ہوئی مکھن کی ٹکیہ کی طرح پگھل گیا۔ اور اس کا پانی چھوٹے چھوٹے پرنالوں کی طرح اس کی آنکھوں اور کانوں اور گالوں پر بہنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد صادقہ بیگم نے آنکھیں کھول کر مجھے حیرت سے گھورا اور پھر

ہاتھ سے دھکیل کر مجھے اپنی چارپائی سے اٹھا دیا۔

"ہائے ہائے کاکا' میرے پاس نہ بیٹھو۔ میرے تو پلیگ نکل آئی ہے۔ اللہ تمہیں حفاظت میں رکھے۔"

میں نے جلدی جلدی اٹھ کر شربت بنایا۔ بہت سی برف کوٹ کر اس میں ڈالی۔ صادقہ بیگم غٹ غٹ سارا گلاس ایک ہی سانس میں پی گئی۔ میں دوسرا گلاس بنانے لگا' تو اس نے روک دیا۔ "بس بس کاکا' ابھی نہیں۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

وہ بڑی دیر تک بستر پر لیٹی چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ "میرا منہ بہت کڑوا ہو رہا ہے۔ کاکا مجھے ایک میٹھا پان لا دو گے؟"

وہ مجھے دینے کے لیے جیب سے کچھ پیسے نکالنے لگی۔ لیکن میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ رگھوناتھ بازار وہاں سے دو ڈھائی میل دور تھا۔ میں بھاگم بھاگ اسی دکان پر پہنچا جہاں سے ہم نے کل بھی میٹھے پان کھائے تھے۔ چار پان خریدے۔ اور اسی طرح ہانپتا کانپتا واپس پہنچا تو صادقہ بیگم کے میکے والوں نے گھر پر چڑھائی کر رکھی تھی۔ تین چار لوگ اس کی چارپائی کے گرد حصار باندھے بیٹھے تھے۔ دو عورتیں باورچی خانے پر قابض تھیں۔ میں پانوں کی پڑیا صادقہ بیگم کو دینے لگا' تو اس کے والد نے مجھے ڈانٹ دیا اور پڑیا میرے ہاتھ سے چھین لی۔

میں کچھ دیر عضو معطل کی طرح بیکار ادھر ادھر گھومتا رہا۔ پھر مولوی صاحب سے بات کرنے پچھلی کوٹھڑی کی طرف گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک چادر لپیٹے بے حس و حرکت لیٹے ہوئے تھے۔ میری آواز سن کر انہوں نے ایک ہاتھ چادر سے نکال کر سرخ جھنڈی کی طرح ہلایا اور مجھے باہر ہی باہر سے دور دفع ہو جانے کو کہا۔ کافی دیر جب کسی نے بھی میرا کوئی نوٹس نہ لیا' تو میں مجبور ہو کر گھر آ گیا۔

رات کو میں نے ماں جی کو بتایا کہ ہمارے دینیات کے ماسٹر صاحب کی بیوی کو پلیگ ہو گئی ہے۔ مولوی صاحب کو بھی گلٹی نکلنے ہی والی ہے۔ میں نے ان کے لیے منت

مانی ہے۔ اس لیے مجھے وہ روشن شاہ ولی کی نیاز پکا دیں۔

"یا اللہ سب کی خیر" ماں جی نے کہا۔ "میں صبح سویرے نیاز پکا دوں گی۔ سکول جاتے ہوئے مزار شریف پر چڑھاتے جانا۔ دعا بھی مانگنا۔ لیکن بیٹا! خبردار' ان کے گھر بالکل نہ جانا۔ یہ چھوت چھات کی بیماری ہے۔ اللہ سب پر اپنا رحم کرے۔"

صبح صبح ماں جی نے کشمش' خوبانی کی گریاں اور ناریل ڈال کر گڑ کے چاول پکائے اور نیاز کے لیے مٹی کے ایک بڑے سے پیالے میں ڈال دیئے۔ پھر انھوں نے سفید چھبیس کی ململ کا ایک نیا دوپٹہ نکالا اور مزار پر چڑھانے کے لیے اسے تہہ کر کے پیالے پر ڈال دیا۔ میں ایک ہاتھ میں سکول کا بستہ اور دوسرے ہاتھ میں نیاز کا پیالہ لے کر خوشی خوشی گھر سے نکلا۔ لیکن روشن شاہ ولی تک پہنچتے پہنچتے میری ساری خوشی کافور ہو گئی۔ مجھے رہ رہ کر مزار کے ملنگ کا خیال آنے لگا' جس نے لٹھے کی چھوٹی چادر کو بڑے مزار پر چڑھانے کے لیے صادقہ بیگم سے سوا روپیہ جرمانہ بھی وصول کیا تھا۔ ململ کا دوپٹہ تو چادر سے بھی چھوٹا تھا۔ اول تو میرے پاس پیسے ہی نہ تھے۔ لیکن اگر ہوتے بھی تو انھیں خواہ مخواہ اس موٹے سے ملنگ پر ضائع کرنا میرا دل قبول نہ کرتا تھا۔

جونہی روشن شاہ ولی کے مزار پر مجھے ملنگ کا یہ بد صورت سا گدھ منڈلاتا نظر آیا۔ میرے دل سے آناً فاناً ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں نے مزار کو دور ہی دور سے سلام کیا۔ اور وہیں سڑک کے کنارے بیٹھ کر آدھے چاول خود کھا لیے اور باقی ایک کبڑی سی بڑھیا کو دے دیئے جو قریب ہی بیٹھی گوبر کے اپلے تھاپ رہی تھی۔

چھبیس کی ململ کا سفید دوپٹہ میں نے تہہ کر کے کتابوں کے درمیان اپنے بستے میں رکھ لیا۔ چلتے چلتے میں نے دل ہی دل میں کئی خیالی پلاؤ پکائے۔ ایک ارادہ تو یہ ہوا کہ میں سیدھا عطاء اللہ رنگریز کی دکان پر چلا جاؤں اور یہ دوپٹہ اسے رنگنے کے لیے دے دوں۔ عنابی' گلابی' فیروزی' کاسنی' انگوری' بسنتی۔ ایک ایک کر کے بہت سے رنگ میرے پردۂ خیال پر لہرائے۔ کوئی رنگ ایسا نہ تھا جو صادقہ بیگم پر پھول کی طرح کھلتا نہ ہو۔

میں نے بار بار اپنے ذہن پر بڑا زور دے کر سوچا کہ اسے خود کون سا رنگ پسند ہے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے اپنی پسند ناپسند کا کبھی ذکر اذکار ہی نہ کیا تھا۔

لیکن جس طرح ہو آج میں اس سے ضرور پوچھ کے رہوں گا' کہ اس کا سب سے زیادہ پسندیدہ رنگ کون سا ہے۔ اگر اس نے صاف صاف بتا دیا تو خیر -------- ورنہ دوسرا منصوبہ میں نے بنایا کہ میں یہ دوپٹہ دین محمد بٹ سے رنگوا لوں گا جو چنریوں اور صافوں پر رنگ برنگ لہریئے ڈالنے میں سارے شہر میں مشہور تھا۔ سکول کی استانیاں اور کالج کے لڑکے جب اس کی کاریگری سروں پر سجا کر باہر نکلتے تھے تو سڑکوں پر ہر طرف بہار ہی بہار آ جاتی تھی۔ دل ہی دل میں گونا گوں رنگوں' خوشبوؤں اور خیالوں کے تانے بانے بنتا جب میں مولوی صاحب کے گھر پہنچا تو شیخ چلی کے انڈوں کی ٹوکری کھٹاک سے زمین پر گر گئی۔ اس کا بنا بنایا کنبہ برباد ہو گیا۔ اس کے سجے سجائے گھروندے مسمار ہو گئے۔ کیونکہ ڈیوڑھی میں صادقہ بیگم کا جنازہ تیار رکھا تھا۔ اور آٹھ دس گدھ نما آدمی قبرستان چلنے کے لیے گلی میں منڈلا رہے تھے۔

میں گھبرا کر مولوی صاحب کی طرف بھاگا۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں چادر اوڑھے بیٹھے تھے اور رو رو کر قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر انہوں نے بائیں ہاتھ سے مجھے دھتکارا اور غصے سے چلائے۔ "میری طرف منہ اٹھائے کیوں چلے آ رہے ہو؟ جاؤ بی بی کے جنازے میں شرکت کرو۔"

انہوں نے قمیض کے دامن سے آنسو پونچھے اور کڑک کر کہا۔ نماز جنازہ کی نیت اور ارکان یاد ہیں یا بھول گئے؟ کئی بار پڑھا چکا ہوں۔"

"ہاں ہاں' یاد ہیں۔" میں نے بلند آواز سے کڑک کر جواب دیا۔ اور دبے لفظوں میں نماز جنازہ کی نیت' نماز جنازہ کے ارکان اور مولوی صاحب کی ماں بہن کو بڑی فحش گالیاں دیں۔

"یہ ہاں ہاں کیا ہوتا ہے؟" مولوی صاحب سانپ کی طرح پھنکارے۔ "جی نہیں کہا جاتا' سور کہیں کے!"

میں نے دل ہی دل میں انہیں چند اور گالیاں دیں اور پھر زبان باہر نکال کر ان کا منہ چڑا دیا۔ مولوی صاحب نے جھپٹ کر اپنا جوتا اٹھایا اور زور سے میری طرف پھینکا لیکن نشانہ خطا گیا۔

گھر سے تو جنازے کے ساتھ دس بارہ آدمی چلے تھے لیکن قبرستان تک پہنچتے پہنچتے صرف پانچ چھ ہی باقی رہ گئے۔ قبرستان میں خوب چہل پہل تھی۔ گورکن بھی خوب مصروف تھے۔ تین چار قبریں پاس پاس کھد رہی تھیں۔ انہوں نے بڑی پھرتی سے صادقہ بیگم کو لحد میں اتارا اور جلدی جلدی بیلچے چلا کر اس کے تن بدن پر بھوری بھوری مٹی کا اونچا سا انبار لگا دیا۔ ایک شخص نے پانی کا آدھا پیپا انڈیل کر قبر پر چھڑکاؤ کیا اور فاتحہ پڑھ کر سب لوگ لوٹ گئے۔

میں نے سوچا کہ اور کچھ نہیں تو چھبیس ململ کا دوپٹہ کم از کم صادقہ بیگم کے مزار پر ہی چڑھا دوں۔ لیکن دوسرے جنازوں کے کچھ لوگ آس پاس کھڑے تھے اس لیے میں جھینپ گیا اور اپنا بستہ بغل میں دبا کر چپ چاپ واپس چلا آیا۔

○○○

• نندہ بس سروس

جموں میں جب پلیگ کے کیس دن بہ دن بڑھتے ہی گئے تو گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ بچوں کو موت کے منہ سے محفوظ رکھنے کے لیے کچھ عرصہ کے لیے سری نگر بھیج دیا جائے۔

سری نگر کے لیے ہم نندہ بس سروس کی لاری میں سوار ہوئے۔ اس کے اندر اور باہر چاروں طرف موٹے موٹے حروف میں کالی اور سرخی سیاہی میں "نندہ ہاؤس بڑا زی سستی" کے اشتہار ہی اشتہار تھے۔ نندہ ہاؤس جموں کشمیر میں کپڑے کی سب سے بڑی اور کشادہ دکان تھی۔ اس میں آٹھ دس کارندے ہر وقت کام میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن دکان کے مالک نندہ صاحب خود بھی بنفس نفیس صبح سے شام تک بڑے انہماک سے کام کیا کرتے تھے۔ وہ بڑے فربہ تن و توش کے بے حد لحیم و شحیم آدمی تھے اور اپنا وزن قابو میں رکھنے کے لیے ہر روز علی الصبح باقاعدگی سے ورزش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ سڑک پر ایک دو فرلانگ لشتم پشتم چہل قدمی کیا کرتے تھے جس طرح بادبانی جہاز سطح آب پر ہچکولے کھاتا ہے۔ اور پھر لکڑی کی دو ڈھائی فٹ اونچی چوکی پر کھڑے ہو کر بر سر عام دس بارہ چھلانگیں لگایا کرتے تھے۔ حفظان صحت کے ان تقاضوں کو پورا کر کے نندہ صاحب اپنی دکان کے فرش پر ٹانگیں پسار کر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ جاتے تھے۔ گاہک چھوٹا ہو یا بڑا' امیر ہو یا غریب' ہزاروں کے مال کا خریدار ہو یا دو تین گز ململ کا طلبگار' نندہ صاحب سب کے ساتھ یکساں اخلاق' انہماک اور خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ ان کے کارندے گاہکوں کے سامنے کپڑوں کے تھانوں پر تھان کھول کھول کر ڈھیر لگاتے جاتے تھے' اور چھوٹے سے چھوٹا گاہک بھی وہاں سے عزت نفس کا ایسا احساس لے کر اٹھتا تھا کہ پھر عمر بھر اس کے لیے کسی اور دکان کا منہ دیکھنا

ہندو تنظیمیں ان کی مالی اعانت کی مرہون منت تھیں۔ خاص طور پر ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ کے تربیتی اکھاڑوں پر ان کی بڑی نظر عنایت تھی۔ ان اکھاڑوں میں ہندو نوجوانوں کو جنگی کرتب سکھائے جاتے تھے تا کہ مسلمانوں کے ساتھ مقابلے میں وہ ان پر ہمیشہ غالب آئیں۔ ایک خفیہ کلب میں ہندوؤں کو خصوصی ٹریننگ دے کر جوانوں کا ہراول دستہ تیار کیا جاتا تھا کہ جب مسلمان عید میلاد النبی کا جلوس نکالیں تو اس پر حملہ کر کے اسے درہم برہم کر دیا جائے۔ ننده صاحب ان تمام انتظامات کی بڑی خاموشی اور خوشدلی سے سرپرستی فرماتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ عید میلاد النبی اور محرم کے جلوسوں کے پانی کی کچھ سبیلیں بھی وہ بڑی باقاعدگی سے لگایا کرتے تھے۔

ننده بس سروس کی جس لاری میں ہم سوار ہوئے' اس میں پندرہ کے قریب اور مسافر بھی تھے۔ ایک پرنس آف ویلز کالج کا کشمیری پنڈت پروفیسر تھا۔ جو اپنی پنڈتانی کے ساتھ گرمی تعطیلات گزارنے سری نگر جا رہا تھا۔ اس شدت کی گرمی میں پنڈتانی نے ابھی سے اونی فرن پہن رکھا تھا' اور سر سے پاؤں تک پشمینے کی گرم چادر اوڑھی ہوئی تھی' اس کے ایک ہاتھ میں پانی کی گڑوی تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک کانگڑی تھی۔ کانگڑی نصف کے قریب راکھ سے بھری ہوئی تھی' تا کہ پیچ در پیچ پہاڑی سڑک کے موڑوں پر جب پنڈتانی کا جی متلائے تو وہ بے تکلفی سے اس میں قے کرتی جائے۔

ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کی گوری چٹی' بھاری بھر کم عورت چنار کے درخت کی طرح پھیلی ہوئی تھی جس پر خزاں کے موسم میں پت جھڑ کا عمل تیز رفتاری سے شروع ہو چکا تھا۔ اس کا آدمی اس کے عین پیچھے والی سیٹ پر براجمان تھا۔ اس نے گیبرڈین کی برجس اور بند گلے کا چست کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر سلیٹی رنگ کی ترچھی فیلٹ ہیٹ تھی جس میں مور کے کئی پر آویزاں تھے۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی سیاہ عینک تھی۔ کندھے سے براؤن چرمی تھیلا لٹک رہا تھا۔ جس میں کیمرہ' دوربین' ٹافیاں اور شراب کی ایک لمبی سی بوتل تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ اس بوتل سے چسکی

دشوار ہو جاتا تھا۔ یوں بھی تھان میں سے کپڑا پھاڑتے وقت نندہ صاحب ایک دو انگل کپڑا گاہک کے حصے میں بڑھا دیتے تھے' اور قیمت کے مول تول میں کچھ ایسا ہنس مکھ رویہ اختیار کرتے تھے گویا ان کا اصلی مقصد منافع کمانا نہیں بلکہ خریدار کا دل خوش کرنا ہے۔ کاروبار کی اس خوش کاری کے ساتھ ساتھ نندہ صاحب کو اشتہار بازی کے فن پر بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ شہر اور گاؤں کے در و دیوار ہوں یا جنگل میں درختوں کے تنے' دور دراز ویرانوں میں پتھریلی چٹانیں ہوں' یا آبادیوں میں بجلی کے کھمبے' ہر جگہ کونے کونے اور گوشے گوشے میں "نندہ ہاؤس بزازی سستی" کا کتبہ موٹے موٹے حروف میں نگاہوں کا تعاقب کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نندہ صاحب کے کاروبار کو چار چاند لگ گئے۔ بزازی کی دکان تو دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ اب انہوں نے لاہور سے جموں اور جموں سے سری نگر تک ایک منظم بس اور ٹیکسی سروس بھی شروع کر دی تھی۔ ساتھ ہی جموں میں پہلا سینما ہال بنانے اور چلانے کا سہرا بھی ان ہی کے سر رہا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی خوشامد میں انہوں نے اس کا نام "ہری ٹاکیز" رکھا۔

چاپلوسی اور خوشامد کے فن میں بھی نندہ صاحب بڑے اہل کمال تھے۔ عام خریداروں سے لے کر والیان ریاست کی خوشنودی حاصل کرنا تو ان کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن دائیں ہاتھ سے وہ اپنے بھگوان کو راضی رکھنے کے لیے بھی بڑے جتن کرتے تھے۔

ان کی فیاضی اور داد و دہش کے عجیب و غریب قصے مشہور تھے۔ یہ بات زبان زد خاص و عام تھی کہ شام کو دکان بڑھا کر وہ بہت سی ہندو بیواؤں' یتیموں اور محتاجوں کے ہاں بذات خود جاتے تھے' اور ایک مخصوص قسم کا "گپت دان" ان میں تقسیم کرنے کے بعد اپنے گھر میں پاؤں رکھتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا' بارش ہو یا آندھی' کاروبار میں نفع ہو یا نقصان' خفیہ اور خاموش خیرات کے اس تسلسل میں ناغہ نہ پڑتا تھا۔ جس پابندی سے نندہ صاحب "مایا دھرم" کا پالن کرتے تھے' اسی طرح وہ ہندو جاتی کی سیاسی برتری قائم رکھنے کے لیے بھی خفیہ طور پر مستقل جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ شہر کی بہت سی

لگا کر تھیلے سے کیمرہ' دوربین اور ٹافیاں برآمد کرتا تھا اور اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی ایک چھریری سی خوبصورت پارسی لڑکی کو کھلونوں کی طرح دکھاتا تھا۔ بس میں داخل ہوتے ہی اس شخص نے جملہ مسافروں کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ بمبئی کے ایک بہت بڑے آغا ہیں۔ ہر سال گرمیوں میں شکار کھیلنے کشمیر آتے ہیں۔ اور مہاراج اور ادھیراج کے مہمان ہونے کا شرف پاتے ہیں۔ اس بار بھی جب وہ سری نگر پہنچیں گے تو امید واثق ہے کہ خبر پاتے ہی ہزہائنس انہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور شاہی مہمان خانے کی زینت بنائیں گے۔ مسافروں میں کون ایسا کافر تھا جو اس امید کے بر آنے پر فی الفور ایمان نہ لے آتا۔ کیونکہ جو نسیم بہار ایسے غنچہ امید کو وا کرتی ہے اسے آغا صاحب احتیاطاً بمبئی ہی سے پارسی لڑکی کی صورت میں اپنے ساتھ لیتے آئے تھے' اور وہ راج محل کے لیے پروانہ راہداری کی طرح ان کے پہلو میں بیٹھی مزے مزے سے ٹافیاں کھا رہی تھی۔

آغا صاحب کی تقریر دلپذیر کا مسافروں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور وہ اپنی اپنی سیٹ پر اور بھی زیادہ دبک کر سکڑ گئے۔ سکھ ڈرائیور بھی مرعوب نظر آتا تھا۔ اس نے کلینز کو ڈانٹا کہ وہ وقت ضائع نہ کرے اور گاڑی کو فوراً اسٹارٹ کرے۔ کلینز نے اچھل اچھل کر زور زور سے ہینڈل گھمایا۔ انجن نے دو چار احتجاجی سسکیاں لیں اور پھر کڑک کر چالو ہو گیا۔ بس کے پہیوں نے حرکت کی تو گرم شال میں لپٹی ہوئی پنڈتانی نے بھی آغاز سفر کا شگون لیا۔ اور عاؤ عاؤ کر کے کانگڑی میں اپنی پہلی قے کر ڈالی۔

شہر سے نکل کر رام نگر سے گزرے تو مہاراجہ اور مہارانی کے محلات آئے۔ آغا صاحب پارسی لڑکی کے سر سے سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور سرگوشیوں میں اسے راج محل کی داستان الف لیلیٰ مزے لے لے کر سنانے لگے۔ فرنٹ سیٹ پر چھائی ہوئی خزاں دیدہ بیگم کو یہ بات ناگوار گزری اور اس نے اپنے نازک سے صندلی پنکھے کی ڈنڈی گھما کر آغا صاحب کا منہ پارسی لڑکی کے کانوں سے اس طرح الگ کر دیا جیسے بلی کے منہ سے چھیچھڑا

کھینچ لیا جاتا ہے۔ آغا صاحب نے اپنے چقندر جیسے چہرے پر بھڑوں کے چھتے کی طرح لٹکی ہوئی مونچھوں کو دونوں ہاتھوں سے مروڑا اور خشونت سے پنڈتانی کو گھورا جو کانگڑی میں منہ دیئے بڑی پابندی سے اپنا فریضہ استفراغ ادا کر رہی تھی۔

"یہ بس ہے یا چمار خانہ؟" آغا صاحب گرجے۔ "چاروں طرف بدبو ہی بدبو پھیلا رکھی ہے۔ توبہ توبہ' ناک میں دم آ گیا ہے۔"

آغا صاحب کی ناراضگی بھانپ کر کلینر اپنی جگہ سے اٹھا اور پنڈت اور پنڈتانی کو دھکیل دھکال کر سب سے الگ تھلگ بس کے آخری کونے میں بٹھا دیا۔ پنڈتانی کو تو خیر آرام ہو گیا کہ وہ جب جی چاہے کھل کر بے روک ٹوک قے کرتی جائے لیکن کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب کا نخل تمنا برباد ہو گیا۔ جب سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ آغا صاحب کے مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ ذاتی مراسم ہیں تو انھوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ اس وسیلہ کو اپنی مقصد براری کے لیے ضرور کام میں لائیں گے۔ پروفیسر صاحب کئی برس سے تگ و دو کر رہے تھے کہ کسی طرح ان کا تبادلہ پرنس آف ویلز کالج جموں سے سری پرتاب کالج سری نگر ہو جائے۔ لیکن کامیابی نہ ہوتی تھی۔ اب بس میں آغا صاحب کو ہم سفر دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ شاید یہ فرشتہ رحمت ان کی حاجت روائی کے لیے ہی غیب سے نازل ہوا ہو۔ چنانچہ وہ بڑی محنت سے کھسک کھسک کر آغا صاحب کی سیٹ کے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ سری نگر تک پہنچتے پہنچتے وہ پارسی لڑکی سمیت آغا صاحب کو شیشے میں اتار لیتے' کیونکہ کشمیری پنڈت کی شان یہ ہے کہ اسے کسی دفتر کی ادنیٰ سے ادنیٰ اسامی پر تعینات کر دیا جائے تو وہ دیمک کی طرح سارے عملے کو اندر ہی اندر چاٹ کر اوپر والی کرسی پر سر نکالتا ہے۔ لیکن کلینر نے انہیں پیچھے دھکیل کر سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔ اب پنڈتانی تو بڑے اطمینان سے کانگڑی میں منہ ٹھونسے بیٹھی تھی اور پروفیسر صاب بصد حسرت و یاس ان خوش قسمت مسافروں کا منہ تک رہے تھے جنہیں

اب بھی آغا صاحب کی سیٹ کا قرب حاصل تھا۔

رام نگر سے ذرا آگے سکھ ڈرائیور نے بس کی رفتار احتراماً ہلکی کر دی۔ کیونکہ یہاں پر نشیب میں درختوں کے جھنڈ کے درمیان "پنج پیر" کی کہنہ اور بوسیدہ سی قبریں تھیں۔ کچھ مسافروں نے گردن جھکا کر "پنج پیر" کو سلام کیا۔ اب پہاڑی راستہ شروع ہونے والا تھا اور بس گھاؤں گھاؤں کرتی پیچ در پیچ سڑک پر چلنے لگی جو بھورے پہاڑ اور سبز درختوں کے ساتھ کالے ربن کی طرح لپٹی ہوئی کبھی اوپر اٹھتی تھی' کبھی نیچے لڑھکتی تھی اور کبھی بڑے بڑے بیضوی دائرے کاٹ کر نظر سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ ایک طرف سنگلاخ چٹانیں ہی چٹانیں تھیں۔ دوسری طرف پر مہیب گہرائی ہی گہرائی۔ جگہ جگہ پہاڑی جھرنوں کا پانی چھوٹی چھوٹی شفاف چادریں بن کر چٹانوں کے اوپر بہتا تھا۔ سڑک کے کنارے پکے چبوترے اور حوض بنے ہوئے تھے۔ اور جھرنوں کا پانی لوہے کے نل کے ذریعے چوبیس گھنٹے ان پر گرتا رہتا تھا۔ ہندو ڈوگرے ان نلوں کی دھار کے نیچے کھڑے ہو کر نہاتے بھی تھے' کپڑے بھی دھوتے تھے' پانی بھی پیتے تھے۔ مسلمانوں کو ان چبوتروں کے پاس تک پھٹکنے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ ان کے چھونے سے چشمے کا صاف پانی ناپاک ہو کر بھرشٹ ہو جاتا تھا۔ جو بچا کھچا مستعمل پانی چبوتروں سے بہہ کر نکلتا تھا' اس کی نکاس سڑک کے دوسری جانب نشیب کی طرف تھی۔ یہاں سے یہ از سر نو ایک بیمار سی آبجو بن کر نیچے کی طرف رواں ہو جاتا تھا۔ اس سیکنڈ ہینڈ پانی کو اپنے استعمال میں لانے کے لیے مسلمانوں کو کھلی چھٹی تھی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ڈرائیور نے بس کا پانی بدلنے کے لیے ایک چشمہ کے پاس پڑاؤ کیا اور مسافروں کو وارننگ دی کہ یہاں سے چل کر اب وہ اودھم پور پہنچ کر رکے گا۔ اس لیے جس نے کچھ کھانا پینا ہو وہ یہیں سے کھا پی کر چلے۔ سڑک کے کنارے ایک چھپر میں حلوائی اور سوڈا واٹر کی دکان تھی۔ ایک تھال میں باسی پکوڑے تھے جن پر کچھ مکھیاں بے دلی سے منڈلا رہی تھیں۔ دوسرے تھال میں لڈو تھے جن پر

سری نگر بانہال روڈ کی گرد اس قدر تہہ در تہہ جمی ہوئی تھی کہ ان پر مکھیوں نے بھی بھنبھنانا چھوڑ دیا تھا۔ لکڑی کے برادے میں لت پت برف کی سل ایک میلے سے ٹاٹ میں لپٹی ہوئی تھی اور لیمونیڈ کی بہت سی بوتلیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔

سب سے پہلے دکاندار نے پتوں کے دونے میں پکوڑیاں اور لڈو ڈال کر لیمونیڈ کی ایک ایک بوتل کے ساتھ بس کے ڈرائیور اور کلینر کو نذرانہ دیا۔ آغا صاحب اپنی بیگم اور پارسی لڑکی کو لے کر سائے میں ایک چٹان پر بیٹھ گئے اور اپنی تھرموس' شراب' گلاس اور سینڈوچ نکال کر پکنک منانے لگے۔ باقی مسافروں نے لیمونیڈ کی بوتلوں پر یورش کی۔ دکاندار نے چار چار لڈو اور کچھ پکوڑے ڈال کر بہت سے دونے تیار کر رکھے تھے۔ جو مسافر لیمونیڈ طلب کرتا' اسے مٹھائی کا ایک دونا بھی زبردستی خریدنا پڑتا تھا۔ باقی سب مسافر تو خیر اپنی اپنی بوتل اور گلاس اور برف لے کر چھاؤں میں بیٹھ گئے لیکن سات آٹھ مسلمان پسنجروں کو لیمونیڈ پینے میں بڑی دیر لگی۔ دکان سے باہر کونے میں ایک ٹوکری لٹک رہی تھی۔ اس میں کانچ کا ایک میلا سا گلاس اوندھا پڑا تھا۔ مسلمان خریدار اس گلاس کو اٹھا کر فقیروں کی طرح ہاتھ پھیلائے دکاندار کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔ دکان والا دور ہی دور سے اس میں برف کی ڈال چھناک سے پھینکتا تھا اور پھر بوتل کھول کر ڈیڑھ دو فٹ کی بلندی سے گلاس میں لیمونیڈ انڈیل دیتا تھا۔ کچھ جھاگ خریدار کے ہاتھ پر پڑتی تھی' کچھ چھینٹے اس کے کپڑوں پر اڑتے تھے اور دو تین گھونٹ بوتل میں بچ رہتے تھے' جسے منہ لگا کر اور ڈکار مار کر حلوائی خود ہضم کر لیتا تھا۔ لیمونیڈ پی کر ہر مسلمان اپنا گلاس دھو کر دوسرے خریدار کے لیے باہر والی ٹوکری میں لٹکا دیتا تھا۔ بس کا ڈرائیور زور زور سے ہارن بجا کر جلدی مچا رہا تھا۔ کلینر بھی بے صبری سے آوازیں دے رہا تھا۔ آغا صاحب الگ ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ البتہ کشمیری پنڈت پروفیسر مطمئن بیٹھے تھے۔ انہوں نے حلوائی کی بھٹی سے پنڈتانی کی کانگڑی میں نئی راکھ مفت بھر لی تھی اور موقع پا کر آغا صاحب کے ساتھ اپنی گفتگو کی تمہید بھی باندھ لی تھی۔

کلینر سے ساز باز کر کے انہوں نے اپنی جگہ بدل لی تھی۔ اور پنڈتانی کو پچھلی سیٹ پر اکیلے چھوڑ کر اب وہ آغا صاحب کے بالکل قریب آ بیٹھے تھے۔

بس دوبارہ روانہ ہوئی تو تازہ دم تھی لیکن ڈرائیور کا موڈ بہت جلد خراب ہو گیا۔ سڑک پر تاحد نظر تتر بتر انسانوں کی لائن ہی لائن لگی ہوئی تھی۔ میلے میلے' بھورے بھورے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس خمیدہ کمر لوگ دو دو تین تین من وزن پیٹھ پر اٹھائے رینگ رینگ کر چڑھائی چڑھ رہے تھے' جیسے دیوار پر چیونٹیوں کی بے ترتیب قطاریں چل رہی ہوں۔ انہوں نے خشک گھاس کے بنے ہوئے چپل پہنے ہوئے تھے۔ اور ان کے تمتماتے ہوئے چہرے پسینے میں شرابور تھے۔ یہ کشمیری مسلمانوں کی قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ کے نمائندے تھے۔ جنہیں عرف عام میں "ہاتو" کہا جاتا تھا۔ موسم سرما کے شروع ہوتے ہی وہ اپنا فردوس بر روئے زمین چھوڑ کر پا پیادہ قافلہ در قافلہ پنجاب کے میدانوں میں اتر جاتے تھے۔ ان کی مائیں بہنیں اور بیٹیاں تو اپنے برف سے گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے چوبی گھروں میں ساری ساری رات کڑوا تیل جلا کر قالین بنتی تھیں یا شال اور غالیچے کاڑھتی تھیں یا پھولدار نمدے بناتی تھیں یا اخروٹ کی لکڑی تراش تراش کر نازک نازک سگریٹ کیسوں' تپائیوں اور پھولدانوں پر نقش و نگار کھودتی تھیں' جنہیں مقامی ساہوکار اونے پونے داموں خرید کر سیاحوں کے ہاتھ بڑی بڑی قیمت پر بیچ ڈالتا تھا۔ سنسان راتوں میں برفانی ہوا کے جھکڑ درختوں اور دیواروں اور چٹانوں سے ٹکرا کر خوفناک چیخیں مارتے تھے۔ وقتاً فوقتاً برف کے بڑے بڑے تودے چھتوں سے گر کر سناٹے میں زلزلوں کا ارتعاش پیدا کرتے تھے۔ تیل کے چراغ گل ہو جاتے تھے۔ کانگڑیوں کی آگ سلگ سلگ کر راکھ ہو جاتی تھی۔ لیکن لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کابکوں میں محبوس بوڑھی اور جوان عورتوں کی فنکار انگلیاں اپنے کام میں لگاتار مصروف رہتی تھیں۔ دھڑکتے ہوئے دلوں سے وہ کبھی حضرت شاہ ہمدان کی حکایات میں مگن ہو جاتی تھیں' جنہوں نے وادی کشمیر میں اسلام کی شمعیں روشن کی تھیں۔ کبھی وہ للہ عارفہ کے گیتوں میں صبر و قرار کا سہارا ڈھونڈتی تھیں۔

صبر، بیٹا، صبر
صبر تو ایک سنہری پیالہ ہے
یہ اتنا بیش قیمت ہے کہ اسے خریدنے کا ہر کسی کو یارا نہیں
صبر، بیٹا، صبر
صبر تو نمک، مرچ اور زیرہ کا تیز مرکب ہے

یہ اتنا تلخ ہے کہ اسے چکھنے کی ہر کسی کو تاب نہیں

جب کبھی برف و باراں کا طوفان تنہائی کی راتوں کو اور بھی تاریک اور طویل کر دیتا تھا تو ان کے شوق کی گہرائیوں سے یہ خاتون کے درد و فراق کے نغمے لہرانے لگتے تھے۔

ویو میانہ پوشے مدنو --------

میں سب رہگذاروں پر پھولوں ہی پھولوں کی سیج بچھا دوں گی
اے میرے پھولوں سے پیار کرنے والے محبوب
آ جاؤ
آؤ کہ
ہم مرغزاروں میں یاسمن، نسرین اور گلاب کے پھول چنیں
آؤ کہ
ہم دونوں کنار دریا چلیں
ساری دنیا نیند کی آغوش میں بے ہوش پڑی ہے
میں تیرے لیے سراپا انتظار بیٹھی ہوں
اے میرے پھولوں سے پیار کرنے والے محبوب
آ جاؤ
ویو میانہ پوشے مدنو --------

حضرت آدم علیہ السلام تو دانہ گندم کی پاداش میں خلد سے نکلے تھے لیکن ڈوگرہ راج

میں کشمیری مسلمان دانہ گندم کی تلاش میں اپنی جنت ارضی سے نکلنے پر مجبور تھا۔ سردیاں آتے ہی وہ گلمرگ' گاندھر بل' اچھابل' تراگ بل' بانڈی پور اور پانپور کے کوہساروں اور مرغزاروں سے نکل کر پنجاب کی دور دراز منڈیوں میں پھیل جاتے تھے۔ دن بھر غلے اور لوہے اور کپڑے کی بار برداری کرتے تھے۔ بسوں اور تانگوں کے اڈوں پر سامان ڈھوتے تھے۔ لکڑی کے ٹالوں پر لکڑیاں پھاڑتے تھے اور شام کو مرغی کے بچوں کی طرح چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اکٹھے بیٹھ کر کچھ چاول ابال لیتے تھے۔ خشکہ رات کو کھا کر کھلے آسمان تلے سو رہتے تھے اور صبح اٹھ کر رات کی بچی ہوئی پچھ میں نمک ملا کر دن کا کھانا بنا لیتے تھے۔ اس طرح خون پسینہ ایک کر کے گرمیوں میں جب وہ کچھ نقدی بچا کر اور دو ڈھائی من سامان پیٹھ پر لاد کر اپنی جنگ گم گشتہ کی طرف واپس لوٹتے تھے' کہیں کسٹم والے ان کا مال لوٹتے تھے' کہیں کوئی ڈوگرا سردار بر سر عام ڈرا دھمکا کر ان کی پونجی ہتھیا لیتا تھا' کہیں پولیس اور محکمہ مال کے اہلکار انہیں سر راہ پکڑ کر کئی کئی دن کئی کئی ہفتے مفت کی بیگار میں لگائے رکھتے تھے۔ یوں بھی کشمیری مسلمان کا بال بال ڈوگرا حکومت کے لا تعداد ٹیکسوں میں جکڑا رہتا تھا۔ پھولوں پر ٹیکس' سبزی پر ٹیکس' بھیڑ' بکری اور گائے پر ٹیکس' چولہا ٹیکس' کھڑکی ٹیکس' اون ٹیکس' شال ٹیکس' بخار اور خیاط پر ٹیکس' مزدور اور معمار پر ٹیکس' نانبائی اور لوہار پر ٹیکس' ملاح اور کمہار پر ٹیکس' ارباب نشاط پر ٹیکس ------- بس فقط ایک حجام تھا' جو ٹیکسوں کی مکڑی کے جالے میں کسی وجہ سے گرفتار نہ تھا۔

کشمیری مسلمانوں کا مال و متاع تو ہر وقت ریاست کے اہلکاروں' خفیہ نویسوں' رئیسوں اور جاگیرداروں کے رحم و کرم پر رہتا ہی تھا' اس غریب کی جان بھی اپنی سر زمین میں بے حد ارزاں تھی۔ ایک زمانے میں کشمیری مسلمان کی زندگی کی قانونی قیمت مبلغ دو روپے تھی۔ اگر کوئی سکھ یا ڈوگرا کسی مسلمان کو جان سے مار ڈالتا تھا' تو عدالت قاتل کو سولہ سے بیس روپیہ تک جرمانہ عائد کر سکتی تھی۔ دو روپے مقتول کے لواحقین کو

عطا ہوتے تھے اور باقی رقم خزانہ عامرہ میں داخل ہوتی تھی۔ جس وقت انگریزوں نے اس جنت ارضی کو ڈوگروں کے ہاتھ فروخت کیا تو یہ نرخ ذرا بالا ہو گیا۔ کشمیر کا سودا

۷۵ لاکھ روپے پر طے ہوا تھا۔ اس وقت کی آبادی کے حساب سے باشندوں کی قیمت سات روپے فی کس کے قریب پڑی تھی۔ ڈوگرہ راج میں کسی وقت مسلمانوں کی زندگی ایک گائے کا درجہ بھی نہ پا سکی۔ شروع شروع میں گاؤ کشی کی سزا موت تھی۔ ملزم کو رسیوں سے باندھ کر سڑکوں پر گھسیٹا جاتا تھا' اور پھر بر سر عام پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا' لیکن بعد میں بھی گائے ذبح کرنے کی سزا دس سال قید بامشقت ہمیشہ رہی۔ کئی جگہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر بھیڑ یا بکری قربان کے لیے بھی حکومت کی اجازت حاصل کرنا پڑتی تھی۔ جو کبھی ملتی تھی' کبھی نامنظور ہو جاتی تھی۔ ان سب دشواریوں' رکاوٹوں' پابندیوں اور لوٹ مار کے باوجود کشمیری "ہاتو" اپنی سر زمین کے ساتھ والہانہ طور پر وابستہ تھا۔ پنجاب کے میدانوں اور منڈیوں میں اسے اجرت بھی زیادہ ملتی تھی۔ بیگار بھی کوئی نہ لیتا تھا۔ اور بڑا گوشت کھانے پر قید کی سزا تھی نہ موت کی۔ لیکن گرمیاں آتے ہی وہ رسے تڑا کر بھاگ اٹھتا اور اپنا مال و متاع پیٹھ پر لاد کر پاپیادہ کشاں کشاں اپنی دور افتادہ وادیوں کی راہ لیتا تھا۔ بانہال سری نگر روڈ پر جا بجا ان کے قافلے اپنی جنگ گم گشتہ کی طرف رواں دواں تھے۔ ان کو دیکھ کر پہلے تو ہماری بس کے ڈرائیور کی رگ ظرافت پھڑکی۔ ایک موڑ پر بھاری بھر کم بوجھ تلے دبے ہوئے چند خمیدہ کمر کشمیری سڑک کے بیچ آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ ڈرائیور نے عین ان کے پیچھے پہنچ کر زور سے ہارن بجا دیا۔ وہ خوف سے کانپ اٹھے اور بد حواس ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ کوئی لڑھک کر گھٹنوں کے بل گرا۔ کوئی بس کے مڈگارڈ سے ٹکرایا۔ کسی نے لجاجت سے ہاتھ باندھ کر ڈرائیور کی منت کی۔ کچھ مسافر کھسیانی سی ہنسی ہنسے۔ آغا صاحب نے زور دار قہقہے بلند کئے۔ نوجوان پارسی لڑکی اس نظارے سے خاص طور پر محظوظ ہوئی۔ اس نے جھٹ پٹ آغا صاحب کا کیمرہ لیا اور سڑک پر گرتے پڑتے بد

حواس لوگوں کی تصویریں اتارنے لگی۔ فوکس ٹھیک کرنے کے لیے آغا صاحب نے لڑکی کا سر اپنے سینے سے لگا کر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ان کی بیگم نے صندلی پنکھے کی

ڈنڈی ان کے کان میں چبھو کر اس بندوبست میں رخنہ ڈالا اور بس شاداں و فرحاں گھاؤں گھاؤں کرتی اگلے موڑ پر پہنچی۔ یہاں بھی ہاتوؤں کے ساتھ وہی تماشا ہوا۔ پھر اس سے اگلے موڑ پر -------- پھر اس سے اگلے موڑ پر -------- تین چار موڑوں کے بعد سب کی طبیعت اس دلپسند مشغلے سے سیر ہو گئی۔ اب اگر کوئی کشمیری سڑک کے درمیان نظر آتا' تو ڈرائیور کے مزاج کا پارہ چڑھ جاتا۔ اور وہ سیاہ چشمان کشمیر کی آل اولاد کو کئی پشت تک بڑی غلیظ گالیاں دیتا۔ کلینر بھی ایک موٹا سا سونٹا لے کر بس کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ اور اسے گھما گھما کر راستہ صاف کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اپنے بوجھ کے تلے دبے ہوئے بچارے کشمیری بے بسی سے پریشان ہو کر سڑک پر ادھر ادھر بھاگتے تھے' اور پہاڑی ڈھلوانوں پر سایہ دار درختوں کے نیچے پکے چبوتروں پر بیٹھے ہوئے ڈوگروں کے لیے بڑی ضیافت طبع کا سامان فراہم کرتے تھے۔

لانبے لانبے کرتوں اور چوڑی دار پاجاموں میں ملبوس بڑی بڑی مونچھوں والے ڈوگرے ریاست میں شاہی اولاد کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے پاس وسیع جنگلات ہوں یا ایک دو ایکڑ اراضی' وہ اپنے نام کے ساتھ راجہ یا ٹھاکر یا دیوان کا دم چھلا ضرور لگاتے تھے اور چھاتی نکال کر ایسے دم خم سے چلتے پھرتے تھے جیسے وہ ابھی ابھی راج محل کے پنگھوڑے سے انگوٹھا چوستے ہوئے برآمد ہوئے ہوں۔ ان کی اراضیاں مسلمان مزارعے کاشت کرتے تھے۔ ان کے مویشی مسلمان بچے جنگلاتی چراگاہوں میں چراتے تھے۔ اور وہ خود آلتی پالتی مار کر بیٹھے چلم پیا کرتے تھے۔ چلم پینے کے علاوہ اپنے گھٹے ہوئے سر پر بر سر عام تیل کی مالش کرانا بھی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ مالش کے بعد وہ اپنی چندیا پر لہراتی ہوئی سات آٹھ انچ لمبی "بودی" کو مونچھوں کی طرح تاؤ دیتے تھے' اور دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رسی کی طرح باٹ کر پیچ در پیچ کارک سکرو کی مانند اینٹھ لیتے تھے۔ ان عجیب الخلقت

ڈوگروں کے آس پاس شیشم اور دیار اور چیڑھ کے درختوں کے نیچے اگر کوئی بانکی ترچھی ڈوگری سر پر پیتل کی دمکتی ہوئی گاگر اٹھائے لٹکتی مٹکتی گزر جاتی تھی تو پہاڑ کی پگڈنڈیوں پر گوٹے اور کناری اور لچکے کی جھالریں ہی جھالریں پھیل جاتی تھیں۔ اور سڑکوں پر چلتی ہوئی بسوں کے ڈرائیور منہ اٹھا کر ان ڈوگریوں کے نظارے میں اتنے محو ہو جاتے کہ بسیں گرنے سے بال بال بچتی تھیں۔

ہماری بس بھی کئی بار کھڈ میں گرتے گرتے بچی۔ آغا صاحب تو بڑے خوش تھے' کیونکہ ہر بار پارسی لڑکی خوف سے چیخ مار کر ان کے ساتھ لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ لیکن ان کی بیگم نے ڈرائیور کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ ایک سخت تادیبی تقریر کے بعد انہوں نے ڈرائیور کو ایک ایسی طویل اور پیچیدہ گالی دی کہ اس فن میں مشاق ہونے کے باوجود وہ ہکا بکا رہ گیا' اور شرم سے اس کے کان سرخ ہو گئے۔

"ہماری خانم دراصل ملکہ دشنام ہیں۔" آغا صاحب نے پنڈت مسافر کو مخاطب کر کے سب مسافروں کو مطلع کیا۔ "بڑے بڑے مہاراجے اور نواب اس کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔ ایک بار سری مہاراج بہادر نے چشمہ شاہی پر گالی گلوچ کا بڑا شاندار ٹورنامنٹ منعقد کیا تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ' مہاراجہ الور' نواب آف پالن پور' مہارانا جھالا وار سب موجود تھے۔ گالیوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ سب نے اپنے اپنے کمال کے جوہر دکھائے لیکن ٹرافی ہماری خانم نے ہی جیتی۔"

کشمیری پنڈت پروفیسر نے گھگیا گھگیا کر اپنے گلے سے کچھ آوازیں برآمد کر کے حسب توفیق داد دی۔

"جانتے ہو' خانم کی گالی کتنی طویل تھی؟" آغا صاحب نے ڈانٹ کر پوچھا۔

پنڈت صاحب خوشامدانہ حیرت و استعجاب سے جبڑے لٹکا کر بیٹھ گئے جیسے بکری کا میمنہ گھاس وصول کرنے کے لیے تھوتھنی کھولتا ہے۔

"خانم کی گالی ڈیڑھ منٹ دراز تھی' پوری ڈیڑھ منٹ۔" آغا صاحب نے اعلان فرمایا۔

پنڈت جی ایک بار پھر تازہ حقے کی طرح گڑگڑائے۔ اور آغا صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے فن دشنام طرازی کے حق میں ایک عالمانہ تقریر جھاڑنے کے لیے پر تولنے لگے۔ لیکن ڈرائیور نے انہیں مہلت نہ دی۔ اودھم پور آ گیا۔ اور بس لاریوں کے اڈے پر جا کر رکی۔

اودھم پور کے اڈے پر بڑی ریل پیل تھی۔ بس رکتے ہی پولیس کے کچھ سپاہیوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ اور یہ خوش خبری سنائی کہ سری نگر میں ہیضہ کی وبا پھوٹی ہوئی ہے۔ اس لیے اناکولیشن سرٹیفکیٹ حاصل کیے بغیر کوئی شخص آگے سفر نہیں کر سکتا۔

اودھم پور کی فرض شناس میونسپلٹی نے اناکولیشن کا بندوبست بھی اڈے ہی پر کر رکھا تھا۔ ایک کھلی جگہ ایک چھولداری نصب تھی جس کے باہر بورڈ پر جلی حروف میں یہ تحریر تھا۔

"خوش آمدید -------- جی آیاں نوں

ہیضے کا ٹیکہ یہاں مفت لگوایئے

از طرف خادم سیاحاں

میونسپل کمیٹی اودھم پور"

اندر ٹیکہ لگانے کا کوئی سامان نہ تھا۔ البتہ ایک بابو بہت سے خالی فارم اور ہیلتھ آفیسر کی مہر لیے ضرور بیٹھا تھا۔ ہر مسافر سے وہ تین روپیہ نذرانہ وصول کرتا تھا اور فارم پر کر کے اور ان پر مہر لگا کے ان کے حوالے کرتا تھا۔ باہر ایک روپیہ پولیس والا لیتا تھا۔ آٹھ آنے کلینر مانگتا تھا۔ اور اس طرح ساڑھے چار روپے میں وبائے ہیضہ کا انسداد کرنے کے بعد مسافر کو بس میں دوبارہ داخلہ نصیب ہو جاتا تھا۔ ہم اس سعادت سے محروم رہے کیونکہ ہم تو پلیگ سے بچنے کے لیے جموں سے نکلے تھے' ہیضے میں مبتلا ہونے کے لیے سری نگر نہیں جا رہے تھے۔ اس لیے ہم بس سے اتر گئے اور اگلے روز ایک دوسری لاری سے جموں واپس لوٹ آئے۔

• چمکور صاحب

جموں میں پلیگ' سری نگر میں کالرا -------- اب ہماری جائے پناہ چمکور صاحب تجویز ہوئی۔

جموں توی کے ریلوے اسٹیشن سے ہم ٹرین میں سوار ہوئے تو ریل کا یہ پہلا سفر مجھے بڑا افسانوی محسوس ہوا۔ ریل چھوٹتے ہی میں کھڑکی سے باہر منہ نکال کر بیٹھ گیا اور گرد و پیش کے عجیب و غریب ماحول کو دیکھنے لگا۔ نزدیک کے کھمبے برق رفتاری سے پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ دور کے درخت بڑے آرام سے ہمارے ساتھ ساتھ آگے کی طرف رواں تھے۔ وسطی کائنات ساکت و جامد تھی۔ کچھ دیر کے بعد پہیوں کی گڑگڑاہٹ میں تال اور سر کے ساتھ طبلوں کی تھاپ بجنے لگی۔ اور انجن کی بھپا بھک' چھکا چھک میں بھی موسیقی کی بہت سی دھنیں سما گئیں۔ ریل کی پٹڑی میں جب کوئی موڑ آتا تھا' تو ٹرین ربڑ کے سانپ کی طرح بل کھا کر اٹھکیلیاں کرتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ ایک موڑ پر میں ٹرین میں لگے ہوئے ڈبوں کی تعداد گن رہا تھا کہ شاں شاں' شوں شوں کر کے انجن نے بڑے زور سے دھواں چھوڑا اور کوئلے کا ایک ذرہ میری آنکھ میں پڑ گیا۔ معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میری پلکوں کے اندر دیا سلائی رگڑ کے جلا دی ہو۔ آنکھیں مل مل کر میرا برا حال ہو گیا۔ اور دائیں آنکھ بوٹی کی طرح سرخ ہو کر سوج گئی۔ سزا کے طور پر مجھے کھڑکی والی سیٹ سے اٹھا کر کمپارٹمنٹ کے درمیان ایک محفوظ جگہ بٹھا دیا گیا۔

چھوٹے بڑے اسٹیشن آتے تھے۔ ٹرین رکتی تھی۔ گارڈ سبز جھنڈی ہلاتا تھا۔ انجن سیٹی بجاتا تھا۔ اور گاڑی پھر روانہ ہو جاتی تھی۔ پلیٹ فارموں پر بڑی چہل پہل تھی۔ قلی اور مسافر بد حواسی سے ادھر ادھر بھاگتے تھے۔ چھابڑیوں اور خوانچے والے بھانت بھانت کی صدائیں لگاتے تھے۔ "ہندو پانی" -------- "مسلمان پانی" -------- گرم پوری' گوشت روٹی' لیمن برف --------

میں دور ہی دور بیٹھا اس رونق کو بصد حسرت و یاس دیکھتا رہا۔ اور دل میں عزم بالجزم کر لیا کہ جب کبھی میں اکیلا سفر کروں گا تو ہر بڑے اسٹیشن پر اتر کے کچھ نہ کچھ ضرور کھاؤں گا۔ چلتی ہوئی گاڑی سے لپک کر پلیٹ فارم پر اترا کروں گا۔ اور جب ٹرین پھر حرکت میں آ جائے گی تو چھلانگ لگا کر دوبارہ اس میں سوار ہوا کروں گا۔

گارڈ کے رعب داب نے بھی میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ اس کے ایک ادنیٰ سے اشارے کے سامنے گاڑی کا دیوہیکل انجن بالکل بے بس تھا۔ سفید وردی' سفید ٹوپی' سرخ اور سبز جھنڈیاں' منہ میں وسل...... گارڈ کی آن بان مجھے خوب بھائی۔ اور میں نے جموں کی ہری ٹاکیز میں گیٹ کیپری کا ارادہ ترک کر کے ریلوے گارڈ بننا اپنا زندگی کا نصب العین بنا لیا۔

لدھیانہ گزر کر غروب آفتاب کے بعد دوراہا کا چھوٹا سا اسٹیشن آیا۔ یہاں پر گاڑی صرف نصف منٹ کے قریب رکتی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی سامان باہر پھینکا اور خود بھی کود کود کر نیچے اترے۔ پلیٹ فارم پر ہو کا عالم طاری تھا۔ نہ روشنی' نہ قلی' نہ کوئی سواری۔ ہم نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے بڑی مشکل سے نہر سرہند کے گھاٹ پر پہنچے۔ جو اسٹیشن سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ چمکور صاحب سے ہوتی ہوئی روپڑ جانے والی کشتی تیار کھڑی تھی۔ کشتی مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ملاحوں نے کسی مسافر کی پھیلی ہوئی ٹانگیں سکیڑیں' کسی کے بازو بھینچے' کسی کا بچہ اٹھا کر اس کی گود میں ڈالا اور ہمیں بھی ٹھونس ٹھانس کر کشتی میں ایسے فٹ کر دیا جس طرح بوری میں فالتو آٹا دبا دبا کر بھرا جاتا ہے۔

آدھی رات کے قریب ملاحوں نے ہر مسافر سے دو دو آنے "چراغی" وصول کی۔ ایک دھندلی سی لالٹین جلا کر ایک بانس سے لٹکا دی اور کشتی نے لنگر اٹھا دیا۔ ہمارا سفر پانی کے بہاؤ کے خلاف تھا اس لیے ایک موٹا سا لمبا سا رسہ لے کر اس کا ایک سرا کشتی سے بندھا ہوا تھا اور دوسرے سرے پر دو بیل جتے ہوئے تھے۔ ایک ملاح سمار لاٹھی

کاندھے پر رکھے اور دوسرے ہاتھ میں سرکنڈے کی مشعل جلائے بیلوں کو ہانکتا ہوا کنارے کنارے چل رہا تھا۔

کشتی کو کئی جگہ روک روک کر اس کے تلے میں بھرا ہوا پانی نکالا گیا۔ بہلول پور پہنچ کر بیلوں کی جوڑی تبدیل ہوئی۔ جب پو پھٹی تو صبح کی زر کار کرنوں میں نہر کے کنارے دور تک ایک طویل قطار نظر آئی جیسے لوہے اور پتیل کی گاگروں کو الٹ کر زمین پر رکھا ہوا ہو۔ جب نزدیک پہنچ کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ گاگریں نہ تھیں بلکہ سکھوں کی قطار تھی جو نہر کی طرف پشت کئے ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے تھے اور سر جھکا کر بڑے خضوع و خشوع سے بر سر عام رفع حاجت فرما رہے تھے۔ جب کشتی ان کے قریب پہنچی تو چند سکھ جوان ہماری طرف منہ کر کے ننگ دھڑنگ کھڑے ہو گئے اور منہ سے بکرے بلا بلا کر بڑے فخر سے اپنے پوشیدہ علم الابدان کی تشریح کرنے لگے۔ کشتی میں سوار عورتوں نے اپنے چہرے دوپٹوں سے ڈھانپ لیے اور مرد کھانس کر ایک دوسرے سے کھسیانی کھسیانی باتیں کرنے لگے۔ ملاح صاحب مسلمان تھے۔ ایک نوجوان کو جو تاؤ آیا تو اس نے بھی اپنا تہبند اٹھا کر سکھوں کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کا ارادہ کیا۔ لیکن عمر رسیدہ ملاح نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے بٹھا دیا۔ جب کشتی ان کے سامنے سے گزر گئی تو سکھ جوان بھی نہر کی جانب پیٹھ کر کے بیٹھ گئے اور از سر نو فطرت سے ہمکلامی میں مصروف ہو گئے۔

دوپہر کے قریب کشتی چکور صاحب پہنچ گئی۔ دادی اماں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اپنے پلو سے کھول کر کچھ لڈو کھانے کو دیئے۔ ان کی عمر کوئی ایک سو چار برس کے قریب تھی۔ دانت مضبوط تھے۔ نظر تیز تھی۔ اور چلنے میں وہ ہم سے بھی زیادہ سبک رفتار تھیں۔

دادی اماں کے قدیمی ملازم کرم بخش نے ہمارا سامان اٹھایا۔ وہ بھی ستر برس سے اوپر تھا۔ چھدری داڑھی کے بال ایسے موٹے موٹے تھے جیسے چہرے سے رسیاں لٹک رہی ہوں۔ سامان کے بوجھ تلے بھی اسے پسینہ تک نہیں آ رہا تھا۔ اس کے دیسی جوتے لوہے کے

کھرپے کی طرح سخت تھے۔ اس نے جوتے کھول کر میرے حوالے کر دیئے' اور آگ کی طرح تپتی ہوئی ریت پر ننگے پاؤں یوں خراماں چلنے لگا جیسے سرسبز گھاس پر چہل قدمی کر رہا ہو۔ کرم بخش کے پاؤں کا تلہ نری کے جوت کے تلے سے بھی زیادہ سخت اور مضبوط تھا۔ وہ کھجور اور کیکر کے بکھرے ہوئے کانٹوں پر بے تکلف برہنہ پا چلتا پھرتا رہتا تھا۔ شدید سردیوں کے زمانے میں اکثر اس کے پاؤں کی ایڑیوں کی جلد خشک ہو کر پھٹ جایا کرتی تھی۔ کرم بخش فوراً گاؤں کے موچی کے پاس جاتا تھا' اور جس طرح پھٹے ہوئے جوتوں کو گانٹھا جاتا ہے' عین اس طرح اپنی ایڑیوں کی جلد میں بھی خوشی خوشی ٹانکے لگوا کر آیا کرتا تھا۔

چمکور صاحب میں بہت سے گردوارے اور ایک خانقاہ تھی۔ گردواروں میں سب سے اونچا درجہ کلغی والے بادشاہ گرو کے گردوارے کا تھا۔ سکھوں کی روایت کے مطابق پنجاب کے ایک مسلمان صوبیدار نے گرو کے دو کم سن صاحبزادوں کو اس گردوارے کی ایک دیوار میں زندہ چنوا دیا تھا۔ صاحبزادوں کے نام بابا اجیت سنگھ اور جھجار ہری تھے۔ اب انہی کے نام پر اس گردوارے کے ساتھ بابا اجیت سنگھ جھجار ہری خالصہ ہائی سکول بھی قائم تھا۔

دوسرے گردوارے کا نام دمدمہ صاحب تھا۔ یہاں پر کسی گرو صاحب نے طبل بجایا تھا۔ ایک مقدس مقام کا نام مسوال صاحب تھا۔ یہاں پر ایک گرو صاحب نے اپنے دندان مبارک پر مسواک فرمائی تھی۔ ایک اور پاکیزہ جگہ جھاڑ صاحب کہلاتی تھی۔ یہاں پر کسی گرو صاحب نے غالباً کچھ اور کیا ہو گا۔

چمکور صاحب کی اکلوتی خانقاہ "بابا صاحبا" تھی۔ بابا صاحبا دراصل شہاب الدین کا عرف عام تھا۔ وہ اپنے زمانے کے صاحب کرامت بزرگ مانے جاتے تھے۔ زہد و عبادت کے علاوہ بابا شہاب الدین اپنے علاقے کے قاضی بھی تھے اور کسب معاش کے لیے نیل کا کاروبار کرتے تھے' بابا صاحب کے صحن میں نیل کے بھرے ہوئے مٹکوں کی قطاریں پڑی رہتی تھیں۔ ایک روز آدھی رات گئے سکھوں کے گرو اچانک بابا صاحب کے احاطے میں آ

گئے۔ گرو صاحب عالم روپوشی میں جان بچاتے پھر رہے تھے۔ کیونکہ ان کے تعاقب میں سرہند کا حاکم فوج کی ایک بھاری جمعیت لے کر نکلا تھا۔

گرو صاحب نے کہا۔ "بابا جی! اگر میں اس جلتی ہوئی بھٹی میں کود جاؤں تو شاید میری روحانیت مجھے آگ کے ضرر سے بچا لے' لیکن سرہند کے مغل حاکم سے بچنے کے لیے انسانی وسیلہ درکار ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی وسیلہ ہو تو بتاؤ۔"

بابا صاحب نے جواب دیا۔ "گرو جی مہاراج' وسیلہ روحانی ہو یا انسانی خدا کے حکم کے بغیر میسر نہیں آتا۔ آپ اللہ کا نام لے کر نیل کے اس مٹکے میں بیٹھ جائیں۔ شاید خدا اسی میں بہتری کرے۔"

گرو صاحب گاڑھے نیل سے بھرے ہوئے ایک مٹکے میں بیٹھ گئے۔ بابا صاحب نے مٹکے کا منہ کپڑے کی جالی سے ڈھانپ دیا۔ سرہند کے حاکم نے اپنی فوج کی مدد سے چمکور صاحب کا کونہ کونہ چھان مارا۔ گردواروں کے گرنتھیوں اور نہنگ اکالیوں کو زمین پر لٹا لٹا کے خوب پٹوایا۔ بہت سے گھروں کی تلاشی لی۔ گنے کے کھیتوں کو کاٹ کے رکھ دیا۔ کچھ سپاہی سلام کرنے کے بہانے بابا شہاب الدین کے ہاں بھی آئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بابا صاحب کے گھر کا جائزہ بھی لیا اور مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ راتوں رات مغل فوج اپنی مہم پر آگے بڑھ گئی۔ صبح سویرے بابا صاب نے گرو صاحب کو نیل کے مٹکے سے باہر نکالا' اور لباس تبدیل کرنے کے لیے انہیں نئے کپڑوں کا جوڑا پیش کیا۔

گرو صاحب نے کہا۔ "بابا جی! اب میں کبھی سفید کپڑے نہ پہنوں گا' آج سے نیلا رنگ میرے پنتھ کا رنگ مقرر ہوا۔"

گرو صاحب بابا شہاب الدین کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔ چند روز بعد چمکور کے گردواروں کے گرنتھی ایک وفد کی صورت میں بابا صاحب کے پاس آئے۔ انہوں نے بڑے ادب نیاز سے بابا صاحب کی خدمت میں ریشم کی ایک تھیلی پیش کی۔ اس تھیلی میں گرو صاب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک فرمان تھا' جس میں سارے سکھ پنتھ کی طرف سے بابا

تقسیم کر دیا جاتا۔ چاولوں کے جو دانے مزار پر پڑے رہ جاتے' ان کو چگنے کے لیے بہت سے کبوتر عام طور پر وہاں جمع رہتے تھے۔ بابا صاحب کے ساتھ کبوتروں کی عقیدت مندی کے متعلق طرح طرح کے قصے بن گئے اور رفتہ رفتہ کبوتروں کو اپنا تقدس حاصل ہو گیا کہ چمکور صاحب کی حدود میں ان کا شکار حرام شمار ہونے لگا۔

جس مقام پر بابا شہاب الدین کا مزار واقع تھا' اس سے کچھ فاصلے پر ایک وسیع و عریض میدان پھیلا ہوا تھا۔ اس میدان کو "پانڈوانہ" کہتے تھے۔ چمکور کے خوش فہم بڑے بوڑھوں کو اس بات کا یقین تھا' کہ کورو پانڈو کی مہا بھارتی لڑائی اسی میدان میں ہوئی تھی۔ ذرا سا کریدنے پر اس میدان سے طرح طرح کے پرانے سکے اور جنگی ہتھیار مل جاتے تھے۔ یوں بھی تیز بارش کے بعد جگہ جگہ انسانی ڈھانچوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں باہر نکل آتی تھیں۔ اگر ہوا تیز ہو تو ان ہڈیوں کی رگڑ سے جا بجا چراغ سے جل اٹھتے تھے۔ برسات کی اندھیری راتوں میں یہ روشنیاں خاص طور پر مافوق الفطرت سماں باندھ دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ مشہور ہونے لگا کہ یہ روحانی دیے بھی بابا صاحب کی کرامت سے روشن ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی رات کے وقت پانڈوانہ کے میدان میں بابا صاحب کی یہ کرامت جگمگاتی تو گاؤں کی بڑی بوڑھیاں سر ڈھانپ کر کوٹھوں پر چڑھ جاتیں اور دامن پھیلا پھیلا کر بابا صاحب سے برکت کی دعائیں مانگنے لگتیں۔

بابا شہاب الدین کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے فرزند بھولے میاں نے نیل کا کاروبار سنبھالا۔ بھولے میاں کا اصلی نام قاسم علی تھا۔ وہ محض دیندار تھے۔ دنیاداری سے قطعی بیگانہ تھے۔ سیدھی سادی' صبر شکر کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے بھی اسی ڈگر پر ثابت قدم رہے لیکن چوتھی پشت میں جا کر چودھری مہتاب دین نے ایک نیا رنگ پکڑا۔ سب سے پہلے انہوں نے گرداوروں کے گرنتھیوں سے مل کر زمین کی پیش کش پر حق جمانے کی کوشش کی۔ یہاں سے ناکام ہو کر انہوں نے نیل کا ایک پرانا مٹکا لے کر اسے پھولوں سے خوب سجایا۔ گھر کے صحن میں ایک زرکار

شہاب الدین کو اپنا محسن مانا ہوا تھا اور اس احسان کے بدلے گرد واروں کی کچھ زمین بھی دائمی طور پر بابا شہاب الدین اور ان کی اولادوں کے حق میں وقف کر دینے کی پیش کش تھی۔

بابا صاحب نے اس فرمان کی پشت پر گورمکھی زبان میں ایک تحریر لکھ دی جس کا مفہوم یہ تھا۔ "اگر یہ موقع گرو صاحب کے ساتھ جہاد کا ہوتا' تو بخدا شہاب الدین خود اپنے ہاتھ سے ان کا سر قلم کر دیتا۔ لیکن یہ جنگ حاکم اور محکوم کا سیاسی تنازعہ ہے۔ گرو صاحب کے ساتھ میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ فقط اپنا اخلاقی فرض ادا کیا ہے۔ اس کی اجرت میرے لیے حلال نہیں۔ زمین کی پیش کش کو میں اپنی آل اولاد پر ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیتا ہوں۔ البتہ میری خواہش ہے کہ چمکور کی حدود میں سور کا گوشت لانا بند ہو جائے۔ اگر سکھ قوم یہ درخواست مان لے تو یہ اس کی عین عنایت ہو گی۔"

سکھوں نے برضا و رغبت اس شرط کو قبول کر لیا۔ اور اس وقت سے چمکور میں سور کے گوشت کی سختی سے ممانعت ہو گئی۔

چند سال بعد جب بابا صاحب کی وفات ہوئی تو دور دور سے ہزاروں ہندو' سکھ اور مسلمان ان کے جنازے میں شرکت کے لیے حاضر ہوئے۔ عقیدت مندوں نے اپنے ہاتھ سے بابا صاحب کا مقبرہ تعمیر کیا۔ مقبرہ ایک سادہ سی چار دیواری پر مشتمل تھا۔ بابا صاحب کی وصیت کے مطابق اس پر چھت نہ ڈالی گئی۔

بابا صاحب کی زندگی میں ہی یہ رسم چل نکلی تھی کہ گاؤں میں آنے یا گاؤں سے جانے والی ہر برات ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتی تھی۔ بابا صاحب کچے چاولوں میں شکر ملا کر ایک ایک مٹھی براتیوں میں بانٹ دیتے تھے۔ ہندو' سکھ' مسلمان سب اس تبرک کو دولہا دلہن کے لیے نیک فال سمجھتے تھے۔ بابا شہاب الدین کی وفات کے بعد اس رسم میں اور بھی شدت آ گئی۔ اب ہر برات بابا صاحب کے مزار پر حاضر ہوتی۔ براتی لوگ کچے چاولوں میں شکر ملا کر مزار پر پھینکتے' اور پھر ان کو اکٹھا کر کے دوبارہ براتیوں میں

شامیانہ تان کر اس کے نیچے ایک خوبصورت تخت بچھایا۔ اس تخت پر ریشمی تکیوں اور گدوں کے درمیان اس مٹکے کو جما کے رکھ دیا۔ دو خوش پوش نہنگ اکالی ملازم رکھے۔

جو مورچھل پنکھے اٹھائے ہر وقت حاضر رہتے تھے' اور بڑے ادب سے مٹکے پر آہستہ آہستہ پنکھا ہلاتے رہتے تھے۔ چودھری مہتاب دین نے چار دانگ عالم میں یہ چرچا کر دیا کہ یہی وہ مقدس مٹکا ہے جس میں بابا شہاب الدین نے گرو صاحب کو چھپا کے رکھا تھا۔ پہلے اکا دکا سکھ مٹکے کی زیارت کے لیے آئے۔ پھر عقیدت مند دیویاں چڑھاوے کے پھول' حلوہ' مٹھائیاں اور پھل لا کر روشن کرنے لگیں۔ چند مہینوں کے بعد جب "سنگھ سبھا" کے موقع پر چمکور میں سکھوں کا سالانہ اجتماع ہوا تو ہزاروں زائرین نے مٹکے کو تعظیم دی۔ چودھری مہتاب دین نے تعظیم دینے کا عملی طریقہ یہ رائج کر رکھا تھا کہ عقیدت مند پہلے ہاتھ جوڑ کر مٹکے کو نمسکار کرتے تھے' پھر گھٹنوں کے بل جھک کر اسے بصد ادب و احترام چھوتے تھے اور آخر میں چاندی کے روپوں یا سونے کی مہروں کا نذرانہ مٹکے میں ڈال دیتے تھے۔ پہلی سنگھ سبھا پر ڈیڑھ دو ہزار روپے جمع ہوئے۔ دوسری پر پانچ چھ ہزار۔ اور اسی طرح بڑھتے بڑھتے آخر ایسا وقت بھی آیا کہ سنگھ سبھا کے روز مٹکا بار بار بھرتا تھا اور بار بار خالی ہوتا تھا۔

پانچ سات برس میں چودھری مہتاب دین ایک معمولی نیل فروش سے ترقی کر کے لکھ پتی رئیس بن گئے۔ چمکور کے ارد گرد انہوں نے سینکڑوں ایکڑ اراضی خرید لی' اور بابا شہاب الدین کے کچے مکان کو مسمار کر کے ایک عالیشان حویلی تعمیر کروا لی۔ جس کے چوبارے کی چھت بلندی میں آس پاس کے گردواروں کے کلس کا مقابلہ کرتی تھی۔ گرنتھیوں کو یہ گستاخی ناگوار گزری۔ یوں بھی کچھ عرصے سے جملہ گرنتھی چودھری مہتاب دین سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ مٹکے کی بڑھتی ہوی مقبولیت نے گردواروں کی آمدنی پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا اور چودھری مہتاب دین کی روز افزوں امارت میں گرنتھیوں کو اپنے حقوق کا خون نظر آ رہا تھا۔ ادھر سکھوں میں صلاح مشورے شروع ہوئے کہ چودھری مہتاب دین کے چوبارے کی بلندی گردواروں کے کلس سے بہرحال کمتر ہونی

چاہیے۔ ادھر چودھری صاحب نے نہلے پہ دہلا مارا۔ اور اس سازش کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے انہوں نے اپنے چوبارے کی چھت پر سکھ پنتھ کے بیشمار جھنڈے گاڑ دیئے۔ اندر وہی زرکار شامیانہ تان کر تخت پوش بچھایا' اور تخت پوش پر ریشمی گدوں اور گدیلوں کے درمیان نیل کا خالی مٹکا جما کے رکھ دیا۔ اب یہ کمرہ "چوبارہ مٹکا صاحب" کہلانے لگا' اور سکھوں میں دور دور تک شہرت ہو گئی کہ واہ بھئی واہ! چودھری مہتاب دین نے بھی کمال کر دیا۔ اپنے خرچ پر مٹکا صاحب کے لیے ایسا بلند و بالا چوبارہ بنایا ہے' کہ چمکور کے گردواروں کو بھی مات کر دیا۔

ہر سنگھ سبھا کے بعد چودھری مہتاب دین سونے چاندی کے سکوں کو گلا کر سلاخوں میں ڈھال لیتے تھے۔ اور ان سلاخوں کو تانبے کی گاگروں میں بھر کر اپنی حویلی کی اندرونی دیواروں میں خفیہ طور پر گاڑ دیتے تھے۔ اس خزانے کی حفاظت کے لیے چودھری صاحب نے ایک نرالی ترکیب نکالی۔ انہوں نے آٹھ دس قاری اور حافظ جمع کر کے ملازم رکھ لیے۔ اندر کے کمرے میں ہر قاری باری باری دو دو تین گھنٹے بابا شہاب الدین کے لیے قرآن خوانی کرتا تھا۔ ایک دو نوکر ان کی خدمت پر ہمہ وقت مامور رہتے تھے چنانچہ اندرونی کمروں میں چوبیس گھنٹے چراغ جلتا تھا اور قرآن خوانی ہوتی تھی۔ ایک پنتھ دو کاج -------- ہم خرما و ہم ثواب۔ بابا شہاب الدین کی روح کو ایصال و ثواب بھی ہوتا رہتا تھا اور چودھری مہتاب دین کے گڑے ہوئے خزانے کی حفاظت بھی بعنوان شائستہ ہوتی رہتی تھی۔ دن رات قرآن خوانی کی خبر پھیلی تو لوگوں نے فرط حیرت و مسرت سے اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ واہ بھی واہ! چودھری مہتاب دین کی کیا بات ہے۔ بابا صاحب کی روح پاک کے لیے دن رات چراغ جلاتا اور قرآن شریف پڑھواتا۔ چودھری صاحب نے بھی اپنی سعادت مندی کا مزید ثبوت دینے کے لیے بابا شہاب الدین کے مزار کی مرمت پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ قبر کا تعویذ بیش بہا سنگ مرمر کا بنوایا اور فرش اور دیواروں پر بے شمار چھوٹے چھوٹے خوشنما شیشے چڑھوا دیئے۔ اب مزار پر ایک چراغ جلتا تھا' فرش اور دیواروں پر اس کے سینکڑوں عکس جگمگا اٹھتے تھے۔ عقیدتمند سرشار ہو

کر جھومتے تھے۔ اور چودھری مہتاب دین کی امارت اور سخاوت کے گن گاتے تھے۔

دین کی طرف سے بے نیاز ہو کر اب چودھری مہتاب دین نے اپنی دولت کا رخ دنیا کی طرف بھی موڑنا شروع کیا۔ حویلی کے بڑے احاطے میں صبح و شام دربار لگا کر بیٹھنے لگے۔ سرخ بانات پر سنہری گوٹ کا شامیانہ لگتا تھا۔ نقرئی پایوں والی زرکار مسند پر چودھری صاحب خود بیٹھتے تھے۔ پیچھے آٹھ دس چوبدار شام دار عصا لیے مستعد کھڑے رہتے تھے۔ دائیں بائیں خوش پوشاک خادم دست بستہ حاضر رہتے تھے۔ سامنے درباریوں کی نشستیں تھیں۔ درباریوں میں قل اعوذیئے ملاؤں' شرادھ کھانے والے پنڈتوں اور بھنگ کے رسیا نہنگ اکالیوں کی اکثریت تھی۔ ان لوگوں کو اپنے دربار سے وابستہ رکھنے کے لیے مہتاب دین طرح طرح کے پاپڑ بیلتے تھے۔ مولویوں کے لیے دو وقت پلاؤ' گوشت اور مرغ پکتے تھے۔ پنڈتوں کے لیے پوری کچوری' حلوے اور کھیر کا دور چلتا تھا۔ نہنگ اکالیوں کے لیے بڑے بڑے کونڈوں میں بھنگ بھگوئی جاتی تھی اور بالٹیاں بھر بھر کے تقسیم ہوتی تھی۔ یوں بھی گرد و نوا کے اٹھائی گیرے' رسہ گیر اور نامی گرامی چور اچکے وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہتے ہیں اور چودھری مہتاب دین کے ساتھ ذاتی رابطہ قائم رکھتے تھے۔ اپنی نوابی کا مکمل ٹھاٹھ جمانے کے لیے چودھری صاحب نے چھ چھ فٹ کے پچاس تنومند گھڑ سواروں کا دستہ بھرتی کیا۔ اور اپنی سواری کے لیے ایک بوڑھا سا ہاتھی بھی کہیں سے خرید لائے۔ اس ہاتھی پر چاندی کا ہودہ لگا کے چکور کے گلی کوچوں میں ہوا خوری کے لیے نکلا کرتے تھے۔ مضافات میں اپنی زمینداری کا دورہ کرنے کے لیے وہ اور ان کا عملہ رتھوں پر سوار ہوتا تھا۔ ان رتھوں کے لیے انہوں نے ہریانے کے چاق و چوبند بیلوں کی خوبصورت جوڑیاں پال رکھی تھیں۔ جب بیل رتھوں میں جتتے تھے تو ان پر زر بفت کے جھول ڈالے جاتے تھے۔ گلے میں چاندی کی ننھی ننھی گھنٹیاں لٹکتی تھیں اور سینگوں پر سونے کے خول چڑھائے جاتے تھے۔ اپنے بیلوں سے چودھری مہتاب دین کو خاص الفت تھی۔ ہر صبح وہ ان کا چارہ اپنے سامنے ڈلواتے تھے۔ دن میں کئی بار ان پر پھریرا ہوتا

تھا' اور ہر جمعرات کو خالص گھی اور شکر میں مکی کی روٹی کی چوری کوٹ کر انہیں کھلائی جاتی تھی۔ رتھ کھینچنے کے بعد بیلوں کو پانی میں گلاب کا عرق ملا کر پلایا جاتا تھا۔

جوں جوں دولت کی ریل پیل بڑھتی گئی' چودھری مہتاب دین کی دلچسپیاں بھی گھوڑوں' بیلوں اور ہاتھیوں کی دنیا سے نکل کر اپنی جولانیوں کے لیے نئے نئے میدان مارنے لگیں۔ طبیعت میں اقتدار کی ہوس اور دماغ پر امارت کا بھوت سوار تھا۔ ان کی سب سے عزیز خواہش تھی کہ چار دانگ عالم میں ان کے نام کا ڈنکا بجے۔ جس طرف وہ گزر جائیں' لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہیں' یہ چودھری مہتاب دین کی سواری جا رہی ہے۔ ''چوبارہ مٹکا صاحب'' کے مالک' راجوں کے یار غار' مہاراجوں کی ناک کے بال چودھری مہتاب دین' جن کے جاہ و جلال اور تزک و احتشام کے سامنے سارے ماجھے میں کسی اور کا چراغ نہیں جل سکتا۔ لیلائے آرزو کے اس جنون میں چودھری صاحب نے سب سے پہلے روپڑ کے راجہ بھوپ سنگھ کو بڑی خوشامد سے چمکور صاحب تشریف لانے کی دعوت دی۔ بھوپ سنگھ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے روپڑ کا حاکم مقرر کر کے بھیجا تھا۔ دریائے ستلج کے کنارے اس چھوٹے سے شہر کی اہمیت ابتدا میں صرف اتنی تھی کہ یہاں سے پٹیالہ' جنید اور نابھ کے راجواڑوں پر نظر احتساب رکھنا آسان تھا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کا دام اقتدار پھیلتا پھیلتا دریائے ستلج تک پہنچ گیا' اور انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ایک سرحدی شہر کی حیثیت سے اب روپڑ کو بڑا اہم مقام حاصل ہو گیا۔ راجہ بھوپ سنگھ نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انگریزوں کے خلاف رنجیت سنگھ کے ساتھ' اور رنجیت سنگھ کے خلاف انگریزوں کے ساتھ اس نے ساز باز کا کچھ ایسا جال بنا کہ دونوں بھوپ سنگھ کو اپنا جگری دوست ماننے لگے اور سازشوں کے اس الجھاؤ میں بھوپ سنگھ رفتہ رفتہ روپڑ کا خود مختار حکمران سا ہو گیا۔ لاہور کا دربار اور انگریزوں کے ایجنٹ راجہ بھوپ سنگھ کو منہ مانگی رقمیں بھیجتے رہتے تھے۔ جنہیں وہ شراب' کباب اور عورت پر بے دریغ خرچ کر ڈالتا تھا۔ اگر کبھی یہ رقمیں وصول ہونے میں تاخیر ہو جاتی' تو بھوپ سنگھ

کے سپاہی روپڑ کے گرد و نواح میں نکل جاتے تھے۔ اور دن دیہاڑے ڈاکے ڈال کے سونا چاندی اور غلہ کے علاوہ گائے' بھینسں' گھوڑوں اور جوان عورتوں کو بھی ایک ہی لاٹھی سے ہانک لاتے تھے۔ راجہ بھوپ سنگھ عرصہ سے چودھری مہتاب دین کی دن دگنی رات چوگنی امارت کے چرچے سن رہا تھا۔ اسے وہ طلسماتی مٹکا دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ جو سال میں کئی بار دولت کے انبار اگلتا تھا۔ اس کے علاوہ چمکور صاحب کے مقدس گردواروں کی زیارت بھی ایک بہانہ تھی۔ چنانچہ جب بھوپ سنگھ کو چودھری مہتاب دین کا دعوت نامہ ملا تو اس نے بسر و چشم قبول کر لیا۔ یہ خبر سن کر چودھری صاحب کا سر وفور مسرت سے چکرانے لگا۔ اور انہوں نے فوراً بابا شہاب الدین کے مزار پر حاضر ہو کر دو نفل شکرانہ ادا کئے۔

راجہ بھوپ سنگھ کی خاطر تواضع اور استقبال کے لیے چودھری مہتاب دین نے جس پیمانے پر انتظامات شروع کئے وہ اپنی مثال آپ تھے۔ سارے گاؤں کے در و دیوار پر چودھری صاحب نے اپنی جیب سے سفیدی پھروائی۔ گلی کوچوں میں حلوان بچھایا۔ بچوں کو نیلے اور سبز ریشم کی وردیاں سلوا کے دیں۔ وہ رنگ برنگی جھنڈیاں لے کر صبح و شام جلوس نکالتے تھے اور نعرے لگانے کی مشق کرتے تھے۔ ہر مشق کے بعد انہیں دودھ جلیبی اور موتی چور کے لڈو بانٹے جاتے تھے۔ پانڈوانہ کے میدان میں راجہ بھوپ سنگھ کے سواروں اور سپاہیوں کے لیے خیموں اور شامیانوں کی قطاریں ایستادہ ہو گئیں جن میں سینکڑوں مشعلوں' شمعوں اور فانوسوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گرد بٹھانے کے لیے بیسیوں سقے صبح شام چاروں طرف چھڑکاؤ کرتے تھے۔ چھڑکاؤ کے پانی میں عرق گلاب کی بوتلیں بڑی فیاضی سے ملائی جاتی تھیں۔

چودھری مہتاب دین کی حویلی کے مردانے میں راجہ بھوپ سنگھ کی رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مہمان خانے کی دیواروں پر ابرق ڈال کر سفیدی کرائی گئی تھی۔ دروازوں پر زری اور کمخواب کے پردے لٹکائے گئے تھے۔ اور فضا کو ہر لحظہ معطر رکھنے کے لیے کئی

ملازم عطر کی پچکاریاں اٹھائے مستعد کھڑے رہتے تھے۔

راجہ بھوپ سنگھ کو چکور صاحب میں صرف ایک دن اور ایک رات قیام کرنا تھا۔ ان کی آمد سے ایک ہفتہ قبل راجہ صاحب کے کچھ افسر انتظامات کا جائزہ لینے تشریف لائے۔

انہوں نے تقریباً ہر چیز میں کچھ نہ کچھ مین میکھ نکالی۔ اور راجہ صاحب کے قیام کو آرادم دہ بنانے کے لیے چودھری مہتاب دین کو بہت سے مفید مشوروں سے نوازا۔ ایک مشورہ یہ تھا کہ راجہ بھوپ سنگھ کے لیے اعلیٰ درجہ کی شراب کثیر مقدار میں موجود ہو۔ شراب کے ساتھ کباب بھی لازمی ہیں' لیکن گوشت حلال نہ ہو' خالص جھٹکا ہو۔

شراب اور کباب کے بعد راجہ صاحب صرف سور کا گوشت نوش فرماتے ہیں۔ سور جوان اور فربہ ہوں اور کھانے کے بعد اعلیٰ درجہ کے ناچ گانے کی محفل برپا ہو' تو چودھری صاحب کے ذوق میزبانی پر راجہ صاحب کی خوشنودی کی مہر ثبت ہونا امر یقینی ہے۔

یہ ہدایات سن کر چودھری مہتاب دین ایک لحظہ کے لیے سکتے میں آ گئے۔ ان کی رگوں میں بابا شہاب الدین رحمتہ اللہ علیہ کے خون کا جو حصہ تھا' اس نے دم بھر کے لیے جوش مارا۔ لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سونے چاندی سے بھری ہوئی گاگروں کا خوش آئند تصور خون کے جوش پر غالب آ گیا۔ اور جاہ و جلال کی شہرت نے موروثی توہمات کے تانے بانے ادھیڑ کر پھینک دیئے۔ چودھری صاحب نے اپنا خاص رتھ دو خوش سلیقہ مصاحبوں کے ساتھ انبالہ کی طرف بھگایا تا کہ یکتائے روزگار موسیقار جھمکا جان اور جگا چودھری کی مشہور عالم رقاصہ ترنجن بائی کو جس قیمت پر ہو سکے اپنے ساتھ لوا لائیں۔ دونوں کے ساتھ تین تین ہزار روپیہ نقد' ایک ایک جڑاؤ گلوبند اور دو دو شاہانہ جوڑوں پر معاملہ طے ہوا۔ اور پانڈوانہ کے میدان میں ان کے طائفوں کے لیے کئی ایک اور خیمے بھی نصب ہو گئے۔

شراب کے لیے چودھری صاحب نے اپنے گماشتے لدھیانہ روانہ کئے۔ وہاں پر انگریزوں کا پولٹیکل ایجنٹ کرنل ویڈ تھا۔ وہ ریشہ دوانیوں کے علاوہ در پردہ انگریزی شراب کا بیوپار بھی کیا کرتا تھا۔ چودھری مہتاب دین کے آدمی اس سے منہ مانگی قیمت پر اعلیٰ درجہ

کی ولایتی شراب کی تین چار پیٹیاں خرید لائے۔

فربہ اور جوان سور فراہم کرنے کے لیے چودھری صاحب کو البتہ قدرے دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے وہ گردواروں کے گرنتھیوں کے پاس گئے کہ وہ اپنی وساطت سے منہ مانگے داموں پر چند ایک اچھے سور منگوا دیں۔ لیکن سکھ گرنتھیوں اور پاٹھیوں نے واہگورو' واہگورو کر کے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ ہم بابا شہاب الدین کے ساتھ اپنے عہد کو توڑنے کے روا دار نہیں ہیں۔ ہر چند چودھری مہتاب دین نے انہیں یقین دلایا کہ عہد نامہ کی شکست و ریخت کا وبال خود ان کی اپنی گردن پر ہو گا' لیکن گردوارہ دمدمہ صاحب کے بوڑھے گرنتھی گیانی کھڑک سنگھ نے انہیں سختی سے ڈانٹ دیا۔ "چودھری مہتاب دین' تم اپنے آپ کو کس کھیت کی مولی سمجھتے ہو؟ آج مرے کل دوسرا دن۔ کسی کو تمہارا نام بھی یاد نہ رہے گا۔ لیکن بابا شہاب الدین کا دربار اور سکھ دھرم تو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کے معاہدہ کو ہاتھ لگانے والے ہم تم کون؟

چودھری صاحب کا بس چلتا تو وہ وہیں کھڑے کھڑے گیانی کھڑک سنگھ کا منہ نوچ لیتے۔ لیکن راجہ بھوپ سنگھ کی آمد کے موقع پر سکھوں سے لڑائی جھگڑا مول لینا قرین مصلحت نہ تھا۔ چنانچہ چودھری مہتاب دین خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے اور دل ہی دل میں کڑھتے اور جملہ سکھ پنتھ کو گالیاں دیتے واپس لوٹ آئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے کوئی درجن بھر چماروں کو جمع کیا۔ اور انہیں توڑے دار بندوقوں اور تیز دھار بلموں سے مسلح کر کے بیلے کے جنگلوں میں بھیج دیا کہ وہ تنومند اور جواں سال سوروں کا شکار کر کے لائیں۔

خدا خدا کر کے آخر وہ روز سعید بھی آ پہنچا جس کے انتظار میں چودھری مہتاب دین بیقراری سے گھڑیاں گن رہے تھے۔ راجہ بھوپ سنگھ اپنے جنگی رتھ پر سوار چمکور صاحب تشریف لائے۔ ان کے جلو میں ہاتھیوں' گھوڑوں' شکاری کتوں اور فوجی سپاہیوں کا لاؤ لشکر تھا۔

جب یہ جلوس چمکور صاحب کی حدود میں داخل ہوا' چودھری صاحب کے بیسیوں ملازم پھولوں کے ٹوکرے اٹھائے دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ جہاں جہاں سے یہ قافلہ گزرتا گیا' یہ لوگ گلاب' چنبیلی اور گیندے کے پھول رتھ کے راستے میں بچھاتے جاتے تھے۔ چھوٹے

چھوٹے بچے رنگ برنگی جھنڈیاں لہراتے تھے اور گلی گلی میں باوردی بینڈ سکھوں کے مشہور ترانے بجا بجا کر سلامی دیتے تھے۔

راجہ بھوپ سنگھ نے پہلے سارے گردواروں کی زیارت کی۔ پھر وہ بابا صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے۔ اور اس کے بعد انہوں نے چوبارہ مٹکا صاحب جا کر اس طلسماتی مٹکے کو تعظیم دی' جس کے بطن میں سونا چاندی بڑی افراط سے پیدا ہوتا تھا۔ راجہ بھوپ سنگھ نے نیلے زر بفت کا سرپوش اٹھا کر مٹکے کے اندر للچائی ہوئی نظروں سے جھانکا جو آج خاص طور پر سونے چاندی کے سکوں اور زیورات سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ چودھری متاب دین نے لپک کر مٹکا انڈیل دیا' اور راجہ بھوپ سنگھ کے قدموں میں یہ زریں انبار لگا کر بڑی لجاجت سے عرض کیا۔ "فقیر کا یہ حقیر نذرانہ قبول ہو۔"

راجہ بھوپ سنگھ کے خاص مصاحبوں نے یہ سارا انبار سمیٹ کر بڑے بڑے رومالوں میں باندھ لیا۔ راجہ صاحب نے اظہار خوشنودی کے لیے مٹکا صاحب کو دوبارہ تعظیم دی۔ انگریزی شراب کی بوتلیں راجہ صاحب کو خاص طور پر پسند آئیں۔ سر شام پانڈوانہ کے میدان میں بڑے بڑے سوروں کی کھالیں اترنے لگیں۔ اور رات گئے جب جھمکا جان اور ترنجن بائی کے طائفے اپنا اپنا ساز و سامان سجا کر محفل میں جم گئے' تو یکایک چمکور کے ہندو' مسلمان اور سکھ بڑے بوڑھے اپنے گھروں کی کنڈیاں چڑھا کر اندر دبک کر بیٹھ گئے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں آج پہلی مرتبہ چمکور میں بر سر عام سور کا گوشت کاٹا گیا تھا۔ آج تک اس قصبہ کی فضا جھمکا جان کے طبلے کی تھاپ اور ترنجن بائی کے گھنگھروؤں کی جھنکار سے ناآشنا تھی۔ رات کے بڑھتے ہوئے سناٹے میں جب ان سازوں کی آواز فضا میں دور دور تک لہرائی تھی تو گاؤں والوں کے دل دھک دھک کرنے لگے تھے۔

خوش عقیدہ عورتیں جو ہر جمعرات کو بابا صاحبا کے مزار پر دیا جلانے جاتی تھیں' سہم سہم کر کوٹھوں کی منڈیر سے لگی بیٹھی تھیں۔ طوفان زدہ اندھیری راتوں میں وہ ان ہی کوٹھوں پر چڑھ چڑھ کے ان مقدس چراغوں سے اپنی مرادیں مانگا کرتی تھیں جو بابا صاحب کے فیض سے پانڈوانہ کے میدان میں روشن ہوا کرتے تھے۔ آج اسی میدان میں رنگ

و بو کا ایک سیلاب سا آیا ہوا تھا۔ قندیلوں اور شمعوں کی ضیا تا حد نظر جگمگا رہی تھی۔ لیکن شراب میں بد مست فوجیوں کی ہر بنکار کے ساتھ گاؤں والیوں کے دل لرزنے لگے تھے' جیسے کوئی زبردستی ان کی بانہیں پکڑ کر کھینچ رہا ہو۔ بے زبان کنواریاں جو سپنوں کی بارات لے کر بابا صاحبا کے مزار پر کچے چاول اور شکر کی مٹھیاں بھر بھر کر نچھاور کیا کرتی تھیں' یوں حیران پریشان تھیں جیسے بھرے ہوئے چوراہے پر بر سر عام ان کا سہاگ لٹ رہا ہو۔ سارا گاؤں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح انجانی فضاؤں میں ڈگمگا رہا تھا۔ روایات کی ڈور ٹوٹ گئی تھی۔ ثبات کا پیچ کٹ گیا تھا۔ سکون کی دولت لٹ گئی تھی۔ تاریخ کے سانچے بے نور ہو گئے تھے۔ وقت کا پاسبان سو گیا تھا۔ صدیوں کے سکوت کو فقط ایک رات کے شور نے نگل لیا تھا۔

دوسری صبح نور کے تڑکے جب راجہ بھوپ سنگھ اور اس کا لاؤ لشکر رخصت ہو کر چلا گیا تو چمکور صاحب کی صورت یوں نکل آئی جیسے ہزاروں گھوڑوں نے کسی خوبصورت قبرستان کو پاؤں تلے روند ڈالا ہو' تھکے ہارے کارندے اور خادم جہاں جگہ ملی پڑ کر سو گئے۔ اندر حویلی میں چودھری مہتاب دین بھی ایک تخت پوش پر لیٹے کروٹیں بدل رہے تھے۔ ایک دو خاص مصاحب ان کا سر اور پاؤں دبا رہے تھے۔ کئی روز کے پے در پے رت جگے نے انہیں چور کر دیا تھا۔ یوں بھی کل رات سے وہ کچھ زیادہ ہی کسل مند تھے۔ رقص و نغمہ کی محفل میں راجہ بھوپ سنگھ نے انہیں کئی بار شراب پینے کی دعوت دی تھی' لیکن چودھری صاحب ہر بار خوش سلیقہ حیلوں بہانوں سے ٹالتے گئے۔ انجام کار جب راجہ صاحب خود لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے اور شراب کا جام بہ نفس نفیس ان کے ہونٹوں سے لگا کر کھڑے ہو گئے تو چودھری مہتاب دین کی مروت انکار کی تاب نہ لا سکی۔ دوسرا جام انہوں نے جھکا جان کر ہاتھ سے پیا۔ تیسرا ترنجن بائی سے۔ اولین بادہ گساری کے اس دور نے چودھری مہتاب دین کے دل و دماغ میں ایسے ایسے رنگین قمقمے روشن کر دیئے جن کی تجلیوں سے وہ آج تک روشناس نہ ہوئے تھے۔ حویلی

کے در و دیوار ایک خوبصورت غبار میں ڈوب گئے۔ جھکا جان کے گلے سے آواز کی جگہ مہتابیاں سی چھوٹنے لگیں۔ ترنجن بائی کے تھرکتے ہوئے تن بدن میں سونے اور چاندی کے تار لہرانے لگے۔ رنگ و نور کے اس سیلاب میں چودھری مہتاب دین غبارے کی طرح اڑ رہے تھے۔ لیکن جب صبح ہوئی تو ٹوٹتا ہوا خمار چودھری صاحب کے رگ و پے میں ٹیسیں مارنے لگا۔ وہ اپنے تخت پوش پر اوندھے پڑے کراہ رہے تھے۔ اس عالم میں سردار نونہال سنگھ نے انہیں ایک مژدۂ جانفزا سنایا۔

سردار نونہال سنگھ "چوبارہ مٹکا صاحب" کی سیوا پر مامور تھے۔ اور اس روحانی کاروبار میں چودھری مہتاب دین کے دست راست تھے۔

سردار نونہال سنگھ نے چودھری صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "چودھری اٹھو' اس طرح حاملہ عورت کی طرح پڑے پڑے کب تک کراہتے رہو گے؟"

چودھری صاحب اپنا دکھتا ہوا بدن سنبھال کر تخت پوش پر اکڑوں بیٹھ گئے۔

چودھری' ہیرا ہیرے کو کاٹتا ہے۔" سردار نونہال سنگھ نے کہا۔ "شراب کا کسل بھی شراب ہی سے جائے گا۔"

سردار نونہال سنگھ کے اصرار پر چودھری مہتاب دین نے شراب کے ایک دو گھونٹ پیئے تو ان کے کسیلے منہ کا ذائقہ بدل گیا۔ زبان پر تراوت آ گئی۔ گلا کھل گیا اور جسم کے دکھتے ہوئے جوڑوں پر از سر نو نشاط عود کر آیا۔ زندگی کے کیف کا یہ تیر بہدف نسخہ چودھری صاحب کو بہت پسند آیا۔ انگریزی شراب کی بچی کھچی بوتلیں جو ٹوکرا بھر کر باہر بھجوائی جا رہی تھیں' انہوں نے واپس منگوا لیں اور اپنے دیوان خانے کی الماری میں احتیاط سے رکھ کر تالا لگا دیا۔

شام کے وقت جب چودھری مہتاب دین ہاتھی پر بیٹھ کر حسب معمول ہوا خوری کے لیے نکلے' تو انہیں اپنے گاؤں کا ماحول کچھ پرایا پرایا سا لگا۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو کلکاریاں مار کر ہاتھی کی سونڈ سے لٹک جاتے تھے اور ہاتھی انہیں اٹھا اٹھا کر چودھری مہتاب دین کی گود میں ڈال دیتا تھا' آج کہیں نظر نہ آئے۔ وہ نوخیز اور شریر لڑکیاں بھی غائب

تھیں جو چودھری کا راستہ روک کر چاندی کے کنگنوں اور سونے کی بالیوں کی فرمائش کیا کرتی تھیں۔ آج کسی نے سر راہ اس کے ساتھ ہلکا پھلکا مذاق نہ کیا۔ وہ سارا گاؤں گھوم آیا' لیکن کسی کوٹھے کی چھت سے دعاؤں کی آواز نہ آئی کہ "او بابا صاحبا کے خوش بخت وارث' اللہ تجھے سدا ہی سکھی رکھے۔" اس بے کیف سیر کے بعد جب چودھری صاحب گھر آئے' محجوب اور شرمندہ سے تھے۔ لیکن سردار نونہال سنگھ نے شراب کی بوتل کھول کر سامنے رکھ دی۔ دو تین پیگ پی کر چودھری صاحب پھر چہک اٹھے۔ چمکور کی سنسان گلیاں جادو کے زور سے پھر آباد ہو گئیں' خاموش کوٹھوں پر خوبصورت پریوں کے جھرمٹ ناچنے لگے۔ آسمان پر قوس قزح چھا گئی۔

راجہ بھوپ سنگھ نے خوش ہو کر چودھری مہتاب دین کو اپنے ہاتھ سے کئی خط لکھ کر دیئے۔ کچھ پروانے کلکتہ میں بڑے بڑے انگریزوں کے نام تھے' جن میں چودھری صاحب کو "وفا شعار حکومت انگلشیہ اور معاون دولت برطانیہ" کے خطابات سے نوازا گیا تھا اور بڑے وثوق سے یہ تصدیق کی گئی تھی کہ راجہ بھوپ سنگھ کے بعد ستلج کے اس پار انگریزوں کا سب سے بڑا بہی خواہ چودھری مہتاب دین ہی ہے۔

راجہ بھوپ سنگھ کی دوسری سند مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار کے نام تھی۔ اس میں چودھری مہتاب دین کو سکھ پنتھ کی آنکھ کا تارا اور خالصہ حکومت کا راج دلارا ثابت کر کے یہ سرٹیفکیٹ دیا تھا کہ ستلج کے اس پار راجہ بھوپ سنگھ لاہور دربار کی تلوار اور چودھری مہتاب دین مہاراجہ ادھیر راج کی ڈھال ہے۔ سری اکال پورکھ نے ان دو وفادار سپوتوں کو پیدا کر کے خالصہ دربار کو ستلج پار کی سرحد سے بالکل بے فکر کر دیا ہے۔ راجہ بھوپ سنگھ واہگورو جی کا خالصہ اور چودھری مہتاب دین واہگورو جی کی فتح ہے۔

چودھری مہتاب دین نے ان نایاب پروانوں کے لیے ریشم کی تہہ در تہہ تھیلیاں سلوائیں۔ دن میں کئی بار وہ ان تھیلیوں کو نسلی بٹیروں کی طرح ہاتھ میں لے کر کبھی سہلاتے تھے' کبھی مٹھیاتے تھے۔ رات کے وقت چسکی لگا کر وہ تھیلیوں کو بڑے اہتمام سے کھولتے

اور خطوں کو ادب و احترام کے ساتھ سر آنکھوں سے لگاتے اور جھوم جھوم کر بار بار پڑھتے۔ بادامی کاغذ کے یہ پرزے چودھری صاحب کے ذہن میں جل پریوں کی طرح ناچتے' اور ان کا ایک ایک حرف الہامی پھوار کی طرح ان کی روح کے ریگزاروں پر رنگ برنگ ترشح کرتا۔ لاہور اور کلکتہ کے شاہی درباروں کا تصور ان کے دل و دماغ میں پھلجڑیاں سی چھوڑتا' اور خیالوں کے اس گل و گلزار میں چمکور کی بستی بڑی ذلیل اور بے معنی نظر آتی۔ یہاں کے لوگ طوطا چشم تھے جو چودھری مہتاب دین سے کنی کترا کر گزر جاتے تھے۔ انہوں نے کسی کو قتل نہ کیا تھا۔ کسی کے ہاں ڈاکہ نہ ڈالا تھا۔ کسی عورت کی آبرو نہ لوٹی تھی۔ اس کے برعکس وہ تو لوگوں کی مدد ہی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے تو اس گاؤں کا سر بلند کر دیا تھا۔ چودھری مہتاب دین کے طفیل آج دور دور تک چمکور کا ڈنکا بجتا تھا۔ لیکن یہاں کے کمینے لوگ اپنی عظمت کے اس احساس سے بے بہرہ تھے۔ دن بہ دن مغائرت کے ایک ٹھوس دیوار چودھری صاحب کے گردا گرد اٹھتی چلی گئی اور رفتہ رفتہ وہ ایک کوڑھی کی طرح سب سے کٹ کر الگ تھلگ پڑے رہ گئے۔ صبح کی سیر بند ہو گئی' شام کو ہاتھی کی سواری بھی موقوف ہو گئی۔ دن بھر وہ اپنی حویلی میں بند رہتے تھے' تا کہ گاؤں والوں سے مڈ بھیڑ نہ ہو جو آنکھیں چار ہوتے ہی منہ دوسری طرف پھیر لیتے تھے۔ ماحول کی اس پاگل کر دینے والی بیگانگی سے گھبرا کر چودھری مہتاب دین نے رخت سفر باندھا اور ایک ہاتھی' تین رتھ' پچاس سوار اور بہت سے پیادوں کی جمعیت لے کر انہوں نے کلکتہ کا رخ کیا۔

جب چودھری مہتاب دین کی سواری روانہ ہوئی تو گویا طاعون کا چوہا گاؤں سے نکل گیا۔ لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ بچوں نے از سر نو حویلی کے میدان میں گلی ڈنڈا کھیلنا شروع کر دیا اور جوان لڑکیوں نے حسب معمول کوٹھوں پر بیٹھ کر بابا صاحبا کے دوہے گانا شروع کر دیئے جن میں آئینہ عشق تو عشق الٰہی کا ہوتا تھا لیکن عکس نوخیز مٹیاروں کے آرزو انگیز سپنوں نئی دلہنوں کے متلاطم ولولوں اور

منتظر سہاگنوں کی آس کا پڑتا تھا۔

یہاں تک آ کر دادی اماں کی سینہ بہ سینہ روایات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا۔ چودھری مہتاب دین کہاں گئے؟ ان کا انجام کیا ہوا؟ ------- دادی اماں کوئی بات وثوق سے نہ بتا سکتی تھیں۔ ایک افواہ یہ تھ کہ کلکتہ کی راہ میں کوسی ندی کے کنارے ان کی ملاقات ایک مجذوب سائیں ریتا شاہ سے ہو گئی جو ریت کی مٹھیاں بھر بھر کر منہ میں ڈالتے تھے اور اسے باداموں کی طرح چباتے رہتے تھے۔ چودھری مہتاب دین نے اپنے لاؤ لشکر کو خیر باد کہا' اور قلندرانہ وضع اختیار کر کے ریتا شاہ کی خدمت میں بیٹھ گئے۔ دوسری خبر یہ تھی کہ بنارس کے شہر میں صبح بنارس کی سیر دیکھتے دیکھتے وہ ایک برہمنی پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ جو گنگا میں اشنان کرنے کے بعد سورج دیوتا کو جل چڑھا رہی تھی۔ اس عاشقی میں انھوں نے چار ابرو کا صفایا کروا دیا' اور ایک ہندو سوامی کا چیلا بن کر جوگ لے لیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن ہمارے بڑے بوڑھوں نے اپنی انا کی حفاظت کے لیے یہ مفروضہ پال رکھا تھا کہ یہ سب پاپڑ بیلنے کے بعد چودھری صاحب لاہور داتا کے دربار میں گوشہ نشین ہو گئے اور چند سال بعد سکھوں کے خلاف کسی معرکے میں جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔ چنانچہ دادی اماں اپنی چادر کا پلو پھیلا کر بڑی عقیدت سے دعا مانگا کرتی تھیں۔ "اللہ چودھری مہتاب دین کو قدم قدم پر جنت نصیب کرے۔ وہ دین اور دنیا دونوں سے سرخرو ہو کر اگلے جہان سدھارا۔"

مجھے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ چودھری مہتاب دین میدان جہاد میں شہید ہوئے تھے۔ یا سائیں ریتا شاہ کے قدموں میں فوت ہوئے تھے یا بنارس کی ہندو برہمنی کے جوگ میں سورگباش ہو گئے تھے۔ میرے دل و دماغ پر تو ان کے سیماب کی طرح مضطرب کردار کی بوقلمونی نے ایسی گرت جما لی تھی جیسے بڑے سائز کا مقناطیس چٹکی بھر لوہ چون کو اپنی کشش میں جکڑ لیتا ہے۔ میرے ذہن سے ہری ٹا کیز جموں کی گیٹ کیپری اور ریلوے ٹرین کا گارڈ بننے کے خیالات کافور کی طرح اڑ گئے۔ اور چودھری مہتاب دین کے نقش قدم پر چلنے کی آرزو نے مجھے مگر مچھ کی طرح غڑاپ سے نگل لیا۔

عجیب و غریب خواہشات کی اس دلدل سے مجھے کرم بخش نے نکالا۔
کرم بخش بچپن ہی سے دادی اماں کا ملازم تھا۔ اب اس کی عمر ستر برس سے اوپر تھی۔ لیکن وہ دن رات تنومند بیل کی طرح بے تکان کام کرتا تھا۔ اس کا تن بدن خار دار کیکر کی طرح سخت اور کرخت تھا۔ لیکن دل بڑا گداز تھا۔ کہنے کو تو وہ بالکل ان پڑھ اور جاہل تھا لیکن یوسف زلیخا کے قصے کی کتاب ہاتھ میں الٹی پکڑ کر وہ صحیح ترتیب سے ساری نظم کے اشعار فر فر سنا دیتا تھا۔ اگر کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی جائے تو اس کی زبان پر نظم کی روانی بھی وہیں رک جاتی تھی۔ وہ خود بھی پنجابی میں بیت کہتا تھا۔ کبھی کبھی چودھری مہتاب دین کے قصے سنا کر جب دادی اماں عجیب سی لے میں بابا شہاب الدین کے گورکھی دوہے الاپنے لگتی تھیں تو کرم بخش بھی پاس بیٹھ کر ہمیں ان کا مطلب سمجھایا کرتا تھا' اور کہیں کہیں بابا صاحب کے کلام اور بیان میں حسب ضرورت اصلاح بھی دیتا رہتا تھا۔ بابا شہاب الدین صاحب کے دوہوں کا رنگ کچھ اس طرح کا ہوتا تھا۔

"او میرے یار' میں نے آج تک تیرے باغ میں قدم نہیں رکھا
میں کیا جانوں تیرے پھول پیلے ہیں یا سرخ ہیں یا سفید ہیں؟
جو تیرا رنگ ہو وہی میرا رنگ ہے
میں تو تیرے باغ میں آنکھوں کے بل جاؤں گی"

"او میرے یار' تیرے دامن کو میں نے کبھی نہیں چھوا
تیرا دامن بادلوں سے پرے ستاروں سے اونچا ہے
میں بچاری تو کبھی تیرے خیال کے دامن کو بھی نہ چھو سکی
تیرا خیال تجھ سے بھی زیادہ تابناک ہے
کیونکہ اس کو میں خود اپنے ہاتھوں سے سجاتی ہوں"

"او میرے یار' رات کی خلوت میں میں نے تجھ کو لمحہ بھر کے لیے آخر پا ہی لیا
اب میری سہیلیاں مجھے طعنہ دیتی ہیں کہ یہ محض خواب تھا

ایسے خواب پر ہزاروں بیداریاں قربان
میں تو اسی کے انتظار میں پڑی سوتی ہوں"

"او میرے یار' میں بھی تو تیرے بہت کام آتی ہوں
دیکھ میں نے تیرے رخ پر اپنے تصور کا حجاب ڈال رکھا ہے
اگر میں اپنے تصور کی آنکھ ذرا سی بھی بند کر لوں
تو ساری دنیا تجھے بے نقاب دیکھ لے گی"

"او میرے یار' تو احد ہے' تو صمد ہے
تو ابد ہے' تو ازل ہے
شکر کر تو میری گلی کا البیلا جوان نہیں
ورنہ میں تجھے خوب ستاتی' خوب ترساتی' خوب تڑپاتی
تجھے بڑی بڑی آزمائشوں میں ڈالتی
اور سارا سارا دن اپنے دروازے کی اوٹ سے جھانک جھانک کر تیرا تماشا دیکھا کرتی"

"او میرے یار' تو عزیز ہے' تو حفیظ ہے
تو کریم ہے' تو حلیم ہے
شکر کر تو میرے سینے کا ارمان نہیں
ورنہ اگر میرا سینہ پھٹ جاتا پھر بھی تو نکل نہ سکتا"

"او میرے یار' تو وہاب ہے' تو ستار ہے
تو تو اب ہے' تو غفار ہے

شکر کر تو ہمارے کھیتوں کا راکھا نہیں
ورنہ میں ہر روز تجھے چوری چوری ملنے آیا کرتی
تو رکھوالی کر ہی نہ سکتا
سارے کھیت کو چڑیاں چگ جاتیں"

"او میرے یار، تو معبود ہے، تو مسجود ہے
تو مقصود ہے، تو موجود ہے
شکر کر تو میں نہیں
ورنہ نہ جانے تیرا کیا حال ہوتا!"

○ ○ ○

ہی یہ حکم بھی سنایا۔ "اگلے سال ورنیکلولر فائنل کا امتحان دینا ہو گا۔ اگر وظیفہ نہ لیا تو کان پکڑ کر سکول سے نکال دوں گا۔"

پہلے روز جب میں اپنی جماعت میں گیا' تو نیا کرتہ' کورے لٹھے کا نیا کھڑ کھڑ کرتا ہوا پاجامہ اور پھندنے والی سرخ رومی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ مجھے اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر بہت سے ہندو اور سکھ لڑک منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں بجانے لگے اور زور زور سے گال پھلا پھلا کر بکرے بلانے لگے۔ ایک لڑکے نے رومی ٹوپی کا پھندنا نوچ کر توڑ لیا اور اسے برش کی طرح اپنے گالوں پر پھیرنے لگا۔ دوسرے نے دھول جما کر ٹوپی کو پچکا دیا۔ تیسرا ٹھوکریں مار مار کر میری پیٹنٹ لیدر کی کالی گرگابی کو مسلنے لگا۔ کئی سکھ لڑکے میرے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے اور لہک لہک کر بھانت بھانت کے آوازے کسنے لگے۔

فوجاں شہروں آئیاں ہیں؟

فوجاں گٹ مٹ کر دی ہیں؟

فوجاں پڑھائی کریں گی؟

فوجاں بابو بنیں گی؟

فوجاں ٹوپی لیتی ہیں؟

فوجاں مسلے ہوتی ہیں؟

ان پے در پے سوالات کے بعد انہوں نے گھونسے تان تان کر ہوا میں گھمائے اور بیک آواز زور زور سے گانے لگے۔ "راج کرو گا خالصہ -------- باقی رہے نہ کو"

اتنے میں کوئی پکارا کہ ماسٹر جی آ رہے ہیں۔ سب لڑکے فوراً شرافت سے اپنے اپنے ڈیسک پر بیٹھ گئے۔ میں اپنی جگہ حیرانی اور پریشانی کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ماسٹر منگل سنگھ اردو اور ریاضی کے استاد تھے۔ انہوں نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا اور رومی ٹوپی کی جگہ پگڑی باندھ کر سکول آنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے تھوڑی

- راج کرو گا خالصہ، باقی رہے نہ کو

دادی اماں اور کرم بخش مجھے بی اے ایس جے ایچ خالصہ ہائی سکول میں داخل کروانے کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔ سکول کا پورا نام بابا اجیت سنگھ ججھار ہری خالصہ ہائی سکول تھا اور گرو کے دو صاحبزادوں کے نام پر قائم کیا گیا تھا جنہیں سکھوں کی فرض روایات کے مطابق مسلمان حاکموں نے ایک ملحقہ گردوارے کی دیواروں میں زندہ گڑوا دیا تھا۔

ہیڈ ماسٹر سوراج سنگھ نے رجسٹر میں میرا نام درج کرنے کے بعد دادی اماں سے پوچھا۔

"تائی، بچے کی عمر دس سال لکھ دوں؟"

دادی اماں کو سارا گاؤں تائی کہا کرتا تھا۔

"پھوٹ تیرا فٹے منہ" دادی اماں نے ہیڈ ماسٹر کو ڈانٹا۔ "تو اندھا ہو گیا ہے، تجھے دکھائی نہیں دیتا؟ میرا پوتا پندرہ برس سے ایک دن کم نہیں۔"

دادی اماں کے نزدیک بچوں کی عمر زیادہ جتانا باعث افتخار تھا۔ اس سے تعلیم بھی جلد ختم ہو جاتی تھی اور نوکری بھی جلد ملنے کا امکان بڑھ جاتا تھا۔

اس مسئلہ پر ہیڈ ماسٹر سوراج سنگھ اور دادی اماں کے درمیان بحثا بحثی ہونے لگی، تو کرم بخش نے نجومی کی طرح زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر زائچہ بنایا اور ثالث بن کر اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ "ماسٹر جی! اس کی عمر تیرہ سال تین مہینے تین دن لکھ دو۔"

ہیڈ ماسٹر نے جز بز ہو کر اٹکل پچو سے رجسٹر میں میری عمر کا اندراج کر دیا اور قبلہ والد صاحب کی وہ ڈائریاں دھری کی دھری رہ گئیں، جن میں انہوں نے ہر بچے کی پیدائش کی ساعت، دن، مہینہ اور سال عیسوی، ہجری اور بکری حساب سے الگ الگ نوٹ کی ہوئی تھیں۔

عمر کے حساب سے ہیڈ ماسٹر نے مجھے دو سال آگے کی کلاس میں داخل کر لیا، اور ساتھ

دیر سبق پڑھایا اور زیادہ دیر بہت سے لڑکوں کی بری طرح پٹائی کی۔

فارسی کے پیریڈ میں پنڈت سری رام نے بھی یہی عمل دہرایا۔ پنڈت جگن ناتھ انگریزی پڑھاتے تھے اور مارنے پیٹنے کی جگہ فقط کان مروڑنے پر اکتفا کرتے تھے۔ البتہ تاریخ اور جغرافیہ کا سبق سکون سے ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ماسٹر تارا سنگھ نہ کبھی ہنستے تھے' نہ مسکراتے تھے' نہ مارتے تھے۔

سکول کا اصلی ہوا ماسٹر منگل سنگھ ہی تھے۔ اردو پڑھانے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اردو کا سبق وہ ٹھیٹھ پنجابی زبان میں دیا کرتے تھے اور اشعار کی تشریح کرنے میں ان کا اپنا ہی نرالا انداز تھا۔ ایک بار غالب کا یہ شعر آیا۔

سادگی و پرکاری' بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرات آزما پایا

اس شعر کو انہوں نے ہمیں یوں سمجھایا۔

"سادگی تے اسدے نال پرکاری' بے خودی تے اسدے نال نال ہشیاری۔ حسن نوں تغافل دے وچ کیا پایا؟ شاعر کہندا اے اس نے حسن توں تغافل دے وچ جرات آزما پایا۔ لئی اپنی جئی گل سی۔ غالب شعر بناندا بناندا مر گیا۔ میں شعر سمجھاندے سمجھاندے مر جانا اے۔ تہاڈے کوڑھ مغزاں دے پلے ککھ نہیں پینا۔ اگے چلو۔"

اردو کے علاوہ ماسٹر منگل سنگھ علم ریاضی میں بھی کامل تھے۔ یہ اور بات ہے کہ سوالات حل کرتے وقت جمع' تفریق' تقسیم کی جگہ وہ طلباء پر ضرب کا عمل زیادہ بروئے کار لاتے تھے۔ حقیقتاً ان کو اصلی شرح صدر صرف زد و کوب کے فن میں حاصل تھا۔

ذرا سی بھول چوک پر وہ قصاب کی طرح طالب علم پر لپکتے تھے۔ اسے گردن سے دبوچ کر ہوا میں اچھالتے تھے اور پھر اس پر لاتوں' مکوں اور تھپڑوں کی ایسی تابڑ توڑ بارش برساتے تھے کہ دیکھنے والوں کو بھی دن میں تارے نظر آنے لگتے تھے۔ ہر روز ایسی

دو دو تین تین پٹائیاں دیکھ کر سکول کا ایک ایک لمحہ میرے لیے سوہان روح بن گیا۔ ہر وقت سر پر خوف کی ننگی تلوار لٹکتی رہتی تھی کہ نہ جانے کس وقت اس مار پیٹ کا قرعہ فال اچانک میرے نام نکل آئے۔ یہ خیال آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور سر سے پاؤں تک پسینہ چھوٹنے لگتا تھا۔

ایک روز میں تیار ہو کر سکول جانے کو تھا' کہ گھر میں کسی کو زور سے چھینک آئی۔ دادی اماں نے چھینکنے والے کو بری طرح کوسا اور مجھے واپس بلا کر بٹھا لیا۔ کیونکہ کام پر روانگی کے وقت کسی کا چھینک دینا بد شگونی کی علامت تھی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد مجھے دوبارہ سکول سدھارنے کی اجازت ملی لیکن اس بد شگونی نے میرے پاؤں من من کے بھاری کر دیئے۔ میرے دل کو یقین سا ہو گیا کہ آج کا دن ہی وہ روز موعود ہے جب ماسٹر منگل سنگھ کے ہاتھوں میری پٹائی کی باری آنے والی ہے۔ اس خوف کا بھوت میرے سر پر کچھ ایسی شدت سے سوار ہو گیا کہ میں نے سکول جانے کی بجائے سیدھا نہر کی راہ لی۔ نہر سرہند کے کنارے بیریوں کے جنگل تھے' آموں کے باغ تھے اور کھجوروں کے جھنڈ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ میں بڑے مزے سے بیر چننے' کچی امبیاں اور کھجوریں کھانے میں مصروف تھا کہ ایک جگہ اچانک کرم بخش سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ وہ مویشیوں کے لیے چارہ لانے شاملات دیہہ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے بھاگ کر کچھ جھنڈوں میں روپوش ہونے کی کوشش کی تو اس نے لپک کر میرا ٹیٹوا لیا۔ مجبوراً میں نے بڑی درد ناکی سے سکول کی ساری رام کہانی اسے سنا دی۔

"اب مدرسے نہیں جاؤ گے؟" کرم بخش نے پوچھا۔

"بالکل نہیں جاؤں گا۔" میں نے شد و مد سے جواب دیا۔

"ہاں جی ہاں" کرم بخش بولا۔ "کتابوں میں کیا رکھا ہے؟ عیش کی زندگی تو میری طرح گھاس کھودنے میں ہے۔ بچو' آؤ آج تمہیں یہ کرتب بھی سکھا دوں۔"

میں خوش خوش کرم بخش کے ہمراہ چل پڑا۔ وہ بڑے آرام سے برہنہ پا چلا جا رہا تھا۔ تیز تیز نوکیلی سولوں والے کھجور کے سوکھے ہوئے ڈھوڑے جا بجا اس کے پاؤں تلے آتے

تھے اور چرمر چرمر کر کے ٹوٹ جاتے تھے۔ اس کی ایڑیوں میں کئی جگہ بڑے بڑے شگاف تھے۔ ہر سال سردیوں میں وہ قصبہ کے موچی کے پاس جاتا تھا اور جس طرح دوسرے لوگ اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے مرمت کرواتے تھے' کرم بخش کھڑے کھڑے اپنی ایڑیوں کی پھٹی ہوئی کھال سلوا لیتا تھا۔

شاملات دیہہ میں کئی جگہ گھٹنے گھٹنے تک گھاس لہلہا رہی تھی۔ ایک مقام پر کرم بخش نے تیز تیز ہاتھ مار کر لمبی گھاس درانتی سے کاٹنے اور چھوٹی گھاس کھرپے سے کھودنے کا گر مجھے سکھایا اور حکم دیا۔ "جلدی جلدی گھاس کی ایک پنڈ کھود لو۔ ڈنگر بھوکے کھڑے میری جان کو رو رہے ہوں گے۔"

میں درانتی اور کھرپا لے کر شروع کرنے والا تھا کہ کرم بخس نے پکار کر کچھ اور ہدایات دیں۔ بچھو اور کنکھجورا نظر آئے تو خبردار کھرپا اور درانتی خراب نہ کرنا۔ انہیں پاؤں سے مسل کر مار ڈالنا۔ سانپ سنپولیا' بجو یا سنکھ پوٹ ملے تو فوراً مجھے ہاک مارنا۔ میں اجیپھا (وظیفہ) پڑھ کر انہیں پکڑ لوں گا۔"

سانپ سے تو خیر میں واقف تھا لیکن باقی نام میرے لیے اجنبی تھے۔ بجو کے متعلق کرم بخس نے اطلاع دی کہ مہین مہین آنکھوں والا بڑا ہوشیار جانور ہے' اور قبروں سے تازہ مردے نکال کر اکڑوں بٹھا لینا یا کٹھ پتلیوں کی طرح اپنے ساتھ ساتھ چلا لینا اس کا دل پسند مشغلہ ہے۔ سنکھ پوٹ انسان کی گدی پر بیٹھ کر اپنے پنجے پیچ کس کی طرح اس کی کھوپڑی میں گاڑتا ہے اور چونچ سے ٹھونگیں مار مار کر تازہ بھیجا کھانے کا بڑا شوقین ہے۔

کرم بخش تو ایک درخت کے سائے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کمر سے ہزار منکوں والی تسبیح کھول کر وظیفہ کرنے لگا لیکن میری ہمت کے بادبان کی ساری ہوا پھس سے نکل گئی۔ ایک تو مجھ سے گھاس ہی نہ کٹتی تھی' دوسرے قدم قدم پر عجیب و غریب حشرات الارض کا خوف میرے دل پر ہتھوڑے مارتا تھا۔ ایک دو جگہ سوراخوں میں سانپ کی کیچلی پھنسی ہوئی نظر آئی تو میں بھاگ کھڑا ہوا' اور کرم بخش کے پاس آ کر

بڑی عاجزی سے ہتھیار ڈال دیئے۔

"اچھا اچھا' گھاس تو میں کھود ہی لوں گا۔ تم کل سے سکول جاؤ گے نا؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔" میں نے جازم جواب دیا۔

کرم بخش چمک کر اٹھا۔ پہلوانوں کی طرح اس نے مجھے کلاوے میں لے کر ہتکنی لگائی اور پھر پالٹ مار کر منہ کے بل زمین پر گرا دیا۔ اس نے ایک پاؤں میری گردن پر رکھا اور دوسری ایڑی سے میری کمر پر پے در پے ضرب لگانے لگا۔ مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا لیکن تابکئے؟ آخر سکول کے بارے میں بھی میں نے مجبوراً ہتھیار ڈال دیئے۔

"توبہ کرو اور ناک سے زمین پر سات لکیریں کھینچو۔" کرم بخش نے حکم دیا۔

میں نے حکم کی تعمیل کر دی۔

"قسم کھاؤ کہ دوبارہ سکول سے نہیں بھاگو گے۔" کرم بخش نے دوسرا حکم دیا۔

میں نے فوراً قسم کھا لی۔

اس فرض منصبی سے فارغ ہو کر کرم بخش نے گھاس کھودی اور پھر آرام سے بیٹھ کر زمین میں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تین تین چار چار انچ گہرے دو سوراخ کھودے۔ میں سمجھا کہ شاید اب ہم اخروٹ یا بنٹے کھیلیں گے لیکن اس نے بڑی چابکدستی سے زیر زمین ٹنل سی کھود کر دونوں سوراخوں کو آپس میں ملا دیا۔ ایک سوراخ میں اس نے کوئی چیز ایسی ٹھونسی جیسے پائپ میں تمباکو بھرا جاتا ہے۔ دوسرے سوراخ میں اپنے ہونٹ فٹ کر کے وہ منہ کے بل زمین پر لیٹ گیا اور سرکنڈا جلا کر پہلے سوراخ پر رکھ دیا۔ کرم بخش نے زور زور سے دو چار سوٹے مارے' آگ کا شعلہ سا لپکا اور پھر وہ پاس پڑی ہوئی ایک اینٹ پر سر ٹکا کر غٹ کے سو گیا۔ گانجے کے اس عمل کے دو ڈھائی گھنٹے کے بعد جب وہ جاگا تو خوب چست تھا۔

واپسی پر کرم بخس گلہری کی طرح ایک کھجور کے درخت پر چڑھ گیا اور پکی ہوئی رسیلی کھجوروں کا ایک گچھا مجھے کھانے کو دیا۔ ساتھ ہی وعدہ کیا کہ آج کی بات وہ گھر

میں کسی کو نہ بتائے گا۔

دوسرے دن میں نے اپنی قسم توڑ دی اور پھر سکول نہ گیا۔ البتہ کرم بخش کی زد سے محفوظ رہنے کے لیے نہر پر جانے کی بجائے گگا ماڑی چلا گیا۔ گگا ماڑی ایک کچا کوٹھا تھا جو گاؤں سے دو ڈھائی میل باہر ایک لق و دق ریتلے ٹیلے پر بنا ہوا تھا۔ اس کے اندر چکی کے پارٹ کی طرح ایک گول چبوترہ تھا۔ مسلمان اسے گگا پیر کی قبر سمجھ کر یہاں فاتحہ درود پڑھتے تھے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ گگا سائیں کی سمادھی تھی کیونکہ ان کے اعتقاد کے مطابق گگا ایک ہندو پرم ہنس تھا اور مرنے کے بعد اس کی راکھ پر یہ سمادھی بنائی گئی تھی۔ چوہڑے چمار اسے اپنا روحانی پیشوا مان کر طرح طرح کی پوجا پاٹ اور جادو ٹونا کیا کرتے تھے۔ علاقے کے ہیجڑے بھی یہاں جمع ہو کر "گدھے" کی محفل جماتے تھے اور عقیدت مندی سے گاتے اور ناچتے تھے۔

گگا ماڑی کے اندر کچھ لوگ اپنے اپنے طریقے سے گگا پیر کو خراج عقیدت پیش کرنے میں مصروف تھے۔ باہر دو کالے بھجنگ آدمی لنگوٹ باندھے اور گلے میں بڑے بڑے ڈھول لٹکائے دم دھناتی دھکم دھیا' دھکم دھیا کی تال پر زور زور سے ڈھول بجا رہے تھے۔

ان کے گرد چار پانچ آدمی بڑے والہانہ طور پر "حال" کھیل رہے تھے۔ کبھی وہ پنجے اٹھا کر اپنی ایڑیوں پر لٹو کی طرح گھومتے تھے' کبھی زمین پر چار زانو بیٹھ کر مینڈک کی طرح پھدکتے تھے' کبھی سر کے بل کھڑے ہو کر ڈھول والوں کے گرد تیز تیز بیضوی دائرے کاٹتے تھے۔ ان میں ایک شخص جو سب سے زیادہ سرمستی کے عالم میں حال کھیل رہا تھا' وہ کرم بخش تھا۔

کرم بخش کی آنکھوں میں لال لال انگارے چمک رہے تھے۔ اس کی داڑھی کے موٹے موٹے بال غضبناک خار پشت کے کانٹوں کی طرح چہرے پر ایستادہ تھے۔ اس کا انگ انگ یوں تھرک رہا تھا جیسے جال میں پھنسی ہوئی مچھلیاں پھڑک پھڑک کر تڑپتی ہیں۔

منہ سے کوئی لفظ کہے بغیر کرم بخش نے میری گردن ناپی اور ڈھول والوں سے کچھ دور تپتی ہوئی ریت پر کان پکڑوا کر میرا مرغا بنا دیا ایک لڑکے کو اس نے میری چوکیداری

پر مامور کیا اور خود حال کھیلنے والوں کے حلقے میں شامل ہو گیا۔

دھوپ میں کان پکڑے پکڑے میرے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔ ڈھول کی ہر دھمک میرے دل و دماغ پر توپ کے گولے کی طرح برس رہی تھی۔ اگر کوئی اکا دکا راہگیر آپس میں بات چیت کرتے ہوئے قریب سے گزرتے تھے تو ان کی آواز میرے کان میں دیر تک یوں گونجتی رہتی تھی جیسے بہت سے کتے اندھے کنویں مل کر لگا تار رو رہے ہیں۔ معلوم نہیں اس حالت میں ایک گھنٹہ گزر گیا یا ایک سال نکلا یا ایک صدی بیت گئی۔ کیونکہ جب "حال" سے فارغ ہو کر کرم بخش نے مجھے کان چھوڑنے کا مژدہ سنایا تو میری کمر پیر فرتوت کی طرح خمیدہ ہو چکی تھی' اور مجھ سے سیدھا کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ کرم بخش نے پیچھے سے میری بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور اپنا گھٹنا زور سے پیٹھ میں مار کر میری کمر سیدھی کی۔ پھر اس نے حکم دیا کہ زمین پر ناک سے اکیس لکیریں نکال کر توبہ کروں۔

میں نے تپتی ہوئی ریت پر ناک سے اکیس لکیریں نکال دیں۔

"قسم کھاؤ کہ اب پڑھائی سے نہ بھاگو گے۔" کرم بخش کڑکا۔

میں نے بخوشی اللہ کی قسم کھا لی۔

"رسول کی قسم کھاؤ۔" کریم بخش نے کہا۔

میں نے بلا تکلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم بھی کھا لی۔

"قرآن کی قسم کھاؤ۔"

میں نے اس کی بھی تعمیل کر دی۔

"اب اپنی جان کی قسم بھی کھاؤ۔" کرم بخش نے حکم لگایا۔

یہ قسم کھانے سے میں ہچکچا گیا۔ کیونکہ مجھے اپنی جان اللہ اور رسول اور قرآن شریف سے بہرحال زیادہ عزیز تھی۔ کرم بخش نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور میرے منہ پر زناٹے سے ایسا کرارا تھپڑ مارا کہ میرے سر میں بھڑوں کے بے شمار چھتے بھنبھنا اٹھے۔ دوسرا

تھپڑ لگنے سے پہلے میں نے کرم بخش کا حکم مان لیا اور اپنی جان کی قسم بھی کھا لی۔

جان کی قسم توڑنے کے ہولناک نتائج کا کرم بخش نے کچھ ایسا بے سروپا اور بے ربط سا نقشہ کھینچا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آنے لگی۔ ہنسی روکنے کی کوشش میں مجھے ہچکی لگ گئی اور گلے سے رندھی سی آوازیں نکلنے لگیں۔ جیسے بیل کے گلے میں تربوز کا چھلکا پھنس جاتا ہے۔ کرم بخش سمجھا کہ خوف و ہراس سے میری گھگھی بندھ گئی ہے۔ اس تاثر کو مزید کمک پہنچانے کے لیے میں نے اپنے بدن پر مصنوعی کپکپی طاری کی اور کچھ تیز تیز جھرجھریاں بھی لیں۔ کرم بخش خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا۔ اور اس کی انا کی تسکین گرم گرم بھاپ کی طرح اس کے کانوں، ماتھے اور گالوں اور ناک پر چھا گئی۔

کرم بخش کو اچھے موڈ میں دیکھ کر میں نے کہا۔ "چاچا تمہارے پاس تو کوئی جادو ہے۔ میں سکول سے بھاگ کر جدھر جاتا ہوں، تم بھی وہاں آ جاتے ہو۔"

کرم بخش نے اصیل مرغ کی طرح فخریہ چھاتی پھلائی اور دو دن کی لے کر کہنے لگا۔

"جادو ٹونا تو پلید کافروں کا کرتب ہے۔ کرم بخش کے پاس تو رب سچے کا اجیھپا ہے۔ تم دلی جاؤ یا دکھن چلے جاؤ، کرم بخش کا ہاتھ تیری گردن پر اسے جا پڑے گا جیسے مرغی کھنگار پر گرتی ہے۔"

کرم بخش کی مزید خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میں نے کہا۔ "چاچا، تمہارے وظیفے نے تو بڑے بڑے معرکے مارے ہوں گے۔"

"اسیغول تے کچھ نہ پھرول" کرم بخش نے محاورتاً کہا کہ ڈھکی چھپی بات کو زیادہ نہ کریدو۔

"چاچا، وظیفے نے کچھ نہ کچھ تو رنگ لگایا ہو گا۔" میں نے خوشامدانہ اصرار کیا۔

"رہے نام رب سچے دا۔" کرم بخش نے سینہ تان کر کہا۔ "کوئی رنگ جیسا رنگ لگایا ہے؟ بیٹ، بیلے، بار سب جگہ کرم بخش ہی کرم بخش کا نام گونجتا تھا۔ بڑے بڑے

جٹا دھاری مہنت' بھان متی کے جوگی اور گیانی تیرے چاچا کے سامنے آنکھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔"

جوش میں آ کر کرم بخش نے اپنے وظیفے کی کرامات کی محیر العقول داستانوں کا تانتا باندھ دیا۔ بھوت پریت چڑیل' چھلاوہ' چھلیڈا' وڈاوا سے مقابلہ کرنا' جن اتارنا اور لوٹے میں سر بھر کر کے جلا ڈالنا۔ آوہ' پڑآوا' دودھ' مکھن باندھنا اور کھولنا۔ حب اور بغض کے فلیتے جلانا۔ مقہوری احدا کے لیے ہنڈیا چھوڑنا' بلان جلانا۔ آٹے کی پتلیوں میں سوئیاں گاڑ کر دشمنوں کو ایذا پہنچانا۔ سانپ' بچھو اور بھڑ کے کاٹے اور آدھا سیسی درد کو جھاڑنا' داڑھ نکالنا' چور پکڑنے کے لیے لوٹا گھمانا' مجبوری کی حالت میں بقدر ضرورت دست غیب حاصل کرنا۔ یہ سب کرم بخش کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن اس کے جس کمال نے میرے ذہن پر سب سے زیادہ اثر کیا وہ تسخیر محبوب کا عمل تھا۔ بھرے میلے میں بڑی بڑی صاحب حسن و جمال چاٹنیاں اپنے بانکے چھبیلے جوانوں کو چھوڑ کر اس پچٹی ہوئی ایڑیوں اور پیلے دانتوں والے کریہہ المنظر بڈھے کے پیچھے یوں لگ جاتی تھیں جیسے مکھیاں گڑ سے چپک جاتی ہیں۔ کرم بخش کچھ دیر انہیں اپنی ڈور کے ساتھ لگائے گھومتا پھرتا' اور پھر انہیں مٹھائی کے لیے کچھ پیسے دے کر رخصت کر دیتا تھا۔

"تیرے چاچے پر وجود کا عیش حرام ہے۔" کرم بخش نے دبی دبی حیرت سے مجھے بتایا۔

"اسی لیے تو مرشد نے شادی کی اجازت نہیں دی۔"

مجھے اس برہمچاری بڈھے کی حماقت پر ہنسی بھی آئی اور ترس بھی آیا۔ لیکن بظاہر میں نے اس کی اتنی تعریف کی کہ وہ خوش ہو کر مجھے ماگھی بنئے کی دکان پر جلیبیاں کھلانے لے گیا۔ ماگھی رام چمکور صاحب کا واحد حلوائی تھا۔ وہ سارا دن لنگوٹ باندھے بڑے بڑے کڑاہوں میں جلیبیاں تلتا تھا یا موتی چور کے لڈو بناتا تھا۔ جنہیں سکھ جاٹ شرطیں بد بد کر سیروں کے حساب سے وہیں کھڑے کھڑے چٹ کر جاتے تھے۔ ماگھی رام کا بوڑھا باپ ایک میلی سی دھوتی باندھے اور سر پر ڈھیلی ڈھالی پگڑی ٹکائے اکڑوں بیٹھا بھٹی جھونکتا رہتا تھا۔ اس کا چہرا پکے ہوئے اناناس کی طرح پیلی پیلی' گلابی گلابی' گدری

گدری جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور مہین مہین چندھائی ہوئی آنکھوں پر لانبی لانبی سفید بھویں ایسے لٹکتی تھیں جیسے اس نے ماتھے پر ململ کی جھالر ٹانک رکھی ہو۔

دونوں باپ بیٹا کرم بخش کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔

"واہ بھئی واہ' کرم بخشا" ماگھی رام بولا۔ "پرماتما کی کرپا سے تو خود ہی آ گیا۔ میں تو تیری تلاش میں نکلنے ہی والا تھا۔

ماگھی بنئے نے چہک چہک کر ہمیں بتایا کہ پانچ روپے ڈال کر اس نے بازار مائی سیواں امرتسر میں لاٹری کا ٹکٹ لیا تھا۔ لاٹری اس کے نام نکل آئی ہے۔ مال بھی چل پڑا ہے اور آج ہی کشتی سے چمکور پہنچ رہا ہے۔

"کرم بخشا" ماگھی رام نے کہا۔ "تو گڈا (بیل گاڑی) جوڑ کے فٹا فٹ گھاٹ پر پہنچ جا۔ کشتی آتے ہی مال چھڑا کر دکان پر لانا ہے۔ ایک سیر پختہ لڈو تجھے دوں گا۔ آدھ سیر گڑ بیلوں کے لیے ملے گا۔"

"واہ جی واہ" کرم بخش نے ناراضگی سے جواب دیا۔ "کرم بخش تیرے باپ کا نوکر جو ہوا' ادھر تو نے حکم دیا ادھر میں گڈا لے کر نہر پر پہنچا۔ لالہ' کبھی تو نے شیشے میں اپنی صورت بھی دیکھی ہے؟"

"چلو چار آنے نقد بھی لے لینا۔" ماگھی رام نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔ "اس میں جھگڑنے کی کیا بات ہے بھلا؟"

"ہزاروں کا مال مفت آ رہا ہے اور کرم بخش کو چونی پر ٹرخاتے ہو؟ لالہ' تم بڑے ندیدے ہو۔" کرم بخش نے کہا۔

دفعۃً ماگھی رام کے بڈھے باپ نے بھی اپنی چندھیائی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کرم بخش کو غصے سے گھور کر بولا۔ "ہزاروں کا مال کون سالا بکتا ہے' بڑی لاٹری کا ٹکٹ تھا کوئی مخول نہیں۔ لاکھ سے کم کا مال نکلے تو میں پیشاب سے داڑھی منڈوا دوں گا۔"

کچھ مزید چق چق بق بق کے بعد بیل گاڑی کی اجرت طے ہو گئی۔ ایک روپیہ نقد' دو

سیر مٹھائی' بیلوں کے لیے ایک سیر گڑ۔ بیعانہ کے طور پر کرم بخش نے آدھ سیر جلیبیاں پیشگی تلوا لیں' اور ہم مزے مزے سے جلیبیاں ٹھونگتے کھلیان پہنچے۔ کرم بخش نے بیل گاڑی تیار کی اور تھوڑی دیر میں ہم نہر پر کشتی گھاٹ پہنچ گئے۔ ماگھی رام اور اس کا باپ کا پہلے سے آئے بیٹھے تھے اور ایڑیاں اٹھا اٹھا کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دوراہے سے آنے والی کشتی کا انتظار کر رہے تھے۔

خدا خدا کر کے کشتی آئی اور ماگھی رام نے اپنے مال کی بلٹی چھڑائی۔ یہ مال لکڑی کی تین پیٹیوں پر مشتمل تھا' جن پر لوہے کی پتی چڑھا کر میخوں کے ساتھ ٹھونکا ہوا تھا۔ کسی پیٹی کا وزن ڈیڑھ دو من سے کم نہ تھا۔

بیل گاڑی میں ماگھی رام اور اس کا باپ ایک ایک پیٹی پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ گئے۔ تیسری پیٹی پر میں چڑھنے لگا' تو انہوں نے ڈانٹ کر منع کر دیا۔ کیونکہ میرے وزن سے ان کے مال و متاع کے آبگینوں کو لحوق ضرر کا احتمال تھا۔ راستہ بھر باپ بیٹا امید کے عجیب و غریب دشت و دریا میں للچائی ہوئی قیاس کے گھوڑے دوڑاتے رہے۔ لکڑی کی یہ پیٹیاں کبھی ریشم اور زربفت اور کمخواب کے تھان بن جاتی تھیں۔ کبھ ان کے دہانوں سے سونے کے کنگن اور چاندی کے تھال جھانکنے لگتے تھے۔ کبھی ان کے اندر بلوری فانوسوں اور شیشہ آلات کی مدھم سی کھن کھن سنائی پڑتی تھی۔ ماگھی رام کے باپ کی قوت لامسہ پیٹیوں کے اوپر ہاتھ پھیر پھیر کر اب اس یقین کی علی الاعلان تصدیق کرنے لگی تھی کہ یہ مال ڈیڑھ دو لاکھ روپے سے کم قیمت کا نہیں ہو سکتا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ لاٹری کا مال جلد از جلد بیچ باچ کر سارا کنبہ ہردوار جا بسے اور وہاں آرام سے بیٹھ کر رام نام کی مالا جپنے میں مصروف ہو جائے لیکن ماگھی رام کو اس لائحہ عمل سے شدید اختلاف تھا۔

"لو اور سنو۔" وہ حقارت سے ہنسا۔ "باپو کی عقل بھی گھاس چرنے گئی ہے۔ بیکنٹھ سدھارنے کا وقت تو اس کا اپنا آیا ہوا ہے' اور اپنے ساتھ ہردوار ہمیں بھی ہانکتا ہے۔ باپو' تم

جم جم ہردوار جاؤ۔ ہمارے کھانے پہننے کے دن تو اب آئے ہیں۔"

ماگھی رام کا فیصلہ تھا کہ لاٹری کا مال بیچ کر وہ لدھیانہ میں دکان کھولے گا۔ وہ کئی بار لدھیانہ جا کر بائیسکوپ دیکھ آیا تھا۔ فلموں میں ناچتی ہوئی میموں کا نقشہ اس نے کچھ ایسی فصاحت و بلاغت سے کھینچا کہ اس بڈھے کے منہ سے بھی جلیبیوں کے شیرے کی طرح بے اختیار رال ٹپکنے لگی۔ اور وہ بخوشی اس بات پر رضا مند ہو گیا کہ پہلے وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کچھ عرصہ لدھیانہ گزارے گا اور پھر اس کے بعد کسی وقت ہردوارہ کی راہ لے گا۔

پیٹیوں کو دکان کے عقبی صحن میں رکھوا کر ماگھی رام نے سب سے پہلے دو دو لڈو بانٹ کر ہمارا منہ میٹھا کرایا اور پھر کرم بخش کے ساتھ مل کر باپ بیٹا پیٹیاں کھولنے میں مصروف ہو گئے۔ تینوں پیٹیاں سیکنڈ ہینڈ کتابوں' سکولوں کے پرانے رجسٹروں اور استعمال شدہ بہی کھاتوں سے اٹا اٹ بھری ہوئی تھیں۔ چند لمحے سکوت رہا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر ماگھی بنیا اور اس کا باپ زمین پر بیٹھ گئے اور دوہتڑ مار کر اپنا سر پیٹنے لگا۔ جس قسم کا دردناک بین وہ کر رہے تھے اسے دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ دونوں واقعی بری طرح لٹ پٹ گئے ہیں۔

کچھ دیر میں جب یہ آہ و زاری قدرے فرو ہوئی تو کرم بخش نے ان کو سمجھانا شروع کیا کہ چور ہاتھ سے نکل جائے تو دانشمند اس کی لنگوٹی پر ہی صبر شکر کر لیا کرتے ہیں۔ یوں بھی یہ کوئی اتنا گھاٹے کا سودا نہیں رہا۔ پانچ روپے کی لاٹری میں اتنی ردی آ گئی ہے کہ کئی سال تک مٹھائیاں باندھنے کے کام آتی رہے گی۔ باپ تو گھٹنوں میں سر دیئے ہولے ہولے کراہتا رہا لیکن ماگھی رام پاگلوں کی طرح بڑبڑاتا ہوا پیٹیوں کا سامان ایک ایک کر کے باہر نکالتا' اسے الٹ پلٹ کر غور سے دیکھتا اور جب گدڑی میں چھپا ہوا کوئی لعل نظر نہ آتا' تو اسے کھٹاک سے زمین پر دے مارتا۔ جب اس نے بڑی تقطیع کی دو تین موٹی موٹی مجلد کتابیں غصے سے زمین پر پٹخیں تو کرم بخش چیل

کی طرح جھپٹا اور ماگھی رام کا ہاتھ پکڑ لیا اور زور سے چیخا۔ "ہاہا' لالہ' رہے نا اوت کے اوت۔ یہ تو دین اسلام کی کتابیں ہیں۔ پاک کلام کی بے حرمتی ہوئی تو گنڈاسا لے کر تربوز کی طرح سر اتار دوں گا۔ ہاں!"

میں نے ایک جلد کھول کر دیکھی' تو رتن ناتھ سرشار کی فسانہ آزاد تھی۔

"کیوں' ہے نہ دین اسلام کی کتاب؟" کرم بخش نے پوچھا۔

"بڑی مقدس کتاب ہے۔" میں نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔

"میں تو پہلے ہی پہچان گیا تھا' یہ سالا بنیا اس کو بھی کاٹھ کباڑ کی طرح ردی میں پھینک رہا تھا۔" کرم بخش نے فسانہ آزاد کی چار جلدوں کو جھاڑ پونچھ کر آنکھوں سے لگایا۔ اور انہیں ایک طرف بلندی پر رکھ دیا۔

اب کرم بخش نے حکم صادر کیا' کہ میں ساری کتابوں کو دیکھ بھال کر دین اسلام کی کتابیں الگ کر لوں۔" اپنے دین کی کتابیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کافروں کی دکان میں ردی کے طور پر انہیں نہیں چھوڑ سکتے۔"

میں نے بڑی محنت سے جائزہ لے کر کوئی تیس کتابوں کا انتخاب کیا۔ محمد حسین آزاد کی "آب حیات" ڈپٹی نذیر احمد کی "مرات العروس" "ایامٰی" اور "رویائے صادقہ" عبدالحلیم شرر کی "فتح اندلس" "فلورا فلورنڈا" "ملک العزیز ورجنا" اور "فردوس بریں" محمد علی طبیب کی "رام پیاری" محمود میاں رونق کی "حاتم بن طے" عرف "افسر سخاوت" حافظ محمد عبداللہ کی "الہ دین خوش نصیب" عرف "چراغ عجیب" محشر انبالوی کی "آل ذورعین" اور رتن ناتھ سرشار کے "فسانہ آزاد" کی چار جلدیں ملا کر کل ۱۸ کتابیں یہ ہوئیں۔ باقی بارہ جاسوسی ناول تھے جو فضل بک ڈپو لاہور نے شائع کئے تھے۔ ان میں سے پانچ ناولوں کا ترجمہ تیرتھ رام فیروز پوری نے انگریزی زبان سے کیا ہوا تھا۔

کرم بخش ان کتابوں کو اپنی چادر میں باندھنے لگا تو ماگھی رام نے اسے جھڑک کر کہا۔

"یہ کیا باندھ رہا ہے بے سالے؟ تھانے میں پرچہ نہ لکھوا دوں کہیں۔ میرا مال ہے۔ تیرے باپ کی جاگیر تھوڑی ہے؟"

"ہمارے سچے دین کی کتابیں ہیں۔ تیرے پاس کیسے چھوڑ دیں؟" کرم بخش نے مدلل جواب دیا۔

"ہم نے تیرے دین کا ٹھیکہ نہیں لیا ہوا۔" ماگھی رام بولا۔ "ایک ہاتھ سے پیسے رکھ دو' دوسرے ہاتھ سے کتابیں لے جاؤ۔ یہاں تو نقدا نقد سودا ہے۔"

کتابوں کی قیمت پر ماگھی رام اور کرم بخش کے مابین بڑا زبردست ہندو مسلم فساد ہوا۔ دونوں کی گردن کی رگیں چیخ چیخ کر پھول گئیں اور منہ سے جھاگ کے بلبلے اڑنے لگے۔ کوئی گھنٹہ بھر کی بک بک جھک جھک کے بعد ساڑھے چھ روپے پر معاملہ طے ہوا۔ ڈیڑھ روپیہ تو کرم بخش نے اسی وقت ادا کر دیا۔ پانچ روپے کل تک ادھار کر کے ہم نے تیس کتابیں اٹھا لیں۔

"کل صبح رقم پہنچ جائے۔" ماگھی بنئے نے کرم بخش کو خبردار کیا۔ "ورنہ بیاج لگ جائے گا۔"

کتابیں لے کر ہم سیدھے اپنی بیٹھک میں آئے۔ یہ گھر سے کافی دور مسجد کے بالکل ساتھ دو پکے کمرے تھے' جنہیں عام طور پر مردانہ مہمان خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کرم بخش نے ایک الماری صاف کی اور میں نے بڑے احترام سے کتابوں کو اس میں سجا تو دیا' لیکن ساتھ ہی یہ فکر بھی دامن گیر رہی کہ کل صبح تک ماگھی رام کو ادا کرنے کے لیے پانچ روپے کہاں سے آئیں گے۔

"تو پانچ روپے کو روتا ہے؟" کرم بخش نے مجھے تسلی دی۔ "دین پیارے کے لیے کرم بخش کی گردن بھی کٹ جائے تو پروا نہیں۔"

"چاچا' گردن تو مفت کٹ جاتی ہے لیکن ماگھی رام تو نقد مانگتا ہے۔ آخر پانچ روپے تم لاؤ گے کہاں سے؟"

"تو فکر نہ کر۔" کرم بخش نے بڑے وثوق سے کہا۔ "یہ تو دین اسلام کی بات ہے۔ رب سچے نے تو مجھے مجرا دیکھنے کے لیے بھی منہ مانگے پیسے دیئے ہیں۔"

"لیکن چاچا' کل صبح تک پیسے ملیں گے کیسے؟" مجھے یہ خطرہ ستا رہا تھا کہ اگر قرض

جذبات پر مجھے شاباش دی اور بڑی رقت سے مجھے اپنے مرشد کے کچھ عارفانہ بیت ترنم سے سنائے' جن کا مطلب کچھ اس طرح کا تھا کہ دین کے علم میں غوطہ کھاؤ تو موتی مونگا پاؤ' دنیا کے علوم میں کھو جاؤ تو مردار ہڈیاں کماؤ اور کتوں کی طرح بیٹھ کر ساری عمر چباؤ۔

ایک پنتھ دو کاج' آم کے آم گٹھلیوں کے دام -------- سکول کو بھی سلام' ماسٹر منگل سنگھ سے بھی نجات اور تیس ناولوں کی دنیا آگے پیچھے آباد۔ اب میں صبح سویرے تیار ہو کر گھر سے سکول جانے کو نکلتا۔ کرم بخش مجھے بیٹھک میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیتا۔ دوپہر کے وقت وہ کچھ روٹیوں پر تازہ مکھن اور شکر ڈال کے مجھے دے جاتا۔ اور چار بجتے ہی میں بستہ بغل میں دبائے' مسکین صورت بنائے پابندی سے گھر پہنچ جاتا۔ کرم بخش نے ہیڈ ماسٹر سوراج سنگھ کو جا کر بتا دیا' کہ ماسٹر منگل سنگھ کی پٹائی کے خوف سے بچے کا دل دہل گیا ہے۔ اسے تاپ چڑھتا ہے۔ تندرست ہوتے ہی سکول آنا شروع کر دے گا۔

کوئی تین ہفتے میں اسی طرح کرم کتابی بن کر اپنی بیٹھک میں معتکف رہا۔ جتنی محنت میں نے ان ایام میں کی ہے' ساری عمر پھر کبھی نہیں کی۔ بیس بائیس دن کے بعد جب میں نے دوبارہ سکول جانا شروع کیا' تو حبس دم کرنے والے جوگیوں کی طرح میری کایا کلپ ہو چکی تھی۔ ماسٹر منگل سنگھ کے خوف سے زبان میں لکنت کی جگہ "آب حیات" کے پر شکوہ فقرے فراٹے بھرنے لگتے تھے۔ تنہائی میں میری حدیث نفس بھی عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کی عبارت میں ہونے لگی۔ کلاس روم میں تابڑ توڑ تین چار جواب مضمون لکھ کر میں نے اپنا سکہ کچھ ایسا بٹھا لیا کہ کبھی کبھی ماسٹر منگل سنگھ اردو کا سبق میرے سپرد کر کے خود غائب ہو جاتے تھے۔ چار پانچ ہندو لڑکے تو آرام سے سبق پڑھ لیتے تھے۔ لیکن سکھ طالب علم الگ بیٹھ کر بڑا اودھم مچاتے تھے۔ سبق کے دوران وہ "جو بولے سو نہال ----- ست سری اکال" کے نعرے لگاتے رہتے تھے' اور اخیر میں کھڑے ہو کر زور زور سے ڈیسک بجاتے تھے اور میری طرف مکے

ادا نہ ہوا تو ماگھی بنیا کتابیں ہی واپس لے جائے گا۔

"اجیپھا' اجیپھا' بچے اجیپھا" کرم بخش نے دونوں ہاتھوں سے چٹکیاں بجا بجا کر مزے سے کہا۔ "آج رات پرانی باؤلی میں ڈھائی پہر ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر اجیپھا پڑھ دوں گا۔ سورج بعد میں نکلے گا' پیسے پہلے پہنچ جائیں گے۔"

اپنے وظیفے کی شان میں کرم بخش نے پنجابی کے کچھ بیت گا گا کر پڑھے۔ ان میں اللہ کی حمد اور رسول اللہ کی ثنا بھی تھی۔ رسول اللہ کا نام آتے ہی کرم بخش اپنے دونوں ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتا تھا اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگتا تھا۔ کرم بخش کو عقیدت مندی کی آگ میں کھولتے ہوئے پانی کی طرح پیچ و تاب کھاتے دیکھ کر میں بھی اپنی عیاری کا جال بچھا کر تاک میں بیٹھ گیا۔ اور موقع پا کر بڑی صفائی سے اس کی سادہ لوحی کے نہلے پر اپنی مکاری کا دہلا دے مارا۔ وہ پگھلے ہوئے موم کا تودہ بنا بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے فن آذری کے دو چار ہاتھ چلائے اور بڑی آسانی سے اسے اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔

سانچہ یہ تھا کہ خالصہ ہائی سکول کفر کا گہوارہ ہے۔ اسلام کے ارکان خمس کے بجائے سکھوں کے پانچ ککوں -------- کنگھا' کھیس' کچھ' کڑا' کرپان سے واسطہ پڑتا ہے۔ شبد گانے پڑتے ہیں۔ اساوری کے کیرتن میں شامل ہونا ضروری ہے۔ جپ جی اور ارداس کا سیکھنا بھی لازمی ہے۔ گرو گرنتھ کے پاٹھ میں سر زمین پر رکھ کر نمسکار بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور گیانیوں' گرنتھیوں' پاٹھکوں اور سیوا کاروں کے منہ سے دن رات مسلمانوں کے خلاف مغلظات بھی سننا پڑتی ہیں۔ اپنا دین بچانے کے لیے ضروری ہے کہ میں ان خطرات میں مبتلا ہونے سے پہلے اپنا ایمان مضبوط کر لوں اور دوبارہ سکول جانے سے پہلے کچھ دن لگا کر وہ بصیرت افروز کتابیں پڑھ لوں جو ہم اتنی محنت سے ماگھی رام کے پنجے سے چھڑا کر لائے ہیں۔

کرم بخش تو پہلے ہی رس گلے کی طرح دین اسلام کے شیرے میں لتھڑا ہوا بیٹھا تھا۔ میری چرب زبانی کے جالے میں وہ مکڑی کی طرح فٹ ہو گیا۔ اس نے میرے دینی

تان تان کر اپنا مخصوص قومی ترانہ گاتے تھے۔

راج کرو گا خالصہ -------- باقی رہے نہ کو

کچھ عرصہ کے بعد "سنگھ سبھا" کا تہوار آیا۔ یہ سکھوں کا سالانہ میلہ تھا جو چمکور صاحب میں لگا کرتا تھا۔ اس موقعہ پر سکھوں کا ایک دیوان بھی منعقد ہوتا تھا۔ جس میں سکھ پنتھ کی شان اور گرو صاحبان کی عظمت پر بڑی دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں۔ اس سال خالصہ ہائی سکول کی طرف سے "دیوان" میں گرو نانک پر مضمون پڑھنے کے لیے میرا انتخاب ہوا۔

میں نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں سے شجاعت و سخاوت و ذکاوت کے قصے نکالے' رتن ناتھ سرشار سے میاں آزاد کا دم خم اڑایا' الفاظ و بیاں کی شوکت محمد حسین آزاد سے لی اور کئی کتابوں کے صفحے نقل کر کے ان میں مناسب ترمیم و تحریف کے بعد ایک ست رنگ خلعت فاخرہ تیار کر کے گرو مہاراج شری نانک دیو کو پہنا دی۔ مضمون کے آخر میں گرونانک کی مدح میں بیس اشعار کا ایک منظوم قصیدہ بھی تھا۔

اس قصیدے کی تیاری میں محشر انبالوی کی تصنیف "آل ذورعین" سے بڑی مدد ملی۔ یہ کتاب دراصل ارائیں برادری کی تاریخ تھی جس میں فاضل مصنف نے اس قوم کو عرب کے ایک نجیب الطرفین قبیلے ذورعین کی آل اولاد ثابت کیا تھا۔

عجیب و غریب تاریخی حقائق و شواہد کے علاوہ اس کتاب میں ارائیوں کی عظمت و فضیلت پر بہت سی نظمیں بھی تھیں۔

بحر طویل میں ایک نظم مجھے پسند آئی۔ میں نے اس میں

"بلبلان بے نظیر" "صلعلان ہم سفیر" جیسی ترکیبیں حذف کر دیں۔ اور ان کی جگہ گرونا نک دیو کے جملہ القاب و صفات کو ٹھونس کر ایک شاندار قصیدہ تیار کر لیا۔

سنگھ سبھا کے دیوان میں ڈھائی تین ہزار کا مجمع تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ کرسی صدارت پر متمکن تھے۔ پنڈال میں ایک طرف نہنگ اکالی بیٹھے تھے۔ دوسری طرف زنکاریوں کا اجتماع تھا۔ ایک کونے میں کلال گڑھی کے کچھ مونے سکھ تھے۔ درمیان میں عوام الناس زمین پر بیٹھے تھے۔ اسٹیج پر اوپر دائیں طرف علاقے کے افسروں اور رئیسوں کی کرسیاں تھیں۔ بائیں جانب ہمارے سکول کا سٹاف تھا۔

پنڈال سے باہر ایک کونے میں تیس چالیس مسلمان مرد و زن بھی اچھوتوں کی طرح الگ تھلگ کھڑے تھے۔ یہ چمکور کی ارائیں برادری تھی جو کرم بخش کی ترغیب پر سکھوں کی بھری محفل میں میری تقریر کا محیر العقل کارنامہ دیکھنے کے شوق میں چلے آئے تھے۔

سٹیج پر آ کر مجھے اپنی زندگی کی پہلی تقریر کرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہ آئی۔ میرا کام تو فقط زبان ہلانا تھا۔ ورنہ فقرے پر فقرہ تو شرر اور سرشار اور آزاد کے قلم سے نکل کر خود بخود پرواز کرتا تھا۔ پنڈال میں بالکل سکوت تھا۔ جب میں نے ترنم سے بحر طویل کا قصیدہ الاپنا شروع کیا تو یہ سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا۔ میری تقریر دلپذیر ختم ہوئی تو پنڈال میں کئی جانب سے "شاباش." "شاباش" کی آوازیں آئیں۔ مہاراجہ پٹیالہ جو کرسی صدارت میں نیم خوابیدہ بیٹھے تھے' اچانک چونکے انہوں نے مجھے تھپکی دی۔ اپنی جیب سے ملکہ وکٹوریہ کی مورت والا چاندی کا ایک روپیہ نکالا' اسے انگلی پر آویزاں کر کے انگوٹھے سے اچھال کر ٹن سے بجایا' اور مجھے انعام میں دیدیا'

دیوان ختم ہوتے ہی میری جماعت کے سکھ لڑکے مجھے کشاں کشاں سکول کے پچھوڑے میں لے گئے۔ کچھ دیر انہوں نے "راج کروگا خالصہ۔۔۔ باقی رہے نہ کو" الاپ الاپ کر میرے گرداگرد بھنگڑا ڈالا اور پھر مہاراجہ پٹیالہ کے انعام کا روپیہ زبردستی چھین کر لے گئے۔

میرے مضمون اور قصیدے کی کامیابی نے گویا میرے سینے میں بندھی ہوئی بہت سی گھنڈیاں کھول دیں۔ "آل ذورعین" کی نظموں سے قافیے اور ردیف جمع کر کے اب میں نے کچھ اپنی تک بندی بھی شروع کر دی۔ پہلے رونق جموی تخلص رکھا۔ پھر کسی ضرورت شعری سے مجبور ہو کر جعفر چکوری سے بدل ڈالا۔ میرا ایک شعر خاص طور پر ہمارے سکول میں زبان زد خاص و عام ہو گیا' اور سکھ طلبہ بھی اسے شوق سے اپنے جواب مضمونوں میں استعمال کرنے لگے۔ شعر عرض کیا تھا

یہ ایسا عجب شہر چکور ہے
کہ ثانہ نہیں جس کا لاہور ہے

رفتہ رفتہ میں نے اپنی بیاض بھی کھول لی۔ ایک روز شام کے وقت میں نہر کے کنارے ٹہل ٹہل کر فکر سخن کر رہا تھا' کہ ماسٹر منگل سنگھ بائیکل پر سوار ادھر سے گذرے۔ مجھے دیکھ کر رک گئے اور بیاض لے کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔ ایک دو جگہ ٹھٹک کر مجھے گھورا اور غصے سے "ہوں." "ہوں" کہا۔ پھر ایک غزل پر پہنچے جس میں عرض کیا تھا۔

مرے منہ پر زلفیں گرانے کو آ جا
مری بات بگڑی بنانے کو آ جا
تری یاد کی گھنٹیاں بج رہی ہیں
مرے دل کی دنیا بسانے کو آ جا
برا حال ہے جعفر ختہ جاں کا
مری جان جاناں بچانے کو آ جا

ماسٹر منگل سنگھ بجلی کی طرح تڑپے' اور بیاض پھاڑ کر نہر میں پھینک دی۔ پھر وہ دونوں

ہاتھ کمر پر رکھ کر جلاد کی طرح میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور کڑک کر بولے۔
"ورنیکلر فائنل کا امتحان سر پر آیا کھڑا ہے۔ اور یہ مرزا غالب کی اولاد شاعری کے ٹل

کھڑکا رہی ہے۔ کیوں بے' یہ کیا واہیات بکواس ہے؟"
انہوں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور ٹانگ گھما کر زمین پر پٹخ دیا۔ پھر وہ دیر تک لاتوں' مکوں اور تھپڑوں سے میری خاطر خواہ تواضع فرما کر اپنے بائیکل پر سوار ہو کے رخصت ہو گئے۔ میں نے اٹھ کر گالوں اور کہنیوں کو سہلایا' کپڑے جھاڑے اور اطمینان کی سانس لے کر از سر نو مشق سخن میں مصروف ہو گیا۔

ورنیکلر فلنکل کے لیے ہمارے امتحان کا سنٹر گورنمنٹ ہائی سکول روپڑ مقرر ہوا۔ روپڑ کا شہر چمکور صاحب سے کوئی گیارہ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ تین چار بیل گاڑیوں میں سوار ہو کر ہم سب فارسی کے استاد پنڈت سری رام کی قیادت میں ایک روز پہلے وہاں پہنچ گئے۔ سکھوں کے ایک مقامی ہوسٹل میں ہمیں ٹھہرایا گیا۔ سورج غروب ہوتے ہی کھانے کی گھنٹی بجی سب لڑکے اپنی اپنی رکابی' گلاس اور گھی لے کر لنگر خانے میں حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے۔ مسلمان بس ایک میں ہی تھا۔ اس لیے مجھے چوکے سے باہر دوسروں سے الگ خاصی دور بٹھا دیا گیا۔ ایک لانگری کڑچھی ہاتھ میں لیے دال بانٹ رہا تھا۔ دو سکھ ایک بہت بڑے توے پر تیز رفتاری سے پھلکے پکا رہے تھے۔ وہ بار بار اپنی داڑھیاں کھجلاتے تھے۔ اور پسینے کے بڑے بڑے قطرے روٹیوں کے لیے گندھے ہوئے آٹے میں مسلسل ٹپک رہے تھے۔ یوں بھی وقتاً فوقتاً وہ اپنی گردن اور بغلوں کا پسینہ پونچھ کر انہی گیلے ہاتھوں سے چپاتیاں پکانے لگتے تھے۔ دال والا لانگری بھی دیگچے کے آس پاس زور زور سے ناک صاف کرتا تھا' اور رینٹ کو انگلوں کے درمیان دیر تک کولڈ کریم کی طرح ملتا رہتا تھا۔ ساتھ ہی وہ بار بار کھانس کر بلغم کے بڑے بڑے غلغفے اپنے سامنے تھوک کر انہیں انڈوں کی زردی کی طرح پاؤں کے انگوٹھے سے مسل دیتا تھا۔ لانگریوں کے یہ بے تکلفانہ انداز دیکھ کر میرا جی متلانے لگا' اور میں سر درد کا بہانہ کر کے کھانا کھائے بغیر لنگر سے اٹھ آیا۔

ہوسٹل کے جس کمرے میں مجھے جگہ ملی' اس میں دس بارہ سکھ لڑکے اور بھی تھے۔ سونے سے پہلے انہوں نے کپڑے اتار ڈالے۔ کچھ دیر ننگے ٹہل کر جسم کو ہوا لگائی اور پھر ایک ایک کچھہرا اور بنڈی پہن کر بیٹھ گئے۔ پہلے انہوں نے اپنے کیس کھولے اور انہیں جھٹک جھٹک کر کنگھا کیا۔ پھر سرسوں کا تیل ڈال کر داڑھیاں چڑھائیں اور ان پر میلی میلی پٹیاں سی باندھ لیں۔ بغلوں کے لانبے لانبے بالوں کو بھی انگلیوں سے مروڑ مروڑ کر ان میں کنڈل ڈالے' اور اس ٹائلٹ سے فارغ ہو کر وہ بڑی دیر تک آپس میں فحش گفتگو اور دھینگا مشتی کرتے رہے۔ دو لڑکوں نے آمنے سامنے بیٹھ کر ہتھ رسی کا مقابلہ کیا۔

لنگر سے وہ آپس میں شرطیں لگا کر چنے کی دال کے ساتھ بیس بیس تیس تیس چپاتیاں کھا کر آئے تھے۔ اب رضائی میں لیٹ کر اگر ایک لڑکا ڈکار لیتا تھا' تو باقی سب بھی اس کے مقابلے میں زور زور سے ڈکارتے تھے۔ اگر ایک لڑکے سے بادشکم کا جھونکا سرزد ہوتا تھا' تو دوسرے بھی باآواز بلند اس کا ساتھ دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ کمرے کی فضا میں سنڈاس کی کثافت رچ گئی' اور رضائی میں منہ سر لپیٹے بھی مجھے ساری رات ابکائیاں آتی رہیں۔ صبح نو بجے پرچہ تھا۔ پرچہ ختم ہوتے ہی میں امتحان کے ہال سے نکلا' اور پاپیادہ چلتا ہوا غروب آفتاب کے وقت چمکور صاحب پہنچ گیا۔

اگلی صبح پھر میں چار بجے دوسرا پرچہ دینے روپڑ کے لیے پیدل روانہ ہو گیا۔ کرم بخش مجھے نہر تک چھوڑنے آیا۔ شدید سردیوں کے دن تھے۔ چاروں طرف بڑی گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ گھاس پر کورا جما ہوا تھا۔ گھپ اندھیرے میں دور تک پھیلے ہوئے جونڈیوں نظر آتے تھے جیسے بہت سے ہاتھی سونڈ اٹھائے کھڑے ہیں۔ وقتاً فوقتاً گیدڑوں کے چیخنے کی آواز بھی آتی تھی۔ ان کی چیخوں کے ساتھ گاؤں کے کتے بھی زور زور سے رونے لگتے تھے۔ ان دنوں سارے علاقے پر جگموہن سنگھ ڈاکو اور اس کے گروہ کی دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کی شجاعت' سخاوت اور بے رحمی کے عجیب و غریب قصے

زبان زد خاص و عام تھے۔ کبھی کبھی میرے دل میں ایک دبی دبی خواہش چوری چوری سر اٹھاتی تھی کہ اگر قسمت یاوری کرے اور جگموہن سنگھ ڈاکو مجھے پکڑ کر اپنے گروہ میں شامل کر لے تو میری زندگی کا بھی کوئی مقصد بن جائے۔

کرم بخش نے مجھے بتایا کہ جگموہن آج کل شملہ پہاڑ کے راجوں اور رجواڑوں کی لوٹ مار میں مصروف ہے۔ اس لیے نہر سرہند کا کنارا مسافروں کے لیے بالکل محفوظ ہے۔ تاہم احتیاطاً اس نے میری پاکٹ واچ اتروا کے اپنے پاس رکھ لی۔

مجھے نہر تک پہنچا کر کرم بخش واپس لوٹ گیا۔ میں نے اپنی لاٹھی کندھے پر رکھی اور روپڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کہنے کو تو میں روانہ ہو گیا' لیکن دراصل میرے پاؤں میں سیسہ بھرا ہوا تھا۔ کچھ سردی اور کچھ خوف سے میرا تن بدن برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اور آس پاس ذرا سی کھڑکھڑاہٹ سے دل اچھل کر گلے میں پھنس جاتا۔ ابھی کچھ دور ہی گیا تھا کہ نہر کی پٹڑی کے عین درمیان دو انگارہ سی آنکھیں مجھے گھورتی نظر آئیں۔ میں نے کھانس کھانس کر اپنی لاٹھی زمین پر زور زور سے ماری' تو جنگلی بلا "میاؤں" کر کے جھاڑیوں میں بھاگ گیا۔ چاروں طرف چھائے ہوئے سناٹے کے گنبد میں وہ "میاؤں" دیر تک صور اسرافیل کی طرح گونجتی رہی۔ دو چار گیدڑ بھاگتے ہوئے آئے اور میرا راستہ کاٹ کر گزر گئے۔ ایک درخت پر اتنی چمگادڑیں پر پھیلائے الٹی لٹکی ہوئی تھیں کہ شاخوں پر کالا کالا سائبان سا تن گیا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ سے ان کے آرام میں خلل پڑا تو چند چمگادڑیں عجیب خوفناک آواز سے چلائیں۔ آگے گیا تو ایک ٹنڈ منڈ درخت پر بہت سے بندر اور چند لنگور شاخ بشاخ الٹی قلابازیاں کھا رہے تھے۔ ایک لنگور بڑی عجیب بازیگری دکھا رہا تھا۔ درخت کی شاخ کے گرد وہ اپنی دم لپیٹ کر جھولے کی طرح جھولتا تھا' اور پھر فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا کسی دوسری شاخ کی طرف لپکتا تھا۔ لیکن دوسری شاخ کو چھوئے بغیر وہ اسی طرح ہوا میں قلابازی کھا کر واپس لوٹتا تھا' اور حسب سابق پہلی شاخ کے ساتھ الٹا لٹک جاتا تھا۔ اس طرح کی اصلی لنگوری جست زندگی میں صرف اسی روز دیکھنا نصیب ہوئی ہے۔ اس کے بعد

یہ کرتب فقط امور ریاست اور سیاست اور سفارت ہی میں نظر آئے ہیں۔ دو تین بندر نہر کی پٹڑی پر بھی بیٹھے تھے۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ نیت تو میری دیر سے ڈانوا ڈول ہو رہی تھی۔ اب بندروں اور لنگوروں کو اپنی راہ میں حائل دیکھا تو دل نے بے اختیار گواہی دی کہ جان ہے تو جہان ہے پیارے۔ امتحان کو گولی مارو' اور آرام سے گھر واپس لوٹ چلو۔ ورنیکلر فائنل اگلے سال بھی ہو جائے گا۔ میں اسی شش و پنج میں کھڑا تھا کہ سناٹے میں دور سے "ہری اوم' ہری اوم" کی آواز لہرائی' اور تاریکی میں ایک پتلا سا سایہ ابھرا' اور "ہری اوم'" "رام رام ست ہے" کی مالا جپتا تیز تیز میرے قریب سے گزر گیا۔ یہ مکسودن پادھا تھا۔

مکسودن پادھا چمکور صاحب کے ہندوؤں کا پروہت تھا۔ سکھ اور مسلمان بھی اس سے اپنے بچوں کی جنم پتریاں بنواتے تھے۔ نجوم اور رمل میں مہارت کے باعث سارے گاؤں میں شادی بیاہ کی تاریخ' سفر پر روانہ ہونے کی ساعت' اور مرگ و حیات کی جملہ رسومات کا پروگرام وہی طے کرتا تھا۔ عام بیماریوں کا علاج تو حکیم بسنت رام کے سپرد تھا۔ لیکن چیچک' خسرہ' پلیگ اور ہیضہ جیسے موذی امراض پر مکسودن پادھا کا کنٹرول تھا۔ اذان کی آواز پر وہ خالی ٹین بجانا شروع کر دیتا تھا' تاکہ بول سنائی نہ دیں۔ درود شریف سن کر وہ دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا تھا۔ جب کبھی وہ ہمارے محلے سے گزرتا تھا' تو مسلمان بچے زور زور سے درود شریف پڑھ کر اس کے پیچھے ہو لیتے تھے۔ یہ سن کر مکسودن پادھا کانوں میں انگلیاں دئے اتنی تیزی سے بھاگنا شروع کر دیتا تھا کہ ہم لوگ بھی اس کے تعاقب میں بری طرح ہانپنے لگتے تھے۔

مکسودن پادھا کا معمول تھا کہ وہ صبح تین چار بجے اٹھ کر زور زور سے ہری اوم' ہری اوم' رام رام ست ہے کہ مہارنی کرتا ہوا نہر پر جاتا تھا۔ اور گرمی ہو یا کڑاکے کی سردی ٹھنڈے پانی سے اشنان کر کے اپنی پوجا پاٹ شروع کرتا تھا۔ اس کے معمول میں ایسی باقاعدگی تھی کہ اس کے نہر پر جانے اور واپس آنے کی آواز لوگوں کے لیے الارم ٹائم پیس کا کام دیتی تھی۔

میرے قریب سے گزر کر مکسودن پادھا جب بندروں کے پاس پہنچا' تو ان کا ایک جم غفیر اس کے گرد جمع ہو گیا۔ ہنومان جی کو نمسکار کر کے مکسودن نے ایک پوٹلی کھولی اور بہت سی پوریاں بندروں کے سامنے ڈال دیں۔ پھر وہ نہر کے کنارے ایک پتھر کی سل پر بیٹھ گیا اور پانی کی گڑویاں سر پر ڈال ڈال کر چھپا چھپ نہانے لگا۔

ایک ساٹھ ستر برس کے دبلے پتلے مخنی سے برہمن کی یہ شان مردانگی دیکھ کر میرے اسلام کی رگ حمیت بھی کسی قدر پھڑکی۔ میں چھاتی نکال کر لاٹھی گھماتا بڑے آرام سے بندروں کے پاس سے نکل آیا جن کی توجہ بہرحال پوریوں پر مرکوز تھی۔ اور مکسودن پادھا سے کچھ دور رک کر اس کی رام رام کے جواب میں زور زور سے درود شریف پڑھنے لگا۔ مکسودن پادھا نے پہلے تو ایڑیاں اٹھا اٹھا کر آواز کی سمت کا کھوج لگایا اور پھر درود شریف کے الفاظ سن کر اس نے یک لخت دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ میں درود شریف بند کرتا تھا' تو وہ کان کھول دیتا تھا۔ اور جب دوبارہ پڑھنے لگتا تو پھر انگلیاں ٹھونس لیتا۔ جی تو بہت چاہا کہ ہری اوم ہری اوم اور درود شریف کی آنکھ مچولی کا یہ کھیل جاری رکھوں۔ لیکن میری منزل کھوٹی ہوتی تھی۔ اس لیے میں باآواز بلند درود شریف کا ورد کرتا آگے بڑھ گیا۔ درود شریف پڑھتے پڑھتے آہستہ آہستہ رگوں میں جمی ہوئی برف پگھلنے لگی۔ پھر جسم پر ہلکی ہلکی حرارت کی تکور ہونے لگی۔ اور اس کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے الیکٹرک بلینکٹ اوڑھا ہوا ہو۔ تین سوا تین گھنٹے کے بعد جب میں امتحان کے ہال میں پہنچا تو خاصا پسینہ آیا ہوا تھا۔ میں نے آرام سے پرچہ کیا' اور پھر ہال سے اٹھ کر درود شریف پڑھتا ہوا خراماں خراماں شام تک گھر پہنچ گیا۔

جب نتیجہ نکلا' تو ورنیکلر فائنل کا وظیفہ تو مجھے صرف دو برس کے لیے ملا' لیکن درود شریف کا وظیفہ میرے نام تاحیات لگ گیا۔

یہ ایک ایسی نعمت مجھے نصیب ہوئی جس کے سامنے کریم بخش کے سارے "اجیبھے" گرد تھے۔ اس کے لیے نہ پرانی باؤلی کے پانی میں رات کو دو دو پہر ایک ٹانگ پر کھڑا

ہونا پڑتا تھا۔ نہ کنوئیں میں الٹا لٹک کر چلہ معکوس کھینچنے کی ضرورت تھی۔ نہ گگاماڑی میں ڈھول کی تال پر کئی کئی گھنٹے "حال" کھیلنے کی حاجت تھی۔ نہ مراقبے کی شدت تھی' نہ مجاہدے کی حدت تھی' نہ ترک حیوانات' نہ ترک لذات' نہ تقلیل طعام' نہ تقلیل منام' نہ تقلیل کلام' تقلیل اختلاط مع الانام' نہ رجعت کا ڈر' نہ وساوس کی فکر' نہ خطرات کا خوف۔ یہ تو بس ایک تخت طاؤس تھا' جو ان دیکھی لہروں کے دوش پر سوار آگے ہی آگے' اوپر ہی اوپر رواں دواں رہتا تھا۔ درود شریف نے میرے وجود کے سارے کے سارے افقوں کو قوس قزح کی لطیف رداؤں میں لپیٹ لیا۔ گھپ اندھیروں میں مہین مہین سی شعاعیں رچ گئیں' جنہیں نہ خوف و ہراس کی آندھیاں بجھا سکتی تھیں نہ افکار و حوادث کے جھونکے ڈگمگا سکتے تھے۔ تنہائی میں انجمن آرائی ہونے لگی۔ بھری محفل میں حجروں کی خلوت سما گئی۔ دل شاد' روح آباد۔ جسم یوں گویا کشش ثقل سے بھی آزاد۔ سب سے بڑی بات یہ تھی' کہ درود شریف کی برکت سے پردہ خیال پر ایک ایسی بابرکت ذات کے ساتھ قربت کا احساس جاری و ساری رہتا تھا۔ جس کے پاؤں کی خاک اغواث اور اقطاب اور اوتار و ابدال کی آنکھ کا سرمہ۔ جس کے قدموں میں دنیا کامران اور عقبیٰ بھی بامراد۔ جس کے ذکر کے نور سے عرش بھی سر بلند اور فرش بھی سرفراز۔ جس کا ثانی نہ پہلے پیدا ہوا' نہ آگے کبھی ہو گا۔ اور جس کی آفرینش پر رب البدیع الخالق الباری المصور نے اپنا صناعی کی پوری شان تمام کر دی

بلغ العلیٰ بکمالہ
کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلو علیہ وآلہ

دو برس بعد میں نے میٹریکولیشن کا امتحان بھی بالکل اسی طرح روپڑ اور چمکور صاحب کے درمیان روزانہ پاپیادہ آتے جاتے اور درود شریف کا ورد کرتے کرتے پاس کر لیا۔

دادی اماں چند ماہ قبل فوت ہو گئی تھیں۔ ایک دن سخت سردی میں انہوں نے حسب معمول ٹھنڈے پانی سے غسل کر کے دھوپ میں بال سکھائے۔ رات کو بخار چڑھا اور اگلے روز ڈبل نمونیہ تشخیص ہوا۔ جب حالت زیادہ بگڑ گئی تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر چپکے سے کہا۔ "پت' اب چل چلاؤ ہے۔ مولی کھانے کو جی چاہتا ہے۔ چوری چوری لا کر مجھے کھلا دو۔"

میں بھاگ کر کھیتوں سے دو بڑی بڑی تازہ مولیاں لے آیا۔ دادی اماں نے رضائی سے منہ سر ڈھانپ لیا اور نمک لگا لگا کر دونوں مولیاں مزے سے کھا لیں۔ اسی شام ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۰۸ برس کے قریب تھی۔

یوں تو کرم بخش پر خوشی زیادہ اثر انداز ہوتی تھی نہ غمی۔ اس پر کبھی گرمی کا اثر ہوتا تھا نہ سردی کا۔ کانٹوں کا نہ سانپ کا' بچھو' بجو اور لسنگہ پوٹ کا۔ لیکن دادی اماں کی موت کے بعد وہ بھی دنیا کے بے ثباتی سے دل برداشتہ ہو گیا۔ اور گگا ماڑی جا کر ڈھول بجانے والے ملنگوں کی صف میں شامل ہو گیا۔

چمکور کے گرد' نواح میں دور دور کالج نہ تھا۔ اس لیے میں بھی جموں واپس لوٹ آیا اور پرنس آف ویلز کالج میں ایف' ایس' سی کا داخلہ لے لیا۔

○○○

• مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ چائے

بابا اجیت سنگھ جھجھار ہری خالصہ ہائی سکول سے اٹھ پرنس آف ویلز کالج جموں کا داخلہ ویسا ہی تھا جیسے کسی دور افتادہ گاؤں کا دیہاتی اچانک بڑے شہر میں وارد ہو جائے۔ چند روز قدرے بوکھلاہٹ رہی۔ لیکن جب میں نے بھی دوسروں کی طرح کوٹ پتلون زیب تن کر کے گلے میں ٹائی کا پھندا ڈال لیا تو بڑی آسانی سے "ہر کہ درکان نمک رفت نمک شد" کے محاورے میں ڈھل گیا۔

پتلون پہن کر پہلی بار باہر نکلا تو بڑا حجاب آیا۔ کیوں ہر قدم پر یہی احساس ہوتا تھا' کہ میں سڑک پر ننگا ہی چلا آیا ہوں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جو لوگ پاجامہ پہنے باہر گھومتے پھرتے نظر آتے تھے' ان پر برہنگی کا شبہ ہونے لگا۔

اردو کا جھنڈا تو میں خالصہ ہائی سکول میں گاڑ ہی آیا تھا۔ اب کالج آ کر میں نے انگریزی زبان کو اپنا تختہ مشق بنا لیا۔ چند مہینوں کے اندر اندر میں نے کالج لائبریری میں شکیسپئیر سے لے کر زمانہ حال تک جتنا انگلش لٹریچر موجود تھا' اس کا بیشتر حصہ ایسے ہی چلتے پھرتے کھنگال ڈالا۔ ٹامس ہارڈی اور رابرٹ لوئی سٹیونسن مجھے پسند آئے۔ لیکن میری جان کو جس کا اصلی روگ لگ گیا' وہ پی۔ جی وڈ ہاؤس تھا۔

وڈ ہاؤس طنز و مزاح کی ایک چھوٹی سی شفاف جھیل ہے۔ زیادہ لمبی چوڑی نہ زیادہ گہری۔ اس میں فلسفہ کا جھاڑ جھنکار اگتا ہے۔ نہ نظر بات کی لہریں اٹھتی ہیں۔ محدود وسعت کی کہانیوں سے وہ لامحدود تفنن طبع کا سامان مہیا کرتا ہے۔ زبان اس پر کبھی حاوی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ خود زبان پر اس درجہ حاوی رہتا ہے' کہ موم کی ناک کی طرح اسے جس طرف چاہے مروڑ کر اپنے بے نظیر اسلوب بیان میں ڈھال لیتا ہے۔ اس نے ۸۸ سے اوپر تصانیف چھوڑی ہیں۔ ایک ایک کتاب کئی کئی بار پڑھنے سے بھی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ انگلش لٹریچر کی تاریخ میں اس کا شمار ان لوگوں میں تو نہ ہو گا جنہیں

کلاسیکی درجہ دیا جاتا ہے لیکن اگر وڈ ہاؤس پیدا نہ ہوا ہوتا تو انگریزی زبان کی بہت سی نزاکتیں اور لطافتیں تشنہ اظہار رہ جاتیں۔

علمی انگریزی تک رسائی تو لائبریری کے ذریعہ ہو گئی' لیکن عملی انگریزی کا تجربہ مجھے اپنے والد بزرگوار سے حاصل ہوا۔

عبداللہ صاحب ایک دریا کی طرح تھے' جو نہایت خاموشی سے نظروں سے اوجھل زیر زمین بہہ رہا ہو۔ پانچ چھ برس کی عمر میں جب وہ یکایک یتیم ہو گئے' تو انکشاف ہوا کہ ان کا بال بال قرضہ میں بندھا ہوا ہے' اور گھر کی ساری زمین اور مکان ساہو کاروں کے پاس رہن رکھے ہوئے ہیں۔ موروثی زر اور زمین کی یہ بے ثباتی دیکھ کر عبداللہ صاحب نے اب ایسی جائیداد بنانے کا تہیہ کر لیا' جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ وہ دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ اس زمانے میں چمکور صاحب میں کوئی سکول نہ تھا۔ پرائمری سکول پانچ میل دور تھا' مڈل سکول گیارہ میل اور ہائی سکول بیس میل۔ دو دو سال کا امتحان ایک ایک سال میں ختم کر کے اور وظیفہ لے کر عبداللہ ضلع انبالہ سے میٹریکولیشن کے امتحان میں اول آئے۔

ان دنوں سرسید احمد خان کی تحریک علی گڑھ کا بڑا چرچا تھا۔ لدھیانہ کی انجمن مفید عام اس تحریک سے متاثر تھی۔ پنجاب میٹریکولیشن میں غالباً پہلی بار کوئی مسلمان لڑکا ایک ضلع میں اول آیا تھا۔ عبداللہ صاحب کا ریزلٹ دیکھ کر انجمن مفید عام کا ایک کارکن چمکور صاحب آیا' اور عبداللہ صاحب کو علی گڑھ سر سید کے پاس لے گیا۔ وہاں پر انہوں نے انگریزی' عربی' فارسی' فلسفہ اور ریاضی میں اپنی دھاک بٹھائی۔ اور علی گڑھ کالج کے ابتدائی دور میں بی۔ اے کر لیا۔

بی۔ اے کے بعد سر سید کی وساطت سے انہیں انگلستان جا کر آئی سی ایس کے امتحان کے لیے وظیفہ ملا۔ اس زمانے کے توہمات میں سات سمندر پار کا سفر بلائے ناگہانی کے مترادف تھا۔ چنانچہ دادی اماں نے اپنے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ

صاحب سعادت مند فرزند تھے۔ انہوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔ سر سید کو مسلمان نوجوانوں کا مستقبل سنوارنے کے دھن ہی نہیں بلکہ جنون تھا۔ انہوں نے عبداللہ صاحب کو بڑا سمجھایا بجھایا' ڈرایا اور دھمکایا۔ غصے میں آ کر کچھ پٹائی بھی کی۔ لیکن ماں کی خواہش کے سامنے وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر مایوس ہو کر سر سید نے انہیں علی گڑھ سے نکال دیا اور حکم دیا کہ اب وہ عمر بھر اپنی منحوس صورت انہیں نہ دکھائیں' اور ایسی جگہ جا کر مریں جہاں کوئی ان کا نام نہ لینے والا ہو۔

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند فرزند تھے' اتنے ہی اطاعت گزار شاگرد بھی تھے۔ سر سید کے حکم کی لاج انہوں نے اس طرح رکھی کہ گلگت کے دور افتادہ مقام پر جا کر کلرکی اختیار کر لی۔ ان دنوں چکوڑ صاحب سے سرینگر کے راستے گلگت پہنچنے کے لیے بیس بائیس روز لگتے تھے۔ ایک سو آٹھ سال کی عمر میں وفات پانے تک دادی اماں نے کبھی گاؤں سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ اس لیے وہ خوش تھیں کہ گلگت جا کر بیٹا گھر کے پاس ہی رہا' سات سمندر پار تو نہیں گیا!

گلگت کی کلرکی عبداللہ صاحب کو بڑی راس آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کشمیر راج کی طرف سے وہاں کے گورنر بن گئے۔ گلگت میں انہوں نے اٹھارہ بیس برس گزارے۔ ان کے سب بچوں کی پیدائش بھی وہیں پر ہوئی۔ تین بیٹے' تین بیٹیاں۔ اس علاقے کی بین الاقوامی اہمیت اور چینی اور روسی ہمسایوں کے معاملات پر انہیں خاصا عبور حاصل تھا۔ کشمیر کے مہاراجہ پرتاب سنگھ کے ساتھ ان کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ اس کی وفات کے بعد جب مہاراجہ ہری سنگھ گدی پر بیٹھا' تو اس سے ان بن ہو گئی۔ سینتالیس سال کی عمر میں عبداللہ صاحب نے ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی' اور مستقل طور پر جموں میں قیام پذیر ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا' جب جموں اور کشمیر کے مسلمانوں کی صدیوں سے خوابیدہ قسمت انگڑائی لینے لگی تھی۔ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے پردے میں چودھری غلام عباس نے اپنی

سیاسی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ نے بھی سرینگر میں ایسوی ایشن کی برانچ کھول کر سیاست کے خارزار میں پہلا قدم رکھ دیا تھا۔ مسلمانان ریاست کے افق پر دو نوجوان تیزی سے ابھرے' اور دیکھتے ہی دیکھتے سیاسی آسمان پر پوری تابانی سے چھا گئے۔ چند برس بعد آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی داغ بیل ڈالی گئی' تو چودھری غلام عباس اور شیخ محمد عبداللہ کی جوڑی اس کی روح رواں تھی۔ لیکن جیسے جیسے برصغیر کی سیاست میں پاکستان کا نظریہ ابھرتا گیا' ویسے ویسے ان دونوں لیڈروں کے راستے بھی ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے' چودھری صاحب نے مسلم کانفرنس سمیت قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں نظریہ پاکستان کا راستہ اختیار کر لیا۔ شیخ صاحب نیشنل کانفرنس کا ڈیڑھ اینٹ کا مندر الگ بنا کر مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے چرنوں میں جا بیٹھے چودھری غلام عباس کی شخصیت اور سیاست صدق' خلوص' دیانت اور امانت کا مرقع تھی۔ ان کی آنکھوں میں عقاب کی تیز نگاہی تھی' اور دل میں جذبات کی طغیانی۔ اسلام پر ان کا صرف ایمان ہی نہ تھا' بلکہ عملی زندگی میں بھی وہ بڑے سحر خیز' عبادت گزار اور قلندر صفت مومن تھے۔ اسلام کے بعد ان کا دوسرا جزو ایمان پاکستان تھا۔ مسلمان کشمیر کے دل میں پاکستان کے ساتھ وابستگی کا عقیدہ راسخ کرنے کا سہرا سب سے زیادہ انہی کے سر ہے۔ زندگی عزیز کے کئی سال انہوں نے جیل میں گزارے۔ پاکستان آ کر بھی انہیں دوبارہ جیل جانا پڑا۔ سچی بات دو ٹوک کہہ دینا ان کی طبیعت ثانی تھی۔ اس لیے اپنے بھی ان سے خفا تھے بیگانے بھی ناخوش۔ وہ زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکے قند۔ حال کی حقیقت کو قال کی مصلحتوں میں چھپانا ان کا شیوہ نہ تھا۔ ان کے اصلی جوہر کو اگر کسی نے پہچانا تو صرف قائداعظم نے پہچانا۔ پاکستان کے باقی سب لیڈر اوپر سے تو ان کی عزت کرتے تھے' لیکن اندر سے کھنچے کھنچے رہتے تھے۔ چودھری صاحب کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ یہ جنس نایاب ہماری سیاست کے مزاج کی ضد تھی۔ اس لیے ذہنی تصادم کا میدان کارزار ہر وقت گرم رہتا تھا۔

اس کے برعکس شیخ محمد عبداللہ کے کباڑخانے میں بے پیندے کا لوٹا تھے۔ جب انھوں نے ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم سے اپنی اڑان شروع کی' اس وقت وہ ایک سکول میں سائنس ٹیچر تھے۔ چہرے پر بڑی خوشنما داڑھی تھی اور گلے میں لحن داؤدی کا نور بھرا تھا۔ ان کی قرات اور نعت خوانی ہزاروں لاکھوں کے مجمع کو مسحور رکھتی تھی۔ لیکن پھر مسٹر گوپال سوامی آئنگر کشمیر کا وزیراعظم بن کر آیا۔ کہنے کو یہ آئی۔ سی۔ ایس افسر تھا' لیکن درپردہ وہ انڈین نیشنل کانگرس کے مندر کا پجاری تھا۔ اس نے اپنے جال کچھ ایسی چابکدستی سے بچھائے' کہ شیخ صاحب سدھائے ہوئے بٹیر کی مانند بڑی آسانی سے تہہ دام آ گئے' دیکھتے ہی دیکھتے۔ ان کی ذہنی' معاشی اور جسمانی کایا کلپ ہو گئی۔ امیر اکدل اور حضرت بل کے جلسوں میں نعتیں پڑھ کر لاکھوں کو رلانے والے شیخ جی اب نئے نئے اپٹوڈیٹ سوٹ پہن کر "بندے ماترم" کا ترانہ الاپنے' بمبئی کے "تاج" اور کلکتہ کے "گرینڈ" ہوٹل کی ہائی سوسائٹی میں چہچہانے لگے۔ ریذیڈنسی روڈ جموں پر انجمن اسلامیہ کے غریبانہ دفتر سے اٹھ کر ان کی نشست و برخاست برلا ہاؤس دہلی' انند بھون الہ آباد اور واردھا جیسے مقامات میں منتقل ہو گئی۔ مسلم کانفرنس سے ناطہ توڑ کر شیخ صاحب نے نیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی' تو پہلے اس کے استرے سے اپنی خوبصورت داڑھی کا صفایا کیا' اور پھر اس قضیہ کشمیر کی خشت اول بھی رکھ دی جو آج تک پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک خطرناک ناسور کی طرح رس رس کر بہہ رہا ہے شیخ محمد عبداللہ کی یہ ڈگر کسی نظریاتی اصول پرستی کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ وہ سیاست کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھ کر اسے اپنی طبعی ہٹ دھرمی برخود غلط انانیت اور ذاتی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لیے بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ کی کرسی ان کی زندگی کا واحد مقصد بن کر رہ گیا تھا۔ اس پر متمکن رہنے کے لیے وہ سیاسی بلیک میل بھی کرتے تھے' اپنا تھوکا ہوا بھی چاٹتے تھے' اصولوں کی قلابازیاں بھی کھاتے تھے اور مسلمانوں کے جذبات کے ساتھ منافقانہ آنکھ مچولی بھی کھیلتے تھے۔ ان کے یار غار

پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کی گیدڑ بھبکیوں کی قلعی کھولنے کے لیے ان کو کئی برس جیل میں ٹھونسے رکھا' اور شیخ صاحب ان کے حضور بدستور وفاداری کی دم ہلاتے رہے۔

پنڈت نہرو کی بیٹی مسز اندرا گاندھی نے کالی دیوی کا روپ دھار کر آمریت کا ڈول ڈالا' تو وہ بھی اس کے فریم میں کھٹاک سے فٹ ہو گئے۔ مسز اندرا گاندھی کی معزولی کے بعد بھارت میں ہوا کا رخ بدلا' تو شیخ صاحب نے بھی جھٹ پٹ "قسقه کھینچا' دیر میں بیٹھا' کب کا ترک اسلام کیا!" چنانچہ جب جموں کے پہاڑ پر ویشنو دیوی کا میلہ منعقد ہوا' تو شیخ محمد عبداللہ نے بھی دیوی کی یاترا کے لیے کمر باندھی' اور آخری تین سو فٹ کا فاصلہ ڈنڈوت کرتے ہوئے پیٹ کے بل زمین پر لیٹ کر رینگتے ہوئے طے کیا۔ دیوی ماتا کے چرن چھوئے' اور اس کے پاؤں کا دھوون پی کر اپنی وزارت اعلیٰ کو آب حیات کا انجیکشن دیا۔ شیخ صاحب کی سیاست پلاس ٹی سین کی ہم صفت تھی' ان کے بھارتی آقا جب چاہیں انہیں توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کا پتلا بنا لیتے تھے۔

مسلم کانفرنس کے ابتدائی دور میں چودھری غلام عباس اور شیخ محمد عبداللہ والد صاحب کے پاس بڑی کثرت سے آیا کرتے تھے۔ ریاستی مسلمانوں کی زبوں حالی' ان کے حقوق اور مطالبات کے متعلق کبھی مہاراجہ کو میمورنڈم بھیجنا ہوتا تھا' کبھی وزیراعظم کو' کبھی ریذیڈنٹ کو' علامہ اقبال کو باخبر رکھنے کے لیے ان کے نام بھی طویل مراسلے تیار کئے جاتے تھے۔ ہندو مسلم فسادات کی تحقیقات کے لیے مڈلٹن کمیشن مقرر ہوا' تو اس کے لیے بھی مسلمانوں کا کیس تیار کرنا ہوتا تھا۔ ریاستی مسلمانوں کی شکایات' مشکلات اور حقوق کا تعین کرنے کے لیے گلانسی کمیشن کا تقرر عمل میں آیا تو اس کو بھی بڑے بڑے میمورنڈم پیش کرنے تھے۔ اس قسم کی سیاسی دستاویزات کی ڈرافٹنگ عبداللہ صاحب کے سپرد ہوتی تھی۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد عبداللہ صاحب آنریری سیکرٹری کے طور پر انجمن اسلامیہ جموں کا کام بھی سنبھالتے تھے' اور صبح سے شام تک ان کے پاس دور دراز سے آئے ہوئے مسلمان کاشت کاروں اور سرکاری ملازموں کا تانتا بندھا رہتا تھا' جنہوں نے اپنی کسی

تکلیف کے سلسلے میں حکومت کے پاس درخواست یا اپیل دائر کرنا ہوتی تھی' عبداللہ صاحب بڑی خندہ پیشانی سے انہیں مشورے بھی دیتے تھے اور ان کی درخواستیں اور اپیلیں بھی ڈرافٹ کر دیتے تھے۔

ان کا طریق کار یہ تھا کہ دن میں وہ اپنا بستر لپیٹ کر گاؤ تکیے کی طرح سرہانے رکھ لیتے تھے' اور بان کی کھری چارپائی پر اس سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو جاتے تھے۔

گرمیوں میں قمیض اتار دیتے تھے' اور صرف شلوار پہن کر بیٹھتے تھے۔ ان کی رومی ٹوپی پاس ہی ایک تپائی پر پڑی رہتی تھی۔ جب کبھی ماں جی کمرے میں داخل ہوتی تھیں' تو وہ فوراً اپنی ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھ لیتے تھے۔ قمیض کے بغیر شلوار اور رومی ٹوپی کا لباس ہمیں عجیب سا نظر آتا تھا۔ لیکن وہ اسی انداز سے بڑے بڑے لیڈروں سے مل لیتے تھے۔ اسی طرح چارپائی پر بیٹھے بیٹھے کھانا کھا لیتے تھے' چائے پی لیتے تھے' اور انگریزی زبان میں نہایت اہم سیاسی' آئینی اور قانونی میمورنڈم لکھاتے جاتے تھے۔

جب انہوں نے کچھ لکھانا ہوتا تھا' تو میری طلبی ہوتی تھی۔ میں کاغذ پنسل لے کر پائنتی بیٹھ جاتا تھا۔ وہ بے تکان بولتے جاتے تھے۔ میں اپنے ہی وضع کردہ شارٹ ہینڈ میں لکھتا جاتا تھا۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی نشست میں تیس تیس چالیس چالیس صفحوں کا ڈکٹیشن ہو گیا۔

آئے دن کی یہ ریاضت اپنا رنگ لا کے رہی' اور دل ہی دل میں مجھے اپنی انگریزی دانی پر کافی اعتماد ہو گیا۔ میں تھرڈائیر میں پڑھتا تھا' کہ لندن سے ایک بین الاقوامی مضمون نویسی کے مقابلے کا اعلان ہوا۔ سب سے چوری چوری میں نے بھی ایک ساٹھ ستر صفحات کا مضمون لکھ کر بھیج دیا۔ حسن اتفاق سے پہلا انعام مجھے مل گیا۔ اس بات کا بڑا چرچا ہوا۔ اخبارات میں تصویریں شائع ہوئیں۔ برصغیر کے بہت سے ہندو اور مسلمان مشاہیر کے تہنیتی خط اور تار آئے۔ کالج والوں نے چندہ کر کے میری ایک بڑے سائز کی فوٹو فریم کروائی۔ سارے کالج کا جلسہ منعقد ہوا۔ پرنسپل نے صدارت کی۔ مجھے ان کے ساتھ سٹیج پر بٹھا دیا گیا۔ چند پروفیسروں نے تعریفی تقریریں کیں۔ اور کافی لمبی چوڑی

رسم کے بعد میری تصویر کالج کے ہال میں ایک نہایت نمایاں جگہ آویزاں کر دی گئی۔ پہلے پہلے تو میں کچھ جھینپتا سا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ انا کی خود پرستی غالب آئی۔ دن میں ایک بار میں ضرور کسی نہ کسی بہانے کالج کے ہال سے گزرتا تھا' اور کن انکھیوں سے جب اپنی تصویر پر نگاہ غلط انداز ڈالتا تھا' تو میرا نفس بے اختیار گول گپے کی طرح پھول جاتا تھا۔

انعام کی مبارکبادی کے دو خط میری جگہ میرے پرنسپل کو آئے۔ ایک حیدر آباد دکن کے وزیراعظم سر اکبر حیدری کے پرائیویٹ سیکرٹری کی جانب سے تھا۔ اس میں تحریر تھا کہ سر اکبر حیدری خوش ہو کر مجھے ایک سو روپے کی کتابیں انعام میں مرحمت فرمانا چاہتے ہیں۔ پرنسپل صاحب اس قیمت کے اندر اندر کتابوں کی فہرست بنا کر بھیج دیں' اور ساتھ ہی میرے چال چلن اور ریاستی حکومت کے ساتھ وفاداری کی تصدیق بھی کریں۔

پرنسپل سیوارام سوری نے مجھے بلا کر میری پسندیدہ کتابوں کے متعلق استفسار کیا۔ انہوں نے میری نیک چلنی اور وفاداری کے متعلق بھی ایک نہایت اچھا سرٹیفکیٹ بنا رکھا تھا۔ لیکن میں نے یہ انعام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس میں انعام کی پیشکش کم اور پولیس انکوائری کا رنگ زیادہ جھلکتا تھا۔ پرنسپل صاحب نے مجھے سمجھایا کہ بیوقوف نہ بنو۔ مفت میں کچھ اچھی اچھی کتابیں ہاتھ آ جائیں گی۔ جب میں نہ مانا تو تالیف قلب کے طور پر انہوں نے اپنی جیب سے مجھے پچیس روپے نقد عطا فرمائے' کہ اپنی مرضی کی کتابیں خرید لو۔

۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ تقریباً ڈیڑھ برس بعد جب علامہ اقبال کی زندگی میں پہلا اقبال ڈے منایا گیا' تو مجھے بھی اس میں شریک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ چرچا عام ہوا' کہ سر اکبر حیدری نے نظام دکن کے توشہ خانہ سے انہیں ایک ہزار روپیہ کا چیک بطور "تواضع" ارسال کیا تھا۔ علامہ نے سر اکبر حیدری صدراعظم حیدر آباد دکن کے نام یہ اشعار لکھ کر چیک واپس کر دیا تھا:

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسن تدبیر سے دے آنی وفانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سردوش
کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

اصل وجہ کا تو اب تک وثوق سے کوئی علم نہیں' لیکن عجب نہیں سر اکبر حیدری نے اپنی عادت کے مطابق علامہ اقبال کے چال چلن اور حکومت وقت کے ساتھ وفاداری کی کوئی تصدیق طلب کی ہو!

پرنسپل کے نام دوسرا خط کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ کے اے۔ ڈی۔ سی کی جانب سے تھا۔ اس میں حکم تھا' کہ ازروئے الطاف خسروانہ ہز ہائینس نے مجھے چائے پر مدعو فرمایا ہے۔ پرنسپل کو ہدایت کی جاتی ہے' کہ وہ مجھے "سرکار" کی حضوری کے آداب سمجھا کر مقررہ وقت پر راج محل حاضر ہونے کی تاکید کریں۔

پرنسپل صاحب نے بڑی وضاحت سے مجھے مہاراجہ کی بارگاہ میں حاضری اور گفتگو کے طور طریقے سکھائے' اور جب وہ روز سعید طلوع ہوا' تو میں بڑے اہتمام سے سوٹ بوٹ پہن کر شام کے چار بجے مہاراجہ پیلس پہنچ گیا۔

وہاں پر ایک صاحب نے جو "ڈیوڑھی وزیر" کہلاتے تھے' مجھے از سر نو مہاراجہ کی سرکار میں پیش ہونے کے آداب سمجھائے' اور ایک آراستہ ویٹنگ روم میں بٹھا دیا' جہاں دس بارہ آدمی درباری لباس پہنے چند پری چہروں کے ساتھ پہلے سے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ کوئی صبح کے نو بجے سے باریابی کا منتظر بیٹھا ہے' کوئی دس بجے سے۔ لیکن سرکار

نے ابھی تک یاد نہیں فرمایا۔ میں نے ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد کچھ بے صبری دکھائی' تو ڈیوڑھی وزیر غصے سے بولے' کہ میاں تم کس کھیت کی مولی ہو۔ یہ دوسرے حضرات جو یہاں بیٹھے ہیں۔ سب کرسی نشین درباری ہیں۔ اور یہ آراستہ پیراستہ خواتین سرکار کی منظور نظر ہیں۔ تین چار دن سے یہ ہو رہا ہے' کہ یہ سب صبح سویرے یہاں آ کر بیٹھ جاتے ہیں' اور شام تک انتظار کر کے ہنسی خوشی واپس چلے جاتے ہیں۔ تم بھی چپکے سے بیٹھے رہو۔

میں گھنٹہ بھر اور چپکے سے بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اپنی خودی کو تھوڑا سا بلند کیا' اور ڈیوڑھی وزیر کو برملا کہہ دیا' کہ مہاراجہ صاحب سے ملنے کی درخواست میں نے نہیں کی۔ انہوں نے خود مجھے چائے پر مدعو کیا ہے۔ اب اگر انہیں فرصت نہیں تو میں چلتا ہوں۔

ڈیوڑھی وزیر صاحب مجبور ہو کر خالص ڈوگری زبان میں بظاہر زیر لب بڑ بڑاتے لیکن حقیقتاً مجھے گالیاں دیتے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد دو اے۔ ڈی۔ سی آئے اور مجھے کشاں کشاں راج محل کے ایک اندرونی برآمدے میں لے گئے۔ وہاں انواع و اقسام کی وردیاں زیب تن کئے بیروں' بٹلروں اور درباریوں کا ہجوم ایک صوفے کے گرد دست بستہ ایستادہ تھا۔ صوفے پر ہزہائینس راج راجیشور مہاراج ادھیراج شری مہاراجہ ہری سنگھ بہادر' اندر مہندر' سپہر سلطنت انگلشیہ' جی۔ سی۔ ایس۔ آئی' جی۔ سی۔ آئی۔ ای' کے۔ سی۔ وی۔ او' نڈھال بھینسے کی طرح اوندھے پڑے تھے۔ ان کے جسم کا گوشت پوست صوفے پر یوں بکھرا ہوا تھا جیسے گندے کپڑوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس تیز رفتار گاڑی سے باہر گر کر پھٹ گیا ہو۔

مہاراجہ ہری سنگھ رات بھر شراب کے ساتھ کچے اور پکے گوشت کا شغل فرماتے تھے' اور دن بھر وید' حکیم اور ڈاکٹر ان کے کشتوں کے پشتے لگا کر انہیں اگلی شب کے لیے تازہ دم کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی چند عورتیں اور مرد ان کے اعضائے رئیسہ و غریبہ کی خفی اور جلی مالش کرنے میں مصروف تھے۔ مہاراجہ کی آنکھیں کچھ

کھلی اور کچھ بند تھیں' اور ان کے کونوں میں گید گندے بیروزے کی طرح تہہ در تہہ جم رہی تھی۔ ایک اے۔ ڈی۔ سی نے مجھے دھکیل کر مہاراجہ کی سرکار میں پیش کیا۔

دوسرے اے۔ ڈی۔ سی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مہاراجہ کے دست مبارک کے ساتھ ہلکے سے رگڑ دیا۔ ہاتھ ملانے کی اس رسم میں وہ کیفیت تھی جو مینڈک کے لجلجے پیٹ کو ہتھیلی پر رکھ کر پیدا ہوتی ہے۔

اس تعارف کے بعد مہاراجہ بہادر کے نرخرے سے غٹ غٹ کی کچھ آوازیں برآمد ہوئیں' جن میں دریافت فرما رہے تھے کہ یہ شخص کون ہے؟ اور یہاں کیوں آیا ہے؟

اے۔ ڈی۔ سی نے کمال ادب سے اطلاع دی' کہ سرکار یہ وہی شخص ہے جس کے انعام جیتنے کا اخبار میں پڑھ کر حضور نے بطور رعایا پروری اور کرم گستری چائے پر مدعو فرمایا تھا۔

مہاراجہ بہادر نے بصد استغنا و دریا دلی ہاتھ کے اشارے سے ایک بیرے کو حکم دیا' کہ لے جاؤ اسے۔ پلاؤ چائے وائے۔ کچھ پیسٹری ویسٹری بھی.......

غنودگی کے مارے مہاراجہ صاحب اپنا فقرہ بھی نہ پورا کر پائے' اور دو تین بیرے میری طرف یوں لپکے جیسے وہ میری مشکیں کس کر چائے پلانے لے جائیں گے۔

اسی روز میں نے اپنے دل میں یہ عزم بالجزم کر لیا' کہ میں کسی صورت میں کبھی ریاست کشمیر کی ملازمت اختیار نہ کروں گا۔ چنانچہ بی۔ ایس۔ سی کرتے ہی جب مجھے سٹیٹ گورنمنٹ سے انگلستان جا کر فارسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کا وظیفہ پیش ہوا' تو میں نے بڑی بے اعتنائی سے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے انگریزی کا داخلہ لے لیا۔

پرنس آف ویلز کالج کے چاروں سال انگریزی کا بھوت میرے سر پر بری طرح سوار رہا۔ اگرچہ کالج میگزین "توی" کے اردو سیکشن کی ادارت میرے سپرد تھی' تاہم اردو تک بھی میری رسائی بزبان انگریزی ہی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں مجھے ہر چیز پہلے انگلش میں

سوجھتی تھی' اور میں اس کر ترجمہ کر کے اردو کے قالب میں ڈھالتا تھا۔ شیلے اور کیٹس کی چند نظموں کے منظوم ترجمے بھی کئے۔ "اے باد غرب" مولانا صلاح الدین احمد صاحب کو بھی پسند آئی۔ اور انھوں نے اسے "ادبی دنیا" میں شائع فرمایا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور سے ایک رسالہ "جاوید" جاری ہوا تھا۔ اس کے ایک ایشوع میں "سہاگ گیت" والی نظم فراق گورکھپوری کے نام سے چھپی دیکھی۔ میرے لیے تو یہ بات باعث فخر تھی' کہ میری کوئی چیز غلطی سے بھی فراق جیسے عظیم شاعر کے نام لگ سکتی ہے۔ لیکن اگر ان کے علم میں یہ چیز آ گئی ہوتی' تو وہ ضرور اسے اپنی توہین قرار دیتے!

○ اے باد غرب

لائی ہے مغربی گھٹا فصل خزاں کا قافلہ
رنج بھی غم بھی خار بھی بادہ بے خمار بھی
تیرے شرار سوز سے پھول چمن میں جل اٹھے
تیرے ہی نیش خار سے سینہ گل فگار بھی
تیری حیات میں نہاں مانا کہ ہے خزاں کی جاں
تیری ہی گود میں جواں پل کے ہوئی بہار بھی

پیدا ہوئے تھے برگ و گل ایک ہی رات کے لیے
تو نے دبا کے رکھ لیے تازہ حیات کے لیے

تیرے خرام ناز سے پیدا اک اضطراب ہے
بحر میں بر میں باغ میں دشت میں کوہسار میں
دامن تار میں نہاں تیرے ہیں لاکھ آندھیاں

جیسے نہاں ہوں بجلیاں گیسوئے تابدار میں

گردش ماہ و سال کو منزل کارواں ہے تو
تیرہ و تار رات کی آخری داستاں ہے تو

نالہ جوش تھا خموش کس نے کیا ہے پر خروش؟

بحر کی خفتہ موج کو کس نے جگایا خواب سے؟
زلفیں عروس باغ کی تو نے صبا بکھیر دیں
سینۂ آب کو نئے داغ دیئے حباب سے

تیری نوائے پر الم، تیری صدائے رنج و غم
تیری ندائے زیر و بم پھیلی ہوئی ہے یم بہ یم

میرا چمن اجڑ گیا باد صبا تو کیا ہوا
تو اور میں تو ایک ہیں درد بھری صفات میں
گیت ہیں ہار جیت کے بھولی ہوئی پریت کے
دونوں کی راگنی ہے غم کارگہ حیات میں
میری صدائے ہاو ہولے جا صبا مثال بو
جا کے سنا دے کوبکو عرصہ کائنات میں

رنگ خزاں نے لے لیے باغ میں برگ و بار کے
بلبل نیم جاں نہ رو، آتے ہیں دن بہار کے
(شیلے کی Ode to the west wind کا ترجمہ)

○ سہاگ گیت

لڑکے:

رات! جلا دے جلدی جلدی دیپک مالا تاروں کی تو
بھر بھر تھال لٹا دے موتی جھولی میں گلزاروں کی تو
چاند کی کرنوں کو بن بن کر سندر صورت سیج بچھا دے
دکھ داتا ہے دن کی اگنی سورج دیو کی جوت بجھا دے
آ جا سندر سپنوں والی جھوٹے حیلے اور بہانے
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہو گا؟ ہائے کوئی یہ کیا جانے

لڑکیاں:

جاری سکھی آکاش کے تارے آج تیرے رکھوالے ہونگے
سکھ سنگیت کی ریت منانے جھوم جھوم متوالے ہونگے
پریم کی اونچ اور نیچ سے تھک کر پیاری سکھی جب تو سو جائے
سندر سندر کومل ٹھنڈے سپنوں میں کھو جائے
رہ رہ کر یوں ڈرتا ہے من' تو اپنی ہے وہ بیگانے
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہو گا؟ ہائے کوئی یہ کیا جانے

لڑکے:

رات کا پل پل بڑھتا جائے دن کی گھڑیاں سوتی جائیں
اونچے نیچے پربت میں سورج کی کرنیں کھوتی جائیں
کوند کوند کے بجلی جیسے کالی بدلی میں کھو جائے
جیسے کالے بالوں والی ناری بیٹھی بال سکھائے

لڑکیاں:

جاری سکھی پر تیرا جانا دل ہی نہ مانے دل ہی نہ مانے
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہو گا؟ ہائے کوئی یہ کیا جانے

سب مل کر:
نیند کے ماتے نیند بھلا دیں پریم کا ساگر جب لہرائے
من کا راگی من مندر میں میٹھی میٹھی تان اڑائے
جیسے من کی پینگ بڑھا کر چنچل آشا جھولا جھولے
یا جیسے رت آئے بسنتی کھیت کھیت میں سرسوں پھولے
روٹھ روٹھ کے بیٹھے کوئی، کوئی ڈھونڈے چور بہانے
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہو گا؟ ہائے کوئی کیا جانے
(شیلے کے bridal song سے متاثر ہو کر)

ooo

- چندر اوتی

پرنس آف ویلز کالج جموں میں تو خیر میں کسی نہ کسی طرح اندھوں میں کانا راجہ بیٹھا تھا لیکن گورنمنٹ کالج لاہور میں آ کر ساری شیخی کرکری ہو گئی اور یہاں میں کسی شمار قطار میں نہ رہا۔ نہ تو مجھ میں سنابری snobbery کی اہلیت تھی اور نہ ہی زبان گھما گھما کر، ہونٹ سکیڑ سکیڑ کر، حلق توڑ مروڑ کر اینگلو انڈین لہجے میں انگریزی بولنا میرے بس کا روگ تھا۔

انگریز تو خیر اپنے مادری لہجے میں انگریزی بولنے پر مجبور ہے ہی لیکن جاپانی، جرمن، اطالوی، فرانسیسی، روسی اور چینی بھی اس زبان میں گفتگو کرتے ہیں تو اپنے فطرتی لہجے کو انگلستانی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ غلامی کے دور نے احساس کمتری کی یہ وراثت صرف ہمیں کو عطا کی ہے کہ اگر ہم اپنے نیچرل لہجے میں انگریزی زبان بولیں تو اسے بڑا مضحکہ خیز لطیفہ سمجھا جاتا ہے۔

اپنی اس کوتاہی کے احساس سے دب کر میں اپنے خول میں گھس گیا۔ اور ریشم کے کیڑے کی طرح سمٹ کر اپنا ایک الگ کوکون بنا لیا۔ یہاں پر میری ملاقات چندراوتی سے ہو گئی۔

وہ لیڈی میکلیگن کالج کی سٹوڈنٹ تھی اور موہنی روڈ پر ہندو لڑکیوں کے ایک آشرم میں رہتی تھی۔

ایک روز پنجاب پبلک لائبریری میں ہم دونوں ایک ہی کتاب اپنے نام جاری کرانے کے امیدوار تھے۔ پہلے ہمارے درمیان ہلکا سا فساد ہوا، لیکن پھر لائبریرین نے یہ کتاب ایک ہفتہ کے لیے میرے نام ایشوع کرنے کا فیصلہ دے دیا۔

جب میں نے رجسٹر میں اپنا نام درج کروایا تو چندراوتی نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے غور سے گھورا اور پھر چمک کر بولی۔ ”اچھا تو تم ہی وہ تیس مار خاں ہو جس نے انگلش

Essay کا انعام جیتا تھا۔؟ اخباروں میں تصویر تو بڑی اچھی چھپوائی تھی۔ دیکھنے میں تو ویسے نظر نہیں آتے۔"

اس غیر متوقع حملے نے مجھے لمحہ بھر کے لیے جھپا دیا۔ میں کوئی جواب سوچ ہی رہا تھا' کہ وہ دوبارہ بولی۔ "ارے تم تو بالکل لڑکیوں کی طرح شرما لجا رہے ہو۔ چلو مان لیا وہ تصویر تمہاری ہی تھی۔ اب پلیز یہ کتاب مجھے دے دو مجھے پرچہ تیار کرنا ہے۔"

میں نے فوراً کتاب اس کے حوالے کر دی۔ اور ساتھ ہی اپنا سارا علم و فضل بھی اس کے قدموں میں ڈال دیا۔

وہ دوسرے تیسرے روز گورنمنٹ کالج آ جاتی تھی۔ میں اپنی کلاس چھوڑ کر اس کے ساتھ لان میں بیٹھا جاتا تھا' اور دیر تک اسے بڑی محنت سے پڑھاتا رہتا تھا۔

جب وہ ہمارے کالج آتی تھی' تو کئی لڑکے دو رویہ کھڑے ہو جاتے تھے' اور اسے دیکھ کر بڑی خوش دلی سے سیٹیاں بجاتے تھے۔ ایک روز ہم لان میں بیٹھے تھے' تو پروفیسر ڈکنسن میری کلاس کا پیریڈ لے کر قریب سے گزرے۔ مجھے دیکھ کر رک گئے' اور کافی دیر تک نگاہیں گاڑ کر چندراوتی کو گھورتے رہے۔ پھر مسکرا کر بولے۔ "ٹھیک ہے' تمہارے لیے یہی مناسب مقام ہے۔ کلاس روم میں تو ایک بھی ایسی گولڈن گرل نہیں۔"

چندراوتی واقعی سورن کنیا تھی۔ وہ سپر ڈیلٹر سمشیر قسم کی لڑکیوں کی طرح حسین نہ تھی۔ لیکن اس کے وجود پر ہر وقت سپیدہ سحر کا ہالہ چھایا رہتا تھا۔ رنگت میں وہ سونے کی ڈلی تھی' اور جلد اس کی باریک مومی کاغذ تھی جس کے آرپار نگاہ جاتی بھی ہے اور نہیں بھی جاتی۔ اس کی گردن میں چند باریک باریک نیلی رگوں کی بڑی خوشنما پچی کاری تھی۔ اور جب وہ پانی پیتی تھی تو اس کے گلے سے گزرتا ہوا ایک ایک گھونٹ دور سے گنا جا سکتا تھا۔

چندراوتی کو لاہور میں رہتے کافی عرصہ ہو چلا تھا۔ لیکن اب تک اس نے نہ جہانگیر کا مقبرہ دیکھا تھا' نہ نورجہاں کے مزار پر گئی تھی' نہ شالیمار باغ کی سیر کی تھی۔ اتوار کے اتوار میں ایک بائیسکل کرائے پر لیتا تھا' اور اسے کیریر پر بٹھا کے تاریخی مقامات

کی سیر کرا لاتا تھا۔ وہ اپنے آشرم سے آلو کی بھجیا اور پوریاں بنا لاتی تھی' اور بڑی احتیاط سے میرا حصہ الگ کاغذ پر رکھ کر مجھے دے دیتی تھی۔ کیونکہ ذات کی وہ کٹر ہندو تھی۔ اور وہ اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو ہرگز ہرگز میرا ہاتھ نہ لگنے دیتی تھی۔ ایک اتوار ہم بادامی باغ کی سیر کے لیے گئے۔ وہاں پہنچ کر ہر طرف دیکھا بھالا' لیکن نہ کہیں بادام نظر آئے اور نہ ہی کوئی باغ دکھائی دیا۔ مجبوراً ہم نے ایک گندے سے دھوبی گھاٹ کے قریب بیٹھ کر اپنا پک نک منا لیا۔

چندراوتی کو سائیکل پر بٹھا کر لاہور کی سڑکوں پر فراٹے بھرنے کی مجھے کچھ ایسی چٹیک پڑ گئی' کہ میں نے اپنا ذاتی بائیسکل خریدنے کا تہیہ کر لیا۔ انہی دنوں ڈیلی ٹریبون میں نیڈوز ہوٹل والے مسٹر نیڈو کا اشتہار نکلا کہ انہیں اپنے بیٹے کے لیے فوری طور پر پرائیویٹ ٹیوٹر کی ضرورت ہے۔ میں نے عرضی ڈال دی۔ مسٹر نیڈو سفید فرنچ کٹ داڑھی والے گول مٹول سے بوڑھے انگریز تھے۔ مجھے دیکھ کر بڑ مایوس ہوئے۔ کہنے لگے' "لڑکا بڑا ضدی اور سرکش ہے۔ پڑھنے لکھنے کا نام نہیں لیتا۔ تم خود نو عمر ہو۔ تم اسے کیونکر سنبھالو گے۔ میں تو کسی تجربہ کار اور خرانٹ ٹیچر کی تلاش میں ہوں۔"

میں نے بے اعتنائی سے جواب دیا' کہ میں بھی بڑا مصروف ہوں۔ ایک ماہ سے زیادہ ٹیوشن نہیں کر سکتا۔ اگر اس عرصہ میں وہ لکھنے پڑھنے کی طرف مائل ہو گیا تو میری اجرت ایک عدد ریلے بائیسکل ہو گی' اگر یہ مقصد پورا نہ ہوا تو میں کوئی فیس نہ لوں گا۔

یہ سودا مسٹر نیڈو کے دل کو بھا گیا۔ لیکن ریلے بائیسکل کی جگہ انہوں نے ہرکولیس کی پیشکش کی۔ آخر کچھ بحثا بحثی کے بعد معاملہ ایک فلپس بائیسکل پر طے ہو گیا۔ ان دنوں ریلے کی قیمت ۹۰ روپے' ہرکولیس کی ۶۴ روپے اور فلپس ۷۲ روپے ہوا کرتی تھی۔ ٹیوشن شروع کرنے سے پہلے میں نے مسٹر نیڈو سے کہا' کہ اگر لڑکا بہت بگڑا ہوا ہے' تو شاید کسی قدر سختی سے کام لینا پڑے۔ انہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟

مسٹر نیڈو عصبی المزاج بزرگ تھے۔ اپنے بیٹے کے لا ابالی پن سے نالاں نظر آتے تھے۔

میری بات سن کر انہوں نے گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھا' کہ کوئی اور گوش برآواز تو نہیں۔ پھر آہستہ سے میرے کان میں کہا۔ "خدا تمہیں خوش رکھے۔ ضرور سختی کرو۔ لیکن دیکھنا کوئی ہڈی وڈی نہ توڑ بیٹھنا۔ میرے سر پر قیامت آ جائے گی۔"

جان نیڈو پندرہ سولہ برس کا مغرور سا لونڈا تھا۔ ایک ملازم مجھے اس کے کمرے میں لے گیا۔ اس نے ناک سکیڑ کر نفرت سے میری طرف دیکھا' اور بدتمیزی سے بولا۔ "نکل جاؤ فوراً آپ کا اس کمرے میں کیا کام ہے؟"

"صبر بیٹا' صبر۔" میں نے کہا۔ "میں تمہارا نیا ٹیوٹر ہوں۔ تمہیں پڑھانے آیا ہوں۔"

"اونہہ' ٹیوٹر۔" جان نے تحقیر سے الفاظ چبا کر کہا۔ "میں کہتا ہوں چلے جاؤ۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں۔"

جان نے چھاتی پھلائی اور دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈال کر میرے سامنے اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھانپ لیا کہ یہ لاتوں کا بھوت ہے' باتوں سے نہیں مانے گا۔ گربہ کشتن روز اول۔ میں نے اس کے منہ پر زور سے ایک زناٹے دار چانٹا رسید کیا' اور ڈانٹ کر کہا۔ "یو سن آف بچ۔ تمہاری اماں نے تمہیں استاد سے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی؟ جیب سے ہاتھ نکال کر سیدھی طرح کھڑے ہو جاؤ۔"

جان نے کچھ اور اکڑ دکھائی' تو میں نے پے درپے اس کے دو تین اور تھپڑ لگا دیے۔ وہ روتا ہوا دروازے کی طرف لپکا' تو میں نے اسے گردن سے پکڑ کر روک لیا۔ اور کہا۔ "تمہارا باپ اس میں کوئی دخل نہ دے گا۔ میں اس سے پوچھ آیا ہوں؟"

"نان سنس۔" جان چلایا۔ "میرا باپ مجھے مارنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"صرف ہڈی توڑنے کی اجازت نہیں۔" میں نے اسے مطلع کیا۔ "باقی سب چھٹی ہے۔"

جان نے مجھے بڑی شستہ انگریزی میں دو تین گالیاں دیں۔

میں نے اس کی کلائی مروڑ کر پیٹھ پہ ایک لات جمائی اور اسے مرغا بننے کا حکم دیا۔ یہ اصطلاح اس کے لیے نئی تھی۔ میں نے خود مرغا بن کر اس کی رہنمائی کی۔ پانچ دس منٹ کان پکڑ کر اس کی طبیعت صاف ہو گئی۔ اور اس کے بعد ہمارے درمیان

دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ ایک ماہ کے بعد جب میں اپنا فلپس سائیکل وصول کر کے رخصت ہونے لگا تو سارا گھر میرے پیچھے پڑ گیا کہ میں منہ مانگی فیس پر جان کا ٹیوٹر بنا رہوں۔ لیکن میری ٹیوشن تو چندراوتی کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے انکار کر دیا۔

اب لاہور تھا' اور میرا بائیسکل۔ کسی ٹریفک سارجنٹ نے بھی شہر کی اتنی گشت نہیں کی ہو گی جتنا کہ ہم دونوں نے لاہور کے گلی کوچوں کو کھنگال ڈالا۔ ایک اتوار میں چندراوتی کے پاس آشرم پہنچا' تو وہی اداس بیٹھی تھی۔ اس نے کوئی الٹا سیدھا خواب دیکھا تھا۔ اور وہ اپنی ماں کے لیے فکر مند تھی۔ میں نے اسے کیریر پر بٹھایا' اور گرینڈ ٹرنک روڈ پر ایمن آباد کی راہ لی۔ میں سائیکل چلاتا رہا۔ چندراوتی پیچھے بیٹھی کوئی بھجن گنگناتی رہی۔ اور چھبیس ستائیس میل کا فاصلہ دیکھتے ہی دیکھتے وقت سے بہت پہلے ختم ہو گیا۔

ایمن آباد ایک تنگ و تاریک گلی میں دو چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں کا ایک بوسیدہ سا گھر تھا۔ چندراوتی کی بیوہ ماں پہلے کپڑے سی کر گزارہ کیا کرتی تھی۔ پھر موتیا اتر آنے سے اس کی نظر کمزور ہو گئی تو سینے پرونے کا کام بند ہو گیا۔ اب وہ غلہ منڈی کے ایک آڑھتی جگدیش چندر کے ہاں برتن مانجھنے' کپڑے دھونے اور گھر کی صفائی کرنے پر ملازم تھی۔ جگدیش چندر اسے معقول تنخواہ دیتا تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ اسے اس کا کام پسند تھا۔ بلکہ صرف اس وجہ سے کہ اس کی بیٹی خوبصورت تھی۔ ماں کی تنخواہ کے بہانے وہ دراصل چندراوتی پر سٹہ کھیل رہا تھا۔ یوں بھی جب کبھی وہ لاہور جاتا تھا' تو چندراوتی کو اس کی ماں کی خیر خیریت بتانے آشرم ضرور جاتا تھا۔ جس روز پک نک کے لیے چندراوتی آلو کی بھجیا اور پوریوں کے علاوہ کچھ مٹھائی بھی لاتی تھی' تو میں سمجھ جاتا تھا کہ جگدیش چندر آیا ہو گا۔ اور پاؤ بھر مٹھائی کا نذرانہ دے کر رسم عاشقی نبھا گیا ہے۔ ایک دو بار میں نے جگدیش چندر کا نام لے کر چندراوتی کو چھیڑنے کی کوشش کی' تو اس نے بڑے درد و کرب سے ہاتھ جوڑ کر منت کی۔ "اس مورکھ کا

نام نہ لو۔ تمہاری زبان میں کیڑے پڑ جائیں گے۔"

چندراوتی کی ماتا مجھے بڑی پسند آئی۔ اس کے پور پور سے شگفتگی' شائستگی اور شانتی ٹپکتی تھی۔ اس نے برف ڈال کر دودھ کی کچی لسی بنائی۔ ان کے ہاں مسلمانوں کے لیے کوئی الگ برتن نہ تھا۔ اس لیے میں نے دونوں ہاتھوں کا چلو بنایا' چندراوتی نے گڑوی اٹھائی' اور دیر تک اس میں دور سے لسی انڈیلتی رہی۔ ماتا جی یہ نظارہ دیکھ کر بہت ہنسی' اور پھر چندراوتی کو ڈانٹا کہ گھر آئے ہوئے پروہنے کو کبھی ایسے بھی لسی پلایا کرتے ہیں؟

"کوئی بات نہیں ماتا جی۔" چندراوتی نے کہا۔ "یہ تو اپنے ہی لوگ ہیں' کوئی پروہنا تھوڑی ہیں۔"

کہنے کو تو بے خیالی میں وہ یہ فقرہ بول گئی۔ لیکن پھر اپنے آپ اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئیں۔ اور وہ جلدی جلدی برتن سمیٹ کر رسوئی میں چلی گئی۔

میں بھی راجہ اندر کی طرح آلتی پالتی مار کر موڑھے پر بیٹھ گیا۔ اور ان پھلجڑیوں کا مزہ لینے لگا جو چندراوتی کی بات سے میرے انگ انگ میں بڑی کثرت سے چھوٹنا شروع ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد پیپل کے پتوں کی دال اور بھنڈی کا سالن پروسا گیا۔ کھانے کا ایک ایک لقمہ گھی اور شکر اور شہد اور بالائی بن کر میرے گلے سے اتر گیا۔ تیسرے پہر جب ہم لاہور کے لیے روانہ ہوئے تو بائیکل کے پیڈل اس طرح گھومنے لگے جیسے دھنکی ہوئی روئی کے گالے ہوا میں اڑتے ہیں۔ سائیکل ذرا تیز ہوا' تو مجھے بھی ترنگ آئی' اور میں نے چندراوتی کو چھیڑنے کے لیے "پروہنا" "سوہنا" "من موہنا" "سانولا سلونا" وغیرہ کے قافیے جوڑ کر کچھ بے تکے سے عاشقانہ مصرعے الاپنے شروع کر دیئے۔

دو تین بار چندراوتی نے مجھے سختی سے ٹوکا۔ لیکن میرے سر پر بھی شاعری کا بھوت سوار تھا۔ جب میں نہ مانا' تو آناً فاناً اس نے چلتی ہوئی سائیکل سے چھلانگ لگا دی۔ گرینڈ ٹرنک روڈ کے عین بیچ وہ منہ کے بل گری اور اس کی بائیں کہنی پر خاصی گہری خراش آئی۔ میں نے زخم صاف کرنے کے لیے اپنا رومال پیش کیا' تو اس نے غصے سے جھٹک

کر زمین پر پھینک دیا۔

چندراوتی کو اصرار تھا' کہ اب وہ یہاں سے پیدل لاہور جائے گی۔ میرے ساتھ بائیکل پر نہ بیٹھے گی۔ میں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ لاہور ابھی اٹھارہ انیس میل کے فاصلے پر ہے۔ وہ اتنا کیسے چلے گی؟ میں اسے اکیلا چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں؟ لیکن وہ بھی تریاہٹ کے سنگھاسن پر چڑھی بیٹھی تھی۔ ہر چند میں نے اپنے کان کھینچے' ہاتھ جوڑے' معافی مانگی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آخر میں نے اپنی پیشانی زمین پر رکھدی اور اس کے سامنے گنگن کر ناک سے لکیریں کھینچنے لگا۔ وہ کھکھلا کر ہنس دی۔ "ارے' یہ تم کس کو ڈنڈوت کر رہے ہو؟"

"دیوی جی' ڈنڈوت نہیں کر رہا۔" میں نے جواب دیا۔ "ناک سے لکیریں کھینچ رہا ہون تاکہ تم معاف کر دو۔"

چندراوتی نے سڑک پر پھینکا ہوا میرا رومال اٹھا کر مجھے دیا' اور کہا' "لو رومال سے اپنی ناک صاف کر لو۔ بالکل سرکس کے کلاؤن نظر آ رہے ہو۔ اب شریف بچوں کی طرح بائسکل چلانا۔"

چندراوتی ہر قسم کی آرزو مندی سے بے نیاز تھی۔ اسے بس ایک حسرت تھی کہ وہ کسی طرح بنارس جا کر گنگا اشنان کر لے۔ میں نے اسے کئی بار چھیڑا' کہ مسلمان بلی تو نو سو چوہے کھا کے حج کے لیے نکلتی ہے۔ ہندو کنیا کا بھی فرض ہے کہ پہلے وہ پاپ کی گٹھڑی کمائے' پھر کہیں جا کر گنگا جی میں نہائے۔ یوں بھی میں نے اردو اور انگریزی ادب کے تیر بہدف اشاروں' کنایوں' تلمیحوں' تشبیہوں' استعاروں' اور طرح طرح کی ترکیبوں سے اس کا ذہن کسی قدر برانگیختہ کرنے کی بے حد کوشش کی' لیکن ہر بار منہ کی کھائی اور بڑی شرمندگی اٹھائی۔ رفتہ رفتہ ایک ہی بائیکل پر بیٹھے ہوئے بھی ہم دو الگ الگ گروں میں بسنے لگے۔ جوں جوں میرے دماغ میں نفسیات کی بھڑوں کا چھتہ بنتا گیا' اسی رفتار سے ہمارے درمیان ایک وسیع و عریض خلا پیدا ہوتا

شروع ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی کوسوں دور ہوتی تھی۔ دراصل میرے دل اور دماغ نے خواہشات کے جس راستے پر چلنا شروع کر دیا تھا' وہ لحظہ بہ لحظہ مجھے اس سے دور ہی دور لے جا رہا تھا۔ جیسے جیسے یہ فاصلے بڑھتے گئے' میرا مزاج چڑچڑا ہوتا گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر چندراوتی کے ساتھ جھگڑا مول لینا میرا معمول بن گیا۔ دن بھر اسے بائیکل پر لادے لادے سڑکوں پر گھومنا مجھے بڑی احمقانہ اور طفلانہ حرکت محسوس ہونے لگی۔ اور میں اس گناہ بے لذت کی اکتاہٹ سے دل ہی دل میں جھنجلانے لگا۔ کئی بار میرے سر پر یہ جنون سوار ہوا' کہ میں بائیکل کو کسی تیز رفتار موٹر کے ساتھ ٹکرا کر چور چور کر دوں۔ کبھی میرا جی چاہتا تھا' کہ میں اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دوں' اور اس کا سر زمین پر مار کر کچے ناریل کی طرح پاش پاش کر دوں۔ ایک روز وہ ایک چھابڑی والے کے پاس تازہ گنڈیریاں کٹوانے کھڑی ہوئی' تو میرے دل میں آیا کہ میں ایک موٹے گنے سے چندراوتی کو مار مار کر ادھ موا کر دوں' اور گنڈیریوں والے کی درانتی سے اس کی ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے دانتوں سے کچر کچر چبا ڈالوں۔ اس نے آ کر میرے حصے کی گنڈیریاں مجھے دیں' تو میں نے جھنجلا کر انہیں نالی میں پھینک دیا۔

جب میں اپنے کمرے میں واپس آیا' تو میرا جسم یوں ٹوٹ رہا تھا' جیسے سڑک کوٹنے والا انجن مجھے روندتا ہوا گزر گیا ہے۔ ناشکیب آرزوؤں کے کوڑے سفاکی سے میری کمر پر برسنے لگے۔ ناسفتہ خواہشات کا گرم گرم دھواں اٹی ہوئی چمنی کی طرح میرے گلے میں پھنس گیا۔ کمرے کی چار دیواری سانپ کی طرح بل کھا کھا کر مجھے اپنی لپیٹ میں جکڑنے لگی۔ میرا دم گھٹ گیا۔ میرے سر میں کالے کالے بھونڈ اور زہر ناک بھڑیں ہوائی جہاز کے انجن کی طرح بھنبھنانے لگیں۔ اور میرے جسم میں اوپر سے نیچے تک تیز رفتار چھپکلیوں کی فوج در فوج اچھلنے کودنے' سرسرانے لگی۔ میں گھبرا کر اٹھا' اور باہر سڑک پر آ گیا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف چھایا ہوا سناٹا قہقہے مار مار کر مجھ پر ہنسنے لگا۔ میں بھی ایک لیمپ پوسٹ سے لپٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اور دیر

تک زور زور سے جوابی قہقہے لگاتا رہا۔ دو تین راہگیروں نے رک کر مجھے گھورا۔ اور پھر شرابی کا فتویٰ دے کر آگے بڑھ گئے۔

لاہور کی کوئی سڑک میرے ساتھ آشنائی کا اقبال جرم کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ دکانوں پر لگے ہوئے سائن بورڈ بالکل اجنبی زبانوں میں لکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ گلی کوچوں کی بیگانگی مجھے قدم قدم پر آوارہ کتے کی طرح دھتکارتی تھی۔ گھروں کے بند دریچے اپنی بلندیوں سے آخ تھو کر کے میرے منہ پر تھوک دیتے تھے۔ سڑکوں کے موڑ جگہ جگہ میرا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے تھے اور میں ایک لاوارث کوڑھی کی طرح کبھی ادھر بھٹکتا تھا' کبھی ادھر بھٹکتا تھا۔ لاہور کی کوئی سڑک' کوئی گلی' کوئی کوچہ مجھے راستہ دینے پر تیار نہ تھا۔ بیگانگی اور دیوانگی کے اس ماحول میں بس ایک دروازہ ایسا دکھائی دیا جو آدھی رات کے بعد بھی آغوش مادر کی طرح وا تھا۔ بہت سے لوگ بے روک ٹوک داتا دربار میں آ جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ یوں ہی بے وضو اندر گھس گیا' اور مزار کی ایک محراب سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک میں آنکھیں بند کر کے انتہائی انہماک کے "ساتھ چندراوتی' چندراوتی" کا ورد کرتا رہا۔ پھر یکایک میرے اندر ایک ویکیوم Vacuum سا پیدا ہوا۔ اور میری محرومیوں کا آتش فشاں بھک سے پھٹ گیا۔ دبی ہوئی خواہشات کا کھولتا ہوا لاوا ابل ابل کر میرے روئیں روئیں سے پرنالوں کی طرح بہنے لگا۔ اور میں بڑی دیر تک محراب کے کونے میں سر دیئے دھاڑیں مار مار کر' بلک بلک کر روتا رہا۔ اس کے بعد مجھے کچھ اونگھ سی آ گئی۔

ایک موٹے سے متولی نے میری پسلیوں میں لاٹھی کا ٹھوکا دے کر مجھے بیدار کیا' اور ڈانٹ کر کہا۔

"تم یہاں خراٹے لینے آئے ہو؟ بدنصیب کہیں کے۔ اٹھو' اپنی داد فریاد کا واویلا مچاؤ۔ حضرت داتا گنج بخش سب کی سنتے ہیں۔"

میں نے اٹھ کر مسجد کے تالاب پر وضو کرنے کے بہانے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اور پھر واپس آ کر اپنی محراب میں بیٹھ گیا۔ میرے گرد و پیش کئی لوگ بڑے خضوع

و خشوع سے اپنی اپنی مرادیں مانگ رہے تھے۔ کوئی روزگار مانگ رہا تھا۔ کوئی رزق مانگ رہا تھا۔ کسی کو بیماریوں سے شفا کی طلب تھی۔ کوئی مقدمہ جیتنے کی دعا کر رہا تھا۔ میں نے بھی بڑی یکسوئی سے اپنی مراد مانگنے کی تیاری کی۔ لیکن میری زبان دانی کی ساری مہارت دھری کی دھری رہ گئی۔ میرے دل کی آرزو اس قدر ننگی تھی' کہ الفاظ کا کوء جامہ اس پر پورا نہ اترتا تھا۔ میں نے بڑی محنت اور کوشش سے فصاحت اور بلاغت اور سلاست اور شرافت اور شائستگی کے پیوند لگا لگا کر بہت سے فقرے بنائے' لیکن ایک فقرہ بھی ایسا نہ تھا جو دراصل چندراوتی کی بے آبروئی نہ کرتا ہو۔ بزرگوں کے مزار پر اس قسم کے انداز گفتگو اور اس قسم کی اظہار تمنا سے مجھے حجاب سا آ گیا۔ داتا صاحب بھی کیا سوچیں گے' کہ یہ بیوقوف میرے سامنے کیسی الٹی باتیں کر رہا ہے۔ تصور ہی تصور میں مجھے داتا صاحب ایک ہاتھ تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں جوتا اٹھائے اپنی جانب لپکتے ہوئے نظر آئے' تو مجھے زور سے ہنسی آ گئی۔ ہنستے ہی ہنستے میں نے اٹھ کر ایک چھلانگ لگائی' اور آس پاس بیٹھے ہوئے کوئی زائرین کو روندتا ہوا باہر بھاگ آیا۔

بس اس ایک چھلانگ میں تحلیل نفسی کا بیڑا پار ہو گیا۔ اس کتھارسس Cathrsis کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ کر بڑے آرام سے گھوڑے بیچ کر سو گیا۔ صبح ہوئی تو نہایا دھویا۔ نیا سوٹ پہنا' اور سائیکل لے کر سیدھا چندراوتی کے آشرم میں پہنچ گیا۔ وہ بیوقوف لڑکی اب تک ماضی کی دلدل میں منہ پھلائے بیٹھی تھی' کہ میں نے اس کی گنڈیریاں نالی میں کیوں پھینک دی تھیں۔ میں نے بڑی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ لیکن وہ بدستور روٹھی رہی۔ اس پر میں نے اپنی ترپ چال چلی۔ بائیکل ایک طرف رکھ دی۔ اور چندراوتی کے سامنے عین بیچ بازار سڑک پر ناک سے لکیریں نکالنے کی تیاری کرنے لگا۔ آشرم کے دروازے پر برسر عام ایسی حرکت سے بڑی جگ ہنسائی کا خطرہ تھا۔ اس لیے وہ فی الفور مان گئی' اور ہم دونوں بائیکل پر سوار ہو کر لارنس گارڈن

چلے گئے۔

اس روز سارا دن چندراوتی کچھ کھوئی کھوئی سی رہی۔ میرا فلاطونی راز و نیاز اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا۔ نہ ہی میرے غیر معمولی نشاط و انبساط کی بظاہر کوئی وجہ نظر آتی تھی۔ اس نے دو تین بار ناک سکیڑ سکیڑ کر میرا سانس سونگھنے کی کوشش کی' کہ میں کوئی نشہ تو کر کے نہیں آ رہا۔ چندراوتی بھی عجب معمہ تھی۔ میرے ایام جاہلیت کی چھوٹی موٹی زیادتیوں اور بداطواریوں کو تو وہ برداشت کر لیتی تھی۔ لیکن اب جو میں شرافت اور شائستگی کا لبادہ اوڑھ کر اس کے سامنے آیا' تو وہ بری طرح بور ہونے لگی۔ سائیکل کی سواری سے اس کا جی بھر گیا۔ شالیمار باغ' مقبرہ جہانگیر' لارنس گارڈن کی کشش ختم ہو گئی۔ بیڈن روڈ پر دہی بھلوں اور گول گپوں کا شوق بھی پورا ہو گیا۔ کامران کی بارہ دری میں اکٹھے بیٹھ کر گھنٹوں راوی کی لہریں گننے کا مشغلہ بھی بند ہو گیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر میرے ساتھ الجھنے لگی۔ اس پر ایک بے نام سا اکل کھرا پن چھا گیا۔ اور وہ بات بات پر برہمی' جھنجھلاہٹ اور آزردگی کا اظہار کرنے لگی۔ ایک روز کسی دکان سے قمیض کا کپڑا خرید رہی تھی۔ رنگوں کے انتخاب میں میں نے کچھ دخل ور معقولات دیا' تو وہ بگڑ کر آپے سے باہر ہو گئی' اور خریداری چھوڑ چھاڑ کر پیدل ہی آشرم کو واپس لوٹ گئی۔ اگلے روز میں اس سے ملنے گیا' تو پنجرا خالی تھا۔ اس نے آشرم چھوڑ دیا' اور اپنا سامان لے کر وہ ایمن آباد چلی گئی تھی۔

میں اس کے تعاقب میں بھاگم بھاگ ایمن آباد پہنچا وہ ایک چٹائی پر بیٹھی اپنی ماں کی مشین سے کچھ کپڑے سی رہی تھی۔ میں نے اس کے سامنے اپنے گلوں اور شکوؤں کا پورا دفتر کھول دیا۔ ابھی تو گرمیوں کی چھٹیوں میں دس بارہ روز باقی تھے۔ وہ اتنے روز پہلے ہی کالج سے کیوں چلی آئی؟ لاہور کو چپ چاپ چوروں کی طرح کیوں چھوڑ دیا؟ مجھے کیوں نہ خبر کی؟

چندراوتی اپنی نظریں سلائی پر گاڑے خاموشی سے مشین چلاتی رہی۔ میرے سوالوں کا اس

نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن کپڑے سیتے سیتے، سر اوپر اٹھائے بغیر، اس نے آہستہ آہستہ دھیمے دھیمے لہجے میں مجھے آگاہ کیا، کہ اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ ساری گرمیوں کی چھٹیاں کپڑے سی کر کچھ پیسے جمع کرے گی اور ستمبر کے مہینے میں اپنی ماتا کو ساتھ لے کر گنگا اشنان کے لیے بنارس چلی جائے گی۔

"پروگرام تو بڑا اچھا ہے۔" میں نے طنزاً کہا۔ "لیکن کالج میں تمہاری جگہ پڑھائی کون کرے گا؟"

چندراوتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور سر جھکائے زور زور سے مشین چلاتی رہی۔ کوئی آدھ گھنٹہ ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں اٹھ کر کھڑا ہوا، اور بولا۔ "اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ پھر کسی روز آؤں گا۔"

"ناں جی ناں۔" چندراوتی نے جلدی سے کہا۔ "اب چھٹیاں چھٹیاں بالکل نہ آنا۔ میرے کام میں ہرج ہوتا ہے۔"

"چھٹیوں کے بعد حاضر ہونے کی اجازت ہے یا وہ بھی نہیں؟" میں نے کسی قدر تلخی سے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتہ۔" اس نے روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھلا کر کہا۔

وہ سر جھکائے کھٹ کھٹ مشین چلاتی رہی۔ میں کچھ دیر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اور پھر بائیسکل سنبھال کر چلا آیا۔

لاہور آ کر میں نے ٹیوشنوں کے اشتہار ڈھونڈنے شروع کئے اور گرمیوں کی چھٹیوں میں دو مہینے کے لیے کیمبلپور میں ایک رائے بہادر کے ہاں ٹیوشن کر لی۔ ایک لڑکا بی اے کی تیاری کر رہا تھا۔ دوسرا سیکنڈ ایئر میں تھا۔ دو لڑکیوں نے میٹریکولیشن کا امتحان دینا تھا۔ چاروں کو دو ماہ پڑھانے کا دو سو روپیہ مشاہرہ طے ہوا۔ رائے بہادر نے رہنے کے لیے مجھے اپنے پٹوار خانے میں جگہ دے دی، اور دو وقت کا کھانا اپنے ایک مسلمان کارندے کے ہاں مقرر کر دیا۔

رائے بہادر کی منت سماجت کر کے میں نے ایک سو روپیہ پیشگی وصول کر لیا، اور اسے

ایک بڑے خوشامدانہ خط کے ساتھ چندراوتی کی خدمت میں بھیج دیا۔ میں نے بڑی منت سماجت' ڈانٹ ڈپٹ سے اس کو لکھا' کہ وہ سلائی مشین پر اپنا وقت ضائع نہ کرے' بلکہ اپنے امتحان کی تیاری کرے۔ بنارس یاترا کے لیے دو سو روپیہ فراہم کرنا میری ذمہ داری ہے۔

چند روز کے بعد منی آرڈر جوں کا توں واپس آ گیا۔

اگلے ماہ میں نے پورے دو سو روپے کا منی آرڈر بھیجا۔ وہ بھی اسی طرح واپس آ گیا۔

چھٹیوں کے بعد میں خود ایمن آباد گیا۔ وہ چارپائی پر بیمار پڑی تھی۔ اس کی ماں پاس بیٹھی پنکھا کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر چندراوتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے شکایت کی کہ اس نے میرے بھیجے ہوئے پیسے واپس کیوں کر دیئے تھے؟

"منی آرڈر کیوں کیا تھا؟" چندراوتی نے تنک کر کہا۔ خود کیوں نہیں لائے؟"

"خود کیسے لاتا؟" میں نے جواب دیا۔ "تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ چھٹیوں میں یہاں نہ آؤں' تمہارے کام میں ہرج ہوتا ہے۔"

"ہائے رام۔" چندراوتی نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "تم میری ہر بات کو سچ کیوں مان بیٹھتے ہو؟"

چندراوتی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں بے اختیار اس غرق شدہ لاش کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا جس کی آنکھ یکایک کھل جائے' اور اس پر یہ انکشاف ہو کہ جہاں وہ ڈوبی پڑی ہے وہاں پانی نہیں محض سراب ہے! میں نے ایک ایک کر کے اپنی انگلیوں پر ان مواقع کا شمار شروع کر دیا جب مجھے چندراوتی کی بات کو سچ نہیں سمجھنا چاہیے تھا' لیکن حماقت سے خواہ مخواہ سچ مان بیٹھا تھا۔

چندراوتی نے پنکھے کی ڈنڈی میرے سر پر مار کر مجھے چپ کرا دیا' اور کہا۔ "بس بس۔ اب زیادہ ہندی کی چندی نہ نکالو۔ بالکل دودھ پیتے بچے ہی بن گئے۔"

"کیوں نہ بنتا؟" میں نے بھی کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنا شروع کیا۔ "تم میرے ہاتھ کا چھوا ہوا پانی کا گلاس تک تو پیتی نہیں ہو۔"

ارے بھئی پانی کا گلاس تو پانی کا گلاس ہوتا ہے۔" چندراوتی نے عجیب طور پر ہنس کر کہا۔ "بندہ پرندہ تو پانی کا گلاس نہیں ہوا کرتا نا۔"

بستر پر بیٹھے بیٹھے اس نے مجھے اپنی بیماری کی رام کہانی ایسے انداز سے سنائی جیسے کوئی شوخ بچہ سکول میں اپنی شرارتوں کے کارنامے سناتا ہے۔ ایک دن یونہی بیٹھے بٹھائے اسے ہلکی ہلکی حرارت شروع ہو گئی۔ پھر کھانسی کے ساتھ تیز بخار ہو گیا۔ ایمن آباد کے وید نے تپ محرقہ تشخیص کیا' اور ٹھنڈے شربتوں سے علاج کرتا رہا۔ کھانسی بڑھتی گئی' اور اکیس دن گزرنے کے بعد بھی جب بخار نہ ٹوٹا' تو وہ گھبرا کر گوجرانوالہ ہسپتال میں سول سرجن کے پاس چلی گئی۔ ڈاکٹر نے ایکسرے لیا' خون ٹیسٹ کیا' تھوک کا معائنہ کیا اور نتیجہ یہ نکالا کہ چندراوتی کو تیسرے درجہ کی Galloping T-B ہو گئی ہے۔

ٹی بی کی خبر سن کر جگدیش چندر آڑھتی نے چندراوتی کی ماں کو اپنی گھریلو ملازمت سے نکال دیا۔ محلے والوں نے بھی ان کے ہاں آنا جانا بند کر دیا۔ اور اب وہ ماں بیٹی اپنی سلائی مشین بیچ کر کھانے پینے اور دوا دارو کا کام چلا رہی تھیں۔

میں ہر دوسرے تیسرے دن صبح سویرے اپنی بائیکل پر ایمن آباد چلا جاتا تھا۔ سارا دن ماں بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلتا اور گپیں ہانکتا۔ اور شام کو بائیکل پر لاہور آ جاتا۔ لیکن رفتہ رفتہ چندراوتی کی کھانسی کے دورے بہت بڑھ گئے۔ کھانسی کی دھونکنی گھنٹہ گھنٹہ بھر بڑے بے رحمی سے چلتی۔ اور وہ بے سدھ ہو کر بستر پر گر جاتی۔ یہ دیکھ کر میں ایمن آباد اٹھ آیا۔ دن بھر چندراوتی کے پاس رہتا۔ رات کو ایک مقامی مسجد کے صحن میں پڑ کر سو رہتا۔

ایک روز چندراوتی کھانس رہی تھی' تو اس کے گلے میں کوئی پھانس سی اٹک گئی۔ اس نے زور سے کھنکار کر گلا صاف کیا' تو ہولی کی پچکاری کی طرح اس کے منہ سے چلو بھر خون نکل آیا۔ ساتھ ہی اسے شدت کے اسہال لگ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ سنار کی کٹھالی میں گلتے ہوئے سونے کی طرح پگھل گیا۔ اور بستر پر لیٹے لیٹے اس

کا تن بدن اس طرح گھلنے لگا جیسے پانی کے گلاس میں پڑی ہوئی مصری کی ڈلی اپنے آپ ریزہ ریزہ ہو کر تحلیل ہونے لگتی ہے۔ اب نہ وہ اٹھ سکتی تھی' نہ بیٹھ سکتی تھی' نہ چل سکتی تھی۔ میں غلہ منڈی سے پٹ سن کی تین چار خالی بوریاں خرید لایا۔ چندراوتی کی ماں نے انہیں کاٹ کر آٹھ دس گدیاں سی بنا لیں۔ وہ یہ گدیاں چندراوتی کے نیچے بستر پر بچھا دیتی تھی۔ جب کچھ گدیاں میلی ہو جاتی تھیں تو میں انہیں لپیٹ کر لے جاتا تھا اور گرینڈ ٹرنک روڈ کے قریب ایک کنوئیں پر دھو کر سکھا لاتا تھا۔

چندراوتی کا یہ حال دیکھ کر میں گوجرانوالہ کے سول سرجن کے پاس گیا۔ سارا احوال ہمدردی سے سن کر اس نے میرے ساتھ ایمن آباد چلنے سے انکار کر دیا' لیکن سولہ روپے فیس لے کر ایک نئے مکسچر کا نسخہ ضرور لکھ دیا۔ میں مسکچر بنوا کر ایمن آباد پہنچا' تو چندراوتی سرگباش ہو چکی تھی۔

شام تک ارتھی تیار ہو گئی' شمشان بھومی میں ڈھائی من سوکھی لکڑی کی چتا بنائی گئی۔ چندراوتی کو اس میں لٹا کر بہت سا گھی چھڑکا' اور صندل کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے اسے آگ دکھا دی گئی۔ شعلے بھڑک بھڑک کر اژدھوں کی طرح ہوا میں زبانیں نکالنے لگے۔ دو تین برہمی زور زور سے منتر الاپنے لگے۔ ایک سادھو نے سنکھ بجایا۔ چنگاریاں چیخ چیخ کر دور تک آنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکی بھی جل کر راکھ ہو گئی جس نے کبھی میرے ہاتھ کا چھوا ہوا پانی تک نہ پیا تھا۔

چندراوتی کی ماتا نے ایک مدھم سی لالٹین کی روشنی میں اپنی بیٹی کے "پھول" چنے۔ اور راکھ سمیٹ کر ایک پوٹلی میں باندھ لی۔ لاہور آ کر میں نے اپنا بائیسکل بیچ دیا۔ اور چندراوتی کی ماں وک بیٹی کے "پھول" گنگا میں بہانے کے لیے بنارس جانے والی گاڑی میں سوار کر دیا۔

لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۲ سے جب بنارس والی ٹرین روانہ ہو گئی' تو اس کی پچھلی سرخ بتی دیر تک اندھیرے میں خون آلود جگنو کی طرح ٹمٹماتی رہی۔ پلیٹ

فارم پر تو بڑی چہل پہل تھی۔ لیکن میں سٹیشن سے نکل کر باہر آیا' تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ لاہور کے سارے لیمپ پوسٹ جادو کے زور سے غائب ہو گئے تھے۔ عاد اور ثمود کی بستیوں کی طرح اس شہر خموشاں کی عمارتیں بھی اپنی چھتوں پر اوندھی پڑی تھیں۔ ہر جانب کھنڈر ہی کھنڈر تھے۔ اس ویرانی میں مفلوج ہاتھ کی بے حس لکیروں کی طرح صرف ان مردہ شاہراہوں کا جال پھیلا ہوا تھا' جن میں چندراوتی کے ساتھ بائیکل چلایا کرتا تھا۔ کئی روز تک میں دن رات ان شاہراہوں پر پا پیادہ گھومتا رہا۔ چلتے چلتے میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ جب مزید چلنے کی سکت باقی نہ رہی' تو مجبوراً میں گورنمنٹ کالج کے لان میں واپس آ گیا اور اپنا پہلا افسانہ لکھنے بیٹھ گیا۔ افسانے کا عنوان "چندراوتی" تھا۔ اور اس کا پہلا فقرہ یہ تھا:

"جب مجھے چندراوتی سے محبت شروع ہوئی۔ اسے مرے ہوئے تیسرا روز تھا......"

افسانہ لکھتے لکھتے میں کئی بار رویا' کئی بار ہنسا۔ مکمل کرنے کے بعد میں نے یہ کہانی اختر شیرانی کی خدمت میں بھیج دی۔ انہوں نے اسے پسند فرمایا' اور مجھے بڑا پیارا خط لکھا۔ افسانہ انہوں نے "رومان" میں شائع کر دیا۔

جب میں یہ افسانہ لکھ رہا تھا تو پروفیسر ڈکنسن کلاس لے کر حسب معمول لان سے گزرے۔ مجھے دیکھ کر رک گئے' اور بولے:

"Hello, she has reverted to the gold mine."

میری آواز مچھلی کے کانٹے کی طرح گلے میں پھنس گئی' اور میں نے سسکیاں لے کر کہا:

"Sir, She has reverted to the gold mine."

○○○

• آئی سی ایس میں داخلہ

ایک روز میں جموں عجائب گھر کی لائبریری میں بیٹھا روزنامہ ٹریبون پڑھ رہا تھا' کہ اچانک میری نظر ایک خبر پر پڑی' جس میں آئی۔سی۔ ایس کے مقابلے کے امتحان کا نتیجہ درج تھا۔ گیارہ آدمی چنے گئے تھے۔ ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ اپنا نام کامیاب امیدواروں کی فہرست میں پا کر خوشی تو ضرور ہوئی' لیکن حیرت کا پلہ زیادہ بھاری رہا۔

چند ماہ قبل جب میں مقابلے کا امتحان دینے دہلی گیا تھا' تو پہلے روز مٹکاف ہاؤس پہنچتے ہی میرا دل بیٹھ گیا تھا۔ برصغیر کے سارے صوبوں سے کوئی ساڑھے سات سو لڑکے امتحان دینے آئے ہوئے تھے۔ ہر کسی کے سر پر کوئی نہ کوئی کلغی لہرا رہی تھی۔ کچھ یونیورسٹیوں کے ریکارڈ ہولڈر تھے۔ کچھ مشہور و معروف مقرر یا کھلاڑی تھے۔ کوئی آکسفورڈ اور کیمبرج کے لہجے میں فرفر' فرفر انگریزی بول رہا تھا' کوئی شین' قاف سے درست اردو کے موتی بکھیر رہا تھا۔ کسی کا ڈیل ڈول بارعب تھا۔ کسی کے لباس کی آرائش دیدہ زیب تھی۔ کچھ آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ کچھ سنجیدہ بحث مباحثوں میں مصرورف تھے۔ مٹکاف ہاؤس کے لان میں شائستہ' ذہین' فتین' خوش پوش' خوش گفتار' خوش رفتار نوجوانوں کے اس ہجوم میں میری کسی ایک سے بھی شناسائی نہ تھی۔ میں کسی سے یہ تک نہ پوچھ سکتا تھا' کہ مٹکاف ہاؤس کے بے شمار دروازوں میں سے امتحان کے ہال کا گیٹ کس طرف ہے؟ ہال میں جا کر اپنے رول نمبر کی سیٹ کس طرح تلاش کی جائے گی؟

اس نامانوس ماحول میں معاً ایک شدید تذبذب اور ایک عجیب سی جھینپ کی سوئیاں میرے تن بدن میں تیز تیز چبھنے لگیں۔ میرے ذہن میں ایک بے نام سی مایوسی کے چیونٹے رینگنے لگے۔ میرے پاؤں میں بیشمار سبک رفتار پھرکیاں گھومنے لگیں' اور بے اختیار جی چاہا کہ میں لپک کر ریل گاڑی میں سوار ہو جاؤں اور مٹکاف ہاؤس سے جان چھڑا کر

گھر واپس لوٹ جاؤں۔ یہ خیال آتے ہی میرے تصور میں ماں جی کا چہرہ ابھرا۔ وہ خوشی خوشی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیں گی' اور بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہیں گی۔

"بچہ' اچھا ہی ہوا تم واپس آ گئے۔ بڑی بڑی نوکریاں تو جان کا جنجال ہوتی ہیں۔ دن میں ایک آدھ بار چٹنی روٹی مل جائے تو یہ غنیمت ہے۔ بس اللہ ایمان سلامت رکھے۔"

لیکن دوسرے ہی لمحے والد صاحب کا خیال آیا۔ غالباً ان کے چہرے پر کسی غم اور غصے کا رد عمل ظاہر نہ ہو گا۔ لیکن ان کے دل و دماغ کے نہاں خانے میں ضرور مایوسیوں کے انبار لگ جائیں گے' دادی اماں نے انہیں خود آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان دینے کے لیے سات سمندر پار جانے سے روک دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ احساس محرومی کا یہ روگ والد صاحب کی زندگی میں اندر ہی اندر خون کے کینسر کی طرح پھیلتا رہا۔ اور وہ باسٹھ برس کی عمر تک "اگر پدر نتوا اندپسر تمام کند" کے خواب کی تعبیر کے منتظر بیٹھے رہے۔ ادھر میں آئی۔ سی۔ ایس میں داخل ہوا۔ ادھر چند مہینوں کے اندر اندر انہوں نے بیٹھے بھائے چشم زدن میں بار زیست یوں اتار پھینکا جیسے ان کی زندگی کا مشن پایہ تکمیل تک پہنچ گیا ہو۔

والد صاحب اور میرے درمیان محبت کے علاوہ مروت کا بھی گہرا رشتہ تھا۔ اس احساس مروت نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی' اور میں چپ چاپ مٹکاف ہاؤس میں امتحان کا پرچہ دینے بیٹھ گیا۔

مٹکاف ہاؤس کا یہ ہال میرے لیے ایک اجنبی وادی تھا' اور آئی۔ سی۔ ایس کے امیدوار صحبت ناجنس۔ سول سروس میں اٹھائیس انتیس سال گزارنے کے باوجود سول سروس والوں کے ساتھ یہ احساس اجنبیت اور ناجبیست ہمیشہ میرے ساتھ ہی ساتھ رہا۔ سول سروس کے تالاب میں نہ میں مچھلی بن سکا نہ مگرمچھ۔ زیادہ سے زیادہ میری حیثیت ایک کاغذی ناؤ کی سی رہی' جسے کوئی شوخ بچہ سطح آب پر چھوڑ کر خود گھر جا بیٹھا ہو۔ شکوہ شکایت یوں بھی میری عادت نہیں' لیکن سول سروس کے متعلق میں کارکنان قضا و قدر سے

یہ گلہ زبان پر بھی نہیں لا سکتا' کہ:

درمیان قصر دریا تختہ بندم کردہ ای

بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

کیونکہ جب میں سول سروس میں داخل ہوا تو بے داماں' اور جب استعفیٰ دے کر نکلا تو چاک گریباں!

یوں بھی میری سروس کا سارا عرصہ بند دیگچی میں کھولتے ہوئے پانی کی' مانند گزرا ہے' جس میں بلبلے بنتے ہیں' ٹوٹتے ہیں' بھاپ اٹھتی ہے' اور پیچ و تاب کھا کر پھر منتشر قطروں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دراصل اس طرز ملازمت کی بنیاد اسی روز پڑ گئی تھی جب میں آئی۔ سی۔ ایس کے انٹرویو کے لیے پیش ہوا تھا۔

انٹرویو کے تین ممبر تھے۔ سرگورڈن ایرے' سر عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر سر رادھا کرشنن۔ موخرالذکر وہی ذات شریف تھے جنھوں نے بعد میں "سر" کاٹ کر کانگریس کی بھینٹ چڑھا دیا' اور پہلے بھارت کے نائب صدر اور پھر صدر بنے۔ شری رادھا کرشنن بڑے بلند پایہ عالم اور بین الاقوامی شہرت کے فلسفی تھے۔ لیکن انٹرویو کے دوران میری غلطی سے ان کے اندر کا برہمن برملا باہر نکل کے بیٹھ گیا' اور اس نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

بات یوں چلی کہ آئی۔ سی۔ ایس کے فارم میں ایک کالم تھا جس میں امیدوار کو اپنی دلچسپیوں اور مشاغل Hobbies کا ذکر کرنا پڑتا تھا۔ میں نے اپنی ایک ہابی یہ بھی درج کی تھی کہ مجھے مذاہب عالم کے تقابلی Comparative مطالعہ کا شوق ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے چھوٹتے ہی مجھ سے سوال کیا کہ تم نے مذاہب عالم کا مطالعہ اسلامی آنکھ سے کیا ہے یا انسانی آنکھ سے؟

اس سوال کا سیدھا سادا جواب دینے کی بجائے میں نے جوش تبلیغ میں ایک چھوٹی سی تقریر جھاڑ دی کہ جو لوگ اسلامی آنکھ اور انسانی آنکھ میں کوئی فرق روا رکھتے ہیں' وہ دراصل

بڑی شدید گمراہی میں مبتلا ہیں!

ڈاکٹر رادھا کرشنن کے چہرے کا ردعمل صاف بتا رہا تھا' کہ انہوں نے مجھے متعصب مسلمانوں کے کھاتے میں ڈال کر آئی' سی۔ ایس کے لیے ناموزوں قرار دے دیا ہے۔ اس لیے اس ایک سوال کے بعد وہ مجھ سے لاتعلق ہو کر خاموش بیٹھ گئے۔ سر گورڈن ایرے نے اصرار کیا' کہ وہ مجھ سے کچھ اور بھی پوچھیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑی بے دلی سے رضا مند ہوئے' اور پھر ایسے بے تکے اور مضحکہ خیز سوالوں کی بوچھاڑ کر دی جن کا واحد مقصد یہی ظاہر کرنا تھا کہ وہ مجھے سنجیدگی سے آئی۔ سی۔ ایس کا امیدوار تسلیم نہیں کرتے۔ مثلاً ٹینس کے گیند کا کیا وزن ہوتا ہے؟ چار اونس وزن پورا کرنے کے لیے پنگ پانگ کے کتنے بال درکار ہوں گے؟ ہاکی کے گول کی چوڑائی اور اونچائی کتنی ہوتی ہے؟ کچھ سوال جانور جنوروں کے متعلق تھے۔ ایک عجیب سوال یہ تھا' کہ اٹلی کو یورپ کا بوٹ کہا جاتا ہے۔ اس کے آس پاس کے جزائر میں سے کس کس جزیرے کو کہاں کہاں چسپاں کیا جائے کہ یہ مردانہ بوٹ نہ رہے بلکہ اونچی ایڑی کا زنانہ شو نظر آئے؟

انٹرویو کا یہ رنگ دیکھ کر بورڈ کے چئیرمین سرگورڈن ایرے نے مداخلت کی' اور دس پندرہ منٹ میرے ساتھ بڑے ڈھنگ کی معقول باتیں کیں۔

تیسرے ممبر سر عبدالرحمٰن خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے بشرے سے ہمدردی' شرافت اور شفقت تو ضرور ٹپکتی تھی' لیکن وہ بیچارے بے بس' مجبور اور معذور سے نظر آتے تھے۔ آزادی سے پہلے یہ دستور تھا' کہ اگر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ جائز ہمدردی کا اظہار کرتا بھی پکڑا جائے تو انگریزوں اور ہندوؤں کی نظر میں وہ متعصب' فرقہ پرست اور غیر منصف قرار پاتا تھا۔

سر عبدالرحمٰن نے مجھ سے صرف ایک سوال پوچھا۔ وہ یہ کہ اگر تم آئی' سی۔ ایس میں نہ لیے گئے' تو زندگی میں اور کیا کام کرنا پسند کرو گے؟

میں نے قدرے تلخی سے جواب دیا۔ "سر' آپ کا سوال بر محل ہے۔ آج کے تجربہ

کے بعد مجھے واقعی اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا ہو گا۔"
اس تان پر میرا انٹرویو ختم ہو گیا۔
روزنامہ ٹریبون میں اپنا ریزلٹ دیکھنے کے بعد دنیا کے باقی تمام خبروں کے ساتھ میری دلچسپی ختم ہو گئی۔ میں نے جلدی جلدی اخبار بند کیا' اور اسے لالہ رام سروپ کے حوالے کر دیا جو کچھ دیر سے میرے سامنے بیٹھے مجھے گھور رہے تھے' کہ میں کب اخبار ختم کر کے انہیں دوں اور وہ شاک ایکسچینج کے صفحہ کا مطالعہ شروع کریں۔
باہر عجائب گھر کے وسیع و عریض کمپاؤنڈ میں ریاست جموں و کشمیر کے سرکردہ ڈوگروں کی دو تین ٹولیاں حسب معمول اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھیں۔ اس کمپاؤنڈ میں سنگ مرمر کی دو بڑی تخت نما چوکیاں ایستادہ تھیں۔ سلطنت برطانیہ کے پرنس آف ویلز کسی وقت اپنی سیر و سیاحت کے دوران جموں شہر کو بھی نواز گئے تھے۔ عجائب گھر ان کے مہمان خانہ کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اور سنگ مرمر کی چوکیاں شاہی دربار منعقد کرنے کے لیے بچھائی گئی تھیں۔ چھوٹی چوکی پر مہاراجہ' بڑے تخت پر پرنس آف ویلز۔
اب سر شام ریاست کے سابق دیوان اور وزیر' ریٹائرڈ حکام' اور عمر رسیدہ ڈوگرہ رئیس ان چوکیوں پر بیٹھ کر شہر کے نظارہ کی سیر دیکھتے تھے' زور زور سے ڈکاریں لیتے تھے' یونہی بلاوجہ کھی کھی کر کے بلند و بالا قہقہے لگاتے تھے' سرگوشیوں میں راج محل کے جنسی سکینڈل سناتے تھے' شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کے گن گاتے تھے اور چودھری غلام عباس کی مسلم کانفرنس پر زہر ناک تبصرے کیا کرتے تھے۔ مجھے ان بوالہوس' متعصب اور مفتن بڈھوں کی باتیں سننے کا چسکا پڑا ہوا تھا۔ میں اکثر لائبریری سے نکل کر کچھ دیر ان کی چنڈال چوکڑیوں کے آس پاس منڈلایا کرتا تھا۔
آج جو میں نے ان لوگوں کی طرف کان لگایا' تو سنا کہ اس محفل میں میرا ہی ذکر خیر ہو رہا ہے۔
جنرل ٹھاکر سنگھ فرما رہے تھے' کہ مسلمان ہے تو کیا ہوا' نام تو جموں کشمیر ہی کا چمکے

گا۔ اس سال ہندوستان کی کسی دوسری ریاست سے اور کوئی امیدوار آئی سی ایس میں کامیاب نہیں ہوا۔

دیوان بدری ناتھ اس نظریے سے متفق نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا' کہ سانپ کا بچہ بہرحال

سانپ ہی ہوتا ہے۔

وزیر فیروز چند نے خدشہ ظاہر کیا' کہ جب یہی سانپ کا بچہ حکومت انگلشیہ کی طرف سے کسی وقت ریاست میں ڈیپوٹیشن پر آ کر ہماری گردن پر سوار ہو گا' تو پھر کیسی رہے گی؟

"واہ جی واہ۔" مہتہ رام تن نے تردید کی۔ "یہ حرامی ڈیپوٹیشن پر بھلا کیوں آئے گا؟ ہم تو بس اپنے ترلوکی جی کو بلائیں گے۔"

ترلوکی ناتھ کول پرنس آف ویلز کالج جموں میں میرا ایک پیشرو تھا۔ چند برس قبل وہ ریاست کا پہلا نمائندہ تھا' جو آئی۔ سی۔ ایس میں کامیاب ہوا تھا۔ کشمیری پنڈت کے ناطے سے ٹی۔ این کول جواہر لال نہرو کی ناک کا بال بن کے رہا۔ بہت سی کلیدی اسامیوں پر فائز ہوا۔ ایران' لندن اور ماسکو میں سفارت کی اور بھارت کی وزارت خارجہ کے سیکرٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔

عجائب گھر میں کھولت' جہالت اور تعصب سے ڈسے ہوئے ڈوگروں کے تبصرے سے شاد کام ہو کر میں نے گھر کی راہ لی۔ راستے میں حسب معمول میں نے رگھوناتھ بازار میں حکیم گورانڈتہ مل' کنک منڈی میں پربھ دیال فروٹ مرچنٹ' عمدہ شیر فروش'........ کبابی' غنی پنساری اور تاج ہوٹل کے مالک چراغاتائی کے ساتھ صاحب سلامت کی۔ لیکن کسی وجہ سے میں انہیں اپنی کامیابی کی خوشخبری سنانے کی جرات نہ کر سکا۔ یہ غریب طبیعت اور خوش خصال لوگ میرے ساتھ بڑی مروت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کی نظر میں پولیس کا سپاہی اور میونسپلٹی کا داروغہ بھی بہت بڑے افسر تھے۔ اب اگر میں نے انہیں یہ بتایا کہ ڈپٹی کمشنر' کمشنر اور جانے کیا کیا ہونے والا ہوں' تو شاید ان کے

ساتھ میرا رشتہ اچانک ٹوٹ جائے گا۔ اس خدشے کی ہچکچاہٹ نے میرا منہ بند کر دیا' اور یہ خبر میرے سینے میں ناکردہ گناہوں کی پوٹلی کی طرح چھپی رہی۔ لیکن جونہی میں اردو بازار میں داخل ہوا' میرے دل اور دماغ نے ایک زبردست قلابازی کھائی' اور یہ پوٹلی کھٹاک سے باہر نکل کر ربڑ کی بے شمار رنگین گیندوں کی طرح میرے گردا گرد اچھلنے کودنے لگی۔ اردو بازار میں سر شام سڑک کے دو رویہ بہت سی طوائفیں بن ٹھن کر اپنے دریچوں اور دروازوں میں بجلی کے تیز تیز بلب جلا کر ان کے عین نیچے بیٹھا کرتی تھیں۔ جی تو بہت چاہا کہ آج میں ان سب کے کانوں میں اپنی خوشخبری کی نے بجاتا جاؤں' لیکن ہمت کا سرگم جواب دے گیا۔

غنیمت ہے کہ میرے گھر پہنچنے سے پہلے روزنامہ "انقلاب" نے یہ خبر وہاں تک پہنچا دی تھی۔ ورنہ میں اندر ہی اندر ڈانواڈول تھا' کہ یہ خبر گھر والوں کو کس انداز سے سنانی چاہیے۔

ماں جی نے فقط اتنا کہا۔ "اللہ کا شکر ہے۔ بچہ' اب تم نوکری پر جموں سے بھلا کتنی دور جاؤ گے؟"

البتہ والد صاحب اپنے خاموش انداز میں بڑے خوش نظر آتے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر مسرت کا ہلکا ہلکا ارتعاش تھا۔ چہرے پر اطمینان کی خنک چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے مجھے دو نصیحتیں کیں۔ وہ بھی انگریزی میں۔ ایک یہ کہ اپنے کیریکٹر کی حفاظت کرنا۔ دوسری یہ کہ کسی شخص کی پیٹھ پیچھے وہی بات کرنا جو اس کے منہ پر بھی دہرا سکو۔

اس وقت مجھے یہ دو باتیں بے حد سطحی' فروعی اور بچگانہ سی نظر آئیں۔ لیکن جب کبھی ان پر عمل کا وقت آیا ہے' تو یہ یہی سادہ ہدایات ہمالیہ کی سنگلاخ چٹانوں سے بھی زیادہ دشوار گزار بن جاتی رہی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ان سیدھی سادی باتوں کو پوری طرح کبھی نہیں نبھا سکا۔ لیکن جب کبھی ان پر جھوٹا سچا' تھوڑا بہت عمل کرنے کی

توفیق نصیب ہوئی ہے' زندگی بڑی آسان اور آسودہ کٹی ہے۔

رات کو سویا' تو نیند کے جوار بھاٹے نے دل کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی کئی خواہشات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر میرے شعور کے ساحل پر ڈال دیا۔ میری ایک دبی دبی سی آرزو تھی کہ میں فلمی کہانیاں' مکالمے اور گیت لکھنے کا دھندا کروں۔ اس میں فن سے لگاؤ کا عنصر کم اور ایکٹروں' ایکٹرسوں کے قرب کی امنگ زیادہ تھی۔ دوسری خواہش بڑی عجیب تھی۔ بچپن سے میں نے جگموہن سنگھ ڈاکو کے بیشمار قصے سن رکھے تھے۔ وہ امیروں کو لوٹ کر ان کی دولت غریبوں میں بانٹ دیتا تھا۔ معصوم اور جوان لڑکیوں کو ہوس کے شکاریوں سے بچاتا تھا۔ خود ہر قسم کی رنگ رلیاں مناتا تھا۔ اور چار پانچ بہترین گانے اور ناچنے والی خوبصورت عورتوں کو اغوا کر کے ہمیشہ اپنے جلو میں رکھتا تھا۔ اس طرز حیات میں میرے لیے اتنی شدید کشش اندر ہی اندر کنڈلی مارے بیٹھی تھی' کہ صبح سویرے جب میں بیدا ہوا تو واقعی یہ سوچ رہا تھا کہ آئی۔ سی۔ ایس میں داخل ہو کر کہیں میں اپنے اصلی نصب العین سے بھٹک تو نہیں گیا؟

دن بھر اس قسم کے مبہم شکوک و شبہات کفران نعمت کی حد تک میرے دل میں سر اٹھاتے رہے۔ شام کے وقت دو بڑے آدمی والد صاحب کو مبارک باد دینے آئے۔ ایک شیخ محمد عبداللہ تھے۔ شیخ صاحب پڑھے ہوئے تو علیگڑھ کے تھے' لیکن ان کا دل جواہر لال نہرو کے الہ آباد میں جا اٹکا تھا۔ انہوں نے مبارک باد تو کوئی خاص نہ دی' لیکن اتنا ضرور کہا کہ پڑھے لکھے نوجوانوں کو انگریزوں کو غلامی میں جھونکنے کی بجائے نیشنل کانفرنس کی تحریک کے حوالے کر دینا چاہیے۔

چودھری غلام عباس علیگڑھ میں پڑھے تو نہ تھے' لیکن ان کے دل میں ضرور علیگڑھ آباد تھا۔ انہوں نے کہا' "یہ لڑکا جہاں بھی ہو گا' ہمارا ہی ہو گا۔ آپ کو مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ اسے خوش رکھے۔"

ان دو رہنماؤں کے اس متضاد ردعمل نے مجھے اور بھی الجھن میں ڈال دیا۔ شام ہوئی تو

میں عجائب گھر کی لائبریری جانے کی بجائے اور اپنے ذہن میں متصادم خیالات کا تانا بانا لیے "پنج پیر" چلا گیا۔

"پنج پیر" کے ساتھ میری بڑی پرانی راہ و رسم تھی۔ ہمارا پہلا تعارف بھی عجیب حالات میں ہوا تھا۔ جب میں اکبر اسلامیہ ہائی سکول جموں کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا، تو کبھی کبھی اپنے ایک دوست ممتاز حیسن کے ساتھ دریائے توی کے کنارے ہندوؤں کے شمشمان بھومی میں ارتھیوں کے جلنے کا تماشا دیکھنے جایا کرتا تھا۔ ایک روز کسی جلتی ہوئی لاش کا سر ایسے دھماکے سے پھٹا، کہ اس کے مغز کا ایک لوتھڑا چٹاخ سے ممتاز کے گال پر لگ کے چپک گیا۔ وہ چیختا چلاتا سرپٹ بھاگا، اور دریائے توی کے پانی میں سر ڈبو کر بیٹھ گیا۔ اس بھگدڑ میں اس کے پاؤں کا جوتا نکل گیا، اور پھسل کر گہرے پانی میں جا ڈوبا۔ اب ممتاز زار زار رونے لگا، کہ وہ ایک پاؤں سے ننگا گھر کیسے جائے گا۔ اس کا باپ پولیس کا ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ اور چھوٹی چھوٹی بات پر بڑی بڑی سزا دینا اس کا روز کا معمول تھا۔ ممتاز کی آہ و زاری دیکھ کر ایک گجری کو ترس آ گیا۔ وہ شہر میں دودھ بیچ کر توی کے پار اپنے گھاؤں واپس جا رہی تھی۔ ممتاز کی بپتا سن کر وہ بولی، کہ یہاں بیٹھ کر رونے دھونے سے کیا ملے گا؟ تم سیدھے "پنج پیر" چلے جاؤ۔ پیر بادشاہ ضرور مدد کرے گا۔

ہم دونوں تھکے ہارے، افتاں و خیزاں شام گئے جموں کے ایک مضاف رام نگر پہنچے۔ وہاں پوچھ پاچھ کر پنج پیر کو تلاش کیا۔ یہ سرینگر جانے والی بانہال روڈ سے کچھ دور دامن کوہ میں درختوں کے جھرمٹ میں گھرا ہوا ایک ویرانہ سا تھا۔ یہاں چند قبریں تھیں۔ جن میں ایک قدرے بڑی اور نمایاں تھی۔ اس کے سرہانے طاقچہ سا بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک بجھا ہوا مٹی کا دیا خالی پڑا تھا۔ کڑوے تیل کے دھوئیں سے یہ چراغ دان کالا سیاہ ہو چکا تھا۔ مزار پر مٹھی بھر بھنے ہوئے چنے، کچھ بتاشے اور کچھ پیسے بکھرے ہوئے تھے۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ کچھ دور اوپر بانہال روڈ تھی۔ اس پر بسیں بھی چل

رہی تھیں' ٹرک بھی گزر رہے تھے' موٹریں بھی آ جا رہی تھیں۔ لیکن ان سب کی آواز پنج پیر کے ویرانے سے کہیں باہر ہی باہر رک جاتی تھی۔ نیچے توی کا دریا چٹانوں سے سر پٹختا شاں شاں کرتا گزرتا تھا۔ لیکن اس کا شور بھی کہیں باہر ہی تحلیل ہو کے رہ جاتا تھا۔ سامنے ایک سرسبز پہاڑی پر مہاراجہ کا فلک بوس پیلس اور مہارانی کا بے شمار بند کھڑکیوں والا محل تھا۔ لیکن پنج پیر کی نشیب سے وہ کیڑے مکوڑوں کے بنائے ہوئے مٹی کے بھربھرے سے گھروندے دکھائی دیتے تھے۔

ہم دیر تک خاموشی سے بیٹھے ہوئے پیر بادشاہ کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن کسی نے بچارے ممتاز کا کھویا ہوا بوٹ اسے واپس لا کر نہ دیا۔ آخر تنگ آ کر میں نے مزار پر پڑے ہوئے پیسے چن کر گنے۔ پندرہ آنے تھے۔ پانچ آنے میں نے اپنی جیب میں ڈالے۔ پانچ آنے ممتاز کو دیئے' اور باقی پانچ آنے مزار پر واپس رکھ دیئے۔

اس روز کے بعد پنج پیر ہماری توجہ کا خاص مرکز بن گیا۔ ہم جمعرات کے جمعرات وہاں باقاعدگی سے جاتے۔ کیونکہ جمعرات کو نذرانہ زیادہ چڑھتا تھا۔ اور ایمانداری سے حساب کر کے اپنا حصہ وصول کر لاتے۔ تزکیہ نفس کی خاطر ہم نے عہد کر رکھا تھا' کہ اس پیسے کو دنیاوی ضروریات پر صرف کرنا ہمارے اوپر حرام ہے۔ چنانچہ اس رقم سے ہم ہفتہ بھر گرمیوں میں صرف ملائی کی اور سردیوں میں صرف اخروٹ اور کشمش کھایا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد ممتاز کا ہیڈ کانسٹیبل باپ فوت ہو گیا۔ گھر میں غربت آ گئی اور ممتاز پڑھائی چھوڑ کر ریاست کی فوج میں سپاہی بھرتی ہو گیا۔ ساڑھے اٹھارہ روپے ماہوار تنخواہ۔ بارک میں رہائش اور کھانا مفت۔ اب میں اکیلا باقاعدگی سے پنج پیر آنے جانے لگا۔ لیکن انصاف سے کام لے کر میں نے تقسیم زر کے فارمولے میں تھوڑی سے ترمیم کر دی۔ اب میں نصف رقم خود رکھ لیتا تھا اور نصف پنج پیر کے حوالے کر دیتا تھا۔ یہ سلسلہ بڑی باقاعدگی سے جاری رہا۔ پرنس آف ویلز کالج سے بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد میں ایم۔ اے کے لے گورنمنٹ کالج لاہور چلا گیا۔ وہاں سے کبھی چھٹیوں پر جموں آنا

جاتا ہوتا' تو میں ہر جمعرات کو پنج پیر کے ساتھ اپنی وضعداری ضرور نبھاتا تھا۔
لیکن آج جب میں اپنے نام پر آئی۔ سی۔ ایس کے تین حروف ڈالے پنج پیر پہنچا تو زندگی میں پہلی بار مجھے ان صاحبان مزار پر ترس آیا۔ کسی کو اتنا بھی معلوم نہیں تھا' کہ یہ مزار کن لوگوں کے ہیں۔ ان کے بارے میں بھانت بھانت کی روایات زبان زد خاص و عام تھیں۔ کوئی کہتا تھا یہ پانچ قطب تھے۔ کسی کا خیال تھا یہ پانچ ابدال تھے۔ کسی کا عقیدہ تھا کہ یہ پانچ ولی تھے جو اس علاقے میں اسلام کی شمع روشن کرنے آئے تھے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ پانچ چور تھے' جو قتل ہو کر یہاں مدفون ہوئے۔ اپنی زندگی میں وہ جو کچھ بھی تھے ہوتے رہیں۔ اب تو وہ فقط اپنی ذات کی نفی تھے۔ کسی کو ان کا نام تک معلوم نہ تھا۔ جو کوئی جس عقیدے کا غلاف ان پر چڑھا دیتا تھا' وہ بلاچوں و چراں اسے پہن لیتے تھے۔ نذرانوں کا ایک تہائی حصہ انہیں ملے' یا نصف ان کے لیے برابر تھا۔ ولی ہوتے تو تصرف دکھاتے۔ چور ہوتے تو مارتے۔ وہ بچارے تو نفی تھے' بالکل نفی۔
نئے آئی سی ایس کو ان بیچارے منفی قسم کے مجبور و معذور بزرگوں پر بڑا ترس آیا۔ ایک بھرپور جذبہ رحم سے سرشار ہو کر میں نے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی جو آج تک پہلے کبھی نہ پڑھی تھی اور جیب سے سوا روپیہ نکال کر مزار پر نذرانہ چڑھا دیا جو آج تک پہلے کبھی نہ چڑھایا تھا۔
نذرانہ چڑھانے کی دیر تھی کہ پنج پیر پر صدیوں سے چھایا ہوا خاموشی کا طلسم چٹاخ سے ٹوٹ گیا۔ سرینگر روڈ پر لاریوں اور ٹرکوں کی گھاؤں گھاؤں درختوں کا حصار توڑ کر مزار سے ٹکرانے لگی۔ دریائے توی کی مہیب شوں شوں کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ مہاراجہ کا پیلس اور بھی فلک بوس ہو گیا۔ مہارانی کے محل کی سینکڑوں بند اور تاریک کھڑکیاں کھل کے روشن ہو گئیں۔ میرا سر تیز رفتار موٹر کے پہیے کی طرح گھومنے لگا۔ اور پنج پیر کی قبروں کے تعویذ چیخ چیخ کر مجھے لعنت ملامت کرنے لگے' کہ اے

او نمک حرام' ابے او بے غیرت' ابے طوطا چشم' ہمارے ساتھ پندرہ سال کا یارانہ توڑتے ہوئے تجھے ذرا بھی شرم نہ آئی۔

میں نے دم دبا کر فوراً سوا روپیہ واپس اٹھا لیا۔ مزار پر پڑے ہوئے پیسوں سے اپنا حصہ وصول کیا۔ پاؤں سے جوتا اتار کر پانچ سات بار اپنے سر پر زور زور سے مارا۔ اور چیخیں مار مار کر بے اختیار رونے لگا۔

میری چیخوں سے گھبرا کر کئی پرندے درختوں سے اڑ گئے۔ لاریوں اور ٹرکوں اور دریائے توی کا شور و شغب بھی پنج پیر کے محیط سے باہر نکل گیا۔ بے برکتی کے جھکڑ بند ہو گئے۔ میرے سر کے گھومتے ہوئے پہیے پر بریک لگ گئی۔ راج محل دھڑام سے گر کر کیڑے مکوڑوں کا مسکن بن گئے۔ پنج پیر اپنے وہی پرانے سکوت اور سکون اور سناٹے کی چادر تان کر لیٹ گیا۔۔۔۔۔ اور میرے دل کی کال کوٹھڑی میں ایک عجیب سی دیوار گریہ نصب ہو گئی۔

خاموش آنسوؤں میں مقناطیس ہوتا ہے۔ جو آرزوؤں کے لوح چون کے چن چن کر آہستہ سے قریب لاتا ہے۔ بلند چیخوں سے لاوا پھوٹتا ہے' جس سے کون و مکان میں زلزلے آتے ہیں۔ اس کا تجربہ مجھے ایک بار اور بھی ہو چکا ہے۔ جب ماں جی نے کراچی کے جناح ہسپتال میں وفات پائی۔ تو ان کی میت کو گھر لانے کے لیے رات کے ایک بجے ایمبولنس میں رکھا گیا۔ میرے بھائی بہن اور دوسرے عزیز بھی اسی ایمولنس میں سوار ہو گئے۔ میرے پاس ڈرائیور نہ تھا۔ اس لیے میں تن تنہا کار چلا کر ایمبولنس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔ یتیمی کے اس کارواں میں چلتے چلتے دفعۃً میرے تن بدن اور میری روح کا لاوا بری طرح ابلنے لگا۔ میں نے کار کے سب شیشے چڑھا کر بند کر لیے۔ اور پھر سٹیرنگ وہیل پر سر مار مار کر اتنا زور زور سے' اتنا زور زور سے رویا ہوں' کہ مجھے محسوس ہونے لگا جیسے ماں جی ایمبولنس سے اٹھ کر میرے ساتھ والی سیٹ پر آ بیٹھی ہوں۔ یہ احساس اتنا صاف اور پر یقین تھا' کہ جب گھر پہنچ کر گاڑی رکی' تو میں نے کار سے اتر کر اس کا دوسرا دروازہ بھی کھولنا چاہا تا کہ ماں جی بھی باہر آ جائیں۔

لیکن وہاں کون تھا جو باہر آتا۔ لاش ایمبولنس سے نکل رہی تھی۔

پنج پیر کے ساتھ اپنا رشتہ از سر نو استوار کر کے جب میں واپس لوٹا تو میرا برا حال تھا۔ ہاتھ تھرتھرا رہے تھے۔ ٹانگوں میں رعشہ تھا۔ پاؤں من من کے بھاری ہو رہے تھے اور سارا جسم کچے پھوڑے کی طرح ٹیس مار رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں کچھ دور پیدل چلا۔ پھر ایک تانگے میں بیٹھ کر گھر پہنچ گیا۔

گھر آ کر میں نے اپنی کہانیاں لکھنے والی کاپی نکالی اور اپنا دوسرا افسانہ لکھنے بیٹھ گیا۔ اس کا عنوان "پہلی تنخواہ" تھا۔ اس میں میں نے پہلی تنخواہ کے عجیب و غریب مخرب الاخلاق مصرف کچھ ایسے انداز سے بیان کئے تھے کہ اختر شیرانی نے اسے اپنے رسالہ میں شائع کرنے سے انکار کر دیا۔

○○○

• صاحب' بنیا اور میں

آئی سی ایس نے لوٹ کھسوٹ میں جنم لیا۔ مار دھاڑ میں پروان چڑھی۔ سلطنت آرائی میں عروج پایا۔ اور برصغیر میں آزادی کے نزول کے ساتھ ہی دم توڑ دیا۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے جنوبی ایشیا میں تجارت کے پردے میں سیاست کا جال پھیلایا' تو اس کے جلو میں ملازمین کا ایک لاؤ لشکر بھی اس خطہ ارض پر ٹڈی دل کی طرح اُمڈ آیا۔ یہ ملازم عام طور پر کمپنی کے ڈائریکٹروں کے بیٹے' بھانجے' بھتیجے یا ان کے دوست احباب کے عزیز و اقارب ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہ ۵ پاؤنڈ ماہوار تک مقرر تھی۔ لیکن اس کے علاوہ ذاتی تجارت کرنے کی بھی ان کو کھلی چھٹی تھی۔ چنانچہ اکثر ملازم کمپنی کا کام کم اور نجی تجارت زیادہ کرتے تھے۔ مقامی راجوں' رجواڑوں' زمینداروں اور رئیسوں سے زبردستی نذرانے وصول کرنے کا رواج بھی عام تھا۔ اور اس طرح اکثر ملازم چند سال میں لاکھوں روپے سمیٹ کر انگلستان واپس چلے جاتے تھے۔ واپسی پر وہ ایک آدھ ملازم چھوکرا یا طرحدار آیا بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے' اور جب وہ انگلینڈ کے مضافات میں بیش قیمت جائیدادیں خرید کر اپنا ٹھاٹھ جماتے تھے' تو وہاں کی سوسائٹی میں "نباب" کہلاتے تھے۔

مال و دولت سمیٹنے کا یہ نیا راستہ دیکھ کر دوسرے انگریزوں کی بھی رال ٹپکنے لگی۔ اور ہندوستان میں کمپنی کی ملازمت حاصل کرنا ایک باقاعدہ مہم کی صورت اختیار کر گیا۔

اب لندن میں ڈائریکٹروں کی بر آئی اور انہوں نے بھی کھلے بندوں ہاتھ رنگنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ کمپنی کی اسامیاں فروخت ہونے لگیں۔ ڈائریکٹر صاحبان ایک ایک اسامی کی قیمت دو ہزار سے تین ہزار پاؤنڈ تک وصول کرتے تھے۔

اسامی سفارش سے ملی ہو یا قیمت دے کر خریدی گئی ہو' کمپنی کے ملازمین کا واحد مقصد یہی ہوتا تھا کہ ہندوستان آ کر وہ کم سے کم عرصہ میں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹیں

اور پھر وطن عزیز واپس جا کر عیش و آرام کی زندگی بسر کریں۔ اس مقصد براری کی دھن میں میں انہیں طرح طرح کے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔

جب کمپنی کا نیا ملازم ہندوستان پہنچ کر جہاز سے اترتا تھا' تو سب سے پہلے اسے یہاں کا بنیا ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا۔ ہر انگریز کے ساتھ ایک ایک بنیا ہر وقت اس طرح چپکا رہتا تھا جس طرح جسم کے ساتھ سایہ لگا رہتا ہے۔ انگریزوں کی ذاتی تجارت کے لیے سرمایہ بنیا فراہم کرتا تھا۔ سمگلنگ کے کاروبار کے نت نئے راستے وہ نکالتا تھا۔ گھروں کے لیے فرنیچر آرائش و زیبائش کا سامان وہ لاتا تھا۔ باورچی خانے کی روزمرہ ضروریات اس کے دم قدم سے پوری ہوتی تھیں۔ گھریلو ملازمین کا چناؤ اس کے مشورہ سے ہوتا تھا۔ نذرانہ وصول کرنے کے لیے موٹی موٹی اسامیوں کی نشاندہی بھی بنیا کرتا تھا۔ اور اپنے فرنگی آقاؤں کی جنسی حاجات پر بھی وہ بڑے رکھ دکھاؤ سے اپنی نظر التفات ہر دم مرکوز رکھتا تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہر طرح کے مسائل کو آناً فاناً حل کرنے میں بنیے نے کچھ ایسے مہارت حاصل کر رکھی تھی' کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اکثر ملازم اس کے بنے ہوئے پیچیدہ جال میں بے بس مکڑیوں کی طرح جکڑے بندھے رہتے تھے۔

ابتداء میں انگریزوں اور ہندو بنیوں کا گٹھ جوڑ شروع تو تجارتی لین دین سے ہوا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک عالمگیر بلا (Octopus) کی طرح اس نے باہمی خیر سگالی کے ہر شعبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک بہت بڑی قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں مسلمانوں کو اپنا واحد دشمن تصور کرتے تھے۔ یہ ملی بھگت خوب رنگ لائی۔ جب انگریزوں نے برصغیر پر اپنا تسلط جمانے کا آغاز کیا' تو تجارتی بنیا ان کا دست راست تھا۔ اور آزادی کے بعد جب انہوں نے یہ خط ارض چھوڑا تو سیاسی بنیا ان کا ہمدم و ہمراز تھا۔ یہ محض حسن اتفاق ہی نہ تھا' کہ ہندوؤں نے جس انگریز سے چھٹکارا حاصل کیا تھا اسی انگریز کو برضا و رغبت بھارت کا پہلا گورنر جنرل بھی تسلیم کر لیا۔

برٹش فراست اور بنیا سیاست کی یہ کامیابی چانکیہ کے فلسفہ ریاست کے عین مطابق ہے۔ جس میں راج نیتی کے کاروبار میں جھوٹ اور فریب واجب ہے' اور ضرورت کے وقت

گدھے کو بھی باپ بنانے میں کوئی ہرج نہیں۔ ڈیڑھ دو سو سال پہلے ان دونوں کا نصب العین مسلمانوں کے بنے بنائے اقتدار کو پامال کرنا تھا۔ آزادی کے بعد دونوں کا مقصد ایک نئی ابھرتی ہوئی اسلامی مملکت کو درہم برہم کرنا بن گیا۔

یوں تو بنیا گیری عام طور پر ایک انفرادی پیشہ تھا۔ لیکن کلکتہ میں چند منچلوں نے مل کر بنیوں کی ایک کمپنی بھی کھول لی تھی۔ اس فرم کا نام "چار یار" تھا' اور یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ بڑے بڑے ٹھیکوں کا کام کیا کرتی تھی۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کا وہ منحوس دن تھا جب سرنگا پٹم کے تاریخی معرکے میں ٹیپو سلطان شہید ہو گئے۔ اور ہندوستان پر قبضہ جمانے کے لیے انگریزوں کا راستہ بالکل صاف ہو گیا۔ اس فتح کی خوشی میں لارڈ کارنوالس نے کلکتہ تھیٹر میں ایک شاندار محفل رقص و سرور منعقد کرنے کا اہتمام کیا۔ ہال میں جگہ جگہ "دشمن" سے چھینے ہوئے سامان حرب کی نمائش لگائی گئی۔ دیواروں پر بڑے بڑے آئینوں کے سامنے معرکہ سرنگا پٹم کے مختلف مناظر کی قد آدم تصویریں بنا کر لٹکائی گئیں۔ ستونوں پر بڑی خوبصورتی سے رنگ برنگ ریشم کے تھان منڈھے گئے۔ چھت سے رنگین سلک کی بڑی بڑی چادروں کو شامیانوں کی صورت میں آویزاں کیا گیا۔ انگریزوں کی جس جس رجمنٹ نے سرنگا پٹم کی جنگ میں حصہ لیا تھا' ان کے جھنڈے ہال کے عین وسط میں لہرائے گئے۔ ان کے عین نیچے سلطان ٹیپو شہید کے جھنڈوں کو الٹا لٹکایا گیا۔ ڈانس رات گیارہ بجے شروع ہوا۔ اور صبح پانچ بجے تک جاری رہا۔ میموں نے سفید ساٹن کی چست وردیاں پہنی ہوئی تھیں جن پر ریشم کے دھاگے سے ۴ مئی کے الفاظ جلی حروف میں کاڑھے ہوئے تھے۔ ڈانس کے درمیان جب مے نوشی کے لیے کچھ وقفہ ہوتا تھا' تو زرق برق کپڑوں میں ملبوس ہندوستانی ناچنے اور گانے والیاں مبارکبادی کے نغمے گا کر معزز مہمانوں کا دل بہلاتی تھیں۔ ارباب نشاط کے ان طائفوں کو "چار یار" نے بڑے اہتمام کے ساتھ بنارس سے فراہم کیا تھا۔ اس تقریب کے لیے خاص طور پر "چار یار" کے بنیوں نے یہ انوکھی اپج نکالی تھی' کہ ٹیپو سلطان کا درباری لباس

اس محفل میں کام کرنے والے خدمتگاروں اور چپراسیوں کو پہنایا گیا تھا۔
اپنے اپنے بنیے کی سرپرستی سے کمپنی کے انگریز ملازموں کی پانچوں گھی میں اور سر اکثر کڑاہی میں رہتا تھا۔ صبح سات بجے کے قریب جب صاحب بہادر کی آنکھ کھلتی تھی، تو سب سے پہلے حمال دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر کھڑکیاں اور دروازے کھولتا تھا۔ مسالچی بستر پر تنی ہوئی مچھر دانی سمیٹتا تھا۔ ایک طرف سے بیرا "چھوٹا حاضری" کی چائے پیش کرتا تھا۔ دوسری جانب سے حجام لپک کر بڑھتا تھا، اور صاحب کے سر کے نیچے دو تین تکیے رکھ کر لیٹے ہی لیٹے اس کی شیو بنا دیتا تھا۔ چلمچی اور آفتابہ لا کر بستر ہی میں اس کا ہاتھ منہ دھلا دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب وہ بریک فاسٹ کے لیے بیٹھتا تھا، تو یہی حجام کرسی کے پیچھے کھڑا ہو کر اس کے سر کی ہلکی ہلکی مالش کرتا تھا، بال بناتا تھا، وگ جماتا تھا۔ کانوں کی میل نکالتا تھا اور ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کو چٹخاتا تھا۔ ناشتہ ختم ہوتے ہی حقہ بردار حقے کی نلکی اس کے منہ میں دے کر خود پیتل کی ایک چمکدار پھکنی سے چلم کی آگ سلگاتا رہتا تھا۔ حقے کی پہلی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہی صاحب کا بنیا جھک جھک کر سلام کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ اس کے بعد ملازموں کی فوج ظفر موج کا ریلا اندر آتا تھا۔ خانساماں، بیرا، مسالچی، حمال، مالی، بہشتی، کتے والا، پنکھے والا، دھوبی، درزی۔ سب باری باری سلام کر کے اپنی دن بھر کی ضروریات پیش کرتے تھے۔ بنیا انہیں پورا کرنے کا بیڑا اٹھاتا تھا۔ اس کے بعد دفتر کے منشی، متصدی، پیشکار، ہرکارے، چوبدار اور چپراسی پیش ہوتے تھے۔ دس بجے صاحب کمرے سے برآمد ہو کر اپنی حیثیت کے مطابق گھوڑے یا پالکی یا فٹن پر سوار ہوتے تھے۔ ان کے سر پر چھاتا کھلتا تھا اور آگے پیچھے دس پندرہ چوبداروں، برقندازوں اور چپراسیوں اور جلوس چلتا تھا، جو بڑی خوبصورت رنگین وردیوں میں ملبوس ہوتے تھے۔ کچھ وقت دفتر میں گزار کر سارے مقامی انگریز ایک بجے ٹفن کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ لنچ میں پندرہ سے اٹھارہ تک کھانے کے کورس اور چار پانچ قسم کی شرابیں ہوتی تھیں۔ چار

بجے کھانے سے فارغ ہو کر شام کے ساتھ بجے تک قیلولہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد باربر ایک بار پھر ان کے کان کی مل نکالتا تھا' انگلیوں کے جوڑ چٹخاتا تھا' اور بال سنوار کر سر پر وگ جماتا تھا' آٹھ بجے سب لوگ اپنی اپنی سواریوں پر ہوا خوری کے لیے نکلتے تھے' اور دس بجے ڈنر کے لیے بیٹھ جاتے تھے۔ ڈنر کے بعد رات گئے تک حقے اور شراب کا دور چلتا تھا۔

اس محنت شاقہ کے عوض یہ لوگ چند برس میں لکھ پتی بن کر اپنے وطن سدھارتے تھے۔

دولت سمیٹنے کے اس کاروبار میں نذرانوں کی وصولی کو بڑا اہم مقام حاصل تھا۔ نذرانہ دراصل رشوت ہی کا دوسرا نام تھا۔ سب سے بڑا نذرانہ کلاؤ نے بنگال کے غدار میر جعفر سے وصول کیا تھا۔ اس نذرانے کا تخمینہ تیں لاکھ پاؤنڈ کے لگ بھگ تھا۔ اپنی تاریخی غداری کے شکرانے میں اس ننگ دنیا ننگ دین ننگ وطن میر جعفر نے اپنی وصیت میں بھی ساڑھے تین لاکھ روپے کے جواہرات اور ڈیڑھ لاکھ روپے کا سونا کلاؤ کے لیے ان القابات کے ساتھ چھوڑا تھا: "ہمارے ہیرو' ہماری آنکھوں کے نور نواب والی قدر لارڈ کلاؤ کے نام جو میدان جنگ میں چٹان کی طرح ثابت قدم رہتے ہیں۔" نذرانوں کے علاوہ میر جعفر کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور لارڈ کلاؤ کمپنی پر بھی بے دریغ ہاتھ صاف کرتا رہتا تھا۔ ایک بار اپنی تنخواہ وغیرہ کے علاوہ اس نے دو برس کے متفرق اخراجات کا جو بل ایسٹ انڈیا کمپنی سے وصول کیا تھا' اس کی تفصیلات کچھ یوں ہیں۔

یورپ سے آنے کا خرچ:
(ان تین ہزار پاؤنڈ کے علاوہ جو کمپنی نے لندن میں دیئے تھے) --------------- ۱۵۔ ۶۔

۳۴۸۹
متفرق اخراجات------------- ۰۔ ۱۲۔ ۹۹۶۲۹
کھانے پینے کے اخراجات----------- ۸۔ ۱۔ ۹۷۴۶۲
ملبوسات---------- ۷۔ ۴۔ ۱۲۹۸۷
ملازمین کی تنخواہ----------- ۴۔ ۱۱۔ ۱۹۷۲۲
دیگر چھوٹے چھوٹے اخراجات------- ۷۔ ۱۰۔ ۱۱۶۷۴
سیکرٹری کو انعام------- ۲۔ ۷۔ ۱۳۹۲۸

ٹوٹل -------------------------- ۲- ۷- ۳۳۳۸۹۵

اپنے اپنے بنیوں کے تعاون سے کمپنی کے بہت سے انگریز ملازم خفیہ طور پر چھوٹے چھوٹے مقامی حرم بھی قائم کر لیتے تھے۔ لیکن باقاعدہ شادی وہ صرف میموں سے ہی رچاتے تھے۔

اس مقصد کے لیے کمپنی کے ڈائریکٹر انگلستان سے آنے والے ہر بحری جہاز میں شادی کی خواستگار میموں کی کھیپ بھی ہندوستان بھیجتے تھے۔ یہ خواتین نئے نئے فیشن کے ملبوسات اور سامان آرائش سے لدی پھندی آتی تھیں۔ اور اپنے دل پسند خاوند کا شکار کرنے کے لیے طرح طرح کے دامن تزویر بچھا کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ان کے دل کو نوجوانوں کی نسبت بڈھے خاوند زیادہ پسند آتے تھے۔ عمر رسیدہ انگریز ہندوستان کی آب ہوا میں سالہا سال کی بسیار خوری اور مے نوشی کے بعد قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہوتے تھے۔ اور ان کی جوان بیویاں بہت جلد ان کی سمیٹی ہوئی دولت کی وارث بن جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ خاوند کے مرتے ہی بیوہ کے نام عمر بھر کے لیے تین سو پاؤنڈ سالانہ کی پنشن بھی مقرر ہو جاتی تھی۔ جو عورت ہندوستان آنے کے بعد ایک سال تک خاوند پھانسنے میں کامیاب نہ ہو سکے' اسے کمپنی کے خرچ پر واپس انگلستان بھیج دیا جاتا تھا۔

البتہ ایک طرحدار میم مس ہالڈین نے انگلستان واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اس نے ہندوستان میں کسی خاوند کا سہارا لیے بغیر ہی دولت کمانے کا ایک نیا راستہ تلاش کر لیا تھا۔ ہندوؤں کی ریت ہے کہ دیوالی کی رات وہ لکشمی دیوی کی پوجا کرتے ہیں تاکہ سارا سال ان پر مایا کی بارش برستی رہے۔ اگر کنواری کنیا کے برہنہ جسم پر سونے چاندی کے سکے رکھ کر پوجا پاٹھ کی جائے تو لکشمی دیوی کا دل زیادہ آسانی سے خوش ہو جاتا ہے۔ چند بنیوں کی مدد سے مس ہالڈین نے دیوالی کی راتوں کے لیے کنواری کنیا کا روپ دھار لیا۔ دولت کے پجاری اس کے عریاں تن بدن کو بڑی فنکاری سے روپوں اور اشرفیوں سے سجاتے تھے' اور پھر اس کے قدموں میں بیٹھ کر ساری رات بڑی عقیدت سے لکشمی دیوی کو برماتے اور اپنے قلب و نظر کو گرماتے تھے۔ رفتہ رفتہ مس ہالڈین

ہلدی دیوی کہلانے لگی۔ "دھن کی موج ہلدی دیوی" من کی کوج ہلدی دیوی کی پھبتیوں کے ساتھ اس کا چرچا دور دور تک پھیل گیا۔ پوجا پاٹھ کے لیے اس کی مانگ اتنی بڑھ گئی کہ ہر رات دیوالی کی رات بننے لگی۔ کمپنی کے ملازمین ایک سفید فام عورت کی ان حرکات پر بڑے چراغ پا تھے۔ ایک طویل سازش کے بعد آخر انہوں نے مس ہالڈین کو زبردستی انگلستان واپس بھجوا دیا۔ اس نے اپنی واپسی کے خلاف عدالتوں میں ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی تو بہت کی' لیکن کہیں کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالتیں مقدموں کا فیصلہ انصاف کی رو سے نہیں بلکہ مصلحت کی رو سے کرنے کی پابند تھیں۔

کمپنی کے عدالتی نظام میں کسی گورے کے ہاتھوں کالے کا قتل بڑا جرم شمار نہ ہوتا تھا۔ ایسے مقدمات میں مقتول اکثر بنگلوں اور دفتروں کے پنکھا قلی ہوتے تھے۔ انہوں نے دن رات مسلسل پنکھا کھینچنے کی بڑی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ بسا اوقات وہ پنکھے کی رسی اپنے پاؤں کے انگوٹھے کے ساتھ باندھ کر فرش پر لیٹ جاتے تھے۔ اس حالت میں اگر کبھی انہیں اونگھ بھی آ جاتی تھی' تو ان کی ٹانگ متواتر چلتی رہتی تھی اور پنکھا بدستور ہلتا رہتا تھا۔ لیکن اگر شومئی قسمت سے کسی وقت پنکھا بند ہو جائے' تو گرمی' نیند اور شراب کے خمار میں بوکھلایا ہوا "صاحب" ہڑبڑا کر اٹھتا تھا' اور سوئے ہوئے قلی کے پیٹ میں زور سے ٹھوکر مار کر اسے بیدار کرتا تھا۔ کئی بار اس ٹھوکر کی ضرب سے بچارے قلی کی تلی پھٹ جاتی تھی اور وہ وہیں لیٹے لیٹے دم توڑ دیتا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں صاحب کو کبھی ایک روپیہ جرمانہ ہو جاتا تھا' کبھی محض وارننگ ملتی تھی' کبھی بالکل باعزت بری۔

ہندوستانیوں کو سب سے کڑی سزا چوری کے جرم پر ملتی تھی۔ مجرم عورتیں ہوں یا مرد' عام طور پر انہیں چوراہوں میں بر سر عام ہر روز ۳۹ کوڑے اس وقت تک لگائے جاتے تھے' جب تک کہ وہ چوری کا مال واپس نہ کر دیں۔ تپتے ہوئے گرم لوہے سے چہرہ' ہاتھ اور ٹخنے داغنا بھی ایک عام سزا تھی۔ کچھ قیدیوں کو ہفتے میں ایک یا دو بار کاٹھ

بھی مارا جاتا تھا۔ کسی کو لکڑی کے شکنجے میں کس کر اس کی نمائش کرنے میں جسمانی تکلیف کی نسبت تذلیل و تشہیر کا عنصر زیادہ نمایاں ہوتا تھا۔ اکثر مقامات پر ہندوستانیوں کے لیے انگریزوں کے سامنے کسی سواری پر بیٹھنا ممنوع تھا اور بارش یا دھوپ میں چھاتا کھول کر چلنے کی بھی ممانعت تھی۔

کوئی دو سو برس تک اسی طرح من مانی کارروائیوں سے کمپنی بہادر نے ایک ہاتھ سے لوٹ مار کر بازار گرم رکھا اور دوسرے ہاتھ سے ملک گیری کی مہم ایسی کامیابی سے چلائی کہ ۱۸۵۳ء میں اس کا تجارتی کاروبار قانونی طور پر بند ہو گیا اور برصغیر پر انگریزوں کی باقاعدہ حکمرانی کا دور شروع ہو گیا۔ نئے سامراجی تقاضوں کے پیش نظر سب سے پہلے آئی سی ایس کی داغ بیل ڈالی گئی اور لارڈ مکالے کی قیادت میں اس سروس کو باضابطہ منظم کیا گیا۔ اب اس میں داخلہ صرف مقابلے کے امتحان کے ذریعہ ہونے لگا۔ آئی سی ایس کا پہلا امتحان لندن میں ۱۸۵۵ء میں منعقد ہوا۔ ۱۸۶۴ء میں پہلا ہندوستانی اس امتحان میں کامیاب ہوا۔ ۱۸۷۱ء میں ان کی تعداد چار ہو گئی۔ اگلے چالیس پچاس برس تک اس سروس میں جتنے ہندوستانی داخل ہوئے' وہ زیادہ تر ہندو ہی تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اس برصغیر میں مسلمانوں پر تعلیم و ترقی کے سبھی دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ لارڈ مکالے کا فتویٰ تھا کہ یہاں پر جو نظام تعلیم راج کیا جائے وہ ایسے انسان پیدا کرے جو رنگت میں تو بیشک ہندوستانی ہوں لیکن چال ڈھال' فہم و فراست' ذوق و مذاق' اخلاق و اطوار اور ذہنی اعتبار سے انگریز ہوں۔ اس پالیسی کے تحت جب فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا تو برصغیر کے ہزاروں مسلمان علماء و فضلاء بہ یک نوک قلم غیر تعلیم یافتہ قرار دے دیئے گئے۔ اس فیصلے کا ہندوؤں نے بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ اس لیے نہیں کہ انہیں انگریزی سے کوئی خاص محبت نہیں بلکہ صرف اس لیے کہ انہیں فارسی سے چڑ تھی' کیونکہ اس زبان کا رابطہ مسلمانوں سے تھا۔

یوں بھی جب ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ گل ہو گیا تو انگریزوں اور ہندوؤں کی ایک مشترکہ کوشش یہ تھی کہ اس برصغیر میں ہر اس امکان کو ختم کر دیا جائے

جس میں مسلمانوں کے دوبارہ سر اٹھانے کا ذرا سا شائبہ بھی موجود ہو۔ یہاں پر مسلمان ہی ایک ایسی قوم تھی جس میں حکومت کرنے کی صلاحیت بھی تھی' روایت بھی تھی اور ہزار سالہ تجربہ بھی حاصل تھا۔ چنانچہ اس قوم کا سر کچلنا دونوں کا فرض منصبی قرار پایا۔

اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے انگریزوں نے سب سے پہلے اقتصادی طور پر ہندوؤں کو آگے بڑھانے اور تعلیمی طور پر مسلمانوں کو پیچھے دھکیلنے کی پالیسی کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ یہ تجربہ بڑا کامیاب رہا۔ حکومت انگلشیہ نے نظام تعلیم کو سیکولر بنا کر اسے براہ راست سرکاری سرپرستی میں لے لیا۔ اس طرح مسلمانوں کے تہذیبی' تمدنی اور علمی گھواروں کا رشتہ اس نظام تعلیم سے بالکل منقطع ہو گیا۔ اسلامی مدرسے اور دارالعلوم تو حکومت کی سرپرستی سے محروم ہو کر اپنے اپنے خود حفاظتی خول میں چلے گئے' لیکن کرسچنن مشنری سکولوں کی تعداد روز بروز بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔ مسلمان طلبہ گورنمنٹ سکولوں میں داخل ہونے سے بڑے طویل عرصہ تک ہچکچاتے رہے۔ اس کی تین وجوہات تھیں۔ ایک تو انگریزوں کا رویہ مسلمانوں کی طرف ویسا ہی تھا جیسا کہ فاتح کا مفتوح کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے مسلمان قدرتی طور پر ان اداروں میں جانے سے استنکاف محسوس کرتے تھے' جو غالب قوم نے خاص اپنے اغراض و مقاصد کے لیے قائم کئے تھے۔ دوسرے' گورنمنٹ سکولوں میں دینی تعلیم پر مکمل پابندی تھی۔ یہ بات مسلمانوں کے لیے ناقابل فہم تھی۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد تھی کہ دین کے بغیر تعلیم کا کوئی نظام نہ مکمل ہو سکتا تھا نہ قابل قبول۔ چنانچہ انگریزوں کا یہ اقدام مسلمانوں کی نظر میں شکوک و شبہات سے اٹا اٹ بھرا ہوا تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے سیاسی زوال سے شہ پا کر اس زمانے میں عیسائی مشنریوں نے بھی برصغیر پر یورش شروع کر

دی' اور وہ بڑی شدت سے مسیحیت کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ یہ پادری جگہ جگہ مسلمان علماء کو مناظرے کا چیلنج دیتے تھے۔ مناظرے اکثر گورنمنٹ سکولوں کی گراؤنڈ پر منعقد ہوتے تھے۔ مقامی انگریز افسر شامیانوں کا بندوبست بھی کرتے تھے اور ہر ممکن طریقے سے پادریوں کی پشت پناہی کا سامان بھی کرتے تھے۔ اس سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ شبہ اور بھی پختہ ہو گیا کہ گورنمنٹ سکولوں' انگریزوں اور مسیحی پادریوں کے درمیان مسلمانوں کے خلاف ضرور کوئی خفیہ گٹھ جوڑ ہے اور مسلمانوں کا سیاسی زور توڑنے کے بعد اب یہ لوگ سرکاری نظام تعلیم کے پردے میں ان کے دین کے درپے ہو رہے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے دینی تعلیمی ادارے اور حکومت کے سرکاری سکول الگ الگ متوازی خطوط پر چلنے لگے۔ آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ اب تک کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ ۸۱-۱۸۸۰ء میں سارے برصغیر میں انگریزی ہائی سکولوں میں ۳۶۶۸۶ ہندو اور صرف ۳۶۳ مسلمان طلبہ پڑھتے تھے۔ اسی طرح اس سال پورے ہندوستان میں ۳۱۵۵ ہندو اور فقط ۵۷ مسلمان گریجویٹ تھے۔ قدرتی طور پر ملک کے انتظامی اور معاشی نظام میں بھی ہندوؤں کا تناسب اسی لحاظ سے تھا۔

مسلمانوں کی پسماندگی کے اس جمود کو سرسید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ نے بڑے موثر طور پر توڑا۔ ۱۹۲۲ء میں جب آئی سی ایس کے مقابلے کا امتحان لندن اور دہلی میں بیک وقت منعقد ہونے لگا تو اس سروس میں مسلمانوں کی تعداد میں بھی اضافہ شروع ہو گیا۔

۱۹۴۰ء میں جب میں آئی سی ایس میں داخل ہوا تو میرا گروپ ۳۰ افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ۱۹ کا انتخاب لندن میں اور ۱۱ کا دہلی میں ہوا تھا۔ گروپ میں ۱۵ انگریز' ۱۲ ہندو اور ۳ مسلمان تھے۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے لندن میں ٹریننگ کے راستے بند تھے۔ اس لیے ہماری ٹریننگ کا کیمپ دہرہ دون میں کھولا گیا۔

جب میں پہلے روز کیمپ میں حاضر ہوا تو ٹریننگ کے ڈائریکٹر مسٹر پنیل (Pinnell) اپنے روزمرہ کے معمول کے مطابق کیمپ کی صفائی کا معائنہ کرنے گشت پر نکلے ہوئے تھے۔

مجھے بھی انہوں نے اپنے ساتھ لے لیا۔ پروبیشنرز کے خیموں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد جب ہم ملازموں کے بیت الخلاء کے قریب پہنچے تو یکایک مسٹر پنیل کے چہرے پر رونق آ گئی۔ انہوں نے اپنی عینک اتار کر جیب میں رکھ لی' رومال سے اپنی گدلی گدلی آنکھوں کی نمی صاف کی' اور پھر جھک جھک کر بیت الخلاء کے قدمچوں میں ناک ڈال کر زور زور سے یوں سانس لینے لگے جیسے شکاری کتا جھاڑیوں میں چھپے ہوئے زخمی بٹیر کو سونگھ سونگھ کر تلاش کرتا ہے۔ ایک قدمچے پر پہنچ کر مسٹر پنیل رک گئے' اور مجھے بھی اس مقام مشام پر نواز کو سونگھنے کی دعوت دی۔ میں نے یونہی کھڑے کھڑے دو چار لمبے لمبے سانس لیے تو مسٹر پنیل خفا ہو گئے۔ انہوں نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کر میرا سر جھکایا اور میری ناک عین قدمچے کے پاس لا کر مجھے نہایت زور سے سونگھنے کا حکم دیا۔ ابھی گھنٹہ بھر پہلے آٹھ دس پر خور بیروں نے اس قدمچے پر اپنے صحت مند معدوں کو صاف کیا تھا۔ مہتر نے صفائی کے لیے فینائل چھڑک کر اس پر چونا ڈال دیا تھا۔ اس ملغوبے پر ناک لٹکا کے میں نے ایک طویل سانس کھینچا' تو عفونت کے پے در پے بھبھکوں سے میرا دماغ پھٹنے لگا' اور مجھے بے اختیار بڑے زور کے قے آ گئی۔ قے کے چھ چھینٹے مسٹر پنیل کے چمکیلے براؤن جوتوں پر بھی پڑے۔ انہوں نے مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھورا' اپنی ناک کو سکیڑا جو ہد ہد کی چونچ کی طرح لمبی' تیکھی' اور ٹیڑھی تھی اور اپنے ذہن میں مجھے آئی سی ایس کے لیے قطعی غیر ناموزوں کھاتے میں ڈال دیا۔

دہرہ دون ٹریننگ کیمپ کے قیام کے دوران کئی ایسے اور مواقع بھی آئے جنہوں نے مسٹر پنیل کے دماغ میں آئی سی ایس کے لیے میری نااہلیت پر ایک کے بعد دوسری' دوسری کے بعد تیسری مہر تصدیق ثبت کر دی۔

کیمپ میں ہر پروبیشنرز کو اپنا اپنا ذاتی بیرا رکھنے کا حکم تھا۔ میں جموں سے اپنے ساتھ ادھیڑ عمر کا ایک کشمیری ملازم رمضان لیتا آیا تھا۔ کیمپ کے میس میں بیٹھ کر بیروں

کو بلانے کا طریقہ یہ تھا کہ دونوں ہاتھ سے تالی بجاؤ اور بلند آواز سے "کوئی ہے؟" کا نعرہ لگاؤ۔ "کوئی ہے؟" کی سیٹی پر بچارے بیرے لپک کر دم ہلاتے ہوئے حاضر ہو جاتے تھے۔ مجھے یہ رسم بڑی معیوب محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے میں ہمیشہ اپنے بیرے کو "رمضان صاحب" کے نام سے آواز دیتا تھا۔ اور "تم" کی بجائے "آپ" کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ مسٹر پنیل کو میرا یہ انداز بری طرح کھٹکتا تھا۔ میرے دوسرے انگریز اور دیسی ساتھی بھی اس پر کافی ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ ایک رات مسٹر پنیل صاحب نے مجھے اپنے خیمے میں کافی پینے کے لیے مدعو کیا اور کافی کے ساتھ ساتھ مجھے ایک طویل لیکچر بھی اس موضوع پر پلایا کہ اچھا افسر بننے کے لیے لازمی ہے کہ عوام الناس کے ساتھ پورا پورا فاصلہ برقرار رکھا جائے۔ ان کے بھاشن میں بیوروکریسی کے وہ سارے برخود اصول جھلک رہے تھے، جنھوں نے نوکر شاہی کو اندرون شہر سے کاٹ کر سول لائنز کی الگ تھلگ اجنبی دنیا میں آباد کر رکھا تھا۔ میں نے مسٹر پنیل کی کافی تو بڑے شوق سے پی، لیکن ان کی تقریر ایک کان سنی اور دوسرے کان اڑا دی۔

ٹریننگ کے بعد آئی سی ایس پروبیشنرز کے امتحان میں تاریخ، نظم و نسق، قانون اور ہندی زبان کے پرچے تو میں نے بڑی آسانی سے پاس کر لیے۔ لیکن گھوڑ سواری کا امتحان میرے لیے بڑا ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ گھوڑے پر سوار ہونا تو درکنار ساری عمر مجھے کسی نے گھوڑے کو ہاتھ تک نہ لگانے دیا تھا۔ اس کی وجہ ایک واہمہ تھی۔ جب روس میں کیمونسٹ انقلاب برپا ہوا تھا تو سنٹرل ایشیا سے بہت سے مسلمان بالشویکی مظالم سے تنگ آ کر دوسرے ملکوں کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ کئی سال تک یہ مہاجرین گلگت بھی آتے رہے۔ ان میں بخارا کے ایک درویش حضرت نوری کے نام بھی تھے۔ ان کی عمر کوئی سو برس کے لگ بھگ تھی۔ والد صاحب نے انھیں اپنے ہاں ہی رکھ لیا۔ وہ چھ سات برس تک ہمارے ہاں رہے اور وہیں وفات پائی۔ جب میں پیدا ہوا تو وہ ہمارے پاس ہی مقیم تھے۔ میرا نام بھی انہی کا تجویز کردہ تھا۔ میری پیدائش پر انھوں نے فارسی

نظم میں ایک طویل "فالنامہ" لکھا۔ اس میں باقی سب باتیں تو مبہم تھیں، لیکن دو چیزیں صاف صاف درج تھیں۔ ایک یہ کہ اس بچے کو ساری عمر کثرت سے نکسیر پھوٹا کرے گی، لیکن اس میں فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ مجھے اب تک برفانی سردیوں میں بھی بیٹھے بٹھائے بلا وجہ نکسیر آنے لگتی ہے۔ ناک سے کچھ دیر خون بہہ جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جسم سے آگ کی چنگاریاں نکل گئی ہیں۔ دوسری پیشین گوئی نوری صاح نے یہ کی کہ اسے گھوڑے کی سواری سے جان کا خطرہ ہے۔ لکھنے کو تو یہ بات نوری صاحب نے اپنے فالنامہ میں لکھ دی، لیکن مجھے ساری عمر کسی نے گھوڑے کی دم تک کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ اس زمانے میں گلگت سے سری نگر کا سفر عورتیں بھی گھوڑے پر بیٹھ کر طے کیا کرتی تھیں۔ لیکن اس سفر میں بھی مجھے اپاہجوں کی طرح پالکی میں بٹھایا جاتا تھا۔ اب آئی سی ایس کے پروبیشنری امتحان میں رائڈنگ ٹیسٹ پاس کرنا لازمی شرط ٹھہرا تو مجھے بڑی فکر دامن گیر ہوئی۔ مسٹر پنیل کو امید واثق تھی کہ میں اس ٹیسٹ میں ضرور فیل جاؤں گا۔ مجھے خود بھی یہی خطرہ تھا۔ اس لیے امتحان سے کچھ عرصہ پہلے میں کیمپ کے رائڈنگ انسٹرکٹر دفعدار جمال خاں سے ملا اور اسے اپنی بپتا کی رام کہانی صاف صاف جا سنائی۔ وہ جہلم کا ریٹائرڈ فوجی تھا۔ اس نے بڑے اعتماد سے میری پیٹھ ٹھونکی اور کہا۔ "صاب! آپ فکر مت کرو، آپ کا بس اتنا کام ہے کہ گھوڑے پر پیٹھ پر جم کے بیٹھ رہیں۔ باقی سب کام اللہ کے حکم سے میں خود سنبھال لوں گا۔"

دفعدار جمال خاں نے مجھے گھوڑے پر جم کر بیٹھنے کے کچھ ایسے گر سکھائے، کہ گھوڑا تو کبھی ٹھوکر کھا کر گر بھی جاتا تھا لیکن میں اس کی پیٹھ کے ساتھ جونک کی طرح چمٹا رہتا تھا۔ امتحان والے دن دفعدار صاحب نے مجھے ایسا گھوڑا دیا جو سرکس کے جانوروں کی طرح بالکل سدھایا تھا۔ جب امتحان لینے والے کرنل نے پکار کر حکم دیا "ٹراٹ" تو ایڑ یا لگام کے کسی اشارے کے بغیر ہی میرے گھوڑے نے بڑے مزے سے دلکی

چال چلنا شروع کر دی۔ "گیلپ" کی آواز پر میرا گھوڑا خود بخود سرپٹ بھاگنے لگا۔ راستے میں ایستادہ رکاوٹوں کو بھی وہ خود ہی اپنی ہنرمندی سے پھلانگتا گیا۔ آخر میں جب کرنل صاحب نے فگر آف 8 بنانے کا آرڈر دیا تو میرے گھوڑے نے ایسے خوبصورت دائرے کاٹ کر انگریزی 8 کا ہندسہ بنایا کہ ممتحن نے مجھے شاباش دے کر بڑے اچھے نمبروں سے پاس کر دیا۔

پروبیشنری امتحان کے بعد جب مجھے صوبہ بہار میں تعیناتی کا حکم ملا تو مسٹر پنیل نے وہاں کے چیف سیکرٹری کو میرے متعلق جو رپورٹ بھیجی اس میں میری چند خصوصیات کو بڑی فصاحت سے اجاگر کیا گیا تھا۔ خفیف الحرکات' ہائی سوسائٹی کے لیے ناموزوں' رذیلوں میں خوش' آئی سی ایس کی روایات اور وقار کے لیے ناکافی' اہم ذمہ داریوں کے لیے نااہل مجموعی طور پر انڈین سروس کے لیے غلط انتخاب -------- اگر ملازمت کے دو یا تین سال بھی پورے کر لے تو اس کی انتہائی خوش نصیبی اور برٹش انڈین گورنمنٹ کی انتہائی بد نصیبی ہو گی۔

○ ◯ ○

• بھاگلپور اور ہندو مسلم فسادات

پٹنہ سے بھاگلپور کے لیے مجھے ٹرین کے جس کمپارٹمنٹ میں جگہ ملی' اس میں ایک مارواڑی خاندان بھی سوار تھا۔ ایک موٹا سا سیٹھ' اس سے بھی موٹی سیٹھانی اور ان دونوں کی فربہی کا مرکب ایک گول مٹول سا لڑکا' جس کی عمر تو دس گیارہ برس سے زیادہ نہ تھی لیکن جسم کا پھیلاؤ اپنے سن و سال سے کئی گنا نکلا ہوا تھا۔ سامان کے طور پر ان کے ساتھ چھ بڑے بڑے ٹرنک اور بستر تھے۔ پانچ بوریاں اور تین ٹوکریاں جن میں میلے کچیلے کپڑے' جوٹھے برتن' جوتے' ٹوپیاں' چنے' پھل وغیرہ اٹا اٹ بھرے ہوئے تھے۔
اچار کا مرتبان' دو تین ناشتہ دان' انگیٹھی' کوئلے' گڑویاں' تھال' دو بالٹیاں' جن میں اسٹیشن کے نل سے پانی بھر کر کمپارٹمنٹ میں رکھ لیا گیا تھا۔ ڈبے کے ایک کونے میں خشک مٹی کی ڈھیری تھی جسے صابون کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ فرسٹ کلاس کا غسل خانہ ناپاک سمجھا جاتا تھا' اس لیے سیٹھ' سیٹھانی اور ان کے فرزند ارجمند ڈبے ہی میں کلیاں کرتے تھے' مٹی مل مل کر ہاتھ دھوتے تھے' اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد انگیٹھی سلگا کر پوریاں' بھاجیاں اور حلوے گرم کر کے تناول فرماتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں وہ اونگھتے تھے' خراٹے لیتے تھے اور زور زور سے ڈکاریں مارتے تھے۔
چند ہی گھنٹوں میں کمپارٹمنٹ کی فضا میں مچھلی کی دکان ایسا نقشہ جم گیا۔ وہی بو' وہی کثافت' وہی بھنبھناتی ہوئی مکھیاں' وہی غل غپاڑہ۔ کیونکہ سیٹھ صاحب اور سیٹھانی سانس توڑے بغیر اونچی آواز میں لگاتار اپنی گھریلو سیاست پر تبصرہ کرنے کے شوقین تھے۔
اس دوران ان کا فرزند دلپذیر بھی کبھی احتجاجاً کبھی اثباتاً اپنی چیخ و پکار کا اضافہ کرتا رہتا تھا۔ سیٹھانی کو غالباً پرانے دمے کی شکایت تھی۔ کیونکہ جب وہ کھاتی یا بولتی یا ڈکاریں نہ لے رہی ہو تو وہ بڑی شدت سے کھانستی تھی۔ اور کھنکار کھنکار کر گائے کے مکھن

کی طرح زرد بلغم اپنی سیٹ کے نیچے تھوکتی جاتی تھی۔

باہر گرد تھی اور انجن سے بھک بھک نکلتا ہوا دھواں میلوں تک ایک بے کیف اور اداس یکسانیت چھائی ہوئی تھی۔ کھیتوں میں چرتے ہوئے نحیف و نزار مویشی۔ گدلے گدلے جوہڑوں پر کپڑے دھوتی ہوئی' پانی بھرتی ہوئی عورتیں' کہیں کہیں کسی جانور کی لاش پر کتوں اور گدھوں کا ہجوم۔ کسی جگہ قضائے حاجت کے لیے سر جھکائے ریل کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھے ہوئے بے تکلف انسان۔ آبادیوں کے آس پاس دھول میں اٹے ہوئے لڑکے جو گاڑی کو دیکھ کر اس پر تھوکتے تھے' پتھر مارتے تھے' اور اپنی غلیظ دھوتیاں کمر سے اوپر اٹھا کر مسافروں کا منہ چڑاتے تھے۔ اسٹیشنوں پر میلی وردیوں میں ملبوس ٹکٹ چیکر گرسنہ بھیڑیوں کی طرح منڈلاتے پھرتے تھے۔ اور مڑی تڑی ہڈیوں والے اپاہج چھوکرے' اندھی عورتیں اور جذام کے مارے ہوئے بھکاری ان گنت خداؤں کا واسطہ دے دے کر خیرات مانگ رہے تھے۔

اپنے کمپارٹمنٹ کے اندرونی اور بیرونی ماحول سے اکتا کر میں ڈائننگ کار میں جا بیٹھا۔ یہاں پر ایک اور طرح کا ہڑبونگ مچا ہوا تھا۔ ایک کرسی طر بھاگلپور کے بیرسٹر نور الحسن بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ چھوٹے قد کے فربہ اندازم گول مٹول بزرگ تھے۔ انہوں نے ہلکا نیلا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ جس کی پتلون ان کے بھاری بھر کم پیٹ پر یوں تنی ہوئی تھی جیسے کسی مٹکے کے پیندے پر ایک تنگ سا غلاف چڑھایا ہوا ہو۔ ان کی پھولدار بوٹائی گردن کے ڈھیلے ڈھالے گوشت کی جھریوں میں دبی ہوئی تھی۔ اور ان کی تیز سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی کا موٹا سا کالا ریشمی پھندنا گردن کی ہر جنبش کے ساتھ گھڑی کے پنڈولم کی طرح رقص کرتا تھا۔ بیرسٹر صاحب نے اپنی سفید گھنی مونچھوں کو فکسو کے ساتھ تاؤ دے کر سیٹ کیا ہوا تھا اور وہ ان کے دونوں گالوں پر ننگی سنگینوں کی طرح ایستادہ تھیں۔

بیرسٹر صاحب کے سامنے بھاگلپور کی راشٹریہ سوایم سیوک سنگ کے کرتا دھرتا کمار اندر

دیو نرائن سنگھ براجمان تھے۔ چھریرا بدن' نکلتا ہوا قد' بند گلے کا ریاستی وضع کا کوٹ۔ جودھپوری برجس۔ سر پر بانکے انداز میں ترچھی رکھی ہوئی فیلٹ جس میں بیش قیمت ہیروں کا بروچ لگا ہوا تھا۔ منہ میں پائپ' بغل میں بید کی نازک سی چھڑی' ہاتھ میں دو بڑے بڑے غضب ناک اور بھیانک شکاری کتوں کی زنجیریں' جو ان کے دائیں بائیں چوکیداروں کی طرح کھڑے بیرسٹر نور الحسن کی طرف یوں دیکھ رہے تھے گویا چشم زدن میں لپک کر انہیں زخمی مرغابی کی طرح دبوچنے والے ہوں۔

کمار صاحب کے پیچھے ایک کرسی پر ست نرائن پانڈے بیٹھا تھا جو بیک وقت ان کے پرائیویٹ سیکرٹری' مصاحب' قانونی مشیر' باڈی گارڈ اور ہر قسم کی دلالی کے فرائض سر انجام دیا کرتا تھا۔ ست نرائن پانڈے نے سفید براق دھوتی اور باریک تن زیب کا بنگالی کرتہ پہنا ہوا تھا جس میں اس کے کسرتی جسم کے پٹھے بڑی صفائی سے جھلک رہے تھے۔ اس کے سر پر کھدر کی گاندھی ٹوپی تھی جس کے کنارے سے اس کی گھنی چٹیا نکل کر ایک کان کے قریب بچھو کے ڈنک کی طرح بل کھا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بہت سی زنجیروں کا گچھا تھا' جن کے ساتھ انواع و اقسام کے چھوٹے بڑے کتے بندھے ہوئے تھے۔ اور ڈائننگ کار میں آنے جانے والے مسافروں پر مختلف آوازوں میں بھونک رہے تھے۔

کمار اندر دیو نرائن سنگھ بڑے زور و شور سے آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاست پر گرج برس رہے تھے' اور بیرسٹر نور الحسن کی توند میں بار بار انگلیاں چبھو کر انہیں خبردار کر رہے تھے' کہ اگر آپ کے جناح صاحب نے پاکستان کا مطالبہ ترک نہ کیا تو ہندوستان میں مسلمانوں کی زندگی حرام ہو جائے گی۔ بچارے بیرسٹر صاحب مرنجان مرنج قسم کے بزرگ نظر آتے تھے' اور بھیگی بلی بنے بڑے تحمل سے کمار صاحب کی لعن طعن برداشت کر رہے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنی ترکی ٹوپی اتار کر میز پر رکھی تو کمار صاحب کا ایک السیشن کتا زبان نکال کر اس کا پھندنا چاٹنے لگا۔ بیرسٹر صاحب نے جلدی سے ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھ لی تو کتے نے اپنے اگلے پاؤں ان کی توند پر رکھ دیئے اور تھوتھنی

اٹھا کر ان کے سر کی جانب لپکا۔ یہ نظارہ دیکھ کر ست نرائن پانڈے اپنی جگہ سے اٹھا اور قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔ "مولبی جی' جرا سنبھل کے۔ ای کتوا بڑا جالم ہوت۔ تمری ٹوپیا کا پھندنوا ای کو بھڑکاوت جاوت ہووَ۔ اپن تو کھیال ہے کہ جان بچانا چاہت ہو' تو ای ٹوپیا اتار کر باہر پھینک دیو۔ ہاں' جے شری گنیش جی کی۔"

کمار اندر دیو نرائن سنگھ نے کتے کو کھینچ کر پیچھے ہٹایا' اور آنکھ مار کر ست نرائن پانڈے کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر گاندھی کیپ سر سے اتاری اور اپنی چٹیا کو مروڑ مروڑ کر بیرسٹر نور الحسن کی مونچھوں کے مقابلے پر تاؤ دینے لگا۔

جب بھاگلپور کا اسٹیشن آیا تو بیرسٹر نور الحسن ایک گھوڑا گاڑی پر سوار ہوئے۔ کمار اندر نرائن سنگھ کے لیے ان کی ڈراپ ہیڈ بیوک آئی ہوئی تھی۔ اور ست نرائن پانڈے اپنے درجن بھر کتوں کے ساتھ ایک ویگن میں جم کے بیٹھ گئے جو کمار صاحب نے خاص اسی مقصد کے لیے بنوائی تھی۔ اس میں کتوں کے لیے الگ الگ سپرنگ دار نشستیں تھیں' اور ہر سیٹ کے اوپر تازہ ہوا کے لیے جالی سے ڈھنپے ہوئے گول گول سوراخ تھے۔ یہ ویگن کتوں کی سواری کے علاوہ راشٹریہ سوایم سیوک سنگ کے والنٹیئروں کے لیے مہلک ہتھیار سپلائی کرنے کا فرض بھی سر انجام دیتی تھی' اور ہندو مسلم فسادات کے موقع پر مسلمان لڑکیوں کو اغواء کرنے کا کام بھی اسی سے لیا جاتا تھا۔

بھاگلپور کے ریلوے اسٹیشن پر مجھے لینے کے لیے وہاں کے کلکٹر مسٹر ایڈون ٹیری پریڈو (E.T.Prideaux) خود آئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے سیدھے اپنے بنگلے پر لنچ کے لیے لے گئے۔ وہاں پر انہوں نے میرا تعارف ڈی آئی جی' ایس پی اور ڈی ایس پی سے کروایا۔ یہ سب انگریز افسر تھے اور غالباً میرا جائزہ لینے کے لیے کلکٹر کے ہاں جمع ہوئے تھے' کھانے کے بعد میں نے دفتر جا کر اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ کا چارج سنبھالا' اور سول کلب کے ایک کمرے میں رہائش اختیار کر لی۔

اسسٹنٹ کمشنری کا چارج لیتے ہی میں نوکر شاہی کے ایک ایسے خود ساختہ زندان خانے

میں محبوس ہو گیا' جس کی تنہائی جیل میں عادی مجرموں کی کال کوٹھڑی سے بھی زیادہ سنگین تھی۔ بھاگلپور کی آبادی ڈھائی تین لاکھ سے اوپر تھی۔ لیکن ضلعی انتظامیہ کے اوپر والے آٹھ دس افسران اعلیٰ کولہو کے بیل کی طرح صرف اپنے ہی مخصوص دائرے میں چکر کاٹنے پر مجبور تھے۔ سول لائن میں یہ ایک دوسرے کی ہمسائیگی میں رہتے تھے' اور شام کو کلب میں جمع ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ ہی ٹینس' بلیرڈ یا برج کھیلتے تھے' باری باری سے ایک دوسرے کے لیے شراب کا آرڈر دیتے تھے' اور باہم موقع پا کر ایک دوسرے کے خلاف حسب توفیق چغلیاں بھی کھا لیتے تھے۔ وقتاً فوقتاً گھروں میں دعوتوں کا اہتمام ہوتا تھا' تو میزبان اور مہمان بھی یہی آٹھ دس خاندان ہوتے تھے۔ افسران بالا کے اس چھوٹے سے حلقے کا باقیماندہ دنیا کے ساتھ بس اتنا ہی رابطہ اور واسطہ تھا جتنا کہ ایک برہمن کو شودر کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

ضلع بھاگلپور کے اندرونی مضافات میں پندرہ بیس ایسے انگریز خاندان بھی تھے' جو ایک ایک دو دو پشت سے وہاں آباد تھے۔ یہ لوگ اکثر نیل کا کاروبار کرتے تھے یا بڑی بڑی جاگیروں پر فارم بنا کر نفع بخش زمینداری چلاتے تھے۔ ان میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جنھوں نے کبھی خواب میں بھی انگلستان نہ دیکھا تھا' لیکن بات بات پر وہ ہندوستان کے مقابلہ میں ہوم لینڈ کے موسم' ہوم لینڈ کے دودھ' ہوم لینڈ کے مکھن اور ہوم لینڈ کی صفائی و نفاست کا حوالہ ایسی بے ساختگی اور چرب زبانی سے دیتے تھے گویا ابھی ابھی رود بار انگلستان کو عبور کر کے یہاں وارد ہوئے ہوں۔ مہینے میں ایک بار یہ لوگ شاپنگ کے لیے شہر آتے تھے' اور کلب میں بیٹھ کر سرگوشیوں میں کلکٹر اور ڈی آئی جی اور ایس پی کو اپنے اپنے علاقوں کے سیاسی اور سماجی کوائف سے آگاہ کر جاتے تھے۔ کالے افسروں کو وہ اس قسم کی بات چیت کے لیے در خور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔

مقامی باشندوں میں سے صرف دو ہندو بھاگلپور کلب کے ممبر تھے۔ ایک کمار اندر نرائن سنگھ جو راشٹریہ سوایم سیوک سنگ کے صدر ہونے کے علاوہ ضلع کے بہت بڑے جاگیردار

بھی تھے۔ دوسرے مسٹر کمل دھاری لال۔ لال صاحب آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ سلجھے ہوئے وسیع المشرب رئیس تھے۔ یورپین ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے اور مہینے میں ایک دو بار بڑے شاندار ڈنر دیا کرتے تھے۔ ان کی بیوی تو وفات پا چکی تھی' لیکن دو بیٹیاں رینکا اور تارا بڑی سلیقہ شعار اور خوش اخلاق میزبان تھیں۔ دونوں نے بچپن ہی سے لندن کے گرائمر سکولوں میں تعلیم پائی تھی' اور انہیں عام طور پر رانو اور ٹونو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ لال صاحب کے ڈنر دراصل ضلع کی انتظامیہ کے لیے رابطہ عامہ کا واحد ذریعہ تھے۔ جب کبھی بھاگلپور میں امن عامہ کا کوئی سنگین مسئلہ سر اٹھاتا تھا تو مسٹر کمل دھاری لال بڑی موقع شناسی سے متعلقہ فریقین کو اپنے ڈنر پر مدعو کر لیتے تھے' اور رانو اور ٹونو کی خوشگوار میزبانی کے سائے میں باہمی افہام و تفہیم کے کئی مشکل مرحلے طے ہو جاتے تھے۔

بھاگلپور کا کوئی مسلمان کلب کا ممبر نہیں تھا۔

ایک شام مسر پریڈو کلب میں آئے تو مجھے ایک طرف لے گئے اور بڑی راز داری سے کہنے لگے۔ "کمشنر کی منظوری سے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کل سے تمہیں نتھ نگر کا اسپیشل مجسٹریٹ مقرر کیا جائے۔ وہاں پر رائے بہادر سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا ایک سلک فیکٹری تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ تمہارا کام ہے کہ سب رکاوٹیں دور کرو تا کہ کمشنر جلد سے جلد فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھ سکے۔"

ساتھ ہی انہوں نے مجھے مقامی امن و امان مکمل طور پر برقرار رکھنے کی تلقین کی اور اس سلسلے میں کمار اندر دیو نرائن سنگھ اور سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی ہدایت بھی دی۔

نتھ نگر بھاگلپور شہر کے ساتھ ملحق ایک گنجان آباد صنعتی علاقہ تھا۔ یہاں پر مارواڑی سیٹھوں کی کئی سلک اور سوتی کپڑے کی فیکٹریاں تھیں۔ کچھ عرصہ قبل سیٹھ بدری پرشاد

جھنجھنیا نے وار فنڈ میں ایک لاکھ روپیہ چندہ دے کر رائے بہادری کا خطاب حاصل کیا تھا۔ اب وہ کمشنر کے ہاتھوں اپنی نئی سلک فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھوا کر وار فنڈ میں ایک اور گراں قدر عطیہ کا اعلان کرنے والے تھے۔ اس لیے سب کو عجلت تھی کہ یہ کار خیر جتنی جلدی سر انجام پا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ سیٹھ صاحب نے ننتھہ نگر کے کاشت کاروں سے فیکٹری کے لیے زمین خرید تو لی تھی' لیکن بہتی گنگا میں ڈبکی لگانے کے لیے ایک منچلے ہندو نوجوان نے بنے بنائے کام میں کھنڈت ڈال دی۔ اس نے "کسان سہائتا پرسد" کے نام سے ایک انجمن بنا کر اعلان کر دیا کہ کسانوں کو دھوکہ دے کر زمین اونے پونے داموں خرید گئی ہے' اور جب تک ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا' فیکٹری کی تعمیر شروع نہیں ہو سکتی۔ شروع میں اس انجمن میں کچھ سکول کے لونڈے' چندیکہ چلانے والے' دو چار پنواڑی اور کچھ اسٹیشن پر مزدوری کرنے والے قلی شامل تھے۔ دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر وہ کاغذ کی سیاہ جھنڈیاں لیے جلوس کی صورت میں نکلتے تھے اور گلی کوچوں کا چکر لگانے کے بعد اس قطعہ زمین میں میٹنگ منعقد کرتے تھے جس کے گرد سیٹھ صاحب کے انجینئروں نے چونے کی لکیر کھینچ کر فیکٹری کی نشاندہی کی ہوئی تھی۔ دن بہ دن تماش بینوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا' اور رفتہ رفتہ اپنے فرصت کے اوقات میں ہر قسم کے لوگ بڑے شوق سے جوق در جوق ان میٹنگوں میں شامل ہونے لگے۔ سر شام فیکٹری کی زمین والا قطعہ "انقلاب زندہ باد" "مورکھ سیٹھ ناش ہو" "ہندوستان چھوڑ دو" "نیتا جی ..... جے ہند" جیسے انواع و اقسام کے نعروں سے گونجنے لگا۔ نعرے لگانے والوں میں اکثر کو یہ علم نہ تھا' کہ وہ کس غرض سے ان حرکات میں اس قدر زور شور سے حصہ لے رہے ہیں۔ لیکن نعروں کی وبا ہیضے کی طرح پھیلتی گئی اور ننتھہ نگر کے مضافات بڑی سرعت سے اس کی زد میں آنے لگے۔

ننتھہ نگر میں مجھے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ اس لیے دو چار روز میں نے بڑی آزادی سے گھوم پھر کر وہاں کے حالات کا جائزہ لیا۔ روزوں کے دن تھے' میں افطار ایک مسجد میں

کرتا۔ تراویح کے لیے کسی دوسری مسجد میں چلا جاتا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ جھگڑا تو سیٹھ کے ساتھ فیکٹری کی زمین کا تھا لیکن نعرے بالکل سیاسی نوعیت کے لگ رہے تھے۔ اور خوف و ہراس بچارے مسلمانوں میں پھیلا ہوا تھا۔ "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" مسلمانوں کا فیکٹری کی زمین سے کوئی واسطہ تھا نہ کانگریس کے سیاسی نعروں سے کوئی تعلق تھا۔ پھر بھی ان کے اذہان خوف اور خطرے کے ایک آہنی شکنجے میں بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ دن بھر ان کے چہروں پر ہوائیاں سی اڑتی تھیں۔ اور سر شام وہ اپنے چھوٹے چھوٹے تاریک گھروں کے کواڑ بند کر کے نتھہ نگر کے گلی کوچوں سے بالکل غائب ہو جاتے تھے۔ رات کی تاریکی میں ایک دو چھکڑ بھی آتے تھے۔ کچھ مسلمان خاندان ان میں اپنا سامان لاد کر اور سہمی ہوئی عورتوں اور ہراساں بچوں کو سوار کر کے انہیں اندھیرے ہی اندھیرے میں بڑی خاموشی سے رخصت کر دیتے تھے۔ نتھہ نگر سے، مسلمانوں کا یہ پر اسرار انخلاء دیکھ کر میں نے وہاں کے پولیس انسپکٹر بشیشر ناتھ تیواری سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بگلا بھگت بن کر اپنی پھیلی ہوئی توند پر ہاتھ پھیرا، اور میری آنکھوں میں خاک جھونکنے کی بڑی بھونڈی سی کوشش کی۔

"حضور" بشیشر ناتھ تیواری نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ "مسلمان لوگ آج کل روزہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد عید ہوتی ہے۔ یہ لوگ تہوار منانے کے لیے اپنے بال بچوں کے ساتھ رشتہ داروں کے ہاں جایا کرتے ہیں۔"

نتھہ نگر کے مسلمان بڑی مفلوک الحال اور غریب لوگ تھے، میں نے پولیس انسپکٹر سے دریافت کیا کہ ایسے مفلس انسان اپنے بال بچوں کے ساتھ چھکڑوں پر سامان لاد کر فقط عید منانے کی غرض سے اس قدر کثیر تعداد میں کہاں جا سکتے ہیں؟"

"حضور! یہاں کا ایسا ہی دستور ہے۔" انسپکٹر نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا اور نتھہ نگر کے مسلمانوں کے ساتھ اپنے جملہ فرائض منصبی سے کلیتہً بری الذمہ ہو گیا۔

پولیس انسپکٹر سے مایوس ہو کر میں نے براہ راست مسلمانوں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ بیسیوں گھروں میں جا جا کر دریافت کیا، کہ وہ لوگ اس قدر پریشان کیوں ہیں

اور اپنے اہل و عیال اور مال و اسباب کے ساتھ نتھہ نگر کیوں چھوڑ رہے ہیں؟ مسجدوں میں بہت سے نمازیوں سے کرید کرید کر سوال کئے۔ لیکن سب کا بس یہی ایک جواب

تھا' کہ بابو خطرہ ہے؟ کیا خطرہ ہے؟ کس سے خطرہ ہے؟ اس بات کی وضاحت کرنے پر کوئی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ ایک مسجد کے پیش امام نے مجھے صرف اتنا بتایا' کہ کوئی مسلمان کسی سرکاری افسر کے سامنے منہ کھولنے کی ہمت نہ کرے گا' کیونکہ انہیں یہ خوف بھی ہے کہ اگر انہوں نے سچ مچ کھری کھری بات بیان کر دی تو مقامی پولیس انہیں فوراً شر انگیز افواہیں پھیلانے کے الزام میں دھر لے گی۔

نتھہ نگر کے مسلمانوں کو اس قدر لب بستہ پا کر ایک رات میں بھاگلپور کے بیرسٹر نور الحسن کے ہاں چلا گیا' اور ان سے درخواست کی کہ اس معمہ کی عقدہ کشائی میں وہ میری رہنمائی فرمائیں۔ پہلے تو وہ بڑی دیر تک ٹال مٹول کرتے رہے لیکن میرے مسلسل اصرار پر انہوں نے مجھ سے حلف لیا کہ اگر نتھہ نگر میں کبھی کوئی انکوائری ہوئی تو میں ہرگز ہرگز کسی کو یہ نہ بتاؤں گا کہ مجھے کوئی معلومات بیرسٹر نور الحسن سے بھی حاصل ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی خوشی سے حلف اٹھا کر انہیں یقین دلایا کہ کسی جگہ کسی صورت میں ان کا نام کبھی نہ آئے گا۔

میری یقین دہانی سے مطمئن ہو کر بیرسٹر صاحب نے اپنی انگریز بیوی کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں اور دروازے بند کئے اور میرے کان کے پاس منہ لا کر ہلکی ہلکی سرگوشیوں میں بتایا کہ پچھلے پندرہ برس سے یہ رواج چل نکلا ہے کہ نتھہ نگر میں جب کوئی نئی فیکٹری تعمیر ہونے لگتی ہے تو اس وقت وہاں پر ایک آدھ ہندو مسلم فساد ضرور ہوتا ہے۔ سیٹھ صاحبان ہندو کاشت کاروں سے فیکٹری کے لیے زمین کا سودا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ قیمتیں بڑھانے کے لیے کسانوں سے ایجی ٹیشن شروع کرا دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ ایجی ٹیشن سیاسی رنگ پکڑ لیتی ہے۔ اس مرحلے پر بھاگلپور کی راشٹریہ سوایم سیوک سنگ کا صدر کمار اندر دیو نرائن سنگھ سیٹھوں سے منہ مانگی رقم

وصول کرتا ہے اور اس کا سیکرٹری ست نرائن پانڈے اپنے مسلح غنڈے مسلمانوں پر چھوڑ کر ہندو مسلم فساد کروا دیتا ہے۔ کچھ مسلمان مارے جاتے ہیں۔ چند مسلمان لڑکیاں اغوا

ہو جاتی ہیں۔ ہندو کسان اپنی ایجی ٹیشن کو بھول کر بڑی دلجمعی سے مسلمانوں کی لوٹ مار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ رات بھر کی لوٹ کھسوٹ کے بعد علاقے پر کرفیو نافذ ہو جاتا ہے۔ کرفیو کی آڑ میں کمشنر یا کلکٹر فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھ دیتا ہے۔ سیٹھ صاحبان گورنمنٹ کے کسی فنڈ میں خاطر خواہ عطیہ کا اعلان فرماتے ہیں اور اس طرح نتھہ نگر میں بڑی خوش اسلوبی سے ایک نئی فیکٹری کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

"کیا اس بار بھی سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا نے کمار اندر دیو نرائن سنگھ کے ساتھ کوئی ساز باز کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

بیرسٹر نور الحسن نے اپنے بند ڈرائنگ روم میں گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا' اور پھر اپنے ہونٹوں کو عین میرے کان کے ساتھ ملا کر آہستہ سے بولے۔ "سننے میں آیا ہے کہ اس بار پچاس ہزار روپے پر سودا طے ہوا ہے۔"

اگلا سارا دن میں نے بھاگلپور کلکٹریٹ کے ریکارڈ روم میں صرف کیا۔ پچھلے دس برس کے دوران نتھہ نگر میں جتنی نئی فیکٹریاں لگی تھیں' ان سب کی فائلیں نکال کر پڑھیں۔ واقعی بیرسٹر نور الحسن کی بات حرف بہ حرف صحیح تھی۔ ہر فیکٹری کی بنیاد ہندو مسلم فساد پر کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ ان فسادات کے سلسلے میں نہ کہیں کمار اندر دیو نرائن سنگھ کا نام آتا تھا' نہ ست نرائن پانڈے کا۔ بلکہ پولیس اور مجسٹریٹوں کی تحقیقاتی رپورٹوں میں بالالتزام مسلمانوں ہی کو مورد الزام ٹھہرایا گیا تھا۔

نتھہ نگر میں کچھ مزید تحقیقات کے بعد ایک روز میں نے رائے بہادر سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ رائے بہادر بادامی سلک کی شیروانی اور سفید براق دھوتی میں ملبوس' زری دار پگڑی پہنے اور ماتھے پر ڈیڑھ دو انچ لانبا پان کے پتے کی شکل کا تلک لگائے خراماں خراماں تشریف لائے اور کرسی پر بیٹھتے ہی انہوں نے سرکار والا مدار

کے ساتھ اپنی خاندانی وفاداری پر ایک طویل تقریر جھاڑ دی۔

میں نے حکومت کے ساتھ ان کی خیر سگالیوں اور وفا شعاریوں کی جی بھر کر تعریف کی' اور ساتھ ہی کہا۔ "سیٹھ صاحب' آپ اپنے وقت کے حاتم طائی بھی تو ہیں۔ کار ہائے خیر میں آپ کے فیاضانہ چندوں کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔"

میری اس بات پر سیٹھ معاً محتاط ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کے دل میں یہ خطرہ ابھرا کہ اس تمہید کے بعد غالباً میں ان سے کسی فنڈ کے لیے چندہ مانگنے والا ہوں۔ اس لیے حفظ ما تقدم کے طور پر پر وہ بولے۔ "ارے جناب کہاں کے حاتم طائی۔ دن رات کولہو میں جت کر ٹکڑا کماتے ہیں۔ جب کبھی پرماتما کی دیا ہوتی ہے تو حضور لوگ کی سیوا بھی کر لیتے ہیں۔ آج کل ہاتھ بڑا تنگ ہے۔ اس فیکٹری کے جھنجھٹ نے سارا کاروبار ٹھپ کر دیا۔"

"سیٹھ جی' آپ کا ہاتھ کب تنگ ہوتا ہے۔" موقع پا کر میں نے ترپ کا پتا پھینکا۔ "ابھی تو آپ نے کمار اندر دیو نرائن سنگھ کو پچاس ہزار روپے کا دان دیا ہے۔"

یہ سنتے ہی سیٹھ صاحب کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ان کے ہونٹ خشک ہو کر یوں پھڑپھڑانے لگے' جیسے چڑیا کا بچہ انڈے سے نکل کر زمین پر گر پڑتا ہے' اور بڑی بے بسی سے سسک سسک کر سانس لینے کے لیے چونچ کھولتا ہے۔

"آپ پریشان کیوں ہو گئے' سیٹھ صاحب؟" میں نے اپنے لہجے میں ذو معنی طنز بھر کر کہا۔ "کمار اندر دیو نرائن سنگھ بڑے نیک آدمی ہیں۔ وہ آپ کا روپیہ بڑی ایمانداری سے اسی کار خیر میں لگائیں گے جس کے لیے آپ نے دان دیا ہے۔"

رائے بہادر سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا کے منہ میں مصنوعی دانتوں کا جبڑا کسی قدر ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اپنے پوپلے منہ سے اسے سنبھالتے ہوئے انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی' تو میں نے بڑی بے رخی سے انہیں روک دیا۔

"رائے بہادر' اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔" میں نے رکھائی سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

رائے بہادر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے گھورا۔ وہ طوعاً و کرہاً کرسی کے بازوؤں کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے' تو ان کی پتلی پتلی ٹانگوں پر دھوتی کے پلے ادھ موئی مرغی کے پروں کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان کی زری دار پگڑی بھی بے ترتیبی سے ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی' اور مصنوعی دانتوں کا جبڑا ہل جانے کی وجہ سے الائچی اور باداموں کا لعاب جنہیں وہ عرصہ سے چبا رہے تھے منہ کے ایک کونے سے پان کی پیک کی طرح بے اختیار بہنے لگا تھا۔

رائے بہادر نے جوں توں کر کے الائچی اور باداموں کے لعاب کا ایک لمبا سا گھونٹ نگلا' اور بڑی لجاجت سے بولے۔ "حضور' میں آپ کا داس ہوں۔ آپ نے جس سیوا کے لیے مجھے بلایا تھا' اس کا حکم دیں' میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

میں نے تلخی سے کہا۔ "رائے بہادر' کمار اندر دیو نرائن سنگھ کو پچاس ہزار کا دان دے کر آپ نے جو سیوا کرنی تھی' وہ تو کر ہی چکے ہیں۔ اب آپ گھر جا کر شانتی سے سکھ کی نیند سوئیں۔"

میری اصلی بات سنی ان سنی کر کے سیٹھ صاحب جاتے جاتے دروازے میں رکے' اور پکار کر ایک بار پھر اپنی وہی پرانی رٹ لگائی۔ "حضور' میں آپ کا داس ہوں' آپ جس سیوا کا حکم دیں گے' میں اس کے لیے حاضر ہوں۔"

اگلے روز میں نے کمار اندر دیو نرائن سنگھ کو اپنے دفتر میں بلایا۔ انہوں نے آنے سے انکار کر دیا۔ اور کہلوا بھیجا کہ شام کو وہ کلب میں آ ہی رہے ہیں۔ جو بات کرنی ہو وہیں کر لی جائے۔

شام کے وقت کمار اندر دیو نرائن سنگھ کلب تشریف لائے۔ ایک ہاتھ میں وہسکی کا گلاس اٹھائے وہ بڑے طمطراق سے میری طرف لپکے اور لہک لہک کر بولے۔ "جناب اسسٹنٹ کمشنر بہادر' آداب عرض ہے۔ آج کل بڑی بڑی طلبیاں ہو رہی ہیں۔ لیجیے بندہ حاضر ہے۔ فرمائیے کیا حکم ہے؟"

پہلے تو میں نے ان کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ لیکن جب دوسری بار انہوں نے اسی طرح بلند آہنگی سے اپنی موجودگی کا اعلان کیا' تو میں نے خشک سا جواب دیا۔ "مسٹر سنگھ' میں دفتر کی باتیں دفتر ہی میں کیا کرتا ہوں۔ کلب میں سرکاری باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔"

کمار اندر دیو نرائن سنگھ نے غٹ غٹ کر کے وہسکی کا گلاس ختم کیا اور گردن جھٹک کر غصے سے بولے۔ "باپ رے باپ' یہ ٹھاٹھ ہیں جناب کے! ارے' شکر وار شکر وار آٹھ دن تو آپ کی سروس ہے' ابھی سے دماغ آسمان پر چڑھا ہوا ہے۔"

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کمار صاحب تیز تیز قدم اٹھاتے بار میں گے اور وہسکی کا ایک تازہ گلاس بھروا کے لائے۔ میرے سامنے کھڑے کھڑے انہوں نے دو تین سانس میں گلاس خالی کیا اور گرج کر بولے۔ "اسسٹنٹ کمشنر بہادر کلب میں بات کرنے کے عادی نہیں۔ کمار اندر دیو نرائن سنگھ کو دفتروں میں حاضری بھرنے کی عادت نہیں۔ اب بات بنے تو کیسے بنے؟"

"مسٹر سنگھ؟" میں نے جواب دیا۔ "آپ کل صبح دس بجے میرے دفتر میں تشریف لا سکتے ہیں۔"

کمار صاحب نے تحقیر و استہزا سے بھرپور بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور چھاتی پھلا کر بولے۔ "آپ کا یہ خاکسار کمشنر اور کلکٹر سے نیچے کسی ٹٹ پونجیے دفتر میں نہیں جایا کرتا۔ یہ بات اب تک آپ کو معلوم ہو جانی چاہیے تھی۔"

کمار صاحب کو نظر انداز کر کے میں اٹھا' اور بلیرڈ کھیلنے کے لیے دوسرے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ کمار صاحب پیچ و تاب کھاتے چند قدم میرے ساتھ چلے۔ پھر رک گئے اور پکار کر بولے۔ "مجھے غلطی سے سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا نہ سمجھ بیٹھنا۔ ہاں' میرا نام کمار اندر دیو نرائن سنگھ ہے۔ ہاں"

جس طرح کچھ مسلمان چپکے چپکے نتھہ نگر سے ہجرت کر رہے تھے' اسی خاموشی سے کچھ اور لوگ نتھہ نگر میں داخل بھی ہو رہے تھے۔ ان میں اکثریت کسرتی جسموں والے

غیر مسلم لاٹھیالوں کی تھی' جو ہر روز بردوان' در بھنگہ اور مونگھیر کی طرف سے آ کر نتھیہ نگر میں خون کے کینسر کی طرح سرایت کر رہے تھے۔ پولیس انسپکٹر بشیشر ناتھ تیواری نے تو مجھے یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ یہ لوگ نتھیہ نگر کی فیکٹریوں میں کام کرنے والے چوکیداروں کے عزیز و اقارب ہیں جو ان سے ملنے ہر سال آتے جاتے رہتے ہیں' لیکن یہ سراسر جھوٹ تھا۔ اگر یہاں پر ان کے کوئی رشتہ دار ہوتے' تو یہ کچھ نہ کچھ وقت تو ان کے ساتھ ضرور گزارتے۔ اس کے برعکس یہ لوگ سمار لاٹھیاں' برچھے' بھالے اور گینتیاں اٹھائے سارا دن گلیوں اور بازاروں میں مٹر گشت کرتے تھے' اور سر شام چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر کھلی جگہوں میں منڈلیاں جماتے تھے۔ بھنگ گھونٹتے تھے۔ چرس اور گانجا پیتے تھے۔ ڈھولکیاں بجا بجا کر پوربی زبان کے فحش گیت گاتے تھے۔ نشے میں دھت ہو کر اچھلتے' کودتے تھے' ناچتے تھے اور ساری ساری رات اسی طرح دھما چوکڑی مچاتے رہتے تھے۔

ایک روز میں چند پولیس کانسٹیبل کے ساتھ بائیکل پر شہر کا گشت کر رہا تھا تو دور سے دیکھا کہ ایک گلی میں ست نرائن پانڈے دھوتی پہنے جھپٹا چلا جا رہا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے چار پانچ لاٹھیال تھ اور دو چوکیدار بندوقیں کندھے پر رکھے تیز تیز چل رہے تھے۔ میں نے بندوق والوں کو للکار کر روکا' اور ان سے ان کا لائسنس مانگا۔ یہ ان کی اپنی بندوقیں تھیں اور نہ ہی ان کے پاس کوئی لائسنس تھا۔ میں نے بندوقیں ضبط کر لیں اور دونوں آدمیوں کو بغیر لائسنس کے اسلحہ رکھنے کے الزام میں پکڑ کر ایک سپاہی کے ساتھ تھانے بھجوا دیا۔

ساری رات تھانے میں بیٹھ کر میں نے نتھیہ نگر کے تمام لائسنسداروں کی فہرست تیار کی جنہیں بندوق یا رائفل یا ریوالور رکھنے کی اجازت تھی۔ تمیں ہندوؤں کے پاس پچاس بندوقوں اور آٹھ پستولوں کے لائسنس تھے۔ صرف دو مسلمانوں کے پاس ایک ایک بندوق تھی۔ دونوں کے دونوں ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے۔

میں نے پولیس انسپکٹر بشیشر ناتھ تیواری کو ساتھ لیا اور راتوں رات ایک ایک لائسنس

ہولڈر کے گھر جا کر ان کے اسلحہ کا معائنہ کیا۔ ہندو لائسنسداروں کی سات بندوقیں اور دو ریوالور غائب تھے۔ ان میں وہ دو بندوقیں بھی شامل تھیں جنہیں آج ہی میں نے ست نرائن پانڈے کے جلو میں جانے والے دو غیر مجاز مشٹنڈوں کے قبضہ سے چھین کر ضبط کیا تھا۔ لاپتہ اسلحہ کے متعلق ان کے مالکوں کے پاس بس ایک ہی بندھا بندھایا پامال اور فرسودہ جواب تھا کہ صفائی یا مرمت کے لیے بھیجا ہوا ہے۔ کب بھیجا ہے؟ کس کے پاس بھیجا ہے؟ کس کے ہاتھ بھیجا ہے؟ کوئی رسید ہے؟ -------- ان سوالوں کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

لائسنسداروں کی اکثریت بڑے بڑے سیٹھوں پر مشتمل تھی۔ ان کے اسلحہ کی جانچ پڑتال کے سلسلے میں مجھے ان کی وسیع و عریض حویلیوں کے کچھ اندرونی حصے دیکھنے کا موقع بھی میسر آیا۔ ایک چیز جو ان سب میں مشترک تھی وہ پوجا پاٹھ کا کمرہ تھا۔ سنگ مرمر کے اس کمرے میں مختلف دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کے ساتھ کئی گھروں میں گاندھی جی کا بت بھی نصب تھا۔ ایک جگہ یہ بت سونے میں ڈھلا ہوا تھا۔ اس کے پاس کئی چراغ جل رہے تھے۔ اور سامنے پھولوں سے لدی ہوئی چنگیر پڑی تھی جیسے ابھی ابھی کسی نے آرتی اتاری ہو۔

ایک شاندار حویلی میں جب ہم پہنچے تو رات کے دو ڈھائی بجے تھے۔ ایسے ناوقت پولیس انسپکٹر کے ساتھ مجھے آتا دیکھ کر گھر کے ملازم گھبرا گئے۔ بوکھلاہٹ ہی بوکھلاہٹ میں وہ ہمیں دالان در دالان گھما کر حویلی کے اندر ایک عجیب کمرے میں لے گئے۔ یہ ایک لمبا سا ہال نما کمرہ تھا جس میں کسی قسم کا کوئی فرنیچر نہ تھا۔ زمین پر چاندی کا فرش تھا' اور طاقچے میں ایک مدھم اور میلی سی لالٹین جل رہی تھی۔ کمرے کے ایک سرے پر ایک بے حد موٹا سیٹھ گاؤ تکیے کے سہارے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ بیس بائیس فٹ کے فاصلے پر کمرے کے دوسرے کنارے ایک اسی قدر موٹی سیٹھانی بالکل اسی طرح آسن جمائے بیٹھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف منہ کئے "صم بکم" یوں

بیٹھے تھے جیسے گیان دھیان میں مگن ہوں۔ دونوں کے عین سامنے چھت سے لوہے کی دو موٹی موٹی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ زنجیروں کے جو سرے سیٹھ اور سیٹھانی کے چہروں کے قریب آویزاں تھے' ان میں پیتل کے چمکدار گول گول ہینڈل لگے ہوئے تھے۔ یہ سارا سماں مجھے بڑا الف لیلوی سا نظر آیا۔ شاید کہ یہ زنجیریں سیٹھ کے پوشیدہ خزانوں کی کنجیاں ہوں اور میاں بیوی اسی طرح اکڑوں بیٹھ کر ساری رات ان کی حفاظت کرتے ہوں۔ یا شاید یہ زنجیریں کھینچنے سے کمرے کے فرش میں پر اسرار سرنگیں کھل جاتی ہوں جو پولیس انسپکٹر کے ساتھ مجھے نگل کر ایسے تہہ خانوں میں پہنچا دیں گی جہاں سے ساری عمر کسی کو ہمارا نشان تک بھی نہ مل سکے گا۔ میرا ذہن کچھ ایسے ہی افسانوی خیالات کے تانے بانے بن رہا تھا' کہ اچانک سیٹھ نے اپنے سامنے والی زنجیر کے ہینڈل کو دونوں ہاتھوں سے دبوچا اور اسے زور سے کھینچ کر ہاتھی کی طرح جھولنے لگا۔ کچھ دیر کی تگ و دو کے بعد جب وہ لشتم پشتم ہانپتا کانپتا اپنی دو ٹانگوں پر ایستادہ ہو گیا تو یہ عقدہ کھلا کہ یہ پر اسرار زنجیریں اور اصل سیٹھ اور سیٹھانی کے موٹاپے کا سہارا ہیں۔ وہ انہی کے ساتھ لٹک جھٹک کر بیٹھتے ہیں اور انہی کے ساتھ جھول جھال کر اٹھتے ہیں۔

اس سیٹھ کے پاس تین بندوقیں اور ایک ریوالور کا لائسنس تھا۔ تین میں سے دو بندوقیں غائب تھیں۔ نمبروں کا جائزہ لینے سے منکشف ہوا کہ یہی وہ دو بندوقیں تھیں جو ست نرائن پانڈے کے دو ساتھیوں سے ہم نے اسی روز اپنے قبضہ میں لی تھیں۔

میں نے ذرا سخت لہجے میں سیٹھ صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے اپنی دو بندوقیں غیر قانونی طور پر ست نرائن پانڈے کو کس مقصد کے لیے دی ہیں؟ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے سیٹھ صاحب گندم کے بورے کی طرح ٹیڑھے ہو کر لڑھکے اور تھپ سے زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ اب اس نے منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بلا کی چپ سادھ لی اور میرے پے در پے سوالوں کے جواب میں گم سم بیٹھا فقط اپنی گول گول آنکھیں گھماتا رہا۔ میں نے پولیس انسپکٹر کو حکم دیا کہ وہ سیٹھ کے خلاف آرمز ایکٹ

کی مناسب دفعہ کے تحت فوراً باضابطہ رپورٹ درج کرے۔ یہ سنتے ہی سیٹھ کی بیوی نے واویلا مچا دیا۔ اور اپنی زنجیر کے ساتھ جھول جھول کر کھڑا ہونے کی سر توڑ کوشش

میں لگ گئی۔

اس ساری کدو کاوش کے بعد میرے پاس اب ننتھہ نگر کی اصلی صورت حال کے متعلق کافی قرائینی شہادت جمع ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں نے بڑی محنت سے کلکٹر کے لیے ایک مفصل! اور مدلل رپورٹ لکھی کہ ننتھہ نگر میں عنقریب ہندو مسلم فساد کا شدید خطرہ ہے۔ فساد کا منصوبہ ایک منظم سازش کا نتیجہ نظر آتا ہے' جس کا سرغنہ کمار اندر دیو نرائن سنگھ کا سیکرٹری ست نرائن پانڈے ہے۔ اس مقصد کے لیے سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا نے غالباً کمار اندر دیو سنگھ کو کچھ مالی امداد بھی ہے۔ بظاہر اس فساد کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ ہندو کسانوں کی حالیہ ایجی ٹیشن کا رخ سیٹھ جھنجھنیا کی سلک فیکٹری سے موڑ کر مسلمانوں کی لوٹ مار کی طرف پھیر دیا جائے۔ ننتھہ نگر کے مسلمان بڑی بے بسی سے یہ نوشتہ دیوار پڑھ رہے ہیں۔ ان کی اکثریت بے حد خوفزدہ ہے۔ کچھ مسلمانوں نے ان خطرات کے پیش نظر اپنی مستورات اور بچوں کے دوسرے محفوظ مقامات پر بھیج دیا ہے۔ ننتھہ نگر میں بغیر کسی ظاہری وجہ کے اچانک بہت سے خطرناک قسم کے غنڈوں کا جھمگٹا نمودار ہو گیا ہے۔ ان کی کچھ ٹولیوں نے نشے میں دھت ہو کر نماز تراویح کے دوران چند مسجدوں کے قریب ڈھول بجانے اور غل غپاڑہ مچانے کا وطیرہ بھی اختیار کر رکھا ہے۔ ننتھہ نگر کے ہندو لائسنس ہولڈروں کی سات بندوقیں اور دو ریوالور ان کی تحویل سے غائب ہیں۔ ان میں سے دو بندوقیں ایسے مشکوک کرداروں سے برآمد ہوئیں جو ست نرائن پانڈے کی قیادت میں تیز تیز قدم کہیں جا رہے تھے۔ اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ کہیں باقی کا لاپتہ اسلحہ بھی ست نرائن پانڈے کے ذریعہ شرپسند عناصر میں تقسیم نہ ہو گیا ہو۔ مقامی پولیس انسپکٹر اور اس کا عملہ ننتھہ نگر کی اس صورت حال سے حیرت انگیز حد تک لا تعلق اور غیر متاثر ہے۔ اس کی وجہ ان کی نااہلی اور بے

حسی نہیں ہو سکتی' کیونکہ یہ سب بڑے ہوشیار اور مستعد کارکن ہیں۔ لیکن فی الحال یہ الزام لگانا بھی مشکل ہے' کہ سازشی عناصر کے ساتھ ان کی کسی قسم کی سانٹھ گانٹھ ہے۔ ان سب کوائف کے مد نظر میں نے کلکٹر کی خدمت میں استدعا کی کہ مندرجہ ذیل اقدامات کو فوری طور پر بروئے کار لایا جائے۔

۱۔ نتھہ نگر میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دیا جائے۔

۲۔ نتھہ نگر کے تمام لائسنس ہولڈروں کا اسلحہ فوراً تھانے میں جمع کروا لیا جائے۔

۳۔ کچھ عرصہ کے لیے کمار اندر دیو نرائن اور ست نرائن پانڈے کا نتھہ نگر میں داخلہ ممنوع قرار دیا جائے۔

۴۔ در بھنگہ' بردوان اور مونگھیر کی طرف سے آئے ہوئے لاٹھیالوں کے جتھوں کو منتشر کر کے نتھہ نگر سے باہر بھیج دیا جائے۔

۵۔ مقامی پولیس کی امداد کے لیے ماؤنٹڈ ملٹری پولیس کا ایک دستہ فوری طور پر نتھ نگر کے تھانے میں تعینات کیا جائے۔

میرا گمان تھا کہ میری رپورٹ پاتے ہی کلکٹر میری معاملہ فہمی اور نبض شناسی کی داد دے گا اور میری سفارشات کو بغیر کنج و کاؤ قبول کر کے ان پر فوراً عملدرآمد شروع کر دے گا۔ لیکن سارا دن گزر گیا اور کسی کے کان پر جوں تک رینگنے کے آثار نمودار نہ ہوئے۔ شام گئے ایک چپڑاسی میرے پاس آیا اور پیغام دیا کہ کمشنر صاحب اپنے بنگلے پر سلام بولتے ہیں۔

بیوروکریسی میں بڑے افسروں نے اپنے کسی ماتحت کو اپنے پاس طلب کرنا ہو تو چپڑاسیوں کے ہاتھ سلام ہی بھجوایا جاتا ہے۔

میں وعلیکم سلام کرنے کمشنر کے ہاں پہنچا تو وہاں پر کلکٹر' ڈی آئی جی اور ایس پی بھی موجود تھے۔ چاروں کے منہ کسی قدر پھولے سے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی کمشنر نے میری رپورٹ کے کاغذ زور سے میز پر پٹخے اور غصے سے کہا۔

"ہم نے تمہارے سپرد ایک نہایت معمولی اور چھوٹی سی انکوائری کی تھی۔ لیکن نہ جانے

تم کس نوعیت کے قریب خیال میں مبتلا ہو کہ اس رپورٹ میں خواہ مخواہ رائی پربت بنا لائے ہو۔"

ڈی آئی جی نے زیادہ صاف گوئی سے کام لیا اور کہا کہ یہ رپورٹ مریضانہ ذہن کی پیداوار ہے۔ جس شخص کے اپنے ذہن میں فرقہ وارانہ تعصب سمایا ہوا ہو اسے ہر جگہ کے مسلمان ہر وقت خطرات ہی خطرات میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ایس پی نے فرمایا کہ ننتھہ نگر کی پولیس پر بے اعتمادی کا اظہار کر کے میں نے اس کی توہین کی ہے جس پر مجھے اس سے معافی مانگنی چاہیے۔

کلکٹر مسٹر پریڈو البتہ خاموش بیٹھے رہے۔

"سر" میں نے کمشنر کو مخاطب کر کے کہا۔ "ننتھہ نگر کی جو حقیقی صورت حال ہے۔ اس کا نقشہ میں نے بے کم و کاست آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب اس پر سنجیدگی سے غور کرنا آپ کا کام ہے۔"

اس بات پر کمشنر غصے میں آ کر آپے سے باہر ہو گیا اور گرج کر بولا۔ "کیا تمہارا مطلب ہے کہ ہم صرف مسخروں کا جھنڈ ہیں اور تمہاری بعید از کار رپورٹ کے رطب و یاس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے؟"

کمشنر نے میری رپورٹ میری طرف پھینکی اور کہا۔ "یہ نادر دستاویز تمہاری اپنی تحویل ہی میں رہے تو اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے فائل میں لگا کر تمہیں سارے دفتر کا نشانہ تضحیک بننے دیا جائے۔"

اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے ننتھہ نگر کے چارج سے سبکدوش کر دیا۔

اس میٹنگ سے فارغ ہو کر جب میں اٹھنے لگا' تو کمشنر نے پکار کر کہا۔ "اور ہاں' کمار اندر دیو نرائن سنگھ کے ساتھ خواہ مخواہ الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ رائے بہادر بدری پرشاد جھنجھنیا کو ہراساں کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ ان دونوں کے ساتھ نارمل تعلقات استوار رکھنا ہی مناسب ہو گا۔"

میں نے اپنی رپورٹ چپکے سے جیب میں ڈالی اور پٹے پٹائے کتے کی طرح دم دبا کر کمشنر

کی کوٹھی سے باہر چلا آیا۔ کلب تک پہنچتے پہنچتے میرے وجود میں خود اعتمادی کے سارے انڈے ٹوٹ پھوٹ کر چکنا چور ہو گئے۔ خاص طور پر کمشنر اور کلکٹر بڑے پڑھے لکھے' عالم فاضل' جہاندیدہ' تجربہ کار اور منصف مزاج افسر تھے۔ ان کے رد عمل کے پیش نظر مجھے رہ رہ کر اپنے مشاہدے کی کوتاہی' اپنے فہم کی کجی اور نظم و نسق کے معاملے میں اپنی شدید نااہلی پر شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ اندر ہی اندر ندامت اور خجالت کے پے در پے ریلوں نے مجھے کچھ ایسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا کہ دو ایک روز میں کلب میں کسی سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت تک نہ کر سکا۔

بھاگلپور کلب ایک نہایت وسیع و عریض کھلے میدان میں واقع تھا۔ طلوع آفتاب سے قبل ہی اس میں انواع و اقسام کی رونق لگ جاتی تھی۔ ایک حصے میں شہر کے نوجوان جسمانی ورزشوں کے کرتب دکھاتے تھے۔ دوسری طرف بھاری بھر کم لالے اور لالیاں وزن گھٹانے اور بھوک بڑھانے کا جتن کرتے تھے۔ ایک کہنہ سال پیپل کے کھوکھلے تنے میں شوجی مہاراج کی مورتی نصب تھی۔ عقیدت مند صبح سویرے اس پر سیندور' مکھن' پھول اور حلوہ پوری کے چڑھاوے بڑی فراوانی سے چڑھایا کرتے تھے۔ ایک جٹا دھاری مہنت بڑی پابندی سے ان چڑھاوں کو سمیٹ لیتا تھا' اور پھر مورتی کے سامنے بیٹھ کر پاٹھ آر بنہ کر دیتا تھا۔ اس کے ساتھ عورتوں' بچوں' بوڑھوں اور جوانوں کا ایک گروہ بھی آنکھیں بند کر کے پوجا میں مستغرق ہو جاتا تھا۔ پھر کہیں دور پیچھے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آنا شروع ہو جاتی تھی۔ جوں جوں یہ آواز قریب آتی تھی' اس ماحول کی عبودیت کا طلسم ٹوٹنے لگتا تھا۔ جٹا دھاری مہنت کے علاوہ اور بھی بہت سے پجاریوں کی محویت میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز بڑی شدت سے خلل انداز ہونے لگتی تھی۔ جب یہ آواز پیپل کے عین قریب پہنچ جاتی تھی تو مہنت جو دیر سے کن انکھیوں سے دور سے آتے ہوئے گھوڑوں اور ان کے سواروں کا جائزہ لے رہا ہوتا تھا' یکایک ہری اوم ہری اوم کہتے ہوئے آنکھیں کھول کر اور آسن بدل کر بیٹھ جاتا تھا۔ کئی دوسرے پجاری بھی

گردنیں موڑ موڑ کر عبادت کا حق ادا کرتے تھے' اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان عربی النسل گھوڑوں کا نظارہ کرنے لگتے تھے جن پر رانو اور ٹونو ہر صبح اپنی مارننگ رائڈ کے لیے نکلا کرتی تھیں۔ رانو نے سرخ کارڈرے کی پتلون اور زرد رنگ کا جمپر پہنا ہوتا تھا اور اپنی پیچ در پیچ زلفوں کو سمیٹ کر وہ سبز ریشم کے سکارف میں برمیوں کی طرح بڑی سمارٹ گرہ باندھ لیتی تھی۔ ٹونو برجس اور چیکدار رائڈنگ کوٹ پہنتی تھی۔ اس کے سر پر کاسنی مخمل کی گول ٹوپی ہوتی تھی۔ جس کے نیچے سے اس کے سرکش بالوں کی لٹیں سنپولیوں کی طرح اس کے گالوں کو ڈستی رہتی تھیں۔ ان کے گھوڑے ایک ساتھ مستانہ چال سے بھاگتے تھے۔ اور ان کے زیر و بم کے ساتھ فضا میں طرح طرح کے رنگین غبارے بنتے اور بکھرتے تھے۔ جب وہ پیپل کے درخت کے پاس سے گزر جاتیں تو جٹا دھاری مہنت دوبارہ آنکھیں موند کر بیٹھ جاتا اور دوسرے پجاری بھی سر جھکا کر از سر نو گیان دھیان میں مشغول ہو جاتے۔

پجاریوں کی آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا کرنے کے بعد رانو اور ٹونو کلب میں میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس رکتی تھیں اور چند لمحے خوش گپیاں کر کے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر میدان کے دوسرے سرے پر کمشنر کے بنگلے کے پاس پہنچ جاتی تھیں۔ بوڑھا کمشنر بھی غالباً انہی کے انتظار میں اپنا پیلا ڈریسنگ گاؤن پہن کر صبح سویرے لان میں نکل آتا تھا' اور اپنے مالی کے ساتھ مل کر باغبانی کے شغل میں وقت گزارا کرتا تھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے بڑا افسر تھا' اس لیے رانو اور ٹونو بھی اس کے ساتھ زیادہ دیر باتیں کیا کرتی تھیں۔

نتھہ نگر کی رپورٹ کے متعلق کمشنر سے ڈانٹ کھانے کے چند روز بعد ایک صبح میں نے رانو اور ٹونو کے درشن کرنے کے لیے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی تو سامنے والا میدان بالکل خالی تھا۔ نہ پیپل تلے پجاریوں کی منڈلی تھی' نہ کسرتی نوجوانوں کا جھمگٹا تھا' نہ بھاری بھر کم لالوں اور ہانپتی ہوئی لالیوں کی قطار تھی۔ کمشنر کے لان میں بھی

کوئی پیلا ڈریسنگ گاؤن گلاب کے پودوں پر جھکا ہوا دکھائی نہ دیتا تھا۔ سورج نکل آیا' لیکن رانو اور ٹونو کے گھوڑے بھی کسی جانب سے نمودار نہ ہوئے۔ میں تیار ہو کر اپنے دفتر پہنچا' تو کچہری میں بھی مقدمہ بازوں کا کوئی خاص رش نہ تھا۔ وکیل وکلاء بھی خال خال نظر آتے تھے۔ میرا پیشکار بھی غیر حاضر تھا۔ کچھ عرصہ بعد میرا کورٹ انسپکٹر چند کاغذات لے کر آیا' تو اس نے مجھے بتایا کہ کل رات نتھہ نگر میں ہندو مسلم بلوہ ہو گیا۔ اب نتھہ نگر میں کرفیو اور بھاگلپور میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے۔ اس وجہ سے کچہریاں بے رونق ہیں۔

نتھہ نگر میں فساد کی خبر میرے دل نے اس طرح وصول کی جیسے ماہ صیام کا اولین روزہ دار ہلال عید کو خوش آمدید کہتا ہے۔ میرے نفس کی ساری کمینگی مسرت و انبساط کے تھپیڑوں سے جوش کھا کھا کر سمندر کی لطیف جھاگ کی طرح میرے وجود پر چھا گئی۔ بیورو کریسی کا بے نام سا پلا جو خفیہ طور پر میرے اندر ہی اندر پرورش پا رہا تھا' ایک دم انگڑائی لے کر جوان ہو گیا۔ اور دم اکڑا کر' چھاتی پھلا کر' تھوتھنی اٹھا کر باؤلے کتے کی طرح بے تحاشا بھوں بھوں کرنے لگا کہ "دیکھا پھر؟ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا......"

نتھہ نگر کی گلیوں میں خون تو نہتے مسلمانوں کا بہا تھا' لیکن اس فتح و نصرت کا سارا سہرا میری انا فقط اپنے ہی سر باندھنے پر مصر تھی۔ مسجد میں تراویح پڑھتے ہوئے نمازیوں پر حملہ تو نشے میں چور مسلح لاٹھیالوں نے کیا تھا' لیکن میرا پھولا ہوا نفس کچھ اس طرح دوں کی لے رہا تھا گویا یہ سب اس کے اپنے ہی بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ سرکاری اعلان کے مطابق اس فساد میں چار مسلمان شہید اور ایک لڑکی اغواء ہوئی تھی۔ اس خبر سے مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ کمشنر اور کلکٹر اور ڈی آئی جی اور ایس پی کے سر پر غرور کو نیچا دکھانے کے لیے تو مجھے اس سے کہیں زیادہ کشت و خون کی ضرورت تھی۔

نتھہ نگر کے اس ایک واقعہ نے میری ذات کو افسرانہ وقار کی بھٹی میں تپا کر بیورو

کرسی کی اس روایتی مشین میں باضابطہ فٹ کر دیا جو حسد اور رقابت اور کشاکشی اور ضدا ضدی کے تیل سے چلتی ہے اور جس میں انفاس اور املاک اور ناموس کا نقصان احساس کے پیمانے سے نہیں ناپا جاتا' بلکہ چار قتل' ایک اغواء بارہ خنجر زنیاں' آٹھ آتشزدگیوں کا حساب جوڑ کر اعداد و شمار کے گوشواروں میں ڈھال لیا جاتا ہے۔

مجھے بڑی توقع تھی کہ جب کمشنر اور کلکٹر اور ڈی آئی جی اور ایس پی کلب میں آئیں گ' تو میرے ساتھ آنکھیں چار کرنے سے شرمائیں گے اور کترائیں گے۔ لیکن یہ امید بھی نقش بر آب ثابت ہوئی۔ یہ حضرات بدستور کلب آتے تھے۔ ٹینس' بلیرڈ اور رم کھیلتے تھے۔ "کوئی ہے؟" "کوئی ہے؟" کے نعرے لگا کر وہسکی اور جن اور دم منگواتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ حسب دستور ہی ہی ہا ہا کر کے ڈنر کے وقت اپنے اپنے گھر روانہ ہو جاتے تھے۔

انہی دنوں ایک روز کمشنر نے ننتھه نگر کی متنازعہ سلک فیکٹری کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا۔ رائے بہادر سیٹھ بدری پرشاد جھنجھنیا نے وار فنڈ میں ایک لاکھ روپے کا گراں قدر عطیہ دیا اور مقامی پولیس کی حفاظت میں فیکٹری کی تعمیر کا کام بعنوان شائستہ شروع ہو گیا۔

ننتھه نگر کے فساد کی فائل تو بہت جلد داخل دفتر ہو کر طاق نسیاں کی زینت بن گئی لیکن میں اپنی مسترد شدہ رپورٹ کو بڑی احتیاط سے سینے سے لگائے بیٹھا رہا۔ ڈی آئی جی اور ایس پی تو نسبتاً کم تعلیم یافتہ اور ٹامی ٹائپ کے روایتی پولیس افسر تھے لیکن کمشنر اور کلکٹر دونوں بڑے شائستہ' مہذب' باوقار اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ کمشنر بڑا سنجیدہ تاریخ دان تھا اور فرصت کے اوقات میں خوبصورت مصوری کرنے کا شوقین تھا۔ کلکٹر فلسفے کا طالب علم رہا تھا' اور انسانی اور اخلاقی اقدار پر اس کی گہری نظر تھی۔ کیا سچ مچ انہیں اس بات کا ایمانداری سے یقین تھا کہ ننتھه نگر میں ہندو مسلم فساد کا خدشہ محض میرا فرضی واہمہ تھا؟ کیا پولیس کی رپورٹوں نے واقعی ان کی آنکھوں پر ایسی مضبوط پٹی باندھ دی تھی کہ انہیں اس فساد کا کوئی شائبہ تک بالکل نظر ہی نہ آتا تھا؟ کیا

کچھ ایسی دوسری مصلحتیں تھیں جن کی وجہ سے وہ اس صورت حال کو جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے؟

کچھ عرصہ تو یہ سوالات کانٹے کی طرح میرے دل میں کھٹکتے رہے۔ لیکن جیسے جیسے انگریز افسروں کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ بڑھتا گیا' ویسے ویسے ان سوالوں کے جواب بھی خود بخود مجھے ملتے گئے۔

انگریز افسر اپنی ذات میں کتنے ہی مہذب اور متمدن اور منصف مزاج اور بااخلاق کیوں نہ ہوں' ان کے سامنے ایک اور فقط ایک نصب العین ہوتا تھا۔ وہ یہ کہ ہر حالت میں ہر طرح سے ہر سطح پر برٹش راج کا استحکام اور بالا دستی برقرار رہے۔ جس طرح جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہے' اسی طرح اس مقصد کی برآوری میں بھی ان کے لیے سب کچھ حلال تھا۔ ذاتی تہذیب و تمدن' انصاف پسندی اور اخلاقی اقدار کو اس بنیادی نصب العین کے راستے میں حائل نہ ہونے دیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب نتھہ نگر کا واقعہ رونما ہوا' اس وقت برصغیر میں برٹش حکومت طرح طرح کے خطرات میں گھری ہوئی تھی۔ مغرب میں ہٹلر کی فوجیں سارے یورپ پر چھائی ہوئی تھیں۔ مشرق میں جاپان فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتا برما تک آ پہنچا تھا۔ ہندوستان میں بھی کانگریس کے تیور بری طرح بدلے ہوئے تھے۔ ان حالات میں بھاگلپور کے انگریز افسروں کو اپنے راج کی مصلحت اسی میں نظر آتی تھی کہ وہ ہر قیمت پر مقامی با اثر ہندوؤں کی خوشنودی اور خیر سگالی اپنے ساتھ رکھیں۔ اسی وجہ سے وہ نہ تو کمار اندر نرائن سنگھ کے خلاف کوئی بات سننے پر تیار تھے کیونکہ وہ راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ کا سربرآوردہ لیڈر تھا۔ اور نہ ہی وہ ست نرائن پانڈے پر کسی شک و شبہ کی گنجائش دیکھتے تھے۔ کیونکہ وہ لا تعداد ہندو غنڈوں کے لاؤ لشکر کا سرغنہ تھا۔ اگرچہ رائے بہادر بدری پرشاد جھنجھنیا اور دوسرے سیٹھ اپنے اپنے گھروں میں بڑی عقیدت سے گاندھی کی مورتیاں سجا سجا کر رکھتے تھے' اور غالباً ان کی پوجا بھی کرتے تھے' لیکن وہ علی الاعلان سرکار والا مدار کی حلقہ بگوشی کا دم بھرتے تھے اور وار فنڈ میں بڑی فیاضی سے چندہ بھی دیتے تھے۔ اس لیے وہ بھی فی الوقت انگریز افسروں

کی آنکھ کا تارا اور مقامی انتظامیہ کے راج دلارا تھے۔ ہندو اکثریت کی خوشنودی پر مسلمان اقلیت کی جان و مال اور عزت و ناموس کی قربانی رموز سلطنت کا ایک ادنٰی سا تقاضا تھی' جس میں ایک ننتھہ نگر چھوڑ بیس ننتھہ نگر بھی بڑی آسانی سے سما سکتے تھے۔

لیکن ایک برس کے اندر اندر جب ہوا کا رخ بدلا' تو انگریز کی حکمت عملی نے بھی گرگٹ کی طرح اپنا رنگ تبدیل کر لیا۔ جولائی ۱۹۴۲ء میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے واردھا میں اپنا وہ ریزولیوشن پاس کیا جسے عرف عام میں "ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک" (Quit India Movement) کہا جاتا ہے۔ اس میں مطالبہ کیا گیا تھا' کہ برطانیہ ہندوستان کا اقتدار فوراً ہندوستانیوں کے حوالے کر کے حکومت چھوڑ دے۔ ورنہ اقتدار زبردستی چھیننے کی غرض سے گاندھی جی کی سرکردگی میں ایک زبردست عوامی تحریک چلائی جائے گی۔ بظاہر اس تحریک کو عدم تشدد اصولوں کی بنیاد پر چلانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن گاندھی جی سمیت سب کانگرسی لیڈر "Do Or Die" (یعنی کریں گے یا مریں گے) کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ یہ نعرہ تشدد کا راستہ اختیار کرنے کے لیے ایک کھلی دعوت تھی۔

۷ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا' جس میں واردھا والے Quit India ریزولیوشن کی توثیق ہونا تھی۔ اس شام میں ٹینس کھیل کر کلب میں اپنے رہائشی کمرے کی طرف آیا' تو برآمدے میں میرے کلکٹر مسٹر پریڈو کی بیوی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مسز پریڈو بڑی ہنس مکھ اور خوش اخلاق خاتون تھی' لیکن ننتھہ نگر کے سانحہ کی وجہ سے ہمارے باہمی تعلقات میں کسی قدر سرد مہری پیدا ہو چکی تھی۔ انہوں نے کہا کہ آج رات ان کے ہاں ایک انتہائی اہم ڈنر ہے۔ جس میں میرا شریک ہونا لازمی ہے۔ اس لیے وہ خود مجھے مدعو کرنے آئی ہیں۔

میں رات کے آٹھ بجے کلکٹر کے ہاں پہنچا' تو وہاں پر دو اور انگریز افسر بھی موجود تھے۔ ایک ایس پی' دوسرا ایک فوجی میجر جو کسی خاص ڈیوٹی پر بھاگلپور آیا ہوا تھا۔ کلکٹر نے شروع ہی میں یہ وضاحت کر دی کہ یہ ڈنر دراصل ایک Top Secret اسپیشل کمیٹی

کا پہلا اجلاس ہے جس کے ہم چاروں افراد ممبر مقرر کئے گئے ہیں۔ اگر آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے بمبئی کے اجلاس نے "ہندوستان چھوڑ دو" ریزولیوشن کی توثیق کر دی تو کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دے کر تمام بڑے بڑے لیڈروں کو فوراً گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد خطرہ ہے کہ بہت سے لیڈر زیر زمین روپوش ہو جائیں گے' اور عوام کو تخریبی کارروائیوں پر اکسائیں گے۔ یہ اسپیشل کمیٹی ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔

مسٹر پریڈو نے مجھے مخاطب کر کے خاص طور پر زور دیا' کہ میں اس کمیٹی کے قیام اور کام کی اطلاع مسٹر ٹی پی سنگھ کو ہرگز نہ دوں۔ مسٹر ٹی پی سنگھ بھی آئی سی ایس کے افسر تھے اور مجھ سے پانچ برس سینئر تھے۔ کچھ عرصہ قبل وہ انگریز افسروں کی ناک کا بال تھے۔ نتھہ نگر کا چارج میرے ہاتھوں سے چھین کر انہی کے سپرد کیا گیا تھا۔ لیکن اب بدلتے ہوئے ماحول میں صورت حال برعکس ہو گئی تھی۔

۸ اگست کو بمبئی میں آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس نے Quit India قرار داد کی توثیق کر دی۔ گاندھی جی' پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اس موقع پر نہایت سخت تقریریں کیں۔ ۹ اگست کی صبح کو کانگریس کی جماعت کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ اس کے بہت سے سربرآوردہ لیڈر ہر جگہ گرفتار ہو گئے۔ باقی سینکڑوں کارکن روپوش ہو کر زیر زمین چلے گئے۔ اس کے بعد جگہ جگہ قتل و غارت' لوٹ مار اور دہشت انگیزی کا دور دور شروع ہو گیا۔ بھاگلپور کا ضلع اس طوفان کی لپیٹ میں بڑی شدت سے آیا۔ سب سے پہلے ہم نے دور دور بکھرے ہوئے اکا دکا انگریز خاندانوں کو جمع کر کے بھاگلپور کلب میں یکجا کیا۔ پھر ایک سٹیمر جہاز خالی کرا کے دریا کے عین منجدھار میں گورا فوج کی نگرانی میں لنگر انداز کر دیا۔ تا کہ اگر مقامی حالات بالکل بے قابو ہو جائیں۔ تو انگریز افسروں اور دوسرے انگریز خاندانوں کو اس میں بٹھا کر کسی محفوظ مقام کی طرف روانہ کر دیا جائے۔ دن رات کانگرسی ہجوم جگہ جگہ ایسی

قیامت برپا کر رہے تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے بھاگلپور کا شہر ضلع کے دوسرے حصوں سے اور ضلع باقی صوبہ سے کٹ کر الگ تھلگ رہ گیا۔ ہڑتالوں کی وجہ سے کھانے پینے کا سامان کمیاب ہو گیا' اور کلب میں محصور انگریز خاندان صبح شام دال چاول پر گزارہ کرنے لگے۔ پندرہ روز بعد پٹنہ سے ایک فوجی ہیلی کاپٹر نے آ کر کلب کی گراؤنڈ میں سبزیوں اور گوشت کے کچھ تھیلے پھینکے تو بہت سے بوڑھے انگریز مرد اور عورتیں وفور جذبات سے سسک سسک کر رونے لگیں۔

اس تحریک کے دوران بھاگلپور کے ضلع میں تشدد اور تخریب کاری کے جو واقعات رونما ہوئے' ان کی نوعیت کچھ اس طرح کی تھی۔

ایک پولیس کانسٹیبل کو جان سے مار کر اور یونین جیک میں لپیٹ کر درخت سے لٹکا دیا گیا۔

دو چوکیداروں نے ملازمت سے استعفیٰ دینے سے انکار کیا تو ایک کی ناک اور دوسرے کے کان کاٹ ڈالے گئے۔

جگہ جگہ ریل کی پٹڑی کو اکھاڑنا' اور ریل کے پلوں کو مسمار کر کے وہاں سرخ جھنڈیاں لگانا تا کہ ریل گاڑیاں حادثوں سے دو چار نہ ہوں۔

ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کی تاریں تاریں بار بار اور جگہ جگہ سے کاٹنا۔

ریلوے اسٹیشنوں' تھانوں' ڈاک خانوں' سرکاری دفتروں' کچہریوں' مال خانوں' خزانوں پر حملے کرنا' لوٹنا اور نذر آتش کرنا۔

عدالتوں میں گھس کر مجسٹریٹوں کی کرسیوں پر قبضہ کر کے بیٹھنا اور مقدمات کی مسلوں کو درہم برہم کر کے ضائع کرنا۔

ریل گاڑیوں میں بغیر ٹکٹ کے سفر کرنا' اور جگہ جگہ اور بار بار گاڑی روکنے والی ہنگامی زنجیر کو کھینچنا۔

انکم ٹیکس' سیلز ٹیکس' مالیہ' آبیانہ اور دوسرا ہر قسم کا ٹیکس حکومت کو ادا کرنے سے انکار کرنا۔

ہڑتالیں کرنا اور سرکاری سرپرستی میں چلنے والی دکانوں اور بدیشی مال کی دکانوں اور گوداموں کو لوٹنا اور جلانا۔
کالجوں اور سکولوں کو زبردستی بند کروانا۔

سرکاری ملازموں کا حقہ پانی بند کرنا۔
برطانوی نظام حکومت کے متوازی ہر سطح پر اپنا قومی نظام حکومت قائم کرنا اور چلانا۔
کاغذ کے نوٹوں کو رد کر کے صرف چاندی کے سکے اس طرح ذخیرہ کرنا کہ انگریزی کرنسی کا نظام معطل ہو کر ناکام ہو جائے۔
بھاگلپور کے ضلع میں یہ تمام حربے کسی نہ کسی حد تک کئی جگہ آزمائے گئے۔ لیکن رفتہ رفتہ تحریک کا زور ٹوٹ گیا اور حکومت کا پلہ بھاری رہا۔ اس ایجی ٹیشن میں پولیس اور فوج کی فائرنگ سے سارے صوبہ میں جتنے لوگ مارے گئے' ان کا صحیح شمار ناممکن ہے۔ جو گاؤں اس تحریک میں پیش پیش تھے' ان پر سزا کے طور پر اجتماعی جرمانہ Fine Collective بھی لگایا گیا۔ صوبہ بہار کے آٹھ ضلع کے ۱۷۰ دیہات سے ۹ لاکھ ۷۸ ہزار روپے کی رقم اجتماعی جرمانہ کے طور پر وصول کی گئی۔ اس میں بھاگلپور ضلع کے ۲۴ گاؤں کا ایک حصہ ایک لاکھ روپیہ تھا۔

○○○

• ایس ڈی او

بھاگلپور کے بعد مجھے ضلع "گیا" میں اورنگ آباد کی سب ڈویژن کا چارج ملا۔
گیا کے شہر میں دو چیزیں قابل دید تھیں۔ ایک تو بدھوں کا قدیمی معبد تھا' جہاں ایک درخت کے نیچے تپسیا کر کے مہاتما بدھ نے نروان حاصل کیا تھا۔ دوسرا عجوبہ روزگار ضلع کے کلکٹر مسٹر والز تھے۔ یہ ایک آدھے کالے' آدھے گورے' نیم تیتر' نیم بٹیر قسم کے اینگلو انڈین تھے' جن کا اپنا مشغلہ شراب پینا تھا' اور ان کی بھدی سی فربہ اندام منہ پھٹ میم صاحبہ کا فرض منصبی رشوت وصول کرنا تھا۔ اس کار خیر میں ان کی دو جوان بیٹیاں بھی اپنی ماں کا بڑھ چڑھ کر ہاتھ بٹایا کرتی تھیں۔
اورنگ آباد پہنچ کر پہلی صبح میں ابھی سویا ہی پڑا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا کوئی دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر آنکھ کھولی تو دیکھا کہ بڑی بڑی سفید مونچھوں اور سفید بھوؤں والا ایک کالا بھجنگ آدمی میرے سینے پر جھکا ہوا ہے اور میرا سر اٹھا کر اس کے نیچے ایک موٹی سی گدی ٹھونس رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ اورنگ آباد کا سب سے زیادہ فیشن ایبل حجام ہے جو منہ اندھیرے بستر میں لیٹے لیٹے ایس ڈی او صاحب کی شیو کرنے آیا تھا۔ میں کچھ حیلہ بہانہ کر کے اسے ٹالنے لگا' تو میرا ہیڈ اردلی شمبھو ناتھ تیواری جو کہیں آس پاس ہی منڈلا رہا تھا' کھٹ سے نمودار ہوا اور میری ڈھارس بندھانے لگا۔ "حجور فکر نہ کریں' اس جگہ کا ایسا ہی دستور ہے۔"
پوپٹ رام حجام نے شیو کرتے کرتے مجھے اطلاع دی کہ وہ خالص "گورمنٹی بالبر" ہے اور عرصہ بیس سال سے صاحب لوگوں کو مونڈنے میں مہارت رکھتا ہے۔ اس نے مجھے مسٹر آئف' مسٹر مارٹن' مسٹر جوائس' مسٹر فشر وغیرہ کے دیئے ہوئے سرٹیفکیٹ دکھائے' اور ساتھ ہی ساتھ مجھے اورنگ آباد کے منصف' سب جج' سب رجسٹرار' سب ڈپٹی کلکٹر'

ڈی ایس پی' کورٹ انسپکٹر' سٹی مجسٹریٹ' سب اسسٹنٹ سرجن' اسسٹنٹ سول سپلائز آفیسر' سب انسپکٹر آف سکولز' گورنمنٹ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر اور گرلز مڈل سکول کے ہیڈ مسٹریس کے جملہ خصائل و اطوار کے متعلق بھی بڑی تفصیلی معلومات بہم پہنچائیں۔

پہلے روز سارا دن شمبھو ناتھ تیواری مجھے گردن سے پکڑے قدم قدم پر نئے ایس ڈی او کے لیے مقامی دستوروں کے چوکھٹے میں بڑی تندہی سے فٹ کرتا گیا۔ چند یوم بعد میں اسی دستور کی تعمیل میں کلکٹر سے ملاقات کرنے گیا' شہر کے لیے روانہ ہونے لگا تو دیکھا کہ میری جیپ میں انڈوں سے بھرا ہوا ایک بڑا سا چھابا اور قیں قیں کرتی ہوئی مرغیوں کا ایک ٹوکرا پہلے سے موجود ہے۔

میرے استفسار پر شمبھو ناتھ تیواری نے بتایا کہ یہ بھی اس جگہ کا دستور ہے۔ جب کبھی ایس ڈی او صاحب بہادر کلکٹر صاحب بہادر کی ملاقات کو جاتے ہیں' سو ٹھور انڈا اور بیس ٹھور مرغی لازمی اپنے سنگ لے جاتے ہیں۔ کلکٹر میم صاحب بہادر کو اورنگ آباد کا مرغی انڈا بہت پسند ہے۔"

"یہ انڈے اور مرغیاں کہاں سے آئی ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہجور سب ڈپٹی کلکٹر بابو نے تھانوں کی باریاں لگائی ہوئی تھیں۔ آج تھانہ اوبرا کی باری تھی۔" شمبھو ناتھ تیواری نے وضاحت کی۔

میں نے سب ڈپٹی کلکٹر کو اپنے ساتھ جیپ میں بٹھایا' اور انڈوں اور مرغیوں کی کھیپ لے کر تھانہ اوبرا پہنچا جو اورنگ آباد سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس وقت تھانیدار صاحب مالش کروا کر لنگوٹ باندھے ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے اور دو حوالاتی کنویں سے بالٹیاں بھر بھر کر ان کے سر پر ٹھنڈے پانی کی دھاریں چھوڑنے میں مصروف تھے۔ ایک سپاہی ان کے لیے دودھ گرم کر رہا تھا اور چند دیہاتی جو اپنی شکایتوں کی رپورٹ درج کروانے آئے تھے' ایک طرف دھول میں بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے۔

مرغیاں اور انڈے واپس کرنے میں ہمیں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی۔ تھانیدار نے

یہ رسد اوبرا کے ایک بنئے سے حاصل کی تھی جس کے پاس مٹی کے تیل کا ڈپو تھا۔
ہم نے اس بنئے کو تھانے طلب کیا' تو وہ گھبرا گیا کہ شاید کچھ انڈے گندے نکلے

ہوں یا مرغیاں خاطر خواہ طور پر فربہ نہ تھیں۔ اس لیے حفظ ماتقدم کے طور پر وہ اپنے
ساتھ گرم گرم دودھ کی ایک گڑوی اور تازہ مٹھائیوں کا ایک تھال بھی لیتا آیا تھا۔
ہر دوسرے تیسرے ماہ کلکٹر صاحب بہادر کے لیے انڈے اور مرغیاں فراہم کرنے کے
علاوہ اوبرا آنے والے سرکاری افسران کی خاطر و مدارت کا فریضہ بھی تھانے کی طرف
سے اسی بنئے کے سپرد تھا۔ اس خدمت گزاری کے عوض سے اپنے ڈپو میں مٹی کا
تیل بلیک کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ وہ تیل میں ملاوٹ بھی جی بھر کرتا تھا۔ دام بھی
من مانے وصول کرتا تھا۔ اور ذخیرہ اندوزی کے کاروبار میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ تھانے
میں اس کے خلاف ہر وقت چند رپورٹیں زیر تفتیش رہتی تھیں' جنہیں تھانیدار ننگی تلوار
کی طرح وقتاً فوقتاً اس کے سر پر لٹکاتا رہتا تھا' تا کہ بنئے کا جذبہ خدمت کسی آن
بھی سرد نہ ہونے پائے۔
تھانے کے ریکارڈ سے میں نے بنئے کے خلاف تین "زیر تفتیش" شکایتوں کو برآمد کیا اور
سب ڈپٹی کلکٹر سے کہا کہ وہ ان کا جائزہ لے کر باقاعدہ کارروائی کا آغاز کرے۔
وہ کاغذات سمیٹ کر دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔ کچھ دیر کے بعد میں اچانک سب
ڈپٹی کلکٹر سے کوئی بات پوچھنے وہاں گیا' تو وہ دونوں پاؤں میز پر پسارے بنئے کے ساتھ
خوش گپیوں میں مصروف تھا' اور ساتھ ہی ساتھ اس کے لائے ہوئے دودھ اور مٹھائیوں
پر بھی بڑی خوش دلی سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔
مرغی' انڈا' دودھ' دہی اور مٹھائیوں کی فراہمی کے علاوہ اوبرا کا تھانیدار اور بھی کئی لحاظ
سے ہر فن مولا تھا۔ ایک دفعہ اس کو ہمراہ لے کر میں ایک نہایت دور افتادہ علاقہ
کے دورے پر گیا۔ یہ مقام مکھیوں اور مچھروں کے لیے مشہور تھا' اس لیے ہم دونوں اپنی
اپنی مچھر دانی کے ساتھ لے کر گئے تھے۔ رات کو ہم دونوں نے جس چھوٹے سے ریسٹ
ہاؤس میں قیام کیا' وہاں چارپائیاں تو تھیں لیکن مچھر دانیاں لگانے کے لیے کسی قسم

کے ڈنڈے موجود نہ تھے۔ مجبوراً مچھر دانی لگائے بغیر میں سامنے والے برآمدے میں لیٹ گیا' اور تھانیدار نے اپنی چارپائی پچھلے برآمدے میں بچھا لی۔ لیٹتے ہی مٹر کے دانوں کی طرح موٹے موٹے مچھروں نے چاروں طرف سے زبردست یورش کر دی۔ وہ قطار در قطار چیں چیں کرتے ہوئے آتے تھے اور اس قدر بے رحمی سے کاٹتے تھے جیسے کوئی دہکتے ہوئے انگارے چمٹے سے اٹھا اٹھا کر مسل رہا ہو۔ مچھروں کے حملوں سے میرا تو برا حال ہو رہا تھا' لیکن عقبی برآمدے سے برابر تھانیدار کے پر سکون خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ آدھی رات کے قریب میں نے دبے پاؤں اٹھ کر اس کی طرف جھانکا' تو دیکھا کہ تھانیدار صاحب کی چارپائی پر ان کی مچھر دانی بڑی آن بان سے تنی ہوئی ہے اور چار مقامی چوکیدار اسے چاروں کونوں سے تھامے بالکل بے حس و حرکت پتھر کے ستونوں کی طرح ایستادہ ہیں۔

فرض شناسی اور خوش تدبیری کے باب میں رفیع گنج کا تھانیدار بھی اپنی مثال آپ تھا۔ رفیع گنج بڑا قصبہ تھا اور وہاں کھاتے پیتے مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی تھی۔ ان دنوں صوبہ بہار کے ادبی حلقوں میں حضرت شفق عماد پوری کے کلام کا خوب چرچا تھا۔ ان کی رباعیوں کا ایک مجموعہ شائع ہو کر کافی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شفق رفیع گنج ہی میں رہتے ہیں تو دل میں ان کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔

ایک روز رفیع گنج کا تھانیدار اورنگ آباد آیا ہوا تھا' میں نے اس سے کہا کہ میں اگلے روز اس کے تھانے کا معائنہ کرنے آ رہا ہوں۔ شامت اعمال سے میں نے اتنا اور بھی کہہ دیا کہ رفیع گنج میں ایک صاحب شفق عماد پوری رہتے ہیں۔ میرے پہنچنے تک وہ ان کا اتہ پتہ معلوم کر رکھے۔ بس اب کیا تھا' بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ راتوں رات پولیس کے سپاہیوں نے شفق صاحب کا سراغ لگایا اور نصف شب کے قریب انہیں کشاں کشاں لا کر تھانیدار صاحب کے روبرو پیش کر دیا۔ جب انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ شفق صاحب کے میرے ساتھ کوئی ذاتی تعلقات نہیں ہیں' بلکہ وہ مجھے جانتے نہیں

نہیں تو تھانیدار نے بڑی تفصیل سے ان کی ولدیت' جائے سکونت' ذریعہ معاش' سیاسی رجحانات اور دیگر کوائف کا اندراج کر کے ایک فائل کھولی اور تحریری طور پر انہیں اگلی صبح طلوع آفتاب کے وقت دوبارہ تھانے میں حاضر ہونے کا پابند کر دیا۔

اگلے روز دوپہر کے قریب تھانے کی انسپکشن سے فار ہو کر میں نے تھانیدار سے دریافت کیا' کہ کیا انہوں نے معلوم کر لیا ہے کہ شفق صاحب کہاں رہتے ہیں۔

"حاضر حضور" تھانیدار صاحب نے اٹینشن ہو کر جواب دیا اور ایک سنتری کو زور سے پکار کر کہا۔ "شیخ سپھنخ کو ترت حاضر کرو۔"

آناً فاناً ایک طرف سے دو تین سپاہیوں کے نرغے میں مجرموں کی طرح گھرے ہوئے ایک سفید ریش' ضعیف البدن بزرگ نمودار ہوئے۔ انہوں نے نیلے چار خانے کا تہبند اور لمبا سفید کرتہ پہنا ہوا تھا۔ سر پر ململ کی دوپلی ٹوپی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ شرم و ندامت کے مارے میرا جی چاہتا تھا کہ میں شفق صاحب سے آنکھیں چار کئے بغیر ہی وہاں سے فرار ہو جاؤں۔ میں ڈرتے ڈرتے اٹھا اور آگے بڑھ کر سلام کیا۔ شفق صاحب کو ثقل سماعت کا عارضہ تھا۔ اس لیے میرا سلام انہیں سنائی نہ دیا۔ تھانیدار لپک کر آگے بڑھا' اور اپنا منہ ان کے کان کے پاس لا کر زور سے چیخا۔ "ابے شیخ جی' ایس ڈی او صاحب بہادر ہیں' سلام کرو۔"

شفق صاحب نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور بڑے سلیقے سے جھک کر مجھے سلام کیا۔

مجھ پر گھڑوں پانی تو پہلے ہی پڑا ہوا تھا۔ اب تو میں بالکل غرق ہو گیا۔ شفق صاحب کو جیپ میں بٹھا کر انہیں ان کے گھر لے گیا۔ بڑی منت سماجت سے اصلی ماجرا سنایا اور "ادبی دنیا" کے چند پرچے ان کی نذر کئے جن میں میرے کچھ افسانے چھپ چکے تھے۔ جب شفق صاحب کو تھانیدار کی حماقت اور میری بے گناہی کا یقین ہو گیا تو وہ مسکرائے اور فرمایا۔ "گنجے کے ناخنوں کی طرح اب تو یہ دعا بھی مانگنا چاہیے کہ خدا ایس ڈی او کو ادیب سے ملنے کا شوق نہ دے۔"

اس حادثہ کے بعد میں جب کبھی شفق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا' انہوں نے ہمیشہ شفقت ہی فرمائی۔ ایک بار میں ان کے ہاں پہنچا' تو وہاں ایک ہندو کوی بھی بیٹھے تھے۔

شفق صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ ہندو کوی نے بھی ترنم کے ساتھ اپنی چند کویتائیں پڑھیں۔ اس کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئے اور بولے۔ "اچھا' اب آپ بھی کچھ بکئے۔"

کوی صاحب کے اس بے تکلفانہ انداز پر میں کچھ حیران ہوا تو شفق صاحب نے ہنس کر فرمایا۔ "آپ برا نہ مانیں۔ ان اطراف کے ہندی محاورے میں بکنا فرمانے کے مترادف ہے۔ بڑے بڑے جلسوں سے معزز مقرر کو اسی اعلان کے ساتھ اسٹیج پر لایا جاتا ہے کہ اب ہمارے مہا بکتا اسٹیج پر پدھار کر کتھا بکیں گے۔"

شفق صاحب ہی نے مجھے متنبہ کیا کہ شام کے وقت اگر کوئی میزبان یہ اصرار کرے کہ ناشتے تک رک جاؤ' تو اس انتظار میں ساری رات وہاں گزارنے کی حاجت نہیں۔ کیونکہ بہار میں شام کی چائے وغیرہ کو بھی اکثر ناشتہ ہی پکارا جاتا ہے۔

اورنگ آباد میں مجھے ابھی ایک برس ہی گزرا تھا' کہ پٹنہ سے چیف سیکرٹری کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ ہم تمہارے کام سے مطمئن ہیں اور اب تمہیں اورنگ آباد سے بڑی اور زیادہ اہم ڈویژن کا چارج دینا چاہتے ہیں۔ تین ماہ بعد سہسرام کا چارج لے لو۔ اگر تین ماہ کا نوٹس کافی نہ سمجھو تو ہمیں لکھ بھیجو' تا کہ تبادلے کا وقت تمہاری سہولت کے مطابق متعین کر دیا جائے۔

سہسرام کی سب ڈویژن آرہ کے ضلع میں واقع تھی۔ اس ضلع میں مسلمانوں کے کئی خوشحال اور مقتدر خاندان آباد تھے۔ چند خاندانوں کے پاس بڑی نادر کتابوں' قلمی نسخوں اور قدیم مخطوطات کے نہایت اعلیٰ کتب خانے تھے۔ ایک صاحب نے مجھے حضرت سید احمد شہید بریلوی' حضرت شاہ اسماعیل شہید' حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور کئی دوسرے اکابر کے چند خطوط بھی دکھائے جو ان کے خاندان میں بڑی محنت اور محبت سے محفوظ چلے آ رہے تھے۔ ان نوادرات میں ایک تعویذ بھی تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران

کسی بزرگ نے مجاہدوں میں تقسیم کیا تھا۔ اس تعویذ کے متعلق روایت تھی کہ اسے بازو پر باندھ کر جو شخص انگریزی فوج کا مقابلہ کرتا تھا' اسے کوئی گزند نہ پہنچتی تھی۔ اسی زمانے کا ایک اور تعویذ کھول کر گلاس کیس میں محفوظ کیا ہوا تھا۔ اس میں درج تھا۔

اللہ جی مہاراج
ظفر کے سرتاج
موا فرنگی تاراج

سہسرام شہر کے بیچوں بیچ جرنیلی سڑک یعنی گرینڈ ٹرنک روڈ گزرتی تھی۔ اس عظیم شاہراہ کا معمار شیر شاہ سوری قریب ہی ایک سنگلاخ مقبرے میں آسودہ تھا۔ مقبرے کے ساتھ ایک وسیع و عریض پختہ تالاب تھا' جس کی سیڑھیوں پر سر شام اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا تھا۔ ایک کنارے پر ہندو راجپوتوں کی ٹولیاں منڈلی جماتی تھیں۔ دوسری جانب پٹھان مسلمان پھسکڑا مار کر حقہ گڑگڑاتے تھے۔ ان دونوں گروہوں کی نگاہوں کا مرکز چند نوجوان ہوتے تھے' جو صاف ستھرے کپڑے پہنے' کنگھی پٹی سے آراستہ' کانوں میں پھول سجائے' ناز نخرے دکھاتے' کولہے مٹکاتے' پان چباتے تالاب کے درمیان والی سیڑھیوں پر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے منڈلایا کرتے تھے۔

شیر شاہ سوری کے مقبرے کے ارد گرد جتنی زرعی اراضی تھی' وہ تقریباً سب کی سب سید الطاف حسین شاہ کے قبضے میں تھی۔ شاہ صاحب ایس ڈی او کے ہیڈ اردلی تھے۔ جو ایس ڈی او سہسرام میں اپنا وقت پورا کر کے تبدیل ہوتا تھا' سید الطاف حسین شاہ جاتے جاتے اس سے اپنی خدمت گزاری کا واسطہ دے کر مقبرے کے ساتھ والی سرکاری زمین کا کچھ حصہ بخشش کے طور پر اپنے نام طویل ٹھیکے پر منتقل کروا لیتے تھے۔ چنانچہ اب ان کا شمار شہر کے اچھے خاصے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ پچھلے چند برس سے وہ اپنے وارڈ سے سہسرام میونسپلٹی کے میونسپل کمشنر بھی بڑی باقاعدگی سے نامزد ہو رہے تھے۔

ایس ڈی او کے دفتر میں ایک کانفیڈنشل فائل تھی' جس میں تقریباً ہر ایس ڈی او کی

یہ پر زور سفارش درج تھی کہ جب سید الطاف حسین شاہ ہیڈ اردلی کے عہدے سے ریٹائر ہوں تو انہیں "خان صاحب" کے خطاب سے ضرور سرفراز کیا جائے۔

درمیانہ قد' چھجے دار کھچڑی داڑھی' کلف سے تازہ دم طرے والی ٹوپی' چست اچکن' اس کے نیچے وضعدار توند' تنگ پائنچوں کی سفید شلوار' کمر کے گرد اپنے عہدے کی پیٹی' کندھے پر شالی رومال' آنکھوں میں جلالی قسم کی سرخی' چہرے پر خشونت گزیدہ سی متانت۔

سید الطاف حسین شاہ پر نظر پڑتے ہی یوں لگتا تھا جیسے کوئی ہزاری دو ہزاری درجے کا سردار ابھی ابھی کسی مغلیہ دربار سے عتاب شاہی کا پروانہ لے کر برآمد ہو۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نے کبھی بھول کر بھی گزر نہ کیا تھا۔ گفتگو میں بھی اس کا انداز درباری' الفاظ ثقیل اور لہجہ گرجدار ہوتا تھا۔

اگر میں کبھی دفتر میں بیٹھا فائلیں دیکھ رہا ہوتا تھا' اور کوئی ملاقاتی آ جاتا تھا' تو الطاف حسین شاہ انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیتا تھا' کہ "صاحب بہادر اس وقت امور سلطنت میں مصروف ہیں۔"

کچہری کا وقت قریب آتا تھا' تو وہ بڑی رازداری سے سرگوشی کر کے مجھے خبردار کر دیتا تھا۔ "حضور' نزول اجلاس کی ساعت آ گئی ہے۔"

ایک روز میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ الطاف حسین شاہ نے آہستہ سے کہا۔ "حضور والا کو امور سلطنت سے جب کچھ فراغت یابی ہو' تو بندہ بلدیہ سہسرام کے میونسپل کمشنر کو حاضر خدمت کرنے کا اذن چاہتا ہے۔"

"میونسپل کمشنر صاحب تشریف لے آئے ہیں یا ابھی آنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"حضور حاضر ہیں۔"

"انتظار کروانا مناسب نہیں۔" میں نے کہا۔ "انہیں ابھی لے آؤ۔"

الطاف حسین شاہ کمرے سے باہر گیا۔ ہیڈ اردلی کی پیٹی اتاری۔ کمر کے ساتھ سبز ململ کا پٹکا باندھا۔ کندھے پر شالی رومال ڈالا' اور واپس آ کر مجھے جھک کر سلام کیا۔ "حضور بندہ بلدیہ سہسرام کا میونسپل کمشنر حاضر خدمت ہے۔"

میں نے اٹھ کر اس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ کرسی پیش کی۔ اور کوئی آدھ گھنٹہ تک ہمارے درمیان سہسرام میونسپل کمیٹی کے کچھ مسائل پر بڑا پر مغز تبادلہ خیالات ہوا۔ اس انٹرویو کے بعد الطاف حسین شاہ نے میرا شکریہ ادا کیا۔ ہاتھ ملا کر رخصت ہوا اور ہیڈ اردلی کی پیٹی باندھ کر پھر اپنی ڈیوٹی پر ایستادہ ہو گیا۔

سید الطاف حسین شاہ کے علاوہ میرے عملے میں عبدالکریم خاں نام کے ایک اور مرغ زریں بھی تھے۔ یہ صاحب سب ڈپٹی کلکٹر کے طور پر ملازمت میں داخل ہوئے تھے' اور پورے تیس برس کی سروس کے بعد عین اسی عہدۂ جلیلہ سے ریٹائر ہونے والے تھے۔ ساری عمر ان کے ضمیر نے ترقی کی خواہش کا بوجھ اٹھانے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ اگر دل میں کبھی کوئی ایسی حرص پیدا بھی ہوئی' تو دماغ نے اس کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ خوش گپیوں' لاف زنیوں' چائے پر چائے پینے' پان پر پان چبانے اور میز پر سر ٹکا کر اونگھنے میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ دفتر کے کام کی طرف متوجہ ہونے کا کبھی ٹائم ہی نہ ملتا تھا۔ لیکن اپنی ملازمت کے آخری برس کے دوران ان کے دل و دماغ پر ایک آرزو ایسی شدت سے چھا گئی تھی جس طرح ملیریا کے مریض پر بے اختیار کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ ان کی تمنا تھی کہ پنشن پر رخصت ہونے سے پہلے کسی طرح ان کو "خان صاحب" کا خطاب مل جائے۔

"جناب عالی" عبدالکریم خاں صاحب فرمایا کرتے تھے۔ "خاکسار نے ساری عمر خون پسینہ ایک کر کے حکومت عالیہ کا حق نمک ادا کیا ہے۔ اب اگر بے خطاب کے لنڈورا ہی گاؤں واپس چلا گیا' تو انگشت نمائی ہو گی کہ لونڈا دھوپ میں بال سفید کرا کے خالی ہاتھ لٹکائے لوٹ آیا ہے۔ جناب عالی! اس میں حکومت کی اپنی جو بدنامی ہے' اس کا ذکر خاکسار لب پر لانے سے شرماتا ہے۔"

ان دنوں سر فرانسس موڈی صوبہ بہار کے قائم مقام گورنر مقرر ہو کر نئے نئے آئے تھے۔ انہوں نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کرسمس منانے کے لیے رہتاس فورٹ کو منتخب کیا۔ سہسرام سے کچھ دور ایک دشوار گزار پہاڑی پر گھنے جنگلات میں گھرا ہوا یہ

ایک پر فضا مقام تھا' جس کی تسخیر کے لیے شیر شاہ سوری اور راجہ رہتاس کے درمیان جنگی معرکوں کے عجیب و غریب افسانے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اپنے اپنے رنگ میں مشہور تھے۔ انگریز افسروں میں یہاں کی شکار گاہ بڑی مقبول تھی اور صوبے کا گورنر ہر دوسرے تیسرے سال یہاں کرسمس کیمپ لگایا کرتا تھا۔

عبدالکریم خاں صاحب کے کان میں سر فرانس موڈی کے پروگرام کی بھنک پڑی تو وہ میرے سر ہو گئے کہ اس بار گورنر کے کیمپ کا پورا انتظام ان کے سپرد کیا جائے۔ سب ڈویژن کے باقی سب افسروں نے ان کے اس مطالبے کی شدید مخالفت کی اور دل کھول کر مذاق بھی اڑایا۔ سب نے باری باری مجھے خاں صاحب کی نااہلی' سستی' کاہلی' کام چوری اور تن آسانی کی جملہ تفصیلات سے از سر نو آگاہ کیا اور گورنر کیمپ میں کسی بد انتظامی کے خطرناک عواقب سے بھی حسب توفیق خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے کیمپ کا چارج عبدالکریم صاحب ہی کے حوالے اس شرط پر کر دیا' کہ کیمپ کے اخراجات کے لیے تاجروں اور زمینداروں سے کسی قسم کا کوئی چندہ وصول نہ کیا جائے گا بلکہ گورنر کے ملٹری سیکرٹری کو صحیح بل دے کر پورا پورا حساب بے باق کیا جائے گا۔ ورنہ اب تک رسم یہی بندھی ہوئی تھی کہ صوبائی گورنر یا دوسرے بڑے افسر رہتاس فورٹ میں کیمپ لگاتے تھے' شکار کھیلتے تھے اور کچھ گفتنی اور کچھ ناگفتنی داد عیش دے کر ہنسی خوشی رخصت ہو جاتے تھے۔ سب ڈویژن کا کوئی افسر ان کے آرام و آسائش کا ہر ممکن خیال رکھنے پر مامور ہو جاتا تھا۔ کیمپ کے اختتام پر وہ ایک علامتی سا بل پیش کر کے قدرے قلیل سی رقم وصول کرتا تھا اور مہمان خانے کے رجسٹر میں "All Billsd Paid" کا باضابطہ اندراج ہو جاتا تھا۔ اصلی اخراجات پورا کرنے کے لیے میزبان افسر علاقے کے زمینداروں' رئیسوں اور راشن ڈپوؤں ہولڈروں سے من مانے چندے وصول کرتا تھا۔ چندوں کا کچھ حصہ بلوں کی ادائیگی پر صرف ہو جاتا تھا۔ باقی ساری پونجی بڑی آسانی سے متعلقہ افسر کی جیب گرم کرتی تھی۔

میری شرط سن کر عبدالکریم صاحب سوچ میں پڑ گئے اور نہایت سنجیدگی اور ہمدردی سے بولے۔ "جناب عالی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن گورنمنٹ ہاؤس کے اسٹاف کو

سالہا سال سے مفت خوری کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔ اس نئے بندوبست پر وہ ضرور بدکیں گے۔ اور لاٹ صاحب بہادر کے حضور میں بھی لگائی بجھائی سے باز نہ آئیں گے۔ جناب عالی' خاکسار فکر مند ہے کہ آپ کی نیک نامی پر اس وجہ سے خواہ مخواہ کوئی دھبہ نہ آئے۔"

میں نے ان کی ڈھارس بندھائی کہ بل تو لاٹ صاحب ہی ادا کریں گے۔ اس وجہ سے کسی پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ البتہ اگر کیمپ کے بندوبست میں کوئی کوتاہی یا خرابی واقع ہوئی تو کچھ عجب نہیں کہ انہیں پنشن سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے۔

عبدالکریم صاحب نے ایک جھرجھری لی اور پھر لنگر لنگوٹ کس کر کیمپ کے انتظام میں جٹ گئے۔ اب کیا تھا۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ اپنی تیس سالہ ملازمت کے دوران وہ جن انتظامی صلاحیتوں کو بچا بچا کر رکھتے آئے تھے' یکایک وہ انہیں اس طرح حرکت میں لے آئے جیسے مداری خالی پٹاری سے پے در پے زندہ کبوتر برآمد کرنے لگتا ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے کیمپ کے سارے ملازموں' خاکروبوں' قلیوں' مالیوں اور بہشتیوں کے لیے نیلے رنگ کی نئی وردیاں سلوائیں۔ وہ زمانہ انگریزوں کے لیے جنگ عظیم کا تاریک دور تھا۔ اپنی قوم کے حوصلے بلند رکھنے کے لیے ونسٹن چرچل نے V (victory) کا نشان عام کر رکھا تھا۔ چرچل کی پیروی میں عبدالکریم خاں نے بھی انگریز مہمانوں کے استقبال کے لیے یہی دلکش خوش کن نشان وسیع پیمانے پر اپنایا۔ نیلی وردیوں کے آگے پیچھے اور کندھوں پر V کے سفید نشان بڑی خوش اسلوبی سے سلے ہوئے تھے۔ ٹوپیوں پر بھی دائیں بائیں یہی نشان تھے۔ رہتاس فورٹ کی دشوار گزار چڑھائی چڑھنے کے لیے میموں کے لیے دلہنوں والی ڈولیاں فراہم کی گئی تھیں۔

ڈولیوں کے کہار بھی سرتاپا V کے نشان والے نئے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ کیمپ میں چاروں طرف بجلی کے سینکڑوں رنگین بلب جا بجا V کی صورت میں آویزاں تھے اور ہر

صبح مہمانوں کے خیموں میں تازہ پھولوں کے جو گلدستے سجائے جاتے تھے' وہ بھی V کی صورت میں بنے ہوتے تھے۔ صبح' شام' دن' دوپہر جس طرف بھی نگاہ اٹھتی تھی' ہر جانب V for Victory کا دلفریب کا نشان ہی غنچہ امید کی طرح کھلا ہوا نظر آتا تھا۔

اس طرح معزز مہمانوں کی ذہنی آسودگی کا خاطر خواہ بندوبست کرنے کے بعد عبدالکریم صاحب نے اپنی توجہ کی لگام ان کے لیے لذت کام و دہن کی طرف موڑی۔ اس میدان میں بھی انہوں نے پیشہ ورانہ مہارت کے ایسے ہاتھ دکھائے' کہ گورنر سے لے کر گورنمنٹ ہاؤس کے بٹلر اور بیرے تک بے اختیار عش عش کر اٹھے۔ کلکتہ سے ایک ٹرین علی الصبح سہسرام سے گزرتی تھی اور دوسری شام کے وقت آتی تھی۔ ہر ٹرین سے عبدالکریم صاحب کا ہرکارا کلکتہ سے تازہ بہ تازہ سامان لے کر صبح و شام بڑی پابندی سے رہتاس فورٹ پہنچ جاتا تھا۔ آرمی اینڈ نیوی سٹور سے کیپر' ہیرنگ' سموکڈ سامن' تازہ بیکٹی' پامفرے اور ہلسا مچھلی' وہاٹ اینڈ لیڈلا سے تازہ مکھن اور پنیر' فرپوز کے کیک اور پیسٹری' گریٹ ایسٹرن کے کولڈ چکن اور اسٹیک' ٹولی گنج مارکٹ کی تازہ سبزیاں اور پھل' شیمپئن کی بوتلیں ٹھنڈی کرنے کے لیے برف کی سلیں -------- اس قسم کی ساری نعمتیں رہتاس فورٹ کے دور افتادہ کیمپ میں روز کے روز ایسی پابندی سے فراہم ہوتی تھیں کہ پٹنہ کے گورنمنٹ ہاؤس کو بھی شاید ہی کبھی نصیب ہوئی ہوں۔ شام پڑتے ہی کیمپ کے کھلے میدان میں لکڑی کے بہت سے بڑے بڑے کندوں کا ڈھیر لگا کر عظیم الشان الاؤ سلگا دیا جاتا تھا۔ ڈنر اور ڈانس کے بعد سب مہمان اپنے ہاتھوں میں شیمپئن کے جام اٹھائے باہر آ جاتے تھے اور کچھ دیر تک الاؤ کے گردا گرد چہل قدمی کرتے تھے۔ محفل برخاست ہونے سے پہلے عبدالکریم خان صاحب کیمپ کے ایک کنارے سے چند راکٹ ہوا میں چھوڑتے تھے' جو انہوں نے پٹنہ کے ایک باکمال آتشباز سے بنوا رکھے تھے۔ راکٹ زوں کر کے چھوٹتے تھے' اور کافی بلندی پر جا کر ٹھاہ کر کے پھٹ جاتے تھے۔ راکٹ پھٹتے ہی ان سے رنگ برنگی پھلجڑیاں کی پھوار برسنے لگتی تھی' جو

بڑی نفاست سے V کی شکلیں بناتی ہوئی رفتہ رفتہ فضا میں تحلیل ہو جاتی تھی۔ یہ روح پرور نظارہ دیکھنے کے بعد ڈنر' ڈانس اور شیمپئن سے گرمائے ہوئے اجسام نفس مطمئنہ کی طرح شاداں و فرحاں اپنے اپنے خیموں کی راہ لیتے تھے۔ ان دنوں انگریزوں کو محاذ جنگ پر شکست پر شکست ہو رہی تھی۔ لیکن عبدالکریم صاحب کے فیض سے ہمارے عزیز مہمانوں کو رہتاس کے خوشنما جنگل میں فتح و نصرت کا منگل ہی منگل دکھائی پڑتا تھا۔

کرسمس کے روز گورنر نے مجھے بھی رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ ڈنر کے بعد باقی مہمان تو باری باری اٹھ کر ڈانس والے خیمے میں چلے گئے لیکن گورنر اور مس میکوین میرے ساتھ کھانے کی میز پر ہی بیٹھے رہے۔

مس میکوین چوڑے چکلے بدن کی قدرے فربہی مائل کافی خوبصورت اور ہنس مکھ خاتون تھی۔ دراصل وہ سر فرانسس موڈی کی مسٹرس تھی' لیکن حفظ مراتب کے خیال سے عرف عام میں اسے گورنر کی بھتیجی ہی کہا جاتا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس کی تقریبات میں وہ اکثر خاتون اول کے فرائض سر انجام دیا کرتی تھی۔ گورنر کے دل اور دفتر دونوں پر ہی اس کی یکساں حکمرانی تھی۔

جب ہم ٹیبل پر اکیلے رہ گئے تو مس میکوین نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ جب سے میں اس کیمپ میں آئی ہوں' مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی فیئری لینڈ میں آ نکلی ہوں۔"

سر فرانسس موڈی بھی مسکرائے اور بولے۔ "اپنی سروس کے ابتدائی دور میں ہم نے بھی کئی گورنروں کے کیمپ بھگتائے ہیں۔ لیکن ایسا شاندار بندوبست تو ہمیں کبھی نہ سوجھا۔ اچھے گورنروں کا قاعدہ ہے کہ جب وہ کسی کام کی تعریف کرتے ہیں' تو ساتھ ہی احتیاطاً اس کے چند نقائص بھی گنوا دیتے ہیں۔ میں نے کوشش تو ضرور کی کہ اس کیمپ کے بھی کچھ نقائص پکڑوں' لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔"

اتنا کہہ کر سر فرانسس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور شرارت سے اپنے چہرے

پر سنجیدگی طاری کر کے کہا۔ ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اچھا گورنر نہیں ہوں' بلکہ اس کا مطلب ہے کہ تم نہایت اچھے ایس ڈی او ہو۔''

میں نے انتہائی خلوص اور سچائی سے گورنر اور مس میکوین کو یقین دلایا کہ کیمپ کے بندوبست میں میرا کوئی عمل دخل نہیں' بلکہ یہ سب کیا دھرا آفیسر انچارج عبدالکریم خاں کے حسن انتظام کا نتیجہ ہے۔

عبدالکریم خاں کا نام سنتے ہی مس میکوین اپنی کرسی سے اچھل پڑی۔ ''سویٹ' سویٹ۔ مسٹر خاں تو کیمپ کی سب خواتین کا ڈارلنگ ہے۔''

مس میکوین کی باتوں سے معلوم ہوا کہ عبدالکریم خاں صاحب کیمپ کی جملہ خواتین کی آنکھ کا تارا بھی بنے ہوئے ہیں۔ دن کے وقت جب مرد بندوقیں لے کر شکار کھیلنے چلے جاتے تھے تو خواتین کی دلبستگی کا سامان کریم صاحب بذات خود فراہم کرتے تھے۔ کبھی ریچھ والا بلایا جاتا ہے' کبھی بندر والا آتا ہے' کبھی سپیرے اپنا کرتب دکھاتے ہیں' کبھی بازیگروں کا تماشا ہوتا ہے۔ کبھی بھانڈ اپنا رنگ جماتے ہیں۔ اس کے علاوہ کریم صاحب نے اردو مثنوی کی طرز پر انگریزی نظم میں ہر میم صاحب کا تفصیلی سراپا بھی تصنیف کر رکھا تھا' جسے وہ ترنم کے ساتھ لہک لہک کر عورتوں کی منڈلی میں بیٹھ کر سنایا کرتے تھے۔ شروع شروع میں تو سب نے یہی سمجھا' کہ یہ بھی ایک پڑھے لکھے مسخرے اور بھانڈ کا سوانگ ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس ڈرامے کے تفنن آمیز اور خندہ انگیز پہلوؤں پر عبدالکریم خاں کے مقصد کی متانت' فطانت اور بے رحم جفاکشی ہی غالب آئی۔ ان بچاری میموں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ان کی زلفوں' پیشانیوں' بھوؤں' آنکھوں' گالوں' ہونٹوں' دانتوں' ٹھوڑیوں' گردنوں' سینوں' بازوؤں' انگلیوں' ناخنوں' کمروں' کولہوں' پنڈلیوں اور ایڑیوں کو فصاحت و بلاغت کے مبالغوں میں بھگو بھگو کر عجیب و غریب تشبیہوں' استعاروں اور تلمیحوں کے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ پائیوریا کے مارے ہوئے مسوڑھوں اور چھائیوں زدہ چہروں والی میموں نے جب سنا کہ ان کے

منہ میں موتی کی لڑیاں اور رخ زیبا پر تازہ گلاب اور چمبیلی کھلی ہوئی ہے تو وہ بے اختیار عبدالکریم خاں کی شائستگی' وفاداری' مستعدی اور انتظامی کارکردگی کا کلمہ پڑھنے لگیں۔

ہر میم نے اپنے اپنے سراپا کی نقل بھی بڑے شوق سے بنوا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔

مس میکوین کے منہ سے یہ تفصیلات سن کر گورنر صاحب مسکرائے' اور بولے۔ "تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایسا جہاندیدہ' کارگزار اور تجربہ کار افسر میسر ہے۔"

"جی ہاں" میں نے موقع غنیمت جان کر مطلب کی بات کہہ دی۔ "لیکن عبدالکریم خاں کی حسن کارکردگی کی مشین ایک بڑے پاور فل ڈائنمو سے چل رہی ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ ریٹائر ہونے سے قبل وہ اپنی ذات کو "خان صاحب" کے خطاب کا اہل ثابت کرتے جائیں۔"

"اگر وہ خطاب کا مستحق نہیں تو میں نہیں جانتی اور کون خطاب کا نام تجویز کیا ہے۔"

مس میکوین نے بڑے جذبے سے کہا۔

"کیا تم نے نئے سال کی آنرز لسٹ کے لیے عبدالکریم خاں کا نام تجویز کیا ہے؟ گورنر نے پوچھا۔

میں نے عذر کیا کہ میں اس سب ڈویژن میں نیا نیا آیا ہوں۔ میرے لیے مناسب نہ تھا کہ میں اس قسم کی کوئی سفارش کرتا۔

"کوئی بات نہیں' کوئی بات نہیں۔" گورنر نے کہا۔ "ابھی وقت ہے' کل صبح تم مجھے اس کے متعلق ایک مناسب سائٹیشن (Cintation) بنا کے بھیج دینا۔"

"تھینک یو ڈارلنگ' تھینک یو ویری مچ" مس میکوین نے اپنے نام نہاد چچا کے گال کو چٹاخ سے چوم کر کہا۔

لوہے کو اس قدر گرم دیکھ کر میں نے لگے ہاتھوں اس پر دوسری ضرب بھی لگا دی' اور گورنر کو مطلع کیا کہ عنقریب ہی میں اس جوہر قابل کی خدمات سے محروم بھی ہو جاؤں گا' کیونکہ عبدالکریم چند ماہ بعد ریٹائر ہونے والے ہیں۔

"اوہ نو' اوہ نو" مس میکوین نے اپنی گردن کو تاسفانہ جھٹکے دے کر کہا۔ "جنگ کے نازم زمانے میں ایسے وفادار افسر کو ہاتھ سے جانے دینا بڑی شرمناک حماقت ہو گی۔"

"مسٹر کریم کی جسمانی صحت کیسی ہے؟" گورنر نے مجھ سے دریافت کیا۔

پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتا' مس میکوین چمک کر بولی۔ "ہی از فٹ ایز اے فڈل ڈارلنگ' ہی از فٹ ایز اے فڈل"

(He is fit as a Fiddle Darling ------- He is fit as a Fiddle)

وہ ہمارے ساتھ دس دس میل بے تکان چلتا ہے اور اونچی اونچی پہاڑیوں پر میمنے کی طرح بے کان ہلائے چڑھ جاتا ہے۔"

تھوڑے سے مزید سوال جواب کے بعد گورنر نے اپنی ڈائری منگوائی اور اس میں اپنے ہاتھ سے یہ یادداشت لکھ لی کہ نئے سال کے اعزازات میں عبدالکریم خاں کو خطاب دینا ہے اور اس کی ملازمت میں دو سال کی توسیع کرنی ہے۔

کرسمس کے دو روز بعد گورنر کا دورہ ختم ہوا' تو میں نے حساب کتاب کی پڑتال کے لیے کیمپ کے کاغذات طلب کئے۔ کیمپ کے اخراجات پر پچیس چھبیس ہزار کی رقم اٹھی تھی۔ لیکن گورنمنٹ ہاؤس کے عملے سے صرف دو ہزار روپے وصول کئے گئے تھے۔

میں نے کاغذات کا پلندا عبدالکریم خاں کے منہ پر دے مارا اور چیخ کر کہا۔ "آخر آپ بھی اسی پرانی تھیلی کے چٹے بٹے نکلے۔ آپ نے تو سینے پر ہاتھ رکھ کے وعدہ کیا تھا کہ میرے حکم کے مطابق آپ پورے اخراجات گورنمنٹ ہاؤس سے وصول کریں گے۔ یا ایں شورا شوری یا ایں بے نمکی۔ کریم صاحب یہ کیا فضول حرکت ہے؟"

عبدالکریم خاں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ انہوں نے ہاتھ باندھ کر سر جھکا لیا اور قسم کھا کر کہا کہ کیمپ کے اخراجات پورا کرنے کے لیے انہوں نے کسی سے ایک پیسہ بھی چندہ نہیں لیا' بلکہ بیوی کا زیور گروی رکھ کر تئیس چوبیس ہزار روپے کی رقم اپنی جیب سے صرف کی ہے۔

"خان صاحب" کے خطاب کی لیلائے آرزو سے ہمکنار ہونے کی دھن میں کریم صاحب

جو پاپڑ بیل رہے تھے' اس پر مجھے غصہ کی بجائے ترس آنے لگا۔ رفتہ رفتہ ترس کا یہ احساس بھی مٹ گیا اور اس کی جگہ حیرت و استعجاب نے لے لی۔ کیونکہ پہلے خطاب اور اس کے بعد ملازمت میں دو سال کی توسیع ملتے ہی خان صاحب کی کایا ہی پلٹ گئی۔ ایک ست الوجود' کام چور' ہمہ وقت پان چبانے' چائے پینے اور میز پر سر ٹکا کر اونگھنے والے عبدالکریم خان نے یکایک ایسا روپ بدلا کہ فرض شناس' مستعدی' دیانتداری اور پبلک کی خدمت گزاری میں وہ اپنے سب ہم منصبوں پر سبقت لے گئے۔ انہوں نے داڑھی بڑھا لی' کوٹ پتلون کی جگہ مولویانہ لباس اختیار کر لیا اور پانچوں نمازیں پابندی سے مسجد میں ادا کرنے لگے۔

چند ماہ بعد ایک روز میں دفتر سے فارغ ہو کر گھر پہنچا ہی تھا کہ ہیڈ اردلی الطاف حسین نے اطلاع دی کہ خان صاحب عبدالکریم خاں تشریف لائے ہیں اور تخلیہ میں کوئی بات بعصیغہ راز عرض کرنا چاہتے ہیں۔

"جناب عالی!" خان صاحب نے اندر آ کر کہا۔ "دنیا کی جتنی کالک ہے وہ تو سمیٹ کر اپنے منہ پر مل ہی چکا ہوں۔ اب جی چاہتا ہے' کہ مرنے سے پہلے کوئی خدمت دین کی بھی کرتا جاؤں۔"

"بڑا مبارک خیال ہے۔" میں نے کہا۔ "در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست"

"جناب عالی' استخارہ کی تو نہیں لیکن آپ کی مدد کی ضرور حاجت ہے۔"

خان صاحب نے بڑی وضاحت سے مجھے آگاہ کیا' کہ مسلم لیگ کی صفوں میں انتشار ڈالنے کے لیے ہندو کانگرس نے ایک نیا ڈھونگ رچایا ہے۔ پٹنہ کے ایک شخص قیوم انصاری نامی کو اکسا کر مومن کانفرنس کا ڈول ڈالا گیا ہے۔ یہ نئی جماعت کانگرس کی ہمنوا ہے اور خاص طور پر نور باف برادری کو بہلا پھسلا کر مسلم لیگ سے توڑنے اور مومن کانفرنس میں شامل کرنے کی سر توڑ کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس صورت حال سے مسلم لیگ کے زعماء خاصے فکر مند ہیں۔ خان لیاقت علی خاں' نواب اسماعیل' اے بی اے' حلیم صاحب اور دیگر مسلم لیگی مشاہیر اس سلسلے میں صوبہ بہار کا دورہ کرنے والے ہیں۔

وہ حضرات سہسرام بھی ضرور تشریف لائیں گے' کیونکہ اس علاقے میں نور بافوں کی بڑی کثیر آبادی ہے۔

"جناب عالی" خان صاحب نے فرمایا۔ "خاکسار کا ارادہ ہے کہ مسلم لیگی وفد کے دورے سے پہلے اس سب ڈویژن کے تمام نور بافوں کو مسلم لیگ کا ممبر بنا ڈالوں۔"

میں نے ہنس کر کہا' کہ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے وہ یہ سیاسی خدمت کیسے سر انجام دے سکتے ہیں؟"

"جناب عالی" خان صاحب نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا۔ "آپ سوت کے کوٹے کی تقسیم اس خاکسار کے سپرد کر دیں۔ باقی میں جانوں اور میرا کام۔"

خان صاحب کا لائحہ عمل ظاہر تھا۔ وہ سوت کا کوٹہ صرف ان نور بافوں کو دیں گے جو مسلم لیگ کے ممبر ہوں گے۔ مومن کانفرنس کے حامی سوت سے محروم رہیں گے۔ ان کی کھڈیاں بیکار ہو جائیں گی۔ ان کا روزگار معطل ہو جائے گا۔

"خان صاحب" میں نے کہا۔ "جو لوگ سوت کے لالچ یا دھونس میں آ کر مسلم لیگ کا ممبر بنیں گے' ان کی ممبری کس کام کی؟"

"جناب عالی" خان صاحب نے جواب دیا۔ "یہ اصولوں یا عقیدوں کی جنگ تھوڑی ہے' اس وقت تو ہندسوں کی لڑائی ہے۔ مسلم لیگیوں کی تعداد گھٹانے کے لیے کانگریس ڈنڈی مار رہی ہے۔ ہم ان کی تعداد بڑھانے کے لیے ڈنڈا مارنے میں حق بجانب ہیں۔"

اس زمانے کے سیاسی پس منظر میں خان صاحب کی بات بڑی وزنی تھی۔ چنانچہ میں نے سوت کی تقسیم کی ذمہ داری بلا تامل ان کے حوالے کر دی۔ خان صاحب عبدالکریم نے یہ ذمہ داری ایسے سلیقے سے نبھائی کہ مومن کانفرنس کے دانت کھٹے کر دیئے۔ چند ہفتے بعد جب مسلم لیگ کے قائدین کا وفد سہسرام سے گزرا تو ساری سب ڈویژن کے ہزاروں نور بافوں نے ان کی شان میں بڑے پر تپاک مظاہرے کیئے۔

چند برس بعد جب مسلم لیگ نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے دیئے

ہوئے خطاب احتجاجاً واپس کر دیں تو عبدالکریم صاحب پنشن پر ریٹائر ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس اپیل پر بلا ہچکچاہٹ لبیک کہا' اور بیوی کا زیور گروی رکھ کر اور فرنگی میموں کے سامنے بھانڈوں کی طرح سوانگ رچا رچا کر حاصل کیا ہوا "خان صاحب" کا خطاب بڑی خوشدلی سے واپس کر دیا۔

سہرام سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر دریائے سون کے کنارے ڈیہری آن سون کا پر فضا قصبہ تھا' جس کے ساتھ دالمیا نگر کی صنعتی بستی ملحق تھی۔ دالمیا نگر میں چینی' سیمنٹ' بسکٹ اور دیگر مصنوعات کی متعدد فیکٹریاں تھیں' جن میں کئی ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ ان کے مالک بھارت کے کروڑ پتی سیٹھ رام کرشن دالمیا تھے۔ وہ خود تو زیادہ تر دہلی اور بمبئی میں رہتے تھے۔ اور دالمیا نگر کا انتظام شانتی پرشاد جین کے سپرد تھا جو سیٹھ دالمیا کی اکلوتی بیٹی کے شوہر تھے۔

دالمیا نگر کے پبلک ریلیشنز یعنی تعلقات عامہ کے نگران ایک جواں سال خوش پوشاک اور خوش گفتار ہندو پریم ناتھ اگروال تھے۔ یہ صاحب لاہور کے ڈی اے وی کالج کے گریجویٹ تھے اور اتوار کے اتوار میرے ساتھ ٹینس کھیلنے اور پنجابی بولنے سہرام آیا جایا کرتے تھے۔

ایک بار دالمیا نگر کی فیکٹریوں کی انتظامیہ اور مزدوروں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ کشیدگی بڑھتے بڑھتے تشدد اور فساد تک نوبت پہنچی جس میں ایک مزدور جان سے مارا گیا۔ حفظ امن کے پیش نظر میں نے فیکٹریاں بند کر کے دالمیا نگر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ جب تک باہمی افہام و تفہیم کے ذریعہ مالک اور مزدور کسی متفقہ صلح نامہ پر دستخط نہیں کرتے' فیکٹریاں بدستور بند رہیں گی۔

فیکٹریوں کا بند ہونا تھا کہ سیٹھ رام کرشن دالمیا اور ان کے داماد شانتی پرشاد جین نے دہلی اور پٹنہ میں اپنے اپنے جیک لگائے اور ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ' جی ایچ کیو' چیف سیکرٹری' کمشنر اور کلکٹر کی جانب سے میرے نام تاروں کا تانتا بندھ گیا' کہ فیکٹریاں بند ہونے کی وجہ سے جنگی ضروریات کی سپلائی میں رخنہ پڑ رہا ہے۔ اس لیے شر پسند مزدوروں

کو گرفتار کر کے تمام فیکٹریاں پولیس کی حفاظت میں فوراً کھول دی جائیں۔ یہ خواہ مخواہ کے احکامات مقامی حالات سے مکمل طور پر لا علمی پر مبنی تھے' اور سیٹھ دالمیا اور ان کے داماد کے یکطرفہ دباؤ کے تحت جاری ہو رہے تھے۔ اس لیے میں نے ان کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

فیکٹریوں کو بند پڑے ہفتہ بھر گزرا تھا کہ ایک روز دالمیا کے پبلک ریلیشنز افسر پریم ناتھ اگروال مجھے ملنے آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بھاری بھر کم بریف کیس تھا اور ساتھ ایک بجی سجائی شوخ و شنگ نوجوان لڑکی تھی۔

چھوٹتے ہی پریم ناتھ اگروال اپنا رونا رونے لگا کہ فیکٹریاں بند ہونے سے دالمیا نگر کو دو ڈھائی لاکھ روپے روزانہ نقصان ہو رہا ہے۔ اگر چندے اور یہی حال رہا تو کمپنی کا دیوالیہ نکل کر رہے گا۔

"آپ ایک بار ہماری ضمانت پر فیکٹریاں کھول دیں۔" پریم ناتھ اگروال نے کہا۔ "ان حرامزادے مزدوروں سے ہم خود نپٹ لیں گے۔"

میں نے سختی سے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ مزدوروں کے ساتھ باضابطہ صلح نامہ کر کے آئیں تو اس کے بعد ہی اس موضوع پر مزید بات چیت ہو سکتی ہے۔ چائے آ گئی تھی۔ میں پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگا تو پریم ناتھ اگروال نے بجلی کی طرح تڑپ کر اپنا بھاری بھر کم بریف کیس میز پر رکھ کے کھول دیا۔ یہ ہزار ہزار روپے کے نوٹوں سے اٹا اٹ بھرا ہوا تھا۔

نوٹوں کی طرف اشارہ کر کے اگروال نے کہا۔ "آپ یہ قبول فرمائیں۔" پھر لڑکی کو میری طرف دھکیل کر کہا۔ "یا یہ قبول فرمائیں ------- لیکن بھگوان کے لیے ہماری فیکٹریاں کھول دیں۔"

چائے دانی میرے ہاتھ میں تھی۔ پیالی میں چائے ڈالنے کی بجائے میں نے ساری چائے دانی پریم ناتھ اگروال کے سر پر انڈیل دی۔ اس کی پنڈلیوں پر اپنے پاؤں سے دو چار ٹھوکریں ماریں۔ پنجابی زبان میں اسے کئی فحش گالیاں دیں۔ اور اپنے ہیڈ اردلی کو بلا

کر زور سے کہا۔ "ان دونوں خبیثوں کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دو۔"

سید الطاف حسین بھی ڈیوٹی کا پابند ہیڈ اردلی تھا۔ اس نے نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس اگروال کو تھما کر اسے کان سے پکڑا اور لڑکی کو ڈنڈے سے دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔

اس روز مجھے ساری رات نیند نہ آئی۔ مجھے رہ رہ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ پریم ناتھ اگروال نے گردن سے پکڑ کر میرا منہ غلاظت کے ڈھیر میں جھونک دیا ہے۔ تمام شب میں اسی ادھیڑ بن میں پیچ و تاب کھاتا رہا کہ اگروال کو آخر یہ خیال کیسے آیا کہ وہ مجھے رشوت دے کر اپنا کام نکال سکتا ہے۔ میں جتنا اپنے آپ کو کریدتا تھا' میری رگ رگ میں احساس کمتری' ندامت اور سبکی کے تعفن پر نالے چھوٹنے لگتے تھے۔ میرے اندر خفت اور خجالت کی پیپ سی بہنے لگی۔ اور گھن اور بدبو کے بھبکے میں میرا وجود نالی میں پڑی ہوئی اوجھڑی کی طرح سڑنے لگا جو دھوپ میں پھول پھول کر پھٹ گئی ہو۔ سپر مارکیٹ میں بکنے والی اشیاء کی طرح کیا انسان کی پیشانی پر بھی قیمتوں کے لیبل چسپاں ہوتے ہیں؟ ہزار ہزار کے نوٹوں سے بھرا ہوا ایک بریف کیس۔ گڑیا کی طرح بنی ٹھنی ایک بے زبان لڑکی۔

چند دنوں میں دالمیا نگر کی انتظامیہ اور مزدوروں کے درمیان صلح صفائی ہو گئی۔ اور ساری فیکٹریاں از سر نو چلنے لگیں۔ اس واقعہ کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ایک روز سیٹھ رام کرشن دالمیا اچانک بہ نفس نفیس میرے دفتر میں آ گئے۔ اس ملاقات کی تقریب انہوں نے یہ بتائی کہ جو لوگ رشوت لیتے ہیں' ان سے ملنے تو ان کے ملازم جایا کرتے ہیں لیکن جو شخص رشوت نہیں لیتا اس سے ملنے کو ان کا اپنا جی چاہتا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے اگلے روز دالمیا نگر میں لنچ پر مدعو کیا۔

لنچ پر ہم دونوں اکیلے تھے۔ سیٹھ صاحب چھوت چھات کے آدمی تھے' اس لیے ہمارے لیے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر الگ الگ تپائیاں لگائی گئیں۔ سیٹھ صاحب کا بھوجن کیلے کے بڑے بڑے پتوں پر پروسا گیا۔ میری تپائی پر ایک گول سنہری تھال میں دس

بارہ خوبصورت کٹوریاں اور طشتریاں تھیں جن میں باوردی ملازم بڑی نفاست سے سبزیاں' دالیں' دہی پوریاں اور مٹھائیاں ڈالتے جاتے تھے۔

کھانے کے دوران سیٹھ دالمیا نے مجھے رشوت لینے اور دینے کے فن پر بڑے محیر العقول قصے سنائے۔

"اب ان برتنوں کو ہی لیجئے جن میں آپ بھوجن کر رہے ہیں۔" سیٹھ صاحب نے میرے تھال کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ان کی قیمت ساٹھ ہزار روپے سے کم نہیں۔ اگر آپ اگروال جی کے سر پر گرم گرم ابلتی ہوئی چائے نہ ڈال چکے ہوتے تو آج چلتے وقت میں ان برتنوں کو آپ کی کار میں رکھوا دیتا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں بھرشٹ ہونے کے بعد اب یہ ہمارے کام کے تو رہے نہیں' اس لیے آپ اپنے ساتھ لے جائیں اور غریب غرباء میں دان پن کر دیں۔"

برتنوں کے حوالے سے سیٹھ دالمیا نے مجھے بتایا کہ کرسمس کے موقع پر جب گورنر نے رہتاس فورٹ پر کیمپ لگایا تو دستور کے مطابق پریم ناتھ اگروال بڑے دن کی ڈالی لے کر وہاں گیا تھا۔ ڈالی میں ایک بڑے سائز کا کیک تھا اور کچھ بادام' کشمش' پستہ اور چھوارے تھے۔ ان سب اشیاء کو بڑی خوبصورتی سے ایک خاص سونے کی طشتری میں سجایا گیا تھا جو ہر سال خاص اسی مقصد کے لیے بنوائی جاتی تھی۔ سر فرانس نے ڈالی قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ کرسمس پر تحفے تحائف قبول کرنا آداب گورنری کے خلاف ہے۔ چنانچہ گورنمنٹ ہاؤس کے تجربہ کار بٹلر نے بندھے بندھائے دستور کے مطابق کیک اور خشک میوے ایک ایلومینیم کی ٹرے میں ڈال کر پریم ناتھ اگروال کو واپس لوٹا دیئے' اور سونے کی طشتری جھاڑ پونچھ کر مس میکوین کے ذاتی سامان میں رکھ دی۔

• نندی گرام اور لارڈ ویول

ایک روز میں اپنے ایک دوست کو لینے سہسرام ریلوے اسٹیشن گیا ہوا تھا۔ کلکتہ سے جو گاڑی آئی وہ مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ فرسٹ' سیکنڈ اور انٹر کلاس میں مارواڑی کا ہجوم تھا' جو اپنا مال و متاع بڑی بڑی پیٹیو میں سنبھالے جاپانی حملہ کے خوف سے کلکتہ سے فرار ہو رہے تھے۔ باقی ڈبوں میں بھوکی پیاسی مخلوق کا ایک جم غفیر چھپکلیوں کی طرح ایک دوسرے سے چمٹا ہوا بیٹھا تھا۔ کھڑکیوں میں پھٹی پھٹی آنکھوں والے بے شمار نڈھال بچے غنودگی کے عالم میں سر ڈھلکائے لٹک رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے گرسنگی و تشنگی کی نقاہت سے مسخ ہو رہے تھے۔ ان کی گردنیں نیم سوختہ شاخوں کی طرح بل کھا کر شانوں پر گری ہوئی تھیں۔ یہ لوگ اپنے دور افتادہ ہرے بھرے گاؤں چھوڑ کر مٹھی بھر چاول کی تلاش میں پہلے کلکتہ آئے تھے' اور پھر کلکتہ سے مایوس ہو کر اب انہیں خود بھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ کس کے پاس جا رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں؟

سارا بنگال ہیبت ناک اور بھیانک قحط کی زد میں آیا ہوا تھا۔ بھوک سے سسک سسک کر جان دینے والوں کی تعداد دوسری جنگ عظیم میں مرنے والوں کی تعداد سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ قحط کے ساتھ ساتھ سمندر میں بھی جوش آیا' اور مغربی بنگال کے ساحلی علاقوں میں جوار بھاٹے کی ایک عظیم لہر سائیکلون کے دوش پر سوار ہو کر کئی میل تک خشکی میں در آئی' اور بے شمار بستیوں' انسانوں اور مویشیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر سمندر کی تہہ میں لے گئی۔

بھوک' افلاس' طوفان اور سیلاب کی بلا ہائے ناگہانی میں گرفتار انسانوں کے حال زار کی خبریں روز بروز اتنی ہولناک ہوتی جا رہی تھیں کہ سہسرام کے دفتر میں بیٹھ کر آرام

و آسائش سے افسری کرنا مجھے ایک جرم عظیم محسوس ہونے لگا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد میں پٹنہ گیا اور گورنر اور چیف سیکرٹری سے درخواست کی کہ مجھے امدادی کام کے سلسلے میں بنگال بھیج دیا جائے۔ پہلے تو انہوں نے سمجھا بجھا کر مجھے اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی کہ تمہارے پاس صوبے کی ایک اہم ڈویژن کا چارج ہے' تمہارا کام بھی تسلی بخش ہے۔ اس لیے تمہارے کیرئیر کے حق میں یہی بہتر ہو گا کہ تم دلجمعی سے یہیں اپنے فرائض سر انجام دیتے رہو۔ لیکن جب میں نے بڑے خلوص سے انہیں یقین دلایا کہ میرا دل واقعی نارمل کام سے اچاٹ ہو گیا ہے تو وہ مان گئے اور میری خدمات عارضی پر بنگال کی صوبائی حکومت کے سپرد کر دی گئیں۔

کلکتہ پہنچ کر جب میں ہوڑہ اسٹیشن پر ٹرین سے اترا تو چاروں طرف بنگال کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ بڑی بڑی کشادہ سڑکیں دودھئی قمقموں کی مہتابی روشنی میں نہائی ہوئی تھیں۔ بازاروں کی دکانیں آراستہ و پیراستہ ساز و سامان سے چمک دمک رہی تھیں۔ نازک اندام بنگالنیں زلفیں لہرائے' جوڑے سجائے' بندیا لگائے بڑے انہماک سے خرید و فروخت میں مصروف تھیں۔ خوش پوش بنگالی مرد کاروں میں' ٹیکسیوں میں' بسوں میں' ٹراموں میں' رکشاؤں میں اور پیدل ہنسی خوشی ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ کچھ اپنے آپ میں مست تھے۔ کچھ اپنے اپنے کام میں مست تھے۔ ان سب کی نگاہوں سے اللہ کی وہ بے شمار مخلوق بالکل اوجھل تھی جو ان کے آگے پیچھے' دائیں بائیں سڑکوں پر' فٹ پاتھوں پر' گلیوں میں' کوچوں میں' میدانوں میں بھوکے پیاسے کیڑے مکوڑوں کی طرح سسک سسک کر رینگ رہی تھی۔ زندگی کے دو مختلف دھارے ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ اس طرح رواں دواں تھے جیسے متوازی خطوط جو آپس میں کبھی نہیں ملتے۔

بنگال کا قحط بلائے ناگہانی کا نتیجہ کم اور حکومت کی بد انتظامی کا نتیجہ زیادہ تھا۔ مشرق بعید میں ملک پر ملک فتح کرنے کے بعد اب جاپانی فوجیں آسام کی سرحد پر ہندوستان کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں۔ کلکتہ اور مدراس پر جاپانی ففتھ کالم کے ایجنٹوں کے اترنے کی

خبریں بھی متواتر پھیل رہی تھیں۔ ۱۹۴۲ء کی Quit India تحریک کے بعد برٹش گورنمنٹ بھی تذبذب میں تھی کہ اگر جاپان نے واقعی حملہ کیا تو خدا جانے مقامی آبادی کس کا ساتھ دے۔ بنگال میں سبھاش چندر بوس کے فارورڈ بلاک کا خاصا اثر تھا۔ اس لیے جاپانی حملے کی صورت میں اس صوبے کی وفاداری کے متعلق حکومت کے ذہن میں بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔ ان تمام خطرات کے پیش نظر حکومت نے ایک طرح کی Policy Scorched Earth کو اپنی حکمت عملی کا حصہ بنا لیا۔ اس پالیسی کے تحت صوبے میں چند بڑے بڑے Procurement Agents مقرر کر دیئے گئے۔ انہوں نے شہروں اور بڑے بڑے میں جگہ جگہ اپنے گودام کھول لئے اور ایڈمنسٹریشن کی مدد سے دھان اور چاول کی ساری فصل سستے داموں خرید خرید کر اپنے گوداموں میں بھرنی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے صوبے کی تقریباً ساری خوراک پروکیورمنٹ ایجنٹوں کے گوداموں میں منتقل ہو گئی۔ یہ ذخیرے زیادہ تر حکومت کی اپنی سول اور ملٹری ضروریات پوری کرنے کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق مستقل احکام یہ تھے کہ جاپانیوں کی پیش قدمی کی صورت میں ان سب کو جلا کر تباہ کر دیا جائے' تا کہ خوراک کا کوئی ذخیرہ دشمنوں کے ہاتھ میں نہ آنے پائے۔

جو تھوڑا بہت چاول پروکیورمنٹ ایجنٹوں کی دسترس سے بچ رہا تھا' اسے مقامی زمینداروں بنیوں اور امیر لوگوں نے دھونس' دھاندلی یا لالچ کے زور سے خرید کر اپنے اپنے ذاتی ذخیروں میں جمع کر لیا۔ رفتہ رفتہ اناج کی منڈیاں بند ہو گئیں' کاشتکاروں کے اثاثے ختم ہو گئے اور زمینداروں اور بنیوں کے چاول کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی۔

شروع شروع میں غریب دیہاتیوں نے چاول کی جگہ ساگ پات پر گزارا کرنا شروع کر دیا۔ پھر وہ درختوں کے پتے ابال ابال کر کھانے لگے۔ گاؤں گاؤں میں بھوک اور موت نے چھاؤنی ڈال دی۔ آدمیوں کی کمریں خمیدہ ہو گئیں۔ عورتوں کی چھاتیاں سوکھ کر مردار گوشت کی طرح لٹکنے لگیں۔ بچوں کی پسلیاں تڑ مڑ کر اندر گھس گئیں اور پیٹ غباروں کی طرح پھول کر باہر نکل آئے۔ اس حالت میں وہ گھبرا کر اپنی ویران جھونپڑیوں

سے باہر نکل آتے تھے۔ باہر سڑک پر آ کر وہ اکیلے نہ رہتے تھے۔ ان کے پیچھے ایک جہان تھا جو امڈتا چلا آ رہا تھا۔ ان میں بچے تھے جو بلکتے ہوئے جا رہے تھے' بوڑھے آدمی جو سسکتے ہوئے جا رہے تھے' عورتیں جو بر سر عام بکتی ہوئی جا رہی تھیں۔ کچھ مر گئے' کچھ لٹ گئے۔ لیکن جو چل سکتے تھے' وہ چلتے رہے۔ جو رینگ سکتے تھے' وہ رینگتے رہے۔ اور ایک آسودہ منزل کا مقناطیس لوہ چون کی طرح سمیٹ کر انہیں اپنی طرف کھینچتا رہا۔ ان کی امیدوں کا کعبہ کلکتہ تھا جہاں اونچے اونچے مکان ہیں' رنگ برنگی دکانیں' موٹے موٹے سیٹھ' جہاں کتوں کو گوشت ملتا ہے' بلیاں دودھ پیتی ہیں' لوگ ناچتے ہیں۔ وہاں چاول بھی تو ہوں گے۔ نیم جان ڈھانچوں کے قافلے در قافلے اسی ایک امید کا سہارا لیے چلتے رہے۔ ان کے تخیل نے کلکتہ کے بلند و بالا مکانوں میں اور سڑکوں پر چاولوں کے بورے ہی بورے بچھا رکھے تھے' جو محض ان کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ خوش آئند ذہنی سراب ان کی ٹوٹی ہوئی کمر میں رسے باندھ کر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ قدم قدم پر گرتے تھے۔ اور ہر نئے موڑ پر ان کی امیدوں کا ہجوم چھما اٹھتا تھا۔ امیدوں کا ہجوم ہی نہیں کلکتہ کی چمکیلی سڑکوں اور تنگ گلیوں میں بھی نیم جان ڈھانچوں کے ہجوم ہی ہجوم تھے' جو سیلاب کے ریلے کی طرح ہر لمحہ بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔

"او ماں چاول ------- او بابا چاول ------- او بابو چاول ------- او دادا چاول -------" لیکن ماں کہاں تھی؟ بابا کہاں تھے؟ اور پھر وہ چاولوں کے بورے کیا ہوئے جو کلکتہ کی سڑکوں پر بکھرے ہوئے تھے؟ یہاں تو دروازوں پر دربان تھے۔ سڑکوں پر موٹریں ------- اور سپاہی۔ یہ بھوکے اور پیاسے لوگ موت سے لڑتے آئے تھے۔ اب کلکتہ پہنچ کر وہ زندگی سے لڑنے لگے۔ وہ نالیوں میں تیرتے ہوئے مونگ پھلی کے چھلکوں اور گوبھی کے پتوں کو نکال کر کھاتے تھے۔ وہ گندگی کے ڈھیروں کو کرید کرید کر اپنا پیٹ بھرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ کارپوریشن کی کوڑے کرکٹ والی گاڑی پر چیلوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے لڑتے تھے' منہ نوچتے تھے۔ بال کھینچتے تھے۔ ان کی لڑائی کتوں

سے ہوتی تھی۔ اور جب وہ نڈھال ہو کر سڑک کے درمیان گر جاتے تھے' تو لال پگڑی والے سپاہیوں کا دستہ انہیں ٹانگوں سے گھسیٹ کر ایک طرف کنارے لگا دیتا تھا' تا کہ سڑک پر چلنے والے سبک رفتار ٹریفک کی آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو۔

شام پڑتے ہی دریائے ہگلی کے ہوتہ برج پر فاقہ زدہ عورتوں اور بچوں کا ایک میلہ سا لگ جاتا تھا۔ اس طویل پل کے دونوں جانب بے شمار مائیں اپنے سہمے ہوئے کمسن بچوں کو گلے سے لگائے آہنی جنگلوں اور محرابوں کے ساتھ قطار در قطار کھڑی ہو جاتی تھیں۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی تھی کہ کوئی کھاتا پیتا خاندان ان کے بچوں کو خرید لے یا مفت اپنے ساتھ لے جائے۔ کبھی کوئی ماں اپنے لخت جگر کو آخری بار سینے سے لگاتی تھی' اور پھر آنکھیں بند کر کے اسے غڑاپ سے دریائے ہگلی میں پھینک دیتی تھی۔ کبھی کوئی عورت اپنے بچوں سمیت خود دریائے میں چھلانگ لگا دیتی تھی۔ ہگلی میں بجرے اور سٹیمر خراماں خراماں چلتے رہتے تھے۔ پل پر دونوں جانب تیز رفتار ٹریفک رواں دواں رہتا تھا۔ اور برٹش حکومت کے لیے ایک اور رات جاپانی حملے کے بغیر خیر و عافیت سے گزر جاتی تھی۔

بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ اس زمانے میں برٹش حکومت کی ذہنی مشغولیت قحط اور سیلاب کے ساتھ نہیں بلکہ تمام تر جاپانی حملے کے امکانات کے ساتھ وابستہ ہے۔ چنانچہ جب میں چیف سیکرٹری کو اپنی حاضری کی رپورٹ دینے رائٹر بلڈنگ پہنچا تو سیکرٹریٹ کی چھت پر دو طیارہ شکن توپیں نصب تھیں اور برآمدوں میں جا بجا بمباری سے بچاؤ کے لیے ریت کی بوریوں کے بنکر بنے ہوئے تھے۔ رائٹرز بلڈنگ کے آس پاس دور دور تک ان بھوکے پیاسے انسانوں کا نام و نشان تک نہ تھا جو کلکتہ کے شہر میں چاروں طرف حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ سیکرٹریٹ کے چھوٹے چھوٹے تاریک کمروں میں بابو نما کالے اور گورے افسر ٹیبل لیمپ جلائے تیز رفتار' بجلی کے پنکھوں کے نیچے اپنی موٹی موٹی گردنیں ایسی فائلوں پر جھکائے بیٹھے تھے جن کا تعلق نہ چاول سے تھا' نہ قحط سے' نہ سیلاب

سے' نہ سائیکلون سے اور نہ جاپان کے متوقع حملے سے۔ میں چیف سیکرٹری کے دفتر میں پہنچا تو ایک افسر نے کھٹ سے میرا پوسٹنگ آرڈر مجھے تھما دیا۔ جو پہلے ہی ٹائپ ہوا پڑا تھا۔ اس حکم کے مطابق مجھے بنگال سیکرٹریٹ میں محکمہ سول سلائز کا انڈر سیکرٹری تعینات کیا گیا تھا۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں بہار چھوڑ کر اس لیے تو نہیں آیا تھا کہ کلکتہ کی رائٹرز بلڈنگ میں بیٹھ کر سیکرٹریٹ کی فائلوں کا پیٹ بھروں۔ انگریز چیف سیکرٹری سے مایوس ہو کر میں سیدھا خواجہ ناظم الدین صاحب کے دفتر میں چلا گیا۔ جو ان دنوں بنگال کے چیف منسٹر تھے' اور ان کے گزارش کی کہ مجھے قحط اور طوفان زدہ علاقے میں کوئی کام دیا جائے۔

خواجہ صاحب بڑے شریف النفس' فرشتہ سیرت لیکن انتظامی امور میں کسی قدر ڈھیلے بزرگ تھے۔ انہوں نے میرا پوسٹنگ آرڈر پڑھا اور بچوں کی سی معصومیت سے سر ہلا کر بولے۔

"چیف سیکرٹری نے تو تمہاری پوسٹنگ کر دی ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟"

میں نے بڑے ادب سے گزارش کی کہ سب کچھ ہو سکتا ہے' کیونکہ وہ صوبے کے وزیر اعلیٰ ہیں۔

خواجہ صاحب کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ "اچھا بیٹھو' میں کوشش کرتا ہوں۔"

میرا خیال تھا کہ خواجہ صاحب چیف سیکرٹری کو اپنے کمرے میں بلا کر کوئی حکم صادر کریں گے۔ لیکن وہ بچارے خود اٹھے' اور بنفس نفیس چیف سیکرٹری کے کمرے سے تشریف لے گئے۔ دس بارہ منٹ کے بعد واپس آئے اور بڑی بے بسی سے سر ہلا کر بولے۔

"وہ نہیں مانتا' تم دو تین ماہ سیکرٹریٹ میں کام کر لو۔ اس کے بعد میں تمہیں کسی متاثرہ علاقے میں بھجوا دوں گا۔"

میرے دل پر خواجہ ناظم الدین کی شرافت اور بے بسی کا یکساں طور پر گہرا اثر ہوا۔ میری ان کے ساتھ پہلے سے کوئی واقفیت نہ تھی اور نہ کسی نے ان کے پاس میری کوئی سفارش کی تھی۔ ایک نہایت جونیئر افسر کی بات اس قدر ہمدردی سے سن کر بذات خود چیف سیکرٹری کے کمرے میں اٹھ کر جانا ہر چیف منسٹر کا کام نہیں۔ اور نفی میں

جواب پا کر اسی طرح چپ چاپ الٹے پاؤں لوٹ آنا بھی ہر چیف منسٹر کا شیوہ نہیں۔
اپنی پوسٹنگ کا یہ حشر دیکھ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ بنگال سیکرٹریٹ میں بے کار وقت ضائع کرنے کی بجائے میرے لیے یہی مناسب ہے کہ میں واپس بہار چلا جاؤں۔ چنانچہ خواجہ ناظم الدین کا شکریہ ادا کرنے اور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے اسی شام میں تھیٹر روڈ پر ان کے گھر چلا گیا۔ اس پر آشوب زمانے میں بھی چیف منسٹر کی قیام گاہ پر کوئی خاص حفاظتی انتظامات نہ تھے۔ باہر ایک لکڑی کے بنچ پر دو سپاہی لاٹھی سے ٹیک لگائے اونگھ سے رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے اتنا بھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو' اور کوٹھی کے اندر کیوں جا رہے ہو؟ اندر ایک ملازم بھی دوسری منزل پر لے گیا' جہاں خواجہ صاحب کھلی چھت پر چاندنی میں بیٹھے تھے۔ خواجہ شہاب الدین اور حسین شہید سہروردی صاحب بھی ان کے پاس تشریف رکھتے تھے۔ دونوں صوبائی وزیر تھے۔ سہروردی صاحب کے پاس سول سپلائز کا محکمہ تھا۔
میری رام کہانی سننے کے بعد سہروردی صاحب نے کچھ سوال جواب کئے۔ اور پھر خواجہ ناظم الدین سے کہا۔ "ایک طرف تو یہ رونا ہے کہ ریلیف کے کام کے لیے افسر نہیں ملتے۔ دوسری طرف جب کوئی افسر والنٹیئر بن کے آتا ہے تو اسے خواہ مخواہ سیکرٹریٹ میں ٹھونسا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے اس نوجوان کو فوراً تملوک بھیج دینا چاہیے۔ وہاں ہمیں اس وقت مسلمان ایس ڈی او کی شدید ضرورت ہے۔"
خواجہ صاحب نے بڑے زور سے اپنا گول مٹول سر اثباتمیں ہلایا' اور فرمایا۔ "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ میرا بھی ایسا ہی خیال ہے۔" پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔ "اُفوہ' بڑا تنگ کرتے ہیں آپ بھی۔ کل صبح سہروردی صاحب کے دفتر میں پہنچ جانا۔ یہ تمہیں چیف سیکرٹری سے نیا آرڈر دلوا دیں گے۔"
سہروردی صاحب مسکرائے اور میرا انٹرویو ختم ہو گیا۔
اگلی صبح دفتر کھلتے ہی میں سہروردی صاحب کے آفس میں حاضر ہو گیا۔ وہ خود گیارہ بجے

کے بعد تشریف لائے۔ پہلے تو انہوں نے مجھے پہچاننے سے صاف انکار کر دیا لیکن جب میں نے رات والی گفتگو کا حوالہ دیا تو انہوں نے مجھے کمرے میں بٹھا لیا۔ کوئی گھنٹہ بھر وہ مختلف کاغذات دیکھتے اور ٹیلیفون پر ٹیلیفون سنتے رہے۔ پھر اچانک میری طرف دیکھا اور حیرت سے بولے۔ "ہاں جناب' تو آپ کیا کام لے کر آئے ہیں؟"

میں نے از سر نو چیف منسٹر کے گھر پر رات والی گفتگو کا حوالہ دینا شروع کیا' تو ان کی یاد فوراً تازہ ہو گئی۔ "اچھا' تو اپنا نام لکھاؤ۔" انہوں نے قلم ہاتھ میں لے کر کہا۔

میں نے ایک ہی سانس میں اپنا پورا نام بول دیا' تو وہ بگڑ گئے۔

"ایسے نہیں بھائی' پتھر نہ لڑھکاؤ۔" سہروردی صاحب نے کہا۔ "دھیرے دھیرے سپیلنگ کر کے بتاؤ۔"

میں نے اپنے نام کے انگریزی میں ہجے کر کے بولنا شروع کیا۔ "کیو یو ڈی آر اے ٹی ..... قدرت"

سہروردی صاحب نے اپنا قلم ہاتھ سے رکھ دیا' اور سر ہلا کر بولے۔ "غلط' سراسر غلط کیو کے بعد ہمیشہ دو حروف علت آنا لازمی ہے۔ تم U کی جگہ ڈبل O استعمال کیا کرو۔ یا Q کی جگہ K سے اپنا نام لکھا کرو۔"

انگریزی زبان کے اس اہم نکتہ کی وضاحت کے بعد سہروردی صاحب نے چیف سیکرٹری سے ٹیلیفون ملایا' اور گرجدار آواز میں تحکمانہ انداز سے انگریزی میں کہا۔ "بہار سے ڈیپوٹیشن پر آنے والا "کیو یو شہاب" میرے پاس بیٹھا ہے۔ چیف منسٹر کی منظوری کے ساتھ ہم اسے آج ہی تملوک بھیج رہے ہیں۔"

چیف سیکرٹری نے غالباً کسی قسم کا احتجاج کیا ہو گا۔ سہروردی صاحب نے خفگی سے آواز بلند کر کے جواب دیا۔ "نو' نو' یہ فیصلہ فائنل ہے۔ پوسٹنگ آرڈر یہاں بھجوا دیجئے۔ ابھی' فوراً ------ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

یہ نادر شاہی حکم صادر کر کے سہروردی صاحب نے اپنا کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر

لٹکا دیا۔ نکٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور دونوں پاؤں ایک تپائی پر رکھ کے اپنی گھومنے والی کرسی میں کمر خمیدہ کر کے بیٹھ گئے۔ پہلے کسی انگریزی گیت کے کچھ الفاظ گنگنائے۔ پھر اسی ٹیون پر سیٹی بجائی' اور اس کے بعد تملوک کی تاریخی حیثیت پر لیکچر شروع کیا۔ چینی سیاح' ہیون سانگ نے اپنے سفر نامے میں اس مقام کا ذکر تمرالپتا کے نام سے کیا ہے۔ کسی زمانے میں یہاں وید پڑھانے کی بہت بڑی پاٹھ شالہ تھی۔ اب بھی کچھ لوگوں کے پاس سنسکرت کی قدیم اور نادر کتابیں موجود ہیں۔ وارن ہیٹنگز اور لارڈ کلائیو نے ان نوادرات کو برٹش میوزیم کے لیے حاصل کرنے کے لیے بہت سے جتن کئے تھے۔ لیکن انہیں پوری کامیابی نہ ہوئی۔

سہروردی صاحب کی عالمانہ تقریر جاری تھی کہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کا ایک انگریز انڈر سیکرٹری دروازے پر دستک دے کر اندر آیا۔ اس نے میری پوسٹنگ کا نیا حکمنامہ سہروردی صاحب کے سپرد کیا' اور مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھورتا ہوا واپس چلا گیا۔

تملوک کلکتہ سے پچاس میل کے فاصلے پر مدنا پور ڈسٹرکٹ کی سب ڈویژن تھی۔ مدنا پور کا ضلع دہشت پسند انقلابیوں کا گڑھ تھا۔ یہاں کے تین انگریز کلکٹر تخریبی عناصر کے ہاتھوں یکے بعد دیگرے قتل ہو چکے تھے۔ اب کی اس دو ساحلی سب ڈویژن' کونٹائی اور تملوک' میں سیلاب' طوفان اور قحط نے قیامت ڈھا رکھی تھی۔

ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ تملوک کا ایک علاقہ تھا جسے نندی گرام کہتے تھے۔ جب سائیکلون آیا تو سمندر کی ایک پہاڑ جیسی اونچی لہر دس بارہ کوس تک خشکی میں گھس آئی اور کوئی ڈیڑھ سو مربع میل کے گنجان آباد رقبے کو صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دی گئی۔ اب یہ سارا علاقہ ایک متعفن دلدل کی صورت اختیار کر چکا ہے' جس میں جا بجا بکھری ہوئی انسانی کھوپڑیوں' مویشیوں کے ڈھانچوں اور گلی سڑی ہوئی مچھلیوں کے علاوہ صرف سانپوں کا بسیرا تھا۔ اس وسیع و عریض دلدل میں انواع و اقسام کے چھوٹے بڑے بے شمار سانپ اس طرح سرسراتے پھرتے تھے جس طرح برسات میں تالاب کے کنارے جھینگروں اور مینڈکوں کا ہجوم تھا۔ خصوصاً رات کے سناٹے میں وہاں کا سماں بڑا

حیرت ناک اور ہیبت ناک ہوتا تھا۔ سمندری لہروں کی شاں شاں کے پس منظر میں سانپوں کے جھمگٹے سے مسلسل ایک پر اسرار ارتعاش بلند ہوتا تھا' جیسے سینکڑوں قلم صیقل

شدہ شیشے کی سطح پر بیک وقت تیز تیز چل رہے ہوں۔ کبھی کبھی کھنکھناتی ہوئی سیٹیاں سی بھی بجتی تھیں' جس کے بعد سارے میدان پر چند لمحوں کے لیے مکمل سناٹا چھا جاتا تھا۔ کبھی کوئی سانپ اندھیرے میں بجلی کی تڑپ کی طرح کوندنے لگتا تھا۔ کبھی کسی جگہ اچانک جگنوؤں کا جھرمٹ سا ٹمٹمانے لگتا تھا۔ سانپوں کی آپس میں لڑائی بھی ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے مقابل آ کر پھنکارتے بھی تھے۔ اور دشمن سے مار کھانے کے بعد دم دبا کر بھاگ جانے کا دستور بھی ان کے ہاں بعینہہ رائج تھا۔

کلکتہ کی ایک فرم کے کچھ نمائندے بھی نندی گرام پہنچے ہوئے تھے۔ یہ کمپنی زندہ سانپوں کا کاروبار کرتی تھی اور خاص خاص قسم کے زہریلے پکڑ کر انہیں یورپ اور امریکہ ایکسپورٹ کیا کرتی تھی۔ ان لوگوں کے پاس سانپ پکڑنے کی عجیب و غریب ترکیبیں تھیں۔ لیکن ان سب کے باوجود انہوں نے ایک ننگ دھڑنگ لنگوٹی پوش جٹا دھاری جوگی بھی اپنے عمل میں شامل کیا ہوا تھا۔ یہ جوگی سوکھی لکڑیوں کا ایک بیضوی الاؤ جلا کر چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اس کے عین بیچ بیٹھ کر سارا دن مالا جپتا رہتا تھا۔ اس کے سامنے دو انسانی کھوپڑیاں پڑی رہتی تھیں۔ ایک میں دودھ کم ہوتا تھا' دوسری میں دیسی شراب۔ شراب تو غالباً وہ خود نوش فرماتا تھا' اور دودھ پر دم کر کے رات کو اس کے جا بجا چھینٹے اڑاتا تھا۔ کہتے ہیں' اس دودھ پر سانپ مکھیوں کی طرح گرتے تھے اور اسے سونگھ یا چکھ کر بے اختیار مدہوش ہو جاتے تھے۔ فرم کے نمائندے ان میں سے اپنی مرضی کے سانپ چھانٹ چھانٹ کر پکڑ لیتے تھے۔

طوفان اور سیلاب کی آفت نندی گرام میں تو زیر زمین دبے ہوئے سانپوں کو کھینچ کر باہر لے آئی تھی' لیکن تملوک کے باقی علاقوں میں قحط کے آلام نے انسان کی فطرت میں سوئے ہوئے سانپوں اور سنپولیوں کو شدت سے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا تھا۔ انسان کے

باطن کا سارا زہر' سارا ظلم' سارا لالچ' ساری حرص و ہوا' ساری خباثت' ساری خود غرضی اور ساری بے رحمی سمندر کی جھاگ کی طرح ابل ابل کر باہر نکل آئی تھی اور اشرف المخلوقات کی شرافت اور نجابت نے دیکھتے ہی دیکھتے بر سر عام بری طرح دم توڑ دیا تھا۔ تملوک کے گاؤں گاؤں میں ایسے گھر آباد تھے جن میں صبح و شام چائے بھی بنتی تھی' بھات بھی ابلتا تھا' مچھلی بھی تلی جاتی تھی' سالن بھی بگھارے جاتے تھے' کھیر بھی پکتی تھی۔ لیکن مٹھی بھر لوگ یہ نعمتیں بند کواڑوں کے پیچھے ہی پیچھے بیٹھ کر ڈکار لیے بغیر ہضم کر جاتے تھے۔ ان آسودہ حال گھرانوں کے آگے پیچھے' دائیں بائیں دور دور تک قطار در قطار ایسے جھونپڑے تھے جن میں ہفتوں اور مہینوں سے چراغ جلا تھا نہ چولہا سلگا تھا۔ ان کے مکین مر چکے تھے یا مر رہے تھے۔ کچھ جھونپڑے بالکل خالی تھے۔ کسی میں ایک آدھ لاش دنوں سے بے گور و کفن پڑی سڑ رہی تھی۔ کہیں پر نیم جاں ہڈیوں کے ڈھانچے اپنے دروازوں سے لگے پیلی پیلی ' گدلی گدلی آنکھیں خلا میں گاڑے' خوشحال گھروں سے آنے والی ابلتے ہوئے چاولوں کی خوشبو سونگھ سونگھ کر تڑپتے تھے' سسکتے تھے' کلبلاتے تھے اور بڑی بے بسی سے موت کا انتظار کرنے لگتے تھے۔ لیکن فاقہ کی موت اتنی ارزاں نہیں کہ آسانی سے ہاتھ آ جائے۔

بنی نوع انسان نے موت کا ذائقہ جن جن طریقوں سے چکھا ہے ان میں بھوک کی موت سب سے زیادہ پر عذاب' کربناک اور اذیت دہ ہے۔ اس میں طائر روح ایک جست میں قفس عنصری سے پرواز نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی کا جوہر رگ رگ اور نس نس سے کشید ہو کر بدن کے پور پور' مسام مسام' روئیں روئیں سے قطرہ قطرہ دنوں اور ہفتوں ٹپکتا رہتا ہے۔ آگ پر رکھے ہوئے بال کی طرح جسم تشنج کے حلقوں میں بٹ جاتا ہے۔ پنڈلی پنڈلی سے لپٹتی ہے۔ بازو بازو سے آویزاں ہوتا ہے۔ ہڈیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح جلد میں ابھر آتی ہیں۔ پسلیاں کمان کی طرح تن جاتی ہیں۔ آنکھیں پتھرا کر گدلائے ہوئے بٹنوں کی طرح پپوٹوں میں جم جاتی ہیں۔ لیکن دل دھڑکتا رہتا ہے' اور دماغ کا

مرکز اعصاب جسم کی ساری روئیداد کو احساس کے پیمانے میں پوری تفصیل سے ریکارڈ کرتا جاتا ہے۔ بھوک میں انسان کا جسم بہت پہلے مر جاتا ہے۔ لیکن اس کا دماغ بڑی دیر تک زندہ رہتا ہے۔ آخری دم تک ذہن کے کسی نہ کسی نہاں خانے میں یہ امید ٹمٹماتی رہتی ہے کہ یہ موت عام قضا کی طرح نہ اٹل ہے نہ لابد ہے' نہ مبرم ہے' نہ ناگریز ہے۔ شاید ابھی کسی ہمسائے کے گھر سے چاولوں کی ایک پلیٹ آ جائے۔ شاید ابھی کوئی راہگیر دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لیے غیب سے نمودار ہو جائے۔ شاید!

راحیل خونڈکر کئی روز سے اسی طرح موت و حیات' امید و بیم کے شکنجے میں جکڑا ہوا اپنی جھونپڑی کے دروازے میں اکیلا پڑا تھا۔ کسی راہگیر یا ہمسائے نے تو اسے دودھ یا چاول لا کر نہیں دیئے تھے' البتہ فرینڈز ایمبولینس یونٹ کی ایک امدادی ٹیم ضرور وہاں آ پہنچی تھی۔ پاؤڈر ملک' گلوکوز کے ڈبوں' بسکٹوں کے پیکٹوں اور وٹامن کی گولیوں سے بھری ہوئی ان کی جیپ دور ایک درخت کے سائے میں کھڑی تھی۔ مسٹر رچرڈ سائمنڈز فلیاہیٹ پہنے' کالا چشمہ لگائے جھونپڑی کے عقب میں گھٹنوں کے بل اس طرح دم سادھے بیٹھا تھا جیسے مچھلی کا شکاری کنڈی لگا کر خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ ایک ناریل کے درخت کی اوٹ میں مس بینکرٹ بھی بائینا کولر آنکھوں سے لگائے جھونپڑی کی طرف ٹکٹکی باندھے بیٹھی تھی۔ جھونپڑی کے قریب ان کا تیسرا ساتھی دبے پاؤں مورچہ جما کر مختلف کیمروں سے کھٹاکھٹ تصویریں کھینچنے میں مشغول تھا۔ راحیل خونڈکر جھونپڑی کے دروازے میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ ابھی مرا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو موم بتی کے پگھلتے ہوئے قطروں کی طرح لٹکے ہوئے تھے' اور ایک گیدڑ اس کے پاؤں کی ایڑی میں دانت گاڑے کچر کچر منہ مار رہا تھا۔ راحیل کی ٹانگوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ گیدڑ کے منہ سے اپنا پاؤں کھینچ لے۔ یہ ایسا نایاب منظر تھا جو امریکی فوٹو گرافر کو کہیں اور ملنا دشوار تھا۔ اس لیے جب میری جیپ کی آواز سن کر گیدڑ بھاگ گیا' تو فرینڈز ایمبولینس یونٹ کی امدادی ٹیم نے بڑا برا منایا اور وہ دیر تک آپس

میں زیر لب بڑبڑاتے رہے۔

فرینڈز ایمبولینس یونٹ کی طرح انٹرنیشنل ریڈ کراس کے امدادی گروپ بھی وقتاً فوقتاً تملوک کے مضافات کا چکر کاٹتے رہتے تھے۔ لیکن ان کا دائرہ کار زیادہ تر غریب خانوں (Houses (Poor کی امداد تک محدود تھا۔

تملوک میں حکومت کی طرف سے مختلف مقامات پر آٹھ غریب خانے کھلے ہوئے تھے۔ ریڈ کراس کی جانب سے ہر غریب خانے کو وقفے وقفے پر دودھ کے ڈبے' گلوکوز' بسکٹ' وٹامن کی گولیاں' صابن اور تیل اچھی خاصی مقدار میں تقسیم ہوتا تھا۔ پوئر ہاؤس کے سپروائزر ان اشیاء کو وصول کر کے بڑی پابندی سے قصبوں اور شہروں کی دکانوں میں فروخت کر ڈالتے تھے۔ ہر پوئر ہاؤس کے رجسٹر میں مکینوں کی تعداد بڑھا چڑھا کر دگنی تگنی درج کی جاتی تھی تا کہ فالتو راشن حکومت سے وصول کر کے باآسانی بلیک مارکیٹ میں بکتا رہے' مکینوں کو بھی ان کی مقررہ مقدار سے کبھی نصف خوراک ملتی تھی' کبھی نصف سے بھی کم۔ چائے' چینی اور دودھ روزانہ وصول ہوتا تھا' لیکن تقسیم اسی روز ہوتا تھا جب کوئی بڑا افسر معائنے پر آیا ہوا ہو۔

غریب خانے میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے بھوک اور افلاس کافی شرط نہ تھے۔ سب سے پہلے گاؤں یا علاقے کا مکھیا' زمیندار یا معزز شہری ایک پرچی جاری کرتا تھا۔ جس میں متاثرہ افراد کی تعداد' نام' ولدیت' سکونت' اخلاقی کردار اور سیاسی رجحان کے کوائف کی تفصیل درج ہوتی تھی۔ اس کے بعد سرکل افسر اس پرچی کی تصدیق کرتا تھا۔ ان دونوں مرحلوں میں تاخیر و تعویق کے بڑے امکان تھے۔ لیکن اگر خوش قسمتی سے کسی خاندان میں کوئی جوان اور قبول صورت لڑکی بھی شامل ہے تو ہر مرحلے پر وہ بڑے موثر پروانہ راہداری کا کام دے سکتی تھی۔ غریب خانے میں داخل ہونے کے بعد بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہی رہتا تھا۔ بچوں اور بوڑھوں کو تو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تھا لیکن سپروائزر سے لے کر سٹور کلرک' اکاؤنٹ کلرک' باورچی' سقہ' مہتر سب اپنی اپنی توفیق کے مطابق جوان عورتوں کی پذیرائی میں منہمک ہو جاتے تھے۔ کوئی انہیں

چوری چوری خوشبو دار صابن کی ٹکیاں دیتا تھا' کوئی دودھ کا ڈبہ' کوئی بسکٹ' کوئی سگریٹ' کوئی وٹامن کی گولیاں ------ غریب خانہ ہو یا راجیل خونڈکر کی جھونپڑی' بھوک کی منڈی میں جسم' جاں اور جنس کا ایک ہی ریٹ تھا۔

ایک روز میں ایک پوُر ہاؤس کا معائنہ کر رہا تھا تو چودہ پندرہ برس کی ایک بے حد حسین و جمیل بچی کو دیکھا' جو اپنی نیم جاں ماں کا سر اپنی گود میں رکھے سب سے الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ اس کا نام نورجہاں تھا۔ اگر اس کے ہاتھ میں دو کبوتر ہوتے اور شہزادہ سلیم اسے دیکھ لیتا تو غریب خانے کی بجائے وہ تاج پہنے کسی محل میں بیٹھی ملکہ عالم کہلاتی۔

پوُر ہاؤس کا سارا عملہ بڑی بے چینی سے اس کی ماں کے مرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کے منہ سے گز گز بھر کی رال ٹپکتے دیکھ کر میں نے ماں بیٹی کو اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالا' اور انہیں قریب کے ایک گاؤں کولا گھاٹ لے گیا۔ وہاں پر ایک کھاتے پیتے مسلمان زمیندار حاجی عبدالرحمٰن رہتے تھے۔ وہ خدمت خلق کے لیے مشہور تھے۔ اور وار فنڈ' ریڈ کراس فنڈ' سیلاب ریلیف فنڈ وغیرہ میں بڑی فیاضی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ ان کی عمر ستر برس سے اوپر تھی۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ اگر وہ ان ماں بیٹی کو اپنے ہاں پناہ دے دیں' تو یہ بڑے ثواب کا عمل ہو گا۔ حاجی صاحب بڑی گرمجوشی سے رضا مند ہو گئے۔ بچاری ماں تو چند روز میں اللہ کو پیاری ہو گئی' اور پھر یہ خبر ملی کہ اس کا چالیسواں کرنے کے بعد حاجی صاحب نے خود نورجہاں سے فی سبیل اللہ نکاح کر لیا ہے۔ اگر حاجی صاحب اس کار خیر میں تاخیر کرتے' تو ان کے کئی بیٹے بھی یہ ثواب کمانے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے بے قرار تھے۔

غریب خانوں کے علاوہ قحط اور طوفان زدہ لوگوں کی مدد کے لیے تملوک میں سیلاب کی روک تھام کے چھ سات بند بھی تعمیر ہو رہے تھے۔ یوں تو ان بندوں کا مقصد سمندری لہروں کو خشکی میں آنے سے روکنا تھا' لیکن دراصل ان بندوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ان کی تعمیر کے بہانے مقامی آبادی کو محنت مزدوری کر کے روزگار کمانے کا موقع

فراہم کیا جائے۔ ان بندوں کی تعمیر کے متعلق بھی عجیب و غریب شکایات سننے میں آتی تھیں۔ ایک روز میں بائیکل پر سوار ہو کے سب سے بڑے بند کا معائنہ کرنے اچانک وہاں پہنچ گیا۔ وہاں پر نہ کسی زیر تعمیر بند کا نام و نشان تھا' نہ کہیں کوئی مزدور کام کر رہے تھے۔ ایک چھولداری میں البتہ ٹھیکیدار کے پاس پی ڈبلیو ڈی کا کچھ عملہ بیٹھا ہوا تاڑی پی رہا تھا۔ مزدوروں کی حاضری کے رجسٹر (Muster Roll) میں ڈیڑھ سو کارندوں کی حاضری کے انگوٹھے بڑی باقاعدگی سے لگے ہوئے تھے' اور اس روز کے لیے ان کی مزدوری کی رقم بھی تقسیم ہو چکی تھی۔ ٹھیکیدار کے عملے میں دو تین شخص ایسے تھے جو پچھلے دو ماہ سے لگاتار فرضی مزدوروں کے نام پر رجسٹر میں ہزاروں جعلی انگوٹھے ثبت کر رہے تھے۔ اس عمل میں ان کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پھٹ کر زخمی ہو چکے تھے۔ باقی کے تمام بندوں پر بھی غبن' خیانت اور بد دیانتی کا کم و بیش ایسا ہی بازار گرم تھا۔

انہی دنوں کلکتہ سے اچانک ایک فوجی افسر کرنل سمتھ تملوک میں وارد ہوا۔ اس کے ساتھ سی آئی ڈی کے دو اینگلو انڈین انسپکٹر بھی تھے۔ انسپکٹر تو ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے اور کرنل سمتھ کو میں نے اپنا مہمان بنا لیا۔ تینوں صبح سویرے اپنی جیپ میں بیٹھ کر نکل جاتے تھے اور کافی دن ڈھلے واپس لوٹتے تھے۔ ایک روز قیامت کی گرمی تھی۔ شام کے وقت کرنل سمتھ اپنی گشت سے واپس آیا تو پسینے میں شرابور تھا۔ وہ اپنے فوجی بوٹ اور اونی جرابیں اتار کر میرے پاس برآمدے میں آیا اور دونوں پاؤں ایک تپائی پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان پسینے اور میل سے جمی ہوئی کیٹ کو مسل مسل کر' کھرچ کھرچ کر دیر تک کریدتا رہا' اور اس کی گولی سی بنا کر منہ میں ڈال لی۔ ایک پاؤں سے فارغ ہو کر اس نے دوسرے پاؤں کی انگلیوں کی کیٹ بھی بڑے اہتمام سے کھرچ کھرچ کر چاٹی اور "ٹو جیم" (Toe Jam) کے جملہ فوائد پر کچھ بے ربط سی تقریر بھی کی۔ اس کے بعد کرنل سمتھ نے نہایت رازداری سے مجھے مطلع کیا کہ وائسرائے ہند لارڈ ویول قحط اور سیلاب زدہ علاقوں

کا دورہ کر رہے ہیں۔ کل دوپہر ساڑھے بارہ بجے کے قریب وہ ہوائی جہاز کے ذریعہ نندی گرام بھی پہنچیں گے۔ ان کے دورے کا انتظام سول افسروں کی ذمہ داری نہیں' بلکہ

یہ سارا بندوبست فوج کے ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کے ہاتھ میں ہے۔ البتہ کل صبح کرنل سمتھ مجھے اپنی جیپ میں نندی گرام ضرور لے جائیں گے' تا کہ وائسرائے کے معائنہ کے وقت میں موقع پر موجود رہوں۔

وہ رات میں نے اپنے گھر میں قریباً قریباً نظر بندی کی حالت میں گزاری۔ سی آئی ڈی کے دونوں اینگلو انڈین انسپکٹر بھی ریسٹ ہاؤس سے میرے ہاں اٹھ آئے تھے۔ منہ سے کچھ کہے بغیر انہوں نے گھر کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میری اور میرے ملازموں کی نقل و حرکت پر کچھ ایسی غیر محسوس سی پابندی عائد ہو گئی کہ نہ ہم کسی سے مل سکتے تھے اور نہ باہر کا کوئی آدمی ہم سے رابطہ قائم کر سکتا تھا۔ غالباً یہ احتیاطی تدابیر وائسرائے کے دورے کو صیغہ راز میں رکھنے کے لیے اختیار کی گئی تھیں۔ کیونکہ تملوک کی سیاست میں دہشت پسندوں کا عنصر نمایاں طور پر غالب تھا۔

اگلے روز جب میں کرنل سمتھ کے ساتھ نندی گرام پہنچا' تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ بہت سے فوجی ٹرک پہلے ہی سے وہاں پہنچے ہوئے تھے اور برٹش فوج کا ایک دستہ حفاظتی پوزیشن لیے باقاعدہ ڈیوٹی پر ایستادہ تھا۔ نندی گرام کے قریب کئی میل لمبا ریتلا سمندری ساحل تھا۔ ایس ڈی او کے ریکارڈ روم میں ایک پرانی مطبوعہ مسل (Printed File) تھی جس میں گورنر جنرل کے طور پر وارن ہیسٹنگز نے حکم دیا تھا کہ اس مقام کو باقاعدہ سمندری سیرگاہ کے طور پر ترقی دی جائے۔ آج اس جگہ سیپرز اور مائنرز (Sapper and Miners) کے کچھ جوانوں نے جہاز اترنے کے لیے ایک ہنگامی ایئر سٹرپ (Air Strip) بھی تیار کر رکھی تھی۔

ٹھیک ساڑھے بارہ بجے فوجی ڈکوٹا آیا۔ وائسرائے کے ہمراہ بنگال کے گورنر ردر فورڈ اور تین فوجی افسر تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے بندوقوں' رائفلوں' ٹامی گنوں اور مشین گنوں کے سائے میں کھڑے ہو کر نندی گرام کی دلدل میں بکھری ہوئی انسانی کھوپڑیوں

اور حیوانی ڈھانچوں کا نظارہ کیا۔ پھر کرنل سمتھ کی قیادت میں معزز مہمان ایک قریبی پوئر ہاؤس میں گئے جس کی تازہ تازہ صفائی ہوئی تھی' اور ساری فضا فینائل اور لسٹرین کی خوشبو سے مہکی ہوئی تھی۔ کچھ بچوں نے وائسرائے کو گیندے کے پھول پیش کئے۔ غریب خانے کے سپروائزر نے کچن کے قریب آج کے کھانے کا نمونہ دکھایا جو چاول' مچھلی اور دہی پر مشتمل تھا۔ سٹور کیپر نے پاؤڈر ملک' گلوکوز' صابن' ٹوتھ پیسٹ' وٹامن کی گولیوں' کپڑوں اور کمبلوں کے اسٹاک دکھائے۔ کچھ بوڑھی عورتوں نے ہاتھ جوڑ کر وائسرائے کو سلام کیا اور غریبوں کے مائی باپ کو زور زور سے کورس میں دعائیں دیں۔

اس کے بعد Procurement Agent کے گودام کی باری آئی۔ ایجنٹ کا نمائندہ اپنے بہی کھاتوں کو ایک اسٹول پر سجائے پہلے سے منتظر تھا۔ گودام میں ڈھائی من دھان کی پانچ ہزار بوریاں تھیں' جو نہایت سلیقے سے ایک دوسری کے اوپر تہہ در تہہ رکھی ہوئی تھیں۔ نمائندے نے دھان کو چوہوں' کیڑے مکوڑوں اور نمی کے اثرات سے بچانے کے لیے حفاظتی اقدامات کی تفصیل بیان کی اور وائسرائے کے ملاحظہ کے لیے ایک گوشوارہ پیش کیا' جس میں بتایا گیا تھا کہ تملوک کی سب ڈویژن میں ان کے گوداموں میں ایک لاکھ بیس ہزار من دھان کا اسٹاک موجود ہے۔ وائسرائے نے نمائندے کو شاباش دی۔

اس کے بعد وائسرائے کی پارٹی ہوائی جہاز کے پاس واپس آ گئی۔ لنچ کا ٹائم ہو گیا تھا۔ ایک فوجی افسر نے ہیلی کاپٹر سے ایک خاصی وزنی پکنک باسکٹ نکالی اور سب نے ناریل کے درختوں کے نیچے کھڑے ہو کر لنچ کیا جو ابلے ہوئے انڈوں' کولڈ چکن' سور کے گوشت کے سینڈوچ' پیسٹری اور برفائی بیئر پر مشتمل تھا۔ ایک افسر نے کسی قدر بے دلی سے مجھے بھی ایک انڈا اور پیسٹری پیش کی' لیکن میں نے معذرت کر لی کیونکہ ماہ رمضان کی وجہ سے میرا روزہ تھا۔

لنچ کے اختتام پر لارڈ ویول نے غالباً ایسے ہی رسمی خوش سگالی کے طور پر مجھ سے دریافت

کیا کہ اس سب ڈویژن کے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے میرے ذہن میں کوئی خاص تجویز ہے؟

موقع غنیمت جان میں نے کھٹ سے اپنی ایک دلپسند تجویز پیش کر دی جسے اس سے پیشتر کلکتہ میں ریلیف کمشنر کے سامنے پیش کر کے میں کئی بار منہ کی کھا چکا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ تملوک کی سب ڈویژن میں جو لاکھ سوا لاکھ من دھان ایجنٹوں کے گوداموں میں مقفل پڑا ہے' اس کا کم از کم نصف حصہ بھوک کے مارے ہوئے نادار لوگوں میں مفت تقسیم کر دیا جائے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ مستحق لوگوں میں مفت تقسیم کر دیا جائے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ مستحق لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سچ مچ کا فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔

میری تجویز سنتے ہی وائسرائے کی پارٹی پر ایک عجیب سی سرد مہری چھا گئی۔ گورنر رور فورڈ نے اپنی آنکھوں کے گوشے سمیٹ کر مجھے ترچھی نظر سے گھورا۔ لارڈ ویول نے اپنی برف جیسی پتھر کی آنکھ میرے چہرے پر بڑی سختی سے گاڑی۔ اور فوجی افسروں نے بے اعتنائی' حقارت اور خفگی کے ملے جلے انداز سے اپنے کندھوں کو اچکایا۔ میری تجویز پر اس خاموش تبصرے کے بعد وائسرائے کی پارٹی تملوک سے رخصت ہو گئی۔

چند ماہ بعد اچانک سمندر کے جوار بھاٹے میں ایک بار پھر جوش اٹھا۔ اور تملوک کی دو ندیوں میں غیر معمولی سیلاب آ گیا۔ ان دو ندیوں کے درمیان آٹھ دس گاؤں آباد تھے' جو چاروں طرف سے پانی میں گھر کر باقی دنیا سے بالکل کٹ گئے۔ پانی کی دھار اس قدر تیز تھی کہ کشتیوں کے ذریعہ بھی گھری ہوئی آبادی تک پہنچنا دشوار تھا۔ رسل و رسائل کے ذرائع منقطع ہوتے ہی وہاں پر فاقے کی موتوں میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ سیلاب سے گھرے ہوئے علاقے میں ایک گودام تھا' جس میں آٹھ ہزار من دھان بوریوں میں بند پڑا تھا۔ میں نے تار پر تار دے کر صوبائی حکومت سے درخواست کی' اس گودام سے کچھ غلہ متاثرہ آبادی میں تقسیم کرنے کی اجازت عطا فرمائی جائے۔

لیکن وہاں سے کوئی جواب آنا تھا نہ آیا۔ ایک روز گودام کے آس پاس تین بچوں اور دو عورتوں کی لاشیں پائی گئیں۔ اب مزید انتظار فضول ہی نہیں بلکہ مجرمانہ غفلت کے مترادف تھا۔ چنانچہ میں نے کانگرس' مسلم لیگ اور فارورڈ بلاک سے ایک ایک نمائندہ چن کر پولیس کی سرکردگی میں گودام کا تالہ تڑوا دیا' اور آدھا دھان ان کے حوالے کر دیا۔ اس کمیٹی نے بڑی محنت اور ایمانداری سے یہ غلہ سیلاب زدہ دیہات کے مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

میں نے اس کمیٹی میں ہندو سبھا کا نمائندہ جان بوجھ کر شامل نہیں کیا تھا۔ اس پر مہا سبھائی لیڈر ڈاکٹر شیام پرشاد مکر جی نے کلکتہ کے اخباروں میں میرے خلاف بڑے سخت بیان دیئے۔ Procurement Agent کے وکیل نے مدنا پور کی سول کورٹ میں میرے خلاف کئی لاکھ روپے کے ہرجانہ کا دعویٰ دائر کر دیا۔ بنگال کے چیف سیکرٹری نے ایک بے حد روکھے سے خط میں مجھے صوبائی حکومت کی بے اطمینانی' ناپسندیدگی اور خفگی سے آگاہ کیا اور میری خدمات صوبہ بہار کو واپس کر دیں۔ بہار کے چیف سیکرٹری نے ایک اسی قدر روکھی ٹیلیگرام کے ذریعہ غالباً سزا کے طور پر میرا تبادلہ اڑیسہ کر دیا۔

مدنا پور کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے زیر اہتمام تملوک سے میری روانگی راتوں رات کچھ اس طرح بعینہ راز عمل میں آئی جیسے کچھ عرصہ قبل لارڈ ویول نے خفیہ طور پر نندی گرام کا دورہ کیا تھا۔ اگلی صبح مسلم لیگ' کانگریس اور فارورڈ بلاک کے والنٹیر اپنے پروگرام کے مطابق ایس ڈی او کی کوٹھی پر میرے تبادلے کے خلاف احتجاجی پکٹنگ کرنے جمع ہو گئے۔ مجھے غیر موجود پا کر وہ مشتعل ہو گئے۔ اور انہوں نے گھر پر حملہ کر دیا۔ میرے سامان میں جو اشیاء پولیس والوں کو پسند آئیں' وہ انہوں نے حملہ آوروں کے نام لگا کر اپنے پاس چن چن کر رکھ لیں اور بچا کھچا اسباب کچھ دنوں کے بعد میرے پاس اڑیسہ روانہ کر دیا۔

• بملا کماری کی بے چین روح

کٹک پہنچ کر میں نے اڑیسہ کے چیف سیکرٹری مسٹر آر ڈبلیو ولیمز کو اپنی آمد کی اطلاع دی تو وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ غالباً اسے تردد تھا کہ جنگ کے زمانے میں خوراک کے ذخیرے کا تالا توڑ کر چار ہزار من دھان بھوکے لوگوں میں مفت تقسیم کرنے والے ایس ڈی او کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ چند روز کی ہیض بیض کے بعد آخر مسٹر ولیمز نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس زمانے میں ایک آئی سی ایس دوسرے آئی سی ایس کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ اور میری پوسٹنگ برہام پور گنجم کے ایس ڈی او اور ساورا ایجنسی کے سب ایجنٹ ٹو گورنر کے طور پر ہو گئی۔

اگرچہ اس علاقے میں مسلمانوں کی آبادی ایک فیصد سے بھی کم تھی' لیکن کسی زمانے میں یہاں مسلمان بادشاہوں کا خزانہ ہوا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے برہام پور کے ساتھ ''گنج عام'' کا لقب لگا ہوا تھا' یہ لقب بگڑ کر گنجم بن گیا تھا۔

برہام پور کے قریب ایک بستی چکاکول نام کی تھی۔ دراصل اس کا اصلی نام ''سکہ کھول'' تھا کیونکہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں یہاں ٹکسال قائم تھی۔

مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے بعد صرف شہروں اور قصبوں کے نام ہی نہیں بگڑے تھے بلکہ برہام پور کے کچھ دور افتادہ علاقوں میں مسلمانوں کی اپنی حالت بھی عبرتناک حد تک ناگفتہ بہ تھی۔ سنگلاخ پہاڑیوں اور خار دار جنگل میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا' جس میں مسلمانوں کے بیس پچیس گھر آباد تھے۔ ان کی معاشرت ہندوانہ اثرات میں اس درجہ ڈوبی ہوئی تھی' کہ رومیش علی' صفدر پانڈے' محمود مہنتی' کلثوم دیوی اور پربھادئی جیسے نام رکھنے کا رواج عام تھا۔ گاؤں میں ایک نہایت مختصر کچی مسجد تھی' جس کے دروازے پر اکثر تالا پڑا رہتا تھا۔ جمعرات کی شام کو دروازے کے باہر ایک مٹی کا دیا جلایا جاتا تھا۔ کچھ لوگ نہا دھو کر آتے تھے اور مسجد کے تالے کو عقیدت

سے چوم کر ہفتہ بھر کے لیے اپنے دینی فرائض سے سبکدوش ہو جاتے تھے۔
ہر دوسرے تیسرے مہینے ایک مولوی صاحب اس گاؤں میں آ کر ایک دو روز کے لیے مسجد کو آباد کر جاتے تھے۔ اس دوران میں اگر کوئی شخص وفات پا گیا ہوتا تو مولوی صاحب اس کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے تھے۔ نوزائیدہ بچوں کے کان میں اذان دیتے تھے۔ کوئی شادی طے ہو گئی ہوتی تو نکاح پڑھوا دیتے تھے۔ بیماروں کو تعویذ لکھ دیتے تھے اور اپنے اگلے دورے تک جانور ذبح کرنے کے لیے چند چھریوں پر تکبیر پڑھ جاتے تھے۔ اس طرح مولوی صاحب کی برکت سے گاؤں والوں کا دین اسلام کے ساتھ ایک کچا سا رشتہ بڑے مضبوط دھاگے کے ساتھ بندھا رہتا تھا۔
برہام پور گنجم کے اس گاؤں کو دیکھ کر زندگی میں پہلی بار میرے دل میں مسجد کے ملا کی عظمت کا کچھ احساس پیدا ہوا۔ ایک زمانے میں ملا اور مولوی کے القاب علم و فضل کی علامت ہوا کرتے تھے۔ لیکن سرکار انگلشیہ کی عملداری میں جیسے جیسے ہماری تعلیم اور ثقافت پر مغربی اقدار کا رنگ و روغن چڑھتا گیا' اسی رفتار سے ملا اور مولوی کا تقدس بھی پامال ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید کہ یہ دونوں تعظیمی اور تکریمی الفاظ تضحیک و تحقیر کی ترکش کے تیر بن گئے۔ داڑھیوں والے ٹوٹھ اور ناخواندہ لوگوں کو مذاق ہی مذاق میں ملا کا لقب ملنے لگا۔ کالجوں' یونیورسٹیوں اور دفتروں میں کوٹ پتلون پہنے بغیر دینی رجحان رکھنے والوں کو طنز و تشنیع کے طور پر مولوی کہا جاتا تھا۔
مسجدوں کے پیش اماموں پر جمعراتی' شبراتی' عیدی' بقر عیدی اور فاتحہ درود پڑھ کر روٹیاں توڑنے والے قل اعوذئے ملاؤں کی پھبتیاں کسی جانے لگیں۔ لو سے جھلسی ہوئی گرم دوپہروں میں خس کی ٹٹیاں لگا کر پنکھوں کے نیچے بیٹھنے والے یہ بھول گئے کہ محلے کی مسجد میں ظہر کی اذان ہر روز عین وقت پر اپنے آپ کس طرح ہوتی رہتی ہے؟ کڑکڑاتے ہوئے جاڑوں میں نرم و گرم لحافوں میں لپٹے ہوئے اجسام کو اس بات پر کبھی حیرت نہ ہوئی کہ اتنی صبح منہ اندھیرے اٹھ کر فجر کی اذان اس قدر پابندی سے کون دے جاتا ہے؟ دن ہو یا رات' آندھی ہو یا طوفان' امن ہو یا فساد' دور ہو یا نزدیک' ہر

زمانے میں شہر شہر' گلی گلی' قریہ قریہ' چھوٹی بڑی' کچی پکی مسجدیں اسی ایک ملا کے دم سے آباد تھیں جو خیرات کے ٹکڑوں پر مدرسوں میں پڑا تھا' اور در بدر کی ٹھوکریں کھا کر گھر بار سے دور کہیں اللہ کے کسی گھر میں سر چھپا کر بیٹھ رہا تھا۔ اس کی پشت پر نہ کوئی تنظیم تھی' نہ کوئی فنڈ تھا' نہ کوئی تحریک تھی۔ اپنوں کی بے اعتنائی' بیگانوں کی مخاصمت' ماحول کی بے حسی اور معاشرے کی کج ادائی کے باوجود اس نے نہ تو اپنی وضع قطع کو بدلا اور نہ اپنے لباس کی مخصوص وردی کو چھوڑا۔ اپنی استعداد اور دوسروں کی توفیق کے مطابق اس نے کہیں دین کی شمع' کہیں دین کا شعلہ' کہیں دین کی چنگاری روشن رکھی۔ برہام پور گنجم کے گاؤں کی طرح جہاں دین کی چنگاری بھی گل ہو چکی تھی' ملا نے اس کی راکھ ہی کو سمیٹ سمیٹ کر باد مخالف کے جھونکوں میں اڑ جانے سے محفوظ رکھا۔ یہ ملا ہی کا فیض تھا کہ کہیں کام کے مسلمان' کہیں نام کے مسلمان' کہیں محض نصف نام کے مسلمان ثابت و سالم و برقرار رہے۔ اور جب سیاسی میدان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی درمیان آبادی کے اعداد و شمار کی جنگ ہوئی تو ان سب کا اندراج مردم شماری کے صحیح کالم میں موجود تھا۔ برصغیر کے مسلمان عموماً اور پاکستان کے مسلمان خصوصاً ملا کے اس احسان عظیم سے کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ جس نے کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی حد تک ان کے تشخص کی بنیاد کو ہر دور اور ہر زمانے میں قائم رکھا۔

مسلمانوں کی اس انتہائی پسماندہ تھوڑی سی تعداد کے علاوہ' برہام پور گنجم میں ایک اور علاقہ تھا جسے ساورا ایجنسی کہا جاتا تھا۔ اس ایجنسی کا نظم و نسق براہ راست گورنر کے ماتحت تھا' اور مقامی ایس ڈی او اس مقصد کے لیے سب ایجنٹ ٹو گورنر کہلاتا تھا۔ ساورا ایجنسی بے حد سنگلاخ پہاڑوں اور انتہائی دشوار گزار جنگلوں کے درمیان واقع تھی۔ بھیل' گونڈ اور دراوڑ جیسے قدیمی قبائل کی طرح یہاں پر ساورا قوم آباد تھی۔ ان کی اپنی زبان تھی' اپنا لباس تھا اور اپنی الگ طرز معاشرت تھی۔ مرد صرف لنگوٹی باندھتے تھے' عورتیں

کمر سے گھٹنوں تک کپڑا لپیٹتی تھیں اور بچے بالکل ننگ دھڑنگ رہتے تھے۔ جو کی روٹی اور شکار کے گوشت پر ان کا گزارا تھا اور پینے کے لیے وہ وسیع پیمانے پر جو کی شراب کشید کرتے تھے۔ ان پراچین لوگوں میں نہ جھوٹ بولنے کی عادت تھی' نہ چوری کا رواج تھا' نہ ڈاکہ زنی کا نہ دھوکہ اور فریب کا۔ ان کی لڑائیاں فقط زن اور زمین پر ہوتی تھیں۔ زر ابھی ان کی زندگی پر مسلط نہیں ہوا تھا' کیونکہ ان کا معاشی نظام چیز کے بدلے چیز کے دلین دین پر مبنی تھا۔

ساورا ایجنسی میں پولیس کی ایک چھوٹی سی چوکی تھی' لیکن اسے کسی واردات میں تفتیش کی زحمت گوارا کرنے کا کبھی موقع ہی نہ ملتا تھا۔ اگر کہیں قتل ہو بھی جاتا تھا تو ملزم مقتول کی گردن کاٹ کر اسے بالوں سے پکڑ کر ہاتھ میں لٹکائے خود پولیس کی چوکی پر حاضر ہو جاتا تھا۔ عدلیہ اور انتظامیہ کے اختیارات سب ایجنٹ ٹو گورنر کے پاس تھے۔ لیکن وکیلوں کو کسی مقدمے میں پیش ہونے کی اجازت نہ تھی۔

وکیلوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے بھی ایجنسی کے داخلہ پر کڑی پابندی تھی۔ سفر کی دشواریوں کے علاوہ ایجنسی کے علاقے کی آب و ہوا ناخوشگوار تھی' زہریلے حشرات الارض کی بھرمار تھی' اور کالا آزاد یرقان اور گردن توڑ بخار جیسی بیماریوں کی وبا عام تھی۔ باہر کے لوگوں میں سے صرف دو شخص ایسے تھے' جو وہاں مدت سے قیام پذیر تھے۔ ایک تو ہسپانوی عیسائی مشنری تھا جو ساورا زبان اور تاریخ کا ماہر تھا اور عرصہ دس برس سے وہاں جم کر بیٹھا ہوا مسیحیت کی تبلیغ میں دل و جان سے مصروف تھا۔ تبلیغ کے ساتھ ساتھ وہ کسی قدر علاج معالجہ بھی کرتا تھا۔ لیکن دس سال کے طویل عرصہ میں وہ صرف چار آدمیوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب ہوا تھا۔ ان میں سے ایک تو ہسپانوی مشنری کا اسسٹنٹ بن کر اس کے ساتھ ہی مقیم تھا۔ باقی تین کلکتہ کے ایک مسیحی ادارے میں مشنری بننے کی ٹریننگ حاصل کر رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً کچھ اسلامی انجمنیں اور آریہ سماجی سنگھٹن بھی اس علاقے میں تبلیغ کرنے کی اجازت مانگتے رہتے تھے' لیکن انگریز گورنر ہمیشہ

انکار کر دیتا تھا۔

باہر کا دوسرا آدمی جو ساورا ایجنسی میں دس پندرہ برس سے قیام پذیر تھا' ایک پنجابی سکھ سردار ہرنام سنگھ تھا۔ اس علاقے میں خود رو کیوڑا کثیر مقدار میں اگتا تھا۔ سردار جی طویل مدت کے لیے اس کا ٹھیکہ لے کر کیوڑے کی تجارت کرتے تھے۔ وہ ساورا زبان بڑی روانی سے بولتے تھے' اور کپڑوں سے بے نیاز کچھرا پہنے' کمر سے کرپان باندھے' کیس کھولے مقامی لوگوں کی طرح ان میں مکمل طور پر گھل مل کر رہتے تھے۔ سردار صاحب نے ساوروں سے شراب کشید کرنے کا راز پا لیا تھا' اور وہ سارا دن ایک مٹکے سے گلاس بھر بھر کر پانی کی طرح جو کی شراب پیتے رہتے تھے۔

ساورا قوم اعتقاداً مظاہر پرست تھی۔ پوجا تو غالباً وہ کسی چیز کی نہ کرتے تھے' لیکن بھوت پریت کے قائل تھے اور سنگ و شجر' آب و آتش' باد و باراں میں روح کی حاضرات پر عقیدہ رکھتے تھے۔ تبت کے لاماؤں کی طرح ان کا روحانی پیشوا بھی بڑی شدید اور کٹھن ریاضتیں کاٹتا تھا۔ اور اپنے باطنی تصرفات سے لوگوں کو علاج معالجہ بھی کرتا تھا' ان کے دل کی مرادیں بھی بر لاتا تھا' موت و حیات کی رسومات بھی نبھاتا تھا' پولیس کی چوکی میں ان کے معاملات کی پیروی بھی کرتا تھا' اور گورنر کے سب ایجنٹ کی عدالت میں ان کے مقدمات کی وکالت بھی کرتا تھا۔

سب ایجنٹ کی حیثیت سے مجھے ہر دوسرے ماہ دس بارہ دن کے لیے ساورا ایجنسی کا دورہ کرنا پڑتا تھا۔ ان دوروں پر ہم بچوں کے لیے رنگ برنگی میٹھی گولیاں' عورتوں کے لیے کانچ کی چوڑیاں' منکوں کے ہار' پیتل اور تانبے کی بالیاں' اور مردوں کے لیے چاقو چھریاں اور ربڑ کے چپل تحفے کے طور پر بانٹنے کے لیے اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ ایجنسی میں سرکاری نرخ پر سالم بکرے کی قیمت دو روپے تھی۔ ایک روپے میں آٹھ مرغیاں آ جاتی تھیں' اور چار آنے میں پچاس انڈے مل جاتے تھے۔ ساورا قبیلے کو ہر بات میں حکومت کا دست نگر رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ انہیں روپے پیسے کی قدر و قیمت سے نا آشنا رکھا جائے۔ چنانچہ ان چیزوں کی تجارت قطعی طور پر ممنوع تھی اور کھانے

پینے کی اشیاء کو ایجنسی سے باہر لانے پر کڑی پابندی تھی۔

ساورا ایجنسی کے طول و عرض میں کوئی سڑک نہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے جنگلی راستے اور

پہاڑی پگڈنڈیاں تھیں' جن پر دورہ کرنے کے لیے مجھے ایک سرکاری ہاتھی ملا ہوا تھا۔
یہ ہاتھی برسہا برس سے اسی خدمت پر مامور تھا اور ہر نئے ایس ڈی او کے ساتھ وہ بڑی جلدی نہایت خوشگوار تعلقات استوار کر لیتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اپنی سونڈ متک پر رکھ کر سلام کرتا تھا اور پھر انعام کے طور پر کسی کھانے کی چیز کا انتظار کرنے لگتا تھا۔ اگر کسی سلام کے بعد اسے اپنا متوقعہ انعام نہ ملے' تو وہ روٹھ جاتا تھا اور اگلی بار سونڈ ماتھے پر رکھنے کی بجائے ایسے ہی بے اعتنائی سے پنڈولم کی طرح ہوا میں گھماتا رہتا تھا۔

ہاتھی پر سوار ہونے کے لیے ہودج کے ساتھ بانس کی ایک چھوٹی سی سیڑھی لٹکتی رہتی تھی۔ لیکن ہاتھی کی اپنی خواہش یہی ہوتی تھی کہ میں اس کی سونڈ کے ساتھ لپٹ جاؤں اور وہ مجھے گیند کی طرح اچھال کر اپنی گردن پر ڈال دے۔ کبھی کبھی اس کی خوشنودی برقرار رکھنے کے لیے ایسا بھی کرنا پڑتا تھا لیکن ہاتھی پر سوار ہونے کا آسان ترین طریقہ یہ تھا کہ ایک آدمی اس کی دم کو بائیں طرف کھینچ کر پائیدان سا بنا لیتا تھا اور دوسرا اس پر قدم رکھ کر پیٹھ پر کود جاتا تھا۔ ایک روز میں ہاتھی پر سوار ساورا ایجنسی کے ایک گھنے جنگل سے گزر رہا تھا' کہ سامنے ایک درخت کے شاخوں سے بڑا موٹا سانپ لٹکتا ہوا دکھائی دیا۔ سانپ کو دیکھتے ہی ہاتھی نے سونڈ اٹھا کر زور کی چیخ ماری اور پھر پیٹھ پھیر کر اس قدر بے تحاشا بھاگا کہ ہمارا ہودہ درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر زمین پر گرنے کے قریب آ گیا۔

ہاتھی جب خوف اور غصے کی حالت میں بھاگ نہ رہا ہو' تو اس کی چال بڑی مستانہ ہوتی ہے۔ اس کے ہچکولوں میں روانی اور تناسب کا ایسا قاعدہ تو اتر ہوتا ہے' کہ مجھے تو اس کی پیٹھ پر بیٹھتے ہی نیند کا خمار چڑھنے لگتا تھا۔ تعجب نہیں کہ راجوں' مہاراجوں اور بادشاہوں

کی یہ پسندیدہ سواری رہی ہے۔ خواب غفلت میں سرشار رہنے کے لیے اس سے بہتر سواری ملنا محال ہے۔ ہاتھی پر بیٹھ کر زمین پر چلنے والی مخلوق واقعی بہت فاصلے پر بڑی بے مایہ' بے حد پست اور نہایت بے حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔

میرا سرکاری ہاتھی اپنے مہاوت کے مقابلہ میں زیادہ عقلمند اور ہوشیار تھا۔ اگر کسی روز مہاوت بے ایمانی سے کام لے کر اس کے راتب میں ڈنڈی مار جاتا تھا' تو وہ اسے اپنی سونڈ کے حلقے میں لے کر جکڑ لیتا تھا۔ ایسے موقع پر ایس ڈی او کو خود آ کر مہاوت کو چھڑانا پڑتا تھا۔ مہاوت ہاتھ جوڑ کر ہاتھی سے معافی مانگتا تھا اور بھاگ کر خوراک کی مقدار پوری کرنے کے لیے ایک ٹوکری میں اضافی راتب لے آتا تھا۔ اپنا پورا راشن وصول کرنے کے بعد ہاتھی مہاوت کے منہ پر کوچی کی طرح سونڈ پھیر کر اس کے ساتھ صلح کر لیتا تھا۔

اس فہیم و سلیم اور خوش مذاق ہاتھی کے ساتھ میری رفاقت بہت کم عرصہ رہی۔ برہام پور گنجم میں ایک سال گزارنے کے بعد میرا تبادلہ کٹک ہو گیا اور اڑیسہ کے سیکرٹریٹ میں مجھے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں پہلے انڈر سیکرٹری اور پھر ڈپٹی سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔

کٹک میں سرکاری رہائش گاہوں کی قلت تھی۔ خصوصاً غیر شادی شدہ افسروں کے لیے سرکاری مکان ملنا محال تھا۔ اس لیے میں کافی عرصہ کٹک کلب کے ایک کمرہ میں مقیم رہا۔ چند ماہ بعد جب صوبے میں کانگرس کی وزارت بر سر اقتدار آئی تو شری ہر کرشن مہتاب چیف منسٹر مقرر ہوئے۔ باقی کئی محکموں کے علاوہ ہوم ڈیپارٹمنٹ بھی ان کے چارج میں تھا۔

شری ہری کرشن مہتاب بڑے خوش مزاج اور خوش اطوار وزیراعلیٰ تھے اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے ذاتی مسائل میں بھی گہری دلچسپی لیا کرتے تھے۔ ایک روز میں چند فائلیں لے کر ان کے پاس گیا' تو انہوں نے میرے مکان کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ کٹک کی سول لائنز میں ایک کوٹھی ہے' جو سالہا سال سے غیر

آباد چلی آ رہی ہے۔ جب کبھی کوئی کوٹھی میں رہائش اختیار کرتا ہے تو چند ہی روز میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ کیونکہ اس گھر کے متعلق مشہور ہے' کہ یہ آسی زدہ ہے۔

مہتاب صاحب نے کہا کہ اگر تم وہمی طبیعت کے مالک نہیں ہو تو بڑی خوشی سے اس بنگلے کو آزما کر دیکھ لو۔

میں کلب میں ایک کمرے کی گھٹن سے تنگ آیا ہوا تھا' اس لیے میں نے فوراً حامی بھر لی اور سول لائنز کی کوٹھی نمبر ۱۸ میرے نام الاٹ ہو گئی۔

یہ ایک ہلکے زرد رنگ کی چھوٹی سی خوشنما کوٹھی تھی جس کے گرد ڈیڑھ دو ایکڑ کا وسیع و عریض لان پھیلا ہوا تھا۔ لان میں گھٹنوں گھٹنوں تک اونچی گھاس اگی ہوئی تھی اور چاروں طرف سوکھے ہوئے کالے پیلے پتوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جا بجا سوکھے ہوے اور تازہ گوبر پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ایک طرف جامن اور آم کے کچھ پیڑ تھے' جن کے نیچے بلیاں اور کتے وقتاً فوقتاً اپنی مخصوص آواز میں رویا کرتے تھے۔ دوسری طرف پیپل کا پرانا درخت تھا' جس کی شاخوں سے بے شمار کالی کالی' بھوری بھوری چمگادڑیں الٹی لٹکی رہتی تھیں۔ کوٹھی کے عقب میں ایک کچا تالاب تھا' جس کے پانی پر سبز کائی کی دبیز تہہ جمی ہوئی تھ اور کناروں پر مینڈکوں' جھینگروں اور دوسرے کیڑوں مکوڑوں کا جم غفیر موجود رہتا تھا۔

کوٹھی سے کوئی ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر باورچی خانہ تھا۔ اسی کے ساتھ دو سرونٹ کوارٹر تھے' جن میں میرا کشمیری خانساماں رمضان اور بنگالی ڈرائیور روز محمد رہتے تھے۔

۱۸ سول لائنز میں ایک ڈرائنگ روم' ایک ڈائننگ روم اور تین بیڈ روم تھے۔ میں نے اپنے استعمال کے لیے جو بیڈ روم منتخب کیا' اس کا ایک دروازہ ڈائننگ روم کی طرف کھلتا تھا۔ دوسرا دروازہ اور ایک کھڑکی برآمدے میں کھلتے تھے جس کے سامنے عقبی لان کا وسیع پھیلاؤ تھا۔ اس بیڈ روم کے ساتھ ایک ڈریسنگ روم اور غسل خانہ بھی ملحق تھا۔

ایک رات میں سب دروازے اور کھڑکی بند کر کے بستر پر لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرے پاس کوئی ٹیبل لیمپ نہ تھا' اور بجلی کا سوئچ پلنگ سے دور والی دیوار پر لگا ہوا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب میں نے کتاب بند کر کے تپائی پر رکھ دی' اور بجلی بجھانے کے لیے اٹھنے لگا تھا کہ پیتل کا سوئچ کھٹاک سے بجا اور بجلی اپنے آپ بجھ گئی۔ میں نے سوچا کہ سوئچ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہو گا۔ اس لیے اس کا بٹن اپنے آپ ہل گیا ہے۔ لیکن پھر خیال آیا' کہ بجلی آف کرنے کے لیے سوئچ بٹن کافی زور سے اوپر کی طرف گھمایا جاتا ہے۔ اگر وہ ڈھیلا ہو گیا ہے' تو اسے نیچے کی طرف گرنا چاہیے تھا۔ وہ خود بخود اوپر کی طرف کیسے اٹھ سکتا ہے؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سوئچ پھر کھٹ سے بجا اور بجلی آن ہو گئی۔ ساتھ ہی ڈرائنگ روم والے بند دروازے پر تین بار دھیمی سے دستک ہوئی جیسے کوئی انگلی بند کر کے اس کے جوڑ سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ڈرائنگ روم بالکل خالی تھا۔ البتہ صوفے کے قریب سفید دھوئیں کا ایک چھلا ضرور نظر آیا جو دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں تحلیل ہو گیا۔ اس چھلے کی ہیئت کچھ اس طرح کی تھی جس طرح کہ سگریٹ کا کش لے کر دھوئیں کے رنگ بنائے جاتے ہیں۔ جس جگہ یہ چھلا ہوا میں معلق تھا' وہاں پر انگریزی سینٹ اور حنا کے عطر کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

اب یہ روز کا معمول ہو گیا' کہ ادھر میں کتاب بند کرتا تھا' ادھر بجلی خود بخود کھٹ سے بجھ جاتی تھی۔ دوسرے تیسرے دن دروازے پر دستک بھی بدستور ہوتی تھی' اور ہر بار دھوئیں کا چھلا پہلے کی نسبت بڑا نظر آتا تھا' اور زیادہ دیر تک قائم رہتا تھا۔ ایک رات میں اپنے بیڈ روم میں آیا' تو میرے سلیپر غائب تھے۔ کافی دیر ڈھونڈتا رہا' لیکن کہیں نہ ملے۔ لیکن جب میں بستر پر لیٹا' تو تکیے سے چرمر چرمر کی آواز آئی۔ اٹھ کر دیکھا تو دونوں سلیپر تکیے کے غلاف کے اندر پڑے تھے۔ سلیپر پہن کر منہ ہاتھ دھونے باتھ روم گیا۔ تو صابن دانی غائب پائی۔ واپس آ کر بستر پر لیٹا تو وہ بھی تکیے کے غلاف

سے برآمد ہوئی۔ صابن دانی غسل خانے میں رکھ کر دوبارہ کمرے میں آیا تو تکیے پر بسکٹوں کا ڈبہ کھلا پڑا تھا جو میرے بیڈ روم کی الماری میں رکھا رہتا تھا۔ دو تین بسکٹ باہر گرے ہوئے تھے۔ میں نے ان بسکٹوں کو اٹھا کر کھا لیا اور ڈبہ الماری میں رکھ کر پلنگ کی طرف مڑا' تو دیکھا کہ تکیے پر سگریٹ کیس کھلا ہوا رکھا ہے جو ڈرائنگ روم کی میز پر مہمانوں کے لیے پڑا رہتا ہے۔ اپنی آٹو میٹک سروس ایجنسی کی اس دل لگی پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں سگریٹ پیتا تو نہ تھا' لیکن سوچا کہ اپنے نادیدہ بامذاق خدمت گزار کر دل خوش کرنے کے لیے آج سگریٹ نوشی میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ میں نے ایک سگریٹ منہ میں رکھا اور ماچس جلائی۔ دیا سلائی کا سلگنا تھا کہ سگریٹ میرے ہونٹوں سے کھنچ کر دور جا پڑا۔ ساتھ ہی ڈرائنگ روم والے دروازے پر وہی مخصوص دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو قریب ہی ریشم کے کپڑے کی سرسراہٹ سنائی دی۔ پھر سفید دھوئیں کا حلقہ تقریباً نصف کمرے میں پھیل گیا۔ سارے کمرے میں بھینی بھینی خوشبو کی پھوار سی برس رہی تھی' اور فضا میں کچھ اس طرح کا ارتعاش لرزاں تھا جیسا کہ فوارہ چلنے سے محسوس ہوتا ہے۔ ان دنوں مجھے موسیقی کا شوق تھا اور اسراج بجانے میں کچھ ریاض بھی کیا تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم کی بتی جلائی تو میری اسراج صوفے کے قریب قالین پر یوں پڑی تھی' جیسے ابھی ابھی کسی نے وہاں لا کر رکھی ہو۔ میں بغیر سوچے سمجھے فرش پر بیٹھ گیا اور اسراج بجانے لگا۔ لیکن تار بالکل Dead تھے۔ ان میں سے کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ چند لمحے ایک عجیب سا بولتا ہوا سناٹا رہا' پھر اچانک ایک زور کا دھماکا ہوا جیسے کمرے میں بارود سے بھرا ہوا گولہ پھٹ گیا۔ سفید دھوئیں کا حلقہ مکڑی کے جالے کے تاروں کی طرح ٹوٹ کا ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اور اس کے ٹکڑے ہوا میں اس طرح کپکپانے لگے جس طرح بادل کی لڑی کا عکس پانی کی متلاطم لہروں میں ٹوٹ ٹوٹ کر لہراتا ہے۔ ساتھ ہی بالکل بند کمرے میں چاروں طرف سے پتھروں اور اینٹوں کی بارش شروع ہو گئی۔ اب میں جہاں کہیں بھی بیٹھتا تھا' میرے

آگے پیچھے' دائیں بائیں پتھر ہی پتھر برستے تھے۔ بستر پر لیٹا تو پلنگ کے ارد گرد سنگ و خشت کا انبار لگ گیا۔ ایک پتھر جو پلنگ کے اوپر میرے عین قریب آ کے گرا' اس کا وزن کئی سیر تھا۔ کمروں کے روشن دان' کھڑکیاں' دروازے سب بند تھے۔ لیکن پتھر بڑے زور سے سنسناتے ہوئے آتے تھے۔ اور میرے بالکل قریب زمین پر گر جاتے تھے۔ خوش قسمتی سے کوئی پتھر مجھے لگتا نہ تھا۔ ورنہ ان میں کچھ اتنے وزنی اور نوکدار ہوتے تھے کہ چند ہی ضربوں میں انسان کی ہڈی پسلی ایک کر دینے کے لیے کافی تھے۔

اس واقعہ کے ساتھ ہی اگلے چند ماہ کے لیے میری زندگی کا ڈھرا بالکل تبدیل ہو گیا۔ آٹو میٹک سروس کی پر لطف آنکھ مچولی بند ہو گئی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر ایک جانی پہچانی شائستہ اور معطر سی دستک بھی موقوف ہو گئی۔ اس غیر مرئی سے ماحول میں ایک عجیب قسم کی لطافت' رفاقت اور ادراکی اشتراک کا جو عنصر تھا اس کی جگہ اب فوق الفطرت' پر اسرار اور ہیبت ناک واقعات کا ایسا تسلسل شروع ہو گیا جسے پوری تفصیل سے بیان کرنا آسان نہیں' اس لیے نمونے کے طور پر فقط چند چیدہ چیدہ اور نسبتاً اہم واقعات ہی درج ذیل کرتا ہوں۔

میرا کشمیری ملازم اور بنگالی ڈرائیور روز محمد عموماً رات کے دس ساڑھے دس بجے کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے تھے' جو کچن کے ساتھ کوٹھی سے دو سو گز کے فاصلے پر واقع تھے۔ ان کے جاتے ہی کارروائی کا آغاز اینٹوں اور پتھروں سے شروع ہو جاتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ اور کمرے کے اندر جو اینٹیں اور پتھر برس رہے ہیں وہ بالکل خشک ہیں۔ صبح سویرے منہ اندھیرے میں اس ملبے کو ٹوکروں کے حساب سے سمیٹ کر لان کے تالاب میں پھینک آتا تھا' تا کہ اس ماجرے کی خبر پا کر رمضان اور ڈرائیور خوفزدہ نہ ہوں۔ یہ کارروائی روزمرہ کا دستور تھی۔

اینٹوں کی بارش کے بعد گھر کے سب دروازے' کھڑکیاں اور روشن دان کھٹ کھٹ

کر کے خود بخود کھل جاتے تھے اور اپنے آپ بند ہو جاتے تھے۔ بند ہوتے وقت دروازوں اور کھڑکیوں کے پٹ ایک دوسرے سے اس زور سے ٹکراتے تھے جیسے شدید آندھی آئی ہوئی ہو۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد یہ عمل کئی مرتبہ دہرایا جاتا تھا۔ گھر کی سب بجلیاں بھی اسی رفتار سے جلتی اور بجھتی رہتی تھیں۔ کبھی کسی کھلے دروازے کو بند کرنے کی کوشش کرتا تو وہ بند نہ ہوتا تھا۔ اور اگر بند دروازے کو کھولنا چاہتا تو وہ کھلتا نہ تھا۔ ایک بند درواز کو کھولنے کے لیے ذرا زیادہ زور لگایا' تو اس کی چوکھٹ اکھڑ کر دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ خود بخود اچھل کر اپنی جگہ فٹ ہو گئی۔

آدھی رات کے قریب میرے ڈرائنگ روم کی چھت چرچرا کر اس طرح بولنے لگتی تھی جیسے اس پر بے حد وزنی بوجھ ڈالا جا رہا ہو۔ کبھی تو یوں محسوس ہونے لگتا تھا' کہ اس بوجھ کے تلے چھت ٹوٹ کر نیچے آ پڑے گی۔ پھر چھت پر ایسی آوازیں ابھرتیں جیسے بہت سے لوگ لکڑی کی کھڑاویں پہنے اچھل کود رہے ہوں۔ ساتھ ہی بڑے بڑے ڈھول دھا دھم اتنا زور سے بجنے لگتے کہ ان کی دھمک سے میرا کمرہ گونج اٹھتا۔ ڈھول کے ساتھ کئی دوسرے ساز بھی بجنا شروع ہو جاتے تھے' جن میں طبلہ' چمٹا' ستار' نفیری اور شہنائی کی آواز خاص طور پر نمایاں ہوتی تھی۔ پھر یکایک سنکھ بجنے لگتا اور دیر تک لگاتار بجتا رہتا۔ رفتہ رفتہ سنکھ کی دلخراش گونج باقی سب آوازوں پر پوری طرح غالب آ جاتی۔

میرے بیڈ روم کے ساتھ عقبی لان کی طرف برآمدہ تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی اور دروازہ برآمدے میں کھلتے تھے۔ رات کے وقت میں دونوں کو بند کر کے اندر سے کنڈی لگا لیتا تھا۔ ایک روز چھت پر سنکھ کی آواز بلند ہوئی تو یوں سنائی دینے لگا جیسے برآمدے کے پکے فرش پر بہت سے شہہ زور گھوڑے بیک وقت سرپٹ بھاگ رہے ہوں۔ سموں کے ٹاپوں کی آواز کے ساتھ ان کی دم کے بالوں کی سرسراہٹ اور نتھنوں سے زور زور سے سانس لینے کی پھڑپھڑاہٹ بھی واضح طور پر سنائی دیتی تھی۔ جب یہ آوازیں

بڑی دیر تک جاری رہیں' تو میں نے کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھول کر برآمدے میں جھانکا۔ وہاں پر گھوڑا تو کوئی نہ تھا' البتہ لال لال انگارہ سی آنکھوں والا الو کی شکل و صورت کا ایک بھاری بھر کم پرندہ پر پھیلائے ہوا میں معلق ہو کر اس طرح ہچکولے کھا رہا تھا جیسے وہ واقعی بھاگتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو۔ میرے جھانکتے ہی وہ اس قدر زور سے چیخا کہ میں نے فوراً کھڑکی بند کر لی۔ کافی دیر تک وہ چیخ برآمدے میں سائرن کی طرح بجتی رہی۔ اور اس کے بعد کچھ عرصہ یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ عجیب الخلقت پرندہ اپنے پنجوں سے کھڑکی کو کرید کرید کر توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ان دنوں میرے پاس ساگوان کی لکڑی کا بہت بڑا ڈائننگ ٹیبل تھا' جس کا وزن ڈیڑھ دو من ہو گا۔ ایک رات کوئی چیز لینے کے لیے میں نے ڈائننگ روم کی الماری کھولی تو ہینڈل سے لپٹا ہوا ایک باریک سانپ بل کھاتا ہوا اچھل کر میرے پاؤں پر آ گرا۔ ساتھ ہی الماری میں رکھے ہوئے چینی کے برتن کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اڑن طشتریوں کی طرح میز پر آ جمع ہوئے۔ اس کے بعد ڈائننگ ٹیبل آہستہ آہستہ ہوا میں اٹھنا شروع ہوا' اور اس قدر بلند ہو گیا کہ اس کے اوپر پڑے ہوئے چینی کے برتن ٹن ٹن کر کے بجلی کے پنکھے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ پنکھے کو چھو کر میز یکلخت دھڑام کر کے فرش پر واپس آ گیا۔ اس کا ایک پایہ میرے بائیں پاؤں کے انگوٹھے پر اس قدر زور سے لگا کہ انگوٹھے کا کچھ حصہ آج تک بالکل بے حس ہے۔

ایک رات میرے کمرے میں اینٹوں اور پتھروں کی جگہ مردار ہڈیاں برسنے لگیں۔ ہڈیوں میں چند انسانی کھوپڑیاں بھی تھیں۔ جا بجا بکھرا ہوا ہڈیوں اور کھوپڑیوں کا یہ انبار اتنا کریہہ المنظر تھا کہ صبح کا انتظار کئے بغیر میں نے انہیں اکٹھا کر کے ایک چادر میں باندھا اور انہیں تالاب میں پھینکنے کے لیے باہر لان میں نکل آیا۔ لان میں پہنچتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے زنجیروں کے گچھے سے میرے دونوں ٹخنوں پر پے در پے زور زور کی ضربیں لگ رہی ہیں۔ تالاب سے اس قسم کی آواز برآمد ہوئی جیسے کوی غوطہ

خور پانی سے باہر ابھرتا ہے۔ ساتھ ہی تالاب کے کنارے سبز کائی میں لپٹا ہوا ایک کالا سیاہ سایہ سا نمودار ہوا' اور خوں خوں کرتا ہوا گوریلے کی طرح میری طرف بڑھنے لگا۔ میں نے ہڈیوں کا گٹھا وہیں پھینکا اور پیٹھ پھیر کر اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں رسیوں کے تانے بانے میں الجھ گئے ہیں۔ برآمدے کے قریب پہنچ کر میں بری طرح لڑکھڑایا' اور منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

اب کھڑا ہونے کی سکت باقی نہ تھی۔ اس لیے میں پیٹ کے بل رینگتا رینگتا بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ میرے ٹخنوں میں شدید سوزش اور جلن ہو رہی تھی' گھٹنے بری طرح چھل گئے تھے۔ اور منہ کے بل گرنے کے باعث ٹھوڑی سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھونے کے لیے میں نے جا کر واش بیسن کا نلکا کھولا تو کچھ دیر سوں سوں کی آواز آتی رہی۔ اس کے بعد یکایک غٹ غٹ کر کے نلکے سے گرم گرم گاڑھے گاڑھے خون کی دھار بہنے لگی۔

ایک رات ہڈیوں کی بوچھاڑ کے بعد یکایک سارے گھر میں ایسا بدبودار تعفن پھیل گیا جیسے غلاظت سے بھرا ہوا گٹر پھٹ گیا۔ کبھی ہوا میں پسی ہوئی مرچوں کی دھانس اٹھنے لگتی تھی۔ کبھی سوجی بھوننے اور ہلدی جلنے کی بو آنے لگتی تھی۔ کبھی سڑی ہوئی مچھلی کی بساند پھیل جاتی تھی۔

ایک بار دن ہو یا رات' میں جو کھانے پینے کی چیز منہ میں ڈالتا تھا اس میں کنکر' مٹی اور ریت کی ملاوٹ ہوتی تھی۔ پھلوں کے اندر بھی کنکر ملتے تھے۔ میں نے ایک کھیلا چھیل کر درمیان سے توڑا تو اس کے اندر جو سیون سی ہوتی ہے' اس میں بھی ریت اس طرح جمی ہوئی تھی جیسے تھرمامیٹر کی نالی میں پارہ بھرا ہوا ہوتا ہے۔

ایک روز آدھی رات کے بعد ڈرائنگ روم میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ڈرائنگ روم میں جانے کے لیے میں نے دروازہ کھولا' تو وہ آدھا کھل کر زور سے بند ہو گیا۔ میں جتنا زور لگاتا تھا' دروازہ تھوڑا سا کھلتا تھا۔ اور پھر لوہے کے سپرنگ کی طرح اچٹ کر بند ہو جاتا تھا۔ آخر میں نے اپنا کندھا دروازے کے ساتھ جوڑ کر پوری قوت سے زور

لگایا' تو میرا دباؤ پڑنے سے پہلے ہی دونوں پٹ آرام سے وا ہو گئے اور میں زور میں بھرا ہوا لڑکھڑاتا ہوا پہلے ایک کرسی سے ٹکرایا اور پھر دھڑام سے قالین پر جا گرا۔ قالین پر سفید چادر میں لپٹی ہوئی انسانی جسم کی طرح کوئی چیز لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کو چھوتے ہی میں تڑپ کر اٹھا' اور بیڈ روم میں واپس آ کر دروازہ بند کر لیا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی ڈیڑھ دو گھنٹے تک متواتر بجتی رہی۔

ایک روز بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ رات کے دو بجے میرے بیڈ روم کے باہر لان میں بائیکل کی گھنٹی بجی اور پھر آواز آئی۔ "تار والا' تار والا' تار والا" میں نے دروازے کی دراڑ سے جھانکا تو واقعی باہر تار والا کھڑا تھا۔ اس نے خاکی وردی پہنی ہوئی تھی۔ سر پر جھالر والی خاکی پگڑی تھی۔ گلے میں چمڑے کا تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ اور وہ سرخ مڈگارڈ والے بائیکل کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس ماحول میں ایک جیتے جاگتے انسان کو اپنے لان میں دیکھ کر میرا دل بڑا مطمئن ہوا۔ میں خوشی خوشی دروازہ کھول کر برآمدے میں آ گیا۔ تار والے نے مجھے سلام کیا۔ اپنی پگڑی میں کان کے اوپر ٹھونسی ہوئی پنسل نکالی اور تھیلے سے تار کی رسید کا فارم نکال کر مجھے دیا۔ میں نے فارم پر دستخط کر کے واپس کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میرے سامنے تار والے کی جگہ انسانی ہڈیوں کا ایک خوفناک ڈھانچہ کھڑا تھا۔ لمبے لمبے ناخنوں والی انگلیوں کی ہڈیوں نے کاغذ اور پنسل میرے ہاتھ سے جھٹکا دے کر کھینچ لیے اور ڈھانچے کا جبڑا کٹ کٹ کر کے اس طرح دانت بجانے لگا جیسے زور زور سے ہنسنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ اس کے بعد کافی دیر تک برآمدے کے پکے فرش پر ہڈیوں کے کھٹکنے اور دروازے پر ناخنوں سے کھرونچے مارنے کی آواز آتی رہی۔

اس قسم کے کچھ کم اور بہت سے ان کے واقعات رات کو ساڑھے دس یا گیارہ بجے شروع ہوتے تھے اور صبح کے ٹھیک تین بجے خود بخود بند ہو جاتے تھے۔ میرے طویل و عریض لان کی گھاس میں بے شمار مینڈکوں اور جھینگروں کا بسیرا تھا۔ شام پڑتے ہی

ان کے ٹرانے کی آواز اور پیپل کے درخت پر الٹی لٹکی ہوئی چمگادڑوں کی چیخ و پکار آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی۔ لیکن جیسے ہی واقعات کا تسلسل شروع ہوتا تھا' پورے لان پر مکمل سکوت چھا جاتا تھا۔ تین بجے کے قریب جب پہلے مینڈک یا جھینگر یا چمگادڑ کی آواز کان میں پڑتی تھی تو میں بھی سکھ کا سانس لیتا تھا کہ چلئے آج کی رات کی منزل بھی طے ہوئی۔

لیکن رات کے یہ چار ساڑھے چار گھنٹے تن تنہا گزارنا بڑی جان جوکھوں کا کام تھا۔ میں بڑی آسانی سے وہ گھر کسی وقت بھی چھوڑ سکتا تھا یا ڈرائیور اور خانساماں کو کوٹھی کے اندر سلا سکتا تھا یا اپنے دوست احباب میں سے کسی کو ہمراز بنا کر اس تجربے میں شریک کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے ایسا کوئی اقدام نہ کیا اور اپنی ذات کو جان بوجھ کر تن تنہا کئی مہینے لگاتار اس کربناک عذاب میں مبتلا رکھا۔ آج چونتیس پینتیس برس گزرنے کے بعد بھی مجھے اپنے اس غیر منطقی رویے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ غالباً یہ میری انا کی احمقانہ ضد تھی' جس نے ان عجیب و غریب واقعات کے چیلنج کو قبول کرنے پر اصرار کیا۔ تفتیش و تجسس کے اس خار زار میں میری تنہا روی محض شوقیہ ہی نہ تھی بلکہ اس کی تہہ میں غالباً یہ خطرہ بھی کار فرما تھا کہ کسی دوسرے کی شراکت سے کہیں بھان متی کا یہ سارا کھیل بالکل ٹھپ ہی نہ ہو جائے۔ اس کا بین ثبوت یہ تھا کہ جب تک میرا ملازم اور ڈرائیور کوٹھی کے اندر موجود رہتے تھے' کسی قسم کا کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہ ہوتا تھا۔ کارروائی کا آغاز ہی اس وقت ہوتا تھا جب وہ دونوں کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے تھے۔

اس سارے عرصہ میں میرا کشمیری ملازم رمضان اور بنگالی ڈرائیور روز محمد مجموعی طور پر ہر طرح کی ابتلا سے محفوظ رہے۔ فقط دو تین بار ان کے ساتھ کچھ ہلکی سی چھیڑ خانی ہوئی۔ ایک رات رمضان اپنے کوارٹر کی کنڈی چڑھا کر اندر سویا ہوا تھا' تو کسی نے

اس کی چارپائی الٹ دی۔ ان دنوں بنگال' بہار کے کچھ حصوں میں بڑے شدید ہندو مسلم فساد ہو رہے تھے۔ رمضان نے یہ سمجھا کہ یہ بھی کسی ہندو کی شرارت ہے۔ اپنے

حملہ آور کا تعاقب کرنے وہ باہر کی طرف بھاگا' تو اندھیرے میں اس کا منہ کھٹاک سے دروازے کے ساتھ ٹکرا گیا کیونکہ کنڈی بدستور اندر سے بند تھی۔

"اگر وہ ہندو باہر سے آیا تھا وہ دروازے کی کنڈی اندر سے کس طرح بند ہو گئی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"صاحب' یہ قوم بڑی چالاک ہے۔" رمضان نے معصومیت سے جواب دیا۔ "اس میں بھی سالے ہندوؤں کی کوئی چال ہو گی۔"

روز محمد ڈرائیور کے کوارٹر میں کبھی کبھار مختلف قسم کی ہڈیاں پڑی ملتی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سب آوارہ بلیوں اور کتوں کی کارستانی ہے' جو دن بھر کوٹھی کے لان میں آزادانہ منڈلاتے رہتے تھے۔ روز محمد اپنے کوارٹر کا دروازہ احتیاط سے بند کر کے رکھا کرتا تھا۔ اس کے سیدھے سادہ دماغ کو اس تشویش نے کبھی پریشان نہ کیا تھا' کہ بلیاں اور کتے بند دروازے سے گزر کر اس کے کمرے میں ہڈیاں کس طرح ڈال آتے ہیں؟

اس ساری ہنگامہ آرائی کا اصلی ہدف صرف ۱۸ نمبر کا بنگلہ تھا۔ رات ڈھلتے ہی یہ کوٹھی میرے لیے خوف و ہراس' عذاب و عتاب کا جہنم بن جاتی تھی۔ ہر نئے واقعہ میں اپنی قسم کی دہشت' اپنی قسم کا ہول' اپنی قسم کی وحشت سمائی ہوتی تھی۔ "پتا کھڑکا' دل دھڑکا" والا مقولہ مجھ پر حرف بہ حرف صادق آتا تھا۔ یوں تو رات بھر ڈر کے مارے میں بار بار پسینے میں شرابور ہوتا ہی رہتا تھا' لیکن کبھی کبھی میرے تن بدن پر خوف و ہیبت کی ایسی تھرتھری' کپکپی اور بدحواسی چھا جاتی تھی۔ کہ نبضیں بیٹھنے لگتی تھیں' دل دھڑکنے لگتا تھا اور دم گھٹ کر گلے میں کانٹے کی طرح پھنس جاتا تھا۔ اس وحشت ناک اور لرزہ خیز ماحول میں میرے پاس خود حفاظتی کا ایک اور صرف ایک ہتھیار تھا۔ وہ ہتھیار کلمہ طیبہ تھا۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

اگر سو برس کا کافر اپنے آخری سانس میں ایمان لا کر صرف ایک بار یہ کلمہ پڑھ لے' تو دوزخ کی آگ سے اس کی نجات ہو جاتی ہے۔ میری مصیبت تو دوزخ کے عذاب سے کہیں کم تھی۔ مشکل صرف یہ تھی کہ اب تک یہ کلمہ میں نے صرف حلق سے پڑھا تھا۔ دل سے پڑھنے کی نہ کبھی توفیق نصیب ہوئی تھی' نہ ضرورت پیش آئی تھی۔ لیکن خوف و ہراس کی شدت میں بڑا مجبور کن اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ اب جو بے کسی و بے بسی کے عالم میں کبھی مجھ پر سانپ گرتا تھا' کبھی میرے پاؤں کا انگوٹھا بھاری میز کے پائے تلے کچلا جاتا ہے' کبھی فرش پر سفید چادر میں لپٹی ہوئی لاش سے ٹکر ہوتی تھی' کبھی چھت چٹخنے لگتی تھی' کبھی پتھر آتے تھے' کبھی اینٹیں برستی تھیں' کبھی انسانی ہڈیوں کا ڈھانچہ سامنے کھڑا ہو کر کٹ کٹ دانت بجاتا تھا۔ اس طرح کے خوف کے دباؤ میں آ کر صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ کبھی کبھی دل سے بھی کلمہ طیبہ کا ورد ہو جاتا تھا۔

ان دنوں میرے پاس ایک چھوٹا سا جاپانی گراموفون تھا جو چابی چڑھا کر بجایا جاتا تھا۔ ایک رات میں نے سہگل کا ایک پسندیدہ ریکارڈ سننے کے لیے گراموفون کو چابی دی تو وہ آگے کی طرف گھومنے کی بجائے سپرنگ کی طرح لچک کر پیچھے کی جانب لوٹ آئی۔ چابی خود ہی اپنے آپ پہلے سے چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے گراموفون پر ریکارڈ رکھ کر چلایا' تو اس میں سے کے ایل سہگل کے گانے کی جگہ عجیب و غریب خوفناک آوازیں آنے لگیں۔ کچھ آوازیں ایسی تھیں جیسے کسی کا گلا گھونٹا جا رہا ہو۔ بیچ بیچ میں عورت کی سسکیاں سنائی دینے لگتی تھیں۔ کبھی کبھی ننھے سے بچے کے رونے کی آواز بھی آتی تھی۔ میں نے ایک کاغذ پر کلمہ طیبہ لکھ کر گراموفون پر رکھا' تو فوراً یہ آوازیں بند ہو گئیں اور ریکارڈ کا اصلی گانا بجنے لگا۔ اب میں کاغذ اٹھاتا تھا تو خوفناک آوازیں شروع ہو جاتی تھیں' واپس رکھتا تھا تو اصلی گانا بجنے لگتا تھا۔ تجربہ کے طور پر میں نے کلمہ طیبہ کا اردو ترجمہ لکھ کر گراموفون پر رکھا تو کوئی اثر نہ ہوا۔ کلمہ

کے الفاظ کو رومن حروف میں لکھ کر رکھا تو پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ کلمہ طیبہ کی یہ تاثیر صرف عربی زبان میں پائی۔

کلمہ طیبہ کے علاوہ میں اپنی تقویت کے لیے آیت الکرسی' سورہ فلق اور سورہ ناس کا ورد بھی اکثر کرتا رہتا تھا۔ ایک رات میرے گرد و پیش ہول و ہیبت کی فضا اپنے نکتہ عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ انتہائی شکستگی' مایوسی' اضطرار کے عالم میں میں نے قرآن شریف کھولا تو سورہ صفت نکلی۔ اس کی ۱۸۲ آیات کا ایک ایک حرف میرے لیے آب حیات کا گھونٹ ثابت ہوا۔ خوف و ہراس کے ماحول میں جب کبھی میں نے اس سورہ کی تلاوت کی' ہر بار تازہ زندگی اور تابندگی پائی۔

کئی ماہ کی لگاتار ہیبت' وحشت اور آسیبیت کی تہہ میں انجام کار یہ راز کھلا کہ اٹھارہ بیس برس پہلے اس گھر میں آئی سی ایس کا ایک اوباش افسر رہا کرتا تھا۔ شادی کا جھانسہ دے کر اس نے الہ آباد میں کالج کی ایک طالبہ بملا کماری کو ورغلایا اور خفیہ طور پر اسے اپنے ساتھ کٹک لے آیا۔ شادی اس نے کرنی تھی نہ کی۔ سات آٹھ ماہ بعد جب بملا ماں بننے کے قریب ہوئی تو ظالم نے اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور لاش کو ڈرائنگ روم کے جنوب مشرقی کونے میں دفن کر دیا۔ اس وقت سے بملا کی نحیف و نزار ماں الہ آباد میں بیٹھی بڑی شدت سے اپنی بیٹی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی وقت سے بملا کماری بھی اس کوشش میں سرگرداں تھی کہ کسی طرح وہ اپنی ماں تک صحیح صورت حال کی خبر پہنچا دے تا کہ انتظار کے اس کربناک عذاب سے اسے نجات حاصل ہو۔ اس کے علاوہ اس کی اپنی خواہش بھی تھی' کہ اس کی ہڈیوں کا ڈھانچہ کھود کر باہر نکالا جائے اور اس کے دھرم کے مطابق اس کا کریا کرم کیا جائے۔ اس عرصہ میں قاتل خود بھی مر چکا تھا' اور اب بملا کی طرف سے پیغام رسانی کی ہر کوشش کو ناکام کرنے میں سرگرم عمل تھا۔

جس روز بملا کی ماں کو اصلی صورت حال کی خبر ملی اور بملا کی بوسیدہ لاش کو چتا میں

رکھ کر جلا دیا گیا' اسی روز ۱۸ سول لائنز کے در و دیوار' سقف و فرش سے آسیب کا سایہ اس طرح اٹھ گیا جیسے آسمان پر چھائے ہوئے بادل یکایک چھٹ جاتے ہیں۔ اس رات نہ مینڈکوں کا ٹرانا بند ہوا۔ نہ جھینگروں کی آواز خاموش ہوئی نہ پیپل کے درخت سے لٹکی ہوئی چمگادڑوں کا شور کم ہوا۔ صبح تین بجے کے قریب اچانک فضا میں لا الہ الا اللہ کی بے حد خوش الحان صدا بلند ہوئی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ آواز مشرق کے افق سے ابھرتی ہے۔ ۱۸ سول لائنز کے اوپر قوس بناتی ہوئی گزرتی ہے اور مغرب کے افق کو جا کر چھوتی ہے۔ تین بار ایسا ہی ہوا اور اس کے بعد اس مکان پر امن اور سکون کا طبعی دور دورہ از سر نو بحال ہو گیا۔

اس عجیب و غریب واقعہ نے ایک طرف تو خوف و ہیبت کے تھپیڑوں سے میرا اچھا خاصا کچومر نکال دیا' اور دوسری طرف اس کی بدولت مجھے حقیقت روح کا قلیل سا ادراک حاصل ہوا۔ مشرق اور مغرب کی تقریباً ہر زبان میں اس موضوع پر بڑا ضخیم لٹریچر پایا جاتا ہے۔ ہر زمانے میں اس پر تائید و تردید' انکار و اقرار' توثیق و تنسیخ' تفتیش و تحقیق کے شدید بحث و مباحثے جاری رہے ہیں۔ ضعیف الاعتقادی اسے عبودیت کے درجے تک پہنچاتی رہی ہے۔ بے اعتقادی اسے مجذوب کی بڑ قرار دیتی ہے۔ اور جدید خود اعتمادی اسے سائنٹیفک فارمولوں میں ڈھال کر ایک ایسی آٹو میٹک مشین بنانے کی فکر میں ہے۔ کہ ادھر بٹن دبایا ادھر مطلوبہ روح کھٹ سے حاضر۔

انگریزی میں اس علم پر سب سے مستند کتاب جو میری نظر سے گزری ہے وہ فریڈرک ڈبلیو ایچ مائرز کی تصنیف "انسانی شخصیت اور جسمانی موت کے بعد اس کی بقا" (Human Personality and Its Survival of Bodily Death) ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۳۶۰ صفحات کی اس کتاب میں سینکڑوں پر اسرار واقعات' حادثات' تجربات اور آثار و شواہد کا منطقی اور سائنسی تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ جسمانی موت کے بعد انسان کی شخصیت کا وہ عنصر باقی رہتا ہے جسے "سپرٹ" کہتے ہیں۔ مصنف کا اسلوب عالمانہ' استدلال علوم جدیدہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور تفصیلات بڑی

معتبر ہیں لیکن ذہنی اور اعتقادی اعتبار سے وہ عیسائیت کے بندھے ہوئے قوانین اور مفروضات سے آزاد نہیں ہو سکا۔

ماڈرن سائنسی دور میں دور سائنسدانوں نے اس علم کے میدان میں کچھ نئی راہیں ہموار کی ہیں۔ سر ولیم کروکس پہلے سائنس دان تھے جنھوں نے مادی دنیا پر مافوق الفطرت روحانی اثرات کا سائنٹیفک مطالعہ اور تجزیہ کیا۔ سر اولیور لاج کی کتاب Raymond بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ ان دونوں کی تحقیق و تجربات پر اس مسلک کی بنیاد پڑی جسے ماڈرن سپریچولزم کے نام سے پکارا جاتا ہے اور جو آج کل مغرب کی دنیا میں بڑے وسیع پیمانے پر زیر مشق ہے۔ ماڈرن سپریچولزم کے اکثر اداروں کی حیثیت تجارتی دکانداری سے زیادہ نہیں۔ حاضرات روح کے شعبے میں دھوکہ بازوں' فریبیوں' ڈھونگیوں اور لپاٹیوں کی گنجائش دوسرے ہر شعبے سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ مغربی سپرچویل اداروں میں عامل و معمول اور پلانچنٹ وغیرہ کے ذرائع سے غیبی پیغامات کی ترسیل و تحصیل زیادہ تر اوہام و وساوس کی ابلہ فریبی ہوتی ہے یا شعوری اور لا شعوری متخیلہ کی کرشمہ سازی نکلتی ہے۔ مشرق میں بھی بہت سے نام نہاد عاملوں اور جھوٹے مدعیوں کا کاروبار بڑے زور شور سے انھی خطوط پر چلتا ہے۔

البتہ موجودہ دور میں پیراسائیکالوجی کے عنوان سے تحقیق و تفتیش کا جو نیا باب کھلا ہے' اس میں نفس انسانی کی نئی نئی اور عجیب و غریب دنیائیں دریافت ہونے کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ انسان کے ظاہر و باطن میں فوق العادت توانائیوں کے جو پر اسرار مخزن پوشیدہ ہیں۔ پیراسائیکالوجی کا مقصد ان کی نشاندہی کرنا اور انھیں کھود' کرید کر دنیاوی ضروریات کے کام میں لانا ہے۔ امریکہ' روس اور ہالینڈ کے علاوہ یورپ کے دوسرے کئی ملکوں میں بھی پیرا سائیکالوجی کے ادارے بڑے اعلیٰ پیمانے پر کام کر رہے ہیں۔ ایٹمی لیبارٹریوں کی طرح پیراسائیکالوجیکل ریسرچ کے بعض پروگرام بھی انتہائی رازداری میں رکھے جاتے ہیں۔ ایک شبہ یہ بھی ہے کہ کچھ بڑی طاقتیں اس سائنس کو اپنے سفارتی تعلقات' بین الاقوامی معاملات اور جنگی انتظامات میں کسی حد تک استعمال بھی کر رہی ہیں۔ یہ احتمال

بعید از قیاس نہیں کہ ایٹمی توانائی کی طرح پیراسائیکالوجی کی ترقی میں بھی انجام کار عالمی سیاست کی آلہ کار بن جائے۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ سے بھی پیراسائیکالوجی کی صلاحیت کار محدود نظر آتی ہے۔ اب تک اس میدان میں جتنی پیش رفت ہوئی ہے' اس میں تفتیش نفس کا تو پورا اہتمام ہے' لیکن تہذیب نفس کا کہیں نام و نشان تک نہیں۔

انسان مشرق میں ہو یا مغرب میں' امیر ہو یا غریب' کالا ہو یا گورا' ترقی یافتہ یا غیر ترقی یافتہ' دیندار ہو یا بے دین' اس کے نفس کے لیے صرف تین حالتیں ہی مقدر ہیں' نفس مطمئنہ' نفس لوامہ اور نفس امارہ۔ اگر پیرا سائیکالوجی کی ترقی زیادہ تر مادی مقاصد کے زیر نگیں رہی تو بلا شبہ یہ ترقی معکوس ثابت ہو گی۔ کیونکہ اس صورت میں روحانیت کی بسیط شاہراہوں پر آگے بڑھنے کی بجائے' یہ جدید سائنس نفس امارہ کے کولہو کا بیل بن جائے گی' جو آنکھوں پر کھوپڑے چڑھا کر ایک ہی تنگ دائرے میں بار بار چکر کاٹنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس ڈگر پر چل کر پیرا سائیکالوجی کی ترقی کا انتہائی کمال یہ ہو گا کہ وہ استدراج کی اس منزل تک رسائی حاصل کر لے جہاں پر جوگی' کاہن' ساحر دوسرے کئی راستوں سے پہنچتے ہی رہتے ہیں۔

مغربی سپرچولزم کی تان زیادہ تر مادہ پرستی پر ٹوٹتی ہے۔ مشرق کی چند اقوام میں روح کا تصور سفلیات کے گنبد میں مقید ہے یا آواگون کے چکر میں سرگرداں ہے۔ اس علم کی علوی صفات صرف اسلامی روایات میں نظر آتی ہیں۔

علامہ حافظ ابن قیم کا رسالہ "کتاب الروح" اس سلسلے کی ایک نہایت مستند دستاویز ہے۔

اس میں مصنف نے حقیقت روح کے ہر پہلو کا قرآن اور حدیث کی روشنی میں جائزہ لے کر بہت سے علمائے سلف کے اقوال و احوال پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس علم پر یہ کتاب ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

عالم اسلام کے بہت سے بزرگان دین اور اولیائے کرام کے حالات اور ملفوظات میں بھی روح کے تصرفات' اتصال' انفصال اور امتثال کے واقعات اور شواہد تواتر کی حد تک

پائے جاتے ہیں۔

راہ سلوک میں سلسلہ اویسیہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔

اسلامی تصوف میں کشف ارواح اور کشف قبور بھی ایک باقاعدہ فن کا درجہ رکھتے ہیں۔

لیکن ان تمام علوم و فنون' تجربات و تصرفات' مشاہدات و نظریات' عملیات و تصورات کے باوجود حقیقت روح کے بارے میں سارے علم' سارے وجدان' سارے عرفان اور سارے ایمان کی آخری حد یہی ہے کہ

"و یسئلونک عن الروح' قل الروح من امر ربی و ما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔"

(اور لوگ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دیں کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے اور نہیں دیئے گئے ہو تم علم سے مگر تھوڑا)

ooo

• پاکستان کا مطلب کیا

اڑیسہ سیکرٹریٹ میں ہوم ڈیپارٹمنٹ کے ڈپٹی سیکرٹری کی حیثیت سے پاسپورٹ جاری کرنے کا کام میری تحویل میں تھا۔ ایک روز میں دفتر سے گھر واپس آیا' تو ادھیڑ عمر کے ایک صاحب برآمدے میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ سہروردی صاحب اب بنگال کے چیف منسٹر تھے' اور وہ ان کا خط لے کر مجھے ملنے آئے تھے۔ ان کا اصلی نام تو کچھ اور تھا لیکن سہروردی صاحب نے انہیں حامد علی کے نام سے موسوم کیا تھا۔

اپنے خط میں سہروردی صاحب نے لکھا تھا' کہ مسٹر حامد علی کلکتہ میں مسلم لیگ کے ایک انڈر گراؤنڈ ورکر ہیں' اور ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں کے تحفظ کے لیے نہایت اہم فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ اب قائداعظم کی اجازت سے انہیں فوری طور پر ایک خفیہ مشن پر مصر بھیجنا مقصود ہے۔ لیکن پاسپورٹ کی مشکل درپیش ہے' کیونکہ مسٹر حامد علی کا نام حکومت کی بلیک لسٹ میں درج ہے۔ تملوک میں میرے چاول کا گودام توڑنے کی طرف مزاحاً اشارہ کر کے سہروردی صاحب نے لکھا تھا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ غیر قانونی حرکات کا تمہیں عملی تجربہ حاصل ہے اس لیے میں حامد علی کو تمہارے پاس بغیر کسی معذرت کے بھیج رہا ہوں۔''

میں نے اس سہ ماہی کی آل انڈیا سول لسٹ اٹھا کر دیکھی تو اس بات پر حیرت ہوئی کہ اس وقت ہندوستان بھر میں اڑیسہ ہی کا سیکرٹریٹ تھا جس میں ایک مسلمان ڈپٹی سیکرٹری کے پاس پاسپورٹ جاری کرنے کا پورا اختیار تھا۔ اس انوکھے حسن اتفاق سے فائدہ اٹھا کر اگلے روز میں نے مسٹر حامد علی کا پاسپورٹ بنا کر ان کے حوالے کیا' اور سہروردی صاحب کے نام صرف اتنا پیغام لکھ بھیجا۔

Order Obeyed, Law Broken

اس فقرے میں کلکتہ کے بنگالی اخبار ''امرت بازار پتریکا'' کے ایک اڈیٹوریل کی طرف

اشارہ تھا‘ جس میں مسٹر سہروردی پر یہ پھبتی کسی گئی تھی‘ کہ ہندو مسلم فسادات میں بنگال کے چیف منسٹر کا فرض منصبی صرف اتنا رہ گیا ہے کہ مسلمان بے روک ٹوک قانون شکنی کرتے رہیں‘ پولیس بے چوں و چراں‘ وزیر اعلیٰ کا حکم مانتی رہے اور ہندو بے دریغ قتل ہوتے رہیں۔

مسٹر حامد علی جتنا وقت پاسپورٹ بنوانے کی خاطر کٹک میں ٹھہرے‘ ان کے منہ سے بار بار بس ایک ہی بات نکلتی تھی۔ وہ یہ کہ ہندوستان بھر میں کانگریس‘ ہندو مہا سبھا‘ راشٹریہ سیوک سنگ‘ اکالی دل‘ اور کئی دوسرے ہندو اور سکھ اداروں کی سرپرستی میں بڑے وسیع پیمانے پر مہلک ہتھیار جمع کئے جا رہے ہیں جو یقیناً نہتے مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے جائیں گے۔ ان ہتھیاروں کی فراہمی کے لیے بہت سے ہندو اور سکھ راجے اور مہاراجے بڑی فراخدلی سے چندہ دے رہے ہیں۔ ان میں مہاراجہ پٹیالہ کا نام سر فہرست ہے۔

پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ مسٹر حامد علی جذبات کی رو میں بہہ کر مبالغہ سے کام لے رہے ہیں۔ لیکن بہت جلد مجھے اس بات کا بین ثبوت مل گیا کہ آل انڈیا کانگرس جیسی بزعم خود نیشنلسٹ سیاسی جماعت بھی مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بندی میں بری طرح ملوث ہے۔

اڑیسہ کے چیف منسٹر شری ہری کرشن و مہتاب کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ ایک بار دہلی سے وہ کانگرس کی کسی میٹنگ سے واپس آئے‘ تو اپنے معمول کے مطابق انہوں نے کاغذات کی کالی صندوقچی میرے حوالے کر دی۔ ہمارا طریق کار یہ تھا کہ سیاسی کاغذات چھانٹ کر میں ان کے پرسنل پرائیویٹ سیکرٹری کے سپرد کر دیتا تھا‘ اور سرکاری کاغذات متعلقہ محکموں کو بھیج دیتا تھا۔ ان کا پرسنل پرائیویٹ سیکرٹری بڑا متعصب ہندو تھا۔ وہ اکثر اس بات پر سر پیٹتا تھا کہ مہتاب صاحب کے سیاسی کاغذات میرے ہاتھ سے کیوں گزرتے ہیں۔ چند بار اس نے چیف منسٹر کے پاس اس طریق کار کے خلاف بڑا سخت احتجاج بھی کیا لیکن مہتاب صاحب نے کبھی سنجیدگی سے اس کی باتوں پر کان نہ دھرا۔ جب کبھی میں سیاسی نوعیت کے کاغذات کا پلندا پرسنل پرائیویٹ

سیکرٹری کے حوالے کرتا تھا تو وہ ماتھے پر ہاتھ مار مار کر بڑی فوں فاں کیا کرتا تھا۔ "گجب ہو گیا' گجب ہو گیا۔ اپن نے تو سینت سینت کر ایک ایک کاگج جرور پڑھ لیا ہو گا۔ اپن نے تو ایک ایک کاگج کی نقل بھی رکھ لی ہو گی۔ بڑے گجب کی بات ہے۔ مہتاب جی کی بدھی تو بالکل ماری گئی ہے۔"

اس بار جو میں نے چیف منسٹر کے کاغذات کا جائزہ لیا' تو ان میں ایک عجیب دستاویز ہاتھ آئی۔ یہ چھ سات صفحات کا سائیکو سٹائلڈ انتہائی خفیہ (Top Secret) حکم نامہ تھا' جو کانگرسی چیف منسٹروں کے نام اس ہدایت کے ساتھ جاری کیا گیا تھا کہ ہر چیف منسٹر اسے اپنی ذاتی تحویل میں رکھے۔ اس میں لکھا تھا کہ تقسیم ہند کا معاملہ تقریباً طے پا چکا ہے۔ اس لیے جن صوبوں میں کانگرس کی وزارتیں قائم ہیں وہاں پر مسلمان افسروں کو کلیدی عہدوں سے تبدیل کر دیا جائے۔ خاص طور پر ہوم ڈیپارٹمنٹ' فنانس ڈیپارٹمنٹ اور پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بااعتماد ہندو افسروں کو تعینات کیا جائے۔ ڈی سی' آئی جی اور ایس پی عموماً ہندو ہوں۔ تھانوں کے انچارج بھی زیادہ سے زیادہ ہندو ہوں۔ محکمہ پولیس اور ضلعی انتظامیہ میں مسلمانوں کو فیلڈ ورک سے ہٹا کر بے ضرر قسم کے دفتری کام کاج پر لگا دیا جائے۔ پولیس کی نفری میں مسلمان سپاہیوں کو بتدریج غیر مسلح کر کے پولیس لائن اور تھانوں کے اندر معمولی فرائض پر مامور کیا جائے۔ جن صوبوں میں سرحدی مسلمانوں سے بھرتی شدہ ماؤنٹڈ ملٹری پولیس ہے' اسے فوراً توڑ دیا جائے اور افسروں اور نفری کو اختتام ملازمت کی مناسب رقم یکمشت ادا کرکے رخصت کر دیا جائے۔ سرکاری خزانوں' اسلحہ خانوں اور محکمہ مال کے ریکارڈ آفسوں کی حفاظت کے لیے ہندو گارڈ تعینات کئے جائیں۔ اسلحہ رکھنے والے مسلمان لائسنس ہولڈرز کی نقل و حرکت کی نگرانی کی جائے۔ ایسے ہنگامی منصوبے تیار رکھے جائیں جن کے تحت ان لائسنسداروں سے قلیل ترین نوٹس پر ہر قسم کا اسلحہ قریبی تھانے میں جمع کروایا جا سکے۔ کاروں' بسوں' ٹیکیوں اور ٹرکوں کے مسلمان مالکوں کی فہرستیں بنا کر ان پر کڑی نظر رکھی جائے۔ مسلمان آتش بازوں

کے لائسنس معطل کر دیئے جائیں اور ان کا آتش گیر اسٹاک فوری طور پر پولیس کی حفاظت میں لے لیا جائے ------ وغیرہ وغیرہ۔ ہر چیف منسٹر کو نہایت سخت تاکید کی گئی تھی کہ وہ ان ہدایات پر ایسی خوش اسلوبی سے عملدرآمد کرے کہ اس سے آبادی کے کسی فرقے کے خلاف کسی قسم کے امتیازی سلوک کا پہلو مترشح نہ ہو۔ بغل میں چھری اور منہ میں رام رام کا اس سے بہتر ظہور چشم تصور میں لانا محال ہے۔

یہ حکم نامہ پڑھ کر مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا۔ مہاتما گاندھی کی نام نہاد بے تعصبی کی لنگوٹی باد مخالف کے جھونکوں میں اڑ اڑ کر دور جا پڑی' اور وہ اپنے اصلی رنگ و روغن میں بالکل برہنہ ہو گئے۔ اہنساپرم دھرم کے اس جھوٹے پجاری کے اشاروں پر ناچنے والی انڈین نیشنل کانگرس کے عزائم مسلمانوں کے خلاف اتنے ہی خطرناک اور سنگین نکلے جتنے کہ ہندو مہا سبھا یا راشٹریہ سیوک سنگ کے سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ کانگریس کے سازشانہ منصوبے دوسریف فرقہ وارانہ جماعتوں سے بھی زیادہ پر خطر اور ہولناک تھے' کیونکہ ہندوستان کے کئی صوبوں میں کانگرس کی حکومت تھی اور مرکز کی عبوری گورنمنٹ میں ۱۴ میں سے چھ کانگرسی اور دو مزید غیر مسلم وزیر تھے۔ فوج کا محکمہ سردار بلدیو سنگھ کے قبضے میں تھا۔ اور سارے ہندوستان کی پولیس' سی آئی ڈی' ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ کی مشین سردار ولبھ بھائی پٹیل کے متعصبانہ ہاتھوں میں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگرس اپنی قوت کے تمام وسائل مسلمانوں کا سر کچلنے کے لیے ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس ہو رہی تھی۔

یہ دستاویز پڑھ کر تھوڑی دیر میرے دل میں ایک عجب سی کشمکش ہوتی رہی۔ ڈپٹی ہوم سیکرٹری کا پیشہ وارانہ ضمیر میرے اندر چھپے ہوئے بے عمل' ناقص اور خوابیدہ سے مسلمان کے ضمیر کے ساتھ ٹکرا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تھوڑی سی لڑائی کے بعد جیت ٹوٹے پھوٹے مسلمان ہی کی ہوئی۔ چنانچہ میں نے یہ دستاویز اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی' اور اسی رات قائداعظم سے ملاقات کرنے کی نیت سے دہلی روانہ ہو گیا۔

ان دنوں مسٹر کے ایچ خورشید قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اگر وہ دہلی میں موجود ہوتے تو غالباً مجھے قائداعظم سے ملنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ لیکن وہ موجود نہ تھے۔

ایک دو روز کی تگ و دو' منت سماجت اور حیلے بہانوں کے بعد آخر بڑی مشکل سے مجھے قائداعظم تک رسائی حاصل ہوئی۔ جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ فارغ ہو کر ایک نظر مجھ پر ڈالی اور گرجدار آواز میں بولے۔

"کیا بات ہے؟"

"سر' میں آپ کے لیے ایک مفید دستاویز لے کر آیا ہوں۔ میرا نام قدرت اللہ شہاب ہے۔ میں اڑیسہ میں ڈپٹی ہوم سیکرٹری ہوں۔" میں نے ایک ہی سانس میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہنے کی کوشش کی۔

"کیسی دستاویز؟"

میں نے آگے بڑھ کر کانگرس کا سرکلر ان کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ بڑے سکون سے اسے پڑھتے رہے۔ میں کھڑا ہوا ان کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ ان کے جذبات میں ہلکا سا ارتعاش بھی پیدا نہ ہوا۔ ایک بار پڑھ چکے تو مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور فرمایا۔ "ہاں' یہ ہمارے لیے مفید ہو سکتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ دوبارہ اس کے مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ اس کے بعد مجھ سے دریافت کیا۔ "یہ تم نے کہاں سے حاصل کی ہے؟"

میں نے فر فر ساری بات کہہ سنائی۔

"ویل' ویل' تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ This is breach of Trust

میں نے اپنا قومی فرض پورا کرنے کے موضوع پر تقریر کرنے کی کوشش کی' تو قائداعظم نے مجھے کسی قدر سختی سے ٹوک دیا' اور فرمایا۔

Don't You see each copy is numbered؟ Its disapearance would be easily tracked down to you. are you prepared to face the consequences؟

میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"Yes Sir, I am fully prepared"

"کیا میں اسے اپنا پاس رکھ سکتا ہوں؟" قائداعظم نے دستاویز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جی ہاں' سر! یہ میں آپ ہی کے لیے لایا ہوں۔"

"آل رائٹ' تم جا سکتے ہو۔" قائداعظم نے حکم دیا۔

میں دروازے سے باہر نکلنے لگا تو قائداعظم نے بلند آواز سے پکار کر پوچھا۔ "تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟"

"قدرت اللہ شہاب"

"بوائے' دوبارہ ایسی حرکت مت کرنا۔" قائداعظم نے فرمایا' مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت ان کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ تھی یا نہیں تھی۔ لیکن ان کے لہجے میں مجھے شفقت کا ہلکا سا گداز ضرور محسوس ہوا۔

یہ اپریل ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ اس وقت ہندوستان کی بساط سیاست پر مسلمانوں کے خلاف جو خطرناک چالیں چلی جا رہی تھیں۔ ان کا پس منظر بڑا سبق آموز ہے۔

جب سے لاہور میں ۱۹۴۰ء کا پاکستان ریزولیوشن منظور ہوا تھا' اسی وقت سے گاندھی جی لنگر لنگوٹ کس کر اسے ناکام بنانے کے لیے میدان عمل میں اترے ہوئے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں جب برطانیہ کو جرمنی اور جاپان کے ہاتھوں چاروں طرف شکست نصیب ہو رہی تھی' تو انہوں نے ایک منجھے ہوئے سیاسی جواری کی طرح حالات کو آنک تول کر اپنا پانسہ پھینکا' اور مسلمانوں کو اعتماد میں لیے بغیر "ہندوستان چھوڑ دو" (Quit India) تحریک کا کھڑاگ کھڑا کر دیا۔ جب یہ پوچھا جاتا تھا کہ اگر انگریز واقعی چلے جائیں' تو ہندوستان کس کے حوالے کر کے جائیں ------ تو گاندھی جی کے چیلے چانٹوں کا جواب بڑا جازم اور غیر مبہم ہوتا تھا۔

"To God or to Anarchy" طوائف الملوکی کی صورت میں پو بارہ اکثریت ہی کی تھی اور برصغیر میں اکثریت ہندو قوم کی تھی۔

ڈیڑھ دو برس بعد جب جنگ عظیم کا پانسہ پلٹنا شروع ہوا' اور برطانیہ کا پلہ بھاری دکھائی دینے لگا' تو گاندھی جی نے بھی پینترا بدلا۔ جس وقت برطانیہ پر شکست کھا رہا تھا' گاندھی جی جنگ کے بائیکاٹ کا پرچار اس اصول کی بنا پر کر رہے تھے کہ جنگ و جدال اہنساپرم دھرم کے منافی ہے۔ لیکن لڑائی کا نقشہ بدلتے ہی اہنسا کا اصول بھی موم کے ناک کی طرح مڑ گیا۔ اب گاندھی جی نے برٹش حکومت کو یہ پیشکش کی' اگر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر کے اقتدار فوراً منتقل کر دیا جائے' تو جنگ کے ہر شعبے میں برطانیہ کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا جائے گا۔ مہاتما گاندھی کے سیاسی دین میں اہنسا کے اصول کو مصلحتوں کی بے حد لچک حاصل تھی۔ جب جی چاہا ہارتے ہوئے انگریز کے خلاف جنگی بائیکاٹ کے لیے استعمال کر لیا اور جونہی حالات بدلے جیتتے ہوئے انگریز کے ساتھ جنگی تعاون کے لیے کام میں لے آئے۔ امور ریاست اور سیاست میں ریا کاری کو فنون لطیفہ کا درجہ دینے والے کوٹلیا کا ارتھ شاستر بھی گاندھی جی کے عملی ہتھکنڈوں کے سامنے بازیچہ اطفال نظر آتا ہے۔

جنگ ختم ہوتے ہی انگلستان میں لیبر پارٹی بر سر اقتدار آ گئی۔ اس پارٹی کے ساتھ کانگرس کے گہرے تعلقات تھے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر گاندھی جی نے گرگٹ کی طرح ایک اور رنگ بدلا۔ اب انہوں نے برملا یہ رٹ لگانی شروع کر دی' کہ انگریزوں کے بعد ہندوستان میں سیاسی اقتدار کی وارث صرف آل انڈیا کانگرس ہے۔ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے' اقتدار حاصل کرنے کے بعد کانگرس خود اس سے نپٹ لے گی۔

اہنساپرم دھرم کا یہ دیرینہ پجاری اب باضابطہ تلوار سونت کر میدان جنگ میں اترنے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

مطالبہ پاکستان کے متعلق گاندھی جی کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان ایک اٹوٹ اور ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ اس کو تقسیم کرنے کی کوشش گئو ماتا کا جسم کاٹنے کے مترادف ہے۔ جراحی کا یہ عمل بھارت ماتا پر کرنے سے پہلے ان کی اپنی لاش پر کرنا پڑے گا۔

اس پس منظر میں برطانوی کیبنٹ مشن آزادی ہند کی گتھی سلجھانے مارچ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان وارد ہوا۔ مشن میں لارڈ پیتھک لارنس، سرتیفورڈ کرپس، اور مسٹر اے وی الیگزینڈر شامل تھے۔

رجحان طبع اور میلا خاطر کے لحاظ سے لارڈ پیتھک لارنس گاندھی جی کی مہاتمائی کے اسیر تھے۔ وہ گاندھی جی کو مشرقی دانائی اور روحانیت کا منبع سمجھتے تھے۔ اور ان دونوں کا آپس میں گرو اور چیلے کا سا تعلق تھا۔

مشن کے سب سے زیادہ تیز، طرار اور فعال ممبر سر سٹیفورڈ کرپس تھے۔ پنڈت نہرو کے ان کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ مشن کی بیشتر اہم تجاویز پنڈت نہرو اور گاندھی جی کے خفیہ مشورے کے بعد مرتب کی جاتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے سرسٹیفورڈ کرپس اپنے ایک ذاتی دوست سدھیر گھوش کو دلال کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

مشن کے تیسرے ممبر اے وی الیگزینڈر کو کانگرسی لیڈروں کے ساتھ کسی قسم کی ذہنی یا جذباتی یا ذاتی وابستگی تو نہ تھی، لیکن ان کو یہ وہم لاحق تھا، کہ کانگرس کے مرد آہن ولبھ بھائی پٹیل کی خوشنودی حاصل کئے بغیر مستبقل میں آزاد ہندوستان اور انگلستان کے باہمی تعلقات خوشگوار نہیں رہ سکتے۔

اس ملی بھگت کے مقابلہ میں قائداعظم کی ذات یکا و تنہا تھی۔ ان کا واحد ہتھیار ان کا ذاتی کردار تھا جس کا ایک نمایاں جوہر ان کی سیاسی بصیرت تھی۔ لیکن اس سے بھی بڑا جوہر ان کی کامل ثابت قدمی اور دیانتداری تھی، جسے نہ خوف دبا سکتا تھا، نہ خوشامد ڈگمگا سکتی تھی، نہ لالچ خرید سکتا تھا۔

جب کیبنٹ مشن ہندوستان آ رہا تھا، تو وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی نے اپنے بیان میں یہ اعلان کیا تھا۔ ”ہندوستان میں اقلیتوں کے حقوق کا ہمیں خیال ہے۔ لیکن ہم یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ کوئی اقلیت اکثریت کے حقوق پر کسی قسم کا ویٹو استعمال کر سکے۔“

اس اعلان پر کانگرس نے بڑی بغلیں بجائیں۔ مسلم لیگ کے لیے یہ ایک طرح کی وارننگ

تھی کہ وہ کانگرس کے عزائم میں زیادہ روڑے اٹکانے کی کوشش نہ کرے۔ قائداعظم نے اس دھمکی کا بڑا خوبصورت جواب دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ایک مکڑی اپنا جالا بن کر تیار کرے اور پھر مکھی کو مدعو کرے کہ وہ تشریف لائے اور جالے میں آ کر پھنس جائے۔ اب اگر مکھی اس دعوت کو قبول نہیں کرتی۔ تو وزیراعظم اٹیلی کے الفاظ میں یہی کہا جائے گا' کہ مکھی مکڑی کے خلاف ویٹو استعمال کر رہی ہے۔

کیبنٹ مشن ہندوستان میں تین ماہ کے قریب رہا۔ اس عرصے کی داستان انگریزوں اور ہندوؤں کی سیاسی چیرہ دستیوں' منافقتوں' ریا کاریوں' دروغ بافیوں اور فریب سازیوں کی عجیب و غریب بھول بھلیاں ہے۔ کانگرس نے اپنا دام تزویر قدم قدم پر بچھا رکھا تھا۔ اور برٹش حکومت کے نمائندے مسلم لیگ کو گھیر گھار کر اسے اس میں پھنسانے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے تھے۔ قائداعظم نے ان سب کا مقابلہ بڑی بے لاگ راست بازی اور ثابت قدمی سے کیا۔

کیبنٹ مشن کا فیصلہ یہ تھا کہ برصغیر کو پاکستان اور بھارت کے دو الگ الگ اور خود مختار حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ متحدہ ہندوستان میں امور خارجہ' دفاع اور ذرائع آمد و رفت مرکزی حکومت کے اختیار میں ہوں گے۔ صوبوں کو تین گروپوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ایک گروپ میں ہندو اکثریت کے صوبے ہوں گے۔ دوسرے گروپ میں پنجاب' سرحد' سندھ اور بلوچستان ہوں گے۔ تیسرے گروپ میں بنگال اور آسام کے صوبے ہوں گے۔ تین مرکزی شعبوں کو چھوڑ کر باقی سب امور میں ہر گروپ خود مختار ہو گا۔

اب منافقانہ سیاست کاری کا ایک نیا منظر ظہور میں آیا۔ ایک الگ پاکستان کا مطالبہ کرنے والی مسلم لیگ نے تو یہ تجویز منظور کر لی۔ لیکن اکھنڈ بھارت کی رٹ لگانے والی کانگرس نے اسے مسترد کر دیا۔

مسلم لیگ کی طرف سے اس تجویز کی منظوری قائداعظم کی سیاسی بصیرت کا عملی شاہکار ہے۔ مطالبہ پاکستان رد ہو جانے کے بعد یہ تجویز بھاگتے چور کی سب سے اچھی لنگوٹی تھی۔ اس میں کم از کم یہ گارنٹی تو موجود تھی' کہ صوبوں کی گروپ بندی کی وجہ سے ایک طرف پنجاب' سرحد' سندھ اور بلوچستان اور دوسری طرف بنگال اور آسام کے مسلمانوں کو اپنے معاملات میں بڑی حد تک ہندو مرکزیت کے اثر سے خود مختاری حاصل ہو گی۔ اس کے علاوہ قائداعظم ہندو ذہنیت سے بڑی اچھی طرح واقف تھے۔ شاید ان کے ذہن میں یہ خیال بھی ہو کہ جس وجہ سے مسلم لیگ اس فارمولے کو منظور کر رہی ہے عین اسی وجہ سے کانگرس اسے مسترد بھی کر سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو مطالبہ پاکستان قدرتی طور پر از سر نو بحال ہو جائے گا۔

کانگرس کی گنگا جمنی سیاست نے وہی کیا جس کی اس سے توقع تھی۔ ہندو قیادت اتنا بھی برداشت نہ کر سکی کہ کسی فارمولے میں مسلمانوں کو ان کے اکثریتی صوبوں میں بھی کسی قسم کا سیاسی اختیار حاصل ہو۔ گاندھی جی چراغ پا ہو گئے۔ پنڈت نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کیبنٹ مشن پلان کی دھجیاں اڑا دیں۔ ہندو پریس نے شور و غوغا کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کیبنٹ مشن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انہوں نے کانگرسی لیڈروں کے ساتھ کچھ ظاہری اور کچھ خفیہ رابطے قائم کئے۔ کانگرس کے دباؤ میں آ کر مشن کے ممبروں نے اپنا تھوکا ہوا خود ہی چاٹنا شروع کر دیا۔ اور کانگرس کے ایماء پر خود اپنے ہی پلان میں انہوں نے ترمیم و تجدید اور غلط تعبیر' غلط تفسیر اور غلط استخراج کے ایسے ایسے پیوند لگانے شروع کر دیئے کہ اس کی شکل بدل گئی' اس کے معنی بگڑ گئے اور متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے جمہوری حقوق مکمل طور پر ہندو آمریت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جس طور پر کانگرس نے اپنی یہ تحریک چلائی اس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا بنیادی مقصد انگریزی راج سے آزادی حاصل کرنا نہیں بلکہ مسلم لیگ کو شکست دینا ہے۔ کانگرس کی نظر میں ہندوستان کی آزادی اسی صورت میں قابل قبول

تھی جبکہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے زیر نگیں رکھنے کے لیے پہلے سے پورا پورا بندوبست کر لیا جائے۔

قائداعظم اپنا فرض پورا کر چکے تھے۔ کیبنٹ مشن کے پلان کو تسلیم کر کے انہوں نے پاکستان کا مطالبہ داؤ پر لگا دیا تھا۔ لیکن کانگرس کے خوف و خوشامد میں آ کر مشن نے جب اپنے پلان کی صورت خود ہی مسخ کر دی' تو مجبوراً مسلم لیگ نے بھی اپنی منظوری واپس لے لی۔ اس طرح اکھنڈ بھارت کی آخری ہنڈیا کانگرس نے خود اپنے ہاتھوں اپنی مسلم کش پالیسیوں کے چوراہے میں پھوڑ دی۔ کانگرس کے بلیک میل کے آگے سر جھکا کر اور دم ہلا کر خود اپنے ہی تیار کردہ پلان میں تحریف و تخریب کرنے والے کیبنٹ مشن نے بھی متحدہ ہندوستان کے تابوت میں آخری کیل گاڑ دی۔

چنانچہ قائداعظم نے اعلان کیا کہ ہم نے مفاہمت کی ہر کوشش' دلیل اور حجت کو کام میں لا کر دیکھ لیا ہے۔ اب یہ بات حتمی طور پر پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ ان تمام مسائل کا واحد حل قیام پاکستان ہے۔ دوسروں سے مدد یا ہمدردی کی امید رکھنا بیکار ہے۔ ایسی کوئی عدالت نہیں جس کا دروازہ ہم انصاف حاصل کرنے کے لیے کھٹکھٹا سکیں۔ ہماری فقط ایک عدالت ہے' وہ مسلمان قوم ہے۔

اب تک مسلم لیگ کی سیاست بڑی احتیاط سے آئینی حدود کے اندر رکھی جاتی تھی۔ لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ انگریزوں کی موجودہ اور ہندوؤں کی مجوزہ غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے سیاست کے اس اسلوب کو ترک کر دیا جائے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے "ڈائریکٹ ایکشن" کا اعلان کیا' اور ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء "ڈائریکٹ ایکشن ڈے" مقرر ہو گیا۔ ساتھ ہی تمام مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے دیئے ہوئے خطابات واپس کر دیں۔

۱۶ اگست کو "ڈائریکٹ ایکشن ڈے" ہر جگہ امن و امان سے گزر گیا' لیکن کلکتہ میں بڑا زبردست فساد ہو گیا۔ مسٹر حسین شہید سہروردی بنگال کے چیف منسٹر تھے۔ انہوں نے

۱۶ اگست کو عام تعطیل کا دن قرار دے دیا۔ کانگرسی حلقے اس اعلان پر بڑے سیخ پا ہوئے۔ کلکتہ کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد ۲۴ فیصد کے قریب تھی۔ ۱۶ اگست کو وہ لاکھوں کی تعداد میں "ڈائریکٹ ایکشن ڈے" کے جلسے میں شریک ہوئے۔ مسٹر سہروردی نے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی۔ جلسے کے بعد جب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے' تو شہر کے گلی کوچوں میں مسلح ہندوؤں نے اچانک ان پر قاتلانہ حملے شروع کر دیئے۔ جلسہ گاہ سے واپس آنے والے مسلمانوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح یکایک ایک پہلے سے ٹھانی ہوئی سازش کا شکار ہو جائیں گے۔ وہ بالکل نہتے تھے۔ اس کے برعکس ہندوؤں کے جتھے ہر قسم کے مہلک ہتھیاروں سے لیس تھے۔

وہ جگہ جگہ گھات لگا کر بے خبر اور بے شان و گمان مسلمانوں کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ تاریخ یہ کبھی نہ بتا سکے گی کہ اس روز کلکتہ کے گلی کوچوں' سڑکوں اور بازاروں میں کتنے مسلمان شہید ہوئے۔ ان کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تھی۔ یہ قیامت صغریٰ کئی روز تک شہر کے طول و عرض میں برپا رہی۔ کلکتہ کے ہندو پہلے سے تیار بھی تھے' مسلح بھی تھے' اور تعداد میں بھی مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھے۔ لیکن ہندو پریس یہی اودھم مچاتا رہا کہ زیادتی سراسر مسلمانوں کی ہے اور صوبے کے چیف منسٹر سہروردی ان کی خفیہ طور پر مدد کر رہے ہیں۔

ہندوستان کے شہروں میں ہندو مسلم فساد کوئی نئی یا عجیب چیز نہیں تھی۔ لیکن جس پیمانے پر کلکتہ میں کشت و خون کا بازار گرم ہوا اس نے سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ دو فرقوں یا دو گروہوں کی لڑائی نہ تھی۔ بلکہ دراصل یہ دو قوموں کی جنگ تھی۔ برصغیر میں پہلی بار دو قومی نظریہ بساط سیاست سے نکل کر میدان کارزار میں اتر آیا تھا' اور اس Great Calcutta Killing نے مستقبل کے نقشے پر بڑے گہرے اور دور رس اثرات مرتب کئے۔

اس کا سب سے پہلا اثر عبوری حکومت کی تشکیل پر ہوا۔ کیبنٹ مشن کی سفارش کے مطابق وائسرائے ہند لارڈ ویول کانگرس' مسلم لیگ اور دوسری اقلیتوں کے نمائندوں پر

مشتمل مرکزی کابینہ بنانے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ یہاں پر بھی کانگرس کی یہی خواہش اور کوشش تھی کہ وائسرائے پہلے کانگرس کو عبوری حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دے۔ اس کے بعد مسلم لیگ سمیت دوسری جماعتیں وائسرائے کی دعوت پر نہیں بلکہ کانگرس کے ساتھ اپنا اپنا معاملہ طے کر کے کابینہ میں شریک ہوں۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی گدی پر بیٹھنے کا حق تو صرف کانگرس کو حاصل ہو۔ باقی جماعتیں کی خوشنودی حاصل کر کے محض طفیلیوں اور حاشیہ نشینوں کی حیثیت سے حکومت میں شامل ہو سکیں۔

لارڈ ویول اس چکمے میں آ گیا۔ اور اس نے کانگرس کے نمائندوں کو عبوری حکومت میں شامل ہونے کی براہ راست دعوت دے دی۔ گاندھی جی کا نخل تمنا ایک دم سرسبز ہو گیا۔ جب کسی نے ان سے پوچھا کہ عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت کا کیا بنے گا' تو گاندھی جی نے خوشی سے چہک چہک کر جواب دیا کہ مسلم لیگ کو اب وائسرائے کی بجائے کانگرس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ جناح صاحب کو چاہیے کہ اس بارے میں وہ پنڈت نہرو سے انٹرویو مانگیں۔

ابھی عبوری حکومت قائم نہیں ہوئی تھی' کہ کلکتہ کا ہولناک فساد برپا ہو گیا۔ فساد کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے لارڈ ویول نے کلکتہ کا دورہ کیا' تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ سپاہی پیشہ وائسرائے میدان جنگ کی نفسیات اور فن حرب کا تجربہ کار ماہر تھا۔ اس کے فوجی ذہن نے بڑی آسانی سے یہ اندازہ لگا لیا' کہ کلکتہ میں ہندو مسلم فساد نہیں ہوا' بلکہ سول وار ہوئی ہے۔ اور مسلمانوں کے جائز حقوق کو مزید پامال کیا گیا' تو سارا برصغیر ایک خوفناک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ جائے گا۔

لارڈ ویول دیانتدار سپاہی اور باضمیر سیاست دان تھا۔ کلکتہ سے واپس آ کر اس نے اخلاقی جرات سے کام لیا' اور کانگرس سے مشورہ کئے بغیر مسلم لیگ کو بھی عبوری حکومت میں شامل ہونے کی براہ راست دعوت دے دی۔

وائسرائے کے اس اقدام سے کانگرس د کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ انگریزوں کے

سائے تلے ہندوستان پر اکیلے راج کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ اس وقت ہندوستان کے سول اور فوجی اداروں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اگر عبوری حکومت کی باگ ڈور صرف کانگرس کے ہاتھ میں آ جاتی' تو بلا شبہ اسے سارے ہندوستان پر رام راج کی راہ ہموار کرنے میں بڑی مدد ملتی۔ مسند اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد مسلم لیگ کو مستقل طور پر عبوری حکومت سے باہر رکھنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کانگرس کے ہاتھ میں ایسے جی حضوریے مسلمان موجود تھے جو بڑے شوق سے انٹرم گورنمنٹ (عبوری حکومت) میں مسلم لیگی سیٹوں کی خانہ پری کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس طرح مسلم لیگی سیاست کا بڑھتا ہوا سیلاب سرکاری رکاوٹوں کی مدد سے اقلیتوں کی بند کھاڑی میں دھکیل دیا جاتا۔ اور تسلسل حکومت کا بہانہ بنا کر کانگرس اپنے اس دعوے کو بھی مستحکم کر لیتی کہ ہندوستان میں وہ برٹش حکومت کی واحد جانشین ہے۔

لیکن وائسرائے کے بر وقت اقدام نے ان تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس پر کانگرس نے بڑا کہرام مچایا۔ طرح طرح کے حیلے بہانوں کی آڑ لے کر گاندھی جی نے لارڈ ویول کو بڑی سختی سے برا بھلا کہا۔ اور لندن میں برٹش گورنمنٹ کے پاس یہ شکایت لکھ بھیجی کہ وائسرائے کلکتہ کے فسادات سے بوکھلا کر بدحواسی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ وہ اعصابی تناؤ میں مبتلا ہے اور آئینی امور میں اس کی قوت فیصلہ کمزور پڑ گئی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وائسرائے کی مدد کے لیے انگلستان سے کوئی ایسا قانونی ماہر بھیجا جائے جو لارڈ ویول سے زیادہ قابل اور صائب الرائے ہو۔

لارڈ ویول پر کانگرس کا یہ پہلا حملہ تھا۔ اس کے بعد کانگری لیڈر مسلسل اسی تاک میں رہتے تھے کہ جس طرح ہو سکے قدم قدم پر وائسرائے کو ہر معاملے میں زک پہنچائی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے لندن میں اپنے ہی خواہوں کے ذریعہ ریشہ دوانیاں شروع کر رکھی تھیں کہ لارڈ ویول کی جگہ کوئی ایسا شخص وائسرائے مقرر ہو جسے کانگرس آسانی سے کٹھ پتلی کی طرح اپنے مفاد کی تار پر نچا سکے۔

کانگرس ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عبوری حکومت میں آئی تھی۔ ۱۵ اکتوبر کو مسلم لیگ بھی اس

میں شامل ہو گئی۔ مسلم لیگ کی شمولیت کانگرس کی مرضی کے خلاف عمل میں آئی تھی۔ اس لیے کابینہ میں ان دونوں کی رفاقت شروع ہی سے معاندانہ اور مخاصمانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

عبوری حکومت ۱۴ اراکین پر مشتمل تھی۔ چھ کانگرسی' پانچ مسلم لیگی' ایک سکھ' ایک عیسائی اور ایک پارسی۔ امور خارجہ اور کامن ویلتھ نہرو کے پاس تھے۔ ہوم' انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ پٹیل کے پاس اور ڈیفنس سردار بلدیو سنگھ کے پاس ------ جو ہر لحاظ سے کانگرس ہی کا کل پرزہ تھا۔ کانگرس نے جان بوجھ کر فنانس کا پورٹ فولیو مسلم لیگ پر اس وجہ سے ٹھونسنے کی پیشکش کی کہ مسلمان مالیاتی حساب کتاب میں کمزور مشہور تھے اور کانگرس کو امید تھی کہ وہ وزارت خزانہ چلانے میں بری طرح ناکام ہوں گے۔ خان لیاقت علی خان نے یہ وزارت سنبھال کر اس چیلنج کو ایسی خوش اسلوبی سے قبول کیا کہ بہت جلد کانگرسی وزیر کف افسوس ملنے ل گے کہ انہوں نے فنانس کا چارج مسلم لیگ کو دے کر بڑی فاش غلطی کی ہے۔

ہر حکومت میں وزارت خزانہ کا یہ ناخوشگوار فرض ہوتا ہے کہ وہ وسائل اور اخراجات میں توازن برقرار رکھے۔ اس مقصد کے لیے عبوری حکومت میں جب خان لیاقت علی خان کسی کانگرسی وزیر کی اخراجاتی تجاویز میں جائز مین میخ نکال کر اسے گھٹاتے یا نامنظور کر دیتے تھے تو اسے ان کی ضد اور سیاسی خصومت پر محلول کیا جاتا تھا۔ مالیاتی امور کے علاوہ باقی بہت سے معاملات میں بھی دونوں گروہوں میں مستقل چخ چخ چلتی رہتی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا عمیق اور وسیع تضاد سیاسی سطح پر تو کیبنٹ مشن کے روبرو آشکار ہو چکا تھا۔ ان دو قوموں کا باہمی عناد کلکتہ کے خونریز فسادات نے اجاگر کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر اب عبوری حکومت کے تجربے نے نکال دی۔

ایک طرف تو حکومت کے اندر مسلم لیگ اور کانگرس کی کشاکشی روز بروز زور پکڑتی جا رہی تھی دوسری طرف برصغیر کے کئی حصوں میں ہندو مسلم فسادات باضابطہ خون کی

ہولی کھیل رہے تھے۔ کلکتہ میں مسلمانوں کے قتل عظیم کے بعد مشرقی بنگال کے ضلع نواکھلی میں فساد ہو گیا' جہاں تین سو کے قریب افراد مارے گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس واقعہ کو ہندو پریس نے مبالغے کا رنگ چڑھا کر ایسے انداز سے پیش کیا کہ ملک کے طول و عرض میں شدید بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ ہندو تو پہلے ہی بپھرے بیٹھے تھے۔ اب نواکھلی کو بہانہ بنا کر انہوں نے بہار میں جوابی کارروائی شروع کر دی۔ یہاں پر مسلمان اقلیت پر جو قیامت ٹوٹی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ صوبے میں کانگرسی وزارت بر سر اقتدار تھی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہاں آٹھ ہزار سے اوپر مسلمان شہید ہوئے۔ لیکن اصلی تعداد کا کسی کو پورا علم نہیں۔ جن علاقوں میں یہ خونی طوفان اٹھا وہاں پر مسلمانوں کی آبادی سات آٹھ فیصد سے بھی کم تھی۔ ہندوؤں کے مسلح جتھے ہاتھیوں' گھوڑوں اور بیل گاڑیوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے اور گاؤں گاؤں جا کر مسلمان آبادیوں کو نیست و نابود کر دیتے تھے۔ پیدل بلوائیوں کے جھنڈ کے جھنڈ ٹڈی دل کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر' چن چن کر برچھیوں اور بھالوں سے مار ڈالتے تھے یا گھروں میں بند کر کے زندہ جلا دیتے تھے۔ درجنوں مسجدیں کھود کر ہل چلا دیا گیا۔ سینکڑوں عورتوں نے اپنی عصمت بچانے کی خاطر کنوؤں میں کود کر جان دے دی۔ بہت سے بچوں کو درختوں کے تنوں کے ساتھ میخوں سے ٹھونک کر مصلوب کر دیا گیا۔ ایک بھاری اکثریت کے ہاتھوں ایک قلیل' بے ضرر اور بے یار و مددگار اقلیت پر ظلم و بربریت کی اس سے زیادہ گھناؤنی مثال ملنا محال ہے۔

بہار کے بعد یو پی کی باری آئی۔ گڑھ مکیتسر میں ہر سال ہندوؤں کا میلہ لگتا تھا جس میں لاکھوں ہندو شامل ہوا کرتے تھے۔ چند ہزار غریب مسلمان بھی اس میلے میں خرید و فروخت کا سامان لے کر جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک روز ہندوؤں نے اچانک مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے میلے میں موجود تمام مسلمان مردوں' عورتوں اور بچوں کو بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جب کلکتہ پر مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے تو ہندو پریس نے اسے مسلمانوں کی

زیادتی کا رنگ دے کر بڑا شور و غوغا کیا تھا۔ نواکھلی کے واقعات کو بھی ہندو پریس نے بڑے ڈرامائی اور سنسنی خیز مبالغے کے ساتھ اچھالا تھا۔ لیکن بہار اور گڑھ مکیتسر میں مسلمانوں کے قتل عام پر اس پریس کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ بہار اور یوپی کی کانگرسی وزارتوں کی شہہ پا کر سارے پریس نے ایک طرح کی اجتماعی چپ سادھ لی۔ لیکن جادو کی طرح خون ناحق بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ان دونوں لرزہ خیز واقعات کی خبریں بڑی سرعت سے پھیل گئیں اور رفتہ رفتہ سارا برصغیر ہندو مسلم تناؤ اور کشیدگی کی انتہائی خطرناک زد میں آ گیا۔

جب نواکھلی میں فساد ہوا تو گاندھی جی فوراً وہاں پہنچے اور کئی ماہ تک انہوں نے متاثرہ علاقوں کا پیدل دورہ کیا۔ وہ روزانہ تین چار میل پاپیادہ چلتے تھے' اور ہر جگہ مسلمانوں کو تلقین کرتے تھے کہ ہندو تمہارے بھائی ہیں اور ان کی حفاظت کرنا تمہارا فرض منصبی ہے۔

اسی دوران بہار میں فسادات برپا ہو گئے۔ بہار کے کچھ کانگرسی مسلمانوں کی بار بار استدعا پر گاندھی جی نے نواکھلی کا پیچھا چھوڑا' اور بڑی مشکل سے بہار تشریف لائے۔ یہاں پر انہوں نے جو کچھ دیکھا' اس نے ہندو جاتی کی امن پسندی' صلح جوئی اور غیر تشدد پسندی کے متعلق ان کے بہت سے مفروضات کی کایا پلٹ دی۔ یہاں پر وسیع و عریض علاقوں میں مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا۔ گھر لٹ چکے تھے۔ مسجدیں ویران پڑی تھیں۔ کنوئیں مسلمان عورتوں کی لاشوں سے اٹا اٹ بھرے ہوئے تھے۔ کئی جگہ ننھے منے بچوں کے ڈھانچے اب تک موجود تھے جنہیں لوہے کے کیل گاڑ کر درختوں اور دیواروں کے ساتھ ٹانک دیا گیا تھا۔ یہ روح فرسا نظارے دیکھ کر گاندھی جی کو غالباً زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ ہندو قوم اتنی نرم دل' امن پسند اور غیر متشدد نہیں ہے جتنا کہ وہ سمجھتے اور پرچار کرتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف بپھر کر ہندو بھی خونخوار درندگی کا پورا پورا مظاہرہ کرنے پر قادر ہیں۔ گاندھی جی کے جیون ساتھی' سیکرٹری اور سوانح

نگار پیارے لال نے اپنی کتاب "Mahatma Gandhi: The Last Phase" میں بڑے واضح طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بہار کی خونریزی دیکھ کر گاندھی جی کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا' اور متحدہ ہندوستان کے متعلق ان کا دیرینہ خواب ٹوٹ کر پاش پاش ہو گیا۔

ان المناک واقعات نے ایک طرف تو گاندھی جی کے ذاتی' سیاسی اور اخلاقی فلسفے میں انقلاب عظیم برپا کر دیا' اور دوسری طرف وائسرائے ہند لارڈ ویول کے فوجی تربیت یافتہ ذہن کے سامنے بھی تلخ حقائق کے انبار لگا دیئے۔ سارا برٹش انڈیا خانہ جنگی کی مہیب لپیٹ میں گھرا ہوا تھا۔ اس بڑھتے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے وائسرائے کے وسائل خوفناک حد تک محدود تھے۔ جنگ عظیم کی وجہ سے اعلیٰ انتظامی سروسوں میں انگریز افسروں کی تعداد پہلے سے نصف رہ گئی تھی۔ برٹش گورنمنٹ کے سٹیل فریم (آئی سی ایس) میں پانچ سو سے بھی کم انگریز افسر تھے۔ ان کی اکثریت بھی آزادی سے پہلے ریٹائر ہو کر گھر واپس جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ ہندوستان پر برٹش ایمپائر کا سایہ قائم رکھنے کے لیے ان لوگوں نے بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے۔ لیکن اب ایمپائر کا سایہ ڈھل رہا تھا۔ اب محض ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی قتال و جدال میں کوئی نمایاں حصہ لینے میں انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہندوستان کی مسلح افواج میں بھی برٹش افسروں کی تعداد گیارہ ہزار سے گر کر فقط چار ہزار رہ گئی تھی۔ گورا فوج کے یونٹ بھی بڑی سرعت سے انگلستان واپس جا رہے تھے۔ کیونکہ جنگ کے بعد ملک کی تعمیر نو کے لیے برطانیہ کو اپنی افرادی قوت کام پر لگانے کی شدید ضرورت تھی۔ سول اور ملٹری وسائل کی اس تقلیل و تخفیف کے پیش نظر برصغیر کے بگڑتے ہوئے حالات پر کنٹرول رکھنا وائسرائے کے بس کا روگ نہ تھا۔ عوامی سطح پر کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ سیاسی سطح پر عبوری حکومت میں مسلم لیگی اور کانگرسی گروپوں کی باہمی کشمکش اور چقپلش روز بروز تلخ سے تلخ تر ہو رہی تھی۔ انتظامی سطح پر غیر جانبدار اور موثر وسائل سراسر ناکافی

تھے۔ ان تمام حقائق کا جائزہ لے کر لارڈ ویول اس نتیجے پر پہنچا کہ برطانیہ کے لیے ہندوستان پر مزید حکومت کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے اس نے برٹش گورنمنٹ کے پاس پر زور سفارش کی کہ برصغیر کا اقتدار مقامی لوگوں کو منتقل کر کے برطانیہ کو جلد از جلد اپنی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جانا چاہیے۔

اس پس منظر میں وزیراعظم اٹیلی نے ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو یہ تاریخی اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ ۱۵ جون ۱۹۴۸ء تک لازمی طور پر ہندوستان کے اقتدار سے دستبردار ہو جائے گی۔ یہ اقتدار کس کو سونپا جائے گا؟ کیا اقتدار برٹش انڈیا کی کسی واحد مرکزی حکومت کو منتقل کیا جائے گا یا الگ الگ صوبوں کے سپرد کیا جائے گا یا کوئی اور مناسب اور متبادل طریقہ اختیار کیا جائے گا؟ اس کا فیصلہ وقت آنے پر حالات کے پیش نظر طے پایا جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی وزیراعظم اٹیلی نے یہ اعلان بھی کیا' کہ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس اعلان پر کانگرس نے خوشی کے بڑے شادیانے بجائے۔ لارڈ ویول مدت سے کانگرس کی تنقید و تنقیص کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ کانگرسی گرگے کافی عرصہ سے حکمران لیبر پارٹی کے حلقوں میں لارڈ ویول کے خلاف اپنا اثر و رسوخ مستعدی سے استعمال کر رہے تھے۔ فیلڈ مارشل ویول کا قصور صرف اتنا تھا' کہ کانگرس کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے اس نے مسلم لیگ کو براہ راست عبوری حکومت میں شامل کر لیا تھا۔ اب یہ بات تاریخی شواہد سے پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ لارڈ ویول کی معزولی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقرری کا پنڈت جواہر لال نہرو کو پہلے سے علم تھا' اور اس فیصلے کو ان کی اشیر باد بھی حاصل تھی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن برطانیہ کے شاہی خاندان کا فرد تھا اور ذاتی طور پر بڑی پر کشش اور چکا چوند کر دینے والی شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی سرشت میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اور اپنا کام نکالنے میں اسے بلا کی تیزی' طراری اور انتھک محنت اور مستعدی کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ شہرت کا دلدادہ' ذاتی پبلسٹی کا رسیا اور رائے عامہ کو اپنی

خواہشات میں ڈھالنے کا باکمال ماہر تھا۔ لارڈ ویول کا حشر دیکھ کر ماؤنٹ بیٹن نے یہ سبق پلے باندھ لیا تھا کہ اپنے مشن میں کامیابی حاصل کرنے لیے اسے کانگرس کی خیر سگالی اور خوشنودی کو ہر قیمت پر خریدنا پڑے گا۔ یہ قیمت اس نے بڑی فراخدلی سے مسلمانوں کے کھاتے سے ادا کی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے خاص طور پر پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ بہت جلد بڑے گہرے تعلقات استوار کر لیے۔ اس رشتے کی آبیاری میں لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا بڑا ہاتھ تھا جو ظاہری حسن و جمال' ذہنی رفاقت اور تمدنی و تہذیبی نزاکت کا خوبصورت مرقع تھی۔

ہندوستان کے آخری وائسرائے کے طور پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن یہاں حکومت کرنے نہیں آیا تھا بلکہ برصغیر سے برٹش حکومت کی بساط لپیٹنے آنا تھا۔ ۱۵ جون ۱۹۴۸ء تک اس فرض کو پورا کرنے کے لیے اس کے پاس فقط پندرہ ماہ تھے۔ ونسٹن چرچل کے نزدیک اتنی بڑی سلطنت کے کاروبار کو اتنے قلیل عرصہ میں منتقل کرنے کی کوشش شدید خطروں سے خالی نہ تھی۔ اس نے اس جلد بازی کو شرمناک فرار قرار دیا تھا' جیسے جہاز کو خطرے میں گھرا دیکھ کر اس کے پیندے میں سوراخ کر کے اسے ڈبو دیا جاتا ہے۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ضمیر پر ایسا کوئی بوجھ نہ تھا۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وائسرائے کا عہدہ سنبھالا' تو تقسیم ہند کا اصول قریباً قریباً طے شدہ امر تھا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ پاکستان کا مطالبہ تو مسلم لیگ نے کیا تھا لیکن اس مطالبے کو جلد از جلد پورا کرنے کی فکر اب کانگرس کو لگی ہوئی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ "پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے" ہندوستان کی تقسیم پر کانگرس اس لیے آمادہ نہیں ہوئی تھی کہ اسے مسلمانوں کے ساتھ کوئی منصفانہ یا فیاضانہ یا دوستانہ سلوک کرنا منظور تھا۔ کانگرسی لیڈروں نے یہ کڑوا گھونٹ بڑے غم و غصہ سے شدید مجبوری اور معذوری کے عالم میں اپنے گلے سے اتارا تھا۔

عبوری حکومت کے تجربہ سے پنڈت نہرو' سردار پٹیل اور ان کے ساتھیوں کو اس بات

کا یقین ہو گیا تھا' کہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ اقتدار میں شریک کر کے کانگرس کبھی بھی اپنی من مانی کارروائیاں کرنے پر قادر نہ ہو سکے گی۔ عبوری حکومت میں مسلم لیگی وزیر کانگرس کی بالا دستی تسلیم نہیں کرتے تھے اور نہ ہی وہ اپنی پالیسیوں میں کانگرس کے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح ناچنے پر تیار تھے۔ کابینہ کے مسلم لیگی گروپ نے اپنا الگ تشخص قائم کر رکھا تھا اور ذاتی اہلیت' دیانت اور فہم وتدبر میں بھی وہ اپنے کانگرسی رفیق کاروں سے کسی طرح کمتر نہ تھے۔

وہ آخری تنکا جس نے عبوری حکومت کے اونٹ کی کمر توڑ دی' خان لیاقت علی خاں کا بجٹ ثابت ہوا جو انہوں نے ۲۸ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیر خزانہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ اسے عام طور پر "غریب آدمی کے بجٹ" کے لقب سے زیادہ کیا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے ضروریات زندگی مہنگی ہو گئی تھیں' بلیک مارکیٹ عروج پر تھی' روپے کی قیمت گر رہی تھی' اور دولت گنتی کے چند منافع خوروں' بڑے صنعت کاروں اور تاجروں کے ہاتھ میں مرکوز ہو گئی تھی۔ اپنی بجٹ تقریر میں خان لیاقت علی خاں نے اعلان کیا' کہ وہ قرآن حکیم کے اس معاشی فلسفہ پر ایمان رکھتے ہیں جو دولت کو فقط امیروں کے درمیان گردش کرنے سے روکتا ہے۔ اس لیے اس بجٹ میں انہوں نے چند ایسی تجاویز شامل کیں جو سماجی انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی طرف پہلا قدم تھیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ جن لوگوں نے ٹیکس ادا نہ کر کے دولت سمیٹی ہے' ان کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جائے گا۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ ایک لاکھ روپے سے اوپر تجارتی منافع پر ۲۵ فیصد اسپیشل انکم ٹیکس وصول کیا جائے گا۔ اسی طرح کے چند اور ٹیکس تھے جن کی زد براہ راست دولت مند افراد پر پڑتی تھی۔ دولت مندوں میں بھاری اکثریت ان برلاؤں' دالمیوں اور دوسرے ہندو سیٹھوں کی تھی جن کی در پردہ مالی اعانت سے کانگرس کا سارا کاروبار چل رہا تھا۔ بجٹ کا اعلان ہوتے ہی ہندو سرمایہ داروں کے حلقے میں کہرام مچ گیا۔ انہوں نے کانگرسی لیڈروں کو آڑے ہاتھوں لیا اور کانگرس کی

مالی امداد بند کر دینے کی دھمکی دی۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کابینہ میں زبردست اودھم مچایا اور خان لیاقت علی خان پر یہ الزام عائد کیا کہ یہ بجٹ غریب عوام کی مدد کے لیے نہیں بلکہ ہندو سرمایہ داروں کو زک پہنچانے اور کانگرس کو مشکل میں ڈالنے کی نیت سے بنایا گیا ہے۔ ہندو پریس نے بھی بڑا واویلا مچایا لیکن نوابزادہ لیاقت علی خاں اپنے موقف پر ثابت قدم رہے اور انہوں نے بجٹ میں کوئی تبدیلی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

بجٹ کے واقعہ نے ہندو تاجروں' صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی آنکھیں کھول دیں۔ انہیں یکایک یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ متحدہ ہندوستان کی حکومت میں اگر مسلمانوں کا کچھ عمل دخل ہوا تو سماجی انصاف' انسانی مساوات وغیرہ کے نام پر ان کے مفادات پر ہمیسہ کوئی نہ کوئی ضرب پڑتی رہے گی۔ ہمیشہ کے لیے یہ درد سر مول لینے کی بجائے یہی بہتر ہے کہ مسلمانوں کو زمین کا کچھ ٹکڑا دے کر الگ ہی کر دیا جائے' تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ چنانچہ ہندو سرمایہ دار بھی دل و جان سے مطالبہ پاکستان کے حامی ہو گئے۔

کانگرس کے مرد آہن سردار ولبھ بھائی پٹیل اب اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے' کہ حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی شراکت بالکل لا یعنی اور عبث ہے۔ مسلمان اکثریت کے جو علاقے پاکستان بننے کے خواب دیکھ رہے تھے وہ بھارت ماتا کے پوتر بدن پر گلے ہوئے' سڑے ہوئے ناسور ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ ان ناسوروں کو جلد از جلد کاٹ کر الگ کر دیا جائے تا کہ ان زہر صحت مند حصوں تک پہنچنے نہ پائے۔

پنڈت نہرو پہلے ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو زبان دے چکے تھے کہ اگر پنجاب اور بنگال کو تقسیم کر دیا جائے تو انہیں پاکستان کے قیام پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

کانگرس نے ایک ہاتھ سے مطالبہ پاکستان کو طوعاً و کرہاً تسلیم کیا' اور دوسرے ہاتھ سے فوراً سر توڑ کوششیں شروع کر دیں کہ یہ نوزائیدہ ملک زندہ رہنے کے قابل نہ ہونے پائے۔ اس کوشش میں اسے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی صورت میں بڑا کارآمد معاون و مددگار

مل گیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ پاکستان کن حالات میں جنم لیتا ہے اور جنم لینے کے بعد زندہ رہتا بھی ہے یا نہیں۔ اس وقت اس کا سب سے بڑا نصب العین یہ تھا کہ آزادی کے بعد بھارت جیسا وسیع و عریض ملک برٹش کامن ویلتھ آف نیشنز (دولت مشترکہ) میں ضرور شامل رہے۔ ماؤنٹ بیٹن کا ریفارمز کمشنر وی پی مینن سردار ولبھ بھائی پٹیل کا بھی دست راست تھا۔ اس کی دلالی میں وائسرائے اور سردار پٹیل کے درمیان سودا بازی ہوئی، اور یہ طے پایا کہ اگر پندرہ مہینے کی بجائے اقتدار دو ماہ میں منتقل کر دیا جائے، تو بھارت دولت مشترکہ کا ممبر بنا رہے گا۔

اقتدار پندرہ ماہ میں منتقل ہو یا دو ماہ میں، بھارت کی ہر طرح پو بارہ تھے۔ اسے بنی بنائی راجدھانی ملتی تھی، جمے جمائے دفتر ملتے تھے، اور صدیوں سے قائم شدہ چالو ادارے ملتے تھے۔ اس جلد بازی میں اگر کوئی مشکل درپیش تھی تو وہ صرف پاکستان کو تھی جسے ایک نئی مملکت کا آغاز انتہائی بے سر و سامانی اور سراسیمگی کی حالت میں کرنا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اپنے قول کے مطابق: "انتظامی طور پر پاکستان کی حکومت کو اپنا کام شروع کرنے کے لیے ہم نہ کوئی بنی بنائی عمارت دے سکتے ہیں نہ ٹین کی چھت دے سکتے ہیں بلکہ فقط ایک خیمہ دے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم اور کچھ نہیں کر سکتے۔"

اس مشکل کے علاوہ کانگرسی قیادت نے پاکستان کا گلا شروع ہی سے گھونٹنے کے لیے اور بھی کئی چالیں چلیں۔ شمال مشرقی سرحدی صوبے میں اکثریت تو مسلمانوں کی تھی جو پاکستان کے حامی تھے، لیکن ہندوؤں کے گٹھ جوڑ کے وہاں ڈاکٹر خان صاحب نے حکومت کانگرس کی قائم کر رکھی تھی۔ گاندھی جی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ صوبہ سرحد میں ہمہ پرسی (ریفرنڈم) نہ ہو بلکہ صوبائی اسمبلی کو اختیار دیا جائے کہ اگر وہ چاہے تو صوبے کو بھارت میں شامل کرنے کا فیصلہ کرے۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستان کو سینڈوچ کی طرح ہر طرف سے بھارت کے شکنجے میں جکڑ دیا جائے۔ یہ تجویز اتنی غیر اصولی اور

احمقانہ تھی کہ کانگرس کا ماؤنٹ بیٹن جیسا فرمانبردار آلہ کار بھی اس کی حمایت نہ کر سکا۔

دوسری چال یہ تھی کہ آزادی کے بعد دونوں مملکتوں کا ایک ہی مشترکہ گورنر جنرل ہو۔ پنڈت نہرو نے تو تحریری طور پر ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ کمٹمنٹ بھی کر لی تھی کہ انتقال اقتدار کے بعد وہ آزاد بھارت کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اپنی انا بھی یہی چاہتی تھی کہ پاکستان کی طرف سے بھی اسے ایسی ہی پیشکش ہو۔ لیکن قائداعظم نے دو اندیشی سے کام لے کر اس دام ہم رنگ زمیں میں پھنسنے سے انکار کر دیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور کانگرس میں ایسی گاڑھی چھن رہی تھی کہ کچھ ہندوؤں نے لاڈ سے اسے پنڈت ماؤنٹ بیٹن کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان حالات میں اسے دونوں ملکوں کا مشترکہ گورنر جنرل مقرر کرنا پاکستان کی گردن پر کانگرس کی چھری لٹکانے کے مترادف ہوتا۔ دراصل اس تجویز کا مقصد ہی یہ تھا کہ روز اول ہی سے پاکستان کی پالیسیوں کو بھارتی مفاد کے تابع رکھا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ماؤنٹ بیٹن دونوں ملکوں کا پہلا مشترکہ گورنر جنرل بن جاتا تو وہ اپنی افتاد طبع' سیاسی میلان اور ذاتی اور جذباتی وابستگی کے باعث پاکستان کو بھارت کا حاشیہ بردار سیٹلائٹ بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔

اس قسم کی مکاریوں' عیاریوں اور چالبازیوں میں ناکام ہونے کے بعد کانگرس نے ایک اور گل کھلایا۔ کانگرسی لیڈر عموماً اور سردار ولبھ بھائی پٹیل اور اس کے حواری خصوصاً اب ببانگ دہل دوان کی لینے لگے کہ مسلمانوں کو وہ پاکستان نہیں مل رہا جس کا وہ مطالبہ کر رہے تھے بلکہ انہیں بے حد کٹا کٹایا' لنگڑا لولا (Truncated) پاکستان دیا جا رہا ہے جس میں زیادہ دیر زندہ رہنے کی صلاحیت اور توانائی ہی نہیں۔ اس قسم کا پاکستان بہت جلد دم توڑ دے گا' اور گھٹنے ٹیک کر دوبارہ بھارت میں شامل ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔ گھر گھر کی یہ زہریلی مہم مسلمانوں کے حوصلے اور عزائم پست کرن کے لیے چلائی

گئی تھی۔ یہ مہم اتنی منظم تھی کہ بہت سے مسلمانوں کے انضباط اور اعتماد نفس پر بڑا برا اثر پڑا۔ کئی ذہنوں میں یہ سوال ابھرنے لگا کہ اس قسم کا Truncated پاکستان قابل

قبول ہے بھی یا نہیں؟

اس گومگو کے عالم میں سب کی نظریں قائداعظم پر لگی ہوئی تھیں۔ خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھی یہ خدشہ تھا کہ کہیں قائداعظم اس کے پارٹیشن پلان کو مسترد نہ کر دیں۔

اس خطرہ کے پیش نظر اس نے حکومت برطانیہ کی منظوری سے ایک "دستبرداری پلان" (Demission Plan) بھی تیار کر رکھا تھا۔ اس پلان کی رو سے اگر مسلم لیگ پارٹیشن پلان نہ مانے، تب بھی اقتدار دو ماہ کے اندر اندر منتقل کر دیا جائے گا۔ صوبائی اختیار موجودہ صوبائی حکومتوں کو منتقل کر دیئے جائیں گے اور مرکزی اختیارات موجودہ عبوری حکومت کو دے دیئے جائیں گے۔ مسلمانوں کے لیے کوئی خاص تحفظات نہیں رکھے گئے تھے۔ مسلمان کلی طور پر ہندو اکثریت کے سامنے ایک اقلیت کا درجہ رکھیں گے۔

اب قائداعظم کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک پارٹیشن پلان تھا۔ اس کے تحت ہندوستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بھارت اور پاکستان کی دو آزاد خود مختار مملکتوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ پاکستان میں مشرقی بنگال، مغربی پنجاب، سندھ اور بلوچستان براہ راست شامل تھے۔ سلہٹ اور صوبہ سرحد میں ریفرنڈم ہونا تھا۔ سرحدوں کے تفصیلی تعین کے لیے باؤنڈری کمیشن قائم کیا جانا تھا۔

اگر مسلم لیگ فوری طور پر پارٹیشن پلان کو منظور نہ کرتی تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا Plan Demission یکطرفہ عمل درآمد کے لیے میز پر تیار پڑا تھا۔ اس منصوبے کے تحت صوبہ سرحد سمیت ہندوستان کے آٹھ صوبوں کا کنٹرول ۱۴ اگست کو براہ راست کانگرس کے ہاتھ میں چلا جاتا کیونکہ وہاں پر کانگرسی وزارتیں قائم تھیں۔ پنجاب میں گورنر راج تھا لیکن وہاں بھی یونینیسٹ پارٹی کے گرگے موجود تھے جو ہندو کانگرسیوں اور سکھ اکالیوں کے ساتھ مل کر ہر چڑھتے ہوئے سورج کو سلام کرنے کا عملی تجربہ رکھتے تھے۔ صرف

سندھ اور بنگال میں مسلم لیگی وزارتیں تھیں جن کے خلاف کانگرسیوں اور دوسری ہندو پارٹیوں کے پریشر گروپ زبردست ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ Demission Plan کے تحت مرکزی کنٹرول عبوری حکومت کو ملنا تھا جس کے چھ کانگرسی ممبر اپنے ہم خیال تین اقلیتی نمائندوں کے ساتھ مل کر کسی وقت بھی پانچ مسلم لیگیوں کو بیک وقت بنی و دوگوش نکال کر باہر کر سکتے تھے اور ان کی جگہ اپنی مرضی کے مسلمان شو بوائز کو حکومت میں بھرتی کر سکتے تھے۔ اس صورت میں پورے ہندوستان کا اختیار بلا شرکت غیرے کانگرس کے قبضہ میں آ جاتا اور مسلمان قوم ایک اقلیت کی حیثیت سے بے یار و مددگار ان عناصر کے رحم و کرم پر چھوڑ دی جاتی جو سر سے پاؤں تک وسیع پیمانے پر مسلح تھے اور کلکتہ' بہار' گڑھ' مکیتسر اور دوسرے مقامات پر اپنے خون آشام ہاتھ بڑی سفاکی سے دکھا چکے تھے۔

ایک طرف Truncated پاکستان تھا' دوسری طرف ہندوؤں کی ابدی غلامی کا عفریت منہ کھولے بیٹھا تھا۔ ان دو متبادل صورتوں کے درمیان قائداعظم نے وہی راستہ اختیار کیا جو ایک عملی سیاست دان' دور اندیش مدبر اور صاحب فراست مسلمان کے شایان شان تھا۔ انہوں نے بڑے واضح احتجاج کے ساتھ پارٹیشن پلان منظور کر لیا۔

جن لوگوں کے دل میں اب بھی یہ وہم ہے کہ اس وقت Truncated پاکستان قبول کرنے کے سوا اور بھی کوئی چارہ کار تھا' انہیں لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور کانگرس کی ملی بھگت کے پس منظر میں Demission Plan کا تفصیلی مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

آخر ۳ جون ۱۹۴۷ء کا تاریخی دن طلوع ہوا' اور تقسیم ہند کے منصوبے کا باضابطہ سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا۔

یہ اعلان کانگرس کی منظوری کے ساتھ کیا گیا تھا۔ رسی تو جل گئی لیکن بل نہ گیا۔ چنانچہ گیارہ روز بعد ۱۴ جون کو آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کا جو اجلاس ہوا' اس میں تقسیم ہند کے "سانحہ" پر بڑے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور سب نے انتہائی

وثوق سے اس امید اور عزم کا اعلان کیا کہ یہ ایک عارضی بندوبست ہے جو وقت کی مجبوریوں اور مصلحتوں کی وجہ سے ناگزیر ہو گیا تھا ورنہ وہ دن دور نہیں جب بھارت ایک بار پھر متحدہ ہندوستان بن کے رہے گا۔ اس موقع پر کانگرس ورکنگ کمیٹی نے جو ریزولیشن پاس کیا' اس میں مندرجہ ذیل پیراگراف آج تک جوں کا توں موجود ہے۔

"Geography and the mountains and the seas fashioned India as She is, and no human agency can cahnge that shape or come in the way of her final destiny. Economic circumstances and the insistent demands of international affairs make the unity if India still more necessary."

"ہندوستان کی شکل و صورت اس کی جغرافیائی حدود' اس کے پہاڑوں اور اس کے سمندروں نے وضع کی ہے۔ کوئی انسانی تدبیر اس صورت کو بدل سکتی ہے نہ اس کے حقیقی مقدر کو ٹال سکتی ہے۔ معاشیاتی حالات اور بین الاقوامی امور کے شدید تقاضوں کے پیش نظر ہندوستان کی وحدت اور بھی زیادہ ضروری ہے۔"

ہندو مہا سبھا نے بھی کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف اعلان کر دیا۔

India is one and indivisible and there will never be place unless and until the separated areas are brought back into the Indian Union and made integral parts thereof.

"ہندوستان واحد اور غیر منقسم ہے۔ جب تک الگ کئے ہوئے علاقوں کو انڈین یونین میں واپس لا کر انہیں اس کا مکمل حصہ نہیں بنایا جاتا' اس وقت تک امن ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔"

اب بھارت میں اقتدار کانگرس کا ہو یا کانگرس کے مخالفین کا' دونوں صورتوں میں ہر بھارتی حکومت اس نصب العین کو پورا کرنے کی پابندہ ہے جس کا ذکر مندرجہ بالا اعلانات میں بڑی وضاحت سے موجود ہے۔ بھارت ہمارے ساتھ خیر سگالی کی بات کرے یا تعلقات معمول پر لانے کا آغاز کرے' تجارتی لین دین ہو یا زراعتی گفت و شنید ہو' یا ثقافتی ہیر پھیر ہو۔ ہر شعبے میں بھارت کی حکمت عملی کی سڑک ایک اور صرف ایک منزل کی طرف جاتی ہے۔ وہ منزل اکھنڈ بھارت ہے۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن' پنڈت جواہر لال نہرو' قائداعظم محمد علی جناح اور سردار بلدیو سنگھ نے پارٹیشن پلان پر آل انڈیا ریڈیو سے اپنے اپنے بیانات نشر کئے۔ میں نے یہ تاریخ براڈ کاسٹ کٹک کی ۱۸ سول لائنز میں بملا کماری والے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سنا۔ میرا کشمیری خانساماں رمضان اور بنگالی ڈرائیور روز محمد بھی ریڈیو کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب قائداعظم کی تقریر کا اعلان ہوا تو رمضان نے بڑی عقیدت اور پیار سے ریڈیو سیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

تقریریں ختم ہوئیں تو رمضان نے بڑی سادگی سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ایسے بڑے بڑے انگریز' ہندو اور سکھ "صاحب لوگ" مل جل کر مسلمانوں کے لیے پاکستان بنا رہے ہیں۔

"رمضان' تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں صاب' بالکل مالوم ہے۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ ------ لا الہ الا اللہ" رمضان نے لہک لہک کر ترنم کے لہجے میں کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ یہ کیسے بنا ہے؟" میں نے اسے مزید کریدنے کی کوشش کی۔

"ہاں صاب' مالوم' بالکل مالوم۔ بس لا الہ الا اللہ' بس لا الہ الا اللہ" رمضان نے وثوق سے جواب دیا۔

رمضان کے پاس ایمان کی دولت تھی۔ اس لیے اس کے لیے اتنا یقین ہی کافی تھا۔ میرے پاس اخباری تراشوں کی ضخیم سکریپ بک تھی۔ میں نے کاغذ پنسل سنبھالی اور اپنی دانشوری

کا بھرم رکھنے کے لیے تاریخی حوالوں کو کھنگال کر پاکستان کا مطلب نکالنے بیٹھ گیا۔

پاکستان کا مطلب کیا؟
۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تکمیل کی طرف ایک مثبت قدم

پاکستان کا مطلب کیا؟
سرسید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ کا تدریجی اور منطقی ارتقاء
پاکستان کا مطلب کیا؟
حکیم الامت علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر جو انھوں نے اپنے خطبہ الہ آباد میں پیش کیا تھا۔
پاکستان کا مطلب کیا؟
دینی' سماجی' معاشی' ثقافتی' تمدنی اور سیاسی بنیادوں پر مسلمانوں کا ایک الگ قوم کی صورت میں ابھرتا ہوا تشخص۔
پاکستان کا مطلب کیا؟
ہندو گئو رکھشا' مسلمان کا ذبیحہ' ہندو کی چٹیا' مسلمان کا ختنہ' ہندو کے مندر کا ناقوس' مسلمان کی مسجد کی اذان' ہندو کی چھوت چھات' مسلمان کی اخوت اور مساوات ------- ان اختلافات کی وجہ سے مستقل اور مسلسل خونریز تصادمات اور فسادات۔
پاکستان کا مطلب کیا؟
قومیت کی اجارہ داری پر ہندوؤں کی ضد اور ہٹ دھرمی
پاکستان کا مطلب کیا؟
آزاد اور متحدہ ہندوستان پر بلا شرکت غیرے حکمرانی کرنے کا کانگرسی جنون۔
پاکستان کا مطلب کیا؟
مسلمانوں کو ایک معمولی اقلیت کی طرح اکثریت کے رحم و کرم پر ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے زیر نگیں رکھنے کا منصوبہ۔
پاکستان کا مطلب کیا؟

مسلم اکثریتی علاقوں میں بھی مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے جمہوری حقوق دینے سے انکار۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

آزاد اور متحدہ ہندوستان کی حکومت میں مسلمانوں کو کوئی موثر کردار دینے کے خلاف ہندو سرمایہ داروں کی زبردست مخالفت اور مزاحمت۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

مسلم اکثریتی علاقوں کو بھارت ماتا کے پوتر بدن پر گندے ناسور سمجھ کر انہیں کاٹ کر الگ کر دینے کا شدھ کانگرسی اپریشن۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

بھارت کو برٹش کامن ویلتھ میں شامل رکھنے کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور کانگرس کی سودا بازی۔ اقتدار کو پندرہ مہینے کی بجائے دو ماہ میں منتقل کرنے کی سازش' تا کہ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو وجود میں آتے ہی ہر طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھارت اور پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل بنانے کی کوشش۔ تا کہ شروع ہی سے اس نئی مملکت کو بھارت کی حاشیہ نشینی کی عادت ڈال دی جائے' اور اس کی پالیسیاں بھارت کی پالیسیوں کے ہم رنگ اور تابع ہوں۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

Truncated پاکستان کی پیشکش کے مقابلے میں Demission Plan کی شمشیر برہنہ۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

کانگرس کا عزم کہ تقسیم ہند ایک عارضی عمل ہے۔ بھارت ایک ہے اور ایک ہو کے رہے گا۔ کوئی انسانی طاقت اس حقیقت کو نہیں بدل سکتی۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

ہندو مہا سبھا کا اعلان کہ بھارت ناقابل تقسیم ہے۔ الگ ہونے والے علاقوں کو ہر قیمت

پر دوبارہ بھارت میں شامل کیا جائے گا۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

ہندوؤں کی جارحیت اور انگریزوں کی منافقت کے گٹھ جوڑ کے مقابلے میں قائداعظم محمد

علی جناح کی بے لوث' بے لاگ' بے بل' بے خوف ایماندارانہ اور مدبرانہ قیادت۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

مسلمانوں کا قائداعظم کی رہنمائی پر مکمل اعتماد۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

تحریک پاکستان کے دوران مسلمان قوم کا اتحاد' ایمان اور نظم۔

آدھی رات ہو چکی تھی لیکن ابھی تک میری سکریپ بک کا عشر عشیر بھی ختم نہ ہوا تھا۔ میں نے تھک کر تراشوں کا انبار سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا' اور اپنی تن آسانی کو سہارا دینے کے لیے رمضان کی طرح کروڑوں مسلمانوں کا ہر دلعزیز شارٹ کٹ اختیار کر لیا۔ "پاکستان کا مطلب کیا؟ ------- لا الہ الا اللہ"

سیالکوٹ کے اصغر سودائی کا یہ لافانی مصرع ایک ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ میں بڑی دیر تک سرور کے عالم میں "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ" گنگناتا رہا۔ اس رات مجھے بڑی میٹھی اور پر سکون نیند آئی۔ خواب بھی بڑے دلفریب دیکھے۔ سب کے پو بارہ نظر آئے۔ سب کے وارے نیارے دیکھے۔ اپنی ترقی کی راہیں بھی بڑی کشادہ محسوس ہونے لگیں۔ دل و دماغ میں خوش امیدیوں کا جشن چراغاں ہونے لگا۔ ساری رات خوب عیش و نشاط میں گزری۔ نیند میں بھی "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ" کی طربناک گونج میرے کانوں میں رس گھولتی رہی اور میرے پردۂ خیال کو ایک لمحہ کے لیے بھی اس فکر نے آلودہ نہ کیا کہ

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل؟

دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

○ ◯ ○

• سادگی مسلم کی دیکھ

۱۹۴۷ء کے اگست کے مہینے میں ایک روز میں اپنی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ اس میں معمولی سے کھردرے سے بادامی کاغذ پر ایک سائیکلو سٹائلڈ خط نکلا' جسے میں اپنی زندگی کا ایک نہایت عزیز خط سمجھتا ہوں۔ آغا ہلالی نے نئی دہلی سے حکم بھیجا تھا کہ مجھے پاکستان کی وزارت تجارت میں انڈر سیکرٹری تعینات کیا گیا ہے اور میں ۱۴ اگست کے بعد جلد از جلد کراچی پہنچ کر اپنے عہدہ کا چارج لے لوں۔ اس خط کا نمبر اور تاریخ اس طرح درج تھے۔

No. CPS (ESTS)/4/47
Cabinet Secretariat (Pakistan)
New Delhi, the 7 August 1947

حکومت پاکستان کے نام سے اپنی زندگی کا پہلا خط پا کر جوش مسرت میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے ایک پوسٹنگ آرڈر نہیں بلکہ ایک سلطنت مل گئی ہے۔

اس خط کا ایک ایک حرف بجلی کی لہر کی طرح میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ میں نے اسے بار بار پڑھا' آنکھوں سے لگایا' سر پر رکھا اور بھاگم بھاگ وزیراعلیٰ کے کمرے میں پہنچ کر ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ شری ہری کرشن مہتاب بڑے خوش اخلاق اور نیک نیت ہندو تھے۔ میرے چہرے پر مسرت کا غیر معمولی ہیجان دیکھ کر وہ کچھ افسردہ سے ہو گئے اور بولے۔ "میری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں۔ جب جی چاہے چلے جانا۔ مجھے تو اس بات کی چنتا ہے کہ اگر سب مسلم آفیسر اسی طرح چلے گئے تو یہاں پر مسلمانوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

مہتاب صاحب کی یہ چنتا محض ان کی ذات تک محدود تھی۔ ورنہ سرکاری اور سیاسی طور پر تو وہ ان ہدایات کے پابند تھے جن میں کانگرس نے حکم دے رکھا تھا کہ ان کے

صوبے میں کوئی مسلمان پولیس اور انتظامیہ کی کسی کلیدی اور موثر اسامی پر متعین رہنے نہ پائے۔ یہ ہدایات آزادی سے چھ ماہ پہلے جاری ہوئی تھیں۔ آزادی کے بعد بھارت

میں کانگرس کی سیکولر حکومت نے جو گل کھلائے' اس کا بڑا واضح نقشہ کے ایل گابا کی کتاب "Passive Voices" میں ملتا ہے۔

کے ایل گابا کا پہلا نام کنہیا لال گابا تھا۔ وہ پنجاب کے ایک انتہائی متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انہوں نے بچپن ہی سے انگلستان میں تعلیم پائی۔ بیرسٹری کرنے کے بعد انہوں نے لاہور ہائیکورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔ وہ انگریزی زبان کے بڑے صاحب طرز انشاء پرداز تھے اور تیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کئی کتابیں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔

مسٹر گابا نے ۱۹۳۳ء میں اسلام قبول کر لیا۔ اس وقت ان کی عمر تیس سال سے کم تھی۔ ان کا اسلامی نام خالد لطیف گابا رکھا گیا۔ اس خبر نے چاروں طرف بڑا تہلکہ مچایا۔ قبول اسلام کے بعد مسٹر گابا نے سیرت النبی پر اپنی مشہور کتاب "The Prophet of the Desert" لکھی جو آج تک بہت سے حلقوں میں شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

کئی نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرح مسٹر گابا بھی تقسیم ہند کے خلاف تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے لاہور چھوڑ دیا' اور بمبئ منتقل ہو کر وہاں کی ہائیکورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔۔ پچیس برس تک انہوں نے بھارتی حکومت کے اپنی مسلمان رعایا کے ساتھ سلوک کا گہرا مطالعہ کیا اور انجام کار وہ بڑے دکھ سے اس نتیجے پر پہنچے کہ برصغیر میں دو قومی نظریہ ہی صحیح نظریہ ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب Passive Voices میں بھارت کی نام نہاد سیکولر ازم کے ڈھول کا پول کھولا اور سرکاری اعداد و شمار کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ بھارتی حکومتیں کس باقاعدگی اور ترتیب کے ساتھ مسلمانوں کو سرکاری' نیم سرکاری' سیاسی اور معاشی زندگی سے خارج کرتی رہی ہیں۔ آزادی کے بعد چند برس کے اندر اندر اڑیسہ کے سیکرٹریٹ' ہائیکورٹ اور پبلک سروس کمیشن میں ایک مسلمان افسر

بھی نہ رہا۔ اڑیسہ سے دس ممبر راجیہ سبھا اور بیس لوک سبھا کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ ان میں بھی مسلمانوں کا کوئی نمائندہ شامل نہیں۔ اڑیسہ کی صوبائی اسمبلی میں ایک سو چالیس سیٹیں ہیں۔ ایک مسلمان بھی اسمبلی کا ممبر منتخب نہیں ہو سکا۔

چیف منسٹر سے فارغ ہو کر میں چیف سیکرٹری مسٹر بی سی مکر جی کے پاس گیا۔ یہ بڑے شوقین مزاج' آزاد خیال اور دہریہ قسم کے آدمی تھے۔ گائے کا گوشت شوق سے کھاتے تھے اور غالباً اسی وجہ سے تعصب کے جذبات سے خالی تھے۔ آئی سی ایس کی ٹریننگ کے دوران انہوں نے لندن میں کسی کے پاس سورہ فاتحہ کا انگریزی ترجمہ دیکھا تھا۔ وہ اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ اسے حفظ کر لیا۔ کبھی کبھی موڈ میں آ کر مجھے سنایا کرتے تھے اور کہتے تھے۔ "یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا' سات چھوٹے چھوٹے فقروں میں اتنا کچھ آ گیا ہے کہ سات کتابوں میں بھی نہیں سما سکتا۔"

جب میں نے مسٹر مکر جی کو چیف منسٹر کی یہ تشویش بتائی کہ اگر مسلمان افسر پاکستان چلے گئے تو یہاں پر مسلم آبادی کی دیکھ بھال کون کرے گا' تو وہ زور سے ہنسے اور بولے۔ "مہتاب جی رسمی باتیں کرتے ہیں۔ تم یہاں رہ بھی جاؤ تو ۱۵ اگست کے بعد تمہیں ہوم ڈیپارٹمنٹ سے نکال کر غالباً ریکارڈ آفس کا افسر بکار خاص لگا دیا جائے گا تا کہ بند کمرے میں بیٹھ کر پرانی پرانی فائلوں کی گرد جھاڑتے رہو۔"

مسٹر مکر جی نے میز کی دراز سے ایک فائل نکالی اور اسے کھول کر مجھے ایک صفحہ دکھایا جس میں صوبے کے نئے گورنر چندو لال ترویدی نے چیف سیکرٹری کو انتہائی درشت الفاظ میں بڑی سخت ڈانٹ پلائی تھی۔ نیا گورنر بھی آئی سی ایس افسر تھا اور حال ہی میں ڈیفنس سیکرٹری کے عہدے سے ترقی پا کر اڑیسہ کا پہلا ہندوستانی گورنر مقرر ہوا تھا وہ بڑا تیز طرار' دھانسو قسم کا نبرد جو ہندو تھا' اور کانگرس کے ساتھ اپنا قارورہ ملانے کی لیے ہر قسم کے اوچھے ہتھیار استعمال کرنے پر کمر بستہ رہتا تھا۔ چیف منسٹر اور دوسرے کانگرسی وزیروں کے سامنے وہ بڑی فرمانبرداری سے دم ہلاتا رہتا تھا لیکن چیف سیکرٹری سمیت باقی

افسروں پر وقت بے وقت' جائز ناجائز دھونس جمانا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ چیف سیکرٹری کے طور پر میں بھی چند روز کا مہمان ہوں۔" مسٹر مکر جی نے کہا۔ "یہ لوگ مجھے درجہ اول کا ہندو نہیں سمجھتے۔ اس لیے بہت جلد مجھے بھی کسی بے ضرر اور بے اثر محکمے کی پول میں دھانس دیا جائے گا۔ مجموعی طور پر یہ چھوٹے دل کے کمینے لوگ ہیں۔ ان کے پتھریلے ضمیر انسان دوستی کی شبنم سے ناآشنا ہیں۔

تم ان کی باتوں میں نہ آنا۔ بڑے شوق سے پاکستان جاؤ۔ وہاں جانا تمہارا فرض ہے۔

چند روز بعد گورنر ہاؤس میں کسی ڈنر کی تقریب تھی۔ اسی روز اعلان ہوا تھا کہ ۱۵ اگست سے مسٹر چندو لال ترویدی مشرقی پنجاب کے گورنر ہوں گے۔ اس خبر پر وہ بے حد مسرور تھے' کیونکہ پنجاب کی تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب کو لازمی طور پر ایک پرابلم صوبہ ثابت ہونا تھا۔ ایسے صوبے کی گورنری کے لیے مسٹر چندو لال ترویدی کا انتخاب ان کی برتری و تفوق کا بڑا نمایاں طرۂ امتیاز تھا۔ چنانچہ وہ وہسکی کا گلاس ہاتھ میں لیے اور ایک موٹا سا سگار کلے میں دبائے پارٹی میں بلبل کی طرح چہک رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ گوریلے کی طرح میری طرف لپکے اور بڑی بلند آواز میں بولے۔ "میں نے سنا ہے تم بھی پاکستان جانے کی تیاری کر رہے ہو۔ بہت خوب! ------- اگر کبھی لاہور کی طرف آنا ہوا' تو مجھے ضرور ملنا۔ مجھے لاہور کا گورنر ہاؤس خاص طور پر پسند ہے۔ اس کے سامنے لارنس گارڈن کی بڑی اچھی سیر گاہ ہے۔"

گورنر کی یہ بات سن کر میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میرے چہرے پر الجھن اور پریشانی کے آثار دیکھ کر ترویدی صاحب نے اپنا بھاری بھر کم بھدا سا ہاتھ میرے شانے پر زور سے مارا اور قہقہہ لگا کر بولے۔ "ہاں' ہاں' لاہور۔ میرے دوست' گڈ اولڈ لاہور۔ مشرقی پنجاب کا نیچرل دارالخلافہ لاہور ہی تو ہے۔"

"کیا یہ فیصلہ ہو چکا ہے؟" میں نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

چیف سیکرٹری مسٹر بی سی مکر جی جو قریب ہی کھڑے وہسکی کا گلاس سوڈا ملائے بغیر غٹاغٹ

پی رہے تھے' میری بات سن کر آگے بڑھے اور نہایت طنزیہ تلخی کے ساتھ بولے۔ "سر سیرل ریڈ کلف نے تو ابھی تک کسی فیصلے کا اعلان نہیں کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر ہز ایکسیلینسی کو لاہور کا گورنمنٹ ہاؤس پسند ہے تو لاہور مشرقی پنجاب کو ہی ملنا چاہیے۔"

گورنر چندو لال ترویدی نے خونی آنکھوں سے چیف سیکرٹری کو گھورا' اور اپنا سگار دانتوں میں چبا کر جنگلی بلے کی طرح غرائے۔ جواباً مسٹر مکر جی نے بھی دھمکی کے انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے۔ صورت حال کی نزاکت کو دیکھ کر شری ہری کرشن مہتاب تیزی سے جھپٹے اور گورنر کو بازو سے تھام کر دوسری طرف لے گئے۔

"یہ حرامزادہ کتیا کا بچہ ہے۔" چیف سیکرٹری نے شستہ انگریزی میں ٹھیٹھ انگلستانی گالی دی۔ "مشرقی جا کر یہ ضرور سکھوں سے شدید فساد کروائے گا۔ گندا کتا۔ سن آف گن"

مسٹر مکر جی کا پارہ خوب چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے گلاس میں بہت سی مزید نیٹ وہسکی انڈیلی اور گورنر کی طرف بڑھنے کا رخ کرتے ہوئے بڑبڑائے۔ "یہ سالا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ کانگرسی چوہڑے اور چماروں کے تلوے چاٹ چاٹ کر سیاسی بد رو میں رینگنے والا ذلیل کیڑا۔ میں ابھی اس کا دماغ ٹھیک کر کے آتا ہوں۔"

میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ چندو لال ترویدی اور بی سی مکر جی کے مابین لپاڈگی کے امکان بڑے روشن ہو رہے تھے۔ ریڈ کلف کا فیصلہ تو جب آتا ہے' آتا رہے گا' فی الحال گورنمنٹ ہاؤس کٹک کے لان پر ایک کٹر ہندو گورنر اور نیم ہندو چیف سیکرٹری کے درمیان لاہور کے قبضہ پر کچھ دست بدست تبادلہ خیال ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن صد حیف کہ میری یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ کچھ اور لوگوں نے مسٹر مکر جی کو اپنے حفاظتی گھیرے میں لے لیا' اور ان کا موڈ بدلنے کے لیے ان کی تازہ ترین محبوبہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسٹر مکر جی کے سر سے گورنر اور لاہور دونوں کے بھوت اتر گئے اور وہ وہسکی پر وہسکی پینے اور اپنے گونا گوں معاشقوں کے ذکر اذکار میں گم ہو گئے۔

اس کے برعکس نئی دہلی کے وائسرائیگل لاج میں کام کرنے والے لوگ مسٹر مکر جی کی نسبت زیادہ قوی الارادہ اور مستقل مزاج تھے۔ انہوں نے اپنے جی میں ٹھان رکھی تھی کہ تقسیم ہند کے عمل میں پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو ہر پہلو سے زیادہ سے زیادہ بے بس اور پا شکستہ کرنا ہے۔ شب و روز کی انتھک محنت سے وہ اپنے اس عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انتہائی نظم و ترتیب سے مصروف کار تھے۔

سارے ہندوستان کی حکومت کا مرکز اعصاب دہلی میں تھا۔ ریلوں' بندرگاہوں اور پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف سسٹم کا نظام کار دہلی سے کنٹرول ہوتا تھا۔ صنعتی مراکز اور ریسرچ کے ادارے بھارتی علاقوں میں تھے۔ امپیریل لائبریری کلکتہ میں تھی۔ بری' بحری اور ہوائی فوج کے ہیڈ کوارٹر دہلی میں تھے۔ سولہ کی سولہ آرڈیننس فیکٹریاں اور فوجی سامان کے تمام ڈپو بھی بھارت کے علاقے میں واقع تھے۔ اس کے علاوہ برٹش راج کا سب سے زیادہ رفیع الشان اور نظر فریب گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی بھارت کے حصے ہی میں آیا تھا۔

متحدہ ہندوستان کے دفتری' مالی اور فوجی اثاثوں کا منصفانہ حصہ پاکستان کو دینا پارٹیشن کونسل کی ذمہ داری تھی جس کا صدر لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھا۔ ہندو قدم قدم پر ڈنڈی مارتا تھا اور سردار پٹیل نے تو گویا قسم کھا رکھی تھی کہ پاکستان کو کام کی کوئی چیز ملنے نہ پائے۔ پاکستان کے حق کی وکالت کرنے کا سہرا چوہدری محمد علی کے سر ہے۔ انہیں قائداعظم اور نوابزادہ لیاقت علی کا مکمل اعتماد حاصل تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے انتھک محنت' لگن اور قابلیت سے اپنے فرائض کو نبھایا۔ پاکستان کے عالم ظہور میں آنے کے وقت اس کی راہ میں جو دشواریاں' رکاوٹیں اور مزاحمتیں حائل کی جا رہی تھیں ان کا احاطہ چوہدری صاحب نے بڑی خوبی اور وضاحت سے اپنی کتاب Emergence of Pakistan میں کیا ہے۔ اس موضوع پر یہ نہایت اہم' مستند' بے لاگ اور واقعیت پسندانہ دستاویز ہے اور تقسیم ہند کے عمل میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن' اس کے انگریز مشیروں اور کانگرسی لیڈروں

کی ملی بھگت کے بہت سے پوشیدہ گوشوں کو بڑی وضاحت سے بے نقاب کرتی ہے۔
تقسیم کے وقت حکومت ہند کے پاس چار ارب روپے کا کیش بیلنس تھا۔ بڑی طویل تکرار' حجت اور مول تول کے بعد پاکستان کو ۷۵ کروڑ روپیہ دینا طے ہوا۔ بیس کروڑ کی ایک قسط ادا کرنے کے بعد بھارت نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب پاکستان وجود میں آیا تو اس نئی حکومت کے پاس بس یہی نقد اثاثہ تھا۔ اس وقت مملکت خدا داد کے سامنے مسائل اور اخراجات کی غیر معمولی بھرمار تھی۔ بھارت کے لیے یہ سنہری موقع تھا کہ کیش بیلنس کی ادائیگی روک کر روز اول ہی سے اس نئی مملکت کے دیوالیہ پن کو ساری دنیا میں مشتہر کر دے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء تک کا زمانہ پاکستان کے لیے مالی لحاظ سے بڑا نازک اور پر خطر تھا لیکن یہ منزل بڑی خوش اسلوبی سے گزر گئی۔ کیونکہ حکومت اور عوام دونوں آزادی کے نشے میں سرشار' کام کی لگن میں چست اور ہر مشکل پر قابو پانے کے لیے تیار تھے۔ آخر ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی کے "مرن برت" سے گھبرا کر بھارتی حکومت نے کیش بیلنس کی باقی قسط بھی بادل نخواستہ پاکستان کو ادا کر دی۔
فوجی سامان کا ایک تہائی حصہ پاکستان کے حصے میں آنا باہمی رضا مندی سے منظور ہوا تھا۔ آرڈیننس فیکٹریاں اور ملٹری سٹور ڈپو سب کے سب بھارت میں تھے۔ اس لیے ان پر بھارتی حکومت کا پورا قبضہ تھا۔ مسلح افواج اور فوجی سامان کی تقسیم کے لیے جو ادارہ قائم ہوا تھا' فیلڈ مارشل آکنلیک اس کے سپریم کمانڈر تھے۔ جیسے ہی انہوں نے کوشش کی کہ پاکستان کو ملٹری سٹورز وغیرہ کا منظور شدہ حصہ ملنا شروع ہو جائے' کانگرسی حکومت نے آسمان پر اٹھا لیا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مل کر ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ فیلڈ مارشل آکنلیک کو استعفیٰ دے پر کر پسپا ہونا پڑا۔ نتیجے کے طور پر فوجی ساز و سامان میں پاکستان کے حق کا کوئی حصہ آج تک ہمیں وصول نہیں ہو سکا۔
دہلی سے سرکاری ملازمین' دفتری فائلوں اور دوسرے متعلقہ سامان کو کراچی پہنچانے کے لیے ہر روز ایک سپیشل ٹرین چلانے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ لیکن بہت جلد یہ بندوبست ترک

کر دینا پڑا کیونکہ ان گاڑیوں پر ہندوؤں اور سکھوں کے شدید حملے شروع ہو گئے۔ ان گنت لوگ مارے گئے۔ بہت سا ریکارڈ تلف ہو گیا۔ بے شمار سامان لٹ گیا۔ ٹرینوں کا سلسلہ بند ہونے کے بعد کچھ دنوں بی او اے سی کے ہوائی جہازوں سے "آپریشن پاکستان" چلا کر کسی حد تک یہی کام لیا گیا۔

ان گونا گوں مسائل کے علاوہ ایک بہت بڑا مسئلہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا تھا۔ ایک تجویز یہ تھی کہ یہ نازک اور اہم کام یو این او کی سرکردگی میں کروایا جائے لیکن پنڈت جواہر لال نہرو نے اسے دو ٹوک رد کر دیا۔ قائداعظم کا مطالبہ تھا کہ صوبوں کی تقسیم کے لیے جو باؤنڈری کمیشن بنائے جائیں۔ ان میں انگلستان کے تین لاء لارڈز کو شامل کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ملا کہ لاء لارڈز کہنہ سال لوگ ہیں اور وہ ہندوستان کی گرمی برداشت نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نامزدگی پر قرعہ فال ایک انگریز وکیل سر سیرل ریڈ کلف کے نام نکلا۔ اور بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے لیے جو باؤنڈری کمیشن ترتیب دیئے گئے اسے ان دونوں کا مشترکہ چیئرمین بنا دیا گیا۔

ریڈ کلف کو اپنی شخصیت کے مقناطیس کے زیر اثر رکھنے کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اسے وائسرائیگل لاج میں مہمان رکھا۔ ریڈ کلف نے بھی اس مسافر نوازی اور تواضع کا پورا پورا صلہ دیا کیونکہ اب یہ بات تاریخی شواہد سے پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے متعلق ریڈ کلف ایوارڈ پاکستان کے خلاف بد دیانتی' فراڈ اور سراسر نا انصافی پر مبنی تھا۔ چودھری محمد علی صاحب نے اپنی کتاب میں اس کے متعلق کئی حیرت انگیز' چشم دید اور براہ راست واقعات بیان کئے ہیں۔ اس بات کا دو ٹوک فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ریڈ کلف کی شرمناک جانبداری فقط لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اثر و رسوخ کا نتیجہ تھی یا اس کی تہہ میں سیم و زر کے کچھ محرکات بھی کار فرما تھے۔ یوں اس زمانے میں یہ افواہ بڑی گرم تھی کہ کانگرس نے ریڈ کلف کی خدمت میں دو کروڑ روپے کا نذرانہ چڑھایا ہے۔ ایسی باتوں کا حتمی ثبوت نہیں ملا کرتا۔ رشوت لے کر تو

چونگی کا محرر بھی صاف بچ نکلتا ہے۔ کانگرس' لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف کا گٹھ جوڑ تو بڑی بات تھی۔ برصغیر میں لارڈ کلائیو اور وارن ہیسٹنگز جیسے مشاہیر باج' خراج اور نذرانہ وصول کرنے کی جو روایات چھوڑ گئے ہیں' ان کے پیش نظر اس بات کی کون ضمانت دے سکتا ہے کہ لندن کا ایک غیر معروف وکیل اس زمانے کی دو کروڑ روپے کی خطیر رقم کو شاہنہ نیازی کے ساتھ پائے حقارت سے ٹھکرا دے گا؟ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ایک ماہر قانون دان ایسے فیصلے کرے جو نہ صرف خلاف عقل' خلاف ضابطہ اور خلاف شہادت ہوں بلکہ بین طور پر بد نہادی' کج رائی' تمرد اور خود سری پر مبنی ہوں۔

ایک فیصلہ تو کلکتہ کے متعلق تھا' جسے ریڈ کلف نے بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے مغربی بنگال میں شامل کر دیا۔ جب کسی نے یہ تجویز پیش کی کہ کلکتہ شہر کی رائے معلوم کرنے کے لیے وہاں ریفرنڈم کروا لیا جائے تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے توبہ توبہ کر کے کانوں کو ہاتھ لگائے' کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہاں کی اچھوت آبادی مسلمانوں کے ساتھ مل کر مشرقی بنگال میں شمولیت کے حق میں رائے نہ دے دے۔ دو برس بعد سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کلکتہ میں ایک تقریر کے دوران یہ انکشاف کیا' کہ کانگرس نے ہندوستان کی تقسیم اس شرط پر مانی تھی کہ کلکتہ ہندوستان کے حصے میں آئے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ خفیہ معاہدہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ ہی ہوا ہو گا۔ مسلم لیگ کو اس سازش کی کوئی خبر نہ تھی۔

پنجاب کی تقسیم میں ریڈ کلف نے اس سے بھی زیادہ خطرناک گل کھلایا۔ گورداسپور کے ضلع کی آبادی میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی۔ تقسیم کے متفقہ فارمولے' کی ہر شق کی مطابق یہ ضلع پاکستان کے حصے میں آتا تھا۔ لیکن ریڈ کلف نے بغیر کوئی وجہ بتائے اسے بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ بھارت کو دے دیا۔ اس طرح بھارت کو ریاست جموں و کشمیر کے ساتھ آمد و رفت کا وہ راستہ مل گیا' جو کسی اور طرح اسے

میسر نہ آ سکتا تھا۔ ریڈ کلف کا یہ فیصلہ دور رس سیاسی بد نیتی کا مظہر تھا' کیونکہ گورداسپور کے بغیر بھارت کو کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا موقع ہاتھ آ سکتا تھا نہ راستہ مل سکتا تھا۔

پہلی ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے جب کشمیر ڈوگروں کے ہاتھ فروخت کیا تھا تو اس کی قیمت مبلغ ۷۵ لاکھ روپے پڑی تھی۔ اب عین ایک سو برس بعد فرنگیوں نے جب دوسری بار کشمیر ہندوؤں کے قبضہ اختیار میں دینے کی چال چلی تو اس کی بھاری قیمت بھارت سے نہیں بلکہ پاکستان سے وصول کی گئی۔ گورداسپور کے راستے بھارت کشمیر کے ساتھ براہ راست منسلک کر کے برطانیہ نے پاکستان کی نظریاتی' جغرافیائی اور معاشی سرحد پر ایک ننگی تلوار لٹکا دی اور حربی نقطہ نظر سے اس نئی مملکت کو غیر متوقع اطراف و جوانب سے بھارت کے بے جواز گھیراؤ میں دھکیل دیا۔

مغربی پنجاب کی معاشی زندگی کو بھارت کے پنجہ اختیار میں دینے کے لیے ریڈ کلف نے گورداسپور کے نہلے پر فیروز پور کا دہلا بھی مار دیا۔ فیروز پور میں ان نہروں کے ہیڈ ورکس تھے' جو مغربی پنجاب کو سیراب کرتی تھیں۔ ریڈ کلف نے یہ ہیڈ ورکس بھی بھارت کی جھولی میں ڈال دیئے۔ آٹھ مہینے کے اندر اندر اپریل ۱۹۴۸ء میں بھارت نے ان نہروں کا پانی بند کر کے پاکستان کو اپنی برتری کا مزا بھی چکھا دیا۔

۱۶ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ریڈ کلف کے معاندانہ' مفسدانہ اور نامنصفانہ ایوارڈ کا اعلان ہوا' اس وقت مشرقی پنجاب اور دہلی کے مسلمانوں پر قتل و غارت کی قیامت ٹوٹی ہوئی تھی' ہندوؤں اور سکھوں کے مسلح جتھے فوجیوں اور پولیس کی مدد سے کلمہ گو مردوں' عورتوں اور بچوں کے جان' مال اور ناموس سے درندوں کی طرح کھیل رہے تھے۔

کتنے لوگ تہ تیغ ہوئے؟

کتنی عصمتیں لٹیں؟

کتنے معصوم بچے مارے گئے؟

ان سوالوں کا جواب تاریخ کے حساب دان دینے سے سراسر قاصر ہیں۔ ان کا جواب صرف

پاکستان کی بنیادوں میں محفوظ ہے۔

دہلی اور مشرقی پنجاب کے علاوہ بھارت کے طول و عرض میں بہت سی اور جگہ بھی ہندو اور سکھ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے میں حسب توفیق مصروف عمل تھے۔

مسلمانوں کے لیے بھارت کی ہر شاہراہ' ہر پگڈنڈی پاکستان کی طرف جاتی تھی اور چند ماہ کے اندر اندر ڈیڑھ کروڑ سے اوپر لٹے پٹے مہاجر پاکستان میں ہجرت کر کے آ گئے۔

۱۵ اگست کو جب بھارت پر آزادی کی دیوی کا نزول ہوا تو امرتسر شہر نے اس روز سعید کو عجیب طور پر منایا۔ جان کونیل نے اپنی کتاب "آکنلیک" میں لکھا ہے کہ اس روز سکھوں کے ایک ہجوم نے مسلمان عورتوں کو برہنہ کر کے ان کا جلوس نکالا۔ یہ جلوس شہر کے گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ پھر سارے جلوس کی عصمت دری کی گئی۔ اس کے بعد کچھ عورتوں کو کرپانوں سے ذبح کر دیا گیا۔ باقی کو زندہ جلا دیا گیا۔ واہ گرو کا خالصہ' واہگرو کی فتح!

○○○

• کراچی کی طوطا کہانی

اگست کے شروع ہی میں کٹک سے کراچی پہنچنے کے سارے رستے مسدود ہو چکے تھے۔ جوں توں کر کے میں کسی نہ کسی طرح بنگال ناگپور ریلوے کے ذریعے ۱۲ ستمبر کو بمبئی پہنچ گیا اور اگلے روز ائیر انڈیا کے ہوائی جہاز سے کراچی آ گیا۔

جب ائیر انڈیا کا وائی کاؤنٹ جہاز کراچی کے ہوائی اڈے پر لینڈ ہوا تو میرا خیال تھا کہ ہم سب مسافر ارض پاک پر سر کے بل اتریں گے اور اترتے ہی اپنی جان اور ایمان سلامت لے آنے پر باجماعت سجدۂ شکرانہ ادا کریں گے۔ لیکن جہاز سے نکلتے ہی ہمیں نفسا نفسی کے آسیب نے دبوچ لیا' اور ہم ایک دوسرے سے ٹکراتے' ایک دوسرے کو پچھاڑتے' ایک دوسرے سے دھکم دھکا ہوتے اپنے اپنے سامان کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ سامان وصول کر کے ہم اسے سینے سے لگا کر بیٹھ گئے اور آج تک اسی سامان کو بڑھانے' سجانے' چمکانے میں دل و جان سے مصروف ہیں۔ جو شجدۂ شکرانہ کراچی ائیر پورٹ پر قضا ہو گیا تھا' سامان کے جھمیلے میں وہ اب تک واجب الادا چلا آ رہا ہے۔ کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر!

وزارت تجارت' صنعت اور ورکس چیف کورٹ بلڈنگ میں واقع تھی۔ مسٹر آئی آئی چندریگر وزیر' مسٹر میکفار سیکرٹری اور مسٹر شجاعت علی حسنی جائنٹ سیکرٹری تھے۔ انڈر سیکرٹری کے طور پر مجھے امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ سیکشن کا چارج دیا گیا۔ میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ تجارت کسے کہتے ہیں اور برآمدات و درآمدات کس چڑیا کا نام ہے۔ بندر روڈ پر ایک کباڑیے کی دکان میں سے میں نے ایک انٹرنیشنل ٹریڈ ڈائریکٹری اور ایک سیکنڈ ہینڈ فلپس اٹلس خریدی اور اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دیا۔

کام کرنے کے لیے مجھے ایک چھوٹا سا کیبن ملا ہوا تھا۔ پہلے روز اس میں فقط ایک میز تھا۔ دوسرے روز ایک کرسی بھی مل گئی۔ چند روز بعد ایک دو کرسیاں اور بھی آ گئیں۔

فائلوں کے لیے کاغذ، پن، ٹیگ کبھی دفتر سے مل جاتے تھے، کبھی ناغہ ہو جاتا تھا۔ اس روز میں یہ اشیاء بازار سے خود خرید لاتا تھا۔

ان دنوں پاکستان میں اچانک چینی اور کوئلے کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔ بھارت سے ان دونوں اشیاء کی درآمد یکایک بند ہو گئی۔ چینی کی جگہ تو خیر لوگوں نے گڑ کا استعمال شروع کر دیا اور کراچی میں جا بجا طرح طرح کا گڑ ریڑھیوں پر بکنے لگا۔ لیکن کوئلے کی کمی بڑی باعث تشویش تھی۔ اس وقت ہماری سب ریل گاڑیاں کوئلے پر چلتی تھیں، اور اس کی قلت سے رسل و رسائل کے سارے نظم کے معطل ہو جانے کا شدید خدشہ تھا۔ اس صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے چندریگر صاحب نے متعلقہ وزارتوں کے افسروں کی ایک ہنگامی میٹنگ منعقد کی۔ میں سیکنڈ ہینڈ فلپس اٹلس اور انٹرنیشنل ٹریڈ ڈائریکٹری کی مدد سے اپنا ہوم ورک کر کے گیا تھا۔ اس لیے میری چند تجاویز بڑی سہولت سے منظور ہو گئیں۔ اس سے میرے وزیر، سیکرٹری، جائنٹ سیکرٹری کو غالباً یہ خوش فہمی ہو گئی کہ مجھے بین الاقوامی تجارت کے معاملات پر کوئی خاص عبور حاصل ہے۔ لیکن مجھے علم تھا کہ میں اندر سے کھوکھلا ہوں۔ تاہم اپنی ہمہ دانی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے میں نے بازار سے تجارتی معاشیات اور فن اعداد و شمار پر کئی کتابیں خرید کر چند روز میں پڑھ ڈالیں اور محکمانہ میٹنگوں میں زبانی کلامی حد تک دخل در معقولات دینے کی شد بد حاصل کر لی۔

میرے اس سطحی قسم کے علم سے چندریگر صاحب خاص طور پر مرعوب تھے۔ اور اپنی بہت سی میٹنگوں میں مجھے اکثر اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ ایک روز وزیر خزانہ غلام محمد صاحب کے کمرے میں میٹنگ تھی۔ کراچی میں دفتری اور رہائشی ضروریات کے لیے جو نئی عمارتیں اور کوارٹر تعمیر ہو رہے تھے، ان کے لیے سینیٹری سامان درآمد کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ میٹنگ میں چار وزیر اور کچھ افسر شریک تھے۔ وزیروں میں مولوی فضل الرحمٰن بھی موجود تھے۔ جن کے پاس امور داخلہ، اطلاعات اور تعلیم کا چارج تھا۔

کچھ بحث و تمحیث کے بعد جب سینیٹری کے سامان کا کوٹہ طے ہو گیا تو وزیر تعلیم مولوی فضل الرحمٰن نے دبے الفاظ میں تجویز پیش کی کہ اگر اس امپورٹ کا کچھ حصہ ڈھاکہ کے لیے بھی مخصوص کر دیا جائے تو مناسب ہو گا۔

اس تجویز پر بڑی ہنسی اڑی۔ کسی نے کہا کہ ڈھاکہ میں کئی خاص تعمیری کام شروع نہیں ہوا' اس لیے وہاں پر سینیٹری سامان بھیجنے کی کوئی تک نہیں۔ کسی نے کہا کہ جو سامان ڈھاکہ جائے گا وہ لازمی طور پر سمگل ہو کر کلکتہ پہنچے گا۔ ایک صاحب نے مذاق ہی مذاق میں یہ پھبتی اڑائی کہ بنگالی لوگ تو کیلے کے گاچھ کی اوٹ میں بیٹھ کر رفع حاجت کرنے کے عادی ہیں' وہ ابھی سے کموڈ اور واش بیسن لے کر کیا کریں گے۔

مولوی فضل الرحمٰن مسکرائے نہ بگڑے۔ انتہائی متانت اور سنجیدگی سے انہوں نے ایک بار پھر زور دے کر کہا کہ زیادہ نہیں تو اس سامان کا ایک قلیل علامتی سا حصہ ڈھاکہ کے لیے ضرور مخصوص کیا جائے' کیونکہ نفسیاتی طور پر یہ مناسب اقدام ہو گا۔ کچھ مزید بحث و مباحثہ اور طنز و مزاح کے بعد مولوی فضل الرحمٰن صاحب کی بات مان لی گئی' اور ڈھاکہ کے لیے سینیٹری سامان کا کچھ حصہ مخصوصل ہو گیا لیکن ایسی بد مزگی کے ساتھ جس طرح دودھ میں مینگنیاں ڈال کر پیش کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں لاشعوری طور پر بنگلہ دیش کی بنیادوں کی کھدائی کا کام اسی روز شروع ہو گیا تھا۔

کامرس منسٹری میں امپورٹ اور ایکسپورٹ کا انڈر سیکرٹری بنتے ہی میرے دفتر کا چھوٹا سا کمرہ بڑے بڑے تاجروں اور سیٹھوں کی محبوب گزرگاہ بن گیا۔ سارا دن بھانت بھانت کے نئے اور پرانے تاجر میرے کمرے میں منڈلاتے رہتے تھے۔ کچھ کام سے آتے تھے' کچھ ویسے ہی کنٹیکٹ بنانے کی فکر میں چکر لگاتے رہتے تھے۔ ان سب میں ایک مضبوط قدر مشترک یہ تھی کہ وہ یکساں لگن سے پیسہ بنانے کی دھن میں سرشار تھے۔ جائز و ناجائز کے سوال پر وہ حیرت و استعجاب سے بھوئیں چڑھاتے تھے۔ کیونکہ یہ بے

وقت کی راگنی ان کے ذوق سماعت پر بڑی گراں گزرتی تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ پاکستان کو فوری طور پر تجارتی وسعت اور معاشی پھیلاو کی ضرورت ہے۔ اس وقت اخلاقی موشگافیوں کی عیاشی میں وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں۔ یہ سب لوگ پاکستان کی ترقی کے دل و جان سے خواہاں تھے۔ اور مملکت خدا داد کی ترقی کا پیمانہ ہر ایک کی اپنی اپنی ذاتی تجوری میں نصب تھا۔ میرے چھوٹے سے دفتر میں فقط ایک کھڑکی تھی جو حرص و ہوا کے اس غبار کو خارج کرنے کے لیے بالکل ناکافی تھی جو ہر آنے والا میرے کمرے کی فضا میں متعدی سمی بخارات کی طرح چھوڑ جاتا تھا۔

ایک روز میرے پاس ریفریجریٹروں کی درآمدی فرم کے ایک ذیشان تاجر کسی کام سے بیٹھے تھے۔ میرا اردلی پینے کے پانی کا ایک جگ لا کر میز پر رکھ گیا۔ جگ میں برف کا ایک بڑا سا ڈلا تیرتا ہوا دیکھ کر تاجر صاحب بڑے حیران ہوئے اور بولے۔ "کیا اپ بازار کی برف استعمال کرتے ہیں؟"

میں نے اثبات میں جواب دے کر کراچی کی برف کی کچھ تعریف کی تو تاجر صاحب نے بازاری برف کی مضر صحت اور مہلک خصوصیات پر ایک طویل تقریر کی۔ "غالباً آپ کا ریفریجریٹر ابھی کراچی نہیں پہنچا۔" انہوں نے پوچھا۔

جب میں نے انہیں آگاہ کیا کہ میرے پاس سرے سے ریفریجریٹر ہے ہی نہیں تو تاجر صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے عجیب قسم کی حیرت سے گھورا۔

اس شام جب میں سمرسٹ ہاؤس واپس آیا' تو دو مستری ایک نیا ریفریجریٹر میرے کمرے میں کھٹا کھٹ فٹ کرنے میں مصروف تھے۔ ایک مستری نے مجھے ایک لفافہ دیا جس میں تاجر صاحب کا وزٹنگ کارڈ تھا۔ کارڈ پر ہاتھ سے یہ مصرع تحریر تھا۔ "برگ سبز است تحفہ درویش"

ریفریجریٹر دودھ کی طرح سفید اور لوہے کی طرح سخت تھا۔ اور تاجر صاحب اسے برگ سبز کا نام دے کر میرے حلق سے اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے ان کی اس بد ذوقی پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے ریفریجریٹر ایک گھوڑا گاڑی پر لدوایا اور مستریوں کو

ساتھ لے کر ان کے شو روم میں پہنچا جو وکٹوریہ روڈ کے ایک فیشن ایبل علاقے میں واقع تھا۔ تاجر صاحب خود تو وہاں موجود نہ تھے لیکن اگلے روز وہ بنفس نفیس میرے دفتر میں تشریف لائے۔ ان کے منہ پر بیرنگ لفافوں کی طرح گلوں شکووں کی بے شمار مہریں لگی ہوئی تھیں۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میرا دل بے اختیار چاہا کہ میں پیپر ویٹ اٹھا کر ان کے سر پر زور سے دے ماروں۔ لیکن حکومت پاکستان نے ابھی تک ہمیں پیپر ویٹ مہیا نہیں کئے تھے۔ اس لیے میں اپنی دلی خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے معذور رہا۔ البتہ دروازہ بند کر کے میں نے انہیں نندہ بس سروس والی ملکہ دشنام کی وہ طویل اور پیچیدہ گالی دی جسے سن کر سکھ لاری ڈرائیور کے کان بھی سرخ ہو گئے تھے۔ ساتھ ہی انہیں خبردار کیا کہ اگر وہ دوبارہ میرے کمرے میں تشریف لائیں' تو احتیاطاً اپنے گوڈے اور گٹے ساتھ نہ لائیں۔

دالمیا نگر کا پریم ناتھ اگروال ہو یا مملکت خدا داد کا مسلمان تاجر' رشوت کی نیلام گاہ میں دونوں ایک ہی طرح سے بولی دیتے ہیں۔

ایک روز کامرس سیکرٹری مسٹر میکفارقر نے امپورٹ ایکسپورٹ سیکشن کی ایک فائل طلب کی۔ بڑی ڈھنڈیا پڑی' لیکن فائل ملنی تھی نہ ملی۔ میرے سیکشن کے اسسٹنٹ سیکرٹری اور سپرنٹنڈنٹ نے چھان بین کے بعد سارا الزام اپنے ایک اسسٹنٹ کے سر تھوپ دیا' کہ مطلوبہ فائل اس کی لاپرواہی سے گم ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے نوٹ میں یہ بھی لکھا' کہ یہ اسسٹنٹ لا ابالی قسم کا منہ زور اور منہ پھٹ قسم کا انسان ہے۔ دفتری دستور العمل کی چنداں پابندی نہیں کرتا۔ اب اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف سخت انضباطی اور تادیبی کارروائی کر کے قرار واقعی سزا ضرور دینی چاہیے۔

میں نے "ملزم" کو اپنے کمرے میں طلب کیا' تو ایک خوش پوش' بانکا ترچھا' گورا چٹا چھریرے بدن کا جوان لٹکتا مٹکتا بے اعتنائی سے آیا اور دونوں کہنیاں میز پر ٹیک کر سامنے والی کرسی پر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ خود میری جواب طلبی کرنے والا ہو۔ میں نے اس سے فائل کے متعلق دریافت کیا' تو اس نے بے حد رکھائی سے بے حد مختصر جواب

دیا۔ "مل نہیں رہی۔"

"کیوں نہیں مل رہی؟" میں نے بھی لہجے میں تیزی پیدا کر کے کہا۔

"گم ہو گئی۔" اسسٹنٹ نے وضاحت کی۔

"کیسے گم ہو گئی؟" میں نے اور بھی تیزی سے پوچھا۔

"بس جی گم ہو گئی' بتا کے تو نہیں گئی۔" اسسٹنٹ نے اپنے بائیں ہاتھ کی پشت ناک رگڑ کر کھوں کھوں کیا اور جس طرح لٹکتا مٹکتا کمرے میں داخل ہوا تھا اسی طرح لٹکتا مٹکتا واپس چلا گیا۔

یہ ٹکا سا جواب سن کر میں کچھ دیر کے لیے سناٹے میں آ گیا۔ رفتہ رفتہ مجھے اپنے سوال کی حماقت اور اسسٹنٹ کے جواب کی بے ساختہ معقولیت پر ہنسی آنے لگی۔ اگر ہر لاپتہ چیز یہ اعلان کر کے جائے کہ وہ کیسے گم ہو رہی ہے تو گمشدگی کے واقعات ہی کیوں رونما ہوں؟

میں نے اپنے افسران بالا کو نوٹ لکھ کر بھیج دیا' کہ فائل نہیں ملی اور غالباً گم ہو گئی ہے۔ چونکہ یہ لغزش میرے سیکشن میں وقوع پذیر ہوئی ہے' اس لیے انچارج افسر کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں اور اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ اس پر مجھے سیکرٹری میکفارقر' جائنٹ سیکرٹری ایس اے حسنی' ڈپٹی سیکرٹری ایم ایوب اور دوسرے ڈپٹی سیکرٹری اشرف سعید سے درجہ بہ درجہ تحریری طور پر خاطر خواہ ڈانٹ پڑی اور ہر ایک نے مجھے آئندہ محتاط رہنے کی شدید وارننگ دی۔

وہ دن اور آج کا دن' جمیل الدین عالی سے میرے تعلقات کچھ اسی نوعیت کے خطوط پر استوار چلے آ رہے ہیں۔ کیونکہ امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ سیکشن کا الھڑ بے باک اور منہ زور اسسٹنٹ جو فائل گم کر بیٹھا تھا' جمیل الدین عالی ہی تھا۔ میں اس واقعہ کو اپنی زندگی کا بڑا قیمتی اور خوشگوار حادثہ سمجھتا ہوں۔ اس کی بدولت مجھے عالی کی دوستی اور رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ جس کے خوبصورت دوہوں اور ملی نغموں نے مجھے شاد کام

کیا ہے۔ جس کے خلوص کی دولت نے مجھے مالا مال کیا ہے اور جس کی نازک مزاجی' زود رنجی' تلملاہٹ' جھنجلاہٹ اور کج کلاہی نے میرے دل میں کبھی کوئی آزردگی پیدا نہیں کی۔

وزارت تجارت میں کام کرتے ہوئے مجھے مشکل سے ایک مہینہ ہوا تھا کہ جموں و کشمیر میں آزادی کی لہر اٹھی اور اس کے ساتھ ہی مہاراجہ ہری سنگھ کی قیادت میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ ماں جی اور دوسرے عزیز جموں سے جان بچا کر سیالکوٹ اٹھ آئے۔ اب مجھے کراچی میں مکان کی فوری ضرورت پڑ گئی تا کہ انہیں اپنے پاس لے آؤں۔ ہماری منسٹری میں ایک صاحب ورکس ڈویژن کے جائنٹ سیکرٹری تھے۔ سرکاری ملازمین کو مکان دینے کے سلسلے میں وہ مختار کل تھے۔ میرے کئی جاننے والوں کو وہ بڑی شفقت اور عنایت سے مکان الاٹ بھی کر چکے تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی ضرورت بیان کی' تو انہوں نے بڑی رکھائی سے ٹکا سا جواب دے دیا۔ میں نے چند افسروں کے نام گنوائے جنہیں وہ حال ہی میں مکان فراہم کر چکے تھے تو انہوں نے لا تعلقی سے انگریزوں کی طرح اپنے شانے اچکائے اور پھر عینک لگا کر فائلیں دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

یہ صاحب بھی دراصل بڑی مشکل میں گرفتار تھے۔ اس وقت کراچی میں رہائشی مکانوں کا وہی حال تھا کہ ایک انار صد بیمار۔ مکان بے حد کمیاب تھے اور مکان مانگنے والوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ ایسے حالات میں وہ صاحب کس کو مکان دیں اور کس کو نہ دیں؟ حقدار سبھی تھے۔ لیکن ترجیحی حقدار کون تھا؟ اس کا فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ یہ صاحب بھی کام چلاؤ طریقوں پر عمل کرنے پر مجبور تھے۔ کوئی کسی وزیر یا افسر کبیر کی سفارش لے آیا تو اسے مکان مل جاتا تھا۔ یا کسی صاحب ہمت نے جائنٹ سیکرٹری کی نظر کرم حاصل کرنے کے لیے خوشامد اور چاپلوسی سے کام لیا تو اس کا مقصد بھی آسانی سے پورا ہو جاتا تھا۔ میں ان دونوں لوازمات سے عاری تھا' اس لیے ان صاحب کی

عنایت بے غایت سے محروم رہا۔
تھوڑی بہت دوڑ دھوپ کے بعد مجھے جواہر لال نہرو روڈ پر (جو اب قائداعظم کے مزار کے سامنے ہے) ایک مکان کا نچلا آدھا حصہ کرائے پر مل گیا۔ اوپر والی منزل میں ہندو مالک مکان خود رہتا تھا۔ اس نے اپنا خاندان اور مال و اسباب تو بھارت بھیج دیا تھا اور اب مکان اور دکان کو اچھی قیمت پر فروخت کرنے کے انتظار میں یہاں رکا ہوا تھا۔ ساٹھ ستر برس کا یہ بڈھا بڑا سخت گیر مالک مکان ثابت ہوا۔ ایک تو اس نے تین چار کمروں کا کرایہ ایسا کس کے لگایا کہ اس میں میری آدھی تنخواہ صاف نکل جاتی تھی۔ دوسرے وہ بجلی اور پانی کے استعمال پر نہایت کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ آدھی رات کو بھی ضرورتاً کسی کمرے کی بجلی جلائی جائے تو سوئے ہوئے مالک مکان کی چھٹی حس فوراً بیدار ہو جاتی تھی' اور وہ واویلا مچانا شروع کر دیتا تھا کہ "بتی بند کرو' بتی بند کرو۔ بجلی مفت نہیں ملتی کہ ساری ساری رات جلا کر عیش کیا جائے۔" ایک روز مالک مکان کہیں سے گھوم کر واپس گھر آیا' تو ماں جی برآمدے میں بیٹھی اپنے بال سکھا رہی تھی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ان کو بے نقط سنانی شروع کر دیں کہ میں تو نلکا بند کر کے گیا تھا' میری غیر حاضری میں پانی کھول کر نہائی کیوں ہو؟ ماں جی نے ہزار سمجھایا کہ انہوں نے نلکا نہیں کھولا۔ بلکہ صبح سے اپنے لیے پانی کی بالٹی بھر کر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن اس شریف آدمی کو بالکل یقین نہ آیا اور اس نے مسلمانوں کے جھوٹ فریب اور مکر پر بڑا سیر حاصل تبصرہ کیا۔
انہی دنوں کراچی میں ہلکا سا ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ کچھ سامان بیچ باچ کر ہمارے مالک مکان نے ڈھائی لاکھ روپیہ نقد جمع کیا ہوا تھا۔ اسے خدشہ محسوس ہوا کہ اگر مسلمانوں نے اس کے مکان پر حملہ کیا تو نقدی بھی لٹ جائے گی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر وہ یہ پونجی ماں جی کے پاس امانت رکھنے کے لیے لے آیا۔ وہ روپے گن کر دینا چاہتا تھا لیکن ماں جی کو دس کے بعد گنتی ہی نہ آتی تھی۔ اس لیے مجھے سامنے بٹھا کر اس نے دھائی لاکھ روپیہ دو بار گنا۔ اور اسے ایک چمڑے کی تھیلی میں تالہ لگا کر ماں جی

کے حوالے کر دیا۔ مجھ سے اس کی رسید لکھوا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔
ماں جی نے اس امانت کی بڑی رکھوالی کی۔ رات کو وہ اس تھیلی کو اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتی تھیں۔ نماز کے لیے بھی وہ اسے اپنے گھٹنے کے ساتھ لگا کر بیٹھتی تھیں۔ دو تین روز میں امن و امان قائم ہو گیا۔ بڈھے مالک مکان نے مجھے پھر سامنے بٹھا کر ڈھائی لاکھ روپیہ دو بار گنا۔ رسید مجھے لوٹائی۔ اور اپنی امانت بغل میں دبا کر اوپر والی منزل میں واپس چلا گیا۔
میرا خیال تھا کہ ہماری اس خدمت گزاری کے عوض مالک مکان بجلی اور پانی کے سلسلے میں شاید اب ہمارے ساتھ کسی قدر نرمی کا برتاؤ دکھائے گا۔ لیکن "ایں خیال است و محال است و جنوں" اس کی وہی داتا کل کل بدستور جاری رہی۔ کئی بار تو وہ بجلی کا مین سوئچ سر شام ہی بجھا کر بیٹھ جاتا تھا۔ اور ہم موم بتی جلا کر اپنا کام چلاتے تھے۔ رات کو پنکھا چلا کر سونا تو بڑی دور کی بات تھی' ایک دو بار میں نے ارادہ بھی کیا کہ اس نامعقول بڈھے سے اس بارے میں جھگڑا کروں۔ لیکن ماں جی نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ بچارا دکھی ہے۔ بے گھر ہو کر بمبئی جا رہا ہے۔ اس وقت اس کا دل بالکل نہیں دکھانا چاہیے۔
مالک مکان نے ایک طوطا بھی پال رکھا تھا' جسے اس نے سندھی زبان میں پاکستان کے خلاف چند گالیاں بڑے شوق سے سکھا رکھی تھیں۔ باہر جاتے وقت وہ طوطے کا پنجرا ماں جی کی رکھوالی میں دے جاتا تھا۔ جب کوئی گھر والا طوطے کے سامنے سے گزرتا تھا تو وہ بڑی بے تکلفی سے اسے اپنی مخصوص گالیاں سنا دیتا تھا۔ اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر جب بڈھا گھر واپس لوٹتا تھا تو ماں جی اکثر اسے چائے یا شربت بنا دیتی تھیں۔ اس کے بعد وہ طوطے کا پنجرا لے کر اوپر چلا جاتا تھا اور تازہ دم ہو کر پھر ہمیں بجلی اور پانی سے محروم کرنے کے عمل میں مصروف ہو جاتا تھا۔
ایک روز چندریگر صاحب کی طبیعت ناساز تھی۔ انہوں نے مجھے ٹیلیفون کیا کہ میں ان

کے دفتر میں پڑی ہوئی سب فائلیں لے کر ان کے گھر آ جاؤں۔ مجھے ان کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ جب میں نے ان سے گھر کا پتہ پوچھا تو وہ بڑی حیرت سے بولے۔

"تعجب ہے، تمہیں اپنے منسٹر کا گھر تک معلوم نہیں۔"

میں اس بات کا کیا جواب دیتا؟ مجھے اپنے یا دوسرے وزیروں کے گھر اس وقت معلوم تھے نہ کبھی بعد میں معلوم کرنے کا شوق چرایا ہے۔

چندریگر صاحب کے دفتر میں تیس چالیس فائلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ میں نے انھیں سمیٹ کر گھوڑا گاڑی میں ڈالا، اور وزیر صاحب کے بنگلے کی راہ لی۔ کوٹھی پر پولیس کا پہرہ تھا۔ انھوں نے گھوڑا گاڑی کو اندر جانے سے روک دیا۔ کیونکہ وزیروں کی کوٹھیوں کے اندر صرف موٹر کاروں ہی کو باریابی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

چندریگر صاحب باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس عبدالرب نشتر بھی تشریف فرما تھے۔

"آپ سٹاف کار میں کیوں نہیں آئے؟" چندریگر صاحب نے پوچھا۔

"سٹاف کار فارغ نہ تھی۔" میں نے جواب دیا۔

چندریگر صاحب نے یکے بعد دیگرے دو تین افسروں کے نام لیے، اور بولے۔ "ہاں، ان میں سے کسی کے بچوں کا کلفٹن کی سیر کرانے گئی ہو گی۔"

کسی وجہ سے چندریگر صاحب مجھے مسٹر سوہاب کہا کرتے تھے۔ انھوں نے نشتر صاحب سے میرا تعارف یوں کرایا۔ "یہ میرے انڈر سیکرٹری مسٹر سوہاب ہیں جو اپنے وزیر کا گھر تک نہیں جانتے۔"

"سحاب آپ کا تخلص ہے؟" نشتر صاحب نے دلچسپی کے انداز میں پوچھا۔

میں نے انھیں اپنا پورا نام بتایا، تو نشتر صاحب پیشانی سکیڑ کر کچھ سوچ میں پڑ گئے اور بولے۔ "کیا ہم پہلے کبھی مل چکے ہیں؟ مجھے اس نام سے کسی قدر شناسائی کی بو آتی ہے۔"

میں نے عرض کیا کہ اس سے پہلے مجھے ان کی نیاز مندی کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

نشتر صاحب نے میرے سروس کیریئر کے متعلق پے در پے چند سوال پوچھے۔ جب قحط بنگال کی بات آئی تو وہ یکایک چونکے اور فرمایا۔ "ہاں' ہاں' خوب یاد آیا۔ ایک بار دہلی میں شہید سہروردی نے آپ کی کچھ مزے کی باتیں سنائی تھیں۔"

چندریگر صاحب کی ہدایت کے مطابق میں نے کامرس' ورکس اور انڈسٹریز ڈویژنوں کی فائلیں چھانٹ چھانٹ کر الگ کر کے رکھ دیں تو نشتر صاحب بھی فارغ ہو کر چلنے کو تیار تھے۔ انہوں نے ازراہ نوازش مجھے اپنی کار میں لفٹ دینے کی پیش کش کی۔

راستے میں ایک مقام پر کچھ ہندو خاندان آٹھ دس اونٹ گاڑیوں پر اپنا سامان لادے بندرگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ نشتر صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "یہ لوگ کتنے آرام سے اپنا تنکا تنکا سمیٹ کر یہاں سے لے جا رہے ہیں۔ اس طرف سے ہمارے لوگ جس حالت میں یہاں پہنچتے ہیں' اس کے تصور سے بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

نشتر صاحب کی تفنن طبع کے لیے میں نے انہیں اپنے ہندو لینڈ لارڈ کے کچھ لطیفے سنائے تو وہ حیرت سے بولے۔ "آپ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں؟ لینڈ لارڈ کیا کرایہ وصول کرتا ہے؟"

"تقریباً آدھی تنخواہ" میں نے بتایا۔

"سرکاری مکان کیوں نہیں ملا؟" انہوں نے پوچھا۔

میں نے خلیلی صاحب کی مجبوریاں اور معذوریاں بیان کیں' تو وہ خاموش ہو گئے۔ دو تین روز کے بعد نشتر صاحب کا پی اے میرے دفتر میں آیا اور لارنس روڈ پر نوشیروان جی مہتہ بلاک کے ایک فلیٹ کا الاٹمنٹ آرڈر میرے حوالے کر گیا۔ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ فلیٹ انہوں نے میرے لیے کس طرح حاصل کیا۔ لیکن اس وقت اس گھر کا ملنا میرے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس جہان میں بھی خوش رکھے۔

یہ فلیٹ ملنے کے چند روز بعد اتفاق سے میری ملاقات جائنٹ سیکرٹری ورکس سے ہو گئی۔ وہ میرے جائنٹ سیکرٹری حسنی صاحب کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ حسنی صاحب نے از

خود میری سفارش ڈالتے ہوئے کہا۔ "ارے بھائی! تم اس غریب کو مکان کیوں نہیں دیتے؟ یہ بھی تو تمہاری سروس کا ہی آدمی ہے۔"

"نہیں!" انھوں نے چونک کر سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا' اور بے اعتباری سے پوچھا۔ "کیا تم واقعی آئی سی ایس کے ممبر ہو؟"

میں نے اعتراف جرم کیا تو ان صاحب نے بڑے تپاک سے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر کہا۔ "میرے دفتر میں آنا۔ "مکان کا بندوبست ہو جائے گا۔"

میری ضرورت پوری ہو چکی تھی' اس لیے میں دوبارہ ان کے دفتر تو نہ گیا لیکن اس بات پر حیرت ضرور ہوئی کہ پاکستان بننے کے بعد بھی انڈین سول سروس (.I.C.S) کا جادو ہمارے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہم آئی سی ایس کے تین حروف بھارت پر ڈال کر پاکستان آ گئے ہیں' لیکن رسی تو جل گئی تھی پر بل نہیں نکلا تھا۔ یہاں پر کئی حضرات اپنے تعارف میں اولڈ آئی سی ایس کا دم چھلا لگانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ایک صاحب نے اپنے دفتر اور گھر پر جو نیم پلیٹس لگوائی تھیں ان پر اپنے نام کے ساتھ آئی سی ایس لکھوا کر ان تین حروف پر ایک ہلکی سی لکیر ایسی چابکدستی سے کھنچوا دی تھی جس طرح چشم محبوب میں کاجل کی تحریر ------ تا کہ ان کا جوبن اور بھی نکھر آئے۔ چند حضرات اپنے وزٹنگ کارڈز پر .Former I.C.S کے الفاظ بڑے اہتمام سے چھپواتے تھے۔ ایک صاحب کا ذاتی رائٹنگ پیڈ ان گنہگار آنکھوں نے

بھی دیکھا ہے جس پر .Former I.C.S کے نیچے بریکٹ میں سیکرٹری آف سٹیٹس امپریل سروس کے الفاظ بھی درج تھے۔

ہم کہ اپنی نوکری کے تین فرسودہ حروف تک اپنے نام سے علیحدہ کرنے سے قاصر تھے' ہم آزادی کے کاروبار کو غلامی کی روایات سے الگ رکھنے پر کس حد تک قادر ہو سکتے تھے؟ اس کا جواب ہم خود دیں یا نہ دیں' لیکن حالات نے دے دیا ہے اور آج تک دے رہے ہیں۔

لارنس روڈ والے فلیٹ میں دو بڑے بیڈ روم اور ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ بسا اوقات اس میں ہم تیس تیس پینتیس پینتیس لوگ گزارہ کرتے تھے۔ بہت سے عزیز و اقارب اور دوست احباب بھارت اور کشمیر سے جان بچا کر ہمارے پاس پہنچ رہے تھے۔ سب کے سب انتہائی خستہ حالی اور درماندگی کا شکار تھے۔ کوئی پا پیادہ قافلوں کے ساتھ مہینوں کے سفر کے بعد پاکستان پہنچا تھا۔ کوئی ان گاڑیوں پر سوار تھا جنہیں جا بجا روک کر لوٹا مارا جاتا تھا۔ کوئی طویل عرصے تک مہاجر کیمپوں کی دلدل میں دھنسا رہا تھا۔ کسی کو کپڑوں کی حاجت تھی۔ کسی کو علاج معالجے کی ضرورت تھی۔ اور زندگی کے ساتھ از سر نو ناطہ جوڑنے کے لیے سب ایک دوسرے کے محتاج تھے۔ ایک روز میں نے اپنا بٹوہ کھولا تو اس میں فقط سولہ روپے موجود تھے۔ مجھے بڑی تشویش لاحق ہوئی کیونکہ ابھی مہینہ پورا نہیں ہوا تھا اور اگلی تنخواہ ملنے میں آٹھ دس روز باقی تھے۔

اس زمانے میں میرے پاس کوئی بینک بیلنس نہ تھا۔ بلکہ اس وقت تک میں نے سرے سے کوئی بینک اکاؤنٹ ہی نہ کھولا تھا۔ بہار' بنگال اور اڑیسہ میں میرا قاعدہ تھا کہ میں پہلی تاریخ کو اپنی تنخواہ نقد وصول کرتا تھا۔ کچھ پیسے ماں جی کو جموں بھیج دیتا تھا۔ اور باقی رقم مہینے کے آخر تک ٹھکانے لگا دیتا تھا۔ اب جو میں نے دیکھا کہ گھر میں دو ڈھائی درجن مہمان اور بٹوے میں صرف سولہ روپے موجود ہیں تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میرا واحد اثاثہ اورینٹل لائف انشورنس کمپنی کی ایک انشورنس پالیسی تھی جو چند سال قبل میں نے بھاگلپور میں خریدی تھی۔ انشورنس ایجنٹ مشہور کانگرسی لیڈر (اور بعد میں بھارت کے پہلے صدر) ڈاکٹر راجندر پرشاد کا بیٹا تھا۔ جو پالیسیاں اس کے ذریعہ لی جاتی تھیں' وہ ان پر تحفتاً اپنے والد کے آٹو گراف کا ٹیگ بھی ضرور چسپاں

کیا کرتا تھا۔ میں اپنی پالیسی لے کر کراچی اورینٹل انشورنس کمپنی کے دفتر گیا اور مینجر سے کہا کہ واجب الادا رقم وصول کر کے میں بیمہ پالیسی سے دستبردار ہونا چاہتا ہوں۔

ہندو مینجر کانگرسی لیڈروں کا پرستار نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کا آٹوگراف دیکھ کر وہ وفور عقیدت سے بوکھلا گیا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ اس آٹوگراف کی وجہ سے یہ پالیسی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ تیس برس بعد جب یہ پالیسی واجب الادا ہو گی تو اپنے آٹوگراف کی وجہ سے اس کا شمار بیش بہا نوادرات میں ہو گا' اور یقینی طور پر اس کی اصلی قیمت اس کی عرفی قیمت سے کئی گنا زیادہ پڑے گی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں یہ بیمہ پالیسی سنبھال کر اپنے پاس رکھوں اور اس سے دستبرداری کا خیال دل سے نکال دوں۔

میں نے مینجر کی کاروباری فراست کی تعریف کی' لیکن دستبرداری کے ارادہ پر مستقل مزاجی سے اڑا رہا۔ کچھ مزید رد و کد کے بعد مینجر نے حساب جوڑا' اور پالیسی واپس لے کر مجھے تین ہزار سات سو روپے ادا کر دیئے۔

یہ گرانقدر رقم ہاتھ میں آتے ہی تہی دستی کے لمحات کی یاد کافور کی طرح اڑ گئی اور میرا دماغ از سر نو آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں سے کوئی سستی سی سیکنڈ ہینڈ موٹر کار مل جائے تو بڑا آرام نصیب ہو۔ اڑیسہ میں میرے پاس بڑی سمارٹ اور بانکی سپورٹ کار تھی۔ کٹک سے روانگی کے وقت سب نے یہی زور دیا کہ میں اسے فروخت کر دوں کیونکہ فسادات کی وجہ سے اس کا ریل کے ذریعہ پاکستان پہنچنا امر محال تھا۔ لیکن اس کار کے ساتھ کچھ ایسی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں کہ اسے بیچنے پر دل رضا مند نہ ہوا اور میں نے اسے ریل کی ایک بوگی میں مقفل کر کے اللہ توکل کراچی کے لیے بک کروا دیا۔ یہ بوگی کسی نہ کسی طرح جالندھر تک تو ضرور پہنچی لیکن وہاں پر کسی صاحب ذوق کی نظر انتخاب اس پر پڑ گئی اور اس نے کار کو ریل گاڑی سے اتار لیا۔ اب کراچی میں پیدل جوتیاں چٹخاتے چٹخاتے طبیعت اکتانے لگی تھی۔ جب انشورنس پالیسی کے پیسے جیب میں آ گئے تو دبی دبی اکتاہٹ کا یہ احساس آناً فاناً شدید تکان اور ماندگی میں تبدیل ہو گیا' اور کار خریدنے کی خواہش نے دل کو بری

طرح اپنے شکنجے میں کس لیا۔

اب کار کے خریدار کی حیثیت سے میں نے کراچی پر نگاہ ڈالی' تو سڑک پر چلنے والی ہر دوسری یا تیسری کار بکنے کے لیے تیار تھی۔ کیونکہ بمبئی جانے والے بہت سے ہندو ہوائی جہاز یا سمندری جہاز پر سوار ہونے سے پہلے آخری چیز اپنی کار فروخت کیا کرتے تھے۔ ایک ایسے ہی خوش پوشاک' چرب زبان ہندو نوجوان مسٹر وڈوانی سے میری ملاقات سر راہ ہو گئی۔ اس کے پاس پندرہ بیس سال پرانی شورلٹ کار تھی' جسے وہ شام کے جہاز پر سوار ہونے سے پہلے فروخت کرنے کی عجلت میں تھا۔ اس نے اپنی کار کی مدح میں رطب اللسان ہو کر ایسے ایسے گیت گائے اور سالہا سال سے اس کی بے عیب خدمت گزاری اور بے لوث وفاداری کے اتنے قصے سنائے کہ مجھے ایک گونہ افسوس ہونے لگا کہ یہ شخص اپنی اس قدر محبوب اور کار آمد شے کو بہ امر مجبوری پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہے۔ میں نے مسٹر وڈوانی سے قیمت کے متعلق استفسار کیا تو اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں سے لگا کر بڑا توبہ تلہ کیا اور قسم کھائی کہ وہ اپنی محبوب کار کی قیمت لگانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اس کی نظر میں یہ کار بالکل انمول تھی' اور نہ ہی وہ پیسہ کمانے کے لیے اسے بیچنا چاہتا تھا۔ وہ تو بس ایک ایسے قدر دان کی تلاش میں تھا' جسے سپرد کر کے اسے یہ اطمینان ہو کہ اس کی چہیتی موٹر کار واقعی صحیح ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ کسی وجہ سے اسے یہ میرے چہرے پر قدر دانی کی مہر ثبت نظر آئی۔ اور میں بھی اس کی چرب زبانی کی چکناہٹ پر ایسا پھسلا کہ پانچ ہزار سے شروع کر کے ڈھائی ہزار روپے پر سودا طے کر لیا۔ مسٹر وڈوانی نے مجھے اپنے ساتھ کار میں بٹھایا اور قدم قدم پر اس کی خوش رفتاری کی تعریف و توصیف کرتا ہوا مجھے ہمارے گھر لے آیا۔ میں نے اسے ڈھائی ہزار روپے نقد ادا کر کے کار کے کاغذات وصول کئے اور وہ بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہو کر رخصت ہو گیا۔

مسٹر وڈوانی کے جانے کے بعد میں نے کار چلانے کی کوشش کی تو اس نے اسٹارٹ

ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ اب یہ عقدہ کھلا کہ انجن اسٹارٹ ہونے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دو چار آدمی اسے کافی دور تک دھکا دیں۔ انجن چالو ہوتا تھا تو پہیے رک جاتے تھے۔ پہیے حرکت میں آتے تھے تو انجن دم توڑ دیتا تھا۔ گیئر بدلنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ اور بریک کبھی لگتی تھی کبھی صاف مکر جاتی تھی۔ میل ڈیڑھمیل چلنے کے بعد پانی جوش میں آ کر ابلنے لگتا تھا' اور ہارن کی جگہ اس کے دروازے اور مڈ گارڈ بڑے زور سے بجتے تھے۔ کار کی اگلی اور پچھلی بتیوں میں سے کوئی بھی کام نہ کرتی تھی اور کئی بار اندھیرے میں موٹر چلانے کے ہم لوگ اس کے سامنے لالٹین جلا کر لٹکا لیا کرتے تھے۔

انہی دنوں چودھری غلام عباس صاحب شیخ عبداللہ کی جیل سے رہا ہو کر پاکستان پہنچے تھے۔ کراچی آ کر وہ ہمارے ہاں ٹھہرے اور ٹیلیفون پر قائداعظم کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ قائداعظم نے انہیں اگلے روز لنچ پر مدعو کیا۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر انہیں سواری کی ضرورت ہو تو گورنر جنرل ہاؤس کی کار انہیں لینے وقت پر آ جائے گی۔ چوہدری صاحب ہمارے ہاں کار کھڑی دیکھ چکے تھے' اس لیے انہوں نے عرض کیا کہ سواری کا انتظام ہے اور وہ خود ہی حاضر ہو جائیں گے۔

سواری کا جو انتظام موجود تھا' اس کی اصلیت سے ہم نے چوہدری صاحب کو آگاہ کیا تو وہ بولے۔ "کوئی پرواہ نہیں' ہم ایک گھنٹہ پہلے ہی گھر سے روانہ ہو جائیں گے تا کہ کار کے سارے ناز نخرے اٹھانے کے بعد بھی کافی وقت ہاتھ میں رہے۔"

لنچ کا ٹائم سوا بجے تھا۔ ہم دھکا لگانے والی نفری کار میں بٹھا کر بارہ بجے ہی روانہ ہو گئے۔ اتفاق سے کار کا موڈ ٹھیک رہا اور ہم ساڑھے بارہ بجے ہی گورنر جنرل ہاؤس پہنچ گئے۔ اے ڈی سی بڑا پریشان ہوا کہ چوہدری صاحب اتنی جلدی کیوں آ گئے ہیں۔ چوہدری صاحب نے اس کی ڈھارس بندھائی کہ وہ بڑی گرم جوشی سے اے ڈی سی کے کمرے میں بیٹھ کر آدھ گھنٹہ انتظار کر لیں گے۔

"انتظار کی بات نہیں۔" اے ڈی سی نے جواب دیا۔ "قائداعظم کا حکم ہے کہ جب چوہدری صاحب تشریف لائیں' تو وہ خود پورچ میں آ کر کار کے دروازے پر ان کا استقبال کریں گے۔ اس لیے فی الحال آپ واپس چلے جائیں اور ٹھیک ایک بج کر پندرہ منٹ پر پورچ میں پہنچ جائیں۔"

اس گفتگو کے دوران کار کا انجن بند ہو گیا تھا۔ ہم نے دھکا دے کر اسے اسٹارٹ کیا اور باہر آ کر گیٹ کے قریب ہی گورنر جنرل ہاؤس کی دیوار کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے رک گئے۔ سیکیورٹی والے بڑے مستعد تھے۔ وہ فوراً ہماری طرف لپکے اور وہاں رکنے کی وجہ پوچھی۔ ہم نے انہیں اصلی صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ حیران ہوئے کہ قائداعظم کا معزز مہمان ایسی پھٹیچر کار پر سوار ہو کر گورنر جنرل ہاؤس آیا ہے۔
سکیورٹی سٹاف کے کچھ لوگوں نے آ آ کر چوہدری صاحب کے ساتھ عقیدتاً ہاتھ بھی ملائے۔

گورنر جنرل ہاؤس کی دیوار کے ساتھ اس وقفہ انتظار کے دوران چوہدری غلام عباس نے کہا کہ ریاست جموں و کشمیر کا جو علاقہ آزاد ہو چکا ہے' وہاں پر نظم و نسق قائم کرنے کے لیے وہ میری خدمات حکومت پاکستان سے مستعار مانگنا چاہتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض تو نہیں؟ چوہدری صاحب نے دراصل میرے منہ کی بات چھین لی' کیونکہ میں خود ان سے یہی درخواست کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں جتنی جلد آزاد کشمیر جا سکوں اسی قدر اسے اپنے لیے باعث سعادت سمجھوں گا۔

وقت ہو چکا تھا۔ سیکورٹی کے کچھ سپاہیوں نے بڑی خوشدلی سے کار کو دھکا لگایا اور ہم بڑے زور شور سے پھٹ پھٹ کرتے ٹھیک سوا بجے گورنر جنرل ہاؤس کی پورچ میں جا رکے۔ عین اسی لمحے قائداعظم بھی اندر سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے چوہدری صاحب کے ساتھ معانقہ کیا اور انہیں بازو سے تھام کر اندر لے گئے۔

ہم نے احتیاطاً کار کا انجن چالو رکھا تھا۔ اس کے شور شرابے میں قائداعظم کا صرف ایک فقرہ سنائی دیا۔

Ghulam Abbas, I am really happy
You are here!

○ ○ ○

- کچھ "یاخدا" کے بارے میں

ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب میں کراچی پہنچا تو چاروں طرف سے لٹے پٹے' کٹے پھٹے مہاجرین کا ایک سیلاب عظیم پاکستان میں امڈا چلا آ رہا تھا۔ انہی میں کہیں میرا ایک نہایت قریبی عزیز اپنی بیوی اور بچوں سمیت بھی شامل تھا۔ وہ کئی ماہ پہلے مشرقی پنجاب کے گاؤں چمکور صاحب سے کسی قافلے میں روانہ ہوا تھا۔ اور ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ پاکستان تک زندہ سلامت پہنچا بھی ہے یا نہیں۔ اور اگر پہنچا ہے تو کہاں پر ہے۔

اس عزیز کی تلاش میں ایک ایک کر کے میں نے تقریباً تمام مہاجر کیمپوں کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا۔ ہجرت کا اصلی اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو خود اس بھٹی سے گزرتے ہیں۔ گھروں میں بیٹھ کر یا دفتروں کی چار دیواری میں اعداد و شمار کے گوشوارے بنا کر یا جلسوں اور جلوسوں میں دھواں دھار تقریریں سن کر ہجرت کا صحیح مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور نہ ہی مہاجر خانوں میں سسکتے ہوئے' تڑپتے ہوئے ایڑیاں رگڑتے ہوئے اور اپنوں اور پرایوں کے ہاتھوں لٹتے ہوئے مہاجرین کی داستان پوری طرح سنائی دیتی ہے۔

اپنی اس تلاش کے دوران ظلم' بربریت اور مصائب کی چادر میں لپٹے ہوئے لاکھوں مہاجرین میری نظروں کے سامنے سے گزرے۔ ان میں ہزاروں کی تعداد میں بچے بھی تھے اور جوان اور بوڑھی عورتیں بھی۔ درجنوں نے تڑپ تڑپ کر' رو رو کر بین کرتے کرتے مجھے اپنی بپتا بھری جیون کہانیاں سنائیں۔ اس کربناک مجموعی مشاہدے نے اندر ہی اندر سلگ سلگ کر آخر ایک روز دلشاد کا روپ دھار لیا۔ ایک شام میں قلم لے کر بیٹھا اور فجر تک ایک ہی نشست میں "یا خدا" کی کہانی مکمل کر کے اٹھا۔

یہ طویل افسانہ سب سے پہلے "نیا دور" کے فسادات نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد احباب کا اصرار ہوا کہ ناولٹ کے طور پر اسے کتابی صورت میں بھی ضرور چھاپنا چاہیے۔

محترمہ ممتاز شیریں مرحومہ نے ایک دیباچہ تحریر فرما دیا اور "یا خدا" کا پہلا ایڈیشن کراچی سے جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ عام قاری کو یہ اتنا پسند آیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چھ ایڈیشن نکل گئے۔ لاہور کے ایک پبلشر نے اس ناولٹ کا نام "یا خدا" کی جگہ "آزادی کے بعد" رکھ کر بھی کچھ کاروبار کیا۔

"یا خدا" کے کتابی صورت میں شائع ہوتے ہی ترقی پسند مصنّفین کی صف میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو۔ کئی مہینوں تک بڑے بڑے مقتدر رسالوں میں اس کے خلاف خوب لمبے لمبے تنقیدی مضامین آتے رہے۔ میں نے کسی تنقید کا کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا' کہ یہ نقاد اگر حق بجانب ہیں تو یہ کہانی بہت جلد مردہ ہو کر دفن ہو جائے گی۔ لیکن پچھلے ۳۷ سال سے ایسا نہیں ہوا۔ مخالفانہ تنقید کسی کو یاد بھی نہیں۔ البتہ "یا خدا" کے ایڈیشن پر ایڈیشن باقاعدہ شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ یہ اللہ کا فضل اور پڑھنے والوں کا کرم ہے۔

آج کل کالجوں کے نوجوان طلبہ کے کچھ طبقوں میں یہ کتاب خاص طور پر پسند کی جا رہی ہے۔ بہت سے لڑکوں اور لڑکیاں "یا خدا" کی جلدوں پر آٹو گراف لینے آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر حیرت سے یہ سوال پوچھتے ہیں۔ "کیا واقعی ہمارا وطن ایسے واقعات سے گزرا ہے جو اس کتاب میں درج ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو دوسرے ادیب کیوں نہیں لکھتے؟" وغیرہ وغیرہ

"یا خدا" کے ماضی اور حال پر روشنی ڈالنے کے لیے میں یہاں پر تین دستاویزات کی نقول درج کر رہا ہوں۔

اول : محمد حسن عسکری کا خط مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۴۸ء بنام محترمہ ممتاز شیریں۔

دوم : اگست ۱۹۵۰ء کے ادب لطیف لاہور میں ابوالفضل صدیقی کا مضمون بعنوان "یا خدا" اور اس کا دیباچہ۔

سوم : "نوائے وقت" کے ایک نوجوان صحافی اظہر سہیل کے تاثرات جو لاہور' راولپنڈی' ملتان اور کراچی کے میگزین سیکشن ۲۹ مارچ تا ۴ اپریل ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئے۔

○ محمد حسن عسکری کا خط

ممتاز شیریں کے نام
معرفت مکتبہ جدید' انارکلی لاہور
۲۰ جولائی ۱۹۴۸ء

محترمہ' آداب!

اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا ہے۔ میں نے اسی وقت قدرت اللہ شہاب کی کتاب "یا خدا" پڑھ کر ختم کی ہے۔ سب سے پہلے تو میں اپ کو ایسا "دیباچہ" لکھنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ نے بڑے بے لاگ طریقے سے اور بالکل بے جھجک حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ آپ نے جس طرح فسادات کے متعلق انسانوں کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ مجھے بہت پسند آیا۔ خصوصاً کرشن چندر کے متعلق تو آپ نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ آپ نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ آپ کا ذہن ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہے اور آپ کسی کی رو رعایت نہیں کرتیں۔ ہمارے ادیب اس خوف سے اپنی زبان بند رکھتے ہیں کہ ہمارا کوئی ہندو دوست برا نہ مان جائے یا ہمیں رجعت پسند نہ سمجھ لیا جائے۔ اس قسم کا خوف ہمارے قومی نقطہ نظر سے جو کچھ بھی ہو' خالص ادبی نقطہ نظر سے بھی بڑی پست چیز ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے انتہائی مسرت ہوئی کہ ہمارے یہاں کم سے کم ایک لکھنے والے نے تو دیانتداری برتی۔ میں تو یہ ذرا بھی نہیں چاہتا کہ محض قومی فائدے کے لیے لوگ اپنی اصلی رائے کی چھپائیں یا حقیقت کو مسخ کریں۔ اگر ہمارے یہاں واقعی کوئی ایسا آدمی ہے جو Rimbaud کی طرح کا کوئی Vision اپنے اندر رکھتا ہے اور وہ پاکستان کی بربادی کی دعائیں مانگتا ہے تو میں اس سے اختلاف رکھنے کے باوجود اسے سر آنکھوں پر بٹھاؤں گا۔ اسے اظہار کی پوری آزادی دوں گا۔ اور اس کے حق کی حمایت میں قائداعظم تک سے لڑنے کو تیار رہوں گا' مگر دکھ تو اس بات سے

ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب محض دوسروں کو خوش کرنے کے لیے یا دوسروں کے کہنے سے پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف نفرت یا کم سے کم بد ظنی پھیلاتے ہیں۔ پاکستان حاصل کرنے کے لیے تو عوام کے ووٹوں کی ضرورت تھی' ان پر نام نہاد Intellectuals کا کوئی اثر نہیں تھا۔ عوام نے پاکستان حاصل کر لیا' لیکن پاکستان کا استحکام محض ووٹوں سے تو نہیں ہو سکتا اس کے لیے تو پوری قوم کی ذہنی اور اخلاقی کاوش کی ضرورت ہے' اور زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی باتوں سے لے کر بڑی سے بڑی باتوں تک میں پڑھے لکھے لوگوں کی پوری جدوجہد کے بغیر ہمیں استحکام کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ لیکن ہمارے ادیب ہیں کہ وہ پاکستان ہی کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور وہ بھی اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں' محض غیر جانبداری' آزاد خیالی اور ترقی پسندی کا تمغہ حاصل کرنے کے لیے۔ ان حالات میں تو یہ بڑی مبارک فال ہے کہ آپ مسلمانوں کی طرف سے بولیں اور آپ نے اس سازش کا پردہ فاش کیا جو ادب کے پردے میں مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہے۔ اس پر آپ کو جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔ کیونکہ یہ بات تو ذرا مشکل ہی سے سمجھ میں آتیہے کہ کوئی ادیب اس حد تک مسلمانوں کا حامی ہو' پھر آپ نے کوئی جذباتی بات بھی نہیں کہی' سیدھی سیدھی دو اور دو چار والی باتیں کی ہیں۔ میں اس بات کو پاکستان کے حق میں کوئی اچھی بات نہیں سمجھوں گا کہ پاکستانی ادیب ہر بات میں قوم یا حکومت کی حمایت کرنے لگیں۔ یا ہر بات کو صرف قومی مفاد کے نقطہ نظر سے دیکھیں۔ میں تو صرف و محض معروضیت اور سچی غیر جانبداری چاہتا ہوں' اور قوم کی سچی تعمیر کا راز اسی میں سمجھتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ آج کل فرانس میں "ذمہ دار ادب" کا بڑا چرچا ہے۔ اس کے متعلق Andre Gide نے کہا تھا۔

I count only on the deserter

میں تو اس مقولے کا بری طرح قائل ہوں۔ اگر میں اپنے لیے کسی شاندار مستقبل کا خواب دیکھتا ہوں تو "وفادار" کی حیثیت سے نہیں بلکہ بھگوڑے کی حیثیت سے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ Gide افریقہ میں Resistance Committee

Writer's کا سیکرٹری بھی تھا۔ (حالانکہ بعد میں آراگون صاحب نے بھی یہ مطالبہ کیا کہ ژید پر مقدمہ چلایا جائے' کیونکہ وہ جرمن سپاہیوں کے رویے کے تعریف کرتا ہے' تو ایسے نازک وقت میں تو ژید تک قومی خدمت پر آمادہ ہو گیا تھا' کیونکہ اس وقت ذہنی ایمانداری کا تقاضا یہی تھا۔ مگر ہمارے یہاں ایمانداری صرف اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ پاکستان کی مخالفت کی جائے یا جو ادیب ایسے ہیں جنھوں نے قہر درویش بجان درویش پاکستان کے وجود کو تسلیم کر ہی لیا ہے۔ وہ بے تعلق رہنا چاہتے ہیں' بلکہ پاکستان کی عملی حمایت کا مطلب جاہ پرستی سمجھتے ہیں۔ یہاں چند نوجوان ایسے ادیبوں کی ایک نئی انجمن بنانا چاہتے تھے جو پاکستان کے وفادار ہوں۔ مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے تاثیر صاحب کو بھی شرکت کے لیے راضی کر لیا۔ لیکن جب یہ نوجوان قیوم نظر صاحب وغیرہ کے پاس گئے تو انہیں یہ جواب ملا کہ تاثیر اور عسکری کو کسی ملازمت کی تلاش ہے۔ ادیبوں کے انجمن بنا کے اپنا پروپیگنڈا کرنا چاہتے ہیں تا کہ لمبا ہاتھ مار سکیں۔ اب بتایئے کہ ایسے عالم میں آدمی کیا کرے کیا نہ کرے' ترقی پسندوں نے میرے بارے میں یہ اڑا رکھا ہے کہ اسے حکومت سے پیسے ملتے ہیں۔ غرضیکہ بولیں تو یہ سب سنیں' اور چپ کیسے رہیں' قوم کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے تو آپ کی یہ تحریر دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ خدا کرے کہ آپ زیادہ لکھا کریں۔ ہماری ضرورت تو قوم کو اسی وقت ہے۔ کہیں تریاق بعد از وقت نہ پہنچے۔

قدرت اللہ شہاب کا افسانہ بھی مجھے بہت پسند آیا۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ کتاب ہر پاکستانی کے گھر میں ہونی چاہیے۔ اگر شہاب صاحب پسند کریں تو میری یہ رائے اپنی کتاب کے اشتہار میں دے دیں۔ میں اس پر اخبار "امروز" میں تبصرہ کر رہا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ زیادہ سے زیادہ اخباروں میں اس پر تبصرہ ہو جائے۔ خیر' یہ کوئی لافانی افسانہ تو نہیں ہے مگر اپنے مقصد کے پیش نظر بڑا کامیاب ہے۔ آخر Vercors کی Silence of the Sea ہی کون سی لافانی ہے؟ یا اس قسم کی دوسری کتابیں۔ مگر پھر بھی

ان کتابوں کا ایک مقام ہے' اور ان مصنفوں کی قومیں بجا طور پر ان کی شکر گزار ہیں۔ شہاب صاحب بھی اسی طرح ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ زیادہ اچھی بات یہ ہے

کہ انہوں نے غیروں کے مظالم دکھانے پر اتنا وقت صرف نہیں کیا' جتنا اپنوں کے مظالم پر۔ کتاب کا تیسرا حصہ سب سے اچھا اور سب سے زیادہ با اثر ہے۔ خصوصاً آخری سین کی تو داد نہیں دی جا سکتی۔ میں کتاب پر مفصل تبصرہ کر رہا ہوں۔

خیر خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ذہنوں پر سے ترقی پسند کی دھند تو چھٹنے لگی۔ شہاب صاحب کو میری مبارکباد پہنچا دیجئے۔

ذرا یہ تو بتایئے کہ کراچی کا ادبی ماحول کیسا ہے۔ کتنے لوگ پاکستانی ہیں اور کتنے ترقی پسند؟ ذرا جلدی جواب دیں تو اچھا ہے۔ صمد شاہین صاحب کو آداب!

نیاز مند ------- محمد حسن عسکری

○ "یا خدا" اور اس کا دیباچہ

ابوالفضل صدیقی!

ادبی تخلیقات کی رفتار جتنی تیز ہوتی ہے اتنی ہی ان فنکاروں کی پیداوار میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ جن کے یہاں انفرادیت ہوتی ہے اس دلچسپ حقیقت کو ہم نے اردو ادب میں بھی دیکھ لیا ہے۔ بیدی' کرشن چندر' عصمت اور دو ایک نام اس فہرست میں اور اضافہ کر لیجئے جنہوں نے اردو افسانہ نگاری میں انفرادیت کی کچھ ایسی مہر لگائی اور اپنی بے پناہ فکر و استعداد سے پیچھے آنے والے ادیبوں کو اس طرح متاثر کیا کہ ۱۹۴۳ء کے بعد ہرنیا ادیب انہی افسانہ نگاروں کی دنیا میں کھو کر رہ گیا۔ کرشن چندر' ان داتا کے بعد آہستہ آہستہ انحطاط کی جانب مائل ہونے لگے۔ بیدی نے ادب کو کبھی کبھار کا مشغلہ بنا لیا اور عصمت جنس سے نکل کر جب مزدوروں اور کسانوں کی دنیا میں آئیں تو اپنے پیچھے چلنے والوں سے بھی پیچھے رہ گئیں۔ جب ہمارے ادب کا یہ حال ہو تو ایسی

صورت میں جب کوئی بت شکن اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو اسے دیکھ کر خواہ بڑے پجاری اور پرانے بت کتنے ہی خفا اور جزبز کیوں نہ ہوں۔ لیکن ایک سچا نقاد داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قدرت اللہ شہاب ۴۳ء کے بعد کا ایک بہت بڑا بت شکن ہے جس نے اپنے افسانوں سے صرف چونکایا ہی نہیں بلکہ بتوں اور پجاریوں کی صفوں میں ایک عجیب انتشار سا بھی پیدا کر دیا ہے۔ اس کا آخری افسانہ "یا خدا" تو اس منزل کا سنگ میل ہے جہاں پہنچ کر ہمیں نہ معلوم کتنے لات و منات اور فنی پجاریوں کو تلملاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اس افسانہ پر جب لوگوں کی برہمی کا اظہار دیکھا تو میں نے اسے دوبارہ پڑھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں غلط طور پر اس سے متاثر ہو گیا ہوں اور تقاضائے بشریت کے تحت جذبات کی رو میں بہہ گیا ہوں اور افسانہ کے موضوع کی سنگین قسم کی رنگینی میں گم ہو کر اسے اردو کے بہترین افسانوں میں سے ایک اور فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں میں بہترین خیال کرنے لگا ہوں۔ لیکن آج پھر ایک بار بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نہ صرف میرا پہلا خیال صحیح ہی تھا بلکہ دوبارہ مخصوص نظر سے پڑھنے کے بعد میری رائے راسخ تر ہو گئی اور نہ صرف رائے راسخ تر ہو گئی بلکہ مجھے اس میں چند خوبیاں ایسی نظر آئیں جن پر پہلے مطالعہ میں نگاہ نہ پہنچی تھی اور اب مجھے کہنا پڑتا ہے کہ لوگوں کی برہمی کے پردے میں کچھ اور ہے جس کی تشریح کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ آخر یہ "یا خدا" پر برہمی کیوں؟ جب سجاد ظہیر اور احمد علی انگارے میں پرانی اقدار پر چوٹ کرتے ہیں۔ جب کرشن چندر بڑے بڑے ان داتاؤں کی زراتی کا بھانڈا پھوڑتا ہے' جب عصمت لحاف کا موٹا پردہ چاک کرتی ہے اور منٹو ادبی بھٹی کے ہون کنڈے دھواں اٹھاتا ہے تو آپ انہیں بڑا فنکار مان لیتے ہیں حالانکہ انہی افسانوں پر ایک خاص سکول کے افراد تلملا اٹھتے ہیں۔ لیکن جب قدرت اللہ شہاب غریب' سڑے گلے سماج کے رستے ناسوروں اور مبروص سیاست کے گینگرینوں (Gangrenes) کی پٹیاں ہٹا کر نقاب کشائی کرتا ہے تو وہ عقاب قسم کے لوگ بھی بگڑ جاتے ہیں جن کا دعویٰ

ہے کہ وہ سورج جیسی حقیقت سے بھی آنکھیں چار کرنے کی تاب رکھتے ہیں۔ فنکار چند بندھے ٹکے ریاضیاتی فارمولوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ ایک فنکار ہے اور سچا فنکار تو اسے براہ راست زندگی اور اس کی پہنائیوں میں داخل ہونا پڑے گا اور اگر وہ صرف اخبار کے اعداد و شمار سامنے رکھ کر اپنے فارمولوں کی مدد سے "تقسیم" اور "ضرب" اور "ضرب" اور "تقسیم" کا عمل کرے گا۔ تو چاہیں اسے کچھ اور کہہ لیں لیکن وہ "فنکار" نہیں ہے اور ترقی پسند ادب تو بالکل ہی نہیں ہے کیونکہ ترقی پسندی مصلحت کی قائل نہیں۔ یہاں زخموں پر پردہ نہیں ڈالا جاتا یہاں پھوڑوں کو دبایا نہیں جاتا۔ وہ انہیں عریاں کرتا ہے۔ خواہ سیاست اور مصلحت اندیشی چیخیں اور کراہتی ہی کیوں نہ رہے۔ حقیقی معنوں میں ترقی پسند فنکار ایک ماہر سرجن کی طرح "چر" سے نشتر لگا دیتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب پر چونکہ نکتہ چینی کی جاتی ہے اسے میں وہ تنقید سمجھتا ہوں' جسے ادب کی تو بالکل ہوا ہی نہیں لگے گی۔ البتہ اس میں نہایت گہری قسم کی سیاسی دور اندیشی کے نشانات ضرور پائے جاتے ہیں۔ مگر جب یہ تنقید کرنے والے اپنی ان تنقیدوں کے ادبی اصولوں پر مبنی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو پھر داستان گوئی کے عشرت خانے سے نکل کر تنقید کے میدان میں آنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک ایسا قلسم ہاتھ میں لے کر جو تلوار سے بھی زیادہ تیز ہو اور جو اس غلیظ تنقید کا خاتمہ کر دے۔ میں ایک افسانہ نگار اور ناول نویس ہوں۔ تخلیقی ادب کی میرے نزدیک اہمیت بھی زیادہ ہے اس لیے نہ تو تنقید کو میں اپنا ادبی مشغلہ بنا سکتا ہوں اور نہ ہر نئے اور پرانے ادیب و شاعر کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی اجارہ داری کا بوجھ میرے نحیف شانے سنبھال سکتے ہیں۔

اس لیے میں قدرت اللہ شہاب کے کہنے والوں کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مگر قدرت اللہ شہاب کے بارے میں چند باتیں کہنی نہایت ضروری سمجھتا ہوں اس لیے کہ میری ادبی ایمانداری اور فنی خلوص بار بار مجھے اکسا رہا ہے کہ اس ہنگامہ میں جبکہ سیاہ و سفید کی تمیز دنیا کے کسی شعبہ میں باقی نہیں رہ گئی تو کم سے کم ادب کے چشمہ کی صاف پھواروں کو ہر قسم کی آمیزش بچانا ہمارا نہ صرف ادبی بلکہ اخلاقی فرض ہے

اور ایسے موقع پر چپ بیٹھے رہنا بھی ایک بڑا فنی جرم ہے۔

قدرت اللہ شہاب کی افسانہ نگاری اور میرا نام دیکھ کر ممکن ہے کہ لوگ پہلی نظر

میں یہ خیال کریں کہ اس مضمون کے ترکش سے کوئی نیا تیر چھوٹے گا' لیکن جب وہ یہ مضمون پڑھیں گے تو انہیں بڑی مایوسی ہو گی کہ انہی کے گروہ کا ایک خادم ادب جس کا ترقی پسندی پر پورا ایمان ہے' آج اپنے ہی اصولوں کی بنا پر ایک سچی بات کہنے میں اس کی بالکل پروا نہیں کر رہا ہے کہ خود اس کے اپنے حلقہ سے کتنی آوازیں اس کے برعکس اٹھ چکی ہیں۔

اس ہنگامہ نے مجھے قدرت اللہ شہاب کے تقریباً تمام پچھلے مشہور افسانے پڑھنے کے لیے اکسایا۔ میں پچھلے دو تین سال سے ہر نئے اور پرانے افسانہ نگار کی تخلیق کو ذرا غور کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کتنے افسانے ایسے ہیں جو ادبی اور افسانوی معیار پر پورے اترتے ہوں۔ میری رائے ناقص میں ان افسانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ انہی معدودے چند افسانوں میں چند افسانے قدرت اللہ شہاب کی جدت و قدرت فکر کا نتیجہ ہیں۔

سب سے پہلی چیز جو قدرت اللہ شہاب کے یہاں ہمیں متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر افسانہ نگار کی شخصیت ہمارے سامنے مکمل طور پر ابھر کر آ جاتی ہے۔ اور افسانہ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ نکھرتی چلی جاتی ہے اور یہی ایک چیز ہے جس نے شہاب کو نہ صرف ایک کامیاب افسانہ نگار بنا دیا بلکہ ایک صاحب طرز ادیب اور ایک حساس شاعر کے ساتھ ایک منفرد انشاء پرداز بھی بنا دیا اور ہر جہتی طور پر وہ ایشیا کا ایک عظیم فنکار ہے جس کے پاس گھلاوٹ اور شیرینی کے خوشگوار گھونٹ ہیں۔ جس کی آستینوں میں طنز و تشنیع کے تیز نشتر اور مسموم پیکان ہیں جس کی دستار پر بانکپن اور تیکھے پن کے

رنگین طرے لہرا رہے ہیں اور اس کو یہ تمام چیزیں ان تمام افسانہ نگاروں سے ممیز

کرتی ہیں جو سپاٹ اور بے جان طریقے سے ایک "اچھی بات" کو پیش کر دینا ہی سب سے بڑی نیکی اور سعادت سمجھتے ہیں۔ "اچھی بات" کا تو میں بھی قائل ہوں لیکن اچھی بات' اچھے طریقے سے پیش نہ کرنا بھی "بری بات" سے کم نہیں۔ ادب میں موضوعات کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ ایک دور کے اکثر ادیبوں کا تجربہ اور مطالعہ تقریباً ایک ہی سا ہوتا ہے۔ لیکن ان کی تخلیقات میں جو چیز امتیازی شان پیدا کرتی ہے وہ ان کے پیش کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ ادب میں "ابلاغ" کو بہت اہمیت ہے۔ آپ کے پاس خواہ کتنا ہی عمدہ موضوع ہو لیکن اگر طرز ادا بھونڈا ہے تو صرف موضوع آپ کی ادبی تخلیق کو جاندار نہیں بنا سکتا۔ موضوع اور طرز اظہار کا جسم و روح والا رشتہ ہے اور وہ بھی خوشگوار تناسب کے ساتھ۔ موضوع اور فن کو جن ادباء نے صحیح طور پر جانا ہے ان میں یہ نوجوان افسانہ نگار بھی ہے۔ پہلے پہل ادبی دنیا میں میں نے شہاب کے افسانے دیکھے تو باوجود نام کے نئے پن کے مجھے ان کی انفرادیت نے متاثر کیا اور سب سے شروع کی ہی چند چیزوں میں مجھے شہاب کے اندر مستقبل قریب کا ادبی بت شکن ابھرتا نظر آیا۔ یہ نوجوان فنکار جس سے میں باوجود اشتیاق ملاقات کے بھی ابھی تک نہیں مل سکا ہوں۔ افسانوں میں ہم سے اس طرح ملتا ہے کہ ایک حد تک اشتیاق ملاقات کی تشنگی تسکین بھی پا جاتی ہے اور تیز تر بھی ہو جاتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جب میں قدرت اللہ شہاب سے ملوں گا تو مجھے مایوسی ہو گی یا مسرت! مگر اس میں شک نہیں کہ وہ قدرت اللہ شہاب جو اپنے افسانوں میں ہمیں چلتا پھرتا اینڈتا نظر آتا ہے جو اپنی کتابوں میں "یک چمن گل' یک نیستاں' نالہ ایک خمخانہ مے" کبھی زہر خند ہنسی ہنستا اور گاہے موسم بہا کے غنچوں والی لطیف مسکراہٹ مسکراتا' کبھی آگ برساتا اور کبھی گل فشانیاں کرتا نظر آتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب تو ضرور اس قابل ہے کہ ہم اس سے محبت کریں۔

"محبت" کا لفظ میں نے خوب سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے اس لیے کہ قدرت اللہ شہاب

اپنے افسانے کے کرداروں کو ہم پر مسلط کر کے ہمیں متاثر نہیں کرتا بلکہ افسانوں کے کرداروں سے زیادہ اس کا طرز ادا خود افسانہ نگار کی شخصیت کو ہم پر سوار کر دیتا ہے۔

یہ ہے کچھ عجیب سا پہلو' شہاب کی بے پناہ فنکاری کا اور اس مخصوص صفت میں ہمیں دور موجودہ میں اپنی صف میں صرف وہ تنہا ہی نظر آتا ہے۔ شہاب اپنی ادبی تخلیقات میں نہ تو ہمارے پاس ایک بزرگ و رہنما پیغمبر کی صورت میں جلوہ افروز ہوتا ہے جس کو دیکھ کر سوائے زانوئے ادب تہ کرنے کے اور کچھ ہمارا فرض ہی نہ ہو اور نہ ایسا بانکا سپاہی جو اتنا طرار ہو کہ اس سے ہر وقت یہ خطرہ محسوس ہوتا ہو کہ نہ معلوم کس وقت اس کی تلوار ہمیں زخمی کر دے۔ اور نہ ہاتھ میں پوائنٹر لیے بلیک

بورڈ کی طرف اشارہ کر کے لیکچر دیتا ہوا' سکول ماسٹر ہوتا ہے۔ ان افسانوں کا شہاب تو ایک "یار" کی صورت میں سامنے آتا ہے اور رخصت ہوتے وقت ایک جدید قربت' ایک نئی ہم آہنگی ایک مزید خلوص چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب کے افسانے پڑھتے وقت ہم خود کو محسوس نہیں کرتے بلکہ اس کے بیان کا طرز ہم پر کچھ ایسا سحر طاری کر دیتا ہے کہ ہم کو ذہنی طور پر ہی نہیں صریحاً مادی طور پر ایسا محسوس ہوتاہے کہ شہاب ہمارے گلے میں بانہیں ڈالے ہمیں اپنی دنیا میں لیے پھر رہا ہے وہی دنیا جہاں "تلاش" ہے۔ جہاں بے بس و مجبور روح انسانی چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کیا مجھے سچی محبت کبھی نہ مل سکے گی؟ جہاں سب کا مالک بنگال کی گنگناتی ہوئی وادیوں میں بھوک کی کھیتیاں اگاتا ہے اور جہاں ریناہوس مالک کے سامنے بل کھا کھا کر ناچتی اور اہل ہوس کی ہوس صرف اس لیے بھڑکاتی ہے کہ اس کو بھوک کی موت کے چنگل سے ہوس کے سیاہ دامن میں پناہ مل سکے۔ یہ دنیا ہمیں جلترنگ' سٹینوگرافر' غریب خانہ' ایک رات کی بات' ماما اور دو رنگا کے محوروں پر گھومتی سینما کے سکرین کی طرح ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان افسانوں میں ہمیں ایک زبردست طنز ملتا ہے جس کے تیکھے پن کی نشریت' نہ صرف شہاب کو رومانیت کے کوچے ہی سے نکال لاتی ہے

بلکہ یاسیت کے گھروندوں کو بھی پاش پاش کر دیتی ہے۔ شہاب کے یہاں نمایاں شخصی انفرادیت ہے۔ لیکن وہ انفرادیت نہیں جو عام انفرادیت پسند ادباء کے یہاں پائی جاتی ہے وہ گھٹن اور تلخی اور ابہام جوان افسانہ نگاروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ شہاب کے یہاں بالکل نہیں ہے اور سماجی احساس سے ہٹ کر چلنے کی روش کا کہیں پر پتہ نہیں ہے۔ شہاب کے افسانے سماج کے لوگوں کے ساتھ رہ کر اور اپنے مسائل کو ان کے مسائل کے ساتھ ہی ٹکرا کر لکھے گئے ہیں۔ ان میں چلتا پھرتا اصلی انسان ہی ملتا ہے ان کے کردار خوابوں کی مخلوق نہیں' بلکہ وہ ایک طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ طبقہ جو داخلی طور پر خوش نہیں ہے جس کے سفید لباس کے نیچے بھی زخموں سے چور بدن ڈھکا ہوا ہے جہاں کوڑھ کے بڑے گھناؤنے داغ ہماری آنکھوں کو بند کر لینے پر مجبور کرتے ہیں جہاں کوٹوں کے نیچے بھوکے پیٹ پناہ لیے ہوئے ہیں۔ جہاں دور نگاہی کی روحانی اور جسمانی برص کے دھبے داخلی اور خارجی تعفن سے شامہ و باصرہ پر ضرب کرتے ہیں جہاں اپنی محبوباؤں کے جسم دوسروں کے بستروں کی زینت بنتے ہیں اور خود افسانے کے ہیرو اپنی راتیں دفتر کے کلرکوں اور چپڑاسیوں کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ عورت' روپوں کی بھری تھیلی' چھوکری کا بھرا ہوا جسم یہ ہے۔ وہ دنیا جہاں قدرت اللہ شہاب ہمیں لے جاتا ہے' جہاں پہنچ کر ہم تقاضائے فطری کے تحت آنکھیں بند کر لینے پر مجبور ہوتے ہیں تو کبھی بے ساختہ نتھنوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں' وہ کہیں ہمارے باصرہ کو خیر کرتا اور کہیں ہمارے شامہ کو زیر و زبر کرتا ہمیں لیے چلا جاتا ہے اور ہم بیزاری اور اختلاج کی حالت میں اس کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ دنیا ہے جسے دیکھ کر ہماری رگ رگ میں کراہت' نفرت اور بیزاری کا شدید احساس ابھرتا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں کی شرع میں سور کے گوشت سے لے کر چیل کے انڈے تک ہر چیز حلال ہے۔

قدرت اللہ شہاب ہمیں رنگ محل در رنگ محل' شیش محل در شیش محل لیے لیے نہیں

پھرتا۔ اس کی دنیا میں غریب خانہ بھی ہے جہاں تھالیوں میں لوگ کتوں کی طرح سپڑ سپڑ کھاتے ہیں اور "غریب خانہ" میں ہمیں مینڈک کی طرح رینگتی ہوئی بوڑھی عورتیں' رعشہ بر اندام بوڑھے' پھولے ہوئے پیٹ' گڑگڑاتے ہوئے بچے' گھگھیاتے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے اور وہ نوخیز لڑکیاں جن کو پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے جنسی بھوک مٹانا پڑتی ہے' ملتی ہیں' غریب خانہ وہ جگہ ہے جہاں بڑے میاں سے لے کر سقہ اور مہتر تک ہر نوجوان لڑکی اپنا حق سمجھتے ہیں اور جب الہڑ دوشیزہ اپنی دنیا سے بھاگ کر شہاب کی دنیا والے غریب خانہ میں پناہ لینا چاہتی ہے تو سہارے کی ہر ڈوری کے دوسرے سرے پر ایک ننگا سا وحشی' حیوان کھڑا ہوتا ہے۔ اس دنیا کی کامنی کوشل جب اپنے ٹھاکر کے پنجے سے نکل کر بھاگتی ہے اور یہاں آ کر پناہ لینا چاہتی ہے تو بقول شہاب' وہ کسی چیز سے ٹکراتی ہے اور منہ کے بل گر پڑتی ہے۔ اور شہاب نہایت خلوص کے ساتھ شروع سے آخر تک گلے میں بازو حمائل کئے کہیں انگلی کے اور کہیں ابروی کے اشارے سے اور کہیں کہیں نہایت آہستہ سے کانا پھوسی کر کے ہر چیز دکھاتا جاتا ہے اور نہایت سلامت روی کی چال سب کچھ بتاتا چلا جاتا ہے۔ آؤ یہ دیکھو یہ میری دنیا' کوڑوں کے انبار والی دنیا' سماجی بھوکوں' سیاسی بھوکوں' اقتصادی بھوکوں والی دنیا' جنسی بھوکوں اور شکمی بھوکوں والی دنیا' نہایت معمولی سی بات کی طرح بغیر مسکرائے غضب کی ڈھٹائی سے' بغیر پیشانی پر ایک ادنیٰ سی بھی چیں لائے ہوئے بلا کی ستم ظریفی کے ساتھ ناظر کے حلق پر کونین کی تہ پر تہ چڑھاتا بڑے انداز میں چلا جاتا ہے۔

میں نے جب شہاب کے یہ افسانے پڑھے تو مجھے ایسے معلوم ہوا کہ یہ افسانہ نگار زبردست لاشعوری طور پر جرات اور خدا داد بے باکی کا حامل ہے اور اپنی انگلیوں میں داؤدی معجزہ لے کر آیا ہے جو لوہے کو موم کی طرح گوندھ کر اپنی مرضی کے مطابق زنجیر تشکیل کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اپنے لیے جو موضوع انتخاب کیا ہے اس میں حسن و رعنائی کے بجائے کوڑھ کے بد نما داغ ہیں' روحانی جذام اور جسمانی جذام کی بہتی ہوئی پیپ جس پر مکھیوں کے چھتے بھنبھناتے ہیں' افلاس کی سیاہیوں کے بادل منڈلاتے ہیں

اور گناہوں کی تاریکیوں کی اندھیریاں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ ایک بہت نازک مقام ہے اور جب ایک افسانہ نگار ان چیزوں کو اپنے یہاں جگہ دیتا ہے اسے بہت چاق و چوبند ہو کر اور اپنی صلاحیتوں کو بھرپور کام میں لا کر افسانہ لکھنا پڑتا ہے کیونکہ موضوع کی غیر شعریت اور بے رنگی جو کرداروں اور ماحول کی کراہتوں کی صورت قاری کے سامنے آ کر سرے سے انہیں پڑھنے سے ہی روکتی ہے' چہ جائیکہ دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرے اور میں بھی شہاب کے افسانے ہرگز نہ پڑھتا' اگر ان میں بے پناہ خلوص اور اسٹائل میں اس غضب کی جان نہ ہوتی۔ اس تاریک دنیا کو شہاب کے جاندار اسٹائل نے اور اس پر خلوص زور بیان نے اس قدر روشن اور گوارا بنا دیا ہے کہ بے اختیار شہاب سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کشمیر کی فردوسی وادیوں اور پنجاب کے وسیع میدانوں کے متعلق سبھی افسانہ لکھتے ہیں اور جنسی جذبات کو ابھار کر اپنی کہانیوں میں لذت پیدا کر لینا تو عام رسم اور سہل نسخہ ہے لیکن ایسی کریہہ دنیا میں پیش کر کے اور ہمیں اس دنیا میں دوش بدوش اپنے ساتھ ایسے چلاتا جیسے ہم ہالی ووڈ اور بمبئی کے اسٹوڈیو میں گھوم رہے ہیں یا سوئٹزر لینڈ اور کشمیر کی وادیوں کا چکر لگا رہے ہیں۔ آج کل کے افسانہ نگاروں میں صرف قدرت اللہ شہاب کی انگلیوں کا معجزہ ہے۔ میں کسی قسم کے تعصب کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں آپ ہی بتایئے کہ کرشن چندر سے کشمیر کی رنگین وادیاں چھین لی جائیں اور ندیم سے پنجاب کے گنگناتے روشن میدان لے لیے جائیں' شفیق الرحمٰن سے ڈیرہ دون اور شملہ کے ہرے بھرے نشیب و فراز نکال لیے جائیں' عصمت' منٹو اور مفتی کے یہاں اعصابی تشنج نہ ہو تو کیا آپ ان کے افسانوں کو پڑھیں گے۔ یہ ایک بہت بڑا سوال ہےجس کا پوچھنا میری جرات رندانہ ہے اور جس کا جواب بھی کچھ دل گردے والا انسان ہی دے سکتا ہے۔ خوبصورت اور جذباتی موضوعات پر افسانہ لکھ کر مقبول ہونا تو بہت آسان ہے لیکن گھناؤنے موضوعات کو کرید کر مقبول اور ہر دلعزیز بنانا صرف شہاب ہی کے زور قلم کا حصہ ہے اور یہ قلم اس وقت تک

نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک افسانہ نگار کی شخصیت میں وہی بانکپن اور

ویسے ہی ہمدردی اور خلوص نہ ہو جو شہاب کے اندر ہے۔

اب کچھ "یا خدا" کے متعلق ------- شہاب کا یہ افسانہ نہ صرف اس کے پچھلے تمام افسانوں میں بڑھ چڑھ کر ہے بلکہ اس کا شمار زبان اردو کے بہترین افسانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح قحط بنگال کے افسانوں میں کرشن چندر کا "ان داتا" سب سے زیادہ بھرپور اور موثر افسانہ ہے' اسی طرح قدرت اللہ شہاب کا "یا خدا" فسادات پر لکھے ہوے افسانوں میں ہے۔ "یا خدا" فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں کا بادشاہ ہے۔ اس کے اندر وہ بے پناہ حقیقت نگاری اور ایسی شدید روح ملتی ہے کہ بعض مصلحت اندیش لکھنے والے اس پر ارتداد و کفر کا فتویٰ صادر کر بیٹھے۔ اپنی عمر میں جن معددودے چند چیزوں سے قاری انتہائی متاثر ہوا کرتا ہے' ان میں ایک "یا خدا" بھی ہے۔

لیکن جب ظہیر بابر اور مجیبۃ حسین کے مضامین دیکھے تو مجھے یہ خوف ہوا کہ کہیں میں غلط راہ پر تو نہیں جا پڑا ہوں۔ جذبات کی رو میں کہیں رجعت پسندی کا شکار تو نہیں ہو گیا ہوں۔ لیکن جب میں نے "یا خدا" کا دیباچہ اور یہ مضامین پڑھے تو یہ محسوس کیا کہ ان مضامین اور "دیباچہ" کو "یا خدا" سے کوئی علاقہ نہیں ہے کیونکہ دیباچہ میں "یا خدا" کے متعلق کہنے کی بجائے کچھ اور کہا گیا ہے اور مضامین میں "یا خدا" سے زیادہ دیباچہ پر بحث کی گئی ہے اور اصل مصنف سے زیادہ دیباچہ نگار پر نکتہ چینی کی گئی ہے اور کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت اللہ شہاب بے چارے ایک جانب سے آلہ کار ہیں اور دوسری جانب سے چکی کے دو پاٹوں میں گیہوں کے ساتھ گھن بن کر پسے گئے ہیں اور ان پر کسی اور جذبے کے تحت تیر و نشتر چلائے گئے ہیں اور اس بے مثال افسانہ میں فرقہ پرستی کے ناپاک جراثیم تلاش کئے گئے ہیں اس میں شک نہیں کہ افسانہ کا فریم دیکھ کر پہلی نظر میں ضرور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس تصویر میں چالاک سیاست دان کی طرح ایک ہی رخ پیش کیا گیا ہے اس کے پیش کرنے والے کے

خلوص میں مجھے ذرا برابر بھی شبہ نہیں ہے۔ فنکار کے قلم نے صرف ان احساسات کی عکاسی کی ہے جو ایک مخصوص ماحول میں' ایک خاص طبقہ کی نمائندگی کرنے والے کردار سے وابستہ ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان میں ظالم و مظلوم کی تمیز اٹھ گئی تھی۔ ظالم ادھر بھی تھے اور ظالم ادھر بھی اور جانبین میں سے کسی ایک کی بھی یہ منطق ظلم کے لیے وجہ جواز نہیں ہو سکتی کہ پہلے اقدام کس کی جانب سے ہوا۔ ہر ہر مہا دیو اور نعرۂ تکبیر کے نعروں اور جے کاروں میں مٹنے والے وہ مظلوم تھے جنہیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایک ماحول کا مصنف صرف اپنے ماحول کے مظلوموں کی عکاسی صحت نیت کے ساتھ کر دیتا ہے تو اس کے یہ معنی کب ہو گئے کہ اس کے ماحول کی حدود کے باہر مظلوم ہیں ہی نہیں۔ ترقی پسند نقطہ نظر تو یہ کہتا ہے کہ ہم اس کی تخلیق کو اس بات کے پیش نظر جانچیں کہ آیا فنکار کہیں جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے یا اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے کسی سچی بات سے چشم پوشی تو نہیں کر رہا ہے اور اس تصویر کے پیش کرنے میں کہیں افراط و تفریط سے تو کام نہیں لے رہا ہے۔ شہاب کے اس افسانہ کو پڑھ کر جو لوگ اس میں فرقہ واریت کے کیڑے دیکھتے ہیں وہ دراصل حقیقت سے آنکھیں چراتے ہیں۔ حقیقت کو پیش کر دینے سے خواہ لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں یا حلق کڑوے ہو جائیں لیکن حقیقت تو حقیقت ہے اور اس کی تلخی یا ترشی مسلم اسے شیریں بنانا کسی کے بس کی بات نہیں۔

"یا خدا" میں صرف ان لوگوں کو فرقہ پرستی کے کیڑے ملتے ہیں جو یا تو مصلحت اندیش ہیں یا پھر جو ان فسادات میں آگ اور خون کی دنیا سے بہت دور بیٹھے صرف پریس کی مدد سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہے اور رائیں قائم کرتے رہے اور اخباری دور بینوں سے مشاہدہ کر کے افسانے لکھتے رہے اور نہایت سستی قسم کی موٹی مصلحت اندیشی کے تحت جانبین کے ظالموں اور مظلوموں میں توازن رکھتے ہوئے' دونوں قوموں میں صلح کرانے کا فورتھ کلاس قسم کا پروپیگنڈا کرتے رہے۔ خیر ان افسانہ نگاروں کے

جذبہ کو مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم اس کے اندر سطحی معصومیت ضرور ملتی ہے اور اگر اس سے قوم کی حالت سدھر سکتی ہے اور نفرت کی آگ ٹھنڈی ہو سکتی ہے تو ایسا ضرور کرنا چاہیے لیکن ہر فنکار سے یہ امید کرنا کہ وہ اپنے مزاج کو بدل کر اور اپنے اوپر اعتدال و توازن کا خول چڑھا کر اس نیک کام میں ان کا ہاتھ بٹائے تو یہ چیز بہت بے معنی ہے۔ یہ ایک ٹھنڈی طبیعت کا ادیب تو کر سکتا ہے لیکن شہاب جیسا شعلہ مزاج اور تند طبیعت نوجوان فنکار اس پر کیسے قادر ہو سکتا ہے' جسے اپنا خلوص اس قدر عزیز ہے کہ خود اپنی تلاشی لیتے ہوئے بھی اسے باک نہیں ہے۔ ایسے ادیب سے یہ امید کرنا کہ وہ اپنی نوک قلم بجائے حقیقت کی آگ کے مصلحت کی برف میں ڈبو کر لکھے' فضول ہے۔ کیونکہ اس کے پچھلے افسانے یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے اندر مصلحت (Compromise) کے عناصر پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔

وہ اس مقدس آگ کے دبانے سے مجبور ہے جو انسانیت سوز آگ کے شعلوں کو دیکھ کر ایک فنکار کے اندر بھک سے بھڑک اٹھتی ہے اور اس شعلہ فشانی کے بغیر شہاب زندہ نہیں رہ سکتا۔ "یا خدا" میں اس کے احساسات کی یہ آگ اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اس کی وسیع انسانی ہمدردی کے جذبہ کو غلط سمجھ کر بد حواسی میں اسے فرقہ پرست کہہ دیا لیکن میں پھر سوچتا ہوں اور بار بار میرے ذہن میں ایک بات کھٹکتی ہے کہ قدرت اللہ شہاب پر یہ تمام عتاب اس لیے نازل ہوا ہے کہ محمد حسن عسکری اور ممتاز شیریں نے اس کو سراہا ورنہ "یا خدا" کی نوعیت وہی تھی جو خواجہ احمد عباس کے "سردار جی" کی تھی۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ "سردار جی" میں تو ایک تشنگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے اس میں کوئی بھرپور کردار ملتا ہے' اور نہ ایسی فضا جس کے مطابق ہم ماحول کا تجزیہ کر کے اس چیز پر مطمئن ہو سکیں جو فنکار کہنا چاہتا ہے۔ سردار جی کا آخری حصہ تو اتنا غیر فطری اور بے جان ہے کہ مصنف کی مصلحت اندیشی اور توازن قائم کرنے کا پول نہایت پھس پھسے طریقہ سے کھل جاتا ہے اور افسانہ ایک

بچگانہ کوشش بن کر آپ اپنا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ اس افسانہ کی ابتدا میں سکھوں سے جو نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے وہ سردار جی کے خاتمہ پر زائل نہیں ہوتا کیونکہ اس کا خاتمہ بہت کمزور ہے اور بچوں کے بہلانے کا جھنجھنا سا بجتا سنائی دیتا ہے۔ شہاب کے افسانہ کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں ایک زندہ سماں ہے اور اس کی فضا میں آپ کو شروع سے آخر تک نہایت خوبصورت یکسانیت ملتی چلی جاتی ہے اور ایک ایسا تجزیہ جس کی روشنی میں نہ صرف آپ کو فسادات کا صحیح پس منظر معلوم ہو جاتا ہے بلکہ اس گھناؤنے ماحول سے نفرت ہونے لگتی ہے اور اس نفرت کو ابھارنا اور اجاگر کرنا ہی مصنف کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ شاید ترقی پسند نقاد اس افسانے پر لکھتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ لینن نے کہا ہے۔ "اگر اپنے ماحول کو بدلنا ہے تو سب سے پہلے اس ڈھانچہ سے نفرت کرو۔" قدرت اللہ شہاب جب بھی نفرت کا جذبہ ابھارتا ہے تو کیا اس کا یہ فعل عین ترقی پسند نہیں ہے۔ فرقہ پرستی کے جراثیم کو ختم کرنے کے لیے صرف دلی کے گورنمنٹ ہاؤس میں بیٹھ کر صلح کی بات چیت کرنا ہی کافی نہیں ہے کیونکہ فسادات کی بنیاد صرف مذہب یا عقیدہ نہیں ہے اس کی تہ میں بہت سے عناصر کار فرما ہیں۔

عناصر دونوں جگہوں پر یکساں ہیں اور انہی سے مل کر یہ ماحول بنا ہے اس لیے جب تک ان بنیادی عناصر سے نفرت پیدا نہ کی جائے اس وقت تک اس ماحول کا پردہ چاک نہیں ہو سکتا اور اصل جراثیم نہیں مٹ سکتے۔ "یا خدا" کے مصنف کا سب سے بڑا فنی کمال یہ ہے کہ اسے پڑھ کر ہندو یا سکھ سے من حیث القوم نفرت کا احساس بیدار نہیں ہوتا بلکہ خنجر بھونکنے والے سے زیادہ خنجر بھونکنے کے عمل اور وحشت و بربریت کی جانب ہم متوجہ ہوتے ہیں۔ دلشاد سے ہمیں اس لیے بڑی ہمدردی نہیں ہوتی کہ وہ ایک مسلمان لڑکی تھی اور ملا علی بخش کی بیٹی تھی بلکہ شہاب کے خلوص بیان نے اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھتے وقت ہم یہ تو بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں کہ وہ کون ہے۔ وہ ہمیں صرف ایک معصوم لڑکی دکھائی دیتی ہے جسے چند وحشی درندے نوچتے

دکھائی دیتے ہیں اور کچھ طرز بیان کا جادو ہم پر ان درندوں کے اس طاغوتی فعل سے ایسا جذبہ نفرت اور لڑکی کی مصیبت پر اپنی ہمدردی بیدار کرتا ہے کہ ہم شیطانی عناصر کے خلاف کمر بستہ ہو جاتے ہیں اور یہی ایک فنکار کا سب سے بڑا کمال ہے کہ اس کا مقصد قاری کے اندر رچ کر رہ جائے اور جب دلشاد کو عمل کے آثار نظر آتے ہیں تو اس کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے اور ہم بلک بلک اٹھتے ہیں مگر ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ مظالم ایک کلمہ گو خاتون پر ٹوٹ رہے ہیں بلکہ دلشاد کے کردار کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک رینگتی ہوئی مخلوق جیسا پیش ہوتا ہے جسے عورت کہتے ہیں۔ اور پھر عورت بے بس و مجبور' عصمت و عفت کی دیوی' جس کے بطن کا مقدس صندوق خالق مطلق نے اپنی تخلیقی شاہکار کی امانت کے لیے منتخب کیا ہے اور دلشاد کا بچہ ہمارے سامنے صرف ایک ناجائز اولاد ہی کی شکل میں نہیں آتا بلکہ اس وحشت اور بربریت کی زندہ تشکیل ہے۔ جب انسانیت دشمن بوالہوس انسان نما درندے انسانی تہذیب و تمدن کے تمام سرمایہ کو ملیا میٹ کر کے اپنی ہوس کی آگ بجھاتے ہیں۔ یہ دلشاد اگر گیتا یا سیتا ہو گی تو بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ یہ مریک سنگھ اور دربار سنگھ اگر شہباز خان اور گلزار خان ہوں گے تو اس عمل میں ماحول کے لحاظ سے ایک ہلکا سا فرق محسوس ہو سکتا ہے۔ لیکن گیتا اور سیتا کی مظلومیت بھی اسی نوعیت کی ہو گی' جیسی دلشاد کی تھی اور ان کی ناجائز اولاد بھی اسی طرح انسانیت کے نام پر طنز و تشنیع کا ایک تیر پھینکتی اور پکار پکار کر کہتی۔ "او میاں ہندوستانی صاحب! دیکھو ہم ہیں بیسویں صدی کی آئینی اور اخلاقی دنیا کے روشن اور سفید صفحہ پر تمہارے ٹپکائے ہوئے کالے دھبے' وہ دھبے جن کی مثال ہندوستان سے باہر اس صدی میں باوجود دنیا کی دو عظیم جنگوں کے بھی کہیں اور نہیں ملتی۔"

"یا خدا" کو پڑھ کر اور اس کے ماحول کا تجزیہ کر کے قاری کے اندر ایک وسیع انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد سکھ اور مسلم پر نہیں بلکہ ظالم اور مظلوم

پر ہے۔ اس کے کردار اپنے ماحول کے لحاظ سے اپنا عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ماحول کو خواہ یوپی میں رکھ لیجئے چاہے بہار میں یا بنگال' آسام اور سندھ میں' اس کی بنیاد نہیں بدل سکتی۔ البتہ دلشاد اپنا نام بدلتی جائے گی۔ وہ کہیں گیتا ہو گی اور کہیں سیتا اور کہیں سعیدہ اور کہیں رقیہ' مگر اس کے ساتھ چند درندے بیدردی سے انسانیت کی بے گور و کفن ننگی لاش کی بوٹیاں نوچتے نظر آئیں گے۔ اب بتایئے کتنا بڑا ظلم ہے اور افسانہ نگار کی کاوشوں کی کتنی بڑی بے قدری ہے۔ جب آپ اپنی خاص عینک سے دلشاد کو صرف مسلمان ہی سمجھ لیں حالانکہ "یا خدا" کے خلوص بیان اور ترقی پسند تنقید نگاری کا تقاضا یہ تھا کہ دلشاد صرف ایک عورت کی صورت میں نظر آتی۔ ایک مظلوم و بے بس عورت۔ ان کے دل میں دلشاد ہی ہمدردی کرتے وقت خود مسجد اور گردوارے کے جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے دل کا چور مصنف کے سر تھوپ دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ تصنیف میں کوئی ادبی نشان بھی اس قسم کا نظر نہیں آتا۔ ایک بات اور قابل افسوس ہے کہ اس افسانے کو شائع کرتے وقت قدرت اللہ شہاب نے ممتاز شیریں سے دیباچہ لکھوایا۔ مگر انہوں نے بھی مصنف اور تصنیف دونوں کے ساتھ خلوص کا ثبوت دیا جو شیریں جیسے ممتاز اور بلند پایہ فنکار کے کسی صورت سے بھی شایان شان نہ تھا۔ انہوں نے بجائے اس کے کہ اپنی ناقدانہ قوتیں افسانہ کے حسن و قبح پر صرف کرتیں بلکہ ترقی پسندوں کے خلاف زور قلم دکھایا۔ حیرت ہے کہ ابھی دو سال پیشتر جب محترمہ دور افسانہ نگاری کا جائزہ لینے بیٹھی تھیں تو کرشن چندر انہیں افسانہ نگاری کا دیوتا نظر آتا تھا اور اس کے ردی سے ردی افسانہ میں بھی وہ وہ باریکیاں دیکھتی تھیں اور ایسی ایسی تشریحیں کرتی تھیں کہ بے چارہ افسانہ نگار "مصنف سوچتا ہے کس کی یہ تصنیف ہے" کا مصداق ہو کر دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ رہ جاتا تھا اور "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کا مضمون تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک سے الگ ہوتے ہی انہیں کرشن چندر کے "ان داتا" میں بھی کیڑے دکھائی دینے لگے' حالانکہ اس سے پیشتر مختلف

پہلوؤں سے وہ اس پر قصیدہ خوانی کر چکی تھیں مگر اب نہ معلوم ادب میں کایا پلٹ ہو گئی یا وہ خود کایا کلپ ہو گئیں کہ ترقی پسند فنکاروں کی تمام کوششیں سرے سے مہمل اور بے جان نظر آنے لگیں اور اس کے اظہار کے لیے وہ مواقع کی تلاش میں اس درجہ سرگرم ہو گئیں کہ مناسب اور نامناسب کی تمیز بھی کھو بیٹھیں۔ شیریں جیسی صاحب فکر و نظر سے ہمیں امید اس چیز کی تھی کہ وہ اپنی اعلیٰ و ارفع استعداد کے مطابق سنجیدگی کے ساتھ "یا خدا" کا جائزہ لیں گی۔ اور اپنے تبحیر علمی کے شایان شان تنقید کریں گی۔ شیر شاہ کی بڑی یا سلیم شاہ کی بڑی کا مقابلہ تو یوں بھی تنقید میں کوئی مستحسن چیز نہیں ہے اور دیباچوں اور تبصروں کو ادبی پالی ٹانا کوئی ادبی خدمت نہیں ہے۔ خیر ہر شخص کو اپنے قول و فعل کا اختیار ہے۔ انہیں اس کی قطعاً آزادی ہے کہ وہ اپنی پچھلی چھ سالہ ادبی خدمت کا گلہ گھونٹ کر ایم اسلم اور قیسی رامپوری کو بیدی اور کرشن چندر پر فضیلت دیں' مگر قدرت اللہ شہاب کو اس اکھاڑے میں اتار کر بیدی اور کرشن چندر سے بھڑانا اور اصولی طور پر غلط ہے۔ انہوں نے قدرت اللہ شہاب کو عقیدت کے ہار پہنا کر اور "یا خدا" کا کچھ "سعدی دیگر است" قسم کا دیباچہ لکھ کر شہاب کے ساتھ ٹھیک ٹھیک نادان دوست والی دشمنی کا ثبوت دیا ہے اور ذاتی اغراض کی بنا پر ایک عظیم فنکار کو آلہ کار بنایا ہے آپ کی غرض پوری ہو یا نہ ہو مگر فنکار کا مطلب تو بگڑ ہی جائے گا۔ اس بنا پر میں ان تمام لوگوں کو دعوت دیتا ہوں جو ادب کا خلوص کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں کہ وہ "یا خدا" کا جائزہ لیں۔

ترقی پسند ناقدین سے دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ وہ "یا خدا" یا "یا خدا" ایسی اور چیزوں کو تبصروں اور دیباچوں کے سرٹیفکیٹ دیکھے بغیر بھی پڑھا کریں اور انہیں قدرت اللہ شہاب کا یہ شہ پارہ ممتاز شیریں اور عسکری کے دیباچہ اور تبصرہ کے لیبل ہٹا کر پڑھنا چاہیے تھا۔ انہیں معلوم ہوتا کہ قدرت اللہ شہاب کم از کم "یا خدا" تک تو انہی کا ہمنوا ہے اور اس کا مقام انہی کی صف میں ہے اور ممتاز شیریں اسے انہی سے

ٹکرانا چاہتی ہے اور اسے کرشن چندر اور بیدی کی قطار سے ایم اسلم اور قیسی رامپوری کی صف میں گھسیٹ رہی ہیں۔ یہاں پر مجھے ان ترقی پسند ناقدین سے شکایت ہے کہ انہوں نے "یا خدا" پر صرف اس لیے کہ اس پر ممتاز شیریں کا دیباچہ تھا اس کی سب خوبیوں پر پانی پھیر دیا اور جذباتیت اور ہٹ دھرمی میں جو فیصلہ صادر کیا وہ نہ صرف علمی و ادبی بد دیانتی ہے بلکہ ترقی پسند اصولوں کے سخت منافی ہے۔ یہ لوگ اس سے پیشتر فسادات نمبر میں "یا خدا" دیکھ چکے ہوں گے اور ممکن ہے کہ پسند بھی کر چکے ہوں گے۔ مگر ان بے چاروں کو اس پر تنقید کرنے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب اس میں ممتاز شیریں کا مقدمہ شامل ہوا' اس کو پرائی بد شگونی کے پیچھے ناک کاٹنا کہتے ہیں۔

آخر میں پھر عرض کروں گا کہ اس میں شک نہیں کہ "یا خدا" کا دیباچہ ایک قسم کی سازش کا پہلو لیے ہوئے ہے مگر اس کی بنا پر اصل شہ پارہ کی عظمت سے منکر ہونا اور نہ صرف منکر ہونا بلکہ اس کی خوبیوں کو برائیوں کا نام دینا خود اس ادبی بد دیانتی کے ارتکاب سے کم نہیں جس سے دیباچہ کی تیاری میں کام لیا گیا ہے اور مجھے رجعت پسند دیباچہ نگار کی صف میں ان ترقی پسند تبصرہ نگاروں کو بھی کھڑا کرنا پڑتا ہے۔ ارے صاحب ترقی پسندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ دیباچہ نگار کی سازش کو بے نقاب کیا جاتا اور "یا خدا" کے مصنف کے متعلق یہ بتایا جاتا کہ کم از کم "یا خدا" تک تو ہماری انجمن کے اصولوں کا سچا ترجمان ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے اب ایک خاص مقصد کے لیے Exploit کیا جا رہا ہے۔ چلتے چلتے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ دیباچہ نگار اور تبصرہ نگار اپنے اپنے رویہ پر غور کریں۔ خصوصاً تبصرہ نگار حضرات جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے افراد ہیں ذرا اسپورٹنگ سپرٹ سے کام لیں اور "یا خدا" کو انصاف کے ساتھ پڑھیں اور پھر اپنے تبصروں کو' اور ممتاز شیریں اور عسکری کے اظہار خیال کرنے کے قصور "یا خدا" سے معاف کر کے دوبارہ تبصرہ لکھیں' یوں تو تنقید میرا میدان نہیں ہے۔ اور اس میدان میں راقم الحروف نووارد سے زیادہ نہیں اس لیے قدرت اللہ شہاب جیسے عظیم

فنکار اور "یا خدا" جیسے بے مثل شہ پاروں کے شایان شان نہ لکھوں گا اور قرار واقعی تنقید نہ کرنے کا "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" لیکن اگر میری اس تحریر پر مصنف' دیباچہ نگار اور تبصرہ نگار حضرات میں سے کوئی غور کریں گے تو میں اپنی سعادت خیال کروں گا اور اردو ادب کے لیے نیک فال۔

○ نظرے خوش گزرے

یہ بہت پہلے کی بات ہے' شاید ۱۹۵۹ء کی
تب میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا کہ والد صاحب ایک چھوٹی سی کتاب لائے اور میں نے دیکھا کہ اسے پڑھتے ہوئے انہوں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔
اس کے بعد موقع ملتے ہی میں نے وہ کتاب ان کی الماری سے اڑائی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ چھوٹی سی کتاب تھی' گھنٹہ بھر میں ختم ہو گئی مگر اسے پڑھ کر مجھے رونا نہیں آیا۔
چار سال قبل' میں نے یہ کتاب دوبارہ پڑھی تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
تب' ایک دم' جیسے بجلی چمکتی ہے' مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ کتاب اس وقت رلاتی ہے جب آپ کا شعور پوری طرح بالغ ہو چکا ہے' اس کتاب کا نام "یا خدا" تھا اور اس کے مصنف تھے' قدرت اللہ شہاب۔ قدرت اللہ شہاب' جو ایک زمانے میں انڈین سول سروس کے ستون تھے' پھر سی ایس پی کے کافی بلند پایہ ستون رہے' آج کل ممتاز مفتی کے معیت میں تصوف کے ایک پورے سلسلہ شہابیہ کے بانی مبانی بنے ہوئے ہیں۔ نستعلیق کتابی چہرے پر نیم متشرع سی ڈاڑھی بھی بڑھا لی ہے۔ یہ الگ بات کہ صوفیوں کی متداول عادت کے برعکس اب وہ مزید نرم دل' مزید آہستہ گو ہو گئے ہیں۔
آج کل انہیں دیکھ کر' ان کی باتیں سن کر بے اختیار صائب کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے کہ

فروتنی ست دلیل رسیدگان کمال
کہ چوں سوار بہ منزل رسد' پیادہ شود

ان میں اتنی عاجزی اور انکسار ہے کہ لگتا ہی نہیں' یہ شخص کبھی بہت زبردست اور معرکے کا سرکاری افسر بھی رہا ہو گا۔ نرم دم گفتگو' گرم دم جستجو' رزم میں تو ہم نے دیکھا نہیں مگر بزم میں وہ پاک دل و پاکباز ہی محسوس ہوئے۔
وہ ساری عمر اپنے متعلقین اور وابستگان کو حیران ہی کرتے رہے۔ تب بھی جب صدر پاکستان کے سیکرٹری تھے' تب بھی جب اطلاعات کے سکتر تھے' اور تب بھی جب نوکری چھوڑ کر یونیسکو میں جا بیٹھے' اور ایک روز پتہ چلا کہ خفیہ طور پر وہ اسرائیل کا چکر بھی لگا آئے ہیں۔ تب ان کے ایک مرحوم دوست ابن انشاء نے جو کالم لکھا' اس کی سرخی یہ شعر تھا۔

قدرت اللہ شہاب کی باتیں
ایسے ہیں جیسے خواب کی باتیں

باتیں وہ اب بھی خواب و خیال ہی کی سی کرتے ہیں' یقین نہیں آتا کہ مثنوی کے مصرعہ جیسی دھان پان قامت میں ایسی قیامت کی شخصیت چھپی ہوئی ہے' ان کی قامت مختصر' مگر داستان طویل ہے' اس میں طوفانوں کی شورش بھی ہے اور جذبوں کی یورش بھی۔
گئے دنوں' گئے زمانوں سے ہم نے کبھی کچھ نہیں سیکھا' یہ داستان بھی بلا سے کوئی اثر مرتب نہ کرے مگر سن تو لیجیے کہ اس میں کتنی عبرتیں' کتنی قیامتیں پنہاں ہیں' قدرت اللہ شہاب کی کہانی' خود انہی کی زبانی-------

من آنچہ شرط بلاغ است، با توی گویم
تو خواہ از سخنم پند گیرو خواہ ملال

اظہر سہیل

○○○

- آزاد کشمیر

ریاست جموں و کشمیر کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ اس کے چار ہزار سال کے قصص و روایات کا کچھ حصہ "راج ترنگنی" کی کلاسیکی سنسکرت میں درج ہے۔ اس کے برعکس تحریک آزادی جموں و کشمیر کی داستان اگرچہ ظاہری طور پر ۱۹۲۵ء سے شروع ہوتی ہے' مگر تاحال ادھوری ہے۔ اس کے باوجود تحریک آزادی کشمیر کی ساٹھ سالہ داستان کئی لحاظ سے "راج ترنگنی" کے ہزاروں سالوں پر بھاری ہے۔ جدوجہد آزادی کی اس تحریک کے ایک ایک پہلو پر ایک مستند اور مکمل راج ترنگنی تصنیف ہو سکتی ہے۔ اتنا بڑا کام سر انجام دینا میرے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے اس باب میں میں اس ڈرامے کی چند چیدہ چیدہ جھلکیاں ہی پیش کر سکوں گا۔

۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کے روز عہد نامہ امرتسر کے ذریعہ انگریزوں نے ریاست جموں و کشمیر ایک ڈوگرہ مسمی گلاب سنگھ کے ہاتھ ۷۵ لاکھ نانک شاہی روپیہ کے عوض فروخت کر دی۔ ریاست کا رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل تھا۔ اس نرخ پر یہ سر زمین رشک فردوس بریں تقریباً ۱۵۵ روپے فی مربع میل یا موجود زمانے کے ایک پیسہ میں تقریباً ۲۷۰ مربع گز پر اٹھی۔ اس وقت کی آبادی کے حساب سے انسانوں کی قیمت تقریباً سات یا سوا سات روپے فی کس پڑی۔

گلاب سنگھ کا جانشین رنبیر سنگھ بھی اپنے باپ کی طرح قطعی ان پڑھ اور جاہل تھا۔ البتہ اس نے اپنے ولی عہد پرتاب سنگھ کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ اتالیق ضرور مقرر کیے۔ کہا جاتا ہے' کہ ان میں ایک مسلمان اتالیق کی بہت جلد چھٹی ہو گئی۔ پرتاب سنگھ پڑھائی میں بے حد غبی اور کند ذہن تھا۔ کسی بات پر ناراض ہو کر اس کے مسلمان

استاد نے اس کو ڈانٹا اور کہا۔ "ابے لونڈے محنت سے پڑھا کر' ورنہ باپ کی طرح جاہل کا جاہل رہ جائے گا۔" یہ بات مہاراجہ رنبیر سنگھ تک پہنچی تو وہ بہت بگڑا۔ اور اس نے اپنے بیٹے کے اتالیق کو ملازمت سے برخاست کر دیا۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ انتہائی کایاں اور "دیوانہ بکار خویش ہوشیار" قسم کا انسان تھا۔ اسے افیون کھانے کی لت تھی جس کی وجہ سے وہ دن بھر خمار آلود غنودگی کی کیفیت میں مبتلا رہتا تھا۔ اس صورت حال کو ڈھال بنا کر وہ اپنی ذات پر ایک مصنوعی مخبوط الحواسی' بے بناوٹی اور کسی قدر احمقانہ حد تک سادگی کا لبادہ اوڑھے رکھتا تھا۔ لیکن اس ملمع کاری کے پیچھے وہ انتہائی چالاک' ہوشیار اور دور رس سمجھ بوجھ کا مالک تھا۔ انگریزوں کے ساتھ وہ اپنے تعلقات انتہائی استوار رکھتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ سادگی اور درویشی کا ڈھونگ رچا کر وہ ان کے خلاف ظلم و استبداد کے سارے قوانین کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا رہتا تھا۔ اور اپنی حکمت عملی سے ڈوگرہ خاندانوں کو ریاست میں سیاہ و سفید کا مالک بنانے میں کمال ہوشیاری سے کام لیتا تھا۔

میں نے نہایت کم عمری میں صرف ایک بار مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو بچشم خود دیکھا تھا۔ انگریز ریذیڈنٹ کی کرکٹ الیون کے ساتھ میچ کھیلنے کے لیے مہاراجہ نے اپنے افسروں کی ایک ٹیم کھڑی کر رکھی تھی۔ میرے والد مہاراجہ کی ٹیم میں شامل تھے۔ مہاراجہ بذات خود اس ٹیم کا کپتان تھا۔ لیکن جب وہ کھیلنے کے لیے میدان میں اترا تو اس کا حلیہ بہروپیوں جیسا تھا۔ اس کے سر پر ایک سفید ٹوکرا نما ڈھیلی ڈھالی پگڑی تھی' جس کی پیشانی پر سامنے کی طرف اور دائیں بائیں ہیرے جواہرات سے جگمگ کرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی کلغیاں تھیں۔ گلے میں رنگ برنگ موتیوں کے بہت سے ہار تھے۔ گھٹنوں تک لمبا نیلے رنگ کا انگلش کٹ کوٹ تھا۔ نیچے سفید پتلون اور سفید بوٹ تھے۔ اس ہیئت کذائی کا ایک گول مٹول اور ٹھگنا سا شخص جب بیٹ گھماتا ہوا وکٹ کے سامنے

آ کر ایستادہ ہو گیا' تو ایسے نظر آتا تھا کہ مکی ماؤس کا رنگین کارٹون کسی کتاب کے صفحے سے بھاگ کر امر سنگھ کلب سری نگر کے سبزہ زار میں آ کھڑا ہوا ہے۔ ریذیڈنٹ کی ٹیم کا باؤلر مہاراجہ کی جانب گیند اس قدر آہستگی سے لڑھکاتا تھا جیسے دو سال کے بچے کی طرف پیار سے پچکار کر لڈو پھینکا جاتا ہے۔ اس پر بھی مہاراجہ بار بار وکٹ آؤٹ ہوتا رہتا تھا' لیکن امپائر بلند آواز سے No بال کا اعلان کر کے شاہی سکور میں ایک رن کا اضافہ کر دیتا تھا۔

اگرچہ ریاست میں سرکاری طور پر بجٹ بنانے کا دستور رائج ہو چکا تھا' لیکن مہاراجہ پرتاب سنگھ کے ذاتی اخراجات کی تفصیل بصیغہ راز رکھی جاتی تھی۔ راج محل کے اخراجات کی ایک مد "ٹٹی پن" کہلاتی تھی۔ قضائے حاجت سے فارغ ہونے کے بعد مہاراجہ بہادر کو طہارت کرانے پر تین ملازم مامور تھے۔ دو ملازم چھبیس کی ململ کے ایک پورے تھان کو کھول کر اس کے دونوں سرے تھام کر ایک برآمدے میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ درمیان میں ایک خاص بناوٹ کی چوکی کا سہارا لے کر مہاراجہ صاحب ململ کے تھان پر مناسب آسن جما کر جھک جاتے تھے۔ تیسرا ملازم چاندی کی گڑوی سے صحیح موقع و مقام پر پانی انڈیلتا تھا اور دوسرے دونوں ملازم آرہ کشوں کی طرح ململ کا تھان آگے پیچھے کھینچ کر مہاراجہ کی صفائی کر دیتے تھے۔ اس عمل کے بعد یہ پورا تھان ان تینوں ملازموں کو دان کر دیا جاتا تھا۔ چھبیس کی ململ اس زمانے میں نہایت اعلیٰ اور مہنگے قسم کے کپڑے میں شمار ہوتی تھی۔ مشہور تھا' کہ مہاراجہ کا "ڈیوڑھی وزیر" (Minister in Waiting) کبھی کبھی اپنے آقا کو دودھ میں کچھ مقدار جمال گوٹہ کی ملا دیا کرتا تھا' جس کی وجہ سے اسے بار بار بیت الخلاء جانے کی حاجت پیش آتی تھی۔ چھبیس کی ململ کا ایک تھان تو حسب دستور تینوں ملازموں میں تقسیم ہو جاتا تھا' لیکن اس کے علاوہ باقی سب تھان "ڈیوڑھی وزیر" کے حصے میں آتے تھے۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ بے اولاد تھا۔ اپنی جانشینی کے لیے اس نے اپنی برادری کا ایک لڑکا

منتخب کر کے متبنہ بنا رکھا تھا۔ لیکن ہری سنگھ کے باپ راجہ امر سنگھ کو یہ بات گوارا نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ اپنے بیٹے کو ریاست کا وارث بنانا چاہتا تھا۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس نے ریاست کے طول و عرض میں سازشوں کا جال بچھا دیا۔ اس ساز باز میں راجہ امر سنگھ کو حکیم نور دین سے بڑی مدد ملی۔ حکیم نور دین مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے سے ریاست کا شاہی طبیب تھا۔ اس کے علاوہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دست راست بھی تھا۔

راجہ امر سنگھ کا بیٹا ہری سنگھ انتہائی بد کردار' بد اخلاق' آوارہ گرد' لچا لفنگا اور بدمعاش شخص تھا۔ اس کی جنسی بے راہریوں اور بد قماشیوں کے بہت سے قصے زبان زد خاص و عام تھے۔ مسٹر X کے پردے میں ایک انگریز عورت کے ہاتھوں بلیک میل ہو کر وہ کافی ذلت' بدنامی اور مالی نقصان اٹھا چکا تھا۔ اس کے باوجود انگریز حکمرانوں نے پرتاپ سنگھ کے منتخب متبنہ کی بجائے رسوائے زمانہ ہری سنگھ کو ہی ریاست کی گدی پر بٹھایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس فیصلے میں طرح طرح کی مالی' سیاسی اور جنسی رشوت کا بھی بہت کچھ عمل دخل تھا۔

مہاراجہ ہری سنگھ ۱۹۲۵ء میں گدی نشین ہو کر اپنے لہو و لعب اور عیش و نشاط کی بد مستیوں میں ایسا غرق ہوا کہ ریاست کے چھوٹے بڑے ڈوگرہ ہندو ملازمین کو اپنی من مانی کارروائیاں کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ مسلمانوں کی آبادی ایک صدی سے زیادہ سکھوں اور ڈوگروں کی غلامی میں ہر طرح کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ اب ان کے مصائب میں کئی گنا مزید اضافہ ہو گیا۔ لیکن اسی زمانے میں مسلمانوں کی نئی نسل میں اچانک رد عمل کے ہیجان نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۹ء میں سری نگر میں شیخ عبداللہ نے "ریڈنگ روم پارٹی" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اسی زمانے میں جموں میں بھی چوہدری غلام عباس نے اے آر ساغر اور دیگر چند ساتھیوں کے ساتھ

مل کر "ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن" کی بنیاد ڈالی۔ ان دونوں تنظیموں کا ظاہر سماجی لیکن باطن سیاسی تھا۔ انہوں نے ریاست کے مسلمان نوجوانوں کو پلیٹ فارم پر مل بیٹھنے' اپنے ماحول کا جائزہ لینے اور معاشرے کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں پر صدائے احتجاج بلند کرنے کا آہنگ سکھایا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کا زیادہ وقت کلکتہ' بمبئی' لندن اور پیرس کے عشرت خانوں میں گزرتا تھا۔ میدان صاف پا کر ریاست کے ہندو اہلکاروں کی چیرہ دستیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ اب وہ مسلمان رعایا کے مال و دولت اور عزت و ناموس کے علاوہ ان کے دین و ایمان پر بھی ہاتھ ڈالنے لگے۔ ۱۹۳۱ء میں پہلے ریاسی میں ایک مسجد شہید کر دی گئی۔ پھر کوٹلی میں مسلمانوں کے ایک جم غفیر کو زبردستی جمعہ کی نماز ادا کرنے سے روک دیا گیا۔ اس کے علاوہ جموں میں ایک ہندو پولیس کانسٹیبل نے جان بوجھ کر قرآن حکیم کی سخت بے حرمتی کی۔ ان واقعات نے ریاست بھر کے مسلمانوں میں شدید غم و غصے کی آگ بھڑکا دی۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسے اور جلوس شروع ہو گئے۔ خاص طور پر سری نگر میں عبدالقدیر نامی ایک شعلہ بیاں مقرر نے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کر کے مہاراجہ کی حکومت کی دھجیاں اڑا دیں۔ اسے گرفتار کر کے جیل میں مقدمہ چلایا گیا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے جیل کا محاصرہ کر کے مطالبہ کیا کہ انہیں عبدالقدیر کے زیر سماعت مقدمہ کی کارروائی سننے کی اجازت دی جائے۔ اجازت دینے سے انکار کر کے مجمع کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے گولی چلا دی۔ جس میں ۲۷ افراد ہلاک اور بے شمار زخمی ہوئے۔ شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس گرفتار کر لیے گئے۔ تین روز بعد پھر سری نگر میں فائرنگ ہوئی جس میں دوبارہ مسلمانوں کا خون بہا۔ آزادی کے نام پر کشمیر کی سر زمین پر خون کی یہ قربانی آج تک بدستور جاری ہے۔ ۱۳ جولائی کو ہر سال شہدائے کشمیر کی یاد بھی پابندی سے منائی جاتی ہے۔

سری نگر میں ۱۳ جولائی کی وحشیانہ فائرنگ سے سارے برصغیر کے مسلمانوں میں بھی رنج

و اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔

سب سے پہلے لاہور میں خان بہادر رحیم بخش سیشن جج کی ملتان روڈ والی کوٹھی پر مشورہ کرنے کے لیے چند مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ جموں کی Young Men's Muslim Association کی نمائندگی کرنے کے لیے اے آر ساغر بھی اس میں شامل تھے۔ اس میں طے پایا کہ ہندوستان بھر کے سر بر آوردہ مسلمان اکابرین کو اکٹھا کر کے اس بارے میں کوئی متفقہ فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو شملہ میں فیئر ویو نام کی ایک دو منزلہ کوٹھی میں ایک میٹنگ کے نتیجہ میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی گئی۔ اس میٹنگ میں جو حضرات شامل ہوئے' ان میں علامہ اقبال' نواب سر ذوالفقار علی' خواجہ حسن نظامی' نواب کنج پورہ' نواب باغپت' سید محسن شاہ' خان بہادر شیخ رحیم بخش' عبدالرحیم درد' سید حبیب' اسمٰعیل غزنوی' صاحبزادہ عبداللطیف اور اے آر ساغر کے نام سر فہرست تھے۔ چند دوسرے حضرات کے علاوہ وادی کشمیر کے ایک نمائندے غالباً میرک شاہ بھی اس میٹنگ میں شریک ہوئے تھے۔

بد قسمتی سے صدارت مرزا بشیر الدین محمود نے کر ڈالی اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے صدر بھی وہی بن بیٹھے۔ یہ قادیانیوں کی ایک سوچی سمجھی چال ثابت ہوئی۔ اس کمیٹی کے قائم ہوتے ہی مرزا بشیر الدین محمود نے ہر خاص و عام کو یہ تاثر دینا شروع کر دیا' کہ ان کی صدارت میں اس کمیٹی کو قائم کر کے ہندوستان بھر کے سرکردہ مسلمان اکابرین نے ان کے والد مرزا غلام احمد قادیانی کے مسلک پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس شر انگیز پروپیگنڈا کے جلو میں قادیانیوں نے انتہائی عجلت کے ساتھ اپنے مبلغین کو جموں و کشمیر کے طول و عرض میں پھیلانا شروع کر دیا تا کہ وہ ریاست کے سادہ لوح عوام کو ورغلا کر انہیں اپنے خود ساختہ نبی کا حلقہ بگوش بنانا شروع کر دیں۔ یہ مہم کافی کامیاب رہی۔ کئی دوسرے مقامات کے علاوہ خاص طور پر شوپیاں میں مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد قادیانی بن گئی۔ پونچھ کے شہر میں بھی مسلمانوں کی اکثریت نے قادیانی مذہب اختیار کر لیا۔ یہ خبر سنتے ہی رئیس الاحرار مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری پونچھ شہر

پہنچے اور اپنی خطیبانہ آتش بیانی سے قادیانیت کے ڈھول کا ایسا پول کھولا کہ شہر کی جو آبادی مرزائی بن چکی تھی' وہ تقریباً ساری کی ساری تائب ہو کر از سر نو مشرف

بہ اسلام ہو گئی۔

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت کی آڑ میں مرزا بشیر الدین محمود کی یہ چالبازیاں اور حرکات دیکھ کر علامہ اقبال نے شملہ والی کشمیر کمیٹی سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے کشمیر کے متعلق اس تحریک کی اعانت اور سرپرستی فرمانا شروع کر دی' جو مجلس احرار نے بطور خود نہایت جوش و خروش سے شروع کر رکھی تھی۔

۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو جموں شہر میں پہلی بار کشمیر ڈے منایا گیا۔ اے آر ساغر اور ان کے دیگر رفقائے کار نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ ریذیڈنسی روڈ پر انجمن اسلامیہ کے احاطے سے مسلمانوں کا ایک جلوس مرتب کر کے شہر بھر میں گھمایا جائے۔ ریاستی حکومت تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے ڈوگرہ فوج کو پہلے ہی سے وہاں پر بھیج دیا تا کہ یہ جلوس نکلنے ہی نہ پائے۔ جلوس کے منتظمین نے خفیہ پیغام رسانی سے کام لے کر انجمن اسلامیہ کے احاطے کی بجائے جامع مسجد میں مسلمانوں کا جم غفیر اکٹھا کر لیا۔ ڈوگرہ حکومت نے صورت حال بھانپ کر ایک مسلمان مجسٹریٹ کو مسجد کے باہر تعینات ک ردیا کہ مزید مسلمان مسجد میں داخل نہ ہونے پائیں۔ اے آر ساغر جب مسجد میں جانے لگے' تو مجسٹریٹ نے انہیں روکا' اور پوچھا۔ "تم اس وقت مسجد میں کیا کرنے جا رہے ہو؟"

ساغر نے جواب دیا کہ وہ نماز ادا کرنے کے لیے مسجد جا رہے ہیں۔

صبح کے آٹھ یا ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ مجسٹریٹ نے پوچھا۔ "یہ کون سی نماز کا وقت ہے؟"

ساغر صاحب نے حاضر جوابی سے کام لے کر کہا۔ "میں نماز اشراق پڑھنے جا رہا ہوں۔"

مسجد میں داخل ہو کر ساغر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جمع شدہ مسلمانوں کا جلوس مرتب کیا اور "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتا ہوا جلوس مسجد سے برآمد ہوا۔ اس وقت تک

نیزوں سے مسلح ڈوگرہ فوج کا ایک دستہ بھی میجر محمد خان کی کمان میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ مسلمان میجر نے ڈوگرہ فوجیوں کو حکم دیا کہ جلوس منتشر کرنے کی خاطر وہ اپنے نیزے سے کسی شخص کو زخمی نہ کریں بلکہ ڈرا دھمکا کر جلوس روک دیں۔ مسلمان ہونے کے ناطے سے میجر محمد خان نے یہ حکم تو صریحاً اپنی ذمہ داری پر دیا تھا لیکن کسی طرح ڈوگرہ فوجیوں کو یہ تاثر بھی دے دیا کہ حکومت کا بھی یہی منشا ہے۔

اس واقعہ کے بعد جب حکام بالا اور مہاراجہ تک یہ خبر پہنچی تو مسلمانوں کے ساتھ اس ہمدردانہ رویے کی پاداش میں میجر محمد خاں کو فوری طور پر فوج سے نکال دیا گیا۔ زندگی کے آخری آٹھ دس برس انہوں نے پاکستان میں انتہائی گمنامی اور مفلسی کی حالت میں گزارے۔ کچھ عرصہ انہوں نے جہلم میں لکڑی کے ٹھیکیداروں کے گوداموں کی چوکیداری کر کے گزر اوقات کی۔ یہ بات انتہائی شرمناک ہے کہ حکومت پاکستان یا آزاد جموں و کشمیر کی حکومت میں کسی کو یہ خیال تک نہ آیا کہ میجر محمد خان جیسے مرد مجاہد کی قربانی اور خدمت بھی ہماری اعانت کی مستحق ہے۔

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو پہلی بار "کشمیر ڈے" منایا گیا تھا۔ عین سولہ برس بعد ۱۹۴۷ء میں اسی تاریخ کو پاکستان کا قیام بھی وجود میں آیا۔ اب ۱۴ اگست کو ہر سال "پاکستان ڈے" منایا جاتا ہے۔ لیکن یوم پاکستان کا جشن آزادی اس وقت تک ہرگز شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکتا' جب تک کہ کشمیر کا ایک بڑا حصہ بھارت کے قبضہ استبداد سے آزاد نہیں کروایا جاتا۔

علامہ اقبال کی سرپرستی میں تحریک کشمیر کی رہنمائی مرزا بشیر الدین محمود کی کشمیر کمیٹی سے نکل کر مجلس احرار میں آ گئی تو قادیانیوں نے متوازی خطوط پر اپنی کمیٹی چلانے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن احراریوں کے مقابلے میں ان کی دال نہ گل سکی۔ کسی وجہ سے جس کا مجھے علم نہیں قادیانی عرصہ دراز سے کشمیر پر اپنا تسلط جمانے کا خواب

دیکھتے چلے آئے ہیں۔ ریاست میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی ایجی ٹیشن میں انہیں غالباً اپنے اس خواب پریشان کی تعبیر نظر آنے لگی۔ لیکن مجلس احرار نے ان کی یہ امنگیں اور

آرزوئیں خاک میں ملا دیں۔

اکتوبر ۱۹۳۱ء میں پہلے تو احرار کے چند سرکردہ قائدین نے خود سری نگر جا کر مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کے وزیراعظم سر ہری کرشن کول سے مل کر افہام و تفہیم کے ذریعہ معاملات سلجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ تو لاتوں کے بھوت تھے' باتوں سے کیسے مان جاتے؟ مایوس ہو کر احراری لیڈر واپس آئے تو سارا پنجاب "کشمیر چلو' کشمیر چلو" کے نعروں سے گونج اٹھا اور آزادی کشمیر کے متوالے رضا کاروں نے سر پر کفن باندھ کر ریاست کی سرحدیں عبور کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔ پہلی یورش سیالکوٹ کی جانب سے شروع ہوئی۔ اس جیالے شہر کے مسلمانوں نے گھر گھر کو جذبہ جہاد کی حرارت سے پگھلا کر رکھ دیا۔ ماؤں نے بیٹوں کو' بہنوں نے بھائیوں کو اور بیویوں نے خاوندوں کو خوشی خوشی دعائیں دے کر ریاست میں داخل ہونے کے لیے رخصت کیا۔ ریاستی حکام کا اندازہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار رضا کار جموں تک آ پائیں گے' جنہیں آسانی سے گرفتار کر کے محبوس کیا جا سکے گا۔ لیکن جب دیکھتے ہی دیکھتے دس ہزار سے بھی اوپر مجاہدین گرفتاریاں پیش کرنے کے لیے جموں پر چڑھ آئے تو مقامی پولیس بے بس اور بد حواس ہو گئی۔

دوسری جانب میر پور میں بھی تحریک آزادی کے شعلے تیزی سے بھڑک رہے تھے۔ خاص طور پر جب ایک مسلمان سیاسی کارکن کو دن دہاڑے ایک ڈوگرہ افسر نے بر سر عام نوک سنگین سے سینہ چھید کر شہید کر ڈالا تو چاروں طرف غم اور غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ پنجاب کے کونے کونے سے مسلمان نوجوانوں کے جتھے کلمہ شہادت کا ورد کرتے جہلم کے راستے کشمیر کی سرحدوں کی طرف پاپیادہ روانہ ہو گئے۔ جس طرف سے وہ پیدل مارچ کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ "کشمیر چلو' کشمیر چلو" کی صدائے بازگشت کا نقش لوگوں کے دلوں پر چھوڑتے جاتے تھے۔

تیسری جانب تیس رضا کار قرآن شریف پر یہ حلف اٹھا کر راولپنڈی سے روانہ ہوئے کہ وہ جان کی بازی لگا کر دریائے جہلم پر کوہالہ کا پل بند کر کے رہیں گے۔ تین دن

کی سر توڑ ہمت مردانہ سے کام لینے کے بعد انہوں نے یہ پل اپنے قبضہ میں کر لیا اور اس طرح وادی کشمیر کے ساتھ تجارت کی یہ واحد شاہراہ بند ہو گئی۔ آن کی آن میں دونوں جانب رکی ہوئی گاڑیوں' لاریوں اور ٹرکوں کی طویل قطاریں بندھنا شروع ہو گئیں۔

کچھ رضا کاروں نے گورداسپور اور گجرات کی جانب سے بھی اپنی یلغار شروع کی۔ لیکن ان علاقوں میں ہندو آبادی کی اکثریت تھی۔ اس لیے یہ محاذ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے۔

مہاراجہ کشمیر کی درخواست پر ہندوستان کی برطانوی حکومت بھی لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں اتر آئی۔ چنانچہ رضا کاروں کو کشمیر میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے اب صوبہ پنجاب میں بھی ان کی گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں۔ پنجاب کی جیلیں بھی بہت جلد اٹا اٹ بھر کر کم پڑ گئیں۔ شدید بد انتظامی اور ضروری سامان کی کمیابی کی وجہ سے کئی درجن رضا کار نمونیہ میں مبتلا ہو کر جیلوں ہی میں وفات پا گئے۔ کئی مقامات پر جیلوں میں جگہ کی قلت کی وجہ سے پولیس والے بہت سے نئے گرفتار شدہ رضا کاروں کے گلے میں تختیاں لٹکا کر احرار کے دفتروں میں چھوڑ جاتے تھے تا کہ جگہ خالی ہونے پر انہیں جیلوں میں لے جائیں۔ اندازہ ہے کہ صرف پنجاب سے تقریباً ۴۵ ہزار نوجوان گرفتار ہوئے' پانچ ہزار سے زائد رضا کار دوسرے صوبوں سے بھی شامل ہوئے۔

ریاست کے اندر اور باہر مسلمانوں کی منظم ایجی ٹیشن سے متاثر ہو کر نومبر ۱۹۳۱ء میں گلینسی کمیشن قائم کیا گیا۔ سر بی جی گلینسی اس کے صدر اور غلام محمد عشائی' پنڈت پریم ناتھ بزاز اور چوہدری غلام عباس اس کے ممبر تھے۔ کمیشن کے مقاصد میں ریاست

کے مسلمانوں کی حالت زار کا جائزہ لے کر ان کے حقوق کی نشاندہی کرنا اور جولائی کی پولیس فائرنگ کے صحیح کوائف کی تحقیقات کرنا شامل تھے۔

دیگر کئی اقدامات کے علاوہ اس کمیشن نے ریاست میں ایک قانون ساز اسمبلی قائم کرنے کی بھی پر زور سفارش کی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے دباؤ سے مجبور ہو کر مہاراجہ ہری سنگھ نے انتہائی بے دلی سے یہ سفارش قبول کر کے ایک اسمبلی قائم کر ڈالی جس کا فریضہ حکومت کو فقط مشورہ دینا تھا۔ اس سے زیادہ اس نام نہاد اسمبلی کے پاس کوئی خاص اختیار نہ تھا۔ ۷۵ اراکین کی اس اسمبلی میں صرف ۳۳ ممبر انتخاب کے ذریعہ لیے جاتے تھے۔ ۲۱ مسلمان اور ۱۲ غیر مسلم۔ باقی ۴۲ ممبر حکومت خود نامزد کرتی تھی۔ اس طرح اس نوعیت کی محدود مشاورتی اسمبلی میں بھی ریاستی حکومت کے اپنے نامزد کردہ اراکین کی تعداد منتخب ممبروں کی تعداد سے کہیں زیادہ تھی۔

گلینسی کمیشن کے قیام کے ایک برس بعد ۱۹۳۳ء میں سری نگر پتھر مسجد میں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی۔ شیخ محمد عبداللہ اس کے صدر اور چوہدری غلام عباس جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں جب اسمبلی کے لیے پہلی بار انتخابات ہوئے تو شیخ عبداللہ مسلم کانفرنس کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر اسمبلی میں شامل ہوئے۔

سات برس تک شیخ صاحب اور چوہدری غلام عباس کا گہرا' پر خلوص اور برادرانہ باہمی تعاون اور ساتھ رہا۔ مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ان دونوں رہنماؤں نے پاپیادہ چل چل کر ریاست کے چپے چپے میں عوام الناس میں سیاسی بیداری کی زبردست روح پھونکنے کا شاندار کارنامہ سر انجام دیا۔ ان دنوں شیخ صاحب اپنی تقریر قرآن حکیم کی قرات اور اس کے بعد نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کرتے تھے۔ ان کی آواز لحن داؤدی کا سماں باندھ دیتی تھی۔ ان کی تقریر میں آتش بیانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔ اسی طرح چوہدری غلام عباس بھی سادگی' خوش بیانی' سلاست اور جذبات کی

فراوانی کا بے حد خوبصورت مجسمہ تھے۔ ان دونوں کی تقریروں کو لوگ سحر زدہ سامعین کی طرح مبہوت ہو کر سنتے تھے' تڑپتے تھے اور بعض دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ اس قسم کے جلسے میں نے زندگی بھر میں اور کہیں نہیں دیکھے۔ ان دونوں حضرات کے علاوہ ایسے جلسوں میں اے آر ساغر کی آتش بیانی بھی فصاحت و بلاغت کی لاجواب فضا باندھ دیتی تھی۔

مسلمان عوام کو ریاست کے طول و عرض میں اس طرح بیدار اور منظم ہوتے دیکھ کر ہندوؤں کے پیٹ میں بھی مروڑ اٹھا اور انہوں نے ڈوگرہ حکام سے مل کر ہندوستان سے ایک جارحانہ ہندو تحریک راشٹریہ سیوم سیوک سنگ (R.S.S) کو دعوت دی کہ وہ جموں اور کشمیر میں بھی اپنے اڈے قائم کرنا شروع کر دے۔ چنانچہ مسلم کانفرنس کے قیام کے دو برس بعد ۱۹۳۴ء میں آر ایس ایس نے اپنا کام شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سری نگر' جموں' میر پور' کوٹلی' سانبہ' اودھم پور اور کٹھوعہ کے علاوہ دیگر کئی مقامات پر بھی اپنے اکھاڑے قائم کر لیے۔ بظاہر ان کا مقصد یہ نظر آتا تھا کہ ہندو نوجوانوں کی جسمانی ورزشوں کے لیے یہ جمناسٹک کلب قائم کئے گئے ہیں۔ لیکن در حقیقت ان اڈوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے ریاست کی ہندو اقلیت کو جنگی تربیت دے کر کیل کانٹے سے لیس کر دیا جائے۔

ادھر عوامی سطح پر راشٹریہ سیوم سیوک نے اپنا کام شروع کیا' ادھر آل انڈیا کانگرس کی قیادت نے شیخ عبداللہ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ اس سیاسی مہم کے سرغنہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو بنفس نفیس پیش پیش تھے۔ یہ تو غالباً وثوق سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کانگرس کے کیوپڈ دیوتا نے شیخ صاحب کے دل پر کیا کیا تیر چلائے' لیکن یہ بات سب جانتے ہیں کہ مسلم کانفرنس کی سات سالہ بے تاج بادشاہی

کے بعد ۱۹۳۹ء میں شیخ عبداللہ سیاست اسلامیہ کی ہمالیہ کی چوٹی سے لڑھک کر منہ کے بل گرے اور ہندو کانگرس کی جھولی میں دھم سے آ پڑے۔ زوال کے اس عمل میں ان کے چہرے پر سجی ہوئی نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب ریش مبارک آناً فاناً غائب ہو گئی اور ان کے سر کی سج دھج ایک سرک رنگ کی ترکی ٹوپی بھی راستے میں کہیں گر کر کانگرس کی گنگا ماتا میں ڈوب گئی۔ مسلم کانفرنس سے رشتہ توڑ کر شیخ صاحب نے آل انڈیا کانگرس سے فیضان اور وجدان اور رہنمائی حاصل کر کے جموں و کشمیر نیشنل پارٹی کا ڈول ڈالا۔ یہ پارٹی شروع ہی سے آل انڈیا کانگرس کی داسی بنی رہی ہے۔ اس کے برعکس چوہدری غلام عباس کی قیادت میں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس نے ہمیشہ پاکستان کے ساتھ غیر مشروط وفاداری سے ساتھ دیا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی اس کایا کلپ کے بارے میں وقتاً فوقتاً طرح طرح کی قیاس آرائیاں اور افواہیں جنم لیتی رہی ہیں۔ اس زمانے میں ایک افواہ جو ریاست کے طول و عرض میں انتہائی شدت سے گردش کر رہی تھی، اس کا تعلق جموں و کشمیر کے وزیراعظم سرگوپال سوامی آئینگر سے تھا۔ یوں تو یہ حضرت انڈین سول سروس کے افسر تھے لیکن در پردہ کانگرسیوں کے ساتھ بھی گہری ساز باز رکھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد وہ بھارت کی کابینہ میں بھی شامل کر لیے گئے تھے۔ مشہور ہے کہ شیخ عبداللہ کو کانگرس کی جھولی میں ڈالنے کے لیے وزیراعظم کی حیثیت سے انہوں نے انواع و اقسام کی ریشہ دوانیوں سے کام لیا۔ ان میں سے ایک افواہ یہ گرم تھی کہ کسی ہیر پھیر سے انہوں نے شیخ صاحب کو دو کروڑ روپے کا جنگلات کا ٹھیکہ بھی دے دیا تھا۔ واللہ اعلم۔

برصغیر میں جوں جوں حصول پاکستان کا مطالبہ زور پکڑتا گیا، ریاست میں بھی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت سے مسلم کانفرنس کا پلہ اسی رفتار سے بھاری ہوتا گیا۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں مسلم کانفرنس نے مسلمانوں کی ۸۰ فیصد نشستیں جیت لیں۔ مسلمانوں

کی سیاسی بیداری کا یہ حال دیکھ کر ڈوگرہ حکومت بد حواس ہو گئی اور انہوں نے فوری طور پر ریاست میں ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کر دیں۔ فقط راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کو ہر قسم کے جلسے کرنے اور جلوس نکالنے کی آزادی تھی۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں مسلم کانفرنس نے سیاسی پابندیوں کی خلاف ورزی کرنے کی کوشش کی تو اس کے تمام رہنماؤں اور بے شمار کارکنوں کو بغیر مقدمہ چلائے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب تقسیم ہند کا فارمولا منظور ہوا تو برصغیر کی ۵۶۲ ریاستوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ اپنی جغرافیائی اور معاشیاتی حقائق کے پیش نظر اپنی اپنی آبادی کی خواہشات کے مطابق بھارت یا پاکستان سے الحاق کر لیں۔ ریاست جموں و کشمیر کی آبادی ۸۰ فیصد مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ اس کی سرحدوں کے چھ سو میل مغربی پاکستان کے ساتھ مشترک تھے۔ ریاست کی واحد ریلوے لائن سیالکوٹ سے گزرتی تھی اور بیرونی دنیا کے ساتھ ڈاک اور تار کا نظام بھی مغربی پاکستان کے ذریعہ قائم تھا۔ ریاست کی دونوں پختہ سڑکیں راولپنڈی اور سیالکوٹ سے گزرتی تھیں اور کشمیر کی تمام درآمدات اور برآمدات کا راستہ بھی پاکستان سے وابستہ تھا۔ ان سب حقائق کے پیش نظر ریاست جموں و کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق لازمی طور پر ایک قدرتی اور منطقی فیصلہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مہاراجہ ہری سنگھ اور کانگرسی لیڈروں کے دلی عزائم اس فیصلہ کے بالکل برعکس تھے۔ اپنے ان مذموم عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مل کر سازشوں کا ایسا جال بنا جس کے پھندے میں مقبوضہ ریاست کے بے بس اور مظلوم باشندے آج تک بری طرح گرفتار ہیں۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کے فارمولے کا اعلان ہوتے ہی سب سے پہلے مہاتما گاندھی اور کانگرس کے صدر مسٹر جے بی کرپلانی فوراً کشمیر پہنچے اور مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ ساز باز کر کے اپنی سازشوں کے جال کی منصوبہ بندی کر آئے۔

پاکستان کے وجود میں آتے ہی مہاراجہ کشمیر نے یہ چال چلی کہ حکومت پاکستان کے

ساتھ ایک Standstill Agreement طے کر لیا' جس کی رو سے ریاست کے ڈاک' تار اور تجارتی کاروباری نظام کو برقرار رکھنے کے لیے پاکستان کی سرزمین پر پہلے جیسی سہولتیں بدستور برقرار رہیں گی۔ پاکستان نے اسے مہاراجہ کی خیر سگالی کا مظاہرہ سمجھا تا کہ الحاق کا فیصلہ کرنے سے پہلے ریاست کے ذرائع رسل و رسائل اور درآمدات' برآمدات میں کسی قسم کا خلل نہ پڑے۔ لیکن مہاراجہ کی جانب سے یہ معاہدہ محض دھوکے کی ٹٹی تھی۔ کیونکہ ساتھ ہی ساتھ اس نے ہندوستان کے ذریعہ جنرل پوسٹ آفس لندن کو یہ ہدایات بھی جاری کر دیں کہ آئندہ ریاست جموں و کشمیر میں آنے والی سب ڈاک نئی دہلی کی معرفت ارسال کی جائے۔ مہاراجہ کی منافقت میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سمیت بھارتی حکومت کی سازشانہ شرکت یہ ایک بین ثبوت تھا۔

۱۶ اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کے بارے میں جب ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان کیا گیا تو ضلع گورداسپور کی آبادی میں واضح مسلمان اکثریت کے باوجود اسے بغیر کوئی وجہ بتائے انتہائی شر انگیز بد نیتی کے ساتھ بھارت کو دے گیا گیا تھا۔ کیونکہ گورداسپور کے بغیر بھارت کو کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا موقع ہاتھ آ سکتا تھا' نہ راستہ مل سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اب ایسے تاریخی آثار و شواہد منکشف ہو رہے ہیں جن سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بذات خود اس سازش میں پوری طرح ملوث تھا۔ البتہ یہ بات فی الحال پردۂ راز میں ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈ کلف کو اس کھلی بد دیانتی' اور نا انصافی کا مرتکب ہونے کے لیے کیا کیا حربے اختیار کئے۔ ان حربوں میں بڑی بھاری رشوت بھی بعید از قیاس نہیں۔

پاکستان کے ساتھ Standstill Agreement طے ہوتے ہی مہاراجہ ہری سنگھ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جموں کے صوبے میں پوری مسلمان آبادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اس مہم کی کمان مہاراجہ نے خود اپنے ہاتھ میں لے کر ڈوگرہ فوج' پولیس اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کے دستوں کو جگہ جگہ خونخوار بھیڑیوں کی طرح مسلم رعایا

پر چھوڑ دیا۔ قتل و غارت' لوٹ مار' خواتین کی بے حرمتی اور جوان لڑکیوں کے اغواء کی جو قیامت برپا ہوئی' اسے الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں۔ اس شورش میں جو بے شمار بچیاں اغواء ہوئیں ان میں چوہدری غلام عباس کی ایک چہیتی بیٹی بھی شامل تھی۔ بے شمار مسلمانوں کو پناہ کا جھانسا دے کر بسوں اور ٹرکوں میں سوار کیا گیا تا کہ انہیں سیالکوٹ کی جانب پاکستان کی سرحد تک پہنچا دیا جائے لیکن راستے میں ڈوگرہ پولیس کی نگرانی میں آر ایس ایس کے درندوں نے انہیں انتہائی بیدردی سے شہید کر ڈالا۔ صوبہ جموں کے بیشتر علاقے مسلمان آبادی کا صفایا کرنے کے بعد اب مہاراجہ نے مسلمانان پونچھ کی طرح اپنا رخ پھیرا۔

پونچھ کی آبادی میں ۹۵ فیصد مسلمان تھے۔ اس آبادی کا ایک کثیر حصہ ریٹائرڈ فوجیوں پر مشتمل تھا' جو دوسری جنگ عظیم میں دنیا کے کئی محاذوں پر داد شجاعت دے چکے تھے۔ صوبہ جموں کے مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں سن کر ان کا خون پہلے ہی جوش میں آیا ہوا تھا۔ ساتھ ہی یہ خبر بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ گلگت میں مقامی مسلمانوں نے گلگت سکاؤٹس اور ریاستی فوج کے مسلمان عناصر کے ساتھ مل کر علم بغاوت بلند کر دیا ہے اور مہاراجہ کی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ کر آزادی کا اعلان کرنے والے ہیں۔

اس پس منظر میں مہاراجہ کے بہیمانہ عزائم کو بھانپ کر پونچھ کے غیور اور بہادر مسلمانوں نے بھی سر دھڑ کی بازی لگا کر پاکستان کے ساتھ الحاق کا عزم بالجزم کر لیا۔ سارے علاقہ میں "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ گونجنے لگا۔ ڈوگرہ حکومت نے جگہ جگہ اپنی فوج اور پولیس کی تعداد بڑھا کر عوام الناس کو تشدد سے کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ۲۵ اگست ۱۹۴۷ء کے روز دھیر کوٹ کے قریب نیلابٹ نامی گاؤں میں الحاق پاکستان کے حق میں ایک جلسہ عام ہو رہا تھا۔ ڈوگرہ فوج کے ایک دستے نے وہاں آ کر اس پر امن جلسے پر بلا وجہ گولی چلا دی۔ اس ظالمانہ واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ دو روز بعد سردار عبدالقیوم خاں نے گوریلا مجاہدین کا ایک دستہ منظم کیا اور دھیر کوٹ میں ڈوگرہ

پولیس اور فوج کے ایک کیمپ پر حملہ کر کے اس کا صفایا کر دیا۔

اپنی فوج کی اس شکست فاش پر مہاراجہ ہری سنگھ غیظ و غضب سے تلملا کر دیوانہ ہو گیا۔ اس نے ریاست کے ہر حصے سے ڈوگرہ فوج' پولیس' آر ایس ایس کے دستوں کو مجتمع کر کے اپنے خاص الخاص افسروں کی سرکردگی میں پونچھ کے مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ ان کو سب سے ضروری ہدایت یہ تھی کہ جتنے مسلمان مرد' عورتیں اور بچے تہ تیغ ہو سکیں انہیں بے دریغ قتل کر دیا جائے۔ باقیماندہ باغیوں کو کسی نہ کسی طرح پاکستان کی جانب دھکیل دھکال کر ریاست بدر کر دیا جائے۔ پونچھ کی آبادی کے قبائل سدھن' عباسی' چب' راجپوت' دانیال اور گکھڑ وغیرہ درانی اور افغانی نسل سے تھے اور پاکستان کے کئی ملحقہ اضلاع مثلاً سیالکوٹ' گجرات' جہلم اور راولپنڈی میں ان کی بیشمار رشتہ داریاں اور عزیز داریاں تھیں۔ ڈوگرہ فوج اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کے تیور دیکھ کر بہت سے مقامی مسلمانوں نے اپنی خواتین اور بچوں کو پاکستان میں اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے ہاں بھیج دیا اور خود سر سے کفن باندھ کر ڈوگرہ حکومت کے ساتھ جہاد کے لیے تیار ہو گئے۔

دھیر کوٹ میں سردار عبدالقیوم خاں نے بہادری کی جو مثال قائم کی تھی' اس کی تقلید میں اب جگہ جگہ مقامی گوریلا دستے منظم ہو گئے اور انہوں نے پے در پے ڈوگرہ فوج کے چھکے چھڑا کر اپنی سرزمین کو ڈوگرہ حکومت کے پنجہ استبداد سے آزاد کروانا شروع کر دیا۔ کپتان حسن خان اور سخی دلیر نے اپنے اپنے گوریلا دستوں کے ساتھ دریائے جہلم پر کچھن پتن پل پر متعین ڈوگرہ فوج پر حملہ کر دیا' اور کئی گھنٹے کی شدید دست بدست جنگ کے بعد پل کو صحیح سالم اپنے قبضے میں لے لیا۔ ڈوگرہ فوج پسپا ہو کر پلندری کی طرف بھاگی' تو کپتان حسن خان نے تعاقب کر کے اسے وہاں سے بھگا کر پونچھ شہر کی جانب دھکیل دیا۔ پونچھ شہر کے نزدیک تولی پور کے مقام پر ایک اور شدید معرکہ ہوا جس میں ڈوگرہ فوج نے ایک بار پھر منہ کی کھائی۔ اس معرکہ میں کپتان حسن خان

نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ پھمن پتن کا نام اب آزاد پتن ہے۔ یہاں پر دریائے جہلم پر واقع پل مجاہدین کے قبضہ میں آنے کے بعد ان کا رابطہ کہوٹہ کے راستے راولپنڈی کے ساتھ براہ راست قائم ہو گیا۔

میجر بوستان خان نے اپنے گوریلا دستے سے منگ کے مقام پر حملہ کر کے وہاں پر مقیم ڈوگرہ فوج کی کمپنی کو مار بھگایا۔ اس کے جواب میں راولا کوٹ کے ڈوگرہ کمانڈر نے سارے علاقے میں قتل عام کا حکم دے دیا' اور گاؤں گاؤں میں ایک ایک گھر کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ یہ آتش زنی اس قدر شدید اور وسیع پیمانے پر تھی کہ اس کے شعلے پاکستان میں مری کے باشندوں کو بھی نظر آتے تھے۔ میجر بوستان خان نے ہمت نہ ہاری اور اس کے مٹھی بھر مجاہدین ڈوگرہ فوج کو قدم قدم پر پسپا ہونے پر مجبور کرتے رہے۔

کیپٹن فیروز خان نے اپنے مجاہدین کے گروپ کی مدد سے تراڑ خیل' دیوی گلی' اور ہجیرا کو آزاد کرا پونچھ شہر کا محاصرہ کر لیا جو کم و بیش ایک برس تک جاری رہا۔

میجر نصر اللہ نے کچھ سابقہ فوجیوں کو منظم کر کے راولا کوٹ میں ڈوگرہ فوج کی مضبوط چھاؤنی پر حملہ کیا' اور ادھر ادھر دیہات میں بکھری ہوئی پلٹنوں کو گھیر گھار کر ان کا مکمل صفایا کر دیا۔ مجاہدین کی اس پیش رفت کی تاب نہ لا کر ڈوگرہ فوج راولا کوٹ سے بھاگ اٹھی' اور پونچھ شہر میں جا کر پناہ گزین ہو گئی۔

ان جنگی کارروائیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ پونچھ شہر اور اس کے گرد و نواح کا تھوڑا سا رقبہ چھوڑ کر اب باقی سارا علاقہ آزاد تھا۔ یہ آزادی مٹھی بھر گوریلا لیڈروں نے اپنے اپنے طور پر مقامی مجاہدین کو منظم کر کے جسم و جان کی بے مثال قربانیاں دے کر اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل کی تھی۔ ان کے پاس نہ کوئی خزانہ تھا جس سے لڑنے والوں کو تنخواہیں ادا کی جاتیں۔ اور نہ ان کے پاس کوئی رسدگاہیں تھیں جہاں سے کھانے پینے اور گولہ بارود کا سامان باقاعدگی سے محاذ جنگ پر پہنچایا جا سکتا۔ ان کے پاس کوئی فوجی

جی ایچ کیو بھی نہیں تھا جہاں سے سپاہیوں کی وردی' آلات حرب اور مرکزی جنگی حکمت عملی کے متعلق ہدایات جاری کی جا سکتیں۔ گوریلا لیڈروں اور مجاہدین فقط ایک جذبے سے

سرشار تھے۔ ان کے دلوں میں ایک بے لوث اور سچا جذبہ جہاد موجزن تھا۔ وہ اپنے پھٹے پرانے کپڑے اور ٹوٹے پھوٹے جوتے پہن کر اپنے سے کئی گنا زیادہ مضبوط اور مسلح دشمن سے دن رات بے جگری سے لڑتے تھے۔ باد و باراں کے طوفان میں وہ کئی کئی روز اپنی خندقوں میں بھوکے پیاسے پڑے رہتے تھے۔ ان کے معصوم بچے یا ان کی مائیں' بہنیں اور بیویاں اپنے سروں پر راشن لاد کر کئی کئی میل پاپیادہ چلتی تھیں' اور دشمن کی نظر بچا کر اپنے لڑنے والے مجاہدوں کو رسد کا سامان پہنچا دیا کرتی تھیں۔ برفباری کے دنوں میں پاؤں میں صحیح جوتے نہ ہونے کی وجہ سے کئی مجاہدوں اور رسد لے کر آنے جانے والے بچوں اور خواتین کے پاؤں متورم ہو کر لہولہان ہو جاتے تھے' لیکن ان کے دل میں بھڑکنے والا جہاد کا شعلہ کبھی مدھم نہ پڑتا تھا۔

جب پونچھ کا بیشتر علاقہ آزاد ہو کر ڈوگرہ حکومت کی لعنت سے پاک ہو گیا تو رفتہ رفتہ چاروں طرف پھیلے ہوئے گوریلا لیڈروں اور مجاہدین کا بھی آپس میں رابطہ ہوتا گیا اور ۱۹۴۷ء کے ماہ اکتوبر کے وسط میں انہوں نے باہمی تعاون سے ایک مرکزی جنگی کونسل قائم کر لی۔ اس کے بعد آزاد شدہ علاقے کا نظم و نسق سنبھالنے کے لیے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جموں و کشمیر حکومت کا قیام عمل میں آیا' جس کے پہلے صدر سردار محمد ابراہیم خان تھے۔ اس حکومت کے قائم ہونے کے بعد مجاہدین آزادی نے باقاعدہ منظم ہو کر ڈوگرہ حکومت کے رہے سہے اقتدار کا قلع قمع کرنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دس ہزار مربع میل سے زیادہ رقبہ آزاد کرا لیا۔ ان میں وہ معرکے خاص طور پر نمایاں ہیں جن میں کامیاب ہو کر بھمبر' میر پور' کوٹلی' منیڈھر' راجوری اور نوشہرہ کو آزادی نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ پونچھ شہر کا طویل محاصرہ بھی ایک یادگار واقعہ ہے۔ ان تمام معرکوں میں آزاد کشمیر کے مجاہدین نے ڈوگرہ فوج کے علاوہ ہندوستانی افواج ککے ساتھ بھی سر

توڑ مقابلہ کیا۔ کیونکہ ریاست کا بھارت کے ساتھ الحاق ہوتے ہی بھارتی مسلح افواج نے بھی فوراً کشمیر پر اپنا قبضہ جما لیا تھا اور اب بر سر عام مجاہدین آزادی کے خلاف میدان

جنگ میں اتر آئی تھیں۔

پونچھ میں اپنی حکمرانی کی بساط الٹتے دیکھ کر مہاراجہ ہری سنگھ کو اب جہلم وادی کی فکر دامن گیر ہوئی' جس کی آبادی ۹۵ فیصد مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ان میں شیخ بھی تھے' مغل بھی اور پٹھان بھی۔ پٹھانوں میں ککی خیل آفریدیوں' یوسف زئیوں اور مچھی پوریوں کا تناسب خاص طور پر نمایاں تھا۔ یہ لوگ پہلے پہل درانیوں کے ساتھ کشمیر آئے تھے اور بعد میں یہیں پر آباد ہو گئے تھے۔ البتہ شمال مغربی صوبہ سرحد میں ان کے اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ گہرے مراسم اور رشتہ داریاں بدستور قائم رہیں۔
مہاراجہ ہری سنگھ نے مسلمانوں کی اس کثیر آبادی کو قابو میں رکھنے کے لیے سری نگر کے علاوہ وادی کے دوسرے اہم شہروں میں بھی ڈوگرہ فوج اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کے بڑے بڑے گروہ جمع کر رکھے تھے۔ جموں اور پونچھ کے واقعات کی خبریں سن سن کر وادی کے مسلمان بھی اپنے درندہ صفت حکمران کے عزائم سے بے خبر نہ تھے۔ جیسے جیسے مختلف مقامات پر ڈوگرہ فوج اور آر ایس ایس کے مظالم مسلم رعایا پر بڑھتے گئے' اسی رفتار سے مظفر آباد اور ٹیٹوال کے علاوہ وادی کے بہت سے باشندوں نے بھی اپنے بال بچوں کو محفوظ رکھنے کے لیے پاکستان کے سرحدی اور قبائلی علاقوں میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں کی آمد کے ساتھ ریاست میں مسلمانوں پر جو قیامت برپا تھی' اس کا چرچا بھی عام ہو گیا۔ ڈوگروں کے مظالم کی دلدوز تفصیلات پھیلتے ہی پاکستان اور افغانستان کے قبائلی علاقوں میں غم اور غصے کی آگ لگ گئی اور پٹھان قبائلیوں کے لشکروں کے لشکر اپنے مظلوم بھائیوں کی امداد کے لیے جوق در جوق ایبٹ آباد کی راہ سے بسوئے کشمیر اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ قبائلی لشکر نہ کسی تنظیم میں منسلک تھے اور نہ ہی ان کی رہنمائی اور خبر گیری کے لیے کسی قسم کا ادارہ موجود تھا۔ جہاں کہیں سے وہ گزرتے تھے' عوام الناس حیرت انگیز کشادہ دلی سے ان کی آؤ بھگت کرتے تھے' خوراک مہیا کرتے تھے اور جگہ جگہ ٹرک' تانگے اور بیل گاڑیاں مفت نذر کرتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر پاپیادہ مارچ کرتے تھے' یا بسوں اور ریل گاڑیوں کی چھتوں پر بیٹھ کر سفر کرتے تھے اور بعض بعض مقامات پر دریاؤں کو تیر کر یا بکری کی کھال کے بنے ہوئے مشکیزے کا سہارا لے کر عبور کر لیتے تھے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء تک ایبٹ آباد اور مظفر آباد کے درمیان بٹراسی کے جنگل میں ہزارہا محسودی' وزیری' آفریدی اور مہمند قبائلیوں کا ایک عظیم الشان لشکر جمع ہو گیا۔

وہاں پر اس لشکر کی نگہداشت مردان کے خان خوشدل خان نے بڑی محنت اور فیاضی سے کی' اور ہندوستانی فوج کے ایک ریٹائرڈ میجر خورشید انور نے اس لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس زمانے میں میجر خورشید انور پاکستان مسلم لیگ کی نیشنل گارڈ کے کمانڈر بھی تھے۔

ریاست کے اندر لوہار گلی اور رام کوٹ وغیرہ میں جو ڈوگرہ فوج متعین تھی' اس میں چند مسلمان افسر بھی موجود تھے۔ ان میں کیپٹن شیر خاں کا نام سر فہرست تھا۔ انہوں نے اپنے طور پر میجر خورشید انور سے خفیہ رابطہ قائم کیا اور مظفر آباد سمیت دریائے کرشن گنگا' دومیل اور کوہالہ کے پلوں کو صحیح سالم فتح کر کے اپنے قبضہ میں لینے کی حکمت عملی تیار کر لی۔ ریاستی فوج کے ایک ریٹائرڈ افسر میجر ایم اسلم خان' ایم سی بھی اس منصوبہ بندی میں شامل ہو گئے۔ وادی جہلم کے مقامی باشندوں نے بھی اندر ہی اندر اپنی صفوں کو منظم کرنا شروع کر لیا۔ "مجاہدین ہوم فرنٹ" کے نام سے ایک خفیہ تنظیم بھی قائم ہو گئی۔ بہت سے رضا کار گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کر کے ایک نیم فوجی تنظیم میں شامل ہو گئے جس کا نام حیدری کالم تھا۔ ثناء اللہ' محمد اقبال اور عبدالرشید نامی چند رضا کاروں نے کچھ خواتین کو اپنے ساتھ ملا کر سری نگر شہر میں کچھ اسلحہ تقسیم کرنے

کی کوشش بھی کی۔ لیکن بد قسمتی سے ان میں سے کئی ایک گرفتار ہو کر جیل میں ڈال دیئے گئے۔

اس قسم کے ابتدائی اقدامات کسی حد تک مکمل ہو چکے' تو ۲۰ اکتوبر کی رات کو مجاہدین نے پیش قدمی شروع کی اور اگلے دو روز کے دوران ڈوگرہ فوج اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگ کے دستوں کو شکست دے کر کوہالہ' دومیل اور مظفر آباد کو فتح کر لیا۔ مظفر آباد سے آگے دس میل دور گڑھی دوپٹہ کے مقام پر ڈوگرہ فوج کو ایک اور شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد اوڑی' بارہ مولا اور سری نگر تک راستہ صاف تھا۔ ۲۴ اکتوبر کو مجاہدین نے مہورہ پر قبضہ کر کے وہ پاور ہاؤس اڑا دیا جس سے سری نگر شہر کو بجلی فراہم ہوتی تھی۔ رات کے نو بجے جب اچانک سارا شہر گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا' اس وقت مہاراجہ ہری سنگ اپنے راج محل میں دسہرہ کا دربار لگائے بیٹھا تھا۔

مہورہ سے مجاہدین کا لشکر بارہ مولا پہنچا' تو دیکھا کہ ڈوگرہ فوج اور آر ایس ایس کے درندے اس شہر کو اپنے ہاتھوں تاخت و تاراج کر کے پہلے ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ سری نگر کی طرف مجاہدین کی یلغار کی خبر پا کر انھوں نے بے شمار نہتے اور معصوم مسلمان شہریوں کو قتل کر ڈالا تھا۔ ان کے گھر لوٹ کر نذر آتش کر دیئے تھے اور ایک عیسائی خانقاہ کے مکینوں اور اس کے ساتھ ملحق ہسپتال کے مریضوں تک کو اپنی بربریت کی سان پر چڑھانے سے گریز نہ کیا تھا۔ بارہ مولا کا شہر ملبے کا ڈھیر بنا پڑا تھا۔ وہاں سے سری نگر فقط ۳۵ میل دور تھا۔ آگے کی جانب سڑک بالکل صاف تھی۔ دشمن کی طرف سے اب کسی مقام پر کسی قسم کی مزاحمت کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ مجاہدین کا لشکر فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتا بارہ مولا تک آ پہنچا تھا۔ اب فقط چند گھنٹوں میں وہ آگے بڑھ کر سری نگر کے ہوائی اڈے کو قبضے میں لے کر اس مظلوم ریاست کے مسلمانوں کی تاریخ کا دھارا بدل سکتا تھا۔

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

مہاراجہ کے دسہرہ دربار کے عین درمیان مہورہ کا بجلی گھر مجاہدین کے ہاتھوں شکستہ ہو کر جب سری نگر کا شہر تاریکی میں ڈوب گیا تو ڈوگرہ نسل کے ہندو راجپوت ہری سنگھ کو آناً فاناً اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اپنے محلات کا جس قدر بیش قیمت سامان وہ آٹھ دس ٹرکوں پر لاد سکتا تھا' انہیں ساتھ لے کر وہ راتوں رات بانہال روڈ کے راستے جموں کی طرف فرار ہو گیا۔ راستے میں جگہ جگہ رک کر اس نے اپنی ڈوگرہ رعایا کو خبردار کیا کہ راج ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اس لیے وہ ریاست کی سر زمین پر مسلمانوں کی بغاوت کا سر کچلنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے پر کمر بستہ ہو جائیں۔ جموں کا شہر اور اس کے مضافات مسلمان آبادی سے یکسر خالی ہو چکے تھے۔ اس مکمل ہندو ماحول کے حصار میں پہنچتے ہی بھگوڑے مہاراجہ نے بھارت سے مدد کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں سردار ولبھ بھائی پٹیل اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا منظور نظر مسٹر وی پی مینن ہوائی جہاز سے پرواز کر کے جموں پہنچا اور بھارتی حکومت کی جانب سے مہاراجہ ہری سنگھ کو دھمکی دی کہ اگر اس نے فوری طور پر اپنی ریاست کا ہندوستان سے الحاق نہ کیا تو اسے کسی قسم کی کوئی مدد نہ دی جائے گی۔ بزدل مہاراجہ نے بلا چوں و چراں گھٹنے ٹیک کر بھارت کے ساتھ الحاق کی درخواست پر دستخط کر دیئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جن الفاظ میں اس درخواست کا منظور کیا' وہ درج ذیل ہیں۔

My Dear Maharaja Sahib،

You Highness letter dated ۲۶ October has been delivered to me by Mr. V.P.Menon. In the special circumstances mentioned by Your Highness my Government has decided to accept the accession of Kashmir State to the Dominion of India. In consistence with their policy that in the case of any state، where the issue of accession has been the subject of dispute، the question of accession should be

decided in accordance with the whishes of the people of the state، it is my Government's wish that as soon as law and order have been restored in Kashmir and her soil cleared of the invader، the question of the state's accession should be decided by a reference to the people.
Meanwhile، in response to Your Highness appeal for military aid، action has been taken today to send troops of the Indian ـrmy to help your own forces to defend your territory and to protect the lives، property and honour of your people.
My Government and I note with satisfaction that Your Highness has decided to invite Sheikh ـbdullah to form an interim Government to work with your Prime Minister.

I remain

Your sincerely،

Mountbatten of ـurma

New Delhi،

[illegible] October، [illegible]

مندرجہ بالا خط پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دستخط کی سیاہی ابھی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ اسی روز صبح نو بجے سے بھارتی ہوائی جہازوں نے ہندوستانی فوج کے دستے سری نگر کے ہوائی اڈے پر اتارنا شروع کر دیئے۔ ایک ایک دن میں پچاس پچاس پروازیں یہ فرض ادا کرتی تھیں۔ ساتھ ہی گرداسپور کے راستے بھارتی فوج کی کثیر تعداد نے بھی صوبہ جموں میں مارچ کرنا شروع کر دیا۔ بھارت نے یہ جنگی تیاریاں پہلے ہی سے مکمل کر رکھی تھیں۔ الحاق کے متعلق مہاراجہ کی درخواست محض ایک بہانہ تھی۔ اس بہانہ کے ہاتھ آتے ہی بھارت نے اپنے جارحانہ عزائم پر فی الفور عملدرآمد شروع کر دیا۔

سری نگر کے ہوائی اڈے پر بھارتی افواج' اسلحہ اور ٹینک انڈین ائیر فورس کے جہازوں سے برآمد ہوتے ہی آزادی کشمیر کی جنگ کا پانسہ اچانک پلٹ گیا۔ مجاہدین کے لشکر کا زیادہ حصہ دو روز سے خواہ مخواہ بارہ مولا میں اٹکا ہوا تھا۔ اگر اس لشکر کا تھوڑا سا حصہ بھی یلغار کر کے سری نگر ائیر پورٹ پر قابض ہو جاتا تو بھارتی فوج وادی کشمیر پر تسلط جمانے میں کسی طرح بھی کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے برعکس مجاہدین کی

ہمت ٹوٹ گئی' ان میں ایک طرح کی بھگدڑ مچ گئی اور وہ انتہائی غیر منظم طور پر اپنے اپنے علاقوں کی طرف واپس لوٹنا شروع ہو گئے۔ یہ صورت حال کیوں اور کیسے پیدا ہوئی؟ اس کا کوئی حتمی جواب مجھے نہیں مل سکا۔ اس بارے میں طرح طرح کے مفروضے' امکانات اور قیاس آرائیاں سننے میں آتی ہیں۔

ایک نظریہ تو یہ مشہور ہے کہ لشکر کے کمانڈر میجر خورشید انور نے مجاہدین کو بارہ مولا میں اس وجہ سے روکے رکھا کہ سری نگر پہنچنے سے پہلے وہ کشمیر کے سیاسی مستقبل میں اپنی ذاتی پوزیشن کو صاف طور پر متعین اور مستحکم کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے سری نگر کی جانب مجاہدین کی پیش قدمی معرض التوا میں پڑی رہی۔

دوسرا گمان یہ ہے کہ شیخ عبداللہ کی نیشنل پارٹی کے ایجنٹوں کے علاوہ ہندوستان کے چھوڑے ہوئے بہت سے جاسوس بھی ففتھ کالم کا لبادہ اوڑھ کر حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے طرح طرح کے نفسیاتی حربوں سے کام لے کر مجاہدین کی صفوں میں اس قسم کی افواہیں پھیلا دیں کہ ہندوستان کی منظم فوج کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان جنگ میں اتر آئی ہے۔ ہندوستان کے بمبار اور لڑاکا طیارے بھی مجاہدین کو اپنا نشانہ بنانے کے لیے پر تول رہے ہیں اور ان کی پسپائی کے راستے بھی رفتہ رفتہ بھارتی فوج کے قبضے میں آتے جا رہے ہیں۔ قبائل لشکر دست بدست گوریلا جنگ لڑنے کے غازی تو ضرور تھے۔ لیکن ففتھ کالم کے ساتھ اس طرح کی نفسیاتی جنگ میں مقابلہ کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے بے بسی اور کسمپرسی کے عالم میں وہ بد نظمی اور انتشار کا شکار ہو کر پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔

تیسرا قیاس یہ ہے کہ مقبول شیروانی نام کے ایک نیشنل کانفرنسی سیاست دان نے مجاہدین کے ایک لشکر کی بارہ مولا تک رہنمائی کرنے کے بہانے اسے ایسے طویل اور پیچیدہ راستوں پر ڈال دیا کہ وہ دو روز تک غلط اور دشوار گزار گھاٹیوں میں ہی بھٹکتے رہے۔ باقیماندہ لشکر بارہ مولا میں بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔ اس طرح سری نگر کی جانب بڑھنے کا

انتہائی قیمتی اور فیصلہ کن وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ بارہ مولا پہنچ کر جب مقبول شیروانی کی غداری کا راز فاش ہوا تو مجاہدین نے اسے وہیں پر تہ تیغ کر ڈالا۔

چوتھی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بھارتی ففتھ کالم کے علاوہ قادیانیوں کے ایک منظم گروہ نے بھی اس موقعہ پر مسلمانوں کے ساتھ غداری کو عملی جامہ پہنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اصلی آزاد کشمیر گورنمنٹ تو ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے روز قائم ہوئی تھی۔ لیکن پونچھ میں جہاد کا رنگ اور رخ بھانپ کر غلام نبی گلکار نامی ایک کشمیری قادیانی نے بیس روز قبل ہی ۴ اکتوب کو اپنی صدارت میں آزاد جمہوریہ کشمیر کے قیام کا اعلان کر دیا تھا۔ غالباً یہ اعلان راولپنڈی صدر کے ایک ہوٹل "ڈان" میں بیٹھ کر کیا گیا تھا۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے مسٹر گلکار نے اپنی تیرہ رکنی کابینہ بھی منتخب کر لی تھی' جو زیادہ تر ایسے افراد پر مشتمل تھی جن کا تعلق قادیانی مذہب سے تھا۔ اس اعلان کے دو روز بعد ۶ اکتوبر کو گلکار مظفر آباد کی راہ سے سری نگر میں اس کی حرکات و سکنات عام طور پر پردہ راز میں ہیں لیکن باور کیا جاتا ہے کہ بارہ مولا سے سری نگر کی جانب مجاہدین کی پیش قدمی سے قادیانیوں کے اپنے منصوبے خاک میں مل گئے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہ جنت ارضی بلا شرکت غیرے قادیانیوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ پاکستان جانے والی ہے تو انہوں نے بھی ففتھ کالم کا روپ دھار کر اس امکان کو ملیا میٹ کر دیا۔

میرے خیال میں یہ سب اندازے اور قیاس آرایاں اپنی اپنی جگہ کسی نہ کسی حد تک حقائق پر مبنی ہیں۔ کشمیر کے محاذ سے مجاہدین کی غیر متوقع' بے محل اور بے وقت پسپائی ان سب وجوہات کا اجتماعی نتیجہ تھی۔

جس مجرمانہ مکاری' دغا' فریب اور سازشانہ جارحیت کے ذریعے بھارت نے کشمیر پر اپنا قبضہ جما لیا تھا' اس کی حقیقت ساری دنیا پر اظہر من الشمس تھی۔ اپنی اپنی گھناؤنی کاروائیوں

پر پردہ ڈالنے کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو نے بین الاقوامی سطح پر بانگ دہل رٹ لگانی شروع کر دی کہ بھارت فیصلہ جموں و کشمیر کے باشندوں کی آزادانہ' منصفانہ اور غیر

جانبدارانہ رائے شماری (Plebiscite) کے ذریعہ کروایا جائے گا۔

بھارتی وزیراعظم کے اس نوعیت کے بے شمار اعلانات کے انبار میں سے میں نے یہاں پر صرف چند ایک کا انتخاب کر کے درج کیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان میں سے ایک بیان پر ایک اعلان بھی سچائی' خلوص' دیانتداری اور نیک نیتی پر مبنی نہ تھا۔ یہ ساری لفاظی پر فریب وعدوں کی نمائش تھی جس کے ذریعہ اقوام عالم کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنا الو سیدھا کرنا تھا۔ راج نیتی میں پنڈت جی اپنے مہا گرو چانکیہ کے نہایت کامیاب چیلے تھے۔ ایک طرف وہ سلامتی کونسل کی بنیادی قرار دادوں کو برضا و رغبت قبول کئے بیٹھے تھے جن کی رو سے انہوں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ کشمیر سے فریقین کی مسلح افواج کے انخلاء کے بعد الحاق کا مسئلہ ایک آزادانہ' منصفانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعہ طے ہو گا' جس کا بندوبست یو این او کا متعین کردہ کرے گا۔ لیکن دوسری جانب جنگ بندی کے فوراً بھارت کی حکومت نے ان قرار دادوں پر عملدرآمد میں طرح طرح کے روڑے اٹکانا شروع کر دیئے تھے۔ جوں جوں کشمیر پر بھارت کا قبضہ مستحکم ہوتا گیا' اسی رفتار سے وزیراعظم جواہر لال نہرو کی وعدہ خلافیوں' بے وفائیوں اور فریب کاریوں کا راز بھی طشت از بام ہوتا چلا گیا۔ اس سلسلے میں پنڈت جی کی قلابازیاں کی فہرست نہایت طویل ہے۔ محض نمونہ کے طور پر ان کی مختصر سی تفصیل درج ذیل ہے۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں یو این او کے کمیشن (U.N.C.I.P.) نے ایک میٹنگ اس غرض سے منعقد کی کہ سلامتی کونسل کی قرار داد کے مطابق پاکستانی اور بھارتی افواج کو کشمیر سے واپس بلانے کا پروگرام طے کیا جائے۔ پاکستان نے اپنا پروگرام پیش کر دیا۔ ہندوستان ٹال

مشول کر کے اپنی فوجیں ریاست کی حدود سے باہر نکالنے سے مکر گیا۔
اسی برس اگست میں یو این او کے کمیشن نے یہ تجویز پیش کی کہ کشمیر سے مسلح افواج

کے انخلاء کا فیصلہ ایک ثالث کے ذریعہ طے کروا لیا جائے۔ ایڈمرل نمٹز (Admiral Nimitz) استصواب رائے کے ناظم (Plebiscite Administrator) نامزد ہو چکے تھے۔ کمیشن کی تجویز تھی کہ ثالثی کا فریضہ بھی انہی کو سونپ دیا جائے۔ یہ تجویز اتنی معقول تھی کہ امریکہ کے صدر ٹرومین اور برطانیہ کے وزیراعظم اٹیلی نے بھی اعلانیہ طور پر سفارش کی کہ دونوں فریق اسے مان لیں۔ پاکستان نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن بھارت نے اسے مسترد کر دیا۔
اس ناکامی کے بعد سلامتی کونسل نے اپنے اس ماہ کے صدر (دسمبر ۱۹۴۹ء) کو یہ اختیار دیا کہ وہ فریقین کے ساتھ گفت و شنید کے ذریعہ موجودہ بحران کا کوئی حل نکالیں۔ ان کا اسم گرامی جنرل میکناٹن تھا اور وہ کینیڈا کے رہنے والے تھے۔ کافی افہام و تفہیم اور سوچ و بچار کے بعد انہوں نے کچھ تجاویز مرتب کیں۔ پاکستان نے ان تجاویز کو قبول کر لیا۔ لیکن بھارت نے مین میخ نکال کر ان میں ترامیم کی ایسی بھرمار کی کہ وہ عملی طور پر مسترد ہو کر رہ گئیں۔
جنرل میکناٹن کے بعد سلامتی کونسل نے سر اوون ڈکسن کو اسی مقصد کے لیے میدان عمل میں اتارا۔ انہوں نے بھی حالات کا پورا پورا جائزہ لے کر بہت سی تجاویز پیش کیں۔ پاکستان حسب معمول مان گیا' لیکن بھارت بدستور اپنی ضد پر اڑا رہا۔
اب سر اوون ڈکسن کی جگہ ڈاکٹر فرینک پی گراہم نے سنبھالی۔ سلامتی کونسل نے ایک بار پھر اپیل کی کہ استصواب رائے کی راہ ہموار کرنے کے لیے متنازعہ امور پر دونوں فریق ثالثی فیصلہ قبول کر لیں۔ بین الاقوامی انصاف کی عدالت کا صدر ثالثوں کو مقرر کرنے کا مجاز ہو گا۔ پاکستان نے سلامتی کونسل کی یہ تجویز منظور کر لی۔ بھارت نے اسے مسترد کر دیا۔

۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیان ڈاکٹر گراہم نے ہر طرح کے ممکنہ فارمولوں کی بنیاد پر سلامتی کونسل کو چھ رپورٹیں پیش کیں۔ اس کے تقریباً ہر فارمولا کو پاکستان منظور اور بھارت نامنظور کرتا رہا۔ ڈاکٹر گراہم کی پہلی رپورٹ میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ ان کو سلامتی کونسل کی تائید بھی حاصل تھی۔ اسی لیے کونسل نے ان تجاویز کو ایک قرار داد کی صورت میں بھی منظور کر لیا تھا۔ یہ قرار داد ۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کو منظور ہوئی تھی' لیکن بھارت نے اسے قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیا۔

ڈاکٹر گراہم کی پانچویں رپورٹ کے بعد سلامتی کونسل نے اپنے صدر اور سویڈن کے سفیر گنار یارنگ کو اختیار دیا کہ وہ اس تعطل میں دخل دے کر اسے توڑنے کی کوشش کریں۔ ہندوستان کی نازک مزاجی کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے ثالثی کا لفظ استعمال کئے بغیر اسی کے لگ بھگ چند نہایت معقول تجاویز پیش کیں۔ پاکستان نے انہیں تسلیم کر لیا' لیکن بھارت نے نامنظور کر دیا۔

اس ناکامی کے بعد دسمبر ۱۹۵۷ء میں سلامتی کونسل نے دوبارہ ڈاکٹر فرینک گراہم کو اپنا مشن سنبھالنے کی پیش کش کی۔ اس بار انہوں نے پانچ نکات پر مبنی ایک نہایت منصفانہ' معتدل اور واجبی تجویز مرتب کی۔ پاکستان نے اس کے پانچوں نکات کو خوش دلی سے تسلیم کر لیا۔ لیکن بھارت نے اسے مکمل طور پر مسترد کر دیا۔

ڈاکٹر گراہم نے اپنی آخری اور چھٹی رپورٹ ۱۹۵۸ء میں پیش کی تھی لیکن اس پر غور کرنے کے لیے سلامتی کونسل کو چار برس بعد اپریل ۱۹۶۲ء میں فرصت ملی۔ غالباً اس وقت تک بین الاقوامی سطح پر کشمیر کا معاملہ کافی ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ چنانچہ سلامتی کونسل میں کسی خاص گرمجوشی کا مظاہرہ کئے بغیر آئر لینڈ کی جانب سے ایک نہایت ہلکی اور دھیمی سی قرار داد پاس ہوئی جس میں فریقین سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ سلامتی کونسل کی سابقہ قرار دادوں کی روشنی میں باہمی افہام و تفہیم سے اس قضیئے کو نپٹانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ لیکن یہ کمزور اور بے اثر سی قرار داد بھی کسی کام نہ آ سکی کیونکہ

سوویت روس نے اسے ویٹو کر دیا۔ یوں بھی ابتدا ہی سے سوویت یونین نے کشمیر کے بارے میں کسی قرار داد پر نفی یا اثبات میں ووٹ ڈالنے سے ہمیشہ احتراز برتا تھا۔

۱۹۶۵ء تک پچھلے ۱۸ سال کے دوران سلامتی کونسل میں کشمیر کا مسئلہ ۱۳۳ بار زیر بحث آ چکا ہے۔ کبھی بھارت کی درخواست پر' کبھی پاکستان کی تحریک پر۔ اب کوئی کس منہ سے کہہ سکتا ہے کہ یہ مسئلہ بھارت کا اندرونی معاملہ ہے؟ سوویت یونین جیسی ایک عظیم سپر پاور اس مسئلہ کو بھارت کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا نام دے کر اپنا ویٹو استعمال کرنے پر اپنے ضمیر کو کس طرح آمادہ کر سکتی ہے؟ ان پریشان کن اور حیران کن سوالات کے جواب چانکیہ اور کوٹلیہ کے شاستروں میں ہوں تو ہوں لیکن مہذب اور شائستہ اقوام کی تواریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکیں گے۔

سلامتی کونسل کی بین الاقوامی اسٹیج پر بھارت نے جو ڈرامہ رچا رکھا تھا' اس کی کچھ جھلکیاں تو مختصراً بیان ہو چکیں۔ لیکن خود مقبوضہ کشمیر کے اندر جو ناٹک کھیلا جا رہا تھا اس کی داستان الگ ہے۔ اس المیے میں شیخ عبداللہ کا اپنا کردار بھی گرگٹ کی طرح بار بار رنگ بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔

کشمیر کا مسئلہ جب پہلے پہل بین الاقوامی سطح پر اٹھایا گیا تھا تو بھارتی وفد کے ساتھ شیخ عبداللہ بھی یو این او گئے تھے۔ پاکستان وفد کے ہمراہ چند ایسے افراد بھی تھے جن کے شیخ صاحب کے ساتھ کسی قدر دیرینہ اور گہرے تعلقات تھے۔ ان میں سے کسی نے شیخ صاحب کو پاکستان کے موقف کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی' تو وہ طیش میں آ گئے اور انتہائی غرور اور تکبر سے بولے۔ "بھارت کے ساتھ کشمیر کا الحاق قطعی اور اٹل ہے۔ اب تو خدا بھی خود آ کر اسے توڑنا چاہے' تو یہ نہیں ٹوٹ سکتا۔" (نعوذ باللہ)
یہ قصہ مجھے ابوالاثر حفیظ جالندھری نے سنایا تھا' جو اس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے۔
اپنے اس دعوے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شیخ عبداللہ نے پنڈت نہرو کے زر خرید

غلام کا روپ دھار کر طرح طرح کے پاپڑ بیلے۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں بھارت نے اپنے آئین میں ایسی ترامیم کر ڈالیں جس کی رو سے ہندوستان کو مقبوضہ کشمیر میں بھی اپنی مرضی کے قوانین نافذ کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔ پاکستان کے طوطی نے حسب توفیق یو این او کے نقار خانے میں اپنی آواز اٹھائی' لیکن بے سود۔

اس اقدام کے ایک برس بعد بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں ایک آئین ساز اسمبلی کا سوانگ رچا کر اس سے ریاست کے الحاق پر تصدیق کا انگوٹھا لگوانے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ اس اسمبلی کی حیثیت کے بارے میں سلامتی کونسل نے ایک قرار داد کے ذریعہ پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ اسے ریاست کے الحاق کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ فیصلہ لازمی طور پر انہی قرار دادوں کے مطابق کیا جا سکتا ہے جنہیں یو این او بھارت اور پاکستان کی منظوری حاصل ہے۔ اس موقع پر سلامتی کونسل میں بھارتی نمائندہ نے بر سر عام اور کھلے بندوں بین الاقوامی رائے عامہ کو یہ یقین دہانی کرائی کہ مقبوضہ کشمیر میں قائم ہونے والی آئین ساز اسمبلی کا ان معاملات سے ہرگز کوئی واسطہ نہ ہو گا جن کا فیصلہ سلامتی کونسل کے دائرہ اختیار میں ہے۔ بھارتی نمائندہ نے واضح طور پر یہ بھی کہا کہ یہ اسمبلی الحاق کے مسئلہ پر اظہار رائے تو کر سکے گی لیکن اسے کسی قسم کا فیصلہ کرنے کا بالکل کوئی اختیار نہ ہو گا۔ اس وعدہ وعید کے بعد مقبوضہ کشمیر میں اس نام نہاد آئین ساز اسمبلی کے لیے انتخابات ہوئے' جو سراسر چالبازی' دھاندلی اور فریب کا دھندہ تھے۔ ان کے نتیجہ میں شیخ عبداللہ کی جماعت نے تمام کی تمام ۷۵ نشستیں بلا مقابلہ جیت لیں۔ انتخابات کے تقریباً دس ماہ بعد جولائی ۱۹۵۲ء میں شیخ عبداللہ نے اس منحوس اور شرمناک دستاویز پر دستخط کر دیئے جو "معائدہ دہلی" کے نام سے موسوم ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے ریاست کا پورا وجود مکمل طور پر بھارتی حکومت کے زیر نگیں آ گیا۔ ایک سو چھ برس قبل انگریزوں نے اس بہشت ارضی کو "معاہدہ امرتسر" کے ذریعہ مبلغ ۷۵ لاکھ نانک شاہی روپیہ کے عوض گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت

کر ڈالا تھا۔ اب ۱۹۵۲ء میں شیخ عبداللہ نے "معاہدہ دہلی" کے نام پر اس سر زمین کو پنڈت جواہر لال نہرو کے قدموں میں فقط اپنی کرسی کے عوض ڈال دیا۔ پنڈت جی کو یہ سودا راس آس آیا' کیونکہ ایک سال اور ایک ماہ کے اندر اندر انہوں نے شیخ صاحب کو کرسی اقتدار سے اٹھا کر منہ کے بل نیچے دے مارا اور لگے ہاتھوں گھسیٹ کر جیل کی کال کوٹھڑی میں بند کر دیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر پر بھارت کا فوجی قبضہ استبداد تو پہلے ہی سے موجود تھا۔ لیکن "معاہدہ دہلی" کے وجود میں آتے ہی ہندوستان کو ریاست کے تمام امور میں دخل اندازی کا بزعم خود آئینی اور قانونی جواز بھی پیدا ہو گیا۔ بھگوڑا مہاراجہ ہری سنگھ عرصہ دراز سے امور ریاست سے کنارہ کش ہو کر جلا وطنی کے دن گزار رہا تھا۔ اب ڈوگرہ راج کی موروثی گدی کو موقوف کر کے مہاراجہ کے ۳۵ سالہ بیٹے کرن سنگھ کو ریاست کے آئینی سربراہ کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔ اس پر ریاست کے طول و عرض میں ہندو آبادی میں شدید رد عمل رونما ہوا اور جگہ جگہ شیخ عبداللہ کے خلاف مظاہروں کا تانتا لگ گیا۔ ریاست بھر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی بھی زور پکڑ گئی۔ اب شیخ صاحب کی آنکھیں کھلیں اور انہیں ہندوؤں کے ساتھ اپنی وفاداری کا نوشتہ دیوار صاف طور پر ظاہر ہو کر سامنے نظر آنے لگا۔ مایوسی کے عالم میں بوکھلا کر انہوں نے ایک بار پھر پینترا بدلا اور اپنی تقریروں میں بھارت کے خلاف گلے شکوے کے علاوہ کشمیر کی خود مختاری اور آزادی کا راگ بھی الاپنا شروع کر دیا۔ ان کے اس رویے میں بھارت کو کشمیر کے خلاف بین الاقوامی سازشوں کو بو آنے لگی۔

چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو کی اشیر باد حاصل کرنے کے بعد کرن سنگھ نے ۹ اگست ۱۹۵۳ء کے روز شیخ عبداللہ کو معزول کر کے جیل بھیج دیا۔

شیخ صاحب کی جگہ بخشی غلام محمد مقبوضہ کشمیر کے وزیراعلیٰ مقرر ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان فرمایا کہ پاکستان جس استصواب رائے کے خواب دیکھ رہا

ہے' کشمیر میں رائے شماری کا وہ دن کبھی طلوع نہ ہو گا۔ پانچ ماہ بعد فروری ۱۹۵۴ء میں انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور کشمیر کی نام نہاد اسمبلی نے بھارت کے ساتھ ریاست کے الحاق کی توثیق کر دی۔ اسی کے ساتھ بھارت نے بھی اپنا پورے کا پورا آئین مقبوضہ کشمیر پر مسلط کر دیا اور یوں پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ بن گیا۔

پاکستان نے ان اقدامات کے خلاف بھارت سے احتجاج کیا تو پنڈت نہرو اپنی عادت کے مطابق بگلا بھگت بن کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ "یو این او" کی قرار دادوں کے مطابق بھارت کشمیر میں استصواب رائے کا وعدہ نبھانے کا سختی سے پابند ہے۔ بغل میں چھری اور منہ میں رام رام کی اس سے زیادہ واضح مثال چراغ لے کر ڈھونڈنے سے ملنا بھی محال ہے۔ کشمیر کے حوالے سے پنڈت جی کی ایسی بہت سی قلا بازیوں کا تذکرہ بھی اس کتاب کے ایک دوسرے باب "صدر ایوب اور پاکستان کی خارجہ پالیسی" میں "بھارت" کے ذیلی عنوان کے تحت کئی جگہ آتا ہے۔

اردو زبان کا ایک فصیح و بلیغ محاورہ ہے۔ "نہ رہے نہ بجے بانسری" ------- اگر آزادی کا بانس شروع ہی میں پوری طرح کشمیریوں کے ہاتھ آ جاتا' تو یقیناً پنڈت جواہر لال نہرو سلامتی کونسل' مقبوضہ کشمیر اور پاکستان کے اسٹیج پر اپنی منافقانہ ہٹ دھرمی اور دوغلی پالیسیوں کی بنسری بجانے سے محروم رہتے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ جب مجاہدین کا لشکر مظفر آباد کے راستے سری نگر کی جانب روانہ ہوا تھا' اس کے ساتھ ہی بیک وقت سوچیت گڑھ کی طرف سے جموں کی طرف بھی چڑھائی کر دی جاتی۔ اٹھارہ بیس میل کا یہ میدانی فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کر کے جموں کا شہر اور وسیع علاقہ با آسانی فتح کیا جا سکتا تھا۔ مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چوہدری حمید اللہ اور خواجہ دین وانی کے علاوہ پروفیسر محمد اسحاق قریشی اور چوہدری غلام عباس کے بھائی محمد زبیر صاحب نے

یکے بعد دیگرے لاہور اور کراچی میں زعمائے پاکستان کی توجہ اس حکمت عملی کو آزمانے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کسی وجہ سے کسی صاحب اقتدار شخص نے ان کی

تجاویز پر عمل کرنے کی حامی نہ بھری۔

اس کے علاوہ کشمیر کو مکمل طور پر آزاد کروانے کا ایک اور موقع بھی آیا تھا' جو ہاتھ سے نکل گیا۔

بھارتی افواج تو کشمیر میں ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی صبح سے داخل ہونا شروع ہوئی تھیں لیکن ہمارے جی ایچ کیو کو ان کے اس ادارے کی خبر ایک رات قبل ہی مل چکی تھی۔ یہ اس طرح کہ لاہور ایریا ہیڈ کوارٹر نے بھارتی پیرا شوٹ بریگیڈ کا ایک خفیہ پیغام راستے ہی میں پکڑ کر اس کے رموز پڑھ لیے تھے اور اسے فوراً اپنے جی ایچ کیو تک پہنچا دیا تھا۔ اس روز قائداعظم لاہور میں موجود تھے' لیکن کسی نامعلوم وجہ سے کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کے حملے کی خبر انہیں اسی روز شام کے وقت سنائی گئی۔

فوری رد عمل کے طور پر قائداعظم نے پاکستان کی بری افواج کے قائمقام کمانڈر انچیف جنرل سر ڈگلس گریسی کو حکم دیا کہ پاکستانی افواج کو بھی بلا تاخیر کشمیر میں بھیج دیا جائے۔ جنرل گریسی نے بست و لعل کر کے اس حکم کی تعمیل کرنے کی بجائے نئی دہلی میں فیلڈ مارشل سر کلاڈ اوکنلیک کو مطلع کر دیا' جو اگلی صبح بنفس نفیس لاہور تشریف لے آئے۔ اوکنلیک نے دھمکی دی کہ قائداعظم کی ہدایات پر عمل کرنے کی صورت میں افواج پاکستان کے تمام برطانوی افسروں کو واپس بلا لیا جائے گا۔ جس کا نتیجہ صرف یہی نکلے گا کہ فوج کا تمام تر ڈھانچہ غیر منظم ہو جائے گا۔

اس کے بعد قائداعظم نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو دعوت دی کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو' مہاراجہ کشمیر اور کشمیر کے وزیراعظم کو اپنے ہمراہ لاہور لے آئیں تا کہ ۲۹ اکتوبر کو ایک میٹنگ میں بالمشافہ گفت و شنید کے ذریعہ اس سنگین صورت حال کا حل تلاش کیا جائے۔ دعوت تو منظور کر لی گئی۔ لیکن مقررہ تاریخ پر پنڈت جی حقیقتاً یا مصلحتاً بیمار پڑ

گئے۔ اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن یکم نومبر کو اکیلے لاہور تشریف لائے۔ قائداعظم نے اس کے سامنے کئی معقول مصالحتی تجاویز پیش کیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ٹال مٹول کر کے دامن بچاتے رہے کہ وہ محض آئینی گورنر جنرل ہیں۔ دہلی واپس جا کر وہ یہ تجاویز بھارتی حکومت کے سامنے رکھیں گے اور پھر ان کے فیصلے سے قائداعظم کو آگاہ کریں گے۔ دہلی جا کر ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم کو خود تو کوئی جواب نہ بھیجا' لیکن اگلے روز وزیراعظم نہرو نے آل انڈیا ریڈیو سے کشمیر کے حوالے سے پاکستان کے خلاف ایک نہایت تند و تیز اور تلخ تقریر نشر کر ڈالی۔ جس سے بھارت کے اصلی عزائم طشت از بام ہو گئے۔ وہ دن اور آج کا دن' بھارت کے ان عزائم میں رتی بھر فرق نہیں آیا۔

آزاد جموں و کشمیر حکومت جو ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء سے قائم ہے' ریاست کے تقریباً ایک تہائی حصے کو کنٹرول کرتی ہے۔ گلگت اور اسکردو سمیت ریاست کے شمالی علاقے حکومت پاکستان کی براہ راست نگرانی میں ہیں۔ وفاقی وزارت امور کشمیر حکومت پاکستان اور حکومت آزاد کشمیر کے درمیان باہمی رابطے کا کام دیتی ہے۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آزاد کشمیر حکومت کے قیام کی خبر سنتے ہی میں فوراً چوہدری محمد علی سیکرٹری جنرل کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ مجھے فوراً تراڑ کھیل روانہ ہونے کی اجازت عطا فرمائی جائے تا کہ میں اس نئی حکومت کی کوئی خدمت بجا لا سکوں۔ انہوں نے فرمایا کہ کشمیر کی جنگ آزادی میں پاکستان کی حکومت کسی طرح بھی ملوث ہونے کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتی۔ تم پاکستان کی ایک اہم سروس کے سرکاری ملازم ہو اس لیے تم آزاد کشمیر نہیں جا سکتے۔

میں نے گذارش کی کہ آپ میرا استعفیٰ لے کر اپنے پاس رکھ لیں۔ اگر کسی وقت آزاد کشمیر میں میری موجودگی پاکستان کے لیے کسی الجھن یا پریشانی کا باعث بنے تو آپ بے شک میرا استعفیٰ منظور کر کے مجھے اپنی ملازمت سے دستبردار سمجھ لیں۔ چودھری صاحب

مسکرائے اور بولے۔ "جذباتی نہ بنو' پاکستان بھی صرف دو ڈھائی ماہ پہلے وجود میں آیا ہے' یہاں پر بھی خدمت کی بہت گنجائش ہے۔"

میں مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ کام تو میں وزارت تجارت میں انڈر سیکرٹری کے طور پر کرتا رہا لیکن دل بدستور آزاد کشمیر میں اٹکا رہا۔ پھر مارچ ۱۹۴۸ء میں اچانک چوہدری غلام عباس مقبوضہ کشمیر سے رہا ہو کر پاکستان آ گئے۔ آتے ہی وہ فوراً قائداعظم کی خدمت میں حاضر دینے کراچی آئے اور ہمارے ہاں فروکش ہوئے۔ اگلے روز قائداعظم نے انہیں لنچ پر مدعو فرمایا۔ جس وقت ہم انہیں ایک نہایت ناقابل اعتبار اور چھپنچر سی کار پر گورنر جنرل ہاؤس چھوڑنے جا رہے تھے تو راستے میں ان کو میں نے آزاد کشمیر کے متعلق اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیا کیا کارروائی کہاں کہاں پر ہوئی البتہ کچھ عرصہ بعد چوہدری محمد علی صاحب نے ایک روز مجھے اپنے دفتر میں بلا کر یہ مژدہ سنایا کہ تمہیں آزاد کشمیر حکومت میں جا کر کام کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن تمہاری موجودہ تنخواہ تمہیں وزارت تجارت ہی سے ملا کرے گی۔ کیونکہ سرکاری گزٹ میں تمہارا نام اسی وزارت کے ملازمین کی فہرست میں شامل رہے گا۔ میں نے پوچھا کہ وہاں جا کر میرا کام کیا ہو گا۔ چودھری صاحب نے فرمایا۔ "وہاں پر کابینہ بن چکی ہے' اس کے ماتحت نظم و نسق کا سارا کام تمہیں سنبھالنا پڑے گا۔"

چلتے چلتے چوہدری محمد علی نے مجھے ایک اور مشورہ بھی دیا۔ "تم نوجوان اور نو آموز ہو۔ کام نیا اور مشکل ہے۔ اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ اگر کبھی کسی معاملہ میں کوئی مشکل پیش آئے تو میرے ساتھ رابطہ قائم کرنے سے ہرگز نہ ہچکچانا۔"

پاکستان کے سیکرٹری جنرل کی اس خیر سگالی کو پلے باندھ کر میں نے خوشی خوشی رخت سفر باندھا اور آزاد کشمیر کی راہ لی۔ اس زمانے میں کہوٹہ سے آزاد پتن ہوتے ہوئے پلندری اور تراڑ کھیل تک انتہائی تنگ اور بالکل کچی سڑک تھی۔ کسی کسی موڑ پر تو گاڑی کا اگلا ایک پہیہ سڑک سے نکل کر کھڈ کی جانب معلق ہو جاتا تھا۔ خاص طور پر

بارش کے دنوں میں اس قدر پھسلن ہوتی تھی کہ جیپوں اور ٹرکوں وغیرہ کے پھسل کر گہری کھڈ میں گرنے کے حادثات آئے دن وقوع پذیر ہوتے رہتے تھے۔ میں بھی ایک روز جیپ میں سوار ہو کر شدید بارش میں پھسلتا اور ہچکولے کھاتا حکومت آزاد کشمیر کے صدر مقام پہنچ گیا' جو پلندری اور تراڑ خیل کے درمیان جنجال ہل نامی ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں پر ڈھائی تین درجن چھوٹے چھوٹے کچے مکان تھے۔ چند مکانوں میں حکومت کے دفاتر تھے۔ باقی گھر صدر' وزراء اور دیگر سرکاری ملازمین کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ یہاں پر مجھے بھی ایک کمرے پر مشتمل ایک کچا کوٹھا مل گیا' جس کے ایک کونے میں باورچی خانے کے طور پر مٹی کا چولہا بنا ہوا تھا۔

جنجال ہل ایک نہایت ہی پر فضا مقام تھا اور طرح طرح کے سرسبز درختوں کے گھنے جنگل میں گھرا ہوا تھا۔ آس پاس ایک دو پہاڑی جھرنے تھے' جن کی ہلکی ہلکی' مدھم مدھم سی موسیقی دن رات اپنی تانیں اڑاتی رہتی تھی۔ دفتروں کے کمرے روایتی ساز و سامان سے بڑی حد تک محروم تھے۔ فائلوں کے لیے نہ زیادہ الماریاں تھیں نہ شیلف۔ عام طور پر پتھر کی سلوں کو ہموار رکھ کر ان سے کام لیا جاتا تھا۔ موسم کے لحاظ سے باہر درختوں کے سائے میں بیٹھ کر دفتری کام کرنے کا رواج بھی عام تھا۔ دن بھر بھارت کے بمبار طیارے ہمارے اوپر سے یا دائیں بائیں پرواز کرتے ہوئے گزرتے رہتے تھے اور اپنے نشانوں پر اندھا دھند بم برسا کر خراماں واپس لوٹ جاتے تھے' ہماری جانب سے ان کی مزاحمت یا روک تھام کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ کئی بار بھارتی طیاروں کی اڑان اس قدر نیچی ہوتی تھی کہ ہمیں پائلٹوں کے منہ اور سر تک صاف نظر آ جاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ہمارا سہارا صرف اللہ پر توکل تھا۔ جب کبھی کوئے بھارتی طیارہ آس پاس بم برساتا یا مشین گن سے بے تحاشا گولہ باری کرتا عین ہمارے اوپر سے گزرتا تھا تو ہم دم سادھ کر اپنی اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھ جاتے تھے تا کہ ہماری نقل و حرکت سے ہوا باز ہماری چھوٹی سی آبادی کا سراغ نہ پا لیں۔

ایک روز آزاد کشمیر کے سپریم ہیڈ چوہدری غلام عباس اور صدر سردار ابراہیم پلندری کے قریب ایک مقام پر ہزاروں لوگوں کے اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔ عین اس وقت بھارتی ایئر فورس کا ایک بمبار طیارہ ان کے اوپر آ گیا۔ بیسیوں جانثاروں نے اپنے دونوں لیڈروں کے اوپر اپنے اجسام کا ایسا حفاظتی حصار بنا لیا گیا کہ گولہ باری کی صورت میں ان کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ باقی ہزاروں سامعین بے حس و حرکت اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ ہندوستانی طیارہ کچھ عرصہ آس پاس منڈلایا اور غالباً جلسہ گاہ میں زندگی کے کوئی آثار نہ پا کر کوئی بم یا گولیاں برسائے بغیر آگے بڑھ گیا۔

بھارتی ایئر فورس کا ایک خصوصی ہدف دومیل (مظفر آباد) میں دریائے جہلم اور دریائے نیلم (سابق کرش گنگا) کے پل تھے' جو فوجی نکتہ نظر سے اس علاقے میں شہ رگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ شروع شروع میں خوش عقیدہ مقامی مسلمانوں نے ان پلوں کی حفاظت کے لیے ان کے دونوں سروں پر قرآن حکیم کا ایک ایک نسخہ بطور تعویذ باندھ رکھا تھا۔ بھارتی بمباروں نے ان پلوں کو نشانہ بنانے کے لیے سینکڑوں حملے کیے لیکن ان کا ایک بھی نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا۔ کچھ عرصہ بعد جب پاکستانی فوج کو مجبوراً اس جنگ کے محاذ پر آنا پڑا تو ان پلوں کی حفاظت کے لیے ایک طیارہ شکن توپ بھی وہاں پر نصب ہو گئی۔ اس بندوبست سے مطمئن ہو کر لوگوں نے پلوں پر باندھے ہوئے قرآن شریف احتراماً اتار کر رکھ لیے۔ کچھ روز بعد خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بھارتی بمباروں کے حملے میں ایک بم سیدھا ایک پل پر آ کے لگا اور پھٹے بغیر سوراخ کر کے نیچے دریا میں جا گرا۔ یہ بھی اللہ تعالٰی کی قدرت ت ھی کہ پل میں ایک معمولی سا سوراخ ہونے کے علاوہ اس بم سے اور کوئی نقصان نہ پہنچا۔

جنجال ہل میں سول حکومت کے سب کارندے بھی اپنی اپنی جگہ جذبہ جہاد سے سرشار تھے۔ سردار محمد ابراہیم کی صدارت میں کابینہ کے تمام اراکین بے حد فعال' خوش خصال اور دیانتدار تھے۔ سید علی احمد شاہ وزیر دفاع نہایت نیک سیرت اور پابند صوم و صلوٰہ بزرگ تھے۔ انہیں ثقل سماعت کا عارضہ تھے۔ غالباً اسی وجہ سے وہ خود بھی ضرورت سے زیادہ

بلند آواز میں بولنے کے عادی ہو گئے تھے۔ عام طور پر وہ دوسروں کی بہت کم سنتے اور اپنی بہت زیادہ سنانے کے شوقین تھے۔ ان کے پاس ایک چھوٹا سا بھونپو نما آلہ سماعت ہوتا تھا۔ اگر کبھی وہ کسی اور کی کوئی بات سننے کا ارادہ کرتے تو اس آلہ کو کان سے لگا کر بیٹھ جاتے تھے۔ ورنہ عام طور پر وہ اسے جیب میں ڈال کر یکطرفہ گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ دفتری قواعد و ضوابط پر انہیں خوبصورت مہارت حاصل تھی اور دساتیر عالم کا مطالعہ کرنے کا بھی انہیں خاص شوق تھا۔ کشمیر کے آئینی مستقبل کا تانا بانا اپنے ذہن میں بنتے رہنا ان کا دلپسند مشغلہ تھا۔ بعد ازاں وہ کچھ عرصہ تک آزاد کشمیر کے صدر بھی رہے۔

وزیر خزانہ سید نذیر حسین شاہ بڑے نیک مزاج' رحمدل اور نرم گفتار انسان تھے۔ جنگ کی وجہ سے خزانہ خالی تھا۔ لیکن سرکاری چیک بک ہمیشہ شاہ صاحب کی جیب میں موجود رہتی تھی۔ جہاں کہیں کوئی ضرورت مند کچھ امداد یا کوئی محکمانہ اخراجات کے لیے کچھ رقم طلب کرتا' وہ وہیں پر کھڑے کھڑے چیک کاٹ کر ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں نہ تو ابھی تک کوئی بجٹ بنانے کی نوبت آئی تھی اور نہ ہی آمدنی اور خرچ پر محکمہ فنانس اور محکمہ اکاؤنٹنٹ جنرل کا روایتی کنٹرول تھا۔ آزاد کشمیر کا نظم و نسق سنبھالتے ہی جب میں نے پہلے پہل بجٹ تیار کر کے محکمہ فنانس اور اکاؤنٹنٹ جنرل کے سرخ فیتے کا نظام رائج کیا اور شاہ صاحب سے سرکاری خزانے کی چیک بک واپس لے لی تو وہ بڑے حیران اور غالباً کسی قدر آزردہ سے ہوئے۔ ایک روز انہوں نے میرے ساتھ گلہ کیا۔ "اگر ہر خرچ کی منظور فنانس ڈیپارٹمنٹ سے حاصل کرنی ہے اور ہر چیک اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر سے جاری ہونا ہے تو وزیر خزانہ کس مرض کی دوا رہ جاتا ہے؟"

خواجہ غلام دین وانی دھیمے مزاج کے روشن دماغ اور خاموش طبع وزیر تھے۔ وہ اپنے فرائض وزیرانہ دم خم سے کم اور فقیرانہ انداز سے زیادہ سر انجام دیتے تھے۔ ان کا تعلق وادی

کشمیر سے تھا اور وہ مقبوضہ علاقے کے تمام بڑے بڑے قائدین مثلاً شیخ عبداللہ' مرزا افضل بیگ اور بخشی غلام محمد کے طور طریقوں اور عادات و خصائل سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ثناء اللہ شمیم صاحب کا تعلق بھی وادی کشمیر سے تھا۔ وہ پڑھے لکھے' جوشیلے' انقلاب پسند اور سیماب صفت جواں سال وزیر تھے۔ وہ اپنے محکموں کی کارکردگی اور کارگزاری پر مضبوط گرفت رکھتے تھے اور بحث مباحثہ اور منطق و استدلال میں ان سے بازی لے جانا امر محال تھا۔

میرے زمانے میں کچھ عرصہ بعد میر واعظ محمد یوسف شاہ بھی کابینہ میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ وادی کشمیر کے ایک عظیم رہنما تھے جہاں پر ان کے لاکھوں مرید تھے۔ سنا ہے کہ ان کے بعض مریدوں کے دل میں ان کے لیے اتنا گہرا جذبہ عزت و احترام تھا کہ جس قالین پر میر واعظ صاحب ایک بار بیٹھ جاتے تھے اس پر کوئی شخص دوبارہ پاؤں نہیں رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ ایسے قالینوں کو گھر والے تبرک دیوار پر آویزاں کر دیتے تھے۔

میر واعظ صاحب محض زاہد خشک نہ تھے بلکہ بذلہ سنجی' لطیفہ گوئی اور پر لطف محفل آرائی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ دھیمی دھیمی مہین سی آواز میں وہ مزاح ہی مزاح میں ایسے پتے کی بات کہہ جاتے تھے کہ سننے والا عش عش کر اٹھتا۔ میرے ساتھ وہ نہایت مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے اور رات کا کھانا اکثر مجھے اپنے ساتھ کھلانے پر اصرار فرمایا کرتے تھے۔ غریب الوطنی کے باوجود ان کا دستر خوان بڑا وسیع ہوتا تھا۔ ان کی وفات حسرت آیات کے بعد اب اس طرح کے کشمیری کھانے خواب و خیال ہو گئے ہیں۔

میر واعظ صاحب جعلی پیروں فقیروں کے ہتھکنڈوں کے متعلق عجیب و غریب حکایات سنایا کرتے تھے۔ خاص طور پر دو واقعات قابل بیان ہیں۔

ایک جعلی پیر صاحب کا معمول تھا کہ وہ صرف جمعرات کے دن اپنے مریدوں یا دیگر حاجت مندوں کو تعویذ لکھ کر دیا کرتے تھے۔ جب فاؤنٹین پین نئے نئے ایجاد ہوئے تو پیر صاحب نے اسے بھی اپنی جملہ کرامات میں شامل کر لیا۔ وہ اس طرح کہ جمعرات

کو وہ اپنے قلمدان کی روشنائی پھنکوا کر خالی دوات اپنے سامنے رکھ لیتے۔ البتہ فاؤنٹین پین کو سیاہی سے بھر کر قلمدان میں سجا لیتے تھے۔ غرض مند لوگ دور دور سے پاپیادہ تعویذ لینے آتے تھے۔ پیر صاحب کی خدمت میں نذرانہ پیش کر کے اپنی حاجت بیان کرتے تھے۔ پیر صاحب تعویذ لکھنے کے لیے فاؤنٹین پین کو دوات میں ڈبوتے تھے۔ اسے خالی پا کر قلم واپس رکھ دیتے تھے اور سرد آہ بھر کر افسوس کرتے تھے۔ "اوہو' آج تو سیاہی ختم ہے۔ خیر اگلی جمعرات کو آ جانا۔ تعویذ لکھ دوں گا۔" دس دس یا بیس کوس سے پیدل آیا ہوا حاجت مند مایوس ہو کر جانے لگتا تو پیر کے چھوڑے ہوئے دلال اسے حضرت پیر و مرشد کے ابر کرم کو جوش میں لانے کی ترکیبیں سمجھاتے۔ حاجت مند از سر نو پیر صاحب کے قدموں میں پہلے سے تین گنا نذرانہ ڈالتا اور گڑگڑا کر آہ و زاری کرتا کہ اللہ اور رسول کی خاطر میری دستگیری فرمایئے۔ پیر صاحب زچ ہو کر کہتے۔ "اوہو' آپ لوگ بڑا تنگ کرتے ہیں۔ اچھا خیر اللہ مالک ہے۔" وہ کچھ پڑھ کر فاؤنٹین پین پر پھونک مارتے اور پیر و مرشد کی کرامت سے دوات میں سیاہی کے بغیر قلم ڈبو کر وہ کھٹ سے تعویذ لکھ دیتے۔

ایک دوسرے پیر صاحب نے پہلے پہل بیٹری والی ٹارچ کی ایجاد سے بھی ایسا ہی فائدہ اٹھایا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ جو شخص ان کے پاس رہ کر چالیس دن کا چلہ کاٹ لے' وہ کھلی آنکھوں سے اللہ کے نور کا دیدار کر سکتا ہے۔ بہت سے لوگ ان کے پاس چلہ کاٹنے آئے۔ ان چالیس ایام کے دوران پیر صاحب ہر شخص سے روزانہ صدقہ کے لیے ایک بکرا اور دوسری خیر خیرات کے لیے کچھ رقم بٹورتے رہتے تھے۔ چلہ کاٹنے والے دن بھر روزہ رکھتے تھے اور رات بھر عبادت اور ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ چالیسویں دن پیر صاحب اگر بتیوں اور عود و لوبان سے مہکائے ہوئے حجرے میں چلہ کش کو اپنے سینے سے لگا کر بیٹھ جاتے اور اس کے چہرے کو اپنے فرن (کشمیریوں کا ٹخنوں تک لانبا کرتہ نما پیراہن) میں ڈال اسے حکم ہوتا تھا کہ وہ کلمہ طیبہ کا ورد کرے اور

پلکوں کو جھپکائے بغیر اپنی آنکھیں پوری توجہ سے پیر صاحب کے قلب کی جانب ٹکٹکی باندھ کر جمائے رکھے۔ حجرے میں بہت سے مریدان باصفا حلقہ باندھ کر ذکر جہر کی محفل برپا کرتے تھے۔ اس ڈرامائی ماحول میں کسی خاص لمحے پر پیر صاحب اپنے فرن میں چھپائی ہوئی ٹارچ کا بٹن دبا کر اس کی شعاعوں سے اپنے سینہ کو بقعہ نور بنا دیتے۔ بعض چلہ کش "نور الہی" کے اس دیدار کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو جاتے تھے۔

یہ کہانیاں سنا کر میر واعظ محمد یوسف شاہ فرمایا کرتے تھے کہ اصلی کرامات تو انسان کی اپنی عقیدت مندی میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ روشنائی سے خالی دوات میں "قلم" ڈبو کر لکھے ہوئے تویذ زیادہ موثر ثابت ہوتے تھے اور چالیس ایام کی نفس کشی اور عبادت و ریاضت کے بعد بیٹری ٹارچ کی آڑ میں "نور الہی" کے دیدار سے مشرف ہونے والے اکثر افراد اپنی بقیہ زندگی سچ مچ عابد شب زندہ دار بن کر گزار دیتے تھے!

کچھ عرصہ کے بعد صوبہ جموں کے چوہدری عبداللہ بھلی بھی کرسی وزارت پر متمکن ہوئے تھے۔ یہ بڑے سادہ لوح اور دلچسپ انسان تھے۔ ایک روز میں ان کے ہمراہ بھمبر اور کوٹلی کی جانب دورے پر گیا ہوا تھا۔ ایک مقام پر ہم کسی کام کے لیے ٹھہرے تو اچانک فضا میں دو تین بھارتی بمبار طیارے نمودار ہوئے اور ادھر ادھر اٹکل پچو سے چند بم گرا کر چلتے بنے۔ بھلی صاحب انتہائی رازداری سے سرگوشی میں بولے: "واہ بھئی واہ۔ ہندوستان کی سی۔ آئی۔ ڈی نے بھی کمال کر دیا۔ ہمارے پہنچتے ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ آج گورنمنٹ یہاں آئی ہوئی ہے اور ان کے طیارے بم لے کر فوراً آ موجود ہوئے!"

جموں کے باسی کیپٹن نصیر الدین بڑی سوجھ بوجھ کے مالک، متحمل اور بردبار وزیر تھے۔ ان کی ساری ملازمت انڈین پولیٹیکل سروس میں گزری تھی۔ کچھ عرصہ تک وہ قلات کے وزیراعظم بھی رہ چکے تھے۔ آزاد کشمیر کی کابینہ میں کافی تاخیر کے بعد شامل ہوئے اور بعدازاں کسی وقت صدارت کی کرسی پر بھی بیٹھے۔

پاکستان میں چوہدری محمد علی سیکرٹری جنرل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شیخی میں آ کر میں

نے آزاد کشمیر پہنچ کر اپنے عہدہ کا نام بھی سیکرٹری جنرل رکھ لیا تھا۔ اس پر چوہدری صاحب نے سرزنش کر کے مجھے ٹوکا کہ مجھے اپنے عہدے کا لقب چیف سیکرٹری رکھنا چاہیے تھا۔ میں نے معذرت کی کہ میں تو اب یہ غلطی کر بیٹھا ہوں۔ اب فوری طور پر اسے بدلنے میں مقامی سطح پر بہت سی الجھنیں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ البتہ میرے بعد اگر اس عہدے کو چیف سیکرٹری کا نام دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ چوہدری صاحب میری بات مان گئے۔ چنانچہ آجکل آزاد جمو و کشمیر کی حکومت میں چیف سیکرٹری ہی مقرر کیا جاتا ہے۔

جنجال ہل میں میرے دوسرے رفقائے کار بھی اپنی مثال آپ تھے۔ ان جیسے محنتی' دیانت دار' سچے اور نڈر افسروں کی اتنی بڑی متحدہ جماعت مجھے ساری عمر اور کہیں نظر نہیں آئی۔ یہاں پر ان سب کا نام بنام ذکر کرنا تو امر محال ہے۔ البتہ مثال کے طور پر ان میں سے چند ایک کا کچھ احوال بیان کرنا باعث دلچسپی ہو گا۔

سرفہرست مجھے محکمہ تعلیم کے سیکرٹری کیپٹن محمد صفدر کا نام یاد آتا ہے۔ وہ سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور انگلستان سے تاریخ میں ایم' اے کر چکے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں کچھ عرصہ ایمرجنسی کمیشن حاصل کر کے فوجی ملازمت کی۔ پھر پنجاب میں کسی کالج میں ملازم ہو گئے۔ جب کشمیر میں جہاد آزادی نے زور پکڑا' تو استعفیٰ دے کر حکومت آزاد کشمیر میں آ گئے۔ وہ جذبہ جہاد کا چلتا پھرتا پیکر تھے۔ محکمہ تعلیم کے سیکرٹری کی حیثیت سے وہ کوئی تنخواہ قبول نہ کرتے تھے۔ آزاد علاقوں میں سرکاری دوروں کا سفر خرچ اور یومیہ بھتہ بھی وصول نہ کرتے تھے۔ وہ جہاد کی اصلی روح ساتھ لے کر کام کرنے آئے تھے اور اس کام کی کوئی اجرت حاصل کرنا صریحاً حرام سمجھتے تھے۔ ہمہ وقت کام کرنے کی ان میں ایسی لگن تھی کہ میں نے انہیں کبھی بیکار بیٹھے یا گپیں ہانک کر وقت ضائع کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب آزاد کشمیر کا دارالحکومت مظفر آباد منتقل ہوا تو صفدر صاحب نے اپنی فائلوں کی بوری کندھے پر اٹھائی اور جنجال ہل سے

لگاتار چل کر سارا راستہ دو روز میں پاپیادہ طے کر لیا۔

محکمہ مال کے سیکرٹری راجہ محمد یعقوب تھے۔ وہ بڑے خوش لباس' خوش کلام اور خوش اخلاق انسان تھے۔ وہ بے خوابی کے دیرینہ مریض تھے۔ کئی کئی راتیں مسلسل جاگ جاگ کر گزارنے کے باوجود دفتر میں بھی ہمیشہ دن بھر چاق و چوبند اور خوش و خرم ہی نظر آیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ بے خوابی کی وجہ سے ساری ساری رات جاگتے جاگتے انہوں نے انگریزی زبان کی ایک پوری ڈکشنری حفظ کر لی تھی۔ ان کا یہ جوہر ہمارے بہت کام آیا۔ جنجال ہل میں آزاد حکومت کے کسی دفتر یا ملازم کے پاس انگریزی کی کوئی ڈکشنری موجود نہ تھی۔ وہاں پر ہم سب ضرورت پڑنے پر راجہ صاحب ہی سے ایک چلتی پھرتی ڈکشنری کے طور پر استفادہ کر لیا کرتے تھے۔

قانون کی ڈکشنری خواجہ عبدالغنی کی ذات تھی۔ ہوم اور لاء سیکرٹری کی حیثیت سے وہ جیل خانوں سے لے کر ہائی کورٹ تک تمام قواعد و ضوابط کی رگ رگ سے واقف تھے۔ دیکھنے میں وہ نہایت بھولے بھالے اور سیدھے سادے نظر آتے تھے۔ لیکن پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو قانونی موشگافیوں کے سانچے میں ڈھال کر آسان اور عام فہم بنا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ہنگامی احکام اور قوانین وغیرہ کے خاکے بنانے اور منظوری کے بعد انہیں باضابطہ مسودوں کی شکل دینے میں بھی انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔ شدید ترین ہنگامی حالات اور بمباری کے دوران بھی وہ پرسکون رہتے تھے اور کسی گھبراہٹ کے آثار کے بغیر ان کا دماغ ان کے زیر غور مسودوں کی کتر بیونت پر مسلسل کام کرتا رہتا تھا۔

محمود ہاشمی حکومت آزاد کشمیر کے چیف پبلسٹی افسر تھے۔ وہ اپنی خوش کلامی' خوش بیانی اور ایک عجیب درویشانہ ادائے دلنوازی سے بہت جلد ہر کس و ناکس کے دل میں گھر کر لیتے تھے۔ وہ ایک پیدائشی ادیب تھے' کیونکہ ان کی بول چال اور تحریر و تقریر پر ایک واضح ادبی چھاپ ہوتی تھی۔ دن بھر وہ دفتر میں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ ہر روز شام

کو یوسف بچ اور میں ان کو اپنے ہمراہ لے کر طویل سیر پر نکل جاتے تھے اور واپس آ کر لالٹین کی مدھم سی روشنی میں رات گئے تک گپ شپ ہانکا کرتے تھے۔ پھر اچانک ایک روز خبر ملی کہ محمود ہاشمی کی کتاب "کشمیر اداس ہے" شائع ہو کر بازار میں آ گئی ہے۔ میری طرح جس کسی نے اس کتاب کو پڑھا' وہ اس سے بے حد متاثر ہوا۔ ریاست کشمیر کے متعلق اس سے بہتر رپورتاژ اور کسی نے نہیں لکھا۔ مجھے آج تک اس بات پر حیرت ہے کہ جھنجال ہل میں ہم سب کی نظر بچا کر محمود ہاشمی نے ایسی عجیب و غریب کتاب کب اور کیسے تصنیف کر ڈالی؟ کافی عرصہ سے اب یہ کتاب نایاب ہے۔ معلوم نہیں پاکستان بھر میں کسی پبلشر کو یہ کتاب دوبارہ شائع کرنے کا خیال اب تک کیوں نہیں آیا؟ کشمیر کا مسئلہ لٹکتا رہے یا حل ہو جائے' اس کتاب کی ادبی اہمیت اور افادیت دونوں صورتوں میں برقرار رہے گی۔

۱۹۵۳ء میں محمود ہاشمی اچانک انگلستان چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ پہلے محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے۔ پھر ریس ریلیشنز (Race Relations) کے اداروں کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد لندن میں اردو کا پہلا باقاعدہ اخبار ہفت روزہ "مشرق" عنایت اللہ مرحوم کے تعاون سے جاری کیا۔ اس اخبار کا ڈنکا کئی برس تک خوب بجتا رہا۔ پھر یہ ریت چل نکلی اور رفتہ رفتہ اردو صحافت نے انگلستان میں بھی اپنے پاؤں جما لیے۔ آجکل وہاں اردو کے غالباً دو روزنامے اور متعدد ہفت روزہ اور ماہانہ رسائل باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں۔ انگریزی کی سرزمین پر اردو صحافت کا پودا لگانے کا سہرا محمود ہاشمی کے سر ہے۔ آجکل وہ ایک نئے انداز میں اردو زبان کا پہلا قاعدہ لکھ رہے ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انگلستان میں مقیم لاکھوں پاکستانی بچوں کو اپنی قومی زبان سیکھنے میں آسانی ہو اور بہت سے انگریز جو شوقیہ طور پر یا ضرورتاً یہ زبان سیکھنے کے خواہشمند ہیں' ان کے کام بھی آ سکے۔

جنجال ہل میں شام کے وقت طویل سیر کے بعد گپ شپ کی شبینہ محفلوں میں دوسرے

ساتھی یوسف بچ تھے۔ انگریزی پر انہیں ایسا عبور حاصل تھا' کہ ان کی تحریر پڑھ کر اہل زبان بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ دفتر میں بیٹھ کر فائلیں کرنے سے انہیں وحشت ہوتی تھی۔ اس لیے انہیں تحریک آزاد کشمیر کے سپریم ہیڈ چوہدری غلام عباس کے ساتھ ایڈوائزر کے طور پر لگا دیا گیا تھا۔ کیونکہ مشاورت کا کام زیادہ تر زبانی کلامی ہی ہوا کرتا تھا۔

جب محمود ہاشمی انگلستان سدھارے تو یہ بھی نیویارک چلے گئے اور یو۔ این۔ او میں پاکستانی سفارت خانہ کے ایک گوشہ میں آزاد کشمیر سینٹر (Free kashmir Centre) کھول کر بیٹھ گئے۔ یو۔ این۔ او کی جنرل کانفرنس اور سلامتی کونسل میں ہمارے مشاہیر جتنی تقریریں کرتے تھے' ان میں اکثر و بیشتر یوسف بچ کی ڈرافٹ کردہ ہوتی تھیں۔ رفتہ رفتہ وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ بھی ان کے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ جب بھٹو صاحب اقتدار میں آئے تو انہوں نے یوسف بچ کو اپنے سپیشل اسسٹنٹ کے طور پر پاکستان بلا لیا۔ جاتے جاتے بھٹو صاحب انہیں سوئٹزر لینڈ میں بطور سفیر متعین کر گئے لیکن مارشل لاء کی حکومت نے بہت جلد انہیں اس عہدے سے فارغ کر دیا۔ یوسف بچ دوبارہ نیویارک جا پہنچے۔ وہاں پر یو این او کے سیکرٹری جنرل کرٹ والڈہیم نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے سٹاف میں شامل کر لیا۔ نئے سیکرٹری مسٹر کوئیر نے آ کر ان کی اسامی کو اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل کا رتبہ دے دیا۔ پروفیسر پطرس بخاری کے بعد یوسف بچ واحد پاکستانی ہیں جو یو۔ این۔ او کے ادارے میں اس رتبے کی اسامی پر فائز ہوئے ہیں۔ بخاری صاحب کو حکومت پاکستان کی پوری پوری تائید حاصل تھی۔ یوسف بچ نے محض ذاتی اہلیت اور حسن خدمت کی بنا پر یہ رتبہ حاصل کیا ہے۔

ڈاکٹر نور حسین صاحب میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ تھے۔ وہ میرے بڑے بھائی مرحوم کے ہم جماعت اور دوست تھے۔ اس لیے میں ان کا ادب و احترام اپنے بزرگوں کی طرح کرتا تھا۔ وہ بھی مجھے بچہ سمجھ کر ویسا ہی برتاؤ کرتے تھے۔ آزادی سے پہلے وہ مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کی مہارانی کے ذاتی معالج بھی تھے۔ اس لحاظ سے انہیں مہاراجہ اور مہارانی کے محلات کے اندرونی کوک شاستروں کا پورا علم تھا۔ کبھی کبھی وہ موڈ میں

آ کر ڈوگرہ حکمران کی ذاتی زندگی کے بارے میں عجیب و غریب قصے سناتے تھے۔ جیسے ہی اس طلسم ہوشربا کا رخ مہاراجہ اور مہارانی کی جنسی بے رہ رویوں کی طرف مڑتا

تھا' تو ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر مجھے محفل سے اٹھا دیتے تھے۔ "کافی دیر ہو گئی ہے۔ بچوں کو جا کر اب سو جانا چاہیے!"

ڈاکٹر صاحب نے پاکستان کے فوجی میڈیکل یونٹ کے ساتھ مل کر آزاد کشمیر کے طول و عرض میں ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کا ایسا نظام قائم کیا جو ڈوگرہ مہاراجہ کے عہد میں کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ جنگ بندی کے بعد جب مسئلہ کشمیر کے حل کا امکان دور سے دور تر ہوتا چلا گیا تو ڈاکٹر صاحب بھی مایوس ہو کر سیالکوٹ چلے آئے۔ یہاں پر انہوں نے دین اسلام کی روح اور عمل کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور زندگی کے آخری ایام انہوں نے کچھ ایسے کیف و مستی و سرور میں کاٹے جسے حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے زاہد و عابد ساری ساری عمر ذکر شغل اور مراقبہ و مجاہدہ میں گزار دیتے ہیں۔ ہمارے نامور صاحب طرز انگریزی زبان کے صحافی خالد حسن ڈاکٹر صاحب کے بیٹے' قائداعظم کے سیکرٹری اور آزاد کشمیر کے سابق صدر مسٹر کے۔ ایچ۔ خورشید ان کے داماد ہیں۔

ڈاکٹر نور حسین ہمعصر اور دوست انور شیخ علی گڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔ وہاں پر انہوں نے یونین کے مباحثوں میں نمایا حصہ لے کر بڑا نام پیدا کیا' وہیں پر شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم بھی استوار ہو گئے تھے۔ کشمیر واپس آ کر انہوں نے اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازمت تو ضرور اختیار کر لی تھی لیکن عملی طور پر وہ ہمیشہ کانفرنس کی سیاست سے وابستہ رہے۔ جہاد کشمیر کے آغاز کے بعد جب شیخ عبداللہ ہندوستانی سنگینوں کے سائے میں اقتدار میں آئے تو انہوں نے انور شیخ کو اعلانیہ طور پر پاکستان کے حق میں سرگرم عمل پا کر کافی عرصہ تک جیل میں ٹھونسے رکھا۔ رہائی کے بعد ان کو بھی آزاد کشمیر میں یوسف بچ کی طرح چوہدری غلام عباس کے ساتھ بطور

مشیر متعین کر دیا گیا۔

ان سب سے نرالی اور دلچسپ شخصیت حسام شاہ کی تھی۔ وہ سرینگر کے ایک متمول اور بارسوخ خاندان کا چشم و چراغ تھا' جس کا بیشتر حصہ مقبوضہ کشمیر ہی میں رہ گیا تھا۔

جب وہ پہلی بار مجھے ملنے آیا' تو میں نے پوچھا کہ وہ خود سوچ کر بتا دے کہ یہاں پر اسے کس نوعیت کا کام سپرد کرنا چاہیے۔ اس نے فوراً نہایت سادگی سے جواب دیا کہ اسے کوئی خاص کام نہیں آتا۔ گرمیوں کے سیزن میں ہندوستان بھر سے جو مسلمان مشاہیر سرینگر آتے تھے' حسام شاہ کے گھر والے اکثر اس کی ڈیوٹی ان کی خاطر مدارت اور دیکھ بھال پر لگا دیا کرتے تھے۔ اس طرح علامہ اقبال سمیت ہندوستان کے تقریباً تمام نامور مسلمانوں کے ساتھ اس کی روشناسائی تھی۔ حسام شاہ نے کسی قدر معتذرانا لہجے میں کہا' "جناب مجھے تو بس دوسروں کی خدمت کرنے کا تجربہ ہے۔اس میں مجھے خود بھی لطف آتا ہے۔"

حسام شاہ کی یہ ادا مجھے بہت بھائی۔ رسمہ ملازمت تو اس کی سول سپلائی کے محکمے میں مقرر کر دی گئی' لیکن عملاً میں نے اس سے کام چیف آف پروٹوکول کا ہی لیا۔ اس کام کو شائستگی سے نبھانے کی اہلیت بھی اس میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

عبدالمجید سلہریا کا نام شامل کئے بغیر آزاد کشمیر میں میرے ہمعصروں کا تذکرہ نامکمل رہ جائے گا۔ میرے زمانے میں وہ محکملہ جنگلات میں کنزرویٹو تھے۔ بعد میں ترقی کرتے کرتے چیف کنزرویٹو اور ترقیاتی محکموں کے سیکرٹری بھی رہے۔ اگر کسی نے اس بگڑے ہوئے' فاسد اور ناقص زمانے میں اپنی آنکھوں سے ایسے شخص کو دیکھنا ہو جو شروع ہی سے جوان صالح رہا ہو' جس نے زندگی بھر دیانت' امانت اور سچائی کا دامن نہ چھوڑا ہو' جس کے خون میں لقمہ حلال کے علاوہ اور کسی خوراک کی آمیزش نہ ہو' اور جو ہر آزمائش میں اللہ کی رضا' توکل اور تقویٰ پر ثابت قدم رہا ہو تو وہ عبدالمجید سلہریا کو دیکھ لے جو ریٹائر ہونے کے بعد اب سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں اپنی معمولی سی پنشن

پر صبر و شکر سے گزارا کر رہا ہے۔ جنگلات کا محکمہ سونے کی کان سمجھا جاتا ہے۔ سلہریا اس سونے کی کان سے دامن بچا کر اس قدر پاک و صاف نکلا کہ اس کا کردار بذاب خود سونا بن گیا۔

باقی سارا کام تو میں نے سنبھال لیا' لیکن محکمہ پولیس کی تنظیم نو میرے بس کا روگ نہ تھی۔ اس مقصد کے لیے پنجاب کے ایک ڈی۔ آئی۔ جی سید نذیر عالم ڈیپوٹیشن پر آزاد کشمیر آ گئے۔ کسی مصلحت سے یہاں آ کر انہوں نے اپنا نام مسٹر ضرار رکھ لیا۔ وہ انڈین پولیس سروس کے ایک تجربہ کار افسر تھے اور بڑی شاہانہ طبیعت کے مالک تھے۔ ان کا اپنا قیام تو راولپنڈی کے سرکٹ ہاؤس میں ہوتا تھا جہاں وہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہا کرتے تھے۔ لیکن آزاد کشمیر میں پے درپے دورے کر کے انہوں نے محکمہ پولیس کو ازسر نو منظم کرنے میں بڑی گرانقدر خدمات سر انجام دیں۔ ان کو آئے ہوئے تھوڑا عرصہ گزارا تھا کہ ایک روز میں اچانک ان سے ملنے راولپنڈی سرکٹ ہاؤس چلا گیا۔ وہاں دیکھا کہ کچھ لوگ برآمدے میں جمع ہیں اور ضرار صاحب درمیان میں بیٹھے چند قیمتی بندوقیں فروخت کر رہے ہیں۔ اس خرید و فروخت کے بعد جب ہم دونوں اکیلے رہ گئے' تو میں نے پوچھا کہ انہیں اپنی خوبصورت بندوقیں یکایک فروخت کرنے کی کیوں سوجھی؟

"بھائی' کیا کرتا؟" وہ بولے۔ "ڈھیر سارے بل جمع ہو گئے تھے۔ انہیں ادا کئے بغیر یہاں سے کیسے چلا جاتا؟"

"یہ آپ پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہاں سے کون جا رہا ہے؟ کیوں جا رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟"

"میں جا رہا ہوں۔ یہ تار مجھے کل شام ملا تھا۔" ضرار صاحب نے ایک سرکاری ٹیلیگرام میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ پنجاب کے چیف سیکرٹری کا تار تھا' جس میں سید نذیر عالم ڈی۔ آئی۔ جی کے لیے مرکزی حکومت کے یہ احکام درج تھے کہ وہ فوراً بہاولپور روانہ ہو جائیں جہاں پر ایک انتہائی

اہم انکوائری ان کے سپرد کی جا رہی ہے۔
میرے استفسار پر عالم صاحب نے قیاساً یہ بتایا کہ ممکن ہے یہ انکوائری بہاولپور کے سابق وزیراعظم نواب مشتاق احمد گورمانی کے بارے میں ہو۔ کیونکہ کچھ عرصہ سے ان کے متعلق پبلک میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔
سید نذیر عالم کا یوں اچانک آزاد کشمیر سے چلے جانے کا مجھے بڑا افسوس ہوا۔ ان کی اعلیٰ انتظامی قابلیت کے علاوہ ان کی دیانت داری اور خوش اخلاق کا درجہ بھی بڑا بلند تھا۔
اس واقعہ کے چند روز بعد میں اپنی جیپ میں سوار راولپنڈی کی مال روڈ پر گزر رہا تھا تو دیکھا کہ ریس کورس کے نزدیک سید نذیر عالم خراماں گھوڑ سواری کا شوق فرما رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر رک گئے۔ میں نے پوچھا' "کیا آپ ابھی تک بہاولپور نہیں گئے؟"
"میں لاہور تک تو پہنچا تھا۔" وہ ہنس کر بولے۔ "وہاں پر کراچی سے حکم آ گیا کہ انکوائری موقوف ہو گئی ہے۔"
"چلو اچھا ہوا" میں نے کہا۔ "اب آزاد کشمیر میں واپس آ جایئے۔"
"ناں بھائی ناں۔" انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ "میری توبہ۔ ب میں وہاں کیسے آ سکتا ہوں؟"
"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ابتدائے عشق ہی روتا ہے کیا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا" انہوں نے ذومعنی انداز سے یہ شعر الاپ کر پڑھا۔
میں نے گلہ کیا کہ ان کی یہ پہیلی میری سمجھ میں نہیں آئی۔
"تھوڑی دیر صبر سے کام لو۔" وہ بولے۔ "رفتہ رفتہ ساری بات سمجھ لو گے۔"
چند ماہ بعد جنگ بندی کے احکام نافذ ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی طرح طرح کی افواہوں کا تانتا لگ گیا۔ ایک افواہ جو بہت جلد حقیقت بن گئی یہ تھی کہ بہاولپور کے سابق وزیراعظم نواب مشتاق احمد گورمانی امور کشمیر کے وزیر بن کر راولپنڈی تشریف لا رہے ہیں۔

جولائی ۱۹۴۸ء میں "اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہندوستان و پاکستان" (United Nations Commission for India and Pakistan - UNCIP) کراچی پہنچا اور اس نے بھارت، پاکستان، مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے قائدین سے رابطہ قائم کر کے مسئلہ کشمیر کا کوئی قابل قبول حل تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک روز اس کمیشن کو آزاد کشمیر حکومت کی جانب سے منگلا کے مقام پر لنچ کی دعوت دی گئی۔ کمیشن کے دو رکن امریکہ کے مسٹر ہڈل۔ اور بلجیم کے مسٹر جریف سفیروں کا درجہ رکھتے تھے۔ میری یہ ڈیوٹی لگی کہ مشایعت کی غرض سے راولپنڈی سے منگلا تک موٹر کے سفر کے دوران میں ان کے ہمرکاب رہوں۔ میں اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ دونوں پیچھے بیٹھے۔ وہ چند روز قبل نئی دہلی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ پٹیل سے مل کر آئے تھے۔ دو ڈھائی گھنٹہ کے اس سفر کے دوران وہ مسلسل ان ملاقاتوں پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ میں بھی آگے بیٹھا کان لگا کر ان کی باتیں سنتا رہا۔ ان کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ بھارتی قیادت نے چکنی چپڑی باتیں کر کے ان دونوں کو کسی طرح سے یہ باور کرایا ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں ہندوستانی فوج صرف دفاعی غرض و غایت سے بیٹھی ہے اور آزاد کشمیر میں پاکستانی اور آزاد افواج کا واحد مقصد جارحیت اور ملک گیری ہے۔ چنانچہ کمیشن کا اولین فرض یہ ہے کہ سب سے پہلے پاکستانی فوج کو آزاد کشمیر سے مکمل طور پر باہر نکالا جائے اور ساتھ ہی ساتھ آزاد مجاہدین کو بھی پوری طرح نہتا کر دیا جائے۔ اب کمیشن کے یہ دونوں مدبر اراکین موٹرکار میں بیٹھے ہوئے سر سے سر جوڑ کر ہندوستان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے عملی تدابیر و وسائل پر انتہائی سنجیدگی سے غور و خوض کر رہے تھے۔ مجھے ان فریب خوردہ سفیروں کے ارادوں سے خطرے کی بو آئی۔ منگلا پہنچتے ہی میں نے ایک مختصر سی رپورٹ تیار کی۔ جسے ایک مقامی فوجی کیمپ کے ذرائع رسل و رسائل سے فوراً چوہدری محمد علی کو بھیج دی۔ ساتھ ہی ایک نقل میں نے وزیراعظم لیاقت علی

خان کے نام بھی ارسال کر دی۔ وہ کشمیر لبریشن کمیٹی کے صدر تھے اور ہر ماہ راولپنڈی تشریف لا کر اس کمیٹی کی میٹنگ کیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے مجھے ان تک براہ راست رسائی حاصل تھی۔ اپنی رپورٹ کی تیسری نقل میں نے جسٹس دین محمد کی خدمت میں پیش کر دی جو اس کمیٹی کے اہم رکن تھے اور بعد میں اس کے صدر بھی رہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میری اس رپورٹ پر کسی نے کوئی دھیان دیا یا نہیں۔ البتہ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ ادھر کمیشن (UNICIP) نے ہمیں اپنے ساتھ مذاکرات میں الجھایا ہوا تھا' دوسری جانب بھارت نے اچانک ایک شدید حملہ کر کے وادی مینڈھر ہمارے قبضہ سے چھین لی اور راجوری اور پونچھ شہر کو آپس میں منسلک کر لیا۔ پونچھ شہر کا محاصرہ جو تقریباً سال بھر سے جاری تھا' ٹوٹ گیا اور وادی مینڈھر اور دوسرے مفتوحہ علاقوں سے دو لاکھ سے اوپر مہاجرین اپنے ہلکے ہلکے سامان کی گٹھڑیاں سروں پر اٹھائے' دشوار گزار پہاڑی راستوں کو پاپیادہ طے کرتے ہوئے پاکستان روانہ ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں' عورتوں اور بوڑھے مہاجرین کے اس قافلے کو بھی انڈین ایئر فورس کے جہازوں نے جگہ جگہ اور بار بار اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد بھارت نے لداخ کے محاذ پر ایک اور شدید حملہ کر کے ہمیں دراس اور کرگل سے نکال کر اسکردو تک دھکیل دیا۔ اس طرح لداخ تحصیل کا اپنے صدر مقام لیہہ کے ساتھ رابطہ قائم ہو گیا اور جموں سے لیہہ تک پورا راستہ بھارت کے قبضہ اختیار میں آ گیا۔

یو۔ این۔ کمیشن کے ساتھ صلح صفائی کی گفت و شنید کے دوران بھارت کے ان جارحانہ فوجی پیش قدمیوں اور کامیابیوں نے سارے آزاد کشمیر میں خوف و ہراس اور مایوسی کی لہر دوڑا دی۔ آزاد مجاہدین نے آزاد کشمیر میں موجود فوجی کمانڈروں کے ساتھ مل کر بھارت کے مزید جارحانہ عزائم کی روک تھام کے لیے کئی دور رس منصوبے بنائے۔ پہلے انہوں نے محاذ پر آگے بڑھ کر کئی ایسے مقامات پر قبضہ جما لیا جہاں سے اکھنور اور بیری پتن

میں دشمن کی نقل و حرکت صاف نظر آتی تھی۔ ان حرکات و سکنات سے عیاں ہوتا تھا کہ بھارت بھمبر پر حملہ کرنے کی بھرپور تیاریاں کر رہا ہے۔ ہندوستان کے ان ناپاک عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے ہماری افواج نے اکھنور اور نوشہرہ کے درمیان فوجی رسل و رسائل کی سڑک کو کاٹنے اور مناورتوی کے مغرب میں خاص طور پر چھمب پر حملہ کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! خدا جانے اس منصوبے کی بھنک ہندوستان کے کان میں پڑ گئی' یا اس کا علم یو۔ این۔ او کمیشن والوں کو ہو گیا کہ دسمبر کے دوسرے نصف میں کراچی سے اچانک چوہدری غلام عباس اور سردار ابراہیم کو بلاوا آ گیا۔ میں بھی ان کے ہمراہ کراچی گیا۔ وہاں پر وزیراعظم لیاقت علی خاں کے ہاں ایک ہنگامی میٹنگ تھی' جس میں وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خاں بھی موجود تھے۔ میں خود تو اس میٹنگ میں موجود نہ تھا' لیکن بعدازاں اس کا احوال چوہدری غلام عباس کی زبانی سنا۔ دونوں کشمیری لیڈروں کو حکومت پاکستان کے اس فیصلے سے آگاہ کیا گیا کہ کشمیر میں جنگ بندی کی تجویز مان لی گئی ہے اور سیز فائر کے احکامات یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے نافذ ہو جائیں گے۔ یہ فیصلہ کشمیری لیڈروں سے مشورہ کئے بغیر اور ان کو اعتماد میں لیے بغیر ہی کر لیا گیا تھا۔ غالباً دونوں لیڈر چھمب پر حملے کی تیاریوں سے کسی قدر آگاہ تھے۔ اس لیے چوہدری غلام عباس نے دریافت کیا کہ اس خاص موقع پر جنگ بندی کا فیصلہ تسلیم کرنے میں کونسی خاص وجوہات یا مصلحتیں ہیں؟ اس موضوع پر چوہدری غلام عباس اور چوہدری ظفر اللہ خاں میں خاصی گرماگرم بحث شروع ہو گئی' بلکہ تلخ کلامی تک نوبت آ گئی۔ لیکن فیصلہ اپنی جگہ برقرار رہا اور دونوں کشمیری قائدین اپنا سا منہ لے کر کراچی سے واپس آ گئے۔

وہ دن اور آج کا دن۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے مسئلہ کشمیر یو۔ این۔ او کی قدیمی دستاویزوں کے محافظ خانے میں سال بہ سال جمع ہو کر متعفن ہوتا گیا۔ پھر ۱۹۶۶ء میں اسے معاہدہ تاشقند کے تابوت میں ٹھونس دیا گیا۔ چھ برس بعد معاہدہ شملہ نے اس تابوت میں غالباً

آخری کیل بھی گاڑ دی۔ اسے آخری کیل کا نام میں نے اس لیے دیا ہے کہ ہندوستان اتنا نازک مزاج ہو گیا کہ مسئلہ کشمیر کی مکھی اب اپنی ناک پر بیٹھنے نہیں دیتا۔ اگر ہم کسی بین الاقوامی فورم پر مسئلہ کشمیر کا ذکر تک کر بیٹھیں تو بھارت کو پاکستان کی سرحدوں پر جنگ کے بادل منڈلاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کشمیر کا نام لینا ہندوستان کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کے مترادف ہو گیا ہے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

جنگ بند ہوتے ہی ہم نے حکومت آزاد کشمیر کا ہیڈ کوارٹر جنجال ہل (تراڑ کھیل) سے مظفر آباد منتقل کر لیا۔ کچھ دفاتر پرانی ضلع کچہری کے چند ٹوٹے پھوٹے کمروں میں سما گئے۔ باقی دفتروں کے لیے اسی عمارت کے احاطے میں بہت سے خیمے نصب ہو گئے۔ قریب ہی ایک ٹیلے پر سرکاری ملازموں کے لیے خیموں کی ایک رہائشی کالونی بھی وجود میں آ گئی۔ ان سب کے لیے ایک مشترکہ باورچی خانہ تھا اور سب کے لیے کھانے کا ایک بڑے خیمہ میں مشترکہ بندوبست تھا۔

مظفر آباد آ کر امن و امان کی فضا میں سانس لیتے ہی ہمیں پہلی بار آزاد کشمیر میں ٹیلیفون کی ضرورت کا احساس دامن گیر ہوا۔ میں نے مری آ کر مقامی پوسٹ آفس سے ٹرنک کال کر کے سردار عبدالرب نشتر کی خدمت میں آزاد کشمیر کی اس ضرورت کے متعلق گذارش کی تو چند روز بعد وہ مرکزی محکمہ ٹیلیفون کے چند بڑے افسران کرام کو ہمراہ لے کر خود ہی مظفر آباد تشریف لے آئے۔ یہاں پر انہوں نے حالات کا جائزہ لے کر مظفر آباد کے علاوہ آزاد کشمیر کے دوسرے اہم مقامات پر بھی ٹیلیفون کا نہایت اچھا نظام رائج کرنے کے خصوصی احکام جاری کر دیئے۔ نشتر صاحب پاکستان کے پہلے مرکزی وزیر تھے جنہوں نے آزاد کشمیر میں قدم رنجا فرمایا تھا۔

جنگ بندی کا اعلان ہوتے ہی مرکزی وزرائے کرام نے جان کی امان پائی اور جوق در جوق اپنے ورد مسعود سے آزاد کشمیر کی سرزمین کو سرفراز فرمانے لگے۔ دو وزیروں کا

دورہ خاص طور پر میرے دل پر نقش ہے۔ ان کی آمد پر دو میل کے پاس کئی سو افراد ان کے والہانہ استقبال کے لیے پل کے قریب جمع ہو گئے۔ دونوں وزیر کار سے نیچے اتر کر کچھ لوگوں سے ہاتھ ملانے لگے' تو ایک چھوٹے موٹے جلسہ عام کی سی صورت پیدا ہو گئی۔ مسلم کانفرنس کے چند کارکنوں نے بڑی جوشیلی استقبالی تقریریں کیں۔ سامعین میں سے ایک بزرگ صورت شخص نے اٹھ کر رقت بھری آواز میں کہا: جناب پاکستان ایک عظیم ملک ہے۔ آزاد کشمیر تھوڑا سا علاقہ ہے۔ آپ اس علاقے کو لیبارٹری اور ہم لوگوں کو تجرباتی چوہوں کی طرح استعمال میں لائیں۔ اسلامی احکامات اور قوانین کو پہلے یہاں آزمائیں اور پھر اس تجربہ کی روشنی میں انہیں پاکستان میں نافذ کرنے کا سوچیں۔

اس بوڑھے کی یہ بات سن کر سارا مجمع سناٹے میں آ گیا۔ پھر اچانک دونوں میں سے ایک وزیر باتدبیر' جوش و خروش سے اٹھ کر فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے لگے۔ جوش خطابت میں انہوں نے کوٹ کی جیب سے ایک لاکٹ نما سی چیز نکال کر مجمع کے سامنے لہرائی اور بولے: بھائیو' آپ اور ہم کس کھیت کی مولی ہیں کہ اللہ کے قانون کو آزما آزما کر تجربہ کریں۔ یہ دیکھو یہ اللہ کا قانون ہے جو چودہ سو برس پہلے نافذ ہو چکا ہے اور جس پر عمل کرنا ہم سب کا دینی' اخلاقی اور ایمانی فرض ہے......." وزیر صاحب کی تقریر میں اسلامی جذبات ایسی شدت سے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے کہ سامعین میں سے چند رقیق القلب لوگ بے اختیار رو پڑے۔

واپسی پر احتراماً میں ان دو وزیرو صاحبان کو کوہالہ کے پل تک چھوڑنے کے لیے ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ ایک وزیر نے دوسرے وزیر کی شاندار تقریر پر تحسین و آفریں کے ڈونگرے برسانے کے بعد پوچھا: "بھائی صاحب' آپ کے پاس قرآن شریف کا لاکٹ بڑا خوبصورت ہے' یہ تاج کمپنی کا بنا ہوا ہے یا کسی اور کا؟"

دوسرے وزیر صاحب کھلکھلا کر ہنسے اور لاکٹ جیب سے نکال کر بولے۔ "ارے کہاں بھائی صاحب' یہ تو محض سگریٹ لائٹر ہے!"

وزیروں کی یہ جوڑی ملک غلام محمد اور نواب مشتاق احمد گورمانی پر مشتمل تھی۔

سیکرٹری جنرل کے طور پر میں نے آزاد کشمیر کا پہلا بجٹ بنایا۔ آمدنی کا تخمینہ پچاس ساٹھ ہزار روپے کے قریب تھا اور اخراجات کا اندازہ دو لاکھ روپے کے لگ بھگ تھا۔ حکومت پاکستان سے ایک لاکھ تیس ہزار روپے کی امداد حاصل کرنے کے لیے میں اپنا بجٹ لے کر کراچی میں حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل چوہدری محمد ولی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلے تو انہوں نے مجھے اس بات پر ڈانٹا کہ میں نے اپنے عہدے کا نام چیف سیکرٹری کی بجائے سیکرٹری جنرل کیوں رکھ چھوڑا ہے؟ میں نے معافی مانگ کر گزارش کی کہ اب تو یہ غلطی ہو گئی ہے۔ فوری طور پر کوئی تبدیلی کرنا مناسب نہیں۔ میرے بعد بے شک اس اسامی کا نام چیف سیکرٹری رکھ دیا جائے۔ چنانچہ اب یہ عہدہ اسی نام سے موسوم ہے۔

میرے بنائے ہوئے بجٹ پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر چوہدری صاحب نے کاغذوں کا پلندہ میز پر دے مارا اور کسی قدر ترشی سے بولے۔ "ایک لاکھ تیس ہزار روپے کی رقم پاکستان کے درختوں پر نہیں اگتی۔ تمہارا فرض ہے کہ تم مقامی وسائل کو کام میں لا کر اپنے بجٹ کی ضروریات پوری کرو۔"

جنگ کی وجہ سے مقامی طور پر غیر معمولی دشواریاں کا رونا رو کر میں نے مزید منت سماجت کی' تو چوہدری صاحب کسی قدر پسیجے اور انہوں نے بڑی مشکل سے مبلغ نوے ہزار روپے کی امداد منظور کی۔ یہ منظوری لے کر میں عبدلقادر صاحب کے پاس پہنچا جو اس زمانے میں وزارت فنانس میں غالبًا جائنٹ سیکرٹری تھے۔ بعد میں وہ پاکستان کے وزیر خزانہ بھی رہے۔ انہوں نے میرے سامنے راولپنڈی میں شجاعت علی صدیقی ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل کو ٹیلیفون کر دیا کہ وہ فلاں فنڈ سے آزاد کشمیر حکومت کو نوے ہزار روپے کی رقم ادا

کر دیں۔ آزاد کشمیر کے ساتھ لین دین کے معاملات میں صدیقی صاحب "محتسب" کہلاتے تھے۔

شجاعت علی صدیقی صاحب بھی مرد مومن کی ایک جیتی جاگتی اور پر اثر تصویر تھے۔ مسجدیں تعمیر کرنا اور انہیں بنا سنوار کر آباد رکھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ میں جتنی بار ان سے ملنے کے دفتر یا گھر گیا ہوں' تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ نماز کا وقت آنے پر وہ وہیں پر باجماعت نماز کا اہتمام کر لیتے تھے۔ ان کا رہن سہن انتہائی سادہ اور ظاہر و باطن شیشے کی طرح صاف اور شفاف تھا۔ سنا ہے کہ راولپنڈی میں سیٹلائٹ ٹاؤن قائم کرنے کا منصوبہ انہی کے ذہن رسا کی اختراع تھا۔

آزاد کشمیر میں ضلع کی سطح پر کام سنبھالنے کے لیے ہم نے پنجاب گورنمنٹ سے چند پی۔ سی۔ ایس افسر ڈیپوٹیشن پر بھی لیے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کا نام کیپٹن میاں محمد سعید تھا۔ ۱۹۵۲ء کے دوران جب میں جھنگ کا ڈپٹی کمشنر تھا' تو حسن اتفاق سے یہ بھی ضلع میں متعین تھے۔ ۱۹۴۸ء میں پہلی بار آزاد کشمیر میں میرے ان کے ساتھ نہایت خوشگوار تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ میاں صاحب بے حد صاف گو' بے باک محنتی اور دیانت دار افسر تھے۔ ایک بار انہیں راولپنڈی سے پچاس ہزار روپے کی رقم دے کر تنخواہیں تقسیم کرنے کے لیے پلندری بھیجا گیا۔ سڑک بھی خراب تھی اور بارش بھی موسلا دھار برس رہی تھی۔ آزاد کشمیر کے علاقے میں جیپ پھسل کر ایک گہری کھڈ میں جا گری۔ میاں سعید کے نہاتی شدید زخم آئے اور بہت سی ہڈیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ اپنی تکلیف بھلا کر انہوں نے پچاس ہزار روپے کی رقم کا بیگ اپنی بغل میں دبایا اور اس کی حفاظت کرنے کے لیے مستعد ہو کر بیٹھ گئے۔ حادثہ کی خبر سن کر آس پاس کے بہت سے دیہاتی بھی جائے وقوعہ پر جمع ہو گئے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ شدید زخموں کے باوجود میاں صاحب سرکاری رقم کی حفاظت کی وجہ سے پریشان ہیں تو سب نے مل کر بہ یک آواز درخواست کی کہ وہ آرام سے لیٹ جائیں۔ یہ رقم بیت المال

کی امانت ہے۔ اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ کئی گھنٹوں کے بعد جب ایک امدادی ٹیم وہاں پہنچی تو میاں صاحب زخموں کی تاب نہ لا کر نڈھال ہو چکے تھے اور سرکاری رقم دیہاتیوں کی حفاظت میں جوں کی توں موجود تھی۔

جس مقام پر اب منگلا ڈیم واقع ہے' وہاں پر پہلے میر پور کا پرانا شہر آباد تھا۔ جنگ کے دوران اس شہر کا بیشتر حصہ ملبے کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ ایک روز میں ایک مقامی افسر کو اپنی جیپ میں بٹھائے اس کے گرد و نواح میں گھوم رہا تھا۔ راستے میں ایک مفلوک الحال بوڑھا اور اس کی بیوی ایک گدھے کو ہانکتے ہوئے سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ دونوں کے کپڑے میلے کچیلے اور پھٹے پرانے تھے۔ دونوں کے جوتے بھی ٹوٹے پھوٹے تھے۔ انہوں نے اشارے سے ہماری جیپ کو روک کر دریافت کیا۔ "بیت المال کس طرف ہے؟" آزاد کشمیر میں سرکاری خزانے کو بیت المال ہی کہا جاتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "بیت المال میں تمہارا کیا کام ہے؟"

بوڑھے نے سادگی سے جواب دیا۔ "میں نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر میر پور شہر کے ملبے کو کرید کرید کر سونے اور چاندی کے زیورات کی دو بوریاں جمع کی ہیں۔ اب انہیں اس کھوتی پر لاد کر ہم بیت المال میں جمع کروانے جا رہے ہیں۔"

ہم نے ان کا گدھا ایک پولیس کانسٹیبل کی حفاظت میں چھوڑا اور بوریوں کو جیپ میں رکھ کر دونوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیا تاکہ انہیں بیت المال لے جائیں۔

آج بھی جب وہ نحیف و نزار اور مفلوک الحال جوڑا مجھے یاد آتا ہے تو میرا سر شرمندگی اور ندامت سے جھک جاتا ہے کہ جیپ کے اندر میں ان دونوں کے برابر کیوں بیٹھا رہا۔ مجھے تو چاہیے تھا کہ میں ان کے گرد آلود پاؤں اپنی آنکھوں اور سر پر رکھ کر بیٹھوں۔ ایسے پاکیزہ سیرت لوگ پھر کہاں ملتے ہیں؟

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر!

یو این کمیشن کے ایک سب کمیشن نے "مقبوضہ کشمیر" اور "آزاد کشمیر" میں نظم و نسق

کی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے دونوں علاقوں کے تفصیلی دورے کئے تھے۔ سب کمیشن کا ایک رکن مسٹر رچرڈ سائمنڈز تھا' جو ۱۹۴۳ء میں قحط بنگال' سیلاب اور سائیکلون کی تباہ کاریوں کے بعد فرینڈز ایمبولینس یونٹ (friends Ambulance Unit) کی جانب سے تملوک میں میرے ساتھ کام کر چکا تھا۔ اس وجہ سے ہماری آپس میں تھوڑی سی بے تکلفی تھی۔ یہ وہی مسٹر سائمنڈز ہیں جو Making of Pakistan کے مصنف بھی ہیں۔ پاکستان پر انگریزی میں یہ اگر پہلی نہیں تو اولین چند کتابوں میں سے ایک ضرور ہے۔

آزاد کشمیر کے نظم و نسق میں ہمارے پاس کوئی ایسی خاص بات نہ تھی جو ہم بڑھا چڑھا کر سب کمیشن کے سامنے نمائش کے طور پر پیش کر سکتے۔ ہماری ایڈمنسٹریشن سادہ تھی۔ افسر دیانت دار اور محنتی تھے۔ لوگ جہاد کے جذبہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ دشمن کے حق میں شمشیر بے نیام اور آپس میں ہمدرد اور غمخوار تھے۔ مقبوضہ کشمیر سے واپسی کے بعد ایک بار مسٹر سائمنڈز نے مجھے اعتماد میں لے کر کہا' اس جانب رقبہ زیادہ' وسائل بے شمار اور ہندوستان کی سول اور فوجی پشت پناہی بے حساب ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں کے بیشتر امور میں زور اور زبردستی' دھونس اور دھاندلی' بے صبری' بے ایمانی اور نمائشی ملمع کاری کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ فرق اپنی رپورٹ میں واضح طور پر بیان کریں گے؟ وہ ہنس کر ٹال گئے اور بولے "ہمارا مقصد فرق نمایاں کرنا نہیں بلکہ پلڑا برابر رکھنے کی کوشش کرنا ہے!"

جنگ بندی کے بعد بہت جلد آزاد کشمیر سے میرا جی بھر گیا۔ اسی زمانے میں راولپنڈی میں وزارت امور کشمیر نئی نئی قائم ہوئی تھی اور نواب مشتاق احمد گورمانی اس کے وزیر انچارج تھے۔ وزارت کا دفتر ضلع کچہری کے مقابل ایک متروکہ عمارت "شہزادہ کوٹھی" میں کھولا گیا تھا۔ گورمانی صاحب کی رہائش اس شاندار بلڈنگ میں تھی جسے چوہدری فضل الہٰی کے زمانے میں ایوان صدر کے طور پر استعمال میں لایا گیا تھا۔ آزاد کشمیر سے مجھے کسی قدر

اکتایا ہوا دیکھ کر چوہدری محمد علی نے مجھے ڈپٹی سیکرٹری کے طور پر وزارت امور کشمیر میں متعین کر دیا۔

اس زمانے میں گورمانی صاحب کی بہت سی ادائیں نرالی تھیں۔ وہ رات بھر جاگ کر اپنا دربار لگاتے اور دن بھر سوتے تھے۔ ان کے اس لائحہ عمل کی پابندی نبھانا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے وہ میرے ساتھ ہمیشہ ناخوش ہی رہتے تھے۔

مسئلہ کشمیر کے حوالے سے گورمانی صاحب کے ہاتھ میں کوئی ایسا کام نہ تھا جس میں وہ اپنی مثبت صلاحیتوں کو بروائے کار لا سکتے۔ چنانچہ ان کی توجہ کا سارا نزلہ بچارے آزاد کشمیر پر ہی گرا۔ یہاں پر ان کی حکمت عملی اور ریشہ دوانیوں نے آزاد کشمیر کی قیادت میں ایسے ایسے تفرقے ڈالے جو آج تک رفو نہیں ہو سکے۔ رفتہ رفتہ منسٹری آف کشمیر افئیرز Ministry of Kashmir Affairs کی بابت یہ پھبتی زبان زد خاص و عام ہو گئی کہ اس کے دائرہ عمل سے کشمیر تو غائب ہو گیا ہے اور اب اس کے پاس فقط Affairs ہی Affairs رہ گئے ہیں!

ایک بار سری پرتاب کالج سرینگر کا ایک بی ایس۔سی کا طلب علم ہندوستان کے غاصبانہ قبضہ کی گھٹن سے تنگ آ کر آزادی کا سانس لینے پاپیادہ گرتا پڑتا سیز فائر لائن عبور کر کے پاکستان آ پہنچا۔ راولپنڈی پہنچ کر وہ مجھے ملا اور اپنی دلی خواہش یہ بیان کی کہ وہ آزاد پاکستان کے کسی وزیر سے مل کر اس کی زیادرت کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کوشش کر کے گورمانی صاحب کے ساتھ اس کی ملاقات کی منظوری حاصل کر لی۔ ملاقات کا وقت رات کے ڈیڑھ بجے مقرر ہوا۔ جون کا مہینہ تھا۔ آدھی رات گئے بھی شدید گرمی تھی۔ میں اس لڑکے کو ساتھ لے کر مقررہ وقت پر گورمانی صاحب کی شاندار قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ گورمانی صاحب کے کمرے میں کئی ٹن کا ائیرکنڈیشنر چل رہا تھا۔ وہ گلے میں ایک سرخ ریشم ک اسکارف باندھے اور جسم پر ایک پشمینے کی چادر لپیٹے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ان کا محبوب حقہ پڑا تھا' جس کے خوشبودار تمبا کو

کی مہک سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ کشمیری لڑکے کو دیکھتے ہی گورمانی صاحب کا مزاج برہم ہو گیا اور انہوں نے اس پر پے در پے اس قسم کے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی: تم سرینگر چھوڑ کر کیوں آئے ہو؟ تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے اور کس مقصد کے لیے بھیجا ہے؟ واپس کب جاؤ گے؟ کیسے جاؤ گے؟ اور یہاں سے کیا لے کر جاؤ گے؟ وغیرہ وغیرہ۔

یہ غیر متوقع سوالات سن کر بیچارا لڑکا بوکھلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور اس نے صرف اتنا وجاب دیا کہ وہ صرف آزاد فضا میں سانس لینے یہاں آیا ہے۔ اب واپس جانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں۔

یہ سن کر گورمانی صاحب کو پھر تاؤ آ گیا اور کسی قدر درشتی سے بولے۔ "پاکستان میں مہاجرین کی پہلے ہی کوئی کمی نہیں۔ خدا کا خوف کرو۔ یہ نوزائیدہ مملکت اس سیلاب کو کیسے سنبھالے گی؟"

اس کے بعد انہوں نے مہاجرین کی تکالیف اور مشکلات پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور انگریزی میں لڑکے کو مخاطب کر کے کہا:

"Now that You have come, do‘nt expect luxuries. All of us have to rough it out here."

یہ سن کر لڑکے کی رگ ظرافت بھی پھڑک اٹھی اور اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

"Sir, If this room is roughing it out here, I am all for it!"

اس پر میں لڑکے کا بازو کھینچ کر اسے باہر لے آیا۔ ورنہ طیش میں آ کر گورمانی صاحب نہ جانے اس کا کیا حشر کرتے۔

گرمی کی چھٹیوں کے بعد جب کالج کھلے' تو میری درخواست پر اسے لاہور کے کنگ ایڈورڈ کالج میں داخلہ مل گیا۔ آزاد کشمیر حکومت نے اسے وظیفہ دے دیا۔ لڑکا قابل تھا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے انگلستان چلا گیا اور آجکل ایک کامیاب اور خوشحال ڈاکٹر کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

چند ماہ بعد وزیراعظم لیاقت علی خاں کشمیر لبریشن کمیٹی کی صدارت کرنے راولپنڈی تشریف لائے۔ میٹنگ ختم ہونے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے پاس روک لیا۔ جب وہ اکیلے رہ گئے تو فرمایا۔ "تمہارے وزیر گورمانی صاحب تم سے اس قدر ناخوش کیوں رہتے ہیں؟"

میں نے عرض کیا۔ "سر' میرے خیال میں اس کی شدید دو وجوہات ہوں گی۔ ایک تو وہ رات کو کام کرتے اور دن میں سوتے ہیں۔ اس پروگرام میں ان کا ساتھ دینے سے میں بار بار چوک جاتا ہوں۔ دوسری وجہ شاید یہ ہو کہ وہ آزاد کشمیر کے سیاسی لیڈروں کو آپس میں لڑاتے بھڑاتے رہتے ہیں۔ اس کاروائی میں میری روک ٹوک غالباً انہیں پسند نہیں آتی۔"

وزیراعظم کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر اچانک انگریزی میں پوچھا۔

Tell me, is Gurmani Straight?

میں نے فوراً جواب دیا "No, Sir. He is not straight."

وزیراعظم نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ پھر آہستہ آہستہ دھواں چھوڑتے ہوئے سنجیدگی سے بولے:

"I do not agree with you. He is as straight as a crokscrew!"

اس گفتگو کے چند ہفتہ بعد میرا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ جہاں پر مجھے وزارت اطلاعات و نشریات میں فارن پبلسٹی کا انچارج ڈپٹی سیکرٹری لگا دیا گیا۔

○○○

• صلہ شہید

جب میری پوسٹنگ کراچی میں وزارت اطلاعات و نشریات کے ڈپٹی سیکرٹری کے طور پر ہوئی تو آزاد کشمیر کی کھلی فضا کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک پنجرے میں بند

ہو گیا ہوں۔

خواجہ شہاب الدین صاحب وزیر تھے۔ مسٹر جی' احمد سیکرٹری اور شیخ محمد اکرام صاحب جائنٹ سیکرٹری تھے۔ اکرام صاحب بڑے عالم فاضل' شریف الطبع اور نیک دل انسان تھے۔ مسٹر جی' احمد بھی پڑھے لکھے آدمی تھے اور ان کے پاس کتابوں کا بڑا عمدہ ذخیرہ تھا۔ ان کا تعلق پولیس سروس سے تھا' اور Intelligence کے کام میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ طبعاً وہ اپنے زیردستوں سے کھنچے کھنچے اور زبردستوں کے سامنے جھکے جھکے رہتے تھے۔ جو فائل اوپر منسٹر یا پرائم منسٹر تک جاتی ہو' اس کی نوک پلک سنوارنے میں وہ خاص محنت کرتے تھے۔ نیچے کی سطح کی فائلوں پر ٹھیٹ پولیس آفیسر کی طرح فقط احکامات صادر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو کسی قدر شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا بھی ان کا شیوہ تھا۔ البتہ سفید فام غیر ملکیوں کی طرف عموماً اور امریکنوں کی طرف خصوصاً ان کا دل بڑے خضوع و خشوع سے فرش راہ رہتا تھا۔

ایک روز مسٹر جی۔ احمد نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ ان کے پاس ایک ادھیڑ عمر کا موٹا سا امریکن بیٹھا تھا۔ مسٹر جی۔ احمد نے کہا کہ یہ ہمارے ایک معزز مہمان ہیں۔ میں انہیں سٹاف کار میں اپنے ساتھ لے جا کر کراچی شہر کی سیر کرا لاؤں۔

کار میں بیٹھ کر میں نے یونہی اخلاقاً اس کا اسم شریف دریافت کیا' تو وہ بگڑ گیا' اور بڑی تیزی سے بولا۔ "تمہیں میرے نام سے کیا واسطہ؟"

"اس سے گفتگو میں آسانی ہو گی۔" میں نے وضاحت کی۔

"گفتگو کون کرنا چاہتا ہے؟" امریکن نے غصے سے کہا۔ "خیر' تمہیں اتنا ہی اصرار ہے'

تو مجھے ہنری کہہ کر پکار سکتے ہو۔"
کچھ دیر خاموشی کے بعد میں نے دوسری غلطی یہ کی' کہ اس سے پوچھ بیٹھا' "کیا آپ صحافی ہیں؟" "مائینڈ یور اون بزنس" ہنری نے چڑ کر کہا۔
اس کے بعد ہم دونوں لب بستہ ہو کر بیٹھ گئے۔ ہنری کے اشارے پر ہماری کار پہلے امریکی سفارت خانے گئی۔ مجھے کار میں چھوڑ کر وہ اندر چلا گیا اور کوئی ایک گھنٹہ کے بعد واپس آیا۔ اب اس کے ساتھ ایک اور امریکی بھی تھا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور مجھے اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے کا حکم دیا۔ دوسرا امریکن غالباً سفارت خانے میں کام کرتا تھا کیونکہ وہ کراچی شہر سے بخوبی واقف تھا۔ اس کی ہدایات پر ڈرائیور نے ہمیں کلفٹن' کیماڑی' بندر روڈ' ہاکس بے اور سینڈزپٹ کی سیر کرائی۔ میری موجودگی کو یکسر نظر انداز کر کے دونوں امریکی آپس میں مزے مزے کی خوش گپیاں کرتے رہے۔ ان کی گفتگو سے صرف ایک کام کی بات میرے پلے پڑی' وہ یہ کہ امریکہ پاکستان کو گندم کی امداد دے رہا ہے۔ جب یہ گندم کراچی پہنچے گی تو جن اونٹ گاڑیوں پر لاد کر بندرگاہ سے نکالی جائے گی' ان اونٹوں کے گلے میں "تھینک یو امیرکہ" کی تختیاں آویزاں کی جائیں گی۔
یہ احمقانہ تجویز سن کر مجھے غصہ بھی آیا' رنج بھی ہوا' شرم بھی آئی۔ اس وقت تو میں چپ رہا لیکن اگلے روز سیدھا مسٹر جی۔ احمد کے پاس جا کر انہیں ساری رئیداد سنا ڈالی۔ جب میں نے اونٹوں کے گلے میں شکریے کی تختیاں لٹکانے کا مذاق اڑایا تو مسٹر جی۔ احمد یکایک سنجیدہ ہو گئے اور گرجدار آواز میں بولے۔ "تمہیں اس میں کیا ہرج نظر آتا ہے؟"
میں نے اس تجویز کے خلاف ایک چھوٹی سی جذباتی سی تقریر کی تو مسٹر جی۔ احمد کے چہرے پر بناوٹی کھ ہنسی کا تبسم لہرایا اور انہوں نے طنزاً کہا' گندم مانگ کر کھانے میں تو کوئی برائی نہیں لیکن شکریہ ادا کرنے کا برا مناتے ہو۔"
"نہیں سر۔ ہم تو کوئی برا نہیں مناتے' لیکن شاید اونٹ برا مان جائیں۔" گرما گرمی کی

لپیٹ میں آ کر میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دے دیا۔

غالباً یہ بات مجھے اس طور پر نہیں کہنی چاہیے تھی۔ کیونکہ اس نے میری ذات کو مسٹر جی۔ احمد کے دماغ کے اس کابک میں بٹھا دیا جہاں پولیس والے ناپسندیدہ افراد کو رکھنے کے عادی ہیں۔ یوں بھی اس زمانے میں ماحول کا رنگ کچھ ایسا بنتا جا رہا تھا کہ امریکنوں کی کسی خفیف الحرکتی پر معمولی سا جائز اعتراض بھی بڑی آسانی سے غیر حب الوطنی کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا تھا۔

ایک روز میری ڈیوٹی لگی کہ میں امریکی صحافیوں کے ایک گروپ کے ساتھ مغربی پاکستان کے دورے پر جاؤں۔ دورہ بڑا کامیاب رہا۔ ہم لاہور' راولپنڈی پشاور اور طورخم تک گئے۔ ہر جگہ مقامی حکام نے بڑی خاطر مدارت کی۔ صحافی بڑے خوش خوش واپس آئے۔ کراچی پہنچ کر گروپ کے لیڈر نے مجھے ایک سو ڈالر کا نوٹ پیش کیا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ یہ میرا "ٹپ" ہے۔ میں نے شکریہ کے ساتھ نوٹ واپس کر دیا اور کہا کہ "ٹپ" کے حقدار تو ہوٹلوں کے بیرے اور خدمت گار ہوتے ہیں۔ ایک سرکاری ملازم کو "ٹپ" کی پیشکش کرنا اس کے لیے عزت کا باعث نہیں۔ گروپ کے لیڈر نے کسی قدر جھینپ کر نوٹ واپس لے لیا۔ چند روز بعد جب میں انہیں الوداع کہنے ایئرپورٹ گیا' تو انتظار گاہ میں بیٹھ کر گروپ لیڈر نے اس مسئلہ پر میرے ساتھ کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی۔ اس نے بتایا کہ اب اس نے "ٹپ" "بخشش" اور "نذرانہ" کے فلسفہ کو بخوبی سمجھ لیا ہے۔ "ٹپ" بیروں اور خدمتگاروں کو دیا جاتا ہے۔ "بخشش" بھک منگوں کے لیے مخصوص ہے' اور "نذرانہ" سرکاری ملازمین کا حق ہے۔ اس نے بتایا کہ دو تین حضرات تو ان سے مانگ مانگ کر کچھ نذرانہ وصول کر چکے ہیں۔ ایک صاحب نے تو اپنی کسی احتیاج کا رونا رو کر ان پر پانچ سو ڈالر کے "نذرانہ" کا تاوان لگایا۔ لیکن کسی قدر مول تول کے بعد ایک سو ڈالر پر بڑی خیر سگالی سے معاملہ طے ہو گیا!

امریکہ کی مضبوط کرنسی کے ساتھ ہماری نئی نئی شناسائی بڑی تازہ دم تھی۔ ڈالر کی چکا چوند سے آنکھوں کا خیرہ ہونا تعجب کی بات نہیں۔ "ٹپ" "بخشش" اور "نذرانہ" کے

اسی تانے بانے نے بین الاقوامی ایڈ اور ٹریڈ کا وہ طلسماتی جال بنتا تھا' جس میں آج ہماری قوم کا بال بال کروڑوں نہیں بلکہ اربوں روپے کے قرضہ میں بڑی بے کسی سے بندھا ہوا ہے۔

ایک روز مسٹر جی احمد نے صبح سویرے مجھے گھر پر ٹیلیفون کیا کہ میں دفتر نہ آؤں بلکہ سیدھا ہوٹل میٹروپول چلا جاؤں۔ وہاں پر حکومت کے ایک نہایت معزز اور اہم مہمان مسٹر ہیکٹر بولیتھو ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں ان کے پاس جا کر ان کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھوں۔ ہوٹل کے کمرے میں ایک بڑھاپے اور فربہی کی طرف مائل صاحب کسی قدر جھنجلاہٹ کے عالم میں صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کے پاس ایک خوش صورت نوجوان بھی بیزار سا بیٹھا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کی خدمت گزاری کے لیے حاضر ہوا ہوں تو نوجوان نے فوراً کہا۔ ٹھیک ہے' تم جلدی سے ہمارے جوتے پالش کرا دو۔"

بیرے کو بلانے کے لیے میں گھنٹی بجانے کو اٹھا تو نوجوان نے بڑے غصے سے آواز بلند کر کے کہا۔ "گھنٹی تو ہم خود بھی بجا سکتے تھے۔ تمہارے آنے سے ہماری سہولت میں کیا اضافہ ہوا؟"

میں نے نہایت فرمانبرداری سے جوتے اٹھائے اور باہر آ کر بیرے کو دیئے کہ جلدی سے اچھی طرح پالش کر دے۔ جوتے پالش ہو گئے تو میں کمرے میں واپس آ کر دوبارہ بیٹھنے ہی لگا تھا کہ نوجوان نے پھر مجھے جھڑک دیا۔ "یہاں کیوں گھستے ہو؟ تمہارے یہاں بیٹھنے سے ہمارے کام میں ہرج ہوتا ہے۔ تمہیں بیٹھنا ہی ہے تو کہیں اور جا کر بیٹھو۔"

میں چپکے سے کان لپیٹ کر باہر آ گیا۔ برآمدے میں دیکھا کہ شیخ محمد اکرام صاحب بھی خراماں خراماں اسی کمرے کی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ حکومت پاکستان کی دعوت پر مسٹر ہیکٹر بولیتھو انگلستان سے تشریف لائے ہیں اور قائداعظم کی سوانح عمری لکھنے کا کام ان کے سپرد ہوا ہے۔ محترمہ مس فاطمہ جناح نے ان سے ملنے اور انہیں قائداعظم کے ذاتی کاغذات دکھانے سے انکار کر دیا ہے۔ اس لیے بولیتھو صاحب

کا مزاج برہم ہے۔ ہمیں ان کا "موڈ" خوشگوار رکھنے کی ہر ممکن تدبیر کرنا چاہیے۔

اس وقت تک میں نے مصنف کے طور پر مسٹر ہیکٹر بولیتھو کا نام سنا تک نہیں تھا۔ چند پڑھے لکھے دوستوں سے پوچھ گچھ کی' تو انہوں نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر انگریزی ادب کے ایک "Who is Who" کی ورق گردانی سے منکشف ہوا کہ موصوف سرکاری درباری قسم کے ادیب ہیں۔ چند غیر معروف ناولوں کے علاوہ انہوں نے زیادہ تر انگلستان کے شاہی خاندان کے افراد اور دیگر مختلف امرا اور روٴسا کی سوانح عمریاں تحریر کی ہیں۔

مسٹر ہیکٹر بولیتھو صف اول کے ادیب تو نہ تھے لیکن انہیں روایتی طرز کی سوانح نگاری پر اچھا خاصا عبور حاصل تھا۔ لیکن اس وقت بہت سے دوسروں کی طرح مجھے بھی اس انتخاب پر مایوسی ہوئی تھی۔ محترمہ مس فاطمہ جناح کو بھی غالباً یہی اعتراض تھا کہ قومی اہمیت کے اس کام کے لیے ایک غیر ملکی شخص کو کیوں چنا گیا ہے۔ لیکن ۱۹۵۴ء میں جب مسٹر بولیتھو کی کتاب لندن میں ایک معروف پبلشنگ ہاوٴس سے شائع ہوئی تو بے شک اس نے بیرون ملک پاکستان کو متعارف کرانے میں ضرور کسی قدر مدد دی۔"

محترمہ فاطمہ جناح کی اپنی خواہش یہی تھی کہ قائداعظم کی سوانح حیات کسی پاکستانی اہل قلم کے ہاتھوں مرتب ہو۔ پچھلے تیس بتیس برس میں کچھ کتابیں لکھی ضرور گئی ہیں۔ قائداعظم کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریب پر بھی بہت سی فرمائشی کتابیں معرض وجود میں آئیں۔ لیکن ابھی تک ایسی کوئی کتاب اردو' انگریزی یا کسی اور زبان میں شائع نہیں ہوئی جو اس عظیم رہنما کی سیرت' کردار اور سیاست کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتی ہو۔ قائداعظم اکیڈمی نے ایک مفصل اور مکمل سوانح حیات تیار کرنے کا منصوبہ بنا تو رکھا ہے۔ اب دیدہ باید کہ یہ بیل کب تک' کہاں تک اور کس طرح منڈھے چڑھتی ہے۔

مادر ملت کے ذاتی کاغذات میں البتہ ایک مسودہ ضرور موجود ہے' جس کا عنوان "Brother

"My" (میرا بھائی) ہے۔ اسے انہوں نے مسٹر جی الانا کے تعاون سے تحریر کیا تھا۔ قائداعظم کی زندگی کے چند گوشوں کا یہ ایک خوبصورت مرقع ہے۔ لیکن اب تک اس کا پورا متن غالباً کہیں شائع نہیں ہوا۔ قائداعظم کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کی تحریک ہوئی تھی لیکن یہ منصوبہ بھی بعض سیاسی "احتیاطوں" کی نذر ہو گیا۔ مشاہیر کے اقوال اور افعال سے اگر کسی قسم کے تنازعے کی صورت نکلتی ہو تو عصری لحاظ سے ایک محدود مدت تک انہیں صیغہ راز میں رکھنا قرین مصلحت ہے۔ لیکن تیس بتیس سال کی مدت بڑی طویل ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں متعلقہ مشاہیر تاریخ کی بے رحم بھٹی سے گزر کر اپنے اپنے مستند مقام پر مستحکم ہو چکے ہوتے ہیں۔ جزوی طور پر کسی ناخوشگوار تفصیل کا افشا ان کے اس مقام کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ یوں بھی آزاد دنیا میں بہت سی جگہ تیس برس کے بعد خفیہ دستاویزات تک کو عام کر دیا جاتا ہے۔

مادر ملت کے مسودہ "میرا بھائی" میں دو مقام ایسے آتے ہیں جن کی وجہ سے اس کی اشاعت میں پس و پیش ہوتا رہا ہے۔

پہلا واقعہ جولائی ۱۹۴۸ء کا ہے' جب قائداعظم علالت کی وجہ سے علاج اور آرام کے لیے زیارت میں تشریف رکھتے تھے۔ محترمہ مس فاطمہ جناح نے لکھا ہے کہ جولائی کے اخیر میں ایک روز وزیراعظم لیاقت علی خان اور سیکرٹری جنرل مسٹر محمد علی اچانک زیارت پہنچ گئے۔ ان کے آنے کی پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی۔ وزیراعظم نے ڈاکٹر الٰہی بخش سے پوچھا کہ قائداعظم کی صحت کے متعلق ان کی تشخیص کیا ہے؟ ڈاکٹر نے کہا کہ اسے مس فاطمہ جناح نے یہاں بلایا ہے' اس لیے وہ اپنے مریض کے متعلق کوئی بات صرف انہیں کو بتا سکتے ہیں۔

"لیکن وزیراعظم کی حیثیت سے میں قائداعظم کی صحت کے متعلق متفکر ہوں۔"

ڈاکٹر نے ادب سے جواب دیا۔ "جی ہاں' بے شک۔ لیکن میں اپنے مریض کی اجازت

کے بغیر کچھ نہیں بتا سکتا۔"

جب مس فاطمہ جناح نے قائداعظم کو وزیراعظم کی آمد کی اطلاع دی' تو وہ مسکرائے اور فرمایا۔ "تم جانتی ہو وہ کیوں آئے ہیں؟ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میری علالت کتنی شدید ہے۔ میں کتنا عرصہ زندہ رہ سکتا ہوں۔ تم نیچے جاؤ اور پرائم منسٹر سے کہہ دو کہ میں انہیں ابھی ملوں گا۔"

مس فاطمہ جناح نے کہا اب کافی دیر ہو گئی ہے۔ وہ کل صبح ان سے مل لیں۔

"نہیں۔" قائداعظم نے فرمایا۔ "انہیں ابھی آنے دو' اور بچشم خود دیکھ لینے دو۔"

وزیراعظم نصف گھنٹہ کے قریب قائداعظم کے پاس رہے۔ اس کے بعد جب مس جناح اندر گئیں۔ تو قائداعظم بے حد تھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے کچھ جوس مانگا اور پھر چوہدری محمد علی کو اپنے پاس بلایا۔ سیکرٹری جنرل پندرہ منٹ تک قائداعظم کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد مس فاطمہ جناح دوبارہ قائداعظم کے کمرے میں گئیں اور پوچھا کہ کیا وہ جوس یا کافی پینا پسند فرمائیں گے؟ قائداعظم نے کوئی جواب نہ دیا' کیونکہ وہ کسی سوچ میں محو تھے۔ اب ڈنر کا وقت آ گیا تھا۔ قائداعظم نے مس فاطمہ جناح سے فرمایا۔ "بہتر ہے کہ تم نیچے چلی جاؤ اور ان کے ساتھ کھانا کھاؤ۔"

"نہیں۔" مس جناح نے اصراراً کہا۔ "میں آپ کے پاس ہی بیٹھوں گی اور یہیں پر کھانا کھا لوں گی۔"

"نہیں۔" قائداعظم نے فرمایا۔ "یہ مناسب نہیں۔ وہ یہاں پر ہمارے مہمان ہیں۔ جاؤ اور ان کے ساتھ کھانا کھاؤ۔"

مس فاطمہ جناح لکھتی ہیں' کہ کھانے کی میز پر انہوں نے وزیراعظم کو بڑے خوشگوار موڈ میں پایا۔ وہ ہنسی خوشی پر مذاق باتیں کرتے رہے' جبکہ مس جناح کا دل اپنے بھائی کے لیے خوف سے کانپ رہا تھا' جو اوپر کی منزل میں بستر علالت پر اکیلے پڑے تھے۔

کھانے کے دوران چوہدری محمد علی چپ چاپ کسی سوچ میں گم رہے۔
کھانا ختم ہونے سے پہلے ہی مس فاطمہ جناح اوپر چلی گئیں۔ انہوں نے بڑے ضبط سے

اپنے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ قائداعظم انہیں دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا' "فطی' تمہیں
ہمت سے کام لینا چاہیے۔"

اس واقعہ کے دو ڈھائی ہفتے بعد ۱۴ اگست کو پاکستان کی آزادی کی پہلی سالگرہ آئی۔
اپنی کمزوری صحت کے باوجود یوم پاکستان پر قائداعظم نے قوم کے نام بڑا ولولہ انگیز
پیغام جاری کیا۔ مس جناح نے اپنے مسودے میں لکھا ہے کہ یوم پاکستان کے چند روز
بعد وزیر خزانہ مسٹر غلام محمد قائداعظم سے ملنے کوئٹہ آئے۔ لنچ کے وقت جب مس فاطمہ
جناح ان کے ساتھ اکیلی بیٹھی تھیں' تو مسٹر غلام محمد نے کہا۔ "مس جناح میں ایک
بات آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں۔ یوم پاکستان پر قائداعظم نے قوم کے نام جو پیغام
دیا تھا' اسے خاطر خواہ اہمیت اور تشہیر نہیں دی گئی۔ اس کے برعکس وزیراعظم کے پیغام
کے پوسٹر چھاپ کر انہیں شہر شہر دیواروں پر چسپاں کیا گیا ہے۔ بلکہ ہوائی جہازوں
کے ذریعہ اسے بڑے بڑے شہروں پر پھینک کر منتشر بھی کیا گیا ہے۔"
مس جناح نے یہ بات خاموشی سے سن لی۔ کیونکہ اس وقت انہیں اپنے بھائی کی صحت
کی فکر تھی' پبلسٹی کی نہیں۔

مسٹر غلام محمد کی اس حرکت میں کھلم کھلا شر' شرارت اور سازش کی آمیزش تھی۔
قائداعظم بستر علالت پر لیٹے ہوئے تھے۔ محترمہ مس فاطمہ جناح ان کی تیمارداری میں پریشان
تھیں۔ ایسے حالات میں اس قسم کی لگائی بجھائی کرنا بڑی مذموم حرکت تھی۔ اگر مسٹر
غلام محمد کو واقعی ایسی کوئی شکایت تھی تو ان کا فرض تھا کہ اس بات کو کابینہ میں اٹھاتے۔
اگر اس کے باوجود ان کا گلہ قائم رہتا تو اصولی طور پر انہیں مستعفی ہو جانا چاہیے تھا۔

لیکن اصولوں پر استعفیٰ دینا ہمارے حکمرانوں کی کمزوری نہیں۔ غلط فہمیاں پیدا کر کے اختلافات کو ہوا دینا انہیں زیادہ راس آتا ہے۔ یہ واقعہ ایک طرف تو مسٹر غلام محمد کے ان ذاتی رجحانات کی غمازی کرتا ہے جنہوں نے آگے چل کر ملک کے کاروبار میں کئی اور گل کھلانے تھے۔ دوسری طرف اس سے یہ بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ پاکستان کی زندگی کے پہلے سال سے مرکزی کابینہ میں ایسے عناصر نے سر اٹھا لیا تھا جو وزیراعظم کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف عمل تھے۔

قائداعظم کی وفات کے بعد محترمہ مس فاطمہ جناح اور حکومت کے درمیان سرد مہری کا غبار چھایا رہا۔ قائد کی دو برسیاں آئیں اور گزر گئیں دونوں بار مس جناح نے برسی کے موقع پر قوم سے خطاب کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی شرط تھی کہ براڈ کاسٹ کرنے سے پہلے وہ اپنی تقریر کا متن کسی کو نہیں دکھائیں گی۔ حکومت یہ شرط ماننے پر آمادہ نہ تھی۔ غالباً اسے خوف تھا کہ نہ جانے مس جناح اپنی تقریر میں حکومت پر کیا کچھ تنقید کر جائیں گی۔ آخر خدا خدا کر کے قائداعظم کی تیسری برسی پر یہ قرار پایا کہ محترمہ فاطمہ جناح اپنی تقریر پہلے سے سنسر کرائے بغیر ریڈیو سے براہ راست نشر کر سکتی ہیں۔ تقریر نشر ہو رہی تھی کہ ایک مقام پر پہنچ کر اچانک ٹرانسمشن بند ہو گئی۔ کچھ لمحے ٹرانسمشن بند رہی۔ اس کے بعد خودبخود جاری ہو گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مس جناح کی تقریر میں کچھ فقرے ایسے تھے جن میں حکومت پر کچھ تنقید تھی۔ وہ تو بدستور ان فقروں کو مائک پر پڑھتی گئیں' لیکن ٹرانسمشن بند ہو جانے کی وجہ سے وہ فقرے براڈ کاسٹ نہ ہو سکے۔ اس بات پر بڑا شور شرابا ہوا۔ اخباروں میں بہت سے احتجاجی بیانات بھی آئے۔ اگرچہ ریڈیو پاکستان کا موقف یہی تھا کہ ٹرانسمشن میں رکاوٹ کی وجہ یہ تھی کہ اچانک بجلی فیل ہو گئی تھی' لیکن کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ مس جناح کی تقریر میں ضرور کوئی ایسی بات تھی جسے حذف کرنے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچایا گیا ہے۔ اس ایک واقعہ نے حکومت

کے اعتماد کو جتنی ٹھیس پہنچائی اتنا نقصان مس فاطمہ جناح کے چند تنقیدی جملوں سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔

جن دنوں یہ قضیہ اپنے عروج پر تھا' ایک روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وزیر داخلہ و اطلاعات کے کمرے میں یہ بات طے کرنے کے لیے میٹنگ ہوئی کہ اس قصے کے متعلق پبلک میں جو چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں' ان پر کس طرح قابو پایا جائے۔ بے حد طویل اور بعید از کار بحث و تمحیص کے بعد آخر مسٹر جی۔ احمد نے تجویز پیش کی کہ کسی نامور شخصیت سے انکوائری کروا کے یہ ثابت کیا جائے کہ مس جناح کے براڈ کاسٹنگ کے دوران بجلی کی کرنٹ فیل ہو گئی تھی۔ اس انکوائری رپورٹ کی اشاعت کے بعد زبان خلق خود بخود بند ہو جائے گی اس کے برعکس وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین کو اصرار تھا کہ انکوائری بے لاگ اور غیر جانب دار ہونی چاہیے۔ اگر یہ ثابت ہو کہ بجلی فیل نہیں ہوئی تو اس بات کا بھی برملا اعتراف کرنا ضروری ہے تاکہ پبلک کے ذہن میں مزید بدگمانیاں پیدا نہ ہوں۔ سیکرٹری اور وزیر کے درمیان اس بحث کی تلخ کلامی نے بڑا طول کھینچا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خواجہ صاحب بھی یہی سمجھتے تھے کہ بجلی فیل نہیں ہوئی' اور اب وہ اس بات کو کھلم کھلا منظر عام پر لانے کے لیے بے تاب تھے۔ وزیراعظم لیاقت علی خاں کی حکومت کے لیے وہ اس قسم کی پریشانیاں اور مشکلات کیوں پیدا کرنا چاہتے تھے؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان دنوں یہ افواہ گرم تھی کہ وزیراعظم انہیں مرکزی کابینہ سے سبکدوش کر کے مشرقی بنگال بھیجنا چاہتے ہیں۔

ان دنوں مرکزی کابینہ سے علیحدگی کی تلوار خواجہ صاحب کے علاوہ اور بھی کئی سروں پر لٹک رہی تھی۔ وزیر خزانہ ملک غلام محمد پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ خرابی صحت کی بنا پر کابینہ سے ان کی رخصتی متوقع تھی۔ نواب مشتاق احمد گرمانی آزاد کشمیر کی سیاست میں پیچ در پیچ الجھنیں ڈال کر کشمیری لیڈروں کو آپس میں دست و گریبان کرانے کا گل کھلا چکے تھے۔ اب وزارت امور کشمیر میں کشمیر تو غائب ہو چکا تھا' فقط امور ہی

امور باقی رہ گئے تھے۔ کچھ گفتنی' کچھ ناگفتنی۔ چنانچہ افواہ گرم تھی کہ عنقریب گرمانی صاحب بھی کابینہ سے چھٹی کرنے والے ہیں۔ یہ حضرات تو کیبنٹ سے نکالے جانے والے خوف میں مبتلا تھے' لیکن ایک حضرت ایسے بھی تھے جو کابینہ میں شامل کئے جانے پر برہم و آزردہ مشہور تھے۔ ان کا نام نامی خان عبدالقیوم خاں تھا۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کے طور پر وہ فرنٹیر کے "مرد آہن" کہلاتے تھے۔ وہاں سے اٹھا کر جب انہیں مرکزی کابینہ میں ڈال دیا گیا تو انتظامی اور عاملانہ امور کے علاوہ وہ اپنی سیاسی اساس سے بھی دور ہو گئے۔ یوں بھی ایک طاقتور صوبائی وزیر اعلیٰ کا ٹھاٹھ باٹھ کچھ اور ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں مرکز کی وزارت چیزے دگر۔ اس لیے عام اطلاع یہی تھی کہ وہ اپنی اس "ترقی" سے چنداں خوش نہیں تھے۔

اس قسم کی افواہوں' قیاس آرائیوں اور خبر تراشیوں کی گرم بازاری اپنے عروج پر تھی کہ یکایک آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کی شام کو چار بج کر چھ منٹ پر راولپنڈی کے جلسہ عام میں ایک گولی چلی اور اس نے پاکستان کی قیادت کو سیاست کی شاہراہ سے موڑ کر موقع پرستی' ابن الوقتی' زمانہ سازی' طالع آزمائی اور مہم جوئی کے ایسے خارزار میں ڈال دیا جہاں ذاتی خواہشات قومی ضرورت اور ذاتی مفاد' قومی مفاد کے مترادفات بنتے چلے گئے۔

قائد ملت لیاقت علی خاں نے جام شہادت نوش کر کے تب و تاب جاودانہ کا صلہ پایا۔ جلسہ گاہ میں راولپنڈی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نجف خاں نے اپنے سپاہیوں کو للکار کر حکم دیا کہ گولی چلانے والے قاتل کو فوراً مار ڈالو۔ سید اکبر بھی گولی کا نشانہ بن کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ راز بھی دفن ہو گیا کہ وہ راولپنڈی کیوں آیا؟ ہر طرح کی سیکیورٹی کے باوجود جلسے کی اگلی صفوں تک کیسے رسائی حاصل کی؟ کسی غیبی طاقت یا روحانی یا شیطانی یا انسانی اشارے نے اس کی انگلی پستول کی لبلبی پر رکھ کر دبا دی؟ اسے زندہ گرفتار کرنے کی بجائے پولیس والوں نے اسے خواہ مخواہ جلسہ گاہ میں مار کیوں ڈالا؟ اس بے ضابطہ کاروائی کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس کے خلاف کیا کروائی

ہوئی؟ اسے ڈی۔ آئی۔ جی کے عہدے پر ترقی کس کارگزاری کے صلے میں ملی؟ عامی ذہن میں یہ سوال آج بھی جوں کے توں قائم ہیں۔ اب تک کسی ایسی بے لاگ انکوائری کا نتیجہ برسر عام نہیں آیا' جو ان سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکے۔ قائد ملت کی ہر برسی پر کسی نہ کسی پیرائے میں ایک مکمل اور بھرپور انکوائری کا مطالبہ اٹھتا ہے اور پھر اگلی برسی تک طاق نسیاں کی زینت بن جاتا ہے۔ درمیانی عرصہ میں وہی پرانے شکوک و شبہات خاموشی سے نشوونما پاتے رہتے ہیں اور اجتماعی رگ و ریشے میں بے اعتمادی کا سرطان پھیلاتے رہتے ہیں۔

خان لیاقت علی خاں کی شہادت نے پاکستان سے اس کا پہلا وزیراعظم ہی نہیں چھینا بلکہ ہمیں ایک نہایت بلند پایہ مدبر' سیاست دان اور انتظامی اور انصرامی قابلیت کے رہنما سے بھی محروم کر دیا۔ تحریک پاکستان میں وہ قائداعظم کے دست راست تھے۔ اس حیثیت میں انہیں مسلمانوں کی تنظیم اور انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ سیاسی نبرد آزمائی کا وسیع تجربہ حاصل تھا۔ جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو اس نوزائیدہ ملک کو چاروں طرف سے انتہائی شدید مصائب نے گھیرا ہوا تھا۔ ایک نئی حکومت کا قیام' مسلح افواج کی تنظیم نو' لاکھوں مہاجرین کی آباد کاری' بھارت کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے وسائل کا فقدان اور پھر کشمیر کی جنگ آزادی کا آغاز------ اس قسم کے بے شمار سنگین مسائل کو نوابزادہ لیاقت علی خاں نے بڑے تدبر' تحمل اور انتظامی قابلیت سے سنبھالا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد پاکستان کی قیادت کا سارا بوجھ لیاقت علی خان صاحب کے کندھوں پر ہی آ پڑا تھا۔ اس بارگراں کو بھی انہوں نے بعنوان شائستہ اٹھایا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی وزارت عظمٰی کو دور پاکستان کے لیے استحکام' استقلال اور سر بلندی کا زمانہ تھا۔ لیکن دو ایسی باتوں کا ذکر بھی ضروری ہے' جنہوں نے ہمارے حالات پر منفی اثرات مرتب کیے۔

اس زمانے میں پاکستان اسلامی دنیا میں سب سے بڑا اور ساری دنیا میں پانچواں بڑا ملک

سمجھا جاتا تھا۔ اس کی اس اہمیت کے پیش نظر روس نے وزیراعظم اور بیگم رعنا لیاقت علی کو روس کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ یہ دعوت نامہ ملنا تھا کہ بھارتی صفوں میں کھلبلی مچ گئی۔ بھارت خود روس سے پینگیں بڑھانے کا جتن کر رہا تھا۔ انہوں نے روسیوں کے کان بھرنا شروع کر دیئے کہ پاکستان خود تو روس کا دوت نامہ قبول نہ کرے گا بلکہ اسے اچھال کر امریکہ کی نظر میں اپنی قدر و قیمت بڑھانے کی کوشش کرے گا۔ دوسری طرف امریکہ کی نظر میں بھی یہ دعوت نامہ بری طرح کھٹکنے لگا۔ پاکستان میں ہر سطح پر ایسے افسروں کی کمی نہ تھی' جو مغربی تہذیب کے ذہنی غلام تھے۔ سیاسی آزادی نے ان کے دل اور دماغ کو مغرب پرستی کے احساس کمتری سے نجات نہیں دی تھی۔ ان کے قلوب اور اذہان پر غلامی کے دور کی روایات اور اقدار برف کی سلوں کی طرح جمی ہوئی تھیں اور آزادی کی تپش نے ابھی تک انہیں پگھلایا نہ تھا۔ اعلیٰ سطح کے بیشتر افسر برطانوی عہد کے تربیت یافتہ تھے۔ ان کے کمال کا جوہر بندھی بندھائی پالیسیوں پر عمل کرنے' سکونیاتی جمود کو ثبات دینے اور مروجہ روش کا جوں کا توں برقرار رکھنے میں مضمر تھا۔ وہ انگریزی نظام حکومت کی لکیر کے فقیر تھے۔ آزادی کے تقاضوں کو نئی پالیسیوں کے سانچے میں ڈھالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ تغیرات کے عمل سے وہ ناآشنا تھے۔ خاص طور پر بین الاقوامی امور کا انہیں کوئی تجربہ نہ تھا۔ ہماری وزارت خارجہ کے بالائی افسر قریباً سب کے سب پرانی آئی۔ سی۔ ایس کے ممبر تھے۔ اس سروس کی روایات کے مطابق وہ برطانیہ اور امریکہ کے خصوصاً اور مغرب کے عموماً والہ و شیفتہ اور ان کے حریفوں کے ان سے بھی بڑھ چڑھ کر حریف تھے۔ وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان بذات خود اس نہلے پر دہلا تھے۔ اپنے مزاج کی افتاد' پس منظر' رجحانات' تعصبات اور ٹریننگ کی وجہ سے یہ سب لوگ پاکستان کی خارجہ پالیسی کو بین الاقوامی تعلقات کے تنے ہوئے رسے پر حقیقت پسندانہ مہارت سے چلانے سے قاصر تھے۔ چنانچہ روس کا دعوت نامہ کھٹائی میں پڑا رہا اور جب امریکہ نے اپنے دعوت نامہ کا دانہ پھینکا تو ہماری وزارت خارجہ اس پر چیل کی طرح جھپٹی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وزیراعظم روسیوں کی

دعوت پر روس کا دورہ کرتے اور امریکنوں کی دعوت موصول ہونے پر امریکہ تشریف لے جاتے۔

اپنی وزارت عظمیٰ کے دوران نوابزادہ لیاقت علی خاں نے کسی وجہ سے مسلم لیگ کی صدارت کا عہدہ بھی خود سنبھال لیا تھا۔ آگے چل کر یہ ادغام مسلم لیگ کے وجود کے لیے صحت مند ثابت نہ ہوا۔ اس نے مسلم لیگ کو حکومت ساز پارٹی کی بجائے حکومت نواز پارٹی میں تبدیل کر دیا۔ حکومت اور سیاست کے امتزاج سے حکومت کو تو ضرور تقویت ملتی ہے لیکن سیاسی عمل آزاد نہیں رہتا بلکہ وہ سرکاری مصلحتوں کے تابع ہو کر مضمحل ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس میں حکومت کی سرپرستی کے بغیر فعال رہنے کی صلاحیت سلب ہونے لگتی ہے اور حزب مخالف کے طور پر سیاسی کردار ادا کرنے کی قوت ماند پڑ جاتی ہے۔ اس سلسلے میں مسلم لیگ کا اپنا انجام اظہر من الشمس ہے۔

قائد ملت کی شہادت کی خبر میں نے پشاور میں سنی۔ میں قبائلی علاقوں اور سوات' دیر' چترال' کافرستان وغیرہ کا طویل دورہ ختم کر کے ن۔ م۔ راشد کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا' جو ان دنوں پشاور ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر تھے۔ یہ المناک خبر نشر ہوتے ہی ریڈیو سٹیشن پر مختلف قسم کے لوگوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ بھانت بھانت کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ کچھ لوگ ن م راشد کے گھر بھی آ گئے اور صبح تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ آدھی رات کے قریب ایک صاحب نے ٹیلیفون پر کراچی کی سوگواری کا حال بیان یا اور ساتھ ہی بتایا کہ شہر کی ایک مشہور فیشن شاپ راتوں رات کچھ امیر کبیر بیگمات کے لیے فیشن ایبل ماتمی ملبوسات تیار کرنے کے لیے صبح تک کھلی رکھنے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔

قائد ملت کی شہادت کے ساتھ ہی یہ سوال ابھر آیا تھا کہ نیا وزیراعظم کون ہو گا؟ ایک خبر یہ گرم تھی کہ شاید یہ قرعہ سردار عبدالرب نشتر کے نام نکلے۔ لیکن ابھی پاکستان کی قسمت میں آزمائش کی جگہ آزمائش لکھی تھی۔ اس لیے حکمرانی کا مال غنیمت بانٹنے

والوں نے وزیراعظم کا عہدہ تو خواجہ ناظم الدین کو سونپا اور گورنر جنرل کی کرسی پر ملک غلام محمد براجمان ہوئے۔ چوہدری محمد علی وزیر خزانہ بنے اور وزارت داخلہ اور اطلاعات کا چارج مشتاق احمد گرمانی نے سنبھالا۔

گرمانی صاحب کے آنے کے مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد مجھے حکم ملا کہ میری خدمات پنجاب کی صوبائی حکومت کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ پنجاب کی حکومت نے مجھے ضلع جھنگ کا ڈپٹی کمشنر مقرر کر دیا۔ "ڈپٹی کمشنر کی ڈائری" اسی زمانے کی چند یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔

○◯○

• چناب رنگ

جھنگ کی سر زمین حسن و عشق' انوار و معرفت اور انوکھی حکمرانیوں کا ایک تاریخی گہوارہ ہے۔ جھنگ اور ملتان کے پہلے مقامی حکمران ملک کبیر خان نے رضیہ سلطانہ کو تخت

دہلی پر بٹھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

حضرت مجدد الف ثانی نے بھی جھنگ کی سرزمین کو اپنے بابرکت قدموں سے نوازا۔ وہ نواب سعد اللہ خاں کے دوست تھے اور ان کی معیت میں ایک ہفتہ چنیوٹ میں قیام فرمایا۔ نواب سعد اللہ خاں بعد میں شاہجہاں کے وزیراعظم مقرر ہوئے۔

حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کی "ہو" کی گونج نے اس سرزمین کو شاد اور آباد کیا۔ عشق حقیقی کی ماہتاب مائی "ہیر" بھی جھنگ کے ایک گاؤں میں چوچک سیال کے ہاں پیدا ہوئی جو ایک معمولی زمیندار اور عمر رسیدہ شخص تھا۔ یہ اولاد اسے حضرت شیر شاہ جلال سرخ بخاری کی دعا سے نصیب ہوئی تھی' جن کا مدفن بہاولپور ہے۔ بچی کا نام عزت بی بی رکھا گیا' لیکن اپنی عبادت گزاری' ریاضت اور زہد و تقوٰی کے باعث عوام الناس پیار سے اسے "ہیر" کے لقب سے پکارنے لگے۔ اس کے ایک مرید اور خلیفہ کا نام مراد بخش تھا۔ جس کی ذات رانجھا تھی۔ عشق حقیقی کے یہ دونوں پرستار بھی جھنگ شہر میں ایک ہی قبر میں آسودہ ہیں۔ وارث شاہ کے رومانی شاہکار ہیر رانجھا کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وارث شاہ خود بھاگ بھری نامی ایک عورت کی محبت میں گرفتار تھا۔ جب ان کے عشق کا راز فاش ہوا تو گھر والوں نے بھاگ بھری کی شادی کہیں اور کر دی' اور صاحب حیثیت ہونے کی وجہ سے وہ لوگ بھی ہاتھ دھو کر غریب وارث شاہ کے پیچھے پڑ گئے۔ محبت کی ناکامی کے غم میں ڈوب کر موزوں طبیعت والے نامراد عاشق نے اپنا وہ شاہکار تصنیف کیا جس میں اپنے وقت کی ایک عارفہ اور پاکباز خاتون بھی ان کے قلم کی زد میں آ کر عشق مجازی کا ایک لازوال کردار بن گئی۔

مرزا صاحباں کا خونچکاں ڈرامہ بھی اسی علاقے میں رونما ہوا۔ میں نے وہ چھوٹی سی خستہ حال مسجد بھی دیکھی ہے جہاں مقامی روایات کے مطابق صاحباں مرزا کی سلامتی کے لیے دن رات سر بسجود ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعائیں مانگا کرتی تھی۔

اٹھارہ ہزاری میں مخدوم تاج الدین کا مزار ہے جن کے بارے میں اب تک مشہور ہے کہ چور اور ڈاکو اس کی حد میں آ کر اندھے ہو جایا کرتے تھے۔ اسی طرح بھوانہ کے نزدیک حافظ برخوردار مدفون ہیں' جن کے جلال کا اب بھی یہ عالم ہے کہ' چور' ڈاکو اور مجرم ان کے مزار کے دروازہ کی کنڈی کو ہاتھ لگانے سے ڈرتے ہیں۔ اس علاقے میں چوری کی واردات پر مشتبہ شخص کی پاکدامنی کے فیصلے کا یہی طریقہ رائج ہے کہ وہ حافظ برخوردار کی کنڈی کو ہاتھ لگا دے۔ اصلی چور اور مجرم ہاتھ نہیں لگاتے' کیونکہ اس طرح قسم جھوٹی ہو جاتی ہے اور باور کیا جاتا ہے کہ یہاں پر جھوٹی قسم کھانے والا سخت ذہنی اور جسمانی عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

فروری ۱۹۵۱ء میں جب میں اس رنگین ضلع میں ڈپٹی کمشنر کا چارج لینے یہاں پہنچا تو اس کا حال اس کے ماضی سے بے حد مختلف تھا۔

میں اپنا واحد سوٹ کیس اور بستر لے کر ریلوے اسٹیشن پر اترا اور ایک تانگے میں سوار ہو کر ڈاک بنگلے آ گیا جہاں پر چند روز کے قیام کے لیے میرے لیے جگہ ریزرو کروائی ہوئی تھی۔ ڈاک بنگلہ کے خانساماں اور چوکیدار نے ناک سکیڑ کر مجھے گھورا اور دونوں نے بہ یک زبان دھتکار کر کہا' "جاؤ جی جاؤ۔ آئے بڑھ ڈاک بنگلے میں ٹھہرنے والے۔ بنگلہ نئے ڈپٹی کمشنر بہادر کے لیے ریزرو ہے۔"

جی میں تو آیا کہ انھیں بتا دوں کہ میں ہی یہاں کا نیا ڈپٹی کمشنر ہوں۔ لیکن خانساماں اور چوکیدار کے تیور دیکھ کر مجھے ایسا کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

میں نے کسی قدر لجاجت سے خانساماں سے پوچھا کہ کیا میں یہاں سے ایک ٹیلیفون کر سکتا ہوں؟

"کہاں کرنا ہے؟" خانساماں نے دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا۔

"ڈی سی صاحب کو۔" میں نے کہا۔

خانساماں اور چوکیدار نے زور سے قہقہہ لگایا جس میں طنز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ یہ منہ اور مسور کی دال! خیر میری مزید منت سماجت پر انہوں نے ڈی سی کے پی اے اللہ دتہ صاحب کے ساتھ فون ملا دیا۔ میرا نام سن کر اس نے فوراً تبدیل ہونے والے ڈی سی سرور صاحب کو ٹیلیفون دیدیا۔

"آپ کب آئے؟" سرور صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

"ابھی آیا ہوں۔"

"کیسے آئے؟"

"ریل گاڑی سے۔" میں نے وضاحت کی۔"

"اسٹیشن سے کیسے آئے؟" انہوں نے پوچھا۔"

"تانگے پر۔" میں نے جواب دیا۔"

"لاحول ولا قوہ۔" سرور صاحب نے فرمایا۔ "بھائی صاحب' خبر تو دے دی ہوتی۔ ہم لوگ سٹیشن پر آپ کا شاندار استقبال کرتے۔ اب کچھ لوگ گلہ کریں گے کہ آپ کے استقبال کے اعزاز سے کیوں محروم رہے۔"

چند لمحوں بعد سرور صاحب تشریف لے آئے اور ان کے ساتھ ہی نظارت کے عملے کا ایک جم غفیر بھی آ نازل ہوا۔ سب لوگ میرا سامان ڈاک بنگلے میں سجا کر رکھنے کے لیے مضطرب تھے۔ لیکن میرے سامان میں صرف ایک معمولی سا سوٹ کیس اور بستر دیکھ کر وہ سب مایوس ہو گئے۔ سرور صاحب بھی۔

سرور صاحب اچھے آدمی تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ مسلمان مجرموں کو سزا دینے سے پہلے وہ ان سے دعائے قنوت سنا کرتے تھے۔ اگر کسی نے ٹھیک سنا دی تو وہ سزا میں مناسب تخفیف کر دیتے تھے۔ غلط سنانے پر سزا بڑھ جاتی تھی۔

• چارج

میں نے اپنے ضلع کا چارج تو بعد میں سنبھالا۔ سب سے پہلے دفتر کے ناظر نے بہ نفس نفیس خود میرا چارج لے لیا۔

ناظر صاحب سے پہلی ملاقات کچھ غیر رسمی طور پر ہوئی۔ مجھ سے زیادہ انہوں نے میرے سامان کا جائزہ لیا۔ میرے ساتھ محض ایک سوٹ کیس اور ایک بستر کو دیکھ کر وہ قدرے مایوس ہو گئے۔ ضابطہ کی رو سے ڈپٹی کمشنر کی آمد سے پہلے ان کے بیرے اور خانساماں کو آنا چاہیے۔ اس کے بعد ان کے سامان کی ویگن اور موٹر کار آنی چاہیے۔ پھر صاحب بہادر خود تشریف لائیں اور ان کے جلو میں اگر چند کتے اور کچھ گھوڑے بھی ہوں تو عین شایان شان ہے۔

ناظر صاحب کی معیت میں ایک کار' دو بڑے ٹرک اور کوئی درجن بھر وردی پوش لوگ تھے۔ کار انہوں نے شہر کے ایک رئیس سے طلب کی ہوئی تھی۔ ٹرک مقامی ٹرانسپورٹ کمپنی نے پیش کئے تھے اور وردی پوش لوگ دفتروں کے چپڑاسی اور چوکیدار تھے۔ سامان کی طرف سے مایوس ہو کر ناظر صاحب نے مجھے ہر دیگر کار لائقہ سے یاد فرمانے کی ہدایت کی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ اگر مجھے ضرورت محسوس ہوئی' تو ان کی خدمات سے فائدہ اٹھاؤں گا۔

ناظر صاحب کو رخصت کر کے میں نے ڈاک بنگلہ کے بیرے سے کچھ گرم پانی کی فرمائش کی۔ گرم پانی کا نام سن کر یکایک دروازے کر پردا ہلا' اور اس کے عقب سے ناظر صاحب نمودار ہوئے۔

"حضور گرم پانی غسل خانہ میں تیار ہے۔" انہوں نے اعلان کیا۔

منہ ہاتھ دھو کر میں نے ڈاک بنگلہ کے بیرے سے چائے مانگی۔ اس فرمائش پر ایک بار پھر ناظر صاحب پردہ غیب سے ظہور میں آ گئے۔

"حضور ڈائننگ روم میں چائے تیار ہے۔"

ڈائننگ روم میں چائے کم تھی اور مرغ زیادہ تھے۔ ایک قاب میں مرغ مسلم تھا۔ دوسری میں مرغ روسٹ تھا۔ ایک پلیٹ میں چکن سینڈوچ تھے۔ کچھ طشتریاں مٹھائیوں سے بھری رکھی تھیں۔ دائیں بائیں پیسٹری کے ڈبے تھے اور ان سب کے درمیان جملہ معترضہ کے طور پر کچھ چائے بھی موجود تھی۔ چائے کا سیٹ چمکدار سلور کا بنا ہوا تھا اور چائے دانی پر مالک کا نام اور پتہ نقش کیا ہوا تھا۔ یہ بزرگ پیشے کے لحاظ سے پیر' خاندانی لحاظ سے رئیس اور نسلاً سید زادے تھے۔ چنانچہ ان کے نام کے ساتھ یہ ساری صفات چائے دانی پر کندہ تھیں۔

ڈاک بنگلہ میں میرے سوا اور کوئی صاحب فروکش نہ تھے۔ لیکن اندر دونوں جگہ خاصی غیر معمولی چہل پہل تھی۔ ناظر صاحب کی سرکردگی میں کئی چپڑاسی اور چوکیدار کسی خاص کام کے بغیر بڑی مستعدی اور بدحواسی سے مصروف نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف برآمدے میں کچھ پٹواری نما لوگ کسی نامعلوم اشارے کے منتظر بیٹھے تھے۔ باہر لان میں بہت سے غیر سرکاری قسم کے حضرات ادھر ادھر منڈلا رہے تھے۔ اس سارے مجمع میں صرف ایک شخص تھا جو اس تمام کروائی سے لاتعلق الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ یہ ڈاک بنگلہ کا سرکاری خانساماں تھا۔ نظارت کے عملہ نے باورچی خانہ پر اپنا تسلط جما کے اسے بے دخل کر دیا تھا اور وہ ایک خاموش حقارت اور بیزاری کے عالم میں سب سے الگ ایک طرف بیٹھا اپنا حقہ پی رہا تھا۔

ایک دوبار میں نے کوشش کی کہ خانساماں کو بلا کر اسے اپنے کھانے کے متعلق کچھ ہدایات دے دوں۔ لیکن ہر بار میرے اردلی نے مجھے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "حضور کا سارا بندوبست ناظر بابو کی تحویل میں ہے۔"

یہ اردلی ایک نمایاں اور رعب دار شخصیت کا مالک تھا۔ بڑی بڑی تاؤ دار سندھی مونچھیں۔ طرے والا مورچھل صافہ۔ سرخ بانات کا کوٹ۔ گلابی پیٹی۔ گول گول چمکدار آنکھیں'

جن میں ادب بھی تھا اور ریا بھی' مکر بھی تھا اور تملق بھی۔ وہ عموماً اپنی پھیلی ہوئی توند پر دونوں ہاتھ رکھ کے گردن میں ایک تعظیمی خم ڈال کر ایستادہ رہا کرتا تھا۔

اس کی زبان میں محکمہ مال کے الفاظ اور اصطلاحوں کا خاصہ اثر تھا اور اگر اس کی پیٹی کا بلا اس کے اصلی عہدے کا غماز نہ ہوتا' تو اس پر بڑی آسانی سے تین ہزاری قسم کے سردار کا دھوکہ ہو سکتا تھا' جو ابھی ابھی "باادب با ملاحظہ ہوشیار" کا نعرہ لگانے والا ہو۔

شام کے وقت میں نے سوچا کہ اکیلے پاپیادہ گھوم کر شہر دیکھنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ ایک دو روز کے بعد میرے پاؤں میں ڈپٹی کمشنر کی مہندی لگ جائے گی اور میرے چہرے پر اس عہدے کا ٹھپہ ثبت ہو جائے گا اور میرے سر میں اس کرسی کا سودا سما جائے گا۔ اس کے بعد مجھے اس نئے شہر کے ان گلی کوچوں کو دیکھنے کی توفیق نہ ہو گی جہاں حکام کو دعوتیں دینے والے عمائدین رہائش نہیں رکھتے۔

ڈاک بنگلہ سے نکلتے ہی میرا اردلی تیز تیز قدم میرے آگے آگے ہو لیا۔ سب سے پہلے اس نے زور کا دھکا دے کر ایک چوکیدار کو میرے راستے سے ہٹایا جو نئے ڈپٹی کمشنر کی جان و مال کی حفاظت کے لیے رات کی ڈیوٹی پر حاضر ہو رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے کڑک کر ایک سقہ کو ڈانٹا جو میونسپل کمیٹی کے زیر اہتمام آج خاص طور پر ڈاک بنگلہ کے آس پاس پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ اگر میں اصرار کر کے اردلی کو واپس نہ کر دیتا' تو بے شک وہ اسی طرح ہٹاؤ بچاؤ کر کے سارے شہر میں میرا جلوس نکالتا۔ اردلی تو طوعاً و کرہاً واپس لوٹ گیا' لیکن تھوڑی دیر کے بعد ناظر صاحب ایک موٹر کار لیے میرے تعاقب میں نکل آئے۔ کار میرے عین مقابل آہستہ سے کھڑی ہو گئی اور اس میں سے ناظر صاحب برآمد ہوئے۔

"حضور کی سواری کے لیے موٹر حاضر ہے۔"

میرے انکار پر انہوں نے میرے ساتھ ساتھ پیدل چلنے کی پیشکش کی۔ میں نے پھر دوبارہ شکریہ ادا کر کے انہیں رخصت کر دیا۔ ناظر صاحب چلے تو گئے' لیکن راستہ بھر مجھے

یہی خدشہ رہا کہ کہیں وہ اچانک اگلے موڑ پر دست بستہ کھڑے نظر نہ آ جائیں۔
دراصل ضلع کے اندرونی نظام میں ناظر کا وجود الہ دین کے چراغ کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس چراغ کی روشنی زیادہ تر ڈپٹی کمشنر کے اپنے بنگلے ہی کو منور کرتی ہے۔ ڈپٹی کمشنر کے باورچی خانے سے لے کر کوٹ پتلون کے بٹنوں تک ناظر صاحب کی تفصیلی نظر رہتی ہے۔ گائے بھینس کا چارا' گھوڑوں اور کتوں کی خوراک' چولہے کا ایندھن' گوشت' سبزی ترکاری' بچوں کی کاپیاں اور پنسلیں' بیوی کے لیے کپڑوں کے تھان' خالص گھی' نمک' مرچ' پیاز' لہسن' چائے چینی' یہ سب چیزیں ناظر صاحب کی وساطت سے خاص ارزاں نرخوں پر دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ناظر کے نرخ عام بازار کے بھاؤ سے کافی ارزاں ہوتے ہیں اور ایک بار جب ڈپٹی کمشنر کو ان نرخوں کا چسکا پڑ جائے تو اس کی اقتصادی زندگی کا نقشہ بہت خوشگوار طور پر بدل جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے' یہ چسکا بچارے ڈپٹی کمشنر کے اپنے اختیار کی بات بھی نہیں۔ روز اول سے جس طرح ناظر صاحب ڈپٹی کمشنر کی ذاتی ضرورت پر چھا جاتے تھے اور جس سلیقے سے وہ ان کے گھر بار کا نظام سنبھال لیتے ہیں اس میں مسئلہ جبر و قدر کا بھی بہت کچھ ہاتھ ہے۔
اشیائے خورد و نوش کے علاوہ ناظر صاحب کے مداری کے پٹارے میں اور بھی بہت سی تن آسانیاں ہیں۔ کمروں کے لیے دریاں' غسلخانوں کے ٹب اور نوکروں چاکروں کی چارپائیاں وہ اپنے سرکاری اسٹاک سے برآمد کر لاتے ہیں۔ بجلی کے فالتو پنکھے اور الماریاں وہ دفتر کے کمروں سے اٹھوا لاتے ہیں۔ بیگم صاحبہ' باوا لوگ اور باورچی کا فرمائشی فرنیچر مقامی دکانوں سے معمولی کرائے پر یا عاریتاً آتا رہتا ہے۔ بے وقت کے مہمانوں کے لیے پکا پکایا کھانا اور صاف ستھرے بستر فراہم کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اگر کبھی حسن اتفاق سے شہر کی بجلی فیل ہو جائے' تو آناً فاناً ناظر صاحب کے سٹور سے جگمگاتے ہوئے پیٹرومیکس اور ہری کین لالٹین ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کو بقعہ نور بنا دیتی ہیں۔ چونکہ

ڈپٹی کمشنر کا سارا وقت بکار سرکار صرف ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے چراغاں میں عموماً سرکاری تیل ہی جلایا جاتا ہے۔

یادش بخیر' انگریزوں کے زمانے میں ایک ڈپٹی کمشنر ولایت سے تازہ تازہ شادی کر کے واپس آئے۔ ناظر صاحب نے عرض کیا کہ ہمارے ہاں رسم ہے کہ جب نئی نیہ دلہن گھر میں قدم رکھے' تو اس کی نیک شگونی کے لیے اس کے سر پر صدقہ اتارا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ دونوں میاں بیوی ایک کمرے میں بٹھا دیئے گئے اور نظارت کے اہل کاروں اور چپراسیوں کی ایک طویل قطار کپڑوں کے تھان اٹھائے ان کے سامنے سے گزرنے لگی۔ صاحب بہادر ہر تھان کو ہاتھ سے چھوتے تھے' پھر اسے میم صاحبہ کے سر پر تین مرتبہ گھمایا جاتا تھا اور اس عمل کے بعد وہ تھان سیدھا بزاز کی دکان پر واپس پہنچ جاتا تھا۔ اس طرح کپڑوں کی ایک پوری دکان نئی دلہن کے سر پر نچھاور کی گئی۔ شام کے وقت نظارت کے زیر اہتمام کچہری اور کوٹھی کی عمارتوں پر چراغاں کیا گیا اور اس کے بعد ناظر صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کی چھت پر بیڈروم کے روشندان کے ساتھ چھپ کر بیٹھ گئے۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر جب میاں بیوی اپنے حجلہ عروسی میں داخل ہوئے تو عین مناسب موقع پر ناظر صاحب نے کھڑے ہو کر ایک بلند نعرہ لگایا اور باہر لان میں چھپا ہوا بینڈ بڑے اہتمام سے انگلستان کا قومی ترانہ بجانے لگا!

اگرچہ انتظامی قابلیت کا ایسا معیار آجکل دیکھنے میں نہیں آتا' پھر بھی ہر فرض شناس ناظر اپنے عہدے کی درخشاں روایات کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن سعی کرتا ہے۔ ایک روز محکمہ مال کے ایک بہت بڑے افسر دورے پر آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی سات آدمیوں کا عملہ تھا۔ دو چپراسی' ایک ڈرائیور' ایک پی۔ اے' ایک نائب تحصیلدار اور دو پٹواری۔ بڑے صاحب ڈاک بنگلہ میں فروکش ہوئے۔ نائب تحصیلدار اور پی۔ اے صاحب کے لیے چولداریاں نصب ہو گئیں۔ پٹواریوں کو خود ناظر صاحب نے اپنے ہاں مہمان ٹھہرایا اور باقی لوگ شاگرد پیشوں میں سما گئے۔ تین دن کے قیام کے بعد صاحب بہادر نے حسب معمول بل طلب کیا۔ ناظر صاحب نے جو بل پیش کیا' اس کی تفصیلات کچھ

یوں تھیں۔

مرغی' چار عدد .... دو روپے پانچ آنے

گوشت' پانچ سیر .... ایک روپیہ تیرہ آنے

سبزی .... چھ آنے تین پائی

دودھ' آٹھ سیر .... ایک روپیہ نو آنے

چائے چینی .... آٹھ آنہ چھ پائی

متفرقات .... ایک روپیہ دو آنے

کل میزان .... سات روپے گیارہ آنہ نو پائی

ایک زمانہ تھا کہ اس قسم کے دوروں پر بل مانگنا یا بل پیش کرنا ناقابل تصور تھا۔ لیکن اپنے نظم و نسق میں دیانت داری کو فروغ دینے کے لیے حکومت نے بڑی سخت تاکیدی ہدایات جاری کر رکھی ہیں کہ ہر افسر اپنے دورے کے بعد اپنے اخراجات کا پورا بل ادا کیا کرے۔ اس بدعت کو نبھانے کے لیے ناظر صاحبان نے جو سہولتیں پیدا کر رکھی ہیں' ان پر بے ساختہ داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہو گی۔ ضابطہ کی پابندی کے لیے ہر بل کے ساتھ قصاب' کنجڑے' گوالے وغیرہ کی دستخطی رسیدیں بھی منسلک ہوتی ہیں تاکہ سند رہیں اور ناگہانی مصیبت کے وقت کام آئیں۔

ڈپٹی کمشنر کے لیے داروغہ منڈی کے فرائض انجام دینے کے علاوہ ناظر صاحب کی ذمہ داریوں میں ایسے کام بھی ہیں جو وہ محض بکار سرکار انجام دیتے ہیں۔ ضلع کے نظام میں نظارت خانہ ایک مکڑی کے جالے کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ عدالتوں کے سمن نظارت کے ذریعہ (Serve) پہنچائے جاتے ہیں۔ گواہوں کا بھتہ ناظر کے ذریعہ ادا ہوتا ہے۔ وزیروں کے جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام ناظر کرتے ہیں۔ عید میلاد اور یوم استقلال پر جھنڈیاں اور جھنڈے ان کے ذریعہ لگائے جاتے ہیں۔ سیلاب کے موقعہ پر رضا کاروں کا کھانا وہ فراہم کرتے ہیں۔ وباؤں میں لاوارث لاشوں کے کفن وہ بنواتے ہیں۔ تبادلے پر

افسروں کا سامان وہ پیک کرواتے ہیں۔ گرمیوں میں خس کی ٹٹیاں ان کے حکم سے لگتی ہیں۔ سردیوں میں دفتروں اور گھروں کے آتشدان ان کی توجہ سے گرم ہوتے ہیں اور جو مجسٹریٹ یا اہلکار ایک دفعہ ناظر کی نظر سے گر جائے' اس کے لیے زندگی کی بہت سی رنگینیاں فی الفور سلب ہو جاتی ہیں۔

آزادی کے بعد ناظر کے اختیارات میں تو کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ لیکن ان کی الجھنوں میں کچھ اضافہ ضرور ہو گیا ہے۔ ایک تو ملبوں کی ادائیگی کا مسئلہ ہے۔ جو نرخ وہ خوب سوچ بچار کے لگاتے ہیں ان کی گرانی پر تو کسی افسر کو شکایت کا موقع نہیں مل سکتا۔ لیکن ایک تشویش جو ناظر کو اکثر ستاتی رہتی ہے وہ یہ ہے کہ کہیں کوئی مائی کا لال ان قیمتوں کی غیر معمولی ارزانی پر بحث نہ چھیڑ دے۔ الحمد للہ' کہ اکثر و بیشتر ناظر صاحبان کو ایسا ناخوشگوار حادثہ پیش نہیں آیا!

ناظر صاحب کی دوسری الجھن ذرا زیادہ تشویش ناک ہے۔ انگریزی راج کی برکتوں میں ایک خاص برکت یہ بھی تھی کہ پہلے ہر ڈپٹی کمشنر اپنے ضلع میں تین چار برس جم کے رہتا تھا۔ ناظر صاحب دلجمعی سے ان کی خدمت کرتے تھے اور تبادلے پر جاتے جاتے ڈپٹی کمشنر صاحبان اپنے فالتو فرنیچر کا اچھا خاصہ حصہ ناظر کو بطور عطیہ مرحمت فرما دیا کرتے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد حالات دگرگوں ہو گئے ہیں۔ اول تو سال بھر میں ایک ایک یا دو دو بسا اوقات تین تین ڈپٹی کمشنر بدلتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ جو ڈپٹی کمشنر جاتا ہے' اس کے سامان کے ساتھ نظارت کے پنکھوں' میزوں اور کرسیوں کی ایک تعداد بھی سہواً غائب ہو جاتی ہے۔

○○○

• درونِ خانہ

حسن اتفاق سے آئی۔ سی۔ ایس کے بارے میں ایک ایسا پرانا کتابچہ دستیاب ہو گیا جسے بجا طور پر ہدایت نامہ ڈپٹی کمشنران کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتابچہ ۱۸۸۹ء میں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر نے مرتب کیا تھا۔ اس میں کام کاج، رہنے سہنے کے وہ سب آداب تفصیلاً درج ہیں جن پر ہر ڈپٹی کمشنر کو کاربند رہنا لازم ہے تا کہ "رعیت" پر اپنے حاکم کا وقار خاطر خواہ قائم رہے۔ ان ہدایات کی رو سے ڈپٹی کمشنر کے ذاتی عملہ میں مندرجہ ذیل اسٹاف ضرور ہونا چاہیے:

بیرا ۱
بٹلر ۱
خانساماں .... (بڑے کھانوں کے موقعوں پر دو مزید باورچیوں کی گنجائش رکھنا مناسب ہے)

خدمت گار ۱
سگ برادر .... (کتوں کی خدمت کے لیے)

سائیس ۲

مسالچی ۱

حمال ۱

آیا ۱

حقہ بردار ۱

دھوبی ۱

درزی ۱

بہشتی ۱

مالی ۱

نائی ۱

دودھ والا ۱

یہ ۱۸۸۹ء کی بات ہے۔ جب ملکہ کا راج تھا اور سلطنت برطانیہ کا آفتاب طلو ہونے کے بعد غروب نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں ڈپٹی کمشنر لوگ ابلا ہوا پانی پیتے تھے' پھلوں کو لال دوائی میں بھگو کر کھاتے تھے' جون جولائی میں لو کے اثرات سے بچنے کے لیے دوپہر کے وقت گرم فلالین کے قمیض پہنتے تھے اور مچھروں سے حفاظت کے لیے سر شام لمبے دستانے اور فل بوٹ چڑھا لینے کا فیشن عام تھا۔ میم صاحبہ سال کا آدھا حصہ پہاڑ پر اور آدھا ولایت میں بسر کرتی تھیں۔ باوا لوگ ولایت میں پیدا ہوتے تھے اور پولیس لائن میں رائیڈنگ سیکھنے کے لیے کبھی کبھی گرمیوں کی چھٹیاں ڈیڈی ابا کے پاس گزارنے آیا کرتے تھے۔

ڈپٹی کمشنر اور دیگر "بڑے صاحب" لوگوں کے گھروں میں عام طور پر نوکروں کا ایک پورا لشکر ہوا کرتا تھا۔ ان نوکروں میں حقہ بردار کا ایک خاص منصب تھا۔ ان دنوں ابھی سگریٹ اور سگار عام نہیں ہوئے تھے۔ البتہ پائپ پیے جاتے تھے۔ لیکن جہاں کمپنی بہادر نے ملکہ معظمہ کے لیے ہندوستان کا ملک چھوڑا تھا' وہاں سفید فام مائی بوپوں کو حقہ کی وراثت بھی تفویض کی تھی۔ یہ رواج تقریباً بیسویں صدی کے شروع تک خاصہ عام تھا۔ انگریز افسروں کے گھروں میں بڑے بانکے اور سجیلے حقے رہا کرتے تھے۔ حقہ میں پانی بھی عرق گلاب ملا کر استعمال ہوتا تھا اور جب صاحب بہادر کوچ پر لیٹ کر حقہ پیتے تھے تو ایک خادم نلکی تھام کے کھڑا ہوتا تھا اور حقہ بردار ایک تانبے کی پھکنی سے برابر چلم پر پھونکیں مارا کرتا تھا۔ بڑی بڑی دعوتوں میں ہر افسر کے ساتھ اس کا حقہ بردار بھی آیا کرتا تھا۔ کھانے کے بعد حقہ برداروں کا جلوس حقے اٹھائے کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ ہر حقہ بردار اپنے آقا کے پاس حقہ جما کے دست بستہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ حقوں کی نشست بڑے رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے جمتی تھی اور کسی دوسرے کے

حقے کی نلکی کے اوپر سے گزرنا انتہائی بے ادبی اور گستاخی سمجھا جاتا تھا۔ حقے کی لت میموں میں بھی عام تھی۔ وہ حقوں کی لانبی لانبی رنگ برنگی لچکدار نلکیوں کو اپنی کمر کے گرد سانپوں کی طرح لپیٹ کر بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے بیٹھ کر حقہ نوش فرمایا کرتی تھیں۔ تمباکو میں الائچی کاست' زعفران اور سونے کے ورق ملائے جاتے تھے اور ولایت میں ان میموں کی مائیں اور چچیاں بڑے فخر اور استعجاب سے اپنے ہمسایوں کو بتایا کرتی تھیں کہ ہندوستان میں ہماری صاحبزادیاں سونا پھانکتی ہیں اور سانپوں سے کھیلتی ہیں!

اگر ڈپٹی کمشنر کی بیوی کسی کی عزت افزائی کرنا چاہتی تھی تو وہ اسے اپنے حقے سے دو چار کش لگانے دیتی تھی۔ اس کے مقابلے میں سیشن جج کی بیوی بھی بڑھ چڑھ کے اپنے حقے کی نمائش کیا کرتی تھی۔ ان دونوں بیویوں میں بڑے زوروں کی چشمک رہا کرتی تھی' لیکن ٹھاٹھ باٹھ رعب داب اور طنطنے میں عموماً ڈپٹی کمشنر کی بیوی کی بیوی کا پلہ ہی بھاری رہتا تھا۔ سیشن جج کی بیوی کے قدم تو اسی وقت جمتے تھے جبکہ ڈپٹی کمشنر مجرد ہوتا تھا۔ کنوارے ڈپٹی کمشنر عام طور پر اپنے لیے باقاعدہ مقامی حرم قائم کرتے تھے۔ شولاپور میں ایک تاریخی ڈپٹی کمشنر گزرے ہیں۔ ان کا نام میڈوز ٹیلر تھا۔ آپ کے حرم میں باسٹھ عورتیں تھیں۔ ان میں ایک پندرہ سالہ مرہٹہ لڑکی تھی' جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ صاحب بہادر کی آنکھیں بڑی ملارت سے ملا کرتی تھی!

بھاگلپور میں مسٹر سینڈیز ایک سیشن جج تھے۔ ان کی بیوی نے قدم قدم پر کلکٹر کی بیوی سے بڑے بڑے معرکے جمائے۔ مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا! لیکن کلکٹر کی بیوی آخر کلکٹر کی بیوی تھی۔ جیت اسی کی ہوتی تھی۔ تنگ آ کر مسز سینڈیز نے سیشن جج کا جھنڈا سر بلند کرنے کے لیے ایک اچھوتی تجویز نکالی۔ اس نے جج صاحب کی عدالت پیپل کے ایک پرانے درخت کے اوپر قائم کر دی۔ ایک مضبوط تنے پر سیمنٹ کی چوکی بنا دی گئی۔ اس پر مخملی تکیے رکھے گئے اور اب ہر روز جج صاحب اس نشست پر بیٹھ کر اپنا اجلاس کرنے لگے۔ ایک قریبی شاخ پر پیشکار صاحب بیٹھتے تھے۔ کسی ٹہنی پر

ملزم ننگا ہوتا تھا' کسی پر گواہ۔ البتہ وکیل صاحبان کو زمین پر کھڑا ہو کر بحث کرنے کی اجازت تھی! اگر ڈپٹی کمشنر کی بیوی اب بھی اپنی ہار نہ مانتی' تو غالباً ان کے شوہر کو اپنا دفتر کھجور کے پیڑ پر کھولنا پڑتا۔

پرانے زمانے میں ایک صاحب مسٹر سنوڈگراس برہم پور گنجام کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کو اور ان کی میم صاحبہ کو تیراکی کا بے حد شوق تھا۔ ضلع میں ایک بہت بڑی چلکا لیک نامی جھیل تھی۔ اس میں ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے وہاں پر ایک خوبصورت سا کمرہ تعمیر کروا لیا۔ ہر صبح میاں بیوی تیر کر وہاں چلے جاتے تھے۔ صاحب بہادر تو بیر پی کر سو رہتے اور میم صاحبہ ان کی فائلوں سے کاغذی ناؤ بنا بنا کر اپنا جی بہلایا کرتیں۔ ہوتے ہوتے سارے کا سارا دفتر غرق مے ناب ہو گیا! انجام کار لیفٹیننٹ گورنر نے فوج کا ایک دستہ بھیج کر میاں بیوی کو ان کے حسین جزیرے سے برآمد کیا۔

ڈپٹی کمشنر کی یہ تاریخی جنس اب بالکل نایاب ہے۔ وہ پچھلے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ بھی اب قائم نہیں رہے۔ نوکروں چاکروں کا ہجوم اب گھٹتے گھٹتے قریباً مفقود ہو رہا ہے۔ اب ڈپٹی کمشنر کے عملے کا ایک اردلی احتیاطاً موٹر ڈرائیوری سیکھ رکھتا ہے۔ دوسرا اردلی کھانا پکانے کی تربیت حاصل کر لیتا ہے اور نظارت کے کچھ چپراسی وقتاً فوقتاً بیروں اور خدمت گاروں کی ڈیوٹی کے لیے بھی آمادہ رہتے ہیں۔ شروع شروع میں ان اردلیوں اور چپراسیوں نے یہ اضافی ٹریننگ محض حفظ ماتقدم کے طور پر لینا شروع کی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ ڈپٹی کمشنر کی کار' کچن اور بنگلہ چلانا ان کا پیدائشی حق بنتا جا رہا ہے۔ اب اگر کوئی ڈپٹی کمشنر اپنے ساتھ اپنا خانساماں یا ڈرائیور لے آئے تو مقامی عملہ اسے اپنی حق تلفی سمجھتا ہے۔

اگرچہ آجکل ڈپٹی کمشنروں کو پچھلے زمانے والے جہانگیری ٹھاٹھ میسر نہیں ہیں' لیکن ان کی بیویوں میں نورجہاں کی روح اکثر و بیشتر حلول کرتی رہتی ہے۔ انگریزوں کے بعد ہمارے سیشن جج صاحبان کی بیگمات نے ڈپٹی کمشنر کی بیوی کے ساتھ رقابت کا میدان قریباً قریباً

خالی کر دیا ہے۔ لیکن اب یہ خلا کپتان پولیس کی بیوی بڑی کامیابی سے پورا کرتی ہے۔
ڈپٹی کمشنر کی بیوی اپنے آپ کو ضلع کی خاتون اول سمجھتی ہے لیکن تھانیداروں' ہیڈ کانسٹیبلوں

اور عادی مقدمہ بازوں کی بیویاں ہمہ وقت ایس۔ پی کی بیوی کو احساس دلاتی رہتی ہیں کہ تمہارا میاں بھی تو ضلع کا برابر کا مالک ہے۔ اگر پولیس کا سہارا نہ ہو تو ڈپٹی کمشنر کی مجال ہے کہ بنگلے سے باہر قدم بھی رکھ سکے۔
ڈپٹی کمشنر کی بیوی کہتی ہے کہ "لو مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ یہ منہ اور مسور کی دال! کپتان پولیس ہے تو اپنی بیوی کے لیے ہو گا۔ وردی پہن کر سلیوٹ تو میرے میاں ہی کو کرتا ہے۔" اس سلسلے میں مجسٹریٹ صاحبان' وکیلوں' تحصیلداروں' میونسپل کمشنروں اور ممبران ڈسٹرکٹ بورڈ کی بیگمات بڑی شد و مد سے ڈی۔ سی کی بیوی کی تائید کرتی ہیں۔
اب ضلع میں خواتین کی سرگرمیاں دو متوازی خطوط پر چلنے لگی ہیں۔ اگر وہاں پر کوئی انجمن خواتین ہے تو وہ دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ لڑکیوں کے اسکول تقسیم انعامات کے لیے دو دو جلسے منعقد کرتے ہیں۔ یتیم خانوں کی تقریبات تعداد میں دگنی ہو جاتی ہیں۔ میلاد شریف کی محفلیں بھی دونوں بیبیوں کی صدارت میں الگ الگ منعقد ہوتی ہیں۔ رؤسا اور زمینداروں کی بیویاں اکثر دونوں قسم کی تقریبات میں شرکت کرتی ہیں اور حسب توفیق اس متوازی ماحول کو تقویت پہنچاتی رہتی ہیں۔
بیویوں کی یہ چپقلش رفتہ رفتہ نوکروں میں سرایت کرنے لگتی ہے اور ڈپٹی کمشنر اور کپتان پولیس کے بیروں' خانساماؤں' آیاؤں اور چپراسیوں میں بڑے زور سے ٹھن جاتی ہے۔
جا زار میں ڈپٹی کمشنر کا حجام کپتان پولیس کے حجام پر دھونس جماتا ہے اور ایس۔ پی کا قصاب ڈپٹی کمشنر کے قصاب کو طعنے دیتا ہے۔ اگر یہ تفرقات ان بیویوں کے شوہروں پر بھی اثر انداز ہونا شروع ہو جائیں تو ضلع بھر میں خانہ جنگی کا سماں بندھ جاتا ہے۔
مجسٹریٹ صاحبان پولیس کے مقدمات پے در پے خارج کرنا شروع کر دیتے ہیں اور

تھانیدار مجسٹریٹوں کے خلاف بیانات جمع کرنے لگتے ہیں۔ اس مسموم فضا میں اگر کوئی پنپتا ہے تو وہ شہر کے غنڈے اور عادی مجرم ہوتے ہیں۔ کیونکہ دونوں پارٹیوں کے کارکن ان کی خدمات سے مستفید ہونے کی ہر ممکن سعی کرتے ہیں!

بھلے وقتوں میں ہمیشہ ڈپٹی کمشنر کا پلہ بھاری رہا کرتا تھا کیونکہ قانون نے ضلع کا بڑا حاکم اسی کو تسلیم کیا ہے۔ یوں تو قاعدے کی رو سے اب بھی کپتان پولیس ڈپٹی کمشنر کے ماتحت ہوتا ہے۔ لیکن اب جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ جمہوری نظام کی برکتوں میں سب سے بڑی برکت الیکشنیں ہیں۔ کبھی میونسپل کمیٹی کی الیکشن' کبھی ڈسٹرکٹ بورڈ کی الیکشن۔ کبھی اسمبلی کے انتخابات۔ ہر وقت ایک نہ ایک الیکشن کا ہنگامہ گرم رہتا ہے۔ ان ہنگاموں میں امن عامہ کو جو خطرات لاحق ہوتے ہیں وہ کسی صاحب بصیرت کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ان خطرات کی روک تھام کے لیے ہمیشہ پولیس ہی خوش اسلوبی سے کام آتی ہے۔ چنانچہ ارباب سیاست بھی عام طور پر پولیس کپتانوں کی خوشنودی برقرار رکھنا قرین مصلحت سمجھتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر مقامی تنازعوں میں فتح کا سہرا سپرنٹنڈنٹ پولیس ہی کے سر رہتا ہے اور ڈپٹی کمشنر اپنا سا منہ لے کر تبدیل ہو جاتا ہے یا طویل رخصت پر وداع ہو جاتا ہے۔

خدا کے فضل و کرم سے میں فی الحال بیوی کی نعمت سے محروم ہوں۔ میرے ایس پی کی بیوی بھی پردے کی پابند ہے۔ اس لیے ہمیں اس داخلی نزاع کا مسئلہ درپیش نہیں آتا۔

اگرچہ میری بیوی نہیں ہے لیکن جس بنگلہ میں میں رہتا ہوں' اس میں ایک چھوڑ دو دو بیویوں کی گنجائش ہے۔ کوٹھی کی پشت پر ایک وسیع صحن ہے۔ اس میں کچی دیوار کھینچ کر اسے دو حصوں میں منقسم کیا ہوا ہے کیونکہ میرے ایک پیشرو بہ یک وقت دو بیویوں کے خاوند تھے۔ اللہ کے فضل سے یہ دو صحن بھی کافی وسیع ہیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ جب کوئی صاحب یہاں چار بیویاں لے کر آئے گا تو ان کا اس کوٹھی میں

گزارہ بھی بڑی سہولت سے ہو جائے گا۔

○○○

• الیکشن

مہینہ بھر سے سارے صوبے میں تبادلوں کا ہیضہ سا پھوٹ پڑا تھا۔ ڈپٹی کمشنروں کے تبادلے ہو رہے تھے۔ تحصیلداروں اور تھانیداروں کی تبدیلیاں زوروں پر تھیں اور سیاست کی بساط پر افسروں اور اہلکاروں کے مہرے بڑے چابکدستی سے سجائے جا رہے تھے کیونکہ الیکشن کی شطرنج شروع ہونے والی تھی اور اس کھیل پر وزیروں اور وزارتوں نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔

اسی زمانے میں "زیادہ اناج اگاؤ" کی مہم بھی اپنے جوبن پر تھی اور افزائش غلہ کے سلسلے میں کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں، پولیس کپتانوں اور محکمہ مال، محکمہ زراعت، محکمہ جنگلات اور محکمہ سول سپلائی کے جملہ افسروں کی ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس صوبائی دارالحکومت میں طلب کر گئی۔

فضیلت مآب چیف منسٹر اور جملہ عزت مآب منسٹر صاحبان نے خاص طور پر اس کانفرنس کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا۔

چیف منسٹر نے اناج کی فضیلت اور کیمیائی کھاد کی برکتوں پر ایک برجستہ تقریر کی، جو وہ لکھوا کر لائے ہوئے تھے۔

اس کے بعد انہوں نے اخلاقیات پر کچھ کلمات خیر فی البدیہہ وعظ فرمائے اور بر سبیل تذکرہ الیکشن کے دوران سرکاری ملازموں کو شدید طور پر غیر جانبدار اور بلند کردار رہنے کی تلقین کی۔

"حضرات۔" چیف منسٹر نے مربیانہ سرپرستی کے انداز میں سنجیدگی سے کھنکار کر کہا۔ "یہ الیکشن آپ کی ایفی شنسی کی آزمائش ہے۔ اگر آپ نے اپنے فرائض بعنوان شائستہ انجام دیئے تو سمجھئے آپ کامران ہیں۔"

"ورنہ" چیف منسٹر کے چہرے پر رموز سلطنت کی خشونگی نمودار ہوئی۔ "ورنہ حکومت اپنا

فرض پورا کرنے میں تساہل نہ کرے گی۔ اگرچہ وہ کتنا تلخ ہی کیوں نہ ہو۔"

فرائض منصبی کی اس تلخ گتھی کو وزیر صاحبان کے ناخن تدبیر نے کھول کر رکھ دیا۔

جب "زیادہ اناج اگاؤ" کی کانفرنس اپنا اہم ایجنڈا پورا کر چکی' تو ہر عزت ماب وزیر اپنے اپنے علاقے کے ڈپٹی کمشنر کے کندھے پر دست شفقت رکھ کے الگ لے گیا اور اس کے حوالے ایک بنی بنائی فہرست کر دی جس میں تفصیلا تفصیلا یہ درج تھا کہ کون سے علاقے سے کونسا امیدوار عوام کا حق نمائندگی پوری طرح ادا کرنے کا اہل ہے اور کون کون سے امیدوار کو ہر قیمت پر ناکام کرنا باعث ثواب ثابت ہو گا۔

ڈپٹی کمشنر صاحبان نے دل و جان سے کاغذ کے بنے ہوئے یہ "جھرلو" اپنی جیب میں ڈال لیے۔ عام زندگی میں "جھرلو" گھمانا مداریوں کا کسب ہے۔ جادو کی یہ چھڑی گھما کر مداری خالی تھیلے سے زندہ کبوتر اور بند ٹوکروں سے آم لگے ہوئے پیڑ برآمد کرتے ہیں لیکن جب یہ "جھرلو" الیکشن کے موقعہ پر ڈپٹی کمشنر کے اشارے پر گھومتا ہے تو عوام کی ہتھیلیوں پر سرسوں کے کھیت جم جاتے ہیں۔ پولیس کی حفاظت میں مقفل تہہ خانوں کے کواڑ "کھل جا سم سم" کے جادو سے وا ہو جاتے ہیں۔ لوہے کی سر بمہر صندوقچیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور نااہل امیدواروں کے نام پڑے ہوئے ووٹ تناسخ ارواح کے اصول پر لائق و فائق امیدواروں کے بکسوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہی "جھرلو" ووٹوں کی جعلی پرچیاں بنوا دیتا ہے۔ اسی "جھولو" کے فیض سے ووٹوں کی تعداد ووٹروں کی تعداد سے کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور یہ اسی "جھرلو" کی برکات کا نزولی ہے کہ افسروں کہ ترقیاں ہوتی ہیں' ان کے تبادلے رکتے ہیں اور ان کے عزیزوں' رشتہ داروں اور طفیلیوں کو نوکریاں اور امپورٹ پرمٹ ملتے ہیں۔

الیکشن کا کاروبار بلیک مارکیٹ سے زیادہ وسیع اور دست غیب سے زیادہ طلسماتی ہے۔ دو ڈھائی لاکھ کی آبادی میں سے صرف ایک مائی کا لال منتخب ہوتا ہے۔ بے زبان کاشت کاروں' مزارعوں' مزدوروں کی یہ آبادی سینکڑوں مربع میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں نہ زیادہ ریڈیو ہیں' نہ اخبار پڑھے جاتے ہیں اور یوں بھی آمدورفت کے وسائل

بیل گاڑیوں' چھکڑوں اور مسافروں سے اثاث بھری ہوئی اکا دکا بسوں سے آگے نہیں بڑھے۔ چنانچہ ایک عام' سیدھا سادا امن پسند دیہاتی شادی' غمی اور دیگر بلاہائے ناگہانی کی مجبوریوں کے علاوہ یونہی خواہ مخواہ سفر وسیلہ ظفر کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوتا۔ عوام جو گاؤں گاؤں' قریہ قریہ' بکھرے ہوئے ہیں اپنے ذاتی ماحول' اپنے آس پاس کے چند ہمسایوں اور اپنے دکھ درد کے ساتھیوں کے علاوہ باقی دنیا سے نہ تو شناسا ہیں اور نہ اس قسم کی شناسائی پیدا کرنے کے وسائل ان کو میسر ہیں۔ دو ڈھائی لاکھ گدڑیوں میں چھپا ہوا ایک لعل ڈھونڈ نکالنا جو ان کی نمائندگی کا حق ادا کر سکے ہرگز ہرگز ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔

چنانچہ عوام کے نمائندوں کا چناؤ اکثر لاہور' پشاور' حیدر آباد' کراچی اور ڈھاکہ کے شہروں میں بیٹھ کر ہوتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے دفاتر' اسمبلی ہالوں' حکومت کے ایوانوں میں پس پردہ سودا ہوتا ہے۔ ٹکٹ دینے اور ٹکٹ حاصل کرنے پر تن' من' دھن کی بازیاں لگتی ہیں۔ قرآن شریف کے صفحوں پر وفاداری کے حلف نامے تحریر ہوتے ہیں۔ پرانی دشمنیاں موقوف' نئی دشمنیاں شروع ہوتی ہیں۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے پرمٹوں کا بازار گرم ہوتا ہے۔ نئے ٹرکوں اور نئی بسوں کے روٹ پرمٹ جاری ہوتے ہیں۔ عدالتوں میں چلتے ہوئے سنگین مقدمات داخل دفتر ہو جاتے ہیں۔ نئے الزامات اور نئے مقدموں کی مسلیں کھل جاتی ہیں۔ ڈپٹی کمشنروں' پولیس کپتانوں' مال افسروں' مجسٹریٹوں' تحصیلداروں' تھانیداروں' گرداواروں' پٹواریوں' نمبرداروں' زمینداروں' گماشتوں' صنعت کاروں' بڑے بڑے تاجروں کے زیر سایہ الیکشن کے "جھرلو" بڑی سرعت سے چلنے لگتے ہیں اور ووٹروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک ہانک کر پیدل یا چھکڑوں میں یا ٹرکوں میں لاد لاد کر پولنگ بوتھ پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ آزاد مملکت کے آزاد شہری اپنا جمہوری حق ادا کرنے کے لیے کاغذ کی پرچیاں اس صندوقچی میں ڈال آئیں جس پر لاہور' پشاور' حیدر آباد یا ڈھاکہ کی خوشنودی کی مہر پہلے ہی ثبت ہو چکی ہے!

اگر ماحول سازگار ہے، تو پرچیاں ڈالنے کے فوراً بعد جملہ ووٹروں کو آزاد کر کے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جس طرح اور جس طرف ان کے سینگ سمائیں اور بڑی خوشی سے تشریف لے جا سکتے ہیں ورنہ اگر مقابلہ سخت ہے تو ووٹروں کو ایک وقت کا کھانا اور ان کے سربراہوں کو نقد نذرانہ دے کر بصد عزت و احترام رخصت کر دیا جاتا ہے۔

جمہوریت کے اس مضحکہ خیز ڈھونگ میں بعض ووٹروں کو اکثر اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا کہ جس کے حق میں اس نے اپنی پرچی ڈالی ہے، وہ انسان ہے یا تار کا کھمبا!

جب پاکستان بن رہا تھا تو کانگرس کے مقابلہ میں جنگ آزادی کو فروغ دینے کے لیے قائداعظم نے اپیل کی تھی کہ ہر مسلمان صرف اس کو ووٹ دے جس پر مسلم لیگ کا لیبل لگا ہوا ہو ------- خواہ وہ بجلی کے تار کا کھمبا ہی کیوں نہ ہو۔

مسلمان عوام نے اپنے محبوب رہنما کا ارشاد سر آنکھوں پر لیا اور چن چن کر ایسے تار کے کھمبوں کو جی بھر کر ووٹ دیئے کہ پاکستان بن بھی گیا، حکومت چل بھی پڑی، حالات معمول پر آ بھی گئے لیکن یہ تار کے کھمبے بدستور اپنی اپنی جگہ ایستادہ رہے۔

زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ حتیٰ کہ کھمبوں کے تار الجھ الجھ کر، جھنجھنا جھنجھنا کر ٹوٹنے لگے------ بجلی کے بلب فیوز ہو گئے------ نور کی جگہ ظلمت چھانے لگی اور مارشل لاء کی ریت وجود میں آ گئی۔

ایک علاقے کے چند کھاتے پیتے، تعلیم یافتہ نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ الیکشن کے موقعہ پر کسی قسم کے "جھرلو" کے دام فریب میں گرفتار نہ ہوں گے بلکہ رائے عامہ کو آزادانہ اور بے باکانہ طور پر اثر انداز کرنے کا جہاد کریں گے۔ اس علاقے کے مستقل اور سند یافتہ عزت ماب وزیر نے یہ خبر سن کر بہت واہ واہ کی۔ تعلیمی ترقی اور جمہوری بیداری کے عنوان پر بڑ خوشگوار قصیدے گائے اور ان نوجوانوں کے نیک ارادوں پر حکومت وقت کی خوش سگالی کی سند چپکانے کے لیے وزیر صاحب نے ان سب کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو فرمایا۔ پر تکلف دعوت اڑی۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوئیں اور جب وہ نوجوان کافی

کی پیالیاں لے کر آرام سے صوفوں پر بیٹھ گئے تو یکایک کمرہ بند کر کے باہر قفل لگا دیا گیا! ایک یا دو روز بعد جب الیکشنوں کی مہم اچھی طرح سر ہو گئی تو یہ بلند ہمت نوجوان بھی رہائی پا کر خیر سے بدھو گھر کو آئے!

ایک مزارع کی بیوی چار بچوں' دو بیلوں' چند برتنوں اور کچھ کپڑوں کا اثاثہ سمیٹے سرراہ خانہ بدوشوں کی طرح بیٹھی تھی۔ اس کے خاوند نے زمیندار کی مرضی کے مطابق اپنا ووٹ ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس جرم کی سزا میں اسے کھڑے کھڑے زمین سے بے دخل کر دیا گیا۔ مکان چھین گیا۔ زمیندار کے گماشتے مزارع کو پکڑ کر تھانے لے گئے۔ تھانیدار نے چوری کے الزام میں اس کا پرچا کاٹا اور بیوی بچے اپنے دو بیلوں سمیت سڑک کے کنارے بیٹھ کر جمہوری راج کی برکتوں کا فیض پانے لگے۔

ایک اچھے خاصے متوسط درجہ کے خاندان کا سربراہ اچانک لاپتہ ہو گیا۔ الیکشن کے سلسلے میں وہ کچھ ناپسندیدہ قسم کی اکڑفوں دکھا رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے درخواست دی کہ الیکشن کے روز میرے باپ کو مخالف پارٹی نے اٹھا کر نہر میں پھینک دیا تھا۔ اب تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ درخواست پر تفتیش کا حکم جاری ہوا۔ رپورٹ آئی۔ ''مسمی مذکور عرصہ سے مفقود ہے۔ پسر مسمی مذکور کا الزام بے بنیاد ہے۔ چنانچہ پسر مذکور کو زیر جرم قانون دروغگوئی ماخوذ کیا جائے۔ چالان زیر تکمیل ہے۔ درخواست ہذا داخل دفتر ہو۔''

ایک دور افتادہ قصبے میں ایک مولوی صاحب تھے۔ پاکیزہ صورت' پاکیزہ سیرت' علم و فضل سے بہرہ مند' خدمت خلق کے جذبے سے سرشار' ضعیفی اور نحیفی میں بھی جوانوں سے زیادہ ہمت اور عزم کے مالک۔ انہوں نے ایک دارالعلوم اور ایک ہائی سکول بھی قائم کر رکھا تھا۔ بچوں سے کوئی فیس نہ لی جاتی تھی۔ کتابیں بھی سکول کی طرف سے مفت تقسیم ہوتی تھیں۔ اس علاقے کی بیشتر آبادی مولوی صاحب کے خلوص کی قائل اور ان کی بزرگی کی عقیدت مند تھی۔ غریب سے غریب کسان بھی فصل آنے پر حسب

توفیق گندم یا کپاس یا دھان مولوی صاحب کے بیت المال میں ڈال آتا تھا' جس سے سکول بھی چلتا تھا' دارالعلوم بھی۔ اور یوں بھی کئی طرح سے غریب غربا کی امداد ہوتی رہتی تھی۔ اس تجربے کی کامیابی نے ہمت بڑھائی اور مولوی صاحب کو شوق ہوا کہ سکول کو وسعت دے کر کالج بنا دیا جائے اور اگر کالج بھی چل نکلے تو اس بنیاد پر ایک مکمل اسلام یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی جائے۔ منصوبہ بلند و بالا تھا اور اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا شوق رفتہ رفتہ جنون کی صورت اختیار کر گیا۔ مولوی صاحب کے بہت سے عقیدت مند زندگی کا گرم سرد دیکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے رائے دی کہ ایسے عالیشان منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہے کہ مولوی صاحب صوبائی اسمبلی میں ممبر بن کر جائیں اور وہاں پر اپنے تعلیمی عزائم کے حق میں آواز اٹھائیں۔

مولوی صاحب گوشہ نشین بزرگ تھے۔ سیاسی ریشہ دوانیوں سے الگ تھلگ۔ اقتدار کی ہوس سے بے نیاز۔ لیکن اپنے تعلیمی منصوبوں کی تڑپ میں وہ چار و ناچار سیاست کے میدان میں اتر ہی آئے اور اگلی الیکشن میں کسی سیاسی پارٹی سے ناطہ جوڑے بغیر ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہو گئے۔ ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ وہ سب سیاسی جماعتوں کے ساتھ مساوی سلوک روا رکھیں تاکہ ان کے تعلیمی پروگرام کو ان سب کی حمایت یکساں طور پر حاصل ہو سکے۔

اپنے علاقے میں دور دور تک مولوی صاحب کا ڈنکہ بج رہا تھا۔ لوگوں نے جوق در جوق ان کے نام ووٹ ڈالے۔ یہاں تک کہ صوبے میں جس جگہ سب سے زیادہ عورتوں نے ووٹ ڈالے وہ مولوی صاحب ہی کا حلقہ تھا۔ بہت سی عورتوں نے حسن عقیدت کے جوش میں "فتویٰ" صادر کر دیا تھا کہ جو مرد مولوی صاحب کو ووٹ نہ دے گا' اس کا نکاح اپنی بیوی سے فسق ہو جائے گا! الیکشن کے روز گاؤں گاؤں کی عورتیں ٹولیاں بنا کر نکلیں اور حمد و ثنا کے گیت اور نعتیں گاتی مولوی صاحب کی صندوقچی میں اپنے ووٹوں کے علاوہ جوش عقیدت میں چاندی کے چھوٹے چھوٹے زیور' نقدی' ریشم کے دھاگے بھی ڈال آئیں۔

سیاست کی باسی کڑھی میں خدمت اور خلوص کا یہ ابال ایک نیا عجوبہ تھا۔
شام کو جب ووٹوں کی سربمہر صندوقچیاں مسلح کانسٹیبلوں کی حفاظت میں تحصیل کے خزانے

میں پہنچ گئیں تو راتوں رات سیاست کا "جھرلو" گردش میں آیا اور صبح ہوتے ہوتے
قبلہ مولوی صاحب تو اپنے حجرے میں بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے اور ان کا وہ حریف بھاری
اکثریت سے الیکشن جیت گیا' جو پچھلے کئی سال سے اسمبلی کی اس موروثی نشست کا
جانشین بنا بیٹھا تھا' جس کے سر پر سرکار کی خوشنودی کا سایہ اور ہاتھ میں ایک منظم سیاسی
پارٹی کا جھنڈا تھا اور جس کے گھر تین منکوحہ بیویوں کے علاوہ بہت سے کتے اور کئی
دوسری طرح کے لوازمات بھی موجود تھے۔

○○○

• اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے

جس طرح "زیادہ اناج اگاؤ" کی مہم ایک مستقل نعرہ بن گئی ہے اسی طرح رہبر بنو اور رہبر بناؤ کی تحریک بھی ایک ہمہ گیر مشغلے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

سیاسی جڑی بوٹیوں کی طرح رہبروں کی بھی دو خاص صورتیں ہیں۔ ایک انتخاب جیتنے سے پہلے دوسری انتخاب ہارنے کے بعد پہلی صورت میں عموماً سفیر یا وزیر پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں جو رہبر وزارت اور سفارت کی اسامیوں سے بال بال بچ جائیں' انہیں قوم کا غم کھانے اور ڈپٹی کمشنروں کا ہاتھ بٹانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔

قوم کا غم کھانے والے رہبر قوم کا غم بڑی خوش اسلوبی سے کھاتے ہیں۔ اگر یہ غمخوار طبقہ عالم وجود میں نہ رہے تو بیچاری قوم بہت جلد گنجی ہو جائے۔ لیکن جو رہبر فقط ڈپٹی کمشنروں کا ہاتھ بٹانے پر مامور ہیں' ان کی ذات سے چشم ما روشن اور دل ماشاد ہوتے ہیں۔

اسی طرح کے ایک رہبر اس وقت مجھے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی چال ڈھال اور ان کے سارے انداز پکار پکار کر پوچھتے ہیں "کہئے صاحب کوئی سنگین واردات تو نہیں ہوئی؟ اگر نہیں ہوئی تو کیوں نہیں ہوئی؟ ضرور ہوئی ہو گی۔ یہ بھی کوئی بات ہے بھلا کہ ہر روز زنا بالجبر ہو؟ خون خرابہ نہ ہو؟ مالک اور مزارع کی لڑائی نہ ہو؟ رشوت ستانی نہ ہو؟ خویش پروری نہ ہو؟ ناانصافی نہ ہو؟ ------ ارے صاحب' یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور ڈنکے کی چوٹ ہو رہا ہے۔ فقط آپ کی اطلاعات کمزور ہیں۔" وہ میز پر مکا مار کے اعلان کرتے ہیں۔

"کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں۔" رہبر صاحب بے الجھن میں ہیں۔ "اگر ایک قصہ ہو تو کچھ تفصیلات بھی عرض کروں۔ لیکن ایں خانہ تمام آفتاب است------ یہاں پر تو قدم

قدم پر یہی رونا ہے۔ آہ! نہ جانے اس بدنصیب قوم کا کیا انجام ہونے والا ہے۔"

جی تو بہت چاہتا ہے کہ بچاری قوم کے انجام سے پیشتر میں انہیں ان کے چھوٹے بھائی کے انجام کی بشارت دوں' جو اگلے روز چینی کی بلیک مارکیٹ کرتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ لیکن مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ میں خاموش رہوں۔ یہ رہبر صاحب کئی بار اعلان کر چکے ہیں کہ صوبے کے کئی اخبار ان کی مٹھی میں ہیں اور اگر ابھی تک ان میں میرے خلاف کوئی بیان شائع نہیں ہوا' تو یہ محض ان کی نظر التفات کا فیض ہے۔

باتیں کرتے کرتے اچانک دور سے کئی بندوقیں چلنے کی آواز آتی ہے۔ رہبر صاحب اپنی کرسی پر اچھل پڑتے ہیں۔ "آپ نے کچھ سنا؟ یہ مہاجر کالونی میں فائرنگ ہو رہی ہے۔ آج صبح میں نے پولیس کے کئی ٹرک اس طرف جاتے دیکھے تھے۔ کئی سال سے غریب مہاجر وہاں امن سے بیٹھے ہیں۔ اب پولیس انہیں زبردستی وہاں سے اٹھا رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں آخر یہ ظلم کب تک جاری رہے گا؟ مجھے اجازت دیجئے۔ میرا وہاں پہنچنا اشد ضروری ہے۔"

میں انہیں اطمینان دلاتا ہوں کہ یہ پولیس کی فائرنگ نہیں بلکہ رائفل کلب میں بندوق چلانے کی مشق ہو رہی ہے۔ اور اپنا دل ہلکا کرنے کے لیے میں شہری دفاع پر وہ پوری تقریر دہراتا ہوں جو آج صبح میں نے رائفل کلب کی رسم افتتاح پر کی تھی۔

میری تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوتا ہے۔ اور جناب رہبر مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں------ یوں بھی یہ حضرت مایوسی کے دائمی مریض ہیں۔ اگر کوئی برقعہ پوش عورت ان کے سامنے بازار میں صحیح سالم گزر جائے تو وہ بے حد مایوس ہو جاتے ہیں کہ کسی صاحب دل نے آگے بڑھ کر اس کا برقعہ کیوں نہیں نوچ ڈالا؟ اگر عورتیں اسی طرح امن و امان' عزت و آبرو سے چلتی پھرتی رہیں تو جلسوں میں گلا پھاڑ پھاڑ کر قوم کی خدمت کیسے ہو گی؟ اگر ہر روز امن عامہ میں خلل واقع نہ ہو تو اخباروں میں دھواں دھار بیانات کون چھپوائے گا؟

جاتے جاتے رہبر صاحب اپنی قیمتی قراقلی ٹوپی جان بوجھ کر میری میز پر بھول جاتے ہیں۔

یہ اس بات کی علامت ہے کہ کچھ وقفہ کے بعد وہ اپنی ٹوپی لینے کے بہانے دوبارہ تشریف لائیں گے اور اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں میری معلومات میں اضافہ فرمائیں گے جو اگلے روز چینی کی بلیک مارکیٹ کرتے پکڑا گیا تھا!

یہ لیڈر ذرا جلالی ٹائپ کے رہبر ہیں۔ ان کے برعکس ایک سرتاپا جمال رہبر ہیں' جو مجھے ملتے ہی پوچھتے ہیں۔ "آپ کے تبادلے کی کوئی خبر تو نہیں؟"

"جی نہیں' میں نے تو کوئی خبر نہیں سنی۔"

"کوئی پروا نہیں۔" جمالی رہبر صاحب بڑے اصرار سے میری ڈھارس بندھاتے ہیں۔ "اگر کوئی ایسی ویسی خبر اڑے' تو بلا تامل مجھے بتا دیجئے گا۔ میں لاہور جا کر سارا بندوبست کر دوں گا۔"

مجھے بار بار ان کو یقین دلانا پڑتا ہے کہ فی الحال میرے تبادلہ کا کوئی اندیشہ نہیں۔ میرے بھائی بندوں پر کوئی مقدمہ نہیں چل رہا۔ میرے بھتیجوں اور بھانجوں پر کوئی آفت نازل نہیں ہوئی------ لیکن جمالی لیڈر صاحب مصر ہیں کہ اگر آج نہیں تو کل مجھے اس قسم کے حادثات سے لازمی طور پر دوچار ہونا ہی پڑے گا۔ لہٰذا میری عافیت اسی میں ہے کہ میں ان کی فرمانبرداری' سعادت مندی اور ان کے خلوص پر مکمل اعتماد رکھوں۔

اس یقین دہانی کے بعد وہ یکایک اپنی جیب سے ایک فہرست برآمد کرتے ہیں۔ اس فہرست میں چند پٹواریوں اور تھانیداروں کے نام درج ہیں جنہیں رہبر صاحب رفاہ عامہ کے خیال سے کسی اور جگہ تبدیل کرانا چاہتے ہیں۔

"مجھے ذاتی طور پر ان ملازموں سے کوئی پرخاش نہیں۔" جمالی صاحب فرماتے ہیں۔ "البتہ عوام کی سہولت اور خیر سگالی کا خیال ہے۔ اگر یہ صاحبان تبدیل ہو جائیں تو عوام کے سر سے ایک بہت بڑی بلا ٹل جائے گی۔"

سرکاری ملازموں کا یہ رد و بدل ان رہبروں کی محبوب مشغلہ ہے۔ رفاہ عامہ کی آڑ میں دراصل یہ حربہ علاقائی کارندوں پر دھونس قائم رکھنے کا موثر ذریعہ ہے۔ اگر ڈپٹی کمشنر اس قسم کے ہتھکنڈوں سے بے نیاز رہنے کی کوشش کرے تو بہت جلد اس غریب کا

اپنا تبادلہ ہو جاتا ہے!

لیڈروں کے طبقہ میں سب سے مشکل پسند برادری ان رہنماؤں کی ہے جو سیاست کی جگہ خالص مذہبی پیشوائی پر گزارہ کرتے ہیں۔ عید بقر عید کی طرح ان کا کاروبار بھی سال بھر میں فقط ایک یا دو بار چمکتا ہے۔ خاص طور پر محرم کے دنوں میں ان کی کارگزاریاں بہت زور پکڑ لیتی ہیں۔ کہیں جلوس کے راستوں پر تنازعہ ہے' کہیں تعزیوں کی لمبائی پر تکرار ہے۔ کسی زمانے میں جب ہولی یا دسہرے کے جلوس مسجدوں کے آگے سے گزرتے تھے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اچھا خاصا میدان کارزار گرم ہو جاتا تھا لیکن آزادی بھی ملی' اور ہندو بھی گئے۔ پھر بھی جلوسوں اور مساجد کا تصادم اسی گرم بازاری سے جاری ہے۔

ظہر کا وقت ہے۔ محرم کا جلوس نکلا ہوا ہے۔ سنیوں کی مسجد میں معمول سے زیادہ نمازی جمع ہیں۔ جلوس نے اپنی رفتار جان بوجھ کر سست کر دی ہے تاکہ جب اذان کی آواز بلند ہو تو لپک کر مسجد کے عین سامنے پہنچا جائے۔ ادھر موذن کو انتظار ہے کہ جلوس نزدیک آئے تو خدا کے بندوں کو نماز کے لیے پکارا جائے------ باہر جلوس اور اندر جماعت دو مخالف فوجوں کی طرف صف آرا ہو جاتے ہیں۔ لیکن عین اس وقت اس علاقہ کا تھانیدار یا مجسٹریٹ دونوں فریقوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے نمائندے ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیجیں۔ فریقین کے پیشوا اپنے اپنے "وفود" لے کر بصد تزک و احتشام ڈپٹی کمشنر کے پاس آتے ہیں۔ اب اگر ڈپٹی کمشنر نے سال بھر سے ان رہنماؤں کے ساتھ مربیانہ خیر سگالی کے تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔ تو بہت جلد مصالحت کے آسان آسان راستے نکل آتے ہیں۔ ورنہ اگر بدقسمتی سے "وفود" میں سے کسی صاحب کا راشن ڈپو ان کی بدعنوانیوں کی وجہ سے منسوخ ہو چکا ہے' یا کسی صاحب کو ٹرک چلانے کا لائسنس نہیں ملا' یا کسی صاحب کی دکان کی الاٹمنٹ معرض التوا میں ہے' یا کسی صاحب کے فرزند ارجمند کو ضلع کچہری میں ملازمت نہیں ملی' تو.........

ایک گاؤں میں اچانک خطرناک قسم کی کشیدگی نمودار ہو گئی۔ مسئلہ متنازعہ یہ تھا کہ

درود و سلام کے دوران "یا رسول اللہ" کہنا جائز ہی نہیں بلکہ باعث برکت بھی ہے۔ دوسرے مولوی صاحب اسے ناجائز اور بدعت قرار دیتے تھے۔ علماء کرام کے دائرے سے پھیلتی

پھیلتی یہ بحث سارے گاؤں میں سرایت کر گئی۔ اس آڑ میں بہت سی ذاتی رنجشوں' اقابتوں اور مخاصمتوں نے بھی اپنا رنگ دکھایا اور رفتہ رفتہ گاؤں کے بہت سے لوگ آپس میں برسر پیکار ہو گئے۔ ایک دوسرے کے مویشی چرائے گئے۔ سر پھٹول ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں فساد اور بدامنی کے ایک مستقل چکر میں بری طرح پھنس گیا۔ آخر کار دونوں مولویوں کو گرفتار کر کے باہر بھیج دیا گیا اور جب پوری تفتیش کے بعد اس جھگڑے کا پہاڑ کھودا گیا تو اس میں سے سیاست کی ایک چھوٹی سی چوہیا برآمد ہوئی۔ گاؤں میں ایک نمبردار صاحب تھے جو کسی زمانے میں صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ تک انہوں نے بڑے ٹھاٹھ سے ممبری کی۔ لیکن پھر ان کے مخالف امیدوار نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ انتخاب ناجائز طریقوں سے ہوا تھا' اس لیے کالعدم قرار دیا جائے۔ مقدمہ منظور ہوا اور ایک دن بیٹھے بٹھائے ایم۔ اے صاحب اسمبلی کی رکنیت سے خارج ہو گئے۔ جن دنوں یہ نمبردار صاحب ایم۔ ایل۔ اے تھے' ان کی شان ہی کچھ اور تھی۔ لاہور جاتے تھے تو وزیروں کے دوش بدوش بیٹھتے تھے۔ ضلع کی تقریبوں میں انہیں اگلی صف میں جگہ ملتی تھی۔ تحصیلدار اور تھانیدار دورے پر آتے تھے تو ان کے گھر کا کھانا ضرور کھاتے تھے۔ چند پٹواریوں اور ضلعداروں کو بھی انہوں نے اپنے اثر سے ادھر ادھر تبدیل کرا دیا تھا------ اتنا سارا کون منہ کو لگنے کے بعد جب اسمبلی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تو زندگی کے سارے مزے کرکرے ہو گئے۔ اب نہ وزیروں کی بات پوچھتے تھے۔ نہ ڈپٹی کمشنر انہیں اپنی دعوتوں میں بلاتا تھا۔ ہاں' تحصیلدار اور تھانیدار البتہ ان کا کھانا اب بھی کھا لیتے تھے' لیکن گھر پر جا کر نہیں بلکہ حسب ضرورت اپنے کیمپوں ہی میں منگوا بھیجتے تھے!

زندگی کی اس بے کیفی کو ختم کرنے کے لیے سابق ایم۔ ایل۔ اے نے بہت سے نسخے آزمائے۔ لیکن سیاسی وقار کی جو عمارت منہدم ہو چکی' اس کے مینارے کسی صورت دوبارہ

بلند نہ ہوتے تھے۔ بہت کچھ سوچ بچار کے بعد آخر انہوں نے اپنے خرچ سے دو متضاد مولویوں کو بلا کر گاؤں میں یہ نیا فساد برپا کر دیا۔ بچارے مولوی صاحبان تو گرفتار ہو گئے، لیکن کچھ روز کے لیے نمبردار صاحب کی لیڈری کا بازار بھی خوب گرم ہو گیا۔ پولیس اور مال کے افسر اور مجسٹریٹ صاحبان جو اس ہنگامہ کے سلسلے میں وہاں جاتے تھے وہ سب سابق ایم۔ ایل۔ اے کے ہاں فروکش ہوتے تھے اور حفظ عامہ کے سارے منصوبوں میں ان کی رائے بڑی مفید ثابت ہوتی تھی۔

لیڈروں کی منڈی میں بازار کے بھاؤ اکثر ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ منڈی غلہ کی ہو یا سیاست کی، تجارتی اصول س ب جگہ قریباً ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ آج کل بڑی بڑ دکانوں میں مختلف چیزوں پر قیمتوں کے لیبل لگانے کا رواج عام ہے۔ یوں بھی حکومت نے قیمتوں پر کنٹرول کرنے کے لیے بہت سے قانون بنا رکھے ہیں۔ لیکن رہنماؤں کی جس جنس سے ڈپٹی کمشنر کو محض اپنی کاروباری فراست اور نظر شناسی سے ہی کام لینا پڑتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ سیاست اور تجارت کی اس کش مکش میں کبھی کبھی بچارے ڈپٹی کمشنر کا بھی دیوالہ نکل جاتا ہے!

○○○

• رپورٹ پٹواری مفصل ہے

مرزا غالب نے فرمایا تھا

جانے کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اگر مرزا آج زندہ ہوتے اور انہیں ضلع کے دفاتر کی زیارت نصیب ہوتی تو ان پر راہ سلوک کی وہ تمام منزلیں منکشف ہو جاتیں جن سے گزر کر قطرے کو گہر ہونا پڑتا ہے!

میرے سامنے چھ درخواستوں کا پلندا پڑا ہے۔ یہ درخواستیں عیدو ولد چینا قوم جوگی سابق سکنہ موہن ماجرہ تحصیل روپڑ حال مقیم موضع روڈو سلطان تحصیل شورکوٹ ضلع جھنگ کی ہیں جو اس نے درجہ بہ درجہ فضیلت ماب گورنر پنجاب' عزت ماب وزیر اعلیٰ' عزت ماب وزیر بحالیات' فانشنل کمشنر' کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے نام بصیغہ رجسٹری ارسال کی تھیں۔ ان سب درخواستوں کا مضمون واحد ہے:

"جناب عالی

بکمال ادب گذارش ہے کہ فدوی ضلع انبالہ کا مہاجر ہے۔ موضع موہن ماجرہ تحصیل روپڑ میں فدوی کے پاس ۱۸ گھماؤں اراضی چاہی و بارانی تھی۔ فدوی نے کلیم فارم داخل کئے تھے' لیکن کسی وجہ سے خالی واپس آ گئے۔ فدوی نے عذرداری کی ہوئی ہے' لیکن ابھی تک سنٹرل ریکارڈ آفس سے جواب نہیں آیا۔ فدوی نے نئے کلیم فارم بھی دیئے ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

موضع روڈو سلطان تحصیل شورکوٹ ضلع جھنگ میں فدوی کو ۱۲ گھماؤں متروکہ اراضی عارضی

طور پر الاٹ ہوئی تھی۔ فدوی چار سال سے اس پر قابض ہے اور فصل کاشت برداشت کر رہا ہے۔ فدوی لگان بھی باقاعدگی سے ادا کرتا رہا ہے۔ لیکن اب پٹواری حلقہ بہ طمع نفسانی یہ زمین کسی اور مہاجر کو الاٹ کر رہا ہے۔ جناب عالی اگر فدوی کی الاٹ منٹ ٹوٹ گئی تو فدوی کا کنبہ فاقوں سے مر جائے گا۔ دوسرا کوئی ذریعہ معاش نہیں۔ فقط کھیتی باڑی پر گزارہ ہے۔ لہٰذا التماس بحضور انور ہے کہ فدوی کا عارضی رقبہ تاتصفیہ عذرداری بحال رکھا جائے تاکہ فدوی اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکے۔ فدوی تازیست حضور انور کی جان و مال کی دعا دے گا۔"

لاٹ صاحب' وزیر اعلیٰ' وزیر مہاجرین' منانشنل کمشنر اور کمشنر کے دفاتر سے یہ درخواستیں یکے بعد دیگرے ڈپٹی کمشنر کے پاس "برائے مناسب کاروائی آتی گئیں۔

صدر کا مسل خواں ہر درخواست پر حسب ضابطہ نوٹ لکھتا گیا۔ "بطلب رپورٹ بخدمت جناب افسر مال صاحب مرسل ہو۔" ڈپٹی کمشنر نے تیز رفتار مشین کی طرح اپنے دستخط ثبت کئے اور درخواستیں "بطلب رپورٹ" افسر مال سے تحصیلدار' تحصیلدار سے نائب تحصیلدار' نائب تحصیلدار سے گرداور قانونگو' اور گرداور قانونگو سے اسی پٹواری کے نام مرسل ہوتی گئیں جو "بہ طمع نفسانی" اس الاٹمنٹ کو منسوخ کرنے کے درپے تھا۔

پٹواری حلقہ نے چھ کی چھ درخواستوں کو جمع کر کے رجسٹر میں نتھی کیا اور ہفتہ دو ہفتہ کے بعد ازرہ فرض شناسی عیدو کو طلب فرمایا۔

"عیدو بھائی' اب تم بہت اونچا اڑنے لگے ہو۔ لو' جی کھول کر اڑ لو۔" پٹواری صاحب نے درخواستوں کا پلندہ رجسٹر سے نکال کر عیدو کے منہ پر دے مارا۔

عیدو کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ لاٹ صاحب' وزیر اعلیٰ' وزیر مہاجرین' فنانشنل کمشنر' کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کی ساری تجلیاں اس وقت پٹواری صاحب کی ذات میں مرکوز ہو گئی تھیں۔ اگر عیدو کو تصوف سے کچھ مس ہوتا تو وہ اسی وقت "ہمہ اوست" کا نعرہ لگا کر معرفت کی بہت سے منزلیں ایک ہی قدم میں طے کر لیتا۔

"اب تم یہ درخواستیں جھنگ' ملتان یا لاہور لے جاؤ۔" پٹواری نے عرضیوں کو رجسٹر میں دوبارہ نتھی کرتے ہوئے کہا۔ "اور ان کی بتیاں بنا کر اپنے سالے باپوں کو دے آؤ۔"

اگر اس عمل سے عیدو کی الاٹمنٹ بحال رہ سکتی تو وہ بڑی خوشی سے یہ رائے بھی قبول کر لیتا۔ لیکن پٹواری نے درخواستوں کو نتھی کر کے پھر رجسٹر میں بند کر لیا' اور عیدو کو چند جدید طرز کی گالیاں سنا کر گھر جا کر آرام سے سونے کی ہدایت کی۔

ایک مہینہ۔ دو مہینے' تین مہینے ------ عیدو ہر دوسرے تیسرے روز تحصیل اور ضلع کے دفتروں میں جاتا اور وہاں سے گھرکیاں' جھڑکیاں اور دھکے کھا کر واپس آ جاتا۔ کبھی کبھی اسے نہایت پیچیدا گالیوں کے ساتھ کوئی مفید مشورہ بھی مل جاتا تھا۔ جس کا سلیس اردو میں یہ ترجمہ ہوتا تھا کہ تمہارے کاغذات پر مناسب کاروائی ہو رہی ہے۔ تم ہر روز یہاں آ کر دق نہ کرو ------ اسی ہیرا پھیری اور مشوروں کی تلاش میں اس کے برتن اور بیوی کے زیور بھی بک گئے۔ اب بیلوں کی جوڑی کی باری تھی لیکن پٹواری صاحب نے بروقت فیصلہ کر کے عیدو کو اس افتادے سے بچا لیا۔

پٹواری صاحب نے عیدو کی زمین منسوخ کر کے کسی دوسرے مہاجر کے نام تجویز کر دی اور اس تجویز کے کنفرم ہونے تک ساری درخواستوں کو رجسٹر میں بڑی احتیاط سے ایک طرف نتھی رکھا۔ جب یہ سب منزلیں بخیر و خوبی طے ہو گئیں تو انہوں نے اپنا فرض منصبی انجام دینے کے لیے عیدو کی درخواستوں پر اپنی رپورٹ تحریر فرمائی:

"جناب عالی۔ سائل مسمی عیدو فضول درخواست ہاء دینے کا عادی ہے۔ اسے متعدد بار سمجھایا گیا کہ اس طرح حکام اعلیٰ کا وقت ضائع کرنا درست نہیں۔ لیکن سائل اپنی عادت سے مجبور ہے۔ سائل کا چال چلن بھی مشتبہ ہے اور اس کا اصلی ذریعہ معاش فرضی گواہیاں دینا ہے۔ مشرقی پنجاب میں اس کے پاس کوئی زمین نہیں تھی۔ کیونکہ اس کا کلیم فارم خالی واپس آ چکا ہے۔ سائل نے دو مرتبہ عذرداری بھی کی لیکن بے سود۔ متعدد گواہان

کے بیان بھی لیے گئے۔ ان سب سے ثابت ہوتا ہے کہ سائل کے پاس مشرقی پنجاب میں کوئی زمین نہ تھی۔ چنانچہ کھیوٹ نمبر ۱۳، مربعہ نمبر ۲۵، موضع روڑو سلطان میں

۱۲ گھماؤں زمین جس پر سائل کا ناجائز قبضہ تھا، اس کے نام سے منسوخ ہو کر مسمی نوربخش کے نام حسب ضابطہ کنفرم ہو چکی ہے۔ مسمی نوربخش ضلع جالندھر کا مہاجر اور سابق سفید پوش ہے۔ اس کے مصدقہ کلیم فارم واپس آ گئے ہیں اور موضع روڑو سلطان میں متروکہ اراضی سے اس کی حق رسی کر دی گئی ہے۔ نیز آنکہ مسمی نوربخش کارسرکار میں ہر وقت امدادی ہے اور خاکسار کی رائے میں صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی خوشنودی کی سند کا مستحق ہے۔ برائے حکم مناسب رپورٹ ہذا پیش بحضور انور ہے۔"

گرداور قانونگو نے لکھا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ برائے حکم مناسب بحضور جناب نائب تحصیلدار پیش ہو۔"

جناب نائب تحصیلدار صاحب نے لکھا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ برائے حکم مناسب بحضور جناب تحصیلدار صاحب پیش ہو۔"

جناب تحصیلدار صاحب نے لکھا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ برائے حکم مناسب بخدمت افسر مال بہادر پیش ہو۔"

صاحب افسر مال بہادر نے لکھا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ برائے حکم مناسب صدر پیش ہو۔"

صدر کے مسل خواں نے حکم لکھا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ درخواست ہائے مسمی عیدو فضول ہیں۔ داخل دفتر ہوں۔ مسمی نوربخش کے کاغذات بوقت انتخاب برائے سندات پیش کئے جائیں۔" صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر نے اس حکم پر اپنے دستخط ثبت فرمائے------

اور مسیمان عیدو اور نوربخش پر بڑی باضابطگی کے ساتھ دولت خداداد کی مہریں لگ گئیں۔

یہ اور بات ہے کہ مہر نور بخش کی پیشانی پر لگی اور عیدو کی پشت پر!

- جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی

نور محمد کا خاندان کوئی چار پشت سے موضع غونثہ والا آباد تھا۔ اس کے پاس ایک مربعہ زمین تھی جو وہ بطور مزارعہ بٹائی پر کاشت کرتا تھا۔ زمین کا مالک حاجی اللہ یار تھا۔

جس کے پاس کل ملا کر کوئی ساڑھے سات ہزار ایکڑ یا پانچ سو مربعہ اراضی تھی۔ حاجی اللہ یار کے دو لڑکے فوج میں کپتان تھے۔ ایک لڑکا صوبائی سول سروس کا افسر تھا' اور چوتھا بیٹا زمینداری میں باپ کا مددگار و معاون تھا۔

حاجی اللہ یار کی زمینداری کا کارخانہ بہت وسیع تھا۔ پانچ سو میں سے کوئی ڈھائی سو مربعوں میں کاشت کاری ہوتی تھی۔ پچاس مربعے باغات کے طور پر استعمال ہوتے تھے اور ان میں طرح طرح کے پھلوں اور پھولوں کے ذخیرے تھے۔ حاجی صاحب کے باغات اعلیٰ قسم کے ریڈ بلڈ مالٹوں اور کوئی انیس قسم کے تخمی اور پیوندی آموں کے لیے دور دور تک مشہور تھے۔ بیس پچیس مربعوں میں جنگل آباد تھا۔ اس جنگل میں بڑے اہتمام سے ہر قسم کے شکاری پرندوں کو پالا جاتا تھا اور سال میں ایک دو بار حاجی صاحب کے ملازم بیٹوں کے بڑے بڑے سول اور ملٹری افسر یہاں شکار کھیلنے آیا کرتے تھے۔ ایسے شکاروں کے موقع پر جنگل میں منگل منایا جاتا تھا۔ سرخ سرخ' پیلے پیلے باناتت کے خیموں کا ایک شہر سا آباد ہو جاتا تھا۔ تیل سے بجلی پیدا کرنے والا انجن خیموں کی اس کالونی کو بقعہ نور بنا ڈالتا تھا۔ حاجی اللہ یار کی وسیع زمینداری سے کوئی ساٹھ ستر جواں سال مزارعے اپنا گھر بار چھوڑ کر جنگل میں آ رہتے تھے تاکہ شکار کے انتظامات میں بیگار ادا کریں۔ افسر لوگ تو گھوڑوں یا جیپوں پر سوار ہو کر شکار کھیلنے جاتے تھے لیکن ان کی نازک اندام بیویاں عام طور پر پالکیوں میں بیٹھ کر شکار کا نظارہ کرتی تھیں۔ شام کو ہر خیمے میں گرم گرم ابلتے ہوئے پانی کے ٹب بھر دیئے جاتے تاکہ دن بھر کی ریاضت کے بعد تھکے ہوئے اجسام نہا دھو کر تازہ دم ہو جائیں۔ ذہن کی استراحت کے لیے شراب

اور کباب کا وافر اہتمام ہوتا تھا اور روح کی بالیدگی کے لیے رات کو بڑے ٹھسے کا مجرا منعقد ہوتا تھا۔ دل' دماغ اور جسم کی اس تسکین کے بعد جب معزز مہمان نرم نرم' گرم گرم رضائیوں میں دبک کر لیٹ جاتے تھے' تو خاص تربیت یافتہ ملازم ان کے پاؤں دبانے پر مامور ہو جاتے تھے۔ نازک اندام بیبیوں کی کمریں اور کولہے دبانے کے لیے دائیاں آ جاتیں تھیں۔ دبانے والوں کے ہاتھوں پر خس اور حنا کے عطر مل دیئے جاتے تھے تاکہ دہقانی پسینے کی بو شہری نتھنوں میں گھس کر کوئی نامانوس رد عمل پیدا نہ کر سکے۔

ڈھائی سو مربعوں میں فصل' پچاس مربعوں میں باغات' پچیس مربعوں میں شکار------ حاجی اللہ یار کے باقی پونے دو سو مربعے یونہی بنجر پڑے رہتے تھے۔ خدا نے حاجی صاحب پر اپنا فضل اتنا عام کر رکھا تھا کہ ان پونے دو سو مربعوں میں کسی قسم کی کاشت کرنے کی حاجت کبھی محسوس ہی نہ ہوتی تھی' لیکن حاجی صاحب اپنی بنجر زمین کی ایک ایک بالشت کی حفاظت بھی اسی تندہی سے کرتے تھے جس طرح اپنے پھلدار باغوں اور درختوں کی۔ ایک بار نور محمد کے باپ نے نظر بچا کر بنجر زمین کے دو کھیتوں میں کپاس بیج لی تھی۔ اس سال اسے کچھ کپڑے کی ضرورت تھی کیونکہ اس کی بڑی لڑکی کا جہیز تیار ہونا تھا۔ جب حاجی اللہ یار کو اس چوری اور سینہ زوری کا علم ہوا تو انہوں نے کھڑے کھڑے کپاس کی فصل کو آگ لگوا دی اور چابک مار مار کر نور محمد کی کھال ادھیڑ دی۔ اس مار دھاڑ میں اچانک ان کی نظر جہیز والی بڑی لڑکی پر بھی پڑ گئی۔ پھول سی کھلی ہوئی جوانی۔ مستانہ نگاہیں۔ گدرا گدرا جسم------ وہ تو خیریت ہوئی کہ حسن کے اس امڈتے ہوئے سیلاب میں ان کا غصہ دھیما پڑ گیا۔ ورنہ وہ نور محمد کو زمین سے بے دخل کر کے ہی دم لیتے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ چوہدری اللہ یار نے ابھی حج نہیں کیا تھا!

سال بھر کی محنت مشقت کے بعد نور محمد مزارعہ اور اس کے تین جوان بیٹے فصل تیار

کر کے گندم اور چنے کی ڈھیریاں بنا لیتے ہیں۔ ایک ڈھیری میں کوئی آٹھ آٹھ من غلہ ہوتا ہے۔ یہ ڈھیریاں مالک اور مزارعہ کا مشترکہ کھاتا ہوتا ہے۔ یوں تو بٹائی کی شرح نصفا نصف ہے لیکن تقسیم سے پہلے ان ڈھیریوں میں سے زمیندار کچھ جائز اور کچھ ناجائز حقوق مالکانہ وصول کر لیتا ہے۔ سالہا سال سے یہ جزیہ ایک قانونی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ گاؤں کے کاغذات میں ان حقوق کی تفصیل اس طرح درج ہے:

تخم بذمہ مزارعہ .... معاملہ بذمہ مالک

سبزہ چارہ سالم حق مزارعہ

ڈھیری جنس بحصہ نصف۔ نصف مابین مالک و مزارعہ بعد وضع خرچ ہائے ذیل:

خرچ کمیاں:

ترکھان .... ساڑھے چار پائی فی ہل

لوہار .... ساڑھے پائی فی ہل

چھاجی .... پانچ ٹوپہ فی ڈھیری

موچی .... نو پائی فی ڈھیری

نائی .... نو پائی فی ڈھری

جنس یا فتنی مالک از ڈھیری مشترکہ:

مصلی (ملازم مالک) .... ۱ پائی فی ڈھیری

محاصل .... ۱ ٹوپہ فی ڈھیری

مالک کا پٹواری .... ۳ ٹوپہ فی ڈھیری

منشی ڈیرے دار .... ۲ پائی فی ڈھیری

دادا (مراثی) .... ۱ پائی فی ہل

جگیہ .... ۱ ٹوپہ فی ڈھیری

دھواں دار
(برائے تکیہ فقیراں) .... ۱ پائی فی ڈھیری

رسول ارواحی .... ۱ ٹوپہ فی ڈھیری

خرچ گھوڑا .... کاھیاں (سٹیاں) ایک گٹھ

یا دو پائی گندم فی ڈھیری

ملبہ (برائے خرچ در ڈاک بنگلہ برائے افسران دورہ گشتی) ۲ پائی فی ڈھیری

دیگر مراعات جو مالک مزارعہ سے لیتا ہے:

مالک کی شادی یا موت پر .... ایک بھیڑ یا بکری یا گائے

مزارعہ کی شادی پر .... مال کے ملازم کے لیے ایک روپیہ

بصورت بیماری یا مہمان .... جتنے مرغ مالک کہلا بھیجے

حسب خواہش و پسند .... لیاری یعنی دودھ دینے والی گائے یا بھینس دودھ کے عرصہ تک۔

اچھا بیل معمولی عوضانہ پر۔

گاہ کے موقعہ پر .... ایک جوڑا بیل و آدمی یا پندرہ پائی گندم

لپائی مکان .... حسب موسم

چکی کی پسوائی .... حسب ضرورت

اس کتر بیونت کے بعد مزارعہ کے پاس جو بچتا ہے' اس میں علاقہ کے پٹواری کا فصلانہ اور تھانیدار کا نظرانہ الگ ہوتا ہے۔ باقی ماندہ جنس میں مزارعہ اپنا پیٹ بھی پالتا ہے اور اپنے خاندان کا بھی۔ اگر حسن اتفاق سے مالک دل پھینک ہے اور مزارعہ کے خاندان میں کوئی لڑکی پکی ہوئی فصل کی طرح تیار کھڑی ہے' تو بٹائی میں ایسے آبگینے بھی آ جاتے ہیں جو دھرتی ماتا کی کوکھ سے جنم نہیں لیتے!

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!

نوٹ:

۱ ٹوپہ .... قریباً ڈھائی سیر

۴ ٹوپہ .... ۱ پائی

ڈھیری .... تقریباً آٹھ من

○ ◯ ○

- گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

"حضرت قبلہ و کعبہ فخر سالکاں رہنمائے عاشقاں آفتاب طریقت ماہتاب معرفت جناب مخدوم زادہ غلام مرشد خاں صاحب پیر' لینڈ لارڈ اینڈ لیڈر"

یہ کسی مزار کا کتبہ نہیں بلکہ ایک جیتے جاگتے انسان کا تعارفی کارڈ ہے جو ایک بہت بڑی گدی کے سجادہ نشین ہیں۔ آپ پکی سڑکوں پر ماسٹر بیوک استعمال کرتے ہیں۔ کچی سڑکوں کے لیے شیورلٹ اسٹیشن ویگن ہے۔ شکار کے لیے جیپوں کا انتظام ہے۔ اس کے علاوہ دس بارہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے ہیں جن پر وہ خود کبھی سوار نہیں ہوتے۔ تین ساڑھے تین درجن نسلی کتے ہیں' جن کی خدمت کے لیے بہت سے خادم مامور ہیں۔ کبوتروں کا بھی شوق ہے اور گاہے ماہے۔ بٹیروں کی پالی سے بھی جی بہلا لیا کرتے ہیں۔

درگاہ شریف پر درویشانہ ٹھاٹھ ہیں لیکن مریدوں کی سہولت کے لیے کئی بڑے بڑے شہروں میں جدید طرز کی کوٹھیاں بنا رکھی ہیں۔ گدی کے نام دو ہزار ایکڑ اراضی وقف ہے۔

یوں بھی سال بھر میں مریدان باصفا سے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ نذرانہ وصول ہو جاتا ہے۔

صوفیائے کرام کا مسلک ہے کہ دنیاوی مال و متاع کا اجتماع راہ سلوک کا راہزان ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے سجادہ نشین صاحب روپیہ روپیہ جمع کرنے کی خطا نہیں کرتے اور ہر سال درگاہ شریف کی ساری آمدنی بڑے سلیقے سے ٹھکانے لگاتے رہتے ہیں۔ گرمیوں میں مری' کوئٹہ' ایبٹ آباد اور سردیوں میں لاہور' پشاور اور کراچی کے شہروں کو فیض پہنچایا جاتا ہے۔ سالانہ عرس کے موقعہ پر گاؤں کے لوگ روحانی ثواب حاصل کرتے ہیں اور اس طرح سجادہ نشین صاحب سارا سال اپنے مریدین کی خاطر دینی اور دنیاوی مجاہدوں میں منہمک رہتے ہیں۔

سالانہ عرس شریف کا آخری دن ہے۔ محفل سماع کے لیے دھوم دھام کا اہتمام ہے۔

عود' لوبان اور اگربتیاں سلگ رہی ہیں۔ گلاب پاش سجے ہوئے ہیں۔ مشک کافور کی مہک فضا میں رچی ہوئی ہے۔ سجادہ نشین صاحب منقش عبا پہنے گدری پر متمکن ہیں۔ چہرے پر جمال اور آنکھوں میں جلال ہے۔ سامنے باریک چقوں کے پیچھے عورتوں کی مجلس ہے۔ سجادہ نشین صاحب کی چشم بصیرت بڑی خوش اسلوبی سے چقوں کے آرپار گھوم رہی ہے۔ گدی کے بائیں ہاتھ افسران ضلع کی نشستیں ہیں۔ دائیں جانب پیر بھائی' روسا اور سیاست پیشہ اصحاب براجمان ہیں۔ ایک کونے میں درویشوں کا گروہ ہے' جن پر قوالی کے دوران یکے بعد دیگرے "حال" طاری ہو گا۔ وجدان کی سہولت کے لیے لاہور سے طریقت پسند لڑکوں کی ایک پارٹی بھی آئی ہوئی ہے اور وہ باریک ململ کے کرتے اور ترچھی ٹوپیاں پہنے بڑے ادب سے دوزانو بیٹھے ہیں۔ ان سب کے درمیان قوالوں کی چوکڑی اپنا ساز و سامان تیار کیے مستعد بیٹھی ہے اور پیچھے حدنگاہ تک زائرین کا اجتماع ہے۔ یہ عقیدت مند دوردراز مقامات سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس سوار کے لیے نہ موٹریں ہیں' نہ گھوڑے اور پالکیاں ہیں۔ لیکن ہر سال روحانیت کی کشش انہیں سفر وسیلہ ظفر کی ہر دشواری اور صعوبت کے باوجود یہاں کھینچ لاتی ہے۔ شاید یہ لوگ اپنے ہل کا بیل فروخت کر کے یہاں آئے ہیں؟ شاید انہوں نے اپنی بیویوں کا زیور یا اپنی بیٹیوں کے جہیز گروی رکھ کر نذرانے کا بندوبست کیا ہے؟ شاید جب یہ واپس لوٹیں گے تو انہیں کئی کئی روز فاقوں کا سامنا کرنا پڑے گا' کیونکہ ان کی گندم کے فالتو ذخیرے درگاہ شریف کے لنگر کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

قوالوں کی پارٹی نے بڑی خوش مستی کے ساتھ ہارمونیم کا ساز چھیڑا۔ طبلہ پر تھاپ پڑی۔ جامی کی غزل فضا میں لہرائی۔ درویشوں کے سر گھومنے لگتے ہیں' طریقت پسند لڑکے بیٹھے ہی بیٹھے بڑی ادا سے کمریں مٹکاتے ہیں۔ سجادہ نشین صاحب کا مورچھل طرہ بھی جنبش میں آ جاتا ہے۔ جیسے بین کی آواز پر سانپ کا پھن لہرا رہا ہو۔ ایک ایک بول' ایک ایک تال پر روحیں بے اختیار پھڑکتی ہیں۔ افسر لوگ اپنے وقار کی بندشوں سے مجبور ہو کر کبھی کبھی محض سر ہلا دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ سیاست پیشہ اصحاب بھی اپنے

منصب کی رعایت سے سر کی جگہ چوری چوری پاؤں ہلاتے ہیں۔ دیہاتی عقیدت مندوں کا ہجوم جو اکثر فارسی زبان سے بے بہرہ ہے نہ سر ہلاتا ہے نہ پاؤں۔ لیکن پیر بھائی' درویش اور طریقت پسند لونڈے آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ وہ بے اختیار گردنیں مٹکاتے ہیں۔ سجدوں میں گرتے ہیں۔ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو ہو کر ہاتھوں نرت کے ساتھ راگنیوں کی تان پر جھومتے ہیں اور جب قوالوں کے گلے خوب گرما جاتے ہیں تو کئی ایک درویش ہو حق کا نعرہ لگا کر میدان میں کود پڑتے ہیں۔

ایک صاحب اپنی سفید داڑھی کو مٹھیوں میں بھینچ کر والہانہ رقص کر رہے ہیں۔ دو درویش ایک دوسرے کے گلے سے لپٹے رموز بے خودی کے راز و نیاز میں مشغول ہیں اور بار بار ترچھی ٹوپیوں والے لڑکوں کے پاس جا جا کر پچھاڑیں کھاتے ہیں جو ان کی وارفتگی کو سہارا دینے کے لیے خاص طور پر لاہور سے مدعو کئے گئے ہیں۔ ساری محفل مودبانہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ عقیدت مند جھک جھک کر دونوں ہاتھوں پر ایک ایک' دو دو' پانچ روپے رکھ کر سجادہ نشین کے حضور میں پیش کرتے ہیں' جو انہیں چھو چھو کر قوالوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ایک طالب عالم نے اپنا فونٹین پین نذر کیا۔ ایک صاحب دل نے اپنا کوٹ اتار کر پھینک دیا۔ ایک کسان جو کے ستوؤں کی پوٹلی پیش کرتا ہے جسے غالباً وہ زاد راہ کے طور پر اپنے ساتھ لایا تھا۔

جامی' حافظ' خسرو' اقبال' بلھے شاہ' خواجہ فرید ------ رات کے ڈیڑھ بجے جب محفل سماع برخاست ہوتی ہے تو سجادہ نشین صاحب بڑے اخلاق سے اپنے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے افسروں اور رئیسوں کو اس خیمے میں چلنے کی دعوت دیتے ہیں جو درگاہ شریف سے کچھ ہٹ کر ایک حویلی کے صحن میں نصب کیا گیا ہے۔ اس خیمہ میں مقربین خاص کے علاوہ اور کسی کا گزر ممکن نہیں۔ "راہ سلوک" میں یہ خیمہ اس مقام پر واقع ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر! کیونکہ اس خیمے میں لاہور' ملتان اور لائلپور کی نامی گرامی گانے اور مجرا کرنے والی فنکاریں اتری ہوئی ہیں۔

قوالی خدا اور مریدوں کو خوش کرنے کا ذریعہ تھی۔ فنکاروں کا مجرا افسروں اور رئیسوں کی خوشنودی کے لیے منعقد ہوتا ہے۔ دین اور دنیا کے اس امتزاج میں سجادہ نشین کے لیے بہت بڑی برکات کا نزول مضمر ہے۔ مجرے والے خیمہ میں پہنچ کر سجادہ نشین صاحب اپنی زرکار قبا اتار دیتے ہیں اور لہراتے ہوئے طرے والی سبز پگڑی بھی خادم خاص کے حوالے کر دیتے ہیں۔ خادم اس دستار فضیلت کو چاندی کی طشتری میں رکھ کر باہر لے جاتے ہیں۔ خدا جانے اب یہ پگڑی کہاں جائے گی؟ شاید یہ پگڑی نبی بخش لوہار کے گھر چلی جائے جس کی بیٹی نے ابھی ابھی اپنی عمر کا سولھواں سال پورا کیا ہے ------ شاید یہ پگڑی روشن دین معمار کے گھر پہنچ جائے جس کی جمیلہ پر شباب کے پھول تازہ تازہ کھلے ہیں۔ شاید........

یہ پگڑی بڑی عصمت اور وقار والی پگڑی ہے۔ اس پگڑی میں اولیائے کرام کی وراثت پارینہ محفوظ ہے۔ اس پگڑی کے ساتھ بزرگی' عظمت اور معرفت کی روایات صادقہ وابستہ ہیں۔ اس پگڑی کے سہارے اوتاد اور ابدال اور اقطاب عرش منیر کے کنگروں تک پہنچتے رہے ہیں۔ اس پگڑی کی سلوٹوں سے فیض کے چشمے بہتے آئے ہیں۔ صدیوں سے بندگان خاص و عام کو یہ پگڑی انور و تجلیات و مشاہدات سے سرفراز کرتی رہی ہے۔ یہ بڑی مرادوں والی پگڑی ہے۔ اس پر ایجاب و قبول کے سب دروازے وا ہیں۔ یہ پگڑی خدا کی بارگاہ سے بھی خالی نہیں لوٹتی ------ لیکن جب یہی سحر کار دستار کسی نبی بخش لوہار یا روشن دین معمار یا چراغ علی کسان کے گھر اچانک جا پہنچتی ہے' تو پیاری پیاری' نازک نازک معصوم جوانیاں سہم کر مرجھا جاتی ہیں۔ خادم خاص پگڑی اٹھائے گھر کا ایک چکر لگاتا ہے اور اسی طرح خاموش واپس لوٹ آتا ہے لیکن یہ خاموشی چیخ چیخ کر اعلان کرتی ہے کہ اے گھر والو' مبارک ہو۔ تمہاری بہو یا بیٹی پر حضرت قبلہ و کعبہ فخر سالکاں' رہنمائے عاشقاں' آفتاب طریقت' ماہتاب معرفت کی نظر انتخاب پڑ گئی ہے۔ اب اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے نصیبوں پر رحمت خداوندی کا سایہ قائم رہے۔ تمہاری کھیتیاں سرسبز لہلاتی رہیں۔ تمہارے جھونپڑوں کو آگ نہ لگے۔ تمہارے مویشی گم نہ

ہوں۔ تمہارے دالان میں ہتھکڑیاں نہ جھنجھنائیں اور جیل خانوں کے دروازے تم پر اچانک وا نہ ہوں' تو برضا و رغبت........

"مالک' ہمارے گھر پگڑی آ گئی ہے۔ خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ ازطرف سکینہ دختر غلام محمد۔ رحبانہ............"

یہ مختصر سا خط مجھے ایک روز ڈاک میں ملا۔ میں نے اسے ایک بڑ پڑھا۔ دوبار پڑھا۔ لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ کراچی میں جو پگڑی رائج تھی اس کا تعلق دکانوں یا مکانوں سے ہوتا تھا لیکن پگڑی کا یہ نیا روپ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں نے پولیس والوں اور مجسٹریٹوں سے پوچھا۔ وکیل صاحبان سے دریافت کیا' لیکن یہ انوکھی گتھی کسی سے حل نہ ہو سکی۔ معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہم نے اسی رات اچانک سکینہ کے گھر پر چھاپہ مارا۔ سکینہ تو بچ گئی لیکن افسوس کہ وہ پگڑی ہمارے ہاتھ نہ آ سکی جس کی ایک ایک سلوٹ میں ریاکاری اور سیاہ کاری کے سانپ لہرا رہے تھے۔

○ ◯ ○

• ڈسٹرکٹ بورڈ

جمہوری راج کی برکتوں میں سب سے افضل برکتیں ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل کمیٹیاں ہیں۔ میرے ضلع میں خدا کے فضل سے ایک ڈسٹرکٹ بورڈ اور تین میونسپل کمیٹیاں ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کو میں نے خاص طور پر روشن ضمیر اور فرض شناس پایا ہے۔ ایک اوورسئیر صاحب تھے جو دس بارہ سال سے لگاتار دونوں ہاتھوں سے رشوت کھا رہے تھے۔ ایک روز اچانک ڈسٹرکٹ بورڈ کے ضمیر نے انگڑائی لی اور قوم کا اخلاق درست کرنے کے لیے اوورسئیر صاحب کو معطل کر دیا گیا۔ معلوم نہیں معطلی کے ایام میں اوورسئیر صاحب نے کن کن فقیری وظائف اور اوراد کا عمل کیا کہ رفتہ رفتہ ڈسٹرکٹ بورڈ کو احساس ہونے لگا کہ رشوت بے شک بری بات ہے لیکن اوورسئیر بھی تو آخر بال بچوں والا آدمی ہے۔ اگر وہ ملازمت سے برطرف ہو گیا تو اس کے اہل و عیال کا کیا بنے گا؟ چنانچہ تجویز یہ ٹھہری کہ نہ صرف اوورسئیر کو بحال کیا جائے بلکہ اس کے منصب میں بھی خاطر خواہ ترقی کر دی جائے۔ یہ تجویز بورڈ کی میٹنگ میں منظوری کے لیے پیش ہوئی۔ میٹنگ کی کاروائی قرآن خوانی اور دعائے خیر سے شروع ہوا کرتی تھی تاکہ خدا بورڈ کو نیک اور صالح اعمال کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ لیکن اس روز سب نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ اوورسیئر کا معاملہ قرآن خوانی سے پہلے طے کر لینا چاہیے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خدا مسبب الاسباب ہے اور ہر آزمائش میں اپنے منتخب بندوں کا ایمان سلامت رکھتا ہے!

ایک دفعہ میں ایک طویل دورے سے واپس آ رہا تھا۔ ایک پرفضا مقام پر ڈسٹرکٹ بورڈ کا ڈاک بنگلہ نظر آیا۔ جی چاہا کہ گھنٹہ دو گھنٹہ یہاں قیام کیا جائے۔ ڈاک بنگلہ کھلا پڑا تھا۔ اندر گیا تو دیکھا کہ چھت غائب ہے۔ پہلے خیال آیا کہ شاید یہ اوپن ائیر تھیٹر کی طرح اوپن ائیر ڈاک بنگلہ ہو۔ لیکن چوکیدار نے بڑی خندہ پیشانی سے وضاحت کی

کہ دراصل یہ ۱۹۵۰ء کے سیلاب کا نتیجہ ہے۔ میں نے پوچھا کہ بھائی سیلاب تو زمین پر آیا تھا لیکن چھت آسمان سے کیونکر گر پڑی؟ چوکیدار نے سادہ لوحی سے جواب دیا کہ صاحب' اس میں بھی اللہ کی کوئی حکمت ہو گی! اس ڈاک بنگلہ میں چینی کی چند پرچ پیالیاں اور کچھ رکابیاں بھی موجود تھیں۔ ان سب کی پشت پر انگریزی میں درج تھا 1854 Jhonson • Jhonson, London, چینی کے بنے ہوئے یہ ظروف ایک سو برس پرانے تھے۔ لیکن ہماری تعمیر کی ہوئی ڈاک بنگلہ کی چھت سیلاب کے ایک ہی ریلے سے بہہ کر گر گئی تھی۔

ڈاک بنگلے کی رعایت سے مجھے ڈسٹرکٹ بورڈ کی ایک ڈسپنسری یاد آ گئی' جو ایک نہایت دور افتادہ گاؤں میں واقعہ ہے۔ بغیر اطلاع دیئے دور دراز دیہات میں اکیلے گھومنے کا مجھے بے حد شوق ہے۔ اس طرح ایک انسان کی آنکھ ان نظاروں کا مشاہدہ کرتی ہے جو ڈپٹی کمشنر کی آنکھ کو نصیب نہیں ہوتا۔ ان دو آنکھوں میں بڑا عجیب و غریب فرق ہے۔ انسان کی آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے اور ڈپٹی کمشنر کی آنکھ فقط ان نظاروں کا مشاہدہ کرتی ہے جو ڈپٹی کمشنر کی آنکھ کو نصیب نہیں ہوتا۔ ان دو آنکھوں میں بڑا عجیب و غریب فرق ہے۔ انسان کی آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے اور ڈپٹی کمشنر کی آنکھ فقط وہی دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہے جو اسے دکھایا جائے۔ اس کے علاوہ انسان کی آنکھ عموماً سیدھی ہوتی ہے اور ڈپٹی کمشنر کی آنکھ اپنے ٹیڑے ترچھے زاویوں کی وجہس ے کسی قدر بھینگی ہو جاتی ہے........ خیر' اس دور افتادہ گاؤں میں مجھے ایک اصطبل نظر آیا جو دراصل وہاں کا ہسپتال تھا۔ ڈاکٹر صاحب دھوتی اور بنیان پہنے کرسی پر اکڑوں بیٹھے تھے اور اپنے گھٹنوں پر پرچیاں رکھے نسخے لکھ لکھ کر مریضوں کو دے رہے تھے' جنھوں نے کرسی کے چاروں طرف گھیرا ڈالا ہوا تھا۔

"کیا مرض ہے؟" ڈاکٹر صاحب ہر مریض سے سوال کرتے تھے۔

مریض اپنی بساط کے مطابق اپنے مرض کی خود تشخیص کرتا تھا اور ڈاکٹر صاحب بڑی سرعت

سے نسخہ لکھ کر اس کے حوالے کر دیتے تھے۔ غالباً یہ نسخہ تعویذ کے طور پر استعمال ہوتا تھا' کیونکہ مریض نسخہ لے کر بغیر کوئی دوا مانگے وہاں سے چلا جاتا تھا۔

میری خاکی پتلون اور سفید بش شرٹ کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے سامنے ایک بنچ پر بٹھا لیا' جس پر ان کا حقہ اور پاندان پڑا تھا۔ انہوں نے کئی بار مجھے دوسرے مریضوں پر ترجیح دینے کی کوشش کی' لیکن میں نے جواب دیا کہ میری تکلیف ذرا پیچیدہ قسم کی ہے' اس لیے میں سب سے آخر میں اپنا حال بیان کروں گا۔

جب مریضوں کا ہجوم ختم ہو گیا' تو ڈاکٹر صاحب بڑی خیر سگالی سے میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے نہایت سنجیدگی سے اپنی تکلیف بیان کی۔

"ڈاکٹر صاحب۔" میں نے کہا۔ "میرے دماغ میں کچھ خلل واقع ہو گیا ہے۔ مجھے بیٹھے بیٹھے وہم ہونے لگتا ہے کہ میں ضلع جھنگ کا ڈپٹی کمشنر لگ گیا ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب نے بڑی پھرتی سے اپنی ٹانگیں کرسی سے نیچے اتاریں اور عینک کے خول کے اوپر سے مجھے بڑے غور سے گھورا۔ جب انہیں اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ میری تراش خراش اور وضع قطع میں ڈپٹی کمشنر کی کوئی علامت موجود نہیں ہے' تو وہ پھر کرسی پر اکڑوں بیٹھ گئے اور ایک کاغذ گھٹنے پر رکھ کر غالباً نسخہ لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وقت انہیں مہلت دیتا تو وہ میرے لیے بدہضمی کا علاج تجویز فرماتے۔ لیکن عین اس وقت گاؤں کے نمبردار نے وہاں پہنچ کر میرے جنون کا راز فاش کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب بے تحاشا بھاگ کر اپنے کوارٹر میں گئے اور کچھ دیر کے بعد بنیان کے اوپر شیروانی پہنے اور ہاتھ میں سٹیتھو سکوپ لے کر برآمد ہوئے۔ اب انہوں نے خالص افسرانہ انداز میں میری تشریف آوری پر اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا اور مجھے ہسپتال کا معائنہ کرنے کی دعوت دی۔ میں نے بھی بڑی وضعداری سے ڈسپنسری کا معائنہ کیا' جس میں ٹنکچر آیوڈین' سوڈا بائی کارب' ایسپرین اور بڑی بوتلوں میں کئی دن کے باسی پانی کے علاوہ اور کوئی دوائی موجود نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ڈسٹرکٹ بورڈ میں ہسپتال

کا بجٹ تو باقاعدگی کے ساتھ سال کے شروع میں منظور ہو جاتا ہے۔ لیکن دوائیوں کا اسٹاک اکثر سال کے اخیر میں یا بعض اوقات اگلے سال موصول ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو یقین تھا کہ اس تاخیر کا ہسپتال کی ہر دلعزیزی یا افادیت پر ہرگز کوئی برا اثر نہیں پڑتا تھا۔ کیونکہ دوائیاں موجود ہوں یا نہ ہوں' مریض بہرحال آتے ہی رہتے تھے اور پھر ڈاکٹر صاحب نے اپنے رجسٹر کے اعداد و شمار سے مجھے یہ خوش خبری بھی سنائی کہ متواتر کئی برس سے مریضوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس مقام پر پورے نو برس سے مسیحائی فرما رہے تھے۔ انہیں فخر تھا کہ اس دوران ملیریا کے مریضوں میں ۷۵ فیصد' پیچش کے مریضوں میں ۵۰ فیصد اور خارش کے امراض میں ۴۵ فیصد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ڈسپنسری کا آخری معائنہ ۱۹۳۱ء میں ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے ہسپتال کا ان ڈور وارڈ بھی دکھایا' جس میں غالباً ان کی بھینس باندھی جاتی تھی کیونکہ ایک کونے میں تازہ گوبر کے نشان تھے' جسے ابھی ابھی صاف کیا گیا تھا۔

معاینے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھے وزیٹرز بک پیش کی کہ میں اس میں اپنی رائے کا اظہار کروں۔ میں نے فی البدیہہ عرض کیا:

"دنیائے طب میں یہ ہسپتال سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں پر دوائیوں کی جگہ نسخوں سے علاج کیا جاتا ہے اور مریضوں کی تعداد روز افزوں ترقی پر ہے۔ ہسپتال میں داخل ہونے والے مریضوں کے لیے بھینس کے خالص دودھ کا خاطر خواہ انتظام ہے کیونکہ وارڈ میں بھینس باندھنے کا بھی اچھا بندوبست ہے۔ گوبر بھی وقت پر اٹھایا جاتا ہے اور مکھیوں کی آمد و رفت پر کوئی خاص پابندی عائد نہیں ہے۔"

چند ماہ بعد جب میں دوبارہ اسی ڈسپنسری کو دیکھنے گیا' تو وارڈ میں ڈاکٹر صاحب کی بھینس تو بدستور بندھی ہوئی تھی لیکن وزیٹرز بک کے جس ورق پر میرے پہلے معاینے کی رائے درج تھی' وہ غائب تھا۔

• علی بخش

ایک روز میں کسی کام سے لاہور گیا ہوا تھا۔ وہاں پر ایک جگہ خواجہ عبدالرحیم صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ علامہ اقبال کے دیرینہ اور وفادار ملازم علی بخش کو حکومت نے اس کی خدمات کے سلسلے میں لائلپور میں ایک مربع زمین عطا کی ہے۔ وہ بچارا کئی چکر لگا چکا ہے لیکن اسے قبضہ نہیں ملتا' کیوں کچھ شریر لوگ اس پر ناجائز طور پر قابض ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا: "جھنگ لائلپور کے بالکل قریب ہے۔ کیا تم علی بخش کی کچھ مدد نہیں کر سکتے؟"

میں نے فوراً جوا دیا' "میں آج ہی اسے اپنی موٹر کار میں جھنگ لے جاؤں گا اور کسی نہ کسی طرح اس کو زمین کو قبضہ دلوا کے چھوڑوں گا۔"

خواجہ صاحب مجھے "جاوید منزل" لے گئے اور علی بخش سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ جھنگ کے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ تم فوراً تیار ہو کر ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ یہ بہت جلد تمہاری زمین کا قبضہ دلوا دیں گے۔"

علی بخش کسی قدر ہچکچایا' اور بولا' "سوچئے تو سہی میں زمین کا قبضہ لینے کے لیے کب تک مارا مارا پھروں گا؟ قبضہ نہیں ملتا تو کھائے کڑھی۔ لاہور سے جاتا ہوں تو جاوید کا نقصان ہوتا ہے۔ جاوید بھی کیا کہے گا کہ بابا کن جھگڑوں میں پڑ گیا؟"

لیکن خواجہ صاحب کے اصرار پر وہ میرے ساتھ ایک آدھ روز کے لیے جھنگ چلنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ میرے ساتھ کار میں بیٹھ جاتا ہے تو غالباً اس کے دل میں سب سے بڑا وہم یہ ہے کہ شاید اب میں بھی بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح علامہ اقبال کی باتیں پوچھ پوچھ کر اس کا سر کھپاؤں گا۔ لیکن میں نے بھی عزم کر رکھا ہے کہ میں خود علی بخش سے حضرت علامہ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔ اگر واقعی وہ علی بخش کی زندگی کا ایک جزو ہیں' تو یہ جوہر خود بخود عشق اور مشک کی

طرح ظاہر ہو کے رہے گا۔
میری توقع پوری ہوتی ہے اور تھوڑی سی پریشان کن خاموشی کے بعد علی بخش مجھے یوں گھورنے لگتا ہے کہ یہ عجیب شخص ہے جو ڈاکٹر صاحب کی کوئی بات نہیں کرتا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور ایک سینما کے سامنے بھیڑ بھاڑ دیکھ کر وہ بڑبڑانے لگا۔ "مسجدوں کے سامنے تو کبھی ایسا رش نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب بھی یہی کہا کرتے تھے۔"
ایک جگہ میں پان خریدنے کے لیے رکتا ہوں' تو علی بخش بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے' "ڈاکٹر صاحب کو پان پسند نہیں تھے۔"
پھر شاید میری دلجوئی کے لیے وہ مسکرا کر کہتا ہے' "ہاں حقہ خوب پیتے تھے۔ اپنا شوق ہے۔ پان کا ہو یا حقہ کا!"
شیخوپورہ سے گزرتے ہوئے علی بخش کو یاد آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک بار یہاں بھی آئے تھے۔ یہاں پر ایک مسلمان تحصیلدار تھے جو ڈاکٹر صاحب کے پکے مرید تھے۔ انہوں نے دعوت دی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو پلاؤ اور سیخی کباب بہت پسند تھے۔ آموں کا بھی بڑا شوق تھا۔ وفات سے کوئی چھ برس پہلے جب ان کا گلا پہلی بار بیٹھا' تو کھانا پینا بہت کم ہو گیا۔"
اب علی بخش کا ذہن بڑی تیزی سے اپنے مرکز کے گرد گھوم رہا ہے اور وہ بڑی سادگی سے ڈاکٹر صاحب کی باتیں سناتا جاتا ہے۔ ان باتوں میں قصوں اور کہانیوں کا رنگ نہیں بلکہ ایک نشے کی سی کیفیت ہے۔ جب تج علی بخش کا یہ نشہ پورا نہیں ہوتا' غالباً اسے ذہنی اور روحانی تسکین نہیں ملتی۔ "صاحب' جب ڈاکٹر صاحب نے دم دیا ہے' میں ان کے بالکل قریب تھا۔ صبح سویرے میں نے انہیں فروٹ سالٹ پلایا اور کہا کہ اب آپ کی طبیعت بحال ہو جائے گی لیکن عین پانچ بج کر دس منٹ پر ان کی آنکھوں میں ایک تیز تیز نیلی سی چمک آئی' اور زبان سے اللہ ہی اللہ نکلا۔ میں نے جلدی سے ان کا سر اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور انہیں جھنجھوڑنے لگا۔ لیکن وہ رخصت ہو گئے

تھے۔"

کچھ عرصہ خاموشی طاری رہتی ہے۔

پھر علی بخش کا موڈ بدلنے کے لیے میں بھی اس سے ایک سوال کر ہی بیٹھتا ہوں۔ "حاجی صاحب کیا آپ کو ڈاکٹر صاحب کے کچھ شعر یاد ہیں؟"

علی بخش ہنس کر ٹالتا ہے۔ "میں تو ان پڑھ جاہل ہوں۔ مجھے ان باتوں کی بھلا کیا عقل۔"

"میں نہیں مانتا۔" میں نے اصرار کیا۔ "آپ کو ضرور کچھ یاد ہو گا۔"

"کبھی اے حقیقت منتظر والا کچھ کچھ یاد ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کو خود بھی بہت گنگنایا کرتے تھے۔"

"ڈاکٹر صاحب عام طور پر مجھے اپنے کمرے کے بالکل نزدیک سلایا کرتے تھے۔ رات کو دو ڈھائی بجے دبے پاؤں اٹھتے تھے اور وضو کر کے جاء نماز پر جا بیٹھتے تھے۔ نماز پڑھ کر وہ دیر تک سجدے میں پڑے رہتے تھے۔ فارغ ہو کر بستر پر آ لیٹتے تھے۔ میں حقہ تازہ کر کے لا رکھتا تھا۔ کبھی ایک کبھی دو کش لگاتے تھے۔ کبھی آنکھ لگ جاتی تھی۔ بس صبح تک اسی طرح کروٹیں بدلتے رہتے تھے۔"

میرا ڈرائیور احتراماً علی بخش کو سگریٹ پیش کرتا ہے۔ لیکن وہ غالباً حجاب میں آ کر اسے قبول نہیں کرتا۔

"ڈاکٹر صاحب میں ایک عجیب بات تھی۔ کبھی کبھی رات کو سوتے سوتے انہیں ایک جھٹکا سا لگتا تھا اور وہ مجھے آواز دیتے تھے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کر رکھی تھی کہ ایسے موقعہ پر میں فوراً ان کی گردن کی پچھلی رگوں اور پٹھوں کو زور زور سے دبایا کروں۔ تھوڑی دیر کے وہ کہتے تھے بس۔ اور میں دبانا چھوڑ دیتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ مجھے اپنے نزدیک سلایا کرتے تھے۔"

ہر چند میرا دل چاہتا ہے کہ میں علی بخش سے اس واردات کے متعلق کچھ مزید استفسار کروں لیکن میں اس کے ذہنی ربط کو توڑنے سے ڈرتا ہوں۔

"ڈاکٹر صاحب بڑے درویش آدمی تھے۔ گھر کے خرچ کا حساب کتاب میرے پاس رہتا

تھا۔ میں بھی بڑی کفایت سے کام لیتا تھا۔ ان کا پیسہ ضائع کرنے سے مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اکثر اوقات ریل کے سفر کے دوران میں کئی کئی اسٹیشن بھوکا رہتا تھا کیونکہ وہاں روٹی مہنگی ملتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب ناراض ہو جاتے تھے۔ کہا کرتے تھے' علی بخش انسان کو ہمیشہ وقت کی ضرورت کے مطابق چلنا چاہیے۔ خواہ مخواہ ایسے ہی بھوکے نہ رہا کرو۔ اب اسی مربعہ کے ٹنٹنے کو دیکھ لیجیے۔ لائلپور کے ڈپٹی کمشنر صاحب' مال افسر صاحب اور سارا عملہ میری بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ بڑے اخلاق سے مجھے اپنے برابر کرسی پر بٹھاتے ہیں۔ ایک روزبازار میں ایک پولیس انسپکٹر نے مجھے پہچان لیا اور مجھے گلے لگا کر دیر تک روتا رہا۔ یہ ساری عزت ڈاکٹر صاحب کی برکت سے ہے۔ مربعہ کی بھاگ دوڑ میں میرے سر کچھ قرضہ بھی چڑھ گیا ہے۔ لیکن میں اس کام کے لیے بار بار لاہور کیسے چھوڑوں۔ جاوید کا نقصان ہوتا ہے۔"

"سنا ہے اپریل میں جاوید چند مہینوں کے لیے ولایت سے لاہور آئے گا۔ جب وہ چھوٹا سا تھا' ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ اللہ کے کرم سے اب بڑا ہوشیار ہو گیا ہے۔ جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا تو وہ اور منیرہ بی بی بہت کم عمر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے نرس کے لیے اشتہار دیا۔ بے شمار جواب آئے۔ ایک بی بی نے تو یہ لکھ دیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ شادی کرنے کے لیے بھی تیار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسی قدر پریشان ہوئے اور کہنے لگے' علی بخش دیکھو تو سہی اس خاتون نے کیا لکھا ہے۔ میں بڈھا آدمی ہوں۔ اب شادی کیا کروں گا۔ لیکن پھر علی گڑھ سے ایک جرمن لیڈی آ گئی۔

علی بخش کا تخیل بڑی تیز رفتاری سے ماضی کے دھندلکوں میں پرواز کر رہا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر اسے اپنے ڈاکٹر صاحب یا جاوید یا منیزہ بی بی کی کوئی نہ کوئی خوشگوار یاد آتی رہتی ہے۔

جھنگ پہنچ کر میں اسے ایک رات اپنے ہاں رکھتا ہوں۔ دوسری صبح اپنے ایک نہایت قابل اور فرض شناس مجسٹریٹ کپتان مہابت خان کے سپرد کر دیتا ہوں۔

کپتان مہابت خان علی بخش کو ایک نہایت مقدس تابوت کی طرح عقیدت سے چھو کر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ وہ علی بخش کو آج ہی اپنے ساتھ لائلپور لے جائے گا اور اس کی زمین کا قبضہ دلا کر ہی واپس لوٹے گا۔ "حد ہو گئی۔ اگر ہم یہ معمولی سا کام بھی نہیں کر سکتے تو ہم پر لعنت ہے۔"

○ ◯ ○

- ملاقاتی

"جو صاحبان ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کرنا چاہیں' وہ سوموار اور جمعرات کے روز صبح نو بجے سے ۱۲ بجے دوپہر تک بے روک ٹوک تشریف لے آئیں۔"

"بے مقصد کے ملاقاتی اور سفارشی حضرات آنے کی تکلیف نہ اٹھائیں۔"

یہ اس نوٹس بورڈ کی عبارت ہے جو میں نے شروع ہی سے اپنے دفتر کے سامنے لگا دیا تھا۔ پہلے تو اس سلیس عبارت کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہ آیا اور پیشہ ور ملاقاتیوں اور سفارشیوں کے علاوہ اور کوئی شخص میرے نزدیک تک نہ پھٹکا۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات بڑی سرعت سے بدلنے لگے۔

پیر اور جمعرات کے روز دو کلرک صبح آٹھ بجے سے دفتر کے برآمدے میں بیٹھ جاتے تھے۔ جو جو آتا تھا' ان کے نام اسی ترتیب سے ایک فہرست میں درج کرتے جاتے تھے اور ملاقاتی اسی فہرست کے مطابق باری باری سب میرے پاس آتے تھے۔ اول اول شہر کے حاجت مند لوگ آنا شروع ہوئے' پھر آس پاس کے قصبوں سے کچھ لوگ آنے لگے اور کچھ عرصہ کے بعد دور دراز کے دیہات سے ہر طبقہ کے لوگ آنے لگے۔

شروع شروع میں ملاقاتیوں کی تعداد پندرہ بیس کے قریب ہوتی تھی۔ دو مہینے کے اندر اندر ان کی تعداد سو سوا سو کے لگ بھگ پہنچ گئی اور کچھ عرصہ کے بعد ایسا وقت بھی آیا کہ ملاقات کے روز مجھے تین تین چار چار سو لوگوں کے ساتھ ملنا پڑتا تھا۔

ایک ایک روز میں اتنے لوگوں کو بھگتنا بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا تھا۔ لیکن جب میں ایمانداری سے جائزہ لیتا ہوں تو ملاقاتوں کے یہی چند روز میری ساری ملازمت کا اصلی سرمایہ نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں اس کی وجہ کردار کی کمزوری یا ماحول کی کجی ہے' لیکن سچ تو یہ ہے کہ سرکاری کرسی اچھے خاصے انسان کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے۔ اس کی فطرت

ٹیڑھے ترچھے سانچوں میں ڈھلنے لگتی ہے۔ نگاہ کا زاویہ بہت حد تک بھینگا ہو جاتا ہے۔ دفتر کی فضا میں سانس لینے کے بعد باہر کھلی ہوا میں گھومنے والے ایک دوسری مخلوق نظر آنے لگتے ہیں۔ دفتری ماحول زندگی کے ہر پہلو پر ایک کثیف غبار کی طرح چھا جاتا ہے اور زندگی کی بے اندازہ وسعت سمٹ سمٹا کر ایک چھوٹے سے گرداب میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔

خاص طور پر ڈپٹی کمشنر کا رشتہ بنی نوع کے ساتھ بے حد محدود ہو جاتا ہے۔ اس کے گرد صرف چند مخصوص عناصر رہ جاتے ہیں' جو اسے مکڑی کے جالے کی طرح اپنے تانے بانے میں جکڑے رکھتے ہیں۔

ان عناصر میں پہلا عنصر سرکاری ملازموں اور وکیل صاحبان کا ہے۔ ملازموں میں مجسٹریٹ بھی شامل ہیں۔ تحصیلدار' نائب تحصیلدار' تھانیدار' قانونگو اور پٹواری بھی۔ اور دفتر کا عملہ بھی جن میں سپرنٹنڈنٹ' ناظر' مسل خواں' پیشکار' واصل باقی نویس اور پی۔ اے پیش پیش ہوتے ہیں عدالت کی کرسی کو احتراماً "عزت ماب" کے لقب سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ طرز تخاطب بہت سے وکلاء کا تکیہ کلام بن جاتا ہے اور وہ کمرہ عدالت کے اندر اور باہر ڈپٹی کمشنر کو اسی طرح مخاطب کرتے کرتے اس بچارے کو عزت مابی کے ذہنی چسکے میں بری طرح مبتلا کر دیتے ہیں۔ نارمل زندگی میں "آپ" کا لفظ کافی عزت و احترام کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن ضلع کے افسروں اور اہلکاروں کے نزدیک احترام کی یہ حد ڈپٹی کمشنر کی ذات کے لیے ناکافی اور ناموزوں ہے۔ چنانچہ وہ ہر وقت اسے "جناب" یا "حضور" کے القابات سے مخاطب کرتے ہیں۔ پہلے پہلے تو ایسے القاب کی تکرار کافی نامانوس ہوتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ڈپٹی کمشنر کے کان ان الفاظ کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس کا دل و دماغ ان کے سحر آفریں سرور میں اس درجہ مخمور ہو جاتا ہے کہ اگر کبھی کوئی دل جلا اسے "آپ" کہہ کر مخاطب کرے تو یہ حرکت ڈپٹی کی شان میں گستاخی اور نظام حکومت کے خلاف بغاوت نظر آنے لگتی ہے!

دوسرا عنصر جو ڈپٹی کمشنر کی ذات پر ایک زہرناک غبار کی طرح چھایا رہتا ہے۔ شہری روٗسا اور دیہات کے بڑے بڑے زمینداروں کا ہے۔ ان میں سے معدودے چند حضرات اپنے یا دوسروں کے جائز معاملات لے کر آتے ہیں۔ کچھ لوگ ناجائز مطالبات اور سفارشیں لاتے ہیں۔ لیکن اکثر بزرگ محض شوقیہ ملاقات فرمانے کی لت پوری کیا کرتے ہیں۔ اضلاعی اصطلاح میں شوقیہ ملاقاتیں سلام کہلاتی ہیں اور زمینداروں کی برادری میں اس سلام کو بڑی سماجی اور سیاسی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

اتوار کا روز ہے۔ ہفتہ بھر کی دفتری بک بک جھک جھک کے بعد جی چاہتا ہے کہ آج کچھ گھنٹے اپنی مرضی کے مطابق گزارے جائیں۔ لیکن یہ امید محض خواب و خیال ہے۔ کیونکہ صبح ہی سے کوٹھی کے صحن میں بھانت بھانت کے معزز ملاقاتی جمع ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ معزز اس لیے ہیں کہ عام ملاقات کے روز دوسرے لوگوں کے ساتھ تشریف لانا ان کے نزدیک کسرشان ہے۔ ان میں ایک بہت بڑے زمیندار ہیں۔ ان کے پاس پندرہ بیس ہزار ایکڑ سے زیادہ زمین ہے اور ضلع کے صدر مقام میں ان کے کئی شاندار بنگلے ہیں۔ مہینے میں ایک یا دو بار وہ پچاس ساٹھ میل کا سفر طے کر کے ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کرنے ضرور آتے ہیں۔ جب وہ شہر آتے ہیں تو ان کے جلو میں مزارعوں اور ملازموں کی ایک فوج کی فوج ہوتی ہے۔ کتے پالنا اور شکار کھیلنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ناچ گانے کا شوق بھی ہے اور عورت ذات کے ساتھ ان کی دلچسپی الف لیلیٰ کی داستانوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ ان کی کوٹھی کے صحن میں بندوقوں' گھوڑوں اور کتوں کے لاؤ لشکر دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ مغلیہ سلطنت کا کوئی شہزادہ ظل سبحانی کے خلاف بغاوت کر کے دارالسلطنت پر چڑھائی کرنے جا رہا ہے۔

اپنے علاقے میں یہ بزرگ زمینداری کا حق ہی ادا نہیں کرتے بلکہ مقامی نظم و نسق کی باگ دوڑ بھی بڑی مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ کسی مزارعہ کا بیل چوری ہو جائے تو تھانے میں رپورٹ ان کی منظوری سے لکھائی جاتی ہے۔ کسی کو بندوق کا لائسنس درکار ہو تو اس کی درخواست زمیندار صاحب کی وساطت سے آگے بڑھتی ہے۔ مقدموں

کی پیرویاں بھی زمیندار کی خوشنودی کے ساتھ پروان چڑھتی ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ مقامی افسروں اور عوام کے درمیان اس قسم کے زمیندار دیوار چین کی طرح حائل ہو جاتے

ہیں۔ دوسرے الفاظ میں بڑی بڑی زمینداریاں ایک مضبوط چھلنی کا کام دیتی ہیں۔ جو لوگ یا جو معاملات اس چھلنی سے بخوبی گزر جائیں وہ خداوندان حکومت کی توجہ کے مستحق بن جاتے ہیں۔ باقی ساری مخلوق زمینداری کی پر پیچ غلام گردشوں میں پس پردہ رہ جاتی ہے۔ اس باریک چھلنی سے گزرنے کے لیے انسان کو خوب اچھی طرح پسنا پڑتا ہے۔ انانیت' خودداری' خوداعتمادی اور آزادی کے روڑے اس چھلنی کے مہین سوراخوں سے گزرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

چھاج اور چھلنی کے اس نظام میں کئی فوائد ہیں۔ ایک طرف تو ضلع کی انتظامیہ اعلیٰ نسل کے برہمن کی طرح عوام الناس کے شودروں سے بڑی حد تک دور رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ بڑے زمینداروں کی اپنے مزارعوں پر گرفت مضبوط رہتی ہے تاکہ یہ برتری وہ حسب ضرورت حکومت اور اپنے ذاتی مفاد میں کام لا سکیں۔ میں نے اس روایتی نظام میں کسی قدر دخل دے کر عوام کے ساتھ براہ راست رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو زمیندارہ برادری میں بڑی تشویش پھیل گئی۔ کچھ لوگ یہ کہہ کر ہنسے کہ یہ نوجوان اور ناتجربہ کار آدمی ہے۔ چار دن میں منہ کی کھا کر ہمارے سامنے ہی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا۔ دوسروں نے غصے سے کہا کہ ہم لوگ بھی مٹی کے مادھو نہیں ہیں۔ ہم اس بیگانہ نظام کو ایک پھونک سے اڑا کر مکڑی کے جالے کی طرح تتر بتر کر دیں گے۔

لیکن میں بھی ثابت قدمی سے اپنے طریق کار پر ڈٹا رہا۔ دن بہ دن ملاقاتیوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ کسی منچلے نے کچہری کے احاطے میں "ملاقاتی ہوٹل" کے نام سے ایک ہوٹل بھی کھول لیا' دور دراز سے آنے والے لوگ سرشام ہی یہاں پہنچ جاتے تھے اور "ملاقاتی ہوٹل" میں بان کی چارپائی پر رات گزارتے تھے تاکہ صبح صبح ملاقاتیوں کی فہرست میں دوسروں سے پہلے اپنا نام درج کروا سکیں۔

ملاقات کے روز میں بھی ایک رجسٹر کھول کر سامنے رکھ لیتا تھا۔ ہر سائل کی شکایت اس میں درج کر لیتا تھا۔ اگر معاملہ مقامی نوعیت کا ہوتا تو متعلقہ افسر کو اپنے پاس بلا کر اسی وقت وہیں فیصلہ کر دیتا تھا۔ اگر مضافات میں کسی پٹواری' نائب تحصیلدار' تحصیلدار یا تھانے دار سے کوئی رپورٹ طلب کرنا ضروری ہوتا' تو عرضی پر یہ حکم لکھ کر سائل کے حوالے کر دیتا کہ یہ رپورٹ ساتھ لے کر فلاں تاریخ کو دوبارہ حاضر ہو۔ یہ حکم اور اگلی پیشی کی تاریخ میں اپنے رجسٹر میں بھی درج کر لیتا تھا۔

پہلے تو کسی کسی پٹواری یا تھانیدار وغیرہ نے ایسی درخواستوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا' اور سائلوں کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا۔ جب مقررہ تاریخ پر کوئی سائل رپورٹ حاصل کئے بغیر خالی ہاتھ واپس آتا' تو میں اسے اپنی کار میں بٹھا کر دور دراز علاقوں میں متعلقہ تھانوں یا پٹواریوں کے ڈیرے پر جا پہنچتا اور سائل کے کاغذات برآمد کر کے اس کے مسائل پر وہیں کھڑے کھڑے مناسب احکام جاری کر دیتا۔ میرے اس طرز عمل کا چرچا پھیلا تو رفتہ رفتہ محکمہ مال اور پولیس کا عملہ بھی اپنی اپنی جگہ محتاط ہو گیا اور میرے ملاقاتیوں کے کام بڑی حد تک نچلی سطح پر حل ہونا شروع ہو گئے۔

میرا ایک ملاقاتی سفید ریش' بزرگ صفت اور نیکدل انسان تھا۔ اس کی باری آئی تو اس نے اپنا عصا کئی بار زور زور سے میری میز پر مارا اور گرجدار آواز میں کڑک کر بولا:

"انصاف کی رسی ہاتھ سے مت چھوڑو۔ یہ بات ہرگز نہ بھولو کہ قیامت بہت قریب ہے اور ہر شخص خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے اعمال کا جواب دہ ہو گا۔"

اس قسم کے خالص تبلیغی ملاقاتی شاذو نادر ہی نظر آتے تھے۔ ورنہ اکثریت تو ایسے لوگوں کی ہوتی تھی جو کسی محکمانہ کاروائی یا کسی مفسد کی چیرہ دستی یا محض قدرت کی ستم ظریفی کا شکار ہوتے تھے۔ جوں جوں ایسے ملاقاتیوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا' اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذاتی مسائل میں بھی عجیب و غریب تنوع پیدا ہوتا گیا۔

ایک طوائف کو شکایت تھی کہ اس کی ہمسائی رات کے وقت نیم عریاں لباس پہنتی ہے اور برسرعام اپنی بے حجابی اور بداخلاقی کا مظاہرہ کر کے شریفانہ مارکیٹ پر برا اثر ڈالتی ہے۔

ایک ساس اپنی لڑاکا بہو کے خلاف شکایت نامہ لائی۔

ایک مڈل سکول کی استانی کو خطرہ تھا کہ اگر اس نے ایک امیر تاجر کی کند ذہن لڑکی کو اچھے نمبروں سے پاس نہ کیا تو اسے غنڈوں کے ذریعہ اغوا کر لیا جائے گا۔

ایک روز ایک بے حد مفلوک الحال بڑھیا آئی۔ رو رو کر بولی کہ میری چند بیگھہ زمین ہے جسے پٹواری نے اپنے کاغذات میں اس کے نام منتقل کرنا ہے لیکن وہ رشوت لیے بغیر یہ کام کرنے سے انکاری ہے۔ رشوت دینے کی توفیق نہیں۔ تین چار برس سے وہ طرح طرح کے دفتروں میں دھکے کھا رہی ہے لیکن کہیں شنوائی نہیں ہوئی۔

اس کی درد ناک بپتا سن کر میں نے اسے اپنی کار میں بٹھایا اور جھنگ شہر سے ساٹھ ستر میل دور اس کے گاؤں کے پٹواری کو جا پکڑا۔ ڈپٹی کمشنر کو اپنے گاؤں میں یوں اچانک دیکھ کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ پٹواری نے سب کے سامنے قسم کھائی کہ یہ بڑھیا بڑی شر انگیز عورت ہے اور زمین کے انتقال کے بارے میں جھوٹی شکائیتیں کرنے کی عادی ہے۔ اپنی قسم کی عملی طور پر تصدیق کرنے کے لیے پٹواری اندر سے ایک جزدان اٹھا کر لایا اور اسے اپنے سر پر رکھ کر کہنے لگا' حضور دیکھیے میں اس مقدس کتاب کو سر پر رکھ کر قسم کھاتا ہوں۔"

گاؤں کے ایک نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ "جناب ذرا یہ بستہ کھول کر بھی دیکھ لیں۔"

ہم نے بستہ کھولا' تو اس میں قرآن شریف کی جلد نہیں بلکہ پٹوار خانے کے رجسٹر بندھے ہوئے تھے۔ میرے حکم پر پٹواری بھاگ کر ایک اور رجسٹر لایا اور سر جھکا کر بڑھیا کی انتقال اراضی کا کام مکمل کر دیا۔

میں نے بڑھیا سے کہا' "بی بی' لو تمہارا کام ہو گیا۔ اب خوش رہو۔"

بڑھیا کو میری بات کا یقین نہ آیا۔ اپنی تشفی کے لیے اس نے نمبردار سے پوچھا' "کیا سچ مچ میرا کام ہو گیا ہے؟"

نمبردار نے اس بات کی تصدیق کی تو بڑھیا کی آنکھوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ اس کے دوپٹے کے ایک کونے میں کچھ ریزگاری بندھی ہوئی تھی۔ اس نے اسے کھول کر سولہ آنے گن کر اپنی مٹھی میں لیے اور اپنی دانست میں دوسروں کی نظر بچا کر چپکے سے میری جیب میں ڈال دیے۔ اس ادائے معصومانہ اور محبوبانہ پر مجھے بھی بے اختیار رونا آ گیا۔ یہ دیکھ کر گاؤں کے کئی دوسرے بڑے بوڑھے بھی آبدیدہ ہو گئے۔

یہ سولہ آنے واحد "رشوت" ہے جو میں نے اپنی ساری ملازمت کے دوران قبول کی۔ اگر مجھے سونے کا ایک پورا پہاڑ بھی مل جاتا' تو میری نظر میں ان سولہ آنوں کے سامنے اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی۔ میں نے ان آنوں کو ابھی تک خرچ نہیں کیا۔ کیونکہ میرا گمان ہے کہ یہ ایک ایسا متبرک تحفہ ہے جس نے مجھے ہمیشہ کے لیے مالا مال کر دیا ہے۔

میرا ایک عجیب ملاقاتی نو یا دس سالہ بچہ تھا۔ جو شہر کے ایک دور افتادہ محلے سے مجھے ملنے آیا تھا۔ دفتر کے اجنبی ماحول میں وہ کچھ سہا سہا تھا۔ لیکن اس نے بڑی صفائی سے کہا۔ "میری ماں مر رہی ہے۔"

"تمہاری ماں کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری ماں اپنے گھر ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا تمہاری ماں بیمار ہے؟" میں نے پوچھا۔

بچے نے اس سوال کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ دیر تک اپنے سامنے کسی خلا میں ٹکٹکی باندھ کر گھورتا رہا اور پھر غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ "اگر میری ماں مر گئی تو میں سارے شہر کو آگ لگا دوں گا۔"

میں نے بچے کو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور جب کام ختم ہوا تو میں نے اسے کہا کہ

وہ مجھے اپنے گھر لے چلے۔
ایک تنگ و تاریک گلی میں ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی میں بان کی ایک چارپائی تھی۔ چارپائی پر کچھ ردی کے کاغذ اور چند پھٹے ہوئے کپڑے بچھے ہوئے تھے۔ ان کی سیج پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت بے ہوش پڑی تھی۔ اسے ڈبل نمونیہ تھا۔ اس کا کرتہ کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ کوٹھڑی میں دو تین خالی برتن تھے اور در و دیوار پر موت کا سایہ لرز رہا تھا۔
"تمہارے گھر میں اور کوئی ہے؟" میں نے بچے سے پوچھا۔
"میری دادی ہے۔ باہر گوبر چن رہی ہے۔"
میں بچے کے ساتھ باہر آیا۔ گلی میں ایک گونگی اور بہری عورت تازہ گوبر اٹھا کر ٹوکری میں جمع کر رہی تھی۔ اس کی کمر خمیدہ تھی۔ چہرے پر افسردہ انگوروں کی طرح جھریوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ گوبر کی ٹوکری میں ڈالنے سے پہلے وہ اسے اپلوں کی صورت میں ڈھال لیتی تھی تاکہ سکھا کر وہ اسے گھر میں ایندھن کے طور پر استعمال کر سکے۔

ایک روز ایک پرائمری سکول کا استاد رحمت الٰہی آیا۔ وہ چند ماہ کے بعد ملازمت سے ریٹائر ہونے والا تھا۔ اس کی تین جوان بیٹیاں تھیں۔ رہنے کے لیے اپنا گھر بھی نہیں تھا۔ پنشن نہایت معمولی ہو گی۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ ریٹائر ہونے کے بعد وہ کہاں رہے گا؟ لڑکیوں کی شادیاں کس طرح ہو سکیں گی؟ کھانے پینے کا خرچ کیسے چلے گا؟ اس نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ پریشانی کے عالم میں وہ کئی ماہ سے تہجد کے بعد رو رو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فریادیں کرتا رہا ہے۔ چند روز قبل اسے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ جس میں حضور نے فرمایا کہ تم جھنگ جا کر ڈپٹی کمشنر کو اپنی مشکل بتاؤ۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا۔
پہلے تو مجھے شک ہوا کہ یہ شخص ایک جھوٹا خواب سنا کر مجھے جذباتی طور پر بلیک میل

کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے چہرے پر شک اور تذبذب کے آثار دیکھ کر رحمت الٰہی آبدیدہ ہو گیا اور بولا۔ "جناب میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ اگر جھوٹ بولتا تو اللہ کے نام پر بولتا۔ حضور رسول پاک کے نام پر کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں؟"

اس کی اس منطق پر میں نے حیرانی کا اظہار کیا' تو اس نے فوراً کہا' "آپ نے سنا نہیں کہ باخدا دیوانہ وبا مصطفیٰ ہشیار باش۔"

یہ سن کر میرا شک پوری طرح رفع تو نہ ہوا لیکن سوچا کہ اگر یہ شخص غلط بیانی سے بھی کام لے رہا ہے تو ایسی عظیم ہستی کے اسم مبارک کا سہارا لے رہا ہے جس کی لاج رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ چنانچہ میں نے رحمت الٰہی کو تین ہفتہ کے بعد دوبارہ میرے پاس آنے کے لیے کہا۔ اس دوران میں نے خفیہ طور پر اس کے ذاتی حالات کا کھوج لگایا اور یہ تصدیق ہو گئی کہ وہ اپنے علاقے میں نہایت سچا' پاکیزہ اور پابند صوم و صلوٰۃ آدمی مشہور ہے اور اس کے گھریلو حالات بھی وہی تھے جو اس نے بیان کئے تھے۔

اس زمانے میں کچھ عرصہ کے لیے صوبائی حکومت نے ڈپٹی کمشنر کو یہ اختیار دے رکھا تھا کہ سرکاری بنجر زمین کے آٹھ مربعے تک ایسے خواہشمندوں کو طویل میعاد پر دیئے جا سکتے ہیں جو انہیں آباد کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ میں نے اپنے مال افسر کو بلا کر کہا کہ وہ کسی مناسب جگہ کراؤن لینڈ کے ایسے آٹھ مربعے تلاش کرے جنہیں جلد از جلد زیر کاشت لانے میں کوئی خاص دشواری پیش نہ آئے۔ غلام عباس مال افسر نے غالباً یہ سمجھا کہ شاید اراضی میں اپنے کسی عزیز کو دینا چاہتا ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پکی سڑک کے قریب نیم آباد سی زمین ڈھونڈ نکالی اور رحمت الٰہی کے نام الاٹمنٹ کی ضروری کاروائی کر کے سارے کاغذات میرے حوالے کر دیئے۔

دوسری پیشی پر جب رحمت الٰہی حاضر ہوا تو میں نے یہ نذرانہ اس کی خدمت میں پیش کر کے اسے مال افسر کے حوالے کر دیا کہ قبضہ وغیرہ دلوانے اور باقی ضروریات پوری کرنے میں وہ اس کی پوری پوری مدد کرے۔

تقریباً نو برس میں صدر ایوب کے ساتھ کراچی میں کام کر رہا تھا کہ ایوان صدر میں میرے نام ایک رجسٹرڈ خط موصول ہوا۔ یہ ماسٹر رحمت الٰہی کی جانب سے تھا کہ اس زمین پر محنت کر کے اس نے تینوں بیٹیوں کی شادی کر دی ہے اور وہ اپنے اپنے گھر میں خوش و خرم آباد ہیں۔ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ حج کا فریضہ بھی ادا کر لیا ہے اور اپنے گزارے اور رہائش کے لیے تھوڑی سی ذاتی زمین خریدنے کے علاوہ ایک کچا سا کوٹھا بھی تعمیر کر لیا ہے۔ ایسی خوشحالی میں اب اسے آٹھ مربعوں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چنانچہ اس الاٹمنٹ کے مکمل کاغذات اس خط کے ساتھ واپس ارسال ہیں تاکہ کسی اور حاجت مند کی ضرورت پوری کی جا سکے۔

میں یہ خط پڑھ کر کچھ دیر تک سکتے میں آ گیا۔ میں اسی طرح گم سم بیٹھا تھا کہ صدر ایوب کوئی بات کرنے کے لیے میرے کمرے میں آ گئے۔

"کس سوچ میں گم ہو؟" انہوں نے میری حالت بھانپ کر پوچھا۔

میں نے انہیں رحمت الٰہی کا سارا واقعہ سنایا تو وہ بھی نہایت حیران ہوئے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر وہ اچانک بولے۔ "تم نے بڑا نیک کام سر انجام دیا ہے۔ میں نواب صاحب کو لاہور ٹیلیفون کر دیتا ہوں کہ وہ یہ اراضی اب تمہارے نام کر دیں۔"

میں نے نہایت لجاجت سے گزارش کی کہ میں اس انعام کا مستحق نہیں ہوں۔

یہ سن کر صدر ایوب حیرانی سے بولے' "تمہیں زرعی اراضی حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں؟"

"جی نہیں سر۔" میں نے التجا کی۔ "آخیر میں فقط دو گز زمین ہی کام آتی ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح مل ہی جاتی ہے۔"

میرا اندازہ ہے کہ میری یہ بات سن کر صدر کچھ چڑھ سے گئے۔ زمین حاصل کرنے کے وہ خود بڑے رسیا تھے۔

ایک روز میری ایک ملاقات بشیراں طوائف تھی۔ وہ بڑے ٹھسے سے دفتر میں داخل ہو

کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے رنگین لباس سے حنا کے عطر کی باسی باسی خوشبو آ رہی ہے اور اس کی آنکھیں رت جگے اور رونے کی آمیزش سے سوجی ہوئی ہیں۔

میں اس کی تراش خراش کا سرسری سا جائزہ لے کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں اور میز پر پڑے ہوئے مستطیل شیشے کی جانب ٹکٹکی لگا کر بیٹھ جاتا ہوں۔

بشیراں طوائف کھنکار کر گلا صاف کرتی ہے۔ "سرکار میری بات سنو۔" اس کی آواز میں ایک بلغمی سا بوجھ اور کھردرا پن ہے۔

"کیا بات ہے؟"

"میری بات سنو سرکار۔" وہ دوبارہ تھکن آلود آواز سے کہتی ہے۔

"سن تو رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟"

لیکن بشیراں مطمئن نہیں ہوتی۔ غالباً اس کا مدعا یہ ہے کہ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات کروں۔ لیکن میں بدستور میز پر پڑے ہوئے مستطیل شیشے کی طرف ٹکٹکی باندھے بیٹھا رہتا ہوں۔ اس پر بشیراں طوائف ایک ہچکی لے کر رونے لگتی ہے۔

میں گھبرا کر اس کی طرف نظر اٹھاتا ہوں اور کسی انجانے خوف سے لرز اٹھتا ہوں۔ اس کی بڑی سوجھی ہوئی آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہیں۔ مجھے رہ رہ کر ڈر لگتا ہے کہ شاید اس کی آنکھوں سے اچانک آنسوؤں کی جگہ خون کے قطرے یا کچے گوشت کے لوتھڑے گرنے لگیں گے۔

مجھے اپنی جانب متوجہ کر کے بشیراں طوائف دوپٹہ کے آنچل سے آنسو خشک کرتی ہے اور اس کے ہونٹوں پر اس کی پیشہ ورانہ مسکراہٹ ازسر نو نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ مسکراہٹ ایک میکانکی عمل ہے۔ اس میں ہونٹوں کے پھیلاؤ کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہیں

"سرکار' میرے گھر پر کل رات میونسپلٹی والوں نے چھاپہ مارا ہے۔" وہ اپنی شکایت شروع کرتی ہے۔

"کوئی وجہ ہو گی؟"

کوئی وجہ ہوتی تو میں کبھی شکایت نہ کرتی۔" وہ خود اعتمادی سے کہتی ہے۔ "مجھے ناحق دق کیا جاتا ہے۔ میں بارہ برس سے اسی جگہ بیٹھی ہوں۔ اپنی محنت سے روٹی کماتی ہوں۔ منڈی کا داروغہ' کمیٹی کا انسپکٹر اور شہر والے لوکل سب مجھ سے خوش ہیں۔ لیکن پانی پت کے پناہ گیر جو اب میرے محلے میں آ کر آباد ہوئے ہیں' ہر روز میرے خلاف عرضیاں دیتے رہتے ہیں کہ مجھے اس مکان سے نکال دیا جائے تاکہ ان کی بہو بیٹیوں پر خراب اثر نہ پڑے اور......"

"مکان کس کا ہے؟" میں بات کاٹ کر پوچھتا ہوں۔

"میرا ہے سرکار۔ لالہ شنکرداس نے میری نتھ اتروائی پر میرے نام کروایا تھا۔" بشیراں نے اپنی پٹاری سے لالہ شنکرداس کے کاغذات نکال کر میز پر رکھ دیئے۔

"بحالیات کے محکمہ سے بھی اجازت لی ہے یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ کنفرم ہے۔" اس محکمہ بحالیات کے کاغذات بھی میز پر دے مارے۔

"سرکار میں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر حج کے لیے رقم جمع کی ہے۔ کراچی سے حج کا قرعہ بھی میرے نام آ گیا ہے۔ اب اگر میں حج پر چلی گئی تو پانی پت والے کمیٹی سے مل کر میرے مکان پر قبضہ کر لیں گے۔ حاضری کا بلاوا تو آ گیا ہے۔ اگر نہ گئی تو اس کا عذاب کون بھگتے گا؟ آخر میں نے بھی تو قوم کی بہت خدمت کی ہے۔"

"کیا خدمت کی ہے؟" میں نے کس قدر طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

وہ اپنے تھیلے سے آزاد کشمیر فنڈ' قائداعظم ریلیف فنڈ' قائداعظم میموریل فنڈ' بیوہ گھر' اور یتیم خانوں میں دیئے گئے چندوں کی رسیدیں نکال کر میز پر ڈھیر لگا دیتی ہے۔

یہ دیکھ کر میں ایک عجیب مخمصے میں گرفتار ہو جاتا ہوں۔ یہ پیشہ ور بدنام عورت ماہئ بے آب کی طرح حج پر جانے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ اللہ اور رسول کا کوئی قانون اسے اس عظیم سعادت کی نعمت سے محروم نہیں کرتا۔ لیکن جھنگ مگھیانہ میونسپلٹی کا قانون اس کا مکان چھین سکتا ہے۔ اگر اس کا مکان چھن گیا تو وہ حج پر جانے سے رہ جائے گی...... اگر دس نمازی اور متقی حج پر نہ جا سکیں تو شاید جنت کی آبادی میں

کوئی کمی واقع نہ ہو گی۔ لیکن اگر یہ طوائف حج پر جا کر توبہ کرنے سے رہ گئی تو دوزخ کے شعلے کس کے لیے سرد پڑیں گے؟

میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتا ہوں اور آغا شجاعت علی صاحب ایس۔ پی کو ٹیلیفون پر یہ صورت حال سناتا ہوں۔ آغا صاحب بڑے بااخلاق' شائستہ اور نیک خو پولیس افسر ہیں۔ وہ اپنی نرم آواز میں بڑے جذبے سے کہتے ہیں' "میں اس قبضے سے واقف ہوں۔ آپ اسے ضرور حج پر جانے دیں۔ اس کا مکان کوئی نہیں چھین سکتا۔ اس کی غیر حاضری میں پولیس اس کے مکان کی حفاظت کرے گی؟"

واپس آ کر میں بشیراں سے کہتا ہوں۔ "تم ضرور حج پر روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے مکان کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ تمہاری واپسی تک پولیس اس کی حفاظت کرے گی۔"

"خدا سرکار کو سلامت رکھے۔" وہ خوشی سے اچھل کر کھڑی ہو جاتی ہے اور جلدی جلدی آزاد کشمیر فنڈ' قائداعظم ریلیف فنڈ' قائداعظم میموریل فنڈ' بیوہ گھر اور یتیم خانوں کے چندوں کی رسیدیں سمیٹ کر اپنی جھولی میں ڈال لیتی ہے۔

اندر ہی اندر میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس سے کہوں کہ جب تم حرمین شریفین کی زیارت کرو تو میرے لیے بھی دعا کے دو لفظ بول دینا۔ لیکن ڈپٹی کمشنر کا شدید احساس کمتری مجھے یہ کہنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ بشیراں محض ایک طوائف ہے۔ یوں بھی محمد صدیق اردلی دیر سے دفتر کے دروازے پر منڈلا رہا ہے اور میرا اس قدر وقت "ضائع" کرنے پر بشیراں کو بڑی سنگدلی سے گھور رہا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ جب وہ میرے دفتر سے باہر نکلے تو محمد صدیق اپنی خالص گڑگانوی زبان میں اسے دو چار گالیں بھی سنا دے۔

ایک روز ایک ملاقاتی آیا' جس کا نام عبداللہ تھا۔ آتے ہی اس نے زور سے اسلام علیکم کہا' اور بولا۔ کسی نے بتایا کہ آپ بھی جموں کے رہنے والے ہیں۔ میرا بھی وہیں بسیرا تھا۔ بس یونہی جی چاہا کہ اپنے شہر والے کے درشن کر آؤں' اور کوئی کام نہیں۔

میں نے اسے تپاک سے اپنے پاس بٹھا لیا اور کرید کرید کر اس کا حال احوال پوچھتا رہا جسے سن کر میں سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

جموں میں عبداللہ کی کوئی دکان تو نہ تھی لیکن وہ اپنے گھر پر ہی رنگریزی کا کام کر کے گزر اوقات کیا کرتا تھا۔ بیوی تین بیٹیاں چھوڑ کر فوت ہو چکی تھی۔ ۹ برس کی زہرہ' ۱۲ برس کی عطیہ اور سولہ برس کی رشیدہ۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنی ذاتی نگرانی میں جموں کے مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کا پروگرام بنایا تو مسلمان خاندانوں کو پولیس لائن میں جمع کر کے اس بہانے بسوں اور ٹرکوں میں سوار کرا دیا جاتا تھا کہ انہیں پاکستان میں سیالکوٹ کے بارڈر تک پہنچا دیا جائے گا۔ راستے میں راشٹریہ سیوک سنگ کے ڈوگرہ اور سکھ درندے بسوں کو روک لیتے تھے۔ جوان لڑکیوں کو اغوا کر لیا جاتا تھا۔ جوان مردوں کو چن چن کر تہ تیغ کر دیا جاتا تھا اور بچے کھچے بچوں اور بوڑھوں کو پاکستان روانہ کر دیا جاتا تھا۔ جب یہ خبریں جموں شہر میں پھیلنا شروع ہوئیں تو عبداللہ پریشان ہو کر پاگل سا ہو گیا۔ اس کی زہرہ' عطیہ اور رشیدہ پر بھی جوانی کے تازہ تازہ پھول کھل رہے تھے۔ عبداللہ کو یقین تھا کہ اگر وہ ان کو اپنے ساتھ لے کر کسی قافلے میں روانہ ہوا تو راستے میں اس کی تینوں بیٹیاں درندہ صفت ڈوگرہ جتھوں کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔ اپنے جگر گوشوں کو اس افتاد سے محفوظ رکھنے کے لیے عبداللہ نے اپنے دل میں ایک پختہ منصوبہ تیار کر لیا۔ نہا دھو کر مسجد میں کچھ نفل پڑھے۔ قصاب کی دکان سے ایک تیز دھار چھری مانگ لایا اور گھر آ کر تینوں بیٹیوں کو عصمت کی حفاظت اور سنت ابراہیمی کے فضائل پر بڑا موثر وعظ دیا۔ زہرہ اور عطیہ کم عمر تھیں اور گڑیا گڑیا کھیلنے کی حد سے آگے نہ بڑھی تھیں۔ وہ دونوں اپنے باپ کی باتوں میں آ گئیں۔ دلہنوں کی طرح سج دھج کر انہوں نے دو دو نفل پڑھے اور پھر ہنسی خوشی کے دروازے کی دہلیز پر سر ٹکا کر لیٹ گئیں۔ عبداللہ نے آنکھیں بند کئے بغیر اپنی چھری چلائی اور باری باری دونوں کا سر تن سے جدا کر دیا۔ عجب اتفاق تھا کہ اس روز آسمان کے فرشتے بھی اس قربانی کے لیے دو دنبے لانے سے چوک گئے۔ چنانچہ

دہلیز پر زہرہ اور عطیہ کی گردنیں کٹی پڑی تھیں۔ کچے فرش پر گرم گرم خون کی دھاریں بہہ بہہ کر بیل بوٹے کاڑھ رہی تھیں۔ کمرے کی فضا میں بھی ایک سوندھی سوندھی سی خوشبو رچی ہوئی تھی اور اب عبداللہ اپنے ہاتھ میں خون آشام چھری تھامے رشیدہ کو بلا رہا تھا۔ لیکن رشیدہ اس کے قدموں میں گری کپکپا رہی تھی' تھرتھرا رہی تھی' گڑ گڑا رہی تھی------ اگر وہ پڑھی لکھی ہوتی تو بڑی آسانی سے اپنے باپ کو للکار سکتی تھی کہ میں کوئی پیغمبر زادی نہیں ہوں۔ نہ ہی تم کوئی پیغمبر ہو۔ کیونکہ ہمارا دین تو صدیوں پہلے کامل ہو چکا ہے۔ پھر تمہیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ خواہ مخواہ میری گردن کاٹ کر ادھوری سنتیں پوری کرو------ لیکن رشیدہ انجان تھی' کم عقل تھی اور فصاحت و بلاغت کی ایسی تشبیہات اور تلمیحات استعمال کرنے سے قاصر تھی۔ وہ محض عبداللہ کے قدموں پر سر رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی' "ابا...... آپا...... آپا...."

رشیدہ کی گڑ گڑاہٹ پر عبداللہ کے پاؤں بھی ڈگمگا گئے۔ اس نے چھری ہاتھ سے پھینک دی۔ بہروپیوں کی طرح اس نے رشیدہ کو ایک بدصورت سی بڑھیا کے روپ میں ڈھالا اور کلمہ کا ورد کرتا ہوا اسے ساتھ لے کر ٹرک پر بیٹھ گیا۔ جب ٹرک والے نے قافلے کو سوچیت گڑھ لا کر اتارا اور وہ لوہے کا پھاٹک عبور کر کے پاکستان کی سرحد میں داخل ہو گئے تو یکایک عبداللہ کو زہرہ اور عطیہ کی یاد آئی جن کے سر جموں میں دروازے کی دہلیز پر کٹے پڑے تھے اور جو پھٹی پھٹی منجمد آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھتی دیکھتی دم توڑ گئی تھیں------ وہ کمر تھام کر سڑک کے کنارے بیٹھ گیا اور رشیدہ کو گلے سے لگائے دیر تک دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔

سیالکوٹ کے مہاجر کیمپ میں آ کر رفتہ رفتہ رشیدہ کی زلفیں پھر لہرانے لگیں۔ اس کی سرگیں آنکھوں میں پھر وہی پرانی چمک جگمگانے لگی۔ لیکن ہولے ہولے عبداللہ نے محسوس کیا کہ اس چمک میں جو شبنم کی سی تازگی اور ستاروں کی سی پاکیزگی اور ستاروں کی سی پاکیزگی جھلکا کرتی تھی' وہ ماند پڑ رہی ہے اور ایک دن اس نے خود اپنی آنکھوں

سے دیکھ لیا کہ ناموس ملت کے جن انمول آبگینوں کو وہ ڈوگروں اور سکھوں کے نرغے سے بچا کر لایا تھا وہ خدا کی مملکت میں سر بازار بک رہے ہیں۔ آدھی آدھی رات گئے جب رشیدہ کیمپ میں واپس آتی تو اس کا دامن پھلوں' مٹھائیوں' رنگ برنگ کپڑوں' پاؤڈر اور کریم وغیرہ کے خوبصورت پیکٹوں سے بھرا ہوتا تھا۔ عبداللہ غضب ناک ہو کر اسے مارتا پیٹتا اور رشیدہ کو پچھاڑ کر اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتا' جب رشیدہ کا سانس اکھڑنے لگتا اور اس کی آنکھیں ابھر کر باہر نکلنے لگتیں' تو اچانک اسے جموں کی وہ خون آلود دہلیز یاد آ جاتی جس پر وہ زہرہ اور عطیہ کی بے نور آنکھوں کو چھت کی جانب گھورتے چھوڑ آیا تھا۔ عبداللہ کے ہاتھ رعشہ کھا کر لرز اٹھتے۔ اس کا سر لٹو کی طرح اس کی گردن پر گھومنے لگتا اور وہ رشیدہ کو چھوڑ کر کیمپ کے دوسرے کنارے پر بیٹھا ساری رات روتا رہتا۔

ایک روز رشیدہ نے ترس کھا کر خود ہی اپنے باپ کو روز روز کی اذیت سے نجات دے دی۔ اس نے کیمپ چھوڑ دیا اور راتوں رات کسی کے ساتھ فرار ہو کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔

عبداللہ بھی کیمپ چھوڑ کر پہلے گجرات' پھر لائلپور اور اس کے بعد جھنگ آ گیا۔ جھنگ میں اس نے پہلے ریڑھی کا انتظام کیا اور دوسروں کی دیکھا دیکھی ریل بازار میں سبزی بیچنے کام کا کام شروع کر دیا۔ لیکن تجارتی بورڈ نے پے در پے ریزولیشن پاس کر کے ان کا ناک میں دم کر دیا کیونکہ ریل بازار میں ریڑھیوں کی بھرمار سے بڑی دکانوں کے بزنس میں خلل پڑتا تھا۔ سخت جان ریڑھی والے تو تجارتی بورڈ کی قراردادوں' کمیٹی والوں کی دھونس اور پولیس کے دباؤ کے باوجود وہیں جمے رہے لیکن سہما ہوا عبداللہ شہید روڈ پر اٹھ آیا' جہاں قوم کا غم غلط کرنے کے لیے مسجد' سینما اور ریڈیو اور گراموفون دن رات مسلسل مصروف عمل رہتے تھے۔

ایک روز میں عبداللہ سے ملنے شہید روڈ گیا۔ اس کی ریڑھی پر باسی سبزیوں کا ڈھیر لگا پڑا تھا۔ عبداللہ نے بتایا کہ دو روز سے کاروبار مندا ہے اور اس کی ریڑھی کی سبزیاں

پڑی پڑی گل سڑ رہی ہیں۔ میں نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر ریڑھی کی ساری سبزیاں تلوا کر کار میں رکھوا لیں۔ پیسے ادا کرنے کے بعد وہاں سے روانہ ہونے لگا تو سڑک کے دوسرے کنارے زمین پر بیٹھے ہوئے ایک موچی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں اس کے پاس گیا تو وہ دوسروں کے ٹوٹے ہوئے جوتے گانٹھنے میں منہمک تھا۔ میری جانب نظر اٹھائے بغر وہ بڑبڑایا' "خوب بچا بے سالے۔ ٹھہری تھی کہ یونہی گزر جاتے تو سالے کو کوڑھی کر کے اسی ریڑھی میں بٹھا دیا جائے۔"

اس کے بعد میں متعدد بار اس پر اسرار موچی سے باتیں کرنے اس کے اڈے پر گیا لیکن اس نے پھر کبھی کوئی لفٹ نہ دی۔

جھنگ کا ایک جانا پہچانا ادیب اور صحافی بلال زبیری مجھے ملنے آیا۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ لاہور میں سعادت حسن منٹو اتنا شدید بیمار ہے کہ جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ منٹو سے میری کافی پرانی صاحب سلامت تھی۔ چند روز بعد میں لاہور میں اس سے ملنے گیا۔ بیگم منٹو نے بتایا کہ جگر میں خرابی ہے۔ دوائیں کام نہیں کرتیں کیونکہ وہ پینے پلانے سے پرہیز نہیں کرتے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی کہا کہ اگر وہ کچھ عرصہ شراب کو منہ نہ لگائیں تو شاید ہمارا علاج بھی کارگر ثابت ہونے لگے۔ میں نے بیگم منٹو سے اجازت لی اور بہلا پھسلا کر منٹو کو اپنے ساتھ جھنگ لے آیا۔ دو تین دن وہ بڑا خوش رہا۔ میرے ساتھ شہر سے نکل کر دیہاتی ماحول میں گھومتا پھرتا۔ کہیں کہیں چلتے ہوئے رہٹ پر نہا بھی لیتا۔ لیکن چوتھے روز اس کا موڈ بگڑ گیا۔ جھنجلا کر کہنے لگا' "یہ گھر ہے یا حوالات؟ نہ کوئی دوست یار' نہ کوئی میل ملاقاتی' نہ کوئی رونق' نہ کوئی محفل' توبہ توبہ۔ کیا بیہودہ جگہ ہے۔"

میں نے وعدہ کیا کہ کل ہم ایسے علاقے کا دورہ کرنے جائیں گے' جسے دیکھ کر اس کی طبعیت خوش ہو جائے گی۔ لیکن وہ بدستور آزردگی سے خاموش بیٹھا رہا۔ شام کو جب میں دفتر سے واپس آیا۔ تو اس کا کمرہ خالی پڑا تھا۔ صدیق اردلی نے بتایا کہ "مہمان

صاحب کو فوراً لاہور جانا پڑ گیا تھا۔ میری فرمائش پر کمپنی کی بس انہیں لینے کوٹھی پر ہی آ گئی تھی۔ ڈرائیور نے فرنٹ سیٹ ان کے لیے خالی رکھی تھی۔ راستے میں ان کا خیال بھی ضرور رکھے گا۔ میں نے تاکید کر دی تھی۔"

جھنگ میں منٹو کا دل کیسے لگتا؟ وہ تو بقول فیض اس عقیدے کا آدمی تھی

آئے کچھ ابر کچھ شراب
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

جھنگ کا ایک پڑھا لکھا نوجوان ایثار راعی بھی کبھی کبھی مجھے ملنے کے لیے آ جایا کرتا تھا۔ وہ ان دنوں فاقہ مستی کا شکار تھا اور آئے دن روزگار کی تلاش میں شہر شہر گھوما کرتا تھا۔ اس کا ایک دوست لائلپور کے محکمہ مواصلات میں سینئر کلرک تھا۔ اس محکمہ میں ایک کلرک کی آسامی نکلی تو اس نے ایثار راعی کو بلا کر اپنے پاس رکھا اور اس سے کلرک کی خالی جگہ کے لیے درخواست دلوا دی۔ انٹرویو تو ہوا' لیکن کلرکی نہ مل سکی۔

کچھ دنوں بعد اسی دفتر میں ایک چپراسی کی جگہ خالی ہوئی۔ ایثار نے سوچا کہ اگر میں چپراسی کے طور پر بھرتی ہو جاؤں تو شاید ترقی کرتے کرتے کسی وقت کلرک کا عہدہ جلیلہ بھی حاصل کر سکوں۔ چنانچہ اس نے چپڑاسی کی اسامی کے لیے بھی عرضی داغ دی۔ محکمہ کے سربراہ نے اسے سب سے آخیر میں بلایا۔ اور انٹرویو کرنے کی بجائے اپنے سامنے کرسی پر بٹھا کر حوصلہ مندی پر تقریر فرمائی۔ تقریر ختم کر کے انہوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ ایک پڑھے لکھے نوجوان کو وہ اپنے دفتر میں چپراسی نہیں لگا سکتے۔

یہ حالات مجھے ایثار راعی کے ایک خط سے معلوم ہوئے۔ میں نے فوراً تار دے کر اسے جھنگ واپس بلا لیا۔ ملازمت تو میرے پاس بھی کوئی نہ تھی لیکن یکایک شہری مسلم لیگ کے سالار شیر زمان خان کا نام میرے پردہ خیال پر ابھرا۔ تقسیم ملک سے پہلے وہ آنکھوں

میں ٹھنڈک پہنچانے والا سرمہ بیچا کرتا تھا اور پاکستان میں آ کر جھنگ شہر کی مسلم لیگ کا سالار بن بیٹھا تھا۔ اسی دھونس میں دیگر کئی مراعات کے علاوہ اسے چینی کا ایک ڈپو بھی ملا ہوا تھا جس میں وہ جی بھر کر چینی کی بلیک مارکیٹ کرتا تھا۔ ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر کے دفتر میں اس کے خلاف شکایات کی ایک بھاری بھرکم فائل بنی پڑی تھی' لیکن اس کے سیاسی دبدبے کی وجہ سے کوئی اس کے خلاف کسی قسم کی کارروائی شروع کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ میں نے فوڈ کنٹرولر سے یہ فائل طلب کر کے انکوائری کے لیے سٹی مجسٹریٹ کے حوالے کر دی۔ بلیک مارکیٹ اور دوسری بدعنوانیوں کا ثبوت مہیا ہونے پر میں نے شیر زمان خان کا ڈپو منسوخ کر کے اسے ایثار راعی کے حوالے کر دیا۔

دوسری شام ایثار ڈپو میں گندم اور چینی کا حساب کتاب کر کے واپس لوٹ رہا تھا کہ پولیس کے دو سپاہی پکڑ کر اسے تھانے لے گئے۔ اسسٹنٹ انسپکٹر آنکھیں سرخ کئے بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ پہلے تو اس نے چھوٹتے ہی ایثار کو دو تین گلاس گالیاں دیں اور پھر ایک نوجوان کو سامنے کھڑا کر کے کہا کہ تم نے اس سے جو نقد رقم اور گھڑی چھینی ہے وہ فوراً واپس کر دو۔

یہ ڈرامہ شہری مسلم لیگ کے سالار شیر زمان خاں کے ایما پر ہو رہا تھا' جو ساتھ والے کمرے میں چند سپاہیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

پولیس اسٹیشن سے ہی فون کر کے ایثار نے اپنی یہ نئی افتاد مجھے سنا دی۔ میں نے فوراً ایس۔ پی۔ صاحب کو ٹیلیفون پر اس دھاندلی سے مطلع کیا۔ انہوں نے نہ معلوم کیا کارروائی کی کہ تھانیدار نے ایثار کو کرسی پر بٹھا کر معافی مانگی اور شیر خاں کو اپنے سامنے بلا کر اسے مغلظات سے نوازنے میں مصروف ہو گیا۔

ڈپو کا سہارا پا کر ایثار راعی نے ادب' ثقافت اور صحافت کی جانب رخ کیا۔ رفتہ رفتہ اس نے جسٹس سردار عبدالجبار خاں اور ریاض انور کے ساتھ مل کر ملتان میں بزم ثقافت کی بنیاد رکھی اور ہر سال جشن فرید منانے کی نہایت شاندار تقریبات منعقد کرنے کا اہتمام

کیا۔

آجکل وہ ملتان میں روزنامہ "مشرق" کے سب آفس کا انچارج ہے۔ اس کا ایک بھائی صدیق راعی بھی صحافت کی دنیا سے وابستہ ہے اور اپنی عبادت گزاری اور شب بیداری کی برکت سے قناعت کی دولت سے مالا مال ہے۔

ایک دور افتادہ گاؤں کا نمبردار ملاقات کے روز آیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ عرصہ سے ایک ملنگ نے گاؤں میں ڈیرہ ڈالا ہوا ہے۔ دوپہر کے وقت موسم گرما کی شدید تمازت میں بھی وہ آگ جلا کر باہر دھوپ میں بیٹھتا ہے اور دن بھر چلم پیتا رہتا ہے۔ دور دور سے لوگ اپنی مرادیں لے کر اس کے پاس آتے ہیں۔ کسی سے وہ گھی کا کنستر وصول کرتا ہے۔ کسی سے گندم کی بوری یا چاول یا چینی کے انبار۔ خاص طور پر عورتوں سے سونے چاندی کی مرکیاں' انگوٹھیاں اور چوڑیاں تک اتروا لیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی فرمائشیں پوری نہ کر سکے تو وہ جلال میں آ کر سائل کی جانب کئی بار ہاتھ جھٹکتا ہے۔ اس عمل سے سائل کے بدن کا کوئی حصہ سن ہو کر مفلوج سا ہو جاتا ہے۔ لوگ اسے چارپائی پر لٹا کر گھر لے جاتے ہیں جہاں پر ڈیڑھ دو ماہ وہ یہ اذیت کاٹ کر ٹھیک ٹھاک ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے درجنوں کیس اس علاقے میں رونما ہو چکے ہیں۔ نمبردار نے کہا' "ساری آبادی اس کے خوف سے سہمی ہوئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں کیا نہ کریں۔"

یہ عجیب واقعہ سن کر مجھے چرایا کہ میں خود وہاں جا کر اس بھید کا کھوج لگاؤں۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے سول ہسپتال سے ایک اسٹریچر منگوا کر گاڑی میں رکھوا لیا اور ایک اردلی اور نمبردار کو اپنے ساتھ بٹھا کر گاؤں کی جانب روانہ ہو گیا۔ پچاس پچپن میل کا سفر تھا۔ راستہ بھر میں لگاتار آیتہ الکرسی اور چاروں قل صمیم قلب سے پڑھتا رہا۔ میں نے گاڑی گاؤں کے قریب رکوائی۔ نمبردار اور اردلی سے کہا کہ وہ گاڑی کے اندر ہی بیٹھے رہیں۔ میں اکیلا ملنگ کے ڈیرے پر جاؤں گا۔ اگر میں نصف گھنٹہ تک

واپس نہ آیا تو وہ اسٹریچر لے کر وہاں آ جائیں۔

ڈیرے پر ایک کالا بھجنگ' فربہ بدن' کریہہ المنظر شخص دھوپ میں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔

اس کے چہرے پر داڑھی کے بال اس طرح لٹک رہے تھے۔ جیسے کھجور کے درخت کی شاخوں سے تیز تیز لانبے لانبے کانٹوں کے گچھے لٹک رہے ہوتے ہیں۔ سامنے آگ کے الاؤ کے قریب چند چٹائیاں بچھی ہوئی تھی۔ چٹائیوں پر کچھ مرد اور چند عورتیں ادب سے دوزانو بیٹھی تھیں۔ میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ باری باری ہر شخص ملنگ کو مخاطب کرتا تھا' "حضرت جی' میری عرض سنو۔" لیکن سرخ سرخ آنکھوں والا ملنگ کسی کی عرض سننے کے موڈ میں نہ تھا۔ بلکہ کش پر کش لگا کر گم سم بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے ملنگ کو للکارا۔ "ارے او بدمعاش غنڈے۔ بولتا کیوں نہیں۔ کیا تو گونگا ہے؟"

یہ سنتے ہی چٹانوں پر بیٹھے لوگ اٹھ کر بھاگ گئے اور دور کھڑے ہو کر مجھے نصیحت کرنے لگے' "شہری بابو' تجھے معلوم نہیں۔ یہ جلالی بابا ہے۔ تم کو بھسم کر ڈالے گا۔

میری للکار سن کر ملنگ بھی غصے میں آ گیا۔ اس نے چلم ہاتھ سے رکھ دی اور زور سے چنگھاڑ کر سروقد کھڑا ہو گیا۔ میرے وجود میں بھی کوئی سپرنگ کھلا اور میں بھی اس کے ساتھ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ ملنگ نے پانچ سات بار زور زور سے جھٹک کر میری جانب اپنا ہاتھ مارا۔ ایک دو لمحوں کے لیے میرے بازوؤں میں ہلکی سی سنسناہٹ تو ضرور ہوئی۔ لیکن فوراً ہی رفع بھی ہو گئی۔ اپنے عمل کی اس ناکامی پر ملنگ گھٹنوں میں سر دے کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اسی دوران نمبردار اور میرا اردلی بھی کار لے کر وہاں آ گئے۔ اب گاؤں کی آبادی کی بڑا حصہ یہ تماشہ دیکھنے وہاں جمع ہو گیا۔ میں نے لوگوں سے کہا۔ "یہ کوئی شیطانی عامل ہے۔ اللہ کے کلام کی برکت سے اس کا عمل ٹوٹ گیا ہے۔ اب تم بے خوف ہو کر آگے آؤ اور لاحول ولا قوہ الا باللہ پڑھ کر اس کے ایک ایک جوتا لگاؤ۔"

یہ سن کر گاؤں کا ایک زندہ دل نوجوان زور زور سے لاحول پڑھتا ہوا آیا اور ملنگ کو زمین پر الٹا الٹا کر اس کی پیٹھ پر گھوڑے کی طرح سوار ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد باری باری مرد' عورتیں اور بچے آتے اور لاحول پڑھ کر ملنگ کو ایک یا دو جوتے رسید کر جاتے۔

میرے کہنے پر نمبردار نے ملنگ کا حجرا بھی کھولا' جو گھی کے کنستروں' شہد کی بوتلوں' گندم اور چاول کی بوریوں' نئے کپڑوں کے بنڈلوں اور سونے چاندی کے زیورات کے ڈبوں سے اثاث بھرا ہوا تھا۔ میں نے مقامی معززین کی ایک کمیٹی بنا کر یہ سارا مال غنیمت اس کے سپرد کر دیا کہ جن جن لوگوں کی ملکیت ثابت ہو وہ مال انہیں واپس کر دیا جائے۔ اگر کچھ اشیاء بچ جائیں تو انہیں غریب غربا میں بانٹ دیں۔

اس کے بعد میں ملنگ کو اپنی کار میں بٹھا کر جھنگ لے آیا۔ میں نے اسے بہت کریدنے کی کوشش کی کہ اس نے یہ شیطانی اور سفلی عمل کب اور کیسے سیکھا ہے؟ لیکن سارا رستہ وہ چپ سادھے بیٹھا رہا۔

جھنگ پہنچ کر میں وہاں کے ایس۔ پی۔ آغا شجاعت علی کے ہاں گیا اور ساری روئداد سنا کر پوچھا' کہ اب کیا کرنا چاہیے؟

آغا صاحب بولے۔ "مقدمہ بھی دائر ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارا تجربہ ہے کہ ایسے مقدمات میں بیشتر لوگ ملنگوں کے خلاف گواہی دینے گھبراتے ہیں۔ اس لیے ایسے مقدمے اکثر کامیاب نہیں ہوتے۔ آپ اسے ہمارے حوالے کر دیں۔ ہمارا "چھتراؤ" کرنے والا بڑا اچھا ماہر ہے وہ دو دن میں "چھتراؤ" کر کے اس کے سر سے شیطان کا بھوت اتار دے گا۔ اس کے بعد ہم اسے ضلع جھنگ سے نکال باہر کریں گے۔ جہاں اس کے سینگ سمائیں وہاں چلا جائے۔

بعد میں یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس سفلی عامل کے سینگ کہاں سمائے۔

جھنگ میں میری ملاقات ایک ایسے بزرگ سے بھی ہوئی جن کا شمار اپنے زمانے کے اولیا

صفت بزرگوں میں ہوتا تھا۔ ان کا اسم گرامی مولانا محمد ذاکر تھا' جنھوں نے محمدی شریف میں ایک دارالعلوم' سکول اور کالج بھی قائم کر رکھا تھا۔ نرم خو' آہستہ خرام' خاموش طبیعت کے مالک اس عالم باعمل اور زاہد شب زندہ دار کی ملاقات میری زندگی کا ایک ناقابل فراموش اثاثہ ہے۔ میں نے ان کی نظر نہ کبھی اوپر اٹھتے دیکھی اور نہ ان کی آواز کبھی بلند ہوتے سنی۔ اپنے دور افتادہ علاقے میں انھوں نے دینی اور دنیاوی علم کی ایسی شمع جلائی جو روز بروز روشن تر ہوتی جا رہی ہے۔ ضلع جھنگ میں پہلی ملاقات کے بعد تادم زیست ان کی نظر کرم ہمیشہ اور ہر جگہ اس بندہ گنہگار پر رہی۔ جب میں لاہور پوسٹ ہوا تو وہ وہاں بھی ایک دو بار تشریف لائے۔ بھٹو دور میں بھی وہ قومی اسمبلی کے ممبر تھے۔ اس وقت ضعیفی اور نقاہت کا یہ عالم تھا کہ اسمبلی کے سیشن کے لیے بیماری کے باوجود طویل سفر اختیار کرتے تھے اور اسمبلی ہال میں پہیوں والی کرسی پر بٹھا کر لے جائے جاتے تھے۔ اس کے باوجود اسمبلی میں یا اس کے باہر نماز باجماعت کبھی قضا نہ ہوتی تھی۔ استقامت کی یہ کرامت میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔

اب ان کے فرزند مولانا رحمت اللہ صاحب اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر نہایت خوش اسلوبی سے چل رہے ہیں۔ جامعہ محمدی شریف کے ناظم اعلیٰ ہونے کے علاوہ وہ اپنے علاقے سے موجودہ اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے منتخب ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی صحت اور صلاحیت میں روز افزوں ترقی دے تاکہ وہ اپنے والد گرامی کے مشن کو بعنوان شائستہ پایہ تکمیل تک پہنچا دیں۔

جھنگ نے مجھے شاعر چناب رنگ شیر افضل جعفری کی دوستی کا تحفہ بھی عطا کیا۔ اردو زبان میں ایک خاص انداز کی بانکی شاعری ان کا طرہ امتیاز ہے۔ یہ ان کی مروت اور خوش اخلاقی ہے کہ انھوں نے آج تک اپنے اس مداح کو فراموش نہیں کیا۔ درویش صفت اور عبادت گزار آدمی ہیں۔ تاہم اس بندہ عاجز کو نوازتے رہتے ہیں۔ کبھی شرف

ملاقات سے، کبھی خطوط دلنواز سے۔ اللہ تعالیٰ ان کو شاداں اور ان کے قلم کو دیر تک رواں رکھے۔

دو بڑے زمینداروں کا تذکرہ کئے بغیر جھنگ میں میرے ملاقاتیوں کا سلسلہ تکمیل رہ جائے گا۔

ایک روز ایک بڑے زمیندار صاحب ملاقات کے لیے آئے۔ خود تو بڑی حد تک ناخواندہ تھے لیکن تعلیم کے فضائل اور فوائد پر ایک طویل تقریر کرنے کے بعد بولے، "جناب آپ اس پس ماندہ ضلع کے لیے نیکی کا ایک اور کام بھی کرتے جائیں۔ فلاں گاؤں میں اگر ایک پرائمری سکول کھول دیا جائے تو اس علاقے پر یہ ایک احسان عظیم ہو گا۔ اگر آپ قبول فرمائیں تو بندہ سکول کے لیے زمین مفت، کمروں کی تعمیر کے لیے بیس ہزار روپیہ نقد اور ایک استاد کی ایک برس کی تنخواہ اپنی جیب سے ادا کرنے کے لیے حاضر ہے۔"

میں نے ان کی روشن خیالی اور فیاضی کی تعریف کر کے کہا، "نیکی اور پوچھ پوچھ؟ آپ جب فرمائیں گے، سکول کھولنے کا بندوبست ہو جائے گا۔ بلکہ میں تو یہ کوشش بھی کروں گا کہ اس سکول کا افتتاح کرنے کے لیے عزت ماب وزیر تعلیم کو بذات خود یہاں مدعو کیا جائے۔"

زمیندار صاحب خوش خوش میری جان و مال کو دعائیں دیتے ہوئے تشریف لے گئے۔

کوئی ایک ہفتہ بعد اسی علاقے کے ایک اور بڑے زمیندار ملنے آئے۔ چھوٹتے ہی انہوں نے روہا ہو کر گلہ شکوہ شروع کر دیا۔ "جناب میں نے کیا قصور کیا ہے کہ مجھے اس قدر کڑی سزا دی جا رہی ہے؟ بندہ بالکل بے گناہ ہے۔"

میں نے حیران ہو کر اس شکوے کی وضاحت طلب کی کہ ان کے ساتھ کیا ظلم ہو رہا ہے اور کون یہ ظلم کر رہا ہے؟ انہوں نے گلوگیر آواز میں یہ تفصیل سنائی، پچھلے ہفتے سکول کے بارے میں جو شخص ملنے آیا تھا، وہ یہ سکول اپنے گاؤں میں نہیں بلکہ

میرے گاؤں میں کھلوا رہا ہے۔ ہمارے درمیان پشتوں سے خاندانی دشمنی چلی آ رہی ہے۔ پہلے ہم ایک دوسرے کے مویشی چرا لاتے تھے۔ کبھی ایک دوسرے کے مزارعوں کو قتل کروا دیتے تھے۔ کبھی ایک دوسرے کی فصلیں اجاڑ دیتے تھے۔ لیکن اب وہ کمینہ میرے گاؤں کی نسلیں برباد کرنے پر اتر آیا ہے۔ اسی لیے آپ سے سکول کھولنے کا وعدہ لے کر گیا ہے۔"

فروغ تعلیم کے فضائل پر یہ نرالی منطق سن کر میں سکتے میں آ گیا۔ چند منٹ سوچنے کے بعد میں نے گزارش کی۔ "آپ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے کیوں نہیں دیتے؟ جو پیشکش انہوں نے کی ہے' اگر وہی بار آپ بھی اٹھا لیں۔ تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان کے گاؤں میں بھی بہ یک وقت ویسا ہی سکول قائم کر دیا جائے گا۔"

یہ سن کر ان کی کسی قدر تشفی تو ہوئی' لیکن اس کے بعد دونوں میں سے کوئی بھی اپنی اپنی فیاضی کی پیشکش لے کر دوبارہ میرے پاس نہ آیا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے یہ واقعہ جھنگ کے بیرسٹر یوسف صاحب کو سنایا' تو وہ مسکرا کر بولے۔ "حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تعلیم جیسی خطرناک وبا کو اپنے اپنے گاؤں سے دور رکھنے کے لیے دونوں نے اسے اپنا مشترکہ فرض سمجھ کر مک مکا کر لیا ہو گا۔ بڑی زمینداروں اور جاگیروں میں ابھی تک تعلیم ہی کو سب سے بڑا اور تباہ کن دشمن سمجھا جاتا ہے۔"

ooo

• تبادلہ

جھنگ سے تعینات ہوئے مشکل سے ایک برس گزرا تھا کہ اچانک میں نے اڑتی اڑتی سی خبر سنی کہ مجھے عنقریب وہاں سے تبدیل کر دیا جائے گا۔ یہ خبر میرے لیے نئی نہ تھی۔ اس سے پیشتر بھی اس قسم کی افواہیں کئی بار اڑ چکی تھیں۔ جب سے میں نے ہفتے میں دو دن عام ملاقاتوں کا سسٹم رائج کر کے عوام الناس کے چھوٹے بڑے مسائل براہ راست نپٹانے شروع کئے تھے' اس وقت سے ضلع کے بڑے بڑے زمینداروں' رئیسوں اور پیشہ ور سیاست دانوں میں رنجش اور بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ حضرات عام لوگوں کے مسائل اپنی وساطت سے حل کروانا اپنا حق سمجھتے تھے۔ اس طرح لوگوں پر بھی ان کی گرفت مضبوط رہتی تھی اور افسروں کے ساتھ بھی ان کا رابطہ قائم رہتا تھا۔ میرے طریقہ کار نے جب ان کی اس اجارہ داری کو ختم کر دیا تو اس میں ان سب کو اپنی بڑی حق تلفی محسوس ہوئی۔ چنانچہ وہ لاہور جا کر صوبائی وزیروں کے پاس اکثر اپنا یہ رونا روتے رہتے تھے۔

صوبائی وزیر صاحبان بھی مجھ سے کسی قدر آزردہ خاطر ہی رہتے تھے۔ ایک وزیر صاحب پیر کے روز دورے پر تشریف لائے' جو میری عام ملاقات کا دن تھا۔ اس روز ستر' اسی کے قریب ملاقاتی جمع تھے۔ ان میں سے کچھ پچاس پچاس' ساٹھ ساٹھ میل کا سفر طے کر کے آئے تھے۔ میں نے ریسٹ ہاؤس میں جا کر وزیر صاحب کا استقبال تو ضرور کیا' لیکن پھر ایک اور افسر کو ان کی خدمت میں چھوڑ کر خود واپس چلا آیا۔ کیونکہ اتنے کثیر ملاقاتیوں کو سارا دن انتظار کی زحمت میں مبتلا رکھنا مناسب نہ تھا۔ ایک اور وزیر صاحب جمعرات کو آئے۔ اس روز بھی یہی واقعہ پیش آیا' کیونکہ وہ بھی ملاقات کا دن تھا۔ میں نے اپنے عملے کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وزیروں کے دورے پر ریسٹ ہاؤس

میں شہر کے لوگوں سے مانگ مانگ کر قالین اور صوفے نہ ڈلوائے جائیں۔ بلکہ حکومت نے ریسٹ ہاؤس میں جس قدر فرنیچر رکھا ہوا ہے' وہ سب کے گزارہ کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ ایک وزیر صاحب جون کے مہینے کی شدید گرمی میں تشریف لائے۔ ریسٹ ہاؤس کے ٹنڈ منڈ کمرے کو دیکھ کر وہ بگڑ گئے اور الٹے پاؤں واپس لوٹ گئے۔ میں نے انہیں اپنے گھر ٹھہرانے کی پیشکش بھی کی لیکن دماغ کا جو پارہ ایک دفعہ چڑھ چکا تھا' وہ نیچے نہ اترا۔ اس کے بعد اور کسی صوبائی وزیر نے جھنگ کا دورہ کرنے کی زحمت نہ اٹھائی۔

میرے قیام جھنگ کے دوران پہلی بار مادر ملت محترمہ مس فاطمہ جناح' اور دوسری بار وزیراعظم خواجہ ناظم الدین ضرور مختصر دورے پر جھنگ تشریف لائے تھے۔ دونوں کا قیام جھنگ میں چند گھنٹے تھا لیکن دونوں موقعوں پر ہم نے ریسٹ ہاؤس کو دلہن کی طرح سجایا تھا۔ لوگوں نے بڑی خوشی سے سڑکوں پر رنگ برنگی جھنڈیاں لگائیں اور استقبالیہ دروازے بنائے تھے۔ ریسٹ ہاؤس کے اندر میں نے اپنے گھر کا ذاتی ساز و سامان سجا دیا تھا۔

اسی زمانے میں موچیوالہ کا المناک واقعہ پیش آیا۔ پولیس کے کچھ سپاہی اس گاؤں میں کسی تفتیش کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ گاؤں والوں کے ساتھ ان کا کچھ جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے نے طول کھینچ کر فساد کا رنگ اختیار کر لیا' جس میں ایک سپاہی جان سے مارا گیا۔ اب کیا تھا۔ مقامی پولیس انتقام لینے کے لیے گاؤں پر چڑھ دوڑی اور راتوں رات اسے تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اگلے روز میں خود جائے وقوعہ پر پہنچا' تو سارا گاؤں سنسان پڑا تھا۔ پولیس کی گارد اور چند نحیف و نزار بوڑھی عورتوں کے علاوہ گاؤں میں اور کوئی فرد و بشتر موجود نہ تھا۔ کچھ لوگ گرفتار ہو چکے تھے اور باقی سب مرد' عورتیں اور بچے خوف سے اپنے گھر بار کھلے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ سارے علاقے میں پولیس کے ظلم و تشدد کی داستانیں طرح طرح کی رنگ آمیزی کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن پولیس والوں کی اپنی رام کہانی یہ تھی کہ ظلم تو خود ان پر ہوا ہے جن

کا ایک کانسٹیبل جان سے مارا گیا۔ ان کا موقف تھا کہ ضابطہ کے مطابق قانونی چارہ جوئی کے علاوہ انہوں نے کسی قسم کی زیادتی نہیں کی اور اب گاؤں والے چند مقامی سیاست دانوں کی شہ پر پولیس کو بدنام کرنے کے لیے مختلف قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔

صوبائی اخباروں میں اس واقعہ کا خاصہ چرچا ہوا۔ کئی جانب سے اس کی مکمل انکوائری کروانے کا مطالبہ بھی اٹھا۔ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ اس کی انکوائری ہونی چاہیے تاکہ صحیح صورتحال واضح ہو جائے۔ ایک روز میں لاہور میں چیف سیکرٹری کے پاس بیٹھا اسی سلسلے میں کچھ بات چیت کر رہا تھا کہ یکایک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف انسپکٹر جنرل آف پولیس خان قربان علی خاں تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں بھی چیف سیکرٹری کے پاس موجود ہوں تو انہوں نے ہم دونوں کو اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔

خان قربان علی خاں عام طور کے انسپکٹر جنرل آف پولیس نہیں تھے۔ صوبائی حکومت میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ وزیر اعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ انہیں۔ برسر عام "انکل" کہا کرتے تھے۔ صوبہ کے وزیر، سیکرٹری اور دوسرے سول افسر ان سے بے حد خم کھاتے تھے۔ قربان علی خاں بھی ان سب پر رعب گانٹھنے، دھونس جمانے اور پولیس کے مقابلے میں انہیں نیچا دکھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ اپنی بات منوانے کے لیے وہ دلیل سے زیادہ ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے تھے اور دوسروں کو زیر کرنے کے لیے وہ تضحیک و توہین کے ہتھیار بڑی مہارت سے استعمال کرتے تھے۔ جو بات ایک بار ان کے منہ سے نکل جائے وہ اس موضوع پر حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ رشوت نہیں لیتے تھے، نماز پڑھتے تھے۔ لیکن ان فضائل نے ان کی خو کی سفاکی اور مزاج کی بے رحم درشتی پر اعتدال اور عجز کا ہلکا سا رنگ بھی نہ چڑھایا تھا۔ ان کے دل و دماغ میں تکبر کے بلند و بالا پہاڑ ایستادہ تھے اور دوسروں کی انا اور عزت کو پاؤں تلے روندنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اگر کسی VIP کی آمد پر اعلیٰ حکام ائیرپورٹ وغیرہ پر

جمع ہوتے تھے تو قربان علی خاں ان کے ساتھ استقبالیہ لائن میں کھڑے ہونا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو باقی سب سے مختلف' اعلیٰ اور ارفع چیز گردانتے تھے۔ اور بید کی باریک سی چھڑی ہاتھ میں گھماتے کسی نہ کسی بہانے گورنر یا چیف منسٹر کے قرب و جوار میں منڈلاتے رہتے تھے۔

جب خان قربان علی خاں نے چیف سیکرٹری کو اور مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا تو ہم نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اس زمانے کا دستور یہی تھا کہ انسپکٹر جنرل آف پولیس سول افسروں کے کمروں میں شاذو نادر ہی تشریف لے جاتے تھے۔ سب لوگ اکثر ان کے کمرے ہی میں حاضری دیا کرتے تھے۔ مجھے مخاطب کر کے قربان علی خاں نے موچیوالہ میں پولیس کی اعلیٰ کارکردگی پر بڑا سیر حاصل تبصرہ کیا اور انکوائری کے سب مطالبوں کو واہیات خرافات قرار دے کر مسترد کر دیا۔ چیف سیکرٹری صاحب جو چند لمحے پہلے اپنے کمرے میں میرے ساتھ انکوائری کے حق میں گفتگو فرما رہے تھے اب ہوا کا رخ دیکھ کر آناً فاناً بدل گئے اور انسپکٹر جنرل آف پولیس کے ہمنوا ہو گئے۔ جھنگ میں پولیس کی نیک نامی کی خاطر میں نے انکوائری کی اہمیت پر کچھ کہنے کی کوشش کی تو خان قربان علی خاں نے ناک سکیڑ کر کچھ دیر سوں سوں کی آواز برآمد کی اور پھر کچھ تبصرہ کئے بغیر میٹنگ برخاست کر دی۔ میرا خیال ہے' ساتھ ہی انہوں نے میرا نام اپنے رجسٹر میں جھنگ کے ناپسندیدہ ڈپٹی کمشنر کے خانے میں درج کر لیا۔

لیکن جس واقعہ نے جھنگ میں میری ڈپٹی کمشنری کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی' اس کا تعلق ایک فوجداری مقدمہ سے تھا جو میری عدالت میں زیر سماعت تھا۔ دونوں فریق ضلع کے بااثر خاندان تھے اور سالہا سال سے باہمی رقابتوں' عداوتوں اور مقدمہ بازیوں میں الجھے ہوئے تھے۔ ایک روز کے مقدمے کی پیشی شروع ہوئی تو ایک فریق نے بڑے طمطراق سے آگے بڑھ کر ایک بند لفافہ میری میز پر دے مارا۔ لفافے پر ایک صوبائی وزیر کی مہر تھی اور اس کے اندر غالباً سفارشی خط تھا۔ یہ ماجرا دیکھ کر دوسرا فریق بھی میدان میں اتر آیا اور اس نے بھی ایک بند لفافہ میری میز پر پٹخ دیا۔ اس پر ایک دوسرے

صوبائی وزیر کی مہر تھی اور اس کے اندر بھی غالباً سفارشی خط تھا۔ وزیر صاحبان کی سفارشیں وصول کرنا اور ان پر عملدرآمد کرنا ہمارا روزمرہ کا معمول تھا۔ لیکن ایک زیر سماعت مقدمے میں تحریری سفارشیں کرنا بڑی بے اصولی اور کڈھب بات تھی۔ میں نے فریقین کے وکیلوں کو دونوں بند لفافے دکھائے اور کہا۔ "آپ مجھے مشورہ دیں کہ ان خطوط کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں خط کھول کر عدالت میں پڑھ کر سنائے جائیں اور پھر انہیں مقدمے کی فائل میں لگا دیا جائے۔ بصورت دیگر انہیں اس طرح بند کے بند آپ کے موکلین کو واپس لوٹا دیے جائیں۔

دونوں وکیل اپنے موکلوں کی اس حرکت پر نالاں تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے موکل پر خوب لعن طعن کی اور بند خطوط مجھ سے واپس لے لیے۔

میرا خیال تھا کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ لیکن جب یہ خبر وزیر صاحبان تک پہنچی تو وہ بڑے چراغ پا ہوئے۔ چند روز بعد میں کسی کام سے لاہور گیا تھا۔ اسمبلی کی غلام گردش میں میری ان سے اتفاقاً مڈبھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے اپنے دو تین اور ہم منصبوں کے ساتھ مل کر مجھے بڑے بڑے آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کا بار بار یہی اصرار تھا کہ بھری عدالت میں ان کے خطوط کا تماشا بنا کر میں نے وزیروں کی جملہ برادری کو تضحیک واستہزا کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی کہ ایسے خطوط لکھ کر انہوں نے بھی کوئی ناروا حرکت کی ہے۔

میں نے یہ واقعہ ملتان جا کر اپنے کمشنر مسٹر آئی۔ یو۔ خاں کو سنایا تو انہوں نے فرمایا۔

"بھائی' دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر لینا کیا ضروری ہے۔ اب یہ لوگ خواہ مخواہ تمہیں دق کرتے رہیں گے۔ میری مانو تو تم کسی طرح اس صوبہ سے رفو چکر ہو جاؤ۔"

اتفاق سے ان دنوں ہالینڈ کے دارالخلافہ ہیگ میں "انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سٹڈیز" کا ادارہ نیا نیا قائم ہوا تھا۔ اس میں پبلک ایڈمنسٹریشن پر ایک چھ ماہ کا کورس شامل تھا۔ مرکزی حکومت نے جب میرا نام اس کورس کے لیے تجویز کیا تو پنجاب گورنمنٹ نے بلا حیل و حجت بڑی خوش دلی سے اس پر آمنّا و صدقنا کہہ دیا۔

• ہالینڈ میں حج کی نیت

ہالینڈ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی چند روز تک میں حواس باختہ رہا۔ ڈچ قوم کے سر پر صفائی کا جو بھوت سوار ہے' اسے دیکھ دیکھ کر مجھے وحشت ہونے لگی۔ سڑکوں اور گلیوں میں دو رویہ تاحد نظر ایک ہی طرح کے دو منزلہ مکان بنے ہوئے ہیں۔ اوپر بیڈروم نیچے ڈرائینگ ڈائننگ روم' سب کی ایک طرح کی شیشے کی کھڑکیاں اور ایک ہی طرز کے لکڑی کے دروازے ہیں۔ بیڈروم کی کھڑکیوں میں ایک ہی طرح کے پھول گلدانوں میں سجے ہوئے ہیں۔ ہر ڈرائینگ روم کی دیوار پر ایک یا دو تصاویر آویزاں ہیں۔ صوفوں پر ہر گھر میں ایک ہی ڈیل ڈول کے میاں بیوی ایک ہی طرح کی مصروفیات میں منہمک ہیں بیوی اونی جرابیں یا مفلر یا سویٹر بن رہی ہیں۔ میاں کتاب پڑھ رہا ہے یا ٹی وی پر فٹ بال کا میچ دیکھ رہا ہے۔ بچوں کی ایک کثیر تعداد ڈائننگ ٹیبل پر جھکی سکول کا ہوم ورک کر رہی ہے۔ رات کے دس بجے سے گھروں کی بجلیاں بجھنا شروع ہو جائیں گی اور گیارہ بجے تک بالکل سناٹا چھا جائے گا۔

صبح ہوتے ہی بچے سکول سدھاریں گے۔ مرد کام کاج پر نکل جائیں گے اور عورتیں رنگ برنگ ایپرن باندھ کر گھر بار کی صفائی میں مشغول ہو جائیں گی۔ قالینوں' پردوں' صوفوں' کرسیوں' میزوں' تصویروں' پھولدانوں' چھتوں اور دیواروں کی جھاڑ پونچھ کے بعد کھڑکیوں کے شیشے دھوئے جائیں گے۔ دروازوں کی اندر اور باہر سے رگڑائی ہو گی۔ دروازے پر لگے ہوئے کیلوں' کنڈوں اور مٹھوں کو پالش کر کے چمکایا جائے گا اور آخر میں گھر کے باہر فٹ پاتھ کا جتنا حصہ مکان کے سامنے سے گزرتا ہے اسے بھی صابن سے دھو کر خوب صاف کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد خاتون خانہ لباس تبدیل کر کے گھر کو تالا لگائے گی اور خود وقت گزارنے کے لیے شاپنگ کو چلی جائے گی یا انہار و اشجار کی سیر کو نکل جائے گی۔ اب اس بے چاری کی خواہش اور کوشش یہی ہو گی کہ

شام ہونے سے پہلے کسی کا قدم اس کے گھر کی چار دیواری میں نہ پڑے' تاکہ اتنی محنت سے کی ہوئی صفائی' منجھائی اور رگڑائی مفت میں برباد نہ ہو۔

مکان اور سامان کی صفائی کا اس قدر اہتمام کرنے والی قوم اپنے اجسام کی صفائی کی چنداں پرواہ نہیں کرتی۔ نہانے سے اسے خاص طور پر پرہیز ہے۔ غسل کی نوبت کافی طویل وقفوں کے بعد آتی ہے۔ درمیانی عرصہ میں عورتیں تو پاؤڈر' اوڈی کلون وغیرہ سے کسی قدر ڈرائی کلیننگ کا اہتمام کرتی رہتی ہیں' لیکن مرد حضرات اس کی بھی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

یہ جفاکش قوم سمندر کی تہہ سے زمین نکال نکال کر بڑی خوبصورت تازہ بستیاں آباد کرتی ہے۔ پھولوں کی بہترین اقسام اس سرزمین پر اگتی ہیں۔ دنیا کے کئی عظیم فن کار اس قوم کی آغوش میں پلے ہیں۔ یہاں کے میوزیم آرٹ اور فن کا بے مثال گہوارہ ہیں۔ قدرتی مناظر کو ان کی اصلی صورت میں برقرار رکھنے کے لیے بڑے بڑے محکمے قائم ہیں۔ جنگلات میں ایک ایک درخت کی فائل بنی ہوئی ہے۔ پون چکیوں کی دیکھ بھال کا منظم انتظام ہے۔ بازاروں میں کتابوں کی دکانوں کی نمایاں بہتات ہے۔ دنیا کے کسی حصے میں کوئی مشہور کتاب شائع ہو تو وہ فی الفور ڈچ زبان میں ترجمہ ہو کر مارکیٹ میں آ جاتی ہے۔ کتابیں خریدنے کا اس قوم کو شوق بھی ہے اور شعور بھی ہے۔ ثقافتی روایات اور اقدار اس کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ لیکن مزاجاً یہ لوگ سردمہر' کم آمیز اور دیر آشنا ہیں اور ذہن ان کا بغیر کسی آمیزش کے خالصتاً تاجرانہ ہے۔ دولت کمانے میں وہ کسی قدر سفاک اور خرچ کرنے میں حد درجہ محتاط ہیں۔

ہالینڈ اپنی اعلیٰ ترین کوالٹی کے انڈے' مرغ' گوشت' مکھن' پنیر' دودھ اور پھول تو برآمد کر دیتا ہے اور اپنے گزارہ کے لیے انہوں نے قومی سطح پر کھانے پینے' رہنے سہنے کا ایسا دستور العمل اختیار کر رکھا ہے جس میں چھوٹے بڑے' امیر غریب سب برضا و رغبت یکساں طور پر شریک ہیں۔ ناشتہ میں مکھن کی جگہ ماجرین لگے ہوئے توس' چینی اور دودھ

کے بغیر چائے اور پنیر' لنچ پر پنیر کے سینڈوچ' شام کو چھ اور سات بجے کے درمیان ڈنر جسے وہ لوگ Hot Meal کہتے ہیں۔ ادھر شام کے چھ بجے' ادھر سڑکیں اور بازار خالی ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ سات بجے تک اچھا خاصا سناٹا چھا جاتا ہے۔ اور پوری قوم بیک وقت ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھ جاتی ہے۔ گرما گرم ابلتا ہوا سوپ موجود ہے تو گوشت ندارد۔ گوشت موجود ہے' تو سوپ غائب۔ ابلے ہوئے آلوؤں کا ڈھیر کا ڈھیر البتہ ہر ڈنر کا لازمی جزو ہے۔ یوں آلو ولندیزیوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔ ڈچ زبان میں آلو کے لیے جو لفظ ہے۔ اس کا مطلب بھی "ٹھوس سیب" ہے۔ اتوار کے اتوار انڈے کی عیاشی بھی ہو جاتی ہے۔ اس دن دس گیارہ بجے کے قریب انڈے اور کافی کے ساتھ "برنچ" کر کے بریک فاسٹ اور لنچ دونوں سے فراغت حاصل کر لیتے ہیں۔ پیاس بجھانے کے لیے اکثر مرد بئیر اور بولز چڑھاتے ہیں اور عورتیں اور بچے بڑی فراوانی سے دودھ پیتے رہتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہالینڈ میں موٹی عورتیں بھدے مرد' اور صحت مند بچے کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں۔

ڈچ لوگ اپنے یار دوستوں کو کسی ریسٹوران میں کھانے کی دعوت تو نہیں دیتے' لیکن کھانے پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے کی دعوت ضرور دیتے ہیں' کھانا ہوتا ہے' خوش گپی ہوتی ہے اور جب بیرا بل لاتا ہے' تو سب لوگ ٹپ سمیت حساب لگا کر اپنے اپنے حصے کی رقم بٹوے سے نکال کر میز پر رکھ دیتے ہیں۔ رسمی تکلفات کو وہ اپنی جیب کا بوجھ نہیں بننے دیتے۔ خودکفیلی کے اس طور طریقے میں جو سہولتیں میسر ہیں' انہوں نے اس آداب مہمانی و میزبانی کو دوسرے مغربی معاشروں میں بھی مقبول عام کر رکھا ہے۔ انگریزی زبان میں تو اس کے متعلق Going Dutch کا محاورہ بھی موجود ہے۔

انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سٹڈیز قائم کرنے کے لیے ہالینڈ کی ملکہ جولیانا نے اپنا ایک پورا محل عطیہ کر دیا تھا۔ یہ شاندار محل ہیگ کے ایک فیشن ایبل اور امیرانہ حصے میں واقع تھا۔ ایک طرف وسیع و عریض سرسبز باغ تھا۔ دوسری طرف شہر کی سب سے مہنگی دکانوں والا بازار تھا۔ درمیان میں اینٹوں کے فرش کا ایک کھلا میدان تھا۔ محل

کے الگ الگ حصوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے رہائش کرے تھے۔ ایک منزل پر ڈائننگ روم' کامن روم اور لائبریری تھی۔ دوسری منزلوں پر کلاس روم اور مذاکروں کے لیے کشادہ ہال تھے۔ دیواروں پر دیدہ زیب نقش و نگار تھے۔ چھتوں سے بڑے خوبصورت بلوری فانوس لٹک رہے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کا سارا ماحول شاہانہ تھا۔ پہلا کورس اسی سال شروع ہوا تھا اس میں آٹھ ملکوں سے ۳۲ طلبا شامل تھے' جن میں چھ لڑکیاں تھیں۔ لڑکیوں میں پاکستان سے صرف ایک لڑکی تھی جو بین الاقوامی امور پر ایم اے کا کورس مکمل کرنے آئی تھی۔ اس کا نام مس خورشید حسن تھا جو بعد میں خورشید حیدر بنیں۔ پاکستان واپس آ کر انہوں نے کچھ عرصہ تک کراچی اور اسلام آباد کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا۔ پھر فارن سروس میں داخل ہو کر ہالینڈ میں سفیر کے عہدہ پر فائز ہوئیں اور آج کل وزارت خارجہ میں ایڈیشنل سیکرٹری ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ میں خورشید نے اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا ہوا تھا۔ وہ نہایت صاف گو' بے باک' بے خوف' بااصول اور خوش خصال لڑکی تھی۔ پاکستانیوں کے گروپ میں ہم چھ مرد تھے۔ ہیگ میں پہنچتے ہی خورشید نے ہمیں فوراً اپنے ڈسپلن کے چھاتے تلے دھر لیا۔ کبھی نرمی اور کبھی گرمی سے اس نے ہم پر واضح کر دیا کہ غیر ملک میں ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ کیا کہنا چاہیے اور کیا نہیں کہنا چاہیے جس سے پاکستان کے وقار پر کوئی حرف نہ آئے۔ میں نے فوراً اس کی اس برتری اور بالا دستی کو تسلیم کر لیا اور انسٹی ٹیوٹ میں اپنی زندگی کو اس کے ہدایت نامہ کے سانچے میں ڈھالے رکھا۔ غالباً اس کی وجہ پاکستان کا وقار بڑھانا کم اور خورشید کی خوشنودی کو برقرار رکھنا زیادہ تھی۔

اپنی دیگر گونا گوں خصوصیات کے علاوہ خورشید صوم و صلوۃ کی پابند بھی تھی۔ اس کی ایک گہری سہیلی ایک چینی لڑکی وکٹوریہ تھی۔ دینی لحاظ سے وہ بھی اپنے مذہب کی خوب پابند تھی۔ بارش ہو یا برف' جھکڑ ہو یا طوفان وہ ہر اتوار کو منہ اندھیرے ایک مقامی گرجے

میں جا کر عبادت کرنے سے ہرگز نہ چوکتی تھی۔

اس برس رمضان شریف کا مہینہ گرمیوں میں آیا۔ ادارے میں ڈنر کا وقت تو شام کے سات بجے ختم ہو جاتا تھا لیکن خورشید نے ایسا بندوبست کیا کہ روزہ رکھنے والوں کے لیے باورچی خانہ ساری رات کھلا رہتا تھا۔ ان دنوں افطاری تقریباً نو ساڑھے نو بجے ہوتی تھی۔ ہم میں سے جو لوگ روزہ رکھتے تھے' خورشید خود ان کے لیے افطاری اور کھانے کا اہتمام کرتی تھی۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد جب سحری کا ٹائم آ جاتا' اس وقت بھی وہ اپنے ہاتھوں ہماری سحری کا انتظام کرتی تھی۔

جون کے آخر میں میرا کورس ختم ہو گیا۔ پچھلے چھ ماہ کے دوران خورشید نے مجھے ترتیب اور اطاعت کے جس سانچے میں ڈھال رکھا تھا۔ اس کی برکت سے میں نے واپسی پر حج کا فریضہ ادا کرنے کی نیت باندھ لی۔ اس حج نے اگر کچھ ثواب کمایا ہے' تو اس کے بیشتر حصہ کی حقدار خورشید ہی ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ میں ہالینڈ کے نظام حکومت کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضع بناؤں۔ یہ چھوٹا سا ملک سیاسی استحکام' فلاحی انصرام اور معاشی برد مندی کا بڑا عمدہ نمونہ ہے۔ یہاں پر باوقار لیکن بے تکلف' عام پسند اور دسترس پذیر بادشاہت ہے۔ بہت سی مختلف الاصول سیاسی پارٹیوں کے باوجود جمہوریت نہ تعطل کا شکار ہوتی ہے نہ تشدد کا۔ حکومت اکثر چند پارٹیوں کے اشتراک اور اتحاد سے مخلوط صورت میں بنتی ہے۔ کولیشن کسی وقت ٹوٹ جائے تو ملک میں ہنگامی حالات پیدا نہیں ہوتے۔ نئی کولیشن بن جاتی ہے یا نئے انتخابات ہو جاتے ہیں۔ ہر پارٹی کی مجموعی رکنیت کے تناسب سے پارلیمنٹ میں ان کی نشستیں محفوظ اور مقرر ہیں۔ بغیر جواز کے ووٹ نہ ڈالنا جرم ہے۔ نہایت اعلیٰ پیمانہ کی صنعتوں کے باوجود ملک میں ہڑتالوں کا رواج عام نہیں۔ ٹیکسوں کا نظام ایسا ہے کہ ذاتی سرمایہ داری کا گھوڑا بے لگام ہو کر نہیں بھاگتا۔ ایک حد چھو لینے کے بعد ذاتی آمدنی کی شرح برائے نام رہ جاتی ہے لیکن اس منزل تک پہنچنے کے بعد بھی صنعت کار اور سرمایہ

کار ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں رہتے' بلکہ ملک کی معیشت کی خاطر پیداوار بڑھانے میں بدستور مصروف عمل رہتے ہیں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں اس نظام حکومت کا تفصیلی مطالعہ کروں جس کے زیر نگیں سیاسی استحکام معاشی ترقی اور عوامی امان و بہبودی کا اس قدر خوبصورت امتزاج نشوونما پا رہا ہے' لیکن ادارے کے ڈائریکٹر نے معذرت کی کہ یہ انسٹی ٹیوٹ کا پہلا کورس ہے اور فی الحال اس میں اس موضع پر کام کرنے کے لیے کوئی بندوبست موجود نہیں۔ اس کی جگہ مجھے ہالینڈ کے کواپریٹو اور میونسپل سسٹم کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ سسٹم ہالینڈ کی سرزمین کے ساتھ مخصوص ہے اور وہاں کی روایات' ضروریات اور مفادات کے مطابق صدیوں میں پروان چڑھا ہے۔ پاکستان کے سیاق و سباق میں اس کی کسی خاص افادیت یا مناسبت نہیں۔ اس قسم کا مطالعہ مجھے تضیع اوقات نظر آیا۔

میرا پہلا ردعمل یہ تھا کہ میں اپنی حکومت سے اجازت لے کر واپس لوٹ جاؤں۔ اس خیال کا تذکرہ میں نے ہالینڈ میں پاکستانی سفارتخانہ کے ناظم الامور مسٹر لال شاہ بخاری سے کیا تو وہ مسکرائے۔ بخاری صاحب بڑے زندہ دل اور تجربہ کار افسر تھے اور اپنے زمانے میں بین الاقوامی شہرت کے ہاکی کے کھلاڑی رہ چکے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "صرف چھ ماہ کی تو بات ہے۔ اتنا وقت تو تمہیں واپسی کی اجازت حاصل کرنے ہی میں لگ جائے گا۔ ڈچ گورنمنٹ کا دیا ہوا مفت کا وظیفہ ہے۔ بہتر ہے تم یہ کورس مکمل کر لو۔ بیٹھے بٹھائے ہالینڈ کی سیر ہو جائے گی اور تمہارے علم میں بھی ضرور اضافہ ہو گا۔"

اس کورس سے میرے علم میں تھوڑا بہت اضافہ تو ضرور ہوا' لیکن پاکستان کی ضروریات کے لحاظ سے یہ علم غیر نافع تھا۔ البتہ اس بہانے ڈچ قوم کی تہذیب و تمدن کو کافی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انڈونیشیا پر کئی سو برس حکومت کرنے کی وجہ سے ہالینڈ کا مسلمانوں کے ساتھ بڑا طویل واسطہ رہا ہے۔ لائیڈن یونیورسٹی کی ایسٹرن انسٹی ٹیوٹ میں اسلامی علوم کا عظیم الشان مرکز ہے لیکن اس کے باوجود ولندیزیوں کے دل مسلمانوں

کے خلاف تعصب اور بغض کے جذبات سے خالی نہیں۔ ہالینڈ میں ہر بچے کی پیدائش میونسپلٹی کے دفتر میں رجسٹر کرانی لازمی ہے۔ اس مقصد کے لیے جو فارم بھرنا پڑتا ہے۔ اس کے ایک خانے میں بچے کا مذہب بھی درج کرنا ہوتا ہے۔ کچھ والدین یہ خانہ خالی چھوڑ دیتے ہیں تاکہ سن بلوغت کو پہنچ کر بچہ اپنی مرضی سے جو مذہب اس کا جی چاہے اختیار کرے۔ کئی میونسپلٹیوں میں مجھے ایسے فارم بھی نظر آئے' جن میں والدین نے مذہب کا خانہ خالی چھوڑ کر اس کے نیچے اپنے ہاتھ سے یہ شرط لکھی ہوئی تھی:

" جوان ہو کر اپنی پسند کا کوئی بھی مذہب اختیار کرنے کے لیے آزاد ہے' سوائے اسلام کے۔"

ایک روز میں آرنہم کے وسیع و عریض جنگل میں گھوم رہا تھا۔ تھک کر درختوں کے جھنڈ میں ایک بنچ پر بیٹھا' تو قریب کے بنچ سے دھیمی دھیمی خوش الحان آواز میں سورہ رحمٰن کی تلاوت کی آواز آئی۔ ایک نہایت خوش پوشاک' فرنچ کٹ سفید داڑھی والا ڈچ آنکھیں بند کئے جھوم جھوم کر سورہ رحمٰن کی قرات کر رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہوا' تو میں نے اٹھ کر السلام علیکم کہا۔ اس نے وعلیکم السلام و رحمتہ اللہ و برکاتۃ' کہہ کر جواب دیا۔

"کیا آپ ڈچ مسلمان ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا نام عبداللہ ڈی ہوگ تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میرا وطن پاکستان ہے' تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے بتایا کہ اسلام کا تحفہ اسے کراچی میں نصیب ہوا تھا۔ وہ پہلے ڈچ نیوی میں اعلیٰ افسر تھا۔ وہاں سے قبل از وقت فراغت حاصل کر کے وہ مرچنٹ فلیٹ میں شامل ہو گیا اور ایک کارگو شپ کا کپتان بن گیا۔ یہ جہاز مشرقی بندرگاہوں اور یورپ کے درمیان سامان ڈھوتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں ایک بار اس کا جہاز کراچی کی بندرگاہ پر کچھ سامان لدوانے کے لیے رکا۔ گرمی اور حبس کا موسم تھا۔ سامان لادنے والے مزدور پسینے میں شرابور تھے۔ جہاز کے عملے نے انہیں ٹھنڈا پانی دیا تو سب نے پینے سے انکار کر دیا' کیونکہ ان کا روزہ تھا۔ ایک بوڑھے

مزدور پر ڈی ہوگ کو بڑا ترس آیا جو گرمی' حبس اور سامان کے بوجھ تلے بدحال ہو رہا تھا۔ دوسروں کی نظر بچا کر وہ اس بڈھے کو اپنے کیبن میں لے گیا اور اسے ٹھنڈے جوس کا گلاس دے کر اشارے سے کہا کہ یہاں پر اسے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ وہ چپکے سے اسے پی لے۔ بوڑھے مزدور نے نفی میں سر ہلا کر جوس کا گلاس واپس کر دیا اور آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر اللہ' اللہ کہتا ہوا کیبن سے باہر چلا گیا۔ ان دیکھے خدا کی ذات پر اس قدر مکمل' بے ابہام اور غیر متزلزل ایمان دیکھ کر ڈی ہوگ کا دل تو اسی وقت مسلمان ہو گیا تھا' لیکن اس کے دماغ نے یہ تبدیلی ایک برس کے بعد قبول کی۔ اس ایک برس کے دوران اس نے اپنے جہاز کے عملے میں ڈچ زبان جاننے والا ایک انڈونیشی مسلمان عالم بھرتی کر لیا۔ اس سے انہوں نے قرآن شریف پڑھا' حدیث سے واقفیت حاصل کی اور پھر قاہرہ کی ایک مسجد میں جا کر باقاعدہ اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ دو برس اور مرچنٹ فلیٹ میں رہا۔ لیکن اپنا اسلام خفیہ رکھا۔ اب ریٹائر ہونے کے بعد وہ آرنہم کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ان کی بیوی بھی مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی' لیکن دو بیٹے جو ترک وطن کر کے آسٹریلیا میں آباد ہو گئے ہیں' اس نعمت سے محروم رہ گئے تھے۔

عبداللہ ڈی ہوگ صاحب نے اپنے ایک دوست کا ذکر بھی کیا' جو ہالینڈ کے ایک بڑے بینک میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ وہ بھی کئی برس سے مسلمان ہو چکے ہیں۔ لیکن اپنی ملازمت کے دوران یہ راز افشا کرنے کی جرات نہیں کر سکتے' کیونکہ اس سے اس کی ترقی کے امکانات ہی مسدود ہونے کا خدشہ نہیں' بلکہ خود ملازمت بھی خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔

یہ تعصبات صرف ہالینڈ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ مغرب کے کئی اور معاشرے بھی اسلام کے متعلق اسی قسم کی تنگ نظری کا شکار ہیں۔ یہ معاشرے اپنی جگہ بڑے متمدن تعلیم یافتہ' آزاد خیال' متحمل' روادار اور سیکولر شمار ہوتے ہیں' لیکن اسلام کے سباق

میں ان کی آزاد خیالی' بردباری اور سیکولرزم بڑی حد تک سلب ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو وہ زہر ہے جو مسیحی پادری اور یہودی مذہبی پیشوا صدیوں سے اسلام کے خلاف طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے پھیلاتے رہے ہیں۔ دوسری وجہ یورپین مستشرقین کا ایک خاص گروہ ہے' جس نے علم و دانش کے پردے میں اسلام اور مسلمانوں کے خدوخال مسخ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کے گمراہ کن اقوال و افکار صرف دوسروں ہی کو اسلام سے بدظن نہیں کرتے' بلکہ احساس کمتری میں مبتلا بعض مسلمانوں کے لیے بھی سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہالینڈ میں اس گروہ مستشرقین کی ایک واضح مثال پروفیسر سنوک ہرگوئین (prof.C. Snouch Hurgronje) ہے۔ یہ صاحب لائیڈن یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے پروفیسر تھے۔ ۱۸۸۴ء میں انہوں نے چھ ماہ جدہ میں گزارے اور پھر ایک فرضی اسلامی نام رکھ کر چھ ماہ کے لیے مکہ معظمہ چلے گئے۔ حدود حرم میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے' لیکن پروفیسر صاحب جعلی مسلمان کے بھیس میں وہاں رہے اور بلد الامین میں مسلمانوں کی زندگی اور معاشرت پر جرمن زبان میں دو جلدوں کی ایک کتاب "Mekka" نامی لکھی۔ اس کے علاوہ وہ ڈچ زبان میں حج کے موضوع پر ایک کتاب "جشن مکہ" (Het Mekkansche Feest) کے عنوان سے بھی لکھ چکے ہیں' جو لوگ دھوکہ بازی اور فریب کاری کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کی رسومات اور مسلمانوں کے حالات کا کھوج لگانے نکلے ہوں۔ ان کے مقاصد میں خوش نہادی' خیر سگالی اور انصاف طلبی کی تلاش سعی لاحاصل ہے۔ یہ ایسی ہی تحریروں کا نتیجہ تھا کہ ایک عام ولندیزی کے ذہن میں مسلمانوں کا تصور حرم گشتگی' بے راہروی' بربریت اور بدمعاملگی کے مترادف تھا۔

میونسپلٹیوں کے نظام کے مطالعہ کے سلسلے میں مجھے ہالینڈ کے چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی جانا پڑتا تھا۔ ایک جگہ میری رہائش کا بندوبست ایک ایسے خاندان میں ہوا' جس میں پانچ بیٹیاں اور چار لڑکے تھے۔ یہ خاصا مذہبی گھرانہ تھا۔ پہلی شام جب ہم اکٹھے بیٹھے' تو سارے لڑکے اور لڑکیاں میرے گرد ہو گئے کہ بتاؤ پاکستان میں تمہاری

کتنی بیویاں' کتنی لونڈیاں اور کتنے غلام ہیں۔ وہ بڑی دیر تک مجھ پر اسی موضوع پر جرح کرتے رہے۔ میرے جوابوں سے مایوس ہو کر ان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یا تو یہ شخص واقعی مسلمان نہیں' یا ہمارے ساتھ مصلحتاً جھوٹ بول رہا ہے!

اتوار کے روز سارے خاندان نے بائیسکلوں پر سوار ہو کر پک نک پر جانے کا پروگرام بنایا۔ گھر میں گیارہ بائیسکل موجود تھے۔ جو میاں بیوی اور نو بچوں میں بٹ گئے۔ میرے لیے بارھواں بائیسکل کسی ہمسائے سے عاریتاً مانگ لیا گیا۔ ہمارا قافلہ سائیکلوں پر سوار ہو کر باہر نکلا' تو چاروں طرف سڑکوں پر بائیسکل ہی بائیسکل نظر آئے۔ ہالینڈ کی سرزمین اتنی ہموار ہے کہ بائیسکل کو یہاں پر قریباً قریباً قومی سواری ہونے کا درجہ حاصل ہے' بہت سی سڑکوں پر بائیسکل چلانے والوں کے لیے الگ الگ راستے ہیں۔ کبھی کبھار ملکہ جولیانا بھی سائیکل پر سوار ہو کر شہر میں نکل جاتی ہیں۔ ان کی شہزادیاں بھی بائیسکل چلانے کی شوقین ہیں ہمارا قافلہ سولہ سترہ کلومیٹر سائیکلنگ کرنے کے بعد ایک خوبصورت پارک میں جا کر رکا۔ بھوک سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ اب ہماری خاتون خانہ کوئی غیبی توشہ دان کھول کر ہماری لذت کام و دہن کا انتظام فرمائیں گی۔ لیکن این خیال است و محال است و جنوں۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنا پرس کھولا اور پیپرمنٹ سویٹ کی ایک ایک گولی تقسیم کر کے ہم سب کو ہدایت کی' "اسے چبانا مت۔ دھیرے دھیرے چوسنا۔ اس سے تمہارا سانس مصفا ہو جائے گا۔"

گولیاں چوس کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہم پارک میں فطرت سے ہم کلام رہے اور جب ہمارا دل شاد اور آنکھیں اچھی طرح آباد ہو گئیں' تو اسی طرح بھوکے پیاسے پھر بائیسکلوں پر سوار ہو کر رخت سفر باندھا۔ راستے میں ایک گاؤں سے گزر ہوا جہاں بڑا بارونق ہاٹ لگا ہوا تھا۔ خوب گہما گہمی تھی اور طرح طرح کا مال و اسباب بک رہا تھا۔ ایک دکان پر گرما گرم مچھلی تلی جا رہی تھی۔ میں نے اس طرف ذرا للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا' تو میری میزبان نے بڑی مروت سے پوچھا۔ "تمہیں تلی ہوئی مچھلی پسند ہے؟"

میں نے بڑے زور سے اثبات میں سر ہلایا اور منہ میں سیروں پانی بھر کر انتظار میں کھڑا ہو گیا لیکن یہ مچھلی بھی پانی سے نہیں سراب سے پکڑی ہوئی تھی۔ اس عفیفہ نے پاؤ بھر مچھلی تلوا کر ایک مومی کاغذ میں لپیٹی اور اسے اپنے پرس میں حفاظت سے بند کر لیا۔ جب ہم واپس گھر پہنچے' تو ڈنر کا ٹائم قریب تھا۔ خاتون خانہ نے تلی ہوئی مچھلی کو چورا چورا کر کے ایک پیالہ میں ڈالا اور اس میں ٹماٹر کی چٹنی اور سرکہ ملا کر لئی سی بنا لی۔ اسے اس نے مکھن کی طرح بہت سے توسوں پر لگا دیا۔ ساتھ ہی بھاپ دیتے ہوئے سوپ کا بال دیا اور ابلے ہوئے آلوؤں کا ڈھیر کھانے کی میز پر آ گیا اور دن بھر کی مشقت کے بعد ہم اتوار کے خصوصی ڈنر سے سرنڈر ہو گئے۔ ایسے موقعوں کے لیے میں احتیاطاً بسکٹوں کے کچھ پکیٹ اپنے سوٹ کیس میں چھپا کر رکھا کرتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ بستر میں لیٹ کر رہی سہی کسر اپنے بسکٹوں سے پوری کر لوں گا' لیکن اس کا موقع بھی ہاتھ نہ آیا۔ کیونکہ دو بڑے لڑکے میرے کمرے میں سوتے تھے اور وہ دیر تک آج کے پک نک کے خوشگوار پہلوؤں پر بڑی گرم جوشی سے تبصرہ کرتے رہے۔

ایک اور قصبے میں میرے میزبان ایک ایسے صاحب تھے جنہیں پیدل سیر کرنے کا شوق تھا۔ چھٹی کے روز وہ مجھے ساتھ لے کر نکل جاتے تھے' اور سارا دن پاپیادہ گھماتے رہتے تھے۔ لنچ کے وقت وہ اپنی جیب سے میٹھی ڈبل روٹی کے دو توس برآمد کرتے تھے۔ ایک توس وہ خود نوش فرما لیتے تھے۔ دوسرا مجھے عنایت ہوتا تھا۔ ان دنوں ان کے چھوٹے سے باغیچہ میں صرف ایک ٹیولپ کا پھول باقی تھا۔ شام کے وقت وہ اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر گھنٹوں بڑے گیان دھیان سے اس پھول کا نظارہ کیا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ فطرت کی نیرنگیوں میں خدا کی قدرت کا مشاہدہ کر رہے ہیں' لیکن فن باغبانی ان کا پیشہ تھا۔ اس لیے وہ پھولوں کی تجارت سے اپنے ملک کا زرمبادلہ بڑھانے کی سوچ میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے۔

ایک روز اتفاق سے میرا تعارف ایک ڈچ صوفی سے ہو گیا۔ اس کا ڈچ نام تو ایڈون

کیٹنگ تھا' لیکن صوفی نام کرم دین تھا۔ بیوی کا صوفی نام کلثوم تھا اور دو بچوں کے نام بھی نور دین اور شرف دین تھے۔ عام زندگی میں تو وہ اپنے اپنے ڈچ نام استعمال کرتے تھے' لیکن صوفی برادری کے جملہ ارکان باہمی میل جول میں بڑی بے تکلفی سے اپنے دوسرے نام استعمال میں لاتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا آدھا نام ڈچ تھا' آدھا دوسرا۔ مثلاً شوکت خان ہاؤزن۔ منیزہ فولٹن۔ رحمت برکلے۔ بشیراں کیسنگ۔ ڈچ صوفیوں کے کئی جگہ اپنے مراکز ہیں' جنھیں صوفی چرچ (Sufi Kerk) کہا جاتا ہے۔ چرچ کا امتیازی نشان انسانی دل ہے' جس کے دونوں طرف پر لگے ہوئے ہیں۔ دل کے اندر چاند تارا بنا ہوتا ہے۔

۱۹۶۳ء میں جب ہالینڈ میں سفیر بن کر گیا' تو وہاں کے وزیر خزانہ پروفیسر وٹے فین Witteveen بھی صوفی تحریک سے وابستہ تھے۔ بعد ازاں وہ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (International Monetary Fund) کے سربراہ بھی رہے۔

یورپ میں اس سلسلہ کے بانی صوفی عنایت خاں تھے۔

○○○

• یورپ کے صوفی

صوفی عنایت خاں ۱۸۸۲ء میں بڑودہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد رحمت خان پنجاب کے رہنے والے تھے۔ یہ موسیقاروں کا خاندان تھا اور ان کے اجداد میں شیخ جما شاہ ایک صاحب باطن بزرگ بھی گزرے تھے۔ رحمت خان خود بھی اچھے موسیقار تھے۔ خاص طور پر دھرپد راگ میں انہیں استاد مانا جاتا تھا۔

ایک بار اپنی سیر و سیاحت کے دوران استاد رحمت خان اجمیر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ پر حاضر ہوئے۔ سماع کی محفلیں برپا تھیں۔ استاد رحمت خان نے بھی بڑھ چڑھ کے اپنا کمال دکھایا۔ اس کے بعد وہ مزار کے پاس کھڑے ہو کر مراقب ہو گئے "رفتہ رفتہ ان کا بدن سن ہو گیا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اور ان پر غنودگی چھا گئی۔ ساتھ ہی انہیں صاحب مزار کی زیارت ہوئی جن کا چہرہ پھولوں کی چادر میں چھپا ہوا تھا۔ حضرت خواجہ نے دونوں ہاتھوں سے پھول ہٹا کر اپنا چہرہ بے نقاب کیا اور اشارے سے رحمت خان کو ایک راستے کا نشان بتایا جس پر چلتے چلتے وہ آخر کار بڑودہ پہنچ گئے۔"

ان دنوں بڑودہ میں استاد مولا بخش کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کا پہلا نام چولے گھیسن خاں تھا لیکن کسی مجذوب کی ہدایت پر انہوں نے یہ نام بدل کر اپنا نام مولا بخش رکھ لیا تھا۔ وہ ایک بہت بڑے گائیکی گھرانے کے سربراہ تھے۔ بڑودہ کے مہاراجہ سیاجی راؤ گائکواڑ پر ان کا بڑا اثر تھا۔ مہاراجہ خود بھی موسیقی کے رسیا تھے اور استاد مولا بخش کی سرپرستی میں انہوں نے موسیقی کی اکیڈمی گیان شالہ کے نام سے کھول رکھی تھی۔ اس میں ہندوستانی موسیقی کے علاوہ مغربی موسیقی کے شعبے بھی موجود تھے۔

استاد مولا بخش کی بیوی ایک مسلمان شہزادی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے مسلمانوں پر مظالم کی قیامت ڈھائی تو دو وفادار ملازم اس شہزادی کو خفیہ

طور پر بڑودہ لے آئے۔ مولا بخش نے اسے اپنے پاس پناہ دی اور بعدازاں اس کے ساتھ شادی کر لی۔ دونوں ملازم بھی تاحیات اسی گھر میں رہے' لیکن شہزادی کے حسب نسب کے متعلق کبھی کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق اسکا رشتہ ٹیپو سلطان کے خاندان سے ملتا تھا۔

جب استاد رحمت خاں بڑودہ پہنچے تو استاد مولا بخش نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی۔ کچھ عرصہ بعد یہ خاتون وفات پا گئی' تو استاد مولا بخش نے اپنی دوسری بیٹی کو رحمت خاں سے بیاہ دیا۔ صوفی عنایت خاں اسی بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے۔

عنایت خاں نے گیان شالہ اکیڈمی میں راگ ودیا پر عبور حاصل کیا۔ مہاراجہ گائیکواڑ کی خواہش تھی کہ وہ مستقل طور پر ان کے دربار کے ساتھ وابستہ ہو جائیں' لیکن عنایت خاں کے دل میں جہانگردی کی دھن سمائی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے دور دراز کے سفر کرنے لگے۔

سب سے پہلے وہ نیپال گئے۔ کھٹمنڈو میں ان کی ملاقات ایک پنجابی بزرگ سے ہوئی جو وہاں کے رانوں اور مہارانوں کی تربیت پر لگے ہوئے تھے' اس بزرگ نے عنایت خاں کا تعارف ایک ہندو یوگی سے کرایا' جو سالہا سال سے آنکھیں بند کئے پہاڑ کی کھوہ میں سمادھی لگائے بیٹھا تھا۔ عنایت خاں صبح و شام اس غار میں جاتے اور یوگی کے سامنے بیٹھ کر دیر دیر تک وینا بجاتے' ایک روز یوگی نے خوش ہو کر آنکھیں کھول دیں اور عنایت خاں کو "ونایک راجہ" کا خطاب عطا کیا۔

نیپال سے عنایت خاں نے برما اور سیلون کا سفر کیا اور پھر گجرات' کاٹھیاوار' میسور' مدراس' مالا بار کی سیاحت کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ کلکتہ میں انہوں نے مدرسہ کالج' پریذیڈنسی کالج اور یونیورسٹی ہال میں کئی لیکچر دیئے' جن میں سے کچھ کی صدارت رابندرناتھ ٹیگور نے بھی کی۔ کلکتہ سے آپ ڈھاکہ آئے' جہاں نواب ڈھاکہ نے احسن منزل میں محفلیں منعقد کر کے ان کا تعارف سلہٹ اور آسام کے مشاہیر سے کرایا۔ مہاراجہ دیناج

پور عنایت خاں کی موسیقی پر خاص طور سے عاشق تھے اور اس فن میں انہیں اپنا گرو تسلیم کرتے تھے۔

اسی دوران میں عنایت خاں حیدر آباد دکن پہنچے اور میر محبوب علی خاں کے دربار میں باریاب ہوئے۔ نظام تصوف اور موسیقی کے دلدادہ تھے اور رفتہ رفتہ دونوں میں خوب گاڑھی چھننے لگی۔ دربار عام کے علاوہ عنایت خاں کو نظام کی خاص مجلسوں اور نجی محفلوں میں بھی عمل دخل حاصل تھا۔ میر محبوب علی کے اصرار پر عنایت خاں اس بات پر رضا مند ہو گئے کہ وہ حیدرآباد میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لیں۔ لیکن کارکنان قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

حیدر آباد میں عنایت خاں کی ملاقات چشتیہ سلسلہ کے ایک بزرگ سید محمد ابو ہاشم مدنی سے ہوئی۔ سید صاحب نے عنایت خاں کو راہ سلوک کے پیچ و خم سے آشنا کیا۔ اس راستہ میں مجاہدے کے ریگزار بھی تھے' اور مشاہدے کے گل و گلزار بھی۔ سفر کی دشوار گزار گھاٹیاں بھی تھیں اور منزل مقصود کے پراسرار سنگ میل بھی' عنایت خاں نے سید ابوہاشم مدنی کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور مرشد کی رہنمائی میں وہ اپنے گلے کا نور برساتے' وینا بجاتے' اس نئے راستے پر چلتے گئے' چلتے گئے' حتیٰ کہ ان کے اپنے الفاظ میں "ایک ایسی منزل آ گئی جہاں پر میرا جسم وینا کا ساز بن گیا۔ میری روح وینا کے تار بن گئی اور میری زندگی ایک سرمدی راگ بن گئی۔ اس مقام پر پہنچ کر میں نے اپنے فن کا سارا اثاثہ اس ازلی اور ابدی موسیقار کے سپرد کر دیا جو کائنات کے سرگم پر ہر لحہ آفاقی تانیں اڑانے میں مصروف ہے۔"

جب عنایت خاں کی موسیقی میں معرفت کا رنگ اچھی طرح رچ گیا' تو ان کے مرشد سید ابوہاشم مدنی نے حکم دیا کہ اب وہ مغربی ممالک میں چلے جائیں' اور اپنے فن کے ذریعہ روحانیت کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں۔

عنایت خاں نے مرشد کے حکم پر سر تسلیم خم کیا اور ۱۳ ستمبر ۱۹۱۰ء کو امریکہ روانہ

ہو گئے۔ ان کے ایک حقیقی اور ایک چچا زاد بھائی بھی ساتھ تھے۔ اس وقت ان تینوں کی عمر تیس تیس سال سے بھی کم تھی۔

نیویارک پہنچ کر عنایت خاں نے اپنا پہلا لیکچر کولمبیا یونیورسٹی میں دیا۔ اس کے بعد وہ بہت سے دوسرے شہروں اور اداروں میں اپنی محفلیں منعقد کرتے رہے۔ ان کے مداحوں میں سانتا روازا کے فن باغبانی کے ماہر لوتھر بونبیک بھی شامل تھے۔ وہ تھوہر کے پودے کو کانٹوں کے بغیر پیدا کرنے کا تجربہ کر رہے تھے۔ بے خار حیات عنایت خاں کا نصب العین تھا' اور بے خار نباتات لوتھر بونبیک کا۔ یہی ان کی دوستی کی قدر مشترک بن گئی۔

امریکہ میں دو برس گزارنے کے بعد عنایت خاں اپنے بھائیوں سمیت انگلستان آ گئے یہاں سے وہ روس گئے۔ ماسکو میں ٹالسٹائی کا بیٹا کاؤنٹ سرجے ٹالسٹائی عنایت خاں کا مداح بن گیا۔ اس نے انہیں بہت سے روسی موسیقاروں سے متعارف کرایا اور ماسکو کے علاوہ دوسرے کئی شہروں میں ان کے فنی شو منعقد کرانے میں مدد دی۔ کاؤنٹ ٹالسٹائی ہی کی کوشش سے عنایت خاں کی کتاب (A Sufi Message of Spiritual Liberty) کا روسی زبان میں ترجمہ ہو کر ماسکو میں شائع ہوا۔

ایک روایت کے مطابق صوفی عنایت خاں کی ملاقات زار روس سے بھی ہوئی تھی۔ اس ملاقات کا بندوبست راسپوٹین نے انتہائی خفیہ طور پر کرایا تھا۔ ملاقات کے دوران راسپوتین کے علاوہ اور کوئی شخص وہاں پر موجود نہ تھا۔ اس ملاقات کی پوری تفصیلات دستیاب نہیں ہو سکیں۔

ماسکو میں عنایت خاں کا ایک مداح بے بیگ تھا۔ بے بیگ تاتاریوں کا سردار تھا اور امیر بخارا کی جانب سے زار روس کے دربار میں سفیر کے عہدے پر مامور تھا۔ بے بیگ نے بہت کوشش کی کہ عنایت خاں بخارا کا دورہ بھی کریں' لیکن انہی دنوں پہلی جنگ عظیم سر پر آ گئی اور عنایت خاں انگلستان واپس لوٹ آئے۔

جنگ کے پانچ سال عنایت خاں نے انگلستان میں بسر کئے۔ اس عرصہ میں انہوں نے ''صوفی

تحریک" کی منظم طور پر بنیاد ڈالی اور لندن میں ایک اشاعتی ادارہ "صوفی پبلشنگ سوسائٹی" کے نام سے قائم کیا۔

جنگ کے بعد انہوں نے یورپ کے چپے چپے کا دورہ کیا۔ ہر جگہ مریدوں کی خاصی تعداد ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے صوفی تنظیم میں داخل ہونے لگی۔ اب وہ موسیقار عنایت خاں کی جگہ مرشد عنایت خاں کہلانے لگے اور چار پانچ سال کے اندر اندر یورپ کے بہت سے ملکوں میں صوفی تحریک کے سنٹر قائم ہو گئے۔ خاص طور پر ہالینڈ' سوئٹزر لینڈ' فرانس' جرمنی' اٹلی' آسٹریا' سویڈن' ناروے' ڈنمارک اور انگلستان کے بہت سے شہروں میں ان کی شاخیں بڑی سرگرمی سے چلنے لگیں۔ امریکہ اور جنوبی افریقہ میں بھی اس کے کئی سنٹر قائم ہو گئے۔

اپنی تحریک کو اس طرح دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتے دیکھ کر عنایت خاں نے جنیوا میں اپنی تحریک کا بین الاقوامی مرکز (The Internaional Headquarters of the Sufi Movement) کے نام سے قائم کر دیا۔ اس کی ایک برانچ پیرس میں کھولی جہاں اب انہوں نے اپنا مستقل قیام اختیار کر لیا تھا۔ یہاں پر ان کی رہائش گاہ کا نام "فضل منزل" تھا۔ بین الاقوامی ہیڈ کوارٹر کی دوسری برانچ ہیگ کے قریب (Katwijk) کے مقام پر تھی۔ اس کا نام "مراد حاصل" تھا۔ یہاں پر اب "مراد حاصل فاؤنڈیشن" قائم ہے۔

۱۹۲۶ء میں عنایت خاں کو ہندوستان چھوڑے سولہ برس ہو چکے تھے۔ یورپ میں ان کی صوفی تحریک اپنے نکتہ عروج پر تھی کہ یکایک ان کے دل میں خاک وطن کی کشش نے زور مارا' اور نومبر کے مہینے میں وہ ہندوستان روانہ ہو گئے۔ ان کی یورپین سیکرٹری قسمت شام ان کے ہمراہ تھی۔ پیرس میں ان کے حلقہ بگوشوں کی کثیر تعداد نے ان کو الوداع کہا اور دوسرے شہروں میں ان کے بہت سے اور مرید اپنے مرشد کی واپسی کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

ہندوستان پہنچ کر صوفی عنایت خاں نے دلی اور لکھنؤ کی یونیورسٹیوں میں لیکچر دیئے اور بنارس' آگرہ' جے پور اور بڑودہ کا دورہ بھی کیا۔ انہوں نے لوگوں کو مغرب میں اپنے مشن کی کامیابیوں سے آگاہ کیا' لیکن یہاں پر ان کے مسلک کو کسی قسم کی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ یہاں پر ان کو فقط ایک یا دو مرید نصیب ہوتے۔ ان میں سے ایک مسز شاستری تھی جو ایک ہندو ڈاکٹر کی امریکن بیوی تھی۔ اپنی اس ناکامی سے مایوس ہو کر انہوں نے یورپ واپس جانے کا پروگرام بنا لیا۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ اجمیر شریف گئے۔ دسمبر کی سردی کے ایام تھے۔ صوفی عنایت خاں کئی رات متواتر محفل سماع میں شریک ہوتے رہے۔ اس کڑاکے کی سردی میں ساری ساری رات ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر بیٹھنے کی وجہ سے انہیں نمونیہ ہو گیا۔ دلی واپس آ کر وہ کئی ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے۔ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خان نے بھی ان کے علاج معالجہ میں حصہ لیا۔ ۴ فروری ۱۹۲۷ء کی رات کو صوفی عنایت خاں بے ہوش ہو گئے۔ مس قسمت شام جو ان کے ساتھ یورپ سے آئی تھی۔ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی کہ اس کا مرشد قریب المرگ ہے وہ یہی سمجھتی رہی کہ مرشد مراقبہ میں غرق ہو کر سمادھی میں گیا ہوا ہے۔ وہ کئی گھنٹے مرشد کی چارپائی کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر زمین پر بیٹھی رہی۔ صبح کے آٹھ بج کر بیس منٹ پر دو ڈاکٹروں اور مسز شاستری نے بڑی مشکل سے اسے یقین دلایا۔ مرشد اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ صوفی عنایت خاں کو خواجہ نظام الدین کی درگاہ کے قریب دفن کر دیا گیا۔

صوفی عنایت خاں کی وفات کے بعد ان کے سلسلہ کو ان کے بھائیوں محبوب خاں محمد علی خاں اور مشرف خاں نے چلایا۔ عنایت خاں کی بیوی ایک امریکن خاتون امینہ بیگم تھیں۔ ان کے بطن سے کئی بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں' لیکن صوفی تحریک کی جانشینی ان میں سے کسی نے نہ سنبھالی۔ ان کی ایک بیٹی نے البتہ ایک دوسرے میدان میں بڑا نام پیدا کیا اس کا نام نور النساء عنایت خاں عرف "بابلی" تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں جب

جرمن افواج نے فرانس پر قبضہ کیا' تو نورالنساء پیرس میں مقیم تھی۔ اس نے "میڈیلین" کا کوڈ نام اختیار کر کے لندن میں اتحادی فوجوں کے ہیڈکوارٹر کو خفیہ پیغامات بھیجنے کا فریضہ سنبھال لیا۔ اس مقصد کے لیے وہ ایک وائرلیس سیٹ استعمال کرتی تھی۔ یہ کام اس نے بڑی جانفشانی اور دلیری سے سر انجام دیا۔ جنگ کے دوران ایک ایسا وقت بھی آیا جب لندن میں اتحادی ملٹری ہیڈکوارٹر کا فرانس کے ساتھ واحد رابطہ نورالنساء عنایت خاں عرف "میڈیلین" کی ذات کے ذریعہ قائم تھا۔ لیکن پھر کسی نے دغا دے کر اس کا راز فاش کر دیا اور جرمن فوجیوں نے اسے گرفتار کر کے گولی سے اڑا دیا' ہٹلر کی شکست کے بعد جب جنرل ڈیگال نے فرانس کی حکومت سنبھالی' تو نورالنساء عنایت خان کو بعد از موت فرانس اور برطانیہ نے بہادری کے نہایت اعلیٰ اعزازات سے نوازا۔ ان اعزازات کی نقول اس باب کے آخر میں منسلک ہیں۔

عنایت خان کے مرشد سید محمد ابوہاشم مدنی نے انہیں اسلامی تصوف کے رموز سے آشنا کیا تھا اور رشد و ہدایت کے اسی طریق کو مغربی ممالک میں پھیلانے کی تلقین کی تھی' لیکن امریکہ اور یورپ پہنچ کر انہوں نے وہاں کے ماحول کے ساتھ سمجھوتا کر لیا۔ وہاں کے لوگوں کو اس سلسلہ میں داخل کرنے کی بجائے انہوں نے اپنے سلسلہ کو ہی مغربی مزاج کے سانچے میں ڈھال لیا۔ چنانچہ اسلام کی تبلیغ کرنے کی بجائے ان کا مسلک تھیوسوفیکل سوسائٹی کی طرز پر مختلف مذاہب کا ایک مجموعہ اخلاقیات سا بن کر رہ گیا۔

اس مسلک میں اسلام سمیت دنیا کے سب مذاہب یکساں درجہ رکھتے ہیں۔ کسی ایک مذہب کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔ اسی طرح "صوفی" یا "مرید" بننے کے لیے بھی کسی خاص مذہبی عقیدے کی ضرورت نہیں مسلمانوں' عیسائیوں' یہودیوں اور زرتشتیوں کے علاوہ ہندو' بت پرست' مشرک اور ملحد بھی یکساں طور پر اس سلسلہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔

اس مسلک میں کتاب فطرت انسان کا واحد مقدس صحیفہ ہے اور عالمگیر انسان کا واحد مشترکہ مذہب ہے۔ عبادت کو بین الاقوامی اتحاد کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں اور اس مقصد کے لیے اس تحریک میں "عالمگیر عبادت" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

"عالمگیر عبادت" میں حصہ لینے والے ایک بند کمرے میں قطار در قطار بیٹھ جاتے ہیں۔ سامنے ایک کشادہ میز کے عین وسط میں ایک بڑی موم بتی روشن کی جاتی ہے جو علامتی طور پر خدائے واحد کا نشان ہوتی ہے جو ساری روشنی اور علم کا منبع و ماوئی ہے۔ اس موم بتی سے نیچے کی سطح پر چھ چھوٹی موم بتیوں کی قطار ہوتی ہے جو علی الترتیب ہندو مت' بدھ مت' زرتشتیت' یہودیت' مسیحت اور اسلام کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ہر موم بتی کے سامنے اس مذہب کا صحیفہ بھی رکھا ہوتا ہے۔ عالمگیر عبادت کے اس مجمع کو (Church For All) کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

اس قسم کی اجتماعی عبادت کے علاوہ مریدوں کا مرشد کے ساتھ اپنا ذاتی رشتہ بھی قائم ہوتا ہے جس میں انہیں الگ الگ ذکر و اذکار کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ تعلیم صیغہ راز میں رکھی جاتی ہے جر مرید ترقی کرتے جاتے ہیں' ان کو حسب مراتب حاجزادی' نور زادی' شہزادہ شہزادی' سراج' چراغ وغیرہ کے خطاب دیئے جاتے ہیں' خاص خاص اجازت یافتہ مرید وقتاً وقتاً ذکر کا حلقہ بھی قائم کرتے ہیں۔ یہ حلقے بھی انتہائی خفیہ طور پر قائم کئے جاتے ہیں۔

اس تحریک کا اسلام اور اسلامی تصوف کے ساتھ صرف اتنا تعلق ہے کہ اس میں بہت سی عربی اور فارسی کی اصطلاحات بڑی روانی سے استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً ذکر' اسم اعظم' پیر و مرشد' شیخ المشائخ' بیعت' مراد حاصل' دربار' ہجرت' ولادت' وصالت' تبروک' رحمت' فضل وغیرہ۔ اس ظاہری تعلق کے علاوہ اس تحریک کا اسلام اور اسلامی تصوف کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں' اسلام میں طریقت کے لیے لازم ہے کہ وہ شریعت کی پابند ہو اس لحاظ سے عنایت خاں کے مشن کو تصوف کا نام دینا ہی اس اصطلاح کا غلط استعمال ہے۔

ہالینڈ میں اس تحریک کے آخری مسلمان سربراہ صوفی عنایت خاں کے چھوٹے بھائی مشرف مولا میاں خاں تھے۔ ۱۹۶۳ء میں جب میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے ہیگ میں متعین تھا' تو مشرف خاں صاحب سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں' ان کی بیگم ایک ڈچ

خاتون تھیں' جن کو صوفی تحریک کی طرف سے "شہزادی" کا خطاب ملا ہوا تھا۔ وہ اپنے میاں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھیں اور ان کی زندگی میں ہی تحریک پر اپنا تسلط جما رہی تھیں۔

ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک روز صوفی مشرف خاں نے بڑے دکھ سے کہا کہ ان کی وفات کے بعد یہ تحریک مکمل طور پر یورپین لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور پھر رفتہ رفتہ اسلام کے ساتھ اس کا جو تھوڑا بہت اصطلاحی سا رابطہ ہے' وہ بھی ختم ہونا شروع ہو جائے گا۔ صوفی مشرف خاں کی وفات کو چند برس گزر چکے ہیں اور جس خدشہ کا انہوں نے اظہار کیا تھا وہ بھی آہستہ آہستہ اپنا رنگ لا رہا ہے۔

صوفی مشرف مولا میاں خاں بڑے سادہ طبیعت مرنجاں مرنج انسان تھے۔ ڈچ زبان روانی سے بولتے تھے۔ کسی قدر انگریزی سے بھی شناسا تھے۔ اردو بول تو لیتے تھے' لیکن پڑھنے میں دقت پیش آتی تھی۔ ایک روز میں ان کے ہاں بیٹھا تھا' تو انہوں نے کچھ "عارفانہ" کلام سنانے کی پیش کش کی۔ پیانو پر پہلے انہوں نے غالب کی اس غزل کے کچھ اشعار گائے:

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اس کے بعد انہوں نے اقبال کی یہ غزل سنائی:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

اس غزل کا ایک شعر ہے:

کھنچے خود بخود جانب طور موسیٰ
کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی

اس شعر کو گاتے وقت وہ "موسیٰ" کو لگاتار "موسی" ہی پڑھتے گئے۔ ان دو غزلوں کو وہ "عارفانہ کلام" غالباً اس وجہ سے سمجھتے تھے کہ ایک میں ابن مریم اور دوسرے میں موسیٰ کا نام آتا تھا۔

ڈچ مرید صوفی مشرف خاں کو "حضرت پیر و مرشد" کے القاب سے مخاطب کرتے تھے وہ خود بھی اپنے آپ کو مرشد مشرف خاں کے نام سے متعارف کراتے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنی تصنیف (Pages in the Life of a Sufi) مجھے تحفتہ" دی۔ اسے انہوں نے ایک انگریز خاتون مس مارگرٹ سکنر کے تعاون سے لکھا تھا۔ میری درخواست پر انہوں نے اس پر انگریزی میں جو آٹو گراف دیا وہ یہ تھا: (Murshid Musharaff Khan) ان کے مریدوں میں ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں میں وہ خاص طور پر ہر دلعزیز تھے۔ غالباً اسکی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ کسی مرید سے کسی بات پر کسی قسم کا اختلاف رائے نہ کرتے تھے! ان کا سر ہمیشہ اثبات میں ہلتا تھا۔ میں نے کبھی ان کا سر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں جانب ہلتے نہیں دیکھا! ان سب باتوں کے باوجود ہالینڈ کے وزیرخزانہ پروفیسر Wiueyeen پر ان کا بڑا اثر تھا اور وہ بہت سے ذاتی اور سیاسی معاملات میں استخارہ کروانے صوفی مشرف خاں کے پاس آیا کرتے تھے۔

ہٹلر کی شکست کے بعد فرانس کے صدر جنرل ڈیگال نے نورالنساء عنایت خاں کو بہادری کا ایک بہت بڑا اعزاز بعد ازموت عطا کیا۔ اس اعزاز کا نام یہ تھا:

(The Croix de Guerre with Gold Star)

اسی طرح برطانیہ کے بادشاہ نے بھی اسے بعد از موت "جارج کراس" کے بیش بہا سے نوازا۔

لڑکی نے کئی بار زیر لب گنگنایا اور پھر امریکن انداز میں اپنے شانے سکیڑ کر میری طرف یوں حیرت سے دیکھنے لگی جیسے میں نے اس سے کوئی عجیب و غریب سوال پوچھ لیا ہو۔

کچھ دیر اور گنگنانے اور کندھوں کو نیم بیضوی جنبشیں دینے کے بعد وہ بادل نخواستہ اٹھی اور مجھے اپنے ہوائی شعبے کے ماہر کے پاس لے گئی سعودی عرب کا نام سن کر ہوائی شعبے کے ماہر نے بھی مجھے کن انکھیوں سے گھورا اور پھر نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ مجھے بحری شعبے کے ماہر کے حوالے کر دیا۔ بحری شعبے والے نے مجھے بری شعبے میں بھیج دیا اور بری شعبے کا ماہر کچھ دیر اپنا سر کھجلانے کے بعد مجھے اپنے مینجر کے پاس لے گیا۔

سعودی عرب کا نام سن کر مینجر بھی کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پہلے اس نے اپنے میز کی دراز سے ایک ضخیم اٹلس نکال کر اس میں مشرق وسطیٰ کے نقشوں کا مطالعہ کیا۔ پھر اٹھ کر وہ سامنے دیوار پر لگے ہوئے چارٹ کا جائزہ لینے لگا' جس میں ساری دنیا کے ہوائی' بحری اور بری راستوں کے مفصل خاکے بنے ہوئے تھے۔ میں نے جدہ' مکہ اور مدینہ پر انگلی رکھ کر مینجر سے کہا کہ اگر میں ان تینوں شہروں میں سے کسی ایک جگہ بھی پہنچ جاؤں تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔

مینجر نے اپنی میز سے سرخ جھنڈیوں والے تین پن اٹھا کر ان مقامات پر نشاندہی کے طور پر لگا دیئے۔

دنیا میں مشرق سے مغرب اور شمال اور جنوب تک ہر قسم کے سفری راستوں کے بے شمار جال بچھے ہوئے تھے' لیکن اس زمانے میں یہ شاہراہیں بغداد اور تہران دمشق اور بیروت قاہرہ اور پورٹ سعید سے ہوتی ہوئیں سیدھی آگے یا پیچھے' دائیں یا بائیں ہو کر نکل جاتی تھیں اور ان کے درمیان حجاز کی مقدس سر زمین الگ تھلگ پڑی رہ جاتی تھی۔

کیونکہ اس وقت تک ابھی سعودی عرب میں دولت دنیا کی ریل پیل شروع نہیں ہوئی تھی' مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے نام مسلمانوں کے دل پر تو بے شک خوب نقش تھے۔

لیکن کسی بین الاقوامی سفری گائیڈ میں ان کا ذکر تک نہ آتا تھا---- حالانکہ ہر سال دنیا کے کونے کونے سے لاکھوں مسلمان قافلہ در قافلہ اس ارض مقدس کا سفر اختیار کرتے رہے ہیں---- پیدل' اونٹوں پر' موٹروں پر' ریلوں پر' کشتیوں میں' ہوائی جہازوں کے ذریعہ..... روئے زمین پر اور کوئی ایسا مقام نہیں جہاں اتنی رنگتوں اور نسلوں اور قومیتوں کے انسان بیک وقت اس قدر تعداد میں جمع ہوتے ہوں۔

"مجھے اپنی لاعلمی پر ندامت ہے۔" امریکن ایکسپریس کے مینجر نے نقشوں کا سرسری سا جائزہ ختم کر کے کہا۔ "لیکن اگر مجھے دو روز کا وقت دیں' تو شاید میں آپ کو اس سفر کے متعلق کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔"

دو روز کے بعد جب میں دوبارہ امریکن ایکسپریس کے دفتر میں گیا' تو مینجر کے سامنے بہت سے سفری گائیڈز کا انبار لگا ہوا تھا' لیکن اس ساری کاوش کا عملی نتیجہ فقط اس قدر تھا کہ یورپ کا یہ وسیع اور ماہر سفری ادارہ اس بات میں میری مدد کرنے سے قاصر تھا کہ میں قاہرہ یا بیروت یا بغداد سے جدہ یا مکہ یا مدینہ پہنچنے کے لیے سفر کا کون سا طریقہ اختیار کروں۔

"اس سلسلے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔" مینجر نے معذرتانہ انداز سے کہا۔ "ہاں' حج کے زمانہ میں کئی حکومتیں اپنے اپنے حاجیوں کے لیے ہوائی جہازوں' سمندری جہازوں اور خشکی کے قافلوں کا خاص انتظام کرتی ہیں۔ یہ انتظام ہر جگہ سرکاری طور پر ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی۔"

برسبیل تذکرہ مینجر نے مجھے ایک اور مشورہ بھی دیا۔ "جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے' میں سمجھتا ہوں کہ اس موسم میں سعودی عرب کا سفر صحت کے لیے خطرات سے خالی نہیں۔ گرمیوں میں وہاں کا درجہ حرارت ۱۲۵ ڈگری سے بھی اوپر پہنچ جاتا ہے۔ یوں بھی اس ملک میں حفظان صحت کا کوئی بندوبست نہیں۔ اگر کسی وجہ سے آپ اپنا ارادہ بدلنے والے ہوں' تو حسن اتفاق سے میرے پاس کیپری کی ایک بکنگ خالی ہے۔ کیپری سے تو آپ ضرور واقف ہوں گے" نیلے نیلے بحیرہ روم کے درمیان وہ خوشنما جزیرہ

جہاں چمکیلی دھوپ ہے۔ خوبصورت سیر گاہیں ہیں۔ اطالیہ کے انگوروں کی بہترین شراب ہے۔ مصر کا سابق شاہ فاروق ہے۔ دراصل کیپری آج کل دنیا بھر کے سیاحوں کا مکہ ہے اگر آپ زندگی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں' تو میری رائے میں کیپری ضرور جایئے۔"

میں نے مینجر کا شکریہ ادا کیا اور دل ہی دل میں یہ شعر گنگناتا ہوا وہاں سے اٹھ آیا۔

اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں

اس سفر کے متعلق بیروت' دمشق اور بغداد سے بھی سفارت خانوں' سفری ایجنسیوں اور مقامی دوستوں کی وساطت سے جو خبریں موصول ہوئیں' وہ بڑی مایوس کن تھیں۔ وہاں قاہرہ سے البتہ امید کی ایک مدھم سی کرن ضرور جھلملائی۔ مصر کی انقلابی حکومت نے اعلان کر رکھا تھا کہ حج سے ایک ماہ پہلے ہر تیسرے روز بحری اور ہوائی جہاز مصر سے حجاز جایا کریں گے۔ یہ جہاز مصری حاجیوں کے لیے مخصوص تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان جہازوں میں ایک پاکستانی مسافر کیلئے بھی جگہ نکل سکے گی یا نہیں۔ بہرحال یہ خبر اس لحاظ سے اطمینان بخش تھی کہ آخر ایک راہ تو ایسی نظر آئی جس کے لیے انسان کچھ دوڑ دھوپ کر سکتا ہے۔ باقی سب راہیں یا تو مسدود تھیں یا ان پر لاعلمی کے کہرابے چھائے ہوئے تھے۔

جب میں نے مصر والی خبر اپنے ایک لبنانی دوست مصطفیٰ الخیری کو سنائی تو اس نے مایوسانہ انداز سے سر ہلایا۔ "تم جا کر کوشش کر دیکھو۔ مجھے بالکل امید نہیں کہ تمہیں کامیابی ہو۔"

اور پھر امریکن ایکسپریس کے مینجر کی طرح مصطفیٰ الخیری نے بھی مجھے ایک مشورہ دیا۔ "اگر قاہرہ پہنچ کر بھی تم ناکام رہو' تو سیدھے بیروت چلے آنا' وہاں میرے بہت سے دوست احباب ہیں۔ وہ تمہیں خوب سیر کرائیں گے۔ بیروت مشرق وسطیٰ کا پیرس ہے۔

وہاں کے نائٹ کلب یورپ کی نشاط گاہوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آج کل سمیعہ جمال بھی وہاں آئی ہوئی ہے۔ وہ مصر کے سابق شاہ فاروق کی محبوب رقاصہ تھی۔"

مصر کے سابق شاہ فاروق کے ساتھ اب مجھے ایک قسم کی ذاتی رنجش پیدا ہونے لگی تھی۔

حجاز کے لیے میں جو راستہ بھی نکالتا تھا۔ اس پر وہ الف لیلیٰ کے جادوگر بادشاہوں کی طرح کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہو کے رہتا تھا۔ کیپری میں وہ بہ نفس نفیس موجود تھا۔ بیروت میں اس کی محبوب رقاصہ تھی۔

برسلز، پیرس، جنیوا، برن، لوزان، لوگانو، میلان، فلورنس، وینس، روم------ روم میں اشفاق احمد وہاں کی یونیورسٹی میں اردو پڑھاتا تھا اور ریڈیو روم میں اردو کا پروگرام بھی کرتا تھا۔ جس وقت میں روم پہنچا، ان دنوں ریڈیو روم میں اشفاق احمد کی جواب طلبی ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں ہندوستان کا ایک جنگی بیڑا یورپ کی کچھ بندرگاہوں کا خیر سگالی دورہ کر رہا تھا۔ ریڈیو کے اردو پروگرام میں اس دورے کی خبر کو نشر کرتے وقت اشفاق احمد جنگی بیڑے کو ہندوستان کا جنگی بٹیرا کہہ دیتا تھا اور پھر معافی مانگ کر صحیح تلفظ ادا کرتا تھا اس پر ہندوستانی سفارت خانہ نے بڑا شور مچایا کہ یہ شخص جنگی بیڑے کو جان بوجھ کر جنگی بٹیرا کہہ کر بھارت ماتا کی توہین کر رہا ہے۔ اب اشفاق احمد اردو املا میں بیڑے اور بٹیرے کی باہمی مماثلت اجاگر کر کے اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ پروفیسر الیگزنڈر باؤسانی اس مقدمے میں اس کی مدد فرما رہے تھے۔

روم میں ایک کئی منزلہ عمارت میں اشفاق احمد کے پاس ایک کمرہ تھا۔ اس نے میرا سوٹ کیس اپنے کمرے میں رکھتے ہی پوچھا۔ "لسی پیو گے؟"

روم میں لسی؟ نیکی میں پوچھ پوچھ کیا۔ میں نے فوراً حامی بھر لی۔ اشفاق مجھے بازار میں ایک اطالوی کی دکان پر لے گیا جو دودھ، دہی، مکھن، کریم اور پنیر بیچتا تھا۔ اس نے دکان میں داخل ہوتے ہی دکاندار کو "چاچا" کہہ کر پنجابی کی ایک فحش گالی دی۔ دکاندار [illegible]

اشفاق احمد نے میرا تعارف کرایا۔ دکاندار نے پنجابی زبان میں چند گالیاں دے کر میرے ساتھ اپنی خیر سگالی کا اظہار کیا اور ہمیں نہایت لذیذ نمکین لسی بنا کر پلائی۔

ان دنوں اشفاق کے پاس ایک سکوٹر ہوتا تھا۔ اس پر بٹھا کر اس نے مجھے روم دکھانے کا پروگرام بنایا۔ ہم تھوڑی سی دور ہی گئے تھے کہ اشفاق نے پوچھا۔ "ہمیں سکوٹر پر بیٹھ کر روانہ ہوئے تین منٹ ہو گئے؟"

"ہاں' ہو گئے" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ ہم خیریت سے ہیں۔" اشفاق نے کہا۔" روم کی سڑکوں پر ہر تین منٹ میں ٹریفک کا ایک حادثہ ہوتا ہے۔"

نصف گھنٹہ کے بعد اشفاق نے پھر مجھے کلمہ شکر پڑھنے کی تلقین کی' کیونکہ روم میں ہر تیس منٹ کے بعد جو حادثہ ہوتا تھا وہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔ یوں بھی سکوٹر چلاتے چلاتے ہاتھ چھوڑ کر جس طرح اشفاق احمد مجھے روم کے قابل دید مقامات کی زیارت کرا رہا تھا' اس سے یہ امر یقینی تھا کہ ہم کسی وقت بھی ٹریفک کے حادثات کے اعداد و شمار میں اضافے کا باعث بن جائیں گے۔ چنانچہ میں نے سکوٹر پر مزید سیر کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بسوں پر بیٹھنا بھی دشوار تھا' کیونکہ اشفاق کو بسوں کے حادثات کی تفصیل بھی بخوبی ازبر تھی۔ اس لیے ہم نے رومتہ الکبریٰ کی سیاحت زیادہ تر پاپیادہ کی۔ کئی روز متواتر پیدل جوتیاں چٹخاتے چٹخاتے میرے بوٹوں کا اکلوتا جوڑا دم توڑ گیا۔ نیا جوتا خریدنے میں اشفاق نے میری رہنمائی کی۔ جوتوں کی دکان میں جا کر میں نے جو پہلا جوڑا ٹرائی کیا۔ وہ فٹ تھا۔ میں نے اسے خریدنے کی ٹھانی' تو اشفاق احمد نے ڈانٹا کہ روم میں جوتا خریدنے کے یہ آداب نہیں ہیں۔ یہاں پر آٹھ دس جوتے ٹرائی کر لو' اس کے بعد دوسری جگہ چلیں گے۔ بڑی مشکل سے تیسری دکان میں جا کر کوئی پندرھواں جوڑا اشفاق کی نظر میں جچ گیا۔ وہ بڑی دیر تک دکاندار کے ساتھ اطالوی زبان میں اس جوتے کے محاسن پر گفتگو کرتا رہا۔ کسی بات پر تاؤ کھا کر دکاندار نے جوتے کا جوڑا تہہ در تہہ مروڑ کر میری پتلون کی جیب میں ڈال دیا۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ

یہ جوتا بے حد نازک' سبک اور لچکدار ہے' اشفاق نے بھی میری جیب پر ہاتھ پھیر کر تصدیق کی کہ جیب میں جوتا نہیں بلکہ رومال پڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کچھ مزید مول تول کے بعد اشفاق نے اپنے پاس سے ساڑھے تین ہزار لیرے ادا کئے اور یہ جوتا خرید کر مجھے بطور تحفہ دے دیا۔ اس مہم کے بعد میں نے اشفاق کو الوداع کہا اور اپنا نیا جوتا پہن کر نیپلز کو روانہ ہو گیا۔

نیپلز پہنچ کر میں نے اپنا سامان ہوٹل میں رکھا اور پہلی ٹرین پکڑ کر پومپیائی کا شہر دیکھنے چل پڑا۔ اتوار کا دن تھا۔ پومپیائی کے کھنڈرات میں سیاحوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ صدیوں پہلے اس شہر کے باشندوں نے حیوانی' شہوانی اور نفسانی عیش و نشاط کو جو فروغ دیا تھا اس کے آثار ملاحظہ کر کے عبرت تو کسی آنکھ میں نظر نہ آئی' البتہ حسرت کا غبار بہت سے چہروں پر چھایا ہوا تھا۔ قدم قدم پر مشتبہ شکل و صورت کے دلال جیبوں میں ہاتھ ڈالے چیلوں کی طرح منڈلا رہے تھے اور فحش تصاویر کے البم بیچنے میں مصروف تھے جن میں پومپیائی کی لذت پرستی کے عجیب و غریب مرقع جمع تھے۔ قریب ہی ماؤنٹ ویسووی اس کا جوالا مکھی پہاڑ بجھے ہوئے آتش فشانی مادے میں لپٹا ہوا کھڑا تھا۔ وقتاً فوقتاً اس کی چوٹی کا آتش فشانی دہانہ بھڑک بھڑک کر پومپیائی کے انجام کی یاد دہانی کراتا تھا لیکن سیاحوں کا جھمگھٹا عقوبت کے اس اشارے سے بے نیاز ان کھنڈروں میں دبی ہوئی جنسی بے راہروی کی لذت میں سرتاپا ڈوبا ہوا تھا۔ پومپیائی کی پتھریلی سڑکوں اور گلی کوچوں میں گھومتے گھومتے یکایک میرے نئے اطالوی جوتے کے دونوں تلے اکھڑ کر الگ ہو گئے۔ میں نے یہ نازک اور لچکدار جوتے مروڑ کر رومال کی طرح جیب میں ڈال لیے اور اس عبرت کدہ کی باقی یاترا ننگے پاؤں کی۔

شام کو نیپلز واپس پہنچا تو ہوٹل کے ڈائننگ روم میں ایک اور مشکل پیش آئی۔ جو ویٹرس میری میز پر مامور تھی وہ انگریزی زبان سے قطعی ناآشنا تھی۔ کھانے کا مینو اطالوی زبان میں چھپا ہوا تھا اور میری سمجھ سے بالکل بالاتر تھا۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ کھانے کے انتخاب کے متعلق کسی طرح اس پر اپنا مفہوم واضح کر سکوں۔ لیکن وہ ہر بار اپنی

گردن مٹکا کر اور شانے اچکا کر مسکرا دیتی تھی۔ میری کسمپرسی کو بھانپ کر قریب والی میز سے ایک نوجوان اٹھ کر آیا اور نہایت شستہ انگریزی میں بولا۔ "کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

"شکریہ" میں نے کہا۔ "میں ویٹرس کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ میرے لیے گوشت اور شراب نہ لائے۔ اگر مچھلی یا انڈے موجود ہوں' تو وہ لے آئے' لیکن وہ سور کی چربی میں تلے ہوئے نہ ہوں۔"

ویٹرس آرڈر لے کر چلی گئی تو نوجوان نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا آپ ہندوستان کے رہنے والے ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں پاکستانی ہوں۔"

"الحمد اللہ۔" نوجوان نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میں شام کا رہنے والا ہوں آیئے آپ ہماری میز پر آ جایئے۔ میں آپ کو اپنی منگیتر سے ملاؤں گا۔ ہم دونوں کو پاکستان سے بڑی دلچسپی ہے۔"

اپنی میز پر پہنچ کر وہ شامی نوجوان خالص مغربی انداز سے تعارف کی رسوم ادا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ "میرا نام رشید مومن ہے۔ یہ میری منگیتر نزہمہ ہے۔ ہم دونوں دمشق کے رہنے والے ہیں۔ روم میں فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آجکل نیپلز آئے ہوئے ہیں کیونکہ داناؤں نے کہا ہے:

See Naples and then die

پھر اس نے نزہمہ سے میرا تعارف کرایا۔ "آپ پاکستانی ہیں۔ الحمد اللہ ہمیں پاکستان سے بڑی محبت ہے۔ ہے نا نزہمہ؟ آپ گوشت نہیں کھاتے۔ شراب نہیں پیتے۔ غالباً سگریٹ سے بھی پرہیز ہو گا۔ انڈے اور مچھلی سے بھی بھاگتے ہیں' اگر وہ چربی میں تلے ہوئے ہوں تو۔ معلوم نہیں نزہمہ' ایسے لوگ یورپ آ کر کیا کرتے ہیں؟" رشید مومن نے طنزیہ ہنس کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔" نزہمہ نے اخلاقاً کہا۔

"جی ہاں' چھوٹی کمزوریاں تو نہیں ہیں۔" میں نے بھی مذاقاً جواب دیا۔

رشید مومن نے زور کا قہقہہ لگایا۔ نزہہ کچھ جھینپ سی گئی۔

"واللہ' نزہہ' جب تم شرماتی ہو تو تمہارا چہرہ اس گلاس کی طرح عنابی ہو جاتا ہے۔" رشید مومن نے ریڈ وائن کا گلاس اٹھا کر کہا۔ پھر انہوں نے اپنے گلاس بلند کیے اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ میرا جام صحت نوش کیا۔

کچھ دیر طرح طرح کی پرلطف باتیں ہوتی ہیں۔ رشید مومن کی باتوں میں نہایت سلجھا ہوا مزاح تھا۔ نزہہ کے خلوص کی سادگی بڑی دلاویز تھی۔ رفتہ رفتہ گفتگو کا رخ میرے سفر حجاز کی طرف پھر گیا۔ اگرچہ اس وقت تک رشید مومن اور نزہہ سرخ اطالوی شراب کی تین بوتلیں ختم کر چکے تھے اور ان کی آنکھوں میں سرور کی ایک لطیف سی غنودگی بھی اتر آئی تھی۔ لیکن حجاز کا ذکر آتے ہی وہ دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"آپ حجاز جا رہے ہیں؟ آپ بڑے خوش نصیب ہیں۔ واللہ آپ بہت ہی خوش نصیب ہیں۔" نزہہ نے بڑے جوش سے کہا۔ اب اس کی آنکھوں میں عقیدت کی ایک ایسی چمک' ایک ایسا کیف چھلک آیا تھا جو سرخ اطالوی شراب کے نشے سے کہیں زیادہ گہرا اور خوشنما تھا۔

"آپ نزہہ کی باتوں میں نہ آئیں۔" رشید مومن نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ "سب جوان لڑکیاں وہمی اور زود اعتقاد ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ حجاز پہنچ کر آپ بہت پشیمان ہوں گے۔"

"خدا کے لیے رشید ایسی باتیں نہ کرو۔" نزہہ نے احتجاج کیا۔ "اگر تم ایسی باتیں کرو گے تو میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گی۔ خدا کی قسم' کبھی معاف نہ کروں گی۔"

"میرا تجربہ ہے کہ نزہہ کا غصہ ہمیشہ عارضی ہوتا ہے۔" رشید مومن نے لاپروائی سے کہا "میں اس کی وقتی خفگی گوارا کر لوں گا' لیکن حجاز کے متعلق اپنے دوست کو کسی قسم کی لاعلمی میں مبتلا نہ رہنے دوں گا۔"

ہوٹل ٹرمینس کے ڈرائینگ روم مین بیٹھے بیٹھے اب رشید مومن کے تن بدن میں ان مغربی

مستشرقین کی روح حلول کر آئی تھی جنھوں نے حج اور اسلام کے متعلق گمراہ کن کتابیں لکھ لکھ کر اپنے زہریلے تعصبات کو علم و دانش کا لباس پہنا رکھا ہے۔ رشید مومن کا ذہن بھی اس علم کے زیور سے پوری طرح آراستہ تھا۔ اس نے یہ غلیظ مواد ایک متعفن قے کی طرح ہمارے سامنے میز پر انڈیلنا شروع کر دیا۔ ریڈ وائن کی ترنگ میں وہ بڑے جوش و خروش سے اپنی خرافات بکتا رہا اور نزہہ اس کے سامنے ایک زخم خوردہ ناگن کی طرح بیٹھی بل کھاتی رہی۔ وہ بار بار اپنے گلاس کو غصے سے چھلکاتی تھی۔ کبھی بوتلوں کو اٹھا اٹھا کر زور سے میز پر مارتی تھی کبھی نیپکن کو اپنی کلائی کے گرد یوں بھینچ کر لپیٹتی تھی کہ اس کی سڈول بانہوں میں خون کی رگیں ابھر کر بڑی حدت سے کپکپانے لگتی تھیں۔ نزہہ کی آنکھوں سے ڈر لگتا تھا کہ شاید ابھی ان سے آگے کے دو شعلے لپک پڑیں گے۔ اس کے چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اس کے ذہن سے زہر کے فوارے پھوٹ کر بہنے لگیں گے۔ ہماری میز پر بڑا شدید تناؤ چھا رہا تھا۔ گفتگو کا رخ بدلنے کے لیے میں نے آرکسٹرا کی تعریف شروع کر دی جو ایک نئے ڈانس کی سریلی دھنیں بجا رہا تھا۔

"بے شک آرکسٹرا بڑی حسین موسیقی بجا رہا ہے۔" رشید مومن نے گویا چونک کر کہا۔ "تم دونوں یہاں بیٹھ کر دین کی باتیں کرو۔ میں اس اطالوی لڑکی کے ساتھ ناچنا چاہتا ہوں جو بے چاری بہت دیر سے تنہا بیٹھی ہے۔"

رشید مومن نہایت بھدے پن سے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ایک دوسری میز پر چلا گیا' جہاں ایک خوبصورت اور آراستہ لڑکی لائم جوس سے جی بہلا رہی تھی۔ اس نے رشید مومن کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور کچھ دیر بعد لائم جوس چھوڑ کر وہ شمپین پینے میں مشغول ہو گئے۔

رشید مومن دیر تک اس لڑکی کے ساتھ ڈانس کرتا رہا۔ نزہہ اپنی کرسی پر بت بنی بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب حسرت' ایک عمیق غصہ اور ایک شدید انتقام چھلک رہا تھا۔ وہ بار بار کچھ بولنا چاہتی تھی' لیکن اس کے ہونٹ کپکپا کر' کچکچا کر رہ جاتے

تھے۔

آدھی رات گئے جب ہوٹل ٹرمینس کا بال روم بند ہونے لگا تو رشید مومن اطالوی لڑکی کے بازو میں بازو ڈالے ہمارے پاس آیا۔ دونوں نشے میں دھت تھے۔

"یہ کیا واہیاتی ہے" رشید مومن ناراض ہونے لگا۔ "ابھی رات شروع بھی نہیں ہوئی اور یہ کم بخت ہوٹل والے ڈانس بند کر رہے ہیں۔ چلو ہم سب کاسینو چلیں۔ وہ صبح تک کھلا رہتا ہے۔"

"میں بہت تھک گئی ہوں۔ تم خوشی سے جاؤ۔" نزہہ نے بیزاری سے کہا۔

"بہت اچھا۔ شب بخیر۔ مجھے امید ہے کہ ہمارا پاکستانی بھائی بدستور تمہارا دل بہلاتا رہے گا۔ خدا کی قسم' پاکستانی بڑے اچھے لوگ ہیں۔ شراب نہیں پیتے۔ سور نہیں کھاتے۔ گرمیوں کے موسم میں حج پر جاتے ہیں اور نزہہ جیسی خوبصورت لڑکیوں کا جی بہلاتے ہیں...... ہاہاہا......ہاہاہا......" رشید مومن پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا' جھومتا' لڑکھڑاتا ہوا اطالوی لڑکی کے ساتھ باہر چلا گیا۔

کچھ دیر نزہہ میز پر کہنیاں ٹیکے دم بخود بیٹھی رہی۔ اس کا سر اس کی ہتھیلیوں کے درمیان جھکا ہوا تھا۔ مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ اگر اب اس نے رونا شروع کر دیا' تو میں کیا کروں گا؟ ہر لحہ مجھے ڈر لگتا تھا کہ میز پر پڑے ہوئے مینو کارڈ پر اچانک ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگیں گے اور میں دل ہی دل میں ان الفاظ اور فقروں کی تلاش کر رہا تھا' جو ایسے نازک موقعوں پر لڑکیوں کی دلجوئی کے لیے استعمال ہوا کرتے ہیں' لیکن خدا کا شکر ہے کہ نزہہ نے مجھے اس آزمائش سے بال بال بچا لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے اپنی ہتھیلیوں سے سر اٹھایا' تو اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں------ سوکھی ہوئی ٹہنیوں کی طرح جو چنگاری دیکھتے ہی بھک سے شعلہ پکڑ لیتی ہیں۔ اس کا چہرہ تھکن آلود تھا اور اس نے نیم غنودگی کے عالم میں کہا۔ "آؤ ہم بھی کسی دوسرے نائٹ کلب میں چل کے بیٹھیں۔ یہاں پر مجھے سخت وحشت ہو رہی ہے۔"

"آپ بہت تھک گئی ہیں۔" میں نے کہا۔" آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں

تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

"نہیں۔ میں اپنے کمرے میں ہرگز نہ جاؤں گی۔ اس وقت اگر میں اکیلی رہ گئی' تو رو رو کر میرا برا حال ہو جائے گا۔"

"آپ اکیلی نہیں ہوں گی۔" میں نے کہا۔ "جب تک آپ کو نیند نہ آ جائے میں آپ کے پاس بیٹھوں گا۔"

نزہمہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی' "ہمارے ملک میں ایک کہاوت ہے کہ اگر مرد اور عورت کسی جگہ اکیلے رہ جائیں' تو ان کے ساتھ تیسرا ساتھی شیطان ہو جاتا ہے۔"

"شیطان کے ساتھ میرے بھی دیرینہ مراسم ہیں۔" میں نے مذاقاً کہا۔ "لیکن اب میں نے اس کے داؤ پیچ سے بچنا سیکھ لیا ہے۔"

نزہمہ ہنسنے لگی۔ اوپر جانے کے لیے جب ہم لفٹ میں سوار ہوئے تو نزہمہ کے ساتھ رشید مومن کی جگہ ایک اجنبی کو دیکھ کر لفٹ بوائے عجیب انداز سے مسکرایا۔

"آپ کی شب خوش بسر ہو۔" لفٹ بوائے نے شرارت سے ایک آنکھ میچ کر کہا۔

"شکریہ۔" میں نے اسے ایک سولیرا کا ٹپ دیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر نزہمہ کہنے لگی۔ "اب اگر میں ساری عمر ایک فرشتہ بن کے رہوں پھر بھی لفٹ بوائے کی نظر میں تو وہی رہوں گی جو اس نے مجھے اس وقت سمجھا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "انسان غلط فہمیوں کا پتلا ہی تو ہے۔"

"ہمارے ملک میں اسے گناہ بے لذت کہتے ہیں۔" نزہمہ کہنے لگی۔

"گناہ کا امکان گناہ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بری بات ہو جائے تو وہ ماضی کا ایک واقعہ بن جاتا ہے' جس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے اور آئندہ اس سے بچ کر رہنا بھی انسان کے اپنے اختیار میں ہے' لیکن بری بات کا امکان خون میں رچے ہوئے زہر کی طرح ہر وقت رگ و پے میں گردش کرتا رہتا ہے۔"

نزہمہ نے بستر سے کمبل اٹھا کر اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور صوفے کی بڑی کرسی پر تکیہ

لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ "یہ عجیب بات ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی فریب سے آلودہ ہوتا ہے۔ کبھی ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ کبھی دوسرے ہمارے متعلق دھوکا کھانے لگتے ہیں۔"

نزہمہ اب اچھے موڈ میں تھی۔ اس نے سگریٹ سلگا کر اپنا سگریٹ لائٹر مجھے دیا۔ "اس سگریٹ لائیٹر کو دیکھو۔ اس پر بڑی خوبصورتی سے لاالٰہ الا اللہ محمد رسوال اللہ نقش کیا ہوا ہے۔ امریکن کمپنیاں یہ لائیٹر خاص طور پر اسلامی ممالک کے لیے بنا کر بھیجتی ہیں۔"

"پہلے کلمہ طیبہ سے ایمان کی شمع روشن ہوتی تھی۔ اب اس کی مدد سے سگریٹ سلگائے جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

نزہمہ ہنسنے لگی۔ اب وہ لفٹ بوائے مجھے جو جی چاہے سمجھے' لیکن دمشق میں میری بزرگ ماں کسی اور ہی خیال میں مسرور ہو گی۔ شاید اس وقت وہ میرے لیے دعا مانگ رہی ہو۔ شاید وہ سوچ رہی ہو کہ میں اب بھی اسی پابندی سے نماز اور قرآن پڑھتی ہوں۔ جس طرح اپنے گھر میں پڑھا کرتی تھی۔"

نزہمہ نے کروٹ لے کر اپنا اٹیچی کیس کھولا' جو صوفے کے قریب ایک تپائی پر پڑا تھا۔ اور اس میں سے ریشمی غلاف میں لپٹا ہوا چھوٹی تقطیع کا قرآن مجید نکالا۔

"جب میں یورپ آ رہی تھی' تو میری ماں نے مجھے یہ تحفہ دیا تھا۔ سال بھر سے میں نے اسے ایک بار بھی کھول کر نہیں دیکھا' لیکن میں جہاں کہیں جاتی ہوں اسے اپنے ساتھ ضرور رکھتی ہوں۔"

"یہ بھی آپ کی عین سعادت مندی ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے یہ وہم سا ہو گیا ہے کہ اگر قرآن مجید کی یہ جلد مجھ سے جدا ہو گئی تو شاید میری پیاری ماں کو کچھ ہو جائے گا۔"

"دنیا کی الہامی کتابوں میں قرآن شریف بڑا مظلوم صحیفہ ہے۔" میں نے جان بوجھ کر طنز سے کہا۔ "کچھ لوگ اسے تعویذ بنا کر گلے میں یا بازوؤں پر باندھتے ہیں۔ بعض لوگ پاکٹ سائز کے قرآن جیبوں میں رکھتے ہیں۔ یوں بھی ہر مسلمان گھرانے میں ایک

دو قرآن خوبصورت غلافوں میں لپیٹ کر ضرور رکھے جاتے ہیں خواہ وہ طاق نسیاں کی زینت ہی کیوں نہ ہوں آپ نے بھی ایک جلد اٹیچی کیس میں بند کر کے رکھ چھوڑی ہے‘

تو یہ رسم زمانہ کے عین مطابق ہے۔"

اب نزہبہ کا موڈ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور مجھے تسبیحوں کے قصے سنانے لگی۔ کس طرح مشرق وسطیٰ میں کچھ لوگ اپنے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح لیے پھرتے ہیں۔ بعض عادتاً‘ بعض فیشن کے طور پر‘ بعض محض اعصاب کی آسودگی کے لیے۔

کچھ دیر کے لیے جب میں رخصت ہونے لگا‘ تو نزہبہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی‘ پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ میرے لیے ایک تکلیف گوارا فرمائیں گے؟"

"بسروچشم۔" میں نے جواب دیا۔

نزہبہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ "جب آپ خانہ کعبہ کی زیارت کریں‘ تو وہاں پر فقط ایک بار میرا نام لے دیں۔"

"یہ تو بڑی آسان فرمائش ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں پر میں آپ کے لیے دعا بھی ضرور مانگوں گا۔"

"آپ ایک بار بس میرا نام ہی لے دیں۔ اس سے زیادہ مجھے کوئی اور حق بھی تو نہیں۔" نزہبہ نے اس نمی کو چھپانے کی ناکام سی کوشش کی جو معاً اس کی خوبصورت آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

"میں ضرور آپ کی فرمائش پوری کروں گا۔ ایک بار نہیں‘ کئی بار‘ اور جب میں روضہ اقدس پر حاضر ہوں گا‘ تو آپ کا سلام بھی ضرور عرض کروں گا۔"

روضہ اقدس کے ذکر پر نزہبہ نے جلدی سے اپنے گلے کا ریشمی سکارف اتار کر اس سے سر ڈھانپ لیا۔ پھر کچھ کہنا چاہا‘ لیکن ہچکچا کر خاموش ہو گئی۔

لفٹ بوائے لفٹ سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی ٹوپی درست

کی' اور کن انکھیوں سے گھور کر مسکرایا' میں نے پھر اسے ایک سو لیرا کا ٹپ دیا۔ کچھ دیر بعد جب رشید مومن واپس آئے گا' تو اسے دیکھ کر یہ لفٹ بوائے ایک بار پھر کن انکھوں سے گھور کر مسکرائے گا۔ شاید رشید مومن بھی اسے ایک سو لیرا کا ٹپ دے۔

اور میں آج تک احساس کے اس گداز پر رشک کرتا ہوں جو نزہمہ کے مقدر میں اسے نصیب تھا۔ نزہمہ جو ریڈ وائن پی کر بھی رشید مومن سے روٹھ جاتی ہے' کیونکہ وہ حج کے متعلق بے سروپا باتیں کرتا ہے۔ نزہمہ جو اب قرآن نہیں پڑھتی' لیکن اپنی ماں کا تحفہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ نزہمہ جس کے نزدیک خدا کے گھر پر اس کا صرف اتنا حق ہے کہ ایک اجنبی فقط ایک بار اس کا نام وہاں لے دے۔ نزہمہ جو روضہ اقدس کے نام پر اپنے سکارف سے اپنا سر ڈھانپ لیتی ہے۔ نزہمہ جو اپنا سلام وہاں پیش کرنے سے بری طرح ہچکچاتی ہے۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم نا گزیر
از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

نیپلز کی بندرگاہ سے ایس۔ ایس۔ اینوترا نے لنگر اٹھایا تو جہاز میں بڑی چہل پہل تھی۔ یہ سیاحی جہاز تھا جو اپنے مسافروں کو بحیرہ روم کی گشت کراتا ہوا کیپری' بیروت اور اسکندریہ کی سیر کرانے نکلا تھا۔ مسافروں میں زیادہ تعداد تماش بین سیاحوں کی تھی۔ کچھ عرب طلباء تھے جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے وطن واپس جا رہے تھے۔ چار عیسائی پادری تھے جو لمبے لمبے لبادے پہنے مسیحت کی تبلیغ کے لیے مصر جا رہے تھے۔ آٹھ فرانسیسی نرسیں تھیں جو بیروت کے کسی مشنری

ہسپتال میں ڈیوٹی پر حاضر ہو رہی تھیں۔

کیپری میں مصر کا سابق شاہ فاروق تو ہمیں کہیں نظر نہ آیا' البتہ جوالا مکھی پہاڑ اسٹرمبولی کے دہانے سے آتش فشاں شعلوں کو بھڑک بھڑک کر بلند ہوتے کئی بار دیکھا۔ کیپری کا جزیرہ مسیحی پادریوں کو خاص طور پر راس آیا۔ فرانسیسی نرسوں پر قبضہ جما کے وہ کئی گھنٹوں کے لیے غائب ہو گئے اور جب جہاز میں واپس آئے تو سب کے چہروں پر ساغر و مینا کی کرامات تھی اور ہاتھوں میں اطالوی شراب کی دو دو صراحیاں تھیں۔

ایس۔ ایس۔ اینوترا بڑی مست خرامی سے چلا جا رہا تھا۔ بحر روم غیر معمولی حد تک پرسکون تھا۔ سورج کی کرنوں میں اس کی شفاف نیلگوں لہریں زرکار شامیانوں کی طرح جھلملاتی تھیں۔ خوش قسمتی سے ان دنوں چاندنی بھی پورے شباب پر تھی۔ رات کے سناٹے میں رہ رہ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی طلسماتی سفینہ پر بیٹھے ایک ایسی دنیا میں سفر کر رہے ہیں جس کی فضا احساس سے بھی زیادہ نازک اور خیال سے بھی زیادہ رنگین ہے۔ سکوت شب میں انجن کی دھیمی دھیمی مسلسل بھک بھک' جہاز کے قدموں میں بچھ بچھ کر ابھرنے والی موجوں کے جل تھل ساز' آسمان پر تاروں کے جگمگاتے ہوئے ہیرے اور جواہرات' چاندنی میں دھلی ہوئی بھیگی بھیگی فضا' لہروں کے زیروبم میں مہتابی کرنوں کے پیچ و خم' جیسے نیلم کی کان میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں------ جوں جوں رات جوان ہوتی جاتی تھی ماحول کی اس خوبصورتی پر ایک عجب دیوانگی' ایک شدید جنون پھیلنے لگتا تھا' جیسے انسان کے دل پر غم اترتا ہے۔ ارض و سما کے درمیان ایک بے آواز سسکی لرزنے لگتی تھی اور چاروں طرف پھیلا ہوا بے پایاں سمندر ایک آنسو کا نگینہ بن جاتا تھا۔

موٹے موٹے شیشوں کی عینک والی ایک آرٹسٹ نما لڑکی جو نیپلز سے ہمارے ساتھ سوار ہوئی تھی۔ دن کا بیشتر حصہ اپنے کیبن کے اندر گزارا کرتی تھی' لیکن ڈنر کے بعد وہ اپنا کمبل اٹھا کر ڈیک پر آ جاتی تھی۔ کبھی وہ کمبل لپیٹ کر آرام کرسی پر دراز ہو جاتی تھی۔ کبھی ڈیک کے جنگلے پر جھک کے لٹک جاتی تھی۔ کبھی بے چینی سے ادھر

ادھر گھومنے لگتی تھی...... صبح کے وقت جب وہ ڈائننگ روم میں ناشتہ کی میز پر نظر آتی' تو مجھے ایک گونہ خوشی کا احساس ہوتا کیونکہ مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ شاید کل رات اس نے چاندنی کے سمندر میں چھلانگ لگا دی ہو۔

تیسرے روز صبح سویرے بیروت کا ساحل نظر آنے لگا۔ عرب طالب علم دوڑ دوڑ کر سب سے اوپر والے عرشہ پر چڑھ گئے اور بڑی خوش الحانی سے اپنے اپنے قومی ترانے گانے لگے۔ فرانسیسی نرسوں کو خاص طور پر یہ گیت بہت پسند آئے' لیکن مسیحی پادریوں نے انہیں ان نوجوانوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے بڑی ہنر مندی سے باز رکھا۔

جب جہاز بندرگاہ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے جو چیز نظر آئی' وہ بہت سے لوگوں کا ہجوم تھا جو ساحل پر کھڑے زور زور سے چیخ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں اور گردنوں کے خشمگیں اشارے بھی برابر ان کی آواز کا ساتھ دے رہے تھے۔ دور سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساحل پربلوہ ہو رہا ہے۔ جب ہم نزدیک پہنچے تو گمان گزرا کہ شاید وہ لوگ جہاز والوں کو غصے سے گالیاں دے رہے ہیں۔ لیکن کچھ دیر یہ راز کھلا کہ دراصل یہ لوگ بندرگاہ کے قلی ہیں۔ اور یہاں اترنے والے مسافروں کو اپنی اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔ ساحل پر جا بجا سرخ سرخ ٹوپیاں نظر آتی تھیں جن کے کناروں پر تیل کی چکنائی اور تہہ در تہہ جمی ہوئی گرد خاص طور پر نمایاں تھی۔ یوں شور و غل' ریل پیل' دھکم دھکا کافی عام تھے اور اس وحشت کو دیکھ کر بے اختیار گھر یاد آتا تھا۔ پولیس کے سپاہی غیر معمولی طور پر موٹے تھے اور اس گرمی میں اپنی وردیوں سے بیزار نظر آتے تھے۔ یہ سپاہی زیادہ تر ٹھیلوں یا کھمبوں کا سہارا لیے اونگھ رہے تھے اور جب ان کی آنکھ کھلتی تھی تو وہ کسی کو دھکا دے کر' کسی کو زور سے ڈانٹ ڈپٹ کر اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہو جاتے تھے۔

فرانسیسی نرسوں کی منزل آ گئی تھی اور وہ اپنا سامان اتروا کر اب مسیحی پادریوں سے رخصت ہو رہی تھیں۔ پادریوں نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں دیر تک سہلایا

اور پھر انھوں نے بڑی بے صبری سے نرسوں کے چٹاخ چٹاخ الوداعی بوسے لیے۔ ان کی حسرت بھری نگاہیں دور تک نرسوں کا پیچھا کرتی رہیں جو ساحل پر پہنچتے ہی اپنے چہروں کا میک از سر نو درست کرنے میں مشغول ہو گئی تھیں۔ بوسے روحانی ہوں یا نفسانی' عورتوں کے پاؤڈر اور لپ اسٹک پر ان کا اثر ایک ہی سا ہوتا ہے۔

یہاں پر جہاز نے چند گھنٹے رکنا تھا۔ بیروت کا شہر دکھانے کے لیے ایک ٹورسٹ ایجنسی نے بہت سی ٹیکسیوں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ جیسی شاندار ٹیکسیاں یہاں نظر آئیں۔ ویسی موٹر کاریں یورپ کے بڑے بڑے شہروں کو بھی کم ہی نصیب ہوتی ہونگی۔ فورڈ' شیورلے اور بیوک کے ماڈل عام تھے کہیں کہیں کیڈی لک کاریں بھی ٹیکسیوں کے طور پر چلتی نظر آتی تھیں۔ یوں بھی بیروت کے چہرے مہرے پر کئی طرح کا بین الاقوامی رنگ و روغن چڑھا ہوا ہے۔ زبان اور آداب میں یہ شہر فرانسیسی ہے۔ موٹروں کے ماڈل' بش شرٹوں کے ڈیزائن' اور یونیورسٹی ڈگریوں کے لحاظ سے یہ شہر امریکن ہے۔ ہوٹلوں کے کاروبار اور پرفضا پہاڑی مقامات کی نسبت سے نہ صرف بیروت بلکہ سارا لبنان مشرق وسطیٰ کا سوئٹزرلینڈ ہے اور جیسا کہ میرے لبنانی دوست مصطفیٰ الخیری نے مجھے ہالینڈ میں بتایا تھا' بیروت کی نشاط گاہوں اور نائٹ کلبوں کو پیرس کی ہمسری کا بھی بجا طور پر دعویٰ ہے۔ چنانچہ بہت سے عرب شہزادے جو اپنے ملک یا اپنے محلات میں شراب پینے سے معذور ہیں۔ اپنے پرائیویٹ ہوائی جہازوں میں جوق در جوق یہاں آتے ہیں اور راتوں رات دادعیش دے کر صبح سویرے اپنے فرائض منصبی پر واپس حاضر ہو جاتے ہیں۔

میری ٹیکسی کے ڈرائیور نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے وہ ہوٹل بھی دکھایا جس میں مصر کے سابق شاہ فاروق کی محبوب رقاصہ سمیعہ جمال اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ہوٹل کے دروازے پر سمیعہ جمال کی ایک بہت بڑی تصویر آویزاں تھی۔ تصویر میں اس کے بال بادلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے باہر چوک کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جہاں ایک پولیس کانسٹیبل نہایت مستعدی سے ٹریفک کنٹرول

کرنے میں مصروف تھا۔ سمیعہ جمال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میری ٹیکسی کے ڈرائیور نے پہلے ایک راہ گیر کو اور پھر چوک والے ٹریفک کانسٹیبل کو اپنی زد میں لینے کی سر توڑ کوشش کی۔ راہگیر بے چارا تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا' لیکن ٹریفک کانسٹیبل نے سیٹی بجا کر ہمارا تعاقب کرنے کی تھوڑی بہت کوشش کی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ایکسی لیٹر دبا کر رفتار اور بھی تیز کر دی اور ہم خطرناک پہاڑی موڑوں اور پیچدار راستوں کو کسی غیبی معجزے کی مدد سے طے کرتے ہوئے ٹریفک کانسٹیبل اور سمیعہ جمال دونوں کی زد سے باہر نکل آئے۔

روم کی طرح بیروت کی سڑکوں پر بھی مجھے ہر دم یہی احساس ہوتا تھا کہ ہم ایک مسلسل حادثے کی زد میں معلق ہیں۔ کھلی سڑکیں ہوں یا گنجان آباد گلیاں' ٹیکسی ہر جگہ ایک ہی رفتار سے چلنے پر مصر تھی۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ کوٹ پتلون والے راہگیروں کے درمیان تو وہ بڑے اطمینان سے ہارن بجاتا ہوا گزر جاتا ہے' لیکن عباؤں والے لوگوں کو دیکھ کر وہ بے اختیار تذبذب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت اس نے یوں کی کہ پتلون والے راہگیر کی ٹانگیں دور سے صاف نظر آ جاتی ہیں اور ڈرائیور آسانی سے دیکھ سکتا ہے کہ وہ کس طرف جا رہا ہے۔ اس کے برعکس عبا کے نیچے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ موٹر کو دیکھ کر ان ٹانگوں کا رخ آگے کی طرف مائل ہے یا پیچھے کی طرف۔ میں نے اعتراف کیا کہ مغربی لباس کا یہ افادی پہلو اب تک میری نظر سے پوشیدہ تھا۔

امریکن یونیورسٹی کے قریب ایک فیشن ایبل ریستوران کے سامنے ٹیکسی روک کر ڈرائیور نے مجھے آگاہ کیا کہ کوئی خوش مذاق سیاح اس ریستوران میں بنیر کا گلاس یا چائے کی پیالی نوش کئے بغیر بیروت سے واپس نہیں جاتا۔ اپنی سیاحت اور خوش مذاقی کی لاج رکھنے کے لیے میں نے بھی اندر جا کر چائے کا آرڈر دیا۔ ریستوران میں اکثر لوگ غیر ملکی تھے اور غالباً وہ سب سیاح تھے اور یہاں اپنی ٹیکسیوں کے ڈرائیوروں کی ہدایات

کے مطابق اپنی خوش مذاقی کی داد دینے آئے تھے۔

ایک نوجوان بیرے نے مجھے چائے لا کر دی۔ اس کی باریک باریک تیکھی مونچھیں تھیں اور اپنی سفید وردی میں وہ جاسوسی ناولوں کا پراسرار ہیرو دکھائی دیتا تھا جو بھیس بدل کر کسی گہرے راز کی تلاش میں ہوٹلوں کی ملازمت کر رہا ہو۔ چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر وہ میرے پاس مودب کھڑا ہو گیا اور فرنچ نما انگریزی میں بولا۔ "آپ کون ہیں؟"

"میں پاکستانی ہوں۔"

"مرحبا' مرحبا۔" بیرے نے خوشی سے ہاتھ مل کر کہا۔

"اور آپ؟" میں نے بھی اخلاقاً دریافت کیا۔

"الحمدللہ' میں مسلمان ہوں"

بیرے کے اس بے ساختہ جواب نے مجھے چونکا دیا۔ عربوں کے متعلق مشہور تھا کہ وہ سب سے پہلے عرب ہوتے ہیں۔ پھر شامی' یا لبنانی یا عراقی یا مصری ہوتے ہیں اور اس کے بعد کہیں جا کر مسلمان کہلانا پسند کرتے ہیں' لیکن یہ نوجوان بیرا نہ صرف سب سے پہلے مسلمان تھا' بلکہ وہ اپنے مسلمان ہونے پر بغیر کسی حجاب کے خدا کا شکر بھی ادا کر رہا تھا۔

"مجھے بھی مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہے۔" میں نے کہا۔

"الحمدللہ۔ الحمد للہ۔" بیرے نے اپنے ہاتھ پھر خوشی سے ملے۔ "آپ نے اخوان المسلمین کا نام سنا ہے۔"

"اخوان کو کون نہیں جانتا؟" میں نے جواب دیا۔

"میں بھی اس تحریک کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔" بیرے نے فخر سے کہا۔

"ہم ساری دنیا کے مسلمانوں کے بھائی اور خدمت گار ہیں۔"

"کیا آپ پاکستان کی فارن سروس میں ہیں؟" بیرے نے اچانک پوچھا۔

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟"

"مشرق وسطیٰ میں جو سیاح آتے ہیں' وہ اکثر سفارت خانوں کے افسر ہوتے ہیں یا وہ گرجوں کے مشنری ہوتے ہیں یا ان کا تعلق تیل کی سیاست سے ہوتا ہے۔" بیرے کے چہرے پر اب غیر معمولی سنجیدگی آ گئی تھی۔ "سفارت خانوں سے وہ ہماری حکومتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گرجوں کے ذریعہ وہ ہمارے دین میں دخل دیتے ہیں اور تیل کی سیاست سے وہ ہماری معاش پر کنٹرول رکھتے ہیں۔"

بیرے نے کن اکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا اور گردن جھکا کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ "ہم اخوان ایسے سیاحوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔"

بیروت کے مضافات میں جابجا چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کی آبادیاں پھیلی ہوئی تھیں ان میں فلسطین کے مہاجر رہتے تھے مہاجر کراچی میں ہوں یا بیروت میں' ان کے جھونپڑوں پر وہی کثافت اور ان کے چہروں پر وہی فلاکت برستی ہے۔ جس طرح کراچی میں مہاجر بستیوں کے درمیان بڑی سرعت سے سیمنٹ کی بڑی بڑی عمارات بلند ہو رہی تھیں' اسی طرح فلسطینی مہاجروں کے گرد و پیش بھی بلند و بالا خوبصورت مکان تعمیر ہو رہے تھے۔ چند امریکن سیاح جو ان جھونپڑوں اور مکانوں کی تصویریں کھینچ رہے تھے' ساتھ ہی ساتھ عربوں کی سیاست پر بھی بڑی بے تکلفی سے رائے زنی فرما رہے تھے۔

"خدا کی قسم۔" ایک سیاح کہہ رہا تھا۔ "جس وقت ان جھونپڑوں والوں نے اٹھ کر ان خوبصورت عمارتوں کو جلانا شروع کر دیا اسی روز مشرق وسطیٰ میں کمیونزم کا سیلاب آ جائے گا۔"

"بائی جو تم میرے پالتو خرگوش کے بچوں سے بھی زیادہ کوتاہ اندیش ہو۔" دوسرے سیاح نے اپنے ساتھی کو پیار سے گالی دی۔ "کمیونزم آگ لگنے کا انتظار نہیں کیا کرتا۔ کمیونزم کا راستہ تو اسی روز ہموار ہو گیا تھا جب عربوں کے ہاتھ میں لاانتہا تیل کی دولت آئی اور ان غلیظ جھونپڑوں کو مکانوں میں تبدیل کرنے کی بجائے ان کے درمیان یہ نامعقول عمارتیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔"

"تم دونوں کتیا کے بچے ہو۔" تیسرے امریکن نے فتویٰ صادر کیا۔ "جب تک یہاں پر

مذہب کا جذبہ غالب ہے کمیونزم کے آنے یا نہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
مذہب کا یہ کارآمد جذبہ غالب رکھنے کے لیے مغربی ممالک بھی حسب توفیق اپنا فرض انجام دینے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ نزیمہ کے پاس جو سگریٹ لائٹر تھا' اس پر نقرئی حروف میں بڑا خوبصورت کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ بیروت اور بغداد اور دمشق اور قاہرہ میں ایسے سگریٹ لائٹر جا بجا فروخت ہوتے ہیں۔ ایک امریکن کمپنی نے خانہ کعبہ کی تصویر والی بنیانوں اور جرسیوں کا ڈول بھی ڈالا ہے۔ بہت سے مغربی سفارت خانے اپنے ملازمین کو خفیہ طور ر متنبہ کرتے ہیں کہ مشرقی ممالک میں کچی سبزیاں' سلاد اور ٹماٹر نہ کھایئے' کیونکہ ان میں عورتیں ہوتی ہیں۔ جب تک مشرقی عورتیں خود آنکھ نہ لڑائیں۔ ان سے آنکھ نہ ملایئے' کیونکہ اس سے ان کا اخلاق خراب ہوتا ہے اور جب تک صاحب خانہ خود شراب نہ پیئے' اس سے شراب نہ مانگئے کیونکہ اس سے ان کا مذہب بگڑ جاتا ہے۔
بندرگاہ کے قریب ایک کھلا میدان ٹاٹ اور ٹین اور چٹائوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میدان کے چاروں طرف کانٹوں والی لوہے کی تار کھینچی ہوئی تھی اور جگہ جگہ پولیس کے کچھ سپاہی پہرے پر مامور تھے۔ اس میدان میں سینکڑوں مرد اور عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح محصور تھیں۔ تمازت آفتاب میں سارا میدان انگیٹھی کی طرح دہک رہا تھا' اور کچھ ضعیف عورتیں ایک چادر کو پانی میں تر کر کے بار بار اپنے چہروں پر مل رہی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ فلسطینی مہاجر نہیں بلکہ یہ میدان حاجیوں کا کیمپ ہے جو حکومت نے خود اپنے خرچ سے قائم کر رکھا ہے۔ کئی کئی مہینوں تک دور دراز سے لوگ آ آ کر اس کیمپ میں جمع ہوتے رہتے ہیں جو خوش نصیب ہیں ان کو کسی ہوائی جہاز یا سمندری جہاز میں جگہ مل جاتی ہے۔ باقی لوگ انتظار کر کے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کے اعداد و شمار کے مطابق اس کیمپ میں ایسے لوگ بھی تھے جو دو دو' تین تین' چار چار سال سے مسلسل یہاں آ کر مہینوں انتظار کرتے تھے اور پھر بے نیل و مرام واپس چلے جاتے تھے۔

حاجی کیمپ کے ایک گوشے میں عصر کی جماعت ہو رہی تھی۔ باقی بہت سی جگہوں کی طرح اس کیمپ میں بھی حاجی زیادہ تھے اور نمازی کم۔ ایک بے حد بوڑھی عورت بڑے خضوع و خشوع سے سربسجود تھی۔ اس کی چادر میلی تھی اور کرتے کا دامن پھٹا ہوا تھا۔ اپنے آس پاس حقے کا شغل کرتے ہوئے بہت سے لوگوں کے برعکس حج کی طلب میں اس نے محض انتظار کا دامن نہیں پکڑا تھا' بلکہ وہ نماز کا دامن پکڑے بیٹھی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بڑے پتے کی بات کہی کہ مسلمانوں میں جہاں کہیں کچھ برکت اور فراغت کے آثار پائے جاتے ہیں وہ ایسے ہی انفاس قدسیہ کے دم قدم سے قائم ہیں۔ اگر یہ بزرگ ماں بھی نماز چھوڑ کر حقہ گڑگڑانے بیٹھ جائے' تو ممکن ہے کہ ہم لوگ ٹیکسیوں میں دندنانے کی بجائے سڑکوں پر بھیک مانگتے نظر آئیں۔

بیروت کا شمار بھی دنیا کے ان مہذب شہروں میں ہے جہاں غریب ہونا تو کوئی جرم نہیں' البتہ بھیک مانگنا ضرور منع ہے۔ بندرگاہ کے باہر پولیس کا ایک سپاہی بید کی چھڑی گھما گھما کر بہت سے گداگروں کو منتشر کر رہا تھا جو سیاحوں پر بھوکی چیلوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ فلسطینی مہاجروں کا ایک خاندان سپاہی کی نظر بچا کر ایک طرف سہما کھڑا تھا۔ ظاہراً وہ دست سوال دراز نہیں کر رہے تھے' لیکن ان کے چہرے اپنی بے زبانی سے پکار پکار کر ان کی بے بسی اور خستہ حالی کی فریاد کر رہے تھے۔

اس خاندان میں ایک چھ سات سال کا لڑکا تھا۔ ایک آٹھ نو سال کی لڑکی تھی اور ان کی ماں ایک ادھوری بہار کی طرح تھی' جسے وقت سے پہلے ہی خزاں نے پامال کر دیا ہو۔ وہ کبھی اپنے بچوں کی طرف دیکھتی تھی۔ کبھی راہگیروں کی طرف اور کبھی اس سپاہی کی طرف جو بید کی چھڑی گھما گھما کر بھیک منگوں کو بھگا رہا تھا۔

مجھے رکتا دیکھ کر وہ لڑکا میری طرف بڑھا اور بڑی لجاجت سے پوچھنے لگا۔ "کیا آپ ہماری تصویر کھینچنا چاہتے ہیں؟"

جس طرح ہمارے ہاں کے فقیر دیا سلائی یا بوٹ پالش کا سہارا لے کر بھیک مانگتے ہیں'

اسی طرح فلسطین کے مہاجر تصویریں کھنچوا کر بخشش کی امید رکھتے ہیں۔ ان کے خوبصورت خدوخال' تیکھے تیکھے نقش اور اداس آنکھیں تصویر کشی کے لیے بڑے تابناک موضوع ہیں اور کیمرے والے سیاح ان کے فوٹو اتار کر بڑا فراخدلی سے بخشش دیتے ہیں۔

تصویر کی فرمائش سن کر میرا جی چاہا کہ میں اس بچے کو اٹھا کر گلے سے لگا لوں اور کہوں کہ میرے معصوم فرشتے! ابھی خدا نے وہ مصور پیدا نہیں کیا جو تیری تصویر کا حق ادا کر سکے۔ تمہارے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ اس جھلستی ہوئی دھوپ میں تمہارے پاؤں ننگے ہیں اور تمہاری سہمی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی خشک ہو چکی ہے۔ وہ تیری ماں ہے جسے قدرت نے شباب کی منزل سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا ہے اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر شاید کوئی فریاد لرز رہی ہے' لیکن وہ سپاہی کے ڈر سے اپنا منہ نہیں کھول سکتی یا شاید اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک غضب ناک بددعا تڑپ رہی ہے جو اس نے صرف اس ڈر سے روکی ہوئی ہے کہ کہیں اس دنیا کا بھی وہی حشر نہ ہو جو نوح اور عاد اور ثمود کی بدنصیب اقوام کا ہوا تھا اور وہ تیری گڑیا سی بہن ہے جس نے ایک ہاتھ سے اپنی ماں کا دامن تھاما ہوا ہے۔ اور دوسرے ہاتھ سے وہ تمہیں واپس بلا رہی ہے تاکہ کوئی راہ گیر تمہیں زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ نہ لے جائے۔ اس ننھی سی معصوم بچی کے پاؤں بھی ننگے ہیں۔ اس کے کپڑوں میں بھی بہت سے سوراخ ہیں۔ اس کے سنہری بال ریشم کے الجھے ہوئے گچھوں کی طرح پریشان اور گھنگھریالے ہیں۔ ان خوبصورت بالوں میں ریت کے ذرے ابرق کی طرح چمک رہے ہیں۔ بچی کی پلکیں گھنی اور نوکدار ہیں اور اس کی اداس آنکھوں میں نیلی نیلی جھیلوں کی اتھاہ گہرائیاں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اگر یہ بچی آسمان پر پیدا ہوئی ہوتی' تو بے شک وہ جنت کی حور بنتی۔ لیکن وہ اس بے رحم زمین پر پیدا ہوئی' اور بنی آدم بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں خدا کا یہ نادر شاہکار بھوک سے مرجھایا ہوا ہے' خوف سے سہما ہوا ہے' بے گھر ہے' بے سہارا ہے' اداس ہے۔ پامال ہے۔

اس بچی کی جلد زیتون کے تیل کی طرح تازہ اور شفاف ہے اس کی رگوں میں جو خون گردش کر رہا ہے۔ اس میں ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کے چشموں کا پانی اور فلسطین کے پھولوں کی نکہت اور فلسطین کے انگوروں کا رس رچا ہوا ہے۔ اس لڑکی کے وجود میں یروشلم کی ان گنت پدیوں کے تقدس کی امانت پوشیدہ ہے۔ اس کی پرورش بڑے بڑے برگزیدہ پیغمبروں کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ اس کی تربیت میں آسمانی صحیفوں کا ہاتھ ہے جو خدا نے اس برکت والی سرزمین پر نازل فرمائے۔ اس لڑکی کے آباؤ اجداد ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کی خاک میں دفن ہو رہے ہیں' لیکن آج یہ لڑکی روٹی کے ایک ٹکڑے اور سہارے کی ایک جھونپڑی کے لیے ننگے پاؤں اور ننگے سر بیروت کی گلیوں میں پریشان حال ٹھوکریں کھا رہی ہے' کیونکہ بنی اسرائیل کی بھیڑوں کو ایک بار پھر وہ گھر یاد آنے لگا ہے جہاں سے ڈھائی ہزار سال قبل خدا نے انہیں نکال باہر کیا تھا۔

یہودیوں کا جدید ترین مقدس صحیفہ "اعلان بلفور" (Baffour Declaration) ہے' جو ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانیہ کے دفتر خارجہ کی جانب سے نازل ہوا اور جس میں بشارت دی گئی تھی کہ شاہ انگلستان کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی گھر مہیا کرنے کے حق میں ہے اور اس سلسلے میں یہودیوں کی ہر ممکن مدد کرے گی۔

جس عقیدت مندی سے یہودی اس انسانی بشارت کی پیروی کر رہے ہیں۔ اگر اسی طرح انہوں نے اپنی الہامی کتاب تورات کو بھی مانا ہوتا تو شاید بنی اسرائیل کو ہزاروں سال تک دربدر کی خاک نہ چھاننا پڑتی۔

اے بنی اسرائیل! وہ دن یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا جہان کے لوگوں پر فضیلت دی۔ جب خدا نے تمہیں قوم فرعون کے پنجے سے چھڑایا جو تمہیں بڑے بڑے دکھ دیتے تے۔ تمہارے لڑکوں پر تو چھری پھیرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رہنے دیتے تھے۔ جب خدا نے تمہارے لیے دریا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دی اور تم کو بچا کر فرعون کے آدمیوں کو تمہارے دیکھتے دیکھتے ڈبو دیا۔ جب خدا نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا۔ جب موسیٰ نے اپنی لاٹھی پتھر پر ماری اور اس

میں سے تمہارے لیے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

اے بنی اسرائیل! وہ دن بھی یاد کرو جب خدا نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم حق کے ساتھ باطل کو نہ ملانا اور خدا کی آیات کو سستے داموں نہ بیچنا' لیکن تم اس وعدہ کو وفا نہ کر پائے اور تم نے بڑی ہٹ دھرمی سے بچھڑے کو اپنا خدا بنا لیا۔ تم نے من و سلویٰ کی نعمت کو ٹھکرا کر ساگ پات اور ککڑی اور لہسن اور مسور اور پیاز کی فرمائش کی۔ اپنی اکڑ میں آ کر تم نے بعض پیغمبروں کو جھٹلایا اور بعض کو ناحق جان سے مار ڈالا اور خدا نے تمہاری نافرمانیوں کی پاداش میں کبھی تم کو خود اپنے ہاتھوں سے ایک دوسرے کو قتل کرنیکا حکم دیا۔ کبھی تم کو بجلی نے لے ڈالا۔ کبھی تم راندہ درگاہ ہو کر بندر بنا دیئے گئے۔ کبھی تمہارے سر پر طور کا پہاڑ لٹکا دیا گیا۔

اے بنی اسرائیل! بے شک تمہارے دل پتھر ہو گئے ہیں' بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ پتھروں میں بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور بعض ہوتے ہیں کہ ان میں دراڑ پڑ جاتی ہے اور ان سے پانی رسنے لگتا ہے۔

اے بنی اسرائیل! آج تمہاری نسل بالکل اسی طرح مسخ ہو چکی ہے جس طرح کہ تم نے خدا کے کلام تورات کی شکل بدل ڈالی تھی۔ تمہاری رگوں میں جو لہو گردش کر رہا ہے' اس میں اسرائیلی خون کی آمیزش بہت ہی کم ہے۔ ہزاروں سال سے تم دنیا کے گوشے گوشے میں مارے مارے پھر رہے ہو اور تمہاری نسل دوسری قوموں میں غلط ملط ہو کر اب اپنی کوئی امتیازی حقیقت نہیں رکھتی۔ یوں بھی تم نے خدا کے رسولوں کی جگہ اب امریکہ اور انگلستان میں اپنی مرضی کے پیغمبر تلاش کر رکھے ہیں اور تمہاری موجودہ تورات "اعلان بالفور" ہے لیکن یاد رکھو' اس عرب بچی کا سہا ہوا دل اور اس کی غم دیدہ ماں کی دبی ہوئی آہ تمہارے سر پر کوہ طور سے بھی زیادہ خطرناک پہاڑ کی طرح لٹک رہا ہے۔ اس معصوم لڑکے کی نگاہ میں غضب ناک' قہرناک' زہرناک بجلیاں تڑپ رہی ہیں اور اگرچہ آج کل بندر بنانے کا رواج عام نہیں' لیکن خدا اپنے وعدہ

کا سچا ہے۔ تم امریکہ اور انگلستان میں ڈھلے ہوئے سونے چاندی کے بچھڑوں کی جس قدر جی چاہے پوجا کر لو' لیکن عذاب کا جو طوق تمہاری گردن میں پڑا ہوا ہے' اس سے تمہیں نجات نہیں مل سکتی۔

قاہرہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ مصر کی انقلابی حکومت نے حاجیوں کی آمد و رفت کے لیے نہایت اعلیٰ درجہ کے انتظامات کر رکھے ہیں۔ حاجیوں کو لے کر ہر روز دو ہوائی جہاز پرواز کرتے تھے۔ ہر تیسرے روز ایک سمندر جہاز بھی جدہ کے لیے روانہ ہوتا تھا۔ وزارت خارجہ کا جو افسر ان انتظامات کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ وہ میری درخواست دیکھ کر بڑا چیں بجبیں ہوا۔

"آپ پاکستانی ہو کر انگریزی میں درخواست کیوں لکھتے ہیں؟" اس نے میری جواب طلبی کی۔

میں نے معذرت کی کہ مجھے عربی نہیں آتی' اس لیے درخواست انگریزی میں لکھنا پڑی۔

"آپ کی اپنی زبان کیا ہے؟" افسر نے پوچھا۔

"اردو" میں نے جواب دیا۔

"پھر انگریز کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے؟" افسر نے طنزیہ پوچھا۔

میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں یہ تسلیم کروں کہ انگریزی کے ساتھ میرا فقط غلامی کا رشتہ ہے۔

میرا یہ اقبال جرم سن کر افسر مطمئن ہو گیا' اور بولا۔ "اس صورت میں بہتر یہی تھا کہ آپ اپنی درخواست اردو ہی میں لکھتے۔" پھر اس نے کچھ عرصہ تک ہر ملک کی قومی زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ غلامی کے دور کی یادگاروں کی مذمت کی اور پھر انقلاب مصر کے حوالے سے عرب نیشنلزم کی فضیلت پر ایک دھواں دھار تقریر کی۔ اس کے بعد اس نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھے ایک مصری جہاز "السوڈان" میں جدہ تک سفر کرنے کی اجازت دے دی۔

اگرچہ مصر کا علامتی صدر ابھی تک جنرل نجیب ہی تھا' لیکن ملک میں اصلی ڈنکہ جمال

عبدالناصر کا بج رہا تھا۔ چاروں طرف عرب نیشنلزم کا تصور زور شور سے ابھر رہا تھا اور مختلف طبقات میں مختلف رنگ کے جذبات پیدا کر رہا تھا۔ اس کا ایک رنگ حاجی موسیٰ رضا کی دکان کا رنگ تھا۔ یہ دکان اندرون قاہرہ ایک بےحد تنگ اور گنجان بازار میں واقع تھی اس بازار میں چٹائیاں' پلنگ' جوتے' اچار' ہلدی' مرچ' شربت' کباب اور تربوزوں کی کٹی ہوئی قاشیں برسرعام دوش بدوش فروخت ہو رہی تھیں۔ حاجی موسیٰ رضا کی دکان میں یہ خصوصیت تھی کہ اس میں پھلوں اور سبزیوں کے علاوہ پرانی بوسیدہ کتابوں کے انبار تھے اور ایک کونے میں قدیم مصری نوادر کا مجموعہ بھی تھا۔ پھلوں میں ایک ٹوکری آموں کی تھی۔ میں نے پوچھا کہ یہ میوہ ہندوستان سے آیا ہے یا پاکستان سے؟

"جی نہیں۔" حاجی موسیٰ رضا نے برا منا کر کہا۔ "یہ پھل خاص مصر کی پیداوار ہے" اور پھر اس نے بڑی تفصیل سے مجھے باری باری وہ پھل اور سبزیاں دکھائیں جو وادی نیل کی خاص پیداوار ہیں۔ ان پھلوں اور سبزیوں میں انار بھی تھے۔ انگور بھی' آلو بھی اور لوکی اور چقندر بھی جس انداز سے حاجی موسیٰ رضا مجھے ان سے متعارف کرا رہا تھا' اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ اب اگر میں یہ کہوں کہ یہ اشیاء دنیا کی کسی اور زمین میں بھی پیدا ہوتی ہیں' تو حاجی موسیٰ رضا پھر برا منائے گا کہ میں آب نیل کی بے حرمتی کر رہا ہوں!

حاجی موسیٰ رضا کی دکان میں جو نوادرات تھے' وہ اکثر فرعونوں کے مقبروں سے نکلے ہوئے زیوروں' برتنوں' منقش پتھر کی سلوں وغیرہ پر مشتمل تھے حاجی صاحب کا بیٹا جو بیروت کی یونیورسٹی کا انڈر گریجویٹ تھا' بڑی فصاحت سے گاہکوں کو ان نوادرات کے حوالے سے مصر کی شاندار تہذیب کا پس منظر سنایا کرتا تھا۔ قاہرہ اور اسکندریہ کی بڑی بڑی دکانوں میں عورتوں کے ملبوسات کی بناوٹ اور زیورات کے نقش و نگار کا رجحان بھی زمانہ فراعین کے فیشنوں کی طرف مائل تھا اور تزئین و آرائش کے جملہ لوازمات صریحاً ان خطوط کی پیروی کر رہے تھے جو آج سے کئی ہزار سال پہلے مصر کی تہذیب و تمدن کا طرہ امتیاز تھے۔ اگر آپ مصر کی اصلی اندرونی زندگی دیکھنے کی خواہش کا اظہار کریں' تو قاہرہ

کے سند یافتہ ٹورسٹ گائیڈ آپ کو ایک خاص ریستوران "عمر خیام" میں لے جائیں گے جو باہر سے قدرے غیر آباد نظر آتا ہے۔ اندر ایک چوکور کمرہ ہے جس کے دروازوں پر سرخ بانات کے پردے لٹک رہے ہیں دیواروں کے ساتھ ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے ہیں اور فرشی نشستوں کے سامنے کھانا کھانے کے لیے لکڑی کی چھوٹی چوکیاں رکھی ہوئی ہیں۔ کمرے میں بیحد مدھم روشنی ہے اور دیواروں پر چاروں طرف فرعونی مقبروں کے اندرونی مناظر کی تصویریں اور علامتیں آویزاں ہیں۔ پردوں کے پیچھے کسی جگہ آرکسٹرا بج رہا ہے' جو نظر نہیں آتا اور اس کی دھن پر ایک لڑکی آپ کے سامنے طرح طرح کے بل کھا کھا کر ناچنے لگتی ہے۔ لڑکی کی کمر اور پنڈلیاں اور باہیں اور سینہ کھلا ہے اور اسکے باقی جسم پر جو باریک لباس ہے وہ پرانی تصویروں کے مطابق فرعونوں کے دربار کی رقاصائیں پہنا کرتی تھیں۔ ریستوران کے عملے میں سے ایک خوش پوش معزز نما انسان آپ کے پاس آ کے بیٹھ جائے گا اور سرگوشی کے انداز میں اس لڑکی کے ناچ پر محققانہ تبصرہ کرنے لگے گا کہ یہ ناچ کس فرعون کی محبوب رقاصہ کا خاص ناچ ہے اور اسے کتنے مقبروں کے اندرونی نقش و نگار کی تحقیق کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔

اگر آپ کے دل اور دماغ پر اس ناچ اور بصرے کا خاطر خواہ اثر ہو رہا ہے' تو یہ خوش پوش' معزز نما شخص بڑی رازداری سے اپنی جیب سے ایک البم نکال کر آپ کے ہاتھ سستے داموں فروخت کرنے کی پیش کش کرے گا۔ اس البم میں بہت سے فرعونوں کی جنسی عیش کوشی کے خفیہ راز پوشیدہ ہیں۔

تصویروں کے بعد یہ خوش پوش' معزز نما انسان آپ کو چند مقوی طلا اور تیل خریدنے کی ترغیب دے گا' جن کے نسخے تین تین ہزار سال پرانے مقبروں کے کتبوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔

چوڑیاں ہوں یا بندے' سبزیاں ہوں یا قدیم نوادر' جنسی تصویریں ہوں یا مقوی ادویات------ قاہرہ میں زندگی کا ہر رخ فرعونوں کی تہذیب سے رشتہ جوڑ کر فخر محسوس کرتا ہے۔

یہاں پر نئی نسل کا ایک ایسا طبقہ بڑی سرعت سے نشوونما پا رہا ہے جس کا تصوری' فکری اور عملی مطمح نظر اس قدر شدید جذبہ قومیت ہے کہ اس کے سامنے دین کی حیثیت محض ذیلی اور ضمنی رہ جاتی ہے۔ اس مکتب خیال کی نظر میں مصر کی تہذیب کا اصلی ورثہ زمانہ فراعین کے آثار ہیں۔ اس تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں وہ اسلام کو ایک ثانوی سی تحریک شمار کرتے ہیں' جو تیرہ چودہ سو برس قبل اس سر زمین پر آئی اور اپنے ساتھ کئی دیر نقوش لائی۔ دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح مصر کے عوام بھی بڑے مخلص اور سیدھے سادھے مسلمان ہیں۔ یہ صرف نئی روشنی کے نوجوانوں کا ایک طبقہ ہے' جو نیشنلزم کی شدید رو میں بہہ کر اسلام کو اپنی قومیت کی بنیاد نہیں بناتا' بلکہ ہزاروں سال پہلے کے زمانہ کفر و ضلالت کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کر کے فخر و مباہات محسوس کرتا ہے فرازدنی اس طبقے کی منہ بولتی مثال ہے۔

فرازدنی سے میری ملاقات ایمسٹرڈم کے رائک میوزیم میں ہوئی تھی۔ وہ وہاں پر آثار قدیمہ کی بحالی' تجدید اور حفاظت کا فن سیکھنے آئی تھی اور اب مصر کے کسی ثقافتی ادارے میں بڑے اچھے عہدے پر فائز تھی۔ قاہرہ میں ایک روز اس نے مجھے اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا۔ شہر کے جس حصہ میں اس کی رہائش تھی' اس کا نام امام شافعی تھا۔ اس علاقے میں اینٹوں اور سیمنٹ کے بے شمار پکے مکانات سلسلہ وار بنے ہوئے تھے' اور ان کی تعمیر میں ایک غیر معمولی یکسانیت نمایاں تھی۔ دیکھنے کو تو وہ رہائشی مکان نظر آتے تھے' لیکن یہ محلہ امیروں کا قبرستان تھا۔ قاہرہ کے کھاتے پیتے لوگ اپنے مردوں کو عوامی قبرستان میں دفن کرنے کے قائل نہیں ہیں جس طرح آج سے ہزاروں سال پہلے شاہان مصر اپنی قبروں پر بلند و بالا اہرام تعمیر کرتے تھے' اسی طرح قاہرہ کے امرا آج بھی اپنی لاشوں کی تدفین کے لیے پکے کمروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہر خاندان کے لیے ایک الگ چار دیواری ہوتی ہے۔ اس کے اندر ایک کشادہ صحن ہے' جس کے نیچے دو زمین دوز کمرے ہوتے ہیں۔ ایک کمرہ مردانہ لاشوں کے کے مخصوص ہوتا ہے'

دوسرا عورتوں کے لیے۔ جب کبھی کوئی نئی میت تیار ہوتی ہے' تو پرانے مردے کی ہڈیوں کو سمیٹ کر ایک کونے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور نئی لاش کو ان تہہ خانوں میں لے جا کر ڈال دیتے ہیں۔ اس کے بعد تہہ خانوں کے دروازے کو بڑی بڑی سلوں کے ساتھ پاٹ دیا جاتا ہے اور جن سیڑھیوں کے ذریعہ ان زمین دوز کمروں میں اترا جاتا ہے۔ ان کے بالائی حصہ کو بھی پتھر کی سلوں سے بند کر دیا جاتا ہے۔ باہر صحن کے ایک کونے میں ایک باقاعدہ کمرہ بھی بنا ہوتا ہے۔ خاندان کے لوگ بعض تقاریب پر یہاں آ کر ٹھہرتے ہیں۔ فاتحہ درود پڑھا جاتا ہے۔ قرآن خوانی ہوتی ہے اور یوں بھی رات کے وقت شہر کی آبادی ان کمروں سے اور بھی کئی طرح کے کام لینا جانتی ہے۔

اس انوکھے شہر خموشاں سے گزر کر ایک تنگ گلی میں فرازدنی کا گھر تھا۔ گھر کی عمارت باہر سے کہنہ اور بوسیدہ تھی' لیکن اندر جا کر دیکھا تو کچھ اور ہی عالم پایا۔ فرازدنی کا اپنا کمرہ جدید ترین فرنیچر سے آراستہ تھا۔ دیواریں فرعونی مقبروں کے آثار' علامات اور نقوش سے بھری پڑی تھیں۔ ایک طرف مغربی موسیقی کے ساز اور بے شمار ریکارڈ جمع تھے۔ دوسری طرف ہوٹلوں کے بار روم کی طرح رنگ برنگ سینچوں کی بنی ہوئی تپائی تھی' جس پر کئی قسم کی شراب کٹ گلاس کی خوبصورت صراحیوں میں سجی ہوئی تھی۔ تیسرے کونے میں زرد فارمیکا کی شفاف میز کے پیچھے بجلی کا ایک خوبصورت چھوٹا سا آٹومیٹک کچن تھا' سب سے پہلے فرازدنی نے میرے ساتھ اس بات پر گہری ہمدردی کا اظہار کیا کہ میں اس قدر گرم موسم میں خواہ مخواہ حج پر جانے کا خطرہ مول لے رہا ہوں۔ پھر اس نے اپنی دیواروں پر لگے ہوئے نقوش و نگار کی وضاحت کر کے فرعونی زمانوں کی تہذیبی و تمدنی عظمت پر طویل تقریر کی اور مسلمانوں کے دل میں فرعون کے خلاف جو بغض بھرا ہوا ہے' اس پر بڑی کڑی تنقید کی۔ اس کے بعد وہ بجلی کا چولہا جلا کر چائے بنانے میں مصروف ہو گئی اور مجھے حکم دیا کہ سینڈوچ بنانے کے لیے میں اس کی الماری سے اپنی پسند کی کوئی چیز نکال لوں۔ فرازدنی کا نعمت خانہ طرح طرح

کے سامان سے لدا ہوا تھا' لیکن جتنے ڈبے میں نے اٹھائے۔ ان سب میں لحم خنزیر کا حصہ غالب تھا۔ اس لیے میں نے صرف خشک بسکٹوں کا ایک پکیٹ نکالا۔ میری اس حرکت پر وہ ہنسنے لگی' اور بولی۔ "مسلمان آپ ہی نہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں' لیکن میں نے اپنے ذہن کو ان قیود سے آزاد کر لیا ہے جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔"

ترقی کی اس بے معنی منطق کے بعد فرازدنی مجھے اپنے باپ سے ملانے مکان کے ایک دوسرے حصے میں لے گئی۔ یہاں ایک اور طرفہ تماشا دیکھا۔ ایک نیم تاریک کمرے میں ساٹھ پینسٹھ سال کے ایک بزرگ گاؤ تکیہ لگائے قالین پر بیٹھے تھے۔ ان کا رنگ گندھے ہوئے میدے کی طرح سفید اور ملائم تھا۔ ان کی داڑھی سنہری اور فرنچ کٹ تھی اور ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اور سرخی جھلک رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ بہت سے اونچے اونچے گلدان تھے' جن میں نیم سوختہ اگربتیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ دیواروں پر فلکیات کے نقشے اور اجرام فلکی کی تصاویر آویزاں تھیں۔ سامنے ایک تپائی پر بہت سے جنتریاں اور کچھ کرہ ارض کے گلوب اور چند اصطرلاب پڑے تھے۔ فرازدنی نے شکوہ کیا کہ اس کا باپ اس قدر قدامت پرست ہے کہ ابھی تک بابل اور ہاروت اور ماروت کے زمانے سے آگے نہیں بڑھا۔ عملیات اور جادوگری اس کا پیشہ تھا۔ مصر میں جادوگری خلاف قانون ہے۔ یہ صاحب دو بار جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔ لیکن اب بھی صبح و شام حاجت مندوں کا ان کے ہاں تانتا بندھا رہتا تھا۔

فرازدنی کے والد بزرگوار نے بڑی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا اور نہایت تپاک سے اپنے قریب بٹھایا۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ ان کے جادو ٹونے کی شہرت سن کر ایک نیا گاہک ان کے دام میں آیا ہے' لیکن جب فرازدنی نے انہیں آگاہ کیا کہ میں مفت کا ملاقاتی ہوں اور عنقریب حج پر جا رہا ہوں' تو اس مرد بزرگ کی گرمجوشی یک لخت سرد پڑ گئی اور انہوں نے بے اعتنائی سے منہ موڑ کر ایک جنتری کا مطالعہ شروع کر دیا۔

والد صاحب سے فارغ ہو کر فرازدنی مجھے اپنی والدہ کے پاس لے گئی' جو پچھلے برآمدے

میں جاء نماز پر بیٹھی تسبیح کرنے میں مشغول تھی۔ فرازدنی نے جب اسے بتایا کہ میں حج پر جا رہا ہوں' تو اس بزرگ خاتون کی آنکھوں میں تیز تیز چمک آئی۔ جانماز سے اٹھ کر اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا' اور پھر ہاتھ اٹھا کر میرے لیے دعائے خیر کی۔
قاہرہ کے اس گھر کی ایک چھت کے نیچے زندگی کے تین دھارے بہہ رہے تھے۔ ایک طرف صاحب خانہ تھا' جو فلکیات' عملیات اور قدیم ساحری کی بھول بھلیوں میں مال و دولت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ دوسری طرف اس کی فیشن ایبل بیٹی تھی جو پرانی کافرانہ تہذیب کے مردہ خانوں میں نئی روشنی کے چراغ لے کر لذت پرستی کے ظلمت کدوں میں بھٹک رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان فرازدنی کی بے زبان ماں تھی جو اپنی جانماز پر اللہ کی رسی مضبوطی سے تھامے بیٹھی تھی۔
بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبروں اور ظالم اور سرکش فرعونوں کی اس سر زمین پر خیر و شر کی قوتیں عجیب و غریب روپ دھار کر نت نئے انداز سے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں تھیں' لیکن سچ تو ہے کہ مصر کے سواد اعظم کا دل اور دماغ اسلام کے رشتے میں اسی طرح پرویا ہوا ہے جس طرح کہ دنیا کے اور مسلمانوں کا' اس کا روح پرور نظارہ میں نے حاجیوں کے جہاز "السوڈان" میں دیکھا۔

○○○

• سرابِ منزل

جس وقت "السوڈان" نے اسماعیلیہ کی بندگاہ سے لنگر اٹھایا' اس میں ساڑھے سات سو عازمین حج سوار تھے۔ اس سارے قافلے میں فقط میں ایک غیر مصری مسافر تھا۔ میرے پاس ڈیک (Deck) پر سفر کرنے کا ٹکٹ تھا۔

جہاز چلتے ہی مائیکروفون پر اعلان ہوا کہ پاکستانی مسافر بالائی عرشہ پر کپتان سے آ کر ملے۔ ایک سٹیوارڈ میری رہنمائی کر کے اوپر لے گیا۔ جہاز کا کپتان نہایت چاق و چوبند نوجوان تھا اور بڑی روانی سے شستہ انگریزی بولتا تھا۔ اس نے میرے پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات کا معائنہ کیا اور پھر قہوہ پلا کر پاکستان میں میری ملازمت کی نوعیت کے متعلق کچھ سوالات کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنے عملے کے ایک آدمی کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ مجھے ساتھ لے جا کر محمد نوفل کے کیبن میں برتھ دلوا دے۔

محمد نوفل اسکندریہ کے بہت بڑے تاجر' صنعت کار اور رئیس تھے۔ وہ دس برس سے ہر سال متواتر حج پر جا رہے تھے۔ دو برتھ کا پورا کیبن انہوں نے اپنے لیے ریزرو کروایا ہوا تھا۔ ایک برتھ پر وہ خود بیٹھے تھے۔ دوسرے برتھ پر ان کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ جہاز کے ملازم نے عربی میں انہیں کچھ کہا اور نوفل صاحب نے اہلاً و سہلاً کہہ کر بڑی خوش دلی سے اپنا سامان اٹھا کر دوسرا برتھ میرے لیے خالی کر دیا۔

نوفل صاحب کی رفاقت میرے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ وہ بڑی اچھی انگریزی بولتے تھے اور مناسک حج کے متعلق مجھے ان سے نہایت مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ پاکستان کے متعلق وہ زیادہ نہ جانتے تھے۔ شام کو مغرب کی نماز کے بعد انہوں نے بہت سے لوگوں کو اپنے ڈیک پر جمع کیا' اور فرمائش کی کہ میں انہیں پاکستان کے متعلق کچھ باتیں بتاؤں۔ جہاز کا کپتان اور اس کے عملے کے کچھ افراد بھی وہاں آ کر بیٹھ گئے۔ کوئی گھنٹہ بھر میں نے انہیں تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے چیدہ چیدہ واقعات سنائے۔

میں انگریزی میں ٹھہر ٹھہر کر بولتا تھا اور نوفل صاحب اس کا عربی میں ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ آزادی کے وقت لاکھوں مسلمانوں کی شہادت' عورتوں کی بے حرمتی اور مہاجرین کے حالات سن کر سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ جب میں نے انھیں پاکستان کی آبادی' رقبہ اور دیگر تفصیلات بتانے کے بعد یہ کہا کہ دنیا کی اس پانچویں بڑی مملکت کا نصب العین یہی ہے کہ: "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" تو سارے مجمع نے بے ساختہ کلمہ طیبہ کا ورد کیا اور پھر سب نے کھڑے ہو کر پاکستان کے حق میں دعا مانگی۔ محمد نوفل صاحب بلند آواز سے دعا کے الفاظ بولتے تھے اور باقی سب لوگ زور زور سے آمین آمین کہتے تھے۔ اس کے بعد کپتان نے قہوہ کا آرڈر دیا۔ یکے بعد دیگرے بہت سے لوگوں نے مجھے قہوے کے اتنے فنجان پلائے کہ اس کی حدت سے مجھے رات بھر کئی بار نکسیر پھوٹی۔

یوں بھی بحر احمر میں گرمی اپنے پورے شباب پر تھی۔ سمندر کی لہریں جہاز سے ٹکراتی تھیں تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمارے چاروں طرف بڑی دیگوں میں ابلتا ہوا پانی جوش کھا رہا ہے۔ ہوا بھاپ کی طرح گدلی گدلی سی تھی اور فضا کا سارا ماحول گرم پانی میں بھیگے ہوئے کمبلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ دن بھر کیبن کی کھڑکی سے ہوا کے جھونکے کھولتے ہوئے پانی کے پرنالوں کی طرح اندر گرتے تھے۔ رات کو پورٹ ہول کی ہوا نیم گرم بخارات کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ کچھ کمروں میں بجلی کے پنکھے لگے ہوئے تھے' لیکن ان کی گردش رطوبت سے لدی ہوئی بوجھل ہوا کو اپنی جگہ سے ہلانے سے قاصر تھی۔ دھوپ میں آفتاب کی کرنیں لوہے کی گرم گرم سلاخوں کی طرح لٹک رہی تھیں اور جہاز کے ہر مسافر کا چہرہ پسینے کی جھالر میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے باوجود عازمین حج کی ٹولیاں بڑے اطمینان سے عرشے پر جابجا بیٹھی تھیں۔ کچھ لوگ تلاوت قرآن میں مصروف تھے۔ کچھ تسبیح کر رہے تھے۔ کچھ حج کی دعائیں یاد کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں محمد نوفل صاحب بھی کرسی پر بیٹھے تھے اور کٹی ہوئی برف کی

پوٹلی بار بار سر پر پھیر رہے تھے۔

دھوپ میں اطمینان سے بیٹھے ہوئے عازمین حج کی طرف دیکھ کر محمد نوفل نے سرد آہ بھری اور کہا۔ "میں بھی ان لوگوں کا ہم وطن ہوں' لیکن ہمارے درمیان ایک بہت بڑا فرق ہے۔ یہ غریب لوگ ہیں۔ ان کے سینے میں قناعت کی اتنی خنکی ہے کہ گرم موسم کی شدت ان پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ میرا معاملہ دوسرا ہے۔ میں بڑا کامیاب تاجر اور صنعتکار ہوں۔ میں جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں اس پر ہن برسنے لگتا ہے' لیکن میرا دل نہیں بھرتا میرے اندر ہر وقت حرص کی بھٹی سلگتی رہتی ہے۔ سردی کے موسم میں بھی برف کے بغیر میری پیاس نہیں بجھتی۔"

میں نے اسے ایک بزرگ کا مقولہ سنایا کہ دنیا کی مثال آدمی کے سایہ کی سی ہے اگر کوئی اپنے سایہ کی طرف دوڑے تو وہ اس کے آگے ہی آگے بھاگتا نظر آئے گا اور اگر سایہ کو پس پشت ڈالے تو وہ خود اس کا پیچھا نہ چھوڑے۔ جو کوئی دنیا کو ترک کرتا ہے دنیا اس کا پیچھا کرتی ہے اور ترک کرنے والے کو تلاش کرتی ہے اور جو کوئی طلب دنیا میں کوشش کرتا ہے' اسے للچا للچا کر کوسوں دور بھاگتی ہے۔

محمد نوفل نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔ "میرے لیے دونوں حالتیں یکساں ہیں۔ میں دنیا کے پیچھے بھاگوں یا دنیا میرے پیچھے بھاگے۔ دونوں صورتوں میں حرص کی آگ میرے تن من میں بدستور بھڑکتی رہتی ہے۔

محمد نوفل کا یہ دسواں حج تھا۔ ہر سال حج کے موقع پر وہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں لاکھوں ریال کی خیرات بانٹ کر آتے تھے۔ "لیکن" انہوں نے بڑی حسرت سے کہا: "حضوری کی جو کیفیت مجھے پہلے حج میں حاصل ہوئی تھی۔ وہ بعد میں کبھی نصیب نہیں ہوئی اس وقت میں بالکل غریب تھا اور میرے پاس معلم کی فیس ادا کرنے کے لیے بھی پوری رقم موجود نہ تھی۔ اب ریالوں سے بھرے ہوئے تھیلے مجھے اپنے حضور میں حاضر رکھتے ہیں۔ طواف کے دوران بھی اللہ تعالیٰ کا گھر مجھ سے ہزاروں میل دور رہتا ہے۔"

اس قسم کی باتیں کرتے کرتے محمد نوفل کی چیخ نکل گئی اور وہ بے اختیار دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ رونے کی آواز سن کر بہت سے عازمین حج وہاں جمع ہو گئے۔ اپنے ملک کے اتنے بڑے رئیس پر گریہ و زاری کا یہ عالم دیکھ کر ان پر بھی رقت طاری ہو گئی اور وہ بڑے خضوع و خشوع سے با آواز بلند کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ذکر کا یہ حلقہ پھیلتا گیا اور سارے عرشہ پر تل دھرنے کو جگہ باقی نہ رہی۔

اگلے روز نماز عشاء کے بعد اعلان ہوا کہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے جہاز میقات حرم سے گزرے گا۔ اس لیے سب لوگ احرام باندھنے کی تیاری کر لیں۔ یہ اعلان سنتے ہی مسافروں میں بجلی کی رو دوڑ گئی اور سب لوگ احرام کی تیاریوں میں منہمک ہو گئے۔ ان میں بڈھے بھی تھے جوان بھی تھے' عورتیں بھی تھیں' مرد بھی تھے اور ان سب کے ذوق و شوق میں پیا ملن کی آس رنگین پچکاریوں کی طرح سارے جہاز کو شرابور کر رہی تھی۔ ساڑھے گیارہ بجے تک سب مسافر احرام باندھ کر جہاز کے عرشوں پر جمع ہو گئے۔ گیارہ بج کر چالیس منٹ پر جہاز کا سائرن بجا اور ساڑھے سات سو حاجیوں نے بیک زبان تلبیہ کا آوازہ بلند کیا۔

لبیک اللھم لبیک۔ لبیک لاشریک لک لبیک۔ ان الحمد و النعمہ۔

اے اللہ میں تیرے دربار میں حاضر ہو گیا۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ تحقیق ہر طرح کی تعریف اور نعمت

لک والملک لا شریک لک۔

تیرے لیے ہے اور ملک تیرے لیے ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

تلبیہ کا نعرہ لگاتے ہی ساڑھے سات سو افراد کا یہ مجمع چشم زدن میں خالق کائنات کے حضور میں جا کھڑا ہوا۔ اس مجمع میں پاکباز بھی تھے' گناہگار بھی تھے۔ ہوسکار بھی تھے قناعت شعار بھی تھے' خوش اخلاق بھی تھے' ریاکار بھی تھے۔ عبادت گزار بھی تھے۔ غفلت کا شکار بھی تھے' لیکن اس وقت وہ سب بلا کسی امتیاز کے ایک ہی وردی میں ملبوس

ایک ہی قطار میں کھڑے ہوئے' ایک ہی کلمہ پڑھتے ہوئے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں بیک وقت حاضر تھے' کسی فرشتے نے ان کے لیے رسائی کا دروازہ نہ کھولا تھا۔ کوئی ابلیس ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا تھا۔ وہ تو بس اپنے رسول کے بتائے ہوئے چند کلمات زبان پر لاتے ہی کھٹ سے اس بادشاہ کے دربار میں پہنچ گئے تھے جس کا کوئی ثانی ہے نہ شریک۔ جس کے پھاٹک پر نہ کوئی پہرہ ہے نہ دربان' نہ اے ڈی سی ہے' نہ پی اے ہے' نہ سیکرٹری ہے' نہ ملٹری سیکرٹری ہے۔ رات کے سناٹے میں تلبیہ کی گونج کالی گھٹاؤں میں بجلی کی چمک کی طرح کوندتی تھی۔ جہاز کے انجن کی چھک چھک اور سمندر کی لہروں کی شاں شاں کسی کو سنائی نہ دیتی تھی۔ بحرا احمر کا پانی کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ آسمان کے تارے بھی سب کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔ ساری کائنات ایک خلا بن گئی تھی جس میں عبد اور معبود کے علاوہ اور کسی کا وجود باقی نہ رہا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے "السوڈان" جدہ کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہو گیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس مقدس سرزمین پر سر کے بل اتروں' لیکن میرے ہاتھوں میں سامان اور سر پر گناہوں کی گٹھڑی تھی اس لیے اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہا۔

کسٹم ہاؤس کے آس پاس بہت سے معلموں کے وکیل اپنا اپنا دفتر لگائے بیٹھے تھے ایک جگہ عبدالرزاق محبوب معلم کا بورڈ لٹکا ہوا تھا اور اس کے اردگرد سہلٹ کے بہت سے بنگالی زائرین جمع تھے۔ معلم کا وکیل حساب لگا کر انہیں چیخ چیخ کر سمجھا رہا تھا کہ جس کے پاس تین سو پچاسی ریال کی رقم موجود نہیں' وہ نہ حج کے اخراجات پورے کر سکتا ہے اور نہ مدینہ منورہ کی زیارت سے فیض یاب ہو سکتا ہے جو شخص اسے پوری رقم گن کر دکھا دیتا تھا وکیل اس کا نام معلم کے رجسٹر میں درج کر لیتا تھا۔ میں نے بھی تین سو پچاسی ریال نقد دکھا کر عبدالرزاق محبوب کو اپنا معلم مقرر کر لیا۔ اس وقت میرے پاس بارہ سو ریال کی رقم موجود تھی۔ اس میں تین سو پچاسی ریال اپنے لیے رکھ کر باقی آٹھ سو پندرہ ریال میں نے چپکے سے شاکر میاں اور تفضل علی میں برابر بانٹ

دیئے' جو خالی ہاتھ تھے اور معلم کے وکیل نے انہیں اپنے رجسٹر میں درج کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ شاکر میاں اور تفضل علی نے سمجھا کہ گرمی کی شدت سے میرا دماغ چل گیا ہے اور میں یہ حرکت دماغی توازن خراب ہو جانے کی وجہ سے کر رہا ہوں۔ انہوں نے یہ ساری بات معلم کے وکیل کو بتائی وکیل نے بھی اس بات کی تائید کی کہ گرمی نے میرے دماغ میں خلل ڈالا ہوا ہے۔ جب میں نے بہت اصرار کیا' تو وہ مجھے کسٹم ہاؤس کی پولیس چوکی میں لے گئے۔ ہم سب کے بیانات سن کر پولیس والوں نے حکم دیا کہ یہ رقم معلم کا وکیل اپنے پاس امانت رکھے۔ اگر چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد بھی میں اقرار کروں کہ میں یہ پیسے بقائمی ہوش و حواس شاکر میاں اور تفضل علی کو دے رہا ہوں' تو بے شک ان کو ادا کر دیئے جائیں۔

جدہ کے حاجی کیمپ میں ہمارے معلم نے اپنی اسامیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک طبقہ تو آسودہ حال حاجیوں کا تھا جو معلم کی فیس کے علاوہ مکہ معظمہ میں اس سے رہائشی کمرے کرائے پر لینے کی توفیق بھی رکھتے تھے۔ دوسرا طبقہ ہمارے جیسے تین سو بچاسی ریال والوں کا تھا جو بڑی مشکل سے صرف ضروری واجبات ادا کرنے کی پوزیشن میں تھے جدہ سے مکہ کو روانگی کے وقت پہلے طبقہ کو بسوں کے اندر سیٹوں پر بٹھایا جاتا تھا' اور ہمیں چھت پر جگہ ملتی تھی۔

ہماری بس آدھی رات کے قریب مکہ معظمہ میں داخل ہوئی۔ معلم عبدالرزاق محبوب کا بارہ تیرہ برس کا بیٹا ہمارے گروپ کو ایک گندے نالے کے کنارے لے گیا اور تیس پینتیس گز زمین گھیر کر اسے ہماری اقامت گاہ قرار دے دیا۔ کچھ لوگ چادریں بچھا کر لیٹنے لگے' تو معلم کے بیٹے نے ڈانٹا کہ یہ پاؤں پسار کر سونے کا وقت نہیں' بلکہ ہم وضو کر کے تیار ہو جائیں' کیونکہ وہ تھوڑی دیر میں واپس آ کر ہمیں عمرہ کرانے لے جائے گا۔ ہم نے بھاگ دوڑ کر کسی نہ کسی طرح وضو کیا اور معلم کے بیٹے کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ وہ برخوردار ڈھائی تین گھنٹے کے بعد نمودار ہوا اور ہم بیس پچیس

آدمی اس کی رہنمائی میں تلبیہ پڑھتے ہوئے بیت اللہ شریف کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں نے سن رکھا تھا کہ جو شخص حرم شریف میں داخل ہوتا ہے' وہ اپنا جوتا' اپنے گناہوں کی گٹھڑی' اپنی دستار فضیلت اور اپنی بزرگی کا عمامہ دروازے کے باہر چھوڑ جاتا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جب وہ باہر آئے گا تو اس کا جوتا' یا اس کے گناہوں کی گٹھڑی' یا اس کی فضیلت کی دستار' یا اس کی بزرگی کا عمامہ اس کو واپس بھی ملے گا یا نہیں۔ بعض لوگوں کے جوتے گم ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کے گناہوں کی گٹھڑیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگ اپنی فضیلت اور بزرگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

میرے پاس حرم شریف کے باہر چھوڑنے کے لیے اپنے پاؤں میں ربڑ کے چپل اور سر پر گناہوں کی گٹھڑی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ میں نے دل و جان سے دونوں کو اٹھا کر باہر پھینک مارا اور باب السلام کے راستے حرم شریف میں داخل ہو گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی دم بھر کے لیے بجلی سی کوندی اور زمین کی کشش ثقل گویا ختم ہو گئی۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے گاڑی کو مضبوط بریک لگا کر میرے وجود کو پنکچر شدہ ٹائر کی طرح جیک لگا کر ہوا میں معلق کر دیا گیا ہو' جیسے میری پنڈلیوں کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہو رہا ہو' میرے جسم کے اعضا کا ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ ٹوٹ سا گیا۔ ہاتھ بے لوچ ہو کر لٹک سے گئے اور سر بھنور میں پھنسے ہوئے خس و خاشاک کی طرح بے بسی سے چکر کاٹنے لگا۔ اس طرح اپاہج سا ہو کر میں طواف کے لیے آگے بڑھنے کی بجائے بے ساختہ لڑکھڑا کر وہیں بیٹھ گیا۔

نماز فجر کے بعد ہمارے معلم کا بیٹا حاجیوں کی ایک اور پارٹی کو عمرہ کرانے میرے قریب سے گزرا۔ ان کے ساتھ شامل ہونے کو جی تو چاہا' لیکن ہمت نہ ہوئی۔ میرے قریب ہی چند قدم کے فاصلے پر قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی تھی۔ میں نے بھی قرآن شریف کی ایک جلد اٹھائی اور ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر تلاوت شروع کر دی۔ ابھی چند سطریں ہی پڑھ پایا تھا کہ مجھے نیند کے سخت جھونکے آنے لگے جیسے کسی نے کلوروفارم

سنگھا دیا ہو۔ اب یہ روگ جان کو لاگو ہو گیا کہ ویسے تو میں بالکل چوکس و بیدار رہتا تھا لیکن قرآن شریف کھولتے ہی آنکھیں نیند کے خمار سے بے اختیار بند ہونے لگتی تھیں۔ کچھ دیر اس کشمکش کی اذیت جھیلنے کے بعد میں اٹھا اور باہر آ کر ڈھونڈتا ڈھونڈتا بڑی مشکل سے اپنی جائے قیام پر واپس پہنچا۔ میرے کچھ ساتھی عمرہ کرنے کے بعد احرام کھول کر آرام سے سو رہے تھے۔ باقی زمین پر بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ میں نے ان سے بیت الخلا کے متعلق دریافت کیا' تو انہوں نے ایک جانب اشارہ کر کے کہا کہ نالے کے ساتھ ساتھ سیدھے چلتے جاؤ۔ پندرہ بیس منٹ میں بیت الخلا پہنچ جاؤ گے۔

کوئی نصف میل چلنے کے بعد ایک کچی چار دیواری آئی۔ اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے دروازے بنے ہوئے تھے۔ ہر دروازے کے سامنے لوگوں کی طویل قطار ہاتھوں میں لوٹے لیے منتظر کھڑی تھی۔ ایک شخص نے چند قرش لے کر مجھے بھی پانی سے بھرا ہوا لوٹا دے دیا جسے سنبھال کر میں بھی ایک قطار میں لگ گیا۔ کافی دیر کے بعد میری باری آئی۔ میں اندر گیا' تو قدمچے کے اوپر تک بول و براز کا ڈھیر تیر رہا تھا۔ اندر جاتے ہی مجھے اس قدر زور کی قے آئی کہ میں پھسل کر پاخانے کی اس دلدل میں گر گیا۔

کمر سے اوپر تک میرا بدن اور احرام غلاظت سے بھر گیا اور میں اسی طرح بدبو اور تعفن میں شرابور نالے کے کنارے واپس پہنچا۔

راستے میں جو کوئی میرے قریب سے گزرتا تھا وہ فوراً گھن کھا کر ناک پر ہاتھ یا کپڑا رکھ لیتا تھا۔ میرے ساتھی بھی میری اس ہیئت کذائی پر خوب ہنسے اور چھی چھی کر کے مجھے اپنی جگہ سے دور بٹھا دیا۔ میرے پاس دوسرا احرام نہ تھا۔ میں نے ایک بنگالی ساتھی سے لنگی مانگی اور اسے باندھ کر احرام دھویا اور غسل کیا۔ ظہر کی نماز تک نہا دھو کر میں نے پھر حرم شریف کی راہ لی۔ اب میرے ظاہر سے تو کسی کو بدبو نہ آ رہی تھی' لیکن اپنے اندر کے تعفن سے میرا دماغ بری طرح پھٹ رہا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ حج کے ایام مین تین سو ساٹھ اولیاء اللہ ہر وقت حرم شریف میں

حاضر رہتے ہیں۔ میں نے حطیم میں کھڑے ہو کر زور زور سے پکارنا شروع کر دیا کہ آپ لوگ جو تین سو ساٹھ کی تعداد میں یہاں پر فوج در فوج موجود ہیں' آخر آپ کس مرض کی دوا ہیں؟ میرے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی ہے اور میں اب تک عمرہ ادا نہیں کر سکا۔ میری آنکھوں میں نیند کا خمار چھایا رہتا ہے اور میں قرآن شریف کی تلاوت سے معذور ہوں کیا آپ حضرات کے پاس ایسے مریض کا کوئی علاج نہیں ہے؟

میرا خیال تھا کہ میری پکار سن کر حرم شریف کے چاروں کونوں سے نورانی صورت والے خرقہ پوش بزرگ بھاگتے ہوئے آئیں گے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے میری مشکل سے نجات دلوائیں گے' لیکن ایسا کوئی واقعہ رونما نہ ہوا۔ البتہ اس کے بعد رفتہ رفتہ میرے پاؤں طواف کے لیے آزاد ہو گئے اور میری آنکھوں میں تلاوت کے لیے بیداری آ گئی۔

نالے کے کنارے میرے بالکل قریب بہاول پور کے ایک خاندان نے ڈیرا لگایا ہوا تھا۔ ایک بوڑھے میاں بیوی کے ساتھ ان کی جوان بہو تھی۔ بڑے میاں تو خاموش بیٹھے حقہ پیتے رہتے تھے' لیکن ساس اور بہو میں بات بات پر بڑی طویل لڑائی ہوا کرتی تھی۔ لڑائی میں ہار اکثر بہو کی ہوتی تھی اور ہر شکست کے بعد وہ روتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوتی تھی اور ساس سے کہتی تھی۔ "اچھا' تم نے جتنا ظلم کرنا ہے مجھ پر کر لو۔ میں بھی ابھی جا کر طواف کرتی ہوں اور اللہ میاں کے پاس اپنی فریاد پہنچاتی ہوں۔"

یہ دھمکی سنتے ہی اس کی ساس فوراً پسیج جاتی تھی اور بہو کا دامن پکڑ کر بری لجاجت سے کہتی تھی۔ "نہ بیٹی نہ۔ تو تو میری بیٹی ہے۔ ایسی غلطی نہ کرنا۔ خواہ مخواہ کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نہ نکال بیٹھنا۔ طواف میں جو منہ سے نکل جائے وہ پورا ہو کے رہتا ہے۔"

یہ ڈرامہ رات دن میں کئی بار ہوتا تھا۔ ایک روز بڑی شدید گرمی تھی۔ دوپہر کے وقت اچانک آندھی آئی اور خوب تیز بارش ہونے لگی۔ نالے کے کنارے مقیم حاجیوں کا سامان کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ اب ساس بہو میں بڑی سخت چیخ چیخ ہونے لگی۔ غصے

میں آ کر ساس نے بہو کو چوٹی سے پکڑ لیا اور اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہنے لگی۔ "آج صبح طواف میں یہ حرام زادی کہہ رہی تھی۔ اللہ میاں بڑی گرمی ہے۔ اللہ میاں بڑی گرمی ہے۔ اللہ میاں بارش' اللہ میاں بارش۔ اری کالے منہ والی' تمہیں پتہ نہیں یہاں ہر دعا قبول ہو جاتی ہے؟ لے اب بارش کا مزا چکھ۔ اب یہ سامان تیرا باپ آ کے سکھائے گا۔

اس خاندان سے ذرا ہٹ کر ایک جوان جوڑے کا بسیرا تھا۔ یہ میاں بیوی بے اولاد تھے اور بچے کی آرزو لے کر حج کرنے آئے تھے۔ اپنا پہلا طواف کر کے یہ واپس آئے تو بیوی نے بڑے وثوق سے کہا کہ اب ان کی مراد ضرور پوری ہو جائے گی' کیونکہ طواف کے دوران اس نے اللہ تعالٰی سے بچہ کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگا۔

"لڑکا مانگا تھا یا صرف بچہ مانگا تھا؟" خاوند نے وکیلوں کی طرح جرح کی۔

"لڑکے کی بات تو میں نے کوئی نہیں کی۔ فقط بچہ مانگنے کی دعا کرتی رہی۔" بیوی نے جواب دیا۔

"رہی نہ اوت کی اوت۔" خاوند نے بگڑ کر کہا۔ "اب اللہ کی مرضی ہے' چاہے تو لڑکا دے' چاہے تو لڑکی دے۔ اب وہ تجھ سے پوچھنے تھوڑی آئے گا۔ اس وقت لڑکے کی شرط لگا دیتی تو لڑکا ہی ملتا۔ یہاں کی دعا کبھی نامنظور نہیں ہوتی۔"

یہ سن کر بیچاری بیوی بھی کف افسوس ملنے لگی۔ پھر چہک کر بولی۔ "کوئی بات نہیں۔ تم کچھ فکر نہ کرو۔ ابھی بہت سے طواف باقی ہیں۔ اگلی بار میں اپنے خداوند کو لڑکے کے لیے راضی کر لوں گی۔"

ان سیدھے سادھے مسلمانوں کا ایمان اس قدر راسخ تھا کہ خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہی وہ کوہ طور کی چوٹی پر پہنچ جاتے تھے اور اپنے معبود حقیقی سے راز و نیاز کر کے نفس مطمئنہ کا انعام پاتے تھے۔ ان سب کو حق الیقین کی دولت حاصل تھی اور وہ بڑی بے تکلفی سے اپنی اپنی فرمائشیں رب کعبہ کے حضور پیش کر کے کھٹا کھٹ قبولیت کی مہر لگوا لیتے تھے۔ ان کے مقابلے میں مجھے اپنی نمازیں' اپنے طواف اور اپنی ادائیں بے

حد سطحی اور کھوکھلی اور بے جان اور جعلی اور نقلی اور فرضی نظر آنے لگیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ مین اس لڑاکا ساس اور بہو اور اس نوجوان کی بے اولاد بیوی کے پاؤں کی خاک تبرک کے طور پر اپنے سر پر ڈالوں' تاکہ کسی طرح مجھے بھی ان کے یقین محکم کا ایک چھوٹا سا ذرہ نصیب ہو۔

منیٰ کے لیے روانگی مقرر ہوتے ہی مجھے شدید لرزہ کے ساتھ بخار آنے لگا اور ساتھ ہی بڑے زور کی نکسیر چلنے لگی۔ میری علالت کی خبر سن کر معلم عبدالرزاق محبوب بنفس نفیس نالے کے کنارے آیا اور میری نبض دیکھ کر بولا کہ منیٰ اور عرفات میں بڑی سخت گرمی ہو گی۔ اس حالت میں وہ مجھے اپنے ساتھ ہرگز نہیں لے جا سکتا۔ دوسرے حاجیوں کو اس نے تاکید کی کہ نماز فجر کے فوراً بعد وہ بس پر سوار ہونے کے لیے اس کے ڈیرہ کے سامنے جمع ہو جائیں۔ معلم کا حکم سن کر میرے بعض ساتھیوں نے میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ بعض نے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ حج پھر کبھی نصیب ہو جائے گا۔ بعض نے تاسفانہ سر ہلایا اور خاموش رہے' لیکن بہاول پوری بہو کی لڑاکا ساس کڑک کر بولی۔ "تم جوان آدمی ہو۔ یہاں ڈھیری ڈھا کر لمبے کیوں پڑے ہو؟ جاؤ' اٹھ کر طواف کرو۔ اللہ میاں یہاں تک لایا ہے تو اب خالی ہاتھ واپس بھیجتے اسے شرم نہ آئے گی؟"

میں اٹھ کر چلنے لگا' تو چلا نہ جاتا تھا۔ نقاہت کے مارے میرا برا حال تھا۔ یہ دیکھ کر اس بے اولاد بیوی کا جواں سال میاں اٹھ کر آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "آؤ میں تمہیں طوف کرا لاتا ہوں۔"

مطاف میں بڑا ہجوم تھا' لیکن اس نوجوان نے بڑی محنت سے سہارا دیکر مجھے طواف کرایا۔ ساتھ ہی بلند آواز سے میرے لیے دعا مانگتا جاتا تھا۔ اس دعا اور طواف نے میری ہمت بندھائی اور اس کے بعد میں نے خود ہی کئی طواف اور بھی کیے۔ صبح سویرے میں بھی تازہ دم تھا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ معلم صاحب کے ڈیرے جا پہنچا۔ وہاں

پر صرف ایک بس کھڑی تھی جو سواریوں سے اٹا اٹ بھری ہوئی تھی۔ چھت پر بھی لوگ سوار تھے۔ اور تل رکھنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ بس کے اردگرد ساٹھ ستر حاجیوں کا ہجوم جمع تھا۔ معلم کا بیٹا انہیں سمجھا رہا تھا کہ انہوں نے انتظام تو تین بسوں کا کیا تھا' لیکن کسی وجہ سے اب تک صرف ایک بس میسر آئی ہے۔ اب جو لوگ ٹیکسی کا کرایہ ادا کر سکتے ہیں' وہ ٹیکسی تلاش کر لیں۔ باقی حضرات پیدل منیٰ کو روانہ ہو جائیں۔ یہ سن کر نالے کے کنارے والے میرے ساتھی ہنسی خوشی پیدل چل پڑے۔ میں بھی ان کے ہمراہ ہو گیا۔

شہر سے نکل کر جب کھلی سڑک پر آئے تو احرام پوش مخلوق کا ایک جم غفیر سیلاب کی لہروں کی طرح منیٰ کی طرف پاپیادہ رواں دواں تھا۔ ان کے درمیان بسوں اور ٹرکوں اور موٹرکاروں کی بے ترتیب قطاریں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھیں۔ بڑی سڑک پر پہنچتے ہی نالے کے کنارے والے ساتھی بھی ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ اب میں بالکل اکیلا اور آزاد تھا' اور اس آزادی کی لذت ایک تیز و تند نشے کی طرح میری رگوں میں سرسرانے لگی۔ فضا میں تلبیہ کی گونج کا سائبان تنا ہوا تھا اور زمین پر ہزاروں مضطرب قدم تیز رفتاری سے ایک ہی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ہر شخص اپنی دھن میں مست اور بے خود تھا۔ ہر شخص گمنام تھا۔ ہر شخص بے جنس تھا۔ ہر شخص لاتشخص تھا۔ چلتے چلتے ایک ضعیف العمر آدمی لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ کسی نے اس کی نبض ٹٹول کر اعلان کیا۔ "خلاص" کسی دوسرے نے انااللہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ اور اس کی لاش کو گھسیٹ کر سڑک کے کنارے لگا دیا۔ باقی لوگ بدستور چلتے رہے۔ لبیک اللھم لبیک۔

منیٰ کے چپے چپے پر کلاہ باراں کی طرح خیموں کی چھتری بنی ہوئی تھی۔ گرد وپیش کی پہاڑیوں پر جا بجا چونے کی سفیدی بکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ قریب جا کر دیکھا' تو یہ چونے کی قلعی نہ تھی بلکہ احرام پوش حاجیوں کے گروہ تھے جو پہاڑیوں کی ڈھلوانوں

پر بسیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ ان کی تقلید میں میں نے بھی ایک چٹان کے سائے میں پناہ ڈھونڈھ لی۔ اگلی صبح لاکھوں کا یہ قافلہ میدان عرفات کی جانب روانہ ہوا' ان کے پیچھے پیچھے میں بھی وہاں پہنچا۔ کچھ لوگوں نے جبل رحمت کے دامن میں بیٹھ کر وقوف کیا۔ میں نے بھی کہیں قریب ہی جگہ ڈھونڈھ لی۔ شام کو سب کے پیچھے پیچھے مزدلفہ پہنچا۔ مزدلفہ کی چاندنی رات ختم ہوتے ہی۔ اس عظیم الشان تنہائی کے لمحات بھی رخصت ہو گئے جو منیٰ اور عرفات اور مزدلفہ میں لاکھوں کے ہجوم نے مجھے عطا کئے تھے دشت و بیابان اور کنج عزلت کی تنہائی میں سکوت ہوتا ہے۔ ہجوم عرفات کی تنہائی میں سکون ہی سکون تھا۔

منیٰ واپس پہنچ کر قربانی کے مقام پر اچانک میری مڈبھیڑ اپنے معلم عبدالرزاق محبوب سے ہو گئی وہ بڑا خوش تھا کہ میں اس کے لیے کسی جگہ بھی درد سر نہیں بنا۔ انعام کے طور پر اس نے قربانی کے سلسلے میں میری خواطر خواہ مدد کی اور دوسرے روز جب ہم مکہ معظمہ کو واپس لوٹے' تو مجھے اپنی بس کی چھت پر بیٹھنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

مکہ معظمہ واپس آتے ہی میرے سر پر مدینہ منورہ پہنچنے کی دھن سوار ہو گئی' لیکن معلم عبدالرزاق محبوب نے بڑی سنگدلی سے مجھے سمجھایا کہ میرے مدینہ شریف روانہ ہونے کی تاریخ سعودی حکومت سے مقرر ہو کر آئے گی۔ اس وقت تک میں صبر سے کام لوں اور بار بار اپنا پاسپورٹ مانگ کر اسے دق نہ کروں۔ ساتھ ہی اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر میں نے مدینہ مدینہ کی رٹ لگا کر اسے زیادہ تنگ کیا' تو وہ رئیس المعلمین کے پاس میری شکایت کر دے گا اور رئیس المعلمین کو اختیار ہے کہ وہ میرا پاسپورٹ ضبط کر کے مجھے پولیس کے حوالے کر دے۔

معلم کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے خانہ کعبہ کی راہ لی۔ راستے میں چلتے چلتے میں دل ہی دل میں بڑی چالبازی اور چابکدستی اور بڑی فن کاری سے ایسے دعائیہ فقرے تراشتا خراشتا رہا' جن سے یہ مطلب نہ نکلے کہ میں خدانخواستہ مکہ معظمہ سے تنگ آ کر یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں' بلکہ جن سے فقط یہ ظاہر ہو کہ میں اللہ کے رسول

مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت میں مدینہ منورہ جانے کے لیے بے تاب ہوں۔ میں اسی ادھیڑ بن میں چلا جا رہا تھا کہ سڑک پر سامنے سے پاکستان ایمبیسی کی ایک کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ کار میں سفارت خانے کا کچھ عملہ سوار تھا۔ ان میں سے ایک صاحب مجھے پہچانتے تھے۔ انہوں نے کار روکی اور علیک سلیک کے بعد چھوٹتے ہی پوچھا:
آپ مدینہ منورہ چلیں گے؟"

"جی ہاں' ضرور۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔ "لیکن کیسے؟"

انہوں نے بتایا کہ خشکی کے راستے آیا ہوا پاکستانی حاجیوں کا ایک قافلہ آج شام جدہ سے مدینہ منورہ روانہ ہو رہا ہے۔ اگر میں اس میں شامل ہونا چاہوں تو ابھی ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر جدہ روانہ ہو جاؤں۔

میں نے بھاگ دوڑ کر کے روا روی میں الوداعی طواف کیا۔ نالے کے کنارے سے اپنے سامان کی پوٹلی اٹھائی۔ ایمبیسی کے عملے نے میرے معلم سے میرا پاسپورٹ وصول کیا' اور پورے ساڑھے تین گھنٹے کے اندر اندر میں راولپنڈی کی حج ٹرانسپورٹ کمپنی کے قافلہ میں بیٹھا ہوا جدہ سے بسوئے مدینہ رواں تھا۔ آں خنک شہرے کہ آں جا دلبراست!

اس زمانے میں جدہ سے مدینہ منورہ جانے والی سڑک پکی نہ بنی تھی۔ بس ایک کشادہ سا روڑے دار راستہ تھا' جو کہیں سے کچا تھا' کہیں سے سنگلاخ تھا' کہیں اونچا تھا' کہیں نیچا تھا اور بسیں اور ٹرک اور موٹر گاڑیاں اس پر ہچکولے کھاتی کشاں کشاں چلتی رہتی تھیں۔ شدید گرمی کی وجہ سے دن کے بیشتر حصہ میں ٹریفک بند رہتا تھا اور ساری رات اس پر گاڑیوں کی گہما گہمی رہتی تھی۔ ہمارا قافلہ بھی رات بھر چلتا رہا اور صبح دس بجے کے قریب مدینہ منورہ سے چار پانچ میل اس طرف رک گیال۔ یہاں پر ایک کنواں تھا جس پر رہٹ چل رہا تھا۔ قافلے والوں نے یہاں اتر کر غسل کیا اور نئے کپڑے پہنے۔ کچھ عقیدت مند بسوں پر دوبارہ سوار ہونے کی بجائے یہاں سے احتراماً پیدل چلنے لگے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے پیدل روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دور چل کر خیال آیا کہ

دیار حبیب میں جوتے پہن کر داخل ہونا بھی ایک طرح کی بے ادبی ہے۔ میں نے فوراً اپنے چپل کھول کر ہاتھ میں اٹھا لیے اور برہنہ پا چلنے لگا۔ دھوپ میں تپتے ہوئے سنگریزوں پر پاؤں پڑتے ہی میرے تلووں میں آگ کے شعلے سے لپکے اور حرارت کی لہریں بجلی کی کرنٹ کی طرح میرے جسم میں پھیل کر دماغ سے ٹکرانے لگیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر چپکے سے اپنے چپل دوبارہ پہن لیے۔ اپنے جذبہ احترام کے اس بودے پن پر مجھے اس قدر جھنجلاہٹ اور ندامت محسوس ہوئی کہ میں نے اپنے چپل پھر کھولے اور انہیں اٹھا کر سڑک سے دور جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ اب ننگے پاؤں چلنا ایک امر مجبوری تھا' لیکن میری خود فریبی اس مجبوری کو احترام کا نام ہی دیتی رہی۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چلنے کے بعد ایک موڑ آیا جس کی گولائی پر چند گاڑیاں رکی ہوئی تھیں اور بہت سے لوگ سڑک پر کھڑے والہانہ انداز میں درود و سلام پڑھ رہے تھے یہ اس بات کی علامت تھی کہ ان حضرات کو اپنا گوہر مقصود نظر آ گیا ہے۔ میری عمر اس وقت بتیس تینتیس برس تھی۔ اس طویل عرصہ میں میری آنکھوں نے زندگی کی کثافت اور رذالت اور رکاکت اور خباثت کے علاوہ اور کچھ بہت کم دیکھا تھا۔ اب جی چاہتا تھا کہ گنبد خضرا پر نگاہ ڈالنے سے پہلے ان گناہگار آنکھوں کو کسی قدر صاف کر لوں۔ اس مقصد کے لیے شاہراہ مدینہ کی خاک سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی تھی؟ میں نے اضطراراً چلتی ہوئی سڑک سے خاک کی ایک چٹکی اٹھائی اور اسے اپنی آنکھوں کا سرمہ بنا لیا۔

مسجد نبوی تک پہنچتے پہنچتے میری آنکھیں سرخ ہو کر سوج گئیں' اور راستہ نظر آنا مشکل ہو گیا۔ قدم قدم پر راہگیروں سے ٹکر لگتی تھی۔ مجھے اندھا سمجھ کر ایک بھلے آدمی نے میری رہنمائی کی اور مجھے باب جبریل تک پہنچا دیا۔

باب جبریل پر عاشقان رسول کا ہجوم تھا۔ اندر جانے والوں اور باہر آنے کا غیر منقطع تانتا بندھا ہوا تھا۔ ایک نورانی بزرگ چٹائی پر بیٹھے لوگوں کے جوتے سنبھالنے میں مصروف تھے۔

میری آنکھوں میں اب تک دھند سی چھائی ہوئی تھی اور بھیڑ کے ریلے میں پھنس کر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میں آگے بڑھ رہا ہوں یا پیچھے جا رہا ہوں۔ ایک مقام پر میں چند لوگوں سے ٹکرا کر بری طرح لڑکھڑایا اور جوتوں کے ڈھیر پر اوندھے منہ گر پڑا۔ جوتوں کی رکھوالی کرنے والے صاحب نے سہارا دے کر مجھے اٹھایا اور اپنے پاس چٹائی پر بٹھا لیا' وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتے تھے۔ میری آنکھیں سوجی ہوئی اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ اپنی صراحی سے پانی کا گلاس پلا کر انہوں نے ازراہ ہمدردی دریافت کیا کہ میری آنکھوں کو کیا مرض لاحق ہے۔ میں نے شاہراہ مدینہ کی خاک کی چٹکی والا واقعہ بے کم و کاست بیان کر دیا۔ اسے سن کر وہ بے اختیار رو پڑے اور مجھے وہیں بیٹھے رہنے کی ہدایت کی۔ عصر کی نماز سے پہلے وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے اور جالی مبارک کے سامنے کھڑے ہو کر بڑے سوز و گداز سے درود و سلام پڑھایا۔ نماز کے بعد وہ مجھے پھر اپنے پاس باہر چٹائی پر لے آئے۔

یہ صاحب مشرق اور مغرب میں بہت سے ملکوں کی سیاحی کر چکے تھے۔ عربی تو ان کی مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ ترکی' فارسی اور انگریزی خوب جانتے تھے۔ کسی قدر فرانسیسی زبان سے بھی آشنا تھے۔ اٹھارہ انیس برس سے روضہ رسول اور مسجد نبوی کی صفائی کے انتظامات کے ساتھ وابستہ تھے۔ حج کے زمانے میں جب زائرین کا رش بڑھ جاتا تھا' تو یہ صاحب رضا کارانہ طور پر باب جبریل کے باہر جوتے سنبھالنے کے کام میں بھی ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ انہوں نے میرا پاسپورٹ دیکھا اور ہنس کر بولے۔ "تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔ میری اردو بڑی کمزور ہے۔ آؤ انگریزی میں گفتگو کریں۔"

جب انہیں معلوم ہوا کہ میرے رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے' تو مغرب کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ جو مسجد نبوی کے بالکل قریب واقع تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کھانا کھلایا' اپنے کپڑوں کا ایک صاف جوڑا عنایت کیا۔ بازار سے نئے چپل لا کر دیئے اور ایک ڈاکٹر کی دکان پر جا کر میری آنکھوں میں دوا ڈلوائی۔ ساتھ ہی انہوں نے فرمایا کہ میں رات بھی ان کے ہاں گزاروں۔ میں نے التماس کی کہ اگر وہ مجھے باب جبریل

کے باہر اپنی چٹائی پر شب بسری کی اجازت دے دیں تو مجھ پر بڑا احسان ہو گا اس پر وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے اور پھر بولے۔ "اس کی اجازت تو نہیں' خیر' عشا کے بعد دیکھا جائے گا۔"

عشاء کے بعد جب مسجد نبوی کے دروازے بند ہو گئے تو وہ اندر ہی رہے' ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد اپنے سرکاری فرائض سے فارغ ہو کر باہر آئے اور مجھے ایک کاغذ دیا جس پر عربی میں کچھ لکھا ہوا تھا اور نیچے مہر لگی ہوئی تھی۔ فرمایا۔ "تم اس چٹائی پر رات گزار سکتے ہو۔ اگر کوئی اعتراض کرے تو یہ اجازت نامہ دکھا دینا۔"

تہجد کی اذان ہونے تک کئی سپاہیوں نے کئی بار آ کر مجھے ٹوکا' لیکن اجازت نامہ دیکھ کر وہ خاموش ہو جاتے تھے۔

ایک روز تو جوتے رکھنے والے صاحب نے اپنی کرم فرمائی کی انتہا کر دی۔ عشاء کے بعد جب مسجد نبوی کے دروازے بند ہونے لگے تو انہوں نے مجھے باہر نکالا اور تہجد کی اذان تک اپنے ساتھ اندر ہی رہنے دیا اور تھوڑی دیر کے لیے جالی مبارک کے اندر اس عرش بریں جیسی مقدس زمین پر مجھے اپنی پلکوں سے جاروب کشی کی اجازت بھی عطا فرمائی۔

اگلے روز انہوں نے مجھے مدینہ منورہ سے رخصت کر دیا۔ میں نے بہت عذر کیا کہ میرا یہاں سے ہلنے کو جی نہیں چاہتا' لیکن وہ نہ مانے۔ فرمانے لگے۔ پانی کا برتن بہت دیر تک آگ پر پڑا رہے' تو پانی ابل ابل کر ختم ہو جاتا ہے اور برتن خالی رہ جاتا ہے۔ دنیا داروں کا ذوق و شوق وقتی ابال ہوتا ہے۔ کچھ لوگ یہاں رہ کر بعد میں پریشاں ہوتے ہیں۔ ان کا جسم تو مدینہ میں ہوتا ہے' لیکن دل اپنے وطن کی طرف لگا رہتا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ انسان رہے تو اپنے وطن میں لیکن دل مدینہ میں لگا رہے۔"

وہ مجھے بسوں کے اڈے تک چھوڑ آئے اور جدہ جانے والی ایک بس میں مجھے ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی سیٹ دلوا دی۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد ہم نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک سیاہ فام افریقی نوجوان ننگے سر دھوپ میں پیدل چلا آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ

اس کی بیوی تھی۔ بیوی کی گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا۔ اس شدید دھوپ میں بھی یہ جوڑا بڑے اطمینان سے پاپیادہ مدینہ شریف کی طرف جا رہا تھا۔ ڈرائیور رحمدل آدمی تھا۔ بس روک کر اس نے ان مسافروں کو اپنی صراحی سے پانی پلایا۔ پانی دیتے ہوئے ڈرائیور نے انہیں بتایا کہ یہ پانی مدینہ سے آیا ہے۔ یہ سنتے ہی ان کے چہرے خوشی سے جگمگا اٹھے۔ انہوں نے ایک گھونٹ اپنے بچے کے منہ میں بھی ٹپکایا۔ پانی کے کچھ قطرے زمین پر گر گئے تھے۔ میاں بیوی نے جھک کر بھیگی ہوئی ریت اٹھائی' اور منہ میں ڈال لی۔

جدہ پہنچ کر بس اپنے اڈے پر رکی' تو سامنے طرح طرح کے ٹھنڈے مشروبات کی دکان نظر آئی۔ جدہ کی بندرگاہ پر اترنے کے بعد اب تک مجھے کوئی ٹھنڈی چیز پینے کا موقع نصیب نہ ہوا تھا۔ اب اس دکان کو دیکھ کر کوئی ٹھنڈی بوتل پینے کے لیے میرا دل بے اختیار مچلنے لگا۔ میں پیاسے اونٹ کی طرح اس دکان کی جانب لپکتا ہوا گیا۔ دکان میں عین سامنے ایک قد آدم آئینہ بھی لگا ہوا تھا۔ جب میں دکان کے قریب پہنچا' تو اس آئینے میں نظر آیا کہ میرے عین پیچھے سائے کی طرح لگا ہوا ایک نحیف و نزار' شکستہ صورت بڈھا بھی ہانپتا کانپتا اسی دکان کی طرف چلا آ رہا ہے۔ اس حالت زار پر رحم کھا کر میں ایک طرف ہو گیا' تاکہ مجھ سے پہلے اپنی خریداری کر لے' لیکن میں نے آئینے میں دیکھا کہ میری طرح وہ بھی اچک کر ایک طرف ہو گیا ہے۔ یہ نظارہ دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی' کیونکہ آئینے میں دراصل وہ میرا اپنا ہی عکس تھا۔ "آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے!" میں نے زور زور سے ہنس ہنس کر عرب دکاندار کو مخاطب کر کے یہ مصرعہ اتنی بار گنگنایا کہ وہ تنگ آ گیا۔ پاگل سمجھ کر اس نے یہ احتیاط بھی برتی کہ کوکا کولا کی قیمت پہلے وصول کی اور بوتل مجھے بعد میں دی۔ بوتل ابھی پوری طرح ختم نہ ہوئی تھی کہ دکاندار نے جھپٹ کر اسے میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ غالباً اسے یہ گمان گزرا ہو گا کہ یہ مخبوط الحواس شخص کہیں خالی بوتل کو پتھر پر مار کر توڑ نہ ڈالے۔ اپنی اس ہیئت کذائی پر کچھ حیران' کچھ پریشان اور کسی

قدر خوشی میں یہ شعر گنگناتا ہوا حاجی کیمپ کی جانب روانہ ہو گیا

مرا اک کھیل خلقت نے بنایا
تماشہ دیکھنے بھی تو نہ آیا

حاجی کیمپ میں معلم عبدالرزاق محبوب کا دفتر حاجیوں سے بدستور بھرا ہوا تھا۔ مکہ معظمہ میں نالے کے کنارے والے میرے چند سلہٹی ساتھی بھی وہاں بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "بابو' ہم نے خواب دیکھا کہ عبدالمصور نے دس ریال رشوت لے کر تمہارا ریٹرن ٹکٹ بنا دیا ہے۔"

ریٹرن ٹکٹ کا لفظ سنتے ہی میرا دل بلیوں اچھلنے لگا' اور میں نے بے صبری سے پوچھا "عبدلمصور کون ہے؟"

"بڑا چھپا ہوا بدمعاش ہے۔" سلہٹی ساتھی نے کہا۔ "نواکھیلی میں دس نمبر غنڈہ تھا۔ اب بھاگ کر کئی برس سے یہاں آ بیٹھا ہے۔ حاجیوں کو گھیر گھار کر پیسے بٹورتا ہے۔"

"اس وقت وہ کہاں ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"یہیں کہیں حاجی کیمپ میں بیٹھا کسی کو ٹھگ رہا ہو گا۔ اول درجے کا لفنگا ہے۔"

"خدا کے لیے مجھے اس سے ملاؤ۔" میں نے منت کی۔

میرے سلہٹی ساتھی نے بہت منع کیا کہ میں اس لپاٹئے کے چکر میں نہ پڑوں۔ لیکن میری مسلسل منت سماجت پر وہ میرے ساتھ چل کر اسے تلاش کرنے پر راضی ہو گیا۔ بڑی تگ و دو کے بعد وہ ایک چائے کی دکان پر بیٹھا مل گیا۔

میں نے اپنا سمندر جہاز کا ٹکٹ نکال کر اسے دکھایا اور کہا۔ "بھائی عبدالمصور' یہ جدہ سے کراچی کا ٹکٹ ہے۔ میری درخواست ہے تم اسے ریٹرن بنوا دو۔"

عبدالمصور نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ "اللہ کی نگری میں واپس آنے کا ٹکٹ یہاں نہیں بنتا۔ اوپر بنتا ہے۔" اس نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

میں نے دس ریال اس کے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ "بھائی اوپر ہی سے بنوا دو۔"
عبدالمصور نے دس ریال جیب میں ڈالے ہاتھ اٹھا کر بنگالی زبان مں کچھ من من کی' اور بولا۔ "چلو ریٹرن ٹکٹ تو ہو گیا۔ اب چائے پلاؤ۔"

دکان پر بیٹھے ہوئے کچھ لوگ یہ تماشہ دیکھ کر خوب ہنسے' انہوں نے عبدالمصور پر بہت سے پھبتیاں کسیں اور میرا بھی خوب مذاق اڑایا۔ میرے سلہٹی دوستوں نے میری چھیڑ ہی "ریٹرن ٹکٹ" ڈال دی۔ اب وہ مجھے میرے نام سے نہیں پکارتے تھے' بلکہ مذاق سے "ریٹرن ٹکٹ" کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ بات آخر عبدالمصور کی ہی پوری ہوئی' کیونکہ اس کے بعد مجھے ایک بار اور حج اور پانچ بار عمرہ ادا کرنیکی سعادت نصیب ہوئی۔

دو تین روز بعد کراچی جانے والا جہاز جدہ کی بندرگاہ پر آ گیا۔ ہماری ایمبیسی کا عملہ حاجیوں کو الوداع کہنے آیا ہوا تھا۔ انہوں نے جہاز میں مجھے ایک سنگل کیبن دلوایا جو ائیر کنڈیشنڈ تھا۔ اس میں فوم کے گدے کا برتھ تھا جس پر صاف ستھرا بستر لگا ہوا تھا' کیبن کا اپنا باتھ روم تھا۔ واش بیسن پر خوشبودار صابن کی نئی ٹکیا پڑی تھی۔ دائیں بائیں مختلف سائز کے رنگ دار تولیے لٹک رہے تھے........ کیبن میں داخل ہوتے ہی میری انا کا بے لگام گھوڑا جسے میں اپنی دانست میں مکہ معظمہ میں نالے کے کنارے چھوڑ آیا تھا۔ دولتیاں جھاڑتا سرپٹ بھاگتا ہوا آیا' اور ہنہنا کر ازسر نو اپنے تھا پر کھڑا ہو گیا۔

ساتھ ہی میرے ذہن میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی وہ غزل بھی دھند گئی جو حج کے دوران میری رگوں میں خون کی طرح رچ بس گئی تھی۔ یہ غزل ایک عجیب اور نادر فن پارہ ہے۔ ارکان حج' طواف کعبہ اور صاحب کعبہ کے حوالے سے ایک عاشق صادق کے جذب و مستی کا یہ ایک بے مثال اظہار ہے:

رقم چو بمکہ ہوس کوئے تو کر دم
دیدم رخ کعبہ ہوس روئے تر کردم

محراب حرم گرچہ بہ پیش نظرم شد
من سجدہ دلے درخم ابروئے تو کردم

درسعی طواف و بحطیم بمقامے
ہر سمت تمنا رخ نیکوئے تو کردم

لبیک دعا خواں ہمہ مخلوق بعرفات
چوں قبلہ نما من دل خود سوئے کر دم

در عرصہ عرفات بپا حشر نمو دم
چوں یاد من آں قامت و بجوئے تو کردم

قربانی حیواں بمعنی میکندعا
قربان سر خود من بسر کوئے تو کردم

"جب میں مکہ گیا تو میرے دل میں تمہارے کوچے کی آرزو تھی
کعبہ کا رخ دیکھا تو دل میں تمہارا رخ دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی
اگرچہ حرم کعبہ کی محراب میری نظر کے سامنے تھی
لیکن میں نے سجدہ صرف تمہارے خم ابروہی میں کیا
سعی میں طواف میں حطیم میں اور مقام ابرہیم پر
ہر جگہ ہر طرف میں نے تمہارے کوچے کے رخ کی تمنا کی

میدان عرفات میں ساری مخلوق لبیک کہہ کر دعائیں مانگ رہی تھی
لیکن میرا دل قبلہ نما کی طرح صرف تمہاری طرف متوجہ تھا
اپنے دل میں تمہارے دل پسند قد کا تصور کر کے میں نے

میدان عرفات میں قیامت برپا کر دی
مقام منا پر ایک دنیا جانوروں کی قربانی دیتی ہے
میں نے تمہارے کوچے کے سرے پر اپنا ہی سر قربان کر دیا"

وطن واپس پہنچ کر مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ میں حج کی منزل طے کر کے نہیں بلکہ محض سراب منزل کے پیچھے بھاگ کر واپس آیا ہوں' خدا جانے تشنگی کا یہ احساس کبھی کم بھی ہو گا یا نہیں۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم!

○○○

• جھوٹ' فریب' فراڈ اور حرص کی دلدل

سر تو میں نے منی میں منڈوایا تھا لیکن اولے کراچی آ کر پڑے۔ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن والوں نے بتایا کہ میری پوسٹنگ صوبہ پنجاب کے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے طور پر کر دی گئی ہے۔ اس لیے میں فوراً لاہور حاضر ہو جاؤں۔

یہ عجب بے تکی پوسٹنگ تھی۔ صنعت و حرفت کا نہ مجھے کچھ علم تھا اور نہ اس کا کاروبار سے کوئی دلچسپی تھی۔ لاہور پہنچ کر یہی بات میں نے وزیر اعلیٰ ملک فیروز خاں نون سے کہی اور اس کام کے لیے اپنی ناموزونیت کا کھل کر رونا رویا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے' اور کہنے لگے۔ اس پوسٹ پر آنے کے لیے بہت سے لوگ ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو پیسے نہ بنائے۔"

معلوم نہیں کہ چیف منسٹر کی اس بات سے میری ستائش منظور تھی یا میری آزمائش۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں پنجاب کے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی پوسٹ سونے کی کان سمجھی جاتی تھی۔ میرے پیشرو مسٹر بی۔ اے قریشی بڑے قابل اور دیانت دار افسر تھے۔ انہوں نے سالہا سال کی محنت سے اس محکمہ کو نہایت اعلیٰ خطوط پر منظم کیا تھا اور اب وہ اتنے سینئر ہو گئے تھے کہ ترقی پا کر یہاں سے تبدیل ہو رہے تھے۔

صنعت و حرفت کے علاوہ انہیں ادب' فنون لطیفہ اور علم آثار قدیمہ سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ چارج چھوڑنے سے پہلے انہوں نے دو ڈھائی ماہ مجھے اپنے سائے عاطفت میں رکھ کر محکمے کے پیچ و خم سے آگاہ کیا اور عملی ٹریننگ کا یہ وقفہ میرے لیے بڑا مفید ثابت ہوا۔

شیخ مسعود صادق وزیر صنعت تھے۔ یہ امرتسر کے ایک امیر کبیر اور مشہور مسلم لیگی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور بڑے شریف النفس' سیر چشم اور خوش باش انسان تھے۔ البتہ

سیاست ان کی گھٹی میں پڑی تھی' اس لے دفتری باضابطگیوں کو سیاسی مصلحتوں پر بے دریغ قربان کرنا ان کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ذاتی لحاظ سے البتہ وہ بڑے صاف گو

اور دیانتدار تھے۔

اس زمانے میں سیاسی مصلحت دراصل سیاسی رشوت کا دوسرا نام تھا۔ ایک روز میں نے اخبار میں خبر پڑھی کہ پنجاب کی کابینہ نے صوبہ میں بناسپتی گھی کی چند نئی فیکٹریاں قائم کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ مجھے اس منصوبے کا کوئی علم نہ تھا اور نہ ہی محکمہ صنعت کے ذریعہ اس قسم کی کوئی تجویز کابینہ میں پیش کی گئی تھی۔ اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ ہمارے دفتر میں فیکٹری لگانے کے خواہشمندوں کی درخواستیں دھڑا دھڑ آنا شروع ہو گئیں۔ درخواستوں کے ساتھ ساتھ پیروی کرنے والے سفارشی حضرات کا بھی تانتا بندھ گیا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں' کیونکہ مجھے اب تک اس فیصلہ کے متعلق سرکاری طور پر کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی تھی اور دوسرے لوگوں کی طرح میری معلومات بھی فقط اخباری خبر تک محدود تھیں۔ جب لوگوں کا دباؤ بڑھ گیا تو میں نے یہ صورت حال وزیر صنعت کے گوش گذار کی اور ان سے رہنمائی کا طلب گار ہوا۔ انہوں نے فرمایا۔ "درخواستیں داخل دفتر کرتے جاؤ اور جو لوگ ملنے آئیں انہیں خوش اسلوبی سے ٹالتے جاؤ۔"

اس بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ اخباروں میں شاید غلط خبر شائع ہو گئی ہے۔ اس لیے میں نے تجویز پیش کی کہ اگر اس خبر کی تردید کر دی جائے تو ہماری جان بہت سے بکھیڑوں سے بچ جائے گی۔

"خبر صحیح ہے۔" شیخ مسعود صادق نے فرمایا۔ "نئی فیکٹریاں منظور ہوئی ہیں اور انہیں مستحق پارٹیوں میں تقسیم بھی کر دیا گیا ہے۔"

یہ سن کر مجھے بڑی سبکی محسوس ہوئی اور سرکاری لحاظ سے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی پوسٹ نہایت بے ضرورت' فالتو اور غیر موثر نظر آنے لگی۔ میں نے وزیر صاحب سے گلہ

کیا کہ اگر وہ اپنے ڈائریکٹر کو اس فیصلے سے قبل اعتماد میں نہیں لے سکتے تھے تو کم از کم بعد میں ہی کچھ بتا دیا ہوتا۔

وزیر صاحب نے جواب دیا۔ "یہ فیصلہ ایک ہنگامی ضرورت کے تحت کیا گیا ہے۔ سیاست میں ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ان معاملوں میں زیادہ حساس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

بڑی بڑی صنعتوں کے فیصلے اسی طرح ڈائریکٹر کے علم اور مشورے کے بغیر اوپر ہی اوپر طے ہو جاتے تھے۔ ان فیصلوں میں کسی مربوط ترقیاتی پلاننگ کا عمل دخل بہت کم ہوتا تھا۔ ان کا دارومدار زیادہ تر انواع و اقسام کی مصلحتوں' خوشنودیوں اور عنایت فرمائیوں پر ہوا کرتا تھا۔

جہاں تک چھوٹی صنعتوں کا تعلق ہے اس زمانے میں پنجاب میں بجلی سے چلنے والی کھڈیوں (Power Looms) اور آرٹ سلک کی گرم بازاری تھی۔ جسے دیکھو اس کے سر میں پاور لوم کا پرمٹ اور آرٹ سلک یارن کا امپورٹ لائسنس حاصل کرنے کا سودا سمایا ہوا تھا۔ ارباب صنعت و تجارت کے علاوہ اسمبلیوں کے ممبر' سیاسی پارٹیوں کے بااثر کارکن' وزیروں کے حاشیہ نشین' کچھ بڑے افسروں کی بیگمات اور جلدی دولت کمانے کے دوسرے رسیا صرف اسی لیلائے آرزو کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے۔ اس دھما چوکڑی میں اگر کوئی سب سے پیچھے تھا' تو وہ بچارا پشینی نور باف تھا' جس کے آباواجداد صدیوں سے کھڈیوں کی دستکاری کے ساتھ وابستہ چلے آ رہے تھے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ سب سے پہلے ان لوگوں کی ضروریات کو پورا کیا جاتا اور اس کے بعد نئے آنے والوں کی باری آتی۔ رجسٹر آف کواپریٹو سوسائٹیز کے ساتھ مل کر ہمارے محکمے نے اس سلسلے میں تھوڑی بہت کوشش بھی کی لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کسی نے نہ سنی۔

پاور لوم کے پرمٹ مانگنے والوں کا زیادہ زور پانچ پانچ پاور لوم حاصل کرنے پر تھا۔ اس کے ساتھ انہیں کافی مقدار میں آرٹ سلک یارن کا امپورٹ لائسنس مل جاتا تھا' جسے بلیک مارکیٹ کر کے خاطر خواہ منافع کمایا جا سکتا تھا۔ کچھ لوگ تو پاور لومز کا پرمٹ

بھی دست بدست بلیک مارکیٹ میں بیچ ڈالتے تھے۔ معدودے چند لوگ جو اپنے پاور لوم خود چلانا چاہتے تھے' وہ بھی اپنی مشینوں کی تعداد پانچ سے زیادہ نہ بڑھاتے تھے' کیونکہ اس طرح وہ فیکٹری ایکٹ کی پابندیوں سے آزاد رہتے تھے۔ دو دو پاور لوم مانگنے والوں کی تعداد بھی بے شمار تھی۔ ان کا مقصد بھی پرمٹ حاصل کر کے اسے بلیک مارکیٹ میں بیچنا ہی ہوتا تھا ایسے بہت کم لوگ تھے جو ان مشینوں کو خود چلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

وزیر صاحبان جب دوروں سے واپس آتے تھے تو ان کے جلو میں پرمٹ لینے والوں کا ایک جم غفیر لاہور پہنچ جاتا تھا اور وزیروں کی سفارشات سے مزین درخواستیں لے کر میرے دفتر کا گھیراؤ کر لیتا تھا۔ اس سارے عرصہ میں فقط ایک پرمٹ ایسا تھا جو میں نے اس قسم کی سفارش یا دباؤ کے بغیر جاری کیا تھا۔ ایک روز ہمارے ممتاز ادیب اور دانشور مسٹر اے حمید مجھے ملنے آئے۔ وہ ان دنوں بے کار تھے اور پاور لوم کی کرشمہ سازی کا چرچا سن کر انہیں بھی اس لائن میں قسمت آزمائی کا خیال آیا۔ میں نے بڑی خوشی سے انہیں چند پاور لوموں کا پرمٹ دے دیا۔ دو ڈھائی ماہ بعد وہ پھر میرے دفتر میں آئے' اور بولے۔ "اس کاروبار کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کام میرے بس کا روگ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے پرمٹ مجھے واپس کر دیا۔ اس کی دلنشین تحریروں کی طرح اس صاحب طرز ادیب کا کردار بھی اتنا صاف اور بے داغ تھا کہ اس نے اپنے پرمٹ کو بلیک مارکیٹ میں بیچنا بھی گوارا نہ کیا۔

پاور لوم اور آرٹ سلک یارن کے علاوہ میرا براہ راست واسطہ گندگی کے ایک اور ڈھیر سے بھی تھا۔ اس کا تعلق تارکین وطن کی صنعتی املاک سے تھا۔

آزادی کے وقت جو ہندو اور سکھ بھارت چلے گئے تھے' وہ صوبہ پنجاب میں بہت سی فیکٹریاں' سینما گھر اور دیگر صنعتی ادارے چھوڑ گئے تھے۔ حکومت پاکستان کا فیصلہ تھا کہ ان فیکٹریوں اور صنعتوں کو کسی صورت میں بھی بند نہ ہونے دیا جائے اور انہیں ان مسلمان مہاجرین کو الاٹ کر دیا جائے جو اسی قسم کا کاروبار یا جائداد بھارت میں چھوڑ آئے ہیں۔ اس

مقصد کے لیے ایک بورڈ قائم کیا گیا تھا اور ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے میں بھی اس بورڈ کا ممبر تھا۔

بورڈ قائم ہوتے ہی درخواستوں کا ایسا سیلاب امڈ آیا کہ الامان و الحفیظ۔ جو کلیم داخل ہوئے ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ امرتسر سے لے کر دہلی' لکھنؤ اور پٹنہ تک جتنے صنعتی ادارے اور سینما گھر تھے' وہ زیادہ تر مسلمانوں ہی کی ملکیت تھے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ مطالبے ضرور جائز حقوق پر مبنی ہونگے لیکن بہت سے کلیم صریحاً جھوٹ فریب اور جعلسازی کی پیداوار تھے۔ جتنا بڑا آدمی ہوتا تھا' اتنا ہی بڑا کلیم ہوتا تھا اور اس کی تہہ میں اتنا ہی بڑا جھوٹ اور فریب کارفرما تھا۔ کچھ لوگ بہ نفس نفیس بھارت جاتے تھے اور وہاں پر متروکہ املاک کے کسٹوڈین کے دفتر سے اپنی مرضی کے مطابق کاغذات اور سرٹیفکیٹ بنوا لاتے تھے۔ بھارتی کسٹوڈین کے دفتر میں جعلسازی کی فیکٹری کھلی ہوئی تھی۔ رشوت کے ریٹ مقرر تھے اور منہ مانگی رشوت دے کر ہر قسم کی ملکیت کی تصدیق کرائی جا سکتی تھی۔ اس صنعتی املاک کی تقسیم نے حرص و ہوا کے جو دروازے کھولے' اس نے ہمارے معاشرے میں اخلاقی گلن' سڑن' بداطواری' بددیانتی۔ جھوٹ' فریب اور جعلسازی کو بڑا فروغ دیا۔

ایک روز میں دفتر سے گھر واپس آیا' تو برآمدے میں ایک صاحب بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے عربی لباس پہنا ہوا تھا اور عطر کی خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔ ان کی بڑی شاندار سیاہ داڑھی تھی' آنکھوں میں سرمہ تھا اور ہاتھ میں سفید منکوں کی تسبیح کھٹاکھٹ چل رہی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ابھی حال ہی میں عمرہ کر کے آئے ہیں اور کل رات داتا صاحب کے مزار پر مراقبہ کر رہے تھے۔ داتا صاحب نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ میری خدمت میں حاضر ہو کر مجھے تحفہ دیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے ایک جانماز' ایک تسبیح' آب زمزم کی ایک سر بمہر کپی اور چند کھجوروں کا تحفہ دیا اور ساتھ ہی فرمایا' ''حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ میں آپ

کو اپنے ساتھ لے کر ان کے مزار پر حاضری دوں۔ آپ وضو کر کے تیار ہو جائیں۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"

یہ نادر شاہی حکم مجھے عجیب سا لگا۔ بھلا داتا صاحب کو کیا پڑی ہے کہ وہ ایک اجنبی کو اس طرح میرے پیچھے بھگاتے پھریں۔ ان کی بات کا مجھے یقین تو نہ آیا' لیکن ان کی نورانی وضع قطع کے سامنے صاف طور پر انکار کرنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ میں نے کسی اور وقت حاضری دینے کا بہانہ بنایا تو وہ جلال میں آ گئے اور بزرگوں کے احکام کی نافرمانی کے سنگین نتائج سے مجھے خوب ڈرایا۔ ان کی چرب زبانی سے مرعوب ہو کر میں نے طوعاً و کرہاً انہیں اپنی کار میں بٹھایا اور داتا صاحب پہنچ گیا۔

داتا صاحب پہنچتے ہی دس بارہ آدمیوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک صاحب نے سبز رنگ کی باریک ململ کا دوپٹہ میرے سر پر پگڑی کے طور پر باندھ دیا۔ کچھ لوگوں نے میرے گلے میں گیندے کے پھولوں کے ہار ڈالے اور پھر وہ سب مجھے دھکیل دھکال کر ایک حجرے میں لے گئے۔ حجرے میں بیٹھتے ہی نعت خوانی شروع ہو گئی اور پھر پلاؤ' زردہ' قورمہ' کباب' مرغ مسلم اور طرح طرح کی نعمتوں سے بھری ہوئی قابوں کا تانتا لگ گیا۔ میں نے کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے صاف انکار کر دیا۔ سب نے شور مچایا کہ یہ داتا صاحب کا تبرک ہے۔ اسے کھا کر برکت حاصل ہوتی ہے لیکن میں معافی مانگ کر اٹھنے لگا' تو اچانک عربی لباس والے بزرگ نے کاغذوں کا ایک پلندا میرے حوالے کر کے کہا۔ آپ اسے گھر جا کر پڑھیں۔ اس میں جو لکھا گیا ہے وہ حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کی ہدایات کے عین مطابق ہے۔ اس پر عمل کرنے سے آپ کو فلاح نصیب ہو گی۔"

یہ کاغذات ایک متروکہ سینما ہاؤس کی الاٹمنٹ کے متعلق تھے۔ میں نے دفتر سے متعلقہ فائل نکلوا کر دیکھی تو یہ عقدہ کھلا کہ عربی لباس والے بزرگ ایک شہر کے لوکل باشندے اور پیر تھے۔ وہاں پر ایک مقامی سینما انہوں نے جعلسازی سے اپنے نام الاٹ کرا رکھا

تھا۔ اب انہوں نے درخواست دے رکھی تھی کہ یہ الاٹمنٹ ان کے نام کنفرم کر دی جائے! میں نے داتا صاحب والے ڈھونگ کا قصہ بورڈ کے ایک اور ممبر کو سنایا' تو انہوں نے بتایا کہ یہی حضرت ان کے پاس کچھ "اور طرح کا سامان" لے کر تشریف لائے تھے اور غصہ میں آ کر انہوں نے ان پر اپنا کتا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس بات کا افسوس رہا کہ بورڈ نے صرف ان کے سینما کی الاٹمنٹ منسوخ کی اور ان پر جعلسازی کا مقدمہ دائر نہ کیا۔

ایک صاحب نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ وہ جو جائداد بھارت چھوڑ آئے ہیں ان میں دلی کا لال قلعہ بھی شامل ہے۔ انہیں اس کی قیمت اور تاریخی عظمت کے مطابق معاوضہ دیا جائے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کا شجرہ نسب آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ براہ راست ملتا ہے۔

ایک سرکس والے نے اپنے شیر کا معاوضہ مانگا تھا' جسے وہ بھارت چھوڑ آیا تھا۔ بورڈ کے ممبروں نے اسے بتایا کہ ہم تو صرف غیر منقولہ جائداد کا معاوضہ دیتے ہیں۔ شیر تو چلتا پھرتا متحرک درندہ ہے' اس کا معاوضہ دینا بورڈ کے اختیار میں نہیں۔ سرکس والے نے برجستہ جواب دیا' "صاحب' شیر تو پنجرے میں بند رہتا ہے۔ پنجرہ تو غیر منقولہ ہے۔"

ایک صاحب پانچ تانگے بھارت چھوڑ آئے تھے اور ان کے عوض کسی فیکٹری کے طلبگار تھے۔ ان سے بھی یہی کہا گیا کہ تانگے غیر منقولہ جائداد کے شمار میں نہیں آتے' اس لیے ہمارا بورڈ ان کا معاوضہ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اس پر درخواست دہندہ نے کہا' "جناب' میرے تانگے غیر منقولہ تھے' کیونکہ میں ان میں گھوڑے نہیں جوتتا تھا۔"

ایک شخص محمد دین نے ضلع لدھیانہ کے کسی گاؤں میں آٹا پیسنے کی مشین لگائی ہوئی تھی۔ اس نے اس کی مالیت دو ہزار دو سو روپے درج کی ہوئی تھی۔ مشین خریدنے کی اصل رسید بھی درخواست کے ساتھ منسلک تھی۔ ہمارا بورڈ پانچ ہزار روپے سے زیادہ مالیت کے اثاثوں کا فیصلہ کرتا تھا۔ میں نے محمد دین سے کہا کہ اگر اس نے اپنی مشین کی قیمت دو ہزار دو سو کی جگہ پانچ ہزار روپے درج کی ہوتی تو بورڈ اسے ضرور معاوضہ دے

دیتا۔ کیونکہ اس کے کاغذات بڑے صاف اور سچے ہیں۔

اس نے جواب دیا۔ "اچھا میری قسمت ہی دو ہزار دو سو ہے تو میں پانچ ہزار کیسے لکھ دیتا۔"

میں نے کہا۔ "تم نے یہ مشین آٹھ برس پہلے خریدی تھی۔ اب تو قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ اب تو اس کی قیمت پانچ ہزار سے اوپر ہو گی۔"

محمد دین ہنسا۔ "صاحب' آپ بھی بڑے بھولے ہیں۔ پرانی ہو کر تو مشین کی قیمت گھٹتی ہے' بڑھا نہیں کرتی۔"

محمد دین کو ہم کچھ نہ دے سکے' لیکن وہ ہمیں بہت کچھ دے گیا۔ صبح سے لے کر شام تک ہمارے بورڈ کو جھوٹ' فریب اور لالچ کے جس طوفان بے تمیزی کا سامنا کرنا پڑتا تھا' اس ماحول میں محمد دین جیسے انسان دیانت اور امانت اور پاکیزگی کے وہ ستون تھے جن کی برکت سے قومیں زندہ رہتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں۔

اسی زمانے میں حکومت پنجاب نے بوریوالا میں ایک ٹیکسٹائل مل قائم کرنے کا ڈول بھی ڈال رکھا تھا۔ باقی بہت سے سرکاری منصوبوں کی طرح اس فیکٹری کی تعمیر میں بھی غیر معمولی تاخیر واقع ہو رہی تھی۔ مل کی تعمیر پر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا جو عملہ مامور تھا اس کا مستقل واویلا یہی رہتا تھا کہ رقم ختم ہو گئی ہے۔ مزید فنڈ فوراً فراہم کئے جائیں۔ ایک روز میں وزیر صنعت شیخ مسعود صادق کے ہمراہ بوریوالا گیا۔ صورت حال کا معائینہ کرنے پر منکشف ہوا کہ تخمینہ سے کہیں زیادہ رقم خرچ ہو چکی ہے لیکن کام ابھی تک جوں کا توں ادھورا پڑا ہے۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے چند سینئر افسروں کو جمع کر کے وزیر صاحب نے ان کو خوب آڑے ہاتھوں لیا اور یہ دھمکی دی: "تم لوگوں کا ہاضمہ بڑا تیز ہے۔ سارے کا سارا بجٹ ہضم کر بیٹھے ہو اور کام ابھی پورا نہیں ہوا۔ اب مزید کچھ رقم نہیں آئے گی۔ دو ماہ کے اندر اندر کام ختم نہ ہوا تو ہماری بجائے پولیس ہتھکڑیاں لے کر آئے گی۔"

یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور خدا خدا کر کے فیکٹری کی تعمیر پایہ تکمیل تک پہنچی۔ دوراندیشی سے کام لے کر صوبائی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اس ٹیکسٹائل مل کو چلانے کے لیے مناسب شرائط پر حبیب بنک کے حوالے کر دیا جائے۔ ورنہ فیکٹری کی کارگزاری بھی محکمانہ سرخ فیتے میں الجھ کر رہ جائے گی۔

اس سلسلے میں حبیب بنک کے جو نمائندے چند بار مجھے ملنے آئے' ان سے میں بہت متاثر ہوا۔ یہ جواں سال' خوش لباس اور خوش کلام نمائندے اپنے بینک کی نمائندگی نہایت رکھ رکھاؤ' خوش اخلاقی' خودداری اور صاف گوئی سے نبھاتے تھے۔ ان کا نام آغا حسن عابدی اور ابن حسن برنی تھا۔ متروکہ صنعتوں کی الاٹ منٹ حاصل کرنے اور جھوٹ' فریب' فراڈ اور حرص کے مارے ہوئے ہجوم سے نپٹ کر جب ان دو حضرات سے ملاقات ہوتی تھی تو اچانک یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تازہ ہوا کا جھونکا آ جائے۔ بوریوالا مل کے علاوہ کبھی کبھی ادب آرٹ اور موسیقی پر بھی دلچسپ گفتگو ہو جاتی تھی۔ سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر میں نے ان دونوں کے ساتھ کوئی خاص یا غیر معمولی سلوک نہیں کیا۔ لیکن یہ ان کے حسن اخلاق کی دلیل ہے کہ اس زمانے سے لے کر آج تک انہوں نے میرے ساتھ انتہائی باخلوص' بے لوث' بے ریا اور بے غرض دوستی کا رشتہ نبھایا ہے۔

بنکاری کی دنیا میں آج آغا حسن عابدی کا نام سارے جہان میں نہایت آب و تاب سے گونج رہا ہے۔ حبیب بنک لاہور کی برانچ سے اٹھ کر انہوں نے بنکاری کی عالمگیر برادری میں جو مقام پیدا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن یہ حیرت ناک کامیابی ان کی خوش اخلاقی' خوش کلامی اور انسان دوستی پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔ اپنے جیٹ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر دنیا بھر میں مشین کی طرح کام کرتے ہوئے بھی اگر کہیں ان کا کوئی پرانا دوست یا رفیق کار نظر آ جائے تو اس کے ساتھ خلوص اور تپاک سے ملنے میں ہمیشہ پہل کرتے ہیں۔ ان کی شدید مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ بسا اوقات وہ ایک ایک ملک میں چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں ٹھہر پاتے۔ لیکن کوئی دوست مل کر گھنٹوں بیٹھا رہے' تو نہ تو وہ کسی بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور نہ ہی بار بار اپنی گھڑی کی جانب

نگاہ ڈالتے ہیں۔

حبیب بنک میں تقریباً ۱۲ سال گزارنے کے بعد انھوں نے یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ (یو۔ بی۔ ایل) کی بنیاد ڈالی' جس نے پاکستان میں بینکاری کو ایک نئی روش اور ایک نئے معیار سے روشناس کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نیشنل بینک کے بعد ہمارے وطن کا یہ دوسرا سب سے بڑا بینک مان لیا گیا' جس کی پاکستان میں ۹۱۲۔ اور بیرون ملک میں ۲۴ برانچیں کھل گئیں۔ اندرونی برانچوں میں ۲۲۴ شاخیں مشرقی پاکستان میں قائم تھیں۔ یو بی ایل نے بین الاقوامی سطح پر اپنا خاص رنگ جمایا اور خلیج کی امارات سمیت مشرق وسطیٰ میں تیل کی حکومت میں جب یو۔ بی۔ ایل قومیا لیا گیا تو آغا صاحب نے بھی اپنی مالیاتی مہارت کا رخ مغرب کی جانب موڑ دیا۔

مغربی دنیا میں آغا حسن عابدی کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی حقیقت ایک افسانے سے بھی زیادہ عجیب اور حیران کن ہے۔

انھوں نے بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل کے نام سے ایک بین الاقوامی ادارہ قائم کیا' جس کے صدر نشین وہ خود ہیں۔ یہ بینک ایک واحد اور مکمل بالذات ادارہ نہیں' بلکہ اپنے ساتھ ملحق ایک وسیع اور متنوع مالیاتی فنون کے اداروں کے مجموعے کا مرکز ہے۔ تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن بھی اس مجموعے کا ایک حصہ ہے۔ بی۔ سی۔ سی۔ اینڈ آئی کی دنیا بھر کے ستر ممالک میں ساڑھے تین سو سے زیادہ شاخیں کام کر رہی ہیں۔ اس کا ہیڈ کوارٹر نمبر ۱۰۰ لیڈن ہال سٹریٹ لندن میں ہے۔ اسی گلی میں ذرا سے فاصلے پر وہ مقام ہے جہاں پر ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ڈالی گئی تھی' جس نے رفتہ رفتہ برطانیہ کی ایسی شہنشاہی کی داغ بیل ڈالی جس کی قلمرو پر سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا۔

اکتوبر ۱۹۸۱ء میں لندن میں وہاں کے ایک مشہور رسالے "نیو سٹیٹسمین (New Statesman) کا ایک شمارہ میری نظر سے گزرا۔ اس کے سرورق پر آغا حسن عابدی کی بڑے سائز کی رنگین تصویر تھی' جس کے نیچے یہ درج تھا: "ہائی سٹریٹ کا بینکر جو حکومتیں خرید

لیتا ہے۔" (The High- Street Banker who buys Governments) رسالے کے اندر بی۔ سی۔ سی۔ آئی کے حوالے سے آغا صاحب کے بارے میں چار صفحات کا طویل مضمون بھی درج تھا۔ مضمون کا فقرہ فقرہ حسد' رقابت' خوف' اور نفرت کی بھٹی میں بجھا ہوا تھا' جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ صاحب مضمون کے مطابق بی۔ سی۔ سی۔ اینڈ آئی ایک ایسا بینک تھا' جو خطرناک تیز رفتاری سے دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل رہا تھا۔ اس مضمون کے مطابق جنوبی امریکہ' لاطینی امریکہ' افریقہ' ایشیا' مشرق وسطٰی اور یورپ کے اہم کاروباری مراکز میں پاؤں جمانے کے علاوہ انگلستان میں بھی اس کی پچاس سے اوپر برانچیں قائم ہو چکی تھیں۔ ترقی اور وسعت کی یہ تیز رفتاری انگلستان کے اونگھتے ہوئے سست رو' سردمہر' بے حس اور سرخ فیتوں میں جکڑے ہوئے غیر مثالی بینکوں کے لیے ایک زبردست خطرے کا نشان بن گئی تھی۔ ایک طرح سے ایک پاکستانی اس بینک کو قائم کر کے برطانوی سامراج کی ڈیڑھ دو صدی کا قرضہ کم از کم اقتصادی شعبے میں بڑی کامیابی سے چکا رہا تھا۔

اس تنقیدی اور تنصیبی مضمون کے مطابق بی۔ سی۔ سی اینڈ آئی کی مثال ترقی اور تعمیر کا راز اس کے پریذیڈنٹ آغا حسن عابدی کی مالیاتی اور اقتصادی مہارت میں نہیں بلکہ ان کی سیاسی شعبدہ بازی میں مضمر تھا۔ اس سیاسی مہارت سے کام لے کر وہ بہت سے ملکوں کے سربراہوں اور حکومتوں کو اپنی مٹھی میں رکھتے تھے اور ان کی سرپرستی سے فائدہ اٹھا کر اپنے بینک کو ترقی دیتے تھے۔

یہ مضمون پڑھ کر مجھے یہ کرید لگ گئی کہ میں آغا صاحب سے مل کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ ان کی ترقی کا اصلی راز کیا ہے' جس کی وجہ سے ان کے خلاف حسد اور بغض کے اتنے بڑے بدنام کن شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد لیڈن ہال سٹریٹ والے ہیڈ کوارٹر میں مجھے یہ موقع مل گیا۔ بینک کی ایک پانچ چھ گھنٹے کی طویل میٹنگ سے فارغ ہو کر جب وہ مجھے ملے تو ہشاش بشاش تھے۔ ہماری ملاقات تقریباً دو گھنٹہ تک جاری رہی۔ اپنے کام کے حوالے سے انہوں نے کوئی بلند بانگ دعوٰی کئے

بغیر اپنے طریق کار پر بڑی فصاحت اور انکساری سے جو روشنی ڈالی' میرے لیے وہ کاروباری دنیا میں ایک نئے اور اچھوتے انداز کا فلسفہ تھا۔ ان کی گفتگو سے میں نے جو تاثر لیا' وہ کچھ یوں تھا۔

بینک ہو یا فیکٹری' کاروباری ادارے ہوں یا کمپنیاں ان میں سرمایہ کاری کا بنیادی مقصد منافع کمانا ہوتا ہے۔ منافع کی کمی بیشی اس ادارے کی کامیابی یا ناکامی کا واحد پیمانہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ پیمانہ صحیح نہیں۔ کامیابی کا اصلی راز اس امر کے ساتھ وابستہ ہے کہ ادارے کے انتظامی اور انصرامی امور کے افراد (Management) مادی سرمایہ میں اخلاقی سرمایہ کس تناسب سے ملاتے ہیں۔ اگر یہ تناسب صحیح ہو' تو انصرام میں مادی اور اخلاقی اقدار کا امتزاج ایک سچی کامیابی کو جنم دیتا ہے۔

مینجر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی نفسیات میں پوری طرح گھل مل جائے' یا ان کی نفسیات کو خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ کرے۔ اس عمل سے مینجر اور اس کے رفقاء الگ الگ فرد نہیں رہتے' بلکہ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ ایک ادارہ بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے انصرامی انتظامیہ کا بالا دست گورننگ بورڈ صرف بورڈ روم کی چار دیواری میں مقید نہیں رہتا' بلکہ سارے کا سارا بورڈ ہر سطح پر ایک فعال کارکن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس عمل سے اختیارات کی مرکزیت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہر سطح پر اختیارات کا خود اپنا مرکز بن جاتی ہے۔ اس بندوبست کی کامیابی کا گر لامرکزیت ہے۔

مینجر میں محض فہم ہی نہیں بلکہ فراست کا موجود ہونا لازمی ہے۔ اگر اس کی فراست حالیہ ماحول اور مقصدیت کے محدود دائرے سے نکل کر آگے پھیل جائے تو مستقبل کے امکانات کے علاوہ زندگی کا اعلیٰ مقصد بھی اس پر عیاں ہونے لگتا ہے۔ اس سے محدود مقصد اور لامحدود امکانات میں حقیقت پسندانہ توازن بھی قائم ہو کر برقرار رہتا ہے۔

وہ مینجر ناکام ہے جو اپنے سے بہتر اپنا جانشین تیار نہیں کرتا۔

صرف مالی منافع کمانا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ روحانی منافع کمانا بھی ضروری ہے۔

روحانی منافع صرف اس صورت میں وجود میں آتا ہے۔ جب ہم سچائی سے یہ کہہ سکیں کہ ہم نے اپنی جانب سے دیا تو زیادہ ہے اور دوسروں سے حاصل کم کیا ہے۔

روحانی منافع عجز اور انکساری کو فروغ دیتا ہے اور دل میں دوسروں کو دینے کی امنگ ابھارتا ہے۔ دینا ذات الٰہی کی صفت ہے۔ اس صفت کو اپنانے سے قلب' ضمیر اور روح میں ایک عجیب نور جگمگانے لگتا ہے۔

دوسروں کو دینے کا راستہ کشادہ کرنے کی ذمہ داری بی سی سی آئی فاؤنڈیشن کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام انواع و اقسام کے فلاحی ادارے چل رہے ہیں۔ کہیں پر ہسپتال' کہیں محروم اور نادر بچوں کے لیے اعلیٰ سکول' کہیں ایسی کمیٹیاں جو بیمار یا معذور یا مرحوم ادیبوں' فنکاروں اور کھیل کے میدان میں نام پیدا کرنے والے کھلاڑیوں کے خاندانوں یا پسماندگان کے لیے طرح طرح کی مالی امداد فراہم کرتی ہیں۔

جس ملک میں بینک کی برانچ جس قدر منافع کماتی ہے۔ اس کا ایک مقررہ حصہ اسی ملک کے اس طرح کے فلاحی اداروں پر ضرور صرف کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بینک کے ۱۰۰۰ ملازمین کو ہر برس پورے سال کی تنخواہ کی ۲ ۱/۲ سے ۳ ۱/۲ فیصد تک اضافی رقم بھی اس شرط پر ادا کی جاتی ہے کہ وہ اسے اپنی ذات پر خرچ نہیں کریں گے بلکہ دوسروں کے کام میں لائیں گے۔ کوئی ملازم اس کو کس حد تک پورا کرتا ہے' اس کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہیں کی جاتی۔ یہ معاملہ شخص کے اپنے ضمیر اور اعتماد پر چھوڑ دیا جاتا ہے' تاکہ بینک کے ملازمین میں دوسروں کو دینے کی عادت ڈالنے کی ترغیب دی جائے۔

جس وقت یہ طویل ملاقات ختم ہوئی تو شام کے ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ بینک کی دس گیارہ منزلہ عمارت سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سب لوگ گھر جا چکے تھے۔ آغا حسن عابدی کے عملے کا صرف ایک افسر موجود تھا۔ آغا صاحب مجھے لفٹ تک چھوڑنے آئے اور اپنے افسر کو میرے ساتھ نیچے بھیجا کہ وہ مجھے بینک کی کار میں بٹھا کر میری قیام گاہ تک پہنچانے کا بندوبست کر آئے۔

میری قیام گاہ وہاں سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر تھی۔ سڑکوں پر لندن کی شام کا ٹریفک سیلاب کی طرح امڈا ہوا تھا اور میں کار میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ آغا حسن عابدی سرمایہ داروں کے جھرمٹ میں درویشی کی تعلیم دے رہے ہیں یا درویشوں کی منڈلی میں سرمایہ داری کا بیج بو رہے ہیں!

آغا صاحب کے ایک ہمدم دیرینہ ابن حسن برنی کے ساتھ میری بیس بائیس برس پرانی دوستی ہے۔ پہلے وہ حبیب بنک میں ملازم تھے۔ بوریوالا ٹیکسٹائل مل حبیب بینک کے پاس آئی' تو اس کے جنرل مینجر مقرر ہوئے۔ یونائیٹڈ بینک کی بنیاد پڑی تو آغا صاحب انہیں اپنے ساتھ یو۔ بی۔ ایل لے گئے۔ آج کل بی۔ سی۔ سی اینڈ آئی کے لندن ہیڈکوارٹر میں ایک اہم اسامی پر تعینات ہیں۔

برنی صاحب محض بینکنگ کے تجربہ کار ماہر ہی نہیں بلکہ ایک نہایت اعلیٰ اور شائستہ ادبی ذوق کے مالک بھی ہیں' جو ان کو ورثہ میں ملا ہے۔ ان کے والد مرحوم سید حسن برنی صاحب ایک کامیاب وکیل ہونے کے علاوہ ایک صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ اپنے زمانے کے اخبارات اور رسائل میں علمی' ادبی' تاریخی اور تمدنی موضوعات پر ان کے مضامین کثرت سے چھپتے رہتے تھے۔ ان مضامین کو دلچسپی اور افادیت کے پیش نظر انجمن ترقی اردو نے کافی محنت اور ریسرچ سے ان کا کھوج لگا کر انہیں دو جلدوں میں مرتب کیا۔ پہلی جلد "مقالات برنی" کے عنوان سے انجمن کے تحت شائع ہو چکی ہے۔ دوسری جلد کی تکمیل پر بھی کام ہو رہا ہے۔ یہ مضامین اردو زبان کے ایک خاص دور کے اسلوب بیان اور ماضی اور حال کی سیاست' ثقافت اور شرافت کا دلچسپ تقابلی مرقع ہیں۔

مشہور زمانہ "قادیانی مذہب" نامی کتاب کے مصنف الیاس برنی بھی برنی صاحب کے نہایت قریبی عزیز تھے۔ اس علمی اور ادبی ماحول میں آنکھ کھول کر ابن حسن برنی نے بھی طالبعلمی کے زمانے میں لکھنے لکھانے کا شوق کسی حد تک نبھایا۔ لیکن کارکنان قضا و قدر نے ان کا نام بینکنگ کے کھاتے میں ڈال رکھا تھا۔ جب نوابزادہ لیاقت علی خاں متحدہ ہندوستان کی عبوری حکومت میں وزیر خزانہ تھے' تو انہوں نے برنی صاحب کو مشورہ دیا

کہ حبیب بینک پڑھے لکھے مسلمان نوجوانوں کو پاکستان میں بینکاری کا نظام سنبھالنے کی تربیت دے رہا ہے۔ انہوں نے یہ مشورہ بسروچشم قبول کر لیا' اور بمبئی جا کر حبیب

بینک میں بھرتی ہو گئے۔ لیکن پینتیس چھتیس برس کی انتہائی مصروف اور کامیاب بینکر کی زندگی نے ان کے علمی اور ادبی ذوق پر کوئی زنگ نہیں لگنے دیا۔ وہ اب بھی نہایت شگفتہ نثر اور اچھی نظمیں لکھنے کی عمدہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ ابن انشا کی پہلی برسی پر لندن کے "جنگ" ایڈیشن میں "پھر ترا وقت سفر یاد آیا...." کے عنوان سے ان کا جو مضمون شائع ہوا تھا وہ آسانی سے فراموش ہونے والی تحریر نہیں۔ ایک روز انہوں نے لندن میں اپنی بیاض کے کچھ حصے مجھے تخلیہ میں سنائے تھے ان میں بیان کا نکھار اور خیالات کی پختگی اور گہرائی تھی۔ میں نے بہت زور دیا کہ ان کی بیاض کے کچھ حصے ضرور شائع ہونے چاہئیں' لیکن وہ نہ مانے۔ خدا کرے کسی روز مان جائیں۔

برنی صاحب پابند صوم و صلوٰۃ ہی نہیں بلکہ دفتر کی گونا گوں مصروفیات میں بھی چپکے سے اٹھ کر کسی خاموش کونے میں جا کر نماز ادا کر آتے ہیں۔ حج کا فریضہ ادا کرنے کے علاوہ عمرہ کی سعادت بھی کئی بار حاصل کر چکے ہیں۔ لندن اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی حلال یا غیر حلال گوشت کی تمیز روا رکھتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پروان چڑھنے والے منصوبوں کے طفیل بے شمار نادار مریض شفایاب ہو رہے ہیں' بہت سے سوگوار خاندان سکون کی زندگی گزار رہے ہیں' یتیم بچوں کی تعلیم جاری رکھنے کے بندوبست ہو رہے ہیں اور یتیم بچیوں کی شادی کے اخراجات میں فیاضی سے حصہ لیا جا رہا ہے اور بے شمار بیواؤں کے ماہانہ گزارہ الاؤنس بھی مقرر ہیں۔ اس وسیع پیمانے پر ایسے فلاحی اور امدادی اقدامات کی کوئی تشہیر نہیں کی جاتی۔ ان کی بیاض کی طرح ان کی انتظامی اور فلاحی کارگزاریاں بھی صیغہ راز ہی میں رہتی ہیں۔ لیکن خدائے رحیم و کریم اور خالق علیم و بصیر سے یہ کار خیر کس طرح چھپا رہ سکتا ہے؟

پنجاب کے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے اے حمید' آٹا پیسنے کی چکی والا محمد دین'

آغا حسن عابدی اور ابن حسن برنی کے ساتھ میری ملاقات اسے زمانے کی خوشگوار یادیں ہیں۔ باقی متروکہ صنعتوں کی الاٹمنٹوں کا سارا کام ایک متعفن دلدل کی ناگوار سڑانڈ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

○○○

• گورنر جنرل ملک غلام محمد

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو میں ایک میٹنگ کے سلسلے میں لاہور سے کراچی گیا ہوا تھا۔ میٹنگ شروع ہوتے ہی ٹیلیفون آیا کہ کیبنٹ سیکرٹری مسٹر عزیز احمد مجھے اپنے دفتر میں بلا رہے ہیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا' تو انہوں نے کہا کہ گورنر جنرل مسٹر غلام محمد تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم ابھی گورنر جنرل ہاؤس چلے جاؤ۔

غلام محمد صاحب کے ساتھ میری بالکل کوئی واقفیت نہ تھی۔ وزیر خزانہ کے طور پر انہیں فقط چند بار دیکھا تھا۔ میں نے مسٹر عزیز احمد سے اس بلاوے کا مقصد دریافت کیا تو انہوں نے اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔

غلام محمد صاحب کے ایک بھائی نے لاہور کسی فیکٹری کی الاٹمنٹ کے لیے درخواست دی ہوئی تھی۔ مجھے گمان گزرا کہ شاید گورنر جنرل اس سلسلے میں کوئی سفارش کرنے والے ہوں۔ میں نے اپنے اس خدشے کا مسٹر عزیز احمد سے ذکر کیا' تو انہوں نے اس سے بھی اپنی مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ مسٹر غلام محمد سنک طبیعت کے آدمی ہیں۔ اس لیے میں ان کے ساتھ بات چیت میں احتیاط سے کام لوں۔

مسٹر عزیز احمد کا مشورہ پلے باندھ کر میں گورنر جنرل ہاؤس پہنچا۔ ایک اے ڈی سی مجھے اپنے ساتھ اوپر والی منزل میں لے گیا۔ وہاں پر برآمدے میں قالین بچھا ہوا تھا اور اس پر صوفے لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک گول میز پر بڑے خوبصورت پھول سجے ہوئے تھے۔ مسٹر غلام محمد ایک گدے والی آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے نیلے رنگ کا دھاریدار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ رومال اور جرابیں ٹائی کے ہمرنگ تھیں۔ کوٹ کے کالر میں گلاب کا پھول ٹنگا تھا۔ سر پر کالی جناح کیپ تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ ان کے قریب والی کرسی پر گورنر جنرل کی پرسنل پرائیویٹ سیکرٹری مس روتھ بورل بیٹھی تھی۔ یہ بڑی

طرحدار' نازک اندام' خوبصورت' نیم امریکن' نیم سوس لڑکی تھی' جسے وہ واشنگٹن سے منتخب کر کے اپنے ساتھ پاکستان لائے ہوئے تھے۔ مس بورل پر نگاہ پڑتے ہی میں نے دل

ہی دل میں مسٹر غلام محمد کے حسن انتخاب کی داد دی۔

اے ڈی سی نے میری آمد کا اعلان کیا تو دونوں نے نظریں گاڑ کر مجھے سر سے پاؤں تک گھورا۔ اس کے بعد مسٹر غلام محمد نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ چند لمحے عجیب سی خاموشی طاری رہی۔ پھر گورنر جنرل نے بچوں کی طرح غوں غاں کر کے کچھ بولنا شروع کیا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح بولتے رہے' لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کس زبان میں گفتگو کر رہے ہیں۔

جب وہ خاموش ہوئے تو مس بورل بولی۔ "ہزایکسیلینسی فرماتے ہیں کہ انہوں نے آپ کو سیکرٹری ٹو گورنر جنرل کی پوسٹ کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس نازک زمانے میں یہ بڑی اہم ذمہ داری ہے۔ ایچ ای امید رکھتے ہیں کہ آپ ان کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کریں گے۔ ایچ ای کا حکم ہے کہ آپ ابھی نیچے جائیں اور اپنی پوسٹ کا چارج سنبھال لیں۔"

یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ صاف انکار کرنا تو مشکل تھا' اس لیے میں نے ایک عذر لنگ پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میں اس وقت پنجاب گورنمنٹ میں ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ جب تک صوبائی حکومت مجھے وہاں سے فارغ نہ کرے کسی اور پوسٹ کا چارج لینا بڑی بے ضابطگی ہو گی۔"

یہ بات سن کر مسٹر غلام محمد غصے میں آ گئے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور انہوں نے کڑک کر کچھ دیر پھر غوں غاں کی' جس کا مفہوم مس بورل نے مجھے یوں سمجھایا۔ "ہزایکسیلینسی فرماتے ہیں پنجاب گورنمنٹ جہنم میں جائے۔ جس بے ضابطگی کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ بھی آپ کے سمیت جہنم میں جائے۔ پنجاب کے چیف منسٹر ملک فیروز خاں نون اتفاق سے نیچے بیٹھے ہیں۔ انہیں ابھی یہاں بلایا جا رہا ہے تا کہ وہ آپ کو پنجاب سے فارغ کر دیں۔ اس کے بعد آپ فوراً نیچے جا کر اپنی پوسٹ کاچارج سنبھال لیں۔"

یہ تیر نشانے پر نہ بیٹھا' تو میں نے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ "جناب میری والدہ اور سامان لاہور میں ہے۔ چارج لینے سے پہلے میں وہاں جا کر انہیں کراچی لا سکتا ہوں؟"

اب مسٹر غلام محمد کا پارہ بے حد اوپر چڑھ گیا اور وہ کرسی میں بل کھا کھا کر زور زور سے چیخنے لگے۔ ان کے منہ کے ایک کونے سے لعاب دہن کی پچکاری سی چلی اور کوٹ کی آستین پر گر گئی۔ مس بورل نے نیپکن سے ان کا کوٹ صاف کیا اور مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "ہزایکسیلینسی نے اپنی شدید خفگی کا اظہار کیا ہے کہ آپ حجت بہت کرتے ہیں۔ ایچ۔ ای کا حکم ہے کہ آپ اس ناپسندیدہ عادت کو فوراً ترک کریں ورنہ آپ کو پچھتانا پڑے گا۔"

یہ سین ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ایک اے۔ ڈی۔ سی پنجاب کے چیف منسٹر ملک فیروز خاں نون کو لے کر برآمدے میں نمودار ہوا۔ ملک صاحب کو دیکھتے ہی مسٹر غلام محمد نے ہاتھ سے میری طرف اشارہ کیا اور غاؤں غاؤں کر کے کچھ بولتے رہے۔ مس بورل ترجمانی کے فرائض سر انجام دیتی رہی۔ اس کے بعد چیف منسٹر نے مجھے کہا۔ "یہ پوسٹنگ بڑے اعزاز کی بات ہے۔ مبارک ہو۔ فوراً چارج سنبھالو۔ باقی ضابطے کی کاروائیاں بعد میں ہوتی رہیں گی۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو چیف منسٹر نے آنکھ مار کر مجھے چپ کرا دیا۔ اس طرح سربراہ مملکت سے میرا پہلا انٹرویو ختم ہوا اور میں اگلے نو برس کے لیے اس بیت الجن میں مقید ہو گیا۔

نیچے آ کر میں مسٹر اے۔ جی۔ رضا کے کمرے میں گیا' جو اس وقت گورنر جنرل کے سیکرٹری تھے۔ اس وقت تک غالباً انہیں کوئی علم نہ تھا کہ ان کا تبادلہ کر دیا گیا ہے اور ان کی جگہ میری تقرری ہو گئی ہے۔ یہ خبر انہوں نے شاید پہلی بار مجھ سے سنی۔ اس طرح بے خبری میں ناگہانی طور پور سیکرٹری بدلنے کا انداز مجھے بڑا بدنما اور نازیبا نظر آیا۔ کسی سربراہ مملکت کے شایان شان نہیں کہ وہ اپنے ماتحت عملے کے ساتھ ایسا سلوک

روا رکھے۔ اس قسم کا طریق کار وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن کا ذہن پیچدار اور سازشی ہو۔ جہاں تک میری تقرری کا تعلق ہے' میں نے تو اسے بلائے ناگہانی ہی سمجھا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ مسٹر غلام محمد نے مجھے اس پوسٹ کے لیے کیوں چنا اور کس کے کہنے پر چنا۔ نومبر ۱۹۵۴ء کے اوائل میں میں نے اس پوسٹ کا چارج سنبھال لیا۔

گورنر جنرل ہاؤس کا ماحول آسیب زدہ سا نظر آتا تھا۔ چاروں طرف ایک غیر وجودی سا سناٹا چھایا ہوا تھا' جس میں گورنر جنرل' مس بورل' ملٹری سیکرٹری' اے ڈی سی' گارڈ کے سپاہی' چپراسی' بیرے اور خدمت گار اس طرح دکھائی دیتے تھے جیسے لکڑی کے متحرک ڈھانچوں کو زبردستی کپڑے پہنا دیئے ہوں۔ سیکرٹری کی پوسٹ کا چارج لینے کے بعد کئی روز تک میں خاموشی سے اس شخصیت کا جائزہ لیتا رہا' جس کے ساتھ اب مجھے دن رات پالا پڑنے والا تھا۔ مسٹر غلام محمد کافی عرصہ سے فالج کے مریض تھے۔ ان کا بلڈ پریشر مستقل طور پر بہت اونچا رہتا تھا۔ وہ چند قدم سے زیادہ چلنے پھرنے سے قطعاً معذور تھے اور اکثر مریضوں والی پہیہ دار کرسی میں بیٹھ کر گورنر جنرل ہاؤس کا گشت کیا کرتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رعشہ تھا اور وہ اپنے دستخطوں کے علاوہ مزید کچھ لکھنے کے ناقابل تھے۔ فالج نے ان کی زبان اور چہرے کو بھی متاثر کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کی گفتگو کسی کو سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ان کے ذہن کا عضلاتی نظام اس قدر کمزور ہو گیا تھا' کہ جب وہ کھانے پینے کی کوئی چیز منہ میں ڈالتے تھے' تو اس کا کچھ حصہ دونوں کونوں سے باہر گرتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں جب کوئی غیر ملکی سفیر اپنی اسناد پیش کرنے آتا تھا تو اسے گورنر جنرل کے ساتھ لنچ بھی کھلایا جاتا تھا۔ سٹاف کے ممبر بھی لنچ میں شریک ہوتے تھے۔ جس وقت مسٹر غلام محمد لقمہ منہ میں ڈال کر سفیر کے ساتھ گفتگو فرمانے کی کوشش کرتے تھے' وہ سماں بڑا عبرتناک ہوتا تھا۔

ان جسمانی عوارض کے علاوہ مسٹر غلام محمد کا ذہن بھی گنڈے دار تھا اور کسی قدر وقفے اور ناغے سے تھم تھم کر کام کرنے کا عادی تھا۔ کبھی تو ان کا دماغ بالکل صاف'

شفاف اور تیز و طرار ہوتا تھا اور وہ ہر چیز کو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سمجھ لیتے تھے۔ لیکن کبھی وہ بلب کی طرح فیوز ہو کر مختل ہو جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ کبھی بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے تھے' کبھی بالکل دیوانے نظر آتے تھے۔

ذہن کی طرح ان کا مزاج بھی پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتا رہتا تھا۔ کبھی گرم' کبھی سرد' کبھی نرم' کبھی سخت۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے مزاج کی گرمی اور سختی میں آمد کم ہوتی تھی اور آورد زیادہ۔ وہ دوسرے پر رعب گانٹھنے کے لیے' یا محض تفنن طبع کے طور پر گیدڑ بھبکیوں سے کام لینا شروع کرتے تھے۔ آواز بلند کر کے اپنے اوپر بناوٹی غصہ طاری کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس عمل کے دوران رفتہ رفتہ بلڈ پریشر کا عفریت ان کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا تھا اور اصلی غصہ ان کے حواس پر قابو پا لیتا تھا۔ ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتی تھی اور وہ چیخ چیخ کر نڈھال ہو جاتے تھے۔

اس نوعیت کے نظارے بڑے ناگفتہ بہ ہوتے تھے۔

کرنل سرور اور ڈاکٹر حفیظ اختر صاحب گورنر جنرل کے سٹاف پر ان کے ذاتی معالج تھے۔ ڈاکٹر حفیظ اختر ہر صبح گورنر جنرل کا طبی معائنہ کر کے جب نیچے آتے تھے تو ہم ان کے چہرے بشرے اور محتاط سوال جواب سے یہ اندازہ لگا لیا کرتے تھے کہ ہمارا آج کا دن کیسا گذرے گا۔ اگر معلوم ہوتا تھا کہ گورنر جنرل کی طبیعت زیادہ نڈھال ہے' تو ہمارا نخل تمنا ہرا ہو جاتا تھا کیونکہ ملک غلام محمد کا نیچے آ کر اپنے اسٹاف پر مار دھاڑ کرنے کا احتمال باقی نہیں رہتا تھا۔ اس کے برعکس اگر ڈاکٹر حفیظ اختر کی چال ڈھال سے اندازہ لگتا تھا کہ گورنر جنرل کی طبیعت بحال ہے تو ہمار نخل تمنا یکایک مرجھا جاتا تھا۔ چنانچہ کام شروع کرنے سے پہلے ہم ڈاکٹر حفیظ اختر کے نیچے اترنے کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے تاکہ ہم اس روز کے رنگ ڈھنگ کا قیاس کر کے صورت حال سے نمنٹنے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں۔

مسٹر غلام محمد کے کردار میں کسی قسم کی کوئی آئیڈیل ازم نہ تھی۔ ان کے مقاصد میں

اولیت کا شرف ہوس اقتدار کو حاصل تھا۔ دوسرے درجہ پر صنف نازک کی طرف ان کا شدید رجحان تھا جو اکثر مریضانہ حد تک پہنچ جایا کرتا تھا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وہ خود غرضی' خودسری' ہٹ دھرمی دھونس' دھاندلی اور ایچ پیچ کے سمیت ہر قسم کا حربہ استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے جن لوگوں نے ان کے ساتھ وزیراعظم لیاقت علی خان کی کابینہ میں کام کیا تھا' ان پر مسٹر غلام محمد کے کردار کے یہ سب پہلو روز روشن کی طرح عیاں تھے۔ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی جب انہیں بستر علالت سے اٹھا کر گورنر جنرل کی کرسی پر بٹھا دیا گیا تو یہ ایک ایسی غلطی کا ارتکاب تھا جس کا خمیازہ پاکستان آج تک بھگت رہا ہے۔

یہ مفلوج' معذور اور مغرور شخص ایسی مٹی سے بنا ہوا نہیں تھا کہ گورنر جنرل کے سنہری اور آئینہ پنجرے میں بند ہو کر صبر و شکر سے بیٹھا رہے۔ ڈیڑھ برس کے اندر اندر اپریل ۱۹۵۳ء میں اس نے قلم کی ایک جنبش سے خواجہ ناظم الدین کو ملک کی وزارت عظمٰی سے موقوف کر دیا۔ ابھی چند روز قبل خواجہ صاحب کا بجٹ قومی اسمبلی نے بھاری اکثریت سے منظور کیا تھا۔ مسٹر غلام محمد کے اس آمرانہ عمل نے پاکستان میں جمہوریت کی بنیاد کو پہلی بار ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اگر مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی میں کچھ دم خم ہوتا تو اس کا فرض تھا کہ وہ گورنر جنرل کے اقدام کی مذمت کر کے خواجہ ناظم الدین میں اپنے اعتماد کی توثیق کر دیتی۔ لیکن مسلم لیگ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے منہ پر یہ چپت بھیگی بلی بن کر قبول کر لی اور گورنر جنرل کے نامزد وزیراعظم محمد علی بوگرہ کو بڑی فرمانبرداری سے اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ آٹھ دس ماہ بعد ۱۹۵۴ء کے اوائل میں جب مشرقی پاکستان میں انتخابات منعقد ہوئے تو اس میں مسلم لیگ کو شکست فاش ہوئی اور ۲۳۷ مسلم نشستوں میں سے ۲۲۳ جگتو فرنٹ نے جیت لیں اور صرف دس نشستیں مسلم لیگ کے ہاتھ آئیں۔ اب مشرقی پاکستان سے یہ مطالبہ ہونے لگا کہ موجودہ مرکزی قانون ساز اسمبلی عوام کی صحیح نمائندگی کا حق ادا کرنے کے قابل

نہیں رہی۔ لہٰذا اس کے لیے بھی نئے انتخابات ہونے چاہئیں۔ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کا حشر دیکھ کر مرکزی اسمبلی کے مسلم لیگی نمائندے نے انتخابات کے نام ہی سے کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ اب انہیں یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ کہیں گورنر جنرل سچ مچ ہی مرکزی اسمبلی کو برخاست کر کے نئے انتخابات کا ڈول نہ ڈال دیں۔ اس کے علاوہ خواجہ ناظم الدین کی ناجائز برطرفی کا کانٹا بھی اب سترہ ماہ بعد اچانک ان کے حساس دل میں چبھنے لگا تھا۔ چنانچہ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء کو آئین ساز اسمبلی نے گورنر جنرل کے وہ تمام اختیارات چھین لیے جنہیں استعمال کر کے وہ وزیراعظم یا کابینہ کو معطل کر سکتے تھے۔

گورنر جنرل کے اختیارات کم کرنے کا جو قدم اسمبلی نے اٹھایا' وہ نہایت مناسب اور صحیح تھا لیکن جس طریقے سے یہ قدم اٹھایا گیا وہ مضحکہ خیز تھا۔ اسمبلی کے ممبر مفلوج غلام محمد سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ انہوں نے یہ کاروائی چوروں کی طرح دبے پاؤں چھپ چھپا کر کی۔ ترمیمات کا ریزرویشن چھپوا کر ممبروں کو فوراً تقسیم نہ کیا گیا بلکہ آدھی رات کو اسمبلی میں ان کے پیجن ہولوں میں رکھوا دیا گیا۔ اگلی صبح اسمبلی کا اجلاس مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ قبل شروع ہوا اور گورنر جنرل کے اختیارات کم کرنے کا ریزرویشن دس منٹ کے اندر اندر پاس ہو گیا۔ اس قرارداد کے بعد مسٹر غلام محمد کی پوزیشن بالکل کابینہ اور اسمبلی کے رحم و کرم پر منحصر ہو گئی۔ اس شب خون کا جواب گورنر جنرل نے ۳ دن کے بعد دیا اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو اچانک ملک بھر میں ہنگامی حالات کا اعلان کر کے قانون ساز اسمبلی کو برخاست کر دیا' کابینہ برطرف کر دی اور مسٹر محمد علی بوگرا کی سرکردگی میں اپنی مرضی کی ایک نئی کیبنٹ تشکیل دے دی۔ مسٹر غلام محمد کے اس اقدام نے پاکستان میں جمہوریت کا رہا سہا بھرم بھی پامال کر دیا اور ذاتی اقتدار کی ہوس پر آئینی اور قانونی اصولوں کو بے دریغ پامال کرنے کی ایسی مثال قائم کی جس نے آگے چل کر ایسے سدا بہار گل کھلائے جو آج تک مرجھانے کا نام تک نہیں لیتے۔

قانون کی عظمت اور آئین کی حرمت چادر عصمت کے مترادف ہے۔ یہ اگر ایک دفعہ چاک ہو جائے تو اسے رفو کرنا انسان کے اختیار میں نہیں رہتا۔ ایک لغزش دوسری لغزش کا پیش خیمہ بن جاتی ہے اور اگر عقوبت کا تازیانہ شروع ہی میں اس کا راستہ نہ روکے' تو ارتکاب جرم عادت ثانیہ بن جاتی ہے اور رفتہ رفتہ راج نراج' حکومت اور طوائف الملوکی' قانون اور بد نظمی' آئین اور آمریت کے فرق کا ادراک کمزور ہو جاتا ہے۔ نظام حکومت سے آئینی شائستگی رخصت ہو جاتی ہے اور نظم و نسق میں عدل و انصاف کا عنصر ماند پڑ جاتا ہے۔ آئین کا تقدس ختم ہو کر اس کی حیثیت ایک سرکاری سرکلر کے برابر رہ جاتی ہے' جسے وقتی یا ذاتی مصلحتوں کے مطابق توڑا مروڑا جا سکتا ہے' معطل کر کے معرض التوا میں ڈالا جا سکتا ہے' یا بالکل منسوخ کر کے کالعدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ ملک کے دستور کا جب یہ حشر ہونے لگے تو دوسری بہت سی قابل احترام روایات اور اقدار کا تقدس بھی اسی تناسب سے کم ہونے لگتا ہے۔ سیاست کا عمل رک جاتا ہے' یا روک دیا جاتا ہے' یا غلط رخ اختیار کرنے لگتا ہے۔ سیاست کا میدان مثل باغیچہ ہے۔ اس کی نشوونما کا عمل جاری رہے تو پھول اور کانٹے اپنے اپنے تناسب سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آبیاری بند ہو جائے تو جھاڑ جھنکار کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ ایسے حالات میں آئیڈیلزم کی جڑیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ جذبہ وطنیت و قومیت کے فروغ میں وہ پہلا ساجوش و خروش باقی نہیں رہتا۔ بے یقینی' تذبذب اور شکوک و شبہات کی فضا میں سانس لے کر معاشرہ کلبیت اور یاسیت کا شکار ہونے لگتا ہے یا تخریب کاری کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ آئینی نظام کا نعم البدل صرف آئینی نظام ہے۔ اس کے علاوہ سب دعوے باطل ہوتے ہیں اور عام طور پر چند محدود عناصر کے ذاتی مفادات کی فریب کاری کا نتیجہ ثابت ہوتے ہیں۔

مسٹر غلام محمد اپنے سہارے چل پھر سکتے تھے' نہ کچھ لکھ سکتے تھے' اور نہ ہی ان کی بات کوئی آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ ان تمام معذوریوں کے باوجود انہوں نے ملک بھر

میں ہنگامی حالات کا اعلان کس برتے پر کیا؟ فیلڈ مارشل ایوب خاں نے اپنی کتاب "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" میں لکھا ہے کہ ہنگامی حالات کا اعلان ہونے سے پہلے وہ پرائم منسٹر محمد علی بوگرا' چوہدری محمد علی اور اسکندر مرزا کے ساتھ امریکہ گئے ہوئے تھے۔ وہاں پر وزیراعظم کو گورنر جنرل کا پیغام ملا کہ فوراً واپس آؤ۔ یہ پیغام پا کر ان سب نے جلد سے جلد واپس آنے کی ٹھان لی۔ جب وہ لندن پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس روز کوئی ہوائی جہاز مشرق کی طرف نہیں جا رہا۔ اس لیے انہوں نے کراچی کے لیے ایک ہوائی جہاز چارٹر کر لیا۔ اس کے بعد واقعات ایوب خاں کے اپنے الفاظ میں اس طرح رونما ہوئے:

لندن ائیر پورٹ پر گورنر جنرل نے مجھے ٹیلیفون پر بلوایا۔ لیکن ان کی بات میری سمجھ میں بالکل نہ آئی' میں نے ٹیلیفون اسکندر مرزا کو دے دیا۔ ہمیں بس اسی قدر معلوم ہو سکا کہ گورنر جنرل مجھے فوراً پاکستان بلانا چاہتے ہیں۔ انہیں دوسروں سے غرض نہ تھی.....

اسکندر مرزا اور چودھری محمد علی اور میں' ہم تینوں گورنر جنرل کی کوٹھی پر پہنچے....... گورنر جنرل اوپر کی منزل پر اپنی خوابگاہ میں لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے خون کا دباؤ بڑھ گیا تھا اور پیٹھ میں بڑی سخت تکلیف تھی۔ جس کی وجہ سے وہ سیدھے ایک تختے پر چاروں شانے چت لیٹنے پر مجبور تھے۔ وہ غصے سے آگ بگولہ ہو رہے تھے اور گالیوں کی بوچھاڑ تھی کہ تھمنے کا نام نہ لیتی تھی لیکن خوش قسمتی سے یہ گالیاں کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ چودھری محمد علی نے جرات کر کے کچھ کہا' اس کے جواب میں ان پر بوچھاڑ پڑی۔ اس کے بعد اسکندر مرزا کچھ بولے' ان پر بھی بوچھاڑ پڑی۔ ہم ان کی خدمت میں یہ گزارش کرنا چاہتے تھے کہ آپ (وزیراعظم" محمد علی (بوگرا" کو ایک موقع اور دیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے غرا کر کہا "جاؤ۔ جاؤ۔ دور ہو جاؤ" ان کی زبان سے بار بار "نہیں' نہیں" کے الفاظ نکلتے تھے' وہ بس ہم کو بھگا دینا چاہتے تھے۔

ہم ایک کے پیچھے ایک ان کی خواب گاہ سے نکلے۔ آگے آگے اسکندر مرزا' ان کے

پیچھے چوہدری محمد علی اور سب سے پیچھے میں۔ میں کمرے سے باہر قدم رکھنے ہی کو تھا کہ اس نرس نے جو ان کی خدمت پر مامور تھی' میرا کوٹ پکڑ کر کھینچا۔ میں پلٹا۔ دیکھتا

کیا ہوں کہ میں ایک بالکل مختلف آدمی سے دو چار ہوں۔ یہی ہمارے بیمار اور بوڑھے گورنر جنرل جو لمحہ بھر پہلے غصے سے دیوانے ہو رہے تھے' اب ان کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا تھا اور وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے دل میں کہا ''آپ بھی بڑے حضرت ہیں۔'' انہوں نے ایک خاص مسرت کی چمک آنکھوں میں لیے مجھے اشارہ کیا۔ ''مہری پر بیٹھ جاؤ۔''

اس کے بعد انہوں نے تکیے کے نیچے سے دو دستاویزیں نکالیں۔ ان میں سے ایک پر کچھ اس قسم کی عبارت تھی کہ ''میں' غلام محمد فلاں فلاں وجوہ کی بنا پر فلاں فلاں اختیارات جنرل ایوب خاں کو سونپتا ہوں اور انہیں حکم دیتا ہوں کہ وہ تین مہینے کے اندر اندر آئین تیار کریں۔'' میں نے اس کاغذ پر نظر ڈالی اور دل میں کہا۔ ''خدا آپ سے سمجھے۔ پچھلے آٹھ برس تو آپ کو ہوش نہ آیا اور اب آپ چاہتے ہیں کہ میں تین مہینے میں دستور بنا کے پیش کر دوں۔''

دوسری دستاویز اس مضمون کی تھی کہ میں نے اس پیشکش کو قبول کر لیا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے میں ان تاریخی دستاویزوں کو اپنے ہاتھ میں تھامے رہا۔

جیسے ہی میں نے ان کاغذوں پر نظر ڈالی میرا تن بدن پکار اٹھا کہ ''نہیں' ہرگز نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ جلد بازی سے کام لے رہے ہیں۔ اس سے ملک کو سخت نقصان پہنچے گا۔ میں فوج کی تعمیر میں مصروف ہوں۔ ہمارا ایک دشمن ہے ہندوستان' جس کو رام کرنا بڑا دشوار ہے۔ ہم ہزار چاہیں کہ وہ ہمیں دشمن نہ سمجھے مگر وہ دشمن سمجھنے پر تلا ہوا ہے۔ میں اپنے پیشے میں رہ کر ملک کی بہتر خدمت کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں کچھ مفید کام سر انجام دے سکتا ہوں۔ آپ اپنی موجودہ ذہنی کیفیت میں کوئی بات کر گزرنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ آگے چل کر سوائے ملک کے نقصان کے اور کچھ نہیں ہو گا۔''

اس کے جواب میں انہوں نے مجھ پر گالیوں کی ایک اور بوچھاڑ کر دی۔ لیکن انہیں احساس ہو گیا کہ میں اس جلد بازی کے کام میں ان کا ساتھ نہیں دوں گا۔

جو کمانڈر انچیف اپنے گورنر جنرل کو ایسی کھری باتیں سنانے کی ہمت رکھتا ہو' اس کا یہ فرض بھی تھا کہ وہ اسے کوئی اور غیر جمہوری اور غیر آئینی قدم اٹھانے سے باز رہنے کی تلقین بھی کرے۔ لیکن ایوب خاں نے مسٹر غلام محمد کو ایسی کوئی وارننگ نہ دی۔ بلکہ اس کے برعکس جب ہنگامی حالات کا اعلان ہوا اور اسمبلی کی برطرفی کے بعد نئی کابینہ بنی تو ایوب خاں نے کمانڈر انچیف کے عہدہ کے ساتھ ساتھ اس میں وزیر دفاع کا منصب بھی قبول کر لیا۔ اسکندر مرزا اس نئی کابینہ میں وزیر داخلہ مقرر ہوئے۔ ان دونوں حضرات کی رفاقت مسٹر غلام محمد کے لیے بڑی زبردست پشت پناہی تھی اور غالباً یہی وہ شہہ تھی جس کے زور پر انہوں نے اتنا بڑا قدم بھی اٹھایا تھا۔ اس زمانے میں اس کابینہ کو Cabinet of Lent کہا جاتا تھا۔ وطن عزیز ایسے جوہر نایاب سے خالی نہیں' جو صرف ہنگامی حالات میں اپنا جوبن دکھاتا ہے اور کابینہ میں شامل ہو کر ملک کی خدمت کرنے میں ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتا۔ یہ صورت حال آج تک جاری و ساری ہے۔

میرے چارج لینے کے چند روز بعد نومبر میں کراچی میونسپل کارپوریشن نے گورنر جنرل کو ایک استقبالیہ پر مدعو کیا۔ استقبالیہ سے چند گھنٹے قبل مجھے انٹیلی جنس کی ایک سپیشل رپورٹ موصول ہوئی' جس میں یہ خدشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ جب گورنر جنرل کارپوریشن کے استقبالیے میں شریک ہونے جائیں گے تو راستے میں شاید کچھ لوگ مظاہرہ کریں اور مخالفانہ نعرے لگائیں۔ میں اس رپورٹ کو فوراً مسٹر غلام محمد کے پاس لے گیا۔ اسے پڑھتے ہی ان کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر سناٹے کے عالم میں رہے' پھر بولے کہ میں یہ رپورٹ لے کر وزیر داخلہ اسکندر مرزا اور وزیر دفاع ایوب خاں کے پاس جاؤں اور ان سے کہوں کہ وہ دونوں گورنر جنرل کے ساتھ ان کی گاڑی میں کراچی کارپوریشن چلیں۔

اسکندر مرزا صاحب کے دفتر پہنچ کر میں نے انہیں انٹیلی جنس کی رپورٹ دکھائی اور گورنر جنرل کا پیغام سنایا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں خی خی کر کے خوب ہنسے اور بولے۔

"بڈھا بہت زیادہ ڈر گیا ہے۔ اس قدر خوف کی بات نہیں۔ چلو ایوب سے چل کر بات کرتے ہیں۔"

اسکندر مرزا صاحب کی گاڑی میں بیٹھ کر ہم ایوب خاں کے پاس پہنچے۔ دونوں پہلے کچھ دیر آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔ پھر زور زور سے قہقہے لگا کر گورنر جنرل کی خوفزدگی کا مذاق اڑاتے رہے۔ پھر مجھ سے کہا کہ میں واپس جا کر مسٹر غلام محمد کو تسلی دوں کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ شوق سے کارپوریشن کے استقبالیہ میں تشریف لے جائیں۔

میں نے جواب دیا کہ گورنر جنرل میری زبانی بات پر زیادہ یقین نہ کریں گے۔ اگر وہ یہی بات لکھ کر دے دیں تو بہتر ہو گا۔

یہ سن کر اسکندر مرزا نے فوراً اپنا قلم نکالا اور انٹیلی جنس رپورٹ کے حاشیے پر ایک نوٹ لکھ دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ میں گورنر جنرل کو مکمل یقین دلاتا ہوں کہ حالات پوری طرح قابو میں ہیں۔ وہ بے فکری سے کارپوریشن کے جلسے میں جائیں۔ راستے میں کوئی گڑبڑ نہ ہو گی۔

تیسرے پہر میں مسٹر غلام محمد کے ساتھ ان کی کار میں بیٹھا اور ہمارا قافلہ کراچی کارپوریشن کی طرف روانہ ہوا۔ ہمارے آگے پیچھے مسلح پولیس کی اتنی کثرت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم استقبالیہ میں شریک ہونے نہیں جا رہے بلکہ کوئی مورچہ فتح کرنے جا رہے ہیں۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں' اور اکا دکا راہگیروں کو بھی پولیس والے لاٹھیوں سے کھدیڑ کر گلی کوچوں میں بھگا رہے تھے۔ راستے میں اس قدر امن و امان دیکھ کر مسٹر غلام محمد ایک دم شیر ہو گئے۔ انہوں نے اپنی چھڑی کا ہینڈل میری پسلیوں میں چبھو کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور انٹیلی جنس والوں کو موٹی گالی دے کر کہا۔ کہاں گئے میرے خلاف مظاہرہ کرنے والے؟ کہاں مر گئے میرے خلاف نعرے لگانے والے؟"

میں نے پولیس کے انتظام کی کچھ تعریف کی تو انہوں نے پولیس والوں کو بھی بڑی سخت گالی دی اور اپنی چھاتی پر ہاتھ مار کر بولے۔ "میں کسی سے ڈرنے والا نہیں۔ اگر کوئی میرے سامنے آئے گا میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ اگر کوئی میرے خلاف نعرہ لگائے گا' میں اس کے منہ پر تھوک دوں گا۔" اپنے اس عزم کا عملی مظاہرہ کرنے کی خاطر مسٹر غلام محمد نے کار میں زور سے تھوکا' جو اچٹ کر ان کے کوٹ کے کالر پر گرا۔ اے۔ ڈی۔ سی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے ایک نیپکن مجھے دیا۔ میں نے اس سے کوٹ کا کالر صاف کرنے کی کوشش کی تو مسٹر غلام محمد نے چھڑی گھما کر مجھے غور سے گھورا اور کہنے لگے۔ "تم کشمیری ہو نا؟ کشمیری ہا تو بڑے بزدل ہوتے ہیں۔ تم صبح سے سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ سڑک پر یہ ہو جائے گا۔ وہ ہو جائے گا۔ اب بولو کیا ہوا؟ غلام محمد کے سامنے کون کھڑا ہو سکتا ہے؟ تھو۔ تھو۔ تھو......" انہوں نے نفرت سے کئی بار تھوکا اور کارپوریشن کے لان تک پہنچتے پہنچتے بڑی مشکل سے ان کے کوٹ کالر اور آستین صاف کی گئی۔

مسٹر غلام محمد کا معمول تھا کہ وہ دن کے گیارہ بجے اپنے عملے کے کچھ افراد کو اپنے ساتھ چائے پر اکٹھا کیا کرتے تھے۔ کارپوریشن کے استقبالیہ کے بعد کئی روز تک وہ چائے پر میرا مذاق اڑا کر مجھے رگیدتے رہے کہ انٹیلی جنس کی رپورٹ دیکھ کر اس شخص کی گھگھی بندھی ہوئی تھی اور یہ کار میں اس طرح سہا ہوا بیٹھا تھا جس طرح چوہا بلی کے ڈر سے تھر تھر کانپتا ہے۔ تیسرے یا چوتھے روز انہوں نے مجھے مخاطب کر کے سوال کیا۔ "سچ سچ بتاؤ' ڈر کے مارے کار میں تمہارا پیشاپ بھی خطا ہوا تھا یا نہیں؟"

میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ یور ایکسیلینسی' اس روز مجھ پر کوئی خوف طاری نہ ہوا تھا۔"

یہ جواب سن کر مسٹر غلام محمد سکتے میں آ گئے۔ پھر غصے سے بولے۔ "تمہارا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

میں خاموش رہا۔

"ہاں' ہاں۔" مسٹر غلام محمد چیخ کر بولے۔ تمہارا یہی مطلب ہے کہ میں جھوٹ بکواس کر رہا ہوں۔"

میں پھر خاموش رہا۔ بس اب کیا تھا۔ گورنر جنرل غصے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے چائے کی پیالی قالین پر پٹخ دی اور چیخ چیخ کر اس بات کا ماتم کرنے لگے کہ اب دو دو ٹکے کے سرکاری ملازم بھی سربراہ مملکت کے منہ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگانے کی جرات کرنے لگے ہیں' جو ملک کے سربراہ کا وفادار نہیں وہ ملک کا وفادار نہیں۔

ایسے غداروں کے متعلق انہوں نے بڑی ہولناک سزائیں تجویز کیں اور ہم سب منہ لٹکائے اپنے اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مس بورل میرے کمرے میں آئی اور میری ڈھارس بندھانے لگی کہ اس گھر میں ایسے واقعات وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ مسٹر غلام محمد کی نفسیات پر تبصرہ کر ہی رہی تھی کہ اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور گورنر جنرل اپنی وہیل چئیر پر بیٹھے ہوئے اندر تشریف لائے۔ آتے ہی انہوں نے مس بورل سے پوچھا کہ وہ یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ وہ میرے آنسو پونچھنے آئی تھی' کیونکہ میں چائے والے واقعہ پر سخت شرمندہ تھا' اور اس وقت سے اب تک زار و قطار روتا رہا تھا۔

اچھا! مسٹر غلام محمد نے بچوں کی طرح خوش ہو کر پوچھا۔ "کتنا رویا ہے؟"

"بکٹ فل' ایکسیلنسی' بکٹ فل'۔" مس بورل نے ہاتھوں سے بڑی بالٹی کا سائز بنا کر کہا۔

"کیا یہ اب ایک پیالی چائے کا مستحق ہو گیا ہے؟" گورنر جنرل نے پوچھا۔

"ہاں ایکسیلنسی' چائے کے ساتھ کیک کا بھی۔" مس بورل نے کہا۔

"نہیں' کیک تم کھانا۔" مسٹر غلام محمد نے مچل کر کہا۔ "اس کو ہم صرف بسکٹ دیں گے۔"

اس مول تول کے بعد وہ دونوں مجھے اپنے ساتھ اوپر لے گئے۔ مسٹر غلام محمد نے چائے کے ساتھ مجھے گن کر صرف ایک بسکٹ دیا اور خود وہ کیک کی کریم انگلیوں سے چاٹ

چاٹ کر کھاتے رہے۔

ایک رات میں اپنے گھر سویا ہوا تھا۔ آدھی رات کے قریب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میرا ڈپٹی سیکرٹری فرخ امین بول رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "آپ جس حالت میں ہیں اسی طرح فوراً گورنر جنرل ہاؤس آ جائیں۔"

مسٹر غلام محمد بیمار تو رہتے ہی تھے۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید اچانک انہیں کچھ ہو گیا ہے۔ میں نے فرخ امین سے پوچھا' بڑے میاں تو ٹھیک ہیں؟"

ٹیلیفون پر تھوڑی دیر کچھ کھسر پھسر سی ہوئی۔ پھر اس نے گول مول سا جواب دیا۔ "ہاں' لیکن آپ فوراً یہاں پہنچ جائیں۔"

میں بھاگم بھاگ گورنر جنرل ہاؤس پہنچا اور سیدھا مسٹر غلام محمد کے بیڈ روم میں گیا' جو تیز روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ گورنر جنرل اپنے بستر پر بہت سے تکیوں کا سہارا لیے بیٹھے تھے اور ان کے اسٹاف کے کئی ممبر کمرے میں ادھر ادھر سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو مسٹر غلام محمد کچھ دیر تک اپنی پیلی پیلی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑے مجھے گھورتے رہے۔ پھر بڑے تلخ انداز میں بولے۔ "مجھے زندہ دیکھ کر آپ کو بڑی مایوسی ہو گی۔ آپ تو بڑے شوق سے میرا جنازہ اٹھانے آ رہے تھے۔"

میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی' تو انہوں نے ڈانٹ کر مجھے چپ کرا دیا اور کہنے لگے۔

"جب تم ٹیلیفون پر فرخ امین سے بات کر رہے تھے' تو میں بھی ریسیور سے کان لگا کر سن رہا تھا۔ تم نے بڑے شوق سے پوچھا تھا کہ کیا یہ بڈھا مر گیا ہے؟"

میں اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہتا تھا لیکن وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ دو ڈھائی گھنٹے تک انہوں نے اسی ایک بات کو طول دے کر بار بار ایسی رٹ لگائی کہ آخر بالکل نڈھال ہو کر تکیوں پر گر گئے۔ ہم نے ان کے ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے آ کر انہیں کچھ گولیاں کھلائیں اور ٹیکہ لگا کر سلا دیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ مسٹر غلام محمد یہ کچہری رات کے دس بجے سے لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے ذاتی عملے کے کسی ملازم سے کوئی قصور سرزد ہو گیا تھا۔ دس بجے سے اس پر مقدمہ چل رہا تھا اور سزا تجویز ہو رہی تھی۔ آخر تنگ آ کر آدھی رات کے قریب کسی نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ سارا کیس سیکرٹری صاحب کے سپرد کر دیا جائے' وہ پوری انکوائری کر کے اپنی رپورٹ گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کریں۔ اس مقصد کے لیے مجھے بلایا گیا اور جب میں حاضر ہوا تو اصل مقدمہ خارج ہو گیا اور ایک بالکل نیا بکھیڑا کھڑا ہو گیا۔ اس زمانے میں مسٹر غلام محمد کا ذہن اسی طور پر کام کرتا تھا۔

ایک روز دفتر پہنچتے ہی پیغام ملا کہ گورنر جنرل یاد فرما رہے ہیں۔ میں ان کے بیڈ روم میں داخل ہوا تو فرش پر ایک فائل پڑی ہوئی نظر آئی۔ میں نے سوچا کسی سے بے خیالی میں گر گئی ہو گی۔ میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ گورنر جنرل نے اپنا ٹائم پیس تڑاخ سے میرے سر پر دے مارا اور گرج کر کہا۔ "فائل کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ ٹائم پیس اٹھا کر یہاں لاؤ۔" میں نے ٹائم پیس اٹھا کر انہیں واپس دیا تو انہوں نے ٹٹول ٹٹول کر اس کا بغور جائزہ لیا کہ میرے سر سے ٹکرا کر اس کا کچھ بگڑ تو نہیں گیا۔ میرے سر میں اس کی ضرب سے گھمڑ سا پڑ گیا تھا۔ میں نے کسی قدر طنز سے کہا۔ "یہ ٹائم پیس بڑا نازک اور قیمتی ہے۔ اس سے پتھر کا کام لینا جائز نہیں۔"

"تمہارا سر بھی تو کنکریٹ سے بنا ہوا ہے۔" مسٹر غلام محمد نے مسکرا کر کہا۔

خیر سگالی کی اس گفتگو کے بعد انہوں نے مجھے مسہری پر بٹھا لیا اور فرش پر پڑی ہوئی فائل کا قصہ سنایا۔ بات یہ ہوئی کہ کل رات انہوں نے مس بورل کو ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ وہ حسب معمول اپنی بوڑھی والدہ کو اپنے ساتھ لے کر آئی۔ یہ بات مسٹر غلام محمد کو پسند نہ تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ مس بورل ڈنر پر تنہا آیا کرے۔ لیکن مس بورل اکثر ان کی اس آرزو کو پورا نہ کیا کرتی تھی۔ کل رات ڈنر کے دوران مسٹر غلام محمد نے مس بورل کی والدہ کے ساتھ بے رخی کا برتاؤ کیا اور کچھ نازیبا کلمات

بھی کہے۔ مس بورل نے اس بات کا بہت برا منایا۔ آج صبح گورنر جنرل نے اسے ایک فائل کے ساتھ اپنے کمرے میں طلب کیا۔ وہ منہ پھلائے ہوئے آئی۔ مسٹر غلام محمد نے اسے حکم دیا کہ وہ صبح سویرے روتی صورت لے کر ان کے کمرے میں نہ آئے' بلکہ مسکراتی ہوئی ان سے ملے۔ مس بورل اسی طرح منہ پھلائے کھڑی رہی۔ گورنر جنرل نے تحکمانہ انداز میں کئی بار اسے مسکرانے کا حکم دیا تو اس نے غصے سے فائل زمین پر دے ماری اور روتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اب مسٹر غلام محمد نے میرے ذمہ یہ ڈیوٹی سپرد کی کہ میں مس بورل کو سمجھا بجھا کر یہاں واپس لاؤں' وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہو اور ہنسی خوشی فرش پر پڑی ہوئی فائل اٹھا کر گورنر جنرل کے حضور میں پیش کرے۔ میں مس بورل کے پاس گیا' تو وہ غالباً اسی نوعیت کی طلبی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ وہ بڑی زیرک اور غمگسار طبیعت کی لڑکی تھی اور مسٹر غلام محمد کی معذوریوں کی وجہ سے اسے ان کے ساتھ ایک خاص قسم کی ہمدردی تھی۔ میں نے اسے ٹائم پیس سمیت سارا واقعہ سنایا' تو وہ فوراً میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی۔ گورنر جنرل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنی مسکراہٹوں کا فوارہ چھوڑا اور فرش پر پڑی ہوئی فائل اٹھا کر اسے بصد ادب و احترام ان کی خدمت میں پیش کیا۔ مسٹر غلام محمد کا چہرہ دودھ پیتے بچے کی طرح کھل اٹھا اور ان کے منہ کے دونوں کونوں سے بے اختیار رالیں ٹپکنے لگیں۔ پھر اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور غرا کر بولے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں یہاں کس نے بلایا ہے؟ فوراً میری نظروں سے دور ہو جاؤ......."

مسٹر غلام محمد نے کبھی یہ بات تسلیم نہ کی تھی کہ فالج کی وجہ سے ان کی زبان میں شدید لکنت ہے اور لوگ ان کی بات سمجھنے سے قاصر ہیں۔ غالباً وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ان کی باتوں کا معیار اتنا بلند ہوتا ہے کہ کم فہم لوگ انہیں آسانی سے سمجھ نہیں پاتے یا کبھی کبھی وہ سمجھتے تھے کہ دوسرے لوگوں کو سماعت میں کوئی فتور

ہے۔ ایک روز ایک جائنٹ سیکرٹری اپنے وزیر کے ہمراہ گورنر جنرل کے پاس آیا ہوا تھا۔ اس بیچارے کی سمجھ میں گورنر جنرل کی کوئی بات نہ آ رہی تھی۔ تنگ آ کر مسٹر غلام محمد نے پوچھا' "کیا تم بہرے ہو؟"

جان بچانے کی خاطر جائنٹ سیکرٹری نے بہانہ بنایا۔ "جی ہاں' سر۔ آجکل میرے کانوں میں بڑی تکلیف ہے۔"

اب کیا تھا۔ گورنر جنرل نے ڈسپنسری سے کمپاؤنڈر کو بلوایا اور وہیں بیٹھے بیٹھے بچارے جائنٹ سیکرٹری کے کانوں میں پچکاری لگوا کر صفائی کر دی!

ایک بار عید کے موقعہ پر مسٹر غلام محمد کے سر پر یہ بھوت سوار ہو گیا کہ وہ قوم کے نام اپنا پیغام خود براڈ کاسٹ کریں گے۔ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل زیڈ۔ اے۔ بخاری کو یہ ترکیب سوجھی کہ پیغام ریکارڈ کر کے پہلے گورنر جنرل کو سنا دیا جائے۔ وہ عقل مند آدمی ہیں۔ یہ اشارہ خود سمجھ جائیں گے کہ ان کی آواز اس قابل نہیں ہے کہ ریڈیو پر براڈ کاسٹ کی جائے۔ چنانچہ بخاری صاحب کی سرکردگی میں بڑے اہتمام سے مسٹر غلام محمد کی تقریر ریکارڈ کی گئی۔ اس کے بعد بخاری صاحب نے بڑے ادب سے پوچھا۔ "حضور' کیا آپ اپنی تقریر کا ریکارڈ سننا پسند فرمائیں گے؟"

"ضرور۔" گورنر جنرل نے گرمجوشی سے جواب دیا۔

اب جو ریکارڈنگ کا ٹیپ چلایا گیا' تو اس سے خر خر' غر غر' غاں غاں کے ساتھ لپٹی ہوئی ایسی آوازیں برآمد ہونے لگیں جیسے پھٹے ہوئے پائپ سے بہت سی گیس بہ یک وقت خارج ہونے کی کوشش کر رہی ہو۔ آدھا ٹیپ سن کر مسٹر غلام محمد آپے سے باہر ہو گئے اور انہوں نے بخاری صاحب کا ٹیٹوا لیا کہ ریڈیو کا یہ کیسا اناڑی ڈائریکٹر جنرل ہے جو ایک تقریر بھی صحیح طور پر ریکارڈ نہیں کر سکتا؟ اس روز ہم لوگوں نے بڑی مشکل سے بخاری صاحب کو گورنر جنرل ہاؤس سے صحیح سلامت باہر نکالا اور مسٹر غلام محمد کافی عرصہ تک اپنے ملنے والوں سے ان کی نااہلی اور اناڑی پن کا رونا روتے رہے۔

کابینہ کے وزیر' غیر ملکی سفیر اور دوسرے ملاقاتی جب گورنر جنرل سے ملنے آتے تھے تو انہیں مسٹر غلام محمد کی گفتگو سمجھنے میں بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ ایسے موقعوں پر کوئی اے۔ ڈی۔ سی یا مس بورل یا میں موقع پر موجود ہو کر ترجمانی کے فرائض ادا کیا کرتے تھے۔ ایک بار مصر کے صدر جمال عبدالناصر کسی دورے پر جاتے ہوئے ایک رات کے لیے کراچی میں رکے۔ انہیں گورنر جنرل ہاؤس میں مہمان ٹھہرایا گیا۔ رات کو ان کے اعزاز میں عشائیہ تھا۔ ڈنر سے پہلے دونوں صاحبان کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے سے ملے تو ان کے درمیان انگریزی میں گفتگو ہونے لگی۔ بات چیت کا آغاز اس طرح ہوا:

مسٹر غلام محمد: پچھلے سال میں بڑا شدید بیمار ہو گیا تھا۔

صدر ناصر: (کچھ نہ سمجھے۔ بلکہ یہ قیاس کیا کہ رسم کے مطابق وہ ان کی خیریت دریافت کر رہے ہیں) یس' ایکسیلنسی۔ گڈ۔ ویری گڈ۔

مسٹر غلام محمد: میں اتنا سخت بیمار ہو گیا تھا کہ مرنے کے قریب تھا۔

صدر ناصر: یس' ایکسیلنسی۔ گڈ۔ ویری گڈ!

اس مرحلے پر ہمارے عملے کا ایک آدمی وہاں پہنچ گیا اور اس نے ترجمانی کا فریضہ سنبھال کر صورت حال کو مزید پیچیدگی سے بچا لیا۔

اسی زمانے میں ترکی کے صدر جلال بیار نے بھی پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ وہ انگریزی بالکل نہ سمجھتے تھے اور ان کا ذاتی ترجمان ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ گورنر جنرل کے سرکاری ڈنر کے دوران ترجمان دونوں کے پیچھے کرسی پر بیٹھ گیا تاکہ مسٹر غلام محمد کی گفتگو کا ترجمہ ترکی میں اور جلال بیار کی باتوں کا ترجمہ انگریزی میں کرتا جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پسینہ پسینہ ہو گیا اور سر پکڑ کر وہاں سے غائب ہو گیا کیونکہ مسٹر غلام محمد کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ کیا میں اس کی کچھ مدد کروں؟ اس نے جواب دیا' کہ صدر جلال بیار نے کہا ہے کہ وہ ترجمان کے بغیر ہی صورت حال سے بخوبی نپٹ لیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد کھانے

کے دوران مسٹر غلام محمد مسلسل بولتے رہے اور ترکی کے صدر کبھی مسکرا کر' کبھی سر ہلا کر' کبھی آنکھیں گھما کر ان باتوں کا جواب اشاروں ہی اشاروں میں دیتے رہے۔

کھانے کی میز پر دو سربراہان مملکت کے درمیان اس قدر طویل یکطرفہ مکالمہ اور کہیں نہیں ہوا ہو گا۔

ایک روز کراچی کے چند مشہور و معروف شہریوں کی درخواست موصول ہوئی کہ اہالیان شہر کے نمائندوں کا ایک وفد گورنر جنرل ہاؤس میں ایک تقریب منعقد کر کے مسٹر غلام محمد کی خدمت میں "محافظ قوم" "Saviour of the Nation" کا خطاب پیش کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس پر ایک لمبا چوڑا نوٹ لکھا کہ یہ لوگ خوشامدی ٹٹو ہیں۔ چڑھتے سورج کی پوجا کرنا ان کا شیوہ ہے۔ ایسی تقریبات سے ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ ارباب حکومت کا قرب حاصل کر کے اپنا الو سیدھا کریں۔ یہ لوگ اپنی ذات کے سوا اور کسی کی نمائندگی نہیں کرتے اور ان کی طرف سے گورنر جنرل کو قومی خطاب دیا جانا بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔ لہٰذا میں نے مشورہ دیا کہ اس درخواست کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے رد کر دیا جائے۔

میرا نوٹ پڑھ کر مسٹر غلام محمد پیچ پا ہو گئے۔ انہوں نے میرا نوٹ تو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ ساری قوم تو قدر شناسی کے طور پر ان کے سر پر عظمت کا تاج رکھنا چاہتی ہے اور میں اس منصوبہ کو سبوتاژ کرنے کے لیے بے قرار ہوں۔ انہوں نے حکم دیا کہ اس معاملے کے ساتھ مزید کوئی سروکار نہ رکھوں اور اس خط کا جواب انہوں نے میرے ڈپٹی سیکرٹری سے تحریر کروایا کہ وہ لوگ بڑی خوشی سے تشریف لائیں اور قوم کی جانب سے (Saviour of the Nation) کا خطاب مسٹر غلام محمد کو مرحمت فرمائیں۔ گورنر جنرل اس اعزاز کو قبول فرمانے کے لیے بخوشی تیار ہیں۔

اس مقصد کے لیے جو تقریب منعقد ہوئی وہ اسی نوعیت کی تھی جیسے چھوٹے چھوٹے بچے جھوٹ موٹ مل کر گڑیا گڈیے کی شادی رچاتے ہیں۔ ایک کشادہ برآمدے میں قالین

بچھائے گئے ان پر کرسیاں اور صوفے لگائے گئے۔ کراچی کے پچیس تیس جغادری خوشامدی ان پر ادب سے بیٹھ گئے۔ مسٹر غلام محمد کالی شیروانی اور جناح کیپ پہنے ایک کمرے سے نمودار ہوئے اور عاجزی سے مسکین صورت بنا کر ایک کرسی پر براجمان ہو گئے۔

ایک صاحب نے سنہری چوکھٹے میں فریم کیا ہوا کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا توصیفی ایڈریس پڑھا اور مبالغے کے جملہ اصناف کو کام میں لا کر مسٹر غلام محمد کو پاکستانی قوم کا نجات دہندہ ثابت کیا۔ جواب میں گورنر جنرل نے جذبات سے مغلوب ہو کر کچھ ٹسوے بہائے اور بھرائی ہوئی آواز میں اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ وہ زندگی کے آخری سانس تک اپنے عزیز وطن اور قوم کی اسی طرح بے لوث خدمت سرانجام دیتے رہیں گے۔ حاضرین نے تالیاں بجائیں اور نجات دہندہ قوم۔۔ زندہ باد" کے نعرے لگائے۔ اس کے بعد سب نے چائے کے ساتھ کیک' پیسٹری اور سموسے کھائے اور اس ضروری کارروائی کے بعد وہ محفل برخاست ہو گئی جس میں جھوٹ' چاپلوسی اور خوشامد کی ملمع سازی اتنی نمایاں تھی کہ اسے دیکھ کر گھن آتی تھی اور کراہت محسوس ہوتی تھی۔

اگر خوشامدیوں کی صحبت میسر آنا خوش قسمتی ہے تو اس باب میں مسٹر غلام محمد واقعی خوش قسمت تھے۔ ان کے قریب ترین اور عزیز ترین دوستوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو گورنر جنرل کے زمانے میں ان کے کھلے بندوں شرمناک حد تک خوشامد نہ کرتا ہو۔ ایک بار وہ اپنے دو تین دوستوں کو ساتھ لے کر کار میں ہوا خوری کے لیے نکلے۔ مجھے بھی اگلی سیٹ پر ساتھ بٹھا لیا۔ ان دنوں کراچی میں غالباً پہلی آٹھ دس منزلہ عمارت "قمر ہاؤس" کے نام سے تعمیر ہو رہی تھی۔ جب ہم اس کے قریب سے گزرے تو مسٹر غلام محمد نے پوچھا' کہ اتنی بڑی بلڈنگ کون بنوا رہا ہے؟ ان کے ایک دوست نے فوراً ادب سے سر جھکا کر کہا۔ "حضور کے اقبال سے بن رہی ہے۔" ایک مسجد سے کچھ لوگ مغرب کی نماز پڑھ کر باہر نکل رہے تھے۔ دوسرے دوست نے گورنر جنرل کی توجہ ان کی طرف منعطف کروائی اور کہا۔ حضور کے اقبال سے آجکل مسجدیں خوب آباد ہیں اتنے نمازی پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔ سب آپ کی برکت ہے۔" "اس

برکت" کا نزول ۲۷ یا ۲۸ برس بعد آج تک جاری ہے!

ایک روز مسٹر غلام محمد نمونئے میں مبتلا تھے۔ ان کے ایک عزیز دوست میرے پاس بکرے ذبح کرنے کی چھری لے کر آئے۔ چھری چاندی کی طشتری میں دھری ہوئی تھی اور اوپر ایک سبز ریشمی رومال ڈالا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں اس چھری پر مسٹر غلام محمد کا ہاتھ پھرا لاؤں' کیونکہ وہ اس سے چند بکرے ذبح کر کے ان کی صحت اور سلامتی کے لیے صدقہ دینا چاہتے ہیں۔ میں نے مسٹر غلام محمد کو یہ بات بتائی تو انہوں نے بڑی خوشی سے چھری پر اپنے دونوں ہاتھ کئی بار پھیر دیئے۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں ان صاحب کے ساتھ اپنا ڈپٹی سیکرٹری بھی بھیجنا چاہتا ہوں تا کہ صدقہ کی رسم چھری پر ہاتھ پھرانے تک ہی محدود نہ رہے بلکہ بکرے بھی ضرور ذبح ہوں۔"

یہ بات سن کر مسٹر غلام محمد کی آنکھوں میں تیز تیز چمک آئی اور انہوں نے زندگی میں پہلی بار مجھے شاباش دے کر کہا۔ "ہاں' ہاں' ضرور بھیجنا۔ بعد میں مجھے رپورٹ بھی دینا۔"

واپس آ کر جب میں نے ان صاحب کو بتایا کہ مسٹر غلام محمد کی خواہش ہے کہ صدقہ کے وقت ان کا ڈپٹی سیکرٹری بھی ان کی نمائندگی کرے' تو ان کا منہ بن گیا اور وہ بڑے بدمزہ ہو کر میرے کمرے سے نکلے۔

خوشامد کی قینچی عقل و فہم کے پر کاٹ کر انسان کے ذہن کو آزادی پرواز سے محروم کر دیتی ہے۔ خوشامدیوں میں گھرا ہوا انسان شیرے کے قوام میں پھنسی ہوئی مکھی کی طرح بے بس اور معذور ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے اپنے حواس معطل ہو جاتے ہیں اور وہ وہی کچھ دیکھتا' سنتا' بولتا' سونگھتا اور محسوس کرتا ہے' جو خوشامدی کیڑے کو کون کی طرح گھس کر اس کے وجود میں پلتے رہتے ہیں۔ جس سربراہ مملکت کی کرسی کو خوشامد کی دیمک لگ جائے اور پائیدار نہیں رہتی' اس کے فیصلے ناقص ہوتے ہیں اور اس کی رائے دوسروں کے قبضہ میں چلی جاتی ہے۔ اگر سربراہ مملکت مسٹر غلام محمد کی طرح جسمانی طور پر مفلوج ہو تو خوشامدیوں کے دوش پر سوار ہو کر وہ سارے ملک کو

خطرے کی صلیب پر لٹکائے رکھتا ہے۔
پرائم منسٹر' وزراء' کمانڈر انچیف اور دیگر اعلیٰ حکام میں کوئی ایسا مائی کا لال نہ تھا جو مسٹر غلام محمد کے روبرو کسی جائز نکتے پر بھی اختلاف رائے کا اظہار کرتا ہو۔ وہ سب ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے اور ان کے منہ پر جی حضوری کا دم بھرتے تھے۔ لیکن ان کی پیٹھ پیچھے سب ان کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کے احکام کو یا تو بالکل نظر انداز کر دیتے تھے یا اپنی خواہش کے مطابق توڑ مروڑ کر عملی جامہ پہناتے تھے۔ کاروبار حکومت کی ہر سطح پر ذاتی پسند اور ناپسند اور شخصی بالادستیوں کا دور دورہ تھا اور مرکز گریز عناصر کو من مانی کاروائیاں کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ خاص طور پر جو لاوا مشرقی پاکستان میں پکنا شروع ہو گیا تھا' اس کی طرف توجہ دینے کی کسی کو فرصت نہ تھی۔ ۱۹۵۴ء کے انتخابات نے مشرقی پاکستان میں سیاست کے ایک نئے رخ اور ایک نئی توانائی کو جنم دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں گورنر جنرل نے مرکز میں کٹھ پتلیوں کا جو کھیل رچا رکھا تھا' اس کی حیثیت قرون وسطیٰ کے رنگ میں رنگے ہوئے کسی رجواڑے سے مختلف نہ تھی۔ مولانا بھاشانی نے کاگماری کے جلسہ عام میں مغربی پاکستان کو "اسلام علیکم" کی دھمکی سنا کر ایک خطرناک علیحدگی پسند رجحان کو زبان دے دی تھی۔ مسٹر غلام محمد کی صدارت میں نت روز مرکزی کابینہ کے اجلاس ہوتے رہتے تھے۔ لیکن ایسا اجلاس کبھی نہ ہوا جس میں مشرقی پاکستان کی نئی صورت حال کا سنجیدگی کے ساتھ سیاسی تجزیہ کیا جائے۔ کابینہ کا اجتماعی ذہن نوکر شاہی کی لکیر کا فقیر تھا۔ وہ مشرقی پاکستان میں ابھرتی ہوئی نئی سیاست کا جواب سیاست سے دینے کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تو وہی فرسودہ نو آبادیاتی فارمولہ تھا کہ اگر صوبائی حکومت پسند خاطر نہ رہے تو اسے برطرف کر کے صوبے میں گورنر کا راج نافذ کر دیا جائے۔
آئین ساز اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین خاں نے اسمبلی کی برطرفی کو قبول نہ کیا تھا اور گورنر جنرل کے ہنگامی حالات کے خلاف سندھ ہائیکورٹ میں رٹ دائر کر رکھی تھی۔ سندھ ہائیکورٹ نے فیصلہ دیا کہ گورنر جنرل کو اسمبلی برطرف کرنے کا کوئی اختیار

نہ تھا۔ حکومت نے اس فیصلہ کے خلاف فیڈرل کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ فیڈرل کورٹ نے اسمبلی برطرف کرنے میں گورنر جنرل کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد ایک طویل قانونی کشمکش کا آغاز ہوا جس کے دوران میں گورنر جنرل نے ایک ایمرجنسی پاورز آرڈی نینس جاری کر کے کئی نئے اختیارات اپنے قبضہ میں لے لیے۔ ان میں ایک تو مغربی پاکستان میں "ون یونٹ" قائم کرنے کا اختیار تھا۔ دوسرا اختیار یہ تھا کہ آئین سازی کے متعلق گورنر جنرل ہر قسم کے انتظامات کرنے کا مجاز ہو گا۔ دراصل مسٹر غلام محمد کا ارادہ یہ تھا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کی جگہ اپنی مرضی کے کچھ لوگوں کو نامزد کر کے ایک Constituent Convention قائم کریں اور اس سے آئین سازی کا کام لیں۔ یہ اختیار اسی ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ اپنے ان اقدامات کے لیے قانونی آڑ حاصل کرنے کی نیت سے گورنر جنرل نے فیڈرل کورٹ کو ایک ریفرنس پیش کی کہ وہ اسمبلی کی برطرفی سے پیدا ہونے والی صورت حال کا جائزہ لے کر ان عوامل و عواقب کے متعلق انہیں اپنا مشورہ دے۔

مولوی تمیز الدین کیس' یوسف پٹیل کیس اور گورنر جنرل کی ریفرنس کے نتیجہ کے طور پر فیڈرل کورٹ نے جو فیصلے دیئے' وہ پاکستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

اول: اسمبلی کو برطرف کرنے کے لیے گورنر جنرل کا اختیار تسلیم کر لیا گیا۔

دوئم: گورنر جنرل کا یہ اختیار تسلیم نہ کیا گیا کہ وہ نامزد لوگوں کا کنونشن قائم کر کے آئین سازی کا کام اس کے سپرد کر دے۔ بلکہ عدالت نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ فوراً برطرف شدہ اسمبلی کی جگہ اسی طرز کی نئی اسمبلی قائم کرنے کے لیے انتخابات منعقد کرائے۔

سوئم: بہت سے ایسے قوانین تھے' جو پچھلی اسمبلی کی طرف سے ابھی باضابطہ طور پر نافذ نہ ہوئے تھے۔ اسمبلی کی برطرفی کے بعد گورنر جنرل نے ایک آرڈیننس کے ذریعہ ان کی توثیق کر دی تھی۔ فیڈرل کورٹ نے کہا کہ عبوری دور تک تو یہ توثیق کام آ

سکتی ہے لیکن جب نئی اسمبلی قائم ہو تو وہ ان قوانین کی باضابطہ منظوری دے۔
ان فیصلوں کے پیچھے "نظریہ ضرورت" کی روح کارفرما تھی۔ ریفرنس کیس میں چیف جسٹس

نے خود لکھا ہے:

We have come to the brink of a chasm with only three alternatives before us:
(ٹ) to turn back the way we came by؛
(ب) to cross the gap by a legal bridge؛
(ب) to hurtle into the chasm beyound any hope of rescue'
(Federal ٮourt of Pakistan، Report on the Special Reference made by His Excellency the Governor General of Pakistan (Lahore، (وڑی ن) Pر ب)

"ہم ایک خندق کے کنارے آ پہنچے ہیں'
جہاں ہمارے سامنے صرف تین راستے ہیں۔
(۱) جس راہ سے ہم یہاں تک آئے ہیں اسی راہ واپس مڑ جائیں۔
(۲) خندق پر ایک قانونی پل تعمیر کر کے اسے عبور کر لیں۔
(۳) خندق میں چھلانگ لگا کر تباہی کا شکار ہو جائیں۔"

فیڈرل کورٹ نے مسٹر غلام محمد کی کھودی ہوئی اس خندق پر جو قانونی پل تعمیر کیا وہ Necessity Law of (قانون ضرورت) کے ستون پر کھڑا کیا گیا تھا۔ قانون کی یہ شاخ ہمارے امور سلطنت میں پہلی بار ۱۹۵۵ء میں داخل ہوئی اور بیس پچیس برس میں پھل پھول کر یہ ایسا تنو مند درخت بن گئی' جس کے سائے کے نیچے دب کر بہت سے دوسرے قوانین

کی باڑھ ماری گئی۔

جس زمانے میں یہ ریفرنس فیڈرل کورٹ کے زیرغور تھی' میں نے دیکھا کہ میرا ڈپٹی سیکرٹری فرخ امین ہر دوسرے تیسرے روز مجھے بتائے بغیر لاہور آ جا رہا ہے۔ ایک روز میں نے اسے ڈانٹا کہ میری اجازت کے بغیر وہ اتنی بار لاہور کیوں آتا جاتا ہے؟ اس نے صاف گوئی سے کام لے کر مجھے بتایا کہ وہ گورنر جنرل کا کوئی خفی پیغام کوڈ ورڈ (Code Words) کی صورت چیف جسٹس مسٹر منیر کے پاس لے جاتا ہے اور وہاں سے اسی طرح کوڈ الفاظ میں چیف جسٹس کا پیغام گورنر جنرل کو لا کر دے دیتا ہے۔ فرخ امین نے مزید بتایا کہ غلام محمد صاحب کا تاکیدی حکم تھا کہ وہ یہ بات کسی کو ہرگز نہ بتائے۔ مجھے معلوم نہیں کہ گورنر جنرل اور فیڈرل چیف جسٹس کے مابین اس خفیہ پیغام رسانی کی کیا نوعیت تھی اور نہ ہی یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس باہمی خفیہ پیغام رسانی نے فیڈرل کورٹ کے فیصلہ پر کوئی اثر ڈالا بھی تھا یا نہیں؟ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے موقع پر مملکت کے سربراہ عدلیہ کے سربراہ کا آپس میں خفیہ رابطہ قائم کرنا دونوں کو زیب نہ دیتا تھا۔

خدا خدا کر کے مسٹر غلام محمد نے کسی قدر بیزاری سے فیڈرل کورٹ کا مشورہ تسلیم کر لیا اور ایک آرڈیننس کے ذریعہ نئی آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ جس روز آرڈیننس تیار ہو رہا تھا' مسٹر غلام محمد نے مجھے حکم دیا کہ جس وقت بھی کاغذات مکمل ہو کر آ جائیں' میں فوراً ان سے دستخط کروا لوں۔ اگر وہ سوئے ہوئے بھی ہوں تب بھی انہیں جگا کر دستخط لے لیے جائیں۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ سارے کاغذات آدھی رات کے قریب موصول ہوئے۔ میں انہیں لے کر مسٹر غلام محمد کے بیڈروم میں گیا۔ وہ اپنے بستر پر گہری نیند سوئے پڑے تھے۔ اس وقت ان کی قوت ارادی کا ڈائنمو بند تھا اور ان کا جسم بوسیدہ ہڈیوں کے ڈھانچے کی طرح پلنگ پر بکھرا ہوا تھا' جیسے کسی پرانی قبر نے اپنے مردے کو اگل کر باہر پھینک دیا ہو۔ میں نے

ان کے ذاتی ملازم کی مدد سے بڑی مشکل کے ساتھ انہیں جگایا۔ بیداری کی لہر ان کے تن بدن میں اس طرح رک رک کر' ٹھہر ٹھہر کر داخل ہوئی جیسے بہت سی چیونٹیاں روٹی کے ٹکڑے کو گھسیٹ گھسیٹ کر دیوار پر چڑھاتی ہیں اور وہ بار بار ان کی گرفت سے پھسل پھسل کر نیچے گرتا رہتا ہے۔ مسٹر غلام محمد کافی دیر تک اپنی پیلی پیلی آنکھیں جھپکا جھپکا کر خلا میں گھورتے رہے۔ پھر اچانک انہوں نے مجھے پہچانا اور اس کے ساتھ ہی وہ فوراً گورنر جنرل کے سنگھاسن پر براجمان ہو گئے۔ پہلے انہوں نے وزارت قانون کو کچھ جلی کٹی سنائیں' جو اتنی سست رفتاری سے کام کرتے ہیں کہ سربراہ مملکت چین کی نیند بھی نہیں سو سکتا۔ پھر انہوں نے کاغذات پر دستخط کئے اور چائے کے ساتھ انڈے کا حلوہ تیار کرنے کا آرڈر دیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب سٹاف کے کچھ افراد کو بھی حاضری کا حکم دیا جائے گا اور اس کے بعد یہ محفل صبح تین چار بجے اس وقت برخاست ہو گی' جب انہیں نیند آور ٹیکہ لگا کر دوبارہ سلا دیا جائے گا۔ میرے پاس دستخط شدہ کاغذات وزارت قانون میں واپس پہنچانے کا بہانہ موجود تھا۔ میں نے اسے کامیابی سے استعمال کیا اور وہاں سے کھسک کر گھر آ گیا۔

اسی عرصہ میں مرکزی کابینہ میں بھی دو بڑی اہمیت کے مالک نئے چہرے داخل ہو چکے تھے۔ ایک تو صوبہ سرحد کے مشہور کانگرسی لیڈر ڈاکٹر خاں صاحب تھے۔ وہ منسٹر آف کمیونکیشنز بنے۔ دوسرے مسٹر حسین شہید سہروردی تھے جن کے سپرد وزارت قانون ہوئی۔

ڈاکٹر خاں صاحب کی جنرل اسکندر مرزا سے ذاتی دوستی تھی۔ اس دوستی کی ابتدا اس وقت ہوئی جب اسکندر مرزا صاحب پشاور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ سنی سنائی روایت ہے کہ ایک بار کانگرسی لیڈر جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ اسکندر مرزا نے جلوس منتشر کرنے کے لیے کوئی پولیس طلب نہ کی بلکہ اس کے خیر مقدم کے لیے جگہ جگہ ٹھنڈے شربت کی سبیلیں قائم کر دیں۔ ہر سبیل پر جلوس والوں کو بڑے تپاک سے شربت پیش کیا جاتا تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ کانگرسیوں نے بڑے شوق سے شربت پیا' جس میں جمالگوٹہ

ملایا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے بعد سب کے پیٹ میں ایسا مروڑ اٹھا کہ ہزاروں کا جلوس آن کی آن منتشر ہو گیا۔

جب ڈاکٹر خان صاحب مرکزی کابینہ میں شامل ہو گئے تو ایک روز جنرل اسکندر مرزا نے چند افسروں کو بر سبیل تذکرہ یہ نصیحت بھی کی۔ ڈاکٹر خاں صاحب کو خوش رکھنے کا خاص خیال رکھا کرو۔ اس شخص نے ساری عمر جیل کی ہوا کھائی ہے یا پولیس کے ڈنڈے کھائے ہیں۔ ہم اسے بڑی مشکل سے گھیر گھار کر حکومت میں لائے ہیں۔ اب اسے گڈ لائف کا ایسا چسکا لگاؤ کہ وہ اس پنجرے سے باہر نہ نکل سکے۔"

مسٹر سہروردی کہنے کو تو وزیر قانون تھے' لیکن دراصل ان کی نظر وزارت عظمٰی پر تھی۔ وہ پرائم منسٹر محمد علی بوگرا کو ناقابل توجہ سمجھ کر ان کے ساتھ کج خلقی سے پیش آتے تھے اور کابینہ کی میٹنگ میں اکثر اس کی سبکی کرتے رہتے تھے۔ ایک بار کابینہ کے اجلاس میں وزیراعظم کسی مسئلہ کی وضاحت کر رہے تھے۔ مسٹر سہروردی نے اپنی لاتعلقی اور بے التفاتی کا اظہار کرنے کے لیے اپنے بیگ سے بیٹری سے چلنے والا شیور نکالا اور وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی داڑھی مونڈنے میں مصروف ہو گئے۔ البتہ ایک راز انہوں نے بہت اچھی طرح پا لیا تھا۔ وہ یہ کہ جس طرز کا نظام حکومت اس وقت ملک میں رائج تھا اس میں عروج حاصل کرنے کے لیے گورنر جنرل کی خوشنودی حاصل کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ وہ اس کے لیے حسب توفیق ہاتھ پاؤں مارے رہتے تھے۔ انہیں فوٹو گرافی کا شوق تھا۔ وہ ساکت اور متحرک تصویریں کھینچنے کے کیمرے کندھے سے لٹکائے مختلف تقاریب میں مسٹر غلام محمد کی تصویر کشی میں نمایاں رہنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ گورنر جنرل ہاؤس میں بھی بہت آنے جانے لگے تھے۔ ہر مرتبہ آنے کا مقصد گورنر جنرل سے ملاقات کرنا نہ ہوتا تھا بلکہ وہ مس بورل کے کمرے میں بیٹھ کر کافی وقت خوش گپیوں میں گزارا کرتے تھے۔ مسٹر غلام محمد کی طرح مسٹر سہروردی بھی خوبصورت عورتوں کی محفل کے شوقین تھے۔ اڑتے اڑتے یہ خبر مسٹر غلام محمد تک

پہنچی تو جذبہ رقابت نے ان کے سینے میں جوش مارا اور انہوں نے بلا کر میری جواب طلبی کی۔

"یہ سہروردی روتھ کے کمرے میں اتنی اتنی دیر آ کر کیوں بیٹھتا ہے؟" مسٹر غلام محمد نے

پوچھا۔

میں نے جواب دیا کہ میں تو اپنے کام میں مصروف رہتا ہوں۔ دوسروں پر چوکیداری کرنے کا مجھے وقت نہیں ملتا۔ اس پر وہ آتش زیرپا ہو گئے اور کڑک کر بولے' "جا کر اسے کہہ دو کہ اگر اس نے دوبارہ ایسی حرکت کی تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

سہروردی صاحب سے میری قحط بنگال کے دنوں سے شناسائی تھی۔ میں اسی شام ان کی کوٹھی پر حاضر ہوا اور ان کو ساری روئداد سنا ڈالی۔ اس کے بعد وہ کافی محتاط ہو گئے۔

مسٹر غلام محمد بھی کئی روز تک اپنی پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر دن میں متعدد بار مس بورل کے کمرے پر یہ دیکھنے کے لیے چھاپہ مارتے رہے کہ کہیں مسٹر سہروردی تو وہاں نہیں بیٹھے۔

نئی اسمبلی قائم کرنے کا حکم مان کر مسٹر غلام محمد کے دلی عزائم کو شکست فاش نصیب ہوئی تھی کیونکہ وہ تو اپنی مرضی کا ساتھ رکنی آئین ساز کنونشن کھڑا کر کے کام چلانا چاہتے تھے۔ اس ذاتی ہزیمت کا غم غلط کرنے کے لیے انہوں نے اپنی کھوئی ہوئی جسمانی قوتوں کو بحال کرنے کی ٹھان لی۔ اس مقصد کے لیے لکھنؤ سے ایک حکیم صاحب طلب کئے گئے' جو نابینا تھے اور ان کی عمر ایک سو پانچ برس سے اوپر بتائی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ ان کا ایک بیٹا بھی تھا جس کی عمر دس برس کے قریب تھی۔ یہ برخوردار حکیم صاحب کی عمر کے پچانویں برس میں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے اسے ان کی طبابت اور حذاقت کا جیتا جاگتا سرٹیفکیٹ تسلیم کیا جاتا تھا۔ حکیم صاحب کے آتے ہی گورنر جنرل ہاؤس کا ایک حصہ طبی دواخانے میں تبدیل ہو گیا۔ دن بھر ہاون دستہ چلتا تھا اور حکیم صاحب کی خواہش کے مطابق جڑی بوٹیاں حاضر ہوتی رہتی تھیں۔ دو تین بار انہوں نے سو سو

زندہ اور صحت مند چڑوں کی فرمائش کی' جو ہم نے بڑی مشکل سے کمشنر حیدآباد کے ذریعہ مضافات سے سندھ سے حاصل کیے۔ چڑوں کو ذبح کر کے ان کا مغز تو کسی دوا میں استعمال ہوتا تھا اور گوشت کی یخنی بنا کر حکیم صاحب خود نوش فرما لیتے تھے۔ ایک بار انہوں نے بکری کا ایسا بچہ طلب فرمایا' جسے پیدا ہونے کے بعد آنکھیں کھولنے سے پہلے ذبح کیا گیا ہو۔ گورنر ہاؤس کے کئی ملازم شہر کی حاملہ بکریوں کے سرہانے جا بیٹھے اور کسی نہ کسی طرح حکیم صاحب کی یہ فرمائش بھی پوری کی گئی۔ ان مغزیات اور لحمیات وغیرہ سے انواع و اقسام کی مقوی ادویات اور کشتہ جات تیار ہوتے تھے جنہیں مسٹر غلام محمد کو بڑے اہتمام سے کھلایا جاتا تھا۔ اس ساری کاروائی کا اور کوئی نتیجہ تو برآمد نہ ہوا البتہ ان کا بلڈ پریشر مزید بڑھ گیا اور ایک روز وہ اچانک بے ہوش ہو کر کوما میں چلے گئے۔ حکیم صاحب تو بستر بوریہ سنبھال کر رفو چکر ہو گئے اور گورنر جنرل کو آکسیجن لگا دی گئی۔

مسٹر غلام محمد کے ذاتی معالج کرنل (بعد میں بریگیڈیئر) سرور دن رات ان کے پاس رہے اگلے روز شام کے چار بجے کے قریب انہوں نے مجھے بتایا کہ گورنر جنرل کی زندگی کا چراغ گل ہونے کے قریب ہے' اس لیے میں پرائم منسٹر اور کابینہ کے دوسرے وزیروں کو اطلاع دے دوں کہ اگر وہ ان کا آخری دیدار کرنا چاہتے ہیں تو فوراً یہاں پہنچ جائیں۔ مسٹر غلام محمد کے بیڈ روم کے دروازے کھول دیئے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا کمرہ وزیراعظم سمیت کابینہ کے ممبروں اور گورنر جنرل کے ذاتی عملے سے کھچا کھچ بھر گیا۔ وزیر دفاع اور کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خاں فوجی وردی میں ملبوس تھے انہوں نے بستر کے پاس کھڑے ہو کر گورنر جنرل کو الوداعی سلیوٹ کیا اور ان کی مدح میں چند فقرے کہے۔ ان کی دیکھا دیکھی چند دوسرے وزیر بھی اسی قسم کی تقریریں کرنے کے لیے پر تول رہے تھے کہ یکایک مسٹر غلام محمد کے منہ پر لگے ہوئے آکسیجن ماسک میں کچھ جنبش سی ہوئی۔ پھر ایک ہاتھ ہلا' پھر دوسرا ہلا' اور کرنل سرور نے بڑی خوشی سے اعلان

کیا کہ گورنر جنرل ہوش میں آ رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی ساری کی ساری کیبنٹ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد مسٹر غلام محمد تکیوں کے سہارے بیٹھے چائے اور کسٹرڈ پڈنگ نوش فرما رہے تھے اور ساتھ ہی اپنے سٹاف کے ایک ایک فرد کو الگ الگ بلا کر تحقیق فرما رہے تھے کہ ان کی بے ہوشی کے دوران کون کتنا خوش تھا اور کون کتنا غمگین تھا۔

اس کے بعد مسٹر غلام محمد پر پے در پے نئی بیماریوں کے حملے شروع ہو گئے۔ کبھی تیز بخار' کبھی نمونیہ' کبھی پلوری' کبھی بلڈ پریشر------ دو چار ہفتوں کے اندر اندر وہ بستر کے ساتھ چپک کر رہ گئے۔ اب فیصلہ ہوا کہ انہیں علاج کی خاطر زیورچ (سوئٹزر لینڈ) بھیج دیا جائے۔ ایک سپر کانسٹیلیشن ہوائی جہاز چارٹر کیا گیا اور مسٹر غلام محمد کو سٹریچر پر لٹا کر خفیہ طور پر جہاز میں پہنچا دیا گیا۔ پرائم منسٹر محمد علی بوگرا دوسرے چند وزیروں کے ساتھ میرے پاس آئے اور کہا کہ میں گورنر جنرل کی کار میں مسٹر غلام محمد کا روپ دھار کر ایئرپورٹ تک چلوں۔ مجھے یہ تجویز بڑی بے تکی اور مضحکہ خیز محسوس ہوئی اور میں نے یہ سوانگ رچانے سے صاف انکار کر دیا۔ اول تو مسٹر غلام محمد کی شکل و صورت کے ساتھ میری کوئی مشابہت نہ تھی۔ دوسرے انہیں پہلے ہی سے خاموشی سے ہوائی جہاز میں پہنچا دیا گیا تھا اور اب ان کی روانگی کا نقلی جلوس نکالنے کی بالکل کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن وزیراعظم اور ان کے رفقاء ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے اور جب حکومت کا سربراہ اس قسم کا احمقانہ حکم صادر کرے تو سرکاری ملازم صرف احتجاج کر سکتا ہے' انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مجبور ہو کر میں نے کالا چشمہ لگا کر سیاہ رنگ کی جناح کیپ پہنی اور گورنر جنرل کی کار میں مسٹر غلام محمد کے انداز میں سکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک اے۔ ڈی۔ سی میرے ساتھ اور دوسرا اگلی سیٹ پر بیٹھا۔ کار پر ایک طرف گورنر جنرل کا فلیگ اور دوسری طرف پاکستان کا پرچم لگا دیئے گئے۔ ہمارے دائیں بائیں' آگے پیچھے موٹر سائیکل سوار فوجیوں کا دستہ تھا۔ پھر سیکورٹی پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ اس

کے بعد وزیراعظم کی کار تھی۔ ان کے پیچھے دوسرے وزیروں اور افسروں کی گاڑیاں تھیں۔
ہمارا یہ قافلہ بڑی شان و شوکت سے روانہ ہوا لیکن راستے بھر کسی نے اس کا کوئی

نوٹس نہ لیا کیونکہ پولیس والوں کی مہربانی سے ایئرپورٹ تک ساری سڑک سنسان پڑی تھی۔ سارے راستہ مجھے یہی خیال آتا رہا کہ اس وقت ہم سب لوگ مل جل کر گورنر جنرل کے فلیگ اور پاکستانی پرچم کی جی بھر کر بے حرمتی کر رہے ہیں۔
ایئرپورٹ پر زیورچ جانے والا جہاز ہینگر کے اندر کھڑا تھا۔ وزیر قانون مسٹر سہروردی اپنے کیمروں سے لیس اس کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ ابھی تک انہیں یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ مسٹر غلام محمد جہاز کے اندر پہنچا دیئے گئے ہیں۔ جب ہمارا جلوس وہاں پہنچا تو وہ بڑے شوق سے گورنر جنرل کی مخصوص کار کی طرف لپکے اور رکتے ہی اس کا دروازہ بڑے احترام سے کھولا۔ کار سے مسٹر غلام محمد کی جگہ جب میں برآمد ہوا' تو مسٹر سہروردی ہکا بکا رہ گئے۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ کیا تماشا ہے؟"
میں نے انہیں سارا ماجرا سنایا' تو مسٹر غلام محمد سے ملاقات کرنے ہوائی جہاز کی طرف لپکے۔ لیکن کرنل سرور نے انہیں یہ کہہ کر روک دیا کہ گورنر جنرل اس وقت کوما میں ہیں۔
زیورچ کے کلینک میں علاج معالجہ کے بعد ان کی طبیعت کچھ سنبھلی' تو ایک روز وہ پکنک منانے ایک پر فضا مقام پر گئے۔ لنچ کے وقت ایک ریستوران میں سٹاف کو الگ میز پر بٹھایا گیا اور مسٹر غلام محمد مس بورل اور اس کی والدہ کے ساتھ علیحدہ ٹیبل پر بیٹھے کھانے کے دوران ان پر فالج کا ایک اور حملہ ہوا اور انہیں ایمبولینس میں ڈال کر زیورچ والے کلینگ میں داخل کر دیا گیا۔
کچھ عرصہ بعد جب مسٹر غلام محمد واپس کراچی آئے تو ان کی دماغی حالت اور بھی پیچیدگی اختیار کر چکی تھی۔ وہ صبح سویرے سوٹ بوٹ پہن کر کیبنٹ روم میں آ جاتے تھے۔ اپنے اسٹاف کے مختلف افراد کو جمع کر کے ہر روز نئی کابینہ بناتے تھے۔ ان سے حلف اٹھواتے تھے۔ پورٹ فولیوز تقسیم کرتے تھے اور اس کے بعد گھنٹوں تک کیبنٹ میٹنگ

ہوتی تھی' جس میں وہ خود لگاتار ایسی باتیں بولتے رہتے تھے جو کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔

ایک روز وزیر داخلہ کے پرائیویٹ سیکرٹری کا ٹیلیفون آیا کہ اسکندر مرزا صاحب نے شام کے پانچ بجے اپنے گھر چائے پر بلایا ہے۔ وہاں پر جنرل ایوب کاں' چوہدری محمد علی اور گورنر جنرل کے معالج کرنل سرور پہلے سے موجود تھے۔ علیک سلیک کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ کچھ اس طرح کی تھی:

اسکندر مرزا: گورنر جنرل کی صحت کے بار میں ہم نے بڑی تشویشناک خبریں سنیں ہیں۔ ہمارا خیال ہے اب انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔

جنرل ایوب خاں: سوال یہ ہے' کیا وہ رضا مندی سے استعفیٰ دینے پر تیار ہو جائیں گے؟

میں: خوشی سے تو تیار نہ ہوں گے۔ لیکن اگر انہیں سمجھا دیا جائے کہ اس کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں تو شاید مان جائیں۔

اسکندر مرزا: ہم نے سنا ہے وہ تم پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ وہ صرف اس کاغذ پر دستخط کرتے ہیں جو تم ان کے پاس لے جاؤ۔

میں: جی نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ میرے علاوہ وہ مس بورل اور میرے ڈپٹی سیکرٹری فرخ امین پر بھی مکمل اعتماد کرتے ہیں۔

جنرل ایوب خاں: مس بورل تو پاکستانی نہیں۔

اسکندر مرزا: مس بورل کو چھوڑ کر تم دونوں میں سے کون اس کام میں زیادہ مدد دے سکتا ہے؟

میں: جناب' میری حقیر رائے میں استعفیٰ کے معاملے میں گورنر جنرل کے ذاتی عملے کو بیچ میں نہیں لانا چاہیے۔ اصولاً تو یہ فرض پرائم منسٹر کو سر انجام دینا چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو' تو یہ کام مسٹر غلام محمد کے اہل خاندان کے سپرد کر دینا چاہیے۔ وہ سمجھا بجھا کر انہیں مستعفی ہونے پر رضا مند کر سکتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ میری یہ بات جنرل اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خاں کو پسند نہ آئی اور وہ برا سا منہ بنا کر خاموش ہو گئے۔ لیکن چوہدری محمد علی نے بڑی گرمجوشی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "اچھا بھئی، شکریہ۔ تم نے صحیح رائے دی ہے۔"

چند ہفتوں کے اندر اندر مسٹر غلام محمد کی سبکدوشی کا مسئلہ طے ہو گیا۔ پہلے انہوں نے کچھ چھٹی لی اور پھر مستعفی ہو گئے۔ جس روز انہوں نے چارج چھوڑا، مجھے حکم ملا کہ میں ان کی طرف سے قوم کے نام ایک پیغام لکھوں اور ریڈیو سے اسے براڈ کاسٹ بھی کروں۔ یہ بڑا مشکل کام تھا کیونکہ گورنر جنرل کے طور پر مسٹر غلام محمد نے کوئی ایسا تعمیری کارنامہ سرانجام نہ دیا تھا جسے ان کے الوداعی پیغام میں فخر کے ساتھ بیان کیا جا سکتا۔ میں نے پانچ منٹ کا ایک رسمی سا پیغام لکھا، جو پرانی دہرائی ہوئی عامیانہ، فرسودہ اور پیش پا افتادہ باتوں اور اقوال پر مشتمل تھا۔ اس تقریر کا ڈرافٹ منظور کرانے کے لیے میں پرائم منسٹر سمیت کئی وزیروں کے پاس گیا، لیکن کسی نے اسے پڑھنے تک کی زحمت گوارا نہ کی، کیونکہ کرسی سے اترتے ہوئے گورنر جنرل کے ساتھ کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ چنانچہ میں نے اسی غیر منظور شدہ ڈرافٹ کو شام کے وقت نیشنل ہک اپ میں ریڈیو سے براڈ کاسٹ کر دیا۔ ریڈیو اسٹیشن سے نکلا، تو باہر سڑک پر مس بورل کی خوبصورت دورنگی کار کھڑی تھی۔ ماں بیٹی کار کے ریڈیو پر میرا براڈ کاسٹ سن کر زار و قطار رو رہی تھیں۔ اس روز مسٹر غلام محمد کے جانے پر شاید یہی چار آنکھیں تھیں جو اس قدر شدت سے اشکبار ہوئی ہوں اور یہ آنکھیں بھی پاکستانی نہ تھیں۔

گورنر جنرل کے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد مسٹر غلام محمد اپنی بیٹی کے ہاں کلفٹن منتقل ہو گئے۔ سرکاری ذمہ داریوں کا بوجھ اترتے ہی ان کی جسمانی اور دماغی صحت حیرت انگیز طور پر اچھی ہو گئی۔ کرنل سرور باقاعدگی کے ساتھ ان کا علاج کرتے رہے۔

کبھی کبھی اپنی خط و کتابت میں مدد دینے کے لیے وہ مجھے بھی بلا لیتے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ سینما دکھانے بھی لے گئے۔

وفات سے چند روز پہلے ان پر ایک عجیب دھن سوار ہو گئی۔ انہوں نے اپنے ڈاکٹر کرنل سرور سے کہا کہ وہ ہوائی جہاز چارٹر کر کے دیوا شریف جانا چاہتے ہیں۔ دیوا شریف لکھنؤ کے قریب کوئی جگہ ہے جہاں حاجی وارث علی شاہ دفن ہیں۔ یہ بزرگ غالباً بیسویں صدی کے اوائل میں فوت ہوئے تھے اور مسٹر غلام محمد کو ان کے ساتھ گہری عقیدت تھی۔ وہ ان کی فوٹو ہمیشہ اپنے بستر کے قریب تپائی پر رکھا کرتے تھے۔ انہوں نے ان کی ملفوظات اور سوانح حیات شائع کروانے میں بھی کافی حصہ لیا تھا اور تقسیم سے پہلے کئی بار دیوا شریف میں ان کے مزار پر حاضری دے چکے تھے۔ حاجی وارث علی شاہ کے حالات زندگی پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ درویشانہ اور قلندرانہ وضع کے بزرگ تھے۔ لیکن ان کے مسلک نے مسٹر غلام محمد پر کچھ بھی اثر نہ کیا تھا' کیونکہ وہ جب تک جئے حب جاہ اور حب دنیا کا عبرتناک مجسمہ بن کر جئے۔ اپنی زندگی کے آخری روز بھی ان کو دیوا شریف جانے کی لگن لگی ہوئی تھی' لیکن کارکنان قضا و قدر کو کچھ اور منظور تھا۔ اسی رات ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی وفات کی خبر سن کر جو لوگ تعزیت کے لیے آئے' ان میں خواجہ ناظم الدین سرفہرست تھے' جنہیں مسٹر غلام محمد نے وزیراعظم کے عہدہ سے غیر آئینی طور پر برطرف کر دیا تھا۔

گورنر جنرل کی حیثیت سے مسٹر غلام محمد کا دور پاکستان کے لیے بدشگونی کا زمانہ تھا۔ جمہوری روایات اور اقدار کی بے دریغ پامالی کا سلسلہ ان کے ہاتھوں شروع ہوا۔ اسی کے ساتھ نظام سلطنت میں "قانون ضرورت" کے عمل دخل کی ابتدا ہوئی۔ حکومت میں شخصیت پرستی نے فروغ پایا۔ مشرقی پاکستان کی سیاست نے واضح طور پر ایک الگ رخ اختیار کیا' لیکن مرکزی قیادت نوکر شاہی کے پٹے پٹائے نوآبادیاتی فارمولوں میں پابجولاں رہی۔

بری افواج کے کمانڈر انچیف نے اپنے عہدہ کے ساتھ وزیر دفاع کی خدمت شامل کر کے کابینہ میں شرکت حاصل کی اور اس طرح حکومت کے اندرونی کاروبار کی ٹریننگ حاصل

کر کے مستقبل کے لیے اپنے عزائم کو پختہ کر لیا۔ اس دور کی مجموعی خصوصیت بے ثباتی' بے یقینی' بے اعتمادی اور بدنیتی تھی۔

مجھ سے کئی بار یہ سوال کیا گیا ہے کہ مسٹر غلام محمد اس قدر شدید بیمار تھے کہ وہ چل پھر نہ سکتے تھے۔ بول نہ سکتے تھے' زیادہ لکھ پڑھ نہ سکتے تھے' لیکن اس کے باوجود وہ بڑے رعب داب سے حکمرانی کرتے رہے۔ ان کی طاقت کا اصلی راز کیا تھا؟

اس سوال کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب یہ ہے کہ مسٹر غلام محمد کی طاقت کا سرچشمہ سیاست دانوں کی کمزوری تھی۔

اس کے علاوہ دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ جنرل اسکندر مرزا کی شہہ پر مسٹر غلام محمد کو کمانڈر انچیف ایوب خاں کی پشت پناہی بھی حاصل تھی' جو نظر نہ آنے والی روشنائی سے لکھی ہوئی تھی! مستقبل کے بارے میں ان دونوں حضرات کے اپنے اپنے عزائم تھے' جو مسٹر غلام محمد کی طرز کے گورنر جنرل کی اوٹ لیے بغیر پروان نہ چڑھ سکتے تھے۔

○○○

• سکندر مرزا کا عروج و زوال

اگست ۱۹۵۵ء میں میجر جنرل اسکندر مرزا نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا اور دستور کے مطابق اسی روز میں نے چارج چھوڑنے کی رپورٹ مکمل کر کے ان کی خدمت میں بھیج دی' تاکہ وہ اپنی پسند کا نیا سیکرٹری منتخب کر لیں۔ وہ یہ رپورٹ ہاتھ میں لیے میرے کمرے میں آئے' اور کہا' "میری خواہش ہے کہ تم اسی جگہ کام کرتے رہو۔"

شروع شروع میں ان کے ساتھ کام کرنے میں ایک عجیب دقت پیش آئی۔ اب تک ہم لوگ گورنر جنرل کی گفتگو آواز سن کر نہیں بلکہ ہونٹوں کی حرکت دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اب معاملہ اس کے برعکس تھا۔ دو تین بار ایسا ہوا کہ جیسے ہی نیا گورنر جنرل کوئی بات شروع کرتا' میں غیر ارادی طور پر ٹکٹکی باندھ کر ان کے ہونٹوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا۔ وہ سمجھتے کہ شاید ان کے منہ پر کوئی چیز چپکی ہوئی ہے۔ وہ فوراً اپنا رومال نکال کر منہ صاف کرنا شروع کر دیتے۔ جب کئی بار یہی واقعہ پیش آیا تو میں نے انہیں بڑی صاف دلی سے صحیح صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ یہ سن کر وہ بہت ہنسے اور بولے----- "کوئی بات نہیں۔ آہستہ آہستہ تمہیں نارمل آواز سننے کی عادت بھی پڑ جائے گی۔"

بیگم ناہید مرزا کے آنے سے گورنر جنرل ہاؤس کی کایا ہی پلٹ گئی۔ وہ بڑی سلیقہ مند اور نفاست پسند ایرانی خاتون تھیں' اور انہیں گھر بار کی آرائش و زیبائش اور زینت و سجاوٹ بے حد شوق تھا۔ ایک روز وہ میرے دفتر کے کمرے میں تشریف لائیں اور پوچھنے لگیں' "تمہیں اپنے کمرے کی نئی تزئین و ترتیب پسند آئی؟"

میں نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا' تو وہ بڑے تعجب سے بولیں۔ "کیا سچ مچ تمہیں اس کمرے میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی؟"

میں بڑی ندامت سے سر کھجانے لگا' کیونکہ میں واقعی اپنے کمرے میں کوئی نیا پن نوٹس نہ کیا تھا۔ بیگم مرزا نے مایوسی سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور کہنے لگیں۔ "ذرا غور سے دیکھو------ پرانے فرسودہ پردوں کی جگہ کتنے خوبصورت نئے پردے لگائے گئے ہیں۔ صوفوں کے کشن بھی پردوں کے ہم رنگ ہیں۔ دروازے کے دونوں طرف کھلے ہوئے پھولوں کے گملے ہیں۔ کھڑکی میں بھی تازہ پھولوں کا گلدان ہے اور تمہارا میلا سا کوٹ جو کھونٹی پر ٹنگا رہتا تھا' اب ڈرائی کلین کر کے پلاسٹک کے کور میں لٹکایا ہوا ہے۔"

میں شرمندہ ہو کر بدذوقی کی معافی مانگنے لگا تو وہ مسکرا کر بولیں۔ "یہ جرم قبل عفو تو نہیں۔ لیکن ایک کام کرو تو معافی مل سکتی ہے۔"

"آپ حکم دیجئے۔ میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

"مس بورل کو فوراً یہاں سے چلتا کرو۔" بیگم مرزا نے سنجیدگی سے کہا۔

اس غیر متوقع فرمائش پر میں کسی قدر حیران ہوا' تو وہ بولیں۔ "حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کامن سنس کی بات ہے۔ جتنی دیر وہ یہاں رہے گی۔ اتنے ہی زیادہ اسکینڈل بننے کا چانس ہے۔ تم اس دفتر کے انچارج ہو۔ جلد سے جلد اسے فارغ کر دو۔ لیکن میرا نام بیچ میں نہ آئے۔"

مس روتھ بورل غیر معمولی طور پر حساس اور دور اندیش لڑکی تھی۔ گورنر جنرل ہاؤس میں تبدیلیاں رونما ہوتے ہی عورت کی چھٹی حس نے خبردار کر دیا تھا کہ اب اس کا یہاں گزارا ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ میرے ہلکے سے اشارے پر اس نے اپنا استعفیٰ دے دیا اور چند روز بعد اپنی والدہ کو لے کر پاکستان سے رخصت ہو گئی۔

میجر جنرل اسکندر مرزا اور بیگم مرزا کے آتے ہی گورنر جنرل ہاؤس میں دعوتوں اور پارٹیوں کا دور شروع ہو گیا۔ کبھی ڈنر' کبھی ڈانس' کبھی مون لائٹ پکنک------ وقتاً فوقتاً نئی نئی تقریبات منعقد ہوتی رہتی تھیں' جو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے شروع ہو کر رات کے ڈیڑھ دو بجے تک چلتی تھیں۔ عورتوں کے لیے تو یہ ایک طرح کی فیشن پریڈ ہوتی تھی'

جس میں وہ اپنے حسن و جمال کے علاوہ قسم قسم کے ملبوسات کی نمائش کیا کرتی تھیں۔ کچھ خواتین ایسا لباس پہننے میں مہارت رکھتی تھیں جو جسم کو چھپانے کی بجائے اسے فنکاری

سے عریاں کرنے میں مدد دیتا تھا۔ ان پارٹیوں میں شامل ہونے والے کئی زندہ دل لوگ ایسی خواتین کے کندھوں اور کولہوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر ان کے لباس کے میٹریل کی دیر دیر تک تعریف کرتے رہتے تھے------ اگرچہ ان کے کندھوں اور کولہوں پر دور دور تک کسی لباس کا کوئی میٹریل موجود نہ ہوتا تھا۔ ساغر و مینا کی کرامات بھی اپنا رنگ جماتی تھیں اور بیگم مرزا کی نگرانی میں تیار کئے ہوئے ایرانی پلاؤ اور کباب اور کوفتے بڑے لاجواب ہوتے تھے۔ ان محفلوں میں جو لوگ صاحب اقتدار ہوتے تھے' وہ دولت مند تاجروں اور صنعت کاروں کی طرف بصد حسرت و یاس تکتے تھے۔ جن کے پاس دولت کی فروانی تھی' ان کو اقتدار والوں پر رشک آتا تھا اور جن کے پاس دولت اور اقتدار دونوں نعمتیں تھیں' ان کی دلچپی کا واحد مرکز عورت ذات تھی۔ کثرت مے نوشی کے بعد کچھ لوگ کھانے پر گدھ کی طرح گرتے تھے اور اس طرح بدحواس ہو کر کھاتے تھے۔ جیسے چوپائے کھاتے ہیں۔ کچھ لوگ کھانے پینے سے بے نیاز ہو کر سکتے کے عالم میں آ جاتے تھے اور غنودگی کی حالت میں گم سم بیٹھ جاتے تھے۔ بعض لوگ غسلخانوں میں جا کر بار بار قے کرتے تھے اور تازہ دم ہو کر ازسر نو شراب ناب کا دور شروع کر دیتے تھے۔ لہو و لعب کے ان مشغلوں میں انسانیت سسک سسک کر دم توڑ دیتی تھی اور بہیمت نت نئے روپ دھارتی رہتی تھی۔ البتہ میجر جنرل اسکندر مرزا شراب پی کر خود کبھی بدمست نہ ہوتے تھے۔ وہ گلاس ہاتھ میں لیے اپنی مہمانوں میں منڈلاتے رہتے تھے اور ان کی بدحواسیوں' کم ظرفیوں اور مدہوشیوں کا خوب مزا لیتے تھے۔ ایک روز وہ ایک خوبصورت خاتون کا پلو پکڑے اس کی ساڑھی کی تعریف کر رہے تھے۔ بیگم مرزا چیل کی طرح جھپٹ کر آئیں اور اس عورت کو ڈانٹا کہ وہ ان کے میاں کے ساتھ فلرٹ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ عورت نے احتجاج کیا کہ وہ تو صرف اس

کی ساڑی کی تعریف کر رہے تھے۔ اس پر بیگم مرزا نے کہا۔ میرے ساتھ تعلقات کی ابتدا بھی انہوں نے اسی طرح کی تھی۔" بیگم ناہید مرزا اسکندر مرزا صاحب کی دوسری بیوی تھیں۔ پہلے وہ پاکستان میں ایران کے ملٹری اٹیچی کے ساتھ بیاہی ہوئی تھیں۔ پھر اس سے طلاق حاصل کر کے انہوں نے اسکندر مرزا سے شادی کر لی۔ اس وقت وہ ڈیفنس سیکرٹری تھے۔

گورنر جنرل کی ان پارٹیوں میں مجھے صرف ایک بار شمولیت کا موقع ملا۔ پارٹی کے رنگ سے مجھے بڑ بدمزگی اور کراہت محسوس ہوئی۔ دوسری بات جب مجھے اسی قسم کی دعوت ملی تو میں نے بیگم مرزا کو فارسی کا یہ شعر لکھ کر بھیج دیا:

در محفل خود راہ مدہ ہمچو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

اس کے بعد انہوں نے سرکاری تقریبات کے علاوہ مجھے اپنی کسی اور دعوت میں شرکت کے لیے مدعو نہ کیا۔

میجر جنرل اسکندر مرزا کے کام کرنے کا طریقہ بڑا منظم تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے سے دوپہر کے ایک بجے تک جم کر دفتر میں بیٹھتے تھے۔ روز کی فائلیں روز ہی نپٹا دیتے تھے۔ اس کے بعد شام کے وقت انہوں نے مجھے کبھی سرکاری کام کے لیے طلب نہیں کیا۔ سیاسی میل ملاپ اور جوڑ توڑ کا سارا کام وہ دفتری اوقات کے بعد کرتے تھے۔ ان کی ملازمت کا بیشتر حصہ برٹش دور کی پولیٹیکل سروس میں گزرا تھا' اس لیے اس کام میں انہیں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ میرے کمرے کی ایک کھڑکی گورنر جنرل ہاؤس کے برآمدے میں کھلتی تھی۔ ایک بجے جب وہ دفتر سے اٹھ کر اس برآمدے سے گزرتے تھے تو لمحہ بھر کے لیے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر پوچھ لیتے تھے کہ کوئی اہم کام باقی

تو نہیں رہ گیا؟ اس کے بعد میرا اور ان کا رابطہ اگلی صبح تک کے لیے ٹوٹ جاتا تھا۔
اس لائحہ عمل میں فقط ایک بار تبدیلی آئی۔ ایک روز میں اپنے گھر پر تھا کہ رات

کے دس بجے گورنر جنرل ہاؤس کی کار آئی اور اس میں سے کراچی کے ایک بہت بڑے سیٹھ نمودار ہوئے۔ وہ شراب کے نشے میں دھت تھے۔ انہوں نے مجھے گورنر جنرل کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک پرچہ دیا جس میں میرے نام حکم تھا کہ میں ان صاحب کو چیف کنٹرولر آف امپورٹ ایکسپورٹ سے پچیس شیورلٹ کاریں درآمد کرنے کا لائسنس فوراً دلوا دوں۔ اسکندر مرزا کے دستخط کے نیچے اس روز کی تاریخ تھی اور تاریخ کے نیچے یہ حکم نامہ تحریر کرنے کا وقت "9 P.M." بھی درج تھا۔ سیٹھ صاحب نے کہا کہ گورنر جنرل نے مجھے بھی اپنے پاس بلایا ہے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا' تو وہ مجھے ایک الگ کمرے میں لے گئے اور کہنے لگے۔ یہ سیٹھ ساری شام ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا رہا۔ میں نے بھی جان بچانے کے لیے یہ مضحکہ خیز نوٹ لکھ دیا۔ اس کے نیچے وقت اس لیے درج کیا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ کہ یہ دفتر کی بات نہیں بلکہ محفل ناؤ نوش کا حکم ہے۔ اب تم اس سیٹھ کو اپنے دفتر میں لے جا کر ڈانٹو ڈپٹو' اور یہ حکمنامہ اس کے سامنے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دو۔ آئندہ بھی اگر کوئی ایسی تحریر لائے جس پر شام کے آٹھ بجے کے بعد کا وقت درج ہو تو اسے بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پھاڑ کر پھینک دو۔"

اسکندر مرزا صاحب کو گورنر جنرل بنے تین روز ہوئے تھے کہ شام کے پانچ بجے مجھے گھر پر مسٹر سہروردی نے ٹیلیفون کر کے پوچھا۔ "پرائم منسٹر کے طور پر میرا حلف لینے کے لیے کون سی تاریخ مقرر ہوئی ہے؟"

یہ سوال سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا' کیونکہ مجھے اس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ میں نے یہی بات ان کو بتائی' تو مسٹر سہروردی غصے سے بولے۔ "تم کس طرح کے نکمے سیکرٹری ہو۔ فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب صرف تفصیلات کا انتظار ہے۔ فوراً گورنر جنرل کے

پاس جاؤ' اور حلف اٹھانے کی تاریخ اور وقت معلوم کر کے مجھے خبر دو۔ میں انتظار کروں گا۔"

مجبوراً میں اسکندر مرزا صاحب کے پاس گیا۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ برج کھیل رہے تھے۔ موقع پا کر میں انہیں کمرے سے باہر لے گیا اور انہیں مسٹر سہروردی والی بات بتائی۔ یہ سن کر وہ خوب ہنسے اور اندر جا کر اپنے دوستوں سے بولے۔ "تم نے کچھ سنا؟ سہروردی وزیراعظم کا حلف لینے کا وقت پوچھ رہا ہے۔ اس پر سب نے تاش کے پتے زور زور سے میز پر مارے' اور بڑے اونچے فرمائشی قہقہے بلند کئے۔ کچھ دیر اچھی خاصی ہڑبونگ جاری رہی۔ اس کے بعد گورنر جنرل نے مجھے کہا۔ "میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم سہروردی کو بتا دو کہ حلف برداری کی رسم پرسوں منعقد ہو گی اور چوہدری محمد علی وزیراعظم کا حلف اٹھائیں گے۔"

وہاں سے میں سیدھا مسٹر سہروردی صاحب کے ہاں پہنچا اور ان کو یہ خبر سنائی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ان کے ساتھ کچھ وعدے وعید ہو چکے تھے۔ اس نئی صورت حال پر وہ بڑے جھلائے اور میرے سامنے انہوں نے بس اتنا کہا۔ "اچھا' پھر وہی محلاتی سازش۔"

دو روز بعد ۱۱ اگست ۱۹۵۵ء کو چوہدری محمد علی نے وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھا لیا۔ ان کی حکومت مسلم لیگ اور یونائیٹڈ فرنٹ کی کولیشن سے بنی تھی۔ "شیر بنگال" مولوی اے۔ کے فضل الحق پہلی بار کسی مرکزی کابینہ میں شامل ہوئے اور انہیں وزارت داخلہ ملی۔ کچھ عرصہ قبل ان پر بڑے زور شور سے "غدار" اور "ملک دشمن" کا الزام لگ چکا تھا۔ لیکن اب وہی "غدار" اور "ملک دشمن" پاکستان کا وزیر داخلہ تھا۔ بدقسمتی سے کبھی کبھی ہماری سرکاری' سیاسی' سماجی اور ذاتی قوت برداشت بڑی ضعیف ثابت ہوتی ہے۔ حکومت وقت کے ساتھ اختلاف غداری بن جاتا ہے اور سیاسی سماجی امور میں رائے کا تصادم وطن دشمنی قرار پا سکتا ہے۔ اس فعل عبث میں حب الوطنی کی ساکھ کے علاوہ اور کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔

اس کابینہ میں ایک نیا چہرہ سید عابد حسین کا تھا۔ وہ ضلع جھنگ میں شاہ جیونہ کے بہت

بڑے زمیندار تھے اور بڑی خوبصورت' خوب سیرت' روشن خیال اور خوش اخلاق شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے کردار میں میانہ روی' حیا داری اور راست بازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور ان کی گفتگو سادہ اور پرکشش ہوتی تھی۔ وہ ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو دولت مند تو تھے' لیکن دولت کی ریل پیل نے ان کے اخلاق میں کوئی کجی پیدا نہ کی تھی۔ جسمانی طور پر وہ صحت مندی کا قابل رشک نمونہ تھے اور ہر طرح کا لباس ان پر خوب پھبتا تھا۔ افسوس کہ انہوں نے زیادہ عمر نہ پائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

چوہدری محمد علی کے وزیراعظم مقرر ہونے کے بعد دو ماہ کے عرصہ میں مغربی پاکستان "ون یونٹ" بنانے کا کام مکمل ہو گیا۔ اس منصوبے کی بنیاد تو اسی وقت پڑ چکی تھی' جب مارچ ۱۹۵۰ء میں مسٹر غلام محمد نے ویسٹ پاکستان (اسٹیبلشمنٹ) آرڈر جاری کر کے نواب مشتاق احمد گورمانی کو مجوزہ صوبے کا گورنر اور ڈاکٹر خان صاحب کو چیف منسٹر نامزد کر دیا تھا لیکن اس قانون کا بل اسمبلی نے ۳۰ ستمبر کو پاس کیا اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو مغربی پاکستان کا صوبہ باضابطہ طور پر معرض وجود میں آ گیا۔

انتظامی لحاظ سے یہ بڑا معقول اور قابل عمل منصوبہ تھا لیکن اسے سیاسی اکھاڑے میں اتارا گیا تو اس کا حلیہ بگڑ کے رہ گیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے زور شور سے اس وقت کام شروع ہوا جب ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کو بری طرح شکست ہو چکی تھی۔ اسی وقت سے کچھ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبے مشرقی پاکستان کی نئی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے مرکزی قیادت پر قبضہ حاصل کر لیں۔ ایسی ذہنیت کے لوگوں کے نزدیک "ون یونٹ" اس قسم کے "خطرات" کو روکنے کا موثر ذریعہ تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ پنجاب کا صوبہ اپنی آبادی' تعلیم اور ترقی کی وجہ سے ہمیشہ دوسرے صوبوں سے آگے رہا ہے۔ اس وجہ سے بین الصوبائی رقابتوں اور تعصبات نے بڑا فروغ

پایا اور پنجاب کے خلاف چھوٹے صوبوں میں کچھ صحیح اور کچھ غلط اور فرضی شکایات اور الزامات کے دفتر کھل گئے۔ "ون یونٹ" کے منصوبے میں بھی چھوٹے صوبوں کو پنجاب کی بالادستی کی سازش نظر آنے لگی اور ان کو شبہ ہو گیا کہ اس سکیم کے ذریعہ پنجاب ان کے نظم و نسق پر بھی براہ راست قبضہ جمانا چاہتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ کچھ سیاست دانوں نے "ون یونٹ" کے خلاف کھلم کھلا محاذ قائم کر کے اس کی مخالفت میں ایک منظم تحریک چلانی شروع کر دی۔ اس میں خان عبدالغفار خان، پیر صاحب مانکی شریف، جی۔ ایم۔ سید، شیخ عبدالمجید اور سردار صمد خاں اچکزائی پیش پیش تھے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کے علاوہ اور کسی سیاسی پارٹی کا رویہ "ون یونٹ" کے حق میں واضح طور پر مثبت نہ تھا بلکہ اس بارے میں کئی چوٹی کے سیاست دانوں کا کردار حیرتناک حد تک متضاد اور متناقض تھا۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ سردار عبدالرشید پہلے "ون یونٹ" کے حق میں تھے، لیکن پھر اچانک اس کے برخلاف ہو گئے۔ اس کی پاداش میں ان کی وزارت برطرف کر دی گئی۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک فیروز خاں نون بھی پہلے ون "یونٹ" کے حمایتی تھے لیکن پھر مخالف ہو گئے۔ نتیجتاً ان کو بھی وزارت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ سندھ کے پیر علی محمد راشدی کا شمار بھی "ون یونٹ" کے حمایتیوں میں ہوتا تھا لیکن وہ بھی پینترا بدل کر اس سکیم کے مخالفین کی صف میں جا کھڑے ہوئے۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی قلابازی مسٹر سہروردی نے کھائی تھی۔ مسٹر غلام محمد کے زمانے میں جب وہ وزیر قانون تھے، تو "ون یونٹ" قائم کرنے کا گورنر جنرلی آرڈر انہی کی نگرانی میں تیار ہو کر جاری ہوا تھا۔ صرف چھ ماہ بعد جب یہی آرڈر بل کی صورت میں اسمبلی کے سامنے آیا تو مسٹر سہروردی نے اس کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اب کابینہ کے رکن نہ رہے تھے؟ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ وزارت عظمیٰ حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ سیاست دانوں کی اس

آنکھ مچولی سے صاف ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی کی نظر "ون یونٹ" کے قومی اور انتظامی فوائد اور خوبیوں کی جانب نہ تھی۔ اس منصوبے کے متعلق اپنی رائے قائم کرنے میں وہ فقط اپنا ذاتی اور وقتی مفاد پیش نظر رکھتے تھے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ "ون یونٹ" بنتے ہی چھوٹے صوبوں کی گورنریاں' وزارتیں اور اسمبلیاں ٹوٹ گئیں اور ان سطحوں کے سارے اختیارات لاہور منتقل ہو گئے۔ نظم و نسق میں Decentralization کا ایسا کوئی طریقہ رائج نہ کیا گیا جس کے ذریعہ مقامی معاملات مقامی طور پر ہی طے پاتے رہیں۔ یوں بھی بیوروکریسی کا روایتی مزاج ایسا ہے کہ جو طاقت ایک بار اس کے ہاتھ میں آ جائے اسے واپس کر کے دوسروں میں تقسیم کرنا اس پر بڑا شاق گزرتا ہے۔ چنانچہ اب صورت حال یہ ہو گئی کہ بلوچستان' سندھ اور سرحد کے لوگوں کو دور دراز کا سفر اختیار کر کے اپنے بعض چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے بھی لاہور آنا پڑتا تھا۔ اس میں بڑی دشواریوں' پریشانیوں اور تکالیف کا سامنا تھا۔ اس نے بھی بہت سے عناصر کے ذہن میں "ون یونٹ" کی افادیت کی مشکوک بنا دیا۔

چھٹی بات یہ ہے کہ صوبائی سطح کے سرکاری ملازمین کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ "ون یونٹ" بننے کے بعد شاید ان کے تبادلے بھی مغربی پاکستان کے دور دراز علاقوں میں ہونا شروع ہو جائیں۔ تبادلوں کا یہ خوف شمشیر برہنہ کی طرح ان کے ذہن پر لٹک گیا اور اس طرح سرکاری ملازمین کی ایک کثیر تعداد کے دل میں "ون یونٹ" کے خلاف بدظنی نے راہ بنائی۔

ساتویں بات یہ ہے کہ ہر صوبے میں ایسے سیاست پسند لوگوں کی خاصی بڑی تعداد ہوتی ہے جو خود تو انتخاب نہیں لڑتے لیکن مقامی سیاست میں کئی طریقوں سے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ جب چھوٹے صوبوں کی اپنی اپنی اسمبلیاں نہ رہیں تو یہ میدان خالی ہو گیا اور عملی طور پر فعال لوگوں کی کثیر تعداد احساس محرومی کا شکار ہو گئی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست دانوں کی محاذ آرائیوں' خود غرضیوں اور قلابازیوں' بیروکریسی کی بے تدبیریوں اور کوتاہ اندیشیوں' بعض سرکاری ملازمین کی بدظنیوں اور عوام کے ایک

بڑے طبقہ کی دشواریوں اور محرومیوں کی وجہ سے "ون یونٹ" کا انتظامی تجربہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔

وزیراعظم کے طور پر چوہدری محمد علی کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۹۵۷ء کے آئین کے نفاذ کا تھا۔ پچھلے نو برس میں خان لیاقت علی خاں سے لے کر اب تک کسی وزیراعظم نے آئین سازی کے کام کو آگے نہ بڑھایا تھا۔ چوہدری محمد علی نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پانچ ماہ کے اندر آئین کا مسودہ شائع کر دیا۔ جب یہ مسودہ آئین ساز اسمبلی میں پیش ہوا تو اس کی ۲۴۵ دفعات کے لیے ۶۷۰ ترامیم پیش ہوئیں۔ خاص طور پر مشرقی پاکستانی میں بڑا طوفان اٹھا۔ وہاں پر "Resistance Day" بھی منایا گیا' جس میں جلسے ہوئے' جلوس نکلے اور ہڑتال ہوئی۔ مولوی اے' کے فضل الحق نے بڑی سخت تقریریں کیں۔ مولانا بھاشانی نے تو مشرقی پاکستان کو الگ کرنے تک کی دھمکی دے دی۔ اسمبلی کے اندر عوامی لیگ کے ایک لیڈر مسٹر ابومنصور نے یہاں تک کہہ دیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کا ایک مذہب ہے اور دونوں نے ایک ہی تحریک کے ذریعے آزادی حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں حصوں میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ دونوں حصے الگ الگ ملک اور الگ الگ قومیں ہیں۔ مسٹر سہروردی نے بھی آئین کی خوب مخالفت کی اور جب رائے شماری کا وقت آیا تو اسبملی سے واک آوٹ کر گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب یہی سہروردی اسی آئین کے تحت وزیراعظم بنے' تو انہوں نے بلا کسی جھجک کے یہ اعلان کر دیا کہ اس آئین میں مشرقی پاکستان کے اٹھانوے فیصد مطالبات پورے ہو گئے ہیں۔

آئین کے خلاف اس تمام محاذ آرائی' مخالفت اور مخاصمت کا سامنا چوہدری محمد علی نے بڑے تحمل' بردباری اور مدبرانہ دانشمندی سے کیا۔ ان کی کوششیں بار آور ہوئیں اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان کا پہلا آئین نافذ ہو کر اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ نئے آئین کے تحت چوہدری محمد علی کے وزیراعظم نے طور پر حلف اٹھایا اور میجر جنرل

اسکندر مرزا ملک کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

۲۳ مارچ ۱۹۵٦ء کو جب ایوان صدر میں نیا آئین نافذ کرنے کی تقریب منعقد ہو رہی تھی' تو اس دوران دو بدشگونیاں ظہور میں آئیں۔ تقریب شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے بڑے زور کی آندھی آئی اور تیز بارش ہوئی جس سے شامیانے کا کچھ حصہ چند مہمانوں کے اوپر گر گیا' جن میں اسمبلی کے سپیکر مولوی عبدالوہاب خاں بھی شامل تھے۔ اس علامت سے شاید فطرت کے عناصر نے یہ پیشگوئی کر دی تھی' کہ اٹھارہ ماہ بعد اس آئین کا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہونے والا ہے۔ دوسری بدشگونی صدر کے طور پر میجر جنرل اسکندر مرزا کا تقرر تھا۔ نیا آئین اسلامی اور جمہوری اقدار کا حامل تھا۔ لیکن ملک کے پہلے صدر کو ان دونوں اقدار سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ نئے آئین کو اسکندر مرزا کی صدارت میں چلانا ویسا ہی تھا جیسے کہ دودھ کو بلی کی رکھوالی میں رکھنا۔

اسکندر مرزا صاحب جوڑ توڑ کے بادشاہ تھے۔ گورنر جنرل یا صدر کے طور پر آئینی بندشوں اور پابندیوں میں مقید ہو کے رہنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ جب ان کے دوست ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ نامزد ہوئے' تو انہیں کسی سیاسی پارٹی کی حمایت حاصل نہ تھی۔ ان کی دستگیری کے لیے اسکندر مرزا صاحب نے ری پبلکن پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ اس پارٹی کی تشکیل گورنمنٹ ہاؤس میں براہ راست ان کی سربراہی میں ہوئی۔ جس وقت یہ پارٹی بن رہی تھی' ان دنوں اسکندر مرزا صاحب اس کام میں اس قدر منہمک تھے کہ انہیں فائلیں دیکھنے کا بھی وقت نہ ملتا تھا۔ دن میں کسی وقت وہ چند لمحوں کے لیے میرے کمرے میں آتے تھے اور کھڑے کھڑے ضروری فائلوں پر دستخط کر کے چلے جاتے تھے۔ کئی بار وہ اتنی عجلت میں ہوتے تھے کہ فائلوں کے فیتے تک نہ کھولتے تھے اور یونہی کاغذوں کو کھینچ کھانچ کر دستخط کر دیتے تھے۔

ری پبلکن پارٹی بنانے کا بھوت ان پر جس شدت سے سوار تھا ویسے ذوق شوق سے میں نے انہیں اور کوئی کام کرتے کبھی نہ دیکھا تھا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ری پبلکن پارٹی بنانے میں مغربی پاکستان کے گورنر نواب مشتاق

احمد گورمانی بھی برابر کے شریک تھے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ پارٹی کا منشور اور آئین بھی انہوں نے ہی مرتب کئے تھے۔ یہ الزم ری پبلکن پارٹی کے ایک سابق جنرل سیکرٹری مسٹر عبدالقیوم نے خاص طور پر لگایا ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر گورمانی کے خلاف جب ایبڈو کے تحت انکوائری ہو رہی تھی' تو مغربی پاکستان کی اسمبلی کے سات ممبروں نے اپنی گواہی میں کہا تھا کہ ری پبلکن پارٹی صدر' وزراء اور گورنر گورمانی کے گٹھ جوڑ سے بنی تھی اور وہ اس میں گورنر کے دباؤ سے مجبور ہو کر شامل ہوئے تھے۔ ان گواہوں کے اسمائے گرامی جمیل حسین رضوی' گل نواز خان' چوہدری محمد احسن' شیخ محمد سعید' رائے نوشیر خاں' حکیم خورشید احمد اور قاضی اور مرید احمد تھے۔

ایک روز اسکندر مرزا نے مجھے قرآن مجید کا ایک نسخہ دیا کہ میں اسے احتیاط سے اپنی خفیہ کاغذات رکھنے والی الماری مقفل کر کے رکھوں اور ان کے سوا اور کسی کو نہ دکھاؤں۔ اس نسخہ میں خاص بات یہ تھی کہ سرورق کی پشت پر جو خالی صفحہ ہوتا ہے اس پر درجن بھر سیاستدانوں نے اللہ تعالٰی کو حاضر و ناظر جان کر اور اس مقدس کتاب الٰہی کو گواہ بنا کر آپس میں تعاون کرنے کا عہد نامہ تیار کیا ہوا تھا۔ اس تحریر کے نیچے پاکستان کے بہت سے چوٹی کے لیڈروں کے دستخط تھے۔ چند ماہ کے اندر اندر یہ مقدس عہد نامہ بھی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ افسوس کہ قرآن شریف کا وہ نادر نسخہ صدر مرزا نے مجھ سے واپس لے لیا۔ ورنہ وہ اس قابل تھا کہ عبرت حاصل کرنے کے لیے اسے ہمارے قومی عجائب گھر میں رکھا جاتا۔

ری پبلکن پارٹی کے بنتے ہی صدر اسکندر مرزا کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی آ گئی' جسے گھما کر وہ سیاست میں جب چاہتے اپنی پسند کی تبدیلی لا سکتے تھے۔ آئین نافذ ہونے کے ۱۳ ماہ بعد چوہدری محمد علی وزیراعظم کے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ ہماری تاریخ میں یہ واحد مثال ہے جس میں کسی وزیراعظم نے اپنے آپ کسی دباؤ کے بغیر اپنے عہدہ سے استعفٰی دیا ہے۔ چوہدری محمد علی انتھک کام کرنے کے عادی تھے۔ ان کی دیانت' امانت

اور منصف مزاجی کا درجہ بھی اعلیٰ تھا۔
وزارت عظمیٰ سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے نہایت صبر اور خاموشی سے زندگی گزاری۔
ایک بار انہیں علاج کے لیے بیرون ملک جانا ضروری ہو گیا۔ لیکن وسائل کی کمی ان کے راستے میں حائل تھی۔ جب صدر اسکندر مرزا کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے خود ان کے ہاں جا کر کوشش کی کہ ان کے اخراجات کے لیے وہ حکومت کی مالی امداد قبول کر لیں۔ لیکن چوہدری صاحب نہ مانے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ انہوں نے حکومت کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں' ان کا انہیں پورا معاوضہ ملتا رہا ہے۔ اب وہ خواہ مخواہ پاکستان کے خزانے پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتے' لیکن صدر مرزا کے مسلسل اصرار پر انہوں نے بیس ہزار روپیہ قرض حسنہ کے طور پر قبول کر لیا۔ بعدازاں یہ رقم انہوں نے چند قسطوں میں واپس ادا بھی کر دی۔
اسی زمانے میں چوہدری محمد علی نے صدر مرزا کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک وائس پریذیڈنٹ بھی رکھ لیں۔ لیکن یہ مشورہ قبول نہ کیا گیا۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر چوہدری صاحب جیسا فہیم شخص ایوان صدر میں ڈپٹی پریذیڈنٹ کے طور پر موجود ہوتا' تو شاید ہماری تاریخ کا دھارا کوئی اور رخ اختیار کر لیتا۔ واللہ اعلم۔
چوہدری صاحب کے بعد مسٹر سہروردی کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور وہ وزیراعظم بنے۔
ان کی حکومت ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ کے اشتراک سے بنی تھی۔ تیرہ ماہ بعد ری پبلکن پارٹی نے ان کا ساتھ بھی چھوڑ دیا اور صدر مرزا نے ان کا استعفیٰ طلب کر لیا۔
آخر میں چھ سیاسی پارٹیوں کی کولیشن سے ملک فیروز خاں نون نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا اور نو ماہ کے قریب حکومت کی۔ ان کے زمانے میں کبھی کبھی ایسی نوبت بھی آ جاتی تھی کہ وزیروں کی فوج ظفر موج وزارتوں کی تعداد سے کہیں آگے نکل جاتی تھی۔
حلف لینے والے وزیروں کو معلوم ہوتا تھا کہ ان کی وزارت کی چاندنی چند ماہ سے زیادہ

نہ چمکے گی۔ اس لیے محکموں کی تقسیم پر بڑا فساد ہوتا تھا۔ اس زمانے میں "خشک" اور "تر" وزارتوں کی اصطلاح بڑی فراوانی سے استعمال ہوا کرتی تھی۔ وزارت خزانہ' تجارت' صنعت' ورکس' خوراک وغیرہ کا شمار "تر" وزارتوں میں ہوتا تھا۔ ایک بار ایک کابینہ نامزد تو ہو گئی لیکن کئی روز تک حلف نہ اٹھا سکی کیونکہ محکموں کی بندر بانٹ کا قضیہ کسی طور طے نہ پاتا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ مسئلہ بھی طے ہوا' اور جب سب لوگ حلف اٹھانے کے لیے ایوان صدر میں جمع ہوئے تو اچانک یہ معلوم ہوا کہ رپورٹ فولیوز کی تقسیم کے دوران وزارت تعلیم پر کسی کی نظر انتخاب نہ پڑی تھی:

آئین نافذ ہونے کے بعد تین سال کے عرصہ میں چار مرکزی حکومتیں اقتدار میں آئیں جن میں گیارہ سیاسی پارٹیوں نے حصہ لیا۔ ری پبلکن پارٹی ان سب میں شامل تھی۔ اس صورت حال کے رونما ہونے پر صدر اسکندر مرزا کے جوڑ توڑ کا بڑا عمل دخل تھا۔ وہ تین باتیں ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اول یہ' کہ نیا آئین قابل عمل نہیں۔ دوئم یہ' کہ ملک بھر میں ایک بھی ایسی سیاسی شخصیت موجود نہیں جو مستحکم حکومت بنا کر اسے خوش اسلوبی سے چلا سکے' اور سوئم یہ کہ عملی سیاست میں کوئی ایسی جماعت نہیں جو ملک کے دونوں حصوں کا اعتماد حاصل کر کے حکومت کا کاروبار سنبھال سکے۔ تین سال کے عرصہ میں انہوں نے اپنا یہ مقصد بڑی حد تک حاصل کر لیا کیونکہ اس عرصہ میں ملک کی تقریباً سب بڑی بڑی سیاسی پارٹیاں اور اہم لیڈر یکے بعد دیگرے حکومت میں شامل ہو کر یا ناکام ہو چکے تھے یا ناکام کر دیئے گئے تھے۔

اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ صدر اسکندر مرزا جمہوریت سے خوفزدہ تھے اور اسے ناکام ثابت کر کے اپنی شخصی آمریت کا تسلط جمانا چاہتے تھے۔ وہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے رسیا تھے اور بادشاہوں کے طور طریقوں کو دیکھ کر بے حد مرعوب ہو جاتے تھے۔ ایک بار وہ افغانستان کے سرکاری دورے پر گئے۔ ظاہر شاہ محض نام کا بادشاہ تھا۔ وہاں پر اصلی حکومت اس کے چچاؤں کی تھی۔ سردار داؤد وزیراعظم تھے اور اسی وقت

سے درپردہ روس کے ساتھ پینگیں بڑھانے میں لگے ہوئے تھے۔ ملک میں غربت' افلاس اور پسماندگی کا دور دورہ تھا۔ لیکن شاہی محلات میں طاؤس و رباب اور کباب و شباب کا زور تھا۔ بادشاہ کی سرکاری دعوت میں جو مینو کارڈز میز پر سجائے ہوئے تھے' ان کے ایک طرف انگریزی طرز کے کھانوں کے نام تھے اور دوسری طرف افغانی کھانوں کی فہرست تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہر مہمان کی پسند کے مطابق اسے انگریزی یا افغانی کھانے کھلائے جائیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ پہلے سب کے لیے چھ کورس کے انگریزی کھانوں کا دور چلا۔ اس کے بعد آٹھ دس قسم کے مرغن افغانی کھانے میز پر آئے۔ کچھ لوگوں نے دونوں قسم کے کھانوں کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے پورا پورا انصاف کیا۔ کھانے کے بعد بادشاہ سلامت سب مہمانوں کو ساتھ لے کر باہر باغ میں آئے' جہاں پانچ چھ سو معززین رات کے استقبالیہ میں شامل ہونے کے لیے کافی دیر سے جمع ہو رہے تھے یہ حضرات گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سے بھوکے پیاسے ان میزوں کے گردمنڈلا رہے تھے جو انواع و اقسام کے سامان خورد و نوش سے لدی ہوئی تھیں۔ دونوں ملکوں کے قومی ترانے بجتے ہی سارا مجمع کھانے کی میزوں پر ٹڈی دل کی طرح چھا گیا۔ ہمارے اندر والے مہمان بھی اس میں بڑے شوق سے شامل ہوئے۔ بادشاہی دعوت کا یہ طریقہ صدر اسکندر مرزا کو بڑا پسند آیا' واپس آ کر بہت عرصہ تک اس کی یاد ان کے دل میں چٹکیاں لیتی رہی۔

بغداد پکیٹ کی کانفرنسوں کے سلسلے میں صدر مرزا نے ایران' عراق اور ترکی کے بھی کئی دورے کئے۔ شاہ ایران سے ان کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ ان دوروں میں بیگم ناہید مرزا ملکہ ثریا کے ساتھ بزعم خود اپنی خوش لباسی اور حسن و جمال کا مقابلہ کرتی رہتی تھیں۔ وہ ہر روز طرح طرح کے رنگوں کی نہایت بھڑکیلی اور مرصع ساڑھیاں زیب تن کرتی تھیں اور ہر تصویر میں بڑے اہتمام سے مسکراتی ہوئی نظر آنے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں۔ ایک روز انہوں نے شکایتاً کہا۔ "ملکہ ثریا کسی تقریب اور تصویر میں مسکراتی نظر نہیں آتی۔ میرا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ لیکن یہ اخبار والے سب

اندھے ہیں۔ ہمارے درمیان اس فرق پر کوئی کچھ نہیں لکھتا۔"

شاہ ایران کی ہر تقریب میں دو تین شوخ وشنگ لڑکیاں ہمہ وقت ان کے گرد منڈلایا کرتی تھیں۔ بسا اوقات یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ملکہ ثریا کو برسر عام نظر انداز کر کے شاہ کی توجہ کا مرکز بننے کی کوشش کر رہی ہیں۔ رضا شاہ پہلوی کے اس وقت تک کوئی اولاد نہ تھی' اور نجی محفلوں میں بعض اوقات وہ شاہی وقار کا رنگ و روغن اتار کر بڑی بے حجابی سے ایک گھٹیا سے "پلے بوائے" کا اوباشانہ روپ اختیار کر لیتے تھے۔ وہ "بلیو" فلموں کے دلدادہ تھے اور یورپ اور امریکہ کے قحبہ خانوں' بیسواؤں اور فحش نگاروں کے متعلق انہیں بڑی وسیع معلومات حاصل تھیں۔ ایک روز شام کی چائے پر انہوں نے صدر اسکندر مرزا کو ڈیڑھ گھنٹہ تک جنسی علوم و فنون کے مختلف گوشوں سے آگاہ کیا اور آخر میں یہ فتویٰ صادر کیا۔ "معاشرے کی توانائی اور ترقی ناپنے کا صحیح پیمانہ یہ ہے کہ اس میں جنسی آزادی کو کتنا فروغ حاصل ہے۔"

ایک بار شاہ ایران صدر مرزا اور بیگم ناہید مرزا کو ہمراہ لے کر اصفہان' شیراز اور شہد کی سیاحت پر گئے۔ طویل فاصلے تو ہوئی جہاز سے طے کئے گئے' لیکن مقامی سیر و سیاحت کے لیے شاہ کے جلو میں موٹروں کا بڑا شاندار قافلہ چلتا تھا۔ موٹروں کا یہ شاہی جلوس جب کسی گاؤں یا قصبے سے گزرتا تھا' تو کئی جگہ سڑک پر دور دور تک قالین ہی قالین بچھے ہوئے نظر آتے تھے۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ قالین میں اگر بہت زیادہ گرد جم کر بیٹھ جائے تو اسے صاف کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اسے چلتی ہوئی موٹر کار کے پہیوں کے نیچے روندا جائے۔ اس طرح گرد کی جمی ہوئی تہیں ٹوٹ جاتی ہیں اور تھوڑا سا جھاڑنے سے بھی قالین صاف ہو جاتا ہے۔ اس ترکیب سے شاہ کی گزر گاہ میں اپنا قالین بچھا کر اس کی وفادار رعایا ایک ہاتھ سے پہلوی خاندان کی ہردلعزیزی پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دیتی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے پرانے قالینوں کی گرد جھاڑ لیتی تھی۔

شیراز میں ہم ایک رات ٹھہرے۔ وہاں پر جو کار مجھے ملی' اسے ایک نوجوان چلا رہا تھا جو یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ یہ کار بھی اس کی اپنی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب کبھی شاہ کے مہمان یہاں نازل ہوتے ہیں' ان کے استعمال کے لیے کاریں اہالیان شہر سے جبراً ضبط کر لی جاتی ہیں۔ ڈرائیور بھی کار کے مالک ہی فراہم کرتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس ڈرائیور نہ ہو تو کار کے مال کو بیگار کے طور پر خود ہی یہ فرض انجام دینا پڑتا ہے۔ یہ نوجوان بڑے امیر اور معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اس وقت اسے سرکاری ڈرائیور کی وردی پہنا کر ہماری خدمت کے لیے مفت کی بیگار میں پکڑا ہوا تھا۔ وہ صبح سات بجے ڈیوٹی پر حاضر ہوتا تھا اور رات کے گیارہ بجے اپنی کار کو سرکاری مہمان خانے میں چھوڑ کر گھر واپس لوٹتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شیراز میں تقریباً سارا سال رات کو کرفیو نافذ رہتا ہے اور رات کو دس بجے کے بعد لوگ اپنے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ہر شہر اور علاقے پر مقامی فوجی گریژن کا تسلط ہے اور خود گیریژن پر سیکرٹ سروس والوں کا کنٹرول ہوتا ہے۔ سیکرٹ سروس کے شعبے میں براہ راست شاہ کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں۔ یہ نوجوان بڑی شدت سے شاہ ایران کا مخالف تھا اور شاہ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔

شاہ ایران کی سرکاری دعوتیں بڑی شاندار ہوتی تھیں۔ ڈنر کے دوران نصف درجن اعلیٰ فوجی افسر تمغوں سے جگمگاتی ہوئی وردیاں پہنے شاہ کی کرسی کے پیچھے بستہ اٹنشن کھڑے رہتے تھے۔ ایک ڈنر کے بعد بیگم ناہید مرزا نے مجھے کہا۔ "شاہ کی نشست کے پیچھے جو افسر کھڑے تھے' ان میں سے دو کا رینک جرنیل کے برابر تھا اور ادھر کراچی میں کپتان اور میجر کے رینک کے اے۔ ڈی۔ سی ہمارے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے متعلق تم لوگوں کو کچھ سوچنا چاہیے۔"

ایک بار صدر اسکندر مرزا ایران' عراق اور سعودی عرب کے دورے پر ایسے وقت نکلے جبکہ نہر سویز کے قضیہ پر مصر پر برطانیہ اور فرانس کا حملہ ہو چکا تھا۔ وزیراعظم سہروردی

اور کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان بھی ان کے ساتھ تھے۔ جمال عبدالناصر کی غیر معتدل پالیسیوں کی وجہ سے مشرق وسطیٰ کی بادشاہتیں ان سے بہت خوفزدہ اور ناراض تھیں اور اب سامراجی طاقتوں کے حملے سے ناصر کی شکست اور تباہی کی امید باندھ کر بہت سے شایان ذی شان خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے۔ خصوصاً بغداد کا سماں بڑا عبرتناک تھا۔ گلیوں اور سڑکوں پر جو عوام تھے' ان کا دل مصر کے ساتھ تھا لیکن سرکاری سطح پر خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ عراق کے وزیراعظم نوری السعید پاشا ہمارے گیسٹ ہاؤس میں آئے اور صدر اسکندر مرزا اور مسٹر سہروردی کے پاس بیٹھ کر انہوں نے صدر ناصر کے خلاف دیر تک زہر اگلا۔ ناصر کا ہوا ان کی رگ و پے میں اس قدر شدت سے چھایا ہوا تھا کہ' یا تو وہ اسے برملا گالی دے کر یاد کرتے تھے یا طنزیہ طور پر "جمال عبدالناصر علیہ السلام" کے نام سے پکارتے تھے۔ اسی نشست میں انہوں نے بڑے وثوق سے پیشگوئی کی کہ نہر سویز میں جمال عبدالناصر کی قبر مقدر ہو چکی ہے اور بہت جلد فرعون کی طرح اس کی لاش بھی پانی سے نکال کر عجائب گھر میں رکھ دی جائے گی۔

نہر سویز کے سلسلے میں ہمارے عوام کا رد عمل بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح مصر کے حق میں تھا لیکن حکومت کا رویہ تذبذب' تامل' شش و پنج' پس و پیش اور حیص بیص کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ صدر اسکندر مرزا اور وزیراعظم سہروردی اپنے عوام کے خوف سے برطانیہ اور فرانس کے حملے کی تائید تو نہ کر سکتے تھے لیکن وہ کھلے دل سے مصر کے حق میں کوئی قدم اٹھانے سے بھی قاصر تھے۔ جب ہم بغداد میں تھے تو وزیراعظم سہروردی نے اچانک مصر کا دورہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ مصر کی حکومت فرانس اور برطانیہ کے حملے کی تباہ کاریوں کے مسائل میں الجھی ہوئی تھی۔ یوں بھی اس خاص موقع پر سہروردی صاحب کے مصر جانے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر مصر کی حکومت نے مسٹر سہروردی کے پروگرام کے متعلق سرد مہری سے کام لیا اور ان کے دورہ مصر کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ تاہم ہمارے وزیراعظم چند افسروں کو ساتھ لے کر بیروت تک

ضرور گئے اور وہاں کچھ سیر و تفریح اور شاپنگ کر کے واپس آ گئے۔ شاپنگ کا جنون ہم لوگوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔

لبنان کے ہمسائے میں مصری قوم تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی۔ ہمارا سرکاری وفد ان کی ہمت بڑھانے قاہرہ تو نہ پہنچ سکا' لیکن بیروت کے بارونق بازاروں میں بڑے انہماک سے خرید و فروخت کے مشغلے میں مصروف ہو گیا۔ اگلے روز جب ہم بغداد سے پاکستان روانہ ہوئے تو کچھ حضرات اپنی بھاری بھر کم شاپنگ سینے سے لگائے جہاز کے اندر ہی لے آئے۔ ہوائی جہاز کے کپتان نے احتجاج کیا کہ اتنا زیادہ سامان کیبن میں رکھنا حفاظتی اصولوں کے خلاف ہے اور جب تک فالتو سامان کو ہولڈ میں منتقل نہیں کیا جاتا' وہ ہوائی جہاز اڑانے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ باہر عراق کے شاہ فیصل' پرنس عبدل الہ' وزیراعظم نوری السعید اور دیگر اکابرین ہماری روانگی کے منتظر کھڑے تھے۔ اندر سامان پر جھگڑا سر اٹھائے کھڑا تھا۔ صدر اسکندر مرزا اس قسم کے تنازعوں میں دخل دینے سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ وہ تو ایک اخبار اٹھا کر اسے پڑھنے میں مصروف ہو گئے اور وزیراعظم سہروردی نے بیچ بچاؤ کر کے کسی طرح یہ معاملہ سلجھایا۔ خدا خدا کر کے ہمارا جہاز کافی تاخیر کے بعد بغداد ایئرپورٹ سے روانہ ہوا اور باہر کھڑی ہوئی الوداعی پارٹی کی بھی گلو خلاصی ہوئی' جسے غالباً یہ گمان تھا کہ شاید جہاز میں کوئی فنی خرابی واقع ہو گئی ہے۔

ایران' عراق اور سعودی عرب کے اس دورے میں یہ دلخراش حقیقت سامنے آئی کہ جمال عبدالناصر کے خلاف نفرت کی وجہ سے مصر کے غریب عوام بھی ان تینوں ملکوں کی حکومتوں کی ہمدردیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ ایک اسلامی ملک پر مغرب کی دو بڑی طاقتیں متحد ہو کر حملہ آور ہوئی تھیں لیکن اس کی مدد کے لیے دوسری اسلامی حکومتوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی تھی۔ عالم اسلام میں نزع و نفاق اور انتشار کی یہ کیفیت بے حد شرمناک' عبرتناک اور المناک تھی۔ اس ڈرامہ میں ہمارا کردار بھی کچھ ایسا نہ تھا'

جسے یاد کر کے ہم اپنا سر فخر سے اونچا کر سکیں۔

۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کو ایک بار پھر اسکندر مرزا کمانڈر انچیف جنرل ایوب خاں کو ہمراہ لے کر تہران کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمارا جہاز علی الصبح چار بجے کے قریب کراچی سے روانہ ہوا۔ پروگرام یہ تھا کہ تہران میں چند گھنٹے شاہ ایران کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد ہم لوگ اسی شام اسنبول روانہ ہو جائیں گے' جہاں بغداد پیکیٹ کے سلسلے میں پاکستان' ایران' عراق اور ترکی کے سربراہان مملکت کی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ تہران پہنچ کر شہنشاہ کے ساتھ ملاقات شروع ہوئی ہی تھی کہ اچانک خبر ملی کہ بغداد میں ایک خون آشام فوجی انقلاب نے بادشاہت کا تختہ الٹ دیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی شاہ ایران سناٹے میں آ گئے اور کچھ دیر تک ان پر سکتہ سا طاری رہا۔ انہوں نے فارسی اور فرانسیسی زبان میں جمال عبدالناصر کو چند گالیاں دیں اور پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کمرے میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر کا چکر کاٹنے لگے۔ ان کا ذہنی اضطراب اور کرب پسینے کے قطروں کی طرح ان کے چہرے سے ٹپک رہا تھا اور وہ بار بار اپنے عملے سے پوچھتے تھے کہ ٹیلی پرنٹر پر بغداد کے متعلق تازہ ترین کیا اطلاع آ رہی ہے۔ ایک بادشاہ کا تختہ الٹنے پر دوسرے بادشاہ کا رنج و الم کسی جذبہ ہمدردی اور غمگساری کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ اس کے اپنے تاج و تخت کی خود حفاظتی اور فکر مندی کا عکس تھا۔ ہمدردی اور ایثار غریبوں کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ بادشاہوں کے خزانے میں اس جنس نایاب سے خالی ہوتے ہیں۔

اسی روز ہم استنبول کے لیے روانہ ہوئے تو راستہ میں ترکی کی حکومت کا پیغام ملا کہ کانفرنس استنبول کی بجائے انقرہ میں منعقد ہو گی۔ شہنشاہ ایران بھی شام تک انقرہ پہنچ گئے اور اس طرح بغداد پیکیٹ کی وہ تاریخی کانفرنس شروع ہوئی' جس میں بغداد تو پیکیٹ سے نکل گیا اور صرف پیکیٹ ہی پیکیٹ باقی رہ گیا' جسے بعدازاں سینٹو (Cento) کا نام دے دیا گیا۔

انقرہ پہنچ کر عراقی انقلاب کی مزید تفصیلات معلوم ہوئیں۔ شاہ فیصل' پرنس عبداللہ اور

وزیراعظم نوری السعیدی بڑی بے رحمی سے قتل کر دیئے گئے تھے۔ پرنس عبدل الہ اور نوری السعیدی کی لاشوں کو عوام نے دیر تک بغداد کی سڑکوں پر بھی گھسیٹا۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ جب پرنس عبدل الہ کے محل پر حملہ ہوا تو اس میں سے کئی نیم برہنہ یورپین لڑکیاں بھی چیختی چلاتی ہوئی برآمد ہوئیں۔ پرنس عیاش طبع آدمی تھے اور ان کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے پاس مشرق وسطیٰ کا بہترین سردابہ شراب تھا اور وہ وقتاً فوقتاً یورپ کے نائٹ کلبوں سے نت نئی حسیناؤں کا انتخاب کر کے اپنے محلسرا کی زینت بناتے رہے تھے۔ پرنس عبداللہ شاہ فیصل کے ماموں یا چچا تھے اور درحقیقت وہی عراق کے اصلی حکمران بھی تھے۔ جواں سال بادشاہ کو انہوں نے اپنے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رکھا تھا اور رفتہ رفتہ اسے بھی اپنی طرز زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ترکی کے متعدد دوروں میں ایک بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ وہ یہ کہ اگر ایک بار کسی قوم کے دل میں اسلام کی روح پوری طرح سما جائے تو پھر اسے اس راہ سے منحرف کرنا قطعی ناممکن ہے۔ پچھلے پچاس برس کے دوران ماڈرن ازم اور سیکولرازم کے نام پر ترکی میں بہت بڑے بڑے طوفان آئے لیکن ترک قوم کے سواد اعظم پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ صرف ملازمت پیشہ لوگ' شہری آبادیوں کا کچھ حصہ' ڈھل مل یقین رکھنے والے نئی روشنی کے دلدادہ' تن آسان مرد' فیشن پرست عورتیں اور بیرونی افکار پر پھلنے پھولنے والے دانشور ہی زیادہ تر اس طوفان کی زد میں آئے۔ اس کے باوجود ترکی میں مسجد میں جا کر نماز پڑھنے والے مرد اور عورتوں کی تعداد بہت سے دوسرے اسلامی مالک سے کہیں زیادہ ہے۔ کئی مسجدوں میں تو صفوں کے سامنے لکڑی کی کسی قدر اونچی تختیاں بھی بچھائی ہوتی ہیں تاکہ انگریزی طرز کی ٹوپیاں اوڑھ کر نماز پڑھنے والوں کو سجدہ کرنے میں دقت پیش نہ آئے۔ ترک عوام بڑے پکے اور سچے مسلمان ہیں اور پاکستان کے لیے ان کے دل میں خاص احترام کا جذبہ ہے۔ ترک قافلے جو حج

پر جاتے ہیں' وہ بھی انتظامی بندوبست' خوش تدبیری' نظم و ضبط اور ایمان و ایقان میں اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔

جدید ترکی میں بہت سی اسلامی روایات اور اقدار کو ازسر نو زندہ کرنے کا سہرا جلال بیار اور وزیراعظم مینڈریس کے سر ہے۔ غالباً اسی "جرم" کی پاداش میں صدر معزول اور مقید ہوئے اور وزیراعظم تختہ دار پر لٹکائے گئے لیکن عوام کے دلوں پر ان کی حکمرانی آج بھی قائم ہے۔ لوگ مسٹر مینڈریس کو شہادت کا درجہ دیتے ہیں اور دیہات میں ان کے متعلق عجیب و غریب مافوق الفطرت کہانیاں جنم لیتی رہتی ہیں۔ ایک روایت جو طرح طرح کے رنگ لے کر متواتر گردش کرتی رہتی ہے' یہ ہے کہ کئی لوگوں نے کئی بار دیکھا ہے کہ مسٹر مینڈرس سفید گھوڑے پر سوار ترکی کے بعض علاقوں میں گھوم رہے ہیں۔

وزیراعظم مینڈریس بڑے ہنس مکھ' خوش مزاج اور خوش اخلاق انسان تھے۔ ان کی پرکشش شخصیت میں اعتدال' اعتماد و عجز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ بڑے دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ گفتگو کے دوران بھی ان کی گردن میں تواضع کا ہلکا سا خم آ جاتا تھا۔ ایک بارہ انفرادہ میں مسٹر مینڈریس نے مجھ سے دریافت کیا۔ "کیا تم ترکی کی سیر سے مطمئن ہو؟"

میں نے جواب دیا کہ میں مطمئن تو بہت ہوں لیکن ایک حسرت ضرور باقی ہے۔

"وہ کیا؟" انہوں نے پوچھا

"ابھی تک مولانا روم کے مزار کی زیارت نصیب نہیں ہو سکی۔" میں نے کہا۔

"بے شک قونیہ یہاں سے کافی دور ہے لیکن اگر شوق تیز ہو تو لمبے سے لمبا فاصلہ آن کی آن میں طے ہو جاتا ہے۔" انہوں نے کسی قدر فلسفیانہ انداز سے کہا۔ اس وقت تو ان کی بات میری سمجھ میں نہ آئی' لیکن کچھ دیر بعد اطلاع ملی کہ ٹرکش ایئرفورس کا ایک جہاز ہمیں قونیہ لے جانے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ پاکستان کی وزارت خارجہ کے سیکرٹری مسٹر اکرم اللہ اور میں چند دوسرے شائقین کے ساتھ اس جہاز میں سوار ہو

کر قونیہ پہنچے۔ اکرام اللہ بڑا اعلیٰ اور لطیف ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ہوائی جہاز کی پرواز کے دوران انہوں نے ہمیں مثنوی مولانا روم کے بہت سے اشعار سنائے اور ان کے معانی پر روشنی ڈالی۔ انہیں اردو اور فارسی اساتذہ کے سینکڑوں اشعار یاد تھے اور موقع و محل کے لحاظ سے عین برجستہ شعر پڑھنے میں انہیں بڑا کمال حاصل تھا۔

قونیہ میں ٹرکش ایئرفورس کا مقامی کمانڈر ہمیں اپنی گاڑی میں مولانا روم کے مزار پر لے گیا۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم نے کچھ دیر وہاں قرآن شریف کی تلاوت کی۔ اس دوران ہم نے دیکھا کہ وردی پوش کمانڈر بھی مزار کے پاس مودب کھڑا ہے اور آنکھیں نیچی کئے زیر لب کچھ آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہے۔ واپسی پر اکرام اللہ' صاحب نے اس سے پوچھا کہ وہ چپکے چپکے کیا پڑھ رہا تھا۔ اس سوال پر جواں سال کمانڈر کچھ جھینپ سا گیا' جیسے اسکی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ پھر کسی قدر معذرت خواہانہ انداز میں اس نے بتایا کہ وہ بھی فاتحہ ہی پڑھ رہا تھا۔ ایئرفورس کے اس افسر کی طرح ترکی میں ایک خاصا وسیع طبقہ ایسا بھی ہے جو باطن میں تو اسلامی اعمال اور اقدار پر پورا پورا یقین رکھتا ہے لیکن اسے برملا ظاہر کرنے سے یا تو ازخود ہچکچاتا ہے یا کسی دباؤ کی وجہ سے مجبور ہے۔

ایک بار صدر اسکندر مرزا ترکی کے دورے پر تھے تو عیدالاضحیٰ کا دن انقرہ میں آ گیا۔ اب ترکی حکومت کے رہنماؤں کو یہ تشویش لاحق ہو گئی کہ اگر پاکستانی وفد نے عید کی نماز پڑھنے پر اصرار کیا تو پروٹوکول کے مطابق ان کو بھی مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑے گا۔ اگرچہ صدر جلال بیار اور وزیراعظم عدنان مینڈریس نے ترکی میں اسلامی اقدار کی از سر نو ترویج میں کافی پیش رفت کی تھی لیکن غالباً ابھی ان میں اتنی ہمت یا حمیت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ کھلے بندوں عید کی نماز میں شامل ہوں۔ چنانچہ اس گتھی کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ عید کے روز منہ اندھیرے ہمیں ایک سپیشل ٹرین میں سوار کر کے استنبول روانہ کر دیا۔ سارا دن ہماری ٹرین ترکی کے بے شمار شہروں' قصبوں اور دیہاتوں سے گزری' اور ہم نے ترک قوم کو بالکل اسی جوش و خروش سے عید مناتے ہوئے

دیکھا جیسے کہ پاکستانی عوام مناتے ہیں۔ کوئی گاؤں ایسا نظر نہ آتا تھا جس میں بلند مینار والی کم از کم ایک مسجد موجود نہ ہو۔ نئے نئے کپڑوں میں ملبوس مرد' عورتیں اور بچے جوق در جوق عید گاہوں میں جمع ہو رہے تھے اور جگہ جگہ سجے سجائے قربانی کے جانوروں کے گرد لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ جب شام ہوئی تو کئی قصبوں اور آبادیوں میں عید کی خوشی میں چراغاں بھی نظر آیا۔ اگرچہ اس روز ہمیں خود عید کی نماز نہ مل سکی لیکن ترک قوم کو عید مناتے ہوئے دیکھ کر بڑا روح پرور نظارہ نصیب ہوا۔

استنبول میں جلیل القدر صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار پر بھی حاضری نصیب ہوئی۔ یہاں پر ہر وقت زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ بچے مزار پر اپنی عقیدت مندی کا اظہار جس سنجیدگی' رکھ رکھاؤ اور نظم و ضبط کے ساتھ کرتے ہیں اسے دیکھ کر بڑا رشک آتا ہے۔

استنبول میں ایک صاحب مجھے محمد امام مرحوم کی قبر پر بھی لے گئے۔ مرحوم محمد امام اس وفد کے ساتھ استنبول آئے تھے جو سلطان ٹیپو نے ۱۷۸۷ء میں ترکی کے سلطان عبدالحمید خاں اول کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اس وفد کے سربراہ سید غلام علی تھے جو سلطان ٹیپو کی جانب سے کچھ خطوط اور تحائف بھی لایا تھا۔ وفد کا مقصد سلطنت عثمانیہ کے ساتھ انگریزوں کے خلاف اتحاد کرنا تھا' جو بوجوہ پورا نہ ہو سکا۔ یہ خطوط آج تک استنبول میں صدارت عظمیٰ کی Archives میں محفوظ ہیں۔

اس وفد میں سیاسی نمائندوں کے علاوہ بہت سے سوار' سپاہی اور خدمت گار تھے جن کی تعداد ۵۰ بتائی جاتی ہے۔ سردار محمد امام کے زیر کمان ۱۰۰ پیادہ سپاہی تھے۔

استنبول میں قیام کے دوران وفد میں طاعون کی وبا پھوٹی۔ غالباً سردار محمد امام اسی مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے۔ قبر پر سر کی جانب ایک پتھر کی سل پر یہ کتبہ درج ہے:

ہوالخلاق الباقی

مرحوم و مغفور

محمد امام سردار

عسکر ایلچی ٹیپو سلطان

ہند روحنہ فاتحہ

۱۲۰۲ ہجری

صدر مرزا نے بیگم مرزا کے ساتھ سپین کا بھی طویل دورہ کیا تھا۔ سپین میں جس چیز نے ان دونوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا' وہ مسجد قرطبہ نہ تھی بلکہ جنرل فرانکو کی اپنے ملک پر آہنی گرفت تھی۔ اس دورے کے بعد بہت عرصہ تک صدر اسکندر مرزا اور ان کی بیگم سپین کے نظام حکومت کے متعلق رطب اللسان رہے۔ انہوں نے وزیراعظم کو ایک تجویز بھی ارسال کی تھی کہ سی۔ ایس۔ پی کے افسروں کو نظم و نسق کی ٹریننگ کے لیے جن ملکوں میں بھیجا جاتا ہے' ان میں سپین بھی شامل کیا جائے۔

ایک روز اچانک میرے کمرے میں آئے' اور بولے' "تم زلفی کو جانتے ہو؟" یہ نام میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا' تو وہ بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے' "تعجب ہے تم زلفی کو نہیں جانتے۔ بڑا سمارٹ لڑکا ہے۔ آجکل کراچی کے نائٹ لائف اسی کی وجہ سے چمکی ہوئی ہے۔"

میں نے کراچی کی نائٹ لائف کی رونق سے بھی اپنی محرومی کا اقبال کیا' تو صدر اسکندر مرزا نے مجھے بتایا ذوالفقار علی بھٹو ایک نوجوان بیرسٹر ہے۔ بڑا پڑھا لکھا' آدمی ہے۔ سندھ کے امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ کتابیں جمع کرنے کا شوقین ہے۔ وہ ایوان صدر کی لائبریری میں سندھ کے متعلق جو بہت سے کتابیں ہیں انہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ صدر مرزا نے مجھے ہدایت کی کہ میں ٹیلیفون کر کے اس نوجوان کو اپنے پاس بلاؤں' اور پریذیڈنٹ ہاؤس کی لائبریری استعمال کرنے میں اس کی مدد کروں۔

میرے بلاوے پر ایک چھریرے بدن کا ایک نہایت خوش لباس' خوبصورت' تیزطرار' شوخ اور سیماب صفت نوجوان میرے کمرے میں وارد ہوا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو میں بلا کی ذہانت اور فطانت تھی اور انہیں بہت سے جدید علوم اور ان کے اظہار پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔ چند ہی روز میں انہوں نے پریذیڈنٹ ہاؤس کی چھوٹی سی لائبریری کو کھنگال

کے رکھ دیا۔ ایک روز وہ میرے کمرے میں بیٹھے کسی کتاب سے کچھ اقتباسات ٹائپ کروا رہے تھے کہ صدر اسکندر مرزا دن کے ایک بجے میری کھڑکی کے پاس آ کر رکے۔ بھٹو صاحب کو دیکھ کر انہوں نے بلند آواز سے کہا۔ ''زلفی' گڈنیوز فار یو۔ تمہارا نام یو۔ این۔ او کے ڈیلیگیشن میں شامل ہو گیا ہے۔''

یہ خبر سن کر بھٹو صاحب خوشی سے سرشار ہو گئے۔ صدر مرزا کے جانے کے بعد انہو نے انگریزی ڈانس کی طرز پر میرے کمرے کے اک دو چکر کاٹے اور پھر مجھے مخاطب کر کے اپنی مخصوص اردو میں کہا۔ ''آپ صاب دیکھو گے اب میں اس راہ پر آزاد ہوں' تو فارن منسٹر کی کرسی تک دوڑ لگاؤں گا۔''

بھٹو صاحب وزیر خارجہ کی منزل سے بہت آگے تک گئے' اور انجام کار اقتدار کے میدان کو یوں چھوڑا: جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔

اپنی پہلی ملاقات ہی سے وہ مجھے ''آپ صاب'' کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ وزیر' وزیراعظم اور صدر کی حیثیت سے بھی انہوں نے اس اسلوب تخاطب کو بڑی وضعداری سے نبھایا۔ ان کے عروج کے آخری دور میں بہت سے وزیروں اور اعلیٰ افسروں کو اکثر یہ شکایت رہتی تھی کہ بھٹو صاحب کابینہ اور دوسری میٹنگوں میں ان کے ساتھ بڑی سختی' بدسلوکی اور ہتک آمیز رویہ سے پیش آتے ہیں۔ لیکن ذاتی طور پر مجھے کبھی کوئی ایسا تجربہ نہیں ہوا۔ میں جیسا ''آپ صاب'' شروع میں تھا' ویسا ہی آخر تک رہا۔

جون ۱۹۵۸ء کا اوائل تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ صدر اسکندر مرزا حسب دستور پورے ایک بجے اپنے کمرے سے اٹھ کر میرے دفتر کی کھڑکی کے پاس آئے' اور پوچھا' ''کوئی ضروری کام باقی تو نہیں؟'' میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ خدا حافظ کہہ کر ایوان صدارت میں اپنے رہائشی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دور چل کر وہ اچانک رکے' اور مڑ کر تیز تیز قدم میرے کمرے میں واپس آ گئے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بولے' ''میں ایک ضروری بات تو بھول ہی گیا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے میری میز سے پریذیڈنٹ ہاؤس کی سٹیشنری کا ایک ورق اٹھایا' اور وہیں

کھڑے کھڑے وزیراعظم فیروز خاں نون کے ایک دو سطری نوٹ لکھا کہ ہماری باہمی متفقہ رائے کے مطابق بری افواج کے کمانڈر انچیف کے طور پر جنرل محمد ایوب خان کی ملازمت میں دو سال کی توسیع کے احکامات فوراً جاری کر دیئے جائیں۔ اس پر انہوں نے "Immediate Most" کا لیبل اپنے ہاتھ سے پن کیا اور مجھے حکم دیا کہ میں ابھی خود جا کر یہ نوٹ پرائم منسٹر کو دوں' ان کے عملے کے حوالے نہ کروں۔

یہ مختصر سا پروانہ بڑی عجلت اور کسی قدر لاپروائی کے عالم میں لکھا گیا تھا۔ صدر اسکندر مرزا کے ہونٹوں میں لٹکے ہوئے سگریٹ کی راکھ بھی اس پر دو بار گر چکی تھی' لیکن کاغذ کے اسے چھوٹے سے پرزے نے ہمارے ملک کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ اگر جون ۱۹۵۸ء میں جنرل محمد ایوب خان کی میعاد ملازمت میں دو سال کی توسیع نہ ہوتی تو پاکستان کی تقدیر کا ستارہ جس انداز سے چمکتا' اس کا زائچہ تیار کرنے کے لیے کسی خاص علم نجوم کی ضرورت نہیں ہے!

۱۹۵۸ء کا سال چڑھتے ہی اسکندر مرزا صاحب کی کرسی صدارت پر عام انتخابات کا خوف شمشیر برہنہ کی طرح لٹک گیا۔ انتخابات نومبر ۱۹۵۷ء میں منعقد ہونے تھے۔ لیکن کسی قدر ہیرا پھیری کے بعد ۱۹۵۸ء تک ملتوی ہو گئے۔ بعدازاں مزید ہیرا پھیری کے بعد ۱۹۵۹ء تک کھسک گئے۔ نئے آئین کے تحت کوئی صدر مسلسل دو میعادوں تک اس عہدے پر فائز نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر انتخابات ہوتے' تو میجر جنرل اسکندر مرزا کو صدارت سے دستبردار ہونا پڑتا یا اگر وہ دوبارہ صدر بننا چاہتے تو اپنے منصب سے استعفیٰ دے کر از سر نو صدارتی انتخابات لڑ سکتے تھے۔ یہ دونوں صورتیں ان کے لیے سوہان روح تھیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی تمام صلاحتیں بروئے کار لا کر انتخابات ہی سے پیچھا چھڑانے کی ٹھان لی۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے کئی حربے استعمال کئے۔ اپنے دیرینہ دوست ڈاکٹر خان صاحب سے انہوں نے ایک شوشہ چھڑوایا کہ صدر مملکت کی سرکردگی میں ایک انقلابی کونسل قائم ہونی چاہیے جو مملکت کا سارا کاروبار خود چلائے۔ اس احمقانہ تجویز پر کسی نے کوئی

دھیان نہ دیا اور سب نے یہی سمجھا کہ ایک پرانا کانگرسی لیڈر سٹھیا کر ایسے ہی دور از کار بڑ ہانک رہا ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب تو لاہور میں ناگہانی طور پر قتل ہو گئے لیکن صدر اسکندر مرزا کے کچھ نادان دوست اس بے تکی اور فضول سکیم پر بدستور جمے رہے۔ چنانچہ ملک کے کئی شہروں میں انہوں نے اس مضمون کے پوسٹر چھپوا کر دیواروں پر چسپاں بھی کئے' جس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ صدر مرزا کے خلاف سیاسی حلقوں میں بدظنی اور بھی بڑھ گئی۔

قلات کے "خان اعظم" میر احمد یار خاں بلوچ نے اپنی کتاب Inside Baluchistan میں صدر اسکندر مرزا کی ایک عجیب سازباز کا حوالہ دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ صدر نے ان کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ قلات کو "ون یونٹ" سے الگ کرنے میں ان کی پوری مدد کریں گے۔ اس کے عوض انہوں نے اپنے صدارتی انتخاب کے لیے ان سے پچاس لاکھ روپے کی رقم طلب کی تھی اور بہاولپور سے چالیس لاکھ اور خیرپور سے دس لاکھ روپے حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میر احمد یار خاں کے بیان کے مطابق صدر اسکندر مرزا نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ وہ پاکستان میں مارشل لاء نافذ کر کے نواب بھوپال کو وزیراعظم بنا دیں گے اور خود صدارت کی کرسی پر بیٹھ کر آمرانہ طریقے سے حکومت کریں گے۔ اس مقصد سے انہوں نے نواب بھوپال کو کراچی بلا بھی لیا تھا۔ لیکن خان آف قلات کا مشورہ سن کر نواب صاحب نے یہ پیش کش قبول نہ کی۔

ایک بار راجہ صاحب محمود آباد نے مجھے خود بتایا تھا کہ صدر اسکندر مرزا نے انہیں بھی کچھ ایسا ہی سبز باغ دکھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن راجہ صاحب بڑے صاحب فراست و بصیرت انسان تھے۔ اس لیے ان کے چکر میں نہ آئے۔

ادھر ایوان صدارت میں میجر جنرل اسکندر مرزا اپنی محلاتی سازشوں میں مصروف تھے' ادھر باہر ملک کے طول و عرض میں سیاسی سرگرمیاں روز بہ روز تیزی سے بڑھتی جا رہی تھیں۔ جمہوریت کا خاصہ ہے کہ جس رفتار سے انتخابات کا وقت قریب آتا ہے اسی رفتار سے

سیاست کے رگ و ریشے میں خون کا دباؤ اور درجہ حرارت بڑھنے لگتا ہے۔ ہمارے وطن میں پہلے عام انتخابات آزادی کے گیارہ برس بعد ہونے والے تھے' اس لیے انتخابی بخار میں غیر معمولی جوش و خروش اور حدت و شدت بالکل قدرتی اور لازمی امر تھا۔ سیاسی جماعتیں' اپنی اپنی انتخابی مہم میں سرگرم عمل ہو گئیں۔ خاص طور پر مغربی پاکستان میں مسلم لیگ نے ایک نئے ولولے سے سر اٹھایا اور خان عبدالقیوم خان کی قیادت میں عوام الناس کے ساتھ اپنی وابستگی کے بڑے شاندار مظاہرے کئے۔ خان قیوم کی تقریروں میں صدر اسکندر مرزا کی سیاسی ریشہ دوانیو کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہ ساری کاروائی ایک خالص سیاسی عمل تھا' جسے نوکر شاہی کی آغوش میں پلے ہوئے حکمران طبقے جمہوریت کی عینک سے دیکھنے سے قطعی طور پر قاصر تھے۔ سیاست میں اس طرح کی ارتقائی ترقی اور فروغ ان کی عقل و فہم سے سراسر بالا تھے۔ خاص طور پر صدر اسکندر مرزا کو اس میں شرپسندی اور ملک دشمنی کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا کیونکہ انتخابات کے نتیجہ میں ان کو خود اپنا سنگھاسن ڈولتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

مشرقی پاکستان میں بھی سیاسی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ وہاں پر ایک افسوسناک واقعہ یہ پیش آیا کہ صوبائی اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر اسمبلی کے اندر ایک ہنگامے میں زخمی ہو کر وفات پا گئے۔ یہ حادثہ اپنی جگہ بڑا المناک بلکہ شرمناک تھا لیکن جمہوریت کی تاریخ میں کوئی ایسا عجوبہ روزگار بھی نہ تھا۔ بڑے بڑے شائستہ' ترقی یافتہ' نستعلیق ممالک کی پارلیمانی نظام کے ارتقا کی تاریخ اشتعال انگیزی' ہنگامہ آرائی' لپاڈگی اور تشدد کے واقعات سے پٹی پڑی ہے۔ صدر اسکندر مرزا جمہوریت سے اس وجہ سے خائف تھے کہ ان کے اپنی ذاتی مفاد پر زد پڑتی تھی' لیکن ملک کے مفاد کی آڑ لے کر ان کی حکومت نے اس ایک واقعہ پر سراسر غیر متناسب رنگ و روغن چڑھا کر اسے جمہوریت کے تابوت میں ایک موثر کیل کے طور پر گاڑنا شروع کر دیا۔

۲۲ ستمبر ۱۹۵۸ء کو دن کے ایک بجے جب صدر اسکندر مرزا اپنے دفتر سے اٹھے تو حسب

معمول میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کر نہ رکے بلکہ مجھے باہر برآمدے میں اپنے پاس بلا بھیجا۔ ان کے ہاتھ میں پاکستان کے آئین کی ایک جلد تھی۔ انہوں نے اس

کتاب کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا۔ "تم نے اس Trash کو پڑھا ہے؟"
جس آئین کے تحت حلف اٹھا کر وہ کرسی صدارت پر براجمان تھے' اس کے متعلق ان کی زبان سے Trash کا لفظ سن کر میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر انہوں نے آئین پر تنقید و تنقیص کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی پہلے سے رٹا ہوا آموختہ دہرا رہے ہوں کچھ دیر بولنے کے بعد وہ بڑی باقاعدگی سے ٹیپ کا یہ فقرہ دہراتے تھے' کہ یہ آئین بالکل ناقابل عمل ہے۔
اسی طرح تقریر کرتے کرتے وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل میں اپنے رہائشی کمروں کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہاں پر ان کے چند ذاتی دوست لنچ کے لیے آئے ہوئے تھے۔
صدر مرزا تو اپنی تقریر ادھوری چھوڑ کر ان میں گھل مل گئے اور میں واپس لوٹ آیا۔
آئین کے متعلق ان کے بہت سے فقرے ہتھوڑی کی طرح کھٹ کھٹ میرے کانوں میں بج رہے تھے۔ واپسی پر جب میں سیڑھیاں اتر رہا تھا تو اچانک میری ٹانگیں بے جان سی ہو گئیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایسکیلیٹر کی طرح نیچے والی سیڑھیاں بڑی تیزی سے اوپر کی طرف آ رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گیا۔ سیکیورٹی کا ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا اور مجھے سہارا دے کر نیچے لایا۔ برآمدے میں صدر کے معالج کرنل سرور کھڑے تھے انہوں نے جلدی جلدی میرا معائنہ کیا اور پھر کار میں ڈال کر جناح ہسپتال کے Intensive Care Unit میں داخل کر دیا۔
دو روز کے بعد جب مجھے Intensive Care سے عام کمرے میں منتقل کیا گیا تو بیگم ناہید مرزا مجھے دیکھنے آئیں' اور بولیں "کرنل سرور نے ہمیں بتایا ہے کہ تمہارے ہارٹ کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ امید ہے تم دس بارہ روز میں ہسپتال سے فارغ ہو جاؤ گے۔ بڑا نازک وقت آنے والا ہے۔ جلدی جلدی ٹھیک ہو کر کام پر آنے کی کوشش کرو۔"

ایک بار صدر سکندر مرزا بھی آئے اور اسی قسم کی گفتگو کر کے چلے گئے۔ ۷ اکتوبر کو مجھے ہسپتال سے چھٹی ملی' لیکن ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ فوراً دفتر جانا شروع نہ کروں بلکہ دو چار روز اور گھر پر آرام کروں۔ ۷ اکتوبر کو میں نے اپنے دفتر ٹیلیفون کر کے کام کاج کا حال دریافت کیا تو میرے عملے نے بتایا کہ کئی روز سے دفتری کاروبار بند پڑا ہے۔ صدر مرزا زیادہ وقت جنرل محمد ایوب خاں کے ساتھ ملاقاتوں میں گزارتے ہیں۔ فائلیں جوں کی توں پڑی رہتی ہیں۔ کئی روز سے کسی نے ان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اسی روز رات گئے ایک صاحب نے پریذیڈنٹ ہاؤس سے ٹیلیفون کر کے مجیے اطلاع دی کہ ابھی ابھی ملک بھر میں مارشل لاء نافذ ہو گیا ہے۔ آئین منسوخ کر دیا گیا ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اور اسمبلیاں توڑ دی گئی ہیں اور جنرل محمد ایوب خاں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہو گئے ہیں۔

۸ اکتوبر کی صبح کو میں اپنے دفتر گیا تو اسکندر مرزا صاحب ایوان صدر کی فضا میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول رہے تھے۔ آئین کو منسوخ کر کے انہوں نے اپنے ہاتھوں وہ درخت ہی کاٹ کر پھینک دیا تھا جس کے سائے میں بیٹھ کر انہیں صدارت کی کرسی نصیب ہوئی تھی۔ فوج کے شعبہ قانون کے ماہرین نے صاف طور پر یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ آئین کی منسوخی کے ساتھ ہی صدر کا عہدہ بھی ختم ہو گیا ہے اور اب حکومت کا واحد سربراہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہے۔ میجر جنرل اسکندر مرزا نے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے بڑے ہاتھ پاؤں مارے۔ کچھ سول افسروں کو ساتھ ملا کر انہوں نے کراچی کے مزدوروں سے اپنے حق میں ایک پھسپھسا سا مظاہرہ بھی کروایا تا کہ جنرل ایواب خان پر عوام میں اپنی ہردلعزیزی کا رعب گانٹھ سکیں۔ مسلح افواج میں پھوٹ ڈالنے کے لیے انہوں نے پاک فضائیہ کے ائیرکموڈور مقبول رب کے ذریعہ چند فوجی جرنیلوں کو گرفتار کرنے کی بھونڈی سی ناکام کوشش بھی کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے جنرل ایوب خاں کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے اپنی روایتی محلاتی سازشوں کے تانے بانے بھی بڑی چالاکی سے بننا شروع کر دیئے لیکن جس محلسرا پر آئین کا سایہ قائم نہ رہے' اس

کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ مارشل لاء میں حکومت اس کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہو۔ یہ فوقیت ایوب خاں کو حاصل تھی۔ چنانچہ عین بیس روز بعد رات کے وقت فوج کے ایک دستے نے ایوان صدر کو گھیرے میں لے لیا۔ تین جرنیل اور ایک مسلح بریگیڈیئر اسکندر مرزا کے پاس گئے اور انہیں کرسی صدارت سے اتار کر پہلے کوئٹہ اور پھر لندن روانہ کر دیا۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات کو جب میجر جنرل اسکندر مرزا اپنی بیگم کے ساتھ پریذیڈنٹ ہاؤس سے آخری بار رخصت ہو رہے تھے تو انہوں نے ایک جرنیل کو ایک نیا فاؤنٹن پین دے کر کہا کہ وہ یہ الوداعی تحفہ ان کی طرف سے مجھے پہنچا دیں۔ اگلی صبح جب یہ تحفہ مجھے ملا تو مجھے ان کے اعصابی کس بل پر بڑا تعجب ہوا۔ جس وقت میجر جنرل اسکندر مرزا اور بیگم ناہید مرزا پریذیڈنٹ ہاؤس سے نکل رہے تھے تو انہیں وثوق سے یہ علم نہ تھا کہ یہاں سے انہیں جیل میں پہنچایا جائے گا یا کسی فوجی بارک میں نظر بند کیا جائے گا یا کہیں لے جا کر گولی سے اڑا دیا جائے گا' یا واقعی کوئٹہ اور لندن بھیجا جائے گا۔ اس بے چینی اور روا روی کے عالم میں اپنے سیکرٹری کو یاد رکھنا اور اس کے الوداعی تحفہ چھوڑنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

جمہوریت کو پامال کرنے کا جو عمل مسٹر غلام محمد نے شروع کیا تھا' میجر جنرل اسکندر مرزا نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں آئین منسوخ کرنے کا بالکل کوئی جواز نہ تھا۔ اس وقت پاکستان کسی غیر معمولی بیرونی خطرے سے دو چار نہ تھا۔ اندرونی "خطرہ" صرف یہ تھا کہ اگر انتخابات منعقد ہو جاتے' تو غالباً اسکندر مرزا صاحب کو کرسی صدارت سے ہاتھ دھونا پڑتا اپنی صدارت کو اس افتاد سے بچانے کے لیے انہوں نے یہ رٹ لگائی کہ ۱۹۵۶ء کا آئین ناقابل عمل ہے۔ یہ بڑا بھونڈا عذر لنگ تھا۔ آئین کو پرکھنے کی کسوٹی انتخابات اور منتخب اداروں کا کردار ہوتا ہے۔ اس آئین کے تحت ایک بھی الیکشن نہ ہوئی تھی۔ اس لیے اس پر ناقابل عمل ہونے کا الزام لگانا سراسر بے

معنی اور بے بنیاد تھا۔ اپنے ذاتی اقتدار کی حفاظت کے لیے صدر اسکندر مرزا نے مارشل لاء کی راہ ہموار کی۔ جنرل ایوب خاں پچھلے چار برس سے اسی نفسیاتی لمحے کا انتظار کر رہے تھے۔ مارشل لاء نافذ کر کے انہوں نے سب سے پہلے صدر مرزا کو بیک بنی و دوگوش نکال باہر کیا۔ پھر اپنے بنے بنائے پلان کے مطابق حکمرانی شروع کر دی۔ یہ پلان انہوں نے ۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کی رات کو لندن کے ڈارچسٹر ہوٹل میں بیٹھ کر بنایا تھا اور اقتدار کے اگلے دس برس انہوں نے قریباً قریباً انہی خطوط پر اپنی صدارت کو استوار کیا۔

پاکستان میں جمہوریت پہلے ہی سسک سسک کر جی رہی تھی۔ آئین کی منسوخی نے اس کا گلا اور بھی گھونٹ دیا۔ زندگی اور جمہوریت میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ پے در پے ناکامیوں کی وجہ سے دونوں منقطع نہیں ہوتیں بلکہ جوں توں چلتی رہتی ہیں۔ اگر جمہوریت ناکام ہونے لگے' تو نقل خون (Blood Transfusion) کی طرح اس کا واحد علاج مزید جمہوریت ہے۔ دوبارہ ناکام ہونے لگے تو اور بھی مزید جمہوریت۔ باقی سب طریقے عطائیوں' اناڑی ریفارمروں اور نیم حکیموں کے نسخے ہوتے ہیں جو ملک اور قوم کے لیے خطرہ جان ثابت ہو سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے جنرل ایوب خاں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور جمہوریت کے نام پر انہوں نے جس نظام کی داغ بیل ڈالی' اس نے ان کے دور صدارت کے ساتھ ہی دم توڑ دیا۔

جمہوریت کا سکہ اسی وقت تک چلتا ہے جب تک کہ وہ خالص ہو۔ جوں ہی اس میں کھوٹ مل جائے' اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔

○ ○ ○

• جنرل ایوب خان کی اٹھان

میجر جنرل اسکندر مرزا کی برطرفی کے بعد اگلی صبح میں اپنے دفتر گیا' تو ایوان صدارت میں الو بول رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور اکا دکا نوکر چاکر اور گارڈ کے سپاہی سرگوشیوں میں رات کے واقعات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ جنرل ایوب خان نے صدارت کا عہدہ سنبھال لیا تھا' لیکن وہ ابھی ایوان صدر میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ اب مجھے اس بیت الجن سے چھٹکارا نصیب ہو جائے گا کیونکہ نئے صدر کے لیے فوجی لوگ ضرور اپنی پسند کا سیکرٹری رکھنا چاہیں گے۔ میں نے اپنے کاغذات درست کئے اور دستور کے مطابق اپنی چارج رپورٹ تیار کر ہی رہا تھا کہ یکایک یونیفارم میں ملبوس جنرل ایوب خاں میرے کمرے کی کھڑکی میں نمودار ہوئے۔ وہ اتنے طویل القامت تھے کہ اگر کھڑکی کے پاس سیدھے کھڑے ہو کر بولتے تو چھت کے ساتھ باتیں کرتے نظر آتے۔ انہوں نے جھک کر کھڑکی کی چوکھٹ سے آگے والی دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور مجھے باہر آنے کو کہا۔

مجھے ساتھ لے کر وہ کافی دیر تک باہر چبوترے پر ٹہلتے رہے۔ پہلے انہوں نے اسکندر مرزا کے ساتھ اپنی دیرینہ دوستی کا ذکر کیا۔ پھر پچھلے دو تین ہفتوں کے دوران ان کی سازشوں اور بیوفائیوں پر طویل روشنی ڈالی۔ مجھے ان کی اس گفتگو پر بڑی حیرت ہوئی۔ جنرل ایوب خاں سے میرے کوئی قریبی مراسم نہ تھے۔ یونہی دور ہی دور سے رسمی سی ملاقات تھی۔ میرا خیال ہے اسکندر مرزا کو برطرف کرنے کا ان کے ذہن پر کسی قدر بوجھ تھا۔ وہ اس قسم کی گفتگو کر کے اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے تھے۔ صبح سویرے میں پہلا سویلین تھا' جو ان کے ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے اپنی ذہنی چاند ماری کا تختہ مشق بنا کے اسکندر مرزا کے ساتھ اپنی وفاداری کا حق ادا کر دیا۔ انسان کے دماغ میں ایسی خود کار مشین نصب ہوتی ہے' جو اندرونی اضطراب کے وقت اسے اپنی مرضی کی سکون آور

گولیاں بنا بنا کر کھلاتی رہتی ہے۔
اس روز صدر ایوب خاں کی پہلی کیبنٹ میٹنگ ہونے والی تھی۔ کچھ وزیر برآمدے میں آ کر جمع ہو گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر صدر نے کہا' "میں چاہتا ہوں کہ کابینہ کی پہلی چند میٹنگوں میں تم بھی بیٹھو تا کہ تم میرے خیالات سے واقف ہو جاؤ۔"
یہ موقع ہاتھ آتے ہی میں نے گذارش کی' "جناب' دراصل میں اپنی چارج رپورٹ مکمل کر رہا تھا تا کہ آپ اپنی پسند کا نیا سیکرٹری متعین کر لیں۔"
یہ سن کر صدر ایوب چلتے چلتے رک گئے اور بولے۔ "ہم فوجی لوگ ہر بات کی تحقیق کرنے کے عادی ہیں۔ ہم نے انکوائری کر لی ہے۔ تم کسی چیز میں ملوث نہیں ہو۔ اس لیے میں نے تم کو اپنا سیکرٹری مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"
یہ سن کر میرا نفس کچھ پھول سا گیا۔ نفس جتنا فربہ ہو' عقل اتنی ہی کمزور پڑ جاتی ہے اور قوت فیصلہ پر خود فریبی کا غبار چھا جاتا ہے۔ میرا بھی حشر ایسا ہی ہوا۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی اس غلط مہمی میں مبتلا ہو گیا کہ نیا صدر جو نیا نظام لانا چاہتا ہے' شاید وہی ملک کے لیے سود مند ثابت ہو۔ اس وقت یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ آئی کہ یہ نظام ریت کا گھروندا ہے' جو ایوب خاں کی صدارت ختم ہوتے ہی دھڑام سے گر جائے گا۔ جمہوریت بڑی غیرت مند اور حاسد دلہن ہے۔
اس کے اوپر سوکن کا سایہ بھی پڑ جائے تو یہ گھر بار جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔
اس نئے دور میں کام شروع کرتے ہی میرے دل میں یہ بات کھٹکی کہ مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد اب تک جتنے سرکاری اعلانات' قوانین اور ریگولیشن جاری ہوئے ہیں۔
ان میں صرف حکومت پاکستان کا حوالہ دیا ہے' حکومت اسلامی جمہوریہ پاکستان کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ شاید ڈرافٹنگ میں غلطی سے ایک آدھ بار یہ فروگذاشت ہو گئی ہو گی۔ لیکن جب ذرا تفصیل سے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ جس تواتر سے یہ فروگزاشت دہرائی جا رہی ہے۔ وہ سہواً کم اور التزاماً زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

اس پر میں نے ایک مختصر سے نوٹ میں صدر ایوب کی خدمت میں تجویز پیش کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو وزارت قانون اور مارشل لاء ہیڈ کوارٹر کی توجہ اس صورت حال کی طرف دلائی جائے اور ان کو ہدایت دی جائے کہ جاری شدہ تمام اعلانات اور قوانین کی صحیح کی جائے اور آئندہ کے لیے اس غلطی کو نہ دہرایا جائے۔

صدر ایوب کا قاعدہ تھا کہ وہ فائلیں اور دوسرے کاغذات روز کے روز نپٹا کر میرے پاس واپس بھیج دیا کرتے تھے۔ لیکن معمول کے برعکس یہ نوٹ کئی روز تک میرے پاس واپس نہ آیا۔ ۵ نومبر کی شام کو میں اپنے دفتر میں بیٹھا دیر تک کام کر رہا تھا۔ باہر ٹیرس پر صدر ایوب اپنے چند رفیقوں کے ساتھ کسی معاملے پر گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب سب لوگ چلے گئے تو صدر میرے نوٹ کا پرچہ ہاتھ میں لیے میرے کمرے میں آئے۔ وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ تھے آتے ہی انہوں نے میرا نوٹ میرے حوالے کیا اور کہا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ڈرافٹنگ میں کسی نے کوئی غلطی نہیں کی۔ بلکہ ہم نے سوچ سمجھ کر یہی طے کیا ہے کہ اسلامک ری پبلک آف پاکستان سے اسلامک کا لفظ نکال دیا جائے۔

"یہ فیصلہ ہو چکا ہے یا ابھی کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

President,s Order (Post proclamation) No. 1 of 1958.
Laws (Continuance in Force), Order, 1958,
10th October, 1958

صدر ایوب نے کسی قدر غصے سے مجھے گھورا اور سخت لہجے میں کہا۔ "ہاں' ہاں فیصلہ ہو گیا ہے۔ کل صبح پہلی چیز مجھے ڈرافٹ ملنا چاہیے۔ اس میں دیر نہ ہو۔"

اتنا کہہ کر وہ خدا حافظ کہے بغیر تیز تیز قدم کمرے سے نکل گئے۔ اگر مجھ میں ہمت ہوتی تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے بھاگتا اور انہیں روک کر پوچھتا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان سے اسلامی کا لفظ حذف کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں؟ لیکن اتنی ہمت مجھ میں نہ تھی اس لیے میں بھی دم دبائے چپ چاپ گھر واپس آ گیا۔ بڑے سوچ بچار کے بعد صبح کے قریب میں نے پریس ریلیز تو تیار نہ کیا بلکہ اس کی جگہ دو ڈھائی

صفحوں کا ایک نوٹ لکھا' جس کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کو اسلام سے فرار ممکن نہیں۔ اس ملک کی تاریخ پرانی لیکن جغرافیہ نیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ریڈ کلف لائن صرف اس وجہ سے کھینچی گئی تھی کہ ہم نے یہ خطہ ارض اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا۔ اب اگر پاکستان سے اسلام کا نام الگ کر دیا گیا تو حد بندی کی یہ لائن معدوم ہو جائے گی۔ ہم پاکستانی صرف اس وجہ سے بنے کہ ہم مسلمان تھے۔ اگر افغانستان' ایران' مصر' عراق اور ترکی اسلام کو خیر باد کہہ دیں تو پھر بھی وہ افغانی' ایرانی' مصری' عراقی اور ترک ہی رہتے ہیں۔ لیکن ہم اسلام کے نام سے راہ فرار اختیار کریں تو پاکستان کا اپنا الگ کوئی وجود قائم نہیں رہتا۔ اس لیے اسلام ہماری طبع نازک کو پسند خاطر ہو نہ ہو' اسلام ہماری طرز زندگی کو راس آئے یا نہ آئے' ذاتی طور پر ہم اسلام کی پابندی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں' حقیقت بہرحال یہی ہے کہ اگر آخرت کے لیے نہیں تو اسی چند روزہ زندگی میں خود غرضی کے طور پر اپنے وطن کی سلامتی کے لیے ہمیں اسلام کا ڈھول اپنے گلے میں ڈال کر برسر عام ڈنکے کی چوٹ بجانا ہی پڑے گا' خواہ اس کی دھمک ہمارے حسن سماعت پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔ جمہوریہ پاکستان کے ساتھ اسلامک کا لفظ لگانے سے اگر کسی کا ذہن قرون وسطیٰ کی طرف جاتا ہے تو جانے دیں۔ دوسروں کی جہالت کی وجہ سے اپنے آپ کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ساتھ ہی میں نے ایک الگ کاغذ پر اپنا استعفیٰ بھی لکھ لیا کہ خرابی صحت کی بنا پر میں کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا' اس لیے میرا استعفیٰ منظور کر کے مجھے ریٹائر ہونے کی اجازت دی جائے۔

یہ دونوں چیزیں میں نے اپنی بیوی کو دکھائیں تو اس نے مجھے خوب شاباش دی اور غالباً میرا دل بڑھانے کو کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ انگریزی بھی اتنی اچھی لکھ لیتے ہیں!"

یہ بات سن کر میں جل گیا۔ "محترمہ' تم انگریزی زبان کے چسکے میں پڑ گئی ہو۔ یہ

نہیں دیکھا کہ میں نے استعفیٰ بھی لکھ رکھا ہے۔ شاید سچ مچ اس کی نوبت بھی آ جائے۔ اس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

اس نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ اس معاملے میں اگر آپ کی بات رد ہو گئی تو استعفیٰ دے دینا چاہیے۔ یہ نوکری چلی گئی تو کچھ اور کام کر لینا۔ کسی کام کو جی نہ چاہے' تو آرام سے گھر بیٹھ کر لکھنا پڑھنا۔ آخر میں نے ڈاکٹری کی ڈگری کس روز کے لیے لی ہے۔"

ہماری شادی کو ابھی صرف ڈیڑھ برس ہوا تھا۔ میں دفتر جانے لگا تو عفت غالباً شرارت سے بولی۔ "آپ صورت حال سے نپٹ لیں گے یا میں بھی ساتھ چلوں؟"

میں اپنے آفس وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ خیال تھا کہ صدر ایوب کے آنے سے پہلے اپنا نوٹ ٹائپ کروا رکھوں گا۔ لیکن وہاں دیکھا تو صدر صاحب پہلے ہی برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کمرے میں آ گئے اور پوچھا۔ "ڈرافٹ تیار ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ تیار تو ہے لیکن ابھی ٹائپ نہیں ہوا۔

"کوئی بات نہیں۔" انہوں نے کہا۔ "ایسے ہی دکھاؤ۔"

وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور میرے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ پڑھنے لگے۔ چند سطریں پڑھ کر کچھ چونکے اور پھر از سر نو شروع سے پڑھنے لگے۔ جب ختم کر چکے تو کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے "Yes, Right You Are" یہ فقرہ انہوں نے دوبار دہرایا اور پھر نوٹ ہاتھ میں لیے کمرے سے چلے گئے۔ اس کے بعد اس موضوع پر پھر کسی نے کبھی کوئی بات نہیں کی۔

چند روز بعد میں کچھ فائلیں لے کر صدر ایوب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی ڈاک دیکھ رہے تھے۔ ایک خط پڑھ کر بولے۔ کچھ لوگ مجھے خط لکھتے ہیں' کچھ لوگ ملنے بھی آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا بدل گئی ہے۔ اب ماڈرن ازم اور اسلام اکٹھے نہیں چل سکتے۔ میں ان سے کہتا ہوں۔

"Pakistan has no Escape from Islam......" اس کے بعد انہوں نے پے در پے

میرے نوٹ کے کئی اور فقرے بھی دہرائے------ ان میں یہ عجیب صلاحیت تھی کہ اگر کوئی بات واقعی ان کے دل میں گھر کر جاتی تھی تو وہ بڑی معصومیت سے اسے اپنا لیتے تھے۔

ایک روز وہ کہنے لگے کہ انہوں نے بچپن میں قرآن شریف ختم تو کیا ہے لیکن رسماً۔ اس کے معانی کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اس لیے میں انہیں اردو کا کوئی آسان سا ترجمہ لا دوں۔ میں نے انہیں دو تین سادہ سادہ سے آسان مترجم قرآن شریف فراہم کر دیئے۔ ان کو انہوں نے بڑی محنت اور غور سے پڑھا۔ بنیادی عقائد' عبادات' نظام کائنات اور قصص القرآن تو وہ آسانی سے سمجھ گئے لیکن زندگی کی کلیت اور مجموعیت کا احکام الٰہی کے ساتھ جو مربوط' مضبوط اور عملی رشتہ ہے وہ پوری طرح ان کے فہم و ادراک کی گرفت میں نہ آ سکا۔ کچھ عرصہ ان کے سر میں یہ سودا بھی سمایا رہا کہ قرآن مجید کو عقائد' عبادات' اخلاقیات' قوانین' تمثیلات' قصص وغیرہ کے عنوانات کے تحت بھی تدوین کر دینی چاہیے تاکہ ہر موضوع کے حوالہ جات تلاش کرنے میں آسانی ہو۔ اس خیال میں کچھ ایسے عناصر کی ہمت افزائی کرتے رہتے تھے جو دین کو انضباطی پابندیوں سے آزاد کر کے اسے سہل انگاریوں اور تن آسانیوں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ جس طرح امتحان پاس کرنے کے لیے کتابوں کے خلاصے اور پاکٹ گائیڈ مقبول ہوتے ہیں' اسی طرح اسلام کا یہ نظرثانی شدہ آسان رنگ بھی صدر ایوب کو بڑی آسانی سے متاثر کر دیتا تھا۔ لیکن عام طور پر یہ تاثر عارضی ہوتا تھا۔ کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک اچھے اور سیدھے سادے مسلمان تھے۔

۱۹۶۰ء میں جب وہ سعودی عرب کے سرکاری دورے پر جا رہے تھے تو عمرہ ادا کرنے کے لیے انہوں نے خاص طور پر تیاری کی۔ ان کی فرمائش پر میں نے انہیں مختلف دعاؤں کے مجموعے دیئے' جن کا انہوں نے چند روز خوب مطالعہ کیا۔ جس روز روانگی کے لیے ہم ہوائی جہاز میں سوار ہوئے' انہوں نے دونوں مجموعے واپس کر دیئے' اور کہا۔ "مجھے

اپنے مطلب کی چیز مل گئی ہے۔ اب زیادہ لمبی چوڑی دعائیں یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔"

میرے استفسار پر انہوں نے جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا' جس پر ایک مختصر سی دعا اردو ترجمہ کے ساتھ نقل کی ہوئی تھی۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ یااللہ مجھے بغیر حساب کتاب کے ہی بخش دے!

مکہ معظمہ میں ایک روز ان کے لیے خانہ کعبہ بھی کھولا گیا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو شاہی معلم نے کہا کہ چاروں طرف منہ کر کے دو دو رکعت نماز پڑھ لیں۔ یہ سنت پوری کرنے کے بعد صدر ایوب بڑے شاداں و فرحاں نظر آتے تھے۔ وہیں اندر کھڑے کھڑے انہوں نے مجھے بتایا کہ چاروں طرف سجدہ کر کے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی مانگی ہے کہ ہندوستان کے سامنے ہمارا سر خم نہ ہو۔ بیت اللہ شریف کے اندر مانگی ہوئی دعا کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ اس کا کھلا ثبوت ہے۔

مدینہ منورہ میں ہمیں روضہ رسول کے حجرہ مبارک کے اندر جانے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ اندر داخل ہوتے ہی صدر ایوب پر ہیبت اور رقت طاری ہو گئی۔ لمحہ بھر کے لیے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے روضہ اطہر کا غلاف تھام لیا اور ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ زندگی بھر میں نے انہیں صرف ایک بار اس طرح اشک بار دیکھا ہے۔

صدارت کا کام جنرل ایوب خاں نے بڑی محنت' لگن' باقاعدگی اور سلیقے سے شروع کیا۔ سب فائلیں وہ غور سے پڑھتے تھے اور ان پر احکامات بھی اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ روز کی فائلیں روز نپٹا دیتے تھے۔ کچھ دن میں' کچھ رات کے وقت۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی فائل اگلے روز کے لیے اٹھا رکھی ہو۔ ہر روز اپنی ڈاک بھی پوری دیکھتے تھے۔ کچھ خطوط خود جواب دینے کے لیے منتخب کر لیتے تھے' باقی میرے حوالے کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں صدر کے نام جتنے خط آتے تھے ان سب کے جواب ضرور دیئے جاتے تھے۔

ایک رو پنجاب کے کسی گاؤں سے ایک دل جلے کا خط آیا' جس میں بڑی سخت زبان

استعمال کی ہوئی تھی اور کچھ گالی گلوچ بھی تھی۔ اس شخص کا کوئی چھوٹا سا معاملہ محکمہ مال میں اٹکا ہوا تھا اور کئی بار رشوت ادا کرنے کے بعد بھی سلجھنے میں نہ آتا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کے ساتھ انصاف نہ ہوا تو وہ ساری عمر صدر ایوب کو بددعائیں دے دے کر مرے گا۔ میرے عملے نے بہت کہا کہ اس قسم کا خط صدر کو نہ دکھایا جائے کیونکہ اسے پڑھ کر وہ خواہ مخواہ غصے میں آئیں گے یا پریشان ہوں گے۔ لیکن میں نے اس خط کو ان کی خدمت میں اس تجویز کے ساتھ پیش کیا کہ اس کا جوب خود صدر مملکت دیں۔ لاہور کے اگلے دورے میں اس شخص کو گورنر ہاؤس میں طلب کر کے اس کی بات سنی اور اس کا معاملہ گورنر کے سپرد کر کے جب تک وہ انجام تک پہنچ جائے اس کا پیچھا نہ چھوڑیں۔ یہ تجویز صدر ایوب کو پسند آ گئی اور اس پر عمل کر کے انہوں نے وقتاً فوقتاً مشرقی اور مغربی پاکستان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے لوگوں کے چھوٹے مسائل حل کرنے میں بڑی مدد دی۔

صدر ایوب کا گھریلو ماحول بھی بڑا سادہ اور خوشگوار تھا۔ بیگم ایوب خاموش طبع' مرنجان مرنج اور پروقار خاتون تھیں۔ ملک کی خاتون اول کے طور پر انہوں نے کبھی ذاتی پبلسٹی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنے بیٹوں کے لیے تو بڑی کمزور ماں ثابت ہوئیں کیونکہ وہ ان میں سے بعض کی خطا کاریوں اور ناپسندیدہ حرکات پر بڑی محنت سے پردہ ڈالتی رہتی تھیں۔ لیکن بیٹیوں کی تربیت پر ان کا اثر بے حدخوشگوار تھا۔ صدر ایوب کی صاحبزادیاں حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے مالا مال تھیں اور ان کے کردار میں حیاداری اور خوش اخلاقی کا بڑا گہرا امتزاج تھا۔ گھر کے اندر بھی وہ کبھی اپنے والد کے سامنے ننگے سر نظر نہ آتی تھیں۔ ان میں سے کسی نے میری بیوی کو بتایا تھا کہ کبھی کبھی وہ دوپٹے کو بالوں کے ساتھ پنوں کے ذریعہ ٹانک کر رکھتی ہے تاکہ بے خیالی میں سرک کر سر سے اتر نہ جائے۔

صدر ایوب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی شکیلہ کی شادی ہوئی تو سادگی میں یہ تقریب بھی

اپنی مثال آپ تھی۔ راولپنڈی سے ان کے ساتھ پرسنل سٹاف کے فقط ہم چار پانچ آدمی ان کے گاؤں ریحانہ گئے۔ ان کے آبائی مکان کے ایک کھلے احاطے میں درختوں کی چھاؤں میں چند کرسیاں اور کچھ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے برات کا استقبال کیا۔ نکاح کے بعد کھانا ہوا اور انتہائی سادگی کے ساتھ رخصتی ہو گئی۔ اس تقریب میں صرف گاؤں کے کچھ احباب اور برادری کے لوگ شریک ہوئے۔ نہ باجا گاجا۔ نہ ڈھول دھمکا۔ نہ تحفے تحائف۔ جس سادگی سے شادی کی تقریب ہوئی تھی' اسی سادگی سے ہم نے اخبار میں ایک چھوٹی سی دو سطری خبر چھپوا دی۔ ٹی۔ وی کا دور تو ابھی نہ آیا تھا' لیکن ریڈیو پاکستان کے کسی بلیٹن میں اتنی سی خبر بھی نہ آئی۔ یہ دیکھ کر چند وزیر' افسر اور پیشہ ور خوشامدی صدر ایوب کے سر ہو گئے کہ اس سادہ تقریب کی خاطر خواہ پبلسٹی نہ ہونے کی وجہ سے ان کا "امیج" بڑھانے کا ایک سنہری موقعہ ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ یہ بات ان کے کانوں میں بار بار اتنی شدت سے بھری گئی کہ رفتہ رفتہ وہ بھی تذبذب کے عالم میں مبتلا ہو گئے۔ ایک روز میں کسی کام سے ان کے پاس گیا' تو ایک ایسا ہی خوشامدی ٹولہ انہیں اپنے نرغے میں لیے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لوگ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے بھی پڑ گئے کہ صدر مملکت کے "امیج" کو فروغ دینے کا ایسا اچھا موقعہ کیوں ضائع کر دیا۔ میں خاموشی سے کھڑا ہوا ان کی چخ چخ بک بک سنتا رہا۔ جب ان کا غوغا بند ہوا' تو میں نے اپنے الفاظ کو قلفی کی طرح برف میں جما کر بڑے ادب سے کہا۔ "اگر اس موقع پر آپ صاحبان بھی مدعو ہوتے تو آپ کو بھی ضرور محسوس ہوتا کہ اس تقریب کی سادگی میں بڑا خلوص تھا۔ اب اسے اشتہاری سٹنٹ میں تبدیل کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں بلکہ خلوص میں ریا کی کھوٹ ملانا بے برکتی کا باعث بن جاتا ہے۔"

میری بات تو غالباً کسی کو پسند نہ آئی۔ لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس موضوع پر مزید چوں چوں بند ہو گئی۔

دفتر کے اندر دفتر کے باہر صدر ایوب کے سر پر ہمیشہ کام کی دھن سوار رہتی تھی۔ صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد مجھے ان کو کافی عرصہ تک کسی قدر قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے انہیں کبھی ایسی باتوں میں زیادہ وقت ضائع کرتے نہیں پایا جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح کام کے کسی نہ کسی شعبے سے نہ ہو۔ ان کے پاس ہمیشہ ایک نوٹ بک رہتی تھی' جس میں وہ تاریخ ڈال کر ہر وہ بات درج کرتے جاتے تھے' جو اس روز ان کو خود سوجھتی تھی' یا کسی سے سنتے تھے' یا کہیں پڑھ لیتے تھے۔ ہر اندراج کا نمبر شمار بھی لکھا جاتا تھا' جو نوٹ بک کے شروع سے آخر تک مسلسل چلتا تھا۔ اس طرح درج شدہ باتوں کو وہ کابینہ کے اجلاس' یا گورنروں یا وزیروں یا افسروں کے ساتھ اٹھاتے تھے اور جب ان پر عملدرآمد ہو جاتا تھا تو اس پر نشان لگا دیتے تھے۔ شروع کے دو برس ان کی جو نوٹ بک ختم ہوتی تھی' اسے میں اپنے پاس لے کر رکھ لیتا تھا۔ میرے پاس اس قسم کی چار کاپیاں محفوظ ہیں۔ ان سب کو ملا کر ان کے اندراجات کی تعداد ۱۲۵ ہے۔ یہ سطور لکھنے کے لیے میں نے ان کا کسی قدر غور سے جائزہ لیا' تو ملکی امور کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے بے شمار معاملات پر ان کا تفصیلی عبور دیکھ کر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہا۔ گورنروں کی تقریباں' وزیروں کے دورے' سفیروں سے گفتگو' امریکن ایڈ' نمایاں قابلیت کے چھوٹے بڑے افسروں کی نشاندہی' کسی جگہ کھاد کی سپلائی' کہیں پانی کی کمی' کسی کی پنشن کا معاملہ' سیم اور تھور کے مسائل' افریقہ میں اسلام کی تبلیغ' ریڈیو سے درس قرآن' بین الاقوامی معاملات------ ایسے ایسے بے شمار موضوعات ہیں جن سے یہ چاروں کاپیاں بھری پڑی ہیں۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

ہو رزم حق و باطل تو فولاد ہے مومن

• صدر ایوب' اصلاحات اور بیوروکریسی

عنان حکومت سنبھالتے ہی صدر ایوب کے سر پر اصلاحات کا بھوت بڑی شدت سے سوار ہو گیا۔ شروع ہی سے انہوں نے اپنے ذہن پر یہ مفروضہ طاری کر لیا تھا کہ پاکستان کے نظام زندگی اور نظام حکومت کا ہر شعبہ بری طرح بگڑا ہوا ہے' اور ان کی اصلاح کرنا ان کا فرض منصبی ہے۔ دل ہی دل میں وہ اپنے آپ کو ایک انقلابی ریفارمر سمجھتے تھے' لیکن درحقیقت ان کی طبیعت کی افتاد انقلاب پسند تھی نہ انقلاب انگیز تھی۔ ان کے کردار میں میانہ روی' اعتدال پسندی' مصلحت اندیشی اور عافیت طلبی کے عناصر اس قدر غالب تھے کہ کسی شعبے میں بھی انقلاب کا کوئی تقاضا پورا کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ بنیادی طور رپ وہ Status quo کے آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحات کے نام پر وہ معمولی سی چھان پھٹک اور جھاڑ پونجھ کے علاوہ کوئی دور رس کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔ جیسے جیسے ان کے زمانہ اقتدار کی رسی دراز ہوتی گئی۔ ویسے ویسے ان میں احتیاط پسندی کی احتیاج شدت سے بڑھتی گئی۔ صاحب اقتدار اگر اپنی ذات کے گرد خود حفاظتی کا حصار کھینچ کر بیٹھ جائے' تو اس کی اختراعی' اجتہادی اور تجدیدی قوت سلب ہو کر اسے لکیر کا فقیر بنا دیتی ہے۔ خود سلامتی کا بیج کونیاتی ٹھہراؤ میں جڑ پکڑتا ہے۔ اور تغیر و تبدل کا زیر و بم اس کی نشوونما کو راس نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحات کا ابتدائی جوش و خروش ملیریا کے بخار کی طرح بڑی تیزی سے چڑھا اور رفتہ رفتہ کہیں بالکل اتر گیا' کہیں مزمن ہو کر رگوں پٹھوں میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ جب کبھی مارشل لاء لگتا ہے۔ یہ خوابیدہ جراثیم نئے سرے سے جوش مارنے لگتے ہیں اور اصلاحات کا شوق باری کے بخار کی طرح کچھ دیر چڑھتا اترتا رہتا ہے اور پھر حسب دستور کہنہ ملیریا کی مانند اگلے موسم تک کے لیے افاقے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

صدر ایوب کا رجحان اصلاحات کی طرف مائل دیکھ کر ہماری فرض شناس نوکر شاہی نے بھی اپنی روایتی نبض شناسی کا ثبوت دیا اور بیوروکریسی کے اعلیٰ طبقہ نے آناً فاناً اصلاحات کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ اب جناب صدر جس شعبے کی اصلاح کا بیڑہ اٹھاتے تھے اس شعبے کے نئے اور پرانے افسر اور سرکاری اور نیم سرکاری ماہرین لبیک لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے تھے اور انہیں لوگوں میں سے کچھ حضرات کا انتخاب کر کے ایک کمیشن یا کمیٹی قائم کر دی جاتی تھی۔ عام طور پر یہ لوگ اپنے اپنے محکمانہ تجربوں' تعصبات' روایات' مفادات اور محرومیوں کی دلدل میں اس قدر دھنسے ہوئے ہوتے تھے کہ ان کا ذہن کسی نئی روش پر سوچنے سے سراسر قاصر تھا۔ سال دو سال کی محنت کے بعد ہر کمیشن یا کمیٹی ایک بھاری بھرکم اور ضخیم رپورٹ مرتب کرتی تھی۔ اس رپورٹ کا ایک نسخہ پیش کشی سنہری حاشیے والی خوبصورت مراکولیدر کی جلد میں سجا کر صدر ایوب کو ایک خصوصی تقریب میں بڑے طمطراق سے پیش کیا جاتا تھا۔ دونوں جانب سے تعریف و توصیف' خیرسگالی اور خوش کلامی کا بڑی فیاضی سے عوض معاوضہ ہوتا تھا اور پھر یہ رپورٹ سیدھی اپنے ہی محکمے میں واپس چلی جاتی تھی' تاکہ جن جن اصلاحات کی سفارش کی گئی ہے' ان پر مزید عمل درآمد شروع کیا جائے۔ یہ عمل اسی طرح کا تھا جیسے بلی کو دودھ کی رکھوالی پر بٹھا دیا جائے۔

اصلاحات کی ناکامی ہو یا کوئی دوسرا منصوبہ ٹوٹ کر بگڑ جائے' اس کی ذمہ داری ہمیشہ بیوروکریسی ہی کے سر تھوپی جاتی ہے۔ سیاستدان اپنی کمزوریوں' کوتاہیوں اور محرومیوں کا الزام بیوروکریسی ہی پر لگاتے ہیں۔ مارشل لاء نازل ہو تو سارے بگاڑ کی وجہ بیوروکریسی کو ہی گردانا جاتا ہے۔ کبھی نوکر شاہی کی تطہیر کے لیے سکریننگ کا عمل ظہور میں آتا ہے۔ کبھی تھوک کے بھاؤ ہزاروں ملازم بغیر کسی انکوائری کے برطرف کر دیئے جاتے ہیں۔ کبھی بیوروکریسی کو راہ راست پر لانے والے افراد چھوٹے بڑے سرکاری ملازموں کی پتلونیں اتار کر انہیں درختوں پر سر کے بل ٹانگ دینے کی دھمکیاں سناتے ہیں۔ ایسے

ماحول میں ہر بار نئے حکمران اپنے آپ کو اللہ کے مقرب فرشتے سمجھتے ہیں' اور نوکر شاہی کے ہر فرد کو ابلیس کا ساتھی قرار دیا جاتا ہے۔

یہ سارے ہتھکنڈے سرکاری ملازمین پر خوف و ہراس کی دھونس جمانے اور عوام پر اپنی برتری کا رعب گانٹھنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کے ہر خطے میں ہر ملک کی بیوروکریسی مملکت کا نظم و نسق چلانے میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بیوروکریسی سول حکومت کی ہوتی ہے' کبھی فوج کی' کبھی سیاسی جماعتوں کی' کبھی کسی مخلوط محاذ کی' لیکن ہر صورت میں بیوروکریسی سے کوئی نظام سلطنت راہ فرار اختیار کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ بیوروکریسی کا نعم البدل بھی بیوروکریسی ہی ہے۔ جمہوری نظام ہو یا آمریت کا دور دورہ' بیوروکریسی دونوں کے حق میں یکساں وفاداری سے کام کرتی ہے۔ یہی اس کا بنیادی فرض اور عملی تربیت کا ثمرہ ہے۔ نوکر شاہی کے فرائض میں حکومتوں یا نظام حکومت کو ادلنا بدلنا شامل نہیں ہے' بلکہ ان کی نافذ کی ہوئی پالیسیوں پر حتی الوسع دیانتداری سے عمل درآمد کرنا ہے۔ حکومت یا نظام حکومت کو بدلنا سیاستدانوں کا حق ہے۔ اگر وہ اپنی بدنظمی یا بے بضاعتی یا انتشار کی وجہ سے یہ حق استعمال کرنے سے قاصر رہیں تو مسلح افواج خود بخود میدان میں اتر آتی ہیں۔ حکومت یا نظام حکومت بدلنے کے اس عمل کو عام طور پر "انقلاب" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ سراسر غلط ہی نہیں' بلکہ لفظ "انقلاب" کی توہین بھی ہے۔ کیونکہ انقلاب ہمیشہ عوام الناس ہی لاتے ہیں۔ مثلاً تحریک پاکستان ایک عوامی انقلاب تھا۔ اس کی کامیابی کے بعد وطن عزیز میں آج تک اور کوئی انقلاب برپا نہیں ہوا۔ صرف حکومتیں تبدیل ہوئی ہیں۔ کبھی سول' کبھی فوجی۔

بیوروکریسی کو پالنا پوسنا فقط سول حکومتوں کی اجارہ داری نہیں' بلکہ ایک پیچ در پیچ عالمگیر دستور کی طرح یہ زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہے۔ سول بیوروکریسی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مسلح افواج میں ان کی اپنی بیوروکریسی چلتی ہے۔ عدلیہ کے نظام میں اس

کی بیوروکریسی کا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ سیاستدانوں کی جماعتوں میں ان کی اپنی بیوروکریسی رائج ہے۔ نیم سرکاری اداروں' بینکوں' بڑی صنعتوں' تجارتی کمپنیوں اور دیگر مینجمنٹ گروپوں میں بھی ان سب کی اپنی اپنی مخصوص بیوروکریسی کا راج ہے۔ سول بیوروکریسی کے علاوہ باقی سب بیوروکریسیاں پردہ نشین بی بیاں ہیں۔ اس لیے ان کا نام لینے کا رواج نہیں' البتہ سول بیوروکریسی کی نہ صرف تعداد بہت زیادہ ہے' بلکہ اس کا رابطہ عوام الناس سے بھی ہمہ وقت براہ راست رہتا ہے۔ باہمی خیر سگالی کا جذبہ کارفرما ہو' تو اس رابطہ سے خوش حالی اور امن آشتی اور ترقی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ ٹکراؤ کی صورت میں چقماق کی رگڑ کی طرح اسی رابطہ سے حسد اور بغض اور کشاکشی کی چنگاریاں چھوٹتی ہیں' رشوت خوری بددیانتی' بداخلاقی' خویش پروری' اقربانوازی اور ناانصافی کے جرائم کا ارتکاب ساری بیوروکریسی تو نہیں کرتی۔ لیکن کلنک کا ٹیکہ اس کی اجتماعی پیشانی پر یکساں لگ جاتا ہے۔

سول بیوروکریسی کے جملہ خصائل پر تبصرہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں' کیونکہ اس میں ہر رنگ ڈھنگ' ہر چلن اور ہر انداز کے افراد پھلتے پھولتے ہیں' لیکن ایک خصوصیت جوان میں مشترک ہے یہ ہے کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

بیوروکریسی کا نشہ ایسا نہیں جسے ترشی اتار دے۔ خاص طور پر جس بیوروکریٹ پر وی آئی پی کے تین حرف پڑ جائیں' وہ دھوبی کے کتے کی طرح نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ یہ تین حرف صرف سول بیوروکریسی کی ذات ہی نہیں بگاڑتے' بلکہ مسلح افواج' عدلیہ اور سیاسی بیوروکریسیوں پر بھی یکساں اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس شخص کا قدم ایک بار وی آئی پی کی شاہراہ پر پڑ گیا' بعد میں وہ کسی عام رہگزر پر گامزن ہونے سے بڑی حد تک ناکارہ ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر ہوائی اڈوں کے VIP Lounge دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ کوڑھیوں کے لیے ایک الگ احاطہ قائم کیا گیا ہے جس میں وہ باقی مخلوق کی نظروں سے پوشیدہ رکھے جا سکیں۔ سربراہان مملکت اور غیر ملکی اکابرین کے لیے وی آئی پی لاؤنج استعمال کرنا تو واجب اور مناسب ہے۔ لیکن اپنے وطن کے وزیروں'

سفیروں اور اعلیٰ افسروں کو اپنے ہی ہم وطن عوام سے کاٹ کر چھوت چھات کے مریضوں کی طرح خصوصی لاؤنج میں محبوس کرنا باعث شرم ہے۔ اگر یہ حضرت بھی عام لاؤنجوں سے گزریں تو لازم نہیں کہ عوام الناس کے دوش بدوش چل کر ان کی ناک کٹ جائے گی۔ البتہ وی آئی پی کا لبادہ اوڑھ کر ان کے دماغ کا ٹیڑھا ہو جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ وی آئی پی کو برہمن اور عوام کو شودر کا درجہ دینا اسلامی اخوت اور مساوات کے تقاضوں کی تذلیل کے مترادف ہے۔

میں نے اپنی تیس سالہ ملازمت کے دوران وی آئی پی لاؤنج فقط چند بار استعمال کی اہے۔ وہ بھی کبھی' اپنے پی۔ اے کا دل رکھنے کے لیے اور کبھی اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کے رعب میں آ کر اسی طرح کے دباؤ میں آ کر ایک بار میں کراچی کے وی آئی پی لاؤنج میں جا بیٹھا۔ لیکن لاؤنج کے پروٹوکول افسر کو میری ذات میں وی آئی پی کی خصوصیت نظر نہ آئی۔ وہ جھپٹ کر میرے پاس آیا' اور رشک و شبہ سے لبریز لہجے میں پوچھنے لگا۔

"کیا آپ وی آئی پی ہیں؟"

میں نے شرماتا کہا' "وہ کیا بلا ہے؟"

"Very Important Person" اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر میرے علم میں اضافہ کیا۔

"جی نہیں' میں تو اپنے کو ایسا نہیں سمجھتا۔" میں نے اقبال جرم کیا۔

"پھر آپ یہاں کیوں آ گئے؟ عوامی لاؤنج میں تشریف لے جائیں۔" افسر نے حکم دیا۔

میں تو تعمیل حکم کے لیے تیار ہو گیا' لیکن عین اس وقت میرا پی۔ اے آڑے آ گیا۔ معلوم نہیں کہ اس نے پروٹوکول افسر سے کیا بات چیت کی کہ وہ بیچارہ مجحوب سا ہو کر میرے پاس آیا' اور بولا۔ "سر' میں معافی کا خواستگار ہوں۔ آپ نے اپنی اصلیت چھپا کر مجھے بیحد شرمندہ کیا۔"

میں نے جواب دیا۔ "بھائی کون وی آئی پی اور کہاں کا وی آئی پی؟ شرمندگی تو ان

حضرات کو لاحق ہونا چاہیے' جو اپنے آپ کو سچ مچ وی آئی پی سمجھ بیٹھتے ہیں۔"
یہ سن کر نوجوان افسر مسکرایا' اور بولا۔ "جناب آپ کس دنیا کی بات کر رہے ہیں۔

اب تو وی آئی پی بھی کسی شمار قطار میں نہیں رہے' کیونکہ انکے سر پر وی وی آئی پی کا درجہ بھی مسلط ہو گیا ہے!"

Very Very Important Person

کون کہتا ہے کہ بیوروکریسی کے سائے تلے وطن عزیز تیز رفتاری سے روز افزوں ترقی کی راہ پر گامزن نہیں؟

اپنی اصلاحات کو نافذ کرنے کے لیے صدر ایوب نے جو کمیشن اور کمیٹیاں قائم کیں' ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

○ اصلاحی کمیشنوں کی فہرست

(۱) زرعی اصلاحات کمیشن
(۲) جہاز رانی کمیشن
(۳) اصلاح قانون کمیشن
(۴) انتظامیہ کی تنظیم نو کے لیے کمیٹی
(۵) کمیشن برائے قومی تعلیم
(۶) صدر مقام کے محل وقوع کی کمیٹی
(۷) تحقیقاتی کمیشن برائے قرضہ جات
(۸) غذائی و زرعی کمیشن
(۹) سائنس کمیشن
(۱۰) تنخواہ و ملازمت کمیشن
(۱۱) کمپنی قانون کمیشن

(۱۲) طبی اصلاحات کمیشن

(۱۳) کھیل' ثقافت اور نژاد نو کی کمیٹیاں

(۱۴) پولیس کمیشن

(۱۵) آئین کمیشن

(۱۶) قیمتوں کی تعین کا کمیشن

(۱۷) فلمی معلوماتی کمیشن

(۱۸) فالتو افرادی طاقت کمیشن

(۱۹) سماجی برائیوں کا کمیشن

(۲۰) برقی طاقت کا کمیشن

(۲۱) مالیاتی کمیشن

(۲۲) قرضہ جاتی کمیشن

(۲۳) رائے دہی کی کمیشن

(۲۴) قومی آمدنی کمیشن

(۲۵) قومی مالیات کمیشن

(۲۶) اقلیتوں کا کمیشن

(۲۷) نشریاتی کمیشن

(۲۸) پریس کمیشن (یہ بہت پہلے قائم ہو چکا تھا لیکن اس کی رپورٹ مئی ۱۹۵۹ء میں موصول ہوئی۔)

(۲۹) شکر کمیشن (یہ بھی پہلے قائم ہو چکا تھا' لیکن رپورٹ اگست ۱۹۵۹ء میں موصول ہوئی)

(۳۰) شادی و عائلی قانون کمیشن۔

(یہ کمیشن ۱۹۵۴ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کی رپورٹ بھی ۱۹۵۶ء میں موصول ہو چکی تھی لیکن اس پر عمل درآمد مارچ ۱۹۶۱ء میں ہوا)

• صدر ایوب اور ادیب

جب مارشل لاء نافذ ہوا' تو مارشل لاء لگتے ہی ایک روز صبح سویرے قرۃ العین حیدر میرے ہاں آئی۔ بال بکھرے ہوئے' چہرہ اداس' آنکھیں پریشان ------- آتے ہی بولی' "اب کیا ہو گا؟"

"کس بات کا کیا ہو گا؟" میں نے وضاحت طلب کی۔

"میرا مطلب ہے اب ادبی چانڈو خانوں میں بیٹھ کر (Loose Talk) کرنا بھی جرم ٹھہرا۔

"ہاں" میں نے کہا۔ "گپ شپ بڑی آسانی سے افواہ سازی کے زمرے میں آ کر گردن زدنی قرار دی جا سکتی ہے۔"

"تو گویا بھونکنے پر بھی پابندی عائد ہے؟" عینی نے بڑے کرب سے پوچھا۔

میں نے مارشل لاء کے ضابطے کے تحت بھونکنے کے خطرات و خدشات کی کچھ وضاحت کی' تو عینی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ آنسو چھپانے کے لیے اس نے مسکرانے کی کوشش کی' اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کسی قدر لا پروائی سے کہا۔ "ارے بھئی' روز روز کون بھونکنا چاہتا ہے۔ لیکن بھونکنے کی آزادی کا احساس بھی تو ایک عجیب نعمت ہے۔"

میرا اندازہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کے تحت الشعور نے اس روز اس لمحے پاکستان سے کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کوئی باغیانہ خیالات کی لڑکی نہ تھی اور نہ ہی اس کے قلم کی روشنائی میں تخریب پسندی' فحاشی' تلخی اور بے راہ روی کی کالک تھی۔ "میرے بھی صنم خانے" کی مصنفہ زندگی کی چلبلاہٹوں' ہلکی پھلکی رنگینیوں' رعنائیوں' فلرٹیشنوں' ثقافتی تصادموں' سماجی بوکھلاہٹوں اور دل اور دماغ کی فسوں کاریوں میں کچھ حقیقی' کچھ افسانوی' کچھ رومانوی رنگ بھرنے کی ملکہ تھی' لیکن سنسر شپ کے تخیل ہی سے اس کو بڑا شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ کچھ عجب نہیں' اسی جھٹکے کے ردعمل نے اس کے قلم کی

باگ "آگ کا دریا" کی طرف موڑ دی ہو۔
اس کے چند ہفتوں بعد ایک روز میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ اچانک قرۃ العین حیدر' جمیل الدین عالی' غلام عباس' ابن الحسن' ابن سعید اور عباس احمد عباسی تشریف لے آئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے کہا آج کل ہر محفل میں گفتگو کا رخ مارشل لاء کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ادیبوں میں بھی اس موضوع پر مختلف النوع خیال آرائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ چند دوستوں کی رائے ہے کہ اب تک ہمارے ملک میں ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لیے نہ کسی نے سوچا ہے نہ کبھی کچھ کیا ہے۔ آج کل جب کہ یہ فوجی حکومت زندگی کے ہر شعبے میں تطہیر و تعمیر' ترقی و بہبود کے نت نئے اعلان کرتی جا رہی ہے' تو موقع ہے کہ اس بات کو آزما دیکھیں کہ حکومت کے بلند بانگ دعوؤں میں ادیبوں کی ویلفئیر کے لیے بھی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں؟ انہوں نے مزید بتایا کہ بابائے اردو کی موجودگی میں بھی یہ تذکرہ آ چکا ہے اور وہ بھی اس قسم کی کوشش کر دیکھنے کے حق میں مائل نظر آتے ہیں۔
جمیل الدین عالی نے فرمایا کہ آج ہم لوگ یہاں اس سلسلے میں آپ کے ساتھ مشورہ کرنے آئے ہیں۔
اس بات پر مجھے کچھ ہنسی آئی۔ یہ حضرات جو میرے سامنے بیٹھے تھے۔ علم و ادب کی دنیا میں اپنا اپنا نمایاں مقام رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے سامنے میری کوئی خاص حیثیت نہ تھی کہ وہ میرے پاس کسی بات میں مشورہ کرنے آئیں۔ ظاہر ہے کہ وہ میرے پاس صرف یہ ٹوہ لگانے آئے تھے کہ اس قسم کی تجویز پر مارشل لاء کی حکومت کا رد عمل کیا ہو گا۔ میرے خیال میں یہ سعی حاصل تھی۔ کیونکہ نئے فوجی حکمران میرے لیے بھی اسی قدر اجنبی تھے۔ جس قدر کہ ان لوگوں کے لیے میرے دل میں بھی یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ نہ معلوم مارشل لاء کی پٹاری سے کس وقت کوئی ایسا ضابطہ برآمد ہو جائے' جو ادب اور ادیب کی آزادی کو سنسر شپ کی زنجیروں میں بری طرح

جکڑ کر رکھ دے اس نامعلوم خدشے کے پیش نظر یہ بات میرے دل کو لگی کہ اگر ادیبوں کی برادری کسی طرح منظم ہو سکے' تو ممکن ہے کہ یہ اس کی خود حفاظتی کے لیے ایک موثر ڈھال ثابت ہو سکے۔ اس کے علاوہ اگر حکومت کسی وقت واقعی علم و ادب کے شعبوں میں فلاح و بہبود کے کسی منصوبے کا ڈول ڈالے' تو ادیبوں کی ایک اجتماعی تنظیم اس کی وصول یابی اور پیش رفت کے لیے پہلے ہی سے عالم وجود میں موجود ہو۔

کسی قدر بحثا بحثی کے بعد بات اس پر ختم ہوئی کہ سب سے پہلے پاکستان بھر کے ادیبوں کی ایک کنونشن منعقد کی جائے' اور اس میں سب کی متفقہ رائے سے اس سلسلہ میں کوئی اگلا قدم اٹھایا جائے۔

چند روز بعد یہی حضرات دوبارہ تشریف لائے' اور اپنے ساتھ ایک اعلان کا مسودہ بھی لائے جو انہوں نے ادیبوں کی کنونشن بلانے کے متعلق تیار کر رکھا تھا۔ یہ اعلان ۴ دسمبر ۱۹۵۸ء کو آٹھ کنوینرز کے دستخطوں سے جاری کیا گیا۔ دستخط کرنے والوں میں میرے علاوہ ابن الحسن' ابن سعید' جمیل الدین عالی' ضمیرالدین احمد' عباس احمد عباسی' غلام عباس اور قرۃ العین حیدر شامل تھے۔ کنونشن بلانے کا ابتدائی کام مبلغ ۱۸۰ روپے کی خطیر رقم سے شروع ہوا' جو آٹھ کنوینروں نے بیس روپیہ فی کس چندہ دے کر جمع کی تھی۔ ان کے علاوہ بیس روپیہ کا چندہ شاہد احمد دہلوی نے ڈالا تھا' جو کنونشن کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر مقرر کئے گئے تھے۔

اعلان کا شائع ہونا گویا سر منڈاتے ہی اولے پڑنے کے مترادف تھا۔ کچھ ادیبوں کو گلہ تھا کہ یہ آٹھ افراد خود بخود ہی کیوں کنونشن بلانے کے خدائی فوجدار بن بیٹھے ہیں؟ کسی کو شبہ تھا کہ فوجی حکومت کے اشارے پر ایک نئے مافیا نے سر اٹھایا ہے تاکہ وہ دانشوری کے سب انڈوں کو ایک ٹوکری میں جمع کر کے مارشل لاء کی جھولی میں ڈال دے جن شکوک و شبہات کو سب سے بڑی تقویت اس وجہ سے ملتی تھی کہ میں اس زمانے میں صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا سیکرٹری بھی تھا۔ چنانچہ ۴ دسمبر

کے اعلان میں میرا نام کچھ اس طرح کھٹکتا تھا' جس طرح آئینہ خانے میں ایک بچھڑا ہوا سانڈ آ گھستا ہے۔ میرے لیے بڑا آسان تھا کہ ان شکوک کے ازالہ کے لیے میں اس سارے کاروبار سے دستبردار ہو کے الگ ہو جاتا' لیکن اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر میں نے نہایت ایمان داری سے یہی سوچا کہ اتفاق سے آج کل میں جس سرکاری عہدے پر متعین ہوں' تو ادیبوں کی تنظیم کے سلسلے میں اگر اس کا اثر و رسوخ کسی طرح کام میں آ سکتا ہے' تو ضرور کام میں لانا چاہیے۔ اب تقریباً ۲۴ برس کے بعد پیچھے کی طرف دیکھتا ہوں' تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میرا فیصلہ صحیح تھا۔ ہر زمانے اور ماحول کے نشیب و فراز میں میں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کی جو تھوڑی بہت خدمت کی ہے' اس پر مجھے ہمیشہ فخر رہے گا۔ خدمت گزاری کے اس جذبہ میں کسی وقت بھی کوئی ایسی مقصدیت شامل نہیں تھی جو ادب اور ادیب کی شرافت اور شان کے منافی ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ کچھ لوگوں کے دل میں غلط فہمیاں پہلے بھی موجود تھیں اور غالباً اب تک موجود ہیں۔ خدا جانے غلط فہمیوں کی یہ دھند کبھی دور بھی ہو گی یا نہیں۔ میری صفائی میں صرف گلڈ کا کھلا ریکارڈ ہے جو سب کے سامنے موجود ہے۔ اس کے علاوہ میرا ضمیر ہے جو میرے اور میرے اللہ کے سامنے ہے۔ ان دونوں کے پیش نظر مجھے ہرگز کوئی شرمندگی لاحق نہیں ہے۔

۴ دسمبر کے اعلان کے بعد شاہد احمد دہلوی' جمیل الدین عالی اور عباس احمد عباسی اپنے چند دوسرے رفقاء کے ساتھ کنونشن کی تیاریوں میں اس طرف مصروف ہو گئے۔ جو انہی کا حصہ تھا۔ خاص طور پر جمیل الدین عالی کی لگن' انتھک محنت اور نہایت اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیتوں سے ہم سب انتہائی متاثر اور مرعوب ہوئے۔ ان کی دن رات کی لگاتار کوشش اور جدوجہد سے آخر ۲۹' ۳۰' اور ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو کل پاکستان رائٹرز کنونشن کراچی میں منعقد ہوئی۔

کنونشن میں ۲۱۲ ادیب شریک ہوئے جن میں ۶۰ مشرقی پاکستان سے آئے تھے۔ ملک بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہر علاقے اور ہر زبان کے ادیبوں کی اتنی تعداد ایک پلیٹ

فارم پر جمع ہوئی تھی۔ "ہمچو ما دیگرے نیست" پر یقین رکھنے والے احساس' جذباتی' جوشیلے' بے چین اور زودرنج افراد کا اتنا بڑا اجتماع طرح طرح کے تناؤ' کھچاؤ' کشاکشی اور باہمی شکر رنجیوں سے خالی نہ تھا' لیکن مجموعی طور پر سب مندوبین نے کنونشن کی کاروائی میں بھرپور حصہ ر کا اتفاق رائے سے پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد ڈالی دی۔ کنونشن کا کام جن خطوط پر آگے بڑھا' وہ کچھ اس طرح تھے:

۲۹ جنوری پہلی نشست (صبح) ۲۱۲ مندوبین کے جی اے ہال کراچی میں جمع ہوئے۔ پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی نے افتتاحیہ تقریر کی۔ جسیم الدین نے صدارت سنبھالی۔ شاہد احمد دہلوی نے خطبہ استقبالیہ پڑھا' اور آٹھ ابتدائی کنوینزوں کی جماعت ختم کر دینے کا اعلان کر کے باقی ساری کارروائی مندوبین کی صوابدید پر چھوڑ دی۔

حفیظ جالندھری کی تحریک پر مندوبین نے جمیل الدین عالی کو سٹیج سیکرٹری نامزد کیا۔

دوسری نشست (سہ پہر) حامد علی خان صدر جلسہ منتخب ہوئے۔ اسٹیرنگ کمیٹی کی تشکیل پر بحث اور ۵۶ ادیبوں پر مشتمل اسٹیرنگ کمیٹی کا انتخاب۔ نو نو ادیبوں پر مشتمل سات ذیلی کمیٹیاں منتخب ہوئیں۔ پہلی کمیٹی ادارہ منصفین پاکستان کے قیام اور اس کے دستور کی تشکیل کے متعلق۔ دوسری ادیبوں کی بہبود اور تحفظ حقوق۔ تیسری پاکستانی ادیبوں کے داخلی و خارجی مسائل کا مطالعہ اور سفارشات۔ چوتھی کمیٹی کاپی رائٹ قانون اور مصنف اور ناشر کے باہمی امور۔ پانچویں کمیٹی۔ ادیبوں کے دارالاشاعت کا قیام۔ چھٹی کمیٹی قومی اور علاقائی زبان و ادب کی ترویج و ترقی۔ ساتویں کمیٹی۔ متفرقات اور رابطہ۔

۲۸۹۶ قراردادیں جو اطراف ملک سے موصول ہوئی تھیں' ان منتخب شدہ ذیلی کمیٹیوں کے سپرد کر دی گئیں۔

۳۰ جنوری۔ کمیٹیوں کی کارروائی تاشب۔

سہ پہر۔ اسٹیرنگ کمیٹی کا اجلاس۔ اس کے سامنے کمیٹیوں کی منظور شدہ تجاویز پیش ہوئیں۔ ان پر بحث ہوئی اور ترمیمات کی گئیں۔ چند ذیلی کمیٹیوں کا کام جاری رہا۔

۳۱ جنوری۔ پہلی نشست۔ بیگم یوسف جمال حسین صدر منتخب ہوئیں۔

(صبح) گلڈ کے دستور کا مسودہ اجلاس عام کے سامنے پیش ہوا جس پر بحث ہوئی۔ سہ پہر تک تمام قرار دادیں منظور ہو گئیں۔

ساڑھے تین بجے ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء سے ۲۴ اپریل ۱۹۶۰ء تک کے لیے مرکزی مجلس عاملہ کے عبوری انتخاب ہوئے' جس کا نتیجہ یہ تھا:

مرکزی عہدیداران

سیکرٹری جنرل------ قدرت اللہ شہاب

اعزازی خازن------ عبدالعزیز خالد

اعزازی افسر رابطہ------ جمل الدین عالی

حلقہ کراچی سے -------

جمیل جالبی

شاہد احمد دہلوی

شوکت صدیقی

غلام عباس

قرۃ العین حیدر

ابن سعید علاقائی معتمد

طفیل احمد جمالی

حلقہ مغربی پاکستان سے-------

احمد راہی

اعجاز بٹالوی

امیر حمزہ شنواری

سید فارغ بخاری

سید وقار عظیم

شیخ ایاز

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

ہاجرہ مسرور

اشفاق احمد ------- علاقائی معتمد

حلقہ مشرقی پاکستان سے-------

ابوالحسن

ابراہیم خان

دیوان محمد اظراف

ڈاکٹر عبدالحئی

سجاد حسین

سید ولی اللہ

بیگم شمس النہار محمود

عبدالقادر

عسکر بن شیخ

غلام مصطفیٰ

متین الدین احمد علاقائی ------- معتمد

۳۱ جنوری آخری نشست ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے صدارت کی۔

۴ بجے شام گلڈ کا منشور پڑھا گیا۔

جلسہ عام کنونشن ختم ہونے کے اعلان کے ساتھ سٹیج سیکرٹری نے گلڈ کے منتخب سیکرٹری جنرل کو چارج دیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال' ڈاکٹر سجاد حسین' پروفیسر ممتاز حسین اور پروفیسر ابو رشد نے ادبی مقالے پڑھے۔

سیکرٹری جنرل نے تقریر کی۔

مندوبین کی درخواست پر صدر مملکت نے بھی تقریر کی اور گلڈ کو دس ہزار روپیہ کا ذاتی

عطیہ دیا۔

چھاپے کے حروف کنونشن کی روئیداد کے پیچھے وہ گرما گرمی' وہ گھما گھمی' وہ دھماکہ خیزی اور وہ دھماچوکڑی بیان کرنے سے قاصر ہیں جو اس کے ہر جلسے اور ہر کمیٹی کا طرہ امتیاز تھے۔ ہر بحث مباحثے میں گرمی گفتار کی شدت اور حدت کبھی کسی سیاسی تنازعات کا رنگ اختیار کرلیتی تھی' کبھی لسانی اور علاقائی اختلافات کی تلخیاں ابھر آتی تھیں۔ کبھی ذاتیات کی آن اور انا کا شدید ٹکراؤ ہوتا تھا۔ بسا اوقات تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اچانک سر پھٹول شروع ہر کر انجمن سازی کا یہ کھڑاگ درہم برہم ہو جائے گا' لیکن ہر قسم کے لڑائی جھگڑے' گالی گلوچ اور لعن طعن کے بعد جب کنونشن اپنے بنیادی مقصد میں کامیاب ہو کر اپنے آخری اجلاس کے لیے جمع ہوئی' تو مشرقی اور مغربی پاکستان کے کئی مندوبین کے گلے پک پک کر بیٹھ چکے تھے۔ سب سے زیادہ گلا جمیل الدین عالی کا بیٹھا ہوا تھا۔

جب انتخابات کا لمحہ آیا' تو مجھے معلوم ہوا کہ چند سینئر ادیبوں کا ارادہ ہے کہ مجھے گلڈ کے پہلے سیکرٹری جنرل کے طور پر بلا مقابلہ منتخب کیا جائے۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ انجمن سازی کے بکھیڑوں سے نپٹنے کے لیے میری صلاحیت کار نہایت محدود ہے۔ اس کے علاوہ مجھے احساس تھا کہ میری سرکاری پوزیشن کی وجہ سے گلڈ پر خواہ مخواہ بے بنیاد شکوک و شبہات کا غبار بدستور چھایا رہے گا۔ میں نے ان خدشات اور اپنی ذہنی ہچکچاہٹ کا ذکر کئی افراد سے کیا۔ لیکن کوئی اسے میرا عذر لنگ سمجھ کر ٹال دیتا تھا۔ کوئی اسے میری کسر نفسی پر محمول کر کے رد کر دیتا تھا۔ ایک محفل میں تو کوی جسیم الدین نے اپنی بنگالی نما اردو میں آخری فیصلہ اس طرح دے دیا۔ "ارے بھائی اب تم ہم سے بھاگنا چاہے گا بھی تو بھاگ سکے گا نہیں۔ گلڈ نیا بچہ ہے۔ اس کی سواری کے لیے ایک ٹھور گھوڑا درکار ہے۔ تم پریذیڈینٹ ہاؤس میں پلا ہوا اچھا سرکاری درباری گھوڑا ہے۔ تم ہمارے بہت سارے کم آ سکتا ہے۔ اب ہم تم کو بالکل نہیں چھوڑے گا۔" گھوڑے

کا لفظ میں نے فقط اپنی عزت بڑھانے کی خاطر استعمال کیا ہے۔ کوی جسیم الدین نے دراصل کسی اور چوپائے کا نام لیا تھا۔

سیکرٹری جنرل منتخب ہونے سے پہلے ہی میری یہ ڈیوٹی لگ گئی تھی کہ کنونشن کے آخری اجلاس میں صدر ایوب کو ضرور لاؤں۔ میں نے صدر کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر نوازش علی سے اس خواہش کا ذکر کیا' تو اس نے منہ بنا کر' ناک چڑھا کر اپنا سر نفسی میں زور زور سے ہلایا اور کہا۔ "صدر اس قدر مصروف ہیں کہ اس قسم کی ٹٹ پونجیا تقریبات میں جانے کا وقت ہرگز نہیں نکل سکتا۔"

اس زمانے کی نوکر شاہی کے تصور میں ادیب نام کی کوئی قابل قدر جنس عالم وجود میں موجود ہی نہ تھی۔ کچھ افسران بالا شاید چند شاعروں کے نام سے کسی قدر واقف تھے۔ جنہیں حسب ضرورت کسی مشاعرے سے یا تقریب سے طلب کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ادیبوں کی کوئی کنونشن بھی ہو سکتی ہے اور وہاں پر سربراہ مملکت کو بھی مدعو کیا جا سکتا ہے۔ یہ کسی بیوروکریسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ بریگیڈیئر نوازش علی سے مایوس ہو کر میں سیدھا صدر ایوب کے پاس گیا اور اپنی درخواست ان کی خدمت میں پیش کی۔

کسی قدر تامل کے بعد انہوں نے پوچھا۔ "کیا میرا وہاں جانا ضروری ہے؟"

"جی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ضروری تو بالکل نہیں۔ البتہ مناسب ہے۔"

کچھ مزید سوال جواب کے بعد صدر نے کنونشن میں جانا منظور کر لیا اور ٹیلی فون پر بریگیڈیئر نوازش علی کو حکم دیا کہ ان کی مصروفیات میں ۳۱ جنوری کو شام کے چار بجے سے ایک دو گھنٹے کا وقت رائٹرز کنونشن کے لیے مختصف کر دیا جائے۔

اس کے بعد بریگیڈیئر نوازش علی سے جب میری مڈبھیڑ ہوئی' تو ان کا منہ سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ صدر کے کنونشن میں جانے پر تو وہ برہم تھے ہی۔ اب انہیں مزید غصہ تھا تو یہ کہ ایسی ٹٹ پونجیا تقریب میں ہم لوگ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر کیا کریں گے؟

میں نے ان کی ڈھارس بندھائی کہ جو مکھیاں ہم ماریں گے' وہی تم بھی مارتے رہنا' لیکن وہ بدستور بگڑا رہا اور پلٹ کر پوچھا۔ "سکیورٹی کا کیا بندوبست ہو گا؟"

میں نے فی الفور بیوروکریٹ کا روایتی عمامہ سر پر رکھا' اور اپنے لہجے میں برف کی سی خنکی ڈھال کر جواب دیا۔ "یہ میرا دردسر نہیں۔ سکیورٹی والوں سے پوچھو۔" ساتھ ہی تابڑ توڑ ایک ہی سانس میں یہ بھی کہا۔ "اور ہاں بریگیڈیئر۔ صدر کے ساتھ دو سے زیادہ پرسنل سٹاف نہ ہو۔ ہمارے پاس نشستوں کی کمی ہے۔"

اس کے بعد غالباً ملٹری سیکرٹری کے ایما پر سکیورٹی والوں کی بھڑوں کا چھتہ کھل گیا اور ہر وقت سول اور فوجی حفاظتی اداروں کے بھونڈ میرے سر پر بھنبھنانے اور منڈلانے لگے۔ کوئی مارشل لاء والوں کی طرف سے آتا تھا۔ کوئی انٹیلی جنس بیورو کی جانب سے آتا تھا۔ اور کنونشن میں شامل ہونے والے مندوبین کے نام' ولدیت' جائے سکونت' اخلاقی معیار' سیاسی رجحان وغیرہ وغیرہ کے متعلق ایک ہی طرح کے درجنوں سوال پوچھتا تھا۔

اس صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے میں نے اپنی آئی۔ سی۔ ایس کی ٹریننگ کو اپنی ڈھال بنایا' اور ایک پختہ کار بیوروکریٹ کی طرح کسی اشتعال طبع کے بغیر جچے تلے الفاظ میں انتہائی ٹھنڈک اور تحمل سے سب کو یہ کہہ کر نمٹاتا رہا کہ کنونشن میں مدعو ہر مندوب اور رضا کار کو خصوصی نشان امتیاز جاری کئے جائیں گے۔ جس کسی نے یہ بلا پہنا ہوا ہو' آپ کا فرض ہے کہ اس کے احترام اور عزت نفس کا پورا پورا خیال رکھیں۔ حفاظتی تقاضے پورے کرنا آپ کا کام ہے' لیکن اس کارروائی میں کسی غوغائی یا مزاحمانہ یا خلل اندازانہ رنگ کا ہرگز کوئی شائبہ نہ ہو۔

چند سر پھرے سکیورٹی افسر کچھ مزید بحثا بحثی کرنے کی کوشش شروع کرتے تھے تو میں پرانے انگریز افسروں کی طرح دو ٹوک انداز میں یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

"Well officer, that,s all from me"

سکیورٹی والوں کی کشاکشی کسی قدر کم ہوئی' تو کنونشن کے آخری روز ایک اور افتاد آ پڑی۔ میں کے جی اے ہال میں صبح کے اجلاس میں بیٹھا تھا کہ پریذیڈنٹ ہاؤس سے

ملٹری سیکرٹری کا ٹیلی فون آیا۔ اس نے مسرت اور بشاشت سے لبریز لہجے میں مجھے بتایا کہ صدر ایوب کو کل رات سے بخار آ رہا ہے۔ اس لیے آج تیسرے پہر وہ کنونشن کے اختتامی اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ کہہ کر انہوں نے ٹلی فون صدر کے ذاتی معالج بریگیڈئیر ایم۔ سرور کے حوالے کر دیا۔ جنہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ بخار کہ وجہ سے صدر کنونشن میں آنے سے معذور ہیں۔

مجھے صدر کے بخار کی خبر کی صداقت پر یقین تو آ گیا' لیکن مایوسی بھی بہت ہوئی۔ میں صدر کی مزاج پرسی کے بہانے دو بجے پریذیڈنٹ ہاؤس پہنچا۔ وہ ڈریسنگ گاؤن پہنے برآمدے میں ایک آرام کرسی پر دراز تھے اور کچھ فائلیں پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائے اور بولے۔ "میں یونہی بہانہ نہیں کر رہا۔ اس وقت بھی مجھے ۱۰۰ درجہ کا بخار ہے۔"

"نہیں سر' میں تو صرف آپ کی خیریت پوچھنے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تمہارے ادیب لوگ یہ تو نہیں سمجھیں گے کہ میں بہانہ کر رہا ہوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"ادیب جو چاہیں سمجھتے رہیں۔ اگر ڈاکٹر نے آرام کا مشورہ دیا ہے' تو آپ کو ضرور آرام کرنا چاہیے۔"

"کچھ لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ یہ ان پڑھ فوجی آدمی ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے سے بھاگ گیا۔" صدر ایوب نے کسی قدر سنجیدگی اور کسی قدر مذاق سے پوچھا۔

"نہیں سر' میں نے کہا۔ "جب انہیں معلوم ہو گا کہ آپ کو ۱۰۰ درجہ کا بخار ہے۔ تو وہ خواہ مخواہ ایسا کیوں سمجھیں گے' اور اگر کچھ لوگ ایسا سمجھتے بھی ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بخار آخر بخار ہے۔ وہ بھی ۱۰۰ درجہ کا۔"

اپنی طرف سے تو مین نے اپنے لہجے میں کوئی طنزیہ انداز سمونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن میری بات سن کر صدر ایوب کچھ اور ہی طرح مسکرائے اور بولے۔ "خیر' یہ اتنی بڑی کوئی بیماری بھی نہیں ہے۔ نوازش اور سرور خواہ مخواہ فکر مند ہیں۔ میرا خیال ہے میں کنونشن میں آؤں گا۔ کوئی تقریر بھی کرنا پڑے گی؟"

"جی نہیں سر' آپ کی طرف سے ہم نے کوئی تقریر نہیں رکھی۔ آپ اگر ہماری چند باتیں سن ہی لیں' تو ہمارے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔"

"Good" صدر ایوب نے کہا۔ "میں ضرور وقت پر آ جاؤں گا۔"

مجھے یقین تھا کہ جلسے کے اختتام پر سامعین ضرور صدر مملکت سے بھی کچھ سننا چاہیں گے' لیکن میں نے جان بوجھ کر پروگرام میں ان کی کوئی تقریر نہ رکھی تھی' کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو صدر کے سیکرٹری کے طور پر میرا فرض منصبی بنتا تھا کہ ان کی تقریر کا ڈرافٹ تیار کر کے ان کی خدمت میں پیش کرتا۔ لیکن آج میں نے ایک سوچا سمجھا خطرہ مول لے کر چالاکی سے اپنے اس فرض سے دیدہ و دانستہ کوتاہی اختیار کر لی۔ کیونکہ کنونشن میں صدر مملکت کے منہ سے میں اپنے ڈرافٹ کئے ہوئے فقرے نہیں سننا چاہتا تھا' بلکہ دوسروں کی طرح مجھے بھی یہی ٹوہ لگی ہوئی تھی کہ دیکھیں ادب اور ادیبوں کے متعلق صدر ایوب کے اپنے ذاتی خیالات کیا ہیں؟"

کنونشن کے آخری اجلاس میں صدر ایوب ٹھیک وقت پر تشریف لے آئے' ہال میں داخل ہوتے ہی حاضرین نے کھڑے ہو کر تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ تین ماہ سے ایوب خان صاحب صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر ملک بھر میں سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے تھے۔ اس حیثیت میں وہ ہر محفل اور تقریب میں سب سے اعلیٰ مرکزی اور نمایاں نشست پر متمکن ہونا اپنا قدرتی حق سمجھنے لگے ہوں گے۔ غالباً اسی وجہ سے ہال میں داخل ہوتے ہی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے' ناک کی سیدھ سٹیج کی جانب لپکے۔ میرے لیے یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا' لیکن ہمت کر کے میں نے انہیں روکا اور چند دوسرے ساتھیوں کی مدد سے گھیر گھار کر انہیں سامعین کی اگلی صف میں لا بٹھایا۔ جہاں ان کے لیے ایک خالی کرسی محفوظ رکھی گئی تھی۔ صدر ایوب کے کان تو کسی قدر سرخ ضرور ہوئے' لیکن پیشانی پر کوئی بل نہ آیا۔ البتہ ان کا پرسنل فوجی سٹاف بری طرح سٹپٹایا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور وہ ہم سب کو قہر آلود نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

لیکن میرے لیے اس سے بھی زیادہ کٹھن مرحلہ اس وقت آیا۔ جب بابائے اردو نے سٹیج پر آ کر کرسی صدارت سنبھالی۔ سٹیج سیکرٹری کی حیثیت سے جمیل الدین عالی ان کے ایک طرف بیٹھے اور منتخب شدہ سیکرٹری جنرل کے طور پر مجھے ان کے دوسری جانب بیٹھنا پڑا مملکت کے مطلق العنان صدر کو نیچے سامعین کی صف میں بٹھا کر اس کے سیکرٹری کا خود سٹیج پر چڑھ کر براجمان ہونا بظاہر بڑی غیر متوازن اور اہانت آمیز جسارت نظر آتی تھی۔ جو لوگ اس ساری صورت حال پر پہلے ہی سے چیں بجبیں تھے۔ ان کے لیے تو خاص طور پر یہ حرکت زخم پر نمک چھڑکنے کا اثر رکھتی تھی۔ سٹیج پر بیٹھنے کے بعد میں سارا عرصہ بڑی کوشش اور محنت سے صدر ایوب کے ساتھ آنکھیں ملانے سے گریز کرتا رہا۔ ان سے آنکھیں چار کئے بغیر میں وقتاً فوقتاً کن انکھیوں سے انہیں چوری چوری جھانک لیتا تھا' تا کہ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ان کے ذہنی ردعمل کا جائزہ لگتا رہے۔ جب اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی' تو میں نے محسوس کیا کہ صدر ایوب کا چہرہ یکایک سرخ سا ہو رہا ہے۔ میرے دل میں کئی طرح کے وسوسوں نے سر اٹھایا۔ شاید صدر صاحب کا بخار اچانک تیز ہو گیا ہو۔ یا شاید اپنے آپ کو نیچے سامعین کی صف میں اور اپنے سیکرٹری کو سامنے سٹیج کے اوپر بیٹھا ہوا دیکھ کر ان کے مزاج کا پارہ چڑھ رہا ہو۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ کے جی اے ہال کے ایک ٹوٹے ہوئے روشندان سے سورج کی کرنیں براہ راست جناب صدر کے منہ پر پڑ کر انہیں تنگ کر رہی ہیں۔ ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ ایوب خان صاحب نے خود ہی کنونشن کے چھپے ہوئے پروگرام کا کتابچہ کھول کر پھیلایا اور دھوپ سے بچنے کے لیے اسے اپنی آڑ بنا لیا۔ اس کے بعد وہ ہمہ تن کنونشن کی کارروائی سننے میں منہمک ہو گئے۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا خطبہ صدارت انہوں نے نہایت غور سے سنا' اور کئی جگہ دوسروں کے ساتھ مل کر انہوں نے تالیاں بجانے میں بھی حصہ لیا۔ چند مقامات پر جہاں بابائے اردو کو بڑی گرم جوشی سے داد ملی' یہ تھے:

"میں اس نادر اجتماع پر نظر ڈالتا ہوں تو اس میں ایسے ایسے فاضل ادیب دیکھتا ہوں جو

جدید عہد کے تقاضوں' ادبی نکات و رموز اور ادیبوں کے حقوق و فرائض پر زیادہ بصیرت' گہرائی اور دقت نظر سے بحث کرتے ہیں۔ یہ نوجوان ادیب زیادہ مستعد اور باخبر ہیں۔ میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں۔ یہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ بنظر انصاف دیکھا جائے تو ان کے ہوتے ہوئے میں اس منصب کا مستحق نہیں جو آپ نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ غور کرتا ہوں تو اس کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ بڑے بوڑھوں کا ادب ہماری قدیم تہذیب میں داخل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے زمرے میں کچھ دقیانوسی خیالات کے حضرات شریک ہیں جو اپنی آبائی سنت پر قائم ہیں۔ انہوں نے اہلیت سے زیادہ سفید بالوں کا لحاظ کیا ہے......

"ہمارے ادب میں جو جمود پایا جاتا ہے' وہ بہت غور طلب ہے...... اب ہمیں ذہنی اور ادبی جمود کو توڑنے کے لیے وہی کرنا ہو گا جو اٹھارویں صدی میں فرانس میں انسائیکلوپیڈسٹ Encyclopaedists نے کیا تھا۔ اس عالی ہمت' جرت مند مفکروں کی مختصر جماعت نے علم و حکمت کی شمع روشن کی اور اوہام باطلہ اور خیالات فاسدہ کی قلع قمع کرنا شروع کیا کائنات اور انسان' ریاست اور معاشرہ' مذہب اور اخلاق کے قدیم نظریات اور روایات کو بڑی جرات اور آزادی سے عقل و حکمت کی کسوٹی پر کسا' اور جملہ علوم انسانی کو نئی بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس انسائیکلوپیڈیا نے خیالات میں تغیر عظیم پیدا کر دیا اور ملک میں بیداری کی ایک نئی لہر دوڑا دی' مگر حکومت اور کلیسا دو بڑی قوتیں درپے آزاد ہو گئیں۔ طرح طرح کی سختیاں کی گئیں۔ تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ حکومت کی طرف سے کتاب کے چھپنے کی ممانعت کر دی گئی۔ مطبع میں چھپتے وقت مضامین میں تحریف کر کے کتاب مسخ کر دی گئی۔ لیکن باوجود ان تمام موانعات اور مصائب کے ان علم و ادب کے شیدائیوں نے کام جاری رکھا اور ان ہی معتوب اور ستم رسیدہ ادیبوں کے افکار و خیالات نے اس عظیم انقلاب کی راہ ہموار کی جو "انقلاب فرانس" کے نام سے مشہور ہے......

"ہماری قوم میں بھی ہماری ہی زندگی میں ایک ایسا ذہنی انقلاب واقع ہو چکا ہے۔ یہ انقلاب

سر سید احمد خان کی پرخلوص سرفروشانہ مساعی سے عمل میں آیا۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے قوم کے اس مصلح اعظم کو قریب سے دیکھنے اور ان

کے ساتھ کام کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ سر سید نے جس وقت اس منزل میں قدم رکھا تو مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا۔ لعن طعن سب وشتم کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ کفر کے فتوے صادر ہوئے اور ملحد' دجال' کرسٹان کے خطاب عطا ہوئے۔ اس نے سب کچھ سہا اور اپنے عزم پر قائم رہا........"

"ایسے لوگ بنی نوع انسان کے محسن ہیں اور زندہ جاوید ہیں۔ ہمیں ان سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ صرف انجمن بنا دینا' قرار دادیں منظور کرنا یا حکومت سے امداد حاصل کرنا کافی نہ ہو گا۔ ہمیں کام کرنا ہو گا۔ کام سے مراد یہ نہیں جو سرکاری دفتروں میں ہوتا ہے کہ ۹ بجے آئے اور ۴ بجے چلتے بنے' یہ کام جو ہمیں کرنا ہے پوری قوت سے کرنا ہو گا۔ دن رات' گرمی سردی' بارش سے بے نیاز ہو کر کام سے عشق ہونا چاہیے۔ عشق نہیں تو وہ کام نہیں بے گار ہے......"

"سلطنتوں کے تخت الٹ جاتے ہیں۔ قومیں فنا ہو جاتی ہیں۔ تہذیبیں مٹ جاتی ہیں' لیکن ان کے ادیبوں کے کارنامے زندہ رہتے ہیں...... ادیب قوموں کی اصل پونجی ہیں۔ اس پونجی کی حفاظت اور نگہداشت قوم کا مقدس فرض ہے...."

"ادب ایک شریف پیشہ ہے۔ اس کی شرافت پر آنچ نہ آنے دیجئے۔ راستی اور خلوص آپ کا شعار ہونا چاہیے۔ آپ ادب کے ذریعہ قوم کے اخلاق اور کردار بنانے' روشن خیالی پھیلانے اور باطل خیالات اور اوہام کی تاریکی مٹانے میں بہت بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اپنے پیچھے ایسی یادگار چھوڑ جایئے کہ آئندہ نسلیں اس سے فیض حاصل کرتی رہیں۔"

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تقریر کے بعد چار مقالے پڑھے گئے۔ خاص طور پر ڈاکٹر جاوید اقبال کے انگریزی مقالہ جو "ادیب' قوم پرستی اور لادنیت" کے موضوع پر تھا۔ صدر ایوب خان نے نہایت غور اور توجہ سے سنا' مقالوں کے بعد گلڈ کے منتخب شدہ سیکرٹری جنرل کے طور پر میری کچھ کہنے کی باری تھی۔ میں نے بھی انگریزی میں "ادیب اور آزادی تحریر" پر ایک مضمون پڑھا۔ پہلے تو صدر ایوب اپنے سیکرٹری کو گھر کی مرغی دال برابر سمجھ کر کسی قدر بے توجہی سے ساکن و جامد بیٹھے رہے' لیکن کئی فقروں پر جب کئی بار سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا' تو غالباً وہ بھی متوجہ ہوئے اور پھر کسی مقام پر مسکراتے اور کسی جگہ اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ میرے مضمون کے کچھ حصوں کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"اس سے پہلے کہ ادیب اور اس کی آزادی تحریر پر گفتگو کی جائے۔ یہ بہتر ہے کہ اس کی ذمہ داریوں کی وضاحت کر دی جائے----- وہ ذمہ داریاں یہ ہیں:

۱۔ ادیب کسی حیثیت سے بھی قانون سے بالا نہیں ہوتا۔

۲۔ وہ ایک ملک میں رہتے ہوئے کسی دوسرے ملک کا وفادار نہیں ہو سکتا۔

۳۔ کسی ایک نظریہ کی تبلیغ کرتے ہوئے Poetic License شاعری کی آڑ لے کر کسی دوسرے نظریہ پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔

"یہ حدیں تمام اچھے شہریوں پر عائد ہوتی ہیں' لیکن ان کا اطلاق زیادہ شدت سے ادیب پر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر لمحے عوام کی نظروں میں رہتا ہے۔ جو کچھ وہ لکھتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یاد کے خزانے میں گم ہو جائے۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی آواز کی گونج صدیوں تک سنائی دیتی رہے۔ ادیب جتنا زیادہ مقبول ہو گا' اتنا ہی اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ زیادہ ہو گا....... اثر انداز ہونے کی اہلیت ادیب کے

لیے نعمت بھی ہے اور مصیبت بھی۔ مصیبت یہ ہے کہ ادیب جیسے غیر معمولی فرد کو عام ترازو میں تولا جاتا ہے۔ اگر آپ کو ادیب میں کوئی کمی یا کجی محسوس ہو تو لازمی طور پر یہ نہ ادیب کا قصور ہے نہ ترازو کا۔ بلکہ ممکن ہے یہ آپ کے جائزے یا آپ کی نظر کا قصور ہو۔"

"ادیب آپ سے برداشت کی نہیں فہم کی بھیک مانگتا ہے۔ مجسٹریٹ یا پولیس انسپکٹر کا فہم نہیں۔ بلکہ ایک باشعور پڑھنے والے کا فہم۔ ایک اعلیٰ اقدار میں یقین کرنے والے کا فہم۔ ایک سچائی کے پرستار کا فہم۔ آپ چور کو پکڑنے کے لیے کسی دوسرے چور کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ادیب کو سمجھنے کے لیے آپ کو پڑھنے والے کی تلاش کرنا ہو گی۔ سرکاری افسر جو ادیب اور اس کے حقوق کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر ان کا مطالعہ صرف دفتری مثلوں اور یادداشتوں تک محدود ہے اور ان کی زندگی کے کوئی لمحات کتابوں کی قسمت میں نہیں' تو وہ ہمیشہ ادب کو غلط سمجھیں گے اور اسے حقارت سے دیکھیں گے۔ یہ سرکاری افسر کبھی اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے کہ جسمانی سزائیں ضروری نہیں کہ روح کے لیے بھی عذاب ہوں اور یہ کہ دنیا کے تمام قانون اور سائنس کی تمام ترقی وہ زنجیر ایجاد کرنے سے قاصر ہے جو علم اور سچائی کو جکڑ سکے۔"

"ادیب کی آزادی کے لیے دوسرا خطرہ اس حقیقت سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ فاصلے اور وقت کی حدوں سے ماورا ہو کر زندہ رہ سکتا ہے۔ وہ ان جانی اور ان دیکھی حقیقتوں کو چھوتا ہے اور اس کے مستقبل کے خواب ممکن ہے آج کی زندگی کی مصلحتوں اور تقاضوں کے بالکل برعکس ہوں۔ وہ نہ پاگل ہے نہ غدار------ بات صرف اتنی ہے کہ اس کی نظر زیادہ گہری اور اس کے جذبات آپ سے زیادہ شدید ہیں۔ اگر آپ ان بلندیوں کا احساس اپنے ذہن میں نہیں رکھتے تو آپ ادیب کے ساتھ کبھی انصاف نہ کر سکیں گے۔"

"ادیب کی آزادی کو تیسرا خطرہ اس کی اقتصادی پست حالی ہے۔ ہمارے ملک میں کتابیں

اس لیے نہیں بکتیں کہ وہ سستی نہیں اور تعلیم عام نہیں جو خرید سکتے ہیں وہ پڑھتے نہیں۔ جو پڑھنا چاہتے ہیں وہ خرید نہیں سکتے۔ اس تمام تضاد میں صرف ایک شخص فائدہ اٹھاتا جاتا ہے' اور وہ ہے ناشر.....''

''ادیب کی آزادی کے لیے ایک اور بھی خطرہ ہے۔ وہ خطرہ بیرونی ہے ہمارا ملک ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ ہم غریب ہیں۔ ہم نے اپنے معاملات کو الجھا دیا ہے۔ ان الجھنوں کی وجہ سے ہمارے کئی ہمدرد پیدا ہو گئے ہیں۔ مدد دینے والے ہمدرد۔ مذاق اڑانے والے ہمدرد۔ ہمدردی کے پردے میں دشمنی کرنے والے ہمدرد........''

''کوئی ہمارا ذہنی مکہ واشنگٹن بنانے کے درپے ہے۔ کوئی ماسکو اور کوئی کلکتہ۔ ماسکو اور کلکتہ والے ہمارے نظریات کی بیخ کنی (Subvert) کرنا چاہتے ہیں۔ واشنگٹن والے ہمیں اپنی راہ لگانا (Convert) چاہتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے ہمارا ذہنی مکہ صرف پاکستان میں ہے اور کہیں نہیں----- پاکستان کے ادیب عالمی سیاست کی بساط پر مہرے نہیں بننا چاہتے۔ ہم غریب سہی۔ لیکن ہمارا اپنا کوئی ذہنی اور ثقافتی افق ہے۔ کچھ دیر ہمیں اپنے چمن کی بھی سیر کرنے دیجئے.......''

''آج جب کہ مارشل لاء کے ۷۹ ضابطے میرا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنفس نفیس میرے سامنے بیٹھے ہیں-- میں نہایت آزادی سے وہ سب کچھ کہہ سکا ہوں جو ابھی کہہ چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ادیب کے طور پر اگر میری اتنی آزادی برقرار رہے' تو یہ میرے لیے قابل قبول ہے۔''

ہرچہ بادا بادکشتی من ور آپ اندر ختم کے مصداق میں نے بھی آج موقع پا کر آزادی تحریر پر اپنے دل کا کچھ غبار نکال باہر پھینکا۔ تقریر ختم کر کے جب میں واپس اپنی کرسی پر بیٹھا' تو بابائے اردو نے مجھے دو تین بار شاباش شاباش کہا۔ پھر مسکرا کر بولے۔

''اب تمہارا کیا بنے گا؟ ایک تو تم صدر کو نیچے بٹھا کر خود سٹیج پر چڑھے بیٹھے ہو۔ دوسرے ایسی تیز تقریر بھی کر ڈالی۔'' پھر کچھ سوچ کر وہ خود ہی بولے۔ ''خیر کوئی بات نہیں۔

نکال دیئے گئے تو انجمن میں چلے آنا۔"

"آخر میں بابائے اردو نے صدر ایوب کو مخاطب کر کے کہا۔ "محترم صدر پاکستان۔ حاضرین جلسہ آپ سے بھی کچھ ارشادات سننے کے آرزو مند ہیں۔ اگر آپ اس جلسہ سے خطاب فرمانا منظور فرمائیں' تو ہماری عزت افزائی ہو گی۔"

یہ سن کر صدر ایوب نے پہلے تو مجھے گھور کر دیکھا' لیکن پھر یہ دعوت قبول کر کے اٹھ کر سٹیج پر آ گئے اور انہوں نے نہایت خود اعتمادی سے انگریزی میں فی البدیہہ تقریر کی جس کے کچھ حصوں کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

"مجھ سے کہہ دیا گیا تھا کہ مجھ سے کسی تقریر کے لیے نہیں کہا جائے گا اور اسی لیے میں نے اپنی کرسی آرام سے سنبھال لی۔ اب مجھے مدعو کیا گیا ہے کہ میں کچھ کہوں۔ میں تقریر پر تیار نہیں ہوں اور ایسے ایسے اہل علم و فضل سامنے ہیں۔ مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ میں آپ کی کاروائیوں سے بہت متاثر ہوا ہوں...... مجھے یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ آپ کے مقررین میں تخلیقی اور مجاہدانہ خصوصیات نمایاں تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خصوصیات پاکستان کے استحکام اور عظمت کے لیے بہت کام آئیں گی......"

"ایک فوجی کی سادہ زبان میں پاکستان کا نصب العین بہت واضح ہے۔ انسانوں کے لیے بہتر سے بہتر آرام دہ بھرپور اور مکمل زندگی۔ ایک مضبوط اور ترقی پسند معاشرہ..... اس کے لیے ہمیں گہری بنیادوں پر منصوبہ بندی اور مخلصانہ اور مسلسل کام کی ضرورت ہے....... کام کا مطلب یہ نہیں کہ صرف عمال حکومت یا فیکٹریوں کے مزدور کام کریں۔ ہم سے ہر ایک کو کام کرنا پڑے گا۔ ہر کام کرنے والا پاکستان کی مشین میں ایک اہم پرزے کی حیثیت رکھتا ہے....."

کام کے سلسلے میں ہمیں اعتماد ہونا چاہیے کہ ہم درست کام کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ادیب اور دانشور بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ بڑھتی ہوئی مادیت کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹا سکتے ہیں۔ گو اس دنیا میں ہم مادیت کی طرف سے آنکھیں بند

نہیں کر سکتے' مگر اس کی قوت کو اسلامی نظریات کے تابع کر سکتے ہیں......"
"پہلے انسانی جسموں کے لیے جنگیں ہوتی تھیں۔ آج ذہن انسانی کی تسخیر کے معرکے بپا

ہیں۔ اس سلسلے میں آپ پر بہت سے فرائض عائد ہوتے ہیں آپ ذہن جدید کی زبان
میں صالح نصب العین کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔"
"کسی نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے کہ سنسر کے قانون کا وجود تخلیقی قوتوں کو دبا دیتا ہے۔
ہاں یہ خوشگوار بات ہے۔ لیکن اگر کوئی حکومت واقعی حکومت کہلانے کی اہل ہے' تو اسے
آٹھ کروڑ انسانوں کے تحفظ کی ذمہ داری پوری کرنی پڑیگی۔"
"اگر کوئی شخص اپنے وطن میں غیر ملکی مفادات اور غیر ملکی نصب العین کی پرورش کرتا
ہے' تو وہ یقیناً اپنے ملک کے لیے ناقابل برداشت ہے یہ ایک افسوناک صورت حال
ہو گی جس کا مقابلہ بے جھجکے اور مضبوط دل سے کرنا ہو گا۔ خواہ کوئی ادیب اتنا بڑا
ہو کہ وہ مریخ سے باتیں کرے' اگر اس نے مادر وطن کی سلامتی کے خلاف کام کیا
تو میں اپنے فرض میں کوتاہی کروں گا اگر اس سے باز پرس نہ کروں......"
"میری کوشش یہ رہی ہے کہ لوگوں کو اپنے لیے کام کرنے کے مواقع فراہم کرنے
میں ان کی مدد کی جائے۔ آپ خود دیکھیں گے کہ آپ کو اپنے لائحہ عمل پر چلنے سے
کوئی نہیں روکے گا۔ ہر شخص کو سوچنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے
اور ہم آپ کے لیے جو کچھ ممکن ہے کریں گے......"
"آج کے نئے انتظامی ڈھانچے کی زبان بدقسمتی سے مارشل لاء کی زبان ہے۔ لیکن ہم
نے اسے نرم سے نرم تر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے آپ اسے پسند نہ کرتے
ہوں۔ لیکن اگر آپ نیتوں اور طریق کار پر غور کرتے رہیں تو دیکھیں گے کہ ہم بہت
جلد اسے ایک عمدہ لائحہ عمل سے بدل دیں گے' جس سے انصرام ریاست کے ضوابط
مرتب ہو جائیں گے......"
"میں نے آپ کا بہت وقت لیا' مگر میں آج بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ نے جو انجمن

بنائی ہے' اس کے لیے آپ کو بہت سی مشکلات درپیش ہوں گی۔ میں اپنے طور پر کہیں نہ کہیں سے دس ہزر کا انتظام کر لوں گا جو میں اپنی پہلی پیش کش کے طور پر دیتا ہوں' مگر ازراہ کرم یقین کیجئے کہ میں جواب میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا' آپ اسے ملکی مفاد کے لیے جس طرح چاہیں خرچ کریں۔"

اگلے روز جب میں یوان صدارت میں اپنے دفتر پہنچا' تو فضا خوشگوار تھی۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ صدر ایوب کنونشن کے اجلاس سے ہشاش بشاش لوٹے' تو ملٹری سیکرٹری اور دیگر عملے کا موڈ بھی خود بخود سازگار ہو گیا' لیکن رفتہ رفتہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ گلڈ کا سیکرٹری جنرل منتخب ہو کر میں پیچ در پیچ الجھنوں اور غلط فہمیوں کے گرداب میں پھنس گیا ہوں۔

ایک الجھن تو یہ تھی کہ چند ادیبوں کا ایک گروہ جو گلڈ کارکن بھی تھا اور مختلف اوقات اور مقامات پر گلڈ کی تقریبات میں خوش دلی سے شامل بھی ہوتا تھا' لیکن کسی معقول دلیل یا ثبوت کے بغیر یہ حضرات اسی شک و شبہ پر جمے بیٹھے تھے کہ ہو نہ ہو یہ تنظیم کسی خفیہ مقصد کے لیے حکومت کے ایماء پر معرض وجود میں لائی گئی ہے۔ مزمن مرض کی طرح مزمن شک بھی آسانی سے رفع نہیں ہوتا۔ اس کا واحد علاج گلڈ کی ۲۳ سالہ تاریخ ہے جو سب کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح حاضر ہے۔

دوسری الجھن یہ تھی کہ گلڈ قائم ہوتے ہی نوکر شاہی کا ایک مضبوط اور مخصوص عنصر بھی اس کے خلاف تلوار سونت کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مغربی پاکستان کے گورنر نواب کالا باغ سے لے کر کے مرکزی وزیر' سیکرٹری اور مختلف درجوں کے محکمانہ افسر گلڈ کے نام سے بدکتے تھے اور اپنی بساط کے مطابق اس پر کسی نہ کسی طرح کی کاری ضرب لگانے سے نہ چوکتے تھے۔ مختلف لوگوں کے حوالے سے اس کی مختلف وجوہات تھیں۔ بیوروکریسی کا ایک طبقہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ ہم نے صدر ایوب کو کامیابی سے بیوقوف بنایا ہے اور اس کی سرپرستی حاصل کر کے بائیں بازو کے غیر محب وطن دانشوروں کی پشت

پناہی کے لیے ایک خطرناک تنظیم قائم کر رکھی ہے۔ چند بار مجھے کابینہ میں پیش ہو کر گلڈ کی صفائی میں طرح طرح کے احمقانہ سوالات کا جواب بھی دینا پڑا۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ صدر ایوب کے علاوہ ساری حکومت میں اور کوئی گلڈ کا ہمدرد اور بہی خواہ موجود نہ تھا۔

اس کے علاوہ بیوروکریسی کی طبع نازک پر غالباً یہ بات بھی گراں گزرتی تھی کہ یہ دو دو ٹکے کے ادیب کل تک تو کسمپرسی کی حالت میں جوتیاں چٹخاتے پھرا کرتے تھے' لیکن اب اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری تقریبوں میں بھی مدعو ہو کر منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ نہ لباس مناسب' نہ حلیہ درست' نہ آداب مجلس سے آشنا۔ لیکن جہاں دیکھو' وہاں کباب میں ہڈی کی طرح موجود۔ ایک بار میں نے حکومت کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بیوروکریسی کے اونچے طبقہ کو تنخواہ کا کچھ حصہ کتابوں کی صورت میں دینا چاہیے' تاکہ ان کا ذہنی افق کسی قدر کشادہ رہے۔ جملہ افسران کرام نے اسے اپنی توہین سمجھ کر پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ ایک بار کراچی کے ایوان صدر میں تقسیم اعزازات و خطابات کی تقریب منعقد ہوئی۔ حسب معمول وزیروں' امیروں اعلیٰ افسروں اور بیرونی سفیروں کی تعداد سینکڑوں میں موجود تھی۔ صدر کے سیکرٹری کے طور پر اعزاز پانے والوں کی فہرست میرے سپرد تھی۔ میں باری باری سے ہر اعزاز پانے والے کا نام پکارتا تھا۔ ہر شخص اپنی مخصوص نشست سے اٹھ کر آتا تھا۔ اپنا تمغہ یا سند وصول کرتا تھا۔ اور صدر کے ساتھ ہاتھ ملا کر اپنی سیٹ پر واپس چلا جاتا تھا۔ جب سرکاری اعزاز یافتگان کی لسٹ ختم ہو گئی' تو میں نے صدر ایوب کو مخاطب کر کے یہ اعلان کیا:

"مسٹر پریذیڈنٹ' سر۔ سرکاری اعزازات کی فہرست مکمل ہو گئی۔

اب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ براہ مہربانی پاکستان رائٹرز گلڈ کے ادبی پرائز جیتنے والے ادیبوں میں انعامات تقسیم فرمائیں۔"

صدر ایوب نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تو میں نے داؤد اور آدم جی انعامات حاصل

کرنے والے ادیبوں کے نام باری باری پکارے۔ جنہیں ہم نے پہلے ہی سے ایوان صدر میں بلا کر خاص نشستوں پر بٹھا رکھا تھا۔ یہ کارروائی میں نے صدر ایواب کی منظوری سے کی تھی۔ بیرونی سفیروں سمیت حاضرین کے ایک طبقہ نے اس غیر رسمی اعلان کو تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح محسوس کیا اور زور زور سے تالیاں بجا کر اس کا جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا' لیکن نوکرشاہی کے پٹے ہوئے مہرے جو اپنی انا کی سلوں کے نیچے دب کر اور آداب و رسوم اور قواعد و ضوابط کے سرخ فیتے میں بے دست و پا ہو کر لکیر کے فقیر بن چکے تھے۔ اس اعلان کو سنکر دم بخود رہ گئے۔ ان کے نزدیک تقسیم اعزازات کا تقدس پامال ہو گیا تھا اور ادیبوں کی ایک مشتبہ تنظیم پر سرکاری پروٹوکول کی عزت و حرمت بلاوجہ قربان کر دی گئی تھی۔ اس وقت تو وہ خون کا گھونٹ پی کر بھیگی بلی بنے بیٹھے رہے' لیکن ایک سال کے اندر اندر انھوں نے کچھ ایسی ریشہ دوانیاں کیں کہ آئندہ کے لیے ایسی ہر تقریب میں اعزازات کی فہرست پڑھ کر نام پکارنے کا استحقاق صدر کے سیکرٹری سے چھین کر کیبنٹ سیکرٹری کے سپرد کر دیا۔ اس وقت سے آج تک یہی سسٹم رائج ہے۔

اگلی بار ہماری درخواست پر پھر صدر ایوب نے گلڈ کے ادبی انعامات اپنے ہاتھ سے تقسیم کرنا قبول کر لیا۔ اس بار ہم نے اس مقصد کے لیے راولپنڈی کے ایوان صدر میں ایک سادہ سی تقریب منعقد کی۔ انعام جیتنے والوں میں "ہفت کشور" کے مصنف جعفر طاہر بھی شامل تھے۔ وہ پاکستان کی فوج میں بے کمیشن کے افسر تھے۔ جب وہ انعام لینے آئے تو فوجی وردی میں ملبوس تھے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے بڑی خندہ پیشانی سے ان کی پذیرائی کی' اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جعفر طاہر سے ان کا حال احوال پوچھتے رہے۔ میں بھی نزدیک ہی کھڑا تھا۔ فیلڈ مارشل نے فخریہ انداز سے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور مجھے مخاطب کر کے بولے۔ "تم نے دیکھا' فوج میں بھی کتنے پڑھے لکھے آدمی ہوتے ہیں۔"

جعفر طاہر نے ادبی زبان سے کہا: "جی ہاں' حضور۔ نان کمشنڈ رینک تک ہی رہتے ہیں!"

اسی طرح کی ایک تقریب "اداس نسلوں" پر عبداللہ حسین کو بھی انعام دیا گیا تھا۔ چند روز بعد مجھے مغربی پاکستان کے گورنر نواب کالا باغ کا ٹیلی فون آیا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ "بھائی شہاب' یہ ہمارے محترم صدر صاحب کس کنجر خانے میں پڑ گئے ہیں؟"

میری درخواست پر انہوں نے وضاحت فرمائی۔ "میرا ہوم ڈیپارٹمنٹ اور پولیس کا محکمہ بڑا سیخ پا ہو رہا ہے کہ ہمیں پوچھے بغیر جناب صدر مملکت کس چکر میں پڑ گئے ہیں؟"

میری مزید درخواست پر انہوں نے مزید وضاحت کی۔ "وہ جو "اداس نسلیں" نام کی لچر بکواس ہے' اسے فحاشی کے الزام پر ضبط کر کے مقدمہ دائر کرنے کی مکمل تیاری تھی۔ اب جناب صدر نے اپنے دست مبارک سے اسے انعام دے مارا ہے۔ اب ہم کریں تو کیا کریں؟ بھائی شہاب' ہم لوگ بھی یہاں صدر صاحب کے خیر خواہ ہی بیٹھے ہیں۔ ایسے نازک معاملوں میں کبھی ہم سے بھی پوچھ لیا کریں۔"

نواب کالا باغ اور بیوروکریسی کے کل پرزوں نے صدر ایوب خان کو بار بار یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ حکومت کی سرپرستی کا فائدہ اٹھا کر گلڈ کے زیر سایہ بہت سی خطرناک اور ناپسندیدہ شخصیات کی پرورش ہو رہی ہے۔ ان میں فیض احمد فیض' احمد ندیم قاسمی' شہید اللہ قیصر' شوکت صدیقی' عبداللہ حسین وغیرہ کے نام سر فہرست تھے' اس کے برعکس صدر کے قریب میں ہی ایک ایسا تن تنہا فرد تھا' جو انہیں یہ باور کرانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا کہ گلڈ کے ۱۲۰۰ ممبروں میں ابوالاثر حفیظ جالندھری' نسیم حجازی' الطاف حسین قریشی اور منشی عبدالرحمٰن جیسے فعال اراکین بھی شامل ہیں۔ لطیفہ کے طور پر میں نے انہیں بتایا کہ ہمارے کچھ ممبر ایسے ہیں کہ جس اجلاس میں خواتین موجود ہوں وہ اس میں شامل نہیں ہوتے' بلکہ کرسیاں نکال کر باہر برآمدے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ ممبر ایسے بھی ہیں کہ اگر خواتین موجود نہ ہوں تو وہ اجلاس کے قریب تک نہیں آتے۔

"تم خود کس گروپ میں شامل ہو؟" صدر ایوب نے ہنس کر پوچھا۔

"اس کا دارومدار خواتین پر ہے۔" میں نے بھی مذاقاً کہا۔ سچ دھج ٹھیک ہو تو اجلاس میں شامل ہوتا ہوں۔ ورنہ شرفا کے پاس برآمدے میں آ بیٹھتا ہوں۔"

جب تک میں صدر ایواب کے قرب و جوار میں موجود رہا' اس قسم کے اللے تللوں سے گلد کے متعلق متوازن تاثرات قائم رکھنے کے لیے حسب توفیق کوشش کرتا رہا' لیکن جب مجھے ملک سے باہر بھیج دیا گیا' تو یہ ادارہ براہ راست مخالفین کی زد میں آ گیا۔ ایوان صدر میں گلڈ کی تقریبات منقطع ہو گئیں اور جمیل الدین عالی جو ابتدائی چند برسوں میں اس انجمن کو مستحکم کرنے اور فعال بنانے کے روح رواں تھے' طرح طرح کی انتقامی کارروائیوں کی لپیٹ میں آ کر ایک دو بار اپنی ملازمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ گلڈ کے متعلق غلط فہمیوں اور مخالفتوں کا یہ طوفان صرف سرکاری سطح تک ہی محدود نہ تھا' بلکہ اس قسم کا انداز فکر قومی صحافت کے ایک ذی اثر' با رسوخ اور مقتدر حلقے میں بھی جاری و ساری تھا۔ میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ صحافت کے اس شعبے کو ہم اپنا نکتہ نظر باور کرانے میں ناکام رہے۔ ادب کی طرح میں صحافت کو بھی ایک شریف اور باوقار پیشہ سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وقت کا دھارا اور تعصبات کے خس و خاشاک کو اپنے ساتھ بہا لے جائے گا' جو ہم عصری تناؤ اور کھچاؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ ماحول بدل جاتا ہے اور اس ماحول میں کھینچا تانی کرنے والے لوگ بھی پردہ عدم میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد صرف تاریخ کا آئینہ باقی رہ جائے گا۔ جس میں کسی ملمع سازی کے بغیر گلڈ کا وہی عکس نظر آئے گا' جو واقعی اس کا اپنا ہے۔

اس وقت تک کے لیے میری یہی گذارش ہے کہ:

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار تو ام
وگر کشادہ جبینم گل بہار تو ام

ان چند در چند اندرونی الجھنوں اور مشکلات کے علاوہ یونہی بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ ہمارے سر پر بیرونی سطح کی ایک افتادہ بھی نازل ہو گئی۔ گلڈ کے منشور میں درج تھا کہ یہ انجمن کسی صورت میں کسی غیر ملکی حکومت یا ادارے سے کوئی امداد قبول نہ کرے گی۔ یہ شرط ہم نے اس زمانے میں عائد کی تھی' جبکہ ہمارے ملک کا بال بال امریکی امداد کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ ہمارا عام سرکاری یا نیم سرکاری یا سراسر غیر سرکاری چلن یہی بن گیا تھا کہ کسی نئے منصوبے کا ڈول ڈالنے سے پہلے یہ لازمی تھا کہ امریکی یا دیگر بیرونی ذرائع سے مال وسائل کی فراہمی کومٹ کرا لی جائے۔ اس بندھی بندھائی ڈگر سے اپنی آزادی اور خودمختاری کی تشہیر کے لیے ہم نے بیرونی وسائل سے گلڈ کے بے نیازی کا ڈھنڈورا کچھ اس طرح پیٹا کہ یہ نامانوس شور و شغب امریکن سفارت کاروں کے ذوق سماعت پر گراں گزرا۔ وہ اس بات کے خوگر ہو چکے تھے کہ عام طور پر پاکستانی ادارے وجود تو بعد میں آتے ہیں' لیکن ان کے لیے امریکی امداد کا بندوبست پہلے کر لیا جاتا ہے۔ اب گلڈ کی اس مختارانہ لاف زنی کو سن کر انہیں یہی گمان گزرا کہ کنگال ملک کے کنگال ادیبوں نے مل جل کر ایک انجمن بنائی ہے۔ ملک کے بہت سے دوسرے اداروں کی طرح آج نہیں تو کل یہ گلڈ بھی ہمارے سامنے دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جائے گا' لیکن جب ایسا نہ ہوا' تو کچھ امریکنوں کے دل میں یہ شک پیدا ہوا کہ ممکن ہے درپردہ یہ ادارہ روس سے اپنی قیمت وصول کر رہا ہو' کیونکہ ہماری بیوروکریسی اور قومی صحافت کے کچھ حلقے یہ تاثر دے ہی رہے تھے کہ گلڈ دراصل بائیں بازو کے "سرخوں" کی کمین گاہ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اس طرح امریکی سفارت خانے کی نظر میں بھی پاکستان رائٹرز گلڈ ایک تخریبی ادارہ تھا۔

دوسری طرف روسی سفارت خانے سے بھی ہمارا بالکل کوئی رابطہ نہ تھا' بلکہ ایک بار تو وہ میرے ساتھ بہت ناراض ہو گئے۔ بات یہ ہوئی کہ سوویت رائٹرز یونین نے مجھے پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے اپنے ایک سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کی دعوت دی اور ساتھ ہی ایک پیغام بھی مانگا' لیکن یونین کو جو پیغام میں نے بھیجا' اس کا لب لباب یہ تھا۔ "سوویت رائٹرز یونین کے حالیہ سالانہ اجلاس کا ایجنڈا بڑا وسیع اور دلچسپ ہے۔ فی زمانہ دنیا کے کئی حصوں میں آزادی اور خود مختاری کی جو تحریکیں چل رہی ہیں۔ ان میں سے چند ایک ذکر آپ کے ایجنڈے میں شامل ہے' لیکن باقی ایسی ہی بہت سی اہم تحریکوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس تفریق کی وجہ میری سمجھ سے بعید ہے مثال کے طور پر ریاست جموں و کشمیر کے تنازعہ پر غور فرمایئے۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ آپ کی یونین نے اپنے پلیٹ فارم پر اس مسئلہ کو کبھی پیش ہونے کا موقع نہیں دیا۔ غالباً نہ ہی آپ کے سامنے کبھی یہ معاملہ زیر غور آیا ہے کہ سوویت یونین جیسی عظیم پاور جو دنیا کے کئی حصوں میں مظلوم اور محکوم قوموں کے حق خودارادیت اور آزادی کی زبردست علمبردار ہے۔ وہ سکیورٹی کونسل میں کشمیری عوام کو یہ حق دینے کے خلاف بار بار اپنا ویٹو استعمال کرتی ہے؟ اگر میں آپ کے سالانہ اجلاس میں شامل ہوا تو مجھے امید ہے کہ مجھے آپ یہ سوالات اٹھانے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔" یہ پیغام پا کر سوویت رائٹرز یونین نے میرے دعوت نامے کی بات ہی گول کر دی۔ کچھ عرصہ بعد (یہ پیغام بھیجنے کے بعد) ایک سفارتی تقریب میں میری مڈبھیڑ روسی سفیر سے ہو گئی۔ وہ بڑا جھنجھلایا ہوا اور پیچ و تاب کھاتا نظر آتا تھا۔ اس نے نہایت کڑوے الفاظ میں مجھے مطلع کیا کہ سوویت رائٹرز یونین میں میرے پیغام کو نہایت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

کچھ ماہ بعد میں صدر ایوب کے ہمراہ نیپال کے دورہ کھٹمنڈو گیا ہوا تھا۔ وہاں پر ان دنوں چند روسی ادیبوں کا ڈیلیگیشن بھی آیا ہوا تھا۔ ایک سرکاری تقریب میں ان کے ساتھ

میرا سامنا ہوا' تو انہوں نے مجھے اپنے نرغہ میں لے لیا اور کوئی گھنٹہ بھر تک رائٹرز یونین کے نام میرے پیغام کو تکا بوٹی کرتے رہے۔ ان کی تلخ و ترش گفتگو میں بار بار ٹیپ کا بند یہی آتا تھا کہ میں امریکنوں کے ہاتھ بکا ہوا پٹھو ہوں۔ میرا انداز فکر شاہانہ سامراجیت سے بری طرح آلودہ ہے اور میرا دماغ سوویت یونین کے خلاف امریکی جارحانہ پروپگنڈے کے دھوون میں پوری طرح دھلا ہوا ہے' اس بے سرو پا الزام تراشی سے کسی قدر آزردہ ہو کر میں ایک طرف کو ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نیپال کی ہوائی فوج کے کمانڈر انچیف کی بیوی لپک کر آئی اور ڈوگری زبان میں مجھے اس طرح الگ تھلگ گم سم بیٹھنے کی وجہ پوچھنے لگی۔ یہ جموں کے مضافات کی ایک پڑھی لکھی' طرحدار ڈوگرہ خاتون تھی اور پرنس آف ویلز کالج جموں کے ناطے سے مجھے جانتی تھی۔ میں نے اسے روسی ادیبوں کی تلخ نوائی سے آگاہ کیا' تو وہ کھلکھلا کر ہنسی جیسے پہاڑی جھرنا پھوٹتا ہے۔ پھر ڈوگری زبان میں اس نے مجھے دو بھینگوں کا قصہ سنایا' جس سے سلیس اردو میں یہ نتیجہ اخذ ہوتا تھا کہ اگر امریکی بھینگا تمہیں روس کی گود میں بیٹھا دیکھتا ہے اور روسی بھینگے کو تم امریکہ کی گود میں نظر آتے ہو' تو یقین جانو کہ تم واقعی پاکستان میں ہو!

پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جنرل کے طور پر مجھے دو بار منتخب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس ابتدائی دور میں گلڈ کی تنظیم و تعمیر کا سہرا دراصل جمیل الدین عالی کے سر ہے۔ اپنی نوابانہ کجلاہی' شاعرانہ نازک' مزاجی' جبلی زودرنجی' ذکی الحسی اور طبعی لاابالی پن کے باوجود انہوں نے جنون کی حد تک دھن' لگن اور خلوص کے ساتھ گلڈ کے لیے انتھک کام کیا۔ طرح طرح کے نامساعد حالات میں انہوں نے ہر قسم کی مخالفت اور مزاحمت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اس معرکہ آرائی میں انہیں انواع اقسام کے مصائب اور اذیتوں سے بھی گزرنا پڑا۔ ایک بار تو وہ اسی کش مکش میں کچھ عرصہ کے لیے اپنی ملازمت تک سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن گلڈ کے لیے ان کے جذبہ خدمت میں کوئی کمی

نہ آئی۔ میں نہایت ایمان داری سے اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ گلڈ کے ادارے سے عالی صاحب نے اپنی ذات کے لیے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

رائٹرز گلڈ جب وجود میں آیا' تو اس کے منشور کے مطابق ہمارے عزائم نہایت بلند تھے۔ میں اپنی بے توفیقی اور عدم صلاحیتی کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہم انہیں پورا کرنے میں بڑی حد تک ناکام رہے۔ ان ناکامیوں میں سرفہرست گلڈ اشاعت گھر ہے۔ یہ قائم تو ہوا تھا اور غالباً بیس بائیس کتابیں شائع بھی ہوئی تھیں' لیکن اس سے آگے نہ چل سکا۔

"ہم قلم" کے نام سے گلڈ کا اپنا ادبی رسالہ بھی جاری ہوا تھا' لیکن تھوڑا سا عرصہ چل کر بند ہو گیا۔

اکیڈمی آف فرانس کے خطوط پر ہم نے پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کا منصوبہ بھی تیار کیا تھا لیکن اس پر بھی کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ ابھی حال میں اسلام آباد میں اکیڈمی آف لیٹرز کے نام سے جو ادارہ قائم ہوا ہے۔ اس سے ہمارے منصوبے کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں موجودہ اکیڈمی آف لیٹرز بظاہر ایک رسمی سی محکمانہ کارروائی نظر آتی ہے جو ایک ادنیٰ ملحقہ ڈیپارٹمنٹ (Minor Attached Department) یا بلدیاتی سطح پر ادبی میونسپل کمیٹی درجہ سوئم کی حیثیت رکھتی ہے۔ موجودہ صورت میں یہ ادارہ محض وقت اور وسائل کا ضیاع ہے۔

ادیبوں کے لیے گروپ انشورنس فراہم کرنا بھی گلڈ کے اہم مقاصد میں شامل تھا' تاکہ بیماری کی حالت میں علاج معالجہ اور موت کی صورت میں لواحقین کے لیے مالی امداد کا خاطر خواہ بندوبست ہو سکے۔ پریمیم ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس وسائل کی کمی' اور رعایت حاصل کرنے کے لیے انشورنس کمپنیوں کے عدم توجہی سے یہ مقصد بھی عملی جامہ نہ پہن سکا۔

ناکامیوں کی اس طویل فہرست کے مقابلہ میں گلڈ کا کوئی ایسا عظیم کارنامہ نہیں' جو ان کی تلافی کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ لے دے کے ہمارا واحد اثاثہ عزت نفس کا وہ

احساس تھا جو گلڈ کی تنظیم نے ادیبوں کی برادری کیلیے یقینی طور پر اجاگر کیا تھا۔ سونے چاندی کی دنیا میں اس اثاثے کی کوئی وقعت نہیں' لیکن انسانیت کے ترازو میں اس کا

وزن بھاری ہے۔

اس زمانے میں یہ چلن تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں کئی ادیبوں کی ذاتی آزادی ان پڑھ پولیس افسروں اور نیم خواندہ مجسٹریٹوں کے رحم و کرم پر منحصر ہوتی تھی۔ ایسے ادیب نہ کسی اخلاقی جرم میں ملوث ہوتے تھے۔ نہ کسی سیاسی بداعمالی کا ارتکاب کرتے تھے۔ لیکن پولیس کے فرضی روزناموں کی بنیاد پر وقتاً فوقتاً گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیئے جاتے تھے۔ نہ کبھی ان پر مقدمہ چلایا جاتا تھا۔ نہ کوئی فرد جرم عائد ہوتی تھی' لیکن پھر بھی یونہی وہ طویل طویل عرصہ تک کسمپرسی کی حالت میں بے یارومددگار جیلوں میں پڑے سڑتے رہتے تھے۔ ہم نے گلڈ کے نام پر ایسے بے گناہ اور معتوب اور مظلوم ادیبوں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا اور ان کوششوں کے نتیجہ میں درجنوں محبوس ادیبوں کو رہائی نصیب ہوئی۔

گلڈ کے تصورات' مطالعاتی رپورٹوں اور قراردادوں کی بنیادوں پر ہی کاپی رائٹ کا قانون جاری ہوا۔ نیشنل بک کونسل قائم ہوئی اور مرکزی اردو بورڈ بنا جس کا مقصد اردو کو قومی نفاذ کی سطح پر لانا اور تمام تعلیمی اور درسی ادبیات اور کتابیات کو اردو میں منتقل کرنا تھا۔

آدم جی فاؤنڈیشن' داؤد فاؤنڈیشن اور نیشنل بنک آف پاکستان کے مہیا کردہ وسائل سے پانچ ادبی انعامات قائم کئے گئے' جو غالباً اب تک جاری ہیں۔ کئی بار اس بات پر تنقید اور تنقیص اور تنازعات کے طوفان اٹھتے رہے کہ فلاں کتاب کو انعام کیوں ملا اور فلاں کتاب کیوں نظر انداز کر دی گئی۔ ادبی تخلیقات کے معیار کی جانچ پڑتال میں یہ کوئی انوکھا سانحہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ایسے اختلافات کی گنجائش ہمیشہ موجود رہنے کا امکان ہے قطع نظر اس کے کہ جج صاحبان گلڈ نے نامزد کئے ہوں یا کسی اور ادارے نے۔

جن دنوں گلڈ کا قیام ظہور میں آیا' اسی زمانے میں مارشل لاء حکام نے ایک بنک میں

قریباً آٹھ لاکھ روپے کی رقم ضبط کی تھی جو چند سیاستدانوں نے انتخابات میں کام لانے کے لیے خفیہ کھاتوں میں جمع کی ہوئی تھی۔ میری تجویز پر صدر ایوب نے اس رقم سے صدر کا ویلفیئر فنڈ قائم کر دیا' جس کا مقصد غریب اور معذور افراد کی مالی مدد کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے اس ویلفیئر فنڈ میں دو لاکھ روپے کی رقم اس مقصد کے لیے مختصف کرائی کہ اس سے بیماری کی حالت میں معذور ادیبوں' صحافیوں اور فنکاروں کی وقتی مدد اور وفات کی صورت میں حاجت مند لواحقین کی اعانت کی جا سکے۔ ویلفیئر فنڈ کے اس حصہ کو چلانے کے لیے جو کمیٹی بنی' اس کا چنیرمین مجھے مقرر کیا گیا۔ میں نے یہ طریق کار اختیار کیا تھا کہ اگر کسی ادیب کے حالات اور کوائف کی تصدیق کروانی ضروری سمجھی جاتی تھی' تو یہ کارروائی گلڈ کے علاقائی دفتر کے ذریعہ کروائی جاتی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ اس قسم کا امدادی فنڈ اب بھی قائم ہے اور اس میں رقم کی مقدار پہلے سے کئی گنا زیادہ تقسیم ہوتی ہے' لیکن ساتھ ہی یہ بھی شنید ہے کہ انکوائری کا کام انتظامیہ سے لیا جاتا ہے۔ کبھی پولیس والے تفتیش کرنے ادیبوں کے گھروں میں آ گھستے ہیں۔ کبھی مرحوم ادیب کے پس ماندگان کو تھانے میں طلب کیا جاتا ہے۔ اگر یہ صورت حال صحیح ہے' تو میرے نزدیک مناسب نہیں' ادیب کے حالات کی ٹوہ ادیب کے ذریعہ ہی لگانی چاہیے۔ پولیس کانسٹیبل کے ذریعہ نہیں۔

لاہور میں اسمبلی ہال کے پیچھے ایک وسیع احاطے میں جو گلڈ ہاؤس قائم ہے۔ پہلے یہ ایک ہوٹل تھا۔ یہ متروکہ جائیداد تھی اور بہت سے طاقتور اور ذی اثر لوگ اسے مستقل طور پر اپنے نام منتقل کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ گلڈ کے لیے اس قیمتی املاک کو حاصل کرنا آسان کام نہیں تھا۔ یہ داستان طولانی ہے اور اسے بیان کرنے میں خواہ مخواہ کسی قدر خودستائی کا پہلو نکلنے کا اندیشہ ہے۔ بس اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ جمیل الدین عالی کے ساتھ ملکر میں نے کسی قدر تگ و دو کے بعد یہ جگہ بحالیات سے گلڈ کے نام منتقل کروا لی۔ اس کے بعد کئی سال تک اس الاٹمنٹ کے خلاف اپیلیں

چلتی رہیں۔ اس مقدمہ بازی میں ریاض انور نے گلڈ کی طرف سے انتہائی محنت، مستقل مزاجی اور قابلیت سے عدالتوں میں پیروی کی۔ آخری اپیل جیتنے کے بعد عمارت کا پورا قبضہ حاصل کرنا اور بہت سے ناجائز قابضین کو وہاں سے بیدخل کرنا ایک الگ مسئلہ تھا۔ اس مسئلہ کو کامیابی کے ساتھ سلجھانے کے لیے اس وقت کے جنرل سیکرٹری محمد طفیل صاحب نے بڑی محنت اور لگن سے کام کیا۔ اب یہ بیش قیمت جائیداد بلا شرکت غیرے گلڈ کے قبضہ میں ہے۔ خدا کرے کہ صاحب جائیداد ہو کر بھی گلڈ زراور زمین کے روایتی گڑھوں میں گرنے سے محفوظ رہے اور خود کفیل ہو کر ان وسائل کے ذریعے ادیبوں کی فلاح و بہبود کے عظیم الشان منصوبے پروان چڑھائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آئین کے مطابق انتخابات ہوتے رہے اور گلڈ کی تنظیمی رگوں میں پابندی سے نیا خون شامل ہوتا رہا تو اس کا وجود کسی نہ کسی حد تک فعال صورت میں قائم و دائم رہے گا۔

ادھر گلڈ قائم ہوا، ادھر بریگیڈیئر ایف آر خان کی رال اس ادارے پر بری طرح ٹپکنے لگی۔ یہ صاحب اس زمانے میں مارشل لاء کی حکومت کے روح رواں سمجھے جاتے تھے اور بزعم خود صدر ایوب کے لیے وہی خدمت سر انجام دینے کے لیے بے چین تھے جو ڈاکٹر گوئبلز نے ہٹلر کے لیے انجام دی تھیں۔ عہدے کے لحاظ سے وہ وزارت اطلاعات و نشریات کے سیکرٹری تھے، لیکن اثر و رسوخ کے اعتبار سے وہ صدر ایوب کو چھوڑ کر باقی سب وزیروں گورنروں اور اعلیٰ حکام پر دھونس جما کر انہیں اپنی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کرنا اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو برملا فوجی حکومت کا "دماغ" سمجھتے تھے اور کسی نہ کسی طریقے سے اس کا اعلان بھی فرماتے رہتے تھے۔

دماغ تو خیر ان کا اتنا ہی بڑا تھا، جتنا کہ ایک عام انسان کا ہوتا ہے، لیکن ان کا ایک خاص ملکہ یہ تھا کہ وہ دوسروں کے دماغ کرید کرید کر ان کے خیالات کو اپنے استعمال میں لانے کے بادشاہ تھے۔ وزارت اطلاعات و نشریات کا چارج لیتے ہی انہوں نے بیورو آف نیشنل ریکنسٹرکشن (ادارہ قومی تعمیر نو) کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم کر لیا تھا،

جس کا مقصد قوم کی سوچ کو حکومت کی سوچ کے ساتھ ہم آہنگ کرنا تھا۔ جب گلڈ قائم ہوا' تو بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان سچ مچ یہی سمجھے کہ میں نے نہایت چالاکی سے ان کے نہلے پر اپنا دہلا مار دکھایا ہے اور گلڈ کے پردے میں ایک ایسا دھوبی گھاٹ بنا ڈالا ہے۔ جہاں پاکستان بھر کے سارے چھوٹے بڑے ادیب حکومت کی تال پر چھوچھو کر قوم کے اجتماعی دماغ کو حسب فرمائش اور حسب خواہش سرکاری صابن سے دھونے کا فریضہ سر انجام دیا کریں گے۔ میرے اس کارنامے پر انہوں نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور اس ادارے کو اپنے طور پر کام میں لانے کے لیے انہوں نے پہلے تو ترغیب و تحریص کے روپہلی اور سنہری باغ دکھانے کی کوشش کی' جب یہ موثر ثابت نہ ہوئے' تو انہوں نے اپنے معمول کے مطابق زور آزمائی کا طریق کار اختیار کیا اور مختلف طریقوں سے میرا بازو توڑنے مروڑنے کا عمل شروع کیا' لیکن کچھ عرصہ بعد انہیں محسوس ہوا کہ میرا بازو بھی ربڑ کا بنا ہوا ہے' جو نہ چٹختا ہے نہ کھٹکتا ہے نہ ٹوٹتا ہے اس کے بعد بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان نے اپنا رویہ بدل لیا اور اس نے اب اسی بات پر قناعت کر لی کہ وہ ہمارے گلڈ کے دفاتر سے ممبروں کی فہرست حاصل کرتا رہتا تھا اور بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن کے نمائندے ایسے ادیبوں کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے جو معاوضہ لے کر حکومت کی مرضی کے مطابق کچھ مضامین یا پمفلٹ اردو بنگالی' انگریزی اور دوسری علاقائی زبانوں میں لکھنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ صدر ایوب کے آئین اور بنیادی جمہوری نظام کی تشہیر میں ان عناصر نے بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان سے معاوضہ لے کر خاصا کام کیا۔ یہ عناصر نہ گلڈ نے پیدا کئے تھے' نہ گلڈ کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ ادیبوں کی برادری میں ایسا بکاؤ مال ہر دور میں موجود رہا ہے اور رہے گا۔ گلڈ کی رکنیت ان کے لیے نہ کوئی رکاوٹ ہے نہ اعانت۔

اب گلڈ کی عمر ۲۴ سال سے اوپر ہے۔ بعض کے نزدیک یہ ادارہ میرے لیے باعث تمغہ اور بعض کے نزدیک باعث تہمت ہے' لیکن میں اپنے آپ کو نہ تمغہ کا مستحق سمجھتا ہوں' نہ تہمت کا۔ مجھے صرف اس بات پر فخر ہے کہ گلڈ کے قیام میں مجھے کچھ حصہ

لینے کا موقع نصیب ہوا۔

○○○

• صدر ایوب اور صحافت

صدارت سنبھالنے سے پہلے اخبارات میں صدر ایوب کی دلچسپی کا مرکز سٹاک ایکسچینج والا صفحہ ہوا کرتا تھا۔ فوج کی ملازمت کے دوران وہ اپنی بچت سے تجارتی اور صنعتی کمپنیوں کے حصص خریدا کرتے تھے اور ان کے بھاؤ کے اتار چڑھاؤ پر کڑی نظر رکھنا ان کا روز بروز کا مشغلہ تھا۔

ان کے ذہن میں یہ بات پتھر پر لکیر کی طرح جمی ہوئی تھی کہ ہماری معاشرے میں چھپے ہوئے حرف کی بے انتہا قدر و قیمت ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ بڑے سے بڑے جھوٹ کو پرنٹنگ پریس کی مشین سے گزار کر کاغذ پر پھیلا دیا جائے تو کئی لوگوں کی نظر میں وہ قابل قبول اور قابل اعتبار بن جاتا ہے۔ اس لیے وہ مذاق سے پرنٹنگ پریس کو ذہنی جنگ کا اسلحہ خانہ کہا کرتے تھے۔ اقتدار میں آتے ہی صدر ایوب نے وزارت اطلاعات کے سربراہ بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان پر طرح طرح کے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اخبارات کے مالکوں کے تعلیمی اور مالی وسائل کیا ہوتے ہیں؟ جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے ایڈیٹروں اور صحافیوں کی تعلیم و تربیت اور ٹریننگ کا کیا بندوبست ہے؟ چھاپہ خانہ کے مالکوں کو پرنٹنگ پریس کے ناجائز استعمال سے کس طرح روکا جاتا ہے؟ صحافیوں کی ملازمت کی شرائط اور اجرت مقرر کرنے کا کیا طریق کار رائج ہے؟

صدر ایوب اپنا یہ نظریہ دو ٹوک انداز میں بیان کیا کرتے تھے کہ معمولی سے معمولی ڈسپنسری میں مرہم پٹی کرنے اور ٹیکا لگانے کے لیے جو کمپاؤنڈر رکھے جاتے ہیں۔ انہیں اس کام کی پہلے سے باقاعدہ ترتیب دی جاتی ہے' لیکن قوم کے ذہن میں صبح و شام ٹیکا لگانے کے لیے جو لوگ صحافت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے لیے کسی قسم کی ٹریننگ حاصل کرنا بالکل لازمی نہیں۔

بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان صدر ایوب کی نفسیات سے خوب واقف تھے اور ان کی چشم

و ابرو کا اشارہ سمجھنے میں اس وقت فوجی ٹولہ میں سب سے زیادہ ماہر قیافہ شناس تھے۔ مارشل لاء حکومت کے ترجمان کی حیثیت سے وہ ہر چیز میں کیڑے نکالنے کے رسیا تھے' اور زندگی کے ہر شعبہ میں تطہیر اور اصلاح کا راستہ وہ اپنے "فوجی فلسفہ انقلاب" میں تلاش کیا کرتے تھے۔ یہ خود ساختہ فلسفہ انقلاب چند ڈرامائی اقدامات پر مبنی تھا' جو بریگیڈیئر صاحب کے جوش خطابت اور جوش عمل کے بل بوتے پر وقتی ابال کی طرح رونما ہوتے تھے' اور کچھ عرصہ کے بعد گیس چھوڑتی ہوئی کوکا کولا کی بوتل کی طرح بدمزہ ہو کر کاٹھ کباڑ میں پھینک دیئے جاتے تھے۔ سب سے پہلے بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان نے دو منزروالنٹری گروپ کے نام سے چند فیشن ایبل خواتین کو جمع کر کے ایک انجمن بنائی' جن کا نعرہ تھا کہ وہ صرف پاکستانی کھدر پہنیں گی' اور باہر سے آیا ہوا بناؤ سنگھار کا کوئی سامان استعمال نہ کریں گی۔ نام کی حد تک تو بیگم ایوب کو اس انجمن کا سرپرست بنایا گیا تھا' لیکن عملی طور پر وہ ہمیشہ اس قسم کی کارروائیوں سے الگ تھلگ رہتی تھیں۔ اس لیے اس انجمن کی باگ ڈور ایسی سادگی پسند خواتین کے ہاتھ میں رہی۔ جنھوں نے دیسی کھدر میں بھی ایسے ایسے نقش و نگار اور گل بوٹے کھلائے کہ ایک ایک لباس کی قیمت ریشم و کمخواب سے باتیں کرنے لگی۔ "سادگی اپناؤ کی یہ تحریک تھوڑا سا عرصہ چند وزیروں اور سیکرٹریوں کی فیشن ایبل بیگمات کے دم قدم سے آراستہ و پیراستہ دیوان خانوں میں چلی اور پھر اپنے آپ خاموشی سے دم توڑ گئی۔ بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان کو گلہ تھا کہ ملک کا پریس اس قدر بے حس ثابت ہوا کہ اس نے اس انقلابی تحریک کی خاطر خواہ پذیرائی تک نہ کی۔

اس کے بعد بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان نے فوجی انقلاب کا بول بالا کرنے کے لیے ایک اور ہتھکنڈا استعمال کیا۔ انھوں نے کسی نہ کسی طرح صدر ایوب کو قائل کر لیا کہ ملک میں سب خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ وزیروں اور سیکرٹریوں وغیرہ کی موٹر کاروں پر جھنڈے لہرائے جاتے ہیں۔ اس سے عوام اور حکومت کے نمائندوں کے درمیان فاصلہ

بڑھتا ہے اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ کابینہ کی ایک میٹنگ میں کافی تلخ بحثا بحثی اور ردوکد کے بعد وزیروں اور سول افسروں کی کاروں سے تمام جھنڈے اتار لیے گئے۔

بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان کے نزدیک پرانے اور بوسیدہ سیاسی نظام کے تابوت میں انقلاب کی یہ آخری کیل تھی' لیکن رفتہ رفتہ جب یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ اس فیصلے سے بریگیڈیئر صاحب کی اپنی ذات کے علاوہ اور کسی کا اعتماد نفس بلند نہیں ہوا' تو بہت جلد وزیروں اور افسروں کے جھنڈے ازسر نو اپنی اپنی کاروں پر اسی آب و تاب سے لہرانے لگے۔ اس پر بھی ایف۔ آر۔ خان کے دل میں یہی خیال پیدا ہوا کہ اتنا عظیم انقلابی اقدام بھی قومی پریس کی سرد مہری' بے رخی اور عدم توجہی سے ملک میں اپنا جائز مقام حاصل نہ کر سکا۔

صدر ایوب کو شکایت تھی کہ پاکستان کا پریس بہت زیادہ زودحس ہے۔ اس کے برعکس بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان کے نزدیک قومی پریس بے حسی کا شکار تھا۔ مارشل لاء حکومت کے چند دوسرے اراکین کا خیال تھا کہ پاکستان پریس متلون مزاج ہے۔ موقع و محل دیکھ کر زودحسی اور نازک مزاجی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ اور جب جی چاہتا ہے بے رخی اور بے حسی اختیار کر لیتا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ صبح سویرے آنکھ کھلتے ہی حکومت کے چھوٹے بڑے سب اراکین سب سے پہلے روزنامہ اخبارات کی سرخیوں سے دوچارہ ہوتے ہیں۔ کہیں سرکاری توقعات اور خواہشات میں تضاد اور تصادم نظر آتا ہے' کہیں ذاتی احساسات ابھرتے ہوئے یا کچلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے سرکاری عہدہ داروں کی اکثریت پریس کی روش میں پریس کے معیار کو اپنے اپنے داخلی پیمانے سے ناپنے کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔

اس صورت حال کے پیش نظر بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان نے اپنے نو ساختہ بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن میں چند لوگوں کو ٹاسک فورس کا نام دے کر انہیں یہ کام تفویض کیا کہ وہ پاکستانی پریس کے نفسیاتی اور دیگر احوال و کوائف پر جلد از جلد ایک مطالعاتی رپورٹ پیش کریں۔ یہ رپورٹ میری نظر سے تو نہیں گزری' لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس

ٹاسک فورس نے تحقیق و تفتیش کا جو پہاڑ کھودا اس میں سے صرف پریس کمیشن کی چوہیا برآمد ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بریگیڈیئر صاحب کی زبان پر ہمہ وقت "پریس کمیشن" کی اصطلاح تکیہ کلام کی طرح جاری ہو گئی اور اب جہاں کہیں اخبارات کے متعلق کوئی سوال اٹھتا تھا۔ وہ نہایت وثوق سے سب کو پریس کمیشن کی رپورٹ کے آنے تک انتظار کرنے کا مشورہ دیتے تھے' جس کے بعد ان کے زعم میں پاکستان میں اپنے عہد سعادت کا دور شروع ہو جائے گا۔

پریس کمیشن کا تاریخی پس منظر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ کمیشن ستمبر ۱۹۵۴ میں قائم ہوا تھا۔ ہائی کورٹ کا ایک سابق جج اس کا چیئرمین تھا اور کمیشن کے ۱۳ ممبروں میں سے ۹ ممبر اخبارات کے ایڈیٹروں پر مشتمل تھے۔ اس زمانے میں پاکستان ایڈیٹروں کی دو متوازی اور عام طور پر متحارب تنظیمیں کام کر رہی تھیں۔ ایک کا نام آل پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس تھا اور دوسری کونسل آف پاکستان ایڈیٹرز کہلاتی تھی۔ ان ۹ ایڈیٹروں میں سے کچھ ایک تنظیم کے ساتھ وابستہ تھے۔ کچھ دوسری تنظیم کے ساتھ منسلک تھے۔ غالباً اس وجہ سے کمیشن میں صحافت کے بیشتر معاملات پر اتفاق رائے کا شدید فقدان رہا اور پورے چار برس تک پریس کمیشن کے کام میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

مارشل لاء کے نفاذ سے ایک ماہ قبل حکومت نے ستمبر ۱۹۵۸ء میں پریس کمیشن کی تنظیم نو کی۔ نئی تشکیل کے مطابق کمیشن کا ایک چیئرمین اور ۵ ممبر مقرر ہوئے۔ ان ۵ ممبروں میں صرف ایک پیشہ ور صحافی شامل تھا' جسے ممبر سیکرٹری کے طور پر نامزد کیا گیا تھا۔ یہ کمیشن فوجی حکومت کی تخلیق نو نہ تھا' لیکن مارشل لاء لگتے ہی بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان نے اسے اس کے کام میں اس طرح مہمیز کرنا شروع کیا کہ اس نے اپنی رپورٹ آٹھ ماہ کے اندر اندر مکمل کر لی۔ بریگیڈیئر صاحب اپنی دھن کے آدمی تھے۔ انہوں نے پریس کمیشن کی رپورٹ کو آڑ بنا کر وزارت اطلاعات کے لائحہ عمل کو ایسے خطوط

پر استوار کیا جس سے ایک اچھا نتیجہ برآمد ہوا اور دوسرا نہایت برا۔
اچھے نتیجے سے میری مراد
The Working Journalists (Conditions of Service) Ordinance No. XVI of 1960

ہے جو ۲۷ اپریل کو صدر پاکستان نے جاری کیا۔ اس آرڈیننس کے طفیل ملک میں پہلی بار کارکن صحافیوں کی تنخواہ، الاؤنس اور شرائط ملازمت کو کسی قدر تحفظ حاصل ہوا۔ ویج بورڈ قائم ہوئے اور پیشہ ور صحافیوں کے لیے پراویڈنٹ فنڈ جاری کرنا قانونی پابندی قرار پائی۔

اس خوش آئند آرڈیننس سے صرف ایک روز پہلے ۲۶ اپریل ۱۹۶۰ء کو وہ قانون نافذ ہو چکا تھا، جو
The Press and publications Ordinance No. XV of 1968 کے نام سے موسوم ہے اور پاکستان کی دنیائے صحافت میں بجا طور پر "کالے قانون" کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس وقت مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ مجموعی طور پر ملک بھر کے اخبارات احتیاط پسندی سے کام لے رہے تھے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے۔ کہیں بھی کوئی ایسے حالات رونما نہ ہو رہے تھے جو اس سخت گیر قانون کے نفاذ کو صحیح یا حق بجانب ثابت کر سکتے۔ دراصل فوجی زندگی کی تربیت اور تجربات نے صدر ایوب کو زیادہ تر "لیں سر" اور "جی ہاں" سننے کا خوگر بنا رکھا تھا۔ ان کے نکتہ نظر پر معمولی سی تنقید یا انحراف ان کو چیں بجبیں کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ صحافت کے متعلق چند ایسے تعصبات بھی تھے جو زمانہ دراز سے ان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ اپنے دوسرے اصلاحی منصوبوں کی طرح وہ جرنلزم کے پیشے کو بھی بزعم خود مثبت خطوط پر منظم کرنے اور سنوارنے کے خواہشمند تھے۔ بدقسمتی سے بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان کی ذات میں ان کو ایک ایسا باصلاحیت اور اطاعت پذیر سیکرٹری اطلاعات مل گیا، جو ان کے ذرا سے اشارے پر بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لیے ہر وقت کمر بستہ کھڑا

رہتا تھا۔ جب اس نے وزارت اطلاعات کی پٹاری سے پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی ننس کا مسودہ برآمد کر کے کابینہ میں منظوری کے لیے پیش کیا' تو سب نے بڑی خوش دلی سے اس پر آمنا و صدقنا کہا۔ اس وقت کابینہ میں بیشتر وزیر ایسے تھے جنھوں نے بڑے بڑے سول اور ملٹر عہدوں کی پناہ میں زندگی گزاری تھی اور ملک میں ایک ایسا پریس جو ان کی ذات اور وزارت کو ہدف تنقید نہ بنا سکے۔ ان کے لیے انتہائی مرغوب خاطر تھا۔

اپنی تمام تر ناقابل قبول سختیوں اور پابندیوں کے باوجود اس قانون میں صرف ایک مد ایسی تھی جسے کسی قدر اطمینان بخش کہا جا سکتا تھا۔ وہ یہ تھی کہ چھاپہ خانوں کے زرضانت کی ضبطی وغیرہ کے متعلق تمام امور کا فیصلہ انتظامیہ کی بجائے عدلیہ پر چھوڑا گیا تھا' لیکن تین سال کے اندر اندر حالات نے پلٹا کھایا اور اگست ۱۹۶۳ء میں جب مغربی پاکستان کی صوبائی حکومت نے اسی آر ڈی ننس کو انتہائی ترمیم شدہ حالت میں ازسر نو جاری کیا' تو یہ مد بھی غائب ہو گئی جون ۱۹۶۲ء میں مارشل لاء اٹھ گیا تھا' اور نئے آئین کے تحت بنیادی جمہوریت کے نظام کا ورد شروع ہو گیا تھا۔ مارشل لاء کے دوران انہوں نے مجبوراً اپنے اوپر اوڑھ رکھا تھا۔ زور خطابت سے اپنی جولانی طبع دکھانے کے لیے نئے اور پرانے سیاستدانوں کو اسمبلیوں کے ایوان بھی تازہ تازہ ملے تھے' چنانچہ اسمبلیوں کے اندر اور باہر اور اخبارات کے صفحات پر جو کچھ ظہور میں آیا وہ نارمل حالات میں تو بالکل طبعی' باقاعدہ اور معمولی واقعات تھے' لیکن مارشل لاء کی چھتری کے نیچے چھائے ہوئے جھوٹے سکون میں یہ سارا ہنگامہ انتہائی شدید طوفان نظر آتا تھا حکومت کے اراکین جو پہلے مارشل لاء کے حفاظتی حصار میں بیٹھے تھے۔ اب کھلم کھلا عوام اور صحافت کی بے رحم سرچ لائٹ کے نیچے آ گئے۔ اس صورت حال سے صدر ایوب بھی پریشان تھے اور کابینہ میں ان کے بہت سے رفیق بھی بے حد بوکھلائے ہوئے تھے۔

اس پریشانی اور بوکھلاہٹ کا مجھے براہ راست ذاتی علم ہے۔ اس وقت تک وزارت اطلاعات سے بریگیڈئیر ایف۔ آر۔ خان کا بستر گول ہو چکا تھا اور وہ جی۔ ایچ۔ کیو میں کسی

بے ضرر اہم اور غیر اہم اسامی کی پول میں دھانس دیئے گئے تھے۔ اسکے بعد وزارت اطلاعات کے کانٹوں کی مالا پہلے مسٹر نذیر احمد نے اور پھر سید ہاشم رضا نے یکے بعد دیگرے پہنی۔ مارشل لاء اٹھانے اور نیا آئین نافذ کرنے کے موقع پر اس وزارت کا چارج سنبھالنے کے لیے صدر ایوب کی نگاہ انتخاب مجھ پر پڑی۔ اس وزارت میں قدم رکھتے ہی صدر سے لے کر وزیروں تک فرمائشوں کی وہ بوچھاڑ شروع ہوئی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ کسی کو گلہ تھا کہ اس کی تصویر نہیں چھپی۔ کسی کو شکایت تھی کہ اس کے بیان یا تقریر کا پورا متن نہیں چھپا۔ کوئی کہتا تھا کہ فلاں تنقید غلط ہے اور حکومت کا وقار گرانے کے لیے اچھالی جا رہی ہے۔ عام مخلوق خدا کی طرح کبھی کبھی کچھ وزیر صاحبان بھی وقتاً فوقتاً بیمار پڑتے رہتے تھے۔ ان میں سے چند ایسے تھے کہ اگر ان کی بیماری کی خبر اخبار میں شائع ہو جاتی تھی' تو وہ اسے شرانگیزی کا شوشہ قرار دیتے تھے جو اخبار والے ان کی وزارت ختم کرنے کے لیے خواہ مخواہ چھوڑتے رہتے ہیں۔ اخباری دنیا میں صدر مملکت کی ذات کے ساتھ شائستگی اور احترام کا سلوک روا رکھنے کی رسم عام تھی اور ذاتی طور پر صدر کو کسی انتہائی شدید اور غیر مناسب تنقید کا نشانہ نہیں بنایا جاتا تھا' لیکن جب گوہر ایوب کے نام گندھارا انڈسٹریز کی منتقلی کا کھڑاگ کھڑا ہوا' تو یہ امتیاز بھی اٹھ گیا اور اس معاملے پر نکتہ چینی اورے لے دے کا وہ طوفان برپا ہوا جو اپنی شدت میں بے مثال تھا۔ صدر کے وزیروں اور رفیقوں میں کوئی ایسا نہ تھا۔ جو اس موقع پر انہیں تحمل' تدبر اور ضبط نفس کا مشورہ دے سکتا۔ اس کے برعکس سب لوگ انہیں ایڑ لگا لگا کر اسی راستے پر گامزن رکھنا چاہتے تھے جو انہوں نے میرے خیال میں غلط طور پر اختیار کر رکھا تھا۔ وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب نے ایک خفیہ سی پریس کانفرنس منعقد کی اور اعداد و شمار کی شعبدہ بازی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ گندھارا انڈسٹریز کی تجارتی کارروائی میں ہرگز کوئی پیچیدگی نہیں اور یہ انتہائی کھرا' بے لاگ اور صاف سودا ہے' لیکن ان کی منطق کسی کو قائل نہ کر سکی۔ بلکہ الٹا یہ اثر چھوڑ

گئی کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے جسے چھپانے کی اتنی بھرپور کوشش ہو رہی ہے۔ ایک وزیر نے تو اسمبلی کے ایوان میں کھڑے ہو کر یہاں تک اعلان کر دیا کہ اگر صدر مملکت کا بیٹا گندھارا انڈسٹریز کا حقدار نہیں مانا جاتا' تو کیا اسے کسی یتیم خانے میں داخل کر دیا جائے؟ ہر وزیر اخبار والوں پر حسب توفیق لعن طعن کر رہا تھا کہ گندھارا انڈسٹریز کی آڑ میں قومی صحافت سربراہ مملکت کے وقار کو مجروح اور حکومت وقت کی بنیاد کو کمزور کرنے میں مصروف عمل ہے۔ اس نقار خانے میں طوطی کی آواز سننے کی بھلا کہاں گنجائش تھی؟ پھر بھی میں نے یہی مناسب خیال کیا کہ سیکرٹری اطلاعات کے طور پر اپنا سرکاری اور صدر ایوب کے ساتھ ذاتی خلوص کی بنا پر اپنا اخلاقی فرض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کروں۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں ایک تحریری نوٹ پیش کیا جس میں میں نے نہایت ادب سے صدر محترم کو دو برس پہلے کا ایک واقعہ یاد دلانے کی جسارت کی' جب کہ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے باضابطہ کارروائی کے بعد مرکز کے وزیر صنعت مسٹر ابوالقاسم خان کو چٹاگانگ میں ایک جوٹ مل قائم کرنے کی منظوری دی تھی۔ جب میں نے یہ فائل صدر ایوب کی خدمت میں پیش کی' تو انہوں نے اپنے ہاتھ سے اس پر یہ احکام صادر فرمائے تھے کہ "استحقاق کی بنا پر مسٹر ابوالقاسم یہ کارخانہ لگانے کے جائز طور پر حقدار ہیں' لیکن انقلابی کابینہ کے وزیر کی حیثیت سے ان کا یہ اقدام غلط فہمیاں پیدا کر سکتا ہے۔ اس لیے میں درخواست کروں گا کہ مسٹر ابوالقاسم اس منظوری سے کوئی فائدہ نہ اٹھائیں۔"

اس کے بعد میں نے اپنے نوٹ میں صدر ایوب سے پرزور اپیل کی تھی کہ گندھارا انڈسٹریز کے سلسلے میں بھی اگر وہ اپنے وضع کردہ اس سنہری اصول کو زیر عمل لائیں۔ تو بہت سی غلط فہمیوں کا خود بخود سدباب ہو جائے گا۔

صدر ایوب نے میرا نوٹ پڑھا تو ضرور لیکن اسے بلا تبصرہ میرے پاس ویسے ہی واپس بھیج دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں بات ناگوار گزری ہے۔ رفتہ رفتہ ان کے زیرک اور پرفراست چہرے میں مجھے واضع طور پر یہ آثار بھی نظر آنا شروع ہو گئے کہ

وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے میری پہلی سی افادیت برقرار نہیں رہی۔

اسی زمانے میں میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ایک روز صبح صدر ایوب راولپنڈی سے مری روانہ ہونے والے تھے جہاں انہوں نے دن کے دس بجے نواب کالا باغ اور چند مرکزی وزراء کے ساتھ ایک میٹنگ مقرر کی ہوئی تھی۔ میٹنگ میں حکومت اور اراکین حکومت کے خلاف ملک کے اخبارات کا رویہ زیرِ بحث آنا تھا۔

روانگی سے پہلے صدر نے مجھے فون پر کہا کہ راستے میں وہ میرے ساتھ کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں ان کے ساتھ ان کی کار میں بیٹھ کر مری چلوں۔ ٹھیک آٹھ بجے صبح میں صدر ایوب کی ائرکنڈیشنڈ کار میں ان کے ساتھ مری روانہ ہونے کے لیے بیٹھ گیا۔ اس خنک اور آرام دہ ماحول میں اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پل بھر کے لیے مجھے کچھ اونگھ سی آ گئی ہو میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں صدر ایوب نے مجھے اونگھتے ہوئے تو نہیں دیکھ لیا' لیکن وہ کسی قدر آزردگی سے خفا خفا منہ پھلائے بیٹھے تھے' کیونکہ راولپنڈی سے مری تک سارا راستہ میں گہری نیند سو رہا تھا اور اب ہماری گاڑی مری پہنچ کر گورنر ہاؤس میں داخل ہو رہی تھی۔

"میں باتیں خاک کرتا۔" صدر ایوب نے کسی قدر جھنجلا کر کہا۔ "تم تو گھنٹہ بھر گہری نیند سوتے رہے۔"

جواب میں میرے پاس کچھ بھی کہنے کو نہیں تھا۔ میں نے شرمندہ ہو کر اقبالی مجرم کی طرح اپنی گردن جھکا لی اور خاموش رہا۔

میری شدید الجھن' پریشانی اور ندامت بھانپ کر صدر ایوب کسی قدر پسیجے اور مسکرا کر بولے' "ایسے حالات میں اتنی گہری نیند اسی کو آ سکتی ہے۔ جس کے ضمیر کا بوجھ نہایت ہلکا ہو۔"

میٹنگ کے کمرے میں پہنچ کر صدر ایوب نے غالباً لطیفہ کے طور پر یہ واقعہ سب کو سنایا۔ چند ایک حضرات نے خوشامداً فرمائشی قہقہے لگائے' لیکن نواب کالا باغ اور دو تین وزراء بدستور سنجیدہ رہے اور انہوں نے کن انکھیوں سے کئی بار مجھے بری طرح گھورا۔

حکومت کے متعلق مختلف اخبارات کے رویہ پر گفتگو شروع ہوئی' تو ایک مرحلے پر نواب کالا باغ نے کہا۔ "جناب' میں نے تو صبح کے وقت اخبار پڑھنا ہی ترک کر دیا ہے۔ آج کل اخبارات ہمارے اوپر اتنی گندگی اچھالتے ہیں کہ صبح صبح انہیں پڑھ کر بلڈ پریشر بڑھتا اور طبیعت منغض ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد دن بھر کام ٹھیک طرح نہیں ہوتا۔"

"یہ سن کر وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب نے پوچھا۔ "نواب صاحب' اگر آپ اخبارات کو پڑھتے ہیں تو پھر نیند کیسے آتی ہے؟"

نواب کالا باغ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولے۔ "یہ راز تو مسٹر شہاب سے پوچھیے۔"

مسٹر محمد شعیب نے بھی طنز کا نشتر چلا کر پھبتی اڑائی۔ "ہاں بھئی شہاب۔ یہ گر ذرا ہمیں بھی تو سکھاؤ۔"

ان دونوں حضرات کا یہ طعن آمیز انداز گفتگو سن کر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے صدر ایوب کو مخاطب کر کے گزارش کی۔ "سر' گورنر مغربی پاکستان اور وزیر خزانہ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ انسانی کمزوری کے ایک معمولی سے واقعہ کو آڑ بنا کر وہ مجھے اس طرح طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں۔ ان دونوں کے اس نامناسب رویہ پر میں آپ کی خدمت میں شدید احتجاج کرتا ہوں۔"

نواب صاحب کی عادت تھی کہ غصہ فرو کرنے کے لیے وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اپنی گھنی مونچھوں پر پھریرا کرنا شروع کر دیا کرتے تھے۔ وہ تو ہونٹ بھینچ کر اس عمل میں مصروف ہو گئے' لیکن وزیر خزانہ مسٹر شعیب طیش کھا کر آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے غصے سے کپکپاتی ہوئی آواز میں زور زور سے چیخ کر وزارت اطلاعات اور میری ذات پر بے سرو پا شکایات اور الزامات کا دفتر کھول دیا۔ سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وزارت اطلاعات کا پریس والوں پر کوئی کنٹرول نہیں۔ اس کی وجہ یا نااہلیت ہے یا ملی بھگت ہے۔

نااہلیت کا الزام تو میں بخوشی قبول کر لیتا مگر ملی بھگت کے متعلق میں نے شعیب صاحب سے مزید وضاحت طلب کی کہ اس سے ان کا کیا مطلب ہے۔

جواب میں انہوں نے کئی دور از کار واقعات کا حوالہ دیا جن میں ایک یہ تھا کہ کسی وقت وزیر خزانہ میڈیکل چیک اپ کے لیے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پریس آفیسر کو ہدایت دی تھی کہ یہ بات مکمل طور پر صیغہ راز میں رہے۔ لیکن اس کے باوجود چند اخباروں میں یہ خبر اس طرح شائع ہو گئی کہ وزیر خزانہ قلب کے عارضہ میں مبتلا ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئے ہیں۔ شعیب صاحب کا خیال تھا کہ یہ شر انگیز خبر صرف اس مقصد سے شائع کی گئی تھی کہ ان کو جسمانی طور پر معذور اور نکما ظاہر کر کے عوام کی نظر میں وزارت کے ناقابل اور نااہل قرار دیا جا سکے۔

گرمی گفتار کی رو میں میرے منہ سے یہ جواب نکل گیا کہ "عارضہ قلب تو ایک عام بیماری ہے۔ جو ہم سب کو کسی نہ کسی وقت لاحق ہو سکتی ہے' لیکن ہمارے ملک کے عوام تو اس قدر سیدھے' اطاعت شعار اور فرمانبردار ہیں کہ انہوں نے غلام محمد جیسے مفلوج' معذور اور اپاہج انسان کو عرصہ دراز تک سربراہ مملکت کی کرسی پر برضاو رغبت برداشت کیا۔

ماضی کے دریچے میں جھانک کر آج میں اس واقعہ پر دوبارہ غور کرتا ہوں' تو مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ میرے لیے اس طرح کا جواب دینا غیر ضروری اور نامناسب تھا۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میرا جواب سن کر شعیب صاحب غصے کے مارے کف در دہن ہو گئے۔ کچھ آواز انہوں نے بلند کی۔ کچھ بلند بانگی میری جانب سے اٹھی۔ یہ شور و شعب باہر سنائی دیا' تو صدر کا پرسنل باڈی گارڈ فوراً دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اسے دیکھ کر صدر ایوب کھسیانے سے ہو گئے اور ہم دونوں بھی جھینپ کر خاموش ہو گئے۔ صدر نے اسے حکم دیا کہ وہ باہر جا کر چائے بھجوائے۔

چائے کے بعد پریس کے معاملات پر دوبارہ میٹنگ شروع ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں اس مجلس میں ایک اجنبی کی طرح شامل ہوں۔ قومی پریس پر مضبوط کنٹرول

قائم کرنے کے لیے نواب کالا باغ سے لے کر ہر وزیر باتدبیر اپنی بساط کے مطابق طرح طرح کے نسخے تجویز کر رہا تھا۔ ایک صاحب کراچی کے روزنامہ ڈان پر گرج برس رہے تھے۔ دوسرے صاحب کے غیظ و غضب کا نشانہ لاہور کا روزنامہ نوائے وقت تھا۔ ان بس کی نظر میں یہ دو اخبار سانپ کے مثل تھے جو حکومت پر ڈنگ مارنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ان دونوں اخبارات کے زہریلے دانت نکالنے کے لیے بھانت بھانت کی تبیریں اور تجویزیں پیش ہو رہی تھیں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ "ڈان" اور "نوائے وقت" کو بھی "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کی طرح حکومت کے قبضے میں لے لینا چاہیے۔ اس پر صدر ایوب بگڑ گئے کہ حکومت کے قبضے میں آ کر "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" چل نہیں رہے' بلکہ رینگ رہے ہیں۔ اب مزید اخباروں کو قبضے میں لے کر حکومت کون سا نیا تیر مارے گی؟ اس قسم کا بے ترتیب اور مسمارکن مذاکرہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا اور اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ "ڈان" اور "نوائے وقت" شائع کرنے والی کمپنیوں میں جو سرمایا لگا ہوا ہے۔ اس کے حصے داروں کی فہرست حاصل کی جائے' اور حکومت کے منتخب افراد اور اداروں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ حکمت عملی سے ان حصص کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید کر ان دونوں اخباروں کی شہ رگ اپنے ہاتھ میں قابو کر لیں۔ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک وزارتی کمیٹی بنائی جائے' جس کا فیصلہ بعد میں ہو گا۔

اس ساری بحث و تمحیص اور منصوبہ بندی کے دوران سب نے مجھے ایک اجنبی کی طرح نظر انداز کئے رکھا' جیسے کسی چھوت چھات کی بیماری کے مریض کو الگ تھلگ ایک طرف بٹھا دیا ہو۔ ساری بحثا بحثی میں کسی نے مجھ سے نہ کوئی سوال پوچھا نہ کوئی بات کی۔ جب میٹنگ برخاست ہونے لگی' تو ایک وزیر صدر سے کہا۔ "جناب میری درخواست ہے کہ اس میٹنگ کی کارروائی کابینہ کی روئیداد کی طرح خفیہ رکھی جائے اور یہاں پر جو کچھ کہا اور سنا گیا ہے وہ باہر نہ نکلنے پائے۔"

یہ بات سنتے ہی سب کی نگاہیں بے اختیار میری جانب اٹھ گئیں۔ مجھے غصہ تو بہت آیا'

اور کچھ جلی کٹی سنانے کو جی بھی چاہا' لیکن موقع نہ مل سکا۔ کیونکہ لنچ کا وقت ہو گیا تھا اور سب لوگ صدر ایوب کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کے لیے بے تابی سے منتشر ہو رہے تھے۔ لنچ پر میں بھی مدعو تھا' لیکن ناسازی طبیعت کا بہانہ کر کے میں نے پریذیڈنٹ کے پرسنل سٹاف سے معذرت کر لی اور ایک دوست کی گاڑی میں بیٹھ کر راولپنڈی چلا آیا۔

گھر پہنچا تو چار بجے کا عمل تھا۔ عفت بے چاری پریشان بیٹھی تھی۔ کیونکہ مری سے دو تین بار ٹیلی فون آ چکا تھا' جس میں میرا اتا پتہ پوچھا گیا تھا اور پیغام تھا کہ صدر صاحب نے شام کے چھ بجے مجھے ملنے کے لیے طلب فرمایا ہے۔ میں نے عفت کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور اسی وقت الٹے پاؤں مری کے لیے روانہ ہو گیا۔

شام کے چھ بجے صدر ایوب گورنر ہاؤس کے وسیع و عریض' سرسبز خوبصورت لان میں چہل قدمی کر رہے تھے' مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا اور بولے۔ "آج کا دن تمہارے لیے سخت گزرا۔ زیادہ پریشان تو نہیں ہو؟"

"نہیں سر۔" میں نے جواب دیا۔ "بلکہ مجھے اس بات پر ندامت ہے کہ آج میں دن بھر آپ کے لیے خواہ مخواہ درد سر بنا رہا۔"

کچھ دیر شش و پنج کی حالت میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر میں جی کڑا کر کے حرف مدعا زبان پر لے ہی آیا۔ "سر' میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے کام کی صلاحیت اور افادیت کا گراف اپنی حد کو چھو کر اب تیزی سے نشیب کی طرف گرنا شروع ہو گیا ہے۔"

صدر ایوب نے لمحہ بھر کے لیے ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھا' اور تیزی سے بولے:

Well, go ahead. What are you driving at?

میں نے پوری دل جمعی اور سکون سے کہا: "سر' ایسے حالات میں اصول اور غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ میں مستعفی ہو جاؤں۔"

صدر ایوب چلتے چلتے رک گئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "دیکھو شوہاب میں تمہیں اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی

جو خواہ مخواہ ملازمت سے ہاتھ دھونے کی معقول وجہ بن سکے۔ اس لیے اس خام خیالی کو دل سے نکال دو۔"

صدر ایوب کے اس شفقانہ رویہ کا دل سے شکریہ و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وزارت اطلاعات میں میری پوسٹنگ اب بالکل بعید از کار اور بے معنی ہے۔"

یہ سن کر صدر ایوب کچھ معنی خیز طور پر مسکرائے جس پر مجھے تعجب ہوا اور فرمانے لگے۔

"خیر' اس کے متعلق میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

چند ہفتہ کے بعد انہوں نے خود تو نہیں' لیکن اپنے پرسنل سیکرٹری مسٹر این' اے فاروقی کے ذریعہ مجھے یہ بتا دیا کہ مجھے وزارت اطلاعات سے سبکدوش کیا جا رہا ہے اور میری اگلی تعیناتی بعد میں طے کی جائے گی۔ فاروقی صاحب یہ پیغام لے کر اتوار کے روز دن کے بارہ بجے میرے ہاں تشریف لائے تھے۔ میں نے کہا۔ "آج تعطیل کے روز آپ نے یہ زحمت کیوں اٹھائی؟ یہی بات صدر صاحب مجھے بلا کر یا فقط ٹیلی فون پر ہی بتا سکتے تھے۔"

"صدر صاحب کی آنکھ میں مروت بہت ہے۔" فاروقی صاحب بولے۔ "غالباً یہ ناخوشگوار فیصلہ وہ تمہیں خود نہیں سنانا چاہتے تھے۔"

یہ سن کر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ کہاں کا ناخوشگوار فیصلہ؟ اور کیسی مروت؟ یہی پیشکش تو میں خود ہی چند ہفتہ قبل جناب صدر کی ذات گرامی میں پیش کر چکا تھا۔ اگلی ملاقات پر میں نے دبے لفظوں میں صدر ایوب کے ساتھ اس بات کا گلہ کیا' تو وہ کچھ جھینپ گئے اور ان کے چہرے پر کسی قدر سرخی سی دوڑ گئی۔ اپنا مافی الضمیر صاف صاف بیان کرنے کے لیے انہوں نے ایک طولانی سی تشریحی اور توضیحی تقریر کا سہارا لیا۔ یہ بات ان کی وضع اور معمول کی سراسر خلاف تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ "اخبارات کو راہ راست پر لانے کے لیے اب ہم نے سخت اقدامات کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس مقصد کے لیے پریس کے قوانین میں ترمیمیں کی جا رہی ہیں۔ نئے آئین کے تحت یہ تبدیلیاں صوبائی حکومتیں نافذ کریں گی۔"

اتنا کہہ کر صدر ایوب نے نواب کالا باغ کی شان میں بہت سے تعریفی کلمات کہے اور بولے۔ "مجھے یقین ہے کہ نواب صاحب اخبار والوں کی مشکیں کس کر انہیں ایسا باندھیں گے کہ ان کو نانی یاد آ جائے گی۔"

اسکے بعد مجھے دلاسا دینے کے لیے صدر صاحب نے یہ خوشخبری سنائی۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ تمہیں اس کارروائی میں شامل نہیں کیا جا رہا۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ سخت گیر اقدامات کا نبھانے کی صلاحیت طبع تم میں موجود نہیں۔ دوسرے رائٹرز گلڈ کے عہدے دار کی حیثیت سے آزادی تحریر وغیرہ کا ساتھ بھی دینا پڑتا ہے۔ میں اس کا برا نہیں مناتا۔ ایک روز تم میرے شکر گزار ہو گے کہ میں نے تمہیں صحیح وقت پر وزارت اطلاعات سے سبکدوش ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔"

صدر ایوب کی اس بات سے میں ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ کیونکہ میں صاف بھانپ گیا تھا کہ آج وہ میرے ساتھ روایتی صاف گوئی سے کام نہیں لے رہے۔ مجھے اس بات کا ذاتی علم تھا کہ ملک میں رونما ہونے والے چند واقعات اور حالات کا صدر کے ذہن پر اس قدر شدید دباؤ تھا کہ وزارت اطلاعات سے مجھے الگ کرنا ان کے لیے قریباً قریباً ناگزیر ہو گیا تھا۔ ان حالات اور واقعات کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ ان کو زبان پر لانا یا تسلیم کرنا ہرگز ان کی شان کے شایان نہ ہوتا۔ اس معاملے میں ان کا اخفا پسندانہ رویہ میرے نزدیک بالکل قدرتی اور قابل فہم ہے۔

ان واقعات کا پس منظر کسی قدر پرانا ہے۔ امریکہ کے ساتھ سالہا سال سے ہماری نہایت برخوردارانہ اور سعادت مندانہ طرز کی دوستی چلی آ رہی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستان کا روس کے ساتھ گٹھ جوڑ تو بالکل عیاں تھا' لیکن امریکہ کے ساتھ بھارت کے تعلقات میں تجاہل عارفانہ اور سردمہری کا عنصر غالب رہتا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں جب چین کے ساتھ سرحدی جنگ میں ہندوستان کو شکست فاش ہوئی تو امریکہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ہندوستان کو اپنے حلقہ اثر میں لانے کے لیے اسے بے دریغ نہایت بھاری مقدار

میں مالی اور فوجی امداد دینا شروع کر دی۔ روس کے علاوہ امریکہ کی طرف سے بھی ہندوستان کو بے تحاشا فوجی امداد کی بھرمار دیکھ کر قدرتی طور پر پاکستان میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔ ہمارے محب وطن اخبارات نے اس سنگین صورت حال کا پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ جائزہ لیا اور ملک بھر میں امریکہ کے اس رویے کے خلاف مخالفت' تنقید اور تنقیص کی ایک تیز لہر دوڑنے لگی۔ پاکستان میں امریکی سفارت کار غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ یہاں کی صحافت مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں ہے اور ہندوستان کو کثیر اور خطیر فوجی مدد دینے پر امریکہ کے خلاف جو کچھ تحریر ہو رہا ہے۔ وہ ضرور وزارت اطلاعات کے ایما پر لکھوایا جا رہا ہے۔ اس لیے امریکن ایمبیسی نے میرا نام اپنے ناپسندیدہ اشخاص کے کھاتے میں درج کر لیا۔

پاکستان رائٹرز گلڈ قائم ہوتے ہی امریکیوں سمیت چند عناصر اسے بلاوجہ بائیں بازو کے خطرناک ادیبوں کی پناہ گاہ سمجھنے پر مصر تھے۔ اس ادارے کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے میں پہلے ہی ان عناصر کے حملے میں اعتراض کی زد میں آیا ہوا تھا۔ اس پر مزید غضب یہ ہوا کہ فروری ۱۹۶۲ء میں جب وزیر خارجہ ذولفقار علی بھٹو چین کے ساتھ سرحدی معاہدہ طے کرنے پکینگ گئے' تو صدر ایوب نے مجھے بھی ڈیلیگیٹ بنا کر ان کے ہمراہ بھیج دیا۔ امریکہ تو اس معاہدے پر ہی بے حد سیخ پا تھا' لیکن جب میرا نام وفد میں دیکھا تو یقیناً میرے متعلق ان کی ناپسندیدگی میں شدید اضافہ ہو گیا۔

چین سے واپسی کے چند ہفتے بعد اچانک ایک روز میں نے "ڈان" اخبار میں خبر پڑھی۔

خبر پڑھ کر میں نے وزیر خارجہ کو خط لکھا'

اس خط کی ایک نقل میں نے صدر ایوب کی خدمت میں پیش کی' تو انہوں نے اس پر یہ لکھ کر مجھے واپس کر دیا۔

I should treat such remarks with the Contempt they deserve
M.A.K
12/3
Mr. Shahab

میری توقع تھی کہ یہ قضیہ اب یہیں پر رفع دفع ہو جائے گا۔ لیکن یہ امید بر نہ آئی۔

امریکہ سفارت خانہ انتہائی محنت سے کام کرتا رہا اور انہوں نے چار پانچ ماہ لگا کر مختلف اخباروں سے ایسے بے شمار تراشے جمع کیے جن میں ہندوستان کو بے اندازہ فوجی مدد دینے اور پاکستان کے تحفظ کو نظر انداز کرنے کے حوالے سے امریکن حکومت پر کڑی نکتہ چینی اور مذمت کا کوئی نہ کوئی پہلو نکلتا تھا۔ ان تراشوں کو سلائیڈ کی صورت میں منتقل کیا گیا اور ایک روز امریکی سفیر یہ سارا ساز و سامان لے کر ایک پروجیکٹر کے ساتھ پریذیڈنٹ ہاؤس میں آ دھمکا' وہاں پر اس نے کافی عرصہ سکرین لگا کر صدر ایوب کو ایک ایک سلائیڈ دکھائی اور ساتھ ہی مژدہ سنایا کہ امریکہ کے انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر جارج بال عنقریب ہی صدر کینیڈی کے خصوصی' ایلچی کے طور پر پاکستان آنے والے ہیں اور جن امور پر وہ گفت و شنید کریں گے۔ ان میں پاکستان پریس کا رویہ بھی ایجنڈے میں شامل ہے۔ اسی زمانے میں ہمارے اخبارات میں یہ خبر بھی نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی کہ کسی تقریب میں امریکی سفیر مسٹر میکناٹی نے بڑے زعم سے فرمایا تھا کہ پاکستانی انتظامیہ کے چند نامرغوب افسروں کو تبدیل کرانا ان کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ سفارتی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیر کیر نے کسی افسر کا نام تو نہیں لیا تھا' لیکن صحافتی حلقوں کے مطابق یہ کوئی راز درون پردہ نہ تھا کہ سفیر صاحب کے بستہ ب میں میرا نام ضرور درج رجسٹر تھا!

ان پے در پے واقعات کا دھاوا اس قدر شدید تھا کہ اس کے دباؤ تلے صدر ایوب کا کسی قدر پریشان ہونا بعید از قیاس نہیں۔ خارجہ تعلقات میں وہ مرنجاں مرنج پالیسی کے حامی تھے۔ خاص طور پر امریکہ کے ساتھ تعلقات کے لیے ان کے دل میں نہایت نرم گوشہ تھا۔ پچھلے اٹھارہ بیس برس کے دوران امریکہ اور پاکستان میں مالی اور فوجی امداد کے جو گہرے رشتے قائم ہوئے تھے' انہیں پروان چڑھانے میں ایوب خان صاحب کی ذات کا بڑا عمل دخل تھا۔ بری فوج کے کمانڈر انچیف کے طور پر امریکہ کے ساتھ عسکری روابط' مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں انہوں نے اپنے منصب کی آئینی حیثیت سے کہیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ پاک امریکہ تعلقات کا یہ ڈھانچہ کانچ کا گھر تھا جس میں ذرا

سی بے احتیاطی اور بے اعتدالی دراڑیں ڈال سکتی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ امریکہ کا رویہ مربیانہ اور پاکستان کا فدویانہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک سپرپاور کی طرح امریکہ کے اپنے مفادات ہر صورت میں پاکستان کے مفادات سے زیادہ اہم تھے۔ ہندوستان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی ترنگ میں اگر پاکستان کے جذبات اور تحفظات کو قربان کرنا پڑتا ہے، تو ایسا کرنے میں امریکہ کو کوئی اخلاقی یا سیاسی رکاوٹ یا ہچکچاہٹ درپیش نہ تھی۔

ایک حقیقت پسند سربراہ مملکت کی طرح بین الاقوامی تعلقات کے اس زیر و بم اور پیچ و خم سے صدر ایوب بخوبی آشنا تھے۔ چنانچہ انہوں نے کسی قسم کی مقاومت اور مزاحمت کی بجائے رفع شر کے لیے آسان ترین رستہ یہ اختیار کیا کہ مجھے بیک بنی و دو گوش وزارت اطلاعات سے نکال باہر کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کارروائی کی اصلی وجہ انہوں نے پوشیدہ رکھی اور الٹا مجھ پر احسان دھر کے مجھے اس اخراج پر شکر گزار ہونے کی تلقین کی۔ لیکن صحافت کے مہم جو رپورٹر اس طرح کے راز ہائے دروں کا کھوج لگانے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ پہلے تو ایک خبر یہ شائع ہوئی کہ وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب سے اختلافات کی بنا پر میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے، لیکن حکومت نے فوراً اس کی تردید کر دی۔ اس کے بعد جب ہالینڈ میں سفیر کے طور پر میری تعیناتی کی خبر نکلی، تو پریس والوں نے اس تبدیلی کی وجوہات کا سراغ لگا لیا اور ملک کے بہت سے اخبارات نے بیرونی دباؤ کے تحت سرکاری ملازموں کے تبادلے پر اپنے شدید رد عمل کا اظہار کیا۔ کئی روز تک قومی اخباروں میں تبصروں اور اداریوں کا یہی موضوع رہا۔

میرے تبادلے کے سلسلے میں غیر ملکی مداخلت پر اخبارات کی خیال آرائیوں نے کچھ ایسی شدت اختیار کر لی کہ صدر کے پرنسپل سیکرٹری مسٹر این۔ اے فاروقی نے ایک پریس ریلیز میں ان قیاس آرائیوں کو قطعی بے بنیاد اور شر انگیز قرار دیا اور کہا کہ تمام سرکاری تبادلے ملکی ضروریات کے پیش نظر کئے جاتے ہیں اور حکومت پاکستان کسی حالت میں

بھی کسی غیر ملکی طاقت کی مداخلت برداشت نہیں کرے گی۔

جولائی ۱۹۶۲ء کے آخر میں جیسے ہی یہ فیصلہ ہوا کہ میں نے سفیر بن کر ہالینڈ جانا ہے تو میں نے صدر ایوب سے درخواست کی کہ مجھے فوراً وزارت اطلاعات سے فارغ کر دیا جائے۔ تاکہ میں چند ہفتے یہاں چھٹی گزار کر ہالینڈ چلا جاؤں۔ اس بات پر وہ رضا مند نہ ہوئے کیونکہ مغربی پاکستان کے فنانس سیکرٹری الطاف گوہر جو میری جگہ مرکزی سیکرٹری اطلاعات بنائے جا رہے تھے۔ ان دنوں امریکہ گئے تھے۔ صدر صاحب نے حکم دیا کہ میں ان کے آنے تک بدستور اپنی جگہ کام کرتا رہوں۔

اگلے چھ سات ہفتے میرے لیے بڑے سوہان روح ثابت ہوئے۔ میں ناکام سیکرٹری اطلاعات ضرور تھا' لیکن کام کے لحاظ سے عملی طور پر عضو معطل بنا بیٹھا تھا۔ ان دنوں میرا کام صرف اتنا تھا کہ روٹین کے طور پر منسٹری کا بندھا ٹکا روزمرہ کا دستور العمل نبھاتا رہوں اس سارے عرصہ کے دوران پالیسی کا ایک معاملہ بھی میرے پاس نہ آیا۔

کافی عرصہ پہلے سے کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کے ساتھ میری ایک میٹنگ مقرر چلی آ رہی تھی ۲۵ اگست کو کونسل کا جو وفد راولپنڈی تشریف لایا۔ وہ مسٹر الطاف حسین (ڈان" میر خلیل الرحمٰن (جنگ) مسٹر عبدالسلام (پاکستان آبزرور ڈھاکہ) مسٹر تفضل حسین مانک میاں (اتفاق ڈھاکہ) مسٹر مجید نظامی (نوائے وقت) اور مسٹر کے۔ ایم۔ آصف۔ (پاکستان ٹائمز) پر مشتمل تھا۔

وفد نے مجھے چھ مدیروں کی فہرست دی جنہیں کورٹ آف آنر کے ممبران کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا۔ یہ کورٹ آف آنر اس مقصد کے لیے قائم ہو رہی تھی کہ صحافیوں کے ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزیوں کا جائزہ لے کر جلد از جلد نمٹاتی رہے۔

وفد نے مجھے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے پانچ ریٹائرڈ ججوں کے نام بھی دیئے کونسل آف ایڈیٹرز کے خیال میں ان میں سے ہر ایک کورٹ آف آنر کا چیئرمین مقرر ہونے کی اہلیت رکھتا تھا۔ تاہم گورنمنٹ کے ساتھ باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لیے انہوں نے اس فہرست میں سے چیئرمین کا حتمی انتخاب حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔

قومی صحافت کے اتنے سربرآوردہ ایڈیٹروں کی یہ پیش کش مجھے بڑی مثبت اور تعمیری نظر آئی۔ اس میٹنگ کی روئیداد کو میں نے فوراً ایک سرکاری یادداشت میں قلم بند کیا' اور اسے اپنے ساتھ لے کر اسی شام صدر ایوب کی خدمت میں پہنچ گیا' لیکن وہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی پائی۔ میرے کاغذات پر انہوں نے ایک سرسری سی نظر ڈال کر ایک طرف دکھ دیئے اور کسی قدر جھلا کر ترشی اور تندی سے بولے۔ "اب یہ سب باتیں بالکل فضول ہیں۔ تم اس کام سے فارغ ہو رہے ہو۔ اب تمہیں خواہ مخواہ ان باتوں میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے اپنا لائحہ عمل تیار کر لیا ہے۔ اب اگر عمل ہو گا تو اسی پر ہو گا۔"

میں اپنا سا منہ لے کر واپس آ گیا' اور اگلے آٹھ نو روز اپنے دفتر میں بیکار بیٹھا مکھیاں مارتا رہا۔ دسویں روز ۳ ستمبر کو خبر ملی کہ مغربی پاکستان کے گورنر نے پریس اینڈ پبلی کیشنز (ویسٹ پاکستان) (ترمیمی) آرڈی ننس ۱۹۶۳ء نافذ کر دیا ہے۔

West Pakistan Ordinance NO. [illegible] of [illegible]
(The [illegible]entral Govt. Press and Publications Ordinance No. XV of [illegible]
was amenses in its application to the province of East Pakistan by
East Pakistan Ordinance- (i) No.[illegible] of [illegible] (with effect from [illegible]rd
September [illegible]) (ii) No.[illegible] of [illegible] (with effect from [illegible] Oct.[illegible])

اس قانون کا پھندا وقتاً فوقتاً مختلف ترمیموں کے ساتھ آج تک ہماری صحافت کے گلے میں پڑا ہوا ہے۔ کچھ لوگوں کو خوش فہمی تھی کہ ایوب کے دور کے بعد یہ کالا قانون اپنی موت آپ مر جائے گا۔ لیکن ہر دور میں یہ امید نقش برآب ہی ثابت ہوتی رہی۔ اندھے کے ہاتھ میں ایک بار لاٹھی آ جائے' تو وہ اس کے سہارے کے بغیر دو قدم چلنے سے بھی معذور ہو جاتا ہے۔ حکومت ایوب خان کے دور کی ہو یا یحیٰی کے یا کسی اور کی' ہر زمانے کے حکمران اسی قانون کی بیساکھیوں کا سہارا لے کر پاکستان کے ارباب عقل و دانش کو برباد اور روشن خیالی اور فہم و فراست کے میناروں کو تاخت و تاراج

کرتے رہے ہیں۔ ذہنوں پر روک تھام' بندش اور پابندی عائد کرنے والا ہر اقتدار کے دور میں قانون لازمی طور پر قوت تخلیق کو بنجر' بانجھ اور بے ثمر کر دیتا ہے۔ دھونس اور دھاندلی کا نشہ بھی شراب کی مانند ہوتا ہے دونوں میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

اس سانحہ کے دو تین روز بعد مسٹر الطاف گوہر امریکہ سے واپس تشریف لے آئے۔ ان کے آتے ہی میں نے وزارت اطلاعات کے استروں کی مالا ان کے گلے میں ڈال دی۔

میرے ساتھ ہی میرے دست راست محمد سرفراز کو بھی اس منسٹری سے فارغ کر دیا گیا۔ سرفراز صاحب میرے دیرینہ دوست اور ایک کہنہ مشق صحافی تھے' آزادی سے پہلے بھی دہلی میں خان لیاقت علی خان سمیت مسلم لیگ کے بہت سے اکابرین کے ساتھ ان کے گہرے روابط تھے۔ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر آف نیوز کے طور پر انہوں نے بڑی نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں۔ اس کے بعد وہ کافی عرصہ تک بغداد پیکیٹ میں اطلاعات کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل رہے۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو پروگریسو پیپرز لیمیٹڈ حکومت کے قبضے میں آ چکے تھے۔ چنانچہ سرفراز کو اس ادارے کے اخبارات اور رسالے کا چیف ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ یہ فرائض انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے نبھائے' لیکن ایک بات پر صدر ایوب ان سے بہت ناراض ہو گئے۔

وہ بات یہ تھی کہ صدر ایوب کے آئین کے خلاف چودھری محمد علی نے ایک نہایت سخت اور طویل بیان دیا تھا۔ اس بیان کو سب قومی اخبارات نے نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔ صحافی اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے سرفراز نے بھی اسے "پاکستان ٹائمز" میں پورے کا پورا چھاپ دیا۔ اس پر صدر ایوب چراغ پا ہو گئے کہ سرکاری تحویل میں لیے گئے اخبار میں ان کے آئین کے خلاف اس بیان کا پورا متن کیوں شائع ہوا۔ میں نے سرفراز کے دفاع میں صحافتی تقاضوں کا کچھ ذکر کیا' تو صدر ایوب ترشی سے بولے۔ "صحافت جائے بھاڑ میں ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں؟ یہ سرفراز کی شرارت ہے۔ وہ ضرور درپردہ چودھری محمد علی کے ساتھ ملا ہوا ہے۔"

جب میں نے وزارت اطلاعات و نشریات کا چارج سنبھالا تھا تو صدر ایوب کی دلی خواہش کے برخلاف میں سرفراز کو اسی وزارت میں ڈائریکٹر جنرل آف پبلک ریلیشنز کے طور پر لے آیا تھا۔ اس عہدے پر انہوں نے نہایت دیانتداری اور وفاداری سے کام کیا۔ لیکن صدر ایوب کے دل و دماغ پر اس کے خلاف جو غبار چھایا ہوا تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ صدر کی دیکھا دیکھی بہت سے دوسرے وزیر صاحبان بھی سرفراز کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔ اب جب کبھی کسی وزیر یا وزارت کے بارے میں کوئی تنقیدی خبر شائع ہوتی تھی' تو سب یہی الزام لگاتے تھے کہ میری پشت پناہی میں سرفراز ہی یہ شرارتیں کروا رہا ہے۔

جونہی وزارت اطلاعات سے میرا بوریا بستر گول ہوا' اسی وقت سرفراز کو بھی نیویارک میں اقوام متحدہ میں پاکستان سفارت خانے کا پریس کونسلر بنا کر چلتا کیا۔

یو۔ این۔ او میں اپنی پسندیدہ شخصیت اور قابل قدر کارگزاری کی وجہ سے وہ اس زمانے کے سیکرٹری جنرل مسٹر او۔ تھانٹ کی نظروں میں آ گیا۔ دونوں کے درمیان کافی گہرے روابط قائم ہو گئے۔ کچھ برس بعد سیکرٹری جنرل نے سرفراز کو اردن میں U.N.D.P کا نمائندہ بنا کر عمان بھیج دیا۔

سرفراز نہایت خوش لباس' خوش کلام اور شاہانہ طبیعت کا انسان تھا۔ وہ گھوڑسواری کے علاوہ پولو' ٹینس اور سکواش کھیلنے کا شوقین تھا۔ عمان میں ایک روز وہ کسی شہزادے کے ساتھ سکوائش کھیل رہا تھا کہ اچانک اس پر دل کا دورہ پڑا اور آناً فاناً سکواش کورٹ ہی میں دم توڑ دیا۔ اللہ تعالٰی اسے اپنے سایہ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

○ ◯ ○

• نیشنل پریس ٹرسٹ

۱۷ اپریل ۱۹۵۹ء کی تاریخ تھی۔ میں آرام سے سو رہا تھا کہ رات کے ساڑھے بارہ بجے میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان فون پر بول رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ اگلی صبح میں کراچی ایئرپورٹ پر پہنچ جاؤں' کیونکہ ہم نے پہلے جہاز سے لاہور کے لیے روانہ ہونا ہے۔

میں نے کہا کہ میں صدر ایوب کی اجازت کے بغیر کیسے کراچی چھوڑ سکتا ہوں؟ علی الصبح جہاز کی روانگی سے پہلے ان کی اجازت کیسے حاصل کروں گا؟

"میں پریذیڈنٹ ہاؤس سے ہی بول رہا ہوں" بریگیڈیئر صاحب نے کہا۔ "صدر صاحب ابھی ایک اہم میٹنگ سے فارغ ہو کر اپنے بیڈروم میں چلے گئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں اجازت دی ہے کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ لاہور لے جائیں۔"

"کس کام کے لیے؟" میں نے پوچھا۔

بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان نے کہا کہ اس سوال کا جواب وہ ٹیلیفون پر نہیں دے سکتے۔

اگلی صبح میں ہوائی اڈے پہنچا' تو بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان لاہور جانے کے لیے موجود تھے۔ روانگی سے پہلے اور ہوائی جہاز کے سفر کے دوران میں نے کئی بار لاہور میں کام کی نوعیت کے متعلق پوچھا' لیکن کوئی ٹھیک ٹھیک جواب نہ مل سکا۔ ہر بار بریگیڈیئر صاحب اپنی عادت کے مطابق طویل تقریروں میں آئیں بائیں شائیں کر کے میرے سوال کا جواب گول کر جاتے تھے۔ اپنی دانست میں وہ چالاکی سے کام لے رہے تھے' لیکن میرے نزدیک یہ ایک طفلانہ سی حرکت تھی۔

لاہور کے ہوائی اڈے پر چند فوجی افسروں نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں گاڑیوں میں بٹھا کر سیدھے فلیگ سٹاف ہاؤس لے گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وزیر داخلہ جنرل کے۔

ایم۔ شیخ بھی لاہور آئے ہوئے ہیں۔ بریگیڈئیر صاحب تو لاہور کے جی۔ او۔ سی۔ کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں کرتے ان کے دفتر کی طرف چل دیئے اور میں کافی دیر تک فلیگ سٹاف ہاؤس کے آراستہ و پیراستہ ڈرائینگ روم میں اکیلا بیٹھا رہ گیا۔ ایک نہایت باادب' خلیق اور شائستہ نوجوان فوجی افسر نے مجھے میرے رہنے کا کمرہ دکھایا اور مشورہ دیا کہ میں نہا دھو کر لنچ تک ایک دو گھنٹے آرام کر لوں۔

پردہ پوشی' رازداری اور سکوت کی یہ فضا میرے لیے بڑا پراسرار معمہ بنی ہوئی تھی۔ ایک دو بار میرے دل میں خیال گزرا کہ شاید ہمیں ہندوستان کی جانب سے حملے کا خطرہ درپیش ہو؟ لیکن اگر ایسی بات ہے تو مجھے ساتھ لانے کی کیا تک ہے؟ دوسرا خیال آیا کہ شاید کشمیر کے سلسلے میں کوئی مہم شروع ہونے والی ہو؟ لیکن اگر یہ فوجی کارروائی ہے تو اس میں میرا کیا کام؟ میں اسی ادھیڑ بن میں غلطاں و پیچاں تھا کہ شام کے چار بجے بریگیڈئیر ایف۔ آر۔ خان نے نہایت رازداری سے سرگوشی کر کے مجھے بتایا کہ آج رات اچانک چھاپہ مار کر میاں افتخارالدین کی کمپنی پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر قبضہ کرنے کے لیے سارے انتظامات مکمل کر لیے گئے ہیں۔ اخفائے راز کا اتنا بڑا پہاڑ کھودنے کے بعد جب اتنی بیچ پوچ اور ادنٰی سی چوہیا برآمد ہوئی تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"بریگیڈئیر صاحب۔" میں نے کہا۔ "یہ اخبار والے تو اپنے ہاتھ میں صرف قلم لے کر بیٹھتے ہیں۔ توپ و تفنگ سے لیس ہو کر نہیں۔ آپ کے انتظامات تو بظاہر فوجی نقل و حرکت سے کم نظر نہیں آتے۔"

بریگیڈئیر صاحب کھسیانی سی ہنسی ہنس کر چپ رہے۔ میں نے کہا۔ "اب آپ نے یہ اہم راز مجھ پر طشت ازبام کر ہی دیا ہے' تو یہ بھی فرمایئے کہ اس سلسلے میں میرے لیے کیا احکامات ہیں؟"

بریگیڈئیر ایف۔ آر۔ خان اچھل کر فوراً اپنے مزاج کے بنیادی عنصر میں آ گئے' اور وثوق سے بولے۔ آج تو آپ آرام کریں۔ کل سے ہمیں تمہارے مشوروں کی ضرورت

پڑے گی۔"

اس فارغ وقت کو غنیمت جان کر میں نے پروگرام بنایا کہ شہر چل کر اپنے چند دوستوں سے مل آؤں۔ گاڑی مانگی تو جواب ملا کہ ورکشاپ تک گئی ہوئی ہے۔ جلدی واپس آ جائے گی۔ پیدل چل کر باہر جانا چاہا' تو وہی باادب' خلیق اور شائستہ نوجوان فوجی افسر لپک کر میرے ساتھ ہو گیا۔ تاکہ معزز مہمان کا جی بہلانے کی خاطر اس کے ساتھ ساتھ رہے۔ میں نے کئی جگہ ٹیلی فون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن کسی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ ان تمام حالات سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ جب سے مجھے آج رات کی مجوزہ کارروائی کا راز معلوم ہوا ہے۔ اس وقت سے اس چار دیواری میں میری حالت عملاً ایک نظر بند کی سی ہو گئی ہے نہ میں کہیں جا سکتا ہوں' نہ کوئی میرے پاس آ سکتا ہے۔ نہ میں کہیں ٹیلی فون کر سکتا ہوں نہ مجھے کوئی ٹیلی فون کر سکتا ہے۔ اپنے اوپر بے یقینی اور بے اعتمادی کا اس قدر گہرا غبار چھایا ہوا دیکھ کر میرا وجود میری اپنی نظر میں بڑا حقیر' بے وقار اور فرومایہ محسوس ہونے لگا۔

بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان لاہور کے مارشل لاء ہیڈ کوارٹر سے ٹیلی فون لگائے اس طرح مستعد بیٹھا تھا جیسے وہ محاذ جنگ پر کسی فوجی دستے کی کمان کر رہا ہو۔ تین پہر رات گئے جب ڈرائننگ روم سے مبارک سلامت کا غلغلہ بلند ہوا' تو اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کا قبضہ کسی مزاحمت یا تصادم کے بغیر حکومت کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ اسی کے ساتھ روزنامہ پاکستان ٹائمز' روزنامہ امروز اور ماہنامہ لیل و نہار بھی سرکاری تحویل میں آ گئے۔

اگلے روز پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مظہر علی خان فلیگ سٹاف ہاؤس آئے اور جنرل شیخ کے ساتھ کافی دیر تک مصروف گفتگو رہے۔ ہمیں بعد میں بتایا گیا کہ وہ مسٹر مظہر علی کو اس بات پر آمادہ کر رہے تھے کہ وہ پاکستان ٹائمز کی ایڈیٹری بدستور اپنے پاس رکھیں۔ لیکن وہ اس کوشش میں ناکام رہے۔

روزنامہ امروز کے مدیر احمد ندیم قاسمی صاحب تھے۔ میرے ذمہ یہ ڈیوٹی لگی کہ میں ان

کو امروز کی ادارت پر فائز رہنے کی درخواست کروں۔ میں قاسمی صاحب کی خدمت میں یہ گزارش لے کر حاضر ہوا۔ لیکن وہ نہ مانے۔

پاکستان ٹائمز کا اگلا شمارہ پریس میں جانے کے لیے تیار ہوا' تو ایڈیٹوریل کسی نے نہ لکھا تھا۔ جنرل شیخ اور بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ آج کا ایڈیٹوریل میں لکھ دوں۔ مجھے اس میں کلام تھا۔ کیونکہ مجھے نہ صحافت کا عملی تجربہ ہے نہ اداریہ سپرد قلم کرنے کا۔ اس کے علاوہ مجھے تو ابھی تک یہ بھی علم نہ تھا کہ اس اخبار کو حکومت کے قبضہ میں لینے کے لیے کیا کیا محرکات اور مقاصد تھے اور نہ ہی یہ معلوم تھا۔ کہ وہ کیا الزامات تھے جن کی پاداش میں سرکار نے اتنا شدید اور غیر معمولی قدم اٹھایا ہے۔ اس لاعلمی کی وجہ سے میں کوئی پرمعنی اور معقول اداریہ لکھنے سے سراسر قاصر تھا' لیکن بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان بھی انتہائی ضدی اور اڑیل ذات شریف تھے۔ وہ اپنے اصرار پر مسلسل اڑے رہے اور آخر مجبور ہو کر میں جنرل شیخ کے بتائے ہوئے خطوط پر وہیں کھڑے کھڑے بے دلی سے ایک مختصر سا اداریہ گھسیٹ دیا جو New Leaf کے عنوان سے پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا۔ یہ تحریر کسی صورت بھی میرے لیے باعث فخر و مباہات نہیں' بلکہ دراصل یہ نامعقولیت اور کج فہمی کے اس پھندے کی عکاسی کرتی ہے جو ایک سرکاری ملازم کو بسا اوقات اپنی مجبوریوں کے دباؤ میں آ کر خواہی نخواہی اپنے گلے میں ڈالنا پڑتا ہے۔

پروگریسو پیپرز لیمیٹڈ کا قلعہ سر کر کے بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان اس قدر شاداں و فرحاں تھے جیسے انہوں نے کسی نہایت سخت محاذ جنگ پر فتح حاصل کر لی ہو۔ رفتہ رفتہ جب ان کی مسرت و انبساط کا جوار بھاٹا فرد ہونا شروع ہوا۔ تو مجھے اس غاصبانہ کارروائی کے پس منظر کے متعلق کسی قدر آگاہی حاصل ہوئی۔ ان اخبارات پر قبضہ جمانے کے لیے مارشل لاء کا کوئی قانون یا ضابطہ جاری نہیں ہوا تھا' بلکہ یہ کارروائی پاکستان سیکیورٹی ایکٹ میں ایک معمولی سی ترمیم کے عمل میں لائی گئی تھی۔ اس کمپنی کے حصہ داروں

میں سب سے بڑے حصے دار میاں افتخار الدین اور ان کا بیٹا عارف افتخار تھے۔ اس حیثیت سے کمپنی کے کاروبار پر میاں صاحب کو مکمل کنٹرول حاصل تھا۔

پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر قبضہ کرنے کے بعد کمپنی کا بورڈ آف ڈائریکٹرز توڑ ڈالا گیا' اور میاں خاندان کے تمام حصے ضبط کر کے نیلامی پر چڑھا دیے گئے۔ الزام یہ تھا کہ اس کمپنی کے اخبارات چلانے کے لیے بیرونی وسائل سے خفیہ امداد حاصل کی جاتی تھی اور غالباً ثبوت کے طور پر یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ میاں افتخار الدین کے حصص کی ضبطی کے وقت ان کے نام لندن کے لائڈز بنک لمیٹڈ میں تین لاکھ باسٹھ ہزار ایک سو تراسی پونڈ چودہ شلنگ اور چار پنس کی رقم بھی جمع تھی۔

قانونی اور اخلاقی لحاظ سے مجھے یہ سرکاری کارروائی بڑی کمزور' بے قاعدہ اور غیر اصولی نظر آئی۔ جان اور آبرو کے علاوہ ہر شہری کی ذاتی املاک کا تحفظ بھی ہر حکومت کا مقدس فرض شمار کیا جاتا ہے۔ میاں افتخار الدین ایک کھاتے پیتے امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ زمینوں کی آمدنی کے علاوہ ان کے بیرون ملک بھی بہت سے تجارتی روابط قائم تھے۔ لاہور میں ان کا گھرانہ نہایت آسودہ اور خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا۔ پھولوں کی نمائش میں ان کی کوٹھی کے گلاب کئی بار نمایاں انعامات جیت چکے تھے۔ عیش و عشرت کی اس فراوانی کے باوجود وہ نظری' علمی اور ذہنی سطح پر بائیں بازو کے رجحانات کے ساتھ وابستگی کا دم بھرتے تھے۔ عملی طور پر وہ فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے علاوہ بہت سے دوسرے ایسے ادیبوں کو بھی اپنے اخبارات کے ساتھ وابستہ کرتے رہتے تھے' جن کے نام ترقی پسند ادب کی تحریک کے حوالے سے زبان زد خاص و عام تھے سیاست میں انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی قلابازیاں کھائیں۔ کافی عرصہ انڈین نیشنل کانگریس میں پنڈت جواہر لال نہرو کی مونچھ کا بال بنے رہے۔ آزادی کے بعد پاکستان میں چند قدم مسلم لیگ کے ساتھ چلے۔ پھر الگ ہو کر آزاد پاکستان پارٹی کے نام سے اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بنالی' جس کا ڈھانچہ مارکسسٹ رنگ ڈھنگ پر تھا۔ اس سے قبل وہ مغربی پنجاب کی مسلم لیگ وزارت میں مہاجرین اور بحالیات کے وزیر بھی

رہ چکے تھے' لیکن زیادہ عرصہ چل نہ سکے' کیونکہ انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بڑی بڑی زمینداریاں توڑ کر انہیں مہاجرین میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تجویز ان کے دوسرے رفقا خان ممدوٹ' دولتانہ اور سردار شوکت حیات وغیرہ کو کیسے قابل قبول ہوتی؟ آئین ساز اسمبلی میں بھی ان کا رویہ اکثر و بیشتر حکومت وقت کے خلاف ہی رہا۔ جب ۱۹۵۶ء کا آئین منظور ہوا' تو میاں افتخار الدین مغربی پاکستان کے واحد رکن تھے۔ جو مسٹر سہروردی اور کئی دوسرے مشرقی پاکستانیوں کے ساتھ ایوان سے احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے تھے۔

میاں افتخار الدین آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے امیر کبیر زمیندار اور تاجر تھے۔ قانونی موشگافیاں کرنے اور پکڑنے میں انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔ طبعاً وہ نہایت زیرک' فعال' سیماب صفت اور اپنے موقف پر اڑنے اور لڑنے والے کردار کے مالک تھے۔ مخالفین پر چومکھی وار کر کے انہیں بدحواس رکھنا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ اپنے اخبارات کے اس غاصبانہ قبضے پر حکومت کے اس اقدام کو انہوں نے چیلنج تو ضرور کیا۔ لیکن ایک آرڈی ننس کے ذریعے اس معاملے میں عدالت کی جور سڈکشن ختم کر دی گئی۔ کچھ عرصہ بعد وہ شدید عارضہ قلب میں مبتلا ہو گئے۔ ایک روز اچانک میری ان کے ساتھ لندن میں ملاقات ہو گئی۔ ان کا حلیہ اس قدر بدلا ہوا تھا کہ انہیں دیکھ کر میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ وہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے تھے۔ وہ سکون آور دواؤں کے اس قدر زیر اثر تھے کہ دن کے وقت بھی عالم غنودگی میں سوئے سوئے سے نظر آتے تھے۔ ان کی گفتگو میں بھی مجھے ربط کا فقدان محسوس ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ وفات پا گئے۔

لیکن میرے نزدیک میاں افتخار الدین کی وفات کے باوجود یہ سوال جوں کا توں قائم ہے کہ کیا کسی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مروجہ قانونی چارہ جوئی کے بغیر کسی نجی املاک کو زبردستی اپنے قبضہ تصرف میں لے آئے؟ جس نظام میں حکومتوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے پاکستان اس سیاسی یا معاشی نظام پر کاربند نہیں۔ اس سارے معاملے

میں ایک متناقضانہ اور بے محل بات اور بھی کھٹکتی ہے۔ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر یہ الزام تھا کہ یہ ادارہ کمیونسٹوں سے ساز باز کر کے خفیہ وسائل حاصل کر رہا تھا' لیکن اس کی تطہیر کے لیے حکومت نے جو طریق کار اختیار کیا۔ وہ بھی کمیونزم ہی کی ایجاد و اختراع تھا۔ پرائیویٹ املاک کے تحفظ کو بالائے طاق رکھ کر اسے زبردستی ہتھیانا عام طور پر اسی سسٹم کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

محمد سرفراز کچھ عرصہ تک اس ادارے کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ بعدازاں حکومت نے فیصلہ کیا کہ یہ ادارہ کسی پرائیویٹ پارٹی کے ہاتھ بیچ دیا جائے۔ پاکستان ٹائمز' امروز اور لیل و نہار کو بکاؤ مال دیکھ کر کئی لوگوں کی رال ٹپکنے لگی۔ لیکن نیلامی کی بولی سیٹھ داؤد کے نام ختم ہوئی۔ وہ کروڑ پتی صنعت کار اور تاجر تھے اور حکومت کے اعلیٰ حلقوں میں وہ ازراہ محبت اور مذاق مٹھو سیٹھ کے لقب سے مشہور تھے۔ گجراتی لہجے میں ٹوٹی پھوٹی اردو بول کر وہ افسران بالا کا جی بہلایا کرتے تھے اور خوشامد کے طور طریقوں کو فن لطیف کا درجہ دے کر انہوں نے حکومت کے سب طبقوں میں ہر دلعزیزی حاصل کر رکھی تھی۔ پیسہ ان کے ہاتھ کا میل تھا۔ سرکاروں درباروں میں انہیں قبول عام کی سند میسر تھی۔ اب صرف اقتدار کا نشہ باقی رہ گیا تھا جسے چکھنے کے لیے وہ بے حد بے چین و مضطرب تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے ایک سوچی سمجھی بازی لگائی اور چونسٹھ لاکھ روپے کی عوض پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کی صحافتی جاگیر اپنے نام منتقل کرالی' لیکن یہ سودا انہیں مہنگا پڑا۔ اپنی بڑی بڑی ٹیکسٹائل ملوں اور دوسرے کارخانوں میں تو وہ ہزاروں مزدوروں کو چشم زدن میں اپنی راہ پر لگا لیتے تھے' لیکن اخباری دنیا میں مٹھی بھر صحافیوں کو اپنے قابو میں رکھنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ یوں بھی ان کی تجوری کا منہ گرسنہ بھیڑیے کی طرح کھلا مٹھو سیٹھ کو بار بار کاٹ کھانے کو آتا تھا کہ چونسٹھ لاکھ روپیہ کی سرمایہ کاری پر تجارتی شرح سے میرا منافع کب آئے گا؟ کیسے آئے گا؟ اور کہاں سے آئے گا؟ سیٹھ داؤد پاکستان کے نہایت کامیاب صنعت

کار اور تاجر تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے دس روپے ڈال کر دوسرے ہاتھ سے بیس نکالنے کے عادی تھے' لیکن اخباری کاروبار میں منافع کی صورت بالکل مختلف تھی۔ اس کے علاوہ مٹھو سیٹھ کو گمان تھا کہ اخباروں کے مالک بن کر وہ ایک ایسی لفٹ میں سوار ہو گئے ہیں جس کا بٹن دباتے ہی وہ آناً فاناً اقتدار کی کسی اعلیٰ کرسی پر جا بیٹھیں گے' لیکن ایسا کوئی واقعہ رونما نہ ہوا۔ اس کے برعکس جسے دیکھو وہ کسی خبر کا شاکی ہے۔ کسی تصویر کا شاکی ہے۔ کسی تنقید کا شاکی ہے۔ نہ پیسہ نہ منافع نہ اقتدار' بلکہ الٹا شکوہ و شکایت کی بھرمار۔ سیٹھ داؤد بہت جلد خسارے کے اس سودے سے بوکھلا گئے اور پروگریسو پیپرز کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکنے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ ملک کے اندر تو وہ صدر ایوب کے گرد مکھی کی طرح بھنبھناتے ہی رہتے تھے۔ لیکن ایک دو بار وہ صدر کے بیرون ملک دوروں میں بھی ان کے ساتھ سائے کی طرح چپکے رہے۔ رو پیٹ کر آخر انہوں نے صدر کو راضی کر لیا اور اس متاع گراں کا ایک اور خریدار بھی لاہور سے برآمد کر لائے۔

نئے خریدار کا نام چودھری محمد حسین تھا۔ نیم خواندگی کے باوجود اسمبلی کے ممبر اور لاہور شہر کے میئر تھے۔ ایک روز کسی بیرونی مہمان گرامی کے اعزاز میں شالامار باغ میں ایک نہایت شاندار استقبالیہ منعقد ہو رہا تھا۔ چودھری صاحب میئر کی حیثیت سے خوش آمدید کا ایڈریس پڑھنے۔ سٹیج پر تشریف لائے۔ انہوں نے مائیکرو فون اپنے قریب کرنے کے لیے اسے ہاتھ لگایا' تو اتفاق سے انہیں بجلی کی کرنٹ کا ہلکا سا جھٹکا لگا۔ بوکھلا کر ان کے منہ سے پنجابی زبان میں ماں بہن کی ایک ایسی فحش گالی نکلی جو لاؤڈ سپیکر کے ذریعے گونج کر سینکڑوں معزز خواتین و حضرات کے مجمع کو شرمساری سے پانی پانی کر گئی۔

اخباروں کے مالک بن کر بھی چودھری محمد حسین صاحب اسی طرح کی بدحواسیوں اور سراسیمگیوں کے چند اور گل کھلانے کے علاوہ کوئی مزید کارنامہ سر انجام نہ دے سکے۔ وہ تکلیف دہ حد تک خالی الذہن اور کودن شخص تھے۔ انہیں جب جاہ کی ہوس تو بے انتہا تھی' لیکن اسے پورا کرنے کے لیے جس عالی حواصلگی' فراخ ہمتی اور اولوالعزمی کی ضرورت

ہوتی ہے۔ اس سے سراسر عاری تھے۔ ان کے منتہائے زندگی کی اڑان غالباً یہیں تک تھی کہ وقتاً فوقتاً انہیں صدر ایوب کی بارگاہ میں رسائی حاصل ہوتی رہے اور ایک دو بار وہ صدر مملکت کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کر سکیں۔ ان کی یہ غرض و غایت پورا ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔ اس کے بعد پروگریسو پیپرز کا بکھیڑا اپنے پاس رکھنے ان کے لیے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی' چنانچہ اس ادارے پر ایک بار پھر بہت جلد "برائے فروخت" کی تختی آویزاں ہو گئی۔

تیسرا گاہک نہایت جہاں دیدہ' سردوگرم چشیدہ' ہوشیار' زیرک' تیزدست اور آزمودہ کار ثابت ہوا۔ یہ گجرات کے چودھری ظہور الٰہی تھے۔ نو دولتیے ہونے کے باوجود وہ خوش اخلاق' ملنسار' اور منکسر مزاج انسان تھے۔ وہ لنگر لنگوٹ کس کر سیاست کے اکھاڑے میں اتر رہے تھے اور جاہ و اقتدار کی سیڑھی پر جلد سے جلد چڑھنا چاہتے تھے۔ گجرات کے گرد و نواح میں ان کی داد و دہش کی دھوم تھی' اور وہ بہت سی بیواؤں اور یتیموں کی کفالت اور نادار طلبہ کے تعلیمی مصارف پر بے دریغ خرچ کرنے میں روز افزوں شہرت اور نیک نامی کما رہے تھے۔ ان کے سیاسی مقاصد کی تکمیل میں "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" جیسے اخبار ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے بعجلت تمام ان کا سودا طے کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے مالک بن گئے۔ چودھری ظہور الٰہی احتیاط پسند آدمی تھے اور سیاست کے کاروبار میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے تھے۔ صدر ایوب کا اعتماد تو انہوں نے بہت جلد حاصل کر لیا' لیکن نواب کالا باغ کے معاملے میں ان سے ایک بھول چوک سرزد ہو گئی۔ گورنر مغربی پاکستان کے طور پر نواب صاحب صوبے کی سیاست پر بھی اپنی مضبوط گرفت رکھتے تھے۔ خاص طور پر پنجاب میں سیاسی قیادت کی شکست و ریخت یا ترقی و بقا نواب کالا باغ کے رحم و کرم پر منحصر تھی۔ ان کی رضا اور خوشنودی کے بغیر کوئی نیا سیاستدان اقتدار کی شاہراہ پر ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ شومئی قسمت سے چودھری ظہور الٰہی نے یہ فاش غلطی کی کہ اپنے سیاسی عزائم پر نزول

برکت کے لیے وہ نواب کالا باغ سے اشیر باد حاصل کرنا بھول گئے یا قصداً نظر انداز کر گئے۔ صدر ایوب کی آمرانہ صلاحیتوں پر چودھری صاحب کا مکمل تکیہ تھا۔ صدر مملکت کو رام کر کے غالباً ان کی اپنی نگاہ مغربی پاکستان کی گورنری پر لگی ہوئی تھی۔ یہ افواہ اڑتے اڑتے نواب کالا باغ کے کانوں تک بھی پہنچی اور وہ طیش میں آ کر چودھری ظہور الٰہی کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ان کے اشارے پر مقامی انتظامیہ نے انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ وقتاً فوقتاً صدر ایوب نواب صاحب کے پاس چودھری ظہور الٰہی کی صفائی اور سفارش کرتے رہتے تھے' لیکن پھر یکایک حالات بے انتہا بگڑ گئے۔ سہواً یا قصداً "پاکستان ٹائمز" میں گورنر مغربی پاکستان کی کسی معمولی سی علالت کے متعلق ایک چھوٹی سی خبر شائع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ایک بے پرکی یہ بھی اڑائی گئی کہ بحالی صحت کے لیے آرام کرنے کی غرض سے نواب صاحب کچھ چھٹی بھی لے رہے ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر نواب صاحب آگ بگولا ہو گئے اور اسے چودھری ظہور الٰہی کی سازش اور شرارت سمجھ کر انتقامی کاروائیوں پر اتر آئے۔ پہلے ایک نہایت فرسودہ اور غیر معروف مواصلاتی ایکٹ کے تحت انہیں گرفتار کر لیا گیا اور پھر ان پر ایک پریشان کن اور طویل مقدمہ چلنا شروع ہو گیا۔

ایک بار صدر ایوب لاہور کے گورنر ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شام کے وقت انہوں نے مجھے کسی کام کے لیے بلایا' تو نواب کالا باغ بھی ان کے پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ صدر ایوب بڑی لجاجت اور نرمی سے چودھری ظہور الٰہی کی صفائی میں کچھ کہہ رہے تھے۔ نواب صاحب کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ اور ان کی مونچھوں کے چھتے میں غیظ اور غضب کے بھونڈ بھنبھنانے لگے۔ پہلے تو انہوں نے فحش گالیاں نکال کر چودھری ظہور الٰہی کی سات پشتوں میں کیڑے نکالے۔ پھر ان کے حکم کے مطابق سپیشل پولیس کی خفیہ برانچ کا ایک ایس پی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذات کا ایک بھاری بھرکم بنڈل تھا۔ کاغذوں کا پلندہ پولیس افسر سے لے کر نواب صاحب نے میز

پر دے مارا اور گرج کر بولے۔ "ظہور الٰہی کا تھوڑا سا کچا چٹھا ان کاغذات میں درج ہے' لیکن وہ سخت جان موذی ہے۔ کاغذ کی مار سے نہیں مرے گا۔ اس لیے میں بہت جلد اس پر اپنا شکاری کتا چھوڑنے والا ہوں۔ یہ اس حرامی کی ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دے گا۔" یہ الفاظ کہتے ہوئے انہوں نے داد طلب نگاہوں سے پولیس افسر کی طرف دیکھا۔

سپیشل برانچ کے ایس پی صاحب نے سینے پر ہاتھ مار کر اپنا سر تسلیم خم کیا اور گھگھیا کر انتہائی چاپلوسی سے کہا۔ "جو حکم عالی جاہ۔ بندہ ہر وقت حاضر خدمت ہے۔"

اگر ان صاحب کے دم بھی ہوتی' تو یقیناً وہ کھڑے ہو کر اپنی دم بھی ضرور ہلاتے۔

خفیہ پولیس کا یہ افسر تفتیش کے کام میں شہرت رکھتا تھا۔ ملزموں کو انتہائی شدید جسمانی اور روحانی اذیت پہنچا کر ان سے زبردستی اقبال جرم کروانا اس کا خاص طرہ امتیاز تھا۔ وہ نواب کالا باغ کا منہ چڑھا منظور نظر تھا اور ان کی زبان مبارک سے اپنے متعلق شکاری کتے کا لقب سن کر خوشی اور فخر سے پھولا نہ سماتا تھا۔

نواب صاحب کا یہ جارحانہ رویہ دیکھ کر صدر ایوب کسی قدر آزردگی سے خاموش ہو گئے۔ پہلے بھی کئی بار اس معاملے میں ان دونوں کے درمیان تھوڑا بہت کھچاؤ پیدا ہوتا رہتا تھا۔ لیکن آج صدر ایوب طرح دے گئے۔ کیونکہ چودھری ظہور الٰہی کی خاطر نواب کالا باغ کے ساتھ جھگڑا یا ناچاقی مول لینا انہیں کسی صورت بھی گوارا نہ تھا۔

اگلے روز جب ہم لاہور سے راولپنڈی واپس آ رہے تھے' تو ہوائی جہاز میں صدر ایوب نے مجھے کہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ چودھری ظہور الٰہی بہت جلد جان چھڑا کر پروگریسو پیپرز سے بھاگ جائے گا۔ اب اس ادارے کا کیا بنانا چاہیے؟"

موقع پا کر میں نے فوراً اپنی ایک دل پسند تجویز پیش کی' جو پہلے بھی کئی بار نامنظور ہو چکی تھی۔ میری تجویز یہ تھی کہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کو ایک کواپریٹو سوسائٹی کی شکل دے کر اس کے سارے حصص کارکن صحافیوں اور دیگر ملازموں کے ہاتھ بیچ دیے جائیں اور

اخبارات چلانے کی ساری ذمہ داری انہیں سونپ دی جائے۔ وہیں جہاز میں بیٹھے بیٹھے صدر ایوب نے زور سے نفی میں سر ہلا کر اس تجویز کو قطعی طور پر نامنظور کر دیا۔ اس کے خلاف انہیں دو اعتراض تھے ایک تو یہ کہ اخبارات کے مالک بن کر اگر صحافی اور دوسرے کارکن بغاوت کر کے حکومت کے کنٹرول سے نکل گئے' تو اس کا کیا علاج ہو گا۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ ان اخبارات کو چلانے کے لیے سرمایہ کہاں سے حاصل کیا جائے گا؟ انہیں یقین تھا کہ صحافیوں اور کارکنوں کی کواپریٹو سوسائٹی پر کوئی سیٹھ یا بینک آسانی سے سرمایہ لگانے کے لیے تیار نہ ہو گا۔

میری دوسری تجویز یہ تھی کہ اس لیمٹڈ کمپنی کا کارپوریشن کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز میں حکومت اپنی مرضی کے فدویانہ قسم کے سرمایہ دار نامزد کر سکتی ہے۔ صدر ایوب کی یہ تجویز بڑی قابل قبول نظر آئی۔ انہوں نے فوراً حکم دیا کہ میں ان خطوط پر کوئی عملی سکیم بنا کر جلد از جلد ان کی خدمت میں پیش کروں۔

اس مفت کی بیگار کو اپنے سر سے ٹالنے کے لیے میں نے صدر ایوب سے گزارش کی کہ ہمارے ملک میں پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی اور واپڈا جیسے عظیم الشان اداروں کو تعمیر کرنے والے مسٹر جی فاروق ماشاء اللہ بقید حیات ہیں۔ میرے خیال میں اس بارے میں ان کے ساتھ مشورہ کرنا مفید ہو گا۔ غالباً یہ بات صدر ایوب کے دل میں بیٹھ گئی اور انہوں نے اپنی نوٹ بک نکال کر اس میں یہ مشورہ درج کر لیا۔

اس کے بعد اس موضوع پر میری کسی سے کوئی مزید بات چیت نہ ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد میں بطور سفیر متعین ہو کر ہالینڈ چلا گیا۔ سات آٹھ ماہ بعد میں نے سنا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ نام کا ایک ادارہ قائم ہو گیا ہے اور مسٹر جی۔ فاروق اس کے پہلے چیئرمین مقرر ہوئے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے نیشنل پریس ٹرسٹ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا' اور پاکستان ٹائمز اور امروز کے علاوہ مارننگ نیوز اور مشرق بھی اس میں شامل ہو گئے۔

مسٹر غلام فاروق کی ماہرانہ قیادت میں قائم شدہ یہ ادارہ اس قدر سخت جان ثابت ہوا

کہ اب تک کوئی حکومت اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکی۔ شروع شروع میں ہر نئی حکومت یہی نعرہ لگاتی ہوئی آتی ہے کہ ہم نیشنل پریس ٹرسٹ کو جلد از جلد توڑ کے رہیں گے لیکن اقتدار کا نشہ منہ کو لگتے ہی یہ سارے دعوے اور عزائم جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ ٹرسٹ کے اخبار حکومت کے حق میں نیاز کی دیگوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان دیگوں میں خوشامد' تملق' چرب زبانی' چکنی چپڑی باتوں' ریاکارانہ گھاتوں اور سرکار کی جا و بیجا تعریف و توصیف کے ایسے چمچے اور کف گیر چلائے جاتے ہیں کہ کوئی حکومت نیشنل پریس ٹرسٹ کو ہاتھ سے کھونے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ اگرچہ ٹرسٹ کے اخباروں کی اشاعت مسلسل گرتی رہتی ہے لیکن اس کے طلسماتی بہی کھاتوں میں خسارے کا نشان کبھی نہیں ابھرتا۔ صرف روزنامہ "مشرق" نے ادبی یا ثقافتی ایڈیشنوں کی وجہ سے ایک اپنے چند شگفتہ کالموں کے بل بوتے پر کسی نہ کسی طرح اپنا بھرم قائم رکھا ہوا ہے۔ باقی تینوں اخباروں میں کسی آب و تاب اور رنگینی کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ بعض اوقات تو وہ محض سرکاری گزٹ کا پھسپھسا اور بھونڈا سا چربہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

موجودہ صورت میں نیشنل پریس ٹرسٹ کا وجود آزادانہ اور بے لاگ صحافت کے لیے ایک وبال جان سے کم نہیں۔ جب تک صحافت کا یہ سفید ہاتھی حکومت کے تھان میں سونے کی زنجیروں سے بندھا رہے گا۔ اس وقت تک دوسرے اخباروں کے لیے رقیبانہ اور حریفانہ ہم چشمی اور مالی وسائل کے مقابلے کا میدان منصفانہ طور پر ہموار نہیں ہو سکتا۔

○○○

• ایوب خان اور معاشیات

جن دنوں پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہو رہا تھا' میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کراچی چھوڑنے سے پہلے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر عمرہ ادا کر آؤں۔ اس مقصد کے لیے مجھے اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے کچھ رقم نکلوانے کی ضرورت تھی۔ اے۔ جی۔ پی۔ آر کی ہدایت کے مطابق میں نے ایک فارم بھرا جس پر اپنے ہیڈ آف آفس کے دستخط کروانے بھی لازمی تھے۔ دفتر والوں نے کہا کہ میرے ہیڈ آف آفس بھی صدر ایوب بذات خود ہیں۔ اس لیے مجھے ان سے بھی دستخط کروانا ہوں گے۔ مجھے اس بات میں کسی قدر تردد تھا کہ اتنی چھوٹی سی بات پر ان کو کیا تکلیف دوں۔ لیکن ضابطے کی خانہ پری بھی ضروری تھی۔ اس لیے وہ فارم ان کی خدمت میں دستخطوں کے لیے بھیجدیا۔ ساتھ ہی پندرہ دن کی چھٹی کی درخواست بھی بھیجدی۔

تھوڑی دیر کے بعد صدر ایوب ان کاغذات کو ہاتھ میں لیے میرے کمرے میں آئے اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ مسکرا کر بولے۔ پراویڈنٹ فنڈ تو ریٹائرڈ ہونے کے بعد کام میں لانا چاہیے۔ تم ابھی سے اس میں سے یہ رقم کیوں نکلوا رہے ہو۔"

میں نے اپنی بیوی کے ساتھ عمرہ پر جانے کا ارادہ بتایا' تو وہ کسی سوچ میں پڑ گئے۔ "اگر ایسا ارادہ تھا تو تنخواہ میں سے پیسہ بچا بچا کر رکھتے۔ پراویڈنٹ فنڈ میں سے کچھ نکلوانا دور اندیشی کی بات نہیں۔"

میں خاموش رہا' تو انہوں نے جیب سے اپنی ذاتی چیک بک نکالی' اور فرمایا۔ "اس رقم کے برابر میں تمہیں اپنا ذاتی چیک دیتا ہوں۔ نصف رقم تم اپنی سہولت سے رفتہ رفتہ واپس ادا کر دینا۔ باقی نصف میرا تحفہ سمجھو۔"

ان کے اس الطاف کریمانہ سے میں بیحد متاثر ہوا' اور شکریہ ادا کر کے انتہائی لجاجت

سے میں نے انہیں سمجھایا' کہ عمرہ جیسے دینی سفر پر مجھے اپنے خرچ ہی سے جانا چاہیے۔ اس کے بعد اگر مجھے کبھی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کی فیاضی سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔

یہ سن کر وہ زور سے ہنسے اور بولے۔ "ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے۔" اس کے بعد میرے فارم پر انہوں نے خندہ پیشانی سے دستخط کر دیئے۔

یہ معمولی سا واقعہ مالی' اقتصادی اور معاشی زاویوں سے صدر ایوب کے ذہنی رجحانات اور ذاتی کردار پر نہایت دلچسپ روشنی ڈالتا ہے۔ ان کی نپی تلی فیاضی جذبات سے آلودہ ہو کر بوجھل یا لکھ لٹ نہ بنتی تھی۔ فضول خرچی اور اسراف سے وہ کوسوں دور تھے۔ پس اندازی ان کے نزدیک عقل و دانش اور دور اندیشی کا شعار تھا۔ اور ہر معاملے میں حساب کتاب سے چلنا ان کی عادت ثانیہ تھی۔ ان کے دور حکومت میں اگر یہی ذاتی اوصاف اور مملکتی سطح پر بھی جاری و ساری ہو جاتے' تو پاکستان کا مالی اور معاشی مستقبل نہایت ترقی یافتہ اور خوشحال خطوط پر مستحکم ہو جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ صورت حال پیدا ہونے سے رہ گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک آزاد مملکت کے فلسفہ معاشیات کے علوم و فنون پر عبور رکھنے والے ماہرین کی ہمیشہ شدید کمی رہی ہے۔ صدر ایوب کو اپنے دور میں جو اقتصادی اور معاشی امور کے وزیر' مشیر اور ماہر میسر آئے' وہ یا تو نہایت لائق فائق' قابل اور مستعد اکاؤنٹنٹ تھے یا غیر معمولی طور پر ذہین و فطین سول سرونٹ تھے' جن کا خاص طرہ امتیاز یہ تھا کہ وہ ورلڈ بنک' انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ اور دیگر بین الاقوامی اداروں کی اصطلاحات اور جارگن نہایت خوش اسلوبی سے اپنا کر اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے تھے۔ ان بلند و بالا' گرنجدار اور پرشوکت الفاظ اور اصطلاحات کی اشکال صوتی میں عقل و دانش' فہم و ادارک اور اقتصادی علوم و فنون کا جو تھوڑا بہت مغز اور گودا ملتا بھی تھا تو اس کی حیثیت ورلڈ بینک کے چھوٹے موٹے مشیروں اور مربیوں کے پس خوردہ اقوال اور مسلمات سے کچھ زیادہ نہ ہوتی تھی۔ اس طرح پاکستان کی جدید اکانومی کا جیٹ طیارہ سیکنڈ کلاس پائلٹوں کے ہاتھ میں آ کر تھرڈ ریٹ پٹرول کے

سہارے بلند ترین فضاؤں میں پرواز کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

فوجی حکومت کے آتے ہی خوف و ہراس کی جو فضا چھا گئی' اس میں مارشل لاء نے چند سطحی لیکن دلچسپ گل کھلائے۔ ذخیرہ اندوزوں' اور بلیک مارکیٹ کرنے والوں نے اپنی دکانوں کے پٹ کھول دیئے اور مخلوق خدا ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ کر گری اور دونوں ہاتھوں سے سستے داموں مال و اسباب خریدنے میں مصروف ہو گئی۔ چند لوگوں نے ناجائز دولت سے بھرے ہوئے سوٹ کیس راتوں رات کھلے میدانوں میں جا پھینکے کروڑوں روپے کا پوشیدہ کالا دھن واجبی ٹیکس ادا کرنے کے بعد ظاہر ہو کر تجارت صنعت کی گردش میں آ گیا۔ مارشل لاء کی عینک لگا کر پولیس کے سراغرسانوں کی بصارت بھی تیز ہو گئی اور ایک روز سمندر کی تہہ میں ڈوبا ہوا ناجائز سونے کا بہت بڑا انبار برآمد کر لیا گیا۔

بیرون ملک چھپا کر رکھے ہوئے سرمائے کو واپس لانے کے لیے مارشل لاء کا ایک ضابطہ نافذ ہوا جس کے تحت ہر شخص اپنا غیر ملکی زرمبادلہ بغیر کسی روک ٹوک کے پاکستان لا سکتا تھا۔ سرکاری شرح مبادلہ پر اس کو پاکستانی روپے پوری تعداد میں مل جاتے تھے۔ اور اس رقم پر کوئی ٹیکس بھی نہ لگایا جاتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس رعایت سے خاطرہ خواہ فائدہ اٹھایا' لیکن بڑے بڑے سیٹھوں کا ایک منظم گروہ اس ضابطہ کو پوری طرح ناکام بنانے پر تلا ہوا تھا' ان حضرات کو یقین تھا کہ ان کا سرمایہ صرف پاکستان سے باہر ہی محفوظ رہ سکتا ہے' ملک کی سلامتی اور بقا کے بارے میں وہ اس قدر متردد تھے' کہ اپنا سرمایہ یہاں لا کر وہ ہرگز ڈبونا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک خفیہ تحریک چلانا شروع کر دی' جس سے وہ اپنے ہم مشرب سیٹھوں اور ساہو کاروں کو تسلی اور تشفی دیتے تھے کہ وہ خواہ مخواہ مارشل لاء کی گیدڑ بھبکیوں میں نہ آئیں' اور اپنا قیمتی زرمبادلہ پاکستان واپس لانے کی غلطی نہ کریں۔ ایک سیٹھ کے محب وطن کارندوں نے یہ راز ایک گمنام خط کے ذریعے صدر ایوب کے نام لکھ کر بھیجدیا۔ اس میں یہ بھی درج تھا' کہ ایم' اے رنگون والا چیئرمین فیڈریشن آف چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری

جے۔ ایس۔ لوبو سیکرٹری کراچی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری۔ اے۔ کے سومار سیکرٹری پاکستان مرچنٹس ایسوسی ایشن اور احمد۔ اے کریم اور تحریک کے روح رواں ہیں۔

صدر ایوب کے نام اس خط کے ساتھ ایک اور پرچہ بھی منسلک تھا جو میرے نام تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ ہمیں معلوم ہے کہ دفتر رسم و رواج کے مطابق گمنام خطوط کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے۔ لیکن تم اس خط کے ساتھ ایسا سلوک ہرگز نہ کرنا۔ کیونکہ ہم اللہ اور رسول کی قسم کھا کر اپنے انکشاف کی سچائی کا اعلان کرتے ہیں۔ اگر تم نے اس خط کو نظر انداز کیا تو تم بھی قوم کے مجرموں کی پشت پناہی کر رہے ہو گے۔

صدر ایوب کی اجازت سے میں نے اس خط کے مندرجات کو ایک مخبرانہ رپورٹ کی صورت میں منتقل کیا۔ اور اس پر مختلف ذرائع سے انکوائری شروع کروا دی۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ معلوم ہوا کہ بہت سے سربرآوردہ اشخاص منظم طور پر یہ سازش کر رہے ہیں' کہ لوگ اپنی پوشیدہ دولت کو ظاہر نہ کریں۔ بیرون ملک جمع کیا ہوا زرمبادلہ واپس نہ لایا جائے اور مہنگائی بڑھانے کی غرض سے مقامی صنعتوں کو go slow پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس تحریک کے سرغنوں کے طور پر رنگون والا' بولو' سومار اور احمد کریم گرفتار کر لیے گئے۔ مجھے یقین تھا کہ ان حضرات پر مقدمہ بھی ضرور چلایا جائے گا۔ لیکن کسی نامعلوم وجہ سے ایسا نہ ہوا۔ چند ہفتوں بعد میں نے اخبار میں خبر پڑھی کہ چاروں کراچی جیل سے رہا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ بات اب تک میرے لیے معمہ ہے کہ اچھا خاصا ثبوت مہیا ہونے کے باوجود ان کے خلاف مزید قانونی کارروائی کیوں نہ کی گئی؟

بیرون ملک جمع کیے ہوئے زرمبادلہ کے حوالے سے ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ مارشل لاء نافذ ہوتے ہی جو کابینہ بنائی گئی تھی' اس میں مسٹر محمد شعیب وزیر خزانہ کے طور پر مقرر ہوئے تھے۔ وزیر خزانہ کا عہدہ انہوں نے اس شرط پر قبول کیا تھا کہ وہ ساتھ ہی ورلڈ بنک کے ڈائریکٹر بھی بدستور رہیں گے۔ ان دو آسامیوں پر ایک شخص

کا بیک وقت فائز رہنا اصولی طور پر معیوب اور نامناسب تھا۔ ایک آزاد مملکت کے وزیر خزانہ کا ساتھ ہی ساتھ ایک بین الاقوامی بنک کی کی ادنئٰ سی آسامی کے ساتھ چمٹے رہنا ہمارے قومی وقار کے سراسر منافی تھا۔ اس لیے شروع ہی سے میرے دل میں ان کے متعلق کوئی خاص قدر و منزلت نہ تھی۔

جن دنوں میں بیرون ملک جمع کیے ہوئے زرمبادلہ کے سلسلے میں چند بڑے سیٹھوں کے خلاف انکوئری شروع کروانے سے مصروف تھا۔ ایک روز محمد شعیب صاحب میرے دفتر میں تشریف لائے۔ ورلڈ بینک کی ملازمت کی وجہ سے امریکہ میں ان کے کئی لاکھ ڈالر جمع تھے۔ انہوں نے صدر ایوب کے نام ایک درخواست لکھ رکھی تھی کہ انہیں یہ رقم امریکہ کے بینک ہی میں رکھنے کی اجازت دی جائے۔ انہوں نے یہ درخواست میرے حوالے کر کے کہا کہ میں صدر ایوب سے منظور کروا کے اسے جلد از جلد ان کے پاس بھیج دوں گا۔ وزارت کے ساتھ ہی ساتھ ورلڈ بینک کی ملازمت کی وجہ سے شعیب صاحب کے خلاف کچھ قدرے تعصب میرے دل میں پہلے ہی موجود تھا۔ اب ان کی اس درخواست نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میں نے لگے ہاتھوں انہیں کراچی کے بڑے بڑے سیٹھوں کی سازشانہ حرکات کا حال سنایا۔ اور اپنی برخود غلط' عادلانہ اور متقیانہ راست بازی کے جوش میں کہہ بیٹھا۔ "سر' ملک کے وزیر خزانہ کو پاکستان کے اقتصادی ثبات اور استحکام پر دوسروں کی نسبت زیادہ کامل یقین اور اعتماد ہونا چاہیے۔ اگر آپ اعلان کر کے ڈنکے کی چوٹ اپنا بیرونی اثاثہ یہاں لے آئیں' تو اوروں کے لیے یہ نہایت صحت مند اور قابل تقلید مثال قائم ہو گی۔"

میری بات سن کر شعیب صاحب تاؤ میں آ گئے۔ انہوں نے اپنی درخواست جھپٹ کر میرے ہاتھ سے چھین لی اور تیزی سے بولے۔ "بس بس۔ میں یہاں پندو نصائح سننے نہیں آیا۔"

میرے کمرے سے نکل کر وہ سیدھے صدر ایوب کے پاس گئے۔ اور اپنی درخواست پر ان کی منظوری کے دستخط ثبت کرا لائے۔

ایک طرف وزارت خزانہ کی کرسی۔ دوسری طرف ورلڈ بینک کی ڈائریکٹری کا سٹول۔ ان دونوں شناختوں کے درمیان شعیب صاحب کی ذات عجیب و غریب لطائف و ظرائف کا شکار ہوتی رہتی تھی۔ چند بار تو میں بھی ان غلط فہمیوں کی لپیٹ میں بری طرح آیا۔

شعیب اور شہاب میں ایک مبہم سی صوتی مماثلت کے علاوہ ہم دونوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ ایک بار صدر ایوب یوگو سلاویہ کے سرکاری دورے پر گئے تو ہم دونوں بھی ان کے ہمراہیوں میں شامل تھے۔ آخری روز مارشل ٹیٹو نے کچھ تحائف تقسیم کیے۔ مجھے ایک نہایت خوبصورت ریڈیو گرام ملا۔ شعیب صاحب کو ایک نہایت معمولی سی ایش ٹرے ملی۔ وہ میرے سر ہو گئے کہ ہمارے ناموں کی مماثلت سے غلط فہمی ہوئی ہے' اور میرے نام کا تحفہ غلطی سے تمہیں مل گیا ہے۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی شک گزرا۔ اتفاق سے یوگوسلاویہ کا چیف آف پروٹوکول ادھر سے گزرا تو میں نے اسے روک لیا۔ شعیب صاحب اور میرے تحائف میں غلطی سے ردو بدل کا شبہ بیان کیا' تو وہ مسکرایا اور بولا۔

"کوئی غلطی یا غلط فہمی نہیں ہوئی۔ آپ دونوں کو اپنے اپنے صحیح تحائف ملے ہیں۔"

"لیکن مسٹر شعیب تو منسٹر کا عہدہ رکھتے ہیں۔" میں نے وضاحت کی۔ "جو تحفہ انہیں دیا گیا ہے وہ ان کے منصب کے شایان شان نظر نہیں آتا۔"

چیف آف پروٹوکول نے کہا۔ "آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہر تقریب میں ہم نے وزیر خزانہ کو ان کے منصب کے مطابق درجہ دیا ہے۔ لیکن تحائف میں ہم نے انہیں ورلڈ بینک کا ڈائریکٹر تسلیم کیا ہے۔"

"وہ کیوں؟" ہمارے صدر کے ملٹری سیکرٹری نے پوچھا۔

"ہمیں اس میں کسی قدر بچت نظر آئی۔" یوگوسلاویہ کے چیف آف پروٹوکول نے کسی قدر تمسخر سے کہا۔

اسی طرح کے ایک دو واقعات صدر ایوب کے دورہ امریکہ کے دوران بھی پیش آئے۔ صدر کینیڈی اور مسز کینیڈی نے صدر ایوب کے اعزاز میں ماؤنٹ ورنن پر ایک نہایت

شاندار ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے کچھ فاصلہ کشتیوں کے ذریعے طے کرنا تھا۔ پہلی کشتی میں مسٹر اور مسز کینیڈی کے ساتھ صدر ایوب اور دوسرے جو لوگ سوار ہوئے ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ شعیب صاحب کو دوسری کشتی میں نسبتاً کم اہمیت والے مہمانوں کے ساتھ بٹھایا گیا۔ اس پر وہ بڑے سیخ پا ہوئے۔ لیکن امریکن چیف آف پروٹوکول سے استفسار کرنے پر یہی جواب ملا کہ ورلڈ بینک کے ڈائریکٹر کے رتبہ کے مطابق انہیں صحیح مقام پر بٹھایا گیا ہے۔

اندرون امریکہ ایک سفر پر ہمیں صدر کینیڈی نے اپنے سرکاری جہاز میں بھیجا۔ امریکی محکمہ پروٹوکول کے ایک افسر بھی ہمارے ساتھ شریک سفر تھے۔ ہر نشست پر انہوں نے ہمارے نام کے کارڈ چسپاں کیے ہوئے تھے۔ میری نشست ہمارے ممتاز سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ تھی۔ مسٹر شعیب کی نشست بھی ایک عبدالسلام کے ساتھ تھی جو صدر ایوب کا ذاتی خدمت گار تھا۔ اس بات پر شعیب صاحب کا برانگیختہ ہونا قدرتی امر تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر شعیب اور شہاب کی مماثلت کو آڑ بنا کر نشستوں کی رد و بدل کا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ اس ناخوشگوار بک بک جھک جھک نے اس قدر طول کھینچا کہ امریکی پروٹوکول افسر نے بیچ بچاؤ کر کے اپنا فیصلہ دیا کہ ورلڈ بینک کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مسٹر شعیب کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی۔

جس وقت صدر ایوب نے عنان اقتدار سنبھالی تھی' اس وقت ملک میں بیرونی زرمبادلہ کی شدید قلت تھی۔ عام اشیائے صرف کمیاب ہی نہیں تھیں بلکہ ان کی قیمتیں بھی بہت گراں تھیں' بلیک مارکیٹ' ذخیرہ اندوزی' اسمگلنگ' امپورٹ لائسنسوں کی برسر عام خرید و فروخت اور دیگر ہر طرح کی سرکاری مراعات کا کاروبار کھلے بندوں عام تھا۔ کسی نے صدر کو یہ پٹی پڑھا دی کہ ان سب خرابیوں اور نقائص کا تیر بہدف علاج بونس واؤچر سکیم میں مضمر ہے۔ یہ تجویز کسی باضابطہ معاشی اصول یا نظریات پر مبنی نہ تھی۔ بلکہ اس کی حیثیت ان نفسیات کے ماہر چرب زبان سنیاسیوں کے ٹونے ٹوٹکوں کی سی تھی

جو پہاڑی جڑی بوٹیوں کے گیت گا گا کر مایوس مریضوں کو صحتمندی کا مژدہ سنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔

اس سکیم کے مطابق جو شخص کوئی چیز ایکسپورٹ کر کے جتنا زرمبادلہ کماتا تھا' اس کا

ایک خاص حصہ اسے بونس واؤچر کے طور پر عطا کر دیا جاتا تھا۔ جس سے وہ اپنی ضرورت یا مرضی کیمطابق جو کچھ چاہے باہر سے درآمد کر سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایکسپورٹ کا کاروبار ہر کسی کا دلپسند مشغلہ بن گیا۔ جسے دیکھو کوئی نہ کوئی شے برآمد کرنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں تگ و دو کر رہا ہے۔ بونس واؤچروں کا نرخ بالا ہو گیا۔ آسودہ حال لوگ انہیں اپنا سامان تعیش درآمد کرنے میں بیدریغ خرچ کرتے تھے۔ چنانچہ دکانوں اور گھروں میں عورتوں کے میک اپ کے اعلیٰ ترین لوازمات عمدہ شرابوں' سربمہر ولائتی کھانے پینے کی اشیا کے ڈبوں' فرانسیسی پانی کی بوتلوں' سوس چاکلیٹوں' جرمن کیمروں اور طرح طرح کی ٹافیوں' مٹھائیوں' پنیروں اور بسکٹوں کی ریل پیل ہو گئی۔ بونس واؤچر ہاتھوں ہاتھ مہنگے داموں بکتے تھے اور ان کے عوض امپورٹ کی ہوئی اشیاء اور بھی زیادہ مہنگی ہو کر بازار میں آتی تھیں۔ بونس واؤچر کی برکت سے بین الااقوامی سطح پر پاکستانی روپے کی قیمت گر کر نصف کے قریب رہ گئی' لیکن اندوان ملک ہمارے اقتصادی ماہر صدر ایوب مونچھ کو تاؤ دیکر ان کے منہ سے یہی اعلان کرواتے رہے کہ ہم کسی دباؤ کے تحت اپنے روپے کی قیمت ہرگز نہیں گھٹائیں گے۔ سرکاری شرح سے تو ایک پونڈ کی قیمت گیارہ بارہ روپے بنتی تھی۔ لیکن کھلی منڈی میں اس کا بھاؤ ۱۸ سے چوبیں روپے تک اٹھتا تھا۔ پاکستانی کرنسی کی اصلی اور نقلی قیمت میں اتنا بڑا فرق اس کی ساکھ کے لیے انتہائی مضر تھا۔

بونس واؤچر سکیم کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ جو سامان زرمبادلہ کی سرکاری شرح پر بھی درآمد کیا جاتا تھا' بازار میں اس کا نرخ بھی بونس واؤچروں کے ریٹ پر فروخت ہوتا تھا۔ اس سے ہماری ساری درآمدی تجارت کی قیمتوں میں یک بیک شدید اضافہ ہو گیا۔

اس سکیم میں اگر کوئی مثبت پہلو نظر آیا تو وہ یہ تھا کہ ملک بھر میں شہری آبادی کا ایک چھوٹا سا مڈل کلاس طبقہ امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار میں آ کر زیادہ تر بلیک مارکیٹ اور ذخیرہ اندوزی کے سہارے کسی قدر آسودہ حال ہو گیا۔

صدر ایوب صدق دل سے خواہاں تھے کہ ملک میں حقیقی خوشحالی اور آسودگی کا دور دورہ شروع ہو۔ انہیں اکانومی کا خود تو کوئی خاص علم یا تجربہ نہ تھا۔ لیکن ایک مستعدد اور چوکس دیہاتی کی عقل سلیم اور سوجھ بوجھ ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس لیے انہیں واقعی یہ احساس تھا کہ بونس واؤچر سکیم کی ملمع سازی خوشحالی کا فریب نظر تو ضرور ہے لیکن خوشحالی کا صحیح راستہ نہیں۔ ایک حقیقت پسند انسان کی طرح وہ اس بات سے بھی بخوبی آشنا تھے کہ جس نظام میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتے چلے جائیں۔ اس میں کوئی شدید سقم اور کجی ہے۔ لیکن عملی طور پر وہ اپنے مالی اور اقتصادی مشیروں اور ماہروں کے نرغے میں آ کر بے دست و پا ہو گئے' اور اپنی جبلی سمجھ بوجھ اور عقل و دانش کو کسی وقت بھی پوری طرح کام میں نہ لا سکے۔ دراصل ان حضرات کو مالی اور اقتصادی ماہرین کہنا اس اصطلاح کا غلط استعمال ہے۔ یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ بابو قسم کے بڑے عہدے دار تھے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کی تعلیم و تربیت یا تو محاسبوں منیموں اور جمع خرچ نویسوں کے طور پر ہوئی تھی' یا وہ ڈپٹی کمشنر' کمشنر' اور جائنٹ سیکرٹری کے مرحلوں سے بخیر و خوبی گزر کر ملک بھر کے مالیاتی' اقتصادی اور منصوبی بندی کے امور پر قابض ہو گئے تھے۔ ایک آزاد مملکت کے مسائل کو اس کے اپنے وسائل کے حصار میں رکھ کر حل کرنا انہوں نے کہیں سے نہ سیکھا تھا۔ لے دے کے ان کی دوڑ مغرب کے چند ترقی یافتہ ممالک تک تھی جن میں امریکہ سرفہرست تھا۔ ان سب ممالک کی اپنی اپنی مصلحتیں' اپنی اپنی ترجیحات اور اپنے اپنے مقاصد تھے۔ ہمارے معاشی اور اقتصادی ماہرین کی اکثریت دوسروں کی مصلحتوں' ترجیحات اور مقاصد کے کنویں کے مینڈک بن کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ وہ ہر سال نہایت درست اور صحیح بجٹ بنا لیتے تھے۔

خسارہ پورا کرنے کے لیے نئے نئے ٹیکس لگانے میں نہایت چابکدستی اور چرب زبانی سے کام لیتے تھے۔ ہر میزانیے میں تو فیری سرخاب کا پر لگانے کے لیے اور اس پر ترقیاتی منصوبوں کا ملمع چڑھانے کے لیے وہ بیرونی امداد اور قرضے لینے کے لیے دوسروں کے سامنے بے حجابانہ ہاتھ پھیلانے میں بے حد مشتاق ہو گئے تھے۔ غیر ملکی امداد کی بیساکھیوں پر چڑھائی ہوئی ہر اقتصادی اور معاشیاتی عمارت غیر محفوظ اور غیر مامون ہوتی ہے۔ ہم پر جب کبھی کوئی آزمائش کی گھڑی آئی ہے' اس عمارت کا ایک نہ ایک حصہ دھڑام سے زمین بوس ہوتا رہا ہے۔ ایوب خاں کے دور حکومت کو بہت سے لوگ مادی ترقی کا سنہری دور کہتے ہیں۔ بے شک اس میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن جن ناقابل اعتبار اور غیر یقینی سہاروں پر اس کی بنیاد رکھی گئی تھی اسے قائم رکھنے کے لیے ہمیں اب تک ہر زمانے میں طرح طرح کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ خود کفالت کی راہ پر قدم بڑھائے بغیر ہر قسم کی ترقی کی اساس مصنوعی اور ناپائیدار رہتی ہے۔ ہماری روز افزوں ضروریات کا مگرمچھ تو منہ کھلے ہل من مزید کا نعرہ بلند کرتا رہتا ہے' لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے دوستوں اور امداد دینے والے بھی خواہوں کی اپنی مصلحتوں کے تقاضوں اور ترجیحات میں زیروبم اور رد و بدل ایک لازمی اور فطرتی امر ہے۔

ہمارے قومی وسائل کو بیرونی ذرائع کا محتاج بنانے کے علاوہ ہمارے نام نہاد اقتصادی ماہرین نے صدر ایوب کو یہ بھی باور کرا دیا کہ پاکستان کی طرح تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک کے لیے مادی ترقی کا ایک ہی راستہ ہے جو طویل بھی ہے اور دشوار گزار بھی۔ اس کے علاوہ نہ تو کوئی متبادل راستہ ہے' اور نہ ہی کوئی شارٹ کٹ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان لکیر کے فقیروں نے سرخ فیتے کی مدد سے صنعتی اور تجارتی ترقی کا زینہ اس طرح آویزاں کر دیا کہ اس پر وہی چیدہ چیدہ' برگزیدہ اور پسندیدہ اشخاص اوپر چڑھ سکتے تھے جو قسمت کے دھنی تھے اور پہلے ہی سے سیڑھی کے ایک نہ ایک پائیدان پر ایستادہ ہو چکے تھے۔ نئی صنعتیں لگانے کے لائسنس یا تو پرانے صنعتکاروں اور تاجروں کو ملتے تھے'

یا ان دوسرے لوگوں کو ملتے تھے جنہیں سیاسی رشوت' اقربا پروری یا کسی دیگر خوشنودی کے طور پر نوازنا مقصود ہوتا تھا۔ یہ دوسرے لوگ لائسنس لے کر انہیں منہ مانگی قیمت پر پرانے صنعت کاروں اور تاجروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے۔ اس طرح بنیادی طور پر صنعت کاروں کا حلقہ اپنے پرانے دائرے کی حدود ہی میں گردش کرتا رہتا تھا۔ اور اس میں تازہ خون بہت کم مقدار میں شامل ہوتا تھا۔ ایک ہی خاندان طرح طرح کی کثیر الانواع صنعتیں لگا لیتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ان کا اپنا بینک' اپنی انشورنس کمپنی' اور اپنے ہی تجارتی گودام بھی قائم ہو جاتے تھے۔ اس قسم کے کارٹل ملک میں اس قدر عام ہو گئے کہ قوم کی دولت کا بیشتر اثاثہ بیس بائیس خاندانوں کی تجوریوں میں مرکوز ہو کر رہ گیا۔ وہ زمانہ ایسا تھا جس پر اس ہندی دوہے کی مثل پوری طرح صادق آتی تھی:

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ
تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات

شروع شروع میں وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب نے نہایت طمطراق سے یہ اعلان کیا تھا کہ ہم کارٹلز کا قلع قلمع کر کے رہیں گے لیکن دو ڈھائی برس کے اندر اندر انہوں نے قلابازی کھا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ کارٹلز بنانے والوں کو رضا کارانہ طور پر انہیں ختم کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد اس موضوع پر زیب داستاں کے لیے اتنی سی بیان آرائی بھی بند ہو گئی۔

مال و زر کی اس تکثیر میں مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں برابر کے شریک تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بنگالی حضرات اپنا لائسنس زیادہ تر مغربی پاکستان میں فروخت کرنے کی کوشش کرتے تھے' کیونکہ یہاں پر خریدار نسبتاً زیادہ تھے اور قیمت بھی غالباً زیادہ ملتی تھی۔ بظاہر اس سے یہی گمان ہوتا تھا کہ اس بندر بانٹ میں مغربی پاکستان کیساتھ

ترجیحی سلوک کیا جا رہا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ بلکہ اس کے برعکس بنگالی وزیر ارباب سیاست اور ان کے عزیز و اقارب پرمٹوں اور لائسنسوں کی صورت میں اپنی قیمت وصول کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے' اس زمانے میں پان کے تازہ بتازہ پتے بڑی کثیر تعداد میں ہر روز پی آئی اے کے ذریعے مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان آیا کرتے تھے۔ یہ نہایت منافع بخش تجارت تھی اور ایک ایک ٹوکری فی یوم کا لائسنس حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی سفارشوں اور اثر رسوخ سے کام لیا جاتا تھا۔ ان لائسنسوں کی تقسیم کلیتہً چند بنگالی وزیروں اور بنیادی جمہوریتوں کے اہم ترین ارکان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ پہلے اپنے بیٹوں' بھانجوں اور بھتیجوں کا پیٹ بھرتے تھے۔ اور اس کے بعد اپنے سیاسی حلیفوں کی وفاداریاں مستحکم کرنے اور حریفوں پر ترغیب و تحریص کا جال پھیلانے کے کام میں لاتے تھے۔ ایک بنگالی وزیر باتدبیر اس کام میں بے حد پیش پیش تھے۔ جب کبھی وہ کسی کو چند ٹوکروں کا لائسنس دلوانے میں کامیاب ہو جاتے تھے تو اپنے ایک چھپے ہوئے خوبصورت کارڈ کے ذریعہ اسے مبارک باد کا خط بھی ضرور بھیجتے تھے۔ اس کارڈ میں کسی من چلے نے بنگالی ترجمہ کے ساتھ فارسی کا یہ مصرعہ بھی درج کروا رکھا تھا

برگ سبز است تحفنہ درویش

حکومت اور سیاست کے درویشوں کے گال اور ہونٹ تو برگ سبز کی برکت سے گلنار ہی رہے تھے' لیکن تحفوں کی اس ہیرا پھیری میں پانوں کے تاجروں کا ایک کثیر طبقہ اپنے آبائی پیشے سے محروم ہو کر بے کاری کا شکار ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کے کچھ لوگوں نے اسے یہ رنگ دیا کہ اب تو مغربی پاکستان والے ہمارے روایتی اور خاندانی پیشہ وروں کی روزی چھیننے کے بھی در پے ہیں۔

اسی زمانے میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے چند پروفیسروں نے Economies Two کا شوشہ چھوڑ رکھا تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کسی مشترکہ معاشیات کا وجود ممکن نہیں۔ بلکہ دونوں حصوں کے الگ الگ معاشیاتی تقاضے ہیں۔ اس لیے ایکسپورٹ امپورٹ کنٹرول پی۔ آئی۔ اے' پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی اور سٹیٹ بینک سمیت ہر اقتصادی شعبے اور ادارے کو تقسیم کر کے دونوں صوبوں میں الگ الگ طور پر قائم ہونا چاہیے۔ صدر ایوب اس صورت حال پر بہت پریشان تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ اس طرز استدلال کا منطقی نتیجہ یہی نکلے گا کہ اگر ملک کی معاشیات اور اقتصادیات مرکز سے ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی' تو رفتہ رفتہ دو سکے رائج ہو جائیں گے' اور اس کے بعد دو الگ الگ ملک عالم وجود میں آ جائیں گے۔

ایک بار صدر ایوب ڈھاکہ گئے ہوئے تھے۔ وہاں پر انہیں خیال آیا' کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ان پروفیسروں سے مل کر دیکھنا چاہیے کہ دو معاشیات کا شوشہ چھوڑنے سے ان کی اصلی غرض و غایت کیا ہے۔ چنانچہ ایک صبح ہم نے چھ سات نوجوان اور ادھیڑ عمر کے پروفیسروں کو صدر کے ساتھ ناشتے پر مدعو کیا۔ ان میں پروفیسر نورالہدیٰ اور پروفیسر نورالسلام بھی شامل تھے۔ چند جواں سال اساتذہ نے نہایت شدو مد سے تیز تلخ لہجہ میں مغربی پاکستان کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے استحصال کا رونا رویا۔ اور اس کا واحد حل یہی تجویز کیا کہ دونوں حصوں میں اپنی اپنی معاشیات کو الگ الگ فروغ دیا جائے۔ ان کی باتیں نہایت صبر و سکون سے سن کر صدر ایوب نے کہا۔

"آپ سمجھ دار لوگ ہیں۔ کیا دو معاشیات ہمیں دو الگ الگ ملکوں میں تقسیم نہ کر دیں گی۔"

اس پر نسبتاً بڑی عمر کے لوگ تو خاموش رہے۔ لیکن دو تین نوجوان اساتذہ خوشی سے اچھل پڑے۔ ایک نے بے ساختہ کہا۔ "سر! میرے خیال میں موجودہ صورتحال کا بس یہی ایک منطقی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اسے روکنا کسی کے اختیار میں نہیں۔"

ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسروں کے ساتھ اس گفت و شنید نے صدر ایوب کو مزید الجھن

اور پریشانی میں ڈال دیا۔ اگلے روز انہوں نے مشرقی پاکستان کے تیس پینتیس سیاستدانوں' اخبار نویسوں اور دیگر اکابرین کے ساتھ مشورہ کرنے کے لیے ایک میٹنگ منعقد کی۔ شیخ

مجیب الرحمٰن کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن انہوں نے آنے سے انکار کر دیا تھا میٹنگ میں صدر ایوب نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ اپنی گفتگو کے تاثرات بیان کئے' اور ایک طویل جذباتی تقریر کے اختتام پر کہا

"اگر آپ نے مغربی پاکستان سے الگ ہونے کا عزم کر لیا ہے تو باہمی زور آزمائی' الزام تراشی اور سر پھٹول کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم سب کو بھائیوں کی طرح ایک میز کے گرد بیٹھ کر خوش اسلوبی اور خیر سگالی سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔"

چند لمحے بالکل سناٹا چھایا رہا۔ اس کے بعد مسٹر نورالدین اور "اتفاق" کے ایڈیٹر مسٹر تفضل حسین عرف مانک میاں سمیت کئی حاضرین نے بیک آواز کہا۔ "ہرگز نہیں۔" ہرگز نہیں۔" ایسی بات تو ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں۔"

"Never Never, we do not even dream of it"

اس کے بعد باہمی اتفاق' اتحاد' تعاون اور خیر سگالی پر بہت سی تقریریں ہوئیں۔ کئی مقررین کے گلے وفور جذبات سے رندھے ہوئے تھے۔ مانک میاں کے روزنامہ "اتفاق" کی روش ایوب خاں کی فوجی حکومت اور ان کے نئے آئین کے خلاف رہا کرتی تھی۔ انہوں نے خاص طور پر صدر ایوب کو مخاطب کر کے کہا۔ "مسٹر پریذیڈنٹ ہمارے اختلافات آپ کی حکومت کے خلاف ہیں' اپنے ملک کے خلاف نہیں' میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب تک میری نسل کے لوگوں کا کچھ اثر و رسوخ باقی ہے' پاکستان کی سالمیت پر کوئی ضرب نہیں آسکتی۔ لیکن ہمارے بعد کیا ہو گا' اس پر ہم نہایت فکر مند ہیں۔"

مانک میاں نے اس بھر محفل میں ایک اور عجیب انکشاف کیا' انہوں نے کہا "ہمیں کئی بار دو بڑی طاقتوں کی طرف سے خفیہ طور پر اسلحہ مہیا کرنے کی پیش کش ہوتی رہتی ہے۔ تاکہ ہم مسلح ہو کر علیحدگی کی تحریک چلا سکیں۔ لیکن ہم نے انہیں ہمیشہ یہی جواب دیا ہے کہ ہمارے اندرونی جھگڑے جو کچھ بھی ہوں۔ ان میں کسی بیرونی مداخلت

کو ہم ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ طاقتیں باقی سب امور میں ایک دوسرے کے ساتھ برسر پیکار رہتی ہیں۔ لیکن پاکستان کو دو لخت کرنے میں دونوں متفق ہیں۔"

اس میٹنگ نے صدر ایوب پر خواب آور گولی کا اثر کیا اور وہ مشرقی پاکستان کے متعلق ضرورت سے زیادہ بخنت ہو کر بیٹھ گئے۔ اب وہ اس صوبے کی ہر پیچیدگی کو اپنی سادہ لوح اثر سے مفرد شکل میں انتہائی سہل بنا کر دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ ایکبار انہوں نے دفعۃً یہ فیصلہ کر دیا کہ مشرقی پاکستان میں جتنے غیر بنگالی افسر ڈیپوٹیشن پر گئے ہوئے ہیں ان سب کو واپس بلا لیا جائے اور آئندہ اس صوبے میں باہر سے کوئی افسر تعینات کر کے نہ بھیجا جائے۔ اس پر بیوروکریسی کے ایک محدود سے طبقے میں معمولی سی واہ وا ہوئی۔ لیکن "سنگباد" ڈھاکہ کے ایڈیٹر ظہور چوہدری نے مجھے کہا۔ "یہ فیصلہ انتہائی غلط اور خطرناک ہے۔ آئندہ یہاں پر مرکز کے خلاف جو زیر زمین مواد پکے گا' اس کا علم آپ کو اسی وقت ہو گا جب وہ لاوا بن کر پھٹ جائے گا۔ اس سے پہلے یہاں کی نوکر شاہی آپ تک کوئی خبر نہ پہنچنے دے گی۔"

ظہور چوہدری کا یہ خدشہ میں نے صدر ایوب کو بتایا تو وہ چڑ کر بولے۔ ظہور چوہدری تو شکوک و شبہات کا دائم المریض ہے۔ اچھی سے اچھی بات سن کر بھی اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتا ہے۔"

ایک روز راولپنڈی کے ایوان صدر میں کابینہ کی میٹنگ تھی۔ میٹنگ ختم ہوتے ہی صدر ایوب نے مجھے حکم دیا کہ میں تین بنگالی وزیروں خان عبدالصبور خاں' فضل قادر چوہدری اور عبدالمنعم خاں کے ساتھ شیخ منظور قادر اور ذوالفقار علی بھٹو کو ساتھ لے کر ان کے کمرے میں آؤں۔ ہم لوگ ان کے کمرے میں پہنچے تو صدر نے کہا۔ "میں نے آپ لوگوں کے ساتھ ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔ غلام فاروق کی جگہ اب مجھے مشرقی پاکستان کے لیے ایک نئے گورنر کی تلاش ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ موقع اب کسی

مشرقی پاکستانی کو ملنا چاہیے۔ اب بتائیے کہ وہاں کا گورنر کون ہو؟

یہ سنتے ہی تینوں بنگالی وزیروں کے چہروں پر حسرت و التجا' خوشامد درآمد الحاح و زاری' ارمان و امنگ کی رنگ برنگ تختیاں کھٹاک سے ثبت ہو گئیں' جن پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "جناب صدر' اس خاکسار میں کیا کمی ہے؟"

چند لمحے سناٹا طاری رہا۔ پھر کمرے میں صدر ایوب کی آواز گونجی۔ "میں بتاتا ہوں مشرقی پاکستان کا نیا گورنر کون ہو گا۔"

گورنری کا طوق اپنی اپنی گردن میں ڈلوانے کے لیے تینوں بنگالی وزیر عقیدت و احترام سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

"عبدالمنعم خاں" صدر ایوب نے نئے گورنر کے نام کا اعلان کیا۔

اچانک عبدالمنعم خاں کی کرسی سے کراہنے کی سی آواز آئی۔ دراصل یہ شادی مرگ کے آثار نہ تھے' بلکہ دوسرے بنگالی وزیروں کی آنکھوں سے دو نالی بندوق کی آتش حسد کے شعلے چھروں کی طرح نکل نکل کر ان کے تن بدن کو چھلنی کر رہے تھے۔

ہم نے سہارا دے کر عبدالمنعم خاں کو کرسی سے اٹھایا۔ باہر آ کر وہ کمر پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اپنی کار کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک بنگالی وزیر نے ہمیں مخاطب کر کے کہا۔ "دیکھو یہ سالا ابھی پوری طرح گورنر تو بنا نہیں' لیکن حرامی کی چال میں ابھی سے گورنری کا رنگ ڈھنگ آ گیا ہے۔"

مشرقی پاکستان کے گورنر کی حیثیت سے عبدالمنعم خاں نے صدر ایوب کے ساتھ پورا پورا حق وفاداری ادا کیا۔ لیکن صوبے کے اندر انہوں نے جبرو استبداد اقربا نوازی' خویش پروری' رشوت ستانیوں اور بدعنوانیوں کے زبردست جھنڈے کھلم کھلا ڈنکے کی چوٹ گاڑ دیئے۔ بنیادی جمہورتیوں کا تعاون اور وفاداری حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ان اداروں کو منافع بخش بدعنوانیوں میں اس طرح لت پت کر دیا جس طرح شہد میں گرنے کے بعد مکھی دوبارہ پرواز کرنے کے قابل نہیں رہتی سائیکلون' سیلاب یا قحط کے مصائب میں غلہ' کپڑا' ادویات اور دیگر مراعات بنیادی جمہورتیوں کے اراکین کچھ تقسیم کرتے تھے

باقی خرد برد کر لیتے تھے' دیہی ترقیاتی پروگرام Rural Works Programme کا سارا کنٹرول بھی انہیں کے ہاتھ میں تھا ان منصوبوں کی بڑی بھاری رقوم ان کے ہاتھوں سے گزرتی تھیں' جن کا بیشتر حصہ ان کی اپنی جیب گرم کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کام کے ٹھیکے فقط اپنے دوستوں اور عزیزوں کو دیتے تھے۔ اور غریب عوام پر فقط دھونس اور دھاندلی جماتے تھے۔ اس عمل سے سارے مشرقی پاکستان میں جگہ جگہ مٹھی بھر لوگ خوشحال اور باقی ساری آبادی ان کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔

جن دنوں میں ہالینڈ میں سفیر کے طور پر متعین تھا' صدر نے مجھے نیویارک ٹائمز (۱۸ جنوری ۱۹۶۵ء کا ایک تراشا بھیجا' جس میں یہ عجیب و غریب خیال آرائی درج تھی۔

> Pakistan may be on its way to an economic milestone that so far has been reached by only one other populars country, the United States of America.

اپنے خط میں صدر نے یہ رونا رویا تھا کہ اگر سات سمندر پار کے اخبارات کو ہماری معاشیاتی ترقی کی رفتار کے متعلق اس قدر آگاہی حاصل ہے' تو ہمارے اپنے لوگ آنکھوں پر پٹی باندھے کیوں بیٹھے ہیں اور کھلے دل سے اس بات کا نوٹس کیوں نہیں لیتے؟

نیویارک ٹائمز کی یہ رپورٹ پڑھ کر میں سمجھ گیا کہ اس میں سچائی اور خلوص نہایت کم اور مبالغہ بہت زیادہ ہے۔ لیکن صدر ایوب نے اپنی سادہ لوحژ سے اسے اپنے دور حکومت کی کامیابی کی سب سے اعلیٰ سند اور دلیل سمجھ رہے تھے۔ ان کے اپنے محکمانہ مشیر بھی خوشامد کے طور پر انہیں اسی قسم کا تاثر دینے میں لگے ہوئے تھے۔ ملک میں نئے کارخانوں کی تعداد تو ہر کوئی بڑھ چڑھ کر بتاتا تھا۔ لیکن یہ کوئی نہ بتاتا تھا کہ ان میں سے کتنے کارخانوں کی مشینری ابھی تک باہر پیٹیوں میں بند پڑی ہے۔ اور کتنے کارخانے اپنی گنجائش اور استعداد سے نہایت کم چل رہے ہیں۔ میں نے صدر ایوب کو لکھا کہ اس قسم کے تلخ حقائق کم و بیش ہمارے اخبار نویسوں کے علم میں ہیں۔ اس لیے وہ ترقیاتی منصوبوں کے متعلق حکومت کے یکطرفہ بیانات پر یقین نہیں لاتے۔ اس

کا واحد علاج یہ ہے کہ متعلقہ شعبے صحیح صورتحال کا سچا اور بے لاگ تجزیہ قوم کے سامنے پیش کریں۔ میرے خیال میں یہ بات انہیں پسند نہ آئی۔ مجھے معلوم ہے کہ نیویارک ٹائمز کا یہی تراشہ انہوں نے میرے جاننے والے کئی دوسرے پاکستانی سفیروں کو بھی بھیجا تھا۔ ان میں سے چند ایک نے انہیں تار کے ذریعے مبارک باد دی' اور اپنے اپنے حلقہ اثر میں امریکی اخبار کے اس بلند بانگ سرٹیفکیٹ کا پرچار کرنے کا بیڑاہ اٹھایا۔

اپنی تمام تر کمزوریوں' خامیوں' ناتمامیوں اور ادھورا پن کے باوجود مجموعی طور پر ایوب خاں کا دور صدارت پاکستان کی نسبتاً واضح معاشیاتی ترقی کا کارنامہ تھا۔ صنعت و تجارت کے علاوہ زراعت کے میدان میں بھی نمایاں پیش رفت ہوئی۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے ساتھ (Indus Basin Water Treaty, 1960) صدر ایوب کا ایک امتیازی کارنامہ ہے۔ کچھ لوگ اس معاہدے کے بعید نتائج پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ لیکن زمانہ حال میں یہ معاہدہ ملک کے لیے بے شک ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ اسی کی وجہ سے بڑے بڑے بندوں' بیراجوں اور نہروں کی تعمیر ممکن ہوئی۔ منگلا ڈیم مکمل ہوا۔ تربیلا ڈیم پر کام شروع کیا گیا۔ بجلی کی پیداوار میں توسیع سے ہزاروں کی تعداد میں ٹیوب ویل اور الیکٹرک پمپ لگائے گئے جن سے سیم اور تھور سے ماری ہوئی لاکھوں ایکڑ اراضی بازیاب ہو کر قابل کاشت بن گئی۔ یہ کوئی انقلابی اقدامات تو نہیں تھے۔ لیکن ہماری تاریخ میں پہلی بار ایک طویل عرصہ تک امن و امان کی فضا میں معاشیاتی استحکام کی طرف چند مثبت قدم اٹھائے گئے۔ ہمارے عوام کا ایک کثیر طبقہ بھی اس حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کرتا ہے۔

○○○

- صدر ایوب اور سیاست دان

صدر ایوب کا المیہ یہ ہے کہ وہ سیاستدانوں کے خلاف گرجتے برستے' ان پر لعن طعن کرتے اور ان کے خلاف نفرت و حقارت کے نعرے لگاتے کرسی اقتدار پر قابض ہوئے پھر دیکھتے ہی دیکھتے لنگر لنگوٹ کس کر بذات خود سیاست کے اکھاڑے میں اتر آئے اور یہیں پر عوام' افواج اور سیاستدانوں کے داؤ پیچ نے انہیں چاروں شانے چت مار گرایا اور گھسیٹ کر اقتدار کے اکھاڑے سے نکال باہر پھینکا۔

سیاست اور سیاستدانوں کے خلاف فیلڈ مارشل کا رویہ کسی گہری سوچ بچار کسی استدلالی چھان بین بالغ نظری کا نتیجہ نہ تھا۔ ان کے ذہن نے بہت سے متفرق اکادکا اور اتفاقی واقعات کو جو کہیں کہیں اور کبھی کبھی رونما ہو چکے تھے' یکجا کر کے کنٹھ مالا کی طرح گلے میں پہن رکھا تھا' ان واقعات کی روشنی میں وہ سیاست اور سیاستدانوں کے خلاف ہر قسم کے الزامات' مفروضات اور نظریات قائم کر کے انہیں حد درجہ ناقص' ناکارہ اور بدراہ ثابت کرنے میں ہمہ وقت کمربستہ رہتے تھے۔ بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان کے بیوروآف نیشنل ری کنسٹرکشن سے انہوں نے خان لیاقت علی خان سے لے کر اپنے زمانے تک نئے اور پرانے چیدہ چیدہ سیاستدانوں کے کردار' گفتار اور اعمال کے متعلق تفصیلی یاداشتیں مرتب کروا رکھی تھیں' جن کا حوالہ دے کر اس موضوع پر وہ اپنی گفتگو کو نہایت چٹخارے دار اور لچھے دار بنانے کے رسیا تھے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان کو وہ دوسرے سیاستدانوں کی نسبت زیادہ دانشمند مدبر اور قابل احترام تسلیم کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ مسٹر حسین شہید سہروردی کے بارے میں ان کا ایک واقعہ بار بار سنانے کے شوقین تھے۔

۱۱ ستمبر ۱۹۵۰ء کو کراچی میں قائداعظم کے دوسرے یوم وفات کی یاد میں ایک بہت بڑا عام جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے کو خطاب کرنے والوں میں آئین ساز اسمبلی کے صدر

تمیزالدین خان سندھ کے محمد ایوب کھوڑو اور سید میراں محمد شاہ' سرحد کے یوسف خٹک کے علاوہ وزیراعظم لیاقت علی خان بھی شامل تھے۔

نوابزادہ لیاقت علی خان کی طویل تقریر میں مسٹر شہید سہروردی کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس موضوع پر ان کی تقریر کے کچھ حصے جو اخبارات میں شائع ہوئے تھے درج ذیل ہیں:

Pakistan Time, Lahore, 13 September, 1950.

"مسٹر سہروردی آج کل ہر روز تقریریں کرنے اور بیانات جاری کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ وہی صاحب ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ کرنے کے بعد یہاں تشریف لائے ہیں۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تھا تو اس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس جماعت کو انڈیا مسلم لیگ اور پاکستان مسلم لیگ کے نام سے تقسیم کر کے دو حصوں میں بانٹ دیا جائے' سہروردی نے مخالفت کر کے انڈیا مسلم لیگ کو قائم نہ ہونے دیا اور اپنے اس موقف کا پرچار شروع کر دیا کہ ہندوستان میں اب فرقہ وارانہ بنیادوں پر کسی جماعت کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ میں پوچھتا ہوں کہ وہاں پر ہندو مہاسبھا اور سکھ اکالی دل جیسی فرقی وارانہ پارٹیاں موجود نہیں تھیں؟ سہروردی کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا اتحاد ختم کر دیا جائے اور آئندہ وہ اپنے اوپر ڈھائے گئے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ اب تک ان کا یہی سب سے بڑا اور شاندار کارنامہ ہے۔"

"اب پاکستان آنے کے بعد بھی مسٹر سہروردی اور ان کی سیاسی جماعت عوامی مسلم لیگ پاکستانی مسلمانوں کے اتحاد اور یقین کو توڑنے مروڑنے میں مصروف عمل ہے۔ سہروردی کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کے حالات دن بدن بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں........ وہ اس قسم کی باتوں کا پرچار کر کے کس کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں؟ بے شک ہمارے دشمنوں نے یہ کتے ہمارے خلاف بھونکنے کے لیے چھوڑ رکھے ہیں۔ یہ لوگ وطن کے غدار ہیں'

جھوٹے ہیں، منافق ہیں......"

"For whose benefit، I ask، is all this being said؟ The enemies of Pakistan have let losse dogs who talk like this. I say thaey are traitors، liars and hypocrites"

وزیراعظم لیاقت علی خان کی تقریر کے مندرجہ بالا حصے صدر ایوب نے اپنی ایک ڈائری میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں درج کر رکھے تھے۔ اقتدار میں آنے کے بعد کچھ عرصہ تک ان کا یہ دستور رہا کہ اپنے چیدہ چیدہ ملاقاتیوں اور نجی محفلوں میں وہ سیاست پر تنقید کرتے ہوئے اس تقریر کا یہ حصہ بھی نہایت چٹخارے لے لے کر سنایا کرتے تھے یہ عمل وہ اتنی بار دہرا چکے تھے کہ میرا اندازہ ہے کہ اس کے بہت سے فقرے انہیں زبانی یاد ہو گئے تھے۔ کئی بار ان کی یہ حرکت بڑی طفلانہ اور مضحکہ خیز نظر آتی تھی، لیکن ان کے ملاقاتیوں اور نجی محفلوں میں شریک ہونے والے افراد کی اکثریت جی حضوریوں پر مبنی تھی، اس لیے کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے ممدوح کو اس بھونڈے اور بچگانہ فعل کی وجہ سے خواہ مخواہ سرمایہ تضحیک بننے سے روکتے۔

سیاست اور سیاستدانوں کو اپنی تنقید کا ہدف بنانے کے ضمن میں صدر ایوب وزیراعظم لیاقت علی خان کے زمانے کی ایک اور مثال بھی بڑے شوق سے بیان کرنے کے عادی تھے۔ جنوری ۱۹۴۹ء میں حکومت پاکستان نے ایک ایسا قانون نافذ کیا تھا۔ جسے عرف عام میں "پروڈا" کہا جاتا تھا۔ اس قانون کا پورا نام یہ تھا:

Public and Representative office (Disqualification) Act

اس قانون کی زد میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے ایسے وزیر، نائب وزیر اور پارلیمانی سیکرٹری آتے تھے۔ جو جانبداری، اقربا پروری اور دیدہ دانستہ بدانتظامی کے مرتکب ہو رہے ہوں۔ اگرچہ یہ ایکٹ ۶ جنوری ۱۹۴۹ء کو جاری ہوا تھا، لیکن عملی طور پر اسے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے نافذ العمل قرار دیا گیا۔ یہ قانون سیاسی عہدہ داروں کے سر پر ایک مستقل شمشیر برہنہ کی طرح آویزاں ہو گیا۔ کیونکہ ان پر بدعنوانیوں کے الزامات عائد کر کے

انکوائریاں شروع کروانا اس ایکٹ کی رو سے ہر کس و ناکس کی دسترس میں دے دیا گیا تھا۔ اگر پانچ افراد ایک ایک ہزار روپیہ چندہ کر کے پانچ ہزار کی رقم کے ساتھ کسی

مرکزی یا صوبائی وزیر کے خلاف الزامات لگا دیں' تو اسے نہایت آسانی سے "پروڈا" کی صلیب پر لٹکایا جا سکتا تھا۔ الزامات ثابت ہونے کی صورت میں "ملزم" کو دس سال تک کے لیے سیاسی عہدوں سے معطل کرنے کی سزا مقرر تھی۔ اس قانون کا سب سے زیادہ استعمال صوبہ سندھ میں ہوا' جہاں صرف ایک وزیر کو چھوڑ کر صوبائی کابینہ کے تمام وزرائے کرام یکے بعد دیگرے اس ایکٹ کی لپیٹ میں آئے۔ ایک جمہوری دور میں جب کہ صوبوں میں بھی ایک ہی سیاسی جماعت کی وزارتیں قائم تھیں۔ اس قسم کے قانون کا نفاذ بلاشبہ محل نظر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قانون ایک سیاسی ہتھیار کی حیثیت سے عالم وجود میں آیا تھا اور سیاسی مقاصد کے لیے استعمال بھی ہوا' لیکن ستمبر ۱۹۵۴ء میں جب آئین ساز اسمبلی اور گورنر جنرل غلام محمد کے درمیان محاذ آرائی شروع ہوئی' تو اس خوفناک ہتھیار کو گورنر جنرل کے ہاتھ سے چھیننے کے لیے اسمبلی نے یہ قانون منسوخ کر دیا۔ اس مثال کو بار بار دہرا کر اس سے صدر ایوب یہ نتیجہ اخذ کیا کرتے تھے کہ وزیراعظم لیاقت علی خان سمیت پاکستان کی تاریخ کے کسی دور میں بھی حکمرانی کا کوئی بھی سیاسی نظام کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ خاص طور پر برطانوی طرز جمہوریت کا تجربہ ہمیشہ ناکام رہا ہے۔

عنان اقتدار سنبھالتے ہی صدر ایوب نے سیاستدانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے دو قانون نافذ کئے۔ پہلا قانون عرف عام میں "پوڈو" کہلایا۔۔۔۔ یعنی 1959

Public Offices (Disqualification) order, 21 March

اپنے پیشرو منسوخ شدہ "پروڈا" کی طرح اس کا اطلاق صرف سیاسی عہدیداروں پر ہوتا تھا اور فرد جرم ثابت ہونے پر پندرہ سال تک سیاسی عہدوں پر فائز ہونے سے نااہلیت کی سزا ملتی تھی۔

لیکن صدر ایوب کا مقصد صرف سیاسی عہدیداروں کی بیخ کنی ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ سیاست

کے میدان میں سرگرم عمل تمام عناصر کو کانٹے کی طرح نکال کر باہر پھینک دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بہت جلد ایک دوسرا قانون بھی نافذ کر دیا۔ جسے "ایبڈو" کے مخفف نام سے شہرت عام نصیب ہوئی۔ یعنی (Disqualification) order, 7 August, 1959 Elective Bodies اس آرڈر کا اطلاق ان سب افراد پر ہوتا تھا' جو کسی سیاسی عہدے پر رہے ہوں یا کسی منتخب شدہ اسمبلی یا ادارے کے رکن بنے ہوں۔ یہ قانون بھی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے نافذ العمل قرار دیا گیا تھا۔ تاکہ نئے اور پرانے سب سیاستدان اس کے پھندے میں جکڑے رہیں۔

"ایبڈو" کے تحت فرد جرم ثابت ہونے پر ملزم کو چھ برس تک سیاست سے کنارہ کش رہنے کی سزا ملتی تھی۔ البتہ اتنی رعایت ضرور تھی کہ اگر کوئی صاحب عدالت میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرنا نہ چاہتے ہوں' تو وہ رضا کارانہ طور پر چھ سال کے لیے سیاست سے دست برداری کا اعلان کر کے اپنی گلو خلاصی کرا سکتے تھے۔

مشرقی پاکستان سمیت قومی اور صوبائی سطح کے ۹۸ ممتاز سیاستدانوں کے خلاف ایبڈو کی کارروائی کی گئی تھی۔ ان میں سے ۷۰ نے رضاکارانہ طور پر چھ سال کے لیے سیاست سے توبہ کر کے اپنی جان چھڑا لی۔ ان میں میاں ممتاز محمد خان دولتانہ' مسٹر محمد ایوب کھوڑو اور خان عبدالقیوم خان کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ۲۸ سیاستدانوں نے اپنی صفائی پیش کر کے مقدمہ لڑا۔ ۲۲ ہار گئے جن میں ایک سابق وزیراعظم مسٹر حسین شہید سہروردی مغربی پاکستان کے سابق گورنر میاں مشتاق احمد گورمانی اور سید عابد حسین شامل تھے۔ صرف چھ سیاستدان ایسے تھے جو بری ہوئے۔

ان بڑے اور ممتاز سیاستدانوں کی فہرست پر نگاہ ڈالی جائے' تو اس زمانے کے سیاست کی کوئی اہم شخصیت "ایبڈو" کی زد سے باہر نظر نہیں آتی۔ نمونہ کے طور پر صرف مغربی پاکستان کے چند چیدہ چیدہ نام درج ذیل ہیں:

۱۔ ملک فیروز خان نون' سابق وزیراعظم

۲۔ سردار امیر اعظم خان' سابق مرکزی وزیر

۳۔ حاجی مولا بخش سومرو' سابق مرکزی وزیر
۴۔ مسٹر یوسف اے۔ ہارون' سابق سفیر
۵۔ خان محمد جلال الدین' سابق مرکزی وزیر
۶۔ قاضی محمد عیسیٰ' سابق سفیر

۷۔ مسٹر حسین شہید سہروردی' سابق وزیراعظم
۸۔ مسٹر سی۔ ای۔ گبن' سابق ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی
۹۔ مسٹر ممتاز حسن قزلباش' سابق چیف منسٹر خیرپور
۱۰۔ خان افتخار حسین خان آف ممدوٹ' سابق وزیر اعلیٰ پنجاب
۱۱۔ پیرزادہ عبدالستار' سابق مرکزی و صوبائی وزیر
۱۲۔ قاضی فضل اللہ' سابق صوبائی وزیر
۱۳۔ پیر الٰہی بخش' سابق صوبائی وزیر
۱۴۔ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ' سابق وزیر اعلیٰ پنجاب
۱۵۔ نواب مظفر علی خان قزلباش' سابق وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان
۱۶۔ سید حسن محمود' سابق صوبائی وزیر
۱۷۔ مسٹر محمد ہاشم گزدر' سابق صوبائی وزیر
۱۸۔ صوفی عبدالحمید' سابق صوبائی وزیر
۱۹۔ خان غلام محمد خان لنڈخور صوبہ سرحد کے سیاستدان
۲۰۔ ارباب نیاز محمد' سابق کرنل پاکستان آرمی
۲۱۔ آغا غلام نبی پٹھان' سابق صوبائی وزیر
۲۲۔ قاضی محمد اکبر' سابق چیئرمین حیدر آباد میونسپلٹی
۲۳۔ مسٹر محمد ایوب کھوڑو' سابق وزیر اعلیٰ سندھ
۲۴۔ مسٹر محمد اکبر خان بگٹی' سابق صوبائی وزیر
۲۵۔ چودھری محمد حسین چٹھہ' سابق صوبائی وزیر
۲۶۔ کرنل محمد امیر خان آف ہوتی' سابق صوبائی وزیر

۲۷۔ ارباب نور محمد خان' سابق صوبائی وزیر
۲۸۔ سید ہادی علی شاہ' سابق میئر لاہور کارپوریشن
۲۹۔ سردار عبدالحمید خان دستی' سابق صوبائی وزیر اور وزیر اعلیٰ

۳۰۔ سید علمدار حسین شاہ گیلانی' سابق صوبائی وزیر
۳۱۔ میر علی نواز خان تالپور' سابق صوبائی وزیر
۳۲۔ چودھری عبدالغنی گھمن' سابق صوبائی وزیر
۳۳۔ سید علی حسین شاہ گردیزی' سابق صوبائی وزیر
۳۴۔ سید عابد حسین' سابق صوبائی وزیر
۳۵۔ بیگم سلمیٰ تصدق حسین' سابق صوبائی ڈپٹی منسٹر
۳۶۔ خان عبدالقیوم خان' سابق وزیر اعلیٰ سرحد
۳۷۔ نواب مشتاق احمد گورمانی' سابق گورنر مغربی پاکستان
۳۸۔ سردار محمد خان لغاری' سابق صوبائی وزیر
۳۹۔ میاں افتخار الدین' سابق رکن مرکزی و صوبائی اسمبلی اور چیئرمین پروگریسو پیپرز لمیٹڈ۔ لاہور

بڑے اور مشہور سیاستدانوں کے علاوہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں دو ہزار سے اوپر نچلی سطح کے سیاسی کارکن بھی "ایبڈو" کا شکار ہوئے۔ یہ وہ حضرات تھے جو ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک کسی وقت بھی کسی اسمبلی' میونسپلٹی' ڈسٹرکٹ بورڈ یا دیگر منتخب شدہ ادارے کے رکن رہ چکے تھے۔

ان اعداد و شمار سے صرف ایک بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ایک فوجی افسر چھاؤنیوں کی محدود فضا میں اپنی عمر عزیز کے باون سال گزارنے کے بعد اچانک مسلح افواج کے ناجائز استعمال سے ایک ہنستی سول حکومت کو زبردستی نکال باہر کرتا ہے اور خود مسند اقتدار پر قبضہ جما کے بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن اس ایک عمل سے یہ لازمی نہیں کہ اس پر عقل و دانش کی ایسی بارش شروع ہو جائے کہ وہ ملک بھر کے تمام اکابرین اور ہزاروں کارکنوں

کو بیک جنبش قلم نااہل' ناکارہ اور نالائق ثابت کرنے میں حق بجانب بھی ہو۔

صدر ایوب کو یہ چسکا تھا کہ "ایبڈو" کی زد میں آئے ہوئے خاص خاص مشہور و معروف سیاستدانوں کی بداعمالیوں اور بدعنوانیوں کی تفصیلات ان کے اپنے علم میں بھی آئیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے باسٹھ ناموں کا انتخاب کیا اور مجھے حکم دیا کہ "ایبڈو" کے تحت مقدمات سماعت کرنے والی خصوصی عدالتوں (Tribunals) سے میں ان سب کے مکمل ریکارڈ حاصل کروں' اور ہر ایک کی بداعمالیوں اور بدعنوانیوں کا خلاصہ تیار کر کے ان کے ملاحظہ کے لیے پیش کروں۔

"ایبڈو" کے ان باسٹھ بلند و بالا پہاڑوں کو جب میں نے کھود کھود کر دیکھا' تو ان میں سے بداعمالیوں اور بدعنوانیوں کی ایسی چھوٹی چھوٹی چوہیاں برآمد ہوئیں جو آج کے ماحول میں انتہائی بے وقعت اور بے ضرر نظر آتی ہیں۔ چند سیاستدانوں پر ان کے مخالفین کی طرف سے وقتاً فوقتاً "غداری" کا الزام ضرور لگ چکا تھا' لیکن کسی فائل میں کسی کے خلاف وطن دشمنی کی کوئی شہادت یا علامت تھی اور نہ کوئی ثبوت تھا۔ ملک کے مفاد کے خلاف کام کرنے کا الزام بھی جگہ جگہ چسپاں تھا۔ لیکن اس کی بنیاد بھی یا تو ذاتی عداوتیں اور مفاہمتیں تھیں یا سیاسی رقابتوں کی وجہ سے ایسے مبہم مفروضوں اور تہمتوں پر مبنی ہوتی تھی جو واقعات اور شواہد کی روشنی میں کسی صورت بھی قابل گرفت قرار نہ پاتی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ باسٹھ نامور سیاستدانوں جو کسی نہ کسی وقت وزیر یا کسی اور عہدے پر رہ چکے تھے۔ ان کے خلاف الزامات کی نوعیت عموماً کچھ اس طرح کی تھی:

سرکاری ٹیلی فون اور سٹاف کار کا بے جا استعمال۔

پی۔ اے۔ یا پرائیویٹ سیکرٹری کے لیے ان کے استحقاق سے زیادہ مراعات۔

اپنے انتخابی حلقوں میں ترجیحی طور پر سڑکوں' سکولوں یا ڈسپنسریوں کی تعمیر۔

اپنے بااثر دوستوں' رشتہ داروں یا سیاستدانوں کے علاقوں میں سڑکیں' سکول یا ڈسپنسریاں

تعمیر کرنے میں ترجیح سلوک۔
اپنے باا‌ثر دوستوں' رشتہ داروں' سیاستدانوں یا ووٹروں کے مفاد میں سرکاری افسروں پر دباؤ یا سفارشیں۔
اپنے انتخابی حلقوں اور اپنے دوستوں اور سیاستدانوں کے علاقوں میں پٹواریوں' تھانیداروں' نائب تحصیلداروں اور دیگر سرکاری کارندوں کے تبادلوں اور تقرریوں میں دخل اندازی۔

انتخابات کے وقت دھاندلی کے بلا ثبوت الزامات۔
سرکاری تقرریوں میں پبلک سروس کمیشن کی سفارشات کو نظر انداز کرنے کا رجحان۔
سرکاری دوروں پر سرکاری انتظامات کا سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے استعمال۔
محکمانہ اخراجات کا منظور شدہ بجٹ سے بڑھ جانے کی مثالیں۔
ایسے منصوبوں کی مثالیں جن پر اخراجات منظور شدہ تخمینوں سے تجاوز کر گئے۔
بے شمار مثالیں جن میں فلاں فلاں ٹیکس لگائے جا سکتے تھے' لیکن اس لیے نہ لگائے گئے کہ سیاسی حکمران ہر دلعزیز بنے رہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔
باٹھ چیدہ چیدہ چوٹی کے سیاستدانوں کے خلاف صدر ایوب نے جب اس قسم کی بے مزہ' پھیکی اور پھسپھسی سی فرد جرم پڑھی' تو وہ بے حد حیران ہوئے۔ انہوں نے تعجب سے کئی بار یہ سوال دہرایا۔ "بس اتنا کچھ ہی ہے؟"
میں نے انہیں یقین دلایا کہ جو فائلیں مجھے دستیاب ہوئی ہیں' ان میں بس اتنا کچھ ہی ہے۔
"اگر یہ بات ہے۔" صدر ایوب نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ "تو یہ ساٹھ ستر جغادری سیاستدان دم دبا کر بھاگ کیوں گئے؟ مردانگی سے کام لے کر ایبڈو کا مقدمہ کیوں نہ لڑے؟"
شاید مارشل لاء سے ڈرتے ہوں۔" میں نے کہا۔ "یا شاید عزت بچانے کی خاطر اپنے آپ ریٹائر ہو کر بیٹھ رہے ہوں۔"
"یہ بات نہیں۔" صدر ایوب نے فیصلہ صادر کیا۔ "تمہاری فائلیں ان کا جرم ثابت کریں

یا نہ کریں۔ لیکن ان کے ضمیر مجرم ہیں۔ یہ بات ان کو بخوبی معلوم ہے۔"
کہنے کو تو انہوں نے یہ بات بڑے طمطراق سے کہہ دی' لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ محض دکھاوے کی بہادری کا ابال تھا۔ ایک تجربہ کار فوجی کی طرح ان میں خود حفاظتی اور خود بقائی کی رگ نہایت مضبوط تھی۔ چنانچہ انہوں نے ذہنی طور پر یہ بات گرہ باندھ لی کہ سیاستدان اتنی گلی سڑی فنا پذیر جنس نہیں ہیں جنہیں "ایبڈو" کی تلوار یا رضاکارانہ طور پر چھ سال کے لیے سیاست سے کنارہ کشی ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دے۔
میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ اس کے بعد رفتہ رفتہ انہوں نے ہر وقت موقع و بے موقع سیاستدانوں کے خلاف بدکلامی' گالی گلوچ اور طعن و تشنیع کا برملا اظہار بہت کم کر دیا۔
ساتھ ہی انہوں نے "بنیادی جمہوریت" کا نظام رائج کر کے سر توڑ کوشش کی کہ ملک میں پرانی طرز سیاست کی جگہ ایک بالکل نئی اور انوکھی سیاست کو جنم دیا جائے۔ ان کو یقین تھا کہ بنیادی جمہوریتوں کے تحت جو اسی ہزار نمائندہ منتخب ہوں گے' ان میں کم از کم کچھ لوگ تو ایسے ضرور نکلیں گے جو قابلیت' ذہانت' وجاہت اور صلاحیت میں پرانے سیاستدانوں کے ہم پلہ یا ان سے بھی ارفع و اعلیٰ ہوں۔ لیکن ان کی یہ امید بر نہ آئی۔ البتہ لگے ہاتھوں بنیادی جمہوریتوں کے اسی ہزار منتخب اراکین کا اتنا فائدہ ضرور اٹھایا گیا کہ ان کے ووٹ حاصل کر کے ایوب خان صاحب نے اپنی صدارت پر مہر تصدیق ثبت کروالی۔ اس استصواب رائے کا نتیجہ مجھے آدھی رات کے بعد معلوم ہوا۔ اس وقت صدر ایوب سو چکے تھے۔ اگلے روز صبح سویرے ان کے پاس گیا' تو وہ بیگم ایوب کے ساتھ بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ان کے حق میں ۷۵۲۸۳ ووٹ ڈالے گئے ہیں جو مجموعی تعداد کا ۹۵.۶ فیصد حصہ ہیں' تو انہوں نے فوراً کاغذ پنسل لے کر ۸۰۰۰۰ میں سے ۷۵۲۸۳ کا ہندسہ تفریق کیا اور کسی قدر مایوسی سے بولے۔ "بلکہ یوں کہو کہ ۴۷۱۷ ووٹ میرے خلاف بھی پڑے ہیں۔" اس کے اس ردعمل سے مجھے

محسوس ہوا کہ وہ اپنے دل کے نہاں خانے میں امید کا چراغ جلائے بیٹھے تھے کہ اس ریفرنڈم میں انہیں سو فی صد ووٹوں سے کامیابی حاصل ہو گی۔ غالباً یہ خوش فہمی ان کی فوجی تربیت کا نتیجہ تھی۔ جہاں کمانڈر کے ایک اشارے پر پوری پلٹن کی پلٹن بے چوں و چرا "فال ان" ہو جاتی ہے!

اس ریفرنڈم کے دو روز بعد ۱۷ فروری ۱۹۶۰ء کو انہوں نے صدر پاکستان کے طور پر ازسر نو حلف اٹھایا اور اس کے فوراً بعد آئین سازی کی طرف متوجہ ہوئے۔ جسٹس شہاب الدین کی سرکردگی میں آئین کمیشن نے جو سفارشات پیش کیں' وہ صدر ایوب کو قابل قبول نہ تھیں۔ اب وہ چند ماہرین کو ساتھ لے کر بذات خود آئین کا خاکہ بنانے میں مصروف ہو گئے۔ یہ عمل بڑا طویل' صبر آزما اور بسا اوقات مضحکہ خیز بن جاتا تھا۔ صدر ایوب انتہائی سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر کرسی پر بیٹھ جاتے تھے۔ ان کے ایک طرف وزیر خارجہ مسٹر منظور قادر آئینی مشیر کے طور پر جگہ سنبھالتے تھے۔ دوسری جانب ایک دو قانونی ماہر بیٹھتے تھے۔ سامنے چند ایسے افسر بٹھائے جاتے تھے جو رائے دینے کی ہمت یا اہلیت تو نہیں رکھتے تھے۔ البتہ نہایت سرگرمی سے ہاں میں ہاں ملانے کے خوب ماہر تھے۔ ایسی محفلوں کی روئیداد قلم بند کرنے کے لیے صدر کے سیکرٹری کے طور پر مجھے بھی حاضر رہنا پڑتا تھا۔ کم و بیش گھنٹہ بھر صدر ایوب اپنے "سیاسی فلسفہ" پر تقریر فرماتے تھے۔ جی حضوری حاضر باش سر ہلا ہلا کر اور ہاتھ نچا نچا کر داد دیتے تھے اور منظور قادر صاحب کو یہ فریضہ سونپا جاتا تھا کہ وہ آج کے صدارتی ملفوظات کو آئینی شقوں میں ڈھال کر لائیں۔

ایک روز صدر ایوب نے حسب معمول اپنے "سیاسی فلسفہ" پر ایک طولانی تقریر ختم کی' تو ایک سینئر افسر وجد کی کیفیت میں آ کر جھومتے ہوئے اٹھے اور سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر عقیدت سے بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "جناب' آج تو آپ کے افکار عالیہ میں پیغمبری شان جھلک رہی تھی۔"

یہ خراج تحسین وصول کرنے کے لیے صدر ایوب نے بڑی تواضع سے گردن جھکائی۔ یہ

سینئر افسر مرزائی عقیدہ سے تعلق رکھتے تھے۔ معاً مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں صدر ایوب سچ مچ اس جھوٹ موٹ کے اڑن کھٹولے میں سوار ہو کر بھک سے اوپر کی طرف نہ اڑنے لگیں۔ چنانچہ اس غبارے کی ہوا نکالنے کے لیے میں بھی اسی طرح عقیدت سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور نہایت احترام سے گزارش کی۔ "جناب' آپ ان صاحب کی باتوں میں بالکل نہ آئیں۔ کیونکہ انہیں صرف خود ساختہ پیغمبروں کی شان کا تجربہ ہے۔"

بات بڑھنے لگی تھی' لیکن صدر ایوب نے بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا اور حکم دیا کہ باہر جانے سے پہلے ہم ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ ہاتھ ملائیں اور گلے ملیں۔

اسی طرح کی چھان پھٹک اور لگاتار محنت کے بعد خدا خدا کر کے صدر ایوب کا آئین مرتب ہوا۔ اس کی نوک پلک درست کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً بیرون ملک سے بھی کچھ ماہرین آتے رہے۔ ۱۹۶۲ء کے شروع ہی سے اس قسم کی خبروں اور افواہوں کا تانتا بندھ گیا کہ عنقریب نیا آئین نافذ ہوتے ہی مارشل لاء اٹھ جائے گا اور اس کے بعد ملک میں ازسر نو سیاسی سرگرمیوں کی اجازت مل جائے گی۔ غالباً ۷ یا ۸ فروری کا دن تھا۔ میں ایوان صدر راولپنڈی میں اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اچانک صدر کا ہیڈ اردلی میرے لیے چائے کی پیالی لے کر آیا اور پریشانی کے لہجے میں رازداری سے بولا۔ آج جی۔ ایچ۔ کیو سے کئی جرنیل صدر صاحب سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ گھنٹہ بھر سے میٹنگ چل رہی ہے۔ بیرا چائے لے کر گیا تو ڈانٹ کر نکال دیا کہ ابھی مت آؤ۔ کبھی کبھی اندر سے کافی بلند آواز سنائی دیتی ہے۔ اللہ خیر کرے۔" یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ کیونکہ فوجی جرنیلوں کے ساتھ اس قسم کی کوئی طویل میٹنگ صدر کے آج کے پروگرام میں درج نہ تھی۔

اس بات کے کوئی نصف گھنٹہ بعد صدر ایوب نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ کسی قدر پریشان سے نظر آتے تھے۔ وہ پھیکے طور پر بددلی سے مسکرائے اور بولے۔ "چند روز قبل اخباروں

میں کسی نجومی نے پیش گوئی کی تھی کہ دنیا عنقریب ختم ہونے والی ہے۔ لیکن آج جو باتیں میں نے سنیں' ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ دنیا کا خاتمہ آج ہی ہونے والا ہے۔"

صدر ایوب نے کسی قدر وضاحت سے مجھے بتایا کہ جی۔ ایچ۔ کیو کے سینئر افسر ان پر یہ زور دینے آئے تھے کہ آئین نافذ کر کے مارشل لاء ہرگز نہ اٹھانا۔ اگر ایسا کیا تو حالات بے حد بگڑ جائیں گے۔ زمین پھٹ جائے گی۔ آسمان گر پڑے گا۔ ان کا اصرار تھا کہ صدر ایوب کم از کم پانچ سال اور مارشل لاء کے زیر سایہ آرام سے حکومت کرتے رہیں۔

"آپ نے ان کو کیا جواب دیا؟" میں نے کسی قدر بے صبری سے پوچھا۔

صدر ایوب مسکرائے۔ "میں نے ان کی بات فوراً مان لی۔ اس شرط پر کہ وہ مجھے یہ گارنٹی لا دیں کہ میں پانچ سال ضرور زندہ رہوں گا!"

غالباً صدر ایوب اس بات پر خوش تھے کہ فوجی افسر ان کی دلیل سے لاجواب ہو کر واپس لوٹ گئے ہیں' لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت کے جرنیلوں میں ایسا کوئی مائی کا لال نہ تھا جو صدر ایوب کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا اور اپنا مطالبہ رد ہوتا دیکھ کر علم بغاوت بلند کر دیتا۔ سول حکومت کے علاوہ فیلڈ مارشل کو اب تک فوج پر بھی پورا کنٹرول حاصل تھا۔ البتہ میرے ذہن میں یہ سوالیہ نشان اب تک باقی ہے کہ ملک میں امن و امان کی صورت حال بالکل درست تھی۔ کوئی بیرونی خطرہ بھی سر پر سوار نہ تھا۔ آئین سازی کا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔ ایک محدود طرز کی لنگڑی لولی جمہوریت کی طرف پیش رفت جاری تھی۔ ایسے ماحول میں آئین نافذ کرنے اور مارشل لاء اٹھانے پر جی۔ ایچ۔ کیو کی اعلیٰ سطح کے جرنیلوں کو اگر اعتراض تھا تو کیوں تھا؟ یہ فروری ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ اس پس منظر میں بعد کے بہت سے واقعات کا زائچہ بنانے کے لیے کسی خاص علم نجوم کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

خدا خدا کر کے یکم مارچ ۱۹۶۲ء کا روز آیا' جب کہ صدر ایوب نے ریڈیو پر تقریر کر

کے اپنے نئے آئین کا اعلان کر دیا۔ اسی روز شام کو کراچی کے گورنر ہاؤس میں ایک پریس کانفرنس بھی بلائی گئی۔ مشرق اور مغربی پاکستان سے قومی' صوبائی اور دوسری سطح کے اخبارات اور رسائل کے بہت سے مدیر جمع ہوئے۔ نئے آئین میں یہ درج تھا کہ آئین کے نفاذ کے دو برس بعد صدر مملکت کا ازسر نو انتخاب ہو گا۔ کابینہ کے چند وزیروں کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ اگر صدر کا انتخاب دو برس کے بعد ہوا تو ان کی وزارت بھی دو برس کے قلیل عرصہ ہی میں ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اپنی وزارتی میعاد کو طول دینے کے لیے انہوں نے یہ چال چلی کہ انہوں نے حیلے بہانے سے صدر پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ آئین میں اپنا انتخاب دو کی بجائے پانچ برس کے بعد رکھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ صدر نے بہت سے انقلابی اصلاحات کا ڈول ڈالا ہوا ہے ان اصلاحات کی بیل منڈھے چڑھانے کے لیے دو برس کا وقفہ نہایت ناکافی ہے۔ اس لیے آئین کی رو سے صدر کا انتخاب پانچ برس کے بعد مقرر ہونا چاہیے۔ (اس نکتے پر جی۔ ایچ۔ کیو کے جرنیلوں اور کابینہ کے نامزد وزیروں میں مکمل ہمخیالی تھی۔) لیکن صدر ایوب اپنے ان خیرخواہ وزیروں کے دل کا اصلی مقصد بخوبی بھانپ گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے کسی کی نہ سنی اور آئین میں اپنا انتخاب دو برس کے بعد رکھنے پر ہی مصر رہے۔ یکم مارچ کو پریس کانفرنس سے چند گھنٹے قبل یہ وزرائے کرام صدر مملکت کے اردگرد شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے رہے اور دو برس کا عبوری دور بڑھانے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے رہے۔ صدر نے انہیں بار بار ڈانٹا ڈپٹا اور اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کیا' لیکن وہ حضرات بھی اپنی دھن کے پکے تھے۔ انتہائی مستقل مزاجی سے اپنی کوششوں میں لگاتار مصروف رہے۔ یہاں تک کہ دوسری منزل پر دربار ہال میں پریس کانفرنس میں جانے کے لیے جب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے' تو ایک وزیر صاحب نے گھٹنے ٹیک کر صدر ایوب کا راستہ روک لیا اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔ "سر' خدا کے لیے عبوری دور کی مدت کچھ تو ضرور بڑھائیے۔"

"اچھا بابا اچھا۔" صدر ایوب نے جھنجلا کر کہا۔ "میری جان خلاصی کرو۔ میں دو سال کی بجائے تین سال کا اعلان کر دوں گا۔"

یہ سن کر میں نے صدر سے کہا۔ "سر آئین کی جو کاپی ہم صحافیوں میں پہلے تقسیم کر چکے ہیں اس میں تو یہ مدت صریحاً دو سال درج ہے۔ اب اچانک اسے بڑھا کر تین سال کا اعلان کرنا ایک خواہ مخواہ کی عجیب سی پس اندیشی نظر آئے گی۔"

صدر ایوب نے جھنجلا کر میری طرف دیکھا اور غصے سے بولے۔ "بس بس۔ اب تم بھی مجھے مزید نروس نہ کرو۔ میں صورتحال سے بخوبی نپٹ لوں گا۔"

اس کش مکش اور کھینچا تانی کے بعد صدر ایوب جب پریس کانفرنس میں پہنچے تو ان کا موڈ کافی خراب اور برہم تھا۔ دربار ہال اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نئے آئین کے متعلق صدر نے اپنا تحریری بیان کسی قدر غصیلے لہجے میں اس طرح پڑھنا شروع کیا جیسے وہ محاذ جنگ پہ بیٹھے دشمن پر گولہ باری کر رہے ہوں۔

جب انہوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ تین برس کے بعد نیا انتخاب لڑیں گے' تو ایک صاحب نے ٹوک کر پوچھا۔ "سر آئین کا جو ڈرافٹ ہمیں تقسیم ہوا ہے۔ اس میں تو دو برس کی مدت درج ہے۔"

"اسے آپ بھول جائیں۔" صدر ایوب نے چڑ کر کہا۔ "میں نے تین برس کا اعلان کیا ہے تو لازماً یہ مدت تین برس کی ہی ہو گی۔"

ایک اور ایڈیٹر نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ "سر' نئے آئین میں کیا ہم اس تبدیلی کو پہلی آئینی ترمیم شمار کرنے میں حق بجانب ہوں گے؟"

یہ سن کر صدر ایوب کا ناریل چٹخ گیا۔ انہوں نے جھلا کر آئینی ترمیم کی اصطلاح پر انتہائی سخت الفاظ استعمال کئے۔ یہ الفاظ سخت ہی نہ تھے' بلکہ ان میں ایک دو غیر ثقہ اور فحش الفاظ بھی در آئے تھے' جن کا استعمال بھری محفل میں بے حد غیر موزوں تھا خاص طور پر جہاں ایک خاتون بھی موجود تھی۔ جونہی صدر ایوب کی نگاہ مشرقی پاکستان

کی اس خاتون صحافی پر پڑی۔ وہ ٹھٹک کر جھینپ گئے اور انتہائی بے بسی سے زیر لب بڑبڑائے۔ "حماقت ہو گئی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔"

اس حادثہ کے بعد صدر ایوب کسی قدر سنبھل کر بیٹھ گئے اور صحافیوں کے سوالوں کے جواب نسبتاً تحمل سے دیتے رہے۔ لیکن بنگالی اخبار سنگ باد کے ایڈیٹر ظہور چودھری نے جب پوچھا کہ کیا اخبارات کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ آئین پر آزادانہ تنقید کر سکیں۔ تو صدر صاحب کا مزاج پھر برہم ہو گیا۔ اس روز ساری پریس کانفرنس کے دوران ان کا پارہ بار بار چڑھا اور بار بار اترا۔ میرے تجربہ میں اس پریس کانفرنس میں صدر ایوب کی کارکردگی انتہائی درجہ کی ہلکی' پست' ناکافی اور کمزور تھی۔

۸ جون ۱۹۶۲ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے صدر ایوب نے نیشنل اسمبلی میں جا کر مارشل لاء اٹھانے کا اعلان کرنا تھا۔ آٹھ بجے وہ تیار ہو کر ایوان صدر کے برآمدے میں آئے' تو جمیل الدین عالی اور میں ان کی تاک میں بیٹھے تھے۔ ہم نے کافی محنت سے کاپی رائٹ قانون کا ایک مسودہ تیار کر رکھا تھا۔ ہماری کوشش تھی کہ مارشل لاء کے دوران ہی یہ قانون آرڈی ننس کے طور پر نافذ ہو جائے تو آسانی رہے گی۔ ورنہ بعدازاں اسمبلی میں جا کر خدا جانے اس کا کیا حشر ہو۔ کیونکہ اسمبلی میں تو لازماً پبلشروں کی لابی بھی اس کے خلاف اپنا اثر و رسوخ بیدریغ استعمال کرے گی۔ چنانچہ جب صدر اپنی کار کی طرف روانہ ہوئے' تو ہم نے انہیں روکا اور برآمدے میں کھڑے ہی کاپی رائٹ آرڈی ننس پر ان سے دستخط کروا لیے۔

پریس کانفرنس میں تو ایک صحافی نے آئین میں پہلی ترمیم کا چٹکلا چھوڑ کر صدر ایوب کو آتش زیر پا کر دیا تھا' لیکن اسمبلیوں کا کاروبار شروع ہوتے ہی آئین میں ترمیمات کا طوفان بدتمیزی اٹھ آیا اور صدر ایوب بڑی خوش دلی سے ان پر برابر آمنا و صدقنا کہتے رہے۔ پہلی ترمیم آئین نافذ ہونے کے بعد چار روز کے اندر اندر عمل میں آ گئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا اور ایوب خان صاحب کے دور صدارت میں ان کے اپنے بنائے ہوئے آئین میں آٹھ بار ترمیم ہوئی۔ آئین کی ۳۹ دفعات تبدیل

کی گئیں۔ ان میں سے چند دفعات تو کئی کئی بار تبدیل ہوئیں۔ ان میں بعض دفعات کا تعلق صدارتی انتخاب سے تھا اور ترمیم کا واحد مقصد یہ تھا کہ اگلے انتخاب میں ہر قیمت پر صدر ایوب کا پلہ بھاری رہے۔ اس کے علاوہ ایک پورے کا پورا باب تبدیل کر کے بالکل نئے سانچے میں ڈھال دیا گیا۔ جس سرعت اور تواتر سے ترمیم و تجدید کا یہ عمل وقوع پذیر ہو رہا تھا اس سے یہی شبہ پیدا ہوتا تھا کہ صدر ایوب کے احاطہ فکر میں آئین کے تقدس نام کی کوئی شے سرے سے موجود ہی نہیں۔

یوں بھی جن اصولوں کی آڑ لے کر صدر ایوب نے اپنا فوجی انقلاب برپا کیا تھا' بہت جلد وہ بھی ریت کی دیوار کی طرح اسی طرح معدوم ہونے لگے۔ جس طرح ان کے اپنے بنائے ہوئے آئین کا حلیہ تبدیل ہو رہا تھا۔ معاشرے کو سیاسی جماعتوں سے نجات دلانا ان کا ایک نہایت بلند بانگ دعویٰ تھا' لیکن مارشل لاء اٹھے ہوئے ابھی چالیس دن بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ صدر کی منظوری کے ساتھ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ جاری ہوا جس کی رو سے اسمبلیوں کے اندر اور باہر سیاسی جماعتیں ازسر نو بحال ہو گئیں۔ اس قانون کے نافذ ہوتے ہی صدر ایوب اپنے نام نہاد انقلابی نصب العین کے بلند پایہ ستون سے لڑھک کر دھڑام سے نیچے گرے اور سیاست کی اسی دلدل میں آ پھنسے جس کی سڑاند اور عفونیت مٹانے کے لیے انہوں نے مارشل لاء کا سارا کھڑاگ کھڑا کیا تھا۔

اس نئی صورت حال میں صدر ایوب کا زاویہ نگاہ یکسر بدل گیا۔ اور جو پرانے سیاستدان "ایبڈو" کی زد میں آ کر چھ سال کے لیے معطل ہو چکے تھے' ان کی نظر میں وہ لوگ بھی یکایک پسندیدہ اور قابل اعتماد بن گئے۔ چنانچہ صدر ایوب کے ایما سے قومی اسمبلی میں ایک بل پیش کیا گیا کہ "ایبڈو" کے تحت سیاست دانوں پر عائد کی ہوئی پابندیاں اٹھائی جائیں' لیکن اسمبلی میں آئے ہوئے نئے سیاستدانوں کو اس میں اپنے لیے شدید خطرات نظر آئے۔ چنانچہ انہوں نے اس بل کو مسترد کر دیا۔ ان نئے حالات میں صدر ایوب نے پہلے اپنی ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ اس میں دال

گلتی نہ دیکھی' تو پھر ان کی نگاہ انتخاب مسلم لیگ پر پڑی۔ دل ہی دل میں وہ اس جماعت کی قیادت کو ایک طرح سے اپنی جائز وراثت بھی سمجھتے تھے۔ ان کے گرد روز افزوں بڑھتے ہوئے خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں کا ایک گروہ رفتہ رفتہ انہیں اس غلط فہمی میں مبتلا کر رہا تھا کہ صدر ایوب قائداعظم کے صحیح جانشین پیدا ہوئے ہیں اور جو کام محمد علی جناح ادھورا چھوڑ گئے ہیں۔ انہیں پورا کرنا ایوب خان کے مقدر میں لکھا ہے۔ کبھی کبھی چند ایک پیشہ ور روحانی بزرگ بھی انہیں اس قسم کے نوشہ تقدیر کی خوشخبری سنا کر نذرانے میں اپنے لیے کوئی ٹرانسپورٹ روٹ پرمٹ یا امپورٹ لائسنس یا زمین کا پلاٹ حاصل کر لیتے تھے۔ سیاسی گماشتے اور دلال تو خیر کاسہ گدائی ہاتھ میں لیے ہر وقت ان کے گرد منڈلانے کے لیے تیار ہی رہتے تھے۔

صدر ایوب ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے ملک میں سیاست پیسے کا کھیل ہے۔ جس کے پاس دولت کی کمی ہے۔ وہ سیاست میں بھی ناکام ہے۔ چنانچہ انہوں نے بعض سیٹھ صاحبان سے چندہ جمع کر کے ایک اچھی خاصی رقم مسٹر اے۔ کے۔ ایم فضل القادر چودھری کے حوالے کی۔ مشرقی پاکستان کے یہ صاحب پرانے مسلم لیگی تھے۔ پہلے صدر ایوب کی کابینہ میں وزیر تھے۔ بعدازاں قومی اسمبلی کے سپیکر رہے۔ ان کی یہ ڈیوٹی لگی کہ مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے کے لیے وہ صدر ایوب کی راہ ہموار کریں۔

ان دنوں مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا مرکز ڈھاکہ بنا ہوا تھا۔ جماعت کی تنظیم نو کے لیے بزرگ مسلم لیگی لیڈر مولانا اکرام خان کے مکان پر پرانے رہنماؤں کے بہت سے اجتماع ہوئے اور مسلم لیگ کونسل کی ایک میٹنگ منعقد کرنے کا اعلان بھی جاری ہوا۔ یہ اعلان سن کر صدر ایوب کے سیاسی دلالوں پر مردنی چھا گئی۔ کیونکہ ڈھاکہ مسلم لیگ کونسل میں بیشتر تعداد ان پرانے' مستند اور کٹر رہنماؤں کی تھی جو صدر ایوب کو اپنی صفوں میں جگہ دینے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے۔ چنانچہ اس کاروبار کو سبوتاژ کرنے کے لیے فضل القادر چودھری صاحب جملہ سازوسامان سے لیس ہو کر بھاگم بھاگ ڈھاکہ پہنچے۔

تفصیلات کا تو مجھے علم نہیں' لیکن انہوں نے کسی نہ کسی طرح مولانا اکرم خان کو شیشے میں اتار لیا اور بغیر کوئی وجہ بتائے مولانا نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کا اعلان منسوخ کر دیا۔ ساتھ ہی مسٹر چودھری نے ڈھاکہ سے میرے سیکروفون پر صدر کے لیے پیغام بھیجا' کہ سیاسی مقاصد کے لیے جو فنڈ ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ ختم ہو چکا ہے اور اب انہیں مزید پانچ لاکھ روپے کی فوری ضرورت ہے۔

ایک دو روز بعد یہ خبر بھی شائع ہو گئی کہ عنقریب مسلم لیگ کی ایک نمائندہ کنونشن راولپنڈی میں منتعقد ہو گی جس میں ایک ہزار سے زیادہ لیڈر اور کارکن شرکت کریں گے۔ بعدازاں اس کنونشن کا مقام انعقاد راولپنڈی سے تبدیل ہو کر کراچی مقرر ہو گیا۔ مولانا اکرام خان کو اس کنونشن کی صدارت کے لیے پھانسنے کے لیے سر توڑ کوشش ہوئی۔ ان کے انکار پر چند وزیروں نے ان کے اخبار "آزاد" کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دیں۔ لیکن مولانا بدستور اپنے انکار پر اڑے رہے۔

مولانا اکرام خان کی طرف سے مایوس ہو کر کنونشن کی صدارت راجہ صاحب محمود آباد کو پیش کی گئی' راجہ صاحب انتہائی سلجھے ہوئے' دیانتداری' پرخلوص اور پاکیزہ سیرت انسان تھے۔ جب انہوں نے بھی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا' تو ایک روز صدر ایوب نے مجھ سے کہا۔ "یہ تمہارے دوست راجہ صاحب بھی صرف باتیں بنانا جانتے ہیں۔ ملک کی خدمت کے لیے اگر انہیں کوئی عملی کام سونپا جائے تو جان چھڑا کر بھاگتے ہیں۔ معلوم نہیں بے چارے قائداعظم ایسے بے عمل لوگوں کے ساتھ کیسے گزارہ کر لیتے تھے۔"

میں نے یہ بات راجہ صاحب کو سنائی' تو وہ مسکرائے اور بولے۔ "صدر صاحب کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے کنونشن کی صدارت کے لیے ایک نہایت کارآمد نام تجویز کر دیا ہے اور انہوں نے اسے منظور بھی کر لیا ہے؟"

"وہ کون سا نام ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"چودھری خلیق الزماں۔" راجہ صاحب نے بتایا۔ "اس کام کے لیے ان سے زیادہ اور کون

شخص موزوں ہو سکتا ہے؟"

چودھری خلیق الزماں صاحب بھی پرانے منجھے ہوئے سیاستدان تھے۔ ۱۹۴۰ء کے تاریخی لاہور ریزولیشن کا متن انہیں کا ڈرافٹ کردہ تھا۔ بعض وجوہات سے وزیراعظم لیاقت علی خان کے زمانے میں مسلم لیگ کے حلقوں میں چودھری صاحب کی حیثیت کسی قدر متنازعہ فیہ چلی آ رہی تھی' لیکن صدر ایوب کی بنائی ہوئی کنونشن مسلم لیگ کو انہوں نے نہایت چابکدستی اور ہنر مندی سے سنبھالا۔ اپنی شیریں بیانی' خوش کلامی اور حکمت عملی سے انہوں نے صدر ایوب کے دماغ سے مسلم لیگ کی قیادت کا کیڑا نکال باہر پھینکا اور رفتہ رفتہ انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل تو ضرور ہو جائیں' لیکن ایک عام رکن کی حیثیت سے! چنانچہ مئی ۱۹۶۳ء میں ایوان صدر راولپنڈی میں ایک خاص گورنر کانفرنس منعقد ہوئی۔ مرکزی وزیروں کے علاوہ بعض چیدہ چیدہ صوبائی وزیر بھی اس میں شامل ہوئے۔ کنونشن مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں خصوصی دعوت پر شریک محفل ہوئے۔ موضوع بحث یہ تھا کہ صدر ایوب کو کنونشن مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کرنی چاہیے یا نہیں۔ چودھری خلیق الزمان نے ایک فصیح و بلیغ طولانی تقریر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ صدر ایوب کا مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کرنا ہی ملک اور قوم کے بہترین مفاد میں ہے۔ اس کے بعد نواب کالا باغ سمیت تمام حاضرین نے یکے بعد دیگرے اس تجویز کی نہایت شدت سے تائید کی۔ چنانچہ مبارک سلامت کے غلغلے میں صدر نے دو فارموں پر دستخط کر کے کنونشن مسلم لیگ کی دہری رکنیت حاصل کر لی۔ ایک مشرقی پاکستان کی طرف سے' دوسری مغربی پاکستان کی جانب سے۔ اس کے بعد دعائے خیر ہوئی۔ پھر کسی من چلے نے رکنیت کا فارم نواب کالا باغ کے سامنے رکھ دیا کہ وہ بھی اس پر دستخط کر کے کنونشن مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ نواب صاحب نے جھٹک کر یہ فارم اس طرح کھینچ کر دور دے مارا' جیسے ان کے دامن پر کوئی

بچھو آ گرا ہو' ساتھ ہی وہ کسی قدر ناراضگی سے بولے۔ "ارے بابا۔ مجھے معافی دو۔ مجھے خواہ مخواہ اس گندگی میں کیوں گھسیٹتے ہو۔"

اتفاق سے یہ فقرہ صدر ایوب نے بھی سن لیا۔ حیرت اور شکایت کے ملے جلے انداز سے گھور کر وہ کچھ لب کشائی کرنے والے تھے کہ نواب صاحب نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا اور انتہائی لجاجت اور انکساری سے کسمسا کر بولے۔ "عالی جاہ۔ گورنر تو جناب کے لگائے ہوئے ادنیٰ غلام ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دوسرے سرکاری ملازمین کی طرح گورنروں کو بھی سیاست سے الگ رکھنا ہی مناسب ہو گا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے تائید حاصل کرنے کے لیے مشرقی پاکستان کے گورنر عبدالمنعم خان کی طرف دیکھا' جو ناک سکیڑے اور تیوریاں چڑھائے اپنے گلے سے فوں فاں' غوں غاں' شوں شاں قسم کی بے معنی سی آوازیں برآمد کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے انداز سے کسی پر یہ عقدہ نہ کھل سکا کہ وہ نواب صاحب کے موقف کی تائید کر رہے ہیں یا تردید۔

اس کے چند روز بعد ایک شادی کی تقریب میں میری ملاقات چودھری خلیق الزماں صاحب سے ہوئی۔ وہ نہایت ہشاش بشاش اور خوشگوار موڈ میں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے۔ "لو میاں شہاب' میں نے تمہارے فیلڈ مارشل کی فوجی وردی اتار کر انہیں مسلم لیگ کے دونی مارکہ کارکنوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔"

"چودھری صاحب' اب تو یہ فرمائیے کہ مسلم لیگ اور ایوب خان دونوں کا اپنا کیا حشر ہو گا؟" میں نے سوال کیا۔

چودھری خیق الزمان نے چہک کر ایک زور کا قہقہہ لگایا اور پھر انہوں نے لہک لہک کر یہ شعر پڑھا:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

ہمارے قریب ہی ایک صاحب ہماری باتوں کی طرف کان لگائے ہمہ تن گوش کھڑے تھے۔ شعر سن کر وہ بدکے اور کان کھجاتے ہوئے ہمارے درمیان آ کھڑے ہوئے آتے ہی انہوں نے اسی بحر' قافیہ اور ردیف میں ایوب خان اور مسلم لیگ کے متعلق ایسے فحش اور مغلظات سے بھرے ہوئے اشعار سنانے کا تانتا باندھ دی اکہ الحفیظ و الامان۔ چودھری خلیق الزماں تو چپکے سے وہاں سے کھسک گئے' لیکن چند دیگر لوگوں نے آ کر ہمیں گھیر لیا اور ایک ایک فحش شعر پر بڑھ چڑھ کر داد دینے لگے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شعر سنانے والے صاحب چودھری خلیق الزماں کے بھائی تھے اور ان کا اسم گرامی غالباً مشفق الزماں تھا۔ سنا ہے کہ ان کے پاس بہت سے موضوعات پر فحش اور غلیظ اشعار کا بہت بڑا ذخیرہ موجود رہتا تھا اور ایسے اشعار سناتے وقت ترنگ میں آ کر وہ خواتین اور بچوں کی موجودگی کا بھی کوئی لحاظ نہ فرماتے تھے۔

میرے نزدیک بھی صدر ایوب کا سیاست کے خارزار میں قدم رکھنا ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ بدشگونی کے طور پر ان کا پہلا قدم ہی ایک پیچیدہ تخریب کا باعث بن گیا۔ وہ یہ کہ قائداعظم کی مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ہو کر کنونشن مسلم لیگ اور کونسل مسلم لیگ بن گئی۔ اس طرح بٹ کر یہ جماعت مستقبل میں کوئی موثر کردار ادا کرنے سے قطعاً معذور ہو گئی۔ موجودہ زمانے میں مزید حصے بخرے ہو کر یہ تین گروہوں میں بکھر گئی ہے جن کا وجود اصولوں کے بجائے چند شخصیتوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ قیوم مسلیم لیگ خواجہ خیر الدین لیگ اور پیر پگارا مسلم لیگ۔ ان تینوں گروہوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو قومی سطح پر کسی سنجیدہ اور باوقار قیادت کا علمبردار ہو۔

سیاست میں داخل ہو کر مسلم لیگ کی شکست و ریخت کے علاوہ صدر ایوب نے اور

کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ سیاست پر انہوں نے اپنی الگ کوئی خاص چھاپ نہیں لگائی' بلکہ اس کے برعکس وہ مروجہ سیاست کے انہی ٹیڑھے ترچھے سانچوں میں برضا و رغبت ڈھلتے گئے' جن کی تطہیر کے لیے انہوں نے مارشل لاء کا سوانگ رچایا تھا۔

اگر ۸ جون ۱۹۶۲ء کو مارشل لاء اٹھانے کے بعد صدر ایوب اپنا وضع کردہ آئین قومی اسمبلی کے سپرد کر کے کہتے کہ سپر دم بتومایہ خویش را۔ تو دانی حساب کم و بیش را۔ اور اس کے بعد خود کنارہ کش ہو کر گوشہ عافیت اختیار کر لیتے' تو تاریخ کا دھارا کوئی اور رخ اختیار کرتا؟

فیلڈ مارشل لاء کی وفات سے کئی ماہ پہلے یہی سوال میں نے ان کے سامنے اسلام آباد میں دہرایا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر سنجیدگی سے بولے۔ "تمہارا یہی سوال ہے نا کہ مارشل لاء اٹھا کر اور نیا آئین نیشنل اسمبلی کے سپرد کر کے اگر میں گھر آ بیٹھتا' تو پھر کیا ہوتا؟ میرا جواب سن لو کہ پھر یقیناً جنرل موسیٰ ہوتا۔"

جنرل موسیٰ اس زمانے میں پاکستانی فوج کے کمانڈر ان چیف تھے۔

سات برس بعد جب صدر ایوب واقعی گھر آ کر بیٹھ رہنے پر مجبور ہو گئے' تو ان کی جگہ آئین کے مطابق قومی اسمبلی کے سپیکر نے نہ لی' بلکہ جنرل یحییٰ آئین منسوخ کرنے کے بعد مارشل لاء لگا کر اقتدار سنبھال بیٹھے۔

یہ بھی تاریخ کی ایک عجیب ستم ظریفی ہے کہ پاکستان میں آئین بنتے ہی ایک نہ ایک فوجی جرنیل اس کا سر کچلنے کے لیے مارشل لاء کا گرز اٹھائے تیار کھڑا ہوتا ہے۔ چودھری محمد علی والا آئین تین برس چل کر جنرل ایوب خان کے ہاتھوں منسوخ ہو گیا۔ ایوب خان کا آئین سات برس بعد جنرل یحییٰ خان نے پاؤں تلے روند ڈالا۔ ۱۹۷۳ء کا ہمہ جماعتی متفقہ آئین بھی۔ ۱۹۷۷ء سے جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء میں ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے! آئین کی پے در پے پامالی کے بعد وطن عزیز میں اس افسوسناک اور تشویشناک صورت حال کی وجہ آخر کیا ہے؟ کیا اس کہ وجہ آئین کی متواتر اور مزمن

بے وقعتی ہے؟ یا شعبہ سیاست کی کم مائیگی و بدحالی ہے یا بری فوج کے کمانڈر انچیف کی نفسیات میں ایسے اجزا شامل ہو گئے ہیں کہ سول حکومت پر قبضہ جمانے کی ترغیب کے سامنے اس کی قوت مزاحمت جواب دے جاتی ہے؟

صدر ایوب کے آئین کے نفاذ کے سوا سال بعد جب میں بطور سفیر تعینات ہو کر ہالینڈ جا رہا تھا' تو میں اس وقت کے بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ کو خدا حافظ کہنے جی۔ ایچ۔ کیو۔ گیا۔ باتوں باتوں میں مجھے یہ صاف اندازہ ہو گیا کہ جنرل موسیٰ بڑی بے چینی سے اس امر کا جائزہ لے رہے ہیں کہ اگر وہ مارشل لاء کے ذریعے صدر ایوب کی حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ تو اس کارروائی پر ملک بھر میں کیا ردعمل ہو گا؟ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی ہمت کی کمی اور شخصیت کی کمزوری کی وجہ سے وہ اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کبھی کوئی معمولی سا قدم بھی اٹھانے سے معذور ہے' البتہ ان کے بعد آنے والے کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان کا حال دوسرا تھا۔ کمانڈر انچیف کے طور پر یحییٰ خان کا انتخاب اخباروں میں شائع ہوا' تو کئی خفیہ نویس اداروں نے صدر ایوب کو یہ رپورٹیں بھیجیں کہ اس خبر کے بعد ملتان' لاہور اور راولپنڈی میں یحییٰ خان کے قریبی رشتہ داروں نے بغلیں بجائیں' چراغاں کیا' اور اس اعلان کے ساتھ مٹھائی بانٹی کہ "اب صدارت ہمارے گھر میں آ گئی ہے۔"

خدا کرے موجودہ مارشل لاء کی حکومت ہمارے وطن عزیز میں اس طرز کی آخری حکومت ثابت ہو۔ اس کے بعد مسلح افواج برضا و رغبت اپنے پیشہ ورانہ دائرہ کار میں قناعت پذیر ہو کر ترقی اور عروج کی منزلیں طے کریں۔ عدلیہ اور سیاست آزاد ہو کر اپنا فطری کار منصبی سنبھالیں۔ جمہوری ادارے ازسر نو قائم ہوں۔ پے در پے انتخابات اس لیے بھی لازمی ہیں کہ سیاسی عمل سے چھن چھن کر نئی قیادت جنم لے۔ نئی قیادت ہماری سب سے اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ پرانی قیادت جو کسی نہ کسی وقت عملی یا ذہنی یا جذباتی طور پر مارشل لاء کی آکسیجن سے چوری چھپے سانس لے لے کر سسکتی رہی ہے۔

اب مکمل طور پر دم توڑ چکی ہے اور کوئی سیاسی معجزہ اب اسے دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا۔ مستقبل اب نئی قیادت کا منتظر ہے۔ اس وقت تک ایک خلا کی سی کیفیت طاری رہے گی۔ جس کے متعلق یہ بھی ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ خانہ خالی را دیومی گیرد۔

○○○

- صدر ایوب اور طلباء

مرکزی وزارت تعلیم کا سیکرٹری متعین ہونے سے پہلے صدر ایوب ایک روز مجھے اپنے ساتھ اپنے آبائی گاؤں ریحانہ لے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ان کی والدہ محترمہ' جو اس وقت بقید حیات تھیں' آج ان سے شدید ناراض ہیں اور ان کے ساتھ ملاقات نہیں کریں گی۔ یہ خبر سن کر صدر صاحب پریشان ہو گئے اور اپنے چند عزیزوں کی وساطت سے اپنی والدہ کی خفگی کی وجوہات معلوم کرنے میں مصروف ہو گئے۔

کسی قدر تگ و دو کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ صدر ایوب کی والدہ محترمہ کو ان کے خلاف تین شکایات تھیں۔ ایک شکایت یہ تھی کہ پریذیڈنٹ ہاؤس کی موٹر کاریں جب کسی کام پر گاؤں میں آتی ہیں' تو یہاں کی چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر وہ بڑی تیز رفتاری سے چلتی ہیں جس سے لوگوں کی جان و مال کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ جو گاڑی بھی گاؤں میں آئے وہ آرام سے آہستہ اور احتیاط کے ساتھ چلے۔

دوسری شکایت یہ تھی کہ گاؤں کے کئی لڑکے کالج کی تعلیم ختم کر کے گھروں میں بے کار بیٹھے ہیں۔ ان کو نوکری کیوں نہیں ملتی؟ اگر نوکری نہیں ملتی تھی' تو کالجوں میں پڑھایا کیوں گیا؟

بڑی بی کو تیسری شکایت یہ تھی کہ میری زمین کا پٹواری ہر فصل کے موقع پر پچاس روپے فصلانہ وصول کر کے خوش رہا کرتا تھا' لیکن اب وہ زبردستی سو روپے مانگتا ہے' کیونکہ وہ کہتا ہے کہ تمہارا بیٹا اب پاکستان کا حکمران ہو گیا ہے۔ اس لیے پچاس روپے کا نذرانہ میرے لیے بہت کم ہے۔ بڑی بی کو گلہ تھا کہ ایوب خان کی حکومت میں رشوت کا ریٹ ڈبل کیوں ہو گیا ہے؟

واپسی پر صدر ایوب نے اقبال کیا کہ اماں کہ پہلی شکایت کا ازالہ ناممکن ہے' کیونکہ

این۔ کول کا تذکرہ کیسے آ گیا؟" ہندوستانی افسر نے انہیں بتایا کہ میں بھی جموں میں کول کے کالج ہی میں پڑھ چکا ہوں۔ پنڈت جی مسکرائے اور بولے۔ "ان کو بھی تو کبھی کشمیر آنے کی دعوت دو۔ ہماری طرف سے خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ ہو گی۔"

میں نے نہایت احترام سے گزارش کی۔ "سر' اگر آپ کی وجہ سے کشمیر کا مسئلہ ہی حل ہو جائے' تو اس سے بڑی خاطر تواضع اور کیا ہو سکتی ہے؟" یہ سنتے ہی پنڈت جی کے تیور بگڑ گئے' جیسے ان کے منہ میں زبردستی کڑوی گولیاں ٹھونس دی ہوں۔ انہوں نے بے اعتنائی سے گردن گھمائی اور منہ دوسری جانب موڑ کر بیٹھ گئے۔

مری میں صدر ایوب نے پنڈت جی کے ساتھ خاص خاطرداری سے کام لیا۔ لیکن اس تواضع اور تپاک نے بھارتی وزیراعظم کے دل میں جمی ہوئی سردمہری کی برف پر گرم جوشی کی ایک ہلکی سی آنچ بھی نہ ڈالی۔ صدر ایوب نے نقشوں کی مدد سے پاکستان کے لیے کشمیر کی دفاعی اور معاشیاتی اہمیت پر پوری پوری روشنی ڈالی اور کہا کہ پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان کے مسلمہ لیڈر ہیں۔ پاکستان میں بھی لوگ میری بات سنتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم نے اپنی زندگی میں قضیہ کشمیر کا حل تلاش نہ کیا تو یہ موقعہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اور پھر شاید کبھی دوبارہ ایسا موقع ہاتھ نہ آئے۔

پندت جی نے صدر ایوب کی تمام باتیں نہایت توجہ اور انہماک سے سنیں۔ پھر سوچ سوچ' کر ایک ایک لفظ تول تول کر انہوں نے نہایت صاف گوئی سے اپنا موقف اس طرح واضح کیا کہ کشمیر کا مسئلہ بہت سی غیر معمولی پیچیدگیوں میں الجھا ہوا ہے۔ اسے جوں کا توں پڑا رہنے دیا جائے تو اسی میں ہم سب کی عافیت ہے کشمیر میں دو بار انتخابات منعقد ہو چکے ہیں۔ اب عنقریب تیسرا انتخاب بھی آنے والا ہے۔ وہاں پر حالات امن و امان کی فضا میں مستحکم ہو رہے ہیں۔ ان حالات کو دگرگوں کرنے کی کوشش کرنا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہو گا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اقلیت کو بھی ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ انہیں ہندوستانی قوم میں ضم کرنے کا

عمل جاری ہے۔ اگر کشمیر میں موجودہ صورت حال کو الٹ پلٹ کیا گیا' تو اس عمل میں شدید رکاوٹ پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ دوسرے الفاظ میں پنڈت نہرو نے صدر ایوب کے سامنے ہندوستانی مسلمانوں کو مسئلہ کشمیر کا یرغمالی بنا کے بٹھا دیا یعنی اگر مسئلہ کشمیر کو از سر نو چھیڑنے کی کوشش کی گئی تو سارے ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ صدر ایوب کے پاس اس کھلی دھمکی اور انوکھی منطق کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس لیے وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اور اس طرح مری کی سات ہزار فٹ کی بلندی پر مسئلہ کشمیر ایک بار پھر برفدان میں ڈال کر سربمہر کر دیا گیا۔

کشمیر کے معاملے میں پنڈت نہرو کی خواہشات اور عزائم نے ایک نیا گل اس وقت کھلایا' جب ۱۹۶۴ء میں شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ پاکستان کے دورے پر تشریف لائے۔ ان دنوں میں ہالینڈ میں بطور سفیر متعین تھا۔ میری واپسی کے بعد ایک بار مجھے صدر ایوب نے خود بتایا کہ چکلالہ کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی انہوں نے پے در پے ایسے بیانات دینا شروع کر دیئے ہیں جن میں بھارت کی نام نہاد سیکولرزم' دوستی اور امن پسندی کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف کا پرچار تھا۔ اس کے علاوہ ان دونوں حضرات نے پنڈت نہرو کے گن گا گا کر برملا یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ تین آزاد ممالک یعنی ہندوستان' پاکستان اور کشمیر کی ایک کنفیڈریشن بنانا ہی ہمارے تمام مسائل کا واحد حل ہے۔ صدر ایوب کا کہنا تھا کہ یہ سن کر وہ ان دونوں سے بے حد مایوس ہوئے اور ان سے کہا کہ اگر آپ ہندوستان کی طرف سے یہی مشن لے کر آئے ہیں' تو آپ سے کسی معاملے میں کوئی سنجیدہ گفتگو کرنا بے کار ہے۔ البتہ آپ ہمارے معزز مہمان ہیں۔ جہاں جی چاہے خوشی سے گھومئے پھریئے' جس کے ساتھ جی چاہے آزادی سے ملئے جلئے۔ ہماری طرف سے آپ کے لیے ہر طرح کی سہولت حاضر ہے۔

شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ پاکستان کے دورے پر ہی تھے کہ پنڈت جواہر لال نہرو دہلی میں سرگباش ہو گئے۔ اگر واقعی کنفیڈریشن کا خناس ان کے ذہن میں سمایا ہوا تھا تو یہ فتنہ بھی ان کی موت کے ساتھ اپنے آپ ختم ہو گیا۔

مری میں قیام کے دوران پنڈت نہرو نے صدر ایوب سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ چین کے ساتھ کسی قسم کی سرحدی معاہدہ طے کرنے کے لیے گفت و شنید کر

رہے ہیں؟ صدر ایوب نے سچ سچ بتا دیا کہ اس موضوع پر بات چیت ضرور ہو رہی ہے' لیکن یہ معاملہ ابھی تک بالکل ابتدائی مراحل میں ہے۔ پنڈت جی نے اپنی شاطرانہ چال کو ہمدردانہ لہجے میں لپیٹ کر وہ نقشہ دیکھنے کی فرمائش کی جس کی بنیاد پر ہم چین کے ساتھ اپنی سرحدیں طے کرنا چاہتے ہیں۔ صدر ایوب نے بغیر سوچے سمجھے انتہائی سادہ لوحی سے متعلقہ نقشہ کھول کر ان کے سامنے بچھا دیا۔ پنڈت جی نے ایک اور داؤ کھیلا اور درخواست کی کہ کیا آپ اس نقشے کی ایک نقل مجھے عطا فرما سکتے ہیں۔ صدر ایوب نے پھر بغیر سوچے سمجھے سادہ لوحی سے فوراً حامی بھر لی۔ ان دونوں کے درمیان یہ گفتگو سراسر ذاتی' غیر رسمی اور دوستانہ سطح پر ہوئی تھی لیکن دہلی واپس پہنچتے ہی پنڈت نہرو نے بات کا بتنگڑ بنا ڈالا' اور چین اور پاکستان کے مابین سرحدی گفت و شنید کو ملی بھگت قرار دے کر اس کے خلاف کڑی تنقید شروع کر دی ساتھ ہی سرکاری سطح پر بھارتی حکومت نے احتجاجی انداز میں وہ نقشہ بھی طلب کر لیا جس کی بنیاد پر پاکستان چین کے ساتھ اپنے سرحدی معاملات طے کرنا چاہتا تھا یہاں پر ہماری متعلقہ وزارتوں کا مشورہ تھا کہ بھارت کا یہ رویہ ناجائز ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے انہیں نقشہ فراہم کرنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن صدر ایوب مصر تھے کہ انہوں نے پنڈت نہرو سے وعدہ کر لیا ہے' اور اب وہ اس معاملے میں کسی قسم کی وعدہ خلافی بالکل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مجبوراً' مطلوبہ نقشے کی نقل سرکاری طور پر بھارتی حکومت کو ارسال کر دی گئی۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی تمام چالبازیوں' قلابازیوں' وعدہ خلافیوں اور ہٹ دھرمیوں کے باوجود غالباً صدر ایوب کے دل میں امید کی یہ کرن ٹمٹماتی رہی کہ شاید دنیا کے دوسرے بڑے لیڈر پنڈت جی پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے پاکستان کے بارے میں انہیں راہ راست پر لانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس زمانے میں امریکہ میں صدر کینیڈی کی ایک نئی اور

جوان قیادت ابھری تھی۔ اقتدار سنبھالتے ہی صدر کینڈی نے پنڈت نہرو کے ساتھ قومی اور ذاتی سطح پر پینگیں بڑھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنی ایک خاص معتمدا اور معاشیات کے بین الاقوامی ماہر پروفیسر گالبریتھ کو بھارت میں امریکن سفیر کے طور پر متعین بھی کر دیا۔ جولائی ۱۹۶۱ء میں صدر کینڈی کی دعوت پر صدر ایوب امریکہ کے سرکاری دورے پر گئے۔ مسز جیکولین کینڈی خصوصاً صدر ایوب کی شخصیت سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئیں اور دونوں میاں بیوی نے ان کی پذیرائی کے لیے انتہائی پروقار اور شاندار تقریبات منعقد کیں۔ ایک روز لنچ سے پہلے ہلکی پھلکی گفتگو ہو رہی تھی۔ صدر ایوب نے اچانک کسی قدر جذباتی انداز میں صدر کینڈی اور مسز کینڈی کو مخاطب کر کے کہا۔ "آپ دونوں ایک مثالی جوڑا ہیں۔ آپ کے حسن صورت اور حسن سیرت کے جادو سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ کیا آپ یہ جادو چلا کر پنڈت نہرو کو مسئلہ کشمیر حل کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتے؟ اس سے ہماری بہت سی مشکلات رفع ہو جائیں گی۔"

مسز کینڈی تو یہ سن کر تھوڑا سا جھینپی اور تھوڑا سا مسکرائی' لیکن صدر کینڈی زور سے ہنسے اور بولے۔ "مسٹر پریذیڈنٹ' پنڈت جواہر لال نہرو دنیا کے ہر موضوع پر نہایت عالمانہ گفتگو کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں لیکن جونہی کشمیر کا ذکر آئے وہ فوراً سر جھکا کر اپنی نگاہیں شیروانی کے کاج میں ٹنگے پھول پر گاڑ کر چپ سادھ لیتے ہیں' اور یوگیوں کی طرح آسن جما کر کسی گہرے مراقبے میں ڈوب جاتے ہیں۔"

ایک تو وہ زمانہ تھا جب پنڈت نہرو کے نخوت بھرے ناز و نخرے سر آنکھوں پر اٹھانے کے لیے دنیا کے بہت سے چھوٹے اور بڑے ملک ہر وقت چشم براہ رہتے تھے لیکن چین اور بھارت کے درمیان سرحدی جنگ کے دوران پنڈت جی کی ناقابل تسخیر شخصیت کی قلعی ایک دم کھل گئی' اور چینی یلغار کے ایک تھپیڑے سے ان کی عظمت اور بہادری کے ملمع کا بھرم چشم زدن میں آناً فاناً اٹھ گیا۔

"ہندی چینی بھائی بھائی" کا بلند بانگ نعرہ کافی عرصہ سے سرد پڑ چکا تھا۔ اور اکتوبر ۱۹۶۲ء کے اوائل ہی سے پنڈت نہرو یہ گیدڑ بھبھکیاں دے رہے تھے کہ ہندوستانی فوجیں چینیوں کو لداخ اور نیفا کے متنازعہ علاقوں سے بہت جلد نکال باہر پھینکیں گی۔ اسی ماہ کی غالباً ۲۰ تاریخ تھی کہ میں ہارلے سٹریٹ راولپنڈی میں اپنے گھر سویا پڑا تھا' رات کے ڈھائی بجے تھے کہ اچانک میری کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں ایک کار داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں بعد میرے ملازم نے اندر آ کر مجھے بتایا کہ ایک چینی آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ غالباً وہ چینی پاکستان میں اردو زبان سیکھنے آیا ہوا تھا اور پہلے بھی مجھ سے کئی تقریبوں میں مل چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بھارت نے چینی سرحدوں پر پے درپے حملے کر کے چین کو جوابی کارروائی پر مجبور کر دیا ہے اور چینی فوج چند مقامات پر بھارت میں داخل ہو کر آگے بڑھ رہی ہے۔ اور وہ اس وقت مجھے یہی اطلاع دینے آیا ہے۔

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ نے یہ بات ہماری وزارت خارجہ تک بھی پہنچا دی ہے؟"

چینی مسکرایا اور بولا۔ "ہمارا خیال ہے کہ شاید صدر ایوب کو اس خبر میں خاصی دلچسپی اور اہمیت محسوس ہو۔ ہمارے اندازے کے مطابق آپ یہ خبر ان تک فوری طور پر پہنچانے میں زیادہ کام آ سکتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے آپکو ایسے بے وقت جگا کر یہ تکلیف دی ہے۔ یہ میرا ذاتی فعل ہے۔ سفارت خانے کی جانب سے نہیں۔"

سفارت کاری کے فن میں چینیوں کا اپنا ہی ایک خاص اور نرالا انداز ہے۔ وہ اپنے دوستوں پر بھی اپنی رائے یا مشورہ یا نصیحت خواہ مخواہ یا برملا ٹھونسنے کے عادی نہیں ہیں۔ لیکن اشاروں کنایوں میں اپنا عندیہ نہایت خوش اسلوبی سے واشگاف طور پر ظاہر کر دینے میں انتہائی مہارت رکھتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ رات کے ڈھائی بجے مجھے جگا کر غالباً وہ اپنے مخصوص انداز میں یہ پیغام پہنچا رہے تھے کہ جنگ کے یہی ابتدائی گھنٹے انتہائی اہم ہیں' ہندوستانی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے ہیں اور چینیوں کے خوف سے سر پر پاؤں رکھ کر ہر محاذ سے بھاگ رہی ہے۔ اگر پاکستان اس موقع سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے'

تو ہرگز وقت ضائع نہ کریں۔

میں نے فوراً لباس تبدیل کیا اور اپنی کار نکال کر تیز رفتاری سے ایوان صدر جا پہنچا۔ اس وقت کوئی تین بجے کا عمل تھا۔ کسی قدر تگ ودود کے بعد مجھے صدر ایوب کی خواب گاہ تک رسائی حاصل ہو گئی۔ میں نے انہیں چینی کے ساتھ اپنی گفتگو تفصیلا سنائی' تو انہوں نے بے ساختہ کہا۔ "یہ کوئی غیر متوقع خبر ہرگز نہیں۔ لیکن اتنی رات گئے تمہیں صرف یہ خبر سنانے کے لیے آنے سے اس کا اصلی مقصد کیا تھا؟"

میں نے اپنا قیاس بیان کیا کہ شاید اس کا مقصد یہ ہو کہ ہم ان لمحات کو اپنے حق میں کسی فائدہ مندی کے لیے استعمال میں لے آئیں

"مثلاً؟" صدر ایوب نے پوچھا۔

"مثلاً" میں نے اناڑیوں کی طرح تجویز پیش کی۔ اسی لمحے اگر ہماری افواج کی نقل و حرکت بھی مقبوضہ کشمیر کی سرحدوں کے خاص خاص مقامات کی جانب شروع ہو جائے' تو............"

صدر ایوب نے تیز و تند لہجے میں میری بات کاٹ کر کہا۔ "تم سویلین لوگ فوجی نقل و حرکت کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہو۔ جاؤ اب تم بھی جا کر آرام کرو۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

آج تک میرا یہی خیال ہے کہ اس رات صدر ایوب نے اپنی زندگی اور صدارت کا ایک اہم ترین سنہری موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔ اگر ان کی قائدانہ صلاحیتوں پر نیند کا غبار نہ چھایا ہوتا اور ان کے کردار میں شیوہ دیوانگی اور شیوہ مردانگی کا کچھ امتزاج بھی موجزان ہوتا' تو غالباً اس روز ہماری تاریخ کا دھارا ایک نیا رخ اختیار کر سکتا تھا۔

سیلاب کے ریلے کی مانند جس طرح چینی فوجیں ہندوستان میں آگے بڑھی تھیں' بھارتی فوج کی اچھی طرح گوشمالی کرنے کے بعد اسی طرح تیزی سے واپس بھی لوٹ گئیں' پنڈت جواہر لال نہرو کی بے بسی' بیکسی اور شکست خوردگی کو اپنے مفاد کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے صدر کینیڈی نے صدر ایوب پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ پنڈت جی

کو فوراً ایک ذاتی پیغام بھیج کر انہیں یہ یقین دلائیں کہ چین کے ساتھ جنگ کے دوران ہندوستان کی سرحدوں پر پاکستان کی جانب سے ہرگز ہرگز کوئی گڑبڑ رونما نہ ہو گی۔

صدر ایوب نے پنڈت نہرو کو اس نوعیت کا پیغام تو کوئی نہ بھیجا' لیکن پاکستان میں اپنے طرز عمل سے ہندوستان کو ہماری طرف سے ہر قسم کے خطرات اور شکوک و شبہات سے بے نیاز کر دیا۔

ہندو بنیوں میں ایک کہاوت ہے کہ چمڑی جاتی ہے تو جائے لیکن دمڑی ہاتھ میں آئے۔ چین کے ہاتھوں ہندوستان نے شکست تو نہایت شرمناک کھائی' لیکن اس داغ کو غیر ملکی امداد کی ریل پیل سے دھونے کے لیے پنڈت نہرو ساری دنیا کے سامنے نہایت بے حجابی سے چینی جارحیت کا ایک مظلوم اور معصوم پیکر بن کر کھڑے ہو گئے۔ چنانچہ اس بت کو رام کرنے کے لیے امریکہ اور انگلستان نے مل کر ہر قسم کی فوجی امداد اور جدید ترین اسلحہ جات نہایت بھاری پیمانے پر ہندوستان کو دینے کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے' پاکستان نے دبے لفظوں میں تھوڑا بہت احتجاج تو ضرور کیا' لیکن کسی نے ہماری باتوں کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ہر کوئی ہمیں بس اتنا کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ یہ فوجی امداد ہندوستان کو صرف چین کے خلاف استعمال کرنے کے لیے دی جا رہی ہے پاکستان کو اس سے کسی قسم کا کوئی خطرہ ہرگز لاحق نہ ہو گا۔

امریکہ کے اس رویے پر پاکستانی اخبارات میں بڑا شدید رد عمل شروع ہو گیا خود امریکہ میں بھی چند اخبارات نے یہاں تک لکھ دیا کہ ہندوستان کو بڑے پیمانے پر فوجی امداد دیتے وقت اسے قضیہ کشمیر کو حل کرنے پر پابند کرنے کا یہی ایک مناسب موقع ہے۔

غالباً یہ اسی قسم کے دباؤ کا نتیجہ تھا کہ اچانک ایک اعلیٰ سطحی بین الاقوامی وفد راولپنڈی میں آوارد ہوا۔ اس وفد میں برطانیہ کے کامن ویلتھ سیکرٹری مسٹر ڈنکن سینڈز (Mr Duncan Sandys) اور امریکہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر ایورل ہیریمن (Mr Averell Harriman) شامل تھے۔ ڈنکن سینڈز ایک زمانے میں ونسٹن چرچل کے داماد بھی رہ چکے تھے' اور مسٹر ایورل ہیریمن دوسری جنگ عظیم کے دوران روز ویلٹ کے خصوصی

ایلچی کے طور پر عالمی شہرت حاصل کر چکے تھے۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء کی ایک چمکیلی صبح تھی۔ ایوان صدر راولپنڈی کے لان میں نہایت خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ یہ دونوں حضرات صدر ایوب کے ساتھ باہر دھوپ میں بیٹھ گئے۔ اور کوئی گھنٹہ بھر کی محنت کے بعد انہوں نے ایک نہایت بے اثر، بے ثمر اور بو گس قسم کے اعلان کا ڈرافٹ تیار کیا جس کا متن یہ تھا:

Resolution

The President of Pakistan and the Prime Minister of India، have agreed that a renewed effort should be made to resolve the outstanding differences between their two countries on Kashmir and other related matters، so as to enable India and pakistan to live side by side in peace and friendship.

In consequence، they have decided to start discussion at an early date with the object of reading an honourable and equitable settlement. These wil be conduct initially at the ministerial level. ـt the aapropriate stage direct talk will be held between Mr Nehru and President Ayub.

صدر ایوب نے تو بلا چوں و چراں اس معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اور مسٹر ڈنکن سنیڈز اس دستاویز کو سینے سے لگا کر پنڈت نہرو کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لنچ کے فوراً بعد دہلی روانہ ہو گئے۔ پروگرام یہ تھا کہ جونہی پنڈت نہرو اس دستاویز پر اپنے دستخط ثبت فرمائیں، مسٹر سینڈز فوراً ٹیلیفون پر یہ خوشخبری راولپنڈی پہنچائیں گے یہ تو معلوم نہیں کہ دہلی پہنچ کر مسٹر ڈنکن سنیڈ پر نہرو جی کے ہاتھوں کیا گزری۔ لیکن یہاں راولپنڈی میں شام کے پانچ بجے ہی سے مسٹر ایورل ہیریمن ایوان صدر کے ڈرائینگ روم میں ہمہ تن انتظار ہو کر بیٹھ گئے۔ بے تابی کے عالم میں وہ کمرے میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ٹہلتے تھے، بار بار اپنی گھڑی دیکھتے تھے۔ اور پھر بت بن کر عالم سکتہ میں کرسی پر بیٹھ جاتے تھے۔ پورے سوا دو گھنٹے وہ اسی طرح آتش زیر پا حالت اضطراب میں مبتلا رہے، خدا خدا کر کے سوا سات بجے نئی دہلی سے ٹیلیفون آیا کہ پنڈت

جواہر لال نہرو نے ٹھیک سات بجکر دس منٹ پر معاہدے پر دستخط کر دیئے ہیں۔ یہ سنتے ہی مسٹر ایورل ہیریمن مسرت و شادمانی سے ایسے سرشار ہو گئے جیسے انہوں نے ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سر کر لی ہو۔ انہوں نے گرمجوشی سے اٹھ کر صدر ایوب کے ساتھ ہاتھ ملایا انہیں مبارک باد دی (کس بات کی؟ یہ مجھے آج تک نہیں معلوم ہو سکا) اور کامیابی اور کامرانی (کس کی؟) کے لمحات منانے کے لیے شیمپین کی بوتل کھولنے کی فرمائش کی۔ شیمپین کا دور چل رہا تھا کہ مسٹر ایورل ہیریمن نے کسی قدر بلند آواز میں صدر ایوب کو مخاطب کر کے کہا۔ "مسٹر پریذیڈنٹ۔ آج کا دن ایک تاریخ ساز دن ہے۔ اس سے پورا فائدہ حاصل کرنے کے لیے آپ کی وزارت خارجہ کو اب ایسے خطوط پر چلنا پڑے گا' کہ امریکہ اور ہندوستان دونوں کے ساتھ یکساں صاف گوئی سے بات چیت کی جا سکے۔"

صدر ایوب حیرت سے کسی قدر چونکے اور بولے۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی بات کا مفہوم صاف صاف نہیں سمجھ سکا۔"

مسٹر ہیریمن نے کہا۔ "میرا مطلب ہے' آپ کو اپنا فارن سیکرٹری تبدیل کر لینا چاہیے۔ کم از کم ہمارا سفارت خانہ ان کے ساتھ آزادانہ گفتگو کرنے میں شدید ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔"

ان دنوں مسٹر ایس کے دہلوی ہماری وزارت خارجہ کے سیکرٹری تھے۔ مسٹر ایورل ہیریمن کے احکام کی پیروی میں صدر ایوب نے انہیں بہت جلد سفیر متعین کر کے قاہرہ بھیج دیا۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء کے معاہدہ پر پنڈت نہرو کے دستخطوں کی مہم سر کرتے ہی مسٹر ڈنکن سنینڈز فتح و نصرت کے جھنڈے لہراتے دہلی سے بسوئے لندن روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ کراچی تک ہی پہنچ پائے تھے کہ پنڈت جی نے ہندوستان کی لوک سبھا میں صدر ایوب کے ساتھ اپنے معاہدہ کی وضاحت میں منافقت سے بھرا ہوا ایک عجیب و غریب بیان دے ڈالا جس کا لب لباب یہ تھا کہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر یہ محض ایک رسمی سی

کارروائی تھی' اور اس معاہدہ کی وجہ سے کشمیر کے متعلق ہندوستان کے رویے میں ہرگز کسی قسم کی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ یہ سنتے ہی مسٹر ڈنکن سنیڈز نے لندن کا سفر منسوخ کیا' اور کراچی سے صدر ایوب کو بتایا کہ وہ ابھی نئی دہلی واپس جا رہے ہیں' اور پنڈت نہرو کو اس بے معنی اور مفسدانہ بیان کی تردید کرنے پر مجبور کریں گے۔ اسی شام ایک بار پھر ایوان صدر راولپنڈی کا ڈرائنگ روم زحمت انتظار کی لپیٹ میں بری طرح آ گیا۔ کل کی طرح آج بھی مسٹر ایورل ہیریمن مٹی کا مادھو بنے ایک کرسی پر آ کر گم سم بیٹھ گئے۔ بے چینی سے اٹھ اٹھ کر کمرے میں بدحواسی سے ٹہلتے تھے' بار بار گھڑی دیکھتے تھے' اور پھر یوگیوں کی طرح آسن جما کر بے حس و حرکت بیٹھ جاتے تھے' گزشتہ شام ہم سب نے اس ماحول میں سوا دو گھنٹے گزارے تھے' لیکن آج انتظار کی یہ کٹھن گھڑیاں بے حد طویل ہو گئیں۔ رات کے گیارہ بجکر بیس منٹ پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ پہلے صدر ایوب نے مسٹر ڈنکن سنیڈز کے ساتھ چند منٹ گفتگو کی۔ پھر مسٹر ایورل ہیریمن نے بے تابی سے لپک کر ریسور تھاما' اور کافی طویل عرصہ تک ان کے ساتھ بات چیت کرتے رہے' ٹیلیفون کی اس ساحرانہ گھنٹی نے کمرے پر چھائی ہوئی مردنی کو مکڑی کے جالے کیطرح اتار پھینکا۔ اور ڈرائینگ روم میں ازسر نو چہل پہل کی رونق واپس آ گئی۔

مسٹر ڈنکن سنیڈز کے ٹیلیفون سے یہ عقدہ کھلا کہ انہوں نے رات گئے پنڈت نہرو کو ایسے وقت جا پکڑا جب وہ شب خوابی کا لباس پہن کر سونے کے لیے اپنے پلنگ پر لیٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔ پہلے تو وہ صاف مکر گئے کہ انہوں نے کوئی ایسی بات کہی ہے جس سے کسی قسم کی غلط فہمی یا بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ پھر ڈنکن سنیڈز کے پرزور اصرار پر انہوں نے آئیں بائیں شائیں کر کے حیلے بہانوں سے لوک سبھا میں اپنے بیان کو توڑ مروڑ کر کچھ عذر لنگ پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مسٹر سنیڈز نے جب ان کی نرم و نازک کلائی کو کسی قدر مزید مروڑا تو پنڈت جی نے حسب

عادت فوراً یہ وعدہ کر لیا کہ وہ بہت جلد ایک ایسا بیان جاری کر دیں گے جس سے ہر قسم کی غلط فہمی اور بدگمانی کا پورا پورا ازالہ ہو جائے۔

لیکن پنڈت جی کے دوسرے بہت سے وعدوں کی طرح ان کا یہ وعدہ بھی ایک بھونڈا سا مذاق ہی ثابت ہوا۔ دو روز کے بعد انہوں نے بغیر کسی سیاق و سباق کے ایک ایسا گول مول سا بیان فرمایا جس سے تنازعہ کشمیر کے حل کی جانب تو بالکل کوئی راستہ وا نہ ہوا' البتہ برطانیہ اور امریکہ کی جانب سے ہندوستان کی جھولی میں مالی اور فوجی امدا بدستور بڑھتی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنا الو سیدھا کرنے اور دوسروں کو کامیابی سے الو بنانے میں پنڈت جواہر لال نہرو کو خاص مہارت حاصل تھی۔

لیکن یہ بھی درست ہے کہ پنڈت جی کی تمام تر چالبازیوں' ہیرا پھیریوں اور منافقتوں کے باوجود ان کا نفسیاتی ہوا صدر ایوب کے دل و دماغ پر کسی نہ کسی حد تک ہمیشہ چھایا رہا' میرے تجربے میں ایسا کوئی موقع دیکھنے میں نہیں آیا جب وہ پنڈت جی کے سامنے اکثر اوقات دبے دبے سے مرعوب ہوتے ہوئے نظر نہ آ رہے ہوں۔ لیکن پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات کے بعد یہ صورت حال یک لخت تبدیل ہو گئی۔ جب شری لال بہادر شاستری بھارت کی وزارت عظمٰی پر براجمان ہوئے تو صدر ایوب اچانک خود اپنی ہی نظر میں قد آور ہو گئے۔ پنڈت نہرو کی موجودگی میں وہ بلاوجہ احساس کمتری میں مبتلا رہا کرتے تھے' لیکن لال بہادر شاستری کے آتے ہی وہ اسی طرح بلاوجہ احساس بدتری کا شکار ہو گئے۔ یہ نفسیاتی زیروبم ان کے کردار کا ایک ایسا المیہ تھا' جس نے رفتہ رفتہ انہیں غلط راستوں اور غلط فیصلوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر انجام کار زوال کے قعر مذلت میں جا پھینکا۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں وزیراعظم لال بہادر شاستری قاہرہ میں غیر جانبدار ممالک کی ایک کانفرنس میں شرکت کے بعد واپسی پر مختصر سے قیام کے لیے کراچی ایئرپورٹ پر رکے' تو صدر ایوب نے انہیں ہوائی اڈے پر ہی لنچ کھلایا۔ شاستری جی چھوٹے قد کے دبلے پتلے اور نحیف سے آدمی تھے' ملاقات خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ لیکن نفسیاتی طور پر صدر ایوب

بیٹھے بٹھائے بلاوجہ شیر ہو گئے۔ اب وہ جگہ جگہ موقع بے موقع جہاں کہیں لال بہادر شاستری کا ذکر آتا' ان کو تمسخر و تضحیک کا نشانہ بناتے' اور اکثر اوقات کہا کرتے تھے' کہ "اس بالشت ڈیڑھ بالشت کے آدمی کے ساتھ کوئی سنجیدہ گفتگو کرنا بیکار وقت ضائع کرنا ہے۔"

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے مجھے تاشقند کا ایک واقعہ سنایا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے باہمی مذاکرات ایک مقام پر آ کر شدید تعطل کا شکار ہو گئے تھے۔ روس کے وزیراعظم کوسیجن نے کئی بار آ کر صدر ایوب پر زور دیا کہ وہ مذاکرات کو ناکام نہ ہونے دیں اور مسٹر شاستری کے ساتھ اپنی گفتگو جاری رکھیں۔ ایک بار صدر ایوب مذاق مذاق میں مسٹر کوسیجن سے یہ کہہ بیٹھے۔ "مجھے ہرگز یہ توقع نہیں کہ اس بالشت ڈیڑھ بالشت کے منحنی سے شخص کے ساتھ کوئی فیصلہ کن گفتگو ہو سکے۔" مسٹر بھٹو کا کہنا تھا کہ یہ سنتے ہی مسٹر کوسیجن سیخ پا ہو گئے اور انہوں نے نہایت سختی سے صدر ایوب سے کہا۔ "مسٹر شاستری ایک عظیم قوم کے مسلمہ اور عظیم لیڈر ہیں' ہم ان کی دل سے عزت کرتے ہیں۔ آپ کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ میرے سامنے ان کی شان میں اس قسم کے گھٹیا الفاظ استعمال کریں۔"

مسٹر بھٹو کا کہنا تھا کہ وزیراعظم کوسیجن کی اس ایک ڈانٹ نے صدر ایوب کے دل و دماغ سے خود اعتمادی کا غبارہ بھک سے اڑا کر نکال باہر پھینکا' اور اس کے بعد وہ معاہدہ تاشقند میں شاستری جی کی ہر ضد کے سامنے بلا پس و پیش ہتھیار ڈالتے چلے گئے۔

تاشقند میں تو خیر جو ہوا سو ہوا لیکن اس میں شک نہیں کہ شروع ہی سے صدر ایوب کی نگاہ میں شری لال بہادر شاستری کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ جنوری ۱۹۶۵ء میں انہوں نے تقریباً تمام سیاسی پارٹیوں کی اجتماعی مخالفت کے باوجود مس فاطمہ جناح کے مقابلے میں صدارتی انتخاب جیت لیا تھا۔ اس مقابلے میں فیلڈ مارشل کو مس جناح سے تقریباً اکیس ہزار ووٹ زیادہ ملے۔ چنانچہ اب وہ اپنے آپ کو واقعی قوم

کا مسلمہ اور منتخب صدر سمجھنے لگے اور اپنے ہر قول و فعل کو ملک و قوم کی متفقہ آواز کی صدائے بازگشت قرار دینے لگے۔ اس پس منظر میں جس تناسب سے ان کے اندر خود اعتمادی کا احساس فروغ پاتا گیا' اسی رفتار سے ان کے اردگرد ایسے خود غرض خوشامدیوں اور جی حضوریوں کا حلقہ بھی وسیع تر ہوتا چلا گیا جو چرب زبانی سے ان کی ہاں میں ہاں ملا کر انہیں صحیح یا غلط راہوں پر ڈالنا اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتے تھے۔

صدارتی انتخاب جیتنے کے چند ماہ بعد رن آف کچھ کا سانحہ پیش آ گیا۔ یہ تنازعہ آٹھ دس برس سے چلا آ رہا تھا' لیکن بھارت نے اچانک یہ الزام تراشی شروع کر دی کہ کچھ آڑ بنا کر پاکستان گجرات میں زیر زمین تیل کے کچھ علاقوں کو ہضم کرنا چاہتا ہے۔ بھارتی اور پاکستانی فوجوں کے درمیان ایک ہنگامی جھڑپ میں ہمارا پلہ کافی بھاری رہا اور ہندوستانی فوج کا کچھ ساز و سامان بھی ہمارے قبضہ میں آ گیا۔ برطانیہ نے ثالثی اختیار کر کے ۳۵۰ مربع میل کا علاقہ پاکستان کے حوالے کر دینے کا فیصلہ دے دیا۔ اس پر بھارت میں بڑا شور و غوغا ہوا' اور وزیراعظم لال بہادر شاستری پر کڑی نکتہ چینی شروع ہو گئی۔ ان واقعات نے صدر ایوب کے دل میں بھارتی فوج پر پاکستانی فوج کی برتری کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز تصورات کو جنم دیا اور لال بہادر شاستری کی قائدانہ صلاحیت ان کی نظر میں اور بھی زیادہ گر گئی۔ شاستری جی نے ایک موقع پر یہ اعلان فرمایا کہ رن آف کچھ کے واقعہ کو وہ ہرگز نہیں بھلا سکتے۔ بلکہ اپنی مرضی کے وقت اور مقام پر وہ اس کا حساب ضرور بے باق کر کے رہیں گے۔

اس کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کی رفتار روز افزوں بڑھتی ہی چلی گئی۔ ۱۹۶۵ء کے وسط ہی میں لال بہادر شاستری اور ان کے وزیر خارجہ نے ڈنکے کی چوٹ یہ صاف صاف اعلان کر دیا کہ جموں و کشمیر کی ریاست بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور پاکستان کا اس کے کسی حصہ پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں۔

اس صورت حال میں صدر ایوب کو کیا راستہ اختیار کرنا چاہیے تھا؟ وہ یہ معاملہ ازسر نو یو۔ این۔ او کی سیکورٹی کونسل میں لے جا سکتے تھے۔ لیکن یہ امر یقینی تھا کہ اگر سیکیورٹی

کونسل کوئی ایسا فیصلہ کرنا چاہتی جو بھارت کو ناقابل قبول ہوتا تو روس ضرور اس کے خلاف اپنا ویٹو استعمال کرتا۔ ۲۳ جون ۱۹۶۲ء تک روس پہلے ہی اس مسئلہ پر ہندوستان کے حق میں اور پاکستان کے خلاف ۱۰۰ مرتبہ اپنا ویٹو استعمال کر چکا تھا۔

ہندوستان کے ساتھ براہ راست یا کسی تیسرے ملک کی نگرانی میں گفت و شنید کے ذریعہ مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرنا بھی ایک دور از کار بات ہوتی۔ کیونکہ ماضی میں اس سلسلے میں ہماری تمام کوششیں ناکام اور تلخ ثابت ہو چکی تھیں۔

جہاں تک اس مسئلہ پر جنگ کرنے کا تعلق ہے' پہلے تو صدر ایوب جنگ کا نام لیتے ہی کانوں کو ہاتھ لگایا کرتے تھے۔ اور ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ تنازعہ کشمیر کا حل ہم نے پاکستان کے مفاد کی خاطر ڈھونڈھنا ہے۔ اس حل کی تلاش میں پاکستان کو داؤ پر نہیں لگانا' پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے یکایک ایسے اقدامات شروع کر دیئے' جن کا قدرتی اور منطقی نتیجہ وہ جنگ تھی جو ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت اور پاکستان کے درمیان لڑی گئی۔

یہ جنگ اب تک میرے لیے ایک معمہ ہے۔ ان دنوں میں ہالینڈ میں بطور سفیر متعین تھا۔ اس لیے اس جنگ کے اندرونی اسباب اور سیاق و سباق کا مجھے ذاتی طور پر کوئی علم نہیں ہے۔ اگر صدر ایوب چاہتے تو وہ نہایت آسانی سے اپنی کتاب "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" Friends not Masters میں خود اس موضوع پر خاطر خواہ روشنی ڈال سکتے تھے۔ یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی تھی' اور دیباچہ میں ان کے اپنے بیان کے مطابق اس کا مسودہ ۱۹۶۵ء کے دوران بھی ان کے زیر غور تھا۔ یہ جنگ ان کے عہد صدارت کا ایک نہایت اہم تاریخی واقعہ تھا۔ اس لیے یہ امر میرے لیے باعث حیرت ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر تک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اگرچہ اس جنگ میں پوری پاکستانی قوم نے صدر ایوب کا بھرپور ساتھ دیا تھا' تاہم ممکن ہے کہ پیچھے کی طرف مڑ کر وہ اس جنگ کو اپنی فوجی مہارت' تدبر' سیاسی بصیرت' دوراندیشی اور دانشمندی کا کوئی خاص امتیازی نشان نہ سمجھتے ہوں۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ

جنگ بندی کے بعد معاہدہ تاشقند کے خلاف مسٹر بھٹو کی شدید مہم کا کھلم کھلا دو ٹوک مقابلہ کرنے سے وہ اپنے آپ کو کسی قدر قاصر پاتے ہوں۔ صدارت کی کرسی انسان کو بااختیار تو ضرور بنا دیتی ہے۔ لیکن بعض معاملات میں حالات کی نزاکت ان سے زبان بندی کا تقاضا بھی ضرور کرتی ہے۔

فوجی یا کسی دوسرے ادارے کی جانب سے ابھی تک اس جنگ کی کوئی مستند تاریخ تجزیہ اور جائزہ ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خاں کی کتاب (The First Round) اس موضوع پر ایک دلچسپ تصنیف ہے۔ اصغر خاں صاحب ایک سچے دیانتدار اور پرخلوص انسان ہیں۔ اس لیے جو واقعات انہوں نے قلم بند کیے ہیں' انہیں صحیح اور معتبر تسلیم کرنے میں مجھے بالکل کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ البتہ کہیں کہیں ان کی رائے کا توازن اعتدال کی حد سے باہر نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

مثلاً ایک مقام پر انہوں نے لکھا ہے کہ یکم یا دوئم ستمبر ۱۹۶۵ء کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو چین کے وزیر خارجہ مارشل چن یی سے کراچی کے ہوائی اڈہ پر تھوڑی دیر کے لیے ملے تھے۔ مارشل چن یی اس وقت پیرس جا رہے تھے۔ اس ملاقات کے بعد مسٹر بھٹو اور وزارت خارجہ کے سیکرٹری مسٹر عزیز احمد نے مارشل چن یی کے حوالے سے صدر ایوب کو یقین دلا دیا تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں ہم اپنے گوریلا لڑاکوں' اور مجاہدین اور دیگر فوجی دستوں کو بھیج بھیج کر جو کاروائیاں جی چاہے کرتے رہیں' بھارت کسی صورت میں بھی یہ جرات نہ کرے گا کہ وہ بین الاقوامی سرحد توڑ کر پاکستان پر حملہ آور ہو۔ اس واقعہ کو مثال بنا کر اصغر خاں صاحب نے اپنی ذاتی رائے سے خود ہی یہ نتیجہ نکال لیا کہ بھٹو صاحب کو اپنی جگہ پر یقین تھا کہ ایسے حالات میں ہندوستان لازمی طور پر پاکستان پر براہ راست حملہ کرے گا۔ لیکن وہ جان بوجھ کر صدر ایوب کو گمراہی کے راستہ پر ڈال رہے تھے۔ تاکہ ہندوستان کے ہاتھوں پاکستان کو شکست فاش نصیب ہو اور اس کے بعد بھٹو صاحب بذات خود پاکستان کی مسند صدارت پر قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ ماروں

گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ ریٹائرڈ ایئرمارشل کی یہ نرالی منطق میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔
غالباً بھٹو دشمنی کے اسی جذبہ بے نیام کے تحت اصغر خاں صاحب اپنی کتاب میں مزید فرماتے ہیں کہ برسر اقتدار آنے کے لیے ۱۹۶۵ء میں تو بھٹو صاحب کے عزائم شرمندہ تکمیل نہ ہو سکے۔ لیکن چھ برس بعد ان کی آرزو پوری ہو گئی جب ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو زبردست فوجی شکست ہوئی' جنرل یحییٰ خاں معزول ہوئے' ملک دو نیم ہوا اور انجام کار مسٹر بھٹو صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے عہدے سنبھال کر برسر اقتدار آ گئے۔ بین السطور غالباً ریٹائرڈ ایئرمارشل صاحب یہی تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کہ ذمہ داری تمام تر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی ذات پر تھی اور وہ اس تخریبی کارروائی میں ۱۹۶۵ء ہی سے مصروف عمل تھے۔
۱۹۶۵ء کی جنگ کی بابت ایک دوسری کتاب جو میری نظر سے گزری ہے' وہ جنرل موسیٰ کی تصنیف "My Version" ہے۔ اس کتاب کو پڑھنا نہایت کٹھن اور صبر آزما کوشش ہے۔ اس جنگ کے متعلق عوام الناس کے ذہن میں جو سوالات ہیں' یہ کتاب ان میں سے کسی کا بھی کوئی جواب فراہم نہیں کرتی اور کسی نکتے پر کوئی خاص یا مزید روشنی نہیں ڈالتی۔ پاکستان کی بری فوج کے ایک سابق کمانڈر انچیف کے قلم سے اس سے کہیں بہتر تحریر کی توقع رکھنی چاہیے تھی' خاص طور پر جو اس جنگ کے دوران بری فوج کا سربراہ بھی رہ چکا ہو۔
اس جنگ کے متعلق ان دو کتابوں کے علاوہ عوام اور خواص کے مختلف طبقوں میں طرح طرح کی قیاس آرائیوں کا کوئی شمار نہیں۔
کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ جنگ قادیانیوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ اس لیے فوج کے ایک نہایت قابل قادیانی افسر میجر جنرل اختر حسین ملک نے مقبوضہ کشمیر پر تسلط قائم کرنے کے لیے ایک پلان تیار کیا جس کا کوڈ نام "جبرالٹر" تھا۔ صاحبان اقتدار کے کئی افراد نے ان کی مدد کی۔ ان میں مسٹر ایم ایم احمد سرفہرست بتائے جاتے ہیں جو خود

بھی قادیانی تھے اور عہدے میں بھی پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئر مین ہونے کی حیثیت سے صدر ایوب کے نہایت قریب تھے۔ جنرل اختر ملک نے اپنے پلان کے مطابق کارروائی شروع کی اور اکھنور کو فتح کرنے کے قریب ہی تھے کہ فوج میں جنرل موسیٰ سمیت کئی اور جرنیل بھی تشویش میں پڑ گئے کہ اگر اختر ملک کی مہم کامیاب ہو گئی تو وہ ایک فوجی ہیرو کی حیثیت سے ابھریں گے۔ صدر ایوب سمیت غالباً باقی بہت سے فوجی اور غیر فوجی صاحبان اقتدار یہ نہیں چاہتے تھے کہ میجر جنرل اختر ملک اس جنگ کے ہیرو بن کر ابھریں اور فوج کے اگلے کمانڈر انچیف کے عہدے کے حقدار بن سکیں۔ کیونکہ یہ عہدہ صدر ایوب نے ذہنی طور پر پہلے ہی سے جنرل یحییٰ خاں کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔ چنانچہ عین اس وقت جب میجر جنرل اختر حسین ملک انتہائی کامیابی سے چھمب اکھنور سیکٹر پر تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں معاً ان کی کمانڈ سے ہٹا دیا گیا اور ان کی جگہ جنرل یحییٰ خاں کو یہ کمانڈ سونپ دی گئی۔ غالباً اس لیے کہ وہ پاکستانی فوج کو اکھنور فتح کرنے کی کوشش سے باز رکھ سکیں۔ یہ فریضہ انہوں نے نہایت کامیابی سے سر انجام دیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ بھارت کے عزائم سے ہمارے فوجی اور سول ادارے اتنے بے خبر تھے کہ انہیں ہندوستان کے حملے کا اس وقت علم ہوا جب رات کے اندھیرے میں بھارتی فوج ہماری سرحد کو پار کرنے کے بعد تیزی سے لاہور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انٹیلی جنس بیورو کے ایک اعلیٰ افسر نے مجھے خود بتایا کہ ان کا ایک ایجنٹ اپنے معمول کے مطابق سرحد کی طرف کسی خفیہ مشن پر جا رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ اگلی جانب سے تیز تیز روشنیاں بڑھتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔ کسی قدر چھان بین کے بعد اسے معلوم ہوا کہ بھارتی فوج کے ٹینک سرحد پار کر کے لاہور پر چڑھائی کر رہے ہیں۔ وہ بھاگم بھاگ واپس آیا۔ اس نے اپنے کسی پولیس افسر کو یہ خبر دی، پولیس افسر نے کسی فوجی افسر کو ٹیلیفون کیا۔ فوجی افسر نے لاہور کے جی او سی کو جگا کر خبردار کیا،

کہتے ہیں کہ جی۔ او۔ سی نے فوری طور پر اس خبر کو سچ ماننے سے کسی قدر ہچکچاہٹ سے کام لیا۔

ایک بار میں نے نواب آف کالا باغ سے اس جنگ کے متعلق کچھ دریافت کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے فرمایا "بھائی شہاب' یہ جنگ پاکستان کی جنگ ہرگز نہ تھی۔ دراصل یہ جنگ اختر ملک' ایم۔ ایم۔ احمد۔ بھٹو' عزیز احمد اور نذیر احمد نے شروع کروائی تھی۔"

جب میں نے پوچھا' کہ جنگ شروع کروانے سے ان حضرات کا کیا مقصد تھا' تو نواب صاحب نے جواب دیا۔ "یہ لوگ ایوب خاں کو شکنجے میں کس کر اپنی طاقت بڑھانا چاہتے تھے۔ اس عمل میں اگر پاکستان کا ستیاناس ہوتا ہے تو ان کی بلا سے۔"

میں بالکل نہیں کہہ سکتا کہ اصلی حقیقت کیا ہے۔ لیکن اس جنگ میں ہماری فوج کی ہائی کمانڈ نے برسر عام اپنی ہمت' مہارت اور اہلیت کا کوئی خاص مظاہرہ نہیں کیا۔ بھارتی حملے روکنے اور پسپا کرنے کا سہرا ہماری ایئرفورس اور فوجی نوجوان افسروں اور جوانوں کے سر ہے جنھوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر حیرت انگیز جوانمردی دکھائی اور بعض نے وطن عزیز کے دفاع میں جام شہادت نوش کیا۔

پاکستان پر ہندوستان کے حملے کی خبر میں نے ہالینڈ کے دارلخلافہ ہیگ میں سب سے پہلے بی بی سی لندن کے ایک براڈ کاسٹ میں سنی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستانی ہائی کمشن لندن کے ایک اعلان کے مطابق بھارتی افواج نے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے۔ میں نے فوراً ہالینڈ کے ریڈیو اور ٹی وی کے اداروں کو ٹیلیفون کیا اور درخواست کی کہ وہ فوراً اس خبر کی تصدیق یا تردید کر کے مجھے مطلع فرمائیں۔ چند منٹ کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ بھارت کے وزیراعظم لال بہادر شاستری نے لوک سبھا میں یہ اعلان کیا ہے کہ لاہور ہندوستانی فوج کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ یہ سنتے ہی عفت بے اختیار رونے لگی۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ باہر صوفی مشرف خاں اور ان کے مرید صوفی Witteveen

کھڑے تھے۔ صوفی (Witteveen) ایک عالم و فاضل پروفیسر تھے جو ان دنوں ہالینڈ کی کابینہ میں وزیر خزانہ کے عہدہ پر فائز تھے۔ اندر آ کر وہ دونوں غمگینی کے عالم میں خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ عفت ان کی خاطر و مدارت کے لیے ایک ٹرالی میں چائے وغیرہ کے لوازمات سجا کر لے آئی صوفی مشرف خان بولے۔ "بیٹی' اس سے غم کھانے کے علاوہ اور کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

عفت پھر رونے لگی اور سسکیاں بھرتی ہوئی فرش پر بیٹھ گئی۔ صوفی مشرف خاں اسے دلاسہ دینے اس کے پاس ہی زمین پر آ بیٹھے۔ اپنے پیر و مرشد کی پیروی میں ولندیزی وزیر صاحب بھی کرسی چھوڑ کر نیچے آ بیٹھے۔ میں بھی انہیں کے حلقے میں شامل ہو گیا' کچھ دیر ہم یونہی خاموش اور غمگین زمین پر بیٹھے رہے۔ پھر اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میرا جی نہ چاہتا تھا کہ میں اٹھ کر ٹیلیفون سنوں۔ اگر لاہور ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو اب نہ جانے کس دوسرے شہر کی خبر ہمارے کانوں میں پڑے۔ میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ ڈچ وزیر صاحب نے اٹھ کر ٹیلیفون سنا اور پھر عربی میں الحمد للہ الحمدللہ' سبحان اللہ' سبحان اللہ کہتے ہوئے میرے ساتھ لپٹ گئے اور بولے کہ ڈچ ریڈیو نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ لاہور کے متعلق بی بی سی کی خبر اور لال بہادر شاستری کا اعلان بالکل غلط اور جھوٹ ہیں۔ ہندوستان نے بغیر اعلان جنگ کے پاکستان پر حملہ ضرور کیا ہے لیکن پاکستانی افواج نہایت بہادری سے ہر محاذ پر ان کا بھرپور مقابلہ کر رہی ہیں۔

کئی گھنٹوں کی تگ و دو کے بعد بڑی مشکل سے ٹیلیفون کے ذریعہ میرا رابطہ پہلے اپنے وزیر خارجہ مسٹر بھٹو اور پھر صدر ایوب کے ساتھ قائم ہوا۔ دونوں کی آواز میں ہمت اور خود اعتمادی کا وزن تھا۔ ان کی ہدایات کے مطابق اگلے روز میں نے ہالینڈ کے وزیراعظم اور وزیر خارجہ سے ملاقات کی۔ ان دونوں نے نہایت خوشدلی سے وعدہ کیا کہ یو' این' او اور سیکیورٹی کونسل میں جہاں کہیں بھی ضرورت پڑی' وہ پاکستان کی بھرپور حمایت

کریں گے۔ وزیر خارجہ نے تو میری موجودگی ہی میں نیویارک ٹیلیفون کیا اور یو۔ این۔ او میں ہالینڈ کے نمائندے کو اس بارے میں نہایت واضح ہدایات دے دیں۔

اسی شام ہالینڈ کی ایک بہت بڑی صنعت کے چند انجینئر ہمارے سفارتخانے میں آئے اور ہمارے ڈارنگ روم میں چند ایسے حساس آلات نصب کر گئے جن کا ایک بٹن دبا کر ہم ریڈیو پاکستان کی نشریات کسی وقت بھی نہایت آسانی سے سن سکتے تھے۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ یہ بندوبست ہماری سہولت کے لیے میرے ولندیزی دوست اور وزیر کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔

اس کٹھن آزمائش کے عین دوران ہمارے دیرینہ آقا اور مربی امریکہ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان کو ہر قسم کا جنگی سامان فراہم کرنا بند کر دیا جائے۔ اس وقت بھی ہالینڈ کے وزیر خزانہ مسٹر (Witteveen) نے چند فوری ضروریات پورا کرنے میں ہماری کافی مدد فرمائی۔ یہ سامان میری طرف سے Diplomatic Bags کی حیثیت سے کے۔ ایل۔ ایم کے عام پروازوں سے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے نام کراچی پہنچایا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ فقط کاغذات کے تھیلے نہ ہوتے تھے۔

اس جنگ کے دوران ایران اور ترکی نے بھی حسب توفیق ہماری مدد کی' لیکن انڈونیشیا کے صدر ڈاکٹر احمد سوئیکارنو نے کئی لڑاکا ہوائی جہاز' چند میزائل بردار سمندر جہاز اور دو جنگی آبدوزیں فراہم کر کے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ اس کے علاوہ چین نے بھارت کے ساتھ شمالی سرحدوں پر اپنی فوجوں کے اجتماع کا مظاہرہ کر کے اور ہندوستان کو ایک سخت الٹی میٹم دے کر اس جنگ کا نہ صرف رنگ بدلنے کی دھمکی دی بلکہ ہمارے ساتھ اپنی گہری دوستی کا عملی ثبوت بھی دیا۔

اس کے برعکس امریکہ اور برطانیہ کا رویہ ہمارے ساتھ بالکل مختلف تھا۔ میں نے سنا ہے کہ جس شب ہندوستان نے لاہور کی جانب اپنا حملہ شروع کیا تھا' اسی صبح سب سے پہلے امریکن سفیر راولپنڈی کے ایوان صدر میں آ دھمکے۔ اس وقت غالباً صدر ایوب ناشتہ کر رہے تھے۔ سفیر صاحب اپنے ہاتھوں کا شکنجہ سا بنا کر صدر ایوب کی گردن کے قریب

لے گئے اور کسی قدر سخت لہجے میں بولے۔ "مسٹر پریذیڈنٹ' ہندوستان نے آپ کو گلے سے دبوچ رکھا ہے۔ ان کے ساتھ صلح کرنے میں جلدی کیجیے۔" برطانوی ہائی کمشنر موریس جیمز بھی وقتاً فوقتاً کبھی کھلم کھلا' کبھی چوری چھپے صدر ایوب سے ملتے رہتے تھے' اور ہندوستان کے ساتھ کسی قیمت پر بھی جنگ بند کرنے کا مشورہ دیتے رہتے تھے۔

ہالینڈ میں بیٹھ کر پہلے چند روز تو جنگ کا نقشہ ہمارے حق میں بڑا حوصلہ افزا نظر آتا رہا۔ لیکن پھر یکایک جمود کی کہر چھا گئی' اور اس کے بعد طرح طرح سے جنگ بندی کی باتیں سننے میں آنے لگیں۔ اسی زمانے میں افغانستان کا ایک دو رکنی وفد کسی تجارتی مشن پر ہیگ آیا ہوا تھا۔ ایک لنچ کی دعوت میں میری ان سے ملاقات ہوئی' تو میں نے وفد کے سربراہ سے پوچھا کہ پاکستان ہندوستان کے ساتھ جنگ کی مصیبت میں مبتلا ہے۔ ایسے نازک زمانہ میں افغانستان میں عام لام بندی اور فوجی ملازمین کو فوری طور پر رخصت سے واپس بلا لینے کے اعلان کی وجہ سے ہماری تشویش میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ افغانی وزیر صاحب صرف فارسی اور فرانسیسی زبان بولتے تھے۔ ان کے مترجم نے کہا کہ وفد کے رئیس آپ کی بات کا شافی جواب دینا چاہتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہوٹل میں اپنے کمرے میں انتظار کریں گے۔ آپ وہاں تشریف لے آئیں اور ہمارے ساتھ کافی نوش فرمائیں۔

لنچ کے فوراً بعد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ نہایت مروت اور شفقت سے پیش آئے۔ ان کے ساتھ میں کوئی پون گھنٹہ رہا۔ اس عرصہ میں انہوں نے اپنی گفتگو میں جو کچھ فرمایا' اس کا خلاصہ کچھ اس طرح کا تھا کہ ریاستوں کے درمیان سیاسی تعلقات ہوتے ہیں' مسلمانوں کے درمیان اسلامی تعلقات ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر ہماری ریاست چاہے بھی تو ہمارے مسلمان عوام ہمیں ہرگز یہ اجازت نہ دیں گے کہ ہم ایسے نازک موقع پر اپنے اسلامی برادر ملک پاکستان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیں۔ اس وقت افغانستان میں جو اقدامات آپ کے لیے باعث تشویش نظر آ رہے ہیں' وہ ہمارے اندرونی

اور کچھ بیرونی سیاسی تقاضے ہیں۔ ان کی وجہ سے آپ کے دل میں پاکستان کے لیے کوئی مزید خطرہ ہرگز نہ ابھرنا چاہیے۔ عام طور پر افغانیوں کی سیاسی اور سفارتی گفتگو کسی قدر ذو معنی یا مبہم یا پیچدار ہوا کرتی ہے۔ لیکن اس گفتگو میں مجھے کسی قدر خلوص کے رنگ کی جھلک محسوس ہوئی۔ گھر آتے ہی میں نے راولپنڈی میں صدر ایوب کے ساتھ ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا۔ اس وقت پاکستانی ٹائم کے مطابق رات کے تقریباً دس یا پونے دس بجے ہوں گے' لیکن صدر ایوب کی آواز میں غیر معمولی تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے انہیں افغانی وزیر کے ساتھ اپنی گفتگو کا لب لباب سنایا' تو وہ چڑ سے گئے اور تیز لہجے میں صرف اتنا کہہ کر ٹیلیفون بند کر دیا: "یہ ایک چال بھی ہو سکتی ہے' ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر میں پاکستان کو تباہی کے غار میں ہرگز نہیں دھکیل سکتا۔"

صدر ایوب کی اس جھنجلاہٹ' اور اس غصیلے رویے سے یہی اندازہ لگتا تھا کہ وہ کسی شدید الجھن میں مبتلا ہیں' اور جنگ کے غیر معمولی تقاضوں کے سامنے بے اختیار ہتھیار ڈالنے والے ہیں۔ اس کے برعکس جب ہم ٹیلیویژن پر وزیر خارجہ مسٹر بھٹو کو سیکیورٹی کونسل میں بڑھ چڑھ کر جوشیلی تقریریں کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو صورت حال بالکل مختلف نظر آتی تھی۔ مملکت کا سربراہ جلد از جلد جنگ بندی کی طرف مائل تھا۔ لیکن ان کا وزیر خارجہ اقوام متحدہ کی کونسل میں ہندوستان کے ساتھ طویل سے طویل یہاں تک کہ ہزار سالہ جنگ تک کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس تضاد اور تصادم میں قدرتی طور پر پلہ صدر ایوب کا ہی بھاری رہا۔ اور ۲۳ ستمبر کو جنگ بندی کا اعلان ہو گیا۔ جس طرح اس جنگ کے آغاز کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں وقتاً فوقتاً اڑتی رہتی ہیں' اسی طرح اس کے اچانک اختتام پر بھی مختلف قسم کی قیاس آرائیوں کی گنجائش موجود ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کے دباؤ میں آ کر صدر ایوب حوصلہ ہار بیٹھے تھے۔ کسی کا خیال ہے کہ ہماری فوجی ہائی کمانڈ بھی اس لڑائی کا بوجھ

اٹھانے سے معذور تھی' اور جلد از جلد اس جنگ کے جنجال سے باہر نکلنا چاہتی تھی' وغیرہ وغیرہ۔

سیز فائر کے اعلان کے بعد مسٹر بھٹو نیویارک سے واپسی پر لندن سے گزرے۔ لندن سے پاکستان جانے کے لیے وہ ایک ایسے ہوائی جہاز میں بیٹھے جو ہالینڈ کی ایئرپورٹ ایمسٹرڈم پر بھی رکتا تھا۔ ایمسٹرڈم کے ہوائی اڈے پر اتر کر انہوں نے مجھے ہیگ میں ٹیلیفون کر کے کہا۔ "میں یہاں پر صرف تم سے ملنے اترا ہوں۔ فوراً ایئرپورٹ پر آ جاؤ۔ اپنے سفارتخانے والوں کو ہرگز نہ بتانا کہ میں یہاں اترا ہوں۔ تم اکیلے آ جاؤ۔"

میں جلدی جلدی کار میں بیٹھ کر ایمسٹرڈم کے ہوائی اڈے پر پہنچا جو ہیگ سے بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ نہایت وسیع و عریض ایئرپورٹ ہے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ مسٹر بھٹو کو یہاں پر کسی خاص جگہ تلاش کروں کہ کے ایل ایم کے وی آئی پی مسافروں کی دیکھ بھال کرنے والی خاتون میری طرف بڑھی اور بولی۔ "آیئے' میں آپ کو آپ کے فارن منسٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔"

راستے میں اس خاتون نے کہا کہ جس جہاز سے مسٹر بھٹو کراچی جا رہے ہیں' وہ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد روانگی کے لیے تیار ہے۔ انہیں دس منٹ بعد ضرور جہاز پہ سوار ہو جانا چاہیے۔ آپ ان کے ساتھ سیڑھیوں تک جا کر الوداع کہہ سکتے ہیں۔" میں نے بھٹو صاحب کو یہ بات بتائی تو وہ بولے۔ "دراصل میں صرف دس بارہ منٹ باتیں کرنے کے لیے یہاں نہیں رکا۔ کیا یہ خوبصورت خاتون ایسا بندوبست نہیں کر سکتی کہ میں دو تین گھنٹے بعد کسی اور فلائٹ سے کراچی روانہ ہو سکوں۔"

کے ایل ایم کی میزبان خاتون نے مسکرا کر کہا۔ "نو پرابلم سر۔ اپنا ٹکٹ مجھے دیجئے۔ میں ابھی سارا انتظام کر کے آتی ہوں۔"

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بھٹو صاحب کا سامان نکلوایا اور تین گھنٹے بعد شام کے ساڑھے سات بجے ایک دوسری ہوائی کمپنی کی پرواز میں کراچی کے لیے ان کی نشست بھی محفوظ کرا لی۔ اس کے بعد اس نے کہا۔ "اگر آپ یہ وقفہ ایئر پورٹ پر ہی گزارنا چاہیں تو

ہمارا وی آئی پی ریسٹ روم حاضر خدمت ہے۔

بھٹو صاحب نے کہا۔ "شکریہ' ہم کچھ دیر کے لیے باہر گھومنے جائیں گے۔ یہ خیال رکھیے کہ میں یہاں پر صرف اپنی ذاتی حیثیت سے رکا ہوں اس لیے پریس اور پروٹوکول والوں کو خبر نہ دیں' تاکہ ان کی خواہ مخواہ زحمت نہ ہو۔"

"نو پرابلم سر۔" میزبان خاتون نے کہا۔ "لیکن آپ سات بجے تک ضرور واپس آ جائیں۔ میں آپ کا سامان اگلی فلائٹ میں رکھوا کر آپ کے بورڈنگ کارڈ کے ساتھ اسی جگہ آپ سے ملوں گی۔"

ائیر پورٹ سے باہر آ کر میں نے بھٹو صاحب سے گلہ کیا کہ اگر وہ لندن سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے ٹیلیفون کر دیتے تو میں یہ سارے انتظامات پہلے ہی سے کروا رکھتا۔ وہ بولے کہ یہاں کچھ دیر رکنا ان کا ذاتی فیصلہ تھا اور وہ اس کا چرچا کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ میری کار کا ڈرائیور کیا کیا زبانیں جانتا ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ وہ ہمارے سفارت خانے میں بالکل نیا ملازم ہوا ہے' صرف ولندیزی زبان جانتا ہے۔ ابھی تک اردو اور انگریزی سے قطعی ناواقف ہے۔

"بس یہ ٹھیک ہے" بھٹو صاحب خوش ہو کر بولے۔ "اب دو ڈھائی گھنٹے مجھے اپنی کار میں ایمسٹرڈم کی سیر کراؤ اور ہوائی جہاز کے وقت پر واپس ائیر پورٹ پہنچا دو۔"

ڈرائیور کو تاکید کر کے کہ ہم نے سات بجے سے پہلے واپس ائیرپورٹ پر پہنچنا ہے' ہم دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ کار ایمسٹرڈم کے خوبصورت اور خوشنما علاقوں سے گزرتی رہی لیکن مسٹر بھٹو نے کسی منظر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ وہ لگاتار بولے چلے جا رہے تھے اور ان کے سینے میں دبا ہوا تلخیوں کا لاوا ان کی گفتگو کی روانی میں بہہ بہہ کر مسلسل باہر نکل رہا تھا۔ اس میں صدر ایوب اور چند فوجی جرنیلوں کی کم ہمتی' کوتاہ اندیشی اور فن حرب کی مہارت کے فقدان کا رونا تھا' جنگ کے دوران چیدہ چیدہ مواقع پر ہماری حربی حکمت عملی کی ناکامیوں کا بیان تھا۔ قبل از وقت جنگ بندی پر کڑی نکتہ چینی تھی اور غالباً سانس لینے کے لیے وہ بار بار ٹیپ کا یہ بند دہراتے تھے

کہ پہاڑ جیسی غلطیوں اور بلاوجہ ناکامیوں کے اس کاروبار میں وہ صدر ایوب کا مزید ساتھ نہیں دے سکتے' انہوں نے دو ٹوک طور پر تو یہ بات نہیں کہی لیکن ان کی گفتگو کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صدر ایوب کی کابینہ سے باہر نکلنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ اور مستقبل کے لیے اپنا ایک الگ سیاسی لائحہ عمل وضع کرنے کی فکر میں ہیں۔

ان کی باتیں سنتے سنتے میں اس شش و پنج میں بیٹھا رہا' کہ وہ ایمسٹرڈم میں رک کر خاص طور پر میرے سامنے یہ گفتگو کیوں کر رہے ہیں؟ ایک خیال تو مجھے یہ آیا کہ شاید وہ اپنے یہ خیالات صدر ایوب تک پہنچانے کے لیے مجھے آلہ کار بنانا چاہتے ہوں۔ دوسری بات مجھے یہ کھٹکی کہ شاید وہ اپنے نئے سیاسی لائحہ عمل کے بارے میں مجھ سے کوئی رائے یا مشورہ لینے آئے ہوں۔ میں نے اپنے یہ دونوں مفروضے ان کو بتائے تو وہ ہنسنے لگے اور میرا ہاتھ دبا کر بولے۔ "ارے بھائی میں ان میں سے کسی مقصد کے لیے نہیں آیا۔ میں صرف اس لیے یہاں رکا ہوں کہ تمہارے ساتھ صاف گوئی سے باتیں کر کے اپنے دل کا غبار نکال لوں کیونکہ مجھے مکمل اعتماد ہے کہ تم میری باتیں اپنے تک ہی رکھو گے اور ان کا کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ گے۔"

مجھے خوشی ہے کہ میں نے بھٹو صاحب کے اعتماد کو پورا پورا نبھایا' اور آج اس واقعہ کو قلم بند کرنے سے پہلے کسی کے ساتھ اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

کار میں بیٹھے بیٹھے ہم دونوں اس گفتگو میں اس درجہ محو تھے کہ ہمیں وقت کا خیال ہی نہ رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے چھ بجے کا عمل تھا۔ ابھی ائیرپورٹ چار پانچ میل دور تھی اور ہماری کار نہایت سست رفتاری سے سڑک پر رینگتی ہوئی جا رہی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کے ہجوم کا وقت (Rush Hour) اپنے عروج پر تھا اور ہم اپنے آگے پیچھے' دائیں بائیں ہزاروں موٹرکاروں کے اژدہام میں بری طرح گھرے ہوئے تھے۔ ان حالات میں ہمیں ائیرپورٹ تک پہنچنے میں کئی گھنٹے لگنے کا اندیشہ تھا۔ ڈرائیور نے عقلمندی سے کام لیا اور کار کی ہنگامی بتیاں ٹمٹما کر ایک ٹریفک سارجنٹ کو اپنی طرف

متوجہ کیا' پھر گاڑی سے اتر کر اس نے ٹریفک سارجنٹ سے کچھ گفتگو کی اور دیکھتے ہی دیکھتے موٹر سائیکلوں پر سوار ٹریفک پولیس کے چند سپاہیوں نے ہماری کار کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ فائر بریگیڈ کی طرح ہنگامی سائرن بجاتے وہ ہمارے آگے پیچھے تیز رفتاری سے روانہ ہو گئے۔ ان کی آواز پر سڑکوں پر چھایا ہوا ہجوم چھٹتا گیا اور ہم ٹریفک کی سرخ بتیوں سے بھی گزرتے ہوئے چند منٹ میں ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ وہاں پر ڈچ وزارت خارجہ کے ایک پروٹوکول افسر نے لپک کر بھٹو صاحب کا خیر مقدم کیا۔ کے۔ ایل۔ ایم کی میزبان خاتون نے معذرتانہ انداز میں کہا۔ "سر میں نے کسی کو آپ کے متعلق بالکل کچھ نہیں بتایا۔ آپ مشہور شخصیت ہیں' آپ کی نقل و حرکت سب کو معلوم ہو جاتی ہے۔"

جنگ بندی کے بعد ہی یہ خبریں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں کہ روس یہ کوشش کر رہا ہے کہ قضیہ کشمیر اور جنگ سے پیدا شدہ دیگر مسائل حال کرنے کے لیے وہ اپنی نگرانی میں بھارت اور پاکستان کے مذاکرات کروائے۔ رفتہ رفتہ یہ معلوم ہوا کہ مذاکرات منعقد ہونے کے لیے تاشقند کا مقام تجویز ہو رہا ہے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے صدر ایوب کو ایک طویل خفیہ تار دی کہ اگر واقعی ایسی کوئی تجویز آپ کے زیر غور ہے' تو آپ اسے فوراً رد کر دیں۔ کشمیر کے تنازعہ میں روس ہمارے خلاف اور ہندوستان کے حق میں بار بار اپنا ویٹو استعمال کر چکا ہے۔ اب روس کی سرکردگی میں اور اس کی سرزمین پر اس بارے میں جو بھی مذاکرات ہوں گے' ان میں حالات اور ماحول کا زیادہ سے زیادہ دباؤ اور جھکاؤ بھارت ہی کے حق میں جانے کا خدشہ ہے۔ اگر ہم نے اس دباؤ اور جھکاؤ کے خلاف زیادہ ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی تو یقیناً روس ہمارا مزید دشمن ہو جائے گا۔ ہمارے موجودہ حالات میں ہمیں روس کی مزید دشمنی مول لینا ہرگز مناسب نہیں۔

اس تار میں دوسری بات میں نے یہ لکھی تھی کہ اب تک تنازعہ کشمیر کی اصلی عدالت یو۔ این۔ او کی سیکیورٹی کونسل رہی ہے' وہیں پر تمام بحث مباحثے ہوئے ہیں اور وہیں

پر سب قرار دادیں منظور ہوئی ہیں جو تمام کی تمام ہمارے حق میں ہیں۔ ہمارے مفادات کا تقاضا ہے کہ ہم یہ مقدمہ اسی عدالت میں قائم رہنے دیں۔ اگر ایک بار یہ معاملہ کسی اور فورم مثلاً تاشقند میں منتقل ہو گیا تو اس کی نوعیت بالکل بدل جائے گی۔ سیکیورٹی کونسل کی تمام پچھلی قراردادیں متروک الاستعمال ہو جائیں گی اور رفتہ رفتہ فرسودگی اور دقیانوسیت کی گرد میں دب کر عملاً منسوخ اور کالعدم سمجھی جائیں گی۔ مستقبل میں ہمارے پاس کشمیر کی بابت صرف وہی حوالہ باقی رہ جائے گا جو مذاکرات تاشقند فراہم کریں گے۔ ایسی صورت حال ہمارے موقف کشمیر کے لیے انتہائی زوال پذیر رجعت پذیری ثابت ہو گی۔

اس تار میں تیسری بات یہ درج تھی کہ کشمیر کے معاملے میں اگر روس بھارت اور پاکستان کے مابین اپنی خیر سگالی کا مظاہرہ کرنا ہی چاہتا ہے' تو یہ مذاکرات یو۔ این۔ او میں سیکیورٹی کونسل کے زیر اہتمام منعقد ہونے چاہئیں۔ وہاں پر روس کو بھی ضرور خصوصی طور پر مدعو کیا جائے تاکہ وہ اپنی خیر سگالی کا برملا عملی اظہار کرنے میں پورا پورا آزاد ہو۔

صدر ایوب نے تو میری اس ٹیلیگرام کا کوئی جواب نہ دیا' لیکن چند روز بعد ہماری وزارت خارجہ سے میرے نام ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ میری تار پڑھ کر صدر ایوب نے اس پر یہ نوٹ تحریر فرمایا تھا۔

"There is a Lot of Sense in what he says?"

صدر کا یہ نوٹ پڑھ کر مجھے ہلکی سی امید بندھ گئی کہ شاید میری معروضات نے ان کے دل پر کچھ اثر کیا ہے اور وہ میرے مشورے پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہوں گے۔ لیکن یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی' کیونکہ چند ہفتوں کے بعد یہ خبر آئی کہ ۳ جنوری ۱۹۶۶ء کو پاکستان کا وفد صدر ایوب کی قیادت میں تاشقند پہنچ گیا ہے۔ بھارتی وفد کے سربراہ وزیراعظم لال بہادر شاستری تھے۔

مذاکرات تاشقند آٹھ روز جاری رہے اس موضوع پر بھی کوئی مستند اور جامع دستاویز ابھی

تک ہمارے سامنے نہیں آئی۔ چند راویوں سے جو ہمارے وفد میں شامل تھے' میں نے اتنا سنا ہے کہ ابتدائی چند ایام تعطل کا شکار رہے۔ کیونکہ شاستری جی نے ان مذاکرات میں کشمیر کا ذکر شامل کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ کشمیر پہلے ہی سے طے شدہ مسئلہ ہے' اور یہ مذاکرات صرف ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ہو رہے ہیں جو حالیہ جنگ سے پیدا ہوئے ہیں۔ غالباً روسیوں کی مداخلت سے شاستری جی کسی قدر پسیجے اور پاکستانی وفد کو ان مذاکرات کے دوران کشمیر کا نام لینے کی اجازت مل گئی۔ البتہ بھارتی وزیراعظم کا رویہ بدستور سخت اور بے لوچ رہا' ان کے نزدیک یہ مسئلہ طے ہو چکا ہوا تھا اور اب اسے ازسر نو چھیڑنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وزیر خارجہ مسٹر بھٹو کا خیال تھا کہ ایسے حالات میں یہ مذاکرات بے مقصد ہوں گے اور پاکستانی وفد کو بغیر کوئی معاہدہ کیے واپس لوٹ جانا چاہیے۔ شروع میں صدر ایوب بھی غالباً اسی خیال سے متفق تھے۔ لیکن روسی وزیراعظم مسٹر کوسیجن نے صدر ایوب سے پے در پے چند ملاقاتیں کر کے ان پر کچھ ایسا جادو کیا کہ ان کا رویہ ڈرامائی طور پر بدل گیا۔ اور وہ دفعتہً اس بات کے حامی ہو گئے کہ کسی معاہدہ پر دستخط کیے بغیر ہمیں تاشقند سے واپس جانا زیب نہیں دیتا۔

مذاکرات کے دوران کسی نکتے پر مسٹر بھٹو نے صدر ایوب کو کچھ مشورہ دینے کی کوشش کی تو صدر کا ناریل اچانک چٹخ گیا۔ انہوں نے غصے میں مسٹر بھٹو کو اردو میں ڈانٹ کر کہا "الو کے پٹھے بکواس بند کرو۔"

مسٹر بھٹو نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا "سر' آپ یہ ہرگز فراموش نہ کریں کہ روسی وفد میں کوئی نہ کوئی اردو زبان جاننے والا بھی ضرور موجود ہو گا۔"

میرا اندازہ ہے کہ غالباً یہی وہ نکتہ آغاز ہے جہاں سے صدر ایوب اور ذوالفقار علی بھٹو کے راستے عملی طور پر الگ الگ ہو گئے۔

وزیراعظم کوسیگن نے صدر ایوب پر کیا جادو چلایا یا کیا دباؤ ڈالا' اس کا ہمیں اب تک

کوئی سراغ نہیں ملا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں رہنماؤں کی ایک یا دو ملاقاتیں ایسی تھیں جن میں ہمارے وفد کا کوئی اور رکن موجود نہ تھا۔ شاید اسی بات کی آڑ لے کر مسٹر بھٹو نے صدر ایوب کے خلاف اپنی مہم میں یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ معاہدہ تاشقند میں کچھ ایسے امور بھی پوشیدہ ہیں جو ابھی تک صیغہ راز میں ہیں اور وہ بہت جلد ان کا بھانڈہ پھوڑنے والے ہیں۔ میرے خیال میں یہ محض ایک سیاسی شعبدہ بازی تھی جسکا مقصد صدر ایوب پر ایک عامیانہ الزام تراشی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یوں بھی صدر ایوب کی معزولی کے بعد مسٹر بھٹو نے اس تہمت کی طرف اشارہ تک کرنا چھوڑ دیا تھا' کیونکہ انہیں بخوبی علم تھا کہ یہ الزام شروع ہی سے بے بنیاد تھا۔

۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو وزیراعظم شاستری اور صدر ایوب نے معاہدہ تاشقند پر دستخط کر دیئے اور مسٹر کوسیجن نے اس پر اپنی گواہی ثبت کر دی۔ اس کے بعد خوشی منانے کی غرض سے دو تقریبات منعقد ہوئیں۔ ایک تو بین الاقوامی صحافیوں کی پریس کانفرنس کا استقبالیہ۔ دوسرا مسٹر کوسیجن کا دونوں وفود کے لیے ایک شاندار ڈنر۔ ان دونوں تقریبات میں پاکستانی وفد کے اراکین کسی قدر بجھے بجھے اور افسردہ دل تھے۔ لیکن بھارتی اراکین خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے' اور پھدک پھدک کر' چہک چہک کر اپنی شادمانی اور مسرت کا برملا اظہار کر رہے تھے۔ لال بہادر شاستری صاحب بھی فخر و انبساط سے سرشار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈنر کے بعد جب وہ اپنے ولا (Villa) میں واپس گئے تو کچھ دیر ٹیلیفون پر دہلی سے باتیں کرتے رہے۔ غالباً اپنی کامیابی اور فتحیابی کی خبر دے رہے ہوں گے۔ اس کے بعد شادی مرگ نے انہیں آ دبوچا اور دو تین گھنٹوں کے اندر اندر دل کی حرکت بند ہو جانے سے وفات پا گئے۔

دو تین روز بعد ہالینڈ کے ایک اخبار میں معاہدہ تاشقند کی تفصیلات پڑھیں۔ ساتھ ہی ایک فوٹو دیکھی جس میں صدر ایوب روسی وزیراعظم کے ہمراہ لال بہادر شاستری کے تابوت کو کندھا دے کر دہلی جانے والے ایک جہاز کی طرف جا رہے تھے۔ اس تابوت میں صرف شاستری جی کا جسد خاکی ہی نہ تھا۔ بلکہ اس میں مسئلہ کشمیر پر یو۔ این۔ او میں ہماری

تمام پیش رفت بھی لپیٹ کر مقفل کر دی گئی تھی۔ کیونکہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کے بعد مسئلہ کشمیر کا حوالہ سیکیورٹی کونسل کی قرار دادیں نہ رہی تھیں' بلکہ معاہدہ تاشقند کی وہ شق رہ گئی تھی جس میں ریاست جموں و کشمیر کا ذکر محض ضمنی طور پر اس طرح آیا تھا:

"The prime Minister of India and the President of pakistan agree that both sides will exert all efforts to create good neighbourly relations between India and Pakistan in accordance with the United Nations Charter، they reaffirm their obligation under the Charter not to have recourse to force and settle their disputes through peaceful means."

"They considered that the interest of peace in the region and particularly in the Indo-Pakistan Subcontinent and indeed، the interests of the people of India and pakistan were not served by the continuance of the tension between the two countries. It is against this background that Jammu and Kashmir was discussed، and each of the sides put forth its respective position."

ہندوستان کے علاوہ معاہدہ تاشقند کا اصلی ثمر روس کے حصے میں بھی آیا۔ یہ مذاکرات اپنی سرزمین پر منعقد کرانے میں روس کی پیش قدمی میں غالباً یہ دعویٰ بھی مضمر تھا کہ حق ہمسائیگی کے طور پر جنوبی ایشیا کے معاملات اس کے حلقہ اثر کا جزو لاینفک ہیں۔ سپر پاور کے درمیان دنیا میں اپنے اپنے حلقہ اثر کی بندر بانٹ کے حوالے سے یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ امریکہ نے روس کے اس خاموش لیکن واضح دعوے کو بلا چوں و چرا تسلیم بھی کر لیا۔

۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو مسئلہ کشمیر معاہدہ تاشقند کے تابوت میں ڈال دیا گیا تھا۔ چھ برس بعد

۱۹۷۲ء کو معاہدہ شملہ نے اس تابوت میں ایک اور کیل ٹھونک دی۔ یہ کیل ان الفاظ کے ساتھ گاڑی گئی تھی:

> In Jammu and Kashmir, the Line of Control resulting from the cease fire of December 17, 1971 shall be respected by both sides without prejudice to the recognised position of either side. Neither side shall seek to alter it unilaterally, irrespective of mutual differences and legal interpretations. Both sides further undertake to refrain from threat or the use of force in violation of this Line.

اس کے بعد رفتہ رفتہ اب یہ نوبت آ گئی ہے' کہ اگر ہم کسی بین الاقوامی پلیٹ فارم پر متنازعہ کشمیر کا نام تک بھی لیں' تو بھارتی حکمران سیخ پا ہو کر ہم پر گرجنے برسنے لگتے ہیں کہ ہم ان کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کیوں کر رہے ہیں؟

مجموعی طور پر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ فیلڈ مارشل ایوب خاں کے عہد کا ایک انتہائی اہم سنگ میل ہے۔ اس موقع پر پوری قوم نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ لیکن ان کے فوجی مشیروں کی ہمت اور اہلیت قوم کی توقعات پر پوری نہ اتر سکی۔ ان کے دیرینہ حلیف امریکہ اور برطانیہ نے ان کے ساتھ بے وفائی کی۔ تاشقند میں روس نے ان پر یقیناً کسی نہ کسی قسم کا دباؤ ڈالا۔ معاہدہ تاشقند میں مسئلہ کشمیر کو اس کی بنیادی پٹڑی سے اتار کر کھٹائی میں ڈال دیا گیا۔ اس کے خلاف ملک میں شدید ردعمل کی رو ابھری۔ اور اسی کے ساتھ صدر ایوب کے زوال اقتدار کے آثار مرتب ہونا شروع ہو گئے۔

○ امریکہ

اقتدار میں آنے سے بہت عرصہ قبل ہی ایوب خاں صاحب امریکہ پرستی کے بین الاقوامی فیشن ایبل مرض میں مبتلا ہو چکے تھے۔ بری افواج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے انہوں نے پاکستانی حکومت سے بالا بالا واشنگٹن میں امریکی فوجی ہیڈ کوارٹر Pentagon سے

نہایت گہرے دوستانہ روابط قائم کر رکھے تھے۔ امریکی فوجی لیڈروں کے اثر و رسوخ کے تحت اور ان کی رہنمائی میں ہمارے کمانڈر انچیف نے اپنی افواج کو اس طور پر منظم

آراستہ اور مسلح کرنا شروع کیا کہ آئندہ ہمیں امریکہ کی فوجی امداد کے بغیر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا یا متبادل دفاعی حکمت عملی اختیار کرنا محال ہی نہیں بلکہ نا ممکن ہو گیا۔

۱۹۵۵ء میں امریکہ نے "بغداد پیکٹ" کے نام سے مشرق وسطیٰ میں روس کے خلاف محاذ آرائی کا ڈول ڈالا تو دنیائے عرب میں اس کے خلاف شدید ردعمل پیدا ہوا۔ ایران اور ترکی پہلے ہی اپنے اپنے طور پر امریکہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کئے بیٹھے تھے۔ اس لیے "بغداد پیکیٹ" میں ان کی شمولیت کوئی حیران کن بات نہ تھی۔ عراق میں وزیراعظم نوری السعید اور ان کی ہمخیال ٹولہ صدر ناصر کی اندھا دھند دشمنی میں حواس باختہ ہو کر امریکن ترغیبات کی بنسی میں ایک کینچوے کی طرح لٹکا ہوا تھا اور "بغداد پیکیٹ" کی میزبانی کا شرف حاصل کر کے عرب دنیا میں انتشار اور نفاق کا بیج بو رہا تھا۔ اس وقت پاکستان کو ایسی کوئی خاص مجبوری لاحق نہیں تھی کہ وہ دنیائے عرب کی ناراضگی مول لے کر خواہ مخواہ اس پیکیٹ میں شامل ہوتا۔ یوں بھی اس معاہدے کے ساتھ پاکستان کا کوئی فوری مفاد وابستہ نہ تھا کیونکہ ہمارے ابدی دشمن نمبر ایک یعنی بھارت کی طرف سے پاکستان پر حملے کی صورت میں یہ معاہدہ ہمارے دفاع کی کوئی ذمہ داری قبول نہ کرتا تھا۔ تاہم بری فوج کے کمانڈر انچیف کے دباؤ میں آ کر حکومت پاکستان بغیر سوچے سمجھے اس پیکیٹ میں شامل ہو گئی۔

عراق میں انقلاب کے بعد بغداد تو اس پیکیٹ سے خارج ہو گیا اور یہی معاہدہ سینٹو یعنی (Central Treatry Organization) کا لبادہ اوڑھ کر انقرہ منتقل ہو گیا۔ اس نئی ہیئت میں بھی ہم بدستور اس پیکٹ کے ساتھ چپکے رہے۔ اس عمل میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ اس کا اندازہ صرف ایڈ' ٹریڈ' توپ و تفنگاور گولہ بارود کے گوشواروں سے نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کا اصلی جائزہ لینا تو اس وقت ممکن ہو گا جب آزادی اقوام کے

آئینے میں وطن عزیز کے واقعات و شواہد تاریخ کی چھلنی سے گزر کر اپنے صحیح پس منظر اور پیش منظر میں رکھے جا سکیں گے۔ فی الحال صرف یہی کہنا کافی ہو گا کہ "بغداد پکیٹ" عرف سینٹو میں پاکستان کی شمولیت نے مسئلہ کشمیر کو زبردست دھچکا پہنچایا اس معاہدے میں شمولیت سے پہلے جب کبھی یہ تنازعہ یو۔ این۔ او میں پیش ہوتا تھا تو اس پر روس کا رویہ غیر جانبدارانہ رہا کرتا تھا۔ اور سیکیورٹی کونسل میں رائے شماری کے دوران روسی نمائندہ کسی جانب بھی ووٹ ڈالنے سے اجتناب برتا کرتا تھا۔ لیکن اس پکیٹ میں ہمارے شامل ہوتے ہی روس نے مسئلہ کشمیر پر اپنا رویہ مکمل طور پر بدل لیا اور وہ اس موقف پر اڑ گیا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ حصہ ہے اور وہاں پر اب کسی قسم کا استصواب رائے کروانا ضروری ہے اور نہ ہی ممکن ہے۔ سیکیورٹی کونسل میں بھی روس نے اس معاملے میں پاکستان کے خلاف ویٹو استعمال کرنا شروع کر دیا۔

سینٹو CENTO کی طرح سیٹو SEATO بھی ایک دوسرا فوجی معاہدہ تھا جو خواہ مخواہ مفت میں ہمارے سر بڑا عرصہ منڈھا رہا۔ سیٹو (ساؤتھ ایسٹ ایشیا ٹریٹی آرگنائزیشن) بھی امریکہ کی رہنمائی میں مغربی مفاد پرستی کا ایک حربہ تھا جو جنوب مشرقی ایشیا میں چین کی ناکہ بندی کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ اس میں ہماری شمولیت بھی نہ پاکستان کے لیے ضروری تھی نہ سود مند تھی۔

اس زمانے میں یہ افواہ بھی گرم تھی کہ ستمبر ۱۹۵۴ء میں جب اس معاہدہ پر غور و خوض کے لیے متعلقہ ممالک کی کانفرنس منیلا میں منعقد ہوئی تو اس میں پاکستان کے وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خاں کو محض آبزرور (Observer) کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ حکومت پاکستان نے انہیں اس بات کی اجازت نہ دی تھی کہ وہ اس معاہدہ میں پاکستان کی شمولیت تسلیم کر کے آئیں۔ لیکن کسی وجہ سے چوہدری ظفر اللہ خاں نے خود اپنی صوابدید پر اس معاہدہ پر دستخط کر دیے تھے اور اسی طرح کی کسی اور وجہ سے کانفرنس کے شرکا نے فل پاور Full Power کے بغیر ان کے دستخط قبول بھی کر لیے۔ اگر یہ افواہ

واقعی صحیح ہے تو یہی سمجھنا چاہیے کہ بیچارے پاکستان کو زبردستی ایک ناپسندیدہ اور غیر نافع بین الاقوامی معاہدے میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

میں نے صدر ایوب سے درخواست کی کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں وزارت خارجہ اور کابینہ کے ریکارڈ دیکھ کر اس افواہ کی تصدیق یا تردید کر سکوں جو ہر دور میں ایک نیا رنگ لے کر زبان زد خاص و عام ہوتی رہتی ہے۔ انہوں نے بخوشی اجازت دے دی لیکن وزارت خارجہ اور کیبنٹ سیکرٹریٹ والوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا یہ اطلاع صدر مملکت نے کسی سرکاری حوالے کے لیے طلب فرمائی ہے یا میں یہ تفتیش صرف اپنی ذاتی حیثیت سے کر رہا ہوں۔ میں نے سچ سچ تسلیم کر لیا کہ یہ اطلاع صدر ایوب نے کسی سرکاری غرض کے لیے طلب نہیں کی۔ اس پر ان دونوں دفاتر کے بابو صفت افسر دفتری معاملات کو صیغہ راز میں رکھنے والے بے معنی اور فرسودہ قواعد و ضوابط کی آڑ میں چپ سادھ کر بیٹھ گئے۔ آزاد دنیا کے مہذب ممالک میں خفیہ سے خفیہ راز ہائے سر بستہ کو بھی کم و بیش تیس برس گزرنے کے بعد بر سر عام فاش کر دیا جاتا ہے تاکہ قومی تاریخ کی تدوین و تصدیق کے تقاضے ہر زمانے میں بعنوان شائستہ پورے ہوتے رہیں۔ سیٹو میں بھی ہماری شمولیت کو اب کوئی تیس برس ہوا چاہتے ہیں۔ امید رکھنی چاہیے کہ اب حکومت پاکستان اس موضوع پر متعلقہ کاغذات اور دستاویزات منظر عام پر لانے میں پس و پیش نہ کرے گی۔ تاکہ تاریخ کے طالب علم ان سے کھلے بندوں استفادہ کر سکیں۔ اور اس سلسلے میں اگر کسی غلط افواہ نے وقتاً فوقتاً سر اٹھایا ہے تو اس کا مناسب سدباب ہو سکے۔

جب ہم نے بغداد پیکیٹ (سینٹو) اور سیٹو میں شمولیت اختیار کی تو ہمارے خلاف بھارت میں بھی شدید واویلا مچایا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ الزام لگایا کہ ان معاہدوں میں شامل ہو کر ہم سپر پاورز کی باہمی "سرد جنگ" کو پاک بھارت برصغیر کی حدود میں کھینچ لائے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ امریکی ڈالروں کی چمک دمک سے تو ہماری آنکھیں روز اول ہی

سے خیرہ ہو رہی تھیں۔ لیکن خود امریکیوں کی نگاہ میں پاکستان کی حقیقی قدر و قیمت کیا تھی' اس کا اندازہ تاریخی واقعات اور شواہد کی روشنی ہی میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں دو باتوں کو ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیے۔ ایک تو یہ کہ امریکہ ایک نہایت عظیم سپر پاور ہے۔ اس کی طاقت' عظمت اور خوشحالی کا انحصار نہ پاکستان کے وجود پر ہے اور نہ ہی پاکستان کی خیر سگالی اور خوشنودی پر ہے۔ پاکستان کے ساتھ امریکہ کی دلچسپی' دوستی اور گرمجوشی وقتاً فوقتاً صرف اسی حد تک قائم ہو سکتی ہے جس حد تک کہ ہم عالمی بساط سیاست پر شطرنج کے مہرے کی طرح اس کے لیے کار آمد ثابت ہوتے رہیں گے۔ ہماری اسی افادیت کے اتار چڑھاؤ پر ہمیں کبھی امریکی فوجی یا معاشی امداد ملنے لگتی ہے کبھی بند ہو جاتی ہے یا کبھی اس میں ترمیم و تجدید یا تخفیف و تعویل ہوتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ امریکن ایڈ کا کوئی پیمانہ قابل عمل نہیں اور قابل اعتبار نہیں کیونکہ لین دین کے اس کاروبار میں کسی اصول' خلوص یا مروت کا بالکل کوئی عمل دخل نہیں۔ دوسری بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے' یہ ہے کہ ہر امریکی حکومت میں عموماً یہودیوں کا عنصر کافی حد تک غالب رہتا ہے۔ اسلام کے حوالے سے یہودی پاکستان کے ازلی اور ابدی دشمن ہیں اور اپنے مفاد کے محدود تقاضوں کے علاوہ اس کی کوئی مزید مدد کرنا کبھی قبول یا گوارا نہ کریں گے۔

کمانڈ انچیف کی حیثیت سے جنرل ایوب خاں نے امریکن فوجی ہیڈ کوارٹر کے ساتھ جو پینگیں بڑھائی تھیں' ان کا ایک منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان ایک فوجی معاہدہ طے کرنے کی گفت و شنید شروع ہو گئی۔ اسی زمانے میں پاکستان کے وزیراعظم محمد علی بوگرا نے کافی دوڑ دھوپ کے بعد طرح طرح کے ہاتھ پاؤں مار کر پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ مسئلہ کشمیر پر گفتگو کرنے کے لیے دہلی میں ایک ملاقات کا راستہ ہموار کیا اس ملاقات کے بعد اگست ۱۹۵۳ء میں دونوں وزرائے اعظم نے ایک مشترکہ اعلان جاری کیا جسمیں واشگاف طور پر اپنے اس موقف کا اعادہ کیا گیا تھا کہ تنازعہ

کشمیر ریاست کے عوام کی خواہشات کے مطابق حل کیا جائے گا۔ اور کشمیری عوام کی خواہشات ایک منصفانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعے معلوم کی جائے گی۔

ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ آٹھ ماہ کے اندر اندر ایک (Plebiscite Administrator) بھی تعینات کر دیا جائے گا۔ لیکن جونہی پنڈت جواہر لال نہرو کے کان میں یہ بھنک پڑی کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان کوئی دفاعی معاہدہ طے ہو رہا ہے' وہ فوراً قلابازی کھا کر اپنے اس اعلان اور فیصلے سے بے حجابانہ مکر گئے۔ انہوں نے انتہائی سخت اور تند لہجے میں وزیراعظم محمد علی بوگرا کو لکھا کہ اگر پاکستان نے امریکہ کے ساتھ کوئی فوجی معاہدہ طے کیا تو پاک بھارت تعلقات پر نہایت مضر اور ناخوشگوار اثر پڑے گا اور تنازعہ کشمیر کے متعلق پچھلے تمام فیصلے اور سمجھوتے کالعدم تصور کیے جائیں گے۔ ہندوستان کی اس بے جا غوغا آرائی کے باوجود پاکستان اور امریکہ کے درمیان ایک دفاعی معاہدہ پر جو (Mutual Defence Assistance Agreement) کے نام سے موسوم تھا مئی ۱۹۵۴ء میں دستخط ہو گئے۔ پاکستان ایشیا کا واحد ملک تھا جو بھارت کی شدید ناراضگی مول لے کر اور کشمیر میں استصواب رائے کے متفقہ فیصلے سے ہاتھ دھو کر امریکہ کے ساتھ فوجی معاہدے میں منسلک ہوا تھا۔ روس کی ناراضگی مول لے کر اور مسئلہ کشمیر میں روس کی شدید مخالفانہ روش اختیار کرنے کے باوجود بغداد پکیٹ عرف ﺳﯿﻨﭩﻮ کا رکن بنا۔ اور چین کی ناراضگی کا خطرہ مول لے کر سیٹو کی رکنیت اختیار کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب "ہندی چینی بھائی بھائی" کا نعرہ ہندوستان کے طول و عرض میں اپنے پورے عروج پر گونج رہا تھا۔ پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنی اس عاجزانہ وفاداری اور فدویانہ اطاعت شعاری کو جس خلوص' نیاز مندی اور پابندی سے نبھایا وہ ہماری مجبوری یا معذوری یا کوتاہ اندیشی تھی۔ لیکن جواباً امریکہ نے وقتاً فوقتاً ہمیں جس سلوک سے نوازا اسے بیان کرنے کے لیے ایک سپر پاور کے پاس کوئی الفاظ ہوں' تو ہوں' عام انسانیت کا نصاب اخلاق ان الفاظ سے قطعی کورا ہے۔

پانچ برس بعد ۱۹۵۹ء میں پاکستان اور امریکہ کے مابین ایک باہمی تعاون کا معاہدہ طے پایا

Bilateral Agreement of Co- operation between the united States of America and Pakistan جس کی ایک سہم شق یہ تھی کہ اگر پاکستان پر کوئی جارحانہ حملہ ہوا تو امریکہ اس کی مدد پر آئے گا۔ اس معاہدے کی خبر پاتے ہی بھارت نے امریکہ کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بہت جلد پنڈت نہرو نے لوک سبھا میں ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کہ امریکہ حکومت نے انہیں یقین دہانی دلا کر ضمانت دی ہے کہ اس معاہدے کا اطلاق ہندوستان پر نہیں ہو گا۔ دوسرے الفاظ میں بھارت کو کھلی آزادی تھی کہ وہ جب چاہے اور جتنی بار چاہے پاکستان پر حملہ آور ہوتا رہے۔ امریکہ اپنے حلیف پاکستان کی ہرگز کوئی مدد نہ کریگا۔ درحقیقت ہوتا بھی یونہی رہا ہے۔ اسی زمانے میں کسی غیر ملکی صحافی نے صدر ایوب سے سوال کیا تھا کہ اگر آپ کی ہندوستان کے ساتھ جنگ چھڑ جائے' تو کیا آپ بھارت کے خلاف وہ اسلحہ استعمال کر سکیں گے جو کسی معاہدہ کے تحت امریکہ سے حاصل کیا گیا؟ صدر ایوب نے سیدھا دو ٹوک یہ جواب دیا تھا کہ فوجی اسلحہ جنگ کی صورت میں استعمال کرنے کے لیے ہی حاصل کیا جاتا ہے۔ کچی روئی (Cotton Wool) میں لپیٹ کر رکھا نہیں جاتا۔ اس پر امریکی سفارتخانہ بڑا برہم ہوا تھا۔ بلکہ ایک پارٹی میں کسی امریکن سفارتخانے نے تندی و تلخی سے یہ پھبتی اڑائی تھی کہ ہم نے صدر ایوب کی یہ بات سنی ہی نہیں کیونکہ اس وقت ہم اپنے کانوں میں کچی روئی ٹھونسے بیٹھے تھے۔

صدر کینڈی کی دعوت پر صدر ایوب نے جولائی ۱۹۶۱ء میں امریکہ کا دورہ کرنا تھا۔ اس دورے میں ہمارے صدر کی تقاریر اور گفت و شنید کے موضوعات متعین کرنے کے لیے مختلف وزارتوں سے تجاویز طلب کی گئیں۔ اور ان تجاویز پر غور کرنے کے لیے متعلقہ وزیروں کی ایک میٹنگ بھی منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ کی کارروائی دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا۔ کیونکہ ان سب تجاویز کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ صدر ایوب اپنے دونوں ہاتھوں میں کشکول گدائی اٹھائے امریکہ جائیں اور منت سماجت' خوشامد اور چاپلوسی کی باتیں کر کے امریکیوں کی خودپسندی کو تقویت دیں اور اپنی جھولی میں امریکی امداد کی رقم بڑھوا

کر فتح و نصرت کے شادیانے بجاتے گھر واپس آ جائیں۔ ڈالروں کی ریل پیل بڑھنے کی توقع اور امکان پر صدر ایوب کے منہ میں بھی پانی بھر آیا' اور وہ غلامانہ ذہنیت کی ان تجاویز پر نہایت خوشدلی سے اثبات میں سر ہلاتے رہے۔

یہ میٹنگ ختم ہوئی تو وزارت خارجہ کے سیکرٹری ایس کے دہلوی اور سیکرٹری اطلاعات نذیر احمد میرے کمرے میں آئے۔ وہ دونوں بھی اس میٹنگ کے رنگ ڈھنگ پر سخت برہم تھے۔ ان کا وسیع تجربہ' قابلیت اور جذبہ حب الوطنی اس قدر جوش میں آیا ہوا تھا کہ ان کا اصرار تھا کہ اگر صدر ایوب اسی طرح کاسہ گدائی ہاتھ میں لے کر امریکہ گئے تو وہ اپنے اپنے عہدوں سے سبکدوش ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اس رات ہم تینوں میرے گھر میں ساری شب بیٹھے رہے۔ اور ہم نے صدر کے دورہ امریکہ کے لیے ایک نیا بریف (Brief) تفصیل سے تیار کر لیا۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ صدر کو ایک آزاد مملکت کے باوقار سربراہ کی حیثیت سے امریکہ کا دورہ کرنا چاہیے اور پاکستان کے مسائل اور مشکلات کو حسن تدبر اور بے باکی سے امریکی عوام' حکومت اور کانگرس کے سامنے بیان کرنا چاہیے۔ جہاں تک امریکہ امداد کا تعلق ہے' وہ ہاتھ پھیلا کر مانگنے سے نہیں ملتی۔ بلکہ امریکہ کے اپنے مفاد کے پیمانے سے ناپ کر دی جاتی ہے۔ امریکہ کے اس دورے کا بنیادی مقصد یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس کے ذریعہ وطن عزیز کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو اور بین الاقوامی سطح پر ہماری عزت نفس بڑھے۔

چونکہ اس زمانے میں میں صدر ایوب کے سیکرٹری کے طور پر متعین تھا' اس لیے میری ڈیوٹی لگی کہ یہ نوٹ میں خود جناب صدر کی خدمت میں پیش کروں۔ اس پر دستخط ہم تینوں نے کیے تھے۔

صبح سویرے دفتر پہنچ کر میں نے یہ نوٹ صدر ایوب کے پاس بھیج دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میرے انٹر کام (Intercom) کا بلب ٹمٹمایا جس کا مطلب تھا کہ صدر صاحب خود ٹیلیفون پر ہیں۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو وہ غضبناک لہجے میں گرج برس رہے تھے۔ ان کے الفاظ یہ تھے۔

"میں نے یہ لغو بات پڑھ لی ہیں۔ تم لوگ اس خیال میں ہو جیسے میں امریکہ صرف مکئی کھیلیں اور آئس کریم کھانے جا رہا ہوں۔ نہیں جناب' نہیں جناب۔ میں ملک کے لیے کوئی بہتری کرنے کی کوشش میں ہوں۔ آخر تم لوگوں کو یہ جسارت ہی کیسے ہوئی کہ میرے وزیروں کے متفقہ فیصلوں کو رد کرنے کا سوچو؟ نہیں جناب۔ اس طرح کام نہیں چل سکتا۔"

اتنا کہہ کر صدر ایوب نے دھماکے کے ساتھ اپنا ریسیور ٹیلیفون پر دے مارا اور مجھے کچھ کہنے کا موقع تک نہ ملا۔ میں نے فوراً فون کر کے دہلوی صاحب اور نذیر احمد صاحب کو اس صورت حال کی خبر دی۔ دہلوی صاحب تو کسی قدر پریشان ہوئے۔ لیکن نذیر احمد نے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا۔ تم فائرنگ لائن میں بیٹھے ہو۔ اب بھگتو۔ لیکن خبردار ڈرنا مت' بس ڈٹے رہو۔"

اس روز دن کے ڈیڑھ بجے کے قریب صدر ایوب اپنے دفتر سے اٹھے۔ ان کا معمول تھا کہ برآمدے سے گزرتے ہوئے وہ اکثر میرے کمرے کی کھڑکی کے سامنے لحہ دو لحہ رک کر سلام دعا کر لیا کرتے تھے اور اگر ان کے ذہن میں یا میرے پاس کوئی ضروری کام ہوتا تو اس کے متعلق چند باتیں بھی کر لیتے تھے۔ لیکن آج وہ اس قدر تاؤ میں تھے کہ میری کھڑکی کی جانب آنکھ تک نہ اٹھائی اور ناک کی سیدھ میں آگے بڑھ گئے۔ دوسری صبح اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے بھی انہوں نے یہی رویہ روا رکھا اور دوپہر کے وقت بھی ایسا ہی کیا۔ ان دو دنوں کے دوران انہوں نے میرے ساتھ نہ کوئی بات کی اور نہ ہی ٹیلیفون کیا۔ ان کے اس برتاؤ نے میرے دل میں بھی کسی قدر آزردگی پیدا کی۔ قومی سطح کے کسی اہم سرکاری معاملے پر اپنی آزادانہ رائے کا اظہار کرنا ہمارا فرض تھا۔ اسے مان لینا یا رد کر دینا صدر مملکت کا اپنا اختیار تھا۔ اگر ہمارے فرض کی ادائیگی ان کو اس قدر گراں گزری تھی تو وہ ہم تینوں کو ہمارے عہدوں سے تبدیل کر سکتے تھے یا یک جنبش قلم ہمیں ریٹائر یا موقوف بھی کر سکتے تھے لیکن بگڑے ہوئے بچے یا بدمزاج ساس کی طرح اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر روٹھ بیٹھنا ان کی

شان کے شایاں نہ تھا ان کے اس طرز عمل کے جواب میں تیسرے دن میں نے بھی ایک ایسی ہی طفلانہ حرکت کی۔ میں نے برآمدے کی طرف کھلنے والی کھڑکی اندر سے بند کر کے کنڈی چڑھا لی۔ غالباً میری اس حرکت پر ان کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور چوتھی صبح وہ اپنے دفتر میں جانے کی بجائے میرے کمرے میں آ گئے۔ اندر آ کر انہوں نے نیم سنجیدگی سے کہا۔ "تازہ ہوا صحت کے لیے مفید ہے۔ کمرے کی کھڑکی کھول کر بیٹھنا چاہیے۔"

پھر وہ اپنے پرانے معمول کے مطابق میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر مجھے بتایا کہ کافی سوچ بچار کے بعد امریکہ کے دورے کے متعلق اب وہ ہمارے ہمخیال ہو گئے ہیں۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے انہوں نے ان موضوعات اور نکات کا جائزہ لیا جو انہیں امریکہ میں جا کر اٹھانے چاہئیں۔ امریکی کانگرس کے سامنے اپنی تقریر کا انہیں خاص خیال تھا۔ وہاں پر وہ لکھی ہوئی تقریر پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ فی البدیہہ خطاب کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھے چند مختصر سے نوٹ تیار کرنے کی ہدایات دیں۔ آخر میں انہوں نے حکم دیا کہ ان کا دورہ شروع ہونے سے چند روز قبل میں دہلوی صاحب اور نذیر احمد صاحب کے ہمراہ واشنگٹن پہنچ جاؤں۔ اور ہم لوگ اپنے سفیر مسٹر عزیز احمد کے ساتھ مل جل کر اس دورے کے نئے رخ کو بعنوان شائستہ نبھانے کی کوشش کریں۔

صدر ایوب کا دورہ شروع ہونے سے چار پانچ روز قبل ہم تینوں واشنگٹن پہنچ گئے۔ وہاں پر مسٹر عزیز احمد نے ہمیں بتایا کہ پریذیڈنٹ کینڈی بذات خود تو نہایت ذہین' روشن خیال اور حقیقت شناس انسان ہیں۔ لیکن ہاورڈ یونیورسٹی کے دانشوروں کے ایک ایسے گروہ نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے جو جذباتی طور پر پاکستان کے مقابلے میں بھارت کی جانب زیادہ مائل ہیں۔ اس لیے صدر ایوب کو اپنے دورے میں ہر مقام پر پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہو گا۔

واشنگٹن میں صدر ایوب کی آمد سے چند منٹ پہلے پریذیڈنٹ کینڈی بھی صدارتی ہیلی کاپٹر

کے ذریعے ہوائی اڈے پر آ گئے۔ مسٹر عزیز احمد نے ان کے ساتھ ہم تینوں کا تعارف کرایا تو وہ مسکرائے اور بولے "میں مان گیا۔ صدر ایوب واقعی ایک عملی فوجی کمانڈر بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے وفد کا ہراول دستہ تو پہلے ہی سے یہاں بھیج رکھا ہے!

صدر کینیڈی اور مسٹر عزیز احمد نے جو سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھے وہ ایک ہی جیسے کپڑے سے بنے ہوئے تھے۔ جونہی مسٹر کینیڈی کے مشاہدے میں یہ بات آئی انہوں نے فوراً کہا۔ مسٹر ایمبیسڈر۔ کیا یہ نیک فال نہیں کہ ہم دونوں نے ایک ہی سا لباس پہنا ہوا ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ہمارے مذاکرات میں بھی ایسی ہی ہمخیالی قائم رہے گی۔"

صدر کینیڈی جوانی' رعنائی' خوش گفتاری اور ذہانت کا سیماب صفت پیکر تھے۔ کبھی کبھی ان کا انداز ایک ایسے الھڑ نوجوان کے ساتھ مشابہت کھانے لگتا تھا جو ابھی ابھی اپنے کالج کی کلاس میں کسی قسم کی شرارت کر کے بھاگا ہو۔ ان کی نیلی نیلی آنکھوں میں بلا کی تیزی اور گہرائی تھی' وزیروں' مشیروں اور سفیروں کے ہجوم کے درمیان بھی وہ یوں نظر آتے تھے جیسے اکیلے اور تنہا ہوں۔ صدر ایوب کے ساتھ دوبار امریکہ کے دوروں میں مجھے صدر کینیڈی کو کئی بار کافی نزدیک سے دیکھنے کا موقع میسر آیا۔ ہر بار مجھے یہی احساس ہوا کہ ان کی دلنواز مسکراہٹ اور چلبلاہٹ کے پردے میں ایک بے نام سا حزن و ملال بھی پوشیدہ ہے۔ صدر ایوب نے اپنے پہلے دورہ امریکہ کو نہایت خوش اسلوبی' خودداری اور خود اعتمادی کے ساتھ نبھایا۔ مسٹر اور مسز کینیڈی نے بھی دل کھول کر ان کی خاطر و مدارات کی مذاکرات بھی اچھے رہے۔ اس زمانے میں یہ افواہ زوروں پر تھی کہ امریکی حکومت Mutual Security Act میں ایسی ترامیم لا رہی ہے' جن سے غیر جانبدار ممالک کو بھی معاشی' اور فوجی امداد فراہم کرنا ممکن ہو جائے گا۔ صدر ایوب نے کہا کہ اگرچہ بھارت روس سے باضابطہ ہر قسم کی فوجی اور معاشی امداد حاصل کرتا رہا ہے لیکن امریکہ کی نظر میں وہ ہمیشہ ایک غیر جانبدار ملک ہی رہا ہے۔ اب اگر قانون میں مجوزہ ترمیم کے بعد بھارت بھی امریکن فوجی امداد کا قانونی طور پر حقدار بن

گیا تو پاکستان جیسا آپ کا پرانا دوست کہاں جائے گا؟
صدر کینیڈی نے دو ٹوک الفاظ میں برملا یہ یقین دلایا کہ امریکہ بلاشبہ پاکستان کی دوستی کی قدر کرتا ہے۔ صدر ایوب خاطر جمع رکھیں کہ ہندوستان کو کسی قسم کی فوجی امداد فراہم کرنے سے پہلے امریکہ پاکستان کو اعتماد میں لے کر اس سے ضرور مشورہ کرے گا۔

لیکن حیف صد حیف کہ صدر کینیڈی اپنا یہ وعدہ وفا نہ کر سکے۔ جونہی بھارت اور چین کے درمیان سرحدی جھڑپ رونما ہوئی' امریکہ کی بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ چینی فوج سے بری طرح شکست کھا کر بھارتی فوج سر پر پاؤں رکھ کر میدان جنگ سے بھاگی تو امریکہ نے بھی فوراً اپنی خیر سگالی کا ڈول ڈالا اور پاکستان کو اعتماد میں لیے بغیر برطانیہ کے ساتھ مل کر ہندوستان کو بے دریغ ہر قسم کی فوجی امداد دینا شروع کر دی۔ واشنگٹن میں ہمارے سفیر نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس کے احتجاج پر کسی نے کان تک نہ دھرے۔ سب لوگ یہی کہہ کر ٹالتے رہے کہ ہندوستان کو جو اسلحہ دیا جا رہا ہے وہ صرف چین کے خلاف استعمال ہو گا' پاکستان کے خلاف استعمال ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
لیکن پاکستان میں ہم بھارت کے اصلی عزائم سے خوب واقف تھے' ہم پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ دشمنی کی ترجیحات میں بھارت کے نزدیک اس کا سب سے بڑا دشمن پاکستان ہے' چین نہیں۔ اس لیے جلدی یا بدیر یہ اسلحہ پاکستان ہی کے خلاف استعمال ہو گا جیسا کہ حقیقت میں ہوا' پہلے ۱۹۶۵ء میں۔ بعدازاں ۱۹۷۱ء میں۔ روز اول ہی سے پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنی وفاداری اور تابعداری نبھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ہمارے پہلے وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں نے روس کا دعوت نامہ پس پشت ڈال کر امریکہ کا دورہ قبول کر لیا۔ گورنر جنرل غلام محمد اور صدر اسکندر مرزا کے زمانے میں امریکی مشیر ہمارے کاروبار حکومت پر ٹڈی دل کی طرح چھائے رہے۔ کمانڈر انچیف کی حیثیت سے صدر ایوب نے ہماری افواج کو اس طرز پر منظم اور مسلح

کیا کہ ہماری دفاعی شہ رگ ہمیشہ کے لیے امریکہ کی مٹھی میں دب کر رہ گئی۔ روس اور عرب ممالک کی ناراضگی مول لے کر ہم بغداد پیکیٹ عرف سینٹو کے رکن بنے تاکہ امریکہ کی خوشنودی ہمارے شامل حال رہے۔ سیٹو میں شامل ہو کر ہم نے چین کی ناکہ بندی میں حصہ لیا تاکہ امریکہ کی خیر سگالی ہمارے ساتھ قائم و دائم رہے۔ لیکن ہماری جانب سے یہ صرف یکطرفہ ٹریفک تھی۔ دوسری جانب سے ہمیں گھر کی مرغی دال برابر سمجھ کر حسب ضرورت پیٹ بھرنے کے لیے تھوڑا بہت دانا دنکا ڈال دیا جاتا تھا ورنہ امریکہ کی اصلی کوشش اور خواہش ہندوستان کو رام کرنے کی تھی جو روس کی گود میں بیٹھ کر امریکہ کو ٹھینگا بھی دکھاتا تھا' اور اپنی نام نہاد غیر جانبداری کا گھونگھٹ نکال کر ۱۹۵۱ء سے ایک Mutual Defence Assistant Agreement کے تحت چپکے چپکے امریکن فوجی امداد بھی مسلسل حاصل کر رہا تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ پاکستان کے وجود میں آتے ہی امریکہ کے چند عناصر نے اس کی مخالفت پر کمر باندھ لی تھی۔ بٹوارہ تو ہندوستان کا ہوا تھا' لیکن اس کا چرکہ امریکہ کے کچھ یہودی اور یہودی نواز طبقوں نے بری طرح محسوس کیا تھا۔ ۱۹۵۰ء کی بات ہے کہ ڈھاکہ میں ایک امریکن کاروباری فرم کا ایک نمائندہ کچھ عرصہ سے مقیم تھا۔ بظاہر اس کا نام (Mr Crook) تھا لیکن باطن میں بھی وہ اسم بمسمہ ثابت ہوا۔ کیونکہ رفتہ رفتہ یہ راز کھلا کہ وہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کا بیج بونے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ پاکستان کی سالمیت کے خلاف اس کی کارروائیوں کا علم ہوتے ہی حکومت نے اسے بلا تاخیر ناپسندیدہ شخص قرار دے کر ملک سے نکال باہر کیا۔

چند قابل قدر مستثنیات کو چھوڑ کر پاکستان میں وقتاً فوقتاً متعین ہونے والے امریکی سفیر اور سفارت کار بھی بعض اوقات ایک مشہور کتاب "The Ugly Amerecan" کے چلتے پھرتے کردار نظر آتے تھے۔ ایک سفیر صاحب ایسے تھے جو صدر مملکت کے ساتھ اپنی ملاقات کا وقت پہلے سے مقرر کروانا اپنی ہتک عزت تصور فرماتے تھے۔ ان کا جب جی

چاہتا تھا وہ اپنی کار میں بیٹھ کر اچانک ایوان صدارت میں وارد ہو جاتے تھے۔ اور جناب صدر ہزار کام چھوڑ کر انہیں خوش آمدید کہنے پر مجبور تھے۔

ایک بار کراچی کے ایوان صدر میں رات کے وقت کوئی لمبی چوڑی تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ ڈنر کے بعد باہر لان میں صدر کے باڈی گارڈ کا بینڈ اپنے جوہر دکھانے لگا۔ مہمان چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بیٹھ کر خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ ایک ایسا ہی گروپ چند امریکی سفارت کاروں اور عالمی بینک کے کارکنوں پر مشتمل شراب ناب سے شغل فرما رہا تھا۔ دو تین پاکستانی افسر بھی انکی خاطر تواضع میں لگے ہوئے تھے۔ شامت اعمال سے ایک پاکستانی دوسرے پاکستانی کے ساتھ اردو زبان میں چند فقرے بول بیٹھا۔ اس پر ایک امریکی سفارت کا پارہ چڑھ گیا' اور اس نے دونوں کو چیخ کر ڈانٹا (Shut up No urdu here) (بکواس بند کرو' یہاں اردو نہیں چلے گی) اس کے علاوہ وہ بلند آواز میں پاکستانیوں کے مجلسی آداب و رسوم میں کیڑے نکالنے بھی بیٹھ گئے۔ بیچ بچاؤ کرنے کے لیے میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو اس نے ڈانٹ کر مجھے بھی ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کی اس بدتمیزی پر مجھے غصہ آ گیا' اور میں نے اس کے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اردو کے چند فقروں نے اس نازک بدن کے کس مقام پر شدید ضرب لگائی ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس قدر بلبلا رہا ہے۔"

یہ سن کر ایک اور امریکی اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا نام غالباً Bell Mr تھا۔ اور وہ کسی مالیاتی یا معاشیاتی ادارے کے ساتھ وابستہ تھا اس نے نہایت دھیمے انداز سے کہا۔ "اس کی وجہ میں سمجھاتا ہوں۔ اردو نہ کوئی مجلسی زبان ہے اور نہ ہی تمدنی زبان ہے۔ اس زبان میں Public کے لیے اپنا کوئی لفظ نہیں کیونکہ آپ لوگ پبلک کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ اس زبان میں Public Servant کے لیے افسر کے علاوہ اپنی کوئی اصطلاح نہیں۔ کیونکہ یہاں پر Public service کا تصور سرے سے مفقود ہے۔" وہ کچھ دیر اسی طرح بے تکان بولتا رہا۔ اس کے امریکی ساتھی تو خیر اسے داد

دے ہی رہے تھے لیکن ہماری نوکر شاہی کے چند کل پرزے بھی موقع واردات پر آ پہنچے اور بڑی خوشدلی سے اثبات میں سر ہلانے لگے۔

صدر ایوب کے اقتدار کے آخری چند برسوں میں یہاں پر امریکہ کے جو سفیر متعین تھے ان کا اسم گرامی مسٹر بی ایچ اوہلرٹ (Mr B.H Oelhert Jr) تھا۔ یہ صاحب نسلاً یہودی تھے' اور کسب کوکا کولا بنانے والی کمپنی کے غالباً وائس پریذیڈنٹ تھے۔ وہ وضع قطع میں بے ڈول' چال ڈھال میں بے ہنگم' اخلاق و آداب میں اکھڑ اور سفارتی رکھ رکھاؤ اور شائستگی سے بڑی حد تک بے نیاز تھے۔ ایک روز راولپنڈی کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں کوئی استقبالیہ تھا' وہاں سے فارغ ہو کر ہم لوگ برآمدے میں کھڑے اپنی اپنی گاڑیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ مسٹر اوہلرٹ کی گاڑی پہلے آ گئی۔ انہوں نے اصرار کر کے اسلام آباد جانے کے لیے مجھے اپنی کار میں بٹھا لیا۔ جتنا عرصہ ہم مری روڈ سے گزرتے رہے۔ وہ پاکستانی سڑکوں پر ٹریفک اور پیدل چلنے والوں کے رنگ ڈھنگ پر طرح طرح کی پھبتیاں کستے رہے موٹروں' بسوں' رکشاؤں اور سکوٹروں کے ہجوم میں بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھٹکنے والے راہگیروں کو وہ تمسخر اور تکبر سے Bipeds (دو پایہ مخلوق) کے لقب سے نوازتے تھے۔ فیض آباد کے چوک پر پہنچ کر جب ہم شاہراہ اسلام آباد کی طرف مڑنے والے تھے تو مسٹر اوہلرٹ نے اچانک اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے اور اپنا سر گھٹنوں میں دے کر سیٹ پر جھک گئے۔ مجھے یہی خیال آیا کہ ان کی آنکھ میں کوئی مچھر یا مکھی گھس گئی ہے اور وہ بے چارے سخت تکلیف میں مبتلا ہیں۔

میں نے ازراہ ہمدردی ان سے دریافت کیا۔ "آپ خیریت سے تو ہیں؟"

مسٹر اوہلرٹ نے اپنی گاڑی ایک طرف رکوائی اور تیکھے لہجے میں بولے "میں بالکل خیریت سے نہیں۔ میں کس طرح خیریت سے ہو سکتا ہوں؟ وہ دیکھو۔" انہوں نے باہر کی طرف اشارہ کر کے کہا "وہ دیکھو آنکھوں کا خار' میں جتنی بار ادھر سے گزرتا ہوں' میری آنکھوں میں یہ کانٹا بری طرح کھٹکتا ہے۔"

میں نے باہر کی طرف نظر دوڑائی تو چوراہے میں ایک بڑا اشتہاری بورڈ آویزاں تھا۔ جس

پر پی۔ آئی۔ اے کا ایک رنگین اشتہار دعوت نظارہ دے رہا تھا اس اشتہار میں درج تھا کہ پی آئی اے سے پرواز کیجیے اور چین دیکھیے!

میں نے انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ یہ محض ایک ایرلائن کا تجارتی اشتہار ہے۔ اسے اپنے اعصاب پر سوار کر کے سوہان روح بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس زمانے میں چین کے خلاف بغض اور دشمنی کا بھوت پوری امریکن قوم کے سر پر بری طرح سوار تھا۔ خاص طور پر اس معاملے میں مسٹر اولرٹ مریضانہ حد تک ذکی الحس تھے۔ اس لیے میری بات سن کر وہ خوش نہ ہوئے بلکہ کسی قدر برا منا کر گم سم بیٹھ گئے۔

چند روز بعد میں نے دیکھا کہ فیض آباد چوک سے چین والا بورڈ اٹھ گیا ہے اور اس کی جگہ پی آئی اے کا اشتہار بنکاک دیکھنے کی دعوت دے رہا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ تبدیلی محض تجارتی نکتہ نظر سے رونما ہوئی تھی یا اس معاملے میں مسٹر اولرٹ کے آشوب چشم کی کچھ رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی تھی۔

چین کے حوالے سے مجھے مسٹر اولرٹ کی نازک مزاجی کا ایک اور تجربہ بھی ہوا۔ ایک بار راولپنڈی کے گورنمنٹ گرلز کالج میں کوئی امریکی پروفیسر تقریر کرنے آیا ہوا تھا۔ پرنسپل صاحبہ نے صدارت کرنے کے لیے مجھے مدعو کر لیا۔ اپنی تقریر کے دوران پروفیسر صاحب نے ایک عجیب و غریب طرز بیان اور پیرائی استدلال اپنایا۔ انہوں نے یہ الزام لگایا کہ ترقی پذیر ممالک امریکی امداد ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگتے تو ضرور ہیں لیکن اسے حاصل کرنے کے بعد بھی وہ بدستور فرسودہ اقدار ثقافت کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔ یہ سراسر ناشکری کی علامت ہے کیونکہ امریکی امداد کا مقصد صرف ڈالر اور اسلحہ ہی تقسیم کرنا نہیں' بلکہ دراصل ہمارا بنیادی مقصد امریکی اقدار' امریکی ثقافت' امریکی طرز حیات اور امریکی رسم و رواج کو بھی ساری دنیا میں پھیلانا اور فروغ دینا ہے۔ خاص کر تعلیم کے شعبہ میں پروفیسر صاحب نے زور دے کر کہا جو طلبا وظائف پر امریکن یونیورسٹیوں

میں جا کر پڑھتے ہیں اور صرف ڈگریاں اور ڈپلومے لے کر واپس آ جاتے ہیں وہ ہمارا وقت اور پیسہ ضائع کرتے ہیں' ہمیں صرف ایسے طلباء اور طالبات کو وظیفوں کا مستحق سمجھنا چاہیے جو ڈگریوں کے علاوہ امریکن اقدار و ثقافت' امریکن اخلاق و عادات' امریکن بود و باش کے نقوش بھی اپنے ہمراہ واپس لائیں اور انہیں اپنے اپنے ممالک اپنے اپنے ماحول اور اپنے اپنے گھروں میں جاری و ساری کریں۔

ان لغویات کے جواب میں میں نے پروفیسر صاحب کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ اگر امریکی امداد کو امریکی اقدار اور کلچر اپنانے کے ساتھ مشروط کر دیا گیا تو کئی غریب اور خود دار ممالک ایسی امداد کو بے نیازی سے ٹھکرا دیں گے۔ جن شرائط پر پروفیسر صاحب ہمارے طلبا اور طالبات کو تعلیمی وظائف دینا چاہتے ہیں' وہ ہمیں قابل قبول نہیں اور ہم ایسے وظائف کو بھی دور ہی سے سلام کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہمیں علوم حاصل کرنے کے لیے دوسرے ممالک کی طرف رخ موڑنا ہو گا۔ یوں بھی ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ علم حاصل کرو' خواہ تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔

میری تقریر کے کچھ حصے ہمارے کئی اخبارات نے بڑے نمایاں طور پر شائع کیے۔ چین والا فرمان رسول پڑھ کر امریکی سفیر مسٹر اولڑٹ سیخ پا ہو گیا۔ ان کا پیغام آیا کہ فوری طور پر میرے دفتر میں آ کر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں ان کے عزائم بھانپ گیا۔ اور میں نے وزارت خارجہ سے درخواست کی کہ اس ملاقات کی روئداد قلم بند کرنے کے لیے وہ اپنا ایک افسر بھی میرے دفتر میں بھیج دیں۔ انہوں نے مسٹر ریاض پراچہ کو اس کام پر مامور کر دیا' جو اس وقت وزارت میں غالباً جائنٹ سیکرٹری تھے اور بعد میں سیکرٹری امور خارجہ کے علاوہ کابل' دہلی اور ہالینڈ میں سفیر کے عہدوں پر بھی فائز رہے۔

مسٹر اولڑٹ بھی سفارت خانے کا ایک کونسلر اپنے ہمراہ لائے تھے۔ وہ شدید اعصابی تناؤ میں مبتلا نظر آتے تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہو کر وہ بیٹھنے کی بجائے دیوانہ وار ادھر ادھر گھومتے رہے۔ پھر اچانک رک کر بولے۔ "کیا مجھے کچھ کافی مل سکتی ہے؟"

میں نے انہیں یقین دلایا کہ کافی ابھی حاضر ہو جائے گی۔

بے چینی کے عالم میں انہوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھر کر کافی کی پیالی ختم کی اور پھر

بیس پچیس منٹ تک وہ نہایت تلخ انداز میں میری تقریر کے بخیے ادھیڑتے رہے۔ انہوں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا کہ اگر آپ امریکہ امداد سے منہ موڑ کر چین کے ساتھ اپنا تعلیمی رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں تو آپ ہمیں لکھ کر بھیج دیجیے پاکستان کو امداد دیئے بغیر امریکہ بحر اوقیانوس میں غرق نہیں ہو جائے گا۔

میں جانتا تھا کہ سفری صاحب اس قسم کا تیز و تند اور اشتعال انگیز رویہ جان بوجھ کر اختیار کر رہے ہیں تاکہ میں بھی برانگیختہ ہو کر ترکی بہ ترکی جواب دینے پر اتر آؤں۔ اور اس طرح یہ واقعہ ایک Diplomatic Scene (سفارتی حادثہ) بن کر حکومت اور صدر ایوب کے لیے مفت کا درد سر بن جائے۔ اس لیے میں نے صبر و تحمل سے کام لیا اور ان کی تلخی و تندی نظر انداز کر کے ایک عام اور نارمل انداز کی گفتگو شروع کر دی۔ اپنا وار خالی جاتا دیکھ کر وہ بڑے مایوس ہوئے۔ کافی کی دوسری پیالی پی کر جب میں انہیں ان کی کار تک چھوڑنے جا رہا تھا تو راستے میں انہوں نے کسی قدر معذرتانہ انداز میں کہا۔ "دراصل میں پیشہ ور سفارتکار (Professional diplomat) نہیں ہوں۔ اس لیے میری گفتگو میں اگر کوئی بات آپ کو بری لگی ہو تو اسے نظر انداز کر دیں۔"

"یور ایکسیلینسی" میں نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ امریکہ جیسی عظیم سپر پاور پاکستان جیسے مخلص حلیف کو اپنے پیشہ ور سفارتی ماہرین سے نوازنا ضروری نہیں سمجھتی۔"

میرے اس جملے کی چبھن امریکی سفیر اور کونسلر دونوں نے صریحاً محسوس کی اور کسی قدر جھینپ کر زیر لب منمناتے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔

جنوری ۱۹۶۸ء کے آخری ایام میں اچانک صدر ایوب پر دل کا شدید دورا پڑا۔ کمانڈر انچیف

جنرل یحییٰ اور وزیر دفاع ایڈمرل اے۔ آر۔ خان نے مل کر فوراً ایوان صدر کو اپنے کنٹرول میں لے لیا اور صدر ایوب دس بارہ روز تک عملاً صرف ان دونوں کی تحویل میں رہے۔ حکومت کے باقی تمام اراکین سے ان کا رابطہ مکمل طور پر کٹ چکا تھا۔ ان ایام میں بھی مسٹر اوہلرٹ کا صبح و شام کا واسطہ اگر کسی سے تھا تو جنرل یحییٰ سے تھا۔

مارچ ۱۹۶۹ء میں جب صدر ایوب کے خلاف ملک گیر ایجی ٹیشن اپنے عروج پر تھی' یکایک یہ خبر نکلی کہ انیس تاریخ کو امریکی سفیر مسٹر اوہلرٹ ایک اہم مشورہ کے لیے واشنگٹن روانہ ہو گئے ہیں' کئی لوگوں نے اندازہ لگایا کہ وہ یحییٰ خان کو اقتدار منتقل کرنے کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کروانے واشنگٹن گئے ہیں۔ واللہ اعلم باصواب۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی واپسی کے ایک یا دو روز بعد ۲۵ مارچ کو صدر ایوب مستعفی ہو گئے' اور جنرل یحییٰ نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر کی گدی سنبھال لی۔

۱۹۶۷ء میں جب صدر ایوب کی خود نوشت سوانح عمری شائع ہوئی تو انہوں نے غالباً امریکہ کے حوالے سے اس کتاب کا نام (Friends Not Masters) رکھا تھا۔ اردو ترجمے کا عنوان تھا۔ "جس رزق سے آتی ہوں پرواز میں کوتاہی۔" اگر یہی کتاب ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کے بعد لکھی جاتی تو امریکہ کے حوالے سے صدر ایوب اس کا یہ عنوان منتخب کرنے میں حق بجانب ہوتے:

"نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی۔"

○ چین

اگرچہ پاکستان ۱۹۵۴ء ہی سے سیٹو (SEATO) کا ممبر ہو کر چین کی ناکہ بندی میں شامل تھا' لیکن عوامی جمہوریہ چین کی قیادت نے کبھی ہمارے اس اقدام کو بنائے فساد اور متنازع فیہ نہیں بنایا تھا۔ اس کی وجہ ان کی عالی حوصلگی اور حسن تدبر ہی نہیں بلکہ ان کی حقیقت شناسی بھی تھی۔ کیونکہ غالباً انہیں ہماری اندرونی اور بیرونی مجبوریوں اور

معذوریوں کا بھی ضرور احساس تھا۔
روس کے ساتھ تو چین کا نظریاتی بھائی چارا شروع ہی سے تھا۔ لیکن ایک زمانے میں "ہندی چینی بھائی بھائی" کا بلند بانگ نعرہ بھی برصغیر کے کونے کونے میں گونج رہا تھا۔ رفتہ رفتہ حالات نے کروٹ لی۔ روس اور چین میں شدید نظریاتی اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان کا باہمی اقتصادی بندھن ٹوٹ گیا۔ روس نے چین میں ترقیاتی منصوبوں کی بساط لپیٹ کر ہر قسم کے تعاون اور امداد سے ہاتھ کھینچ لیا' یہاں تک کہ جو فیکٹری یا منصوبہ جس منزل میں تھا' وہیں پر ادھورا چھوڑ کر ان کے بلیو پرنٹ تک اپنے ساتھ واپس لے گئے۔
ہندوستان نے ایشیا کی قیادت کا تاج اپنے سر پر سجانے کے لیے چین کے ساتھ رقابت اور مسابقت کا راستہ اختیار کیا تو دونوں کے درمیان قدرتی طور پر ٹھن گئی اور باہمی سرحدی مناقشات اور اختلافات بھی سر اٹھانے لگے۔ ایسے معاملات میں بھارت کی ہٹ دھرمی اور اپنی من پسندی کو اجاگر کرنے کے لیے چین نے برما اور نیپال جیسے چھوٹے ملکوں کے ساتھ نہایت معقول سرحدی معاہدے طے کر کے اپنی فراخدلی کا ثبوت دیا۔ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ہماری وزارت خارجہ نے بھی اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا' اور چین اور پاکستان کے درمیان ایک سرحدی معاہدہ طے کرنے کے لیے تفصیلات طے کر لیں۔ شروع میں تو صدر ایوب کسی قدر حیص بیص' شش و پنچ اور طرح طرح کی ہچکچاہٹوں میں ڈانواں ڈول رہے۔ لیکن ۱۹۶۲ء کی بھارت اور چین جنگ کے رنگ نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور فروری ۱۹۶۳ء کے اواخر میں انہوں نے ایک پاکستانی وفد کو سرحدی معاہدہ طے کرنے کے لیے چین جانے کی اجازت دے دی۔
اس وفد کے قائد ہمارے وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ حسن اتفاق سے مجھے بھی اس وفد میں شامل کر دیا گیا تھا۔ دوسرے اراکین وزارت خارجہ کے ایک سینئر افسر مسٹر خراس' پاکستان کے سرویئر جنرل اور پکینگ میں ہمارے سفیر میجر جنرل رضا تھے۔ صدر ایوب کو تشویش تھی کہ سرحدی معاہدہ پر دستخط ہونے سے پہلے اگر ہمارے وفد کی

خبر عام ہو گئی تو ہماری راہ میں روڑے اٹکانے کی غرض سے ان پر طرح طرح کے دباؤ بڑھنا شروع ہو جائیں گے اور چین کے دشمن ممالک بھی ہمارے منصوبے کو سبوتاژ کرنے کے لیے مختلف قسم کی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو جائیں گے چنانچہ فیصلہ ہوا کہ ہم نہایت خاموشی سے سفر کر کے پیکینگ پہنچیں اور سرحدی معاہدہ پر دستخط ہونے سے قبل اس وفد کی کوئی خبر باہر نہ نکلنے پائے۔

ہمارے سرویئر جنرل صاحب تو الگ پیکینگ کے لیے روانہ ہو گئے اور مسٹر خراس اور میں مسٹر بھٹو کے ساتھ کراچی سے ہانگ کانگ جانے کے لیے Lufthansa کے ایک ہوائی جہاز میں سوار ہو گئے۔ یہ جہاز گھنٹہ بھر کے لیے کلکتہ کے ہوائی اڈے پر بھی رکا۔ وہاں پر ہمارے کونسل جنرل مسٹر ایم۔ اے علوی ہمیں ملنے اندر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر کافی کوشش کی کہ ہم ٹرانزٹ لاؤنج میں چند خالی کرسیوں پر بیٹھنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اول تو لاؤنج میں ہجوم زیادہ تھا۔ دوسرے اگر ہم کسی خالی کرسی کی طرف بڑھتے بھی تھے تو دوسرے مسافر لپک کر اس پر قبضہ جما لیتے تھے۔ آخر مجبور ہر کر علوی صاحب ہمیں ریسٹوران میں لے گئے جہاں چائے کا آرڈر دے کر ہم پون گھنٹہ کے قریب بیٹھے رہے۔

ہانگ کانگ میں سارا دن بھٹو صاحب مجھے اپنے ہمراہ لے کر نوادرات کی دکانوں اور بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹورز میں گھومتے رہے۔ ایک فیشن ایبل سٹور میں انہوں نے اپنے لیے پانچ سوٹ سلوانے کا آرڈر دیا۔ جو چین سے ان کی واپسی پر تیار ملیں گے۔ اصرار کر کے انہوں نے پانچ سوٹوں کا آرڈر میرے لیے بھی دے دیا میں نے بہت احتجاج کیا کہ یہ سوٹ مہنگے ہیں اور مجھے ان کی ضرورت بھی نہیں لیکن وہ نہ مانے اور واپسی پر میرے سوٹوں کی قیمت بھی اپنی جیب سے ادا کی۔ ان میں سے ایک آدھ سوٹ آج تک بھی میرے پاس موجود ہے۔

چین میں ہمارے وفد کی نہایت شاندار پذیرائی ہوئی۔ چینی وزیر خارجہ مارشل چن ژی بڑے زندہ دل اور بذلہ سنج انسان تھے۔ ہمارے پروگرام کی سب تفصیلات وہ اپنی ذاتی نگرانی

میں طے کرتے۔ ۲ مارچ ۱۹۶۳ء کو ایک پروقار تقریب میں انہوں نے مسٹر بھٹو کے ساتھ پاک چین سرحدی معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ دستخط کرتے وقت ان دونوں کی کرسیوں کے پیچھے جو لوگ قطار بنا کر کھڑے ہوئے ان میں چین کے صدر لیوشاؤچی اور وزیراعظم چو این لائی بھی شامل تھے۔

وزیراعظم چو این لائی تحمل' تدبر' فراست اور ذہانت کا ایک بے مثال پیکر تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکے سے تبسم کی ایک مدھم سی لہر ہر وقت یوں کھیلتی رہتی تھی کہ کسی کو یہ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ مسکرا چکے ہیں یا مسکرانے والے ہیں ان کی تیز نگاہی ماحول میں پیوست ہو کر گرد و پیش کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتی تھی۔ اور ان کی شگفتہ بیانی عالمی سیاست کے تجزیے کو فصاحت و بلاغت کے سانچے میں ڈھال کر عجیب و غریب جادو جگاتی تھی' مشاہیر عالم میں ایسی غیر معمولی خصوصیات کا اور کوئی رہنما میری نظر سے نہیں گزرا۔

ایک روز وزیر اعظم چو این لائی نے بھٹو صاحب کے ساتھ مذاکرات شروع کئے تو وہ تقریباً سارا دن بولتے رہے۔ پانچ ساڑھے پانچ گھنٹوں میں انہوں نے سیاسیات عالم کا انتہائی گہرا اور بھرپور تجزیہ کیا۔ یہ تجزیہ اور تبصرہ وہ زبانی کرتے رہے' اور ایک بات بھی نہ تو انہوں نے کسی فائل یا یادداشت کی طرف رجوع کیا' نہ اپنی کوئی بات دہرائی اور نہ ہی کسی مقام پر رکے یا ہچکچائے۔ ان کے دلائل ٹھوس حقائق و شواہد پر مبنی تھے اور ان کا انداز بیان جذبات' مروضات اور داخلی آرزو مندی کی ملاوٹ سے خالی تھا۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ اب وہ اپنے تجزیے کا خلاصہ پیش کر کے یہ گفتگو ختم کر رہے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے تجزیے کا لب لباب اسی ترتیب سے سمیٹ کر بیان کر دیا جس ترتیب سے انہوں نے صبح سے شام تک اسے وضاحت سے بیان کیا تھا۔

انسانی دماغ کو ایک خود کار مشین اور کمپیوٹر کی مانند اس طرح کام کرتے ہوئے میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔

وزیراعظم چو این لائی کی گفتگو کو مسٹر خراس اور میں قلم بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یوں تو وہ صرف چینی زبان بولتے تھے' لیکن یقیناً انہیں انگریزی زبان پر بھی ضرور عبور حاصل ہو گا۔ ان کا ترجمان جب ان کی گفتگو کا انگریزی میں ترجمہ کرتا تھا' تو کئی بار مسٹر چو این لائی اسے ٹوک کر اس کے ترجمہ کی اصلاح بھی کر دیتے تھے۔

جب مسٹر چو این لائی واقعات عالم پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ایک چینی لڑکی وقتاً فوقتاً ہمیں چینی چائے کے تازہ مگ تقسیم کرتی رہتی تھی۔ یہ ابلتا ہوا گرم پانی تھا جس میں چائے کی ایک یا دو پتیاں تیر رہی ہوتی تھیں۔ اس میں دودھ شکر ملانے کا رواج نہ تھا۔ چائے ڈھانپنے کے لیے ہر مگ کا اپنا خوبصورت سا ڈھکن بھی ہوتا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ وزیراعظم چو این لائی روانی سے بولتے بولتے کسی قدر ٹھٹھک جاتے ہیں اور ان کی نگاہیں بار بار میری جانب اٹھ رہی ہیں' مجھے خیال آیا کہ شاید میرے بیٹھنے کے انداز میں کوئی کجی یا قباحت پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے فوراً پینترا بدل کر پہلو تبدیل کر لیا لیکن اس کے باوجود مسٹر چو این لائی کی نظریں بدستور میری طرف اٹھتی رہیں۔ اس پر پریشان ہو کر میں کسی قدر جھینپا تو انہوں نے چائے تقسیم کرنے والی لڑکی کو بلا کر کچھ کہا۔ وہ میرا مگ اٹھا کر ان کے پاس لے گئی مسٹر چو این لائی نے مگ کا ڈھکن اٹھا کر اسے دکھایا کہ یہ چھوٹا ہے اور اس مگ پر اچھی طرح نہیں جمتا۔ لڑکی کا چہرہ عرق ندامت سے شرابور ہو گیا۔ اور وہ جا کر میرے لیے چائے کا ایک اور مگ لے آئی۔ اس کے بعد مسٹر چو این لائی سکون سے بیٹھ گئے اور اپنے تبصرے میں بدستور مصروف ہو گئے۔ ایک نہایت سنجیدہ تجزیے کے دوران ایک انتہائی کثیر المشاغل شخص کے ذہن کا اس قدر باریک تفصیل کی طرف منتقل ہونا میرے لیے بے حد حیرت ناک تھا۔

ایک پڑھی لکھی چینی خاتون مترجم کے فرائض سر انجام دینے کے لیے میرے ساتھ بھی مامور تھی۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ چائے تقسیم کرنے والی جس لڑکی کی غلطی پکڑی گئی ہے' کیا اسے اب کوئی سزا بھی ملے گی؟

اس نے جواب دیا کہ چیئرمین ماوزی تنگ کا فرمان ہے کہ انسان غلطی کا پتلا ہے۔ ہر غلطی جرم کا درجہ نہیں رکھتی۔ اس لڑکی کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ معزز مہمانوں کے سامنے اس کی غفلت اور غلطی کا بھانڈا پھوٹ گیا۔

ایک روز ہمارے وفد کو چیئرمین ماوزء تنگ کے ساتھ ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ وزیراعظم چو این لائی اور وزیر خارجہ مارشل چن ژی بھی وہاں موجود تھے۔ لیکن سارا عرصہ دونوں خاموشی سے مودبانہ بیٹھے رہے۔ اس وقت چیئرمین ماؤ کی عمر اسی برس کے لگ بھگ تھی لیکن ان کا گول مٹول چہرہ نیم خوابیدہ بچوں کی طرح پر سکون اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ مسٹر بھٹو کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے ہی چیئرمین ماؤ نے جو پہلا سوال کیا وہ یہ تھا۔ (Is East Pakistan Tranquil?) (کیا مشرقی پاکستان میں امن و امان ہے؟)

اس زمانے میں مشرق پاکستان میں بظاہر کسی خاص شورش کے آثار نمایاں نہ تھے۔ اس لیے چیئرمین ماؤ کا یہ سوال مجھے کسی قدر بے تک اور بے موقع و بے محل محسوس ہوا۔ لیکن اس کے بعد کئی دعوتوں اور استقبالیوں میں وزیراعظم چو این لائی اور وزیر خارجہ مارشل چن ژی کے علاوہ چند دوسرے چینی اکابرین بھی اپنے اپنے انداز سے ہمیں مشرقی پاکستان کے متعلق خاص طور پر باخبر اور چوکنا رہنے کی فرداً فرداً تاکید کرتے رہے۔

چین کے ساتھ ہمارے سرحدی معاہدے کی خبر عام ہوئی تو اس کے خلاف بھارت میں بڑا شور و غوغا ہوا' روس کو بھی یہ بات پسند نہ آئی اور امریکہ نے بھی ہمارے اس اقدام پر تیوریاں چڑھائیں۔ پاکستان میں امریکی سفارت خانہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ یہ معاہدہ طے کروانے میں میرا کوئی خاص ہاتھ تھا۔ اس لیے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق ان کے غم و غصے کا زیادہ نزلہ میری ذات پر ہی گرا۔ مارچ ۱۹۶۳ء ہی سے انہوں نے صدر ایوب کے ذہن میں میرے خلاف اپنے دباؤ کا پیچ ایسے انداز سے مروڑ مروڑ کر کسنا شروع کر دیا تھا کہ چھ سات ماہ کے اندر اندر مجھے پاکستان سے اٹھا کر ہالینڈ بھیج دیا گیا۔

تین برس بعد جب میں ہالینڈ سے واپس آ کر وزارت تعلیم کا سیکرٹری مقرر ہوا تو ۱۹۶۶ء میں مجھے ایک بار پھر چین جانے کا موقع نصیب ہوا۔ اس بار میں چین کے ساتھ ایک

ثقافتی معاہدہ اور پروگرام طے کرنے گیا تھا۔ اس دورے میں میری اہلیہ عفت بھی میرے ہمراہ تھی' ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے وہاں کے ہسپتالوں کا نظام دیکھنے کا شوق تھا چین پہنچتے ہی ایک چینی لیڈی ڈاکٹر اس کے ساتھ مامور ہو گئی اور عفت نے پیکینگ شنگھائی کے بڑے ہسپتالوں کے علاوہ دور دراز دیہاتوں میں پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے شفاخانوں اور ڈسپنسریوں کا بھی معائنہ کیا۔

Barefoot Doctors کے عملی رواج اور روایتی نظام کا بھی اس نے کسی قدر مطالعہ کیا۔ اور ایکوپنکچر طریقہ علاج کے چند حیرت انگیز نمونے بھی اس کے مشاہدے میں آئے۔ اس کا کہنا تھا کہ چین کا طبی نظام سستا اور موثر ہے' اور ہر کس و ناکس کو فوری طور پر باآسانی میسر ہے۔ ایک اور دلچسپ بات اس نے یہ بتائی کہ چین میں موٹے مرد اور موٹی عورتوں کی تعداد بے حد کم ہے۔ سب سے زیادہ موٹے بچے صرف نرسری سکولوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ جوں جوں وہ بڑے ہو کر اگلی جماعتوں میں جاتے ہیں' اسی طرح ان کے اجسام بھی سڈول ہو کر متناسب ہوتے جاتے ہیں۔

عفت کی میزبان چینی لیڈی ڈاکٹر نے وضاحت کی کہ انقلاب کے بعد سے چینی قوم نے جسمانی ورزش کو انتہائی پابندی سے اپنا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ چینی خوراک بھی صحت مند اور متوازن ہے۔ موٹاپے کا تعلق سستی' غلاظت اور جعت پسندی سے ہے۔ اس لیے چینی معاشرہ میں ہر کوئی اس سے بچنے کی سعی کرتا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "چائے کے نام پر یہ جو آپ ہر وقت کھولتا ہوا گرم پانی پیتے رہتے ہیں' کیا موٹاپا روکنے میں اس کا بھی کوئی عمل دخل ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔" وہ ہنس کر بولی۔ "لیکن یہ ہمارا قومی مشروب ہے۔ اس میں بھی ضرور کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہو گی۔"

اس دورے کے وقت چین ماؤزی تنگ کے ثقافتی انقلاب کی زد میں آیا ہوا تھا۔ یہ ایک

عجیب اور عظیم تجربہ تھا' جو اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ غالباً اس کا مقصد یہ تھا کہ چیئرمین ماؤزے تنگ کی زندگی ہی میں چین کی سیاسی اور ثقافتی قیادت ۱۵ سے ۲۵ برس کی جواں سال نسل کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے' چیئرمین ماؤزے کے فوجی لانگ مارچ کی طرح یہ ایک نئی طرز کا ذہنی لانگ مارچ تھا جو ناکام رہا اس کی ناکامی کی متعدد وجوہات تھیں۔ اگرچہ چین کی جوان نسل نے چیئرمین ماؤ کا بھرپور ساتھ دیا لیکن انقلابی جوش و خروش میں ان سے کچھ ایسی غلطیاں اور زیادتیاں سرزد ہوئیں' جن کی وجہ سے اس انقلاب کا مستقبل عوام الناس کی نظروں میں مشکوک اور مخدوش ہو کر رہ گیا۔ اس کے علاوہ اس نئی اور جوان نسل کے اوپر ادھیڑ عمر اور بوڑھے لوگوں کی کم از کم دو نسلیں بقید حیات تھیں جو چین کی سیاسی اور ثقافتی قیادت سے دستبردار ہونے کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہ تھیں۔ ان دو نسلوں کے لوگ چین کی قیادت کو اپنی جائز اور ناقابل منسوخ وراثت سمجھتے تھے۔ اپنی اس وراثت پر حق قائم رکھنے کے لیے انہوں نے ثقافتی انقلاب کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ناکامی کی تیسری وجہ غالباً یہ تھی کہ چیئرمین ماؤزے تنگ ضعیف العمری کی ایسی منزل میں تھے جہاں سے نوجوانوں کے اتنے عظیم اور شدید انقلاب کو اپنی زیر نگرانی کامیابی سے ہمکنار کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر چند دوسرے لوگوں نے اس انقلاب کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کی۔ یہ بات چینی دانشوروں اور پارٹی لیڈروں کو قابل قبول نہ تھی۔ چنانچہ چیئرمین ماؤ کی آنکھ بند ہوتے ہی ثقافتی انقلاب نے بھی دم توڑ دیا' اور ماؤزے تنگ کی عظمت کے بت پر بھی بہت سی بدنما خراشیں چھوڑ گیا۔

چین کے دوسرے دورے کے دوران میں نے عظیم چینی شاعر اور دانشور کو مورو سے درخواست کی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ میں ثقافتی انقلاب میں ریڈگارڈز (Red Guards) کے کسی کیمپ کو جا کر دیکھ سکوں؟

انہوں نے حامی تو نہ بھری لیکن وعدہ کیا کہ وہ کوشش کر دیکھیں گے۔ دو روز کے

بعد تین لڑکوں اور تین لڑکیوں پر مشتمل ریڈ گارڈز کا ایک دستہ مجھے ایک جیپ میں بٹھا کر پکینگ سے کافی دور ایک کیمپ میں لے گیا' یہ کیمپ ایک نہایت وسیع کھلے میدان میں پھیلا ہوا تھا۔ ۱۵ سے ۲۵ برس تک کے کئی ہزار لڑکے اور لڑکیاں انتہائی منظم طور پر اس کیمپ میں خیمہ زن تھیں۔ کیمپ کی ساری آبادی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر نہایت تن دہی سے انواع و اقسام کے مشاغل میں مصروف ٹولیاں قومی اہمیت کے مختلف مسائل پر نہایت بے باکی اور گرم جوشی سے بحث و مباحثہ کر رہی تھیں۔ کسی کسی جگہ کھلی کچہریاں قائم تھیں جن میں ملک کے نامور دانشور ادیب' سیاستدان اور صنعت کار ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے تھے۔ ان کے خیالات' اعمال اور کردار پر کھلے بندوں طرح طرح کے الزم عائد کیے جا رہے تھے۔ اور ہر "ملزم" نہایت شد و مد سے اپنی صفائی پیش کرنے میں مصروف تھا۔

ریڈ گارڈز کے اس وسیع و عریض کیمپ میں ہزاروں تیز و تند اور جوانسال اذہان چقماق کے ٹکڑوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے جو انقلابی فکر و عمل کی رگڑ سے چاروں طرف شراروں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس کیمپ میں آٹھ دس گھنٹے گزارنے کے بعد جب میں واپس لوٹا تو میرا یہی تاثر تھا کہ اگر یہ عجیب و غریب تجربہ کامیاب ہو گیا تو چین میں ایک ایسا انقلاب رونما ہو گا جو چشم فلک نے اور کہیں نہیں دیکھا اور بصورت دیگر اگر یہ تجربہ ناکام ہو گیا تو خدا جانے اس کا رد عمل کیا گل کھلائے۔

چین کے اندرونی حالات ان کا اپنا معاملہ ہیں۔ بیرونی سطح پر چین ہمیشہ پاکستان کا قابل اعتماد' پرخلوص اور وفادار دوست ثابت ہوا ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ جب چین کے ساتھ ہماری دوستی کے فراسم ابتدائی دور سے گزر رہے تھے مجھے ان تعلقات کی پیش رفت میں کسی قدر حصہ لینے کا موقع نصیب ہوا۔ وہ دن دور نہیں جب روس اور امریکہ کے علاوہ چین بھی دنیا میں تیسری سپر پاور کے طور پر ابھرنے والا ہے۔ اگر ہم نے اپنی

خارجہ پالیسی میں تدبر' تشکر' تفکر اور تصور کا توازن برقرار رکھا تو مجھے یقین ہے کہ چین کے ساتھ ہماری دوستی ہر دور میں بدستور زندہ و تابندہ رہے گی۔

○ ایران' ترکی اور آر سی ڈی

ایران اور ترکی میں ایک خاص قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں امریکہ کے حلقہ بگوشوں میں شامل تھے۔ اس کے سوا یہ دونوں ممالک اپنے درمیان کسی قسم کا ثقافتی روایتی یا اسلامی بھائی چارہ کھلے بندوں تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ دونوں "جدیدیت" کی دلدل میں بری طرح دھنسے ہوئے تھے اور اپنی اقدار کو مغربی تہذیب و تمدن کے نام نہاد سانچوں میں ڈھالنے کی سر توڑ کوشش میں مبتلا تھے۔ بغداد پکیٹ عرف سینٹو میں شامل ہو کر ان دونوں ممالک کا رشتہ دنیائے عرب سے مزید کٹ گیا تھا۔ اور اس طرح عالم اسلام کے ساتھ بھی ان کے رابطے میں ایک خلاء کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

اس خلاء کو پر کرنا پاکستان کے مقدر میں لکھا تھا۔ اپنی گوناں گوں مغرب پرستی اور امریکہ نوازی کے باوجود پاکستان کو یہ فضیلت حاصل رہی ہے کہ اپنے اسلامی تشخص اور نصب العین کو برملا تسلیم کرنے اور اس کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کرنے میں ہم نے کبھی کوئی حجاب یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

آزادی کے بعد پاکستان کا پہلا سرکاری دورہ کرنے والے غیر ملکی سربراہ مملکت ایران کے شہنشاہ رضا شاہ پہلوی تھے۔ سکندر مرزا صاحب کی صدارت کے دوران شاہ ایران کے ساتھ یہ دوستانہ مراسم خاص طور پر گہرے ہو گئے۔ دونوں حضرات بلاتکلف فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ اور بیگم ناہید اسکندر مرزا کا تعلق بھی ایک معروف ایرانی قبیلے اور خاندان سے تھا۔ شاہ ایران اور صدر سکندر مرزا کے باہمی ذاتی اور سرکاری مراسم اس قدر گہرے نظر آئے تھے کہ ان کے جلو میں وقتاً فوقتاً طرح طرح کی افواہیں جنم لیتی رہتی تھیں۔

اس زمانے میں اس افواہ نے بھی سر اٹھایا تھا کہ شاہ ایران کی سربراہی میں پاکستان اور ایران کی ایک متحدہ کنفیڈریشن بنانے کا منصوبہ تیار ہو رہا ہے۔ اگر اس قسم کی خواہش

کہیں موجود تھی تو ممکن ہے ان دونوں سربراہوں کے ذہنوں کے نہاں خانے میں کسی جگہ پوشیدہ ہو۔ عملی سطح پر میں نے ایسی کسی تجویز کا کبھی کوئی ذکر نہیں سنا تھا۔

اعلیٰ ترین سرکاری سطح پر تو ایران اور پاکستان کے باہمی تعلقات نہایت مستحکم اور خوشگوار تھے۔ لیکن ایرانی علما' فضلا' طلبا' اساتذہ' دانشوروں اور عوام کے ساتھ ہمارا رابطہ بے حد کمزور تھا۔ اندرون بیرون خود ایرانی حکومت کا بھی کم و بیش کچھ ایسا ہی حال تھا۔ شہنشاہ رضا شاہ پہلوی اور ان کے دربار کے برگزیدہ اراکین تہران کے ایک مخصوص حصے میں ایک ایسی الگ تھلگ مخلوق نظر آتے تھے جن کا اپنے وطن کی دوسری آبادی کے ساتھ بظاہر کوئی رشتہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ یہ حضرات فرانسیسی زبان بولنے کے رسیا تھے اور اپنی نشست و برخاست' لباس و طعام اور بود و باش میں فرانسیسی تہذیب و تمدن اور مغربی اقدار و اطوار میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے تھے۔ ایک سرکاری دورے کے دوران میں نے شمار کیا کہ ہم نے ایرانی درباریوں سمیت صبح سے شام تک چار مرتبہ اپنے لباس ہائے فاخرہ تبدیل کیے۔ مذاکرات کے وقت لاؤنج سوٹ' لنچ پر مارننگ ٹیل سوٹ۔ شام کے استقبالیہ میں بلیک ٹائی ڈنر سوٹ۔ رات کے ڈنر پر وہائٹ ٹائی ٹیل سوٹ! اسی تہران کے گلی کوچوں میں ایسے غربا اور مساکین کی کمی نہ تھی جنہیں شدید سردیوں میں بدن ڈھانپنے کے لیے پورا کپڑا تک میسر نہ تھا اور دیہاتوں میں جا بجا ایسی خواتین چلتی پھرتی نظر آتی تھیں جن کے پاؤں ننگے اور برقعے تار تار تھے۔

۱۹۵۸ء میں صدر ایوب نے میجر جنرل اسکندر مرزا کو برطرف کر کے عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں لی تو شاہ ایران اس تبدیلی پر کسی قدر برہم ضرور تھے۔ لیکن صدر ایوب نے ان کی خیر سگالی حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت اور کوشش سے کام لیا تیل کے بل بوتے پر جیسے جیسے ایران کی دولت اور فوجی قوت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی تناسب سے

شاہ میں رعونت، خودسری اور فرعونیت کا مادہ بھی پروان چڑھتا گیا۔ اس کہ وجہ سے ایک طرف تو اس کے پنجہ استبداد کی گرفت ایرانی قوم پر مزید سخت ہو گئی۔ دوسری طرف ذاتی سطح پر صدر ایوب کے ساتھ اس کے تعلقات میں وہ گرمجوشی باقی نہ رہی جو کسی زمانے میں اسکندر مرزا کے ساتھ موجزن رہا کرتی تھی، بایں ہمہ پاکستان کے حق میں شاہ کے تعلقات بدستور استوار رہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر انہوں نے اپنی خیر سگالی کا عملی ثبوت بھی دیا۔ امریکہ کی لگائی ہوئی بندش کے باوجود انہوں نے خفیہ طور پر ہمیں کئی قسم کا مطلوبہ جنگی سامان فراہم کرنے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہ لیا۔ اس جنگ کے دوران امریکہ اور برطانیہ کے رویہ پر شاہ نے شدید نکتہ چینی کی اور واشنگٹن پوسٹ کے ایک انٹرویو میں گلہ کیا کہ پاکستان سینٹو کا ممبر تھا۔ اس کے باوجود ہندوستان نے اس کی سالمیت پر جارحانہ حملہ کیا، تو امریکہ اور برطانیہ نے پاکستان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایران کے ساتھ بھی ایسی ہی افتاد پیش آ سکتی ہے۔

(ءکیکی July کی Washington Post)

۱۹۶۷ء میں جب صدر ایوب کی آٹو بائیو گرافی "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" (Friends Not Masters) شائع ہوئی، تو اس میں صدر جمال عبدالناصر کے حق میں چند توصیفی کلمات شاہ ایران کو بہت ناگوار گزرے۔ اس لیے صدر ایوب کا زوال ان کے نزدیک ایک قدرتی اور قابل قبول واقعہ تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ صدر ایوب کے جانشین جنرل آغا محمد یحییٰ تھے جو مسلکاً شیعہ تھے۔ لساناً فارسی بول سکتے تھے اور مشرباً شاہ ایران کے اس فلسفہ پر عملی طور پر کار بند تھے کہ جنسی آزادی قومی ترقی کا زینہ ہے۔

امام خمینی کے اسلامی انقلاب سے پہلے دولت کی فراوانی، اقتدار کی بد لگامی، انداز حکومت کی بدعنوانی، اور عدل و انصاف اور اخلاق کی سوختہ سامانی کے طفیل شاہ ایران ایسی منزل

پر جا پہنچے تھے جس کے بعد اگلی منزل صرف عذاب الٰہی باقی رہ جاتی ہے۔ بیسوی صدی میں چشم فلک نے ایک ایسا عبرتناک نظارہ دیکھا کہ ایک شخص کے دنیا بھر میں جگہ

مال و دولت کے انبار جمع ہیں۔ جابجا بڑے بڑے شاہانہ محلات اس کے انتظار میں چشم راہ کھڑے ہیں۔ لیکن زمین کی ساری وسعت اس پر سکڑ گئی ہے اور وہ اپنی قبر کے لیے دو گز زمین کی تلاش میں ساری دنیا میں مارا مارا پھر رہا ہے۔

ایران کے برعکس ترکی میں پاکستان کی حیثیت کی نوعیت مختلف تھی۔ حکومتی سطح پر ترکی اور پاکستان کے تعلقات ہمیشہ دوستانہ اور مخلصانہ رہے ہیں۔ خاص طور پر صدر جلال بیار اور وزیراعظم عدنان مینڈرس کے دور حکومت میں ان تعلقات میں کسی حد تک ذاتی گرمجوشی کا عنصر بھی نمایا تھا۔ لیکن ان کے زوال کے بعد بھی دونوں حکومتوں کے تلعقات میں کوئی کجی کمزوری یا دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن ترک عوام میں عموماً اور سیدھی سادی دیہاتی آبادی میں خصوصاً پاکستان کے لیے ہمیشہ خیر سگالی اور عزت و احترام کا جذبہ موجزن رہا ہے۔ اس جذبے کی اصلی بنیاد ان کا اسلام کے ساتھ گہرا لگاؤ ہے۔ کیونکہ ترک عوام انتہائی سچے پکے اور جاحمیت مسلمان ہیں۔ چند مخصوص اور محدود طبقوں کی دین سے بے اعتنائی اور بے زاری کے باوجود یہ ترکی کے غیور عوام ہی کی برکت ہے کہ انہوں نے یورپ کے عین دہانے پر اپنے وطن کو اسلام کا ناقابل تسخیر قلعہ بنائے رکھا ہے۔ وہ دن بہت زیادہ دور نہیں جب وہاں پر اسلام کے نام پر شرمانے والے احساس کمتری کے مارے ہوئے مریضانہ عناصر بھی عفو معطل ہو کر رفتہ رفتہ پردہ عدم میں روپوش ہو جائیں گے۔

بغداد پکیٹ عرف سینٹو میں شمولیت کی وجہ سے دنیائے عرب کی ایران' ترکی اور پاکستان کے ساتھ بے گانگی اور برگشتگی کا احساس کافی شدید حد تک بڑھ چکا تھا حکومتی سطح پر ایران اور ترکی کو اس صورت حال سے کوئی خاص پریشانی لاحق نہ تھی۔ لیکن عربوں کے ساتھ ہمارے جذباتی اور روایتی لگاؤ اور اسلام کے ساتھ ہماری کھلم کھلا وابستگی کے

پیش نظر پاکستان کے لیے یہ صورت باعث تشویش تھی۔ صدر ایوب کا خیال تھا کہ سینٹو کی مخالفت اس وجہ سے ہے کہ اسی پکیٹ کی نوعیت سیاسی اور فوجی ہے۔ اس مخالفت کا زور توڑنے کے لیے انہوں نے ہمخیال ممالک کے مابین تجارتی' ثقافتی اور معاشی تعاون کے لیے کوئی مناسب ادارہ قائم کرنے کا ڈول ڈالا۔ یہ خیال شاہ ایران اور ترکی کے صدر گورسل اور وزیراعظم عصمت انونو کو بھی پسند آیا۔ شاہ نے اپنے طور پر افغانستان کو بھی اس نئے معاہدے میں شامل کرنے کی سر توڑ کوشش کی جس میں وہ ناکام رہے۔ اس طرح ۱۹۶۴ء میں آر۔ سی۔ ڈی کا ادارہ وجود میں آیا۔

○ صدر ناصر

نومبر ۱۹۶۰ء میں مصر کا سرکاری دورہ کرنے سے پہلے صدر ایوب کے دل میں صدر ناصر کے متعلق وہی جذبات اور تعصبات موجود تھے جو اس زمانے میں دوسرے بہت سے پاکستانیوں کے دلوں میں موجزن تھے۔ برسر اقتدار آنے کے بعد صدر ناصر نے جس سختی سے اخوان المسلمین کی تحریک کو کچلنا شروع کر دیا تھا' اس کی وجہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں رنج و اضطراب کی ایک لہر دوڑی ہوئی تھی' دنیائے عرب کے عین منجدھار مصر میں روس کا بظاہر بے تحاشا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ بھی عالم اسلام کے نزدیک کوئی نیک فال تصور نہ کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اتحاد المسلمین کی بجائے جب صدر ناصر نے عرب نیشنلزم کا نعرہ انتہائی زور و شور سے اپنا لیا تو یہ بات بھی بہت سے پاکستانیوں کے نزدیک بڑی مایوس کن تھی۔ اس کے علاوہ نہر سویز پر فرانسیسی اور برطانوی حملے کے موقع پر پاکستانی حکومت اور اس کے نمائندوں نے جس بے تدبیری' بے حسی اور غیر مروتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس پر صدر ناصر کو قدرتی طور پر اس قدر شدید غم و غصہ تھا کہ اپنی ایک تقریر میں انہوں نے پاکستان کو "مغربی سامراجیت کے زرخرید غلام" کے لقب سے نوازا تھا۔ اسی غیظ و غصہ کے عالم میں انہوں نے ایک اور موقع پر یہاں تک کہہ دیا تھا کہ نہر

سویز مصر کو اتنی ہی عزیز ہے جس قدر کہ کشمیر ہندوستان کو عزیز ہے۔ ان افسوسناک واقعات کی وجہ سے پاکستان میں صدر ناصر کی شخصیت ملے جلے جذبات اور طرح طرح کے شک و شبہات کی دھول میں اٹی ہوئی تھی۔

قاہرہ میں چند روز کی ملاقاتوں اور مذاکرات کے بعد صدر ایوب کے ذہن سے صدر ناصر کی ذات پر جمی ہوئی گرد بڑی حد تک چھٹ گئی۔ جمال عبدالناصر کے کردار میں کوئی بدنما پیچ و خم نہ تھا۔ وہ صوم و صلوٰہ کے پابند تھے اور ان کے چہرے مہرے سے صدق و صفا' خلوص اور دیانتداری کی پھوار ٹپکتی تھی ان کی گفتگو میں سادگی' متانت اور (directness) راستی کا رنگ غالب تھا۔ مذاکرات کے پہلے ہی دور میں انہوں نے بچپن ہی سے اسلام کے ساتھ اپنی والہانہ وابستگی' شاہ فاروق کے عہد میں مصر کی شدید پستی' جنرل نجیب کے ساتھ اختلافات کی وجوہات' اقتدار میں آنے کے بعد علمائے دین کے ایک طبقہ کے ساتھ ذہنی اور نظریاتی کشمکش' مصر میں امریکہ کے عزائم اور پالیسیوں کی طرف سے بے یقینی اور مایوسی اور رد عمل کے طور پر مصر کا روس کی جانب جھکاؤ کی تفصیلات پر ایسا سنجیدہ' مدبرانہ اور متوازن تبصرہ کیا جس میں صدر ناصر کے جذبات اور احساسات کی دلسوزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

ایک موقع پر صدر ایوب نے کہا "تاریخ میں پہلی بار یہ موقع آیا ہے کہ بہت سے اسلامی ممالک حقیقی طور پر آزاد اور خود مختار ہوئے ہیں۔ کیا میرا اور آپ کا یہ فرض نہیں کہ ہم مل کر غیر مسلم ممالک میں اسلام کی تبلیغ اور ترویج کے لیے بھی کوئی عملی قدم اٹھائیں؟"

یہ سن کر صدر ناصر نے بے اختیار اپنی نشست سے کسی قدر اٹھے اور جذبات میں بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "آپ کی بابت تو میں کچھ نہیں جانتا۔ صرف اپنے متعلق کہتا ہوں کہ میں اپنے اس فرض سے لمحہ بھر کے لیے بھی غافل نہیں ہوں۔"

اس کے بعد صدر ناصر نے وضاحت کی کہ غیر جانبدارانہ تحریک کے ساتھ ان کی وابستگی

اور روس کے ساتھ سفارتی اور سیاسی گٹھ جوڑ' یہ سب دنیاداری کے دھندے ہیں۔ توشۂ آخرت کے طور پر وہ صرف دین کی خدمت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اعداد و شمار کی مدد سے ہمیں کئی منصوبے بتائے جن کے ذریعہ وہ افریقہ کے کئی ملکوں میں تبلیغ اسلام کے لیے کیا کیا خدمات سرانجام دے رہے تھے۔

صدر ایوب نے چند بار صدر ناصر کو گھیر گھار کر کشمیر کے موضوع پر لانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہایت چابک دستی سے طرح دیکر اس موضوع پر کچھ کہنے سے کنی کترا جاتے تھے۔ پھر اچانک نیشنل یونین کے ایک عظیم الشان جلسہ میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ رونما ہوا۔ یہاں پر صدر ناصر نے ایک طویل اور ولولہ انگیز تقریر کی جس کے دوران سامعین نے عموماً اور نوجوان طبقہ نے خصوصاً بار بار فلک شگاف نعرے بلند کر کے تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے۔ اس تقریر میں دنیا بھر کے مسائل کا ذکر تھا۔ لیکن بے چارے پاکستان کے کسی مسئلہ کی طرف ہلکا سا بھی اشارہ موجود نہ تھا۔ جب صدر ایوب کی باری آئی تو انہوں نے اپنی پہلے سے تیار شدہ تقریر لپیٹ کر ایک طرف رکھدی اور نہایت دھیمے اور پروقار لہجے میں گھنٹہ بھر ایک انتہائی مدلل اور موثر فی البدیہہ تقریر کرتے رہے۔ ان کی کھری کھری باتیں سن کر پہلے تو سامعین پر سناٹا سا چھایا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ نوجوان طبقہ نے ان کی باتوں کا اثر قبول کر کے وقتاً فوقتاً نہایت پرجوش نعرے لگانا شروع کر دیے۔

صدر ایوب نے اپنی تقریر میں تاریخی حوالے دے کر فلسطین سمیت دنیائے عرب کے ہر مسئلہ پر پاکستان کی بھرپور حمایت اور یکجہتی کا احوال بیان کیا۔ اور کسی قدر دکھ کے ساتھ گلہ کیا کہ پاکستان کو اپنی گوناں گوں مشکلات اور مسائل میں عربوں کی ہمدردی اور حمایت کا ابھی تک انتظار ہے۔ اس موقعہ پر انہوں نے صدر ناصر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہلکا سا توقف کیا اور پھر ڈرامائی انداز میں کہا۔ "مستقبل میں ہمیں آپ کی جواں سال قیادت سے بہت سے خوشگوار امیدیں ہیں۔" اس فقرے پر سارا ہال تالیوں

سے گونج اٹھا' اور سامعین نے صدر ایوب اور صدر ناصر کے حق میں نہایت پرجوش نعرے لگائے۔

صدر ناصر نے صدر ایوب کی فی البدیہہ تقریر نہایت غور اور توجہ سے سنی۔ میں قریب ہی بیٹھا ٹکٹکی باندھ کر ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ان کا ردعمل بھانپتا رہا۔ میرا اندازہ ہے کہ ایک دو مقامات پر وہ کسی قدر کھسیانے ہو کر مسکرائے۔

صدر ایوب کی تقریر ختم ہوئی تو صدر ناصر نے نہایت گرمجوشی سے ان کے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا۔

(Truth and sincerity win the hearts of people. Indeed there is no sub-stitute for truth and sincerity)

(سچائی اور خلوص لوگوں کا دل جیت لیتے ہیں' بے شک سچائی اور خلوص کا کچھ نعم البدل نہیں۔"

مصر کے اس دورہ نے یہ حقیقت صدر ایوب پر روز روشن کی طرح عیاں کر دی تھی کہ مشرق وسطیٰ میں صدر ناصر کے مقابلے میں کسی اور رہنما کا چراغ جلنا ناممکن ہے۔ اس بات کا اعتراف انہوں نے اپنی کتاب (Friends Not Masters) میں کسی قدر محتاط انداز سے کیا' تو شاہنشاہ ایران اس پر چراغ پا ہو گئے۔

صدر ناصر کا انجام دل شکستگی' ناکامی اور مایوسی کی آغوش میں ہوا۔ زندگی بھر ان کے انقلابی فلسفہ کا کوئی مقدمہ یا منصوبہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ عرب نیشنلزم کا بلند بانگ نعرہ کھوکھلا ثابت ہوا۔ بین المملکتی سطح پر مصر اور شام کا اتحاد تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ گیا۔ تنظیم آزاد فلسطین کی پامالی اور شکست و ریخت کا عمل بھی ان کی آنکھوں کے سامنے شروع ہو چکا تھا۔ خاص طور پر اردن میں مہاجرین فلسطین کے کیمپوں پر ظلم و ستم کے جو پہاڑ توڑے گئے۔ وہ ان کی ناکامیوں کے تابوت کا آخری کیل تھے۔

صدر ایوب کے دورہ مصر کے نو برس بعد مجھے ایک بار پھر صدر ناصر سے ملاقات کا موقع نصیب ہوا۔ صدر ایوب کے زوال کے بعد جنرل یحیٰی پاکستان میں برسراقتدار آ گئے تھے۔

میں بھی ملازمت سے مستعفی ہو کر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ تاہم میں ذاتی حیثیت سے یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا ممبر منتخب ہو چکا تھا۔ ان دنوں عرب ممالک یہ شکایت کر رہے تھے کہ یروشلم سمیت مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیل نے فلسطینی مہاجر بچوں کے لیے یونیسکو کے قائم کردہ سکولوں میں یہودی استاد تعینات کر کے غیر اسلامی نصاب تعلیم جاری کر دیا ہے۔ یونیسکو کے اپنے ذرائع سے جب ان شکایات کی خاطر خواہ تصدیق نہ ہو سکی تو میں نے اسرائیل کا خفیہ دورہ کر کے اصل صورت حال تحقیق کرنے کی پیشکش کی۔ اس منصوبہ کو صدر ناصر کی منظوری اور سرپرستی حاصل تھی۔ اسی سلسلے میں انہوں نے مجھے قاہرہ طلب کر کے ملاقات کا موقع دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ پچھلے نو برس کے دوران صدر ناصر کی شخصیت میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اب وہ جسمانی اور ذہنی طور پر اپنی عمر سے بہت زیادہ بوڑھے نظر آتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اولوالعزمی کی وہ پہلی سی چمک دمک ماند پڑ چکی تھی۔ مغرب کا وقت آنے پر انہوں نے نماز تو ضرور ادا کی' لیکن مجموعی طور پر اسلام کے متعلق ان کے نظریات اب کسی قدر زنگ آلود نظر آتے تھے۔ وہ اس بات پر خوش تھے کہ مصر کے دانشوروں کی نئی نسل مصر کی عظمت کے ڈانڈے دور فراعنہ کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ملانے میں کوئی حجاب یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ خاص طور پر وہ اس پر بھی مطمئن تھے کہ نوجوان لڑکیوں کے زیورات اور بناؤ سنگھار کا فیشن دن بدن فرعونوں کے زمانے کی سج دھج میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ صدر ناصر کافی دیر قوموں میں تسلسل ثقافت کی اہمیت پر کسی قدر بے سروپا باتیں کرتے رہے۔ان کے نزدیک مصر کی تاریخی عظمت میں کئی دوسری تحریکوں کی طرح اسلام کی تحریک کا بھی اہم حصہ تھا۔ ان کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ دوام تاریخ کو حاصل ہے تحریک کو نہیں۔

جس طرح دنیائے عرب اور بین الاقوامی سیاست میں صدر ناصر منفی اثرات کے علاوہ کوئی تعمیری کردار ادا نہ کر سکے۔ اسی طرح غالباً آخری عمر میں وہ اپنی ذہنی اور باطنی دنیا

میں بھی انتشار' اضطراب' ابتری اور پراگندگی کا شکار رہے۔ یہ ایک ایسے انسان کی عبرتناک مثال ہے جس کی خوبیوں پر اس کی بے برکتیاں غالب آ گئیں۔

○ صدر ایوب کے دیگر غیر ملکی دورے

صدر ایوب کے اور بھی کئی غیر ملکی دوروں میں مجھے ان کی ہمراہی کا موقع حاصل ہوا۔ ان ممالک میں برطانیہ' کینیڈا' مغربی جرمنی' یوگوسلاویہ' لبنان' عراق' سعودی عرب' برما' فلپائن' ہانگ کانگ' سنگاپور' انڈونیشیا اور جاپان شامل تھے۔ اس کے علاوہ اپریل ۱۹۶۵ء میں وہ روس بھی گئے تھے۔ اس زمانے میں ہالینڈ میں میں بطور سفیر متعین تھا۔ اس لیے ان کے اس اہم دورے کا مجھے ذاتی طور پر کوئی علم نہیں۔ البتہ صدر ایوب کے دل میں یہ خوش فہمی قائم تھی کہ اس دورے کی وجہ سے وہ پاکستان کے متعلق روسی لیڈروں کے دل میں جمی ہوئی سردمہری کی برف کو کسی حد تک پگھلانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

○ لندن

کامن ویلتھ وزرائے اعظم کانفرنس میں شرکت کے لیے صدر ایوب قریباً قریباً ہر دوسرے برس لندن جایا کرتے تھے۔ اس کانفرنس میں کوئی بڑا مسئلہ تو کبھی حل نہ ہوا لیکن انگلستان میں بسے ہوئے لاکھوں تارکین وطن کی فلاح و بہبود کے لیے یہ اجتماع اکثر و بیشتر سود مند ثابت ہو جایا کرتا تھا۔ یوں بھی دولت مشترکہ کی حکومتوں کے سربراہوں کا میل جول باہمی خیر سگالی کو فروغ دینے کا ایک اچھا ذریعہ تھا۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر صدر ایوب نے ایک دو بار پنڈت نہرو کے ساتھ کشمیر کے بارے میں کچھ مفید مطلب گفتگو کرنے کی کوشش ضرور کی۔ لیکن ہر بار پنڈت جی چکنا گھڑا ہی ثابت

ہوتے رہے۔

میرے خیال میں کامن ویلتھ سے ہماری علیحدگی جلد بازی سے کیا ہوا ایک غیر دانش مندانہ فیصلہ تھا۔ ہمارے اس احتجاج سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی بلکہ الٹا پاکستان ہی ایک بنے بنائے بین الاقوامی فورم پر کوئی موثر کردار ادا کرنے سے محروم ہو گیا۔ کامن ویلتھ کی برادری میں ہمارے دوبارہ شامل ہونے کی خواہش اور کوشش کے جواب میں زبانی کلامی تو سب ہمارا ساتھ دینے کی حامی بھرتے ہیں لیکن عملی طور پر ابھی تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ یقیناً ہندوستان ہماری کامن ویلتھ میں ازسر نو شمولیت کی راہ میں طرح طرح کے روڑے اٹکانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے گا۔ اس کے علاوہ برطانیہ اور چند دیگر ممالک بھی غالباً یہی چاہتے ہیں کہ عبرت کے طور پر ہماری اچھی طرح ناک رگڑوائے بغیر کامن ویلتھ میں ہماری واپسی کی راہ بعجلت اور باآسانی ہموار نہ ہو۔

ایک روز لندن میں اتفاقاً میری ملاقات بیگم ناہید اسکندر مرزا سے ہو گئی وہ ٹوکری ہاتھ میں لیے ایک دکان سے سبزی خرید رہی تھیں۔ پہلے تو انہوں نے کنی کترا کر مجھے نظرانداز کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے بڑھ کر سلام کیا تو بڑی خندہ پیشانی سے ملیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اگر میں ان کے میاں سے ملاقات کرنے ان کے ہاں آنا چاہوں تو اس میں کوئی اعتراض کی بات تو نہیں؟

انہوں نے جواب دیا۔ "ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ تمہارے باس ایوب خاں کو ضرور اعتراض ہو گا۔"

میں نے کہا کہ میں صدر ایوب سے اجازت لے کر ہی ملنے آؤں گا

بیگم ناہید مرزا بولیں۔ "ایوب خاں شکی مزاج کا آدمی ہے۔ اپنا برا بھلا سوچ سمجھ کر اجازت مانگنا۔"

میرے اصرار پر انہوں نے مجھے اپنا ایڈریس اور ٹیلیفون نمبر دے دیا جو خفیہ رکھنے کی غرض سے انہوں نے ٹیلیفون ڈائریکٹری میں درج نہ کروائے تھے۔

اپنے ہوٹل واپس آ کر میں نے صدر ایوب کو بیگم مرزا سے ملاقات کا واقعہ سنایا تو ان کے ہونٹوں پر ایک کینہ ورانہ سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور وہ بولے۔ "اچھا تو بیگم صاحبہ

اب ٹوکری اٹھائے سبزی خریدتی پھر رہی ہیں۔ ایک زمانے میں ان کا دماغ اتنا بگڑا ہوا تھا کہ وہ پاکستان کی ملکہ بننے کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔"

میں نے صدر ایوب سے اسکندر مرزا صاحب کو ملنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے حیرت سے مجھے گھور کر دیکھا' اور کہا۔ "کیا ضرورت ہے ملنے کی؟"

میں نے وضاحت کی کہ میں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے اور معزولی کے عین بعد ایوان صدارت سے رخصت کے وقت وہ میرے لیے ایک فاؤنٹین پن کا تحفہ بھی چھوڑ گئے تھے۔ اس لیے میرا جی چاہتا ہے کہ میں خود مل کر ان کا شکریہ ادا کروں۔

صدر ایوب نے کسی قدر سوچ کر جواب دیا۔ "تم اصرار کرتے ہو تو تھوڑی دیر مل آؤ۔ اسکندر چرب زبان آدمی ہے۔ اس کی باتوں پر زیادہ دھیان نہ دینا۔"

میں ٹیلیفون پر وقت طے کر کے رات کے ساڑھے نو بجے اسکندر مرزا صاحب کے ہاں پہنچا۔ فلیٹ کی گھنٹی بجائی تو بیگم مرزا نے دروازہ کھولا۔ ہائیڈ پارک کے قرب میں اچھا خاصا کشادہ فلیٹ تھا جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ کسی پاکستانی صنعتکار نے انہیں رہائش کے لیے دے رکھا تھا۔ فرنیچر کافی پرانا اور معمولی تھا۔ باقی ساز و سامان بھی کسی قدر بوسیدہ نظر آتا تھا۔ اسکندر مرزا صاحب ڈریسنگ گاؤن پہنے ڈرائینگ روم میں کھڑے وہسکی پی رہے تھے۔ غالباً انہیں ثقل سماعت کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ اونچا سنتے تھے' اور خود بھی بلاوجہ اونچا بولتے تھے۔ بیگم مرزا نے مجھے کافی بنا کر پلائی اور ایوان صدر کراچی سے اپنے اخراج کا واقعہ کسی قدر تلخ لہجے میں سنایا۔ انہیں خاص طور پر یہ گلہ تھا کہ جو جرنیل صاحبان اسکندر مرزا سے استعفیٰ طلب کرنے آئے تھے وہ ڈراوے کے طور پر اپنے ساتھ ایک موٹا سا بریگیڈیئر بھی لائے تھے جس نے جارحانہ طور پر ایک فوجی پستول بھی اپنی کمر سے لٹکا رکھا تھا!

اسکندر مرزا صاحب نے پاکستان یا صدر ایوب کے متعلق میرے سامنے کوئی بات نہ کی۔ وہ زیادہ تر اپنی گرتی ہوئی صحت اور لندن میں زندگی کی مشکلات کا رونا روتے رہے۔ قریباً نصف گھنٹہ گزرنے کے بعد انہوں نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "تمہارے آنے کا شکریہ! میرا خیال ہے اب تمہیں چلا جانا چاہیے۔"

بیگم مرزا نے کہا۔ "آغا اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو یہ آیا ہے۔"

"نہیں خانم۔" اسکندر مرزا صاحب بولے۔ "کچھ بعید نہیں کہ دوسری جانب بھی کوئی گھڑی لیے حساب لگا رہا ہو کہ یہ کتنی دیر یہاں بیٹھا ہے۔"

اسکندر مرزا صاحب طبعاً شاہ خرچ انسان تھے۔ ان کے کئی دوسرے ملنے والوں سے میں نے یہی سنا کہ لندن میں اکثر انہیں تنگدستی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ ان کے ذی اثر انگریز دوستوں نے انہیں چند رئیسانہ کلبوں کا ممبر مفت بنوا دیا تھا جہاں وہ اپنا برج کھیلنے کا شوق باآسانی پورا کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ریجنٹ سٹریٹ میں ویرا سوامی ریسٹورنٹ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے انہیں اپنے شعبہ ایکسپورٹ کا ڈائریکٹر بھی نامزد کر رکھا تھا' جہاں سے انہیں کوئی معقول معاوضہ بھی ضرور ملتا ہو گا۔ لیکن کراچی کے ایوان صدر میں تین ساڑھے تین برس داد عیش دینے کے بعد لندن میں کسمپرسی کی زندگی کا دونوں میاں بیوی کے لیے سوہان روح ثابت ہونا ایک لازمی اور قدرتی امر تھا۔

○ مارشل ٹیٹو

یوگوسلاویہ کے دورے پر مارشل ٹیٹو سے ہماری ملاقات ایک نہایت دلکش اور فرحت بخش تجربہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں مارشل ٹیٹو ہٹلر اور مسولینی کے خلاف اپنے وطن کی آزادی کے لیے ایک گوریلا جنگی ہیرو کے طور پر عالمی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ جنگ

کے بعد روس سے ایک زبردست نظریاتی ٹکر لے کر انہوں نے یوگوسلاویہ کو ایک نسبتاً آزاد' کشادہ اور غیر متشدد طرز اشتراکیت کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ غیر جانبدارانہ تحریک کی تخلیق' قیام اور فروغ میں بھی ان کا نام سر فہرست تھا۔ صدر ایوب کے ساتھ مذاکرات کے دوران مارشل ٹیٹو کی شخصیت کا نقش بڑا رفیع الشان اور پر شوکت طور پر ابھرا۔ واقعات عالم کا عموماً اور پاکستان کے مسائل کا خصوصاً انہیں گہرا شعور تھا۔ خاص طور پر مسئلہ کشمیر پر ان کی سوجھ بوجھ انتہائی منصفانہ اور حقیقت پسندانہ تھی۔ غیر جانبدارانہ تحریک کے حوالے سے ان کے پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ بیحد گہرے ذہنی اور سیاسی رشتے تھے لیکن مسئلہ کشمیر پر انہوں نے اپنا موقف انصاف اور حقائق کی بنیادوں پر ہی استوار رکھا۔ اور استصواب رائے کی تجویز کے خلاف کچھ نہ بولے ایسی سطح کے بے لاگ اور باوقار مدبر کے سامنے صدر ناصر جیسے رہنما کو تاہ قد بالشتیے نظر آتے تھے جو عارضی مصلحتوں اور ذاتی مروتوں کے اینچ پیچ میں الجھ کر منصفانہ اصولوں کی حمایت سے بھی منحرف ہو جاتے تھے۔

○ صدر سوئیکارنو

انڈونیشیا کے دورے میں صدر ایوب کی صدر احمد سوئیکارنو سے خوب گاڑھی چھنی۔ ان دونوں حضرات کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ڈاکٹر سوئیکارنو لہو و لعب کے رسیا تھے اور ان کے کردار میں شوخی' چلبلاہٹ اور زندہ دلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سرکاری ضیافتوں اور دوسری تقریبات سے فارغ ہو کر صدر ایوب تو رات دس یا گیارہ بجے تک سونے کے لیے چلے جاتے تھے لیکن صدر سوئیکارنو چیدہ چیدہ مہمانوں کو روک کر ڈانس ہال میں رقص و سرود کی محفل گرم کرتے تھے۔ تین تین چار چار گھنٹے تک مغربی اور انڈونیشی ڈانس اپنا رنگ جماتے تھے جنمیں ڈاکٹر سوئیکارنو خود بھی انتہائی ولولے اور انہماک سے حصہ لیتے تھے' صبح کے تین یا چار بجے کے قریب یہ مجلس برخاست ہوتی

تھی۔ نہ معلوم وہ سوتے کب تھے کیونکہ صبح سات بجے دن کی پہلی تقریب میں صدر سوئیکارنو ہشاش بشاش' چاق و چوبند تازہ دم موجود نظر آتے تھے۔

صدر سوئیکارنو بے حد نازک مزاج اور نفاست پسند طبیعت کے مالک تھے۔ وہ دن بھر میں تین یا چار بار لباس تبدیل کرتے تھے اور موقع و محل کے حساب سے بری یا بحری یا ہوائی فوج کی وردی زیب تن فرماتے تھے۔ کسی مقام پر چلتے چلتے اگر چند قدم بھی دھوپ آ جاتی تھی تو ایک اے۔ ڈی۔ سی لپک کر انہیں سولا ہیٹ پیش کر دیتا تھا' اس کے بعد چھاؤں میں قدم رکھتے ہی وہ فوراً دوسری ٹوپی پہن لیتے تھے۔ اسی طرح لکھنے پڑھنے کے علاوہ دھوپ اور چھاؤں میں استعمال ہونے والی عینکیں بھی وہ بار بار تبدیل کرتے تھے جو ان کے اے۔ ڈی۔ سی نہایت پابندی اور اہتمام سے ان کی خدمت میں پیش کرتے رہتے تھے۔

صدر ایوب کو اپنے ہمراہ لے کر صدر سوئیکارنو جہاں کہیں جاتے تھے رنگ برنگ کے کپڑوں میں ملبوس نوجوان لڑکیاں دور رویہ قطاروں میں کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتی تھیں اور پھولوں کی پتیاں ان پر نچھاور کرتی تھیں۔ پھر انڈونیشی ترانوں کے ساتھ کچھ رقص پیش کیے جاتے تھے اور اس کے بعد کسی دوسرے پروگرام کی باری آتی تھی۔

خاص طور پر جزیرہ بالی میں بالکل پرستان کا سماں تھا۔ چاروں طرف پھولوں سے لدی ہوئی نازک اندام پراچین عورتوں کے جھنڈ کے جھنڈ جگہ جگہ محو رقص و سرود تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جزیرے کی ساری آبادی کا واحد نصب العین گانا اور ناچنا ہے۔ جزیرے کی دوشیزائیں قدم قدم پر صدر سوئیکارنو کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھیں اور وہ ان کے درمیان راجہ اندر کی طرح گھل مل کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

بندونگ میں صدر سوئیکارنو نے ایک جلسہ عام سے خطاب کیا۔ اپنے زور خطابت کا کمال دکھانے وہ صدر ایوب کو بھی اس جلسے میں لے گئے۔ چار پانچ لاکھ کا مجمع تھا۔ صدر سوئیکارنو ڈیڑھ گھنٹہ تک بے تکان بولتے رہے۔ وہ ایسے جادو بیان مقرر تھے کہ لاکھوں کا ہجوم دم بخود انتہائی خاموشی سے انہیں سنتا رہتا تھا۔ پھر اچانک وہ سامعین میں جوش

و خروش کی ایسی بجلی دوڑاتے تھے کہ سارا مجمع سمندر کے جوار بھاٹے کی لہروں کی طرح تہہ و بالا ہو جاتا تھا۔ اس جوش و خروش اور زیر و زبر میں بہت سے لوگ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ اور رفاہ عامہ کے رضاکار انہیں ایمبولینسوں میں ڈال ڈال کر ہسپتال لے جاتے تھے۔ صدر سوئیکارنو کی تقریر انڈونیشی زبان میں تھی۔ لیکن انہوں نے جگہ جگہ قرآن شریف کی چھوٹی چھوٹی عربی آیات بھی بکثرت استعمال کیں۔ اس کے علاوہ وہ متعدد بار ولندیزی زبان میں بھی گرجے برسے۔ میرے ساتھ مامور مترجم لڑکی نے بتایا کہ غصے میں آ کر صدر سوئیکارنو جب کسی کو ڈانٹتے ہیں یا گالی دیتے ہیں تو ایسے موقع پر بے اختیار ڈچ زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ غلامی کے دور میں انڈونیشی قوم نے ڈچ زبان میں گالی گلوچ اور ڈانٹ ڈپٹ سنتے سنتے کئی صدیاں گزاری ہیں۔ غالباً اسی لیے ڈانٹ اور دشنام کے لیے یہ زبان اب ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے!

صدر سوئیکارنو مغربی سامراجیت کی عجیب و غریب کہانیاں بیان کرنے کے بڑے شوقین تھے۔ ایک محفل میں انہوں نے انگریزی زبان کے متعلق ایک لطیفہ اس طرح سنایا۔

"In their arrogance and superiority complex، the ‌ritish imperialists did not refrain even from corrupting their own language. For instance، their grammar says that the word "arrive" should be followed by the "at" So you arrive at Washington، at Rome، at ‌erlin، at cario، at Karachi، Delhi، at Jakarta، at Tokyo، in short، at every place in the world except London - the capital of ‌ritish Empire. ‌ccording to the Standard english grammar، you arrive not at but in London."

مذاکرات میں صدر سوئیکارنو کی ہمدردیاں واضح طور پر پاکستان کے ساتھ تھیں وہ پنڈت نہرو سے بالکل مرعوب نہ آتے تھے۔ بلکہ پنڈت جی کی دانشوری میں حیلہ سازی اور مکاری کی ملاوٹ خوب بھانپ چکے تھے۔ اس کے علاوہ ایشیا کی قیادت کا سہرا اپنے سر باندھنے کا جو خناس پنڈت جی کے دماغ میں سمایا ہوا تھا وہ بھی ڈاکٹر سوئیکارنو کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھا۔ وہ روس اور امریکہ دونوں سے کسی قدر بددل اور مایوس تھے اور چین کی جانب ان کا جھکاؤ صاف اور غیر مبہم تھا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں انہوں نے جس

کھلے دل سے ہماری عملی مدد کی اسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

صدر سوئیکارنو کی پالیسیوں کی وجہ سے روس اور امریکہ ان کے برابر کے دشمن تھے۔ ۱۹۶۵ء کے بعد سے بھارت بھی ان کے خون کا پیاسا تھا۔ انڈونیشی عوام میں وہ اس قدر مقبول تھے کہ کوئی اندرونی سازش ان کا بال بیکا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ جی بی اور سی آئی اے دونوں کی ساز باز اور سانٹھ گانٹھ بروئے کار آئی' اور دنیا کی دو متصادم اور متحارب سپر پاورز کے اشتراک عمل نے انڈونیشی قوم کو اس کے محبوب "بنگ کارنو" (عظیم بھائی) سے محروم کر دیا۔

جس زمانے میں صدر سوئیکارنو انڈونیشیا میں اقتدار سے معزول ہوئے۔ اس وقت میں ہالینڈ میں بطور سفیر متعین تھا۔ میں نے چند نہایت اہم' نازک اور خفیہ ذرائع سے صدر سوئیکارنو کے خلاف سازشوں کی تفصیلات معلوم کر کے صدر ایوب کو ایک (Top Secret) رپورٹ بھیجی تھی۔ اس رپورٹ میں میں نے ان خطوط کی نشاندہی بھی کی تھی کہ جن پر پاکستان میں ان کے خلاف بھی ہلچل اور کھلبلی نمودار ہونے کا امکان تھا۔ اس وقت تو صدر ایوب نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی لیکن جب ان کے خلاف چلنے والی تحریک اپنے عروج پر تھی تو ایک روز انھوں نے کسی قدر حسرت سے مجھے کہا۔ "آج میں نے تمہاری ہالینڈ والی رپورٹ پھر نکلوا کر پڑھی ہے۔ بے شک تمہارے سب اندازے صحیح تھے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔"

○ جاپان

جاپان کے دورے میں جب ہم ٹوکیو پہنچے تو ہمیں شہنشاہ ہیروہتو کے ایک ذاتی محل میں ٹھہرایا گیا جو خاص خاص مواقع پر مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد جاپان کی ثقافت بظاہر امریکی اثرات کی زد میں آ گئی تھی۔

لیکن دراصل اس قوم کی روح اپنی قدیمی روایات اور اقدار کے جادہ سے ذرا بھی نہ بھٹکی تھی' بے شک جاپانیوں کے دماغ جدیدیت کی روشنی سے منور تھے لیکن ان کے دل بدستور قدامت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ تھے۔ غیر ملکی سیاحوں کی لطف اندوزی کے لیے انھوں نے اپنی گیشاؤں کو روایتی کیمینو پہنا کر بڑے بڑے عالیشان نائٹ کلبوں کی زینت بنا دیا تھا۔ لیکن گھروں کی چاردیواری میں جاپان کے اپنے قدیمی رہن سہن' لباس' خوراک' پوشاک اور رسوم و رواج کا چلن مسلسل اور غیر منقطع طور پر جاری و ساری تھا۔ اگرچہ مذہب کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی لیکن شہنشاہ پرستی کے جذبہ میں کوئی فرق نہ آیا تھا' اگر کوئی جاپانی باہر بازار میں ہم میں سے کسی کے پاس شاہی مہمان خانے کا سگریٹ یا ماچس کی ڈبیا کا کاغذ کا پنکن دیکھ لیتا تھا جس پر بادشاہ کے ذاتی نشان کی علامت ثبت ہوتی تھی تو فرط حیرت و عقیدت سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی تھیں اور وہ ہماری طرف یوں دیکھنے لگتے تھے جیسے ہم کسی دوسرے خلائی کرہ کی مخلوق ہوں' ہماری پارٹی کا ایک رکن کسی دکان میں سوٹ کیس خریدنے گیا۔ اس کے ہاتھ میں مہمان خانے کی ایک ماچس کی ڈبیہ تھی جس پر بادشاہی emblem کا نشان ثبت تھا۔ دکاندار نے پہلے تو وہ ڈبیہ لے کر چوما اور سر آنکھوں سے لگایا اور پھر نہایت لجاجت سے یہ ڈبیہ اپنے پاس رکھنے کے لیے مانگ لی۔ ہمارے دوست نے بخوشی اسے دے دی۔ شکرانے کے طور پر دکاندار نے سوٹ کیس کی قیمت وصول نہ کی۔

پوری جاپانی قوم جس محنت اور لگن سے دن رات محنت کرنے کی عادی ہے اس کی مثال دنیا بھر میں اور کہیں نہیں ملتی۔ ہم نے ملک بھر میں کوئی بھک منگا نہیں دیکھا۔ زمین کی اصل قدر و قیمت بھی جاپان میں نظر آئی۔ وہاں پر آبادی زیادہ اور زمین کی وسعت کم ہے جہاں کہیں بھی اراضی کا کوئی قطعہ موجود ہے' وہ لازمی طور پر تعمیراتی' یا صنعتی یا زرعی مقاصد کے لیے زیر استعمال ہے۔ ہم نے ریل اور موٹر کار کے ذریعہ جاپان میں کئی لمبے سفر کیے۔ ہمیں خالی زمین کا بے مصرف ٹکڑا کہیں نظر نہیں آیا۔ شہروں کی

سڑکوں کے کناروں پر' دیہاتوں کے گلی کوچوں میں یا گھروں کے اندر یا باہر کسی کونے کھدرے میں جہاں بالشت دو بالشت خالی زمین نظر آئے' جاپانی فوراً وہاں پر موسمی پھول اور سبزی ترکاری بو دیتے ہیں۔ ہم نے ٹوکیو کے گنجان ترین علاقوں میں مکانوں اور دکانوں کی دہلیزوں کے کونوں اور کناروں میں اس طرح کی بے شمار لہلہاتی ہوئی کھیتیاں دیکھی ہیں۔

جاپان جانے سے پہلے ہم برما میں بھی چند روز کے لیے ٹھہرے تھے۔ واپسی پر پھر ایک روز وہاں پر رکے۔ اس وقت برما کے وزیراعظم مسٹر اونو تھے۔ وہ بدھ بھکشوؤں کی طرح ایک درویش سیرت انسان تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ہر سال کم از کم ایک ماہ کسی غار یا معبد میں معتکف ہو کر عبادت اور مراقبے میں بسر کرتے تھے۔ انہوں نے صدر ایوب سے پوچھا کہ ان کا جاپان کا دورہ کیسا رہا؟ صدر ایوب نے جاپانی قوم کی انتھک محنت' لگن اور ترقی کی خوب تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "جاپانی لوگ واقعی مشین کی طرح کام کرتے ہیں۔"

یہ سن کر مسٹر اونو کھلکھلا کر ہنسے اور بولے "بے چارے بدنصیب جاپانی۔ انسان کی عظمت انسان بننے میں ہے۔ مشین بننے میں نہیں۔"

وزیراعظم اونو نے قوموں کی مادی ترقی کے متعلق اپنا فلسفہ کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جس کا لب لباب یہ تھا یہ زمانہ مادی ترقی کا زمانہ ہے۔ رفتہ رفتہ مادی ترقی ساری دنیا کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لے گی جس طرح کہ برف' مٹی اور یخ کا تودہ پہاڑ کی چوٹی سے پھسلتا ہے۔ اگر کوئی ملک مادی ترقی سے بچنے کی کوشش کرے بھی تو وہ اس میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا' ہم سب مادی ترقی کی زد میں بے دست و پا مقید ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ترقی یافتہ ہو کر بھی انسان ہی رہیں۔ ایسی مشین نہ بن جائیں جس میں حرکت تو تیز ہو لیکن روح ندارد!

• ماں جی کی وفات

۲ مارچ ۱۹۶۲ء کو رات کے ساڑھے گیارہ بجے ماں جی جناح ہسپتال کے ایک کمرے میں اچانک ہم سے رخصت ہو گئیں۔ اس وقت میری جیب میں ریل گاڑی کے دو ٹکٹ تھے۔ کیونکہ اگلی صبح میں نے ان کو اپنے ہمراہ لے کر راولپنڈی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ لیکن انہوں نے یکایک اپنا ارادہ بدل لیا' اور اکیلے ہی اکیلے سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔

ماں جی کو کراچی کے قبرستان میں چھوڑ کر جب میں تنہا راولپنڈی واپس پہنچا۔ تو معاً یوں محسوس ہوا کہ گھر کی چھت اڑ گئی ہے اور اب دھوپ' بارش اولے اور آندھی سے بچنے کا کوئی حفاظتی سہارا موجود نہیں رہا۔ ایوان صدر میں اپنے دفتر گیا تو وہ بھی اجڑا اجڑا سا نظر آیا۔ کئی روز تک میرے سامنے میز پر فائلوں کا پلندہ جمع ہوتا رہا اور میں دیر دیر تک اس ڈھیر پر سر ٹکائے بے حس و حرکت بیٹھا رہتا تھا۔ چند بار سب سے اوپر والی فائل بھیگ جاتی تھی۔ جسے میرا اردلی عرفان باہر دھوپ میں رکھ کر سکھا لاتا تھا۔

ایک روز نہ جانے دل میں کیا ابال اٹھا کہ فائلیں میز پر جمع ہوتی رہیں۔ اور میں ایک کاغذ پر سر جھکائے بے ساختہ "ماں جی" کے عنوان پر ان کے بارے میں لکھتا رہا۔ لکھتے لکھتے آنکھوں سے بار بار آنسو ٹپ ٹپ کر کے گرتے تھے اور کاغذ پر تحریر شدہ الفاظ کو بھگو کر لکیروں کی صورت میں پھیلا دیتے تھے۔ میرے اردلی نے بتایا کہ اس دوران صدر ایوب کوئی بات کرنے بذات خود میرے کمرے میں تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مجھے کاغذ پر جھکے ہوئے آنسو بہاتے دیکھا۔ تو بغیر کچھ کہے سنے چپ چاپ واپس چلے گئے۔ دو تین گھنٹے میں میری تحریر مکمل ہو گئی اور دل پھول کی پتی کی طرح ہلکا ہو گیا۔ صدر کے ملاحظہ کے لیے میں نے جلدی جلدی چند فائلیں تیار کیں۔ اور انہیں لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ان کی میز پر فائلوں والی ٹرے خالی پڑی تھی اور

وہ کرسی میں نیم دراز سے ہو کر کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ میری فائلوں کو انہوں نے خاموشی سے دیکھا اور ان سب پر مناسب احکامات درج کر کے مجھے لوٹا دیں۔ جب میں اٹھ کر باہر آنے لگا' تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے واپس بٹھا لیا۔ چند لمحے مکمل خاموشی طاری رہی پھر وہ نہایت نرم اور ہمدردانہ لہجے میں بولے۔ "مجھے احساس ہے کہ تمہارا زخم ابھی ہرا ہے۔ میری مانو تو چند روز کے لیے سوات ہو آؤ۔ تم اورنگ زیب اور اس کے والد کو اچھی طرح جانتے ہو۔ خوش مزاج اور زندہ دل لوگ ہیں۔ میں انہیں ٹیلیفون کر دونگا۔ شاید تمہارا غم کسی قدر ہلکا ہو جائے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے کہا۔ "سر' آج ایک خاص بات تھی۔ وہ پوری ہو گئی ہے۔ اب میں بالکل نارمل ہوں۔"

"ایسی کیا خاص بات تھی؟ کچھ ہمیں بھی اعتماد میں لو۔" وہ نرمی سے بولے۔ میں نے کسی قدر ہچکچاہٹ سے جواب دیا۔ "سر' میں نے اپنی ماں کی یاد کو الفاظ میں ڈھال کر کاغذ پر منتقل کر دیا ہے۔ اب یہ المیہ صرف میرا ہی غم نہیں رہا۔"

"کہاں چھپواؤ گے؟ انہوں نے پوچھا۔

"کسی رسالے میں۔ غالباً نقوش میں۔" میں نے جواب دیا۔

"جب چھپ جائے تو مجھے بھی پڑھنے کے لیے دینا۔" انہوں نے فرمائش کی

کچھ عرصہ بعد جب "ماں جی" نقوش میں شائع ہوئی۔ تو میں نے رسالہ کی ایک جلد صدر ایوب کی خدمت میں بھی پیش کر دی۔ معلوم نہیں انہوں نے اسے کبھی پڑھا بھی یا نہیں۔

البتہ بہت سے دوسرے لوگوں نے اسے شوق سے پڑھا۔ اور عرصہ تک مجھے نہایت اچھے اچھے خط آتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد جب ابن انشاء نے "نفسانے" کے منتخب افسانوں کو شامل کر کے میری تحریروں کے ساتھ "ماں جی" نام کی کتاب شائع کروائی۔ تو اب بھی وقتاً فوقتاً کچھ قارئین مجھے بڑے حوصلہ افزا خط لکھتے رہتے ہیں۔

"ماں جی" پر اردو کے نامور افسانہ نگار' ڈرامہ نویس' ناولسٹ' نقاد اور دانشور میرزا ادیب کا تبصرہ بھی جو "نقوش" کے سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) میں شائع ہوا تھا' یہاں پر شامل کر

رہا ہوں۔

میری طرح کے جز وقتی نیم ادیب کے لیے یہ تبصرہ بڑا قیمتی اور باعث صد افتخار ہے۔ یہی احساس اسے یہاں پر نقل کرنے کے لیے میرے لیے وجہ ترغیب ہے یہ خود ستائی کی بات نہیں بلکہ جذبہ تشکر کا اظہار ہے۔

○ ◯ ○

• ماں جی

اردو ادب کا ایک زندہ کارنامہ

میرزا ادیب

اگر آپ قدرت اللہ شہاب کا نام لیتے ہیں
اور آپ کے ذہن میں یہ نام لیتے ہی "ماں
جی" کا تصور نہیں ابھرتا' تو یوں سمجھئے کہ آپ
نے شہاب کا پورا نام نہیں لیا۔ اسی طرح
آپ "ماں جی" کا ذکر کرتے ہیں اور ایک
برقی رو کی مانند شہاب کا نام آپ کے دماغ
میں در نہیں آتا۔ تو "ماں جی" کا ادھورا
خیال آپ نے کیا ہے۔ اصل میں قدرت اللہ
شہاب اور "ماں جی" اس طور پر ایک دوسرے
سے وابستہ ہو گئے ہیں کہ ایک نام دوسرے
نام کے بغیر غیر مکمل لگتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں ان گنت
ایسی تحریریں منظر عام پر آئی ہیں' جنھوں نے
اپنے مصنفوں کو شہرت کے بلند سے بلند تر
افق پر پہنچا دیا ہے' مگر ایسی تخلیقات بہت
کم وجود پذیر ہوئی ہیں جو اپنے خالقوں کا ایک
طرح سے جزو لانیفک بن گئی ہیں۔ جو اپنے
خالقوں کو اپنے ساتھ لے کر چلی ہیں اور

ہمیشہ ہم قدم رہی ہیں۔ ہم قدمی کا یہ انداز "ماں جی" اور قدرت اللہ شہاب کے ہاں موجود ہے۔

شہاب بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کی تعداد چالیس پینتالیس سے آگے نہیں بڑھتی' لیکن "ماں جی" لکھ کر تو انہوں نے ایک ایسا مقام حاصل کر لیا ہے جو گردش شام و سحر کے درمیان پہلے بھی بہت نمایاں تھا اور آج بھی اس کی اس قابل رشک حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس افسانے کو نہ جانے میں نے کتنی مرتبہ پڑھا ہے اور ہر بار اس کی پراسرار مقناطیسی کیفیت میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے اور چھائی ہوئی ہے۔

"ماں جی" کا ایک حد تک تجزیاتی مطالعہ کرنے سے پیشتر شہاب کی دو ایک خصوصیات کا ذکر ضرور کروں گا۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شہاب نے مختصر افسانے کے اساسی تقاضوں کو بہت اچھی طرح سمجھ کر ادب کی اس صنف کی طرف بھرپور توجہ کی ہے۔ ان کا افسانہ صحیح معنوں میں مختصر افسانہ ہوتا ہے۔ افسانے کی پوری تحریر میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا فقرہ ملے گا جو افسانے کی تعمیر میں اس حد تک اہم حصہ نہ لے کر اسے فالتو سمجھا جا سکے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں طنز کہیں تو واضح طور پر محسوس ہو جاتا ہے اور کہیں دبا دبا رہتا ہے۔ طنز کا جو رنگ شہاب میں ہے' اردو کے کسی بھی افسانہ نگار کے ہاں نہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد نے شہاب کو اردو کا سب سے بڑا طنز نگار افسانہ نگار کہا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

آیئے اب شہاب کے اس افسانے کی طرف توجہ کرتے ہیں جس کا عنوان "ماں جی" ہے اور جسے میں نے شہاب کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ ماں کا اولین فقرہ یہ ہے:

"ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔"

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال کیونکر معلوم ہو سکتا تھا۔ صحیح سن ولادت تو اس شخص کا معلوم ہو سکتا ہے جس کا تعلق دوران وقت سے ہو۔ جو ہستی زمان و مکان کے حدود

سے ماورا ہو اسے وقت کے پیمانے سے کیسے ناپا جا سکتا ہے؟ "ماں جی" ایک ہستی' ایک فرد' ایک شخصیت کی بجائے' آفاقی مامتا' کا تصور دیتی ہے۔ ایک ازلی اور ابدی وجود (Motherhood Universal) شہاب نے یہ الفاظ جب لکھے تھے' تو ان کے ذہن میں یہ تصور نہیں ہو گا' جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ مگر کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ہم غیر شعوری طور پر کچھ ایسے الفاظ لکھ جاتے ہیں جن کی اپنی کئی پرتیں ہوتی ہیں۔ شہاب نے ایک عام مفہوم کے لیے یہ فقرہ لکھا ہے۔ مقصود ان کا اپنی والدہ کے سن پیدائش سے ہے جو انہیں معلوم نہیں' لیکن یہ فقرہ لکھتے وقت انہیں یہ احساس نہیں ہو گا کہ وہ ایک خاص ماں کا ذکر نہیں کریں گے بلکہ حقیقتاً اس روح کا کریں گے جو ہر ماں کے اندر کار فرما ہے۔ جو آفاقی ہے اور جسے عام مفہوم میں "ممتا" یا مامتا کہا جاتا ہے۔

"ماں جی" نے دنیا میں آنے کے بعد ایک ایسے ماحول میں اپنی طفولیت کا دور گزارا ہے جو حد درجہ معصوم ہے۔ ان کے والد کے پاس چند ایکڑ زمین تھی' جو نہر کی کھدائی میں ختم ہو گئی تھی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیئے جاتے تھے۔ یہ بزرگ معاوضہ لینے کے ڈھنگ سے واقف ہی نہیں تھے۔ نتیجہ یہ کہ معاوضہ حاصل کرنے کی بجائے خود نہر کی کھدائی میں محنت مزدوری کرنے لگے۔

تو یہ ماں جی کے والد تھے۔

اب دیکھیے جو لڑکی ایسے باپ کے زیر تربیت اپنے شب و روز گزارے گی وہ قدرتاً کس سانچے میں ڈھل جائے گی۔ اسے دنیا داری کی کیا خبر ہو گی؟ اس کے باطن میں اول تو وہ امنگیں پیدا ہی نہیں ہوں گی جو ایک سوجھ بوجھ اور زمانے کے نشیب و فراز کو سمجھنے والی ہستی میں پیدا ہو سکتی ہیں اور اگر پیدا ہوں گی بھی تو صبر و شکر کے گہرے احساس میں مدغم ہو جائیں گی۔

"ماں جی" کا سفر بڑی سادگی کے عالم میں شروع ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے شاداب راستوں پر سفر نہیں کرتیں۔ ان راہوں پر قدم اٹھاتی ہیں جن پر کہیں کہیں سایہ دار درخت

مسافر کو تیز دھوپ سے بچا لیتے ہیں۔ بس وہ اسی کو زندگی کا انعام سمجھ لیتی ہیں اور کبھی بھی حرف شکایت لب پر نہیں لاتیں۔ ان کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ بقر عید کا تہوار آتا ہے تو ان کے والد انہیں تین آنے بطور عیدی کے دے دیتے ہیں۔ یہ تین آنے اتنی بڑی رقم تھی کہ اس کا مصرف ہی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

یہ تین آنے ان کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہتے ہیں۔ پھر ایک روز وہ گیارہ پیسوں کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیتی ہیں اور ایک پیسہ اپنے پاس محفوظ رکھتی ہیں۔

اس کے بعد جب کبھی ان کے پاس گیارہ پیسے جمع ہو جاتے ہیں، تو کسی مسجد کے دیے میں تیل ڈالنے کا انتظام کر لیتی ہیں، اس کے علاوہ ان گیارہ پیسوں کا کوئی مصرف وہ نہیں جانتیں۔ "ماں جی" کی اس حرکت یا طریق عمل کو محض ایک رسمی اور روایتی کہا جائے گا مگر ایسا نہیں ہے۔ شہاب نے ماں جی کی اس عادت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"ساری عمر جمعرات کی شام کو اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی، لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی "ماں جی" کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ چونکہ وہ جمعرات کی شب تھی۔"

شہاب کے اس افسانے کا ایک ایک فقرہ بڑا بلیغ اور پر معنی ہے۔ مگر یہ پیرا جو میں نے نقل کیا ہے، اس اعتبار سے بے حد اہم ہے کہ اس کے ذریعے "ماں جی" کا پورا کردار واضح ہو جاتا ہے۔

میں نے ماں جی کے کردار پر غور کیا ہے تو یہ باتیں میری سمجھ میں آئی ہیں۔

تمہیدی سطور میں عرض کر چکا ہوں کہ "ماں جی" ایک فرد واحد تو ضرور ہیں مگر ان

کا کردار فرد واحد سے زیادہ اس جذبے کی تجسیمی صورت ہے جو مامتا کہلاتا ہے۔ خدائے رحیم و رحمٰن نے نزول رحمت کی خاطر بے شمار ذرائع اختیار کئے ہیں لیکن ان ذرائع میں سب سے موثر' سب سے قوی اور ہمہ گیر اور آفاق گیر ذریعہ مامتا ہے۔ پیدا کرنے والے نے مامتا کو اپنی رحمت کا مظہر بنا کر اس خاکدان تیرہ و تاریک میں بھیجا ہے۔ رحمتوں کی ایک صورت ضیا افروزی ہے اور "ماں جی" کا یہ عمل جس کی وساطت سے وہ اندھیروں میں روشنی پھیلاتی ہیں۔ نزول رحمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ان کے عمل سے روشنی پھیلتی ہے اور روشنی رحمت و برکت کا دوسرا نام ہے۔

روشنی وہیں پھیلائی جاتی ہے' جہاں تاریکی ہو۔ ماں جی جہاں بھی رہتی ہیں تاریک گوشوں کو ڈھونڈتی رہتی ہیں کہ وہاں جا کر روشنی بکھیریں۔ یہ عمل ہنگامی نہیں' عارضی نہیں' مستقل ہے۔ خدا کی رحمت جب مستقل ہے تو دنیا میں اس کی رحمت کا مظہر عارضی کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہاں ایک اور بات کا بھی خیال رہے۔ ماں جی کی اس روشنی کا تعلق مسجدوں سے ہے۔ مسجدوں کے حوالے سے یہ روشنی جو ان کے دم قدم سے ظہور پذیر ہوتی ہے' ایک قسم کا تقدس حاصل کر لیتی ہے۔

رحمت کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ خود کو چند افراد' چند خاندانوں' چند لوگوں تک محدود نہیں کرتی۔ کیا سورج جب طلوع ہوتا ہے تو وہ اپنی کرنوں کو پھیلانے کے لیے رنگ' نسل' امارت' غربت وغیرہ کا امتیاز روا رکھتا ہے۔ کیا یہ کرنیں سیاہ فام نسل انسانی کو اپنا نور دینے سے انکار کر دیتی ہیں۔ کیا یہ کرنیں اونچے مکانوں کے ارد گرد ہی اپنا دامن پھیلا دیتی ہیں۔ غریبوں کی جھونپڑیوں کی طرف نہیں جاتیں؟

ماں جی تو سب کے لیے ہیں۔ رحمت خداوندی کی طرح۔ وہ سب کا بھلا چاہتی ہیں۔ ان کی دعا ہے "سب کا بھلا"

ماں جی کو ایک بالکل مختلف خاتون کی حیثیت سے شہاب نے پیش کیا ہے۔ ایک تو وہ زمانہ تھا کہ "ماں جی" اور ان کا خاندان بمشکل اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ روکھی سوکھی کھا کر سب سو جاتے تھے یا محنت مزدوری کرنے لگتے تھے مگر ماں جی کے شوہر جب گلگت

کے گورنر بنے تو ان کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بنگلہ' وسیع باغ' نوکر چاکر' دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ۔ لیکن ماں جی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس سارے جاہ و جلال نے ان کی طبیعت میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ وہ ویسی کی ویسی رہی۔ بالکل سادہ' درویش منش خاکسار۔ اگر وہ کوئی عام عورت ہوتیں' تو ان کے خیالات بدل جاتے۔ مگر وہ تو سب کی طرح ہونے کے باوجود سب سے مختلف تھیں۔

کیا وہ سچ مچ ایک آئیڈیل ہستی تھیں؟ عام انسانوں سے ماورا' محض ایک زندہ' متحرک نصب العین۔

ماں جی میں ہزار دو ہزار خوبیاں موجود ہیں مگر شہاب اس گہری حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ انسان دیوتا کی عزت کرتا ہے۔ اس کی عظمت کا تہ دل و جان اعتراف کرتا ہے۔ مگر اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ پیار نہیں کر سکتا۔ پیار وہ انسان ہی سے کرے گا۔ شہاب کا یہ انتہائی خوب صورت کردار بڑا اونچا' بڑا مختلف کردار ہے۔ لیکن اپنی ساری خوبیوں' اپنی ساری بلندی کے باوصف وہ آخر ایک انسان ہی رہتا ہے۔

ایک بار "ماں جی" رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں' جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔ گلگت میں ہر قسم کے احکامات "گورنری" کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔

"بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں' لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے' خواہ مخواہ"

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے' رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا۔ "بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے۔ گورنری تو دراصل تمہاری سوکن ہے۔ جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔"

یہ سن کر ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔ آخر ایک عورت تھیں۔ سوکن کا جلاپا مشہور ہے۔ اگر وہ اس مقام پر وسعت قلب کا مظاہرہ کرتیں' تو وہ شاید اس سے زیادہ عظیم کردار بن جاتیں۔ مگر انسانی دنیا سے الگ

تھلگ ہو جاتیں۔ ہمارے دلوں میں ان کے لیے صرف عظمت ہوتی' صرف احترام ہوتا۔ وہ پیار نہ ہوتا' جو ہم ان سے کرتے ہیں' وہ محبت نہ ہوتی جو انہیں انسانوں کی اس دنیا میں حاصل ہے کیونکہ ایک کردار کی صرف عزت کرنے کے لیے اس کی ملکوتی صفات کی ضرورت ہوتی ہے اور جب اس کی عزت بھی کی جائے' اس سے پیار بھی کیا جائے' اس سے محبت بھی کی جائے تو یہ اس کی انسانی صفات کی وجہ سے ہوتا ہے۔

شہاب کا ناقابل فراموش کردار "ماں جی" جہاں اپنے اندر ملکوتی صفات رکھتا ہے' وہاں انسانی صفات سے بھی محروم نہیں ہے۔ ملکوتی اور انسانی صفات اسے عظیم اور پیارا کردار بنا دیتی ہیں۔ میں نے اوپر بتایا ہے کہ طنز نگاری کا جو جوہر شہاب میں ہے۔ وہ اردو کے بہت ہی کم نثر نگاروں کے حصے میں آیا ہے۔ ان کے یہاں طنز کی کاٹ بڑی گہری ہوتی ہے۔ اس پورے افسانے پر سنجیدگی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ مگر شہاب کا قلم یہاں بھی طنز کا رنگ جما دیتا ہے۔

"ماں جی" دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں اور اب شہاب کا مسئلہ ان کے اپنے الفاظ میں سنئے۔

اگر "ماں جی" کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ کی ہمت نہیں ہوتی لیکن مسجد کا ملا پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔ ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے۔ لیکن کھانے والا درویش کہلاتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

آخر میں میں ایک فقرہ لکھنا چاہتا ہوں' شاید اسے ایک رسمی فقرہ گردانا جائے مگر میں اپنی طرف سے ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں' مجھے یقین ہے کہ اگر شہاب صرف یہی ایک افسانہ لکھ کر قلم ہاتھ سے رکھ دیتے تو بھی وہ ادب کی تاریخ میں زندہ رہتے۔ فقط اس افسانے کی بدولت' یہ افسانہ زندہ رہنے والی تخلیقات میں سے ہے' تو پھر اس تخلیق کا خالق کیوں کر فراموش کیا جا سکتا ہے؟

شہاب نے اس افسانے میں ایسی نثر کا نمونہ دیا ہے جسے میں شعری اصطلاح میں سہل ممتنع کہہ سکتا ہوں۔ ایسی نثر لکھنے کی ہزار کوشش کرو' نہیں لکھی جائے گی۔ وہ شاعری نہیں کرتے مگر ان کی اس نثر میں شاعری موجود ہے۔ ایسی روانی جیسے ہم اقبال کا "ساقی نامہ" پڑھ رہے ہیں۔

"پرچھ لگا" کی ترکیب یا تو محمد حسین آزاد کے ہاں پڑھی تھی یا شہاب کے ہاں پڑھ رہے ہیں۔ یہ ترکیب انہوں نے اس طرح استعمال کی ہے۔ انہی دنوں پرچھ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے۔

کتنا سبک فقرہ ہے۔ "پرچھ" کی جگہ اطلاع لفظ رکھئے فقرے کی ساری خوبصورتی پامال ہو کر رہ جائے گی۔

"ماں جی! آپ کی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟" ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔

"توبہ توبہ پت" ماں جی کانوں کو ہاتھ لگاتیں۔

اس "توبہ توبہ پت" کا جواب نہیں ہے۔

یہ افسانہ پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں ایک سوال آیا تھا۔ ممکن ہے کسی اور قاری کے ذہن میں بھی یہ سوال آیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ شہاب نے "ماں جی" کے کردار کو تو بہت خوش اسلوبی سے بنایا سنوارا ہے۔ اپنے باپ کے کردار کی طرف توجہ کیوں نہیں کی۔ وہ انہیں افسانے میں جہاں کہیں ان کا ذکر آتا ہے "عبداللہ صاحب" کہتے ہیں۔

میں عرض کروں گا کہ "ماں جی" کے کردار میں جیسا کہ میں نے کہا ہے' شہاب نے "یونیورسل مدرہوڈ" یا ان کے آفاقی جذبے کی تجسیم کی ہے۔ باپ کے معاملہ میں ان کے پیش نظر کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ ان کے والد مکرم کا کردار بھی اپنی جگہ ایک منفرد کردار محسوس ہوتا ہے۔

سرسید احمد خاں عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلواتے ہیں کہ انگلستان میں جا کر آئی

سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔ مگر عبداللہ صاحب کی والدہ بیٹے کو انگلستان جانے سے روک دیتی ہیں۔

عبداللہ صاحب وظیفہ واپس کر دیتے ہیں' سر سید سخت خفا ہو کر پوچھتے ہیں۔ "کیا تم اپنی

بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو۔"

"جی ہاں" عبداللہ صاحب جواب دیتے ہیں۔

کیا یہ اس کردار کی انفرادیت نہیں ہے۔ مگر اس افسانے کا مرکزی کردار "ماں جی" ہی ہے۔ "ماں جی" جو سدا بہار کردار ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والا کردار ہے۔

(بہ شکریہ "نقوش" لاہور)

○◯○

• صدر ایوب کا زوال

صدر ایوب کے زوال کے اسباب مفرد نہیں بلکہ مرکب تھے۔ ان کے اقتدار کے عصا کو ۱۹۶۹ء سے برسوں پہلے زوال کی دیمک نے اندر ہی اندر چاٹنا شروع کر دیا تھا لیکن حکمرانی کی ترنگ میں انہوں نے کبھی اسے محسوس نہ کیا۔

صاحب اقتدار کا زوال سب سے پہلے اس کے اپنے اندر شروع ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ صدر ایوب کی نیت کو گھن لگنا کس وقت شروع ہوا۔ (اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان کی نیت میں ابتدا ہی سے کوئی فتور تھا) نیتوں کا اندازہ قرائنی شہادت ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ فروری ۱۹۶۲ء میں ایک صاحب مدراس (بھارت) سے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں گزارنے سعودی عرب جا رہے تھے۔ ایک برس سے ان کے بہت سے خطوط مدراس سے آ چکے تھے کہ پاکستان میں چند روز قیام کے دوران وہ صدر ایوب سے ضرور ملنا چاہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ علم جعفر کے بہت بڑے ماہر ہیں اور ایوب خاں کو چند اہم پیشین گوئیاں سنانا چاہتے ہیں۔ صدر کے ساتھ ان کی نصف گھنٹہ کی ملاقات بڑا صبر آزما مرحلہ تھی۔ کیونکہ ان صاحب کی عمر سو برس سے اوپر تھی۔ ضعیف العمری اور لکنت کے علاوہ وہ بہت اونچا سنتے تھے۔ ان کی گفتگو بھی کافی حد تک بے سروپا تھی۔ لیکن ایک بات جو ہمارے پلے پڑی' وہ یہ تھی کہ ان کے علم جعفر کی رو سے صدر ایوب پاکستان پر آٹھ یا نو برس تک حکومت کریں گے۔

جب وہ صاحب چلے گئے تو صدر ایوب نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "یہ بڈھا کیا بک رہا تھا کہ میں آٹھ یا نو برس حکومت کروں گا۔ کیا اس کے علم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ نیا آئین نافذ ہو رہا ہے جس میں میری صدارت کی معیاد فقط دو سال اور ہے۔ اس کے بعد نئی اسمبلیاں ہوں گی اور نئے ووٹر ہوں گے۔ شاید وہ صدر بھی نیا منتخب کرنا

چاہیں۔

میرا اندازہ ہے کہ اس وقت یہ ان کی ایماندارانہ رائے تھی جو سراسر نیک نیتی پر مبنی تھی۔ لیکن اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کا رخ بدل گیا۔ اور نیک نیتی کا سارا بھرم نفسانی خواہشات' آئینی ترمیمات اور سیاسی ریشہ دوانیوں کی نذر ہو گیا۔ اس انحطاطی عمل کا آغاز بظاہر مئی ۱۹۶۴ء میں شروع ہوا۔ جب صدر ایوب نے قومی اسمبلی میں اپنے آئین میں دوسری ترمیم منظور کروانے کے لیے سر توڑ کوشش شروع کر دی۔ آئین کی رو سے صدر کے انتخاب سے پہلے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات مکمل ہونا لازمی تھے لیکن اب صدر ایوب کی نیت بدل گئی۔ ان کے ایماء پر اس بندوبست کو الٹ کرنے کے لیے جو آئینی ترمیم پیش کی گئی' اس کے خلاف قومی اسمبلی میں شدید رد عمل ہوا۔ ترمیم منظور کرنے کے لیے اسمبلی میں مطلوبہ ووٹوں کی تعداد حاصل کرنا دشوار ہو گئی' تو حکومت نے دھونس' دھاندلی' لالچ اور فریب سے کام لے کر حزب مخالف کے آٹھ اراکین کو توڑ لیا۔ اس سے قبل صدر ایوب نے بڑے اہتمام سے پولٹیکل پارٹیز ایکٹ میں یہ شرط رکھوائی تھی کہ اگر قومی یا صوبائی اسمبلی کا کوئی ممبر اپنی پارٹی چھوڑے گا تو اسے اسمبلی کی نشست سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا اور اس نشست کے لیے اسے از سر نو انتخاب لڑنا ہو گا۔ لیکن قومی اسمبلی کے آٹھ بھگوڑے ممبروں کے خلاف ایسی کوئی کارروائی عمل میں نہ لائی گئی بلکہ ان میں سے ایک کو تو بعد ازاں ہائیکورٹ کا جج بھی بنا دیا گیا۔ دوسرے سات ممبروں کو کیا انعام دیا گیا' اس کا مجھے علم نہیں۔

چنانچہ اس ترمیم کے ذریعہ اب یہ قرار پایا کہ نیا صدر منتخب ہونے تک موجودہ صدر بدستور عنان اقتدار میں رکھے گا۔ اور صدر کا انتخاب مرکزی اور صوبائی اسمبلوں کے انتخابات سے قبل عمل میں لایا جائے گا۔ بلا شبہ ان آئینی تبدیلیوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ اگلے انتخاب میں صدر ایوب کا پلہ بھاری رہے۔ صدارتی انتخاب میں دھاندلی کی راہ ہموار کرنے کے لیے آئین کی یہ توڑ مروڑ عوام کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی۔ اور صدر ایوب کے اپنے بنائے ہوئے آئین کی ان کے اپنے ہاتھوں پامالی نے ان کی ذات

پر بھرم اور بھروسے کا گراف کئی درجہ نیچے گرا دیا۔
اس ترمیم کے جلو میں اسی برس یکے بعد دیگرے دو مزید آئینی ترامیم بھی معرض وجود میں آئیں۔ ایک کے ذریعے دیہاتی سطح پر نمبرداروں' انعام داروں' سفید پوشوں اور ذیلداروں کو بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات لڑنے کا اہل قرار دے دیا گیا تا کہ حکومت کے اپنے کارندے اور حلقہ بگوش زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان اداروں میں شامل ہو سکیں۔ دوسری ترمیم سے سرکاری ملازمین کی معیاد ملازمت اور سبکدوشی کے نئے قواعد و ضوابط نافذ ہو گئے اور حکومت کی گرفت ان کی شہ رگ پر براہ راست اور بھی مضبوط ہو گئی۔ ان اقدامات سے ان شکوک و شبہات کو مزید تقویت ملی کہ صدر ایوب سیاست کے علاوہ نظم و نسق کے ہر شعبے میں بھی طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے اگلا صدارتی انتخاب ہر قیمت پر جیتنے کا جال بچھا رہے ہیں۔
ان آئینی ترامیم کے ساتھ ہی صدر کے عہدہ کے لیے انتخابی مہم پورے زور و شور سے شروع ہو گئی۔ ملک کے بہت سے سربر آوردہ صدر ایوب کی مخالفت کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ ان میں خواجہ ناظم الدین' میاں ممتاز دولتانہ' شیخ مجیب الرحمٰن' مولانا بھاشانی' خان عبدالولی خان' چوہدری محمد علی اور مولانا مودودی کے نام سر فہرست تھے۔ ان رہنماؤں کی قیادت میں کونسل مسلم لیگ' عوامی لیگ' نیشنل عوامی پارٹی' نظام اسلام پارٹی اور جماعت اسلامی کے اتحاد سے "کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز" کی تنظیم قائم ہوئی۔ جس کا واحد مقصد صدر ایوب کو صدارتی انتخابات میں شکست دینا تھی۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی اور مشترکہ لائحہ عمل یا منشور نہ تھا۔
اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے یہ لازمی تھا کہ یہ متحدہ محاذ ایک ایسا صدارتی امیدوار نامزد کرے جو ایوب خاں کو شکست دینے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ان کے سامنے ایک نام تو مس فاطمہ جناح کا تھا جو قائداعظم کی بہن ہونے کے ناطے سے ملک بھر میں ایک خاص عزت و احترام اور جذباتی قدر و منزلت کی حامل تھیں۔ دوسرا امکان جنرل محمد اعظم

خاں کے نام کا تھا۔ گورنر کے طور پر وہ مشرقی پاکستان میں نمایاں ہر دلعزیزی حاصل کر چکے تھے۔ اور وزیر مہاجرین و بحالیات کی حیثیت سے وہ مغربی پاکستان میں بھی خاصے نیک نام تھے۔ مس جناح کی جگہ اگر جنرل اعظم کو صدارتی امیدوار نامزد کیا جاتا تو یقیناً صدر ایوب کو بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا لیکن وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اس موقع پر ایک عجیب ترپ کی چال چلی۔ نیشنل عوامی پارٹی کے ایک ممتاز رکن مسٹر مسیح الرحمٰن سے ان کا گہرا یارانہ تھا۔ مسیح الرحمٰن بھٹو صاحب کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کے علاوہ مولانا بھاشانی کے دست راست بھی تھے۔ ذاتی طور پر وہ اچھی شہرت کے مالک نہ تھے۔ اور سیاست میں مول تول کرنے کے اسرار و رموز سے واقف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر بھٹو نے انہیں پانچ لاکھ روپے کے عوض خرید لیا۔ بعض ذرائع تو اس پانچ لاکھ روپے کی بانٹ میں مولانا بھاشانی کو بھی شراکت کا حصہ دار ٹھہراتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسیح الرحمٰن کے داؤ پیچ میں آ کر مولانا بھاشانی نے کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز پر شرط عائد کر دی کہ وہ صرف ایسی شخصیت کو صدارتی امیدوار نامزد کریں جس کا مارشل لاء کی حکومت سے کبھی کوئی تعلق نہ رہا ہو۔ جنرل اعظم خاں مارشل لاء کی حکومت کا ایک نہایت اہم رکن رہ چکے تھے اس لیے یہ شرط عائد ہونے کے بعد صدارتی امیدوار کی حیثیت سے ان کا نام خود بخود خارج از بحث ہو گیا۔

اسی طرح کا پیچ دار حربہ استعمال کر کے صدارتی انتخابات کے سلسلے میں مسٹر بھٹو نے صدر ایوب کی ایک اور اہم خدمت بھی سر انجام دی تھی۔ چند قانونی ماہرین کے مشورے سے کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز نے یہ خفیہ فیصلہ کیا کہ ایوب خاں کی صدارتی امیدوار کی حیثیت کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائے کیونکہ فیلڈ مارشل کے طور پر ان کی تقرری کے جو احکام جاری ہوئے تھے ان کے پیش نظر وہ آئینی طور پر کسی انتخاب میں حصہ لینے کے اہل نہیں رہے۔ اپنی قیمت وصول کر کے مسیح الرحمٰن نے متحدہ محاذ کا یہ راز

درون خانہ بھی مسٹر بھٹو پر فاش کر دیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر صدر ایوب نے فوراً اپنی تقرری کے احکامات میں موثر بر ماضی رد و بدل کر کے انہیں آئینی تقاضوں کے ہم آہنگ کر لیا۔

صدر ایوب اپنے انتخاب کی راہ میں ہر رکاوٹ کو دور کرنا اپنا حق سمجھنے لگے تھے۔ اس عمل میں ان کے نزدیک جائز یا ناجائز طریق کار کی کوئی تمیز باقی نہ رہی تھی۔ میرے خیال میں زوال کی طرف یہ ان کا ایک یقینی قدم تھا۔

صدارتی الیکشن کے دوران صدر ایوب نے دین اور دنیا دونوں سے بے دریغ فائدہ اٹھایا۔ پہلے تو ایک مشہور پیر صاحب نے اعلان فرما دیا کہ انہیں بذریعہ کشف یہ الہام ہوا ہے کہ کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل نہیں۔ اس کے بعد چند علمائے کرام نے یہ فتویٰ بھی صادر کر دیا کہ اسلام کی رو سے کسی عورت کا سربراہ مملکت کے عہدے پر فائز ہونا جائز نہیں۔ اس مسئلہ پر جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی کی یہ رائے تھی کہ اسلام میں عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی اجازت تو ہے لیکن مناسب نہیں۔ صدر ایوب کے حواریوں نے مس فاطمہ جناح کو نیچا دکھانے کے لیے حسب توفیق اسلام کا ہر ممکن استعمال یا استحصال کیا۔

صدارتی الیکشن کے دوران دین کے علاوہ دنیا بھی بے حساب کمائی اور لٹائی گئی۔ ایوب خاں کی کنونشن مسلم لیگ کے ہاتھ میں کروڑوں کا الیکشن فنڈ موجود تھا۔ اسے جمع کرنے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کئے گئے تھے۔ اکثر تاجروں اور صنعت کاروں کو امپورٹ لائسنسوں پر مقررہ شرح سے الیکشن فنڈ میں چندہ دینا ہوتا تھا۔ کچھ لائسنس فرضی ناموں پر جاری کر کے بھاری قیمت پر ضرورت مند تاجروں اور صنعت کاروں کے ہاتھ فروخت کر دیئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ پٹ سن کے کارخانوں اور سوتی اور اونی ٹیکسٹائل ملوں سے بھی بھاری بھرکم چندے وصول کئے گئے تھے۔ اس بہتی گنگا میں ہر کوئی ننگا اشنان کر رہا تھا اور بہت سے کارکن اپنا اپنا ہاتھ رنگنے میں نہایت بے حجابی سے سر عام مصروف تھے۔ صدر ایوب کے صدارتی انتخاب کی مہم میں پیسے کی ریل پیل نے

سیاسی گلن اور سڑن کو ایسا فروغ بخشا جس کی مثال ہماری تاریخ میں پہلے نہیں ملتی۔
انہوں نے سیاست کی تطہیر کی خاطر پوری فوج کے ساتھ سیاستدانوں پر چڑھائی کی تھی۔

اور اب ان کی پارٹی خود ہی الیکشن کے تالاب میں گندی مچھلی کا روایتی کردار ادا کرنے میں سرگرم عمل تھی۔

الیکشن کے بعد ۳ جنوری ۱۹۶۵ء کو جب نتیجہ برآمد ہوا تو صدر ایوب کے حق میں ۴۹۶۴۷ ووٹ اور مس فاطمہ جناح کے حق میں ۲۸۳۴۵ ووٹوں کا اعلان ہوا۔ بظاہر ایوب خاں صاحب ۲۱۳۰۲ ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئے تھے لیکن اس تعداد سے کئی گنا زیادہ عوام کی نظر میں دراصل وہ بازی ہار بیٹھے تھے۔ کیونکہ اب وہ اس طرح کا امیج لے کر نہیں ابھرے تھے جس کے ساتھ وہ پہلے پہل اقتدار میں آئے تھے۔

انتخاب میں ڈھاکہ اور کراچی نے بھاری اکثریت سے صدر ایوب کے خلاف ووٹ ڈالے تھے۔ ڈھاکہ کے متعلق تو وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ لیکن کراچی میں ان کے فرزند دلپذیر گوہر ایوب نے اہالیان شہر کی گوشمالی کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ ۵ جنوری کو جشن فتحیابی کے نام پر کراچی میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔ جس کی قیادت گوہر ایوب کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے جلو میں سڑکوں' جیپوں' ویگنوں' بسوں اور رکشاؤں کی طویل قطار تھی۔ ان سب کے ڈرائیور اور سواریاں زیادہ تر پٹھانوں پر مشتمل تھیں۔ صدارتی الیکشن سے کئی ماہ قبل کراچی میں ضلع ہزارہ کے پٹھانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی اور جشن فتح یابی کے روز وہ شہر کی فضا پر ایک دہشتناک غبار کی طرح چھائے ہوئے تھے۔
لیاقت آباد اور چند دوسرے علاقوں میں جلوس اور شہریوں کے درمیان کچھ جھڑپیں ہوئیں۔
اس کا بدلہ چکانے کے لیے رات کے اندھیرے میں ان بستیوں پر شدید حملے کئے گئے۔
آگ لگائی گئی اور کافی جانی اور مالی نقصان پہنچایا گیا۔ اس نقصان کا صحیح اندازہ کسی کو نہیں لیکن "شہیدان لیاقت آباد" کی یاد منانے کے لیے ہر سال ۵ جنوری کو ایک تقریب منائی جانے لگی۔ کئی روز تک کراچی میں خوف و ہراس طاری رہا۔ اور پٹھانوں اور مہاجرین

کے درمیان شدید کشیدگی پیدا ہو گئی۔ کچھ راویوں کے مطابق اس زمانے میں ایک بار پھر ہندو مسلم فسادات کے واقعات کی یاد تازہ ہو گئی۔ صدارتی انتخاب جیتنے کے فوراً بعد یہ صورت حال صدر ایوب کے نئے دور حکومت کے لیے صریحاً ایک شدید بد شگونی کی علامت تھی۔

گندھارا انڈسٹریز کے بعد گوہر ایوب کا یہ دوسرا شگوفہ تھا جس نے صدر ایوب کی ساکھ پر بدنامی' بد سگالی' بد فالی اور نحوست کی گہری دھول اڑائی۔ اس کارنامے کے بعد اس فرزند دلپذیر نے مزید کل پرزے نکالنا شروع کیے جس سے بادی النظر میں یہ گمان گزرتا تھا کہ شاید صدر ایوب اس برخوردار کو اپنی ولی عہدی کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ کراچی کے نظم و نسق میں بڑی حد تک دخیل ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب انہیں کراچی مسلم لیگ کی رابطہ کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا گیا تو فی الفور یہ افواہ پھیل گئی کہ اس تقرری کے پردے میں اس نوجوان کو اگلا صدارتی انتخاب لڑنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ کراچی میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جن کے دل میں گوہر ایوب کے خلاف غم و غصے کی آگ پہلے ہی سے سلگ رہی تھی۔ اس افواہ نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ اس صورت حال کا علم نہ صدر ایوب کو تھا نہ گوہر ایوب کو۔ کیونکہ بیشتر سرکاری اور سیاسی ادارے ان دونوں کی خوشامد اور چاپلوسی میں لگے ہوئے تھے۔ اہالیان کراچی کی آشفتگی' برہمی اور جھلاہٹ کا بھانڈا اس وقت پھوٹا' جب رمضان المبارک کے پہلے جمعہ کے موقع پر گوہر ایوب نے کراچی کی میمن مسجد میں تقریر کرنے کی کوشش کی۔ اس پر مسجد میں زبردست ہنگامہ ہو گیا۔ لوگوں نے تقریر سننے سے صاف انکار کر دیا۔ کسی قدر ہاتھا پائی بھی ہوئی۔ اور گوہر ایوب کو بمشکل پولیس کی حفاظت میں مسجد سے باہر لایا گیا۔ اس احتجاجی واقعہ نے ایک طرف گوہر ایوب کی بڑھتی ہوئی توقعات اور خواہشات کی بساط الٹ دی۔ دوسری جانب صدر ایوب کے اقتدار کی سیڑھی کے پائیدان کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

یوں بھی اقتدار کی سیڑھی کے اس پائیدان میں پہلے ہی سے بہت سی دراڑیں پڑ چکی تھیں۔
میمن مسجد والے حادثہ سے تقریباً چار ماہ قبل کراچی میں ایک اور واقعہ بھی رونما ہو چکا تھا۔

جولائی ۱۹۶۷ء میں مادر ملت مس فاطمہ جناح کی وفات پر کراچی میں لاکھوں شہری ان کے جنازے میں شامل ہوئے۔ جلوس کے ایک حصے نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ کچھ نعرے حکومت کے خلاف بلند ہوئے۔ کچھ نعروں میں "ایوب خاں مردہ باد" کہا گیا۔ اس پر پولیس کی مشینری حرکت میں آئی اور لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے علاوہ گولی بھی چلائی گئی۔ مرنے والوں کی صحیح تعداد مصدقہ طور پر کبھی متعین نہیں ہوئی لیکن خون کی جس قدر مقدار بھی اس موقع پر بہائی گئی بلا شبہ اس نے صدر ایوب کے زوال کی راہ ہموار کرنے میں بد نصیبی کا چھڑکاؤ کیا۔

کراچی کی میمن مسجد میں گوہر ایوب کو جو سانحہ پیش آیا تھا' اس کے بعد پے در پے بدفال واقعات کا ایسا تانتا بندھ گیا جس نے صدر ایوب کے راج سنگھاسن کو نہایت بری طرح ڈگمگا کے رکھ دیا۔ دسمبر ۱۹۶۷ء کے آخری حصے میں وہ مشرقی پاکستان کے دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ میں بھی اسی سلسلہ میں ڈھاکہ گیا ہوا تھا۔ یکایک خبر اڑی کہ صدر ایوب کو اغوا کر کے انہیں قتل کرنے کی سازش پکڑی گئی ہے۔ اس خبر کے پھیلتے ہی صدر کی ذاتی حفاظت کا انتظام کئی گنا زیادہ سخت کر دیا گیا اور ڈھاکہ میں ایوان صدر پر پولیس اور فوجی گارد بھی غیر معمولی طور پر بٹھا دی گئی۔

انہی دنوں صدر ایوب کے احکام پر میں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کی یونیورسٹیوں سے پولٹیکل سائنس کے بہت سے اساتذہ کو ڈھاکہ میں جمع کر رکھا تھا۔ کیونکہ صدر ان کے ساتھ قومی اتحاد اور سالمیت کے موضوع پر تبادلہ خیالات کرنے کے خواہشمند تھے۔
مقررہ وقت پر ہم سب ایوان صدر کے وسیع برآمدہ میں جمع ہو کر بیٹھ گئے۔ میں صدر کو بلانے کے لیے اندر گیا تو ڈرائنگ روم میں عجب سماں دیکھنے میں آیا۔ ایک صوفے پر صدر ایوب سراسیمگی کے عالم میں بیٹھے ہوئے گورنر عبدالمنعم خاں کے ساتھ سرگوشیاں

کر رہے تھے۔ دوسری جانب چند وزرائے کرام ایک دوسرے کے ساتھ کانا پھوسیوں میں مصروف تھے۔ تیسری طرف فوج اور سول انٹیلی جنس کے دو تین اعلیٰ افسر اسی طرح سر سے سر جوڑے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی صدر ایوب نے کہا۔ "کیا یہ میٹنگ ملتوی نہیں کی جا سکتی؟"

میں نے جواب دیا کہ کئی پروفیسر صاحبان دور دراز مقامات سے آئے ہوئے ہیں اور آج شام یا کل صبح واپس جانے کے لیے بکنگ کروائے بیٹھے ہیں۔ اگر یہ میٹنگ آج نہ ہوئی تو انہیں مایوسی ہو گی۔

صدر ایوب نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں صرف چند منٹ کے لیے آ جاؤں گا۔ زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہو گا۔ باقی بحث مباحثہ تم لوگ خود کرتے رہنا۔"

پولٹیکل سائنس کے پروفیسروں اور کچھ صحافیوں کی ملی جلی میٹنگ میں آ کر صدر نے مختصر طور پر چند اکھڑی اکھڑی سی باتیں کیں۔ اور پھر نہایت عجلت کے ساتھ گورنر عبدالمنعم خاں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گورنر ہاؤس روانہ ہو گئے۔

اسی رات گورنر ہاؤس میں صدر کے اعزاز میں ایک پر تکلف عشائیہ تھا۔ معمول کے مطابق مہمانوں کا ہجوم تھا لیکن سارے مجمع پر ایک پر اسرار سی مردنی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ہوئے آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔

اپنی عادت کے خلاف صدر ایوب دو گھنٹے سے زیادہ تاخیر کے بعد دعوت میں تشریف لائے۔ اس وقت بھی ان کے چہرے پر کسی قدر تھکاوٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ آج ہی اگرتلہ سازش کا راز ان پر فاش ہوا ہے اور وہ صبح سے شام تک اس سازش کی تفصیلات کا جائزہ لینے میں مصروف رہے ہیں۔

جنوری ۱۹۶۸ء کے اوائل میں اس سازش کا سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا۔ سازش میں شیخ مجیب الرحمٰن کے علاوہ ۲۸ دیگر افراد ملوث تھے۔ ان پر یہ الزام تھا کہ ڈھاکہ میں بھارتی سفارتی مشن کے فرسٹ سیکرٹری پی این اوجھا کے زیر اہتمام یہ لوگ ہندوستانی عناصر کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کی سازش میں مصروف عمل تھے۔ اس

مقصد کے لیے اگرتلہ (بھارت) میں ایک مرکز قائم کیا گیا تھا جہاں سے علیحدگی کی تحریک کو اسلحہ اور دوسرا تخریبی مواد فراہم کیا جاتا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن تو پہلے ہی مئی ۱۹۶۶ء سے اپنے چھ نکاتی پروگرام کی پاداش میں ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت جیل میں تھے۔ لیکن اب انہیں اگرتلہ سازش کیس میں ملزم کے طور پر از سر نو گرفتار گروانا گیا۔

اگرتلہ سازش کے مقدمہ کی سماعت کے لیے ایک خصوصی ٹریبونل قائم کیا گیا۔ جس کے سربراہ پاکستان کے ایک سابق چیف جسٹس مسٹر ایس اے رحمان تھے۔ سترہ برس قبل ۱۹۵۱ء میں بھی راولپنڈی سازش کیس کے لیے ایک خصوصی ٹریبونل قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اس مقدمے کی سماعت کھلی عدالت میں نہیں بلکہ بہ صیغہ راز ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اگرتلہ سازش کیس کی سماعت کھلی عدالت میں رکھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سماعت کے دوران مشرقی پاکستان کی علیحدگی اس کے الگ نام، پرچم اور قومی ترانے تک کی تفصیلات کھل کر بر سر عام آ گئیں۔ اور علیحدگی پسند عناصر کو اپنی جائز اور ناجائز شکایتوں کی تشہیر کا بھی ایک نادر موقع ہاتھ آ گیا۔ جس کر و فر سے یہ سب تفصیلات اخبارات میں اچھالی جاتی تھیں۔ اس کے دو پہلو تھے۔ ایک پہلو یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے خلاف نفرت بڑھتی تھی اور صدر ایوب کی مرکزی حکومت پر اعتماد کمزور پڑ جاتا تھا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ علیحدگی کے جراثیم عوام کے ذہن میں جڑ پکڑتے گئے اور شیخ مجیب الرحمٰن کی قیادت کو بیٹھے بٹھائے انتہائی فروغ حاصل ہو گیا۔ بلا شبہ اگرتلہ سازش کا مقدمہ صحیح حقائق و شواہد پر مبنی تھا۔ لیکن جس طور پر اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ سے اس مقدمے کی پبلٹی اور تشہیر ہوئی اس نے اس کے حقائق کو سیاسی اور عوامی ہیجان کی دلدل میں ملیا میٹ کر دیا۔ یہ ہیجان اس قدر شدید تھا کہ ایک روز ڈھاکہ کے ایک بے قابو ہجوم نے اس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پر حملہ کر دیا جس میں اگرتیلہ سازش کیس ٹریبونل کے سربراہ جسٹس ایس اے رحمان قیام پذیر تھے۔ انہوں نے بمشکل تمام ایک

وفادار بنگالی خدمت گار کی کوٹھڑی میں روپوش ہو کر اپنی جان بچائی۔ اور پھر چپکے چپکے پوشیدہ طور پر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر لاہور واپس چلے آئے۔

۲۹ جنوری ۱۹۶۸ء کے روز اردن کے شاہ حسین کراچی آئے ہوئے تھے۔ اسی شام راولپنڈی کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں ان کا عشائیہ تھا۔ صدر ایوب جب ہوٹل پہنچے تو ان کا رکھ رکھاؤ اور چہرہ مہرہ ان کے معمول کے حساب سے نارمل نظر نہ آتا تھا۔ دعوت کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے وہ سیدھے بار (شراب خانہ) گئے اور ایک گلاس میں بہت سی وہسکی ڈلوا کر پانی یا سوڈا واٹر ملائے بغیر اسے ایک ہی سانس میں غٹ غٹ چڑھا گئے۔ اس کے بعد یہی عمل انہوں نے چند بار دہرایا۔ شراب وہ ضرور پیتے تھے لیکن اس طرح کھڑے کھڑے ندیدوں کی طرح نیٹ وہسکی کے گلاس پر گلاس چڑھانا ان کا دستور نہ تھا۔ ہوٹل کی بار میں اس طرح کئی گلاس پینے کے بعد ان کی آواز کس قدر خمار آلود ہو گئی۔ کھانے کے بعد جب وہ پہلے سے تیار کردہ لکھی ہوئی تقریر پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو غالباً ان کا عارضہ قلب ان کی رگ و پے میں کسی نہ کسی صورت میں رینگنا شروع ہو چکا تھا۔ ان کی طبیعت ہرگز ٹھکانے نہ تھی۔ یہاں تک کہ اپنی تقریر پڑھتے پڑھتے وہ بیک بار اس کے دو ورق الٹ گئے۔ اور انہیں اپنی اس غلطی اور بے ربطی کا احساس تک نہ ہوا۔ اور وہ بدستور آگے پڑھتے چلے گئے۔ دعوت ختم ہونے کے بعد جب وہ ایوان صدر واپس گئے' تو اسی رات ان پر نہایت شدید ہارٹ اٹیک ہوا۔

صدر ایوب کی علالت کی خبر ملتے ہی راتوں رات کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خاں اور وزیر دفاع ایڈمرل اے آر خاں نے مل کر ایوان صدر پر قبضہ جما لیا۔ پریذیڈنٹ ہاؤس کا صدر دروازہ بند کر دیا گیا۔ اور گارد کے سپاہیوں کو حکم ہو گیا کہ فوجی عملے کے چند مخصوص افراد کے علاوہ کسی اور شخص کو ایوان صدر میں داخل ہونے کی بالکل اجازت نہ دی جائے۔

اگلی صبح آٹھ بجے کابینہ کے سینئر وزیر خواجہ شہاب الدین کا انٹرویو صدر کے ساتھ پہلے

سے مقرر تھا۔ پونے آٹھ بجے خواجہ صاحب اپنی کار پر جھنڈا لہراتے ایوان صدر کے گیٹ پر پہنچے تو اسے بند پایا۔ گارد کے سپاہیوں نے انہیں باہر ہی باہر سے واپس لوٹا دیا۔ کیونکہ اندر داخل ہونے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ خواجہ صاحب اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئے۔ انہوں نے ایک بار مجھے بتایا تھا' کہ یہ صورت حال دیکھ کر معاً انہیں یہ شک گزرا کہ شاید راتوں رات کسی نوعیت کا ناگہانی انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ اور اب صدر ایوب معزول ہو کر ایوان صدر میں محبوس یا مقتول پڑے ہیں۔

اس قسم کے شک میں مبتلا ہونے والوں میں تنہا خواب شہاب الدین ہی شامل نہ تھے' جو سینئر وزیر ہونے کی حیثیت سے قریب قریب وزیراعظم کا درجہ رکھتے تھے۔ بلکہ ایوان صدر کی چار دیواری کے اندر بسنے والی مخلوق کے کچھ افراد بھی ایسے ہی وہم و گمان کا شکار تھے۔ اس روز صبح سویرے ایوان صدر کا ایک ڈرائیور محفوظ علی میرے پاس آیا۔ اللہ اسے غریق رحمت کرے۔ مرحوم کئی برس پہلے میرے ساتھ بھی کام کر چکا تھا۔ اس روز وہ گھبرایا ہوا اور کسی قدر پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے نہایت رازداری سے مجھے بتایا' کہ رات بھر ایوان صدر میں قیامت کا سا سماں رہا ہے۔ بیگم ایوب سمیت سب بیٹے اور بیٹیاں غمگین' پریشان اور گم سم ہیں۔ ڈاکٹروں کے آنے جانے کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ کچھ مشینیں بھی لائی گئی ہیں۔ چار دیواری کے سارے گیٹ بند کر کے قفل چڑھا دیئے گئے ہیں۔ جنرل یحیٰی اور ایڈمرل اے آر خاں بار بار آ کر کھسر پھسر کرتے ہیں۔ ڈرائیور نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "صاحب ہمیں تو یہ بھی یقین نہیں کہ صدر صاحب زندہ ہیں یا مر چکے ہیں یا مار ڈالے گئے ہیں۔ ہاں ہم یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ صدر کے مکان پر اب چیف صاحب کا قبضہ ہے۔"

یہ باتیں سن کر میں نے فوراً ایوان صدر ٹیلیفون کیا اور ملٹری سیکرٹری یا کسی اے ڈی سی سے بات کرنا چاہی۔ آپریٹر مجھے پہچانتا تھا۔ اس نے معنی خیز انداز میں بتایا کہ آج سب نمبر مصروف ہیں۔ کسی اور روز ان سے بات کریں۔

اس جواب پر میرے دل میں بھی یہ شبہ پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو صدر ایوب بیماری کے پردے میں کسی اور آفت کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں۔ صحیح واقعات معلوم کرنے کے لیے

میں اسی روز وزارت اطلاعات و نشریات کے سیکرٹری الطاف گوہر کے پاس پہنچا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ہم سب کی طرح ایوان صدر کے اندرونی حالات سے وہ بھی قطعی طور پر لا علم ہیں۔

شروع میں ہر طرف طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ سب کو یہ معلوم گیا کہ جناب صدر واقعی شدید بیمار ہیں۔ ان کی بیماری کی نوعیت پر پردہ ڈالنے کی غرض سے سرکاری سطح پر انواع و اقسام کے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے ہیں لیکن یہ سب حربے بے سود ثابت ہوئے۔ چند روز بعد جب صدر کی صحت کے بارے میں میڈیکل بلیٹن جاری ہونا شروع ہوئے تو یہ اس قدر سطحی' جھرجھرے اور بعض اوقات خود تردیدی ہوتے تھے کہ کسی کو ان کی صداقت پر یقین نہ آتا تھا۔ چاروں طرف افواہوں کی بھرمار تھی۔ اور ہر شخص اپنی پسند کی افواہ کو اپنی آرزومندی کے سانچے میں ڈھال کر مزید قیاس آرائیاں اڑانے اور پھیلانے میں مکمل طور پر آزاد تھا۔

صدر ایوب کی بیماری کے پہلے سات آٹھ روز انتہائی خطرناک اور غیر یقینی تھے۔ جب تک وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار رہے' جنرل یحییٰ خاں نے ان کا رشتہ بیرونی دنیا سے پوری طرح منقطع رکھا اور صدر کی ذات اور ایوان دونوں پر اپنا تصرف مکمل طور پر جمائے رکھا۔ اس پورے عرصہ کے دوران کسی سویلین کو ایوان صدر کے بیرونی احاطے کی دیوار تک چھونے کی اجازت نہ تھی لیکن جب ان کی حالت کسی قدر سنبھل گئی اور فوری موت کا خطرہ سر سے ٹلتا ہوا نظر آنے لگا تو یہ پابندیاں بھی کسی حد تک نرم پڑ گئیں۔ چنانچہ دسویں روز صدر ایوب کی خواہش پر محمد بشیر خالد صاحب پہلے سویلین تھے جنہیں چند منٹ کے لیے ان کے ساتھ ملاقات کی اجازت ملی۔ اس زمانے میں وہ پرسنل اسسٹنٹ کے طور پر صدر کے خصوصی معتمد تھے۔ بعد ازاں تہران میں آر سی ڈی

کے ثقافتی ادارے میں ڈپٹی ڈائریکٹر رہے۔ اور آج کل وفاقی وزارت ثقافت میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہیں۔ غالباً صدر ایوب کو اس احساس نے ستانا شروع کر دیا تھا کہ بیماری شروع ہونے کے بعد سے اب تک انہیں پاکستان کی سول حکومت کے ہر فرد و بشر سے خاص طور پر جان بوجھ کر زبردستی مطلقاً الگ تھلگ رکھا گیا ہے۔ اس لیے اپنے اختیار و اقتدار کو آزمانے یا شاید از سر نو جمانے کا مظاہرہ کرنے کی خاطر انہوں نے اصرار کر کے خالد صاحب کو ملاقات کے لیے طلب کیا تھا۔

انہی دنوں اچانک یہ افواہ بڑی تیزی سے گردش کرنے لگی کہ صدر ایوب پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور وہ اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے ہیں۔ اس افواہ کی تردید ایک تصویر سے کر دی گئی جو تقریباً تمام اخبارات میں شائع ہوئی۔ تصویر میں صدر ایوب ڈریسنگ گاؤن پہنے مغربی پاکستان کے گورنر جنرل موسیٰ کے ساتھ گفتگو میں مصروف دکھائے گئے۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ اس تصویر کو جعلی شعبدہ بازی سمجھ کر اسی خوش فہمی میں رہنے پر مصر تھے کہ مفلوج ہو کر صدر ایوب اب کسی کام کے نہیں رہے۔

لیکن ایسے حلقوں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی جب یکم اپریل ۱۹۶۸ء سے صدر ایوب نے قوم کے نام ریڈیو اور ٹی وی سے اپنے ماہانہ خطاب کا سلسلہ از سر نو جاری کردیا۔ پہلے اعلان ہوا کہ ۲۳ مارچ کو یوم پاکستان کے موقع پر مسلح افواج کی پریڈ کی سلامی بھی وہ خود ہی لیں گے۔ لیکن ناتوانی کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے۔ اس روز پریڈ کی سلامی وزیر دفاع ایڈمرل اے آر خاں نے لی۔ جنرل یحییٰ خان ان کے ساتھ بھیگی بلی بنے کھڑے رہے۔

بیماری سے جانبر ہو کر جب صدر ایوب دوبارہ کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے تو ان پر یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی تھی کہ ان کے اقتدار کا سرچشمہ ان کا اپنا بنایا ہوا آئین یا بنیادی جمہوریت کا نظام یا قومی اسمبلی یا مرکزی کابینہ نہیں' بلکہ ان کے صدارتی وجود اور عہدے کی شہ رگ کلیتہً کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ کی مٹھی میں ہے۔ جس آئین کے تحت انہوں نے صدارت کا حلف اٹھایا تھا' اس میں صاف طور پر درج تھا کہ

بیماری کی صورت میں اگر مملکت کا سربراہ اپنے فرائض ادا کرنے سے معذور ہو جائے تو قومی اسمبلی کا سپیکر ان کی قائم مقامی کرے گا۔ صدر ایوب ڈیڑھ دو ماہ تک صاحب فراش رہے۔ لیکن اس تمام عرصہ میں قومی اسمبلی کے سپیکر عبدالجبار خاں سے کسی نے یہ تک نہ پوچھا کہ میاں تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ بیماری کے ابتدائی چند ایام میں جب صدر ایوب زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہے تھے' اس وقت جنرل یحیٰی خاں ان کے تن بدن پر بنفس نفیس منڈلاتے رہے کہ جونہی یہ ٹھنڈا ہو تو وہ فوراً گدھ کی طرح اس پر جھپٹیں۔ ان کی یہ امید تو بر نہ آئی لیکن موت کا خطرہ ٹلنے کے باوجود صدر ایوب مزید پانچ چھ ہفتے اپنے فرائض منصبی سر انجام دینے سے قطعاً معذور رہے۔
اس طویل عرصہ میں انہوں نے ایک بار بھی ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہ کیا کہ اپنے نافذ کردہ آئین کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر وہ قومی اسمبلی کے سپیکر کو چند روز کے لیے اپنی قائم مقامی کا موقع عطا فرما دیں۔ یا ممکن ہے کہ جنرل یحیٰی کے تیور دیکھ کر وہ اس طرح کا کوئی ارادہ زبان پر لانے ہی سے باز رہے ہوں۔
بیماری سے اٹھنے کے بعد ڈاکٹروں نے صدر ایوب کو دن میں چند بار دواؤں کی متعدد گولیاں پابندی سے کھانے پر لگا دیا تھا۔ غالباً ان میں کچھ سکون آور دواؤں (Tranquilizer) کا عنصر بھی شامل تھا۔ جس کی وجہ سے ان پر ہمہ وقت کسی قدر غنودگی' آلکس اور سستی سی چھائی رہتی تھی۔ امور سلطنت میں ان کی روایتی سوجھ بوجھ' اثر پذیری اور ذہنی رد عمل کی صلاحیت بڑی حد تک ماند پڑ گئی تھی۔ اور کئی معاملات میں صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی قوت فیصلہ بھی کسی قدر متاثر ہوئی ہے۔ یہ حالت تین چار ماہ کے قریب رہی۔ اس کے بعد جولائی کے مہینے میں وہ لندن گئے۔ کچھ علاج معالجہ ہوا۔ چند روز مضافات میں ایک خوبصورت مقام پر آرام فرمایا۔ اور جب وہ واپس لوٹے تو ان کی خود اعتمادی اور صحت پوری طرح بحال ہو چکی تھی۔ اسلام آباد میں چند وزیروں کی ایک محفل میں انہوں نے اپنی صحت کے متعلق استفسار کے جواب میں انتہائی خود اعتمادی سے کہا۔ "نامی گرامی ڈاکٹروں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اگر میں مناسب احتیاط سے کام لوں تو مزید

پچیس برس تک اس عہدے کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔"

اسی زمانے میں صدر ایوب کے دور کی ترقی کا دس سالہ جشن بھی اپنے عروج پر تھا۔ یہ کارروائی ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۷ء سے شروع ہو چکی تھی اور اس تقریب کو مسلسل ایک برس تک منایا گیا۔ سرکاری دفتروں میں اسٹیشنری سے لے کر ریڈیو' ٹیلیویژن' اخبارات اور نشر و اشاعت کے دیگر تمام ذرائع بھی سال بھر اسی جشن کا اشتہار بنے رہے۔ تمام سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی پیشانی پر ایک ہی نعرہ ثبت تھا۔

The Great Decade of Development and Reform

اخبارات باری باری اپنے ضمیمے شائع کرتے تھے۔ جن میں بینکوں' زراعت' آبپاشی' ریلوے' جہاز رانی' تجارت' صنعت و حرفت کے علاوہ سیاست' ثقافت' آئین اور نظم و نسق کے جملہ شعبوں میں تعمیر و ترقی کے تفصیلی نقوش اجاگر کئے جاتے تھے۔ بعض اخبارات کے ایک ایک شمارے میں اکثر و بیشتر صدر ایوب کی آٹھ یا دس یا اس سے بھی زیادہ تصاویر شائع ہوتی تھیں۔ شروع شروع میں کچھ لوگوں نے ایک معقول حد تک تو اس مہم میں دلچسپی کا اظہار کیا لیکن جب یہ سلسلہ حد سے زیادہ دراز ہوتا چلا گیا اور دن رات چاروں طرف یہی ڈھنڈورہ پیٹنے کی آواز سنائی دینے لگی' تو لوگ اس سے تنگ آ کر اکتا گئے۔ رفتہ رفتہ اس کا مذاق اڑنے لگا۔ اور اس پر طرح طرح کی پھبتیاں کسی جانے لگیں۔ اس پر بھی یہ مہم بدستور جاری رہی۔ تو لوگ اس سے چڑنے اور گھن کھانے لگے۔ جس زمانے میں یہ مہم ایوب خاں کے دور کی برکتوں کے قصیدے الاپنے میں مصروف تھے۔ بد قسمتی سے اسی زمانے میں آٹا' چاول' چینی اور دالوں کے دوسری بہت سی اشیائے خورد کی قیمتوں میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ گرانی کے علاوہ ان اشیاء کی قلت بھی بار بار رونما ہونا شروع ہو گئی تھی۔ خاص طور پر کراچی میں آٹا اور میدہ کی قیمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہاں کی بیکریوں نے ایک روز احتجاج کے طور پر مکمل ہڑتال کر دی۔ چینی کی شدید گرانی اور قلت کے پیش نظر کراچی اور لاہور میں چینی کی راشن بندی کر دی گئی۔ مرکزی وزیر تجارت نواب عبدالغفور خاں ہوتی کے اس اقدام پر بہت

سی الزام تراشیاں ہوئیں۔ اور عوام الناس میں ان کا لقب "چینی چور" مشہور ہو گیا۔ یوں بھی عوام میں ان پر کئی طرح کے آوازے کسے جانے لگے۔ ایک آوازہ جس نے کافی زور پکڑا' یہ تھا۔ "عبدالغفور ہوتی ------ ایوب خاں دی کھوتی" ڈھاکہ میں لوگوں نے شہید مینار کے سامنے ایک خستہ حال ہڈیوں کا انسانی ڈھانچہ آویزاں کر رکھا تھا جو ترقی و اصلاحات کے جشن کا دن رات منہ چڑاتا رہتا تھا۔

اشیاء کی گرانی اور قلت کے ان ہنگاموں میں ایوبی دور کے دس سالہ کارناموں کا ذکر بے معنی نظر آنے لگا۔ اور جس حد تک وہ نیک نامی' عزت اور وقعت کے جائز طور پر مستحق تھے' وہ بھی انہیں خاطر خواہ طور پر نصیب نہ ہو سکی۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو عرصہ سے موقع کی تاک میں بیٹھے تھے۔ لوہا گرم دیکھ کر انہوں نے ہتھوڑے کی ضرب لگائی اور صدر ایوب کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کر دیا۔ ماحول کی سازگاری کے علاوہ انہیں جی ایچ کیو کے چند عناصر کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ ان میں جنرل یحییٰ خاں کے دست راست میجر جنرل پیر زادہ کا نام سر فہرست تھا۔ یہ صاحب ایک زمانے میں صدر ایوب کے ملٹری سیکرٹری رہ چکے تھے۔ وہاں پر انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تو صدر ایوب نے انہیں واپس جی ایچ کیو بھیج دیا۔ اس پر پیرزادہ صاحب صدر سے ناراض ہو گئے اور ان کے خلاف اپنے دل میں شتر کینہ پال کر ان سے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ مسٹر بھٹو کے ساتھ ان کی پہلے سے کچھ راہ و رسم تھی۔ اب پیر زادہ نے اپنے ہتھکنڈوں سے ان پر یہ بات واضح کر دی کہ اگر انہوں نے صدر ایوب کے خلاف کوئی تحریک شروع کی تو وہ اس مہم میں تنہا نہ ہوں گے بلکہ پاکستانی فوج کا ایک بڑا عنصر بھی ان کی پشت پر ہو گا۔ اس ملی بھگت سے پیر زادہ کا مقصد مسٹر بھٹو کو بر سر اقتدار لانا نہیں تھا بلکہ ایوب خاں کے زوال کی خاطر انہیں ایک کٹھ پتلی کی طرح استعمال کر کے جنرل یحییٰ کی راہ ہموار کرنا تھا۔ اس قسم کی شاطرانہ دو رخی میجر جنرل پیر زادہ کی عیاری اور زمانہ سازی کا طرۂ امتیاز تھی۔ جب صدر ایوب انہیں اپنا ملٹری سیکرٹری بنا کر ایوان صدر میں لا رہے تھے' تو ایک روز میں نے ان سے پوچھا تھا۔ "نیا ملٹری سیکرٹری کیسا

شخص ہے؟" صدر ایوب نے مسکرا کر جواب دیا۔ "کھچرا آدمی ہے۔" پنجابی زبان کی یہ فصیح و بلیغ اصطلاح میجر جنرل پیر زادہ کی ذات پر یوں چسپاں ہوتی ہے جیسے دنبے کے بدن پر کھال مڑھ ہوئی ہوتی ہے۔

چنانچہ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۸ء کے روز مسٹر بھٹو نے حیدر آباد (سندھ) میں ایک جلسہ عام منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جلسہ عام کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ تو لوگ جوق در جوق ایک پرائیویٹ احاطے میں جمع ہو گئے۔ وہاں پر بھٹو صاحب نے ایک تیز و تند تقریر میں قسم کھائی کہ وہ صدر ایوب کو مسند اقتدار سے اتارے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ انہوں نے ایوبی دور حکومت پر شدید نکتہ چینی کے علاوہ صدر ایوب کی ذات پر بھی بزدلی' بد دیانتی' خیانت' اقرباء پروری اور سیاسی بد نیتی کے بے شمار الزام لگائے۔ اس کے بعد مسٹر بھٹو کی ہر تقریر میں ان دھمکیوں اور الزامات کے علاوہ معاہدہ تاشقند پر بھی نہایت کڑی تنقید ہوتی تھی اور وہ ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کرتے تھے کہ وہ عنقریب اس معاہدہ کی چند ایسی خفیہ شقوں کا بھانڈہ پھوڑنے والے ہیں جو انتہائی چالاکی سے اب تک صیغہ راز میں رکھی گئی ہیں۔ اس الزام تراشی کا جواب دینے کے لیے سوویت یونین نے صدر ایوب کے حق میں ایک غیر معمولی حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ روس کی سرکاری خبر رساں ایجنسی "تاس" نے یہ تردید شائع کی کہ معاہدہ تاشقند میں کسی قسم کی کوئی خفیہ شق ہی موجود نہیں ہے۔ لیکن لوگوں نے اس تردید کو کوئی وقعت نہ دی۔ چاروں طرف بھٹو صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کا منہ بند کرنے کے لیے صوبائی اور مرکزی حکومت نے طرح طرح کے حربے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ مغربی پاکستان کے گورنر جنرل موسیٰ اور کئی وزیروں نے پہلے تو دھمکی آمیز اور جارحانہ تقریروں سے مسٹر بھٹو کو دبانا چاہا۔ جب اس سے کام نہ بنا تو لاڑکانہ اور سکھر کی عدالتوں میں ان کے خلاف اراضیات وغیرہ کے متعلق تفتیشات اور مقدمات دائر کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے علاوہ مغربی پاکستان کے غنڈہ آرڈیننس میں ایک ایسی ترمیم لائی گئی جس کی رو سے تقریباً ۲۶ قسم کے مختلف افراد "غنڈہ" کے زمرہ

میں آ گئے۔ اس ترمیم کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے ناقدین اور مخالفین کو نہایت آسانی سے غنڈہ قرار دے کر قانون کے شکنجہ میں لایا جا سکے۔ شروع شروع میں مسٹر بھٹو کے کچھ ساتھی اس آرڈی ننس کی زد میں آئے لیکن یہ حربہ بھی زیادہ موثر ثابت نہ ہو سکا۔ کیونکہ ملک میں طلباء کی بڑھتی ہوئی بد نظمی اور بد امنی دن بہ دن اپنا رنگ لا رہی تھی۔ ۱۹۶۸ء کے وسط ہی سے طالب علموں کی ہنگامہ آرائی اپنے زوروں پر تھی اور اکثر سکول اور کالج زیادہ تر بند رہتے تھے۔ اس وجہ سے پرائیویٹ اداروں کے اساتذہ کی اکثریت بھی اپنی تنخواہوں سے محروم رہتی تھی۔ تنگدستی سے مجبور ہو کر وہ بھی طلباء اور عوام کے احتجاجی مظاہروں میں برضا و رغبت شریک ہونے لگے۔ اور ان کی دیکھا دیکھی بہت سے دوسرے شعبوں اور اداروں کے محنت کشوں کی دلچسپی اور ہمدردی بھی صدر ایوب کے خلاف پھیلتی ہوئی فضا میں شامل ہوتی گئی۔

پھر اچانک ۷ نومبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی میں ایک المناک واقعہ رونما ہوا۔ طلباء کا ایک گروپ طورخم وغیرہ کی سیاحت سے واپس آ رہا تھا۔ راولپنڈی پولی ٹیکنیک پہنچتے ہی پولیس نے انہیں روکا اور الزام لگایا کہ وہ لنڈی کوتل کی باڑہ مارکیٹ سے بہت سا سامان اسمگل کر رہے ہیں۔ اس لیے ان کی تلاشی لی جائے گی۔ یہ ایک بندھا بندھایا معمول تھا کہ بہت سے سیاح لنڈی کوتل کے باڑہ بازار سے کچھ خرید و فروخت کا سامان اپنے ساتھ لایا کرتے تھے اور ان سے کبھی کوئی باز پرس نہ کی جاتی تھی۔ اس دستور کے برعکس جب پولیس نے طلباء کی تلاشی لینے پر اصرار کیا تو انہوں نے مشتعل ہو کر ہنگامہ برپا کر دیا۔ پولی ٹیکنیک کے بہت سے طالب علم بھی اس میں شامل ہو گئے۔ پولیس نے جی بھر کر لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال کیا۔ جب اس سے صورت حال قابو میں نہ آ سکی تو انہوں نے گولی چلا دی جس سے ایک نوجوان طالب علم عبدالحمید جاں بحق ہو گیا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو برق رفتاری سے موقع واردات پر پہنچے۔ انہوں نے مرحوم عبدالحمید

کی لاش کو اس کے آبائی گاؤں پنڈی گھیپ پہنچانے کے لیے ایک زبردست جلوس ترتیب دیا۔ اس طرح راولپنڈی کے گرد و نواح میں ساٹھ ستر میل تک جس جس گلی یا گاؤں یا قریہ سے یہ ماتمی جلوس گزرا' وہاں پر صدر ایوب کی قسمت کا ستارہ ڈوبتا چلا گیا۔

یوں بھی جواں سال عبدالحمید کا خون ناحق بہتے ہی ملک کا گوشہ گوشہ بد امنی اور شورش کے لا متناہی طوفان کی زد میں آ گیا۔ ۷ نومبر ۱۹۶۸ء سے لے کر ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو صدر ایوب کی معزولی تک کوئی ایسا دن نہ گزرا جب کہیں نہ کہیں طلباء اور عوام کے جلسے' جلوس' توڑ پھوڑ' لوٹ مار' پتھراؤ' گھیراؤ یا جلاؤ وغیرہ کے واقعات رونما نہ ہوئے ہوں۔ عبدالحمید کی موت کے دوسرے روز راولپنڈی میں عوام کا غم و غصہ انتہائی شدت اختیار کر گیا۔ پولیس کی فائرنگ سے دو اور افراد موت کے گھاٹ اتر گئے۔ عوامی غیظ و غضب کے سامنے پولیس بے دست و پا ہو گئی تو امن قائم رکھنے کے لیے فوج کو میدان میں اتارا گیا۔ لیکن بہت جلد یہ راز کھل گیا کہ فوجی افسروں کو در پردہ ہدایت تھی کہ صدر ایوب کے خلاف مظاہرے کرنے والوں پر کسی قسم کی کوئی سختی نہ کی جائے۔ چنانچہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باوجود لوگ ہزاروں کی تعداد میں بھٹو صاحب کی تقریریں سننے کے لیے جلسوں اور جلوسوں میں شامل ہوتے رہے۔ انہی دنوں مختلف شہروں کی دیواروں پر ایک اشتہار چسپاں پایا گیا۔ جس میں پاکستان کی بری فوج کے کمانڈر انچیف کے نام اپیل تھی کہ ملک میں امن و سلامتی برقرار رکھنے کے لیے جنرل یحیٰی کو فوراً عنان حکومت اپنے ہاتھ میں سنبھال لینی چاہیے۔ خفیہ اداروں کے ذرائع نے انکشاف کیا کہ اس کارستانی کے پیچھے اسٹینڈرڈ بنک کے مالک مسٹر علوی کا ہاتھ ہے۔ یہ صاحب جنرل یحیٰی کے لنگوٹئے یار تھے۔ اور ان دونوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت بہت سی چہ میگوئیوں کا دل پسند موضوع تھی۔

عبدالحمید کی موت کے چار روز بعد ۱۱ نومبر کو پشاور میں صدر ایوب پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا۔ وہ ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے کہ اچانک سامعین میں سے ایک نوجوان

ہاشم نامی اٹھا اور اس نے پستول تان کر ان کی طرف دو فائر کئے۔ نشانہ خطا گیا۔ یوں بھی صدر ایوب نے اپنی فوجی مہارت سے کام لے کر ڈائس پر گولی روک کر روسٹرم کے پیچھے بر وقت پناہ لے لی تھی۔ فوج کے ایک پنشنر صوبیدار نے حملہ آور پر قابو پا کر اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس کارگزاری کے صلے میں اسے دس ہزار روپے کا نقد انعام دیا گیا۔

اس کے دو روز بعد مسٹر بھٹو اور خان عبدالولی خاں کو دوسرے بہت سے اہم سیاستدانوں سمیت ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ ان گرفتاریوں نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ مغربی پاکستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں شدید ہنگاموں نے مزید زور پکڑ لیا۔ جگہ جگہ پولیس اور مظاہرین کے درمیان تصادم کے واقعات بڑھ گئے اور نہتے عوام پر پولیس کی زیادتیوں کی داستانیں زبان زد خاص و عام ہو گئیں۔ کئی مقامات پر کچھ لوگوں نے لاٹھی چارج اور آنسو گیس سے بچنے کے لیے بھاگ کر مسجدوں میں پناہ لی، تو پولیس نے وہیں جا کر انہیں بیدردی سے زد و کوب کیا۔ ایسے ہنگاموں کے دوران ایک دو جگہ قرآن حکیم کی بے حرمتی کی خبریں بھی سننے میں آئیں۔ خاص طور پر کراچی کی آرام باغ والی مسجد کا واقعہ بہت بدنام ہوا۔ جس میں جوتوں سمیت گھس کر پولیس نے بعض لوگوں کو اس قدر پیٹا کہ مسجد کا فرش تک لہولہان ہو گیا۔

یوں تو وطن عزیز میں ہماری پولیس پہلے بھی کبھی نیک نام نہ تھی، لیکن اس قسم کے تشدد آمیز واقعات نے عوام کے دل میں اس کے خلاف اور بھی زیادہ نفرت پھیلا دی۔

اس کے بعد اچانک کھاریاں میں خانم کے سانحہ کی خبر نکلی جس نے صدر ایوب کی حکومت کے آخری ایام پر ایک عجیب بے برکتی کا سایہ ڈال دیا۔ خانم ایک سولہ برس کی جوان لڑکی تھی جو اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی کے ہمراہ کسی قتل کی تفتیش کے سلسلے میں کھاریاں پولیس اسٹیشن میں لائی گئی تھی۔ رات کو پولیس والے اسے ایک الگ کوٹھڑی میں لے گئے۔ جہاں سے ساری شب اس کے چیخنے اور چلانے کا شور سنائی

دیتا رہا۔ صبح کے وقت وہ اپنی کوٹھڑی میں مردہ پائی گئی۔ پولیس والوں کا کہنا تھا کہ اس نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی ہے۔ لیکن میڈیکل رپورٹ نے یہ ثابت کر دیا کہ کثیر التعداد لوگوں نے خانم کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔

اسی زمانے میں کئی اور شہروں میں بھی جنسی بے راہروی کی بہت سی خبریں آندھی کی طرح اٹھیں اور بگولوں کی طرح پھیل گئیں۔ خبریں اس قسم کی تھیں کہ چند بڑے بڑے مخصوص اور با اقتدار خاندانوں کے نوجوان دن دیہاڑے شریف اور باعزت گھرانوں میں گھس کر ان کی لڑکیاں زبردستی اٹھا لاتے تھے۔ اور پولیس ڈر کے مارے ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاتی تھی۔ غالباً ان خبروں میں حقیقت کم اور افواہ سازی کا عنصر زیادہ ہوتا تھا۔ لیکن انہوں نے ماحول کی کثافت اور غلاظت کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ ان خبروں اور افواہوں میں جتنا بھی تھوڑا بہت حقیقت کا عنصر تھا' اس نے صدر ایوب کے آخری ایام حکومت کی بے برکتی میں بہت زیادہ ظلمت کو فروغ دیا۔

دوسری جانب مشرقی پاکستان کو بھی عوام الناس نے اسی طرح اپنے غیظ و غضب کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ پہلے وہاں پر یہ خبر نکلی کہ اگرتلہ سازش کے ایک ملزم فلائیٹ سارجنٹ ظہور الحق کو فوج کی حراست میں گولی مار کر سنگینوں سے ہلاک کر دیا گیا ہے۔ الزام یہ لگایا گیا کہ وہ جیل سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کسی کو اس الزام کی صداقت پر یقین نہ آیا۔ عام خبر یہی تھی کہ وہ حراست کے دوران وحشیانہ تشدد کا شکار ہو کر مرا ہے۔ اس پر صوبہ بھر میں جگہ جگہ فساد شروع ہو گئے۔ ڈھاکہ میں مشتعل عوام نے دو وزیروں کے گھروں کو آگ لگا دی۔ ایک ہجوم نے اس سرکاری مہمان خانے پر ہلہ بول دیا۔ جہاں پر اگرتلہ سازش کیس ٹریبونل کے صدر جسٹس ایس اے رحمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ کھلنا میں ایک مرکزی وزیر خان عبدالصبور خاں کے مکان

کو نذر آتش کر دیا گیا۔ راج شاہی یونیورسٹی کے طلباء نے ایک احتجاجی جلوس نکالنے کی کوشش کی۔ یونیورسٹی کے ایک ہر دلعزیز استاد ڈاکٹر شمس الضحیٰ نے انہیں یونیورسٹی کے صدر دروازے پر روک لیا۔ اور طلباء کو سمجھا بجھا کر منتشر ہو جانے کی تلقین کر ہی رہے تھے کہ ایک سپاہی نے جھپٹ کر انہیں اپنی سنگین پر دھر لیا اور مار مار کر اسی جگہ ہلاک کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں فلائٹ سارجنٹ ظہور الحق اور ڈاکٹر شمس الضحیٰ کے نام شہیدوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔ اور عوام نے جگہ جگہ پولیس اور فوج کے نافذ کردہ کرفیو کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ کئی مقامات پر بنیادی جمہوریت کے اراکین کو پکڑ کر بر سر عام پیٹا گیا۔ چند ایک جان سے بھی مارے گئے۔ کسی کسی جگہ ان کی رہائش گاہوں یا دکانوں یا یونین کونسلوں کے دفاتر کو توڑ پھوڑ کر آگ لگا دی گئی۔ لوگوں کے اس تیز و تند سیلاب کے سامنے بے بس ہو کر کچھ ممبر مستعفی ہو کر روپوش ہونا بھی شروع ہو گئے تھے۔

فروری کے وسط میں ایک روز صدر ایوب نے مجھے ایک سرکاری فائل کے ساتھ اپنے دفتر میں طلب کیا۔ جس وقت میں ایوان صدر پہنچا تو ایک نامی گرامی عالم دین ملاقات کے بعد ان کے کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ اندر جا کر میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر غیر معمولی شکستہ دلی کے آثار نمایاں ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک لمبا چوڑا کاغذ تھا جس پر عربی اور اردو میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ غالباً میرے آنے سے پہلے والے ملاقاتی انہیں بہت سے وظائف پڑھنے کے لیے دے گئے تھے۔ صدر نے کسی قدر بے دلی سے اس کاغذ کو میز کی دراز میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "سب یہی کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ تاریخ اپنے آپ کو منسوخ کرنے کے لیے بھی دہراتی ہے۔"

چند لمحے توقف کرنے کے بعد وہ یوں گویا ہوئے۔ "تمہیں یاد ہو گا کہ ۱۹۶۲ء کی فروری میں مسلح افواج کے اعلیٰ افسر مجھ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ آئین نافذ کرنے کا نام نہ لو۔ سیاستدانوں کے قریب تک نہ جاؤ۔ اور اسی طرح مارشل لاء کے سائے میں بیٹھ کر

ہنسی خوشی حکومت کرتے رہو۔ اور آج سات برس بعد اسی مہینے میں وہی لوگ مجھے مشورہ دے رہے ہیں کہ سیاستدانوں کو مناؤ۔ ان کی منت سماجت کر کے ان کے ساتھ سب معاملات فوراً طے کرو ورنہ حالات قابو سے نکل جائیں گے۔"

"اب آپ نے کیا سوچا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"سوچنے کے لیے میرے پاس اب رہ ہی کیا گیا ہے؟" صدر ایوب تلخی سے بولے۔ "میرا خیال ہے کہ اگلے چند روز انتہائی نازک اور فیصلہ کن ہوں گے۔"

اس روز مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ صدر ایوب مسلح افواج کی حمایت سے قطعی طور پر ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ باہر چاروں طرف شورش اور بد امنی کا زور بدستور بڑھ رہا تھا۔ ایک روز پشاور میں لوگوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر کو جلا کر راکھ کر دیا۔ پھر ۱۴ فروری کو ملک بھر میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ سڑکوں پر نکلنے والی ہر بس' ٹرک' ویگن' ٹیکسی' موٹر سائیکل' تانگہ اور رکشا نے سیاہ ماتمی جھنڈے لہرائے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ میونسپل کارپوریشنوں' کمیٹیوں اور کئی دیگر سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی گاڑیاں بھی سیاہ جھنڈیاں لگائے ہوئے تھیں۔ اس روز جو گاڑی سیاہ جھنڈی لہرائے بغیر باہر نکلتی تھی اس پر پتھراؤ کر کے اسے توڑ پھوڑ دیا جاتا تھا۔ راولپنڈی شہر میں چند موٹر کاریں ہجوم نے نذر آتش بھی کر دیں۔ چند سینئر افسر اسٹاف کاروں میں بیٹھے مری روڈ سے گزر رہے تھے تو لوگوں نے انہیں روک لیا اور ان سے "ایوب کتا مردہ باد" کے نعرے لگوا کر آگے بڑھنے دیا۔ ڈیوٹی پر متعین پولیس ڈر کے مارے بے بس تھی اور سڑکوں پر گشت کرتی ہوئی فوج بھی خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔ ہڑتال والے دن لاہور' کراچی اور حیدر آباد میں شدید ہنگامے اور تصادم بھی ہوئے اور بہت سے لوگ مارے گئے۔

اسی روز مسٹر بھٹو نے ۱۹۶۵ء سے نافذ شدہ ایمرجنسی کے خلاف تادم زیست بھوک ہڑتال شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔

ان حالات سے مجبور ہو کر صدر ایوب نے ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی کے صدر نوابزادہ نصراللہ خاں کو دعوت دی کہ وہ اپنی پسند کے ساتھوں سمیت ۱۷ فروری کو ایک راؤنڈ ٹیبل

کانفرنس میں ان سے آ کر ملیں۔ نوابزادہ صاحب نے شرائط عائد کیں کہ یہ ملاقات اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ڈیفنس آف پاکستان رولز اور ایمرجنسی کا نفاذ فوراً ختم کیا جائے' جلسوں اور جلوسوں پر دفعہ ۱۴۴ کی پابندی اٹھا لی جائے' اور تمام گرفتار شدہ طلباء اور سیاسی کارکنوں کو رہا کیا جائے۔ موقع شناسی سے کام لے کر صدر ایوب نے ان کی بہت سی شرائط مان لینے کی ٹھان لی۔ اور ایک تجربہ کار فوجی کی طرح نہایت منظم طور پر اپنے ہتھیار ڈالنا شروع کر دیئے۔ پہلے انہوں نے ایمرجنسی ختم کرنے کا اعلان کیا۔ پھر ڈیفنس آف پاکستان رولز اٹھائے۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر بھٹو سمیت سب سیاستدان اور سیاسی قیدی رہا ہو گئے۔ مشرقی پاکستان کی دلجوئی کے لیے انہوں نے روزنامہ اتفاق کے چھاپہ خانہ کی ضبطی کا وہ حکمنامہ منسوخ کر دیا جو تین برس قبل جاری ہو چکا تھا۔ صدر ایوب نے شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی پیرول پر رہا کر کے راولپنڈی میں دوسرے سیاستدانوں کے ساتھ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ شیخ صاحب نے یہ دعوت قبول کر لی اور انہیں راولپنڈی لانے کے لیے ایک خصوصی طیارہ بھی ڈھاکہ کی ایئر پورٹ پر تیار ہو کر آ کھڑا ہوا۔ لیکن سیاست دانوں اور صدر ایوب کے درمیان صلح صفائی کی یہ پیش رفت جنرل یحیٰی' میجر جنرل پیر زادہ اور ان کے ہم خیال ٹولہ کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ چنانچہ انہوں نے فی الفور اپنے ہتھکنڈے استعمال کر کے اس پیش رفت کو سبوتاژ کر دیا۔ ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمٰن اگرتلہ سازش کیس کے سلسلہ میں فوجی حراست میں تھے وہاں پر کچھ ایسے تار ہلائے گئے کہ وہ پیرول پر راولپنڈی آنے سے اچانک مکر گئے۔ اب انہیں یہ ضد ہو گئی کہ وہ ایک زیر حراست قیدی کی حیثیت سے کسی مذاکرات میں ہرگز شرکت نہ کریں گے۔ ان کو رام کرنے کے لیے حکومت نے اگرتلہ سازش کا مقدمہ عدالتی ٹریبونل سے واپس لے لیا۔ یہ مقدمہ واپس ہوتے ہی شیخ مجیب الرحمٰن سمیت سازش کیس کے سارے ملزم رہا ہو گئے۔

سیاستدانوں کے ساتھ مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کے لیے صدر ایوب نے اپنے بنائے ہوئے

آئین سے بھی ہاتھ اٹھا لیا اور برملا اعلان کر دیا کہ عوام کے نمائندے اپنی مرضی کا نیا آئین ملک میں نافذ کرنے کے لیے قطعی طور پر آزاد ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے قوم کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ اگلے صدارتی انتخابات میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑے نہ ہوں گے۔

اس پس منظر میں ۲۶ فروری ۱۹۶۹ء کو صدر ایوب اور سیاستدانوں کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی کے اراکین کے علاوہ شیخ مجیب الرحمٰن اور ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خاں شریک ہوئے۔ مسٹر بھٹو اور مولانا بھاشان نے کانفرنس میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ ابتدائی گفتگو کے بعد کانفرنس کا اگلا اجلاس ۱۰ مارچ تک ملتوی ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی صدر ایوب اور جنرل یحییٰ خاں کے درمیان ایک خاموش اور زیر زمین قسم کی زور آزمائی شروع ہو گئی۔ مسٹر بھٹو' مولانا بھاشانی اور ائیر مارشل اصغر خاں پر تو صدر ایوب کا کوئی بس نہ چلتا تھا۔ لیکن باقی سیاستدانوں کا دل ان کی جانب کسی قدر پسیجا ہوا تھا۔ جس انداز سے صدر ایوب نے یکے بعد دیگرے ان کی سب شرائط مان لی تھیں۔ اس سے متاثر ہو کر جملہ سیاستدان ان کے ساتھ کوئی فیصلہ کن گفتگو کرنے پر آمادہ تھے۔ لیکن مذاکرات کی اصل کنجی شیخ مجیب الرحمٰن کے ہاتھ میں تھی۔ ان کو اپنی راہ پر لانے کے لیے صدر ایوب نے کافی ہاتھ پاؤں مارے۔ مشرقی پاکستان کے گورنر عبدالمنعم خان کی جگہ انہوں نے شیخ مجیب کے ایک پسندیدہ سیاستدان اور اقتصادی ماہر ڈاکٹر ایم این ہدیٰ کو وہاں کا گورنر متعین کر دیا۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں بھی جنرل موسیٰ کی جگہ مسٹر یوسف ہارون کی تقرری بطور گورنر ہو گئی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ ہارون خاندان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ ہارون فیملی اور بھٹو فیملی کے درمیان بھی قدیمی دشمنی تھی۔ یوسف ہارون کو گورنر بنا کر غالباً صدر ایوب ایک تیر سے دو شکار کرنے کی امید رکھتے تھے۔ ان کی یہ کوششیں کسی حد تک رنگ بھی لائیں۔ اور پارلیمانی نظام حکومت اور عام بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر

شیخ مجیب الرحمٰن راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں کوئی سیاسی سمجھوتہ قبول کرنے پر مائل بھی ہو گئے تھے لیکن جی ایچ کیو میں صدر ایوب کے مخالف ٹولہ نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔

جنرل یحیٰی اور میجر جنرل پیر زادہ وغیرہ نے ڈھاکہ اور راولپنڈی میں اپنے ذرائع سے شیخ مجیب الرحمٰن کی یہ برین واشنگ کر دی کہ اس بڈھے (صدر ایوب) کے ہاتھ میں اب کوئی اقتدار باقی نہیں جسے وہ سمجھوتہ کرنے کے بعد سیاستدانوں کو منتقل کر سکے۔ اقتدار حاصل کرنے کا شوق ہے تو ہمارے ساتھ چلو۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے یہ بات اپنے پلے باندھ لی اور ۱۰ مارچ کو جب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس دوبارہ شروع ہوئی تو انہوں نے اپنے بریف کیس سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکال کر ایک طویل اور کسی قدر بے ربط تقریر پڑھی جس میں ذکر تو ان کے چھ نکات کا تھا لیکن انجام علیحدگی اور تخریب پر مبنی تھا۔ اپنی تقریر ختم کرتے وقت شیخ صاحب نے زور دے کر کہا تھا کہ ان کی پیش کردہ تجاویز پر عمل کرنے ہی سے ملک سلامت رہ سکتا ہے۔

اس پر صدر ایوب نے برجستہ پوچھا تھا۔ "کون سا ملک؟"

اس رنگ اور سر پر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس تو ناکام ہو کر ختم ہو گئی لیکن ملک کے طول و عرض میں بد امنی اور ہنگاموں کا زور نہ ٹوٹنا تھا نہ ٹوٹا۔ بلکہ ان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ سول محکموں اور اداروں کی نمائندہ یونینیں اور انجمنیں بھی پنجے جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور انہوں نے اپنے حقوق منوانے' تنخواہیں بڑھوانے اور سی ایس پی وغیرہ کو ختم کروانے کی تحریک شروع کر دی۔ مغربی پاکستان میں ڈاکٹرز' اساتذہ' پوسٹل ملازمین' گودیوں کے مزدور اور دوسرے بہت سے محنت کش بھی ہڑتالوں پر چلے گئے۔ قدم قدم پر مار پیٹ قتل و خون' توڑ پھوڑ' گھیراؤ جلاؤ کے واقعات رونما ہونے لگے۔

ایک روز نیشنل بنک کے ہیڈ آفس میں چھوٹے ملازمین نے بنک کے سربراہ اور مینجنگ ڈائریکٹر کا آدھی رات تک گھیراؤ کر کے ان سے اپنے سب مطالبے زبردستی منظور کروا لیے۔

اندرون خانہ ملک کی معیشت انتہائی شدید بحران میں مبتلا تھی۔ باہر امن عامہ کی چادر تار تار تھی۔ ایک مشتعل ہجوم نے کراچی ریس کورس پر حملہ کر کے وہاں پر ہر شے کو تہس نہس کر دیا۔ پی آئی ڈی سی' سرکاری' نیم سرکاری اور پرائیویٹ تجارتی اداروں کے علاوہ سب چھوٹی بڑی صنعتی ملیں اور فیکٹریاں بھی گھیراؤ اور جلاؤ کی زد میں آئی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے ملک کے اقتصادی نظام پر گہرا جمود چھا گیا۔ ۱۳ مارچ کو کراچی کا اسٹاک ایکسچینج بھی بند ہو گیا۔ ڈھاکہ میں آدم جی جوٹ ملز اور پاکستان تمباکو کمپنی پر مزدوروں نے اپنا قبضہ جما لیا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کا شہر شہر' گلی گلی' کوچہ کوچہ "ایوب کتا ہائے ہائے" اور "ایوب کتا مردہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔ اس ماحول میں صدر ایوب نے کابینہ کا اجلاس بلایا جو ان کے عہد صدارت کی آخری کیبنٹ میٹنگ ثابت ہوئی۔ کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ کو اس میٹنگ میں خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ صدر نے ملک بھر میں پھیلی ہوئی بد امنی اور بد نظمی کا تجزیہ بیان کر کے یہ تجویز پیش کی کہ اس بگڑتی ہوئی صورت حال پر قابو پانے کا واحد طریقہ مارشل لاء کا نفاذ ہے۔ سب کی آنکھیں بری فوج کے کمانڈر انچیف کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ جب جنرل یحییٰ سے اس تجویز پر رائے طلب کی گئی تو انہوں نے یہ کہہ کر کنی کترا لی کہ وہ اس بارے میں صدر ایوب سے الگ بات کریں گے۔ اس کے بعد صدر ایوب کی آخری کابینہ کا آخری اجلاس ہمیشہ کے لیے برخاست ہو گیا۔

بعد ازاں تخلیہ میں صدر ایوب اور جنرل یحییٰ کے مابین جو گفتگو ہوئی اس کا براہ راست کسی کو کچھ علم نہیں البتہ بعض قرائن و شواہد سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ جنرل یحییٰ نے مارشل لاء نافذ کرنے کی حامی اس شرط پر بھری کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دیا جائے' صوبائی گورنروں کو ان کی کابینہ سمیت موقوف کر دیا جائے اور ۱۹۶۲ء کے آئین کو منسوخ قرار دیا جائے۔

صدر ایوب عاقل آدمی تھے۔ جنرل یحییٰ کا اشارہ پا گئے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر

بن کر وہ خود صدارت کی کرسی سنبھالنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کی اپنی ذاتی مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اپنے پروردہ جنرل آغا محمد یحییٰ خاں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ چنانچہ ایوان صدر کے بند کمرے میں انہوں نے خاموشی سے بلا چوں و چراں ان کی ساری شرائط منظور کر لیں۔

تین چار روز بعد میں نے سنا کہ پاکستان میں متعین امریکن سفیر اچانک ایک خصوصی پرواز سے واشنگٹن روانہ ہو گیا ہے۔ اسی شام ایک سفاتی تقریب میں چند غیر ملکی نامہ نگار ایک طرف کھڑے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک دو سے میری شناسائی تھی۔ ایک انگریز صحافی سے میں نے پوچھا۔ "پاکستان میں اس شدید بحران کے دوران یہ امریکی سفیر واشنگٹن کیا کرنے گیا ہے؟"

اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "کیوں نہیں؟ منتقلی اقتدار پر عملدرآمد سے پہلے واشنگٹن سے OK حاصل کرنا بھی تو لازمی ہے؟"

معلوم نہیں' اس کا یہ جواب فکاہیہ تھا یا سنجیدہ لیکن یہ حقیقت ہے کہ امریکی سفیر کے واپس آتے ہی ۲۵ مارچ کو صدارت کی کرسی بدل گئی۔ اس روز صبح دس بجے ایوان صدر میں صدر ایوب نے اپنا آخری پیغام ریڈیو اور ٹیلیویژن کے لیے ریکارڈ کروایا گیا۔ ریکارڈنگ کے دوران جنرل یحییٰ غمگین صورت بنائے ٹسوے بہانے کے انداز میں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جونہی ریکارڈنگ کے ٹیپ ان کے قبضہ میں آ گئے۔ ان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ وہ ہشاش بشاش جھومتے جھامتے کمانڈر انچیف ہاؤس واپس آئے۔ اپنے چند لنگوٹے دوستوں اور منظور نظر خواتین کو طلب کیا۔ شراب ناب کا دور چلا اور دیر تک سب نے "ہے جمالو" کی تان پر آپس میں مل جل کر دیر تک بھنگڑا ڈالا۔

۲۵ مارچ کو جنرل یحییٰ نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا۔ اسی روز مجھے سابق صدر ایوب کا ایک خط ملا جو درج ذیل ہے۔

President House، Rawalpindi

ت:th March، ںکءں

From: Field Marshal، Muhammad ےyub Khan، N.Pk.، H.J.

My Dear Shahab،

You must have heard my broad cast to the nation today in which I announced my decision to reliquish office. I know that you must have been shoked by this and I deeply value your sentiments toward me. I assure you my decision was dicatated by only one consideration namely the need to preserve the unity and integrity of Pakistan. ال my life I have believed in cetrain principles and I could not compromise them merely to continue in office. ےs senior funtionaries of Government you know that this country cannot exist and make progress without a viable centre. I could not possibly preside over the liquidation of Pakistan by agreeing to all manner of demands. It was through a strong ےentral Government that we were able to achieve a great deal during the last ٹن years. In this your personal contribution and the contribution of your colleagues has been tremendous، Today all civil servants are under pressure but they represent one of the most valuable assets of our national life. So، don't lose heart and continue to do your duty without fear. You must do your job whatever the conditions and I expect you to give full co-operation to the new regime. I have no doubt in my mind that you will be treated with respect and that you will receive a fair deal.

I part from you with a heavy heart because I have come to have great affection and regard for You. You worked with dedication and a tremendous sense of loyalty.

Your Sincerly،

صدر ایوب کی شخصیت چنار کے درخت کی طرح خوبصورت' تنا ور اور شاندار تھی۔ لیکن گرتے گرتے اس کا تنا کافی حد تک کھوکھلا ہو چکا تھا۔

ذاتی طور پر وہ نیکی' شرافت' عدل پسندی اور رحمدلی کے خوگر تھے۔ اقتدار میں آ کر انہوں نے ایک محنتی طالب علم کی لگن سے اپنا کام سیکھا۔ اور اس میں نمایاں مہارت حاصل کی۔ ان کی رگ رگ میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خارجہ پالیسیوں میں نئے زاویے قبول کر کے انہوں نے دنیا بھر میں پاکستان کا وقار بلند کیا۔ اندرون ملک انہیں زرعی اور صنعتی اور تجارتی ترقی کو بام عروج تک پہنچانے کا جنون تھا۔

ان شعبوں میں انہوں نے اتنی کامیابی ضرور حاصل کی کہ بہت سے لوگ ان کے دور حکومت کو پاکستان کی مادی ترقی کا سنہری زمانہ کہتے ہیں۔

سیاست میں وہ ناکام رہے۔

تینوں مسلح افواج نے بڑی حد تک ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ لیکن اقتدار کے آخری ایام میں ان کے پروردہ چند بڑے افسر ان کے ساتھ بیوفائی کر گئے۔ اقتدار سے علیحدگی کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کے ایام نہایت خاموشی اور وقار سے گزارے۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں ان کی اچھی اور خوشگوار یادیں ہمیشہ تازہ رہیں۔ اسلام آباد میں جب کبھی وہ عید کی نماز پڑھنے عید گاہ میں آتے تھے تو ایک بڑا ہجوم ان کے ساتھ گلے ملنے یا ہاتھ ملانے کے شوق میں انہیں گھیر لیتا تھا۔

ایک روز وہ راولپنڈی میں ایک کتابوں کی دکان سے باہر نکل رہے تھے تو کچھ طلباء نے انہیں گھیر لیا۔ ایک لڑکے نے کہا۔ "سر' آپ دوبارہ صدارت کیوں نہیں سنبھالتے؟"

ایوب خاں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بیٹا! اب ایوب کتا بڈھا ہو گیا ہے۔"

کئی جگہ ٹیکسیوں کے اندر' بسوں کے اڈوں پر اور چھوٹی چھوٹی دکانوں میں اب تک ان کی تصویریں آویزاں نظر آ جاتی ہیں۔ جب کبھی وطن عزیز پر کسی خطرے کے بادل منڈلانے لگتے ہیں تو کئی دیہاتی علاقوں میں فوجی وردی میں ملبوس پاکستان کا علم بلند کئے ایوب خاں کی تصویر کے نیچے ایک فلمی گیت کے یہ بول درج ہوتے ہیں۔

"تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد"

○○○

• روزگار سفیر

جب مجھے سفیر ہالینڈ بھیجنے کا فیصلہ سنایا گیا تو مجھے یہ کرید لگ گئی کہ میں نوع انسانی کی اس جنس کے متعلق کچھ معلومات حاصل کروں جنہیں انگریزی میں "ڈپلومیٹ" اور اردو میں پہلے ایلچی کہا جاتا تھا اور اب سفارتکار کہتے ہیں۔

اب تک میں نے سفیر حضرات کو سطحی طور پر کسی قدر بے اعتنائی سے زیادہ تر سرکاری تقریبات میں کھاتے پیتے یا ہوائی اڈوں پر استقبالیہ اور الوداعیہ موقعوں پر قطاریں بناتے دیکھا تھا۔ اگرچہ یہ لوگ اپنے اپنے ملک کی الگ الگ نمائندگی کرتے ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ عجیب الخلقت مخلوق ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے نظر آتی ہے۔ ان سب کی وضع قطع' تراش خراش' چال ڈھال' بول چال' لب و لہجہ اور بندھی بندھائی' پٹی پٹائی اصلاحات و تلمیحات و محاورات پر اس محدود چار دیواری کی واضح چھاپ لگی ہوتی ہے جسے عرف عام میں Diplomatic Enclave کہا جاتا ہے۔ عام طور پر ان کے چہروں پر ایک ایسی مستقل اور مصنوعی مسکراہٹ چسپاں ہوتی ہے جیسے کسی بڑھئی نے بسولی کا ٹانکا مار کر خشک لکڑی پر خط منحنی تراش دیا ہو۔ خوش طبعی اور زندہ دلی سے کھلکھلا کر ہنسنا ان کے آداب میں داخل نہیں' بلکہ موقع و محل یا ماحول کی رعایت سے ٹھٹھا لگانا یا ناک بھوں چڑھا کر منہ سکیڑنا اور شانے اچکانا ان کی عادت ثانیہ ہے۔ گفتگو میں وہ چھپاتے زیادہ اور بتاتے کم ہیں اور ذو معنی اور گنجلک بات کو ابہام کی سان پر چڑھانا ان کا خاص طرۂ امتیاز ہے۔ پروٹوکول کی رو سے سب سفیر برابر کا درجہ رکھتے ہیں لیکن چھوٹے ملک کے سفیر کی ایک پہچان یہ ہے کہ اس کی کار بہت بڑی ہوتی ہے۔ غریب ممالک کے سفیر اپنے سفارت خانوں پر امارت کا چونا لگانے کی مہارت حاصل کرتے ہیں۔ جس سفیر کا ملک جس قدر غیر اہم ہو گا' اسی تناسب سے وہ اپنی اہمیت قدر و منزلت اور وقار کے وزن تلے دب کر خمیدہ کمر نظر آنے کی کوشش میں لگا ہو گا۔ بڑے اور طاقتور

ممالک کے سفیر بھی کسر نفسی سے کام لینا نہیں جانتے اور بشرط ضرورت سفارتی اکھاڑے میں اپنے مخصوص جوڈو کراٹے کے کرتب آزمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنواتے۔

دراصل کچھ سفیر بہت جلد اپنی انفرادیت پس پشت ڈال کر اس خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کی ذات ان کے ملک کا نقش ثانی ہے۔ اس مماثلت کو نبھانے کے لیے بعض اوقات وہ ایسے ایسے مضحکہ خیز جتن کرتے ہیں کہ ان پر چلتے پھرتے انسانوں کی بجائے دیوار پر ٹنگے ہوئے نقشوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سفارت کاری کا فن یونانی علم الاصنام کے ایک دیوتا Herms کے زیر سایہ جنم لے کر پروان چڑھا تھا۔ یہ نہایت دلچسپ اور معنی خیز حسن اتفاق ہے کہ یونانی دیو مالا میں اسی نام کے دیوتا کو بیک وقت جھوٹوں' اٹھائی گیروں' آوارہ گردوں اور لچوں لفنگوں کا سرپرست بھی مانا جاتا ہے۔

قدیم یونان میں سفیروں کی کامیابی کا معیار صرف اتنا تھا کہ وہ طویل گفتگوؤں اور تقریروں میں فصاحت و بلاغت کے دریا تو ضرور بہائیں' لیکن ان میں معانی و مطالب کا شائبہ تک نہ آنے دیں۔ سلطنت روما میں حکومت اپنے مفاد میں معاہدے تیار کر کے دارالخلافہ میں متعین غیر ملکی سفیروں کو حکم دیتی تھی کہ وہ ان پر بلا چوں و چراں دستخط کر دیں۔ اگر کوئی سفیر کسی معاہدہ کو ماننے میں پس و پیش کرتا تھا' تو اسے باغی اور جاسوس قرار دے کر قید و بند کی حالت میں اس کے وطن واپس بھیج دیا جاتا تھا۔ معاہدوں پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے بعض اوقات سفیروں سے ضمانت کے طور پر یرغمالی بھی طلب کر لیے جاتے تھے۔

سفارت کاری کو سب سے پہلے کاروبار حکومت میں ایک باقاعدہ اور منظم شعبے کا درجہ دینے کا سہرا بزنطینی سلطنت کے سر ہے' لیکن قسطنطنیہ میں جتنے غیر ملکی سفیر متعین ہوتے تھے' ان کی نہایت کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ سفیروں کی رہائش کے لیے حکومت انہیں نہایت عالیشان حویلیاں فراہم کرتی تھی۔ جن میں داخل ہونے کے بعد وہ بڑی حد تک

نظر بند قیدیوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اگر کوئی سفیر باہر جانے کے لیے قدم اٹھاتا تھا' تو فوجی گارد سلامی دینے کے بعد اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ باہر سے بھی کسی شخص کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ آج کل کی طرح ہر زمانے میں عام شہریوں کا سفارت کانوں سے میل جول بڑھانا شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کئی ممالک میں اس جرم کی سزا قید تھی۔ یورپ میں ایک ملک ایسا بھی تھا جہاں پر سفارت خانوں سے میل جول رکھنے والا شہری تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ انگلستان کے حکمران کرامویل نے اعلان کر رکھا تھا کہ ہاؤس آف کامنز کا جو ممبر کسی غیر ملکی سفارتکار سے بات چیت کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اسے پارلیمنٹ کی رکنیت سے فی الفور خارج کر دیا جائے گا۔

سفارت خانوں کے اخراجات ان کی افادیت کے پیش نظر ہمیشہ بھاری تصور کئے جاتے ہیں۔ ایک زمانے میں سفیروں کو کھلے بندوں تجارت کرنے کی اجازت تھی' لیکن یہ بندوبست دیرپا ثابت نہ ہوا' کیونکہ سفیر حضرات سرکاروں درباروں میں حاضری دینے کی بجائے اپنا زیادہ وقت منڈیوں اور بازاروں میں صرف کرنے لگے تھے۔ کچھ یورپین ممالک نے چھوٹے چھوٹے دستکاروں' کاریگروں اور اہل حرفہ کو سفارتی عہدوں پر مامور کر کے بھی دیکھا۔ فرانس کے ایک بادشاہ نے اپنے حجام کو سفارت کی کرسی پر بٹھایا۔ فلورنس کے حکمران نے ایک عطار کو یہی اعزاز بخشا۔ اس سے سفارت خانوں کے اخراجات میں تو ضرور نمایاں کمی واقع ہوئی۔ لیکن روم میں پاپائے اعظم نے صدائے احتجاج بلند کی کہ ان کے پاس جو سفیر بھیجے گئے ہیں' ان کا معیار زندگی اتنا پست ہے کہ ان کے تن بدن سے بدبو آتی ہے۔ اسی طرح انگلستان کے بادشاہ ہنری ہفتم نے ایسے سفیروں کو اپنے دربار سے نکال دیا جن کے کپڑوں میں جوئیں رینگتی تھیں اور جو نہانے دھونے کے عادی نہ تھے۔

اس تجربہ کی ناکامی کے بعد کچھ حکومتوں نے اعلیٰ حسب نسب کے ایسے امیر کبیر افراد کو چن چن کر اپنا سفیر مقرر کرنا شروع کر دیا۔ جو سفارت خانوں کے پورے اخراجات

اپنی جیب سے پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ آرام پسند امراء میں اس مفت کی بیگار کو قبول کرنے سے کنی کتراتے تھے۔ بعض ممالک میں ایسے لوگوں پر بھاری جرمانے کئے جاتے تھے۔ بعض دوسرے ملکوں میں انہیں پولیس اور فوج کی نگرانی میں زبردستی ان کے سفارتی عہدوں پر روانہ کر دیا جاتا تھا۔

مختلف زمانوں میں سفارت کاری کے آداب اور معیار بھی مختلف رنگ اختیار کرتے رہے ہیں۔ ایک زمانے میں سفارتی مشن کی وقعت اور اہمیت کا دار و مدار ان بیش بہا اور نادر تحفوں پر ہوتا تھا جو شاہی دربار میں پیش کئے جاتے تھے۔ بعد ازاں تحفوں تحائف کی جگہ سفیروں کا ذاتی جاہ و جلال اور حسن و جمال رنگ لانے لگا۔ اٹھارہویں صدی کے آخیر میں انگلستان نے روس میں اپنا ایک ایسا سفیر متعین کیا جو مردانہ حسن صورت میں یوسف ثانی سمجھا جاتا تھا۔ سفارت کاری میں اس کا اہم ترین کارنامہ یہ شمار ہوتا تھا کہ ملکہ کیتھرائن نے اسے اپنے پرائیویٹ ڈریسنگ روم میں شرف باریابی بخشا اور فرمایا۔ ''اگر میری عمر کچھ کم ہوتی' تو میں اس قدر مصلحت اندیشی اور اختیار سے ہرگز کام نہ لیتی۔'' روس کی ملکہ کیتھرائن کی عمر پچاس برس سے اوپر تھی اور خوبصورت مرد اس کی کمزوری مشہور تھے۔

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ڈپلومیسی میں برطانیہ کا تجربہ دوسروں کی نسبت زیادہ طویل اور وسیع ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ انگریزوں نے سفارت کا ڈھونگ رچا کر مغل بادشاہوں سے ایسی مراعات حاصل کر لیں جن کو آڑ بنا کر رفتہ رفتہ وہ اس برصغیر کے حکمران بن بیٹھے لیکن یہ سفارت کاری کا عمل کم اور تجارت کے پردے میں سیاسی سازشوں اور فوجی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ زیادہ تھا۔ لارڈ پامرسٹن (متوفی ۱۸۶۵ء) کے زمانے تک سارے دنیا میں انگلستان کے صرف تین سفیر سینٹ پیٹرز برگ' پیرس اور ویانا میں متعین تھے۔ باقی مقامات پر فقط ایک آدھ کونسلر اور دو تین کلرک کافی سمجھے جاتے تھے۔ لارڈ پامرسٹن خود بھی لندن کی وزارت خارجہ میں ہفتہ میں دو یا تین روز سے زیادہ آ کر بیٹھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ فارن آفس کا مٹھی بھر عملہ اپنا زیادہ وقت شغل بیکاری میں گزارتا

تھا۔ وقت کاٹنے کے لیے ان کا ایک محبوب مشغلہ یہ تھا کہ شیشوں کا گھما پھرا کر وہ سڑک کے دوسری جانب نمبر ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ میں پرائم منسٹر کے ہاں کام کرنے والی

خادماؤں پر روشنی کی تیز تیز شعاعیں ڈالا کرتے تھے۔

ٹیلیگرافی' ٹیلیفون' ریڈیو' ٹیلیویژن' ہوائی جہاز اور موجودہ ایٹمی دور کی "ہاٹ لائن" سیٹلائٹ اور دیگر برق رفتار ذرائع رسل و رسائل کی ایجادات نے سفارت کاری کی اہمیت اور نوعیت کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ ایک زمانے میں امریکہ کے صدر لنکن کی موت کی خبر ہندوستان میں تین ماہ بعد پہنچی تھی۔ صدر کینیڈی کے قتل کی خبر ساری دنیا میں چند منٹ کے اندر پھیل گئی۔ آج کل مملکتوں اور حکومتوں کے سربراہ ایک دوسرے کے ساتھ فوری طور پر مل کر یا "ہاٹ لائن" پر گفتگو کر کے بڑے بڑے نازک مسائل پر قابو پا لیتے ہیں۔ موجودہ دور میں سفارت کاری کا سب سے بڑا کمال غالباً یہی ہے کہ وہ حکمرانوں کے درمیان افہام و تفہیم اور باہمی میل ملاپ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھیں۔

آج کل بیشتر ممالک میں سفارتی عہدوں فارن سروس کے پیشہ ور افراد سے پر کئے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی سیاست کے علاوہ دوسرے شعبوں سے بھی بعض لوگوں کو بوجوہ منتخب کر کے ان عہدوں سے نواز دیا جاتا ہے۔ البتہ امریکہ واحد ملک ہے جہاں ایک انجینئر' تاجر' سیاستدان' صنعت کار' بینکر' انشورنس ایجنٹ' وکیل یا یونیورٹی کا پروفیسر بھی آسانی سے سفیر کا عہدہ حاصل کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ کروڑ پتی ہو اور جیتتے ہوئے صدر کی انتخابی مہم میں جی کھول کر چندہ دے چکا ہو۔ ایک بہت بڑے تاجر میکسویل گلک کے متعلق مشہور ہے کہ ۱۹۵۷ء میں اس نے ۲۱۵۰۰ ڈالر کا چندہ ادا کر کے سری لنکا میں سفیر کا عہدہ حاصل کیا تھا۔ جب وہ سینیٹ کی فارن ریلیشنز کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے' تو ان سے پوچھا گیا کہ سری لنکا میں کیا مسائل ہیں جن کے ساتھ امریکن سفیر کا واسطہ پڑے گا؟ اس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔

پھر پوچھا گیا۔ "ہندوستان کے وزیراعظم کا نام کیا ہے؟"

مسٹر گلک نے جواب دیا۔ "مجھے نام یاد نہیں آ رہا۔"
پھر پوچھا گیا۔ "سری لنکا کا وزیراعظم کون ہے؟"
مسٹر گلک نے جواب دیا۔ "اس کا کچھ عجیب اور نامانوس سا نام ہے' مجھے یاد نہیں۔"

سری لنکا میں سفیر کے طور پر مسٹر گلک کی تقرری منظور ہو گئی۔ وزیراعظم مسٹر بندرانائیکے تک جب یہ خبر پہنچی کہ کولمبو آنے سے پہلے امریکی سفیر ان کا نام تک نہ بتا سکتے تھے' تو انہوں نے ہنس کر ٹال دیا اور کہا کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ وہ چار برس آکسفورڈ یونیورسٹی میں رہے اور صرف دو شخص ان کے نام کا صحیح تلفظ ادا کرنے میں کامیاب ہوئے۔
پاکستان کو بھی ایک ایسے امریکی سفیر سے واسطہ پڑ چکا ہے' جو امریکہ میں غالباً کوکا کولا کی تجارتی فرم کے وائس پریذیڈنٹ تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ عہدۂ جلیلہ کس قدر چندہ کے عوض حاصل کیا تھا۔
پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے ہالینڈ جانے کے لیے میں نے عفت اور ثاقب کے ساتھ کراچی سے نیپلز تک سمندری جہاز سے سفر کیا اور چند روز روم میں ٹھہرنے کے بعد ریل کے ذریعہ ہم پہلے ایمسٹرڈیم اور پھر دی ہیگ پہنچے۔ ہیگ میں ہماری رہائش گاہ ایک تاریخی چوک پلین ۱۸۱۳ میں تھی۔ اس چوک کے چاروں کونوں میں صرف ایک ایک عمارت تھی۔ ایک کونے میں ہماری دو منزلہ رہائش گاہ تھی جس کے سامنے خوبصورت باغ اور پیچھے نہایت وسیع لان تھا۔ یہ عمارت حکومت پاکستان کی اپنی خرید کردہ ملکیت ہے۔ اس کے سامنے والے کونے میں وزیر خارجہ کی سرکاری قیام گاہ ہے۔ تیسرے کونے میں وزیراعظم کا دفتر اور اس کے سامنے کینیڈا کا سفارت خانہ ہے۔ یہ چوک قومی آثار قدیمہ میں شمار ہوتا ہے اور ان پر چار عمارات کے علاوہ یہاں پر کوئی اور مکان یا دکان تعمیر کرنے کی اجازت نہیں۔
ہالینڈ کا دارالسلطنت تو ایمسٹرڈیم کہلاتا ہے۔ لیکن حکومت کے دفاتر ہیگ میں ہیں۔ اور

ملکہ کا محل ہیگ سے ۳۰ کلومیٹر دور واقع ہے۔ جب میری باری آئی کہ میں ملکہ جولیانا کے سامنے حاضر ہو کر ان کی خدمت میں اپنی سفارتی اسناد پیش کروں تو شدید برفباری کے دن تھے۔ صبح آٹھ بجے شاہی محل کی ایک خوبصورت کار اور موٹر سائیکل سوار پولیس کے آٹھ جوان ہمارے ہاں آ گئے۔ ساڑھے آٹھ بجے میں اس کار پر پاکستان کا سبز پرچم لہراتا ہوا شاہی محل کے لیے روانہ ہو گیا۔ موٹر سائیکل سوار پولیس نے کار کو اپنے حصار میں لے لیا۔ چار آگے چار پیچھے۔ پولیس کے دستے کا سائرن سنتے ہی سڑک کا سارا ٹریفک ہمارے قافلہ کو راستہ دے دیتا تھا۔ کوئی چالیس پینتالیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد جب ہم شاہی محل کی حدود میں داخل ہوئے تو صدر دروازے پر ایک چست اور مستعد فوجی گارد نے سلامی دی۔ اندر شاہی دربار کا ایک مارشل مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گیا۔ وہاں پر ہم کچھ دیر کافی پیتے اور خوش گپیاں کرتے رہے۔ اتنے میں وزات خارجہ کا چیف آف پروٹوکول اندر آیا اور مجھے اپنے ساتھ ملکہ جولیانا کی خدمت میں لے گیا۔ اسناد سفارت پیش کرنے کے بعد ہم دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ ملکہ جولیانا کچھ دیر پاکستان کے بارے میں خیر سگالی کی باتیں کرتی رہیں۔ انہوں نے بیگم لیاقت علی خاں کا بھی خاص احترام سے ذکر کیا جو مجھ سے پہلے ہالینڈ میں پاکستان کی سفیر رہ چکی تھیں۔ پھر پروٹوکول کا عملہ ہمارے سفارت خانہ کے ایک افسر مسٹر جمیل الحسن کو اندر لے آیا۔ میں نے ان کا تعارف ملکہ سے کرایا اور اس کے بعد ہم اسی طرح موٹر سائیکل سوار پولیس کے ہمراہ ایک جلوس کی صورت میں واپس ہیگ آ گئے۔

ہالینڈ کے ساتھ ہمارے تعلقات میں کوئی الجھاؤ نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں وہاں پر پاکستانیوں کی تعداد بھی نہایت کم تھی۔ اس وقت تک ان کے بھی کوئی خاص مسائل پیدا نہ ہوئے تھے۔ اس لیے سفارت خانے میں میرا کام غیر معمولی حد تک آسان اور ہلکا تھا۔ میرے ساتھ کام کرنے والا سارا عملہ بھی محنتی اور دیانتدار تھا۔ اپنے فالتو وقت کو مصرف میں لانے کے لیے میں نے لائڈن یونیورسٹی کی ایسٹرن انسٹی ٹیوٹ سے کسی قدر استفادہ کیا۔ صوفی مشرف خان اور ان کی ولندیزی بیگم سے راہ و رسم بڑھی' تو

صوفی عنایت خان کے حوالے سے میں نے یورپ میں صوفی تحریک کا تھوڑا بہت جائزہ لیا۔ اس کے علاوہ یوٹریکٹ یونیورسٹی کی انسٹی ٹیوٹ آف پیراسائیکالوجی کے ڈائریکٹر پروفیسر ٹین ہاف کے ساتھ بھی میرے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ ان کی اجازت سے میں نے کچھ عرصہ پیراسائیکالوجی کی ایک پوسٹ گریجوایٹ کلاس میں شرکت بھی کی۔ وہاں پر لیکچر دینے دنیا بھر کے ماہر روحانیات' نفسیات اور مابعد النفسیات کے عالم اور علاج بالاعتقاد کرنے والے نامی گرامی ڈاکٹر آیا کرتے تھے۔ ان میں مسٹر جیرڈ کرانسیٹ کی بین الاقوامی شخصیت کا خاص درجہ تھا۔ قومیت کے لحاظ سے تو وہ ولندیزی تھے لیکن سارے یورپ اور امریکہ میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ علاج بالاعتقاد Faith Healing کے علاوہ ان کے فن میں کشفیات کو خاص دخل تھا۔ خصوصاً وہ گمشدہ بچوں اور لاپتہ عورتوں اور مردوں کی نشاندہی کرنے میں عجیب مہارت دکھاتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی زندہ بچے' عورت یا مرد کا سراغ لگانے میں وہ کبھی کامیاب نہ ہوئے۔ ان کا کشف جب کبھی بروئے کار آیا فقط لاشوں کا کھوج لگانے کے کام آیا۔ ان تمام حضرات کے عملی کمالات اور پیراسائیکالوجی کے علمی نصاب کا بغور تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مغرب کا یہ سارا کاروبار اسلامی تصوف کی ابجد تک کو نہیں چھوتا۔

انسٹی ٹیوٹ آف پیراسائیکالوجی کے سربراہ ٹین ہاف اکثر مہینے میں ایک ویک اینڈ ہمارے ہاں گزارا کرتے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی تصانیف ضیاء القلوب کا انگریزی ترجمہ کر کے میں نے انہیں دیا تو وہ ششدر رہ گئے۔ ان کا جی تو بہت للچایا کہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائیں' لیکن اپنی ملازمت کے تحفظ کی فکر اور معاشرے کے خوف سے اس سعادت سے محروم رہے۔ البتہ ان کی اسٹینوگرافر مس جین ڈالٹن پر بیٹھے بٹھائے اللہ کا فضل ہو گیا۔ اپنے ادارے میں واپس جا کر پروفیسر صاحب نے ضیاء القلوب کا انگریزی ترجمہ اپنی اسٹینو گرافر کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے ان کے کاغذات کے ساتھ سنبھال کر رکھ دے۔ مسٹر ڈالٹن تجسس کا

شوق رکھنے والی تحقیق پسند لڑکی تھی۔ اس نے ضیاء القلوب کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر ایسا اثر قبول کیا کہ ایک روز ہمارے ہاں آئی اور درخواست کی کہ ہم اسے مسلمان کر لیں۔

میں نے کہا کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر بتائے کہ وہ کیوں مسلمان ہونا چاہتی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ اس راہ سلوک پر چلنے کی آرزو مند ہے جسے اختیار کرنے کا طریقہ ضیاء القلوب میں بتایا گیا ہے۔

ہم نے نہایت خاموشی سے اسے مشرف بہ اسلام کر کے اس کا نام رابعہ رکھ دیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک وہ ہمارے ہاں رہی۔ عفت نے اسے قرآن شریف ختم کروایا۔

پھر وہ ملازمت چھوڑ کر اپنے گاؤں چلی گئی اور عبادت اور ریاضت کے سہارے راہ سلوک پر ایسا قدم رکھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہم جیسے گنہگاروں کی پہنچ سے بہت دور نکل گئی۔

اس نے ساری عمر شادی نہیں کی اور اب کچھ عرصہ سے اس کا مستقل قیام مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں ہے۔

دنیا کے دوسرے بہت سے دارالخلافوں کی طرح ہیگ میں بھی مقامی لوگوں کا ایک ایسا گروہ موجود تھا۔ جو سفارت خانوں کے استقبالیوں میں بن بلائے مہمانوں کی حیثیت سے شریک ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ قریباً قریباً ہر سفارت خانے کی ریسپشنز میں یہ جانے پہچانے "مان نہ مان میں تیرا مہمان" نظر آیا کرتے تھے۔ خوش لباسی اور خوش گفتاری ان کا خاص طرۂ امتیاز تھا اور موقع محل کے لحاظ سے وہ ہلکی پھلکی گپ شپ اور مقامی سکینڈل سنانے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ہالینڈ کی وزارت خارجہ کے افسر ان لوگوں کی طرف نہایت قہر آلود نگاہوں سے گھورا کرتے تھے' کیونکہ ان کے خیال میں غیر ملکی تقریبات میں گیٹ کریش Gate Crash کر کے یہ افراد ڈچ قوم کا وقار گرا رہے تھے' لیکن عام طور پر سفارت خانے ان سے قطع تعلق کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ البتہ کمیونسٹ ممالک کی تقاریب میں شامل ہونے سے یہ لوگ بھی احتیاط برتتے تھے۔

اپنے اپنے وطن کا قومی دن ہر سفارت خانے کے لیے خاص اہمیت اور جشن کا دن Day Red Letter ہوتا ہے۔ اس دن کو منانے کے لیے عام طور پر ایک شاندار استقبالیہ منعقد کیا جاتا ہے' جس میں اکثریت ایسے مدعوئی کی ہوتی ہے جو یوں بھی وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کے ساتھ ملتے جلتے ہی رہتے ہیں۔ بھیڑ بھاڑ' ناؤ نوش' خوش خوری اور سبک گفتاری کے انبوہ کے درمیان یہ استقبالیے بعض اوقات ماہی منڈی کا سا سماں پیش کرتے ہیں۔ جہاں پر ایک دوسرے کے ساتھ سنجیدہ گفت و شنید کا امکان سراسر مفقود ہوتا ہے۔ ایسے ہجوم میں خاموش رہ کر صرف کھانے پینے سے دلچسپی لینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے ہر کوئی ایک غیر معین سی خیر سگالی کی آڑ لے کر ایسی ایسی سمال ٹاک (Small Talk) کرنے میں لگا ہوتا ہے جن کی مثال اور کسی جگہ ملنا محال ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص خوب سے خوب تر کی تلاش میں اس قدر سرگرداں ہوتا ہے کہ گفتگو کے دوران اگر اپنے مخاطب سے زیادہ کوئی اہم شخصیت نزدیک نظر آ جائے تو منہ کی بات ادھوری چھوڑ کر آناً فاناً اس کی طرف رجوع کرنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھا جاتا۔ دنیا بھر کے بہت سے ممالک میں اس طرح کی بے شمار تقاریب میں شریک ہونے کے بعد میرا اندازہ ہے کہ ان استقبالیوں میں کوئی مقصد پورا نہیں ہوتا اور تھوڑی سی وقتی نمائش کو چھوڑ کر ان کا حاصل فقط وقت اور وسائل کا ضیاع ہے۔ ایک بار میں نے وزیر خارجہ مسٹر بھٹو کو ہالینڈ سے یہ تجویز لکھ کر بھیجی تھی کہ ہمارے سفارت خانے اس قسم کے رسمی استقبالیوں پر جو لاکھوں زر مبادلہ ہر سال خرچ کرتے ہیں' اس کا زیادہ بہتر مصرف یہ ہو گا کہ اس رقم سے دوائیاں خرید کر اپنے وطن کے غریب بیماروں میں مفت بانٹ دی جائیں۔ اس خط کا تو مجھے کوئی جواب نہ ملا لیکن مجھے امید ہے کہ ایک نہ ایک روز کوئی نہ کوئی حقیقت شناس ملک جرات سے کام لے کر اس بے معنی بے مقصد اور مسرفانہ رسم سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

ہالینڈ پہنچ کر محکمہ پروٹوکول کے ایک افسر نے مجھے بر سبیل تذکرہ یہ بتایا کہ اگر ہم سور کے گوشت (پورک ہیم' بیکن وغیرہ) سے پرہیز کرتے ہیں تو بازار سے بنا بنایا قیمہ نہ

خریدیں کیونکہ بنے ہوئے قیمے میں اکثر ہر قسم کا ملا جلا گوشت شامل ہوتا ہے۔ اس انتباہ کے بعد ہم لوگ ہالینڈ کے استقبالیوں کا ایک من بھاتا کھاجا قیمے کی گولیاں (Balls Meat) کھانے سے اجتناب کرتے تھے۔

ایک روز قصر امن میں بین الاقوامی عدالت عالیہ کا سالانہ استقبالیہ تھا۔ چودھری ظفر اللہ خان بھی اس عدالت کے جج تھے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ قیمے کی گولیاں سر کے اور رائی کی چٹنی میں ڈبو ڈبو کر مزے سے نوش فرما رہے ہیں۔ میں نے عفت سے کہا کہ آج تو چودھری صاحب ہمارے میزبان ہیں' اس لیے قیمہ بھی ٹھیک ہی منگوایا ہو گا۔ وہ بولی' ذرا ٹھہرو پہلے پوچھ لینا چاہیے۔

ہم دونوں چودھری صاحب کے پاس گئے۔ سلام کر کے عفت نے پوچھا۔ "چودھری صاحب! یہ تو آپ کی ریسپشن ہے۔ قیمہ تو ضرور آپ کی ہدایت کے مطابق منگوایا گیا ہو گا؟"

چودھری صاحب نے جواب دیا۔ "ریسپشن کی انتظامیہ کا محکمہ الگ ہے۔ قیمہ اچھا ہی لائے ہوں گے۔ لو یہ کباب چکھ کر دیکھو۔"

عفت نے ہر قسم کے ملے جلے گوشت کا خدشہ بیان کیا۔ تو چودھری صاحب بولے۔

"بعض موقعوں پر بہت زیادہ کرید میں نہیں پڑنا چاہیے۔ حضور کا فرمان بھی یہی ہے۔"

دین کے معاملات میں عفت بے حد منہ پھٹ عورت تھی۔ اس نے نہایت تیکھے پن سے کہا۔ "یہ فرمان آپ کے حضور کا ہے یا ہمارے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا؟"

ہیگ میں ہمارے قیام کے دوران چودھری صاحب کا معمول تھا کہ اتوار کے روز شام کے چار بجے ہم کار بھیج کر انہیں اپنے ہاں لے آتے تھے۔ رات کا کھانا کھلا کر نو بجے کے قریب ہم انہیں ان کے فلیٹ میں واپس پہنچا آتے تھے۔ ان کی یادداشت غضب کی تیز تھی اور ان کی زندگی کے مختلف ادوار کے متعلق ان کی گفتگو نہایت دلچسپ ہوتی تھی۔ ایک دو گھنٹے وہ ہمارے ساتھ انتہائی انہماک سے Scrabble بھی کھیلا کرتے تھے۔ انگریزی زبان پر اس قدر عبور حاصل ہونے کے باوجود وہ دوسروں کے حروف پر

کن انکھیوں سے نظر ڈالنے سے دریغ نہ کرتے تھے' اور ان چھوٹی چھوٹی چالاکیوں سے بازی جیت کر وہ بچوں کی طرح خوش ہوا کرتے تھے۔

جس روز وہ پہلی بار ہمارے ہاں آئے' ثاقب انہیں دیکھ کر بے حد حیران ہوا اس کی عمر اس وقت دو برس کی تھی۔ چند روز قبل ہم اسے ہالینڈ کے سب سے بڑے چڑیا گھر کی سیر کروا کر لائے تھے۔ چودھری ظفر اللہ خاں کے سرخ و سفید چہرے پر سفید داڑھی اور سر پر سرخ رومی ٹوپی دیکھ کر وہ زور سے بولا۔ "کیا یہ ببر شیر ہے؟"

چودھری صاحب طبعاً چھوٹے بچوں میں بالکل کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ اس لیے ہر اتوار کو جب وہ چار پانچ گھنٹے ہمارے ہاں گزارتے تھے' تو اتنا عرصہ ثاقب قدرتی طور پر نظر انداز رہتا تھا۔ یہ بات اس پر اتنی شاق گزرتی تھی کہ وہ دل ہی دل میں ان کے خلاف شدید دشمنی کے جذبات پالتا رہتا تھا۔ ان جذبات کا اظہار کرنے کے لیے وہ دو موقعوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ ایک تو یہ کہ چودھری صاحب کے ارد گرد منڈلا کر وہ زیرِ لب بڑبڑایا کرتا تھا۔ "توڑ کر پکا کر کھا جاؤں گا۔" عفت نے ثاقب کو بہت ڈانٹا ڈپٹا' ڈرایا دھمکایا کہ وہ معزز مہمان کے قریب جا کر ایسی بدتمیزی کی باتیں نہ کرے' لیکن وہ کبھی باز نہ آیا۔ البتہ غنیمت یہ ہوئی کہ چودھری صاحب اس کا یہ فقرہ کبھی سمجھ ہی نہ پائے۔ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے چودھری صاحب دودھ کے ایک گلاس میں شہد کے دو چمچے ملا کر پیا کرتے تھے جونہی ان کے لیے دودھ کا گلاس لایا جاتا' ثاقب بھی ضرور کہیں نہ کہیں سے آ کر عین سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی وہ شہد کا دوسرا چمچہ دودھ میں ڈالنے لگتے تھے' ثاقب چلا کر کہتا تھا۔ "بس بس ختم ہو جائے گا۔" ہم نے اس کو اس حرکت سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی' لیکن بے سود۔

ہیگ میں محمود ربانی نام کا ایک لبنانی نوجوان بھی رہائش پذیر تھا۔ اس کا بہت بڑا اور وسیع کاروبار تھا اور وہ نہایت امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ چودھری ظفر اللہ خاں کی دوسری بیگم بشریٰ کا بھائی تھا۔ کچھ عرصہ قبل چودھری صاحب اور بشریٰ بیگم

کے درمیان علیحدگی ہو چکی تھی۔ کسی وجہ سے محمود ربانی چودھری صاحب کا مداح نہ تھا۔ بلکہ ان کے خلاف معاندانہ اور سوقیانہ گفتگو کرنے کے موقع کی تلاش میں رہا کرتا تھا۔

وہ کئی بار میرے پاس آیا اور چودھری صاحب کی ذات کو الف لیلوی انداز سے بے نقاب کرنے کی پیش کش کی' لیکن میں اسے خوش اسلوبی سے ٹالتا رہا' البتہ ہیگ میں ایسے افراد کی کمی نہ تھی جو محمود ربانی کو ہاتھوں ہاتھ لے کر سر ظفر اللہ خاں جیسی بین الاقوامی شہرت کے مالک اور عالمی عدالت کے جج کی کردار کشی کی داستانوں کو چٹخارے لے لے کر سننے کے شوقین نہ ہوں۔

ہیگ میں جتنے سفیر متعین تھے۔ ان میں ایک خاص کندۂ ناتراش بھارتی سفیر تھا۔ وہ کسی چھوٹی موٹی ریاست کا راجکمار تھا اور ضرورت سے زیادہ بلند آواز میں باتیں کرنے کا عادی تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں جب یہ غلط خبر پھیلی کہ ہندوستانی افواج نے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے تو اچانک سفارتی حلقوں میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ بعض نجی محفلوں میں بھارتی سفیر یہ ڈینگیں مار رہا ہے کہ وہ عنقریب پلین ۱۸۱۳ میں پاکستانی سفارت خانے کی عمارت پر قبضہ کر کے اس میں ہندوستانی آرٹ اور کلچر کا مرکز کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس قسم کی خبریں سن کر ترکی کے سفیر خاص طور پر مجھے ملنے آئے۔ میں نے ان سے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ جو باتیں ہندوستانی سفیر سے منسوب کی جا رہی ہیں' وہ محض بے بنیاد افواہیں ہیں۔"

ترکی کے سفیرنے مسکرا کر پوچھا۔ "آپ کی اس خوش فہمی کی کیا خاص وجہ ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں کوئی ذمہ دار سفیر بقائمی ہوش و حواس اس قسم کی بیہودہ باتیں نہیں کر سکتا۔"

ترکی کے سفیر استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر رہ چکے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "ہندوستان کی اسٹیٹ پالیسی کی بنیاد کوٹلیہ یا چانکیہ کے فلسفہ پر ہے۔ ان کی سیاسی اور سفارتی بائبل "ارتھ شاستر" ہے۔ غالباً ارتھ شاستر کی رو سے ایسی باتیں کرنا بالکل ممنوع نہیں جو آج

کل یہاں پر ہندوستانی سفیر کے ساتھ منسوب ہو رہی ہیں۔ سنا ہے کہ نئی دہلی میں سفارت خانوں کے علاقوں کو چانکیہ پوری" کہا جاتا ہے۔"

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران پرتگال کا سفیر مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر بار بار ملا کرتا تھا اور زور زور سے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تیز تیز لہجے میں کہا کرتا تھا۔ "ان کو مارو۔ ایسا مارو کہ ان کا سر کچل ڈالو۔"

پرتگال کا سفیر دل سے خواہشمند تھا کہ اس جنگ میں ہندوستان کو شکست فاش نصیب ہو۔ اس کی خفگی کی وجہ یہ تھی کہ کشمیر، جونا گڑھ اور حیدر آباد کی طرح بھارت نے گوآ پر بھی زبردستی قبضہ کر رکھا تھا۔

ایران کے سفیر ایک کمزور شخصیت کے مالک تھے، ان کی سب سے بڑی مضبوطی صرف یہ تھی کہ شہنشاہ رضا پہلوی کے خاندان کے ساتھ ان کا کسی قسم کا رشتہ تھا۔ وہ اس رشتے کے زعم کی کلغی ہر وقت سر پر سجائے رکھتے تھے۔ شراب کے رسیا تھے لیکن بہت جلد انٹا غفیل ہو کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جایا کرتے تھے۔ تھوڑی سی مے نوشی کے بعد وہ بھری محفل میں لکڑی کا کندہ بن کر ایستادہ ہو جاتے تھے اور دیر دیر تک زمین جنبد نہ جنبد گل محمد کی مثال بے حس و حرکت کھڑے رہتے تھے۔

امریکی سفیر پہلے تو میرے ساتھ کچھ کھنچے کھنچے سے رہے لیکن ایک چھوٹے سے واقعہ کے بعد ہمارے درمیان جمی ہوئی سرد مہری کی برف پگھل گئی۔ ایک اتوار کے روز دوپہر کے بارہ بجے کے قریب میں، عفت اور ثاقب سڑک کے کنارے کھڑے ساحل سمندر کی طرف جانے والی ٹرام کا انتظار کر رہے تھے۔ امریکی سفیر اپنی بیوی کے ساتھ کار میں ادھر سے گزرا۔ ہمیں دیکھ کر وہ رک گئے اور پوچھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ میں نے بتایا کہ ہم ساحل سمندر کی طرف جانے والی ٹرام نمبر ۸ کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بولے کہ وہ بھی وہیں جا رہے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ کار میں بیٹھ جائیں۔ میں نے کہا۔ "ہم بیچ پر پکنک منانے ہمیشہ ٹرام ہی سے جاتے ہیں۔ اگر ہم کار

سے جائیں تو ہمارا بیٹا برا مناتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا ہمارے پاس ٹرام میں سفر کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں؟"

یہ سن کر سفیر کی بیوی مسز ٹیلر خوب ہنسی اور بولی۔ "اچھا' آپ اپنے بچے کی خوشی کی خاطر آئیں تو بے شک ٹرام سے' لیکن وہاں پر یوروپا ہوٹل میں آ کر ہمارے ساتھ لنچ ضرور کریں۔"

عفت نے کہا۔ "مسز ٹیلر' اگر وہاں پر بھی آپ نے ہوٹل کے اندر بیٹھ کر لنچ کھانا ہے' تو بیچ پر جانے کا فائدہ؟ ------ میری تجویز ہے کہ آپ اپنی کار چھوڑ دیں اور ہمارے ساتھ مل کر ٹرام میں چلیں۔ آپ کو واقعی پکنک کا لطف آئے گا۔"

معلوم نہیں' انہیں یہ بات اچھی لگی یا بری' لیکن اخلاقاً اور مروتاً انہوں نے اپنی موٹر کار واپس بھیج دی اور ہمارے ساتھ ٹرام میں بیٹھ کر سخیونینگن کی طرف روانہ ہو گئے۔ بیچ پر پہنچ کر ہم نے کہیں سے مونگ پھلی خریدی۔ کہیں سے مکئی کی میٹھی اور نمکین کھیلیں' کچھ آئس کریم کے ڈبے' چند کوکا کولا کی بوتلیں اور اپنے ساتھ لائے ہوئے آلو کے بھرے ہوئے پراٹھے' مٹر قیمہ اور گھر کا بنا ہوا آم کا اچار ان کی خدمت میں پیش کیا۔ خشک ریت پر بیٹھ کر انہوں نے یہ کھانا ایسی رغبت سے کھایا کہ اس کے بعد وہ اور بھی کئی بار اسی طرح ہمارے ساتھ ٹرام میں بیچ پر آئے۔ ہماری دیکھا دیکھی کئی اور سفیر بھی گرمیوں کے موسم میں اتوار کے اسی طرح بے تکلفی سے بیچ پر اکٹھے مل کر پکنک منانے لگے۔ البتہ برطانوی سفیر نے اپنی اکڑفوں بدستور قائم رکھی۔ وہ ہمیشہ اپنی شاندار رولز رائس میں آتا تھا اور تھری پیس سوٹ اور فیلٹ ہیٹ میں ملبوس ریتلے گرد و غبار سے دامن بچاتا۔ پکی سڑک پر کچھ دیر سمندری ہوا کھا کر داد عیش دے جاتا تھا۔

ہیگ میں چینی سفارت خانہ ایک ناظم الامور کے چارج میں تھا۔ اس کے ساتھ ہمارے نہایت اچھے تعلقات تھے اور ہم ایک دوسرے کو اکثر کھانے یا چائے کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ ناظم الامور عوامی جمہوریہ چین کی جدوجہد آزادی کا ایک پرانا اور آزمودہ کار سپاہی

تھا۔ ایک بار چند چینی ماہرین کا کوئی وفد ہیگ آیا ہوا تھا۔ وہ سب چینی سفارت خانے کی بالائی منزل میں قیام پذیر تھے۔ کسی طرح مقامی خفیہ اداروں نے وفد کے ایک رکن کو ورغلا کر چین سے منحرف ہونے اور ہالینڈ میں سیاسی پناہ حاصل کرنے پر آمادہ کر لیا۔ غالباً چینی ناظم الامور اس شخص کی نیت کو بھانپ گیا اور اسے سفارت خانے سے باہر نکلنے سے منع کر دیا۔ پھر ایک روز ایک خاص وقت پر اس شخص نے سفارت خانے کی بالائی منزل کی کھڑکی سے باہر سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ پکی سڑک پر گر کر وہ کافی زخمی ہو گیا۔ عین اس وقت ایک ایمبولینس جو کہیں پاس ہی منتظر کھڑا تھا' غیب سے نمودار ہوا اور زخمی چینی کو اس میں ڈال کر ہسپتال روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز چینی ناظم الامور اور اس کے چند ساتھیوں نے آپریشن تھیٹر میں کام کرنے والے ڈاکٹروں اور نرسوں کی وردی پہنی۔ چہرے پر جراثیم روکنے والی جالیاں اور ماسک چڑھائے اور حلیہ بدل کر ہسپتال پہنچ گئے۔ زخمی چینی کو آپریشن تھیٹر لے جانے کے بہانے انہوں نے اسے ایک اسٹریچر پر لٹایا اور اپنی کار میں ڈال کر چینی سفارت خانے لے آئے۔ جب ہسپتال والوں کو حقیقت حال کا علم ہوا تو ڈچ پولیس نے فوراً سفارت خانے کا محاصرہ کر لیا۔ حکومت زخمی چینی کو اپنے قبضہ میں لے کر دوبارہ ہسپتال لے جانا چاہتی تھی' لیکن ہر سفارت خانے کی چار دیواری مقامی قانون کی دسترس سے باہر ہوتی ہے اور اجازت کے بغیر کوئی شخص کسی سفارت خانے میں داخل ہونے کا مجاز نہیں ہوتا۔ پولیس کا محاصرہ دس روز تک جاری رہا اور وہ زخمی چینی سفارت خانے کے اندر ہی پڑا پڑا دم توڑ گیا۔ اس پر ناراض ہو کر ڈچ حکومت نے چینی ناظم الامور کو ناپسندیدہ شخص قرار دے کر چوبیس گھنٹے میں ہالینڈ سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ ہیگ چھوڑنے سے پہلے وہ چند منٹ کے لیے مجھے بھی الوداع کہنے آیا۔ اس روا روی کے عالم میں بھی اس نے پاکستان کے ساتھ اپنی خیر سگالی کا خوب ثبوت دیا۔

میرے قیام ہالینڈ کے دوران ہم نے "اقبال ڈے" منانے کا اہتمام ہر برس لائڈن یونیورسٹی

میں کیا۔ ایک بار وہاں کے وزیر تعلیم اقبال ڈے کی صدارت کے لیے آئے' تو ان کے ہمراہ ان کے ایک دوست بھی تھے جنہیں میں پہچانتا تھا۔ کئی برس پیشتر ہم دونوں ایک ٹریننگ کورس میں اکٹھے رہ چکے تھے اور اس وقت سے ہمارے درمیان نہایت اچھے تعلقات استوار تھے۔ اب یہ صاب ایک عالمی سطح کے خفیہ ادارے میں کسی اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ اقبال ڈے پر اس تجدید ملاقات کے بعد وہ اکثر ہمارے ہاں آنے جانے لگے۔ کسی وجہ سے وہ یہودیوں سے سخت نفرت کرتے تھے اور کٹر عیسائی ہونے کے باوجود مسلمانوں کے لیے ان کے دل میں کسی قدر نرم گوشہ تھا۔ انہوں نے براہ راست تو مجھے کبھی کوئی راز کی بات نہ بتائی۔ لیکن ان کی باتوں کے بین السطور میں نے بہت سے دلچسپ نتائج اخذ کئے۔ خاص طور پر انڈونیشیا کے صدر سائیکارنو کے خلاف دونوں سپر پاورز کی سازشوں کی تفصیلات اور چند برس بعد پاکستان میں صدر ایوب کے نام ایک ٹاپ سیکرٹ خط میں لکھ دیں۔ انہوں نے اس خط کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا' اور اسے پڑھ کر داخل دفتر کر دیا۔ ممکن ہے کہ انہوں نے میرے خط کے اس حصہ کا برا بھی منایا ہو گا جس میں ان کے خلاف اٹھنے والے طوفان کے امکان کے متعلق کچھ اشارے کئے گئے تھے' لیکن فروری ۱۹۶۹ء میں اقتدار چھوڑنے سے ایک ماہ قبل انہوں نے مجھے کہا' آج میں نے تمہارا ہیگ والا خط فائل سے نکلوا کر دوبارہ پڑھا ہے۔ تم نے جو کچھ لکھا تھا' بڑی حد تک ٹھیک لکھا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟"

ہیگ میں عید کی نماز کی جماعت ہماری رہائش گاہ میں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر محمود جو آج کل کینیڈا میں پروفیسر ہیں' امامت کرایا کرتے تھے۔ وہ اس زمانے میں واخیننگن یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ اس موقع پر بہت سے پاکستانیوں کا اجتماع ہو جاتا تھا۔ ایک عید پر

ایک نووارد ہنس مکھ نوجوان سے میں نے پوچھا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے؟

"میں کمرشل آرٹ سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"میں نے سنا ہے کہ کمرشل آرٹ سکول بہت بھاری فیسیں لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں' فیسیں تو بھاری ہیں۔" وہ بولا۔ "لیکن اللہ اس ملک کے کتوں کو سلامت رکھے' گزارا ہو رہا ہے۔"

اس عجیب پر جواب پر مجھے حیرت ہوئی تو اس نے یوں وضاحت کی۔ "یہاں پر ایک قانون ہے کہ اگر کوئی پالتو کتا کسی شخص کو کاٹ لے یا صرف پتلون پر دانت کے نشان لگ جائیں تو انشورنس کمپنی سے اسے کافی بھاری ہرجانہ مل سکتا ہے۔ دکانوں پر ایسا مسالہ بھی دستیاب ہے جو پتلون کے پائنچوں پر چھڑک پر باہر نکلا جائے تو کتے بے اختیار منہ کھول کر اس کی طرف لپکتے ہیں۔ کمرشل آرٹ کی فیس کی ادائیگی کے وقت میں ان سہولتوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتا رہتا ہوں۔"

مجھے اس نوجوان کی حاضر دماغی' سوجھ بوجھ اور خوش تدبیری پر واقعی رشک آیا۔ ساتھ ہی مجھے افسوس ہوا کہ تیرہ چودہ برس قبل جب میں اسی شہر کی انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اسٹڈیز میں ایک کورس کر رہا تھا' تو اس زمانے میں مجھے یہ گر کیوں نہ معلوم ہوا۔

○ ○ ○

• سی ایس پی سے استعفیٰ

جنرل یحییٰ کے اقتدار میں آتے ہی حالات نے کچھ ایسا رنگ اختیار کیا کہ میں نے سول سروس آف پاکستان سے استعفیٰ دے دیا۔ عمر کے لحاظ سے اس وقت میری ملازمت کے ابھی آٹھ یا نو برس باقی تھے۔

دراصل شروع ہی سے سول سروس میرے لیے بازیچہ اطفال کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ ملازمت کے دوران پہلے بھی میں نے چار بار استعفیٰ دے کر سول سروس کے بے رنگ و بو شیش محل سے نکل بھاگنے کی کوشش کی تھی' لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

پہلی بار جب مجھے استعفیٰ پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی' اس وقت مجھے آئی سی ایس میں داخل ہوئے فقط دس ماہ گزرے تھے۔ میں صوبہ بہار کے ضلع بھاگلپور میں اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر متعین تھا۔ درجہ سوم کی مجسٹریٹی کرنا اور پولیس کے تھانوں کی کارکردگی کا جائزہ لینا میرے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ میری کچہری میں جو مقدمات آتے تھے ان میں ملزموں کی اکثریت یکہ چلانے والوں' رکشا کھینچنے والوں' فٹ پاتھ پر چھابڑی لگانے والوں اور ممنوعہ علاقوں میں بر سر عام پیشاب کرنے والوں کی ہوا کرتی تھی۔ مجھے یہ لوگ بڑے مظلوم اور بے بس دکھائی دیتے تھے' جو چھوٹی چھوٹی بے ضابطگیوں کی پاداش میں زبردستی دھر لیے جاتے تھے۔ میں ایسے مقدموں کی سماعت پر زیادہ توجہ نہ دیتا تھا اور ضروری کارروائی پوری کر کے بعض ملزموں پر ہلکا سا جرمانہ کر دیتا تھا۔ بعض کو عدالت کے برخاست ہونے تک قید سنا دیتا تھا اور اکثریت کو باعزت بری کر دیتا تھا۔ اس پر میرا کمشنر اور سیشن جج دونوں بڑے ناخوش تھے اور وقتاً فوقتاً مجھے تحریری طور پر ڈانٹ پلاتے رہتے تھے۔ البتہ تھانوں کے معاینے کا فرض میں نے بڑی تندہی سے نبھایا۔ میں پروگرام بنائے بغیر کوئی دور افتادہ تھانہ چن کر وہاں اچانک یوں نازل ہو جایا کرتا

تھا جیسے پولیس والے جوئے کے اڈوں پر چھاپہ مارا کرتے ہیں۔ دن دن' رات رات معائنہ کر کے میں تھانوں کی کارکردگی میں ہزاروں کیڑے نکال کر بڑی بڑی طویل رپورٹیں لکھا کرتا تھا۔ اس پر بھاگلپور کا انگریز ایس پی مجھ سے نالاں رہتا تھا۔

انہی دنوں "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع ہوئی اور اس کی شدت نے آناً فاناً بھاگلپور کے پورے ضلع کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کانگرسیوں نے ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ دیں۔ سڑکوں کے پل توڑ دیئے' دریا کی کشتیاں جلا ڈالیں اور ڈاک خانوں' تار گھروں اور تھانوں پر حملے کر کے انہیں تباہ کر دیا۔ ضلع کے ساتھ سارے ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل منقطع ہو گئے اور جگہ جگہ دہشت انگیزی اور تشدد کے واقعات رونما ہونے لگے۔ ایک روز خبر آئی کہ کسی گاؤں میں کانگرسیوں نے ایک پولیس کانسٹیبل کو مار ڈالا ہے اور اس کی لاش کو یونین جیک میں لپیٹ کر ایک درخت سے لٹکا دیا ہے۔ کمشنر' کلکٹر' ڈی آئی جی اور ایس پی نے فوراً حکم لگایا کہ میں موقع واردات پر جاؤں اور تفتیش کے بعد ملزموں کو گرفتار کر کے بھاگلپور لاؤں۔

میں نے دفعدار شیر خاں کی سربراہی میں مسلح گھوڑ سوار پولیس کا ایک دستہ ساتھ لیا اور جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ Mounted Armed Polices پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں سے بھرتی کی جاتی تھی اور برٹش حکومت اسے ہندو اکثریت کے صوبوں میں نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے استعمال میں لاتی تھی۔ اس بندوبست میں آم کے آم گٹھلیوں کے دام تھے۔ ایک طرف تو امن بحال رہتا تھا' دوسری طرف ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف عموماً اور پنجابی اور پٹھان مسلمانوں کے خلاف خصوصاً منافرت کا جذبہ بڑی مضبوطی سے جڑ پکڑتا تھا۔

گاؤں پہنچ کر میں نے اپنا کیمپ لگایا اور مقامی کانگرسی لیڈروں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہاں کا ایک لیڈر بھارت کے سابق صدر بابو راجندر پرشاد کا بیٹا تھا۔ وہ اورینٹل لائف انشورنس کارپوریشن کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ اور چند ماہ پیشتر

میں نے اس سے پانچ ہزار روپے کی انشورنس پالیسی لی تھی۔ میرے بلاوے پر وہ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ میرے کیمپ میں آ گیا۔ پہلے انہوں نے آزادی کی برکات پر جی بھر کے لمبی لمبی تقریریں کیں۔ میں بھی کالج سے تازہ تازہ نکلا ہوا تھا۔ جواباً میں نے بھی غلامی کی لعنت پر حسب توفیق تبصرہ کیا۔ میری باتیں سن کر وہ لوگ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ دفعدار شیر خاں نے چائے تیار کروائی۔ چائے کے دوران کانگرسی لیڈروں نے ازراہ خیر سگالی اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر آئی سی ایس میں میرے ہم خیال لوگ زیادہ تعداد میں ہوتے تو آج پولیس کے سپاہیوں کے قتل و خون کی نوبت ہی نہ آتی۔ میں نے عرض کیا کہ اگر میں پولیس کانسٹیبل کے قاتلوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہا۔ تو میرے یہ خیالات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور ضلع کی انتظامیہ مجھے عضو معطل بنا کر ایک طرف بٹھا دے گی۔ کچھ بحث و مباحثہ کے بعد کانگرسی لیڈر اس بات پر رضامند ہو گئے کہ اگر میں ایک دو روز صبر سے کام لوں تو وہ سپاہی کے قاتلوں کی نشاندہی میں ضرور میری مدد کریں گے۔

گاؤں واپس جا کر راج نرائن پرشاد نے ایک عجیب حماقت کی۔ اس نے کانگرسیوں کے اجتماع میں میرے ہمدردانہ اور معقول رویے کی مبالغہ آمیز تعریف کی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک خاصا بڑا جلوس میرے کیمپ کی جانب روانہ ہو گیا۔ جلوس میں دو ہاتھی' آٹھ دس گھوڑے' کئی ڈھول بجانے والے اور دو ڈھائی سو عوام شامل تھے۔ وہ حکومت کے خلاف کانگرس کے مخصوص نعرے لگا رہے تھے اور بیچ بیچ میں کبھی کبھی "اسسٹنٹ کمشنر جندہ باد" کا نعرہ بھی سنائی دیتا تھا۔ میرے کیمپ کے پاس آ کر جلوس رک گیا۔ اور چند نوجوانوں نے آ کر اصرار کرنا شروع کیا کہ میں ان سے خطاب کروں۔ بڑی منت سماجت سے میں نے انہیں ٹالا اور وہ نعرے لگاتے ڈھول بجاتے خوشی خوشی واپس لوٹ گئے۔ ایک چھوٹی سی بچی نے آگے بڑھ کر گیندے کے پھولوں کا ہار بھی مجھے پہنایا۔

جب یہ خبر بھاگلپور پہنچی تو حکام بالا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اگلی صبح انگریز کلکٹر مسٹر پریڈو' ایس پی مسٹر سٹوک اور اسپیشل ڈیوٹی پر آیا ہوا ایک ڈی آئی جی مسٹر

سٹیوارٹ مشین گنوں اور وائر لیس سے مسلح جیپ میں سوار ہو کر گاؤں پہنچے۔ ان کے ساتھ برما شیل کا بڑا سا ٹینکر تھا جو پٹرول سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

یہ تینوں حضرات بغیر علیک سلیک کے میرے خیمے میں داخل ہوئے۔ میری موجودگی کو سراسر نظر انداز کر کے آپس میں میٹنگ کرنے لگے۔ ان کی گردنیں بپھرے ہوئے خنزیروں کی طرح تنی ہوئی تھیں اور غیظ و غضب سے تمتما کر ان کے چہرے گلے سڑے چقندروں کی طرح سیاہی مائل سرخ ہو رہے تھے۔ ان کا منصوبہ تھا کہ وہ گاؤں کو آبادی سے خالی کر کے پٹرول چھڑک کر آگ لگا دیں اور اسی طرح آس پاس کی فصلوں کو بھی نذر آتش کر دیں تا کہ آزادی مانگنے والوں کی پیٹھ پر خاطر خواہ تازیانہ عبرت لگایا جا سکے۔ جب وہ آپس میں اس نامعقول منصوبے کی تفصیلات طے کرنے لگے۔ تو میں نے انہیں ٹوک کر یاد دلایا کہ یہ خاکسار بھی خیمے میں حاضر ہے اور اپنا مشورہ ان کی خدمت میں پیش کرنے کا خواہشمند ہے۔

ڈی آئی جی نے پستول پر ہاتھ رکھ کر مجھے گالی دی۔ ''شٹ اپ یو باسٹرڈ' خیمے سے دفع ہو جاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔ ڈیم سن آف بچ''

کلکٹر اور ایس پی بھی خوب گرجے برسے لیکن میں اڑا رہا کہ میں اس انکوائری کا انچارج ہوں۔ میرے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ایس پی نے اٹھ کر میرے منہ پر زناٹے سے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ میں نے بھی جواب آں غزل کے طور پر اسی طرح کا زور دار چانٹا اس کے منہ پر دے مارا۔ بھاری بھر کم ڈی آئی جی غصے سے چنگھاڑ کر اٹھا' مجھے گردن سے دبوچ کر ہوا میں اچھالا اور میری پیٹھ پر زبردست ٹانگ رسید کر کے خیمے سے باہر پھینک دیا۔

خیمے سے اس طرح برآمد ہو کر میں نے دفعدار شیر خاں سے مشورہ کیا۔ ہم دونوں نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا کہ سرکاری فرائض کی ادائیگی تو بہرحال لازمی ہے۔ لیکن ایک غریب گاؤں کو آگ کے شعلوں سے بچانا بھی ہمارا فرض ہے۔ چنانچہ میں نے تینوں فرنگی افسروں کے نام ایک حکم نامہ لکھا کہ ہر گاہ کہ آپ کے عزائم حکومت' ملک

اور انسانیت کے مفاد کے سراسر خلاف ہیں اس لیے علاقہ مجسٹریٹ کی حیثیت سے میں آپ کو پابند کرتا ہوں کہ تا حکم ثانی آپ خیمے کے اندر ہی تشریف رکھیں۔ اس حکم

کے خلاف ورزی کر کے اگر آپ میں سے کسی نے باہر نکلنے کی کوشش کی تو سنگین نتائج کی ذمہ داری آپ کی گردن پر ہو گی۔

دفعدار شیر خاں کی ہدایت پر مسلح پولیس کا دستہ گھوڑوں پر سوار ہو خیمے کا محاصرہ کر کے ایستادہ ہو گیا۔ شیر خاں رائفل کندھے پر رکھ کر اندر گیا' اور سلیوٹ کر کے میرا حکم نامہ میز پر رکھنے کے بعد دروازے کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔

خیمے کے اندر پہلے تضحیکی قہقہے بلند ہوئے۔ پھر فصیح و بلیغ گالیوں کا طوفان امڈا۔ کچھ دیر بعد کلکٹر مسٹر پریڈو نے اپنی لمبی یہودیانہ ناک ذرا سی باہر نکال کر صورت حال کا جائزہ لیا تو اس کا سر ربڑ کی گیند کی طرح پچک کر شاک سے اندر چلا گیا۔ اس کے بعد خیمے کے اندر مردنی چھا گئی۔

میں نے ان افسروں کی جیپ سے بیئر کی بوتلیں' گلاس' سینڈوچ کے پیکٹ اور وائر لیس کا سیٹ ایک سپاہی کے ہاتھ خیمے میں بھجوا دیا۔ اور برما شیل کے پٹرول ٹینکر کو حکم دیا کہ وہ فوراً بھاگلپور واپس چلا جائے۔

خیمہ میں کچھ دیر سناٹا رہا۔ صرف بیئر کی بوتلوں اور گلاسوں کی کھن کھن سنائی دیتی تھی۔ پھر ایس پی نے وائر لیس سیٹ چلایا اور بھاگلپور پولیس لائن کے ذریعہ کمشنر کے نام کلکٹر کی جانب سے ایک پیغام لکھوایا۔ جب یہ پیغام کمشنر مسٹر بی کے گوکھلے تک پہنچا تو انہوں نے گورا فوج کا ایک دستہ ساتھ لیا اور بہ نفس نفیس ہمارے کیمپ کی جانب روانہ ہو گئے۔

اس اثنا میں اس سارے واقعے کی خبر متاثرہ گاؤں اور اس کے مضافات میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ خبر کم اور قیاس آرائیاں زیادہ۔ کوئی کہتا تھا کہ انگریز افسروں نے مجھے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے' کسی کا خیال تھا کہ میں نے ایک انگریز افسر

مار ڈالا ہے اور دو کو حراست میں لے رکھا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ افواہوں کے اس ریلے میں آٹھ نو سو افراد کا ہجوم ہمارے کیمپ کے آس پاس جمع ہو گیا۔ کچھ لوگ ہاتھیوں اور گھوڑوں پر سوار تھے۔ کچھ بیل گاڑیوں اور رتھوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی مخلوق پاپیادہ تھی۔ یہ لوگ ڈھول بجا رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے اور فرنگیوں کو بے نقط گالیاں دے رہے تھے۔ کمشنر گوکھلے آیا تو بڑے طنطنے سے تھا کہ میری گوشمالی کرے لیکن مجمع کا یہ رنگ دیکھ کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے دم دبا کر کلکٹر' ڈی آئی جی اور ایس پی کو گورا فوج کی حفاظت میں دیا اور مجھے "باغی" مسلح پولیس کے دستے کے ہمراہ فوراً بھاگلپور حاضر ہونے کی تاکید کی۔

ہیڈ کوارٹر پہنچ کر دفعدار شیر خاں اور اس کے ساتھیوں کو نہتا کر کے کوارٹر گارڈ کر دیا گیا اور مجھے نااہلی' بد انتظامی' سرکشی' حکم عدولی اور مسلح پولیس کو بغاوت پر اکسانے کی چارج شیٹ ملی۔

جواب میں میں نے آئی سی ایس سے دو سطری استعفیٰ لکھ دیا۔

چند روز بعد صوبہ بہار کے انگریز گورنر نے مجھے صبح کے ناشتے پر گورنمنٹ ہاؤس پٹنہ میں مدعو کیا۔ ان کی فرمائش پر میں نے سارا واقعہ حرف بہ حرف بیان کر دیا' جسے سن کر انہوں نے میرا استعفیٰ مجھے واپس کر دیا۔ اور بولے۔ "شاباش' تم نے صورت حال کو مزید پیچیدہ ہونے سے بچا لیا۔ اس پر تمہیں مستعفی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

گورنر کے حکم پر میں نے اس سارے واقعہ کی تحریری رپورٹ بھی ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ اس کے دو ڈھائی ماہ بعد ایک روز مجھے اچانک یہ حکم ملا کہ میں نئی دہلی میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ہوم ممبر کی خدمت میں حاضری دوں۔ ان کا اسم گرامی سر ریجنیالڈ میکسویل تھا۔ یہ ایک مسخرے سے بیمار صورت آدمی تھے۔ اس سانحہ کے متعلق ان کے سامنے کئی متضاد رپورٹیں تھیں۔ گورنر کی رپورٹ میرے حق میں تھی۔ لیکن چند انگریز افسروں نے دیگر ذرائع سے اس کے برعکس رپورٹیں پہنچا رکھی تھیں۔

جب میں مقررہ وقت پر سر ریجنیالڈ کے دفتر پہنچا' تو وہاں کونسل کے ایک مسلمان ممبر سر سلطان احمد بھی موجود تھے۔ ہوم ممبر نے ان کے سامنے مجھے بری طرح لتاڑنا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید سر سلطان احمد میرے حق میں کچھ کلمات خیر ارشاد فرمائیں گے۔ وہ صوبہ بہار کے رہنے والے تھے۔ وہاں کے صحیح واقعات سے پوری طرح واقف تھے اور پٹنہ میں میری ان کی تھوڑی بہت صاحب سلامت بھی تھی۔ لیکن وہ دم سادھے چپ چاپ بیٹھ رہے۔ جب ہوم ممبر آٹھ دس منٹ بول چکے تو انہوں نے قدرے چیخ کر کہا۔ "تم بھی تو کچھ بولو۔" کیا تمہارے منہ میں زبان نہیں۔"

میں نے جواب دیا۔ "سر' میں اپنی تحریری رپورٹ گورنر کو دے چکا ہوں۔ اپنا استعفیٰ بھی پیش کیا تھا۔ اگر آپ چاہیں تو میں تحریری رپورٹ یا استعفیٰ دونوں از سر نو آپ کی خدمت میں پیش کر دوں؟"

"بے تکی اور غیر متعلق باتوں سے میرا وقت ضائع مت کرو۔" انہوں نے جھنجلا کر کہا۔ "کیا تمہارے پاس اپنی صفائی میں ایک بھی معقول دلیل نہیں ہے؟"

میں نے ملائمت سے کہا۔ "سر' آپ آئی سی ایس کے آخری زینے پر ہیں۔ میں ابھی پہلی سیڑھی پر ہوں۔ اگر آپ میری جگہ موقع واردات پر ہوتے تو اپنے وسیع تر تجربے کی روشنی میں کیا قدم اٹھاتے؟"

اس پر ہوم ممبر سرکس کے کلاؤن کی طرح اپنی کرسی پر گھومے' اور ہنس کر بولے۔ "غالباً وہی جو تم نے اٹھایا۔ تمہارا فیصلہ صحیح لیکن طریق کار غلط تھا۔ خیر جاؤ' آئندہ احتیاط برتنا۔"

میں نے پوچھا کہ دفعدار شیر خاں اور اس کے ساتھیوں کا کیا حشر ہو گا؟ سر ریجنیالڈ نے کہا کہ ان کے خلاف بھی کوئی ایکشن نہیں لیا گیا' البتہ انہیں صوبہ بہار سے کہیں اور تبدیل کیا جا رہا ہے۔

جب میں ہوم ممبر کے کمرے سے نکلا تو سر سلطان احمد بھی میرے ساتھ ہی باہر آ گئے۔ انہوں نے بڑی شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مشورہ دیا کہ آئی سی

ایس میں پہلے ہی مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ ملازمت کے سلسلے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ چائے پلائی اور کچھ دیر تک اپنی قومی خدمات کا ذکر کرتے رہے۔

اس کے بعد دوبارہ سابق صدر اسکندر مرزا اور ایک بار فیلڈ مارشل ایوب خاں کے زمانے میں بھی ملازمت سے استعفیٰ دینے کا شوق چرایا' لیکن تینوں بار تیر نشانے پر نہ بیٹھ سکا۔

لیکن جب یحییٰ خاں اپنے بے ضمیر باطن کی اندھیر نگری سے چوپٹ راجہ بن کر ارض پاک پر نازل ہوا' تو میرے اندر کسی دبے ہوئے جنون نے بھی کروٹ لی۔ اس شخص کو میں مدت سے پہچانتا تھا۔ اس کی پیشانی پر بے برکتی اور بد توفیقی کی ایک واضح مہر ثبت تھی۔ جن دنوں آزاد کشمیر کا جہاد زوروں پر تھا' یحییٰ خاں کسی سلسلے میں پونچھ فرنٹ کی طرف آیا۔ میں آزاد کشمیر حکومت کا سیکرٹری جنرل تھا۔ پلندری اور تراڑ کھیل کے درمیان ایک پہاڑی جونجال ہل پر ہمارا سیکرٹریٹ واقع تھا۔ یہاں پر چند کچے مکان تھے جن میں آزاد کشمیر کے صدر' وزراء اور دوسرے ملازمین کی رہائش گاہیں اور دفاتر تھے۔ دن کے وقت سیکرٹریٹ کا کام عموماً درختوں کے سائے میں ہوتا تھا۔ کسی کے پاس لوہے کی کرسی تھی۔ کسی کے پاس چوبی اسٹول' کوئی پتھروں کا چبوترہ بنا کر بیٹھتا تھا' کوئی گھاس پر نیم دراز ہو کر فائلیں چلاتا تھا۔ دن میں کئی بار ہندوستان کے بمبار طیارے ہمارے اوپر سے گزرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی پرواز اس قدر نیچی ہوتی تھی کہ پائلٹ کا چہرہ تک نظر آنے لگتا تھا۔ ایک روز ہم کوئی میٹنگ کر رہے تھے کہ ایک گول مٹول سا فوجی جیپ سے اتر کر ہمارے پاس آیا۔ چہرے پر سوجن اور آنکھوں میں گندے انڈے کی ابلی ہوئی زردی سی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بید کی چھڑی اور دوسرے میں چمڑے کا گول تھیلا تھا۔ آتے ہی اس نے اپنی جھونپڑی میری ناک کے عین سامنے گھمائی اور قدرے ڈانٹ کر پوچھا۔ "یہاں کیا تماشا ہو رہا ہے؟"

میں نے عرض کیا کہ یہ آزاد جموں و کشمیر گورنمنٹ کا سیکرٹریٹ ہے۔

یہ سن کر اس کی توند تسلے میں پڑی ہوئی باسی اوجھڑی کی طرح گدگدائی اور گلے سے غوغو غاغا کی کچھ رندھی ہوئی آوازیں برآمد ہوئیں۔ یہ اس بات کی دلیل تھی' کہ آغا محمد یحییٰ خاں صاحب ازراہ تمسخر قہقہہ فرما رہے ہیں۔ ہمارے سیکرٹریٹ کی ہیئت کذائی پر چند تحقیری اور تضحیکی پھبتیاں کسنے کے بعد آغا صاحب بور ہو گئے اور کچھ دور پرے جا کر درختوں کی اوٹ میں ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ اپنا تھیلا کھول کر انہوں نے کچھ سینڈوچ نوش فرمائے' اور پھر پیاس بجھانے کے لیے غالباً بیئر کی بوتل نکالی۔ رمضان کے دن تھے۔ یہ دیکھ کر میرا پونچھی اردلی جلال میں آ گیا اور اس نے دور ہی دور سے انہیں للکارا۔ "خبردار صاحب! یہ حرام بند کرو' ابھی ابھی مینڈھر کی وادی ہمارے ہاتھ سے نکل کر ہندوستان کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ اب خدا کے غضب کو اور نہ بلاؤ۔ بوتل توڑ دو۔ ورنہ خون خرابہ ہو جائے گا۔"

یحییٰ خاں نے بوتل تو نہ توڑی۔ لیکن جلدی جلدی سامان سمیٹ کر زیر لب بڑبڑاتا ہوا نو دو گیارہ ہو گیا۔

کئی برس بعد مجھے یحییٰ خاں کی زیارت ایک اور رنگ میں نصیب ہوئی۔ جب پاکستان کا دارالخلافہ راولپنڈی اور اسلام آباد منتقل ہو رہا تھا' تو ارباب پنڈی کلب نے کراچی سے تازہ واردان بساط ہوائے دل کی خیر سگالی کے لیے ایک زبردست محفل ناؤ نوش منعقد کی۔ مارشل لاء کا بول بالا تھا۔ کئی سول سرونٹ چند کلیدی فوجی حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ کچھ بیگمات بھی اس مہم میں اپنے خاوندوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے سج دھج کر شریک محفل تھیں۔ اس انجمن میں یحییٰ خاں چہک چہک کر پھدک پھدک کر کبھی ایک بیگم کبھی دوسری بیگم سے ٹکراتا تھا۔ بڑی محنت مشقت کے بعد اس نے ایک طرحدار خاتون کو پھانسا اور اسے گھیر گھار کر باہر لان میں لے گیا۔ کچھ دیر آنکھ مچولی کا کھیل ہوتا رہا۔ بد مستی کے عالم میں یحییٰ خاں کی بہیمانہ ہنہناہٹ اور طرحدار خاتون کے نرم و نازک قہقہے اندر بیٹھے ہوئے دوسرے امیدواروں

کی چھاتی پر مونگ دلتے رہے۔ پھر زور کا دھماکا ہوا' اور سب لوگ بھاگ کر باہر آ گئے۔ خاتون تو ایک میز پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی بڑے آرام سے شیمپئن کا جام پی رہی تھی لیکن غریب یحییٰ خاں کسی کرسی سے ٹکرا کر آدھ موئے دنبے کی طرح زمین پر چاروں شانے چت گرا پڑا تھا۔ یار لوگوں نے دھکیل دھکال کر اسے بٹھایا۔ وہ حنوط شدہ اکڑی ہوئی لاش کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا اور کسی نے اس کی پتلون اوپر کھینچ کر توند کے نشیب پر از سر نو فٹ کی۔

جس زمانے میں فیلڈ مارشل ایوب خاں نے یحییٰ خاں کو فیڈرل کیپٹل کمشن کا چیئرمین نامزد کیا تو میں اس حسن انتخاب پر عش عش کر اٹھا۔ میں نے سوچا کہ فیلڈ مارشل نے غضب کی مردم شناسی سے کام لیا ہے۔ اور بڑی حکمت عملی سے اس شخص کو فوج سے الگ کر کے کیپٹل کمیشن کی پول میں دھانس دیا ہے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے جب سابق صدر ایوب نے اس مخمور اور بد مست شخص کو پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف بنا ڈالا تو یہ راز کھلا کہ یہ مردم شناسی کا اعجاز نہیں۔ بلکہ خود حفاظتی کی ڈھال کے طور پر کوئی معشوق ہے اس پردۂ نگاری میں!

کمانڈر انچیف کے عہدے پر فائز ہوتے ہی آغا صاحب نے فوج کی قیادت کے علاوہ ملک کی صدارت کی ریہرسل بھی شروع کر دی۔ اس ریہرسل کا پہلا زریں موقع یحییٰ خاں کو اس وقت ملا جب ۱۹۶۸ء کی جنوری میں ایک رات فیلڈ مارشل ایوب خاں پر اچانک عارضہ قلب کا شدید حملہ ہوا۔ وہ تو رفتہ رفتہ صحت یاب ہو گئے لیکن یحییٰ خاں کو صدارت کی اس ریہرسل کا کچھ ایسا چسکا پڑا کہ اب اس نے برسر اقتدار آنے کی با ضابطہ منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اس جوڑ توڑ کو پروان چڑھانے کے لیے اسے بڑی آسانی سے ایک سدھا سدھایا بھاڑے کا ٹٹو بھی پاس ہی مل گیا۔ اس شخص کا نام میجر جنرل ایس جی ایم' ایم پیر زادہ تھا۔ جس زمانے میں وہ صدر ایوب کا ملٹری سیکرٹری بن کر آیا تھا' اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر وقت بلا وجہ مسکرانے کی کوشش میں

رہا کرتا تھا۔ ریا کاری کے اس رندے نے اس کے چہرے پر دو ایسی مستقل سلوٹیں تراش رکھی تھیں کہ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی کا منہ چڑھا رہا ہے۔ یوں بھی اس کے کان کی لووّں اور چہرے بشرے کے مساموں سے گنجلک' روباہی' چکمہ سازی' حیلہ گری اور ہچر مچر کا گدلا سا لعاب اس طرح رس رس کر ٹپکتا تھا جیسے چیڑ کے تنے سے لٹکے ہوئے بدھنے میں لیسدار گندہ بیروزہ قطرہ قطرہ پھسل کر گرتا ہے۔ کبھی کبھی جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوتا تھا تو خبث باطن کا تعفن پھٹے ہوئے گٹر کی سڑاند کی مانند چاروں طرف پھیل جاتا تھا اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ لپک کر بہت سی کھڑکیاں کھول دی جائیں اور باہر کی صاف ہوا کو اندر آنے دیا جائے۔

ملٹری سیکرٹری کے طور پر کام کرتے ہوئے میجر جنرل پیر زادہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس پر بھی دل کا دورہ پڑا۔ چند ماہ بعد صدر ایوب نے اسے جی ایچ کیو واپس بھیج دیا۔ یہ واپسی اس کی خواہش اور توقع کے خلاف تھی۔ اس لیے جاتے وقت وہ علی بابا چالیس چور کی مرجینا کی طرح ایوان صدر کے پھاٹک پر اپنی ناکام آرزوؤں کی کالک سے اپنی مراجعت کے عزم کا نشان ڈالتا گیا۔

اس کے بعد جنرل پیر زادہ سے میری ملاقات چند بار بریگیڈیئر ایف آر خاں کے گھر پر ہوئی۔ جہاں وہ مفت کی شراب پینے بالالتزام آیا کرتا تھا۔ شراب کے نشے میں دھت ہو کر وہ اکثر قالین پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ جاتا تھا۔ اور ملک کے بگڑتے ہوئے حالات پر بے ربط قسم کا تبصرہ شروع کر دیتا تھا۔ ایک روز موضوع سخن بدلنے کے لیے میں نے اس سے کہا کہ افواج پاکستان کی پنشن کمیٹی نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ جنرل یحییٰ کی رائے بھی لی جائے کہ کمانڈر انچیف کی پنشن متعین کرنے کے لیے کیا فارمولا وضع کرنا چاہیے؟ یہ سن کر میجر جنرل پیر زادہ فوراً اکڑوں ہو کر بیٹھ گیا۔ شراب کے نشے میں بکھری ہوئی اس کی ٹیڑھی ترچھی آنکھیں سمٹ کر سکڑ گئیں' جیسے پلاسٹک کے باوا کو ملایا جائے تو اس کی آنکھوں کے منکے گھوم

گھوم کر ایک دوسرے کے پاس آ جاتے ہیں۔ اس نے سر جھنجھوڑ کر زور سے تمسخر بھرا قہقہہ لگایا اور بولا۔ "تم اس فکر میں نہ پڑو۔ کمانڈر انچیف کی پنشن تمہارے بس کا روگ نہیں۔ وقت آنے پر آغا جنرل محمد یحییٰ اسے خود ہی طے کر لیں گے۔ انشاء اللہ"

پاکستان کی بحری' بری اور فضائی افواج کے لیے ایک منظم اور باضابطہ پنشن کوڈ تجویز کرنے کے لیے حکومت نے ایک کمیٹی قائم کی تھی۔ میں اس کا چیئرمین تھا۔ اور بریگیڈیئر عبدالحمید کموڈور اے حمید اور گروپ کیپٹن غلام حسن اس کے ممبر تھے۔ یہ تینوں افسر بڑے محنتی' لائق اور واقعیت شناس تھے۔ ایک برس کی لگاتار محنت کے بعد ہم نے کوڈ مرتب کر لی۔ اسے آخری شکل دینے سے پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ بحریہ' فضائیہ اور بری افواج کے سربراہوں سے بھی مشورہ کر لیا جائے کہ ان کے ہم مرتبہ افسروں کی پنشن کن اصولوں کے تحت تجویز کی جائے۔ ایئر فورس اور نیوی کے سربراہوں نے تو اپنی رائے دے دی لیکن جنرل یحییٰ چپ سادھ کر بیٹھ گیا۔ تنگ آ کر میں نے وزیر دفاع ایڈمرل اے آر خاں سے اس بات کا ذکر کیا۔ تو انہوں نے مجھے اپنے ہمراہ لے کر یحییٰ خاں کی خدمت میں خود حاضر ہونے کی حامی بھر لی۔ راستے میں میں نے ان سے پوچھا۔
"وزیر دفاع کے طور پر آپ کو یہ اختیار ہو گا کہ آپ آرمی کے کمانڈر انچیف کو اپنے دفتر میں بھی طلب کر سکیں؟" ایڈمرل صاحب نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔
جی ایچ کیو پہنچ کر پنشن کے متعلق جنرل یحییٰ سے جتنے سوال پوچھے گئے۔ غالباً وہ سب اسے کسی قدر ناگوار گزرے۔ جس غیر سنجیدہ اور لا ابالی انداز میں اس نے سارے مسئلہ کو ٹرخا دیا۔ اس سے عیاں ہوتا تھا کہ کمانڈر انچیف کے عہدے سے پنشن پر جانا اس شخص کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔

ایوب خاں کے زوال پر جس روز یحییٰ خاں نے زندہ ناچ گانے کے ساتھ اپنا جشن تاجپوشی منایا۔ اسی روز جنرل پیر زادہ نے بھی ایوان صدر پر قبضہ کر کے اس میں اپنا آسن جما لیا۔ اس گھر کی غلام گردشوں سے وہ پہلے ہی بخوبی واقف تھا۔ یہ ایک ایسے بے برکتے

دور کی ابتدا تھی جس کی بسم اللہ ہی الٹی پڑی۔ اگلے روز اس کے ایماء پر ایک حکمنامہ جاری ہوا کہ ایڈمرل اے آر خاں' سید فدا حسین شاہ اور میاں ارشد حسین کو صدر پاکستان کا مشیر مقرر کیا گیا ہے۔ یہ خبر پا کر فضائیہ اور بحریہ کے کمانڈر انچیف یحیٰی خاں پر چڑھ دوڑے۔ اور ایک ہنگامی میٹنگ میں انہوں نے مارشل لاء کے مال غنیمت میں اپنا اپنا حصہ طلب کیا۔ یہ میٹنگ اس قدر طوفانی تھی کہ ایک کمانڈر انچیف نے جو عام طور پر شراب نہیں پیتے تھے' برانڈی کا آدھا گلاس منگوایا اور اسے ایک ہی سانس میں غٹاغٹ چڑھا گئے۔

جنرل پیر زادہ نے ہاتھ پاؤں تو بہت مارے لیکن مشیروں کی تقرری کا پروانہ منسوخ ہو گیا اور ان کی جگہ ایک مشترکہ انتظامی کونسل قائم ہوئی' جو جنرل عبدالحمید' ایئر مارشل نور خاں اور ایڈمرل احسن پر مشتمل تھی۔ مرکزی حکومت کی وزارتیں ان تینوں میں بٹ گئیں اور میجر جنرل پیر زادہ یحیٰی خاں کو سنبھال کر بیٹھ نہیں گیا۔ بلکہ انتظامیہ کونسل کو درہم برہم کرنے کی سازش میں مصروف ہو گیا۔

جنرل عبدالحمید خاں اپنے حصوں کی وزارتوں میں زیادہ دخل نہیں دیتے تھے' کیونکہ ان کی زیادہ تر توجہ فوجی ہیڈ کوارٹر کے کام پر مرکوز تھی۔ ایڈمرل احسن بھی میانہ رو انسان تھے۔ البتہ ایئر مارشل نور خاں نے اپنا کام بڑی سنجیدگی سے شروع کیا۔ وزارت تعلیم انہی کے چارج میں تھی۔ وہ چکلالہ کے ایئر فورس بیس میں رہتے تھے اور اسلام آباد سیکرٹریٹ ہیلی کاپٹر سے اڑ کر آیا جایا کرتے تھے۔ بات چیت میں وہ گفتگو کم اور تقریر زیادہ فرماتے تھے۔ اور کام کاج میں پھرتیلی اور نیم پختہ منصوبہ بندی کی نمائش نسبتاً زیادہ ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنے ارد گرد چند پڑھے لکھے ذہین نوجوانوں کا گروپ جمع کر رکھا تھا جن کے خیالات کرید کرید کر وہ اپنے کام میں لایا کرتے تھے۔ کم از کم تعلیم کے متعلق ایئر مارشل کا انداز فکر کچھ اس قسم کا تھا' کہ علم صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا جنہیں سست روی سے ورق ورق الٹنا پڑتا ہے' بلکہ یہ ہوائی جہازوں میں لاد

کر اڑانے والا کوئی کارگو ہے۔ پہلے روز جس طمطراق سے انہوں نے وزارت تعلیم پر نزول اجلال فرمایا۔ اس سے عیاں ہوتا تھا کہ وہ جب چاہیں گے کھڑکی سے منہ نکال کر "کھل جا سم سم" کا نعرہ لگائیں گے۔ اور مارگلا ہل کی چٹانوں سے فوراً علم و ہنر کے چشمے پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگیں گے۔

مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد دس دن تک مرکزی سیکرٹریٹ کا کام کم و بیش معطل رہا۔ کیونکہ نیا حکمران ٹولہ کاروبار سلطنت کی بندر بانٹ میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ہم لوگ دفتر جاتے تھے' چائے پیتے تھے۔ قیاس آرائیاں کرتے تھے اور اس طرح دن بھر کی روزی حلال کر کے گھر آ جاتے تھے۔ ان ایام میں سول سیکرٹریٹ کا اپنی حکومت کے ساتھ ہمارا واحد رابطہ روزانہ اخبارات کے ذریعہ تھا۔

ان دس دنوں میں ملک پر بلا شرکت غیرے نظام سقے کا راج تھا جس نے سالہا سال کی سازشوں کے آواگونی چکر سے نکل کر میجر جنرل پیر زادہ کی صورت میں نیا جنم لیا تھا۔ چام کے دام تو اس نے بعد میں قوم کی کھال سے چلائے لیکن اس دس روز کی بادشاہی میں اس کے زریں کارنامے جو ہم تک مختلف ذرائع سے پہنچتے رہے' کچھ اس طرح کے تھے۔

آج فلاں دفتر کے دروازے سات بج کر بیس منٹ پر بند کر دیئے گئے۔ دیر سے دفتر پہنچنے والوں کو فٹ پاتھ پر دھوپ میں کھڑا کر دیا گیا۔

آج ایک دفتر کی اچانک حاضری بلائی گئی' غیر حاضر ملازمین کی جواب طلبی۔

آج سڑکوں پر جھاڑو پھر گئی۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر غائب۔

آج نالیوں کی صفائی کا حکم نامہ جاری ہو گیا' اور فینائل چھڑکی گئی۔

آج مکھی مارنے کی مہم کا آغاز ہو گیا۔

آج دودھ' دہی اور مٹھائی کی دکانوں پر جالی لگانے کے احکامات صادر ہو گئے۔

آج یہ ------- آج وہ -------

پھر اچانک ایک حکمنامہ آیا کہ کل مورخہ ۴ اپریل صبح دس بجے صدر پاکستان اور

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر آغا جنرل محمد یحییٰ خاں پریذیڈنٹ گیسٹ ہاؤس میں مرکزی سیکرٹریوں اور دیگر اعلیٰ سول حکام سے خطاب فرمائیں گے۔

بارے مارشل لاء ٹولے کو یاد تو آیا کہ پاکستان میں سول سیکرٹریٹ نام کی کسی شے کا بھی کوئی وجود موجود ہے۔ مارشل لاء لگے ہوئے دس روز گزر چکے تھے۔ اس تمام عرصہ میں یہ برگزیدہ لوگ یا تو اقتدار کی باہمی چھینا جھپٹی میں الجھے ہوئے تھے یا دفتروں کی حاضریاں گن کر' سڑکوں پر جھاڑو پھروا کر' یا نالیاں صاف کروا کر قوم کے ہنگامی مسائل حل کرنے میں مصروف تھے۔ اب تک کسی سول افسر کو ایوان صدارت یا چیف مارشل لاء ہیڈ کوارٹر تک باریابی کا شرف حاصل نہ ہوا تھا' بیوروکریسی کے کچھ خاص گرد آلود پیادے جو چڑھتے سورج کی پرستش پر ایمان رکھتے ہیں۔ انتظار کی گھڑیاں گن گن کر چور ہو گئے تھے کہ کب نئے خداوندان نعمت کی زیارت نصیب ہو اور کب وہ اپنا ہدیہ دل ان کے قدموں پر نثار کریں۔ آخر ان کی امید بر آئی۔ میٹنگ کا نوٹس وصول ہوتے ہی ہمہ وقت کورنش بجانے والے کئی افسروں کی خمیدہ کمر میں جی حضوری کی ایک تازہ لچک پیدا ہو گئی۔

اگلی صبح میں پونے دس بجے پریذیڈنٹ گیسٹ ہاؤس پہنچا۔ میٹنگ کا کمرہ پہلے ہی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پہلی صف میں فوجی ہی فوجی بھرے ہوئے تھے۔ صرف ایک کنارے پر چار سینئر سیکرٹری کسی قدر پچکے ہوئے سے بیٹھے تھے۔ باقی افسران کرام پچھلی صفوں پر تھے۔ میں بھی کہیں ایک خالی کرسی پا کر بیٹھ گیا۔

جب دس بجے تو ہم سب کن انکھیوں سے بار بار دروازے کی طرف جھانکنے لگے۔ لیکن یحییٰ خاں ہے کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ آخر عین دس بج کر چالیس منٹ پر آگے آگے یحییٰ خاں اور اس کے پیچھے میجر جنرل پیر زادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ صدر کے چہرے پر ایک درشت گھر کی چمگادڑ کے پروں کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ پیر زادہ کے گالوں پر مصنوعی مسکراہٹ کی دو مستقل سلوٹیں سنجیدگی کا غازہ لگا کر مردار جھریوں کی

طرح لٹکی ہوئی تھیں۔

یحییٰ خاں مغلئی انداز سے چھاتی نکال کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور ہم سب پر حقارت سے بھرپور نظر دوڑائی۔ چند لمحے کمرے میں سناٹا طاری رہا۔ پھر اس نے منہ کھولا اور ڈانٹ ڈپٹ کے لہجے میں بڑی اچھی باتیں کیں۔ اس نے کہا۔ "تم سول سرونٹ بڑے خوشامدی اور چاپلوس لوگ ہو۔ تم ہر نئے حکمران کی ہاں میں ہاں ملا کر اسے غلط راستے پر لگاتے ہو۔ تم اخلاقی جرات سے عاری ہو۔ صحیح رائے دینے سے احتراز کرتے ہو۔ خوشامد اور جی حضوری سے کام لے کر اپنا الو سیدھا کرتے ہو۔ لیکن اب خبردار ہو جاؤ۔ میں سیدھا سادا سپاہی آدمی ہوں۔ میں تمہارے ہتھکنڈوں میں نہیں آؤں گا۔ میرے ساتھ صاف گوئی سے کام لینا ہو گا میں اپنی خوشی سے صدارت کی کرسی پر نہیں بیٹھا۔ تم لوگوں کی مہربانی سے ایوب خاں ناکام ہو گیا۔ ملک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے اسے بچانے کا فرض مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ میں اس فرض کو پورا کرنے آیا ہوں۔ میں اس فرض کو پورا کر کے رہوں گا۔ میں جلد از جلد ملک میں نارمل حالات پیدا کر کے اپنی بیرک میں واپس چلا جاؤں گا۔ تم لوگ بھی ہوش میں آ جاؤ۔ اپنا کام تندہی سے کرو' جرات سے کام لے کر سیدھی بات کرو۔ بے لاگ رائے دو۔ خوشامد سے پرہیز کرو۔ اگر کسی نے کوئی سوال پوچھنا ہے تو خوشی سے صاف صاف پوچھو۔ میں سولجر آدمی ہوں۔"

دس پندرہ منٹ اس قسم کی معقول باتیں کر کے یحییٰ خاں خاموش ہو گیا۔ پھر سول سروس کے ہیڈ پوپ مسٹر ایم ایم احمد نے لب کشائی کی۔ انہوں نے کھڑے ہو کر نماز توبہ کی نیت تو نہ باندھی لیکن بڑے خضوع و خشوع سے اعتراف جرم کا خطبہ دیا' کہ بے شک سول سرونٹ سے بڑی بڑی کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں' لیکن الحمدللہ کہ اب اللہ تعالیٰ نے ملک پر رحم فرمایا ہے۔ ماشاء اللہ آپ جیسا ناخدا اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو نصیب ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم آپ کو اپنی بے لوث خدمت

اور وفاداری کا پر خلوص یقین دلاتے ہیں۔

ایک دو اور حضرات نے بھی حسب توفیق اسی طرح کے خوشامدانہ کلمات خیر ارشاد فرمائے۔

یحییٰ خاں نے اپنا گول مٹول سر ہلا ہلا کر چاپلوسی کا یہ نذرانہ بڑی گرمجوشی سے قبول کیا۔ اس کی گدلی گدلی آنکھوں سے فخر و مباہات کی شعاعیں پھوٹ نکلیں۔ اس کا نیلا نیلا' پیلا پیلا سوجا ہوا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اس کی لٹکی ہوئی ڈھیلی ڈھالی ٹھوڑی گھوڑے کی زین کی طرح کس گئی۔ اور کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

اس خاموشی کو میں نے اٹھ کر توڑا۔

"مسٹر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر" میں نے کھڑے ہو کر یحییٰ خاں کو مخاطب کیا۔

اس طرز تخاطب پر یحییٰ خاں کے کان کھڑے ہوئے۔ پھر اس نے اپنا سر جھٹک کر اوپر اٹھایا اور نیم باز آنکھوں سے گھور گھور کر مجھے دیکھا۔ اگلی صف میں لٹکی ہوئی تمام گردنیں بھی بے پیندے کے لوٹوں کی طرح گھوم کر مجھے تاکنے لگیں۔

"مسٹر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر" میں نے کہا۔ "میں صرف سرکاری ملازم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست کی طرح کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں" یحییٰ خاں نے جھنجلا کر کہا۔ "ہم بھی تو دوست ہیں' ہم کوئی بالشویکی تو نہیں۔"

"سر" میں نے کہا۔ "آپ نے صاف گوئی کا حکم دیا ہے' اس لیے میں جو کچھ کہوں گا بلا کم و کاست عرض کروں گا۔"

"ہاں ہاں' بولو بولو" یحییٰ خاں نے گھڑی دیکھ کر مزید جھنجلاہٹ سے کہا۔

"جناب" میں نے گزارش کی۔ "پچھلے دس برس میں یہ دوسری بار مارشل لاء نافذ ہوا ہے۔ یہ بیچارہ ملک بار بار مارشل لاء کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس لیے ------"

اگلی صف میں پہلے کھسر پھسر ہوئی۔ پھر "اس لیے کیا؟" ------ "اس لیے کیا؟" کی چند طنزیہ سول اور ملٹری آوازیں بلند ہوئیں۔

"اس لیے جناب!" میں نے کہا۔ "جس کام کا بیڑا اٹھا کر آپ تشریف لائے ہیں' اسے

جلد از جلد شروع کر کے ------"

اگلی صف سے پھر انواع و اقسام کے آوازے بلند ہوئے۔

"یہ کیا بات ہوئی جی؟"

"یہ بھی کوئی بات ہے بھلا؟"

"سب کام ہو رہے ہیں۔"

"سب کچھ شروع ہے جی"

ان آوازوں کے حق میں یحییٰ خاں نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ اور مجھے ڈانٹ کر پوچھا۔

"کیا تم صبح اٹھ کر اخبار نہیں پڑھتے؟"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا۔ "آج کل خاص طور پر ضرور پڑھتا ہوں۔ کیونکہ اپنی حکومت کے ساتھ آج کل ہمارا یہی واحد رابطہ ہے۔"

"کیا پڑھتے ہو؟" یحییٰ خاں نے جھلا کر کہا۔ "یہ پڑھتے ہو کہ ہم بیکار بیٹھے ہیں؟ ہم کچھ کام نہیں کر رہے؟"

"جناب!" میں نے کہا۔ "سڑکیں صاف ہو رہی ہیں' نالیوں میں فینائل چھڑکی جا رہی ہے' دکانوں میں جالیاں اور دفتروں میں حاضریاں لگ رہی ہیں اور ------"

"اور' اور کیا؟" یحییٰ خاں نے مجھے غصے سے ٹوکا۔ "کیا یہ ضروری کام نہیں ہیں؟"

"سر" میں نے جواب دیا۔ "یہ کام ضروری تو ہیں لیکن ان کے لیے مارشل لاء ضروری نہیں۔ آپ کے اپنے اعلان کے مطابق مارشل لاء کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ------

ایک بار پھر اگلی صف میں شور برپا ہو گیا۔ بھانت بھانت کی آوازیں بھانت بھانت کا غوغا مچا رہی تھیں۔ ان سب کا خیال تھا کہ یہ شخص خواہ مخواہ اس میٹنگ کا وقت ضائع کر رہا ہے۔ ورنہ مارشل لاء جن مقاصد کو پورا کرنے آیا ہے وہ نہایت خوش اسلوبی سے پورے ہو رہے ہیں۔ میں بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جب یہ شور و شر قدرے فرو ہوا تو میں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے پھر مخاطب کیا۔

"سر" میں نے پوچھا۔ "کیا میں اپنی بات پوری کر سکتا ہوں۔"

یحیٰی خاں نے میری گزارش سنی ان سنی کر کے کہا۔ "چلو چلو' اب چائے پئیں۔"
چائے کے کمرے میں یحیٰی خاں مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میجر جنرل پیر زادہ بھی چیل کی طرح ہمارے آس پاس منڈلاتا رہا۔ یحیٰی خاں بولا۔ "بھئی ہم لوگ صرف کرنے والے خاکروب ہی تو نہیں' تم دیکھتے جاؤ۔ ہم تو بہت بڑے کام کرنے والے ہیں۔"

میں نے جواب دیا۔ "آپ بے شک بڑے بڑے کام کریں لیکن ایک بات کا ضرور خیال رکھیں۔"

"وہ کیا؟" یحیٰی خاں نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ انگریزی فوج میں اگر کوئی ٹامی رومن حروف میں تھوڑا بہت اردو سیکھ لیتا ہے تو اسے برصغیر کے معاملات کا ماہر سمجھ لیا جاتا تھا۔ یہ میجر جنرل پیرزادہ جو ہماری طرف کان لگائے آس پاس منڈلا رہا ہے' کچھ عرصہ صدر ایوب کا ملٹری سیکرٹری رہ چکا ہے۔ اب کہیں اس وجہ سے آپ اسے پاکستانی امور سلطنت کا ماہر نہ سمجھ بیٹھیں۔

یہ سن کر یحیٰی خاں جنگلی بلے کی طرح مجھ پر غرایا۔ اس کی دیکھا دیکھی پیر زادہ بھی غراتا ہوا ہماری طرف لپکا۔ ان دونوں کی غراہٹ آس پاس کھڑے ہوئے کئی دوسرے افسروں نے بھی سنی۔ جب میں اپنے لیے چائے کی پیالی لینے ان کی میز پر گیا تو یہ لوگ بدحواسی میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے وہاں سے فوراً تتر بتر ہو گئے۔ البتہ ہوم سیکرٹری اے بی اعوان صاحب سکون سے کھڑے رہے اور میرے ساتھ باتیں کرتے رہے۔

اگلے روز صبح سویرے راجہ صاحب محمود آباد ہمارے ہاں تشریف لائے۔ ان کے ساتھ میرے دیرینہ برادرانہ تعلقات تھے' انہوں نے مجھے بتایا کہ کل رات یحیٰی خاں نے انہیں اور اسٹینڈرڈ بنک کے مسٹر علوی کو ڈنر پر مدعو کیا ہوا تھا۔ جوں جوں وہسکی کا نشہ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا تھا۔ یحیٰی خاں گفتگو کے باقی تمام موضوع چھوڑ کر اس خاکسار پر برستا

شروع کر دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صبح کی میٹنگ میں لب کشائی کر کے میں نے مارشل لاء اور حکمران ٹولے کے خلاف مزاحمت کا جذبہ اکسانے کی کوشش کی ہے۔

راجہ صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ میں صبر و تحمل سے کام لوں اور اپنی ملازمت کے کے بارے میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کروں۔

اسی روز اسٹینڈرڈ بنک کے مسٹر علوی بھی ہمارے ہاں آئے۔ ان کی ذات شریف سے میرے کوئی مراسم نہ تھے۔ کئی برس پہلے فقط ایک بار کراچی میں سرسری سی ملاقات ہوئی تھی لیکن انہوں نے آتے ہی بڑے بے تکلفانہ اور مربیانہ انداز میں گلہ شروع کر دیا۔ "بھائی صاحب! یہ آپ نے کیا غضب کیا؟ بڑے صاحب کو اس قدر ناراض کر دیا۔ ہم نے تو آپ سے بہت کچھ کام لینا ہے۔ آپ کے لیے ہم نے ایک نہایت اہم پوسٹنگ سوچ رکھی تھی۔ خیر اب بھی وقت ہے' ہم ہر قسم کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔"

علوی صاحب کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ میں حکومت پاکستان کا نہیں بلکہ اسٹینڈرڈ بنک کا ملازم ہوں۔ ان کی باتوں سے یہ اعتماد بھی ٹپکتا تھا' کہ حکومت کا کچھ کاروبار اب غالباً سٹینڈرڈ بنک کے اشاروں پر چلا کرے گا۔ میں نے کسی قدر رکھائی سے علوی صاحب کو ٹال دیا کہ وہ میری ملازمت اور پوسٹنگ کے بارے میں فکر مند نہ ہوں۔ میں یہ معاملات خود ہی طے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔

اس کے بعد غالباً دو بار پھر یحییٰ خاں کے ساتھ میرا آمنا سامنا ہوا۔ ہر بار کی ملاقات پہلے سے بھی زیادہ ناخوشگوار ثابت ہوئی۔ اس کے وجود کی ساری نحوست اور کثافت سنڈاس کی بدرو کی طرح اس کے روئیں روئیں سے بے برکتی کی سڑاند چھوڑتی تھی۔ میجر جنرل پیر زادہ کی بیساکھیوں کا سہارا لے کر جب وہ سربراہ مملکت کی کرسی پر متمکن ہوا تو ایوان صدر کی ہر دیوار پر نوشتہ تقدیر کی صورت میں ذلت اور تخریب کے اٹل اور ناگزیر کتبے آویزاں ہو گئے۔ میرے لیے وہ ساعت نیک تھی۔ جب ایک روز میں نے اچانک ائیر مارشل نور خاں سے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر

اب زندگی کے بقیہ ایام لکھنے پڑھنے میں صرف کروں۔ میرا خیال ہے کہ میرا یہ ارادہ سن کر ایئر مارشل نور خاں کی طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ اور یہ خبر ان کے چہرے پر یوں لگی جیسے ڈاک خانے کی مہر لفافے کے ٹکٹ پر ثبت ہوتی ہے۔

انہی دنوں پیرس میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا ایک اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ چند ماہ پیشتر میں اس بورڈ کا رکن منتخب ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں یونیسکو ایگزیکٹو بورڈ کے ممبر اپنی ذاتی حیثیت سے منتخب ہوا کرتے تھے۔ اس میٹنگ میں شامل ہونے کے لیے میں نے رخت سفر باندھا' تو میجر جنرل پیر زادہ نے کئی طرح کی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی ہر کوشش ناکام رہی۔ پیرس پہنچ کر میں نے خاموشی سے عفت اور ثاقب کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ اور جنرل یحییٰ کو سی ایس پی سے اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔ میرا خیال تھا کہ میرا استعفیٰ چشم زدن میں منظور ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا' ہر کوئی اپنے اپنے اقتدار اور غرور کے گھوڑے پر چڑھا بیٹھا اس بات کا منتظر تھا کہ پہلے میں واپس آ کر ان کے حضور میں سر تسلیم خم کروں تو اس کے بعد وہ میرے استعفیٰ پر غور فرمائیں گے۔ یہ ان کی ناجائز ہٹ دھرمی تھی۔ میں ان سے کچھ مانگ تو نہیں رہا تھا۔ بلکہ اپنی ملازمت کے آٹھ نو سال برضاء و رغبت چھوڑ رہا تھا۔ اس لیے میں نے ان کی یہ طفلانہ ضد ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

خدا خدا کر کے ایک برس کی کشاکشی اور ضدا ضدی کے بعد میرا استعفیٰ تو منظور ہو گیا لیکن میری پنشن تین برس تک بند رہی۔ تین برس کے بعد مجھے پنشن اس وقت ملنا شروع ہوئی۔ جب ملک کو ایک عظیم تباہی اور ذلت کے کنوئیں میں گرا کر یحییٰ خاں اور پیر زادہ ایوان صدر سے نکل بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ طویل عرصہ ہم نے انگلستان کے کئی چھوٹے چھوٹے دیہات میں رہ کر بسر کیا۔ ہر سال اپریل اور اکتوبر کے مہینوں میں پیرس میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا اجلاس منعقد ہوا کرتا تھا۔ ہر اجلاس چار سے پانچ ہفتے تک جاری رہتا تھا۔ وہاں پر کسی نہ کسی طرح تنگی ترشی سے گزارہ کر کے میں

اپنے روزانہ الاؤنس کا کچھ حصہ بچا لاتا تھا۔ اور واپس آ کر رقم عفت کے حوالے کر دیتا تھا۔ جس سے وہ اگلے چھ ماہ تک گھر کا کاروبار چلاتی تھی۔ ان تھوڑے سے پیسوں میں وہ گھر بھی سنبھالتی تھی اور آنے جانے والے مہمانوں کو بھی کسی نہ کسی طرح بھگتاتی رہتی تھی۔ ثاقب کی عمر ان دنوں آٹھ برس کے قریب تھی۔ سکول آنے جانے کے لیے عفت ہر صبح اسے بس کا کرایہ دیا کرتی تھی۔ ایک روز باد و باراں اور برفباری کا شدید طوفان تھا۔ جب سکول بند ہونے کا وقت ہوا تو میں بس اسٹاپ پر جا کھڑا ہوا تا کہ ثاقب کو اپنے ساتھ حفاظت سے گھر لے آؤں۔ کئی بسیں گزر گئیں۔ لیکن ثاقب کسی بس سے نہ اترا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ دور فٹ پاتھ پر وہ افتاں و خیزاں طوفان کے تھپیڑوں میں لڑھکتا ہوا پیدل چلا آ رہا ہے۔ تیز و تند آندھی میں پھسل پھسل کر گرنے سے اس کے دونوں گھٹنے زخمی ہو گئے تھے۔ جن سے خون رس رس کر بہہ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ بس میں کیوں نہیں سوار ہوا؟ اس نے جواب دیا کہ وہ ہر روز سکول سے پیدل ہی آیا کرتا ہے اور بس کا کرایہ بچا کر ہر ہفتے بچوں کا ایک پسندیدہ رسالہ خرید لیتا ہے۔ میں نے عفت کو یہ بات بتائی' تو لمحہ بھر کے لیے تو خوش ہوئی لیکن پھر بے اختیار رو پڑی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ تھوڑے سے پیسوں میں پورا گھر چلانا عفت کی کوئی خاص مہارت تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ عقدہ کھلا کہ وہ مجھے اور ثاقب کو اور ہمارے مہمانوں کو خوب کھلاتی پلاتی رہتی تھی۔ لیکن مشرق کی روایتی خواتین کی طرح اپنی ذات پر شدید نفس کشی اور ایثار سے کام لیتی رہی تھی۔ یہ راز مجھ پر یوں افشا ہوا کہ اچانک اس کی صحت گرنے لگی۔ میں نے ہسپتال جا کر اس کا طبی معائنہ کرایا تو معلوم ہوا کہ اس کے گردوں کا نظام بری طرح بگڑ گیا ہے۔ پے در پے آپریشنوں کی وجہ سے اس کے گردے پہلے ہی سے کمزوری کی زد میں غیر محفوظ تھے لیکن اب ڈاکٹروں کی تشخیص تھی کہ مرض کی پیچیدگی غذا کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

میرا معمول تھا کہ یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کی میٹنگوں میں شامل ہونے کے لیے میں ہمیشہ لندن اور پیرس کے درمیان پی آئی اے سے سفر کیا کرتا تھا۔ غریب الوطنی میں یہ چھوٹا سا سفر بڑا تسکین بخش ثابت ہوتا تھا۔ ایک روز میں پکیڈلی اسٹریٹ میں پی آئی اے کے دفتر اپنا ٹکٹ بنوانے گیا۔ کاؤنٹر پر کام کرنے والی لڑکی کے پاس اس کی ایک سہیلی بھی بیٹھی تھی' جو ایئر ہوسٹس کی وردی میں ملبوس تھی۔ جب میں نے اپنا نام لکھوایا تو ایئر ہوسٹس چونک کر میری طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔ "میں کچھ عرصہ عفت کی ہم محلہ رہی ہوں۔ آپ سے آج پہلی بار ملاقات ہوئی ہے۔ اب ٹکٹ تو بعد میں بنوائیں' پہلے مجھے چائے پلائیں۔"

یہ کہتے ہی وہ کاؤنٹر سے اٹھ کر میری طرف آ گئی اور کہنے لگی۔ "آپ ہرگز نہ سوچیں کہ میں کوئی فارورڈ قسم کی لڑکی ہوں۔ جو مان نہ مان میں تیرا مہمان بن کر ہر کسی کے ساتھ چائے پینے اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ دراصل میں آپ کو ایک ضروری بات بتانا چاہتی ہوں۔"

باہر نکل کر ہم ایک قریبی کافی ہاؤس میں جا بیٹھے۔ وہاں پر اس نے مجھے بتایا کہ چند ہفتے قبل وہ اسلام آباد سے کراچی والی فلائٹ پر اپنی ڈیوٹی ادا کر رہی تھی۔ اسی فلائٹ میں یحییٰ خاں اور چند سینئر افسر بھی سفر کر رہے تھے۔ پرواز کے دوران اس نے یحییٰ خاں کو ایک سینئر پولس افسر پر گرجتے برستے سنا کہ قدرت اللہ شہاب کو واپس لا کر اب تک ان کے حضور پیش کیوں نہیں کیا گیا۔ یحییٰ خاں نے پولیس افسر کو دھمکی دی کہ اگر اس حکم کی تعمیل میں مزید تاخیر ہوئی تو وہ اس افسر کی چمڑی اتار دیں گے۔

اتنی بات بتا کر لڑکی نے مجھے مشورہ دیا کہ مناسب یہی ہے کہ میں لندن اور پیرس کے درمیان پی آئی اے کا سفر کرنے کا خطرہ مول نہ لوں۔ اس نے اپنا نام بتانے سے انکار کر دیا اور یہ کہہ کر پی آئی اے کے دفتر واپس چلی گئی کہ "اگر عفت کو کوپر روڈ پر اپنی کوئی ہمسایہ سہیلی یاد ہے' تو وہ شاید مجھے پہچان جائے۔"

گھر آ کر میں نے عفت کو یہ واقعہ سنایا۔ اس نے اپنی بہت سی ہمسایہ سہیلیوں کے نام اور حلئے بتائے لیکن ہماری یہ فرشتہ رحمت ہمیشہ گمنام ہی رہی۔

جس چھوٹے سے گاؤں میں ہم رہتے تھے' وہاں سے کچھ فاصلے پر جلنگھم کا بارونق شہر تھا۔ اس کی ہائی اسٹریٹ میں خود کار واشنگ مشینوں والی ایک لانڈری تھی۔ میں ہر پیر کے روز میلے کپڑوں کا ایک بنڈل وہاں لے جا کر دھو لایا کرتا تھا۔ ایک دن میں لانڈری پہنچا تو باہر فٹ پاتھ پر بڑی بڑی مونچھوں والا ایک لمبا تڑنگا پاکستانی جناح کیپ اوڑھے کھڑا تھا۔ اس نے زور سے کھنکار کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر اپنا ادھ بجھا سگریٹ میرے کندھے پر پھینک کر پنجابی زبان میں بولا۔ "ارے دھوبی کے بچے' کپڑے مشین میں ڈال کر باہر آؤ۔ تمہارے ساتھ باتیں کرنی ہیں۔

یہ شخص میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ اس کی بے تکلفی کے انداز میں ایک خوفناک جارحیت کا عزم جھلک رہا تھا۔ مجھے فوراً ایئر ہوسٹس کی بات یاد آ گئی۔ لانڈری کی دیکھ بھال کرنے والی خاتون مجھے جانتی تھی۔ مشین میں کپڑے ڈالتے ہوئے میں نے اس کو بتایا' کہ باہر فٹ پاتھ پر جو شخص منڈلا رہا ہے غالباً وہ یہاں پر میرے خلاف کوئی واردات کرنے آیا ہے' تم فوراً پولیس کو ٹیلیفون پر خبردار کر دو۔

میں لانڈری سے باہر آیا' تو وہ شخص لپک کر مجھ سے بغل گیر ہوا۔ میں نے پوچھا۔ آپ کی تعریف؟

اس نے دو چار مغلظات سنا کر کہا۔ "میری تعریف باتوں سے نہیں بلکہ ہاتھوں اور لاتوں سے ہو گی۔"

اس نے دوستانہ طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور کہا۔ "بیٹا! اب سے تم میرے قبضہ میں ہو۔ اب کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا۔ کسی کی جانب کوئی اشارہ نہ کرنا۔ جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کرنا۔ ورنہ یاد رکھو ہمارا ایک آدمی تمہارے گھر کے اندر متعین ہے۔ دوسرا آدمی سکول کے باہر بیٹھا تمہارے بیٹے کا انتظار

کر رہا ہے۔ ہم رحملی سے کام لے رہے ہیں۔ ہماری بے رحمی کو بیدار کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھنا۔"

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میرے ساتھ ابھی اپنے گھر چلو۔ اپنا پاسپورٹ اور سامان اٹھاؤ۔ آج شام کی پرواز سے کراچی روانہ ہونا ہے۔"

میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ تو اس نے پھر چند مغلظات بک کر کہا۔ "دیکھو اب کوئی چالبازی نہ سوچنا۔ ورنہ ہم آج شام کو تمہاری بیوی اور بچے کو اپنے ساتھ لے کر کراچی میں چل دیں گے پھر تم خود ہی سر کے بل ان کے پیچھے آؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے منظور ہے' میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ آؤ اب گھر چلیں۔"

"گھر کیسے چلیں؟" اس نے بگڑ کر کہا۔ "تم اس شہر سے واقف ہو۔ ایک ٹیکسی منگاؤ۔"

میں نے اسے بتایا کہ یہاں پر ٹیکسی ٹیلیفون کر کے ہی منگوائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ہم دونوں لانڈری کے اندر گئے۔ لانڈری والی خاتون کو میں نے اپنا ایڈریس دیا اور درخواست کی کہ وہ ٹیلیفون کر کے ایک ٹیکسی بلا دے جو ہمیں اس ایڈریس پر پہنچا آئے۔ خاتون نے ٹیلیفون کرنے کے بعد بتایا کہ ٹیکسی پانچ سات منٹ میں آ جائے گی۔

ہم دونوں باہر آ کر فٹ پاتھ پر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے ہی ہوئے تھے کہ ایک پولیس کار لانڈری کے عین سامنے آ کر رک گئی۔ اس میں تین باوردی پولیس کانسٹیبل سوار تھے۔ ان میں سے ایک کار سے اتر کر اندر لانڈری میں چلا گیا۔ انہیں دیکھ کر میرا پاکستانی ساتھی شدید گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا اور بولا۔ "یہ حرامی یہاں کیا لینے آئے ہیں؟"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "ان کے کپڑے بھی میلے ہو جاتے ہوں گے' شاید دھلوانے آئے ہوں۔"

چند منٹ بعد ہماری ٹیکسی آ گئی اور ہم دونوں اس میں سوار ہو کر گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ایک اسی وضع قطع کا لمبا تڑنگا پاکستانی کالے

رنگ کی جناح کیپ پہنے ہمارے ڈرائنگ روم میں بیٹھا چائے پی رہا ہے۔ عفت کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑا ہوا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھے بتایا کہ ان لوگوں کا ایک ساتھی ثاقب کے سکول کے باہر بھی اس کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ لانڈری والی وہی پولیس کار ہمارے گھر کے سامنے آ کر رکی۔ دو کانسٹیبل گھنٹی بجا کر ہمارے گھر میں داخل ہوئے تو عفت نے واویلا مچایا کہ ان غنڈوں کا ایک ساتھی ہمارے بیٹے کی تاک میں اس کے سکول کے باہر بیٹھا ہے۔ یہ سنتے ہی تیسرے کانسٹیبل نے عفت کو اپنے ساتھ پولیس کار میں بٹھایا اور چند منٹ بعد وہ سکول کے باہر منڈلاتے ہوئے ایک مشٹنڈے کو جو کالی جناح کیپ پہنے تھا' اپنے ساتھ ہمارے ہاں لے آئے۔

ایک کانسٹیبل نے میرے اور عفت کے بیانات لکھے۔ دوسرے نے پاکستانیوں کے کاغذات اور شناختی کارڈ وغیرہ دیکھ کر کچھ خانہ پری کی اور پھر وہ تینوں پاکستانیوں کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اسی شام وہی تینوں انگریز پولیس کانسٹیبل پھر ہمارے ہاں آئے۔ انہوں نے معذرت کی کہ ان کے علاقے میں ہمارے ساتھ ایسا ناخوشگوار سانحہ پیش آیا۔ اور ساتھ ہی ہمیں یقین دلایا کہ ہم مطمئن رہیں کہ اب دوبارہ اس قسم کا کوئی واقعہ رونما نہ ہو گا۔

لیکن ان کی اس یقین دہانی نے عفت پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس واقعہ نے اس کے دل کا سکون مکمل طور پر چھین لیا۔ وہ رات کو بار بار اٹھ کر ثاقب کو دیکھتی تھی کہ وہ صحیح سلامت اپنے بستر پر موجود ہے یا نہیں۔ جتنا عرصہ وہ سکول میں رہتا تھا وہ قریب کی لائبریری میں بیٹھ کر یہ جائزہ لیتی رہتی تھی کہ سکول کے آس پاس کوئی مشتبہ شخص منڈلا تو نہیں رہا۔ چند ہی روز میں اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایمن آباد والی چندراوتی کی طرح عفت کے بدن کا کندن بھی سنار کی کٹھالی میں پگھل پگھل کر ریزہ ریزہ ہو رہا ہے۔ میں اسے پھر

ہسپتال لے گیا۔ طویل معائنہ کے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ان کا مشورہ تھا کہ میں اسے امریکہ لے جاؤں۔ جہاں ان دنوں اس مرض کے کچھ کامیاب آپریشن ہوئے تھے۔

میں نے جنرل یحییٰ خاں کو کئی خط لکھے اور تاریں بھیجیں کہ میری اپنی تنخواہ سے کاٹا ہوا پراویڈنٹ فنڈ حکومت کے پاس جمع ہے' مجھے وہ فوراً ادا کر دیا جائے تا کہ میں اپنی بیوی کا علاج کروانے کے قابل ہو سکوں۔ لیکن جواب ندارد۔

استعفیٰ دینے کے تین برس بعد جب مجھے میری پنشن ملنا شروع ہوئی اور میرا پراویڈنٹ فنڈ ادا ہوا تو اس وقت تک عفت کا مرض لا علاج ہو چکا تھا۔

انگلستان میں یہ تین برس میرے لیے بڑے سبق آموز ثابت ہوئے۔ بنی نوع انسان کی طوطا چشمی کے علاوہ اس کی مروت' رواداری اور خلوص کا بیک وقت خوب تجربہ ہوا۔ خاص طور پر لندن میں پاکستانی سفارت خانے میں جب یہ خبر پھیلی کہ یحییٰ خاں کی ناراضگی مول لے کر میں نے استعفیٰ دے دیا ہے تو ایمبیسی کے اسٹاف کی اکثریت میرے سائے سے بھی دور بھاگنے لگی۔ ان میں کچھ افسر ایسے بھی تھے' ماضی میں جن کی میں نے کچھ نہ کچھ مدد کی تھی۔ البتہ سفارت خانے میں ایجوکیشن کونسلر تنویر احمد خان کا رویہ ان سب سے مختلف تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے برملا ملتے تھے۔ جب کبھی میں لندن آتا تھا۔ تو تنویر ہر بار اپنی کار میں مجھے وکٹوریہ ریلوے اسٹیشن سے لے جاتے تھے۔ بلا خوف مجھے اپنے دفتر میں بٹھاتے تھے اور شب بسری کے لیے اپنے ہاں لے جاتے تھے۔ گھر آ کر وہ اور ان کی بیگم رشیدہ اپنا کمرہ (Master Bed Room) مجھے دے دیتے تھے۔ اور میاں بیوی دونوں اپنے بچوں کے چھوٹے کمرے میں جا کر سو رہتے تھے۔ میں بار بار احتجاج کرتا تھا کہ میری خاطر وہ اس قدر تکلیف نہ اٹھایا کریں۔ لیکن انہوں نے اپنا یہ معمول کبھی ترک نہیں کیا۔ سفارت خانے کے چند بڑے افسروں نے انہیں کئی بار مشورہ دیا کہ وہ میرے ساتھ اس طرح بر سر عام میل جول نہ رکھیں۔ لیکن تنویر صاحب نے اس طرح کے مشوروں اور انتباہ پر کبھی کان نہ دھرا۔ ان کی اس شفقت

اور حسن سلوک کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ آج کل وہ بنگلہ دیش میں ہمارے سفیر ہیں۔ خدا انہیں مزید ترقیاں عطا فرمائے۔

میرے دوست اور رفیق کار محمد سرفراز کے برادر نسبتی نسیم غور کی یاد بھی میرے دل میں زندگی بھر تازہ رہے گی۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں' جن کا وسیع کاروبار ہندوستان' پاکستان' جرمنی اور انگلستان میں پھیلا ہوا تھا۔ لندن کے مضافات سٹن (Sutton) میں ان کا ایک خوبصورت اور شاندار فلیٹ ہے۔ لندن میں پہنچتے ہی انہوں نے اپنا فلیٹ ہمارے حوالے کر دیا۔ جس میں ہم کئی ماہ رہے۔ بعد ازاں ہم پہلے نوٹنگھم اور پھر جلنگھم کے قریب وگمور نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں منتقل ہو گئے وہاں پر نسیم غور نے ہمیں ایک چھوٹا سا مکان خریدنے کے لیے چھ ہزار پونڈ کی خطیر رقم قرض حسنہ کے طور پر دے دی۔ اس رقم کی انہوں نے کوئی رسید تک نہ لی۔ ۱۹۷۲ء میں یحیٰی خاں کی معزولی کے بعد جب ہم پاکستان آنے لگے تو یہ مکان ہم نے بیچ دیا۔ اس وقت تک ہر چیز کی قیمت بڑھ چکی تھی۔ اس لیے اس مکان کی قیمت فروخت اس کی قیمت خرید سے زیادہ ملی۔ لیکن نسیم غور نے اپنے قرض حسنہ کے فقط چھ ہزار پونڈ ہی واپس لینا منظور کیا۔

نسیم غور باغ بہار طبیعت کے آدمی ہیں۔ شگفتہ دلی' بذلہ سنجی اور خوش اخلاقی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ جب کبھی وہ لندن آتے تھے تو وگمور سے ہمیں اپنی کار میں بٹھا کر اپنے سٹن والے فلیٹ میں لے جاتے تھے۔ انواع و اقسام کے پاکستانی کھانے پکانے میں انہیں خاص مہارت تھی۔ بارہا انہوں نے ہمیں اپنے ہاتھوں سے بڑے لذیذ کھانے پکا کر کھلائے۔ ثاقب سے وہ بے حد پیار کرتے تھے۔ ثاقب بھی آج تک ان کا گرویدہ ہے۔

اسی زمانے میں راجہ صاحب محمود آباد بھی لندن میں مقیم تھے۔ وہ ریجنٹ پارک والی مسجد کمیٹی کے ڈائریکٹر تھے اور وہیں پر بالائی منزل کے چند کمروں میں رہتے تھے۔ انہوں نے ہمیں کئی بار اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ نوابی طرز کے خوش ذائقہ کھانے وہ خود

پکایا کرتے تھے۔ ایک روز عفت نے انہیں باورچی خانے میں ہانڈیاں پکاتے ہوئے دیکھا تو اس کے آنسو آ گئے کہ اتنا بڑا رئیس اور تحریک پاکستان کا ممتاز کارکن خود باورچی خانے میں کام کر رہا ہے۔ وفات تک انہوں نے ہمارے ساتھ شفقت اور محبت ہی کا برتاؤ روا رکھا ہے۔

اس طرح کی روشن مثالوں کے برعکس لندن میں پاکستانی سفارت خانے کے ایک ذمہ دار افسر کا رویہ بھی قابل ذکر ہے۔ ان حضرت کو میں لاہور میں ایک معمولی سے عہدے سے اٹھا کر ایوان صدر میں لے آیا تھا۔ ترقی پر ترقی کرتے وہ لندن میں ہمارے سفارت خانے کے ایک اہم شعبے کے سربراہ بن گئے۔ جب تک میں ملازمت میں رہا وہ اور ان کی بیگم صاحبہ وقت بے وقت میری اتنی خوشامد اور خاطر تواضع کرتے تھے کہ مجھے الجھن اور پریشانی محسوس ہونے لگتی تھی۔ لیکن جونہی میں نے ملازمت سے استعفیٰ دیا انہوں نے یکایک اپنی آنکھیں پھیر لیں۔ پورے تین برس انہوں نے میرے ساتھ ٹیلیفون پر بھی بات تک نہ کی۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً لندن کے اردو اخبارات اور پاکستان میں ایک دو اخباروں میں میرے خلاف من گھڑت خبریں بھی آنا شروع ہو گئیں۔ ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ میرے خلاف ہر خبر چھپوانے کے لیے پانچ سے دس پونڈ تک معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ مجھے شک ہے کہ یہ مہم انہی حضرت کی سرکردگی میں چل رہی تھی۔ واللہ اعلم اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔

تیری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایت زمانہ

○○○

- یونیسکو

پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا میں امن و امان کو فروغ دینے کے لیے لیگ آف نیشنز وجود میں آئی تھی' لیکن یہ انجمن کفن چوروں کی جماعت ثابت ہوئی اور اقوام عالم کی بہت سی قبریں آپس میں تقسیم کرنے کے بعد اس نے آرام سے جنیوا میں دم توڑ دیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ کی تنظیم نو' یو این او نے جنم لیا۔ اس ادارے کا رہنما اصول جس کی لاٹھی اس کی بھینس ہے۔ جب کوئی لاٹھی والا طاقتور ملک جارحیت سے کام لے کر کسی چھوٹے اور کمزور ملک کی بھینس زبردستی ہنکا کر لے جاتا ہے تو یو این او فوراً جنگ بندی کا اعلان کر کے فریقین کے درمیان سیز فائر لائن کھینچ دیتی ہے۔ جنگ بندی کے خط پر یو این او کی نامزد فوج اور مبصر متعین ہو جاتے ہیں۔ جو اس بات کی خاص نگہداشت رکھتے ہیں کہ مسروقہ بھینس دوبارہ اپنے ملک کے پاس واپس نہ پہنچنے پائے۔ اس کے بعد یہ سارا معاملہ جنرل اسمبلی اور سکیورٹی کونسل کی قرار دادوں میں ڈھل ڈھل کر نہایت پابندی کے ساتھ یو این او کے سرد خانوں میں جمع ہوتا رہتا ہے۔

نیویارک میں جگہ کی کمیابی کے باعث مختلف شعبوں کے اپنے اپنے سرد خانے یو این او کے دم چھلا بین الاقوامی اداروں کے نام سے بہت سے دوسرے یورپی ممالک میں قائم ہیں۔ غالباً سیاسی گرد و غبار' موسمیاتی تپش و حرارت اور ناخواندگی و افلاس کی گرم بازاری کے پیش نظر مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید سمیت کسی افریقی اور ایشیائی ملک کو اقوام متحدہ کے کسی بڑے ذیلی ادارے سے نہیں نوازا گیا۔ البتہ ابھی حال ہی میں Prog کے متعلق ایک بین الاقوامی ادارہ نیروبی میں قائم ہوا ہے۔ جس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ وہ عین خط استوا کے قریب واقع ہے۔

اقوام عالم میں تعلیم' سائنس اور ثقافت کی ترقی و تعمیر و ترویج کے لیے یو این او کا جو

ادارہ پیرس میں قائم ہے اس کا نام یونیسکو (UNESCO) ہے۔

(United Nation's Education, Science and Culture Organization)

اس کا ایک خاص طرۂ امتیاز یہ ہے کہ یہ ادارہ اپنے بجٹ کا تقریباً دو تہائی حصہ پیرس میں متعین اپنے ہیڈ کوارٹر اسٹاف پر صرف کرتا ہے اور باقی ایک تہائی حصہ ساری دنیا میں تعلیم' سائنس اور ثقافت کے فروغ پر لگاتا ہے۔ یعنی سارے عالم میں تیس روپے کے تعلیمی سائنسی اور ثقافتی پروگراموں پر عمل درآمد کے لیے یونیسکو کا ہیڈ کوارٹر پیرس میں بیٹھے ہوئے اسٹاف پر ستر روپے خرچ کرتا ہے۔

شروع میں یونیسکو کا ہیڈ کوارٹر ایک پانچ منزلہ عمارت میں سمایا ہوا تھا۔ جوں جوں یونیسکو کا بجٹ بڑھتا گیا' اسی رفتار سے اس کے عملے میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نوبت بہ ایں جا رسید کہ ایک دوسری عمارت بھی تعمیر ہوئے جس کی بلندی گیارہ منزلہ ہے۔ سنا ہے کہ بتدریج بڑھتے ہوئے اسٹاف کی ضروریات کے لیے یہ دو عمارتیں بھی اب ناکافی ثابت ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ مضافات میں ایک نہایت خوبصورت محل نما وسیع و عریض بنگلہ بھی ہے جو خاص الخاص لوگوں کے لیے مناسب اوقات پر عیش و نشاط فراہم کرنے کے کام آتا ہے۔

یونیسکو کی یہ ترقی معکوس اس کے ایک فرانسیسی ڈائریکٹر جنرل موسیو رینے ماہیو کے زمانے میں ہوئی۔ یہ صاحب نیچے درجے کی اسامیوں سے ترقی کرتے کرتے اس عہدہ جلیلہ پر پہنچے تھے اور پورے بارہ برس تک یونیسکو کے سیاہ و سفید پر چھائے رہے۔

یو این او کے دیگر بین الاقوامی اداروں کی طرح یونیسکو کی خود مختاری ہر نوعیت کے احتساب سے بالا تر ہے۔ رینے ماہیو جیسا کائیاں ڈائریکٹر جنرل یونیسکو میں دونوں سپر پاورز کی ترازو کے پلڑے قریباً قریباً ہم وزن رکھتا تھا۔ دوسرے ممالک کے نمائندے اگر کسی موضوع پر کوئی حرف شکایت زبان پر لاتے تھے تو ان کا منہ بند کرنے کے لیے سیکرٹریٹ میں ملازمتوں کی رشوت فوراً کام آتی تھی۔ کچھ لوگ دنیا بھر میں سفر کرنے والے کمشنوں اور کمیٹیوں میں شمولیت پر ہی آسانی سے رُخا دیئے جاتے تھے۔ بعض لوگوں کی قیمت صرف

اتنی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً یونیسکو کے خرچ پر پیرس آتے جاتے رہیں۔ ان حربوں سے ہر طرح کی تنقید و تنقیص کا راستہ بند کرنے کے بعد جنرل کانفرنس اور ایگزیکٹو بورڈ کا کوئی اجلاس ڈائریکٹر جنرل کا بال تک بیکا نہ کر سکتا تھا۔

خود حفاظتی کا یہ حصار کھینچ کر موسیو رینے ماہیو نے بارہ برس تک یونیسکو میں اپنی اندر سبھا قائم کئے رکھی۔ ان کا زمانہ اخلاقی اقدار کی پامالی نا انصافی' خویش پروری اور جنسی بے راہروی کا دور تھا۔ انہوں نے اپنی ایک داشتہ کو اپنے ذاتی عملے میں ایک بڑی اسامی پر مامور کر رکھا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرا بہت سا اسٹاف بھی اسی روش پر چل نکلا۔ جب میں پہلی بار یونیسکو کی جنرل کانفرنس میں شریک ہونے پیرس گیا' تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دفتر کے بہت سے کابک نما کمروں میں ایک ایک مرد کے سامنے ایک ایک عورت سج دھج کر بیٹھی ہے اور دونوں ٹکٹکی باندھے ایک دوسرے کی جانب ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق لگاتار دیکھ رہے ہیں۔ یونیسکو کی غلام گردشوں میں گھومتے پھرتے یہ بھی نظر آیا کہ کہیں کہیں یہ جوڑے اسی محویت کے عالم میں سارا سارا دن آمنے سامنے گلدانوں کی طرح سجے رہتے تھے۔ اس زمانے میں یہ دستور عام تھا کہ یونیسکو کے کئی منچلے انٹرنیشنل سول سرونٹ اپنی محبوباؤں کو سیکرٹری کے طور پر بھرتی کر کے اپنے دفتر کے کمرے کی زینت بنا لیتے تھے۔ انہی دنوں فرانس میں ایک اسٹیج ڈرامہ انتہائی مقبول ہو رہا تھا جس کا موضوع پیرس کی سڑکوں پر ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے مرد حضرات کی بے بسی اور بے چارگی تھا۔ ڈرامے کا مرکزی کردار ایک بین الاقوامی ادارے (غالباً یونیسکو) کا ملازم تھا جس کی ایک بیوی گھر میں منتظر ہوتی تھی۔ ایک داشتہ کو دفتر سے گھر پہنچانا ہوتا تھا اور اس کے بعد پیرس کے مضافات میں دوسری داشتہ سے ملنے کے لیے جانا بھی ہر روز لازمی تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک جام اس مظلوم عاشق مزاج بین الاقوامی سول سرونٹ کے پروگرام کو اس قدر درہم برہم کر دیتا تھا کہ اس کی زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی جاتی تھی۔ جس میں شیرینی گھولنے کے لیے یونیسکو کا بجٹ

ہر سال اس کی تنخواہ اور دیگر مراعات میں خاطر خواہ اضافہ کرتا رہتا تھا۔ جس طرح ڈائریکٹر جنرل اپنی من مانیاں کرنے میں مختار کل تھا، اسی طرح اس کا منظور نظر عملہ بھی اپنے ماتحتوں پر ہر طرح کی مشق ناز آزمانے میں آزاد تھا۔ لیکن فرعونے رامو سے، رینے ماہیو کی فرعونیت کا طلسم توڑنے کے لیے یونیسکو میں احتجاج اور مزاحمت کی جو آواز اٹھی۔ وہ ایک پاکستانی کے مقدر میں لکھی تھی۔ ان کا نام نسیم انور بیگ ہے۔ نسیم بیگ گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک ممتاز طالب علم تھے۔ وہ اپنے زمانے کے نہایت نامور مقرر تھے اور طلباء کے آل انڈیا مباحثوں میں حصہ لے کر بہت سی ٹرافیاں جیت چکے تھے۔ اکنامکس میں ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے لاہور لاء کالج سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن بھی تھے اور تحریک پاکستان میں طلباء کے کردار کے بارے میں قائداعظم سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمت میں کئی بار حاضر ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں لاہور میں خضر حیات ٹوانہ کی حکومت کے خلاف تحریک میں حصہ لے کر وہ کچھ عرصہ تک جیل میں بھی رہے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ انٹرنیشنل سول سروس میں داخل ہو کر یونیسکو کے ہیڈ کوارٹر میں آ گئے۔ یہاں پر وہ کئی برس متواتر یونیسکو اسٹاف یونین کے صدر منتخب ہوتے رہے۔ ملازمین کے حقوق کی حفاظت کے لیے انہوں نے جس دور اندیشی اور جرات مندی کا مظاہرہ کیا اس کی دھوم یو این او کے تمام بین الاقوامی اداروں میں پھیل گئی اور یونائیٹڈ نیشنز کے تمام اداروں کی یونینوں کی فیڈریشن نے بھی ان کو کافی عرصہ تک اپنا مشترکہ صدر منتخب کئے رکھا۔ اس حیثیت میں نسیم بیگ کا یونیسکو کے آمرانہ ڈائریکٹر جنرل رینے ماہیو کے ساتھ کئی بار شدید ٹکراؤ ہوا۔ اس قسم کے ہر تصادم میں ڈائریکٹر جنرل نے ہمیشہ منہ کی کھائی لیکن ذاتی سطح پر اس نے نسیم بیگ کی ملازمت میں ہر طرح کے رخنے ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ نسیم بیگ صاحب کی ہمت تھی کہ ڈائریکٹر جنرل کی منتقمانہ کارروائیوں کو خاطر میں لائے بغیر وہ اپنے عدل و انصاف

کے موقف پر کامیابی سے ثابت قدم رہے اور یونیسکو میں تیس سالہ بے لوث خدمت کی روایات چھوڑ کر ابھی حال ہی میں وہاں سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۶۸ء میں مجھے پاکستانی وفد کا سربراہ بنا کر یونیسکو کی جنرل کانفرنس میں شرکت کے لیے پیرس بھیجا گیا تھا۔ وہاں پر میں نے یہ چلن دیکھا کہ تقریباً ہر ملک کے وفد کا قائد زبانی کلامی تو ڈائریکٹر جنرل کے خلاف بڑھ چڑھ کر تنقید و تنقیص کرتا ہے۔ لیکن اسٹیج پر آ کر اپنی تقریر میں اس کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر منافقت اور خوشامد کے اس گھٹیا معیار نے ایک بندھی بندھائی رسم کے صورت اختیار کر رکھی تھی۔ ریا کاری کی اس بدعت کو توڑنے کا موقع حسن اتفاق سے میرے ہاتھ آ گیا۔ میں نے اپنی تقریر میں اعداد و شمار اور حقائق و شواہد کو بنیاد بنا کر یونیسکو کی انتظامیہ میں پھیلی ہوئی بد نظمیوں' بد عملیوں' نا انصافیوں' فضول خرچیوں' بد اعتدالیوں اور عیاشیوں کا تفصیل کے ساتھ پردہ چاک کیا۔ یہ باتیں سن کر چند لمحے تو ہال میں گہرا سناٹا چھایا رہا۔ لیکن اس کے بعد زبردست تالیوں کے ساتھ ایک ایک فقرے کی یوں پذیرائی ہوئی جیسے مشاعروں میں اشعار پر داد ملتی ہے۔ ڈائریکٹر جنرل رینے ماہیو بھی اسٹیج پر بیٹھا تھا۔ میری تقریر سن کر وہ اتنا بے چین ہوا کہ اس نے پے در پے اورنج جوس کے چار یا پانچ گلاس نوش کئے اور تقریر ختم ہوتے ہی غیظ و غضب کے عالم میں بھنایا ہوا اٹھ کر چلا گیا۔

اسی جنرل کانفرنس کے دوران ایگزیکٹو بورڈ کی چند خالی نشستوں کے لیے انتخاب بھی منعقد ہونے والا تھا۔ ایک نشست کے لیے انتخاب لڑنے کا میں بھی امیدوار تھا۔ ہندوستان' روس اور امریکہ تینوں میری مخالفت پر کمر بستہ تھے۔ ہندوستان تو صرف اس لیے میرے خلاف تھا کہ میں پاکستانی ہوں' لیکن روس اور امریکہ کے پاس ناراضگی کی یہ مشترکہ وجہ تھی کہ چین کو یونیسکو کا ممبر بنانے کی مہم میں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ اس کے علاوہ امریکہ کو یہ شکایت بھی تھی کہ یروشلم اور مقبوضہ عرب علاقوں میں

اسلامی تاریخ آثار اور اسلامی ثقافت کے نشان کو مسخ کرنے اور مٹانے پر میں اسرائیل کے خلاف شدید احتجاج کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ اب اس پر مستزاد یہ کہ ڈائریکٹر جنرل بھی میری مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے اپنے حواریوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے ایگزیکٹو بورڈ میں آنے سے روکیں۔

مخالفانہ قوتوں کے اس بھاری بھر کم صف آرائی کے مقابلے میں میرا بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر تھا۔ نسیم انور بیگ نے اپنا اثر و رسوخ بھی میرے حق میں بے دریغ استعمال کیا' اور اپنے دفتر کا کمرہ عملی طور پر میری انتخابی مہم کے مرکز میں تبدیل کر دیا۔ پاکستانی وفد کے تین اراکین تنویر احمد خان' عبداللطیف مرحوم اور ڈھاکہ کی بیگم رقیہ کبیر نے دن رات کی محنت اور جانفشانی سے انتہائی مفید کام کیا۔ خوش قسمتی سے انہی دنوں عرب ممالک نے جنرل کانفرنس میں یہ قرار داد پیش کر رکھی تھی کہ یونیسکو میں انگریزی' فرانسیسی' ہسپانوی اور روسی زبانوں کی طرح عربی کو بھی بین الاقوامی زبان کا درجہ دیا جائے۔ امریکہ' برطانیہ اور تمام یورپی ممالک اپنے حواریوں سمیت اس تجویز کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے۔ کسی قدر تیاری اور محنت کے بعد میں نے ہر موقع پر عربی زبان کے حق میں ایسی تقریریں کیں کہ عرب ممالک کے وفود نے مطمئن ہو کر یونیسکو میں اس تحریک کی قیادت میرے اوپر چھوڑ دی۔ ساتھ ہی مجھے معلوم ہوا کہ ہر طرح کے دباؤ اور مخالفت کو نظر انداز کر کے عرب ممالک کا پورا گروپ ایگزیکٹو بورڈ کی الیکشن میں مجھے ووٹ دینے پر رضا مند ہے۔ اسی طرح افریقہ اور لاطینی امریکہ کے گروپوں کی جانب سے بھی یہی اشارے ملے کہ وہ بھی میرے حق میں ووٹ دینے پر متفق ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ایگزیکٹو بورڈ میں وہ ایک ایسا شخص بھیجنا چاہتے تھے جو ڈائریکٹر جنرل کی آمریت اور بد عنوانیوں پر کھل کر بات کر سکے۔ یہ ساری وجوہات اندازے اور قیاس آرائیاں محض طفل تسلیاں تھیں۔ اصل بات صرف یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا اور جب الیکشن ہوا تو میں ۱۱۷ میں سے ۹۱ ووٹ حاصل

کر کے چھ برس کے لیے ایگزیکٹو بورڈ کا ممبر منتخب ہو گیا۔

ایگزیکٹو بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے مجھے یونیسکو کے ظاہر اور باطن کو اچھی طرح کھنگالنے کا موقع نصیب ہوا۔ مجموعی طور پر میں نے اس کا اندر اور باہر کھوکھلا کر دیا۔ گرمئی گفتار اس کی روح اور چھپا ہوا کاغذ اس کا پیرہن ہے۔ اس کی چار دیواریوں میں ہر دوسرے برس تحریری اور تقریری الفاظ کا سیلاب طوفان نوح کی طرح اٹھتا ہے اور نیا بجٹ اور پروگرام منظور ہوتے ہی دفعتہ فرو ہو کر زیر زمین غائب ہو جاتا ہے۔ یونیسکو کی تحریر اور تقریر کی اپنی مخصوص زبان پر اپنا لہجہ اپنی اصطلاح اور اپنا اسلوب ہے۔ اس ادارے کا سب سے نمایاں خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اس کے زیر سایہ تقریباً ڈھائی تین ہزار ملازمین پیرس کے سیکرٹریٹ میں اور تقریباً ڈیڑھ دو ہزار افراد دنیا کے دوسرے حصوں میں اچھی تنخواہوں پر آرام اور سکون کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد نہایت عمدہ پنشن پاتے ہیں۔ یونیسکو کے اسی ایک کام کو غالباً اس کا سب سے بڑا فلاحی اور تعمیری درجہ دیا جا سکتا ہے۔

ایک بار نوجوانوں کے مسائل پر سوچ بچار کرنے کے لیے یونیسکو کے زیر اہتمام پیرس میں ایک سیمینار منعقد ہوا۔ اس میں حصہ لینے کے لیے دنیا بھر سے جو نمائندے مدعو کئے گئے' ان سب کی عمر ساٹھ برس سے اوپر تھی۔ ایگزیکٹو بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے میں بھی اس میں شریک ہوا۔ میری عمر بھی اس وقت ۵۱ برس کے قریب تھی۔ اس کے باوجود میں اس سیمینار کا سب سے کم عمر ڈیلیگیٹ تھا۔ میں نے سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں یہ پوائنٹ آف آرڈر اٹھایا کہ یہ انتہائی غیر نمائندہ اجلاس ہے کیونکہ پچاس ساٹھ برس سے اوپر والی عمر کے لوگ آج کل کی نوجوان نسل کے مسائل سمجھنے اور حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس پر بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ تماشائیوں کی صف سے کچھ نوجوان کود کر ہال میں آ گئے اور انہوں نے الٹی میٹم دیا کہ جب تک نئی نسل کے نمائندوں کو اس سیمینار میں شامل نہیں کیا جاتا' وہ اس اجلاس کی کارروائی کو جاری رہنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ مجبوراً ان کی شرط مانی گئی اور نوجوانوں کی بعض تنظیموں

کے نمائندوں کو بھی سیمینار کے اجلاس میں شامل کیا گیا۔
سیمینار میں ایک مقالہ میں نے بھی پڑھا۔ اس کا ایک حصہ کچھ علمی طبقوں میں کسی قدر

پسند کیا گیا۔ خاص طور پر یورپ میں نوجوانوں کی کئی تنظیموں نے اس کی کئی زبانوں
میں خاصی تشہیر کی۔

یونیسکو کے اسٹاف میں ایک اسامی ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کی بھی تھی۔ ایک بار موسیو رینے ماہیو کے سر پر بھوت سوار ہو گیا کہ اس کے نیچے ایک کی بجائے دو ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ہونا چاہئیں۔ دوسری اضافی اسامی کی نہ کوئی ضرورت تھی' نہ کوئی جواز تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ وہ اپنے کسی منظور نظر کو خواہ مخواہ ترقی دے کر اس عہدے پر فائز کرنا چاہتا تھا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کی دوسری اسامی کی منظوری کے خلاف ایگزیکٹو بورڈ میں بڑی لے دے ہوئی۔ رینے ماہیو اس تجویز کو جنرل کونسل میں لے گیا۔ حسن اتفاق سے وہاں پر تقریر کرنے کے لیے پہلے میری باری آئی۔ میں نے انتظامی لحاظ سے اعداد و شمار کا تجزیہ کر کے اس تجویز کی شدید مخالفت کی اور اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی۔

If You have two bottle necks instead of one، does it really double the capacity of the bottle؟ Please answer this question، Mr. Director General!

میری تقریر کا یہ فقرہ چل نکلا۔ میرے بعد بہت سے مندوبین جو اس مسئلہ پر تقریر کرنے آئے ان میں سے ہر ایک نے یہ سوال ضرور دہرایا۔ صبح سے شام تک سارا دن یہ فقرہ سنتے سنتے ڈائریکٹر جنرل کے اعصاب جواب دے گئے اور ووٹ اندازی سے پہلے ہی اس نے اپنی تجویز واپس لے لی۔
فلسطینی مہاجرین کے بچوں کے لیے یونیسکو نے اپنے خرچ پر یروشلم' دریائے اردن کے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں بہت سے سکول کھول رکھے تھے۔ ان سکولوں میں تربیت یافتہ مسلمان اساتذہ بھی یونیسکو کی منظوری سے تعینات ہوتے تھے' اور ان میں جو درسی کتابیں

پڑھائی جاتی تھیں۔ وہ بھی یونیسکو کی جانب سے منظور شدہ ہوتی تھیں' جب یروشلم سمیت ان علاقوں پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا تو رفتہ رفتہ یہ خبریں آنے لگیں کہ اسرائیلی حکومت نے ان سکولوں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ یونیسکو کے متعین کردہ مسلمان اساتذہ کو زبردستی گھر بٹھا دیا گیا ہے۔ ان کو تنخواہ تو باقاعدہ ملتی ہے' لیکن کسی سکول کے قریب تک آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اگر کوئی استاد کسی جگہ حرف شکایت زبان پر لاتا ہے' تو وہ اپنے بال بچوں سمیت ناقابل بیان مظالم اور تشدد کی زد میں آ جاتا ہے۔ ان مسلمان اساتذہ کی جگہ ہر سکول میں اب کٹڑ یہودی اسٹاف فلسطینی مہاجر بچوں کو پڑھانے پر مامور ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر سکول سے یونیسکو کی منظور شدہ درسی کتابیں بھی نصاب سے خارج کر دی ہیں۔ اور ان کی جگہ اب ایسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن میں اسلام سیرت مبارکہ اور عرب تاریخ و ثقافت کے خلاف انتہائی گمراہ کن' غلیظ اور شرمناک پروپیگنڈا ہوتا ہے۔

ایگزیکٹو بورڈ کے ہر اجلاس میں عرب ممالک کے نمائندے اور اسرائیل کی ان مذموم حرکات کا کچا چٹھا کھولتے تھے اور اپنے ثبوت میں ان کتابوں کے نمونے بھی پیش کرتے تھے جو اس نے یونیسکو کے قائم کردہ سکولوں میں زبردستی رائج کی ہوئی تھیں۔ صحیح حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے دو بار ایک معائنہ ٹیم اسرائیل گئی' لیکن دونوں بار ہمیں یہ رپورٹ ملی کہ عربوں کے الزامات کی تصدیق میں مقامی طور پر کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ ٹیمیں اسرائیلی حکومت کے ساتھ پہلے سے اپنا پروگرام طے کر کے وہاں جاتی تھیں' اور معائنہ کے روز اسرائیلی حکام متعلقہ سکولوں میں یونیسکو کے منظور شدہ اساتذہ اور کتابوں کی نمائش کا ڈرامہ رچا دیتے تھے۔

ایگزیکٹو بورڈ میں عرب نمائندوں کے ساتھ میرے بڑے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔ ہم لوگ آپس میں مل جل کر اکثر ایسی تدبیریں سوچا کرتے تھے جن سے اسرائیل کی اس صریح دھاندلی اور اسلام دشمنی کا بھانڈا پھوڑا جائے۔ کافی سوچ بچار کے بعد سب کی یہی متفقہ

رائے ہوئی کہ کسی قابل اعتماد شخص کو خفیہ مشن پر اسرائیل بھیجا جائے اور وہ وہاں سے اسرائیل کے خلاف عائد کردہ الزامات کا ایسا ثبوت فراہم کرے جو ناقابل تردید ہو۔ کئی ہفتوں کی چھان بین اور بحث مباحثہ کے بعد انجام کار قرعہ فال میرے نام نکلا۔ میں نے بھی اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔ یہ بات نہیں کہ میں جیمز بانڈ کی طرح کسی خطرناک اور سنسنی خیز مہم میں کود کر جان کی بازی لگانے کا شوقین تھا' بلکہ وجہ صرف یہ تھی کہ ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد اس زمانے میں میرے پاس کچھ فالتو وقت تھا۔ اس کے علاوہ میرے دل میں ایک لگن یہ بھی تھی کہ شاید اسی بہانے میرے ہاتھوں ہزاروں فلسطینی بچوں کی کوئی خدمت ہو جائے جو اسرائیل کے قبضہ اختیار میں آ کر ایسی کتابیں پڑھنے پر مجبور تھے۔ جن میں دین اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک پر انتہائی رکیک' بے بنیاد' غلیظ اور گمراہ کن حملے کئے گئے تھے۔ چنانچہ میرا رابطہ ایک خفیہ تنظیم سے قائم ہو گیا۔ چند ہفتے مجھے پیرس' قاہرہ اور بیروت میں زیر تربیت رکھا گیا۔ اس کے بعد ایک جعلی ایرانی پاسپورٹ پر مجھے دس روز کے لیے اسرائیل بھیجنے کا پروگرام طے ہو گیا۔ اس زمانے میں سابق شاہ ایران کی حکومت نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہوا تھا۔

ٹریننگ کے دوران میری سب سے بڑی کمزوری یہ پائی گئی کہ میں اپنا اصلی نام بھلا کر اپنا فرضی ایرانی نام اپنانے میں بار بار چوک جاتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ انسان اپنی ذات کے گنبد میں اتنا اسیر ہوتا ہے کہ اپنے نام کی زنجیر تک سے چھٹکارا پانا محال ہے۔ میری اس کمزوری یا معذوری کو بھانپ کر میرے مددگاروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسرائیل میں قیام کے دوران میں سونے سے قطعاً پرہیز کروں۔ انہوں نے مجھے متنبہ کیا کہ نیند کے دوران یا نیند سے اچانک چونک کر میرے ذہن میں اپنی اصلی اور فرضی نام گڈمڈ ہونے کا شدید احتمال ہے۔ اس لیے خود احتیاطی اور عقل سلیم کا یہی تقاضا ہے کہ میں وہاں پر اپنا تمام وقت عالم بیداری میں ہی گزاروں۔ نیند سے

بچنے کے لیے انہوں نے مجھے ایک خوبصورت سی ڈبیہ (Pillbox) میں کچھ گولیاں دیں۔ پہلے روز ایک گولی' دوسرے روز دو گولیاں' تیسرے روز تین ------- اسی طرح ہر روز ایک گولی بڑھانے سے رات بھر نیند نہ آنے کا قوی امکان تھا۔ ان گولیوں کے علاوہ اس ڈبیہ میں سرخ رنگ کا ایک کیپسول بھی تھا۔ یہ کیپسول دراصل موت کی پڑیا تھی۔ اسے نگلتے ہی انسان آناً فاناً ابدی نیند سو جاتا تھا۔ مجھے حکم تھا کہ اسرائیل میں اگر کسی وقت میرا راز فاش ہوتا ہوا محسوس ہو تو میں فوراً اس کیپسول کو نگل کر جان جان آفریں کے سپرد کر دوں۔ کیونکہ اسرائیلیوں کے ہاتھ آ کر زندہ درگور ہونا انتہائی ذلت اور اذیت کی زندگی کو دعوت دینا تھا۔ اس کے علاوہ زندہ گرفتار ہونا خفیہ تنظیم کے وجود کو بھی خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

ایک روز میں نے تربیت دینے والے ماہرین سے پوچھا کہ اسرائیل سے میرے صحیح سلامت واپس آ جانے کا کتنے فیصد امکان ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایسی مہمات میں عموماً پچاس فیصد کامیابی اور پچاس فیصد ناکامی کا تناسب رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس تناسب کا تمہارے کیس پر اطلاق نہیں ہوتا۔ کیونکہ تمہارے اپنے اصلی نام سے مختلف رسالوں اور اخباروں وغیرہ میں تمہاری تصویریں شائع ہوتی رہی ہیں اس لئے دوسروں کی نسبت تمہارے پکڑے جانے کا خطرہ بہت زیادہ ہے۔

یہ سن کر میری ہمت کا غبارہ اندر سے پچک گیا۔ موت کے خوف سے میرے دل اور دماغ کی گھگھی بندھ گئی۔ دو تین روز میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں دم سادھے یوں بے حس و حرکت پڑا رہا جیسے چڑیا کا بے بال و پر بچہ گھونسلے سے گر کر زمین پر چونچ کھولے سسک رہا ہو۔ خدمت اسلام کا نشہ ہرن ہو گیا اور فلسطینی مہاجر بچوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی خوف و ہراس کے ملبے میں دب کے رہ گیا۔ پورے تین روز میں طرح طرح کے حیلے بہانے تراشتا رہا جنہیں آڑ بنا کر میں کسی طرح اس مہم سے کنارہ کشی اختیار کر لوں لیکن چوتھے روز ایک اتفاقیہ حادثے نے میرے خوفزدہ اور پراگندہ ذہن

کی سوچ کا دھارا بدل دیا۔

میں اپنے ہوٹل سے نکل کر سڑک عبور کرنے کے لیے ایک قریبی ٹریفک لائٹ پر کھڑا تھا۔ جب ہمارے سامنے والی بتی سبز ہوئی تو بہت سے دوسرے راہگیروں کے ساتھ میں نے بھی ایک زیبرا کراسنگ پر سڑک کو پار کرنا شروع کیا۔ عین اس وقت سرخ بتیوں کی جانب سے ایک مرسیڈیز کار اچانک نمودار ہوئی اور نہایت تیز رفتاری سے چار راہگیروں کو کچلتی ہوئی کچھ دور آگے جا کر رک گئی۔ کار کو ایک خاتون چلا رہی تھی جو کسی خطرناک نشے میں مدہوش تھی۔ دو راہگیر تو موقع پر ہی ہمارے سامنے ہلاک ہو گئے۔ باقی دو شدید زخمی ہو کر سڑک پر اوندھے پڑے تھے۔ میں نے حساب لگایا کہ اگر میں دو یا تین فٹ آگے ہوتا' تو یقیناً میرا شمار بھی مرنے والوں میں یا زخمی ہونے والوں میں ہوتا۔ اس المناک جائے وقوعہ پر دو لاشوں اور دو قریب المرگ ڈھانچوں کے درمیان کھڑے کھڑے میرے منطق گزیدہ دماغ کو زندگی میں پہلی بار اس بات کا یقین آ گیا کہ اگر موت مقدر میں ہے تو اسرائیل جانے یا نہ جانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں' بلکہ یہاں پیرس میں اپنے ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر سبز ٹریفک لائٹ کی حفاظت میں زیبرا کراسنگ پر چلتے ہوئے بھی موت کا فرشتہ میرا گلا دبوچنے کے لیے آناً فاناً غیب سے نازل ہو سکتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد میری خود اعتمادی کسی قدر بحال ہوئی اور میں نے اپنی ٹریننگ کا باقی حصہ بھی خوش اسلوبی سے طے کر لیا۔ چند آزمائشی مشقوں میں پورا اترنے کے بعد میں نے عفت اور ثاقب کے نام ایک مختصر سا وصیت نامہ لکھ کر اس مہم کے معتمد کے حوالے کیا' اور پھر ایک روز پیرس کے اورلی ہوائی اڈے پر تل ابیب جانے کے لیے اسرائیل ہوائی کمپنی (ElAl) کے جہاز پر سوار ہو گیا۔

جہاز میں بیٹھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں واقعی سفر آخرت پر روانہ ہو رہا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میرے دل پر بزدلی' افسردگی اور مردنی کی برف جم گئی۔ خوف و ہراس نے ایک بار پھر مجھے اپنی گرفت میں دبوچ لیا۔ جب جہاز کا دروازہ بند ہوا تو میری حالت اس لاش کی طرح ہو گئی جس کے اوپر پتھر کی سلیں اور منوں مٹی ڈالنے کے بعد سب

لوگ اسے اکیلا چھوڑ کر قبرستان سے واپس چلے گئے ہوں۔ زمین پر تا حد نگاہ پھیلے ہوئے مکانوں کے مکینوں پر مجھے رشک آنے لگا جو ہر خوف اور خطرے سے بے نیاز اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہنسی خوشی وقت گزار رہے تھے۔ مجھے بے اختیار اپنی بیوی' اپنا بیٹا' اپنا بھائی' اپنی بہن' اپنے سارے عزیز و اقارب اور دوست یاد آنے لگے جو ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ ایک ایک کر کے ماضی کی کسی بے تھاہ سرنگ میں غائب ہوتے جا رہے تھے۔ اگر یہ جہاز اسرائیلی ہوائی کمپنی کا نہ ہوتا تو شاید میں اپنی نشست پر کھڑا ہو کر زور زور سے چیخیں مار کر رونے لگتا۔

ہوائی جہاز تھوڑی دیر کے لیے روم کے ہوائی اڈے پر بھی اترا۔ ٹرانزٹ لاؤنج کی قد آدم کھڑکیوں سے میں نے باہر جھانکا تو دور تک ملک ملک اور کمپنیوں کے طرح طرح کے ہوائی جہاز قطار در قطار کھڑے نظر آئے۔ ان میں ایک جگہ پی آئی اے کا ڈی سی ۱۰ بھی دکھائی دیا۔ پی آئی اے کے ہوائی جہاز کی جھلک میرے اضطراب پر تسلی اور سکون کی شبنم بن کر ٹپکی۔ اس سکون بخش منظر نے میرے خوفزدہ وجود میں تحلیل نفسی کی ایسی اگربتی سلگا دی کہ معاً خجالت' ندامت' تشکر اور خود اعتمادی کے ملے جلے احساس سے میرا دل بھر آیا۔ ایک قریبی ٹائلٹ میں گھس کر میں نے اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ پہلے خوب رویا۔ جب دل کی بھڑاس اچھی طرح نکل گئی' تو میں نے اپنے پاؤں کا جوتا کھولا اور اسے ہاتھ میں لے کر سات آٹھ بار اپنے سر پر زور زور سے مارا۔ غالباً اس جھاڑ پھونک سے خوف و ہراس اور کمزوری اور بزدلی کے بھوت کا سایہ میرے سر سے اتر گیا۔

تل ابیب کے ہوائی اڈے پر کسٹم والوں سے فارغ ہو کر جب میں اپنا سامان لیے باہر نکلا' تو اسرائیل کی ٹورسٹ کارپوریشن کے ایک خوش لباس نوجوان نمائندے نے لپک کر مجھے خوش آمدید کہا۔ گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے دبی زبان سے وہ شناختی الفاظ بھی ادا کئے جن کے متعلق مجھے پیرس میں آگاہ کر دیا گیا تھا۔ جواباً میں نے بھی

اپنے مقرر کردہ شناختی الفاظ دہرائے۔ اس کے بعد "مصطفیٰ" نے اگلے دس روز کے لیے میرا مکمل چارج سنبھال لیا۔

مصطفیٰ اس نوجوان کا کوڈ نام تھا۔ چھبیس ستائیس برس کا یہ پڑھا لکھا فلسطینی جوان کئی سال سے جان کی بازی لگا کر اسرائیل میں آزادی وطن کی خاطر طرح طرح کے خفیہ فرائض سر انجام دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک بجلی کی طرح کوندتی تھی اور اس کی رگ رگ میں جہاد کا جوش اور جنون سیماب کی مانند بے چینی سے گردش کر رہا تھا۔ دن رات وہ میرے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا تھا اور قدم قدم پر انتہائی شفقت اور احترام سے میری رہنمائی اور خدمت کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے اخی اور سیدی کے القاب سے پکارتا تھا۔ اسی کے زیر اہتمام میں یونیسکو کے قائم کردہ بہت سے سکولوں میں گیا اور ۱۳ شر انگیز کتابوں کے نسخے حاصل کئے جو اسرائیلوں نے یونیسکو کے نصب شدہ نصاب کی جگہ وہاں پر زبردستی رائج کر رکھے تھے۔ ان کتابوں پر میں نے ہیڈ ماسٹروں اور کئی دیگر اساتذہ کے آٹو گراف بھی لیے۔ یہ وہ یہودی ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ تھے جنہیں اسرائیلیوں نے یونیسکو کو دھوکہ دے کر مسلمان اساتذہ کی جگہ تعینات کر رکھا تھا۔ کئی جگہ میں نے ان کو بہت سی خفیہ تصویریں اتاریں۔ ایک دو سکولوں میں وہاں کے یہودی اسٹاف کے ساتھ میرا گروپ فوٹو بھی کھینچا گیا۔ ایک سکول میں ایک فلسطینی بچے کو انتہائی بے دردی کے ساتھ نہایت کڑی اور ذلت آمیز سزا مل رہی تھی۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنی کتاب کا وہ حصہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں انتہائی گستاخ الفاظ درج تھے۔ ہم نے اپنے خفیہ کیمرے کی مدد سے اس سین کی پوری فلم اتار لی جس کی لمبائی دو سو فٹ سے کچھ اوپر تھی۔

اسرائیل میں آئے ہوئے مجھے پانچواں روز تھا کہ اچانک مصطفیٰ بولا۔ "یا اخی' اب تک تو تم نیند کے بغیر ٹھیک گزارہ کر رہے تھے' لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے قدم

لڑکھڑانے لگے ہیں اور تمہاری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "ابھی پانچ روز باقی ہیں۔ کام تو ختم کرنا ہے۔"

اس وقت تو وہ مسکرا کر چپ ہو گیا' لیکن نماز عشاء کے وقت مجھے ایک ٹیکسی میں بٹھا کر مسجد اقصیٰ لے گیا۔ اس زمانے میں عشاء کے بعد اگلی اذان تک مسجد کے دروازے مقفل ہو جاتے تھے۔ الاقصا کے کلید بردار مصطفیٰ کے ہمراز تھے۔ ان کے ساتھ ساز باز کر کے نماز کے بعد اس نے مجھے اندر اکیلا چھوڑ کر باہر تالا لگوا دیا اور یہ ہدایت کر گیا کہ میں رات بھر خوب اطمینان سے اپنی نیند پوری کر لوں۔ فجر کے بعد وہ مجھے اسی جگہ آ ملے گا۔

قبلہ اول کی چار دیواری کے اندر جب میں اکیلا رہ گیا تو تاریخ اور تقدس کے ایک مہیب سناٹے نے مجھے سر سے پاؤں تک غڑاپ سے نگل لیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی پاکیزہ شیش محل میں ایک کتا غلطی سے بند ہو گیا ہے۔ لرزے کے بخار کی طرح میرے تن بدن پر کپکپی طاری ہو گئی اور دانت بے اختیار کٹ کٹ بجنے لگے۔ مرگی کے مریض کی مانند تشنج میں گرفتار ہو کر آناً فاناً لڑھکتا ہوا ایک ایسی ٹائم ٹنل میں جا گرا جہاں پر نسل انسانی کی ہزاروں سال کی خوابیدہ تاریخ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی اور کہکشاں کی طرح جگمگ کرتی ہوئی شاہراہوں پر بڑے بڑے ذیشان پیغمبروں کے قدموں کی خاک سے نور کے چشمے پھوٹنے لگے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام' حضرت داؤد علیہ السلام' حضرت سلیمان علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور پھر اللہ کے آخری نبی خاتم النبیین رحمت اللعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جنہیں اللہ کی پاک ذات شب کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی تا کہ ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھائے۔ اسی مسجد میں فرش سے عرش تک نوری فرشتوں نے وہ راستہ منور کر دیا جس پر نبوت کا سفر اختیار کر کے حضور نے رسالت کی معراج کو پایا۔ سدرۃ المنتہٰ کے پاس جس کے قریب جنت الماویٰ ہے۔ جب اس سدرۃ المنتہٰ کو لپٹ رہی

تھی' جو چیزیں لپٹ رہی تھیں نگاہ تو نہ ہٹی اور نہ بڑھی' انہوں نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے۔"

خبر نہیں یہ وصال کی گھڑی تھی یا فراق کا لمحہ' کہ عین اس وقت فضا میں اذان کی آواز گونجی اور بچپن میں کہیں پڑھا ہوا یہ پرانا شعر مجھے بے اختیار یاد آ گیا۔

خدا سمجھے موذن سے کہ ٹوکا عین عشرت میں
چھری مجھ پر چلا دی نعرۂ اللہ اکبر سے

خدا کا شکر ہے کہ پیرس واپس آنے کے بعد اسرائیل سے لائی ہوئی میری شہادتوں کو یونیسکو والوں نے تسلیم کر لیا۔ ڈائریکٹر جنرل نے ایسے اقدامات کئے کہ مقبوضہ عرب علاقوں میں یونیسکو کے قائم کردہ تمام سکولوں میں عربوں کا منظور شدہ درسی نصاب از سر نو رائج ہو گیا۔ اور اسرائیل کی لگائے ہوئی ۱۱۳ شر انگیز کتابیں بھی منسوخ ہو گئیں۔ اس کے علاوہ آئندہ اس صورت حال پر کڑی نظر رکھنے کے لیے قابل اطمینان بندوبست کر دیا گیا۔

میری اس حقیر سی خدمت کے اعتراف کے طور پر پیرس میں متعین تمام عرب سفیروں نے ایک مشترکہ تقریب منعقد کی۔ صدر ناصر کا ایک ذاتی نمائندہ اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے خاص طور پر قاہرہ سے آیا۔ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد میں ان دنوں بیروزگار تھا' اس لیے کئی سفیروں نے اشاروں کنایوں میں اور چند ایک نے کھلے بندوں مجھے منہ مانگے انعامات نذر کرنے کی پیشکش کی۔ ان سب کی خدمت میں میرا صرف یہ جواب تھا کہ یہ معمولی سا فرض میں نے کسی دنیاوی لالچ یا غرض و غایت سے ادا نہیں کیا' میں اسے اپنے لیے محض توشہ آخرت سمجھتا ہوں۔

اس واقعہ کے ایک برس بعد انگلستان کے گاؤں وگمور میں ایک رات میں اپنے گھر سو

رہا تھا۔ آدھی رات کے قریب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب مصطفیٰ بیروت کے ایک ہسپتال سے بول رہا تھا۔ ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ اس طرح کی تھی۔

"ہیلو مصطفیٰ تم کیسے ہو؟"

"الحمدللہ خوش و خرم ہوں۔"

"اگر خوش و خرم ہو تو ہسپتال سے کیوں بول رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بلڈ کینسر تشخیص ہوا ہے۔ علاج کروا رہا ہوں۔"

"توبہ توبہ' بلڈ کینسر کی بات تم ایسے کر رہے ہو جیسے معمولی زکام ہو۔ تم اصلی بات بتاؤ کہ تمہارا حال کیسا ہے؟"

"یا اخی' اللہ کی رضا پر راضی ہوں۔"

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اندازہ ہے کہ انشاء اللہ میں بہت جلد اپنے خالق سے جا ملوں گا۔"

"تم موت کا ذکر یوں کر رہے ہو جیسے کسی پکنک پر جا رہے ہو۔ علاج تو سنجیدگی سے کروا رہے ہو نا؟"

"الحمدللہ علاج خوب ہو رہا ہے۔ ماشاء اللہ میں راضی برضا ہوں۔ تم میرے لیے حسن خاتمہ کی دعا کرنا۔ میرے بعد اگر میرا والد تمہیں کوئی خط لکھے تو اسے جواب ضرور دینا۔"

چند ہفتے بعد مجھے اس کے والد کا خط ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ مصطفیٰ مرحوم ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی یاد میں وہ بلڈ کینسر کے نادار مریضوں کے علاج اور مدد کے لیے دس لاکھ امریکن ڈالر کا ایک فنڈ قائم کر رہا ہے۔ جس کا انتظام ایک تین رکنی مینجنگ کمیٹی کے ہاتھ میں ہو گا۔ مصطفیٰ کی وصیت تھی کہ اس کمیٹی کا ایک رکن مجھے نامزد کیا جائے۔

میں آٹھ برس تک اس فنڈ کی منتظمہ کا ممبر رہا۔ اس عرصہ میں بلڈ کینسر کے ۱۱۵۴

نادار مریضوں کو قومیت اور مذہب کے امتیاز کے بغیر طبی اور دیگر مالی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ پھر مصطفیٰ کے والد گرامی کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد بیروت کے فسادات اور خانہ جنگی کے دوران مصطفیٰ کے نام پر یہ صدقہ جاریہ بھی رفتہ رفتہ بند ہو گیا۔

صوم و صلوٰۃ کے پابند جواں سال مصطفیٰ کی سیماب صفت شکل و صورت آج تک میری آنکھوں کے سامنے گھومتی پھرتی نظر آتی ہے۔ کروڑ پتی باپ کے اس اکلوتے مجاہد بیٹے نے اسرائیل میں دس روز تک لگاتار میری خدمت گھریلو ملازموں کی طرح کی۔ ہم جہاں کہیں ستانے کے لیے کچھ دیر بیٹھتے تھے' وہ فوراً اپنے بریف کیس سے ایک جھاڑن نکال کر میرے بوٹ صاف کر دیتا تھا۔ اسرائیل سے واپسی کے وقت میرے پاس آٹھ اسرائیلی پاؤنڈ بچے ہوئے تھے جو اس زمانے میں تقریباً ۱۸ روپے کے برابر تھے۔ حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر میں نے یہ ساری رقم ٹپ کے طور پر مصطفیٰ کو دے دی۔ اس نے اسے وصول کر کے آنکھوں سے لگایا اور انتہائی اظہار تشکر کے ساتھ جیب میں ڈال لیا۔ مصطفیٰ کا اصلی بھید تو مجھے معلوم نہیں' لیکن جب کبھی یہ چھوٹے چھوٹے واقعات یاد آتے ہیں تو اس کے کردار کی عظمت کی حرارت میرے وجود پر جمی ہوئی بے حسی کی برف کو کسی قدر پگھلا دیتی ہے۔ اور اس کی جدائی کا احساس ایک بار پھر میرے دل و دماغ کی ظلمت پر چند لمحوں کے لیے ایک ناقابل بیان غمگینی' رنگین اور نور کی پھوار سی برسا جاتا ہے۔

سورج بنتا ہے تار زر سے
دنیا کے لیے ردائے نوری!
عالم ہے خموش و مست گویا
ہر شے کو نصیب ہے حضوری
دریا' کہسار' چاند' تارے
کیا جانیں فراق و ناصبوری

شایاں ہے مجھے غم جدائی
یہ خاک ہے محرم جدائی

○○○

• عفت

۱۷ جون ۱۹۷۴ء
آج عفت مر گئی۔

میں اسے مذاقاً اپنی "بڑھیا" کہا کرتا تھا۔ لیکن جب میں کنٹربری کاؤنٹی کونسل کے دفتر میں تدفین کا اجازت نامہ حاصل کرنے گیا تو ایک فارم پر کرنا تھا۔ اس میں مرحومہ کی تاریخ پیدائش بھی درج کرنا تھی۔ جب میں نے اس کا پاسپورٹ نکال کر پڑھا' تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس کی عمر فقط ۴۱ برس تھی۔

لیکن میرے لیے وہ ہمیشہ میری "بڑھیا" کی بڑھیا ہی رہی۔ کنٹربری ہسپتال میں ہم نے اسے گرم پانی میں آب زمزم ملا کر غسل دیا۔ پھر کفنایا اور جب اسے قبلہ رو کر کے لکڑی کے بنے ہوئے ہلکے بادامی رنگ کے تابوت میں رکھا تو تنویر احمد خاں نے بے ساختہ کہا۔ "ارے' یہ تو ایسے لگتی ہے جیسے ابھی کالج کے فرسٹ ایئر میں داخلہ لینے جا رہی ہو۔"

بات بھی سچی تھی۔ جب میں اسے بیاہ کر لایا تھا' تو وہ لاہور کے فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے فائنل ایئر سے نکلی تھی۔ جب میں نے اسے دفنایا تو واقعی وہ ایسے لگ رہی تھی جیسے ابھی ابھی فرسٹ ایئر میں داخلہ لینے جا رہی ہو۔ درمیان کے اٹھارہ سال اس نے میرے ساتھ یوں گزارے جس طرح تھرڈ کلاس کے دو مسافر پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوں۔ سامان بک ہو چکا ہو۔ ٹرین کا انتظار ہو۔ اس کی گاڑی وقت سے پہلے آ گئی۔ وہ اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ میری ٹرین لیٹ ہے۔ جب آئے گی' میں بھی اس میں سوار ہو جاؤں گا۔ لیکن سامان کا کیا ہو گا؟ جو کبھی آگے جاتا ہے اور کبھی پیچھے' اور کوئی اسے وصول کرنے کے لیے موجود نہیں ہوتا۔

لیکن ہمارے سامان میں آخر رکھا ہی کیا ہے؟ کچھ کاغذ' ڈھیر ساری کتابیں' کچھ کپڑے'

بہت سے برتن اور گھریلو آرائش کی چیزیں جنہیں عفت نے بڑی محنت سے سیلز میں گھوم گھوم کر جمع کیا تھا۔ اور ایک ثاقب۔ لیکن ثاقب کا شمار نہ سامان میں آتا ہے نہ احباب میں۔ یہ بارہ سال کا بچہ میرے لیے ایک دم بوڑھا ہو گیا۔ کنٹربری کے قبرستان میں جب مٹی کے گرتے ہوئے ریلوں نے عفت کے تابوت کا آخری کونہ بھی ہماری نظر سے اوجھل کر دیا تو ہم دونوں جو بڑی بہادری سے کھڑے ہوئے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے' بیک وقت گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہمارے گھٹنے ہمارے اندر کے بوجھ سے دب کر اچانک دہرے ہو گئے۔ چند لمحوں کے لیے ثاقب نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا' اسے زور سے دبایا' پھر خاموشی سے چھوڑ دیا۔ ہم دونوں نے اب تک ایک دوسرے کے سامنے کبھی آنسو نہیں بہائے۔ نہ آئندہ ایسا کوئی ارادہ ہے۔ لیکن صد حیف! کہ اب میرے پاس وہ بچہ نہیں جسے گلے سے لگا کر میں دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ میرے پاس صرف ایک بارہ سال کا بوڑھا انسان ہے جو باپ کی طرح میری دیکھ بھال کرنے پر مامور ہو گیا ہے۔ یہ گر اس نے اپنی امی سے سیکھا ہے۔ ہماری شادی خانہ آبادی کے پانچ برس بعد جب ماں جی فوت ہو گئیں' تو عفت نے بھی یہی چالا کی برتی تھی۔ ماں جی کے مرتے ہی عفت نے فوراً ان کا کردار اپنا لیا تھا۔ عین اس طرح جیسے عفت کے مرتے ہی ثاقب میرا مائی باپ بن بیٹھا ہے۔ پتہ نہیں یہ ماں اور بیٹا کیسے لوگ ہیں۔ یہ خود تو صبر و شکر کا بادبان تان کر ہنسی خوشی زندگی اور موت کے سمندر میں کود جاتے ہیں اور مجھے بے یار و مددگار اکیلا ساحل پر چھوڑ جاتے ہیں' جیسے میں انسان نہیں پتھر کی چٹان ہوں۔ خیر' اللہ انہیں دونوں جہان میں خوش رکھے۔ میرا کیا ہے؟ میں نہ اس جہان کے قابل نہ اس جہان کے۔ کوئی تنہائی سی تنہائی ہے۔

میرا خیال ہے کہ میری اس عجیب سی تنہائی کا احساس عفت کو بھی ضرور تھا۔ بات تو اس نے کبھی نہیں کی۔ لیکن عملی طور پر اس نے اس بے نام خلا کو پر کرنے کی بے حد کوشش کی۔ یہ کوشش پورے ۱۸ سال جاری رہی۔ لیکن میرے لیے اس کا ڈرامائی کلائمکس اس کی وفات سے عین پندرہ روز پہلے وقوع پذیر ہوا۔

۲ جون کی تاریخ اور اتوار کا دن تھا۔ چاروں طرف چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئے تھی۔ عفت صبح سے ثاقب کے ساتھ ایک کیاری میں دھنیا' پودینہ' ٹماٹر اور سلاد کے بیج بجوا رہی تھی۔ پھر اس نے گلاب کے چند پودوں کو اپنے ہاتھ سے پانی دیا۔ اس کے بعد ہم تینوں لان میں بیٹھ گئے۔ عفت نے بڑے وثوق سے کہا۔ "یہ کیسا سہانا سماں ہے۔ غالباً بہشت بھی کچھ ایسی ہی چیز ہو گی۔"

"پتہ نہیں۔" میں نے کہا۔

عفت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یہ اس کا آخری بھرپور قہقہہ تھا جو میں نے سنا۔ وہ بولی۔ "تم مجھے کچھ نہیں بتاتے۔ ممتاز مفتی جو کچھ لکھتے ہیں' اس سے مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ تمہیں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آخر مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔"

میں نے کہا۔ "ممتاز مفتی کو جانتی ہو' بہت بڑا افسانہ نگار ہے۔ جو جی میں آئے لکھتا رہتا ہے۔ اس نے میرے سر پر سبز عمامہ باندھ کر اور اس پر مشک کافور کا برادہ چھڑک کر مجھے ایک عجیب و غریب پتلا سا بنا رکھا ہے۔ وہ دیدہ و دانستہ عقیدے سے بھاگتا اور عقیدت کا روگ پالتا ہے۔ اس کی کسی بات پر دھیان نہ دو۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "یہ ممتاز مفتی بھی عجیب آدمی ہیں۔ میرے ساتھ بڑی محبت کرتے ہیں۔ ثاقب کے ساتھ گھنٹوں بچوں کی طرح کھیلتے ہیں۔ لیکن وہ جب میرے پاس تمہاری باتیں کر کے جاتے ہیں تو مجھے یہ احساس ہونے لگتا ہے جیسے میں تمہاری بیوی نہیں بیوہ ہوں۔"

"یہی تو اس کی افسانہ نگاری کا کمال ہے۔" میں نے کہا۔

وہ تنک کر بولی۔ "مفتی جی کو گولی مارو۔ آؤ آج ہم دونوں عیش کریں۔ اس ملک میں ایسی اچھی دھوپ روز روز تھوڑا نکلتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھی۔ جلدی جلدی مٹر اور قیمہ پکایا۔ کچھ چاول ابالے اور سلاد کاٹا۔ ہمیں کھانا کھلا کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جامنی رنگ کی شلوار قمیض پہنی' ڈھیر سارا میک اپ کیا' اور جب خوب بن ٹھن کر نکلی تو ثاقب نے بے ساختہ کہا۔ "واہ واہ

امی! آج تو بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ اب تو ابو کی خیر نہیں۔"
"زیادہ بک بک نہ کیا کرو۔" اس نے ثاقب کو ڈانٹا۔ "تم اپنا سائیکل نکالو اور خالد کے گھر چلے جاؤ۔ شام کو طارق کی سالگرہ ہے۔ ہم بھی پانچ بجے تک پہنچ جائیں گے۔"

ثاقب نے گھڑی دیکھ کر شرارت سے کہا۔ "امی' ابھی تو صرف دو بجے ہیں۔ پانچ بجے تک آپ اکیلے کیا کریں گے؟"
"ہم مزے کریں گے۔" عفت نے کہا۔ "اب تم جاؤ۔"
ثاقب اپنے بائیسکل پر بیٹھ کر خالد کے ہاں چلا گیا۔ میں نے عفت سے کہا۔ "آج تو تم زبردست موڈ میں ہو۔ بولو' کیا ارادہ ہے؟"
اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کہنے لگی۔ "اب میں تمہارے کسی کام کی نہیں رہی۔ چلو پارک چلیں۔"
ہم دونوں ٹیکسی لے کر اس کے ایک مرغوب پارک میں چلے گئے' چاروں طرف جوان بوڑھے جوڑے ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے ہوئے سبز گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ بہت سے فوارے چل رہے تھے۔ گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ چیری کے درخت گلابی اور سرخ پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ آس پاس ٹھنڈے دودھ اور رنگا رنگ مشروبات کی بوتلیں بک رہی تھیں۔ ہم دونوں لکڑی کے اس بنچ پر ایک دوسرے سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئے۔
اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور بولی۔ "بہشت کا نظارہ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہو گا!"
"پتہ نہیں۔" میں نے کہا۔
"تم مجھے کچھ نہیں بتاتے۔" اس نے شکایت کی۔ "ممتاز مفتی تمہیں مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔"
"مفتی جی افسانہ نگار ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان کو گولی مارو' اپنی بات کرو۔"
"میری بات صرف اتنی ہے کہ میں تیرے کسی کام نہ آ سکی۔" وہ بولی۔

"یہ فضول بکواس چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "کوئی کام کی بات کرو۔"
"واقعی کروں؟" اس نے ایسے انداز سے کہا جیسے کوئی بچہ ٹافی خریدنے کے لیے خوشامد کر کے پیسے مانگنے والا ہو۔ "برا تو نہیں مناؤ گے؟ بات کاٹو گے تو نہیں؟ ٹالو گے تو نہیں؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے اسے یقین دلایا۔
وہ لکڑی کے بنچ پر مجھے تکیہ بنا کر لیٹ گئی۔ اور بولی۔ "سنو' جب میں مر جاؤں تو مجھے کنٹربری کے قبرستان میں دفنا دینا۔"
اس کے منہ سے موت کا یہ پیغام سن کر مجھے بڑا شدید دھچکا لگا۔ لیکن میں نے اس کی بات نہ کاٹنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اس لیے بالکل خاموش رہا۔
وہ بولتی گئی۔ "یہ شہر مجھے پسند ہے۔ یہاں کے ہسپتال نے مجھے بڑا آرام دیا ہے۔ یوں بھی اس شہر پر مجھے حضرت مریم کا سایہ محسوس ہوتا ہے۔ یہاں پر تمہیں بھی کچھ محسوس ہوتا ہے یا نہیں؟"
اس نے منہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ اس نے اپنے جامنی رنگ کے دوپٹے کے پلو سے میرے آنسو پونچھے اور بے حد غیر جذباتی انداز میں اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔" اس ملک میں ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ اس لیے میرے جنازے پر کسی کو نہ بلانا۔ یہاں پر تم ہو' ثاقب ہے' خالد ہے' زہرہ ہے' آپا عابدہ ہے۔ خالد کے چند مسلمان ڈاکٹر دوست ہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔"
اب میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "بزنس آخر بزنس ہے۔" میں نے کہا۔ "جرمنی سے تنویر احمد خاں اور پیرس سے نسیم انور بیگ شاید آ جائیں۔ ان کے متعلق کیا حکم ہے؟"
"وہ آ جائیں تو ضرور آئیں۔" اس نے اجازت دے دی۔ "وہ بھی تو اپنے ہی لوگ ہیں۔ لیکن پاکستان سے ہرگز کوئی نہ آئے۔"
"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔
وہ بولی۔ "ایک دو عزیز جو استطاعت رکھتے ہیں ضرور آ جائیں گے۔ لیکن دوسرے بہت

سے عزیز جن میں آنے کی تڑپ تو ہے' لیکن آ نہیں سکتے خواہ مخواہ ندامت سی محسوس کریں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"میڈم' آپ کا اشارہ سر آنکھوں پر۔" میں نے جھوٹی سی ہنسی ہنس کر کہا۔

"اور کوئی ہدایت؟"

"میری قبر کے کتبے پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ضرور لکھوانا۔"

"ضرور" میں نے کہا۔ "اور کوئی حکم؟"

"ہاں' ایک عرض اور ہے۔" اس نے کہا۔ "اپنے ہاتھوں کے ناخن بھی خود کاٹنا سیکھ لو۔ دیکھو اس چھوٹی سی عمر میں بھی ثاقب کیسی خوبی سے اپنے ناخن کاٹ لیتا ہے۔ تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھی' اپنا پرس کھولا۔ ایک چھوٹی سی قینچی نکالی اور بولی۔ "لاؤ' آج میں پھر تمہارے ناخن تراش دوں۔"

اس نے میرے ناخن کاٹے۔ اس آخری خدمت گزاری کے بعد وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھ گئی۔ اور اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ مجھے اچھا تو بڑا لگا کیونکہ اس سے پہلے ہم بر سر عام اس طرح کبھی نہ بیٹھے تھے۔ لیکن اس کی باتوں میں الوداعیت کا جو پیغام جھلک رہا تھا' اس نے مجھے بے تاب کر دیا۔ میں نے کہا۔ "میڈم' اٹھو۔ ہمارے ارد گرد جو بے شمار بچے کھیل کود رہے ہیں' وہ کیا سمجھیں گے کہ یہ بڈھا بڈھی کس طرح کی عاشقی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔"

وہ چمک کر اٹھ بیٹھی اور حسب دستور مسکرا کر بولی۔ "یہ لوگ یہ سمجھیں گے نا کہ کوئی بوالہوس بوڑھا کسی چھوکری کو پھانس لایا ہے۔ کبھی تم نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے۔"

"ہاں' روز ہی دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اس نے میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے آخری بار کنگھی کی' اور بولی۔ "تمہارے بال

کتنے سفید ہو رہے ہیں۔ میں نے اتنی بار کہا ہے کہ مہینے میں کم از کم ایک بار کلر گلو کا شیمپو کر لیا کرو۔ لیکن تم میری کوئی بات نہیں مانتے۔"

میں خاموش رہا۔

اس نے مجھے گدگدا کر ہنسایا اور کہنے لگی۔ "تمہیں ایک مزے کی بات سناؤں۔"

"ضرور سناؤ۔" میں نے کہا۔

وہ بڑے فخریہ انداز میں کہنے لگی۔ "کوئی دو برس پہلے میں نسیم انور بیگ کی بیگم اختر کے ساتھ آکسفورڈ اسٹریٹ میں شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ وہاں اس کی ایک سہیلی مل گئی۔ اس نے میرا تعارف یوں کرایا کہ یہ عفت شہاب ہے۔ یہ سن کر اختر کی سہیلی نے بے ساختہ کہا' ارے ہم نے تو سنا تھا کہ شہاب صاحب کا صرف ایک بیٹا ہے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ان کی اتنی بڑی بیٹی بھی ہے۔ دیکھا پھر.......؟"

"ہاں ہاں بیگم صاحبہ' دیکھ لیا۔" میں نے جھینپ کر کہا۔ "پانچ بجنے کو ہیں۔ چلو' طارق کی سالگرہ پر بھی تو جانا ہے۔"

یہ ہمارا آخری انٹرویو تھا۔ اٹھارہ سال کی ازدواجی زندگی میں ہم نے کبھی ایک دوسرے کے ساتھ بیک وقت اتنی ڈھیر ساری باتیں نہ کی تھیں۔ دوستوں' یاروں اور عزیزوں کے ساتھ بیٹھ کر ہم کئی کئی گھنٹے ہی ہی' ہا ہا کر لیتے تھے۔ لیکن اکیلے میں ہم نے اتنی دل جمعی کے ساتھ اتنے موضوعات پر کبھی اتنی طویل گفتگو نہ کی تھی۔ یہاں تک کہ جب میں نے سی ایس پی سے استعفیٰ دیا تو یوں ہی ایک فرض کے طور پر مناسب سمجھا کہ اپنی بیوی سے بھی مشورہ کر لوں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں ملازمت سے مستعفی ہونا چاہتا ہوں تو وہ ثاقب کے سکول جانے سے پہلے اس کے لیے آملیٹ بنا رہی تھی' آملیٹ بنانے کا چمچہ ہاتھ سے چھوڑے بغیر اور میری طرف آنکھ اٹھائے بغیر وہ بولی۔

"اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو بسم اللہ۔ ضرور استعفیٰ دے دو۔"

اس کی اس شان استغنا سے جل کر میں نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "بیگم صاحبہ'

آپ کی رضامندی کے بغیر میں ایسا قدم کیسے اٹھا سکتا ہوں؟ اور ایک آپ ہیں کہ کوئی توجہ ہی نہیں دیتیں۔"

اس نے چمچ ہاتھ سے رکھ دیا اور میری طرف یوں پیار سے دیکھا جیسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ پھر بولی۔ "ارے یار، تجھے کیسے سمجھاؤں کہ جو تیری مرضی وہ میری مرضی۔"

مجھے یہ زعم تھا کہ میں خود فنا کی تلاش میں ہوں۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ عفت پہلے ہی اس مقام سے گزر چکی ہے۔ جب وہ تابوت میں لیٹی پڑی تھی تو میں نے چپکے سے اس کے سر پر آخری بار ہاتھ پھیر کر پیار کیا۔ میرے اندر کے توہمات نے میرے سینے میں عجیب و غریب امیدوں کی موم بتیاں سجا رکھی تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی معجزے کی ایک بھی موم بتی روشن نہ ہوئی۔ وہ مر گئی تھی۔ ہم نے اسے قبرستان میں لے جا کر دفنا دیا۔ باقی اللہ خیر سلا۔

یوں تو آپس کی روٹھ راٹھ، چھوٹی موٹی ناراضگیاں اور باہمی شکر رنجیاں ہمارے درمیان درجنوں بار ویسے ہی ہوئیں جیسے ہر میاں بیوی کے درمیان ہونا چاہئیں۔ لیکن ہماری اصلی بڑی لڑائی صرف ایک بار ہوئی۔ اسلام آباد میں میں نے اپنے ڈرائنگ روم کے لیے قالین خریدنا تھا۔ میں نے بڑے شوق سے ایک قالین پسند کیا۔ جس کی زمین سفید اور درمیان میں رنگین پھول تھے۔ عفت نے اسے فوراً یہاں مسترد کر دیا جس طرح وہ چالاک سبزی فروش کو الٹے ہاتھوں باسی پالک، مولی، گاجر اور گوبھی کے پھول لوٹا رہی ہو۔ مجھے بڑا رنج ہوا۔ گھر آ کر میں نے سارا دن اس سے کوئی بات نہ کی۔ رات کو وہ میرے پہلو میں آ کر لیٹ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ میرے گالوں پر رکھ کر کہنے لگی۔ "دیکھ تیرا منہ پہلے ہی بڑا گول ہے۔ جب تو ناراض ہوتا ہے تو یہ اور بھی گول مٹول ہو جاتا ہے۔ آج بھلا تو اتنا ناراض کیوں ہے؟"

میں نے قالین کی بات اٹھائی۔

"قالین تو نہایت عمدہ ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن ہمارے کام کا نہیں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"دراصل بات یہ ہے۔" وہ بولی۔ "جن لوگوں کے لیے یہ قالین بنا ہے ان میں سے کوئی بھی ہمارے ہاں نہیں آتا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تلخی سے دریافت کیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور سکول کی استانی کی طرح بڑی وضاحت سے گن گن کر سمجھانے لگی کہ ہمارے ہاں ابن انشاء آتا ہے' وہ پھسکڑا مار کر فرش پر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک طرف مالٹے' دوسری طرف مونگ پھلی' سامنے گنڈیوں کا ڈھیر۔ جمیل الدین عالی آتا ہے' آتے ہی فرش پر لیٹ جاتا ہے اور سگریٹ پر سگریٹ پی کر ان کی راکھ ایش ٹرے میں نہیں بلکہ اپنے ارد گرد قالین پر بکھیرتا ہے۔ ممتاز مفتی ایک ہاتھ میں کھلے پان اور دوسرے ہاتھ میں زردے کی پڑیا لیے آتا ہے۔ اشفاق احمد قالین پر اخبار بچھا کر اس پر تربوز چیرنا پھاڑنا شروع کر دیتا ہے۔ ملتان سے ایثار راعی آم اور خربوزے لے کر آئے گا۔ ڈھاکہ سے جسیم الدین کیلے اور رس گلوں کی ٹپکتی ہوئی ٹوکری لائے گا۔

وہ یہ سب تحفے لا کر بڑے تپاک سے قالین پر سجا دیتے ہیں۔ سال میں کئی بار سید ممتاز حسین شاہ بی اے ساٹھ سال کی عمر میں ایم اے انگلش کی تیاری کرنے آتا ہے اور قالین پر فاؤنٹین پن چھڑک چھڑک کر اپنی پڑھائی کرتا ہے۔ صرف ایک راجہ شفیع ہے' جب کبھی وہ مکئی کی روٹی' سرسوں کا ساگ اور تازہ مکھن اپنے گاؤں سے لے کر آتا ہے تو آتے ہی انہیں قالین پر نہیں انڈیلتا بلکہ بڑے قرینے سے باورچی خانے میں جا کر رکھ دیتا ہے کیونکہ وہ نہ شاعر ہے نہ ادیب۔ فقط ہمارے دوستوں کا دوست ہے۔

بات بالکل سچ تھی۔ چنانچہ ہم نے ایک نہایت میل خوردہ قالین خرید کر آپس میں صلح کر لی۔

عفت کو میرے دوستوں کے ساتھ بڑا انس تھا۔ وہ ادیب پرست بھی تھی اور ادب شناس بھی۔ "شاہنامہ اسلام" کے سینکڑوں اشعار اسے زبانی یاد تھے۔ حفیظ جالندھری کا وہ اپنے

باپ کی طرح ادب کرتی تھی۔ جوش صاحب کی "یادوں کی بارات" کی بھی مداح تھی۔
ایک روز میں نے کہا۔ "میں جوش صاحب کی طرف جا رہا تھا۔ آؤ تم بھی ان سے

مل لو۔"

"تم جاؤ۔" اس نے کہا۔ "میرے لیے جوش صاحب کے دور کے ڈھول ہی سہانے ہیں۔"

یحییٰ خاں کے زمانے میں جب ہم انگلستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں خاموشی سے اپنے دن گزار رہے تھے تو فیض احمد فیض لندن آئے۔ وہاں سے انہوں نے مجھے ٹیلیفون کیا کہ میں کل تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ دوپہر کا کھانا تمہارے ہاں کھاؤں گا۔
عفت نے بڑا اچھا کھانا کھایا۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ شدید برف باری ہو رہی تھی۔ لندن سے ہمارے ہاں آنے کے لیے ایک گھنٹہ ریل کا سفر کا تھا۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ بس کا سفر' اور پھر کوئی پندرہ منٹ پیدل۔ ڈھائی' تین بجے جب فیض صاحب گھٹنے گھٹنے برف میں دھنستے وھنساتے افتاں و خیزاں ہمارے ہاں پہنچے تو عفت کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ کھانا گرم کرتے ہوئے اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور بڑی عقیدت سے کہنے لگی۔

"ہم کتنے خوش نصیب ہیں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے دور کا اتنا بڑا شاعر ایسے خراب موسم میں اتنی دور تم سے ملنے آیا ہے۔"

"یہ فیض صاحب کی مروت ہے۔" میں نے کہا۔

"مروت نہیں۔" اس نے مجھے ٹوکا۔ "یہ ان کی عظمت اور سخاوت ہے۔"

ہمارے اچھے سے اچھے دنوں میں اس کا ایک مرغوب مصرع یہ تھا۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

اس پر اس نے غالباً اپنی طرف سے دوسرا مصرع یہ گانٹھ رکھاتھا۔

نہ زمیں ہو نہ زماں ہو آسماں کوئی نہ ہو

بیماری کے دنوں میں وہ بار بار پڑھا کرتی۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اپنی تین سال کی بے وطنی کے زمانے میں ہمیں اکثر اوقات مالی تنگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دفعہ جب ہم تیسری چوتھی بار نقل مکانی پر مجبور ہو گے تو اس نے بڑی محنت سے ہمارا سامان باندھا۔ اس کی تھکن اس کے بند بند سے یوں ٹپک رہی تھی جیسے شدید بارش کے بعد ٹوٹی ہوئی چھت ٹپکنے لگتی ہے۔

میں نے اس کے پاؤں دبا کر کہا۔ "عفت میری وجہ سے تمہیں کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔"

ماں جی کی طرح وہ کبھی کبھی بہت لاڈ میں آ کر مجھے "کوکا" کہا کرتی تھی۔ بولی "ارے کوکے میں تو تیرے ساتھ بہت خوش ہوں لیکن بے چارے ثاقب پر ترس آتا ہے اس ننھی سے عمر میں یہ اس کا آٹھواں سکول ہے۔"

"ثاقب کی بات چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "آخر ہمارا بیٹا ہے۔ ہر نئے سکول میں جا کر آسانی سے فٹ ہو جاتا ہے۔ لیکن تجھے اتنا تھکا ماندہ دیکھ کر مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"ہاں' ٹھیک ہی ہوں۔" اس نے اپنا سر میرے شانوں پر ٹیک کر کہا۔ مجھے اس کے بند بند سے غالب کا یہ شعر آہ و زاری کرتا ہوا سنائی دے رہا تھا۔

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

میرا خیال ہے کہ اسی زمانے میں در بدری کی محنت و مشقت نے اسے وہ روگ لگا دیا

جس نے انجام کار اسے کنٹربری کے گورستان میں جا بسایا۔ یہ خیال اب ہر وقت احساس جرم کا تازیانہ بن کر میرے ضمیر پر بڑے بے رحم کوڑے مارتا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ ایک فقیر حقیر' بندۂ پر تقصیر' اسیر نفس شریر کر بھی کیا سکتا ہے۔

جی چاہتا ہے خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

○ ◯ ○

• نیا گھر

ایک نیا گھر بسا لیا تو نے

ہم سے دامن چھڑا لیا تو نے

دل کی دنیا میں حور ہے نہ قصور
دعویٰ بے رنگ' دار بے منصور
خالی خالی سی رات کی بانہیں
شیشہ بے آب' چاندنی بے نور

جانے کیا کیا چرا لیا تو نے
ایک نیا گھر بسا لیا تو نے

چھا گئے ظلمتوں کے لات و منات
کیا ہوئی کائنات ذات و صفات
بے عصا طور پہ کھڑا ہے کلیم
نہ جستجو نہ تجلی نہ آرزو نہ بات

کچھ تو ہے جو اڑا لیا تو نے
ایک نیا گھر بسا لیا تو نے

تازہ تازہ سی تیرگی کا سماں

میٹھی میٹھی سی آگ ہلکا دھواں
موتیوں کی لڑی میں تنہائی
سنگریزوں میں گمشدہ سا نشاں

ڈھونڈھا میں نے تھا پا لیا تو نے
ایک نیا گھر بسا لیا تو نے

موج در موج خاک کا انبار
مور و ملخ و ملائکہ کی قطار
ایک تابوت نقد جاں کے عوض
ڈولی دلہن کے ساتھ چار کہار

راز جینے کا پا لیا تو نے
ایک نیا گھر بسا لیا تو نے

کیا وہاں بھی فساد اٹھتے ہیں
آگ لگتی ہے سانس گھٹتے ہیں
کیا وہاں بھی برات آئی تھی
کیا وہاں بھی سہاگ لٹتے ہیں

جانے کیا کیا پتہ لیا تو نے

ایک نیا گھر بسا لیا تو نے

خیر تیری، ترے مکاں کی خیر
تہمت آرزوئے جاں کی خیر
ہم تو پھر بھی زباں رکھتے ہیں
یا خدا میرے بے زباں کی خیر

اک نیا گھر بسا لیا تو نے
ایک نیا گھر بسا لیا تو نے

○ ○ ○

- موسم موسم گا راگ

جاڑا آیا جاڑا آیا مونگ پھلی چلغوزے لایا

ہم تم مل بیٹھیں تو گویا کشمش اور بادام
گرمی کا موسم جو آیا باہر محنت اور پسینہ
اندر سردے گرمے پیچی ٹھنڈی میٹھے آم

برکھا رت کی بات نہ کرنا برکھا رت تو بیت گئی
تیری آنکھیں سوکھے ساگر میری آنکھوں میں طوفان
موسم گل کی رعنائیوں کو ڈھل جانے کا خوف
پت جھڑ کی سوکھی شاخوں میں جینے کے ارمان

دنیا ایک تماشا لوگو تمبولے کا کھیل
نہ تو ہارے نہ تو جیتے نہ تو پاس نہ فیل
آنے والے ایسے آئیں جیسے جھوٹے خواب
جانے والے ایسے جائیں جیسے خیبر میل

دنیا بھر کی نیرنگی دیکھی جس کا عرض نہ طول
پھولوں کی پھلواری جس میں کانٹے اور ببول
شیروں جیسے غازی جن کے بازو بے شمشیر

کندن جیسی ناریں جن پر کیچڑ کنکر دھول

پھر بھی بار بار وہ پوچھے کیا نعمت جھٹلائے؟

میں بولوں کافر کہلاؤں' کون کسے سمجھائے؟

○ ◯ ○

- ایک دن

ایک دن میں نے سوچا چلو جی تو لیں میں نے
جی بھر کے اذن طرب دے دیا
جام و مینا لیے ساقیوں کے پرے رقص
و نغمے کا جادو جگانے لگے
ایک دن کعبہ و سومنات و کلیسا و آتش
کدے جوں کے توں رہ گئے
صبر و ایماں کے فانوس گل ہو گئے،
آگہی کے قدم ڈگمگانے لگے
ایک دن ڈھل گیا، شام ڈسنے لگی، رات کا
ناگ پہرے پہ پھر آ گیا
چاند کی جھیل میں یاد کے پاسباں چشم گریاں
کے موتی چرانے لگے
ایک دن ایسا ایا جو آتا رہے گا، تیری عادتوں
سے سوا بھی نہیں
مری بندگی کا تقاضا یہی ہے میں کس منہ سے
کہہ دوں خدا بھی نہیں

کرنل اطہر

○ ڈاکٹر عفت شہاب

○ ڈاکٹر عفت شہاب

میں عفت سے کبھی نہیں ملا۔

حالانکہ ان کے دو سگے بھائیوں حامد اور محمود سے میری بیس سال کی یاد اللہ ہے۔ میں قدرت اللہ شہاب سے بھی کبھی نہیں ملا' صرف دور سے ہسپتال کے کمرے میں دیکھا تھا۔ جب عفت بیمار تھیں اور ان سے کسی کو ملنے جلنے کی اجازت نہیں تھی۔ حامد کی بیوی بھابی سعیدہ نے فون کیا تھا اور میں اور نفیسہ صرف رسم پوری کرنے کو گئے تھے۔ کیونکہ مزاج پرسی تو صرف دیکھنے کے بعد ہی ہو سکتی تھی۔ کچھ روز پہلے میں لاہور گیا تھا۔ سعیدہ بھابی سیالکوٹ سے آئی تھیں۔ کہنے لگیں۔ "سیارہ ڈائجسٹ" میں شہاب نامہ میں عفت کی موت کا ذکر ہے۔ میں پڑھتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔"

میں اس روز سرگودھا دورے پر جا رہا تھا۔ راستہ بھر اس کا خیال رہا کہ قدرت اللہ شہاب نے ایسی کیا چیز لکھی ہے کہ انسان روتا رہا۔ سرگودھا کے ائیر فورس میس میں جا کر ٹھہرا اور یہ بھی عجیب بات ہے' قدرت اللہ شہاب کا "ماں جی" جب پڑھا تھا تو فوراً وضو کر کے ماں جی کی روح کو ایصال ثواب پہنچایا تھا اور "شہاب نامہ" پڑھ کر بھی میں نے یہی کیا۔ عفت کی روح کو ایصال ثواب پہنچایا۔ شہاب کی تحریریں اور میرے اس جذبہ میں کیا تعلق ہے' میں نہیں جانتا نہ بیان کر سکتا ہوں' میں رو نہیں سکتا' کیونکہ دو جنگوں میں میں نے موت بڑے قریب اور بڑے عزیزوں کی دیکھی ہیں۔ باقی اندر سے دل کی وہ کیفیت تھی جب انسان اپنے آپ کو موت کے قریب پاتا ہے۔ شاید یہی جذبہ ہر انسان کو اپنے معبود کی طرف کھینچتا ہے۔

کنٹربری میں نے آج سے ۲۲ سال پہلے دیکھا تھا' بہت خوبصورت جگہ تھی۔ میں خیالوں ہی میں اس قبرستان کا چکر لگانے لگا جہاں عفت دفن ہیں۔ یہ قبرستان بہت دلفریب اور پر سکون جگہ پر ہے۔

عفت نے کیا خوب اپنے لیے مستقل مقام چنا۔ یہ وہ قبرستان ہے جہاں آج سے ۲۲ سال پہلے میں نے اپنے ایک انگریز دوست کو دفن کیا تھا۔ جب میں انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا' لیکن انگلستان کی شہرہ آفاق دھند چھائی تھی'

جب ہم لوگ اس نوجوان کے جنازے کو لے کر کنٹربری کے اس قبرستان میں پہنچے تھے۔ جوانی میں اپنے دوستوں کی موت کا غم ویسے ہی بڑا گہرا اور اثر پذیر ہوتا ہے۔ اپنے دوست

کے تابوت کو قبر کی گہرائیوں میں جاتے دیکھ کر میں نے اپنی روح کی گہرائیوں سے اس کے لیے دعائے مغفرت کی تھی اور اس کیفیت سے میں ہفتوں نڈھال رہا تھا۔

عفت کی موت نے بھی مجھ پر وہی اثر کیا۔ میں نے روح کی گہرائیوں سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ تصور میں میں نے عفت کے جنازے میں شرکت کی۔ ان کے تابوت کو قبر میں جاتے ہوئے دیکھا۔ قدرت اللہ شہاب کے دھندلائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ اس بچے کا تصور کیا جو بن ماں کے ہو گیا۔ اور پھر خیالات بھٹکتے ہوئے نہ جانے عفت کی والدہ تک جا پہنچے' جنھوں نے اپنے بڑے بیٹے کی اچانک موت کا غم دیکھا تھا جو فوج کا کرنل تھا اور ایک صبح ہنستے ہوئے دفتر گیا اور پھر زندہ واپس نہ آیا اور اب بیٹی کا غم دیکھنے کے لیے زندہ رہیں۔ یہ گھرانہ اتنا خدا ترس' اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننے والا اور ایسی روزمرہ کی زندگی گزارنے والا ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور عفت کی والدہ اس گھرانے کی وہ نیک بخت بی بی ہیں جنھوں نے جوان بیٹے کی موت پر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا' اور مرضی مولا کہہ کر چپ ہو رہیں۔

حامد میرا دوست' عفت کا بھائی سیالکوٹ کے ہر فلاحی ادارے کا سرگرم رکن ہے۔ اس نے اپنی ذاتی کوششوں سے ایک ایسی سوسائٹی علامہ اقبال کے نام سے قائم کی ہے' جس کے ذریعے سینکڑوں مستحق طلباء کو وظیفہ ملتا ہے اور اس سوسائٹی کے کئی وظیفہ پانے والے طالب علم ماشاء اللہ اب ڈاکٹر اور انجینئر ہیں۔

یہ میرے ذاتی مشاہدہ کی بات ہے کہ حامد نے اپنے ہر اس دوست سے جو ذرا سا بھی خوشحال ہے اس سوسائٹی کے ممبر ہونے کی درخواست کی ہے اور خدا کی قسم وہ اس کام کو اس محنت اور لگن سے کرتا ہے کہ بعض اوقات میں اپنی کم مائیگی پر آنسو بہائے

بغیر نہیں رہ سکتا۔ سچ ہے دنیا ایسے ہی لوگوں کے دم سے قائم ہے۔

سعیدہ بھابی نے نہ جانے کتنی یتیم اور بے سہارا لڑکیوں کی شادیاں کرائی ہیں اور کتنے اجڑے گھرانوں کو بسوایا ہے اور یہ کام یہ دونوں میاں بیوی اس خاموشی سے کرتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ حامد' رشید اور سعیدہ بھابی پچھلے ۲۷ سال سے سیالکوٹ میں مقیم ہیں اور وہاں کا بچہ بچہ ان کو عزت و احترام سے دیکھتا ہے۔ ان کی خاموش روی کو دیکھتے ہوئے میں مزید اس میں کچھ اضافہ نہ کروں گا۔ قدرت اللہ شہاب کو ایک انسان اور ایک دوست کی حیثیت سے جاننے کی حسرت ہی رہی لیکن اگر ممتاز مفتی سچے ہیں تو شہاب اپنے اندر ایک درویش صفت انسان کو چھپائے ہوئے ہیں جو خدا کے بہت قریب ہیں۔

خدا کے اتنے اچھے بندوں سے تعلق خاطر رکھتے ہوئے بھی عفت اتنی جلدی کیوں مر گئیں؟

میرے مولیٰ! کیا تو صرف اپنے نیک بندوں ہی کا احتساب کرتا ہے یا یہی تیری مشیت ہے!

(بہ شکریہ "سیارہ ڈائجسٹ" فروری ۱۹۷۵ء)

• پاکستان کا مستقبل

وطن عزیز میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو پاکستان کے مستقبل کے بارے میں وقتاً فوقتاً شکوک و شبہات میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں بہت کم عوام اور بہت زیادہ خواص کی تعداد ہوتی ہے۔ خواص میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کی ایک جیب میں پاکستانی پاسپورٹ اور دوسری جیب میں امریکن گرین کارڈ یا دیگر ممالک کے اقامت نامے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ ان کے مال و متاع کا بیشتر حصہ بھی بیرونی بینکوں کی تجوریاں گرماتا ہے اور پاکستان میں وہ صرف ایسے کرنٹ اکاؤنٹ کھولنے پر قناعت کرتے ہیں جن پر زکوٰۃ کٹنے کا خطرہ لاحق نہ ہو۔ اس کے علاوہ انکم ٹیکس، ویلتھ ٹیکس اور زکوٰۃ سے بچ بچا کر اور غالباً منشیات کے کاروبار سے ہاتھ رنگ کر بھی کالے دھن کے انبار ایسی مہارت سے جمع کرتے ہیں کہ انجام کار حکومت ہی ان کے سامنے گھٹنے ٹیک کر دھوبی گھاٹ کھول دیتی ہے جہاں پر سرکاری افسر عجیب و غریب قوانین کا صابن مل مل کر کالی پونجی کو سفید کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ دیانت اور امانت کے ساتھ ساتھ ایک بھونڈا مذاق ہے۔

بہت سے لوگوں کے نزدیک پاکستان کی سلامتی اور استحکام کا راز فقط اس بات میں مضمر ہے کہ حالات کے اتار چڑھاؤ میں ان کے ذاتی اور سراسر انفرادی مفاد کا پیمانہ کس شرح سے گھٹتا یا بڑھتا ہے۔ ایسے لوگ قابل رحم ہیں۔ وہ بنیادی طور پر نہ تو وطن دشمن ہوتے ہیں اور نہ ہی ان پر غداری کا الزام لگانا چاہیے۔ مریضانہ ذہنیت کے یہ لوگ حرص و ہوس کی آگ میں سلگ سلگ کر اندر ہی اندر بزدلی کی راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ حوادث دنیا کا ہلکا سا جھونکا اس راکھ کو اڑا کر تتر بتر کر دیتا ہے۔ ان کا اپنا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ ان کا اصلی وطن محض ان کا اپنا نفس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو سر زمین بھی ان کی خود غرضی، خود پسندی، خود فروشی اور منافقت کو راس آئے وہ وہیں کے

ہو رہتے ہیں۔ پاکستان میں اس طرح کے افراد کا ایک طبقہ موجود تو ضرور ہے لیکن خوش قسمتی سے ان کی تعداد محدود ہے۔

اس کے برعکس پاکستانیوں کا سواد اعظم حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی حب الوطنی پر بار بار انتہائی کڑی آزمائش کے دور آتے رہے ہیں لیکن اب تک ان کے پائے ثبات میں کسی نمایاں لغزش کے آثار نمودار نہیں ہوئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے۔ البتہ ہمیں یہ ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیے کہ بار بار کفران نعمت کا مرتکب ہونے سے اللہ کے عذاب کی گرفت بھی بڑی شدید ہوتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ قوم کی قوت برداشت کا ضرورت سے زیادہ امتحان لیا جا چکا ہے۔ اب اس کے پیانہ صبر کو لبریز ہونے سے بچانا ہم سب کا اجتماعی اور انفرادی فرض ہے۔

ایک مختصر سا وقفہ چھوڑ کر اکتوبر ۱۹۵۸ء سے لے کر بڑے طویل عرصہ تک ہماری فوجی اور سول دونوں طرح کی حکومتیں مارشل لاء کی چھتری تلے برضا و رغبت ہنسی خوشی حکمرانی کرتی رہی ہیں۔ اس عمل سے ہماری مسلح افواج پر کیا اچھے یا برے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ان کا تجزیہ کرنا فوجی ماہرین کا کام ہے۔

البتہ یہاں پر ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ ۱۹۶۹ء میں جب میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا ممبر تھا تو ایک صاحب سے میرے نہایت اچھے مراسم ہو گئے' جو مشرقی یورپ کے باشندے تھے۔ اور ان کا ملک اپنی مرضی کے خلاف روس کے حلقہ اقتدار میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے وطن میں بعض کلیدی اسامیوں پر رہ چکے تھے اور روس کی پالیسیوں اور حکمت عملی سے بڑی حد تک واقف اور نالاں تھے۔

ایک روز باتوں باتوں میں انہوں نے کہا۔ "اگرچہ روس اور امریکہ ایک دوسرے کے حریف ہیں لیکن بعض امور میں اپنے اپنے مفاد کی خاطر دونوں کی پالیسیاں اور منصوبے ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت اختیار کر لیتے ہیں۔"

"مثلاً؟" میں نے پوچھا۔

"مثلاً پاکستان" وہ بولے۔
میری درخواست پر انہوں نے یہ وضاحت کی۔ "یہ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ پاکستان کی مسلح افواج کا شمار دنیا بھر کی اعلیٰ افواج میں ہوتا ہے۔ یہ حقیقت نہ روس کو پسند ہے اور نہ امریکہ کو۔ روس کی نظر افغانستان کے علاوہ بحیرۂ عرب کی جانب بھی ہے۔ اس کے علاوہ روس کو بھارت کی خوشنودی حاصل رکھنا بھی مرغوب خاطر ہے۔ ان تینوں مقاصد کے راستے جو چیز حائل ہے۔ وہ پاکستان کی فوج ہے۔ امریکہ کا مقصد مختلف ہے۔ امریکہ کی اصلی اور بنیادی وفاداری اسرائیل کے ساتھ ہے۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ اگر کسی وقت اسلامی سطح پر جہاد کا فتویٰ جاری ہو گیا تو پاکستان ہی وہ ملک ہے جہاں کی مسلح افواج اور نہتی آبادی کسی مزید حکم کا انتظار کئے بغیر جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر ایک دم بسوئے اسرائیل اٹھ کھڑی ہو گی۔ عالم اسلام میں اپنی تمام کامیاب ریشہ دوانیوں کے باوجود امریکہ یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ اس کے علاوہ روس کی مانند امریکہ بھی بھارت کی خیر سگالی اور خوشنودی حاصل کرنے اور بڑھانے کا آرزو مند ہے۔ پاکستان کی مسلح افواج روس' امریکہ اور بھارت کی آنکھ میں برابر کھٹکتی ہیں۔ اس لیے تمہاری فوج کو نکما اور کمزور کرنا تینوں کا مشترکہ نصب العین ہے۔
"لیکن وہ اس مشترکہ نصب العین کو پورا کیسے کر سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
وہ ہنس کر بولے۔ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ہر کوئی اپنا اپنا طریق کار وضع کرنے میں آزاد ہے۔ بدی اور شر کو بروئے کار لانے کے لیے ہزاروں راستے کھل جاتے ہیں۔ تیسری دنیا کے چھوٹے ممالک میں ایک طریقہ جو نمایاں کامیابی سے آزمایا جا رہا ہے۔ یہ ہے کہ وہاں کی مسلح افواج کو طویل سے طویل تر عرصہ کے لیے سول حکومت کے امور میں الجھائے رکھا جائے۔"
یہ گفتگو اس زمانے میں ہوئی جبکہ روس نے ابھی افغانستان پر قبضہ نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی مشرقی پاکستان میں بنگلہ دیش کی تحریک نے شدت اختیار کی تھی۔ اس کے بعد آج تک ۱۷ میں سے ۱۳ برس ہمارا وطن مارشل لا کے تحت رہا ہے۔ خدا نہ کرے یہ

صورت حال روس اور امریکہ اور اسرائیل کی دلی خواہش پورا کرنے کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام دے۔

سول حکومت کی مشینری کے بارے میں میرا تجربہ اور اندازہ یہ ہے کہ اس کی بہت سی اہم چولیں بتدریج پڑتی جا رہی ہیں۔ اوپر سے نیچے تک خود حفاظتی کی آڑ میں احساس ذمہ داری سے جان بچا کر ٹال مٹول کرنا عام ہو گیا ہے۔ ہر سطح پر قوت فیصلہ کمزور پڑ گئی ہے۔ رشوت کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور اس کا دائرہ عمل بھی افقاً اور عموداً دونوں جانب بہت زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ ان رذائل کا گندہ مواد طرح طرح کے ناسور بن کر معاشرے کے بیشتر شعبوں میں پھوٹ رہا ہے۔

اس کا واحد علاج یہ ہے کہ مارشل لاء خندہ پیشانی ہمیشہ کے لیے اپنے غروب آفتاب کا رخصتی کا بگل بجا کر بیرکوں میں واپس چلا جائے۔ ملک بھر میں بغیر کسی رکاوٹ کے سیاسی عمل از سر نو جاری ہو۔ ہر چوتھے یا پانچویں سال ہر سیاسی جماعت کے اپنے اپنے انتخاب لازمی ہوں۔ تاکہ جماعتی سطح پر قیادت کی چھان پھٹک ہوتی رہے۔ اور ان میں تازہ خون بھی باقاعدگی سے شامل ہوتا رہے۔ اس کے ساتھ اگر اگلے پندرہ برس میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے بھی چار پانچ منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات ہوتے رہے تو ۲۰۰۰ء میں انشاء اللہ ہمارے جمہوری نظام کا بھی ویسا ہی چرچا ہو سکتا ہے جس طرح کہ آج کل ہماری سکوائش' ہاکی اور کرکٹ کا ڈنکہ چار دانگ عالم میں بج رہا ہے۔

علامہ اقبال نے خبردار کیا تھا۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

ہندوستان تو کسی حد تک سمجھ گیا ہے۔ اس لیے سنبھل بھی گیا ہے اور اس کی داستان ہر جگہ بڑی آب و تاب سے جاری و ساری ہے۔ اب اپنے پاکستان میں ہمارے سمجھنے

کی باری ہے۔

قومی سطح پر ہماری سیاسی قیادت کا ایک بڑا حصہ اپنی طبعی یا ہنگامی زندگی گزار کر ہمارے درمیان سے اٹھ چکا ہے' یا جمود کا شکار ہو کر غیر فعال ہو چکا ہے۔ کچھ سیاسی پارٹیوں کے رہنما پیر تسمہ پا کی طرح اپنی اپنی جماعتوں کی گردن پر زبردستی چڑھے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے چند ایک نے کھلم کھلا یا در پردہ مارشل لاء کی آکسیجن سے سانس لے کر سسک سسک کر زندگی گزاری ہے۔ ان نیم جان سیاسی ڈھانچوں میں نہ تو کوئی تعمیری سکت باقی ہے اور نہ ہی ان کو عوام کا پورا اعتماد حاصل ہے۔ پرانی سیاست کی بساط الٹ چکی ہے۔ اب جب کبھی سیاست کا دور دورہ شروع ہو گا تو اس میں فقط ایسی نئی قیادت ابھرے گی جس کا دامن ماضی کی بہت سی آلائشوں سے پاک ہو۔ خدا کرے یا دور جلد سے جلد آئے اور اسے پوری پوری ایمانداری' خلوص اور نیک نیتی سے فروغ دیا جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا یا اس سے رکاوٹیں پڑتی رہیں تو پھر کیا ہو گا؟ اس کے تصور ہی سے دل لرز اٹھتا ہے۔ اس کے بارے میں نوشتہ دیوار جلی حروف میں ہمارے سامنے موجود ہے جسے پڑھنے کے لیے کسی خاص عینک لگانے کی ضرورت نہیں۔

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

کچھ عرصہ سے یہ فیشن بھی عام ہو رہا ہے کہ سول اور فوجی اعلیٰ افسر اپنی اپنی ملازمتیں پوری کرنے کے بعد خاصی تعداد میں بعض سیاسی جماعتوں میں نمایاں مقامات حاصل کر رہے ہیں۔ یہ سیاست اور جماعتوں دونوں کی بد قسمتی ہے۔ سرکاری ملازمتوں کو اپنا اپنا الگ چلن اور رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ اس میں طویل عرصہ گزارنے کے بعد انسان کی سوچ' وضع قطع' اخلاق و آداب' رکھ رکھاؤ' طور طریقہ اور انداز زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ سانچہ ان ضروریات سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو ایک کامیاب

سیاستدان بننے کے لیے لازمی ہیں۔ ایسے سابق اعلیٰ افسر چلے ہوئے کارتوس ہوتے ہیں ان میں سیاسی بارود بھر کر دوبارہ چلانے کی کوشش کرنا عملاً بیکار' بے حاصل اور بے اثر ہے جو سیاسی جماعتیں ایسی بیساکھیوں کا سہارا لے کر زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ عوام میں ان کی مقبولیت کی رفتار بھی بڑی حد تک لولی لنگڑی رہنے کا امکان ہے۔ اسی طرح جو افسران کرام ساری عمر سرکاری ملازمتوں کی کرسیاں گرمانے کے بعد پنشن خوار بن کر سیاست میں کود پڑتے ہیں تا کہ وہ اقتدار کی ان سیڑھیوں پر چڑھ بیٹھیں جن کے ماتحت وہ عمر بھر کام کرتے رہے ہیں۔ تو سیاست کو داغدار کرنے کے علاوہ وہ خود بھی جنت الحمقا میں رہتے ہیں۔ سیاست کا ایک ہمہ وقتی اور محترم پیشہ ہے۔ یہ بہروپیوں کا بازیچہ اطفال ہیں جہاں پر ریٹائرڈ سول اور فوجی افسر اپنے بالوں کو خضاب لگا کر اور پلپلے مسوڑھوں پر نئی بتیسیاں چڑھا کر قوم کو الو بنانے میں کامیاب ہو سکیں۔

اسی طرح غیر مخلص اور سخن ساز نعرے بھی سیاست کے وجود کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل چند سیاسی جماعتوں نے مل کر اپنی ایک مخالف جماعت کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ سیاسی اصولوں کے مطابق یہ ایک جائز اور روایتی عمل تھا۔ لیکن جب ان جماعتوں کے گٹھ جوڑ سے "نظام مصطفیٰ" کا نعرہ بلند ہوا تو اس ایجی ٹیشن کا رنگ بدل گیا۔ نظام مصطفیٰ کا نعرہ لگانے والوں پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ مقدس نعرہ منہ سے نکالنے سے پیشتر ان سب کو اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر اپنی ذاتی طرز معاشرت' رہن سہن' حقوق اللہ اور حقوق العباد پر کس حد تک پورا اترتا ہے۔ اس خود احتسابی کے بغیر محض ایک سیاسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایسا محترم نعرہ بلند کرنا اس کی بے حرمتی ہے۔ چنانچہ جونہی مخالف حکومت کا تختہ الٹا' اسی وقت تحریک میں شامل جماعتوں کا اتحاد تار عنکبو کی طرح ٹوٹ گیا۔ اور نظام مصطفیٰ کا نعرہ بھی طاق نسیاں کی زینت بن گیا۔ نظام مصطفیٰ کے حوالے سے اس تحریک کو چلانے کے لیے عوام اور خواص نے دل کھول کر چندہ بھی دیا تھا۔ اس فنڈ کی بد نظمی اور بد انتظامی کے بارے میں کافی عرصہ تک اخبارات میں ایسی خبریں آتی رہیں جنہیں

پڑھ کر ایک عام مسلمان کا سر شرم سے جھک جاتا تھا۔ کسی سیاسی جماعت کے منشور میں دین کو بنیاد بنانا یا سر فہرست رکھنا ایک قابل فہم بات ہے۔ لیکن دین کی آڑ لے کر وقتی طور پر سیاسی مقاصد حاصل کرنا دین کی تضحیک اور بے حرمتی ہے۔ ہماری سیاست کے جو عناصر اس منافقت کے مرتکب ہوتے رہیں گے۔ وہ ہمیشہ منہ کی کھائیں گے اور اقتدار کی ہوس ان کے سینوں میں ہمیشہ ناکامی کی راکھ میں دب کر سلگتی رہے گی۔

سیاست کی اساس یا دین ہوتی ہے یا دنیا' یا دونوں کا حسن امتزاج۔ اگر ہم اپنی سیاست میں دین اور دنیا کے حسین امتزاج کو کسی حد تک نبھانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ ہماری عین خوش نصیبی ہے۔

سیاست کی خود کفالت اس کی پاکیزگی اور توانائی کی کلید ہے۔ جو سیاسی عناصر دوسرے ممالک کی بخشی ہوئی بیساکھیوں کا سہارا لینے پر انحصار کرتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کی آزادی اور نمائندگی کی اہلیت نہیں رکھتے بلکہ الٹا غلامی کا بیج بونے کے مجرم ہیں۔ کچھ عرصہ سے یہ رسم بھی چل نکلی ہے کہ کچھ صاحبان اقتدار اور سیاسی رہنما ایک نہ ایک سپر پاور سے اپنے حق میں سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ضروری تصور کرتے ہیں۔ اگر وفاق میں صوبائی اختیارات نیک نیتی' دیانتداری' خلوص' باہمی افہام و تفہیم اور حقیقت شناسی سے متعین کر کے اس پر سچائی سے عمل درآمد نہ کیا جائے۔ تو فیڈریشن کا وجود کھوکھلا ہو کر کنفیڈریشن کے نعرے میں ڈھل جاتا ہے۔ سیاست اور نظم و نسق میں اس زہر کا فوری طور پر حسن تدبر سے کام لے کر تریاق فراہم نہ کیا جائے۔ تو رفتہ رفتہ کنفیڈریشن کا تصور بھی انتشار کے صحرا میں پھیل کر باد سموم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس زہر کا تریاق سیاسی عمل کی آزادی سے ظہور میں آتا ہے فوجی دباؤ کی گھٹن سے نہیں۔

ایٹمی توانائی کا حصول ہر آزاد ملک کا حق ہے۔ اس پر چند مختلف ممالک کی اجارہ داری ایک نئی شہنشاہیت اور سامراجیت کی بالا دستی کے نظام کو جنم دیتی ہے۔ بجلی' ٹیلیفون' ریڈیو' ٹیلیویژن' ہوائی جہاز وغیرہ کی ایجادات فروغ علم کا نتیجہ ہیں۔ علم نہ دبائے دبتا

ہے' نہ چھپائے چھپتا ہے۔ ایٹمی توانائی کا علم بھی دوسرے علوم کی طرح رفتہ رفتہ عام ہو رہا ہے۔ نیو کلیئر ٹیکنالوجی کے حصول اور استعمال کا انحصار وسائل کی دستیابی پر ہے۔ وسائل کی کمیابی سے تاخیر تو ممکن ہے۔ لیکن تدبیر کی کامیابی سے ہمیشہ کے لیے فرار ناممکن ہے۔ پاکستان میں ایٹمی سائنس کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا ہماری ہر حکومت کا فرض ہے۔ اس میں معذرت خواہی سے کام لینا ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ روس' امریکہ' اسرائیل اور بھارت ہمارے ایٹمی مراکز کو تباہ کرنے میں یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارا اصلی دفاع یہی ہے کہ ہم نیوکلیئر اسلحہ جات سے پوری طرح لیس ہوں۔ "اسلامی بم" کے طعنوں اور دھمکیوں میں آ کر گھٹنے ٹیک دینا ایک مجرمانہ لغزش ہو گی۔ جو ممالک "اسلامی بم" پر قدغن لگانے میں پیش پیش ہیں۔ ان سے بعید نہیں کہ وہ کسی وقت اسلامی اعمال کو بھی ممنوع قرار دینے کا نادر شاہی حکم صادر فرما دیں۔ ایسے عناصر کو پائے حقارت سے ٹھکرانے میں ہی ہماری خود اعتمادی اور عزت نفس کی بقا ہے۔

دنیا بھر میں جنگ کی بنیاد انفرادی یا محدود قبائلی سطح پر زر' زن اور زمین کی حرص میں شروع ہوئی تھی۔ پھر اس نے سامراجیت (Colonialism) کا رنگ چڑھا کر زبردست کی حکمرانی کی اور زیردست کی غلامی کا وطیرہ اختیار کر لیا۔ اس کا بنیادی مقصد ملک گیری کی ہوس تھا۔ اگلی منزل میں سیاسی نظام' معاشی نظریات اور سماجی اقدار میں اختلافات اور تصادم نے بڑے پیمانے پر عالمگیر جنگوں کا سلسلہ شروع کیا۔ اب رفتہ رفتہ ہوا کا رخ مزید بدل رہا ہے۔ حالیہ آثار گواہی دیتے ہیں کہ جلد یا بدیر سب سے بڑی اور ممکن ہے کہ آخری جنگ دین کی اساس پر دو تہذیبوں اور تمدنوں کے درمیان لڑی جائے۔ دنیائے اسلام ایک طرف اور باقی تمام غیر مسلم عناصر باہم مل جل کر دوسری جانب اس امکان کو فراموش کریں یا اس سے نبرد آزما ہونے کی تیاری میں غفلت سے کام لینے میں عالم اسلام کو عموماً اور پاکستان کو خصوصاً سب سے بڑا اور مہلک خطرہ ہے۔

اسرائیل کے خلاف ہماری پالیسی عربوں کو خیر سگالی حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ بلکہ

اسلام اور فقط اسلام کے ناطے سے ہے۔ یہود اور نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے اس پالیسی میں کسی قسم کی لچک یا کمزوری کو جگہ دینا لاریب اسلام کے ساتھ غداری کے

مترادف ہے۔ ایسی حرکت بے برکتی کی آندھیوں کو دعوت دے کر وطن عزیز کے وجود کو طرح طرح کے خطرات میں مبتلا کر سکتی ہے۔ یہ محض سیاسی حماقت ہی نہیں بلکہ دینی جرم بھی ہے۔

اسی طرح بھارت کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے (Normalization of Relations) کی آڑ میں ریڈ کلف لائن کو مدھم ہونے سے بچانا ہر صورت میں لازمی ہے۔ "بغل میں چھری اور منہ میں رام رام" والا محاورہ ایک ابدی اور اٹل حقیقت ہے۔ بھارت کے عزائم اور اعلانات میں ان کے ظاہر اور باطن کی تمیز کو چشم بصیرت' حسن تدبر اور شیوۂ دیوانگی سے پرکھنا ہمارا اولین فرض ہے۔ اگر یہ تمیز مصلحتوں یا غفلتوں کی نذر ہو گئی تو بربادی' تباہی اور فنا کا اندھا کنواں منہ پھاڑے سامنے کھدا پڑا ہے۔

افغانستان پر روس کا تسلط اسلام پر کھلا حملہ ہے۔ مشرق اور مغرب کے نام نہاد سیکولر اور آزادی پرست اقوام کے دل میں اسلام کے خلاف ہمدردی نہیں بلکہ بغض اور کینہ ہے۔ زبانی کلامی اعلانات اور ایک سپر پاور کے خلاف محدود مالی یا اسلحہ جاتی امداد محض نمائشی ڈھونگ ہے۔ اس بھرم کو قائم رکھنے کے لیے بہت سے ملک ہمارے ساتھ ہیں لیکن یہ قضیہ ہمیں کو چکانا ہے۔ رفتہ رفتہ روس کی افواج کسی نہ کسی حد تک واپس چلی جائیں تو چلی جائیں لیکن روسی اثرات کے جراثیم آسانی سے جانے والے نہیں ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ جراثیم جڑ پکڑتے رہیں گے۔ اگر سنٹرل ایشیا کے پسے ہوئے خوابیدہ مسلمان بیدار نہ ہوئے' تو ممکن ہے کہ افغانستان بھی انہی کا ہمرنگ ہو جائے۔ پاکستان میں اسلام کے فروغ کا نصب العین فقط ہمارے مفاد ہی میں نہیں' بلکہ افغانستان اور سنٹرل ایشیا کے لیے بھی کام آ سکتا ہے لیکن Islamization کے پردے میں Cosmetic Islam کا ڈھونگ رچانا منافقت کی دھول اڑانے کے علاوہ کوئی مقصد پورا نہیں کر سکتا۔ ہمیں